مئی - جون ۱۹۷۹ء

29(2-3)

15/2

ابن انشا

ایک روپیہ

گورنمنٹ رضا ڈگری کالج رامپور کی بزم اردو کے زیر اہتمام یوم میر منعقدہ ۵ نومبر ۱۹۶۶ء کے شرکاء

(بیٹھے ہوئے بائیں سے داہنے) ڈاکٹر آفتاب اختر، ڈاکٹر محمد حسن، غلام احمد فرقت کاکوروی، مولانا اختر علی تلہری، مالک رام، سید احمد مہدی۔
نائب وزیر حکومت ہند، ڈاکٹر او۔ بی۔ ایل۔ کپور پرنسپل اور سرپرست بزم اردو، ہز ہائی نس نواب سید مرتضیٰ علی خاں نواب رامپور مہمان خصوصی،
نعمت اللہ خاں صدر، مصطفیٰ علی خاں سکریٹری بزم اردو، پروفیسر سید احتشام حسین، مولانا امتیاز علی عرشی، سید شبیہ الحسن نونہروی،
پروفیسر نجم الدین نقوی، کیپٹن ذراست علی خاں

نیا دور

احتشام نمبر

جلد ۲۹ | نمبر ۲ و ۳

مئی - جون ۱۹۷۳ء
ویشاکھ جیشٹھ ۱۸۹۵ شک

چندہ سالانہ: پانچ روپے
فی پرچہ: پچاس پیسے
(احتشام نمبر: ایک روپیہ)

عنوانات

تصویر: عطیہ ڈاکٹر خلیق انجم

سرورق: بلی آرٹ

ایڈیٹر: خورشید احمد
پبلشر: شری ونی شرما، ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات، اتر پردیش
پرنٹر: اشوک دو، سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یو۔ پی
مطبوعہ: نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنؤ
شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش

اپنی بات

نیا دور کا احتشام نمبر حاضر خدمت ہے۔ عام طور سے کسی خاص نمبر کی اشاعت میں جو دشواریاں اور دقتیں پیش آتی ہیں انھیں کچھ وہی حضرات سمجھ سکتے ہیں جن کو اس قسم کی کاوشوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ پھر احتشام صاحب سے متعلق خاص نمبر کی اشاعت اس لیے بھی آسان نہ تھی کہ ان کی موت بیک وقت ایک متبحر عالم، ایک عظیم مفکر، ایک جلیل القدر ادیب، ایک نامور نقاد، جس نے اردو میں جدید تنقید کی بنیاد رکھی، ایک بالغ نظر معلم، ایک ماہر لسانیات ایک بڑے انسان اور شرافت و نیک نفسی، تہذیب و اخلاق، محبت و شفقت اور وضع داری کے ایک پیکر کی موت تھی جو ایک قومی حادثہ ہونے کے ساتھ ان کے بے شمار دوستوں مداحوں اور ان کے قریب آنے والوں کا ذاتی غم بن گئی۔ ایسے میں فوری ان پر کچھ لکھنا اور ان کے بلند پایہ ادبی کارناموں پر اظہار رائے کرنا اگر ناممکن نہیں تو بے انتہا دشوار تھا لیکن ہم اپنے قلمی معاونین کے ممنون ہیں کہ اس کے باوجود انھوں نے ہماری آواز پر آواز دی اور ہم اتنے کم وقت میں اتنا ضخیم نمبر پیش کرنے کا فخر حاصل کر رہے ہیں۔

احتشام حسین صاحب قصبہ ماہل ضلع اعظم گڑھ کے ایک معزز اور تعلیم یافتہ خاندان میں ۲۱ جولائی ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے پھوپھا کی نگرانی میں حاصل کی۔ ابھی عنفوان شباب ہی تھا کہ ۱۹۲۹ء میں آپ کے والد سید ابو جعفر صاحب نے بعارضہ چیچک انتقال کیا۔ والد کے انتقال کے بعد خود بھی زبردست چیچک میں مبتلا ہوئے اور زیست کی کوئی امید باقی نہ رہی لیکن قدرت کو انھیں منارۂ علم و دانش بنا کر ایک پوری نسل کی رہنمائی کا ان سے کام لینا تھا اس لیے مرض مہلک ہونے کے باوجود بچ گئے۔ ۱۹۳۰ء میں ویسلی اسکول اعظم گڑھ سے ہائی اسکول کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور اعلیٰ تعلیم [illegible] کرنے کے لیے الہ آباد گئے جہاں ۱۹۳۲ء میں انٹرمیجیٹ اور ۱۹۳۴ء میں بی۔ اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور گولڈ میڈلسٹ ہوئے۔ پھر ۱۹۳۶ء میں الہ آباد یونیورسٹی ہی سے ایم اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور سب میں اول آئے اور دو طلائی تمغے حاصل کیے۔ ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر مقرر ہوئے اور بعد میں ریڈر ہو گئے۔ لکھنؤ میں قیام کا زمانہ آپ کی بہترین علمی و ادبی سرگرمیوں کا زمانہ رہا۔ ۱۹۵۲ء میں راک فیلر فاؤنڈیشن کی جانب سے امریکہ و یورپ کا سفر کیا۔ ۱۹۶۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر اور ہیڈ مقرر ہوئے۔ لیکن لکھنؤ سے جانے کے بعد احتشام صاحب جیسے بجھ سے گئے تھے۔ ایک نامعلوم خلش انھیں بے چین اور متفکر رکھتی تھی۔ بالآخر یہی خلش جان لیوا ثابت ہوئی اور یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو صبح ساڑھے ۵ بجے ایسا شدید قلبی دورہ پڑا کہ طبی امداد بھی نہ پہنچ سکی اور وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے اور الہ آباد ہی کی خاک کو ہمیشہ کے لیے اپنی آغوش میں لے لینے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کی تصانیف میں ویرانے (افسانوں کا مجموعہ ۱۹۴۴ء) اور تنقیدی مضامین کے مجموعوں میں تنقیدی جائزے (۱۹۴۵ء)، روایت اور بغاوت (۱۹۴۷ء)، ادب اور سماج (۱۹۴۸ء) تنقید اور عملی تنقید (۱۹۵۲ء) ذوق ادب اور شعور (۱۹۵۵ء) عکس اور آئینے (۱۹۶۲ء)، افکار و مسائل (۱۹۶۲ء)، اعتبار نظر (۱۹۶۴ء) روشنی کے دریچے (۱۹۶۴ء)، تاریخ ادب اردو (ہندی میں) (۱۹۵۵ء) ساحل اور سمندر (سفرنامہ) (۱۹۵۵ء) اور تراجم میں کلکی: ڈاکٹر رادھا کرشنن، سالومی: آسکر وائلڈ، سوامی وویکانند: رومین رولاں، ہندستانی لسانیات کا خاکہ: جیمز بیمز، گنجی کی کہانی: لیڈی موراساکی اور ہماری سڑک: جے۔ پیٹرسن شامل ہیں۔

اس نمبر کے قلمی معاونین میں ہمارے بزرگ بھی شامل ہیں اور نوجوان بھی لیکن بعض نئے لکھنے والوں کے مضامین اور شعری تخلیقات مشہور و معروف ہی نہیں بلکہ بزرگ تر ادیبوں کے مقابلے میں بھی پہلے درج ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے بزرگ ادیبوں کی نگارشات ان کی بے انتہا مصروفیتوں کے باعث بار بار خط اور تار کے ذریعے یاد دہانیوں کے باوجود ہمیں بہت تاخیر سے موصول ہوئیں چنانچہ اس خیال سے کہ احتشام نمبر کی اشاعت میں بہت زیادہ تاخیر نہ ہو جائے عنوانات کی موجودہ ترتیب قائم کر کے جیسے جیسے مضامین وغیرہ موصول ہوتے رہے انھیں عنوانات کے تحت ان کی کتابت ہوتی اور کاپیاں جاتی رہیں۔ ورنہ مضامین اور نظموں کے تقدم اور تاخر کے اعتبار سے ادیبوں اور شاعروں کے درجے پر قیاس کرنا یا کوئی اور نتیجہ نکالنا ہرگز مناسب اور قرین انصاف نہ ہوگا۔

صاحبان نظر دیکھیں گے کہ اس نمبر میں بعض نادر و نایاب چیزیں شامل ہیں جنھیں نیا دور پہلی بار شائع کرنے کا فخر حاصل کر رہا ہے، مثلاً احتشام صاحب کی آخری تحریر جو انتقال سے کچھ دیر قبل مکمل ہوئی تھی اور ہمیں مرحوم کے منجھلے صاحبزادے برادرم عسکری جعفر صاحب سے موصول ہوئی ہے، جناب سری نواس لاہوٹی صاحب کے نام خط جو انتقال سے دو گھنٹے قبل شب میں لکھا اور ڈاک کے سپرد کیا گیا تھا، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد صاحب کے نام ایک خط جس میں موصوف کے استفسار پر مانی و بہزاد پر روشنی ڈالی گئی ہے (ان خطوط کا عکس ص۔ پر شائع کیا جا رہا ہے) اور جناب یونس خالدی صاحب کی کتاب کے لیے پیش لفظ جو اس سے قبل طبع نہیں ہوا۔ مرحوم بھائی فرقت صاحب کاکوروی کی نظم کا تذکرہ بھی یہاں ضروری ہے۔ احتشام صاحب کے انتقال کے بعد فرقت بھائی نے اپنے تاثرات نظم کیے تھے اور ازراہ محبت و خلوص اشاعت کے لیے نیا دور کو بھیج دیے تھے۔ یہ خبر نہیں تھی کہ اشاعت سے قبل انھیں بھی احتشام صاحب کے پاس پہنچ جانے کی عجلت ہوگی۔ یہ نظم اور اس کے ساتھ مرحوم کا خط تبرک کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔

آخر میں ان تمام مخلصین کا شکریہ ادا کرنا ایک اخلاقی فریضہ ہے جنھوں نے اس نمبر کی ترتیب میں اپنے مفید مشوروں سے نوازا اور خصوصیت سے تصویروں کی فراہمی میں عملی اعانت فرمائی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے مرحوم احتشام صاحب کے بھائی اعجاز حسین صاحب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ بیشتر تصویریں موصوف ہی سے حاصل ہوئیں۔ اس کے علاوہ چار تصویریں (احتشام صاحب دانش محل میں، اپنے مطالعہ کے کمرے میں، لائبریری میں کتابیں دیکھتے ہوئے اور جاننا جیکر کھیلتے ہوئے) محبی نسیم احمد صاحب دانش محل سے، انجمن ادب اطفال کے جلسے کا گروپ اور انجمن ترقی ادب کے جلسے کے دو گروپ محترمی ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی صاحب سے، رضا لائبریری رام پور میں یوم کبیر کی تقریب کے موقع کی تصویر محترم نجم الدین نقوی صاحب کی نشاندہی پر اور احتشام صاحب کی طالب علمی کے زمانے کی تصویر برادرم ساغر مہدی صاحب سے دستیاب ہوئی۔ یہ حضرات بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ اپنے دیرینہ کرم فرما محترمی صباح الدین عمر صاحب سکریٹری اترپردیش اردو اکادمی کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ موصوف کے مفید مشورے بھی برابر حاصل رہے۔ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ یہ نمبر ہر حیثیت سے جامع اور احتشام صاحب کے شایان شان ہے لیکن اتنا ضرور عرض کیا جا سکتا ہے کہ احتشام صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور ان کے مرتبے کی ایک جھلک پیش کر دینے کی پرخلوص کوشش کی گئی ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں ہماری یہ سعی و کوشش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ — ایڈیٹر
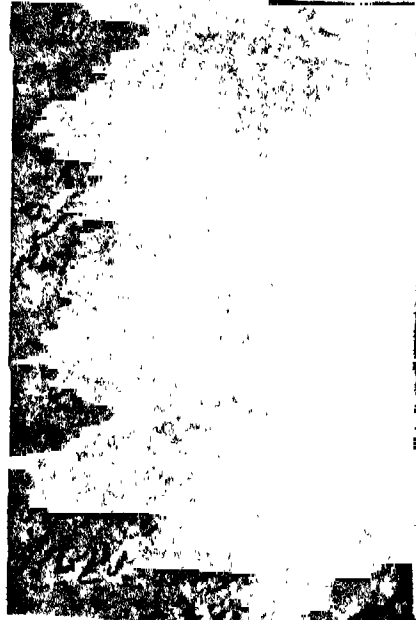
عکسِ تحریر

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کے نام خط جس میں آغا بہزاد پر روشنی ڈالی ہے
لاہوتی صاحب کے نام خط پانچ خطوط میں سے ایک جو زندگی کی آخری رات میں لکھے گئے تھے

RAJ BHAVAN

نینی تال
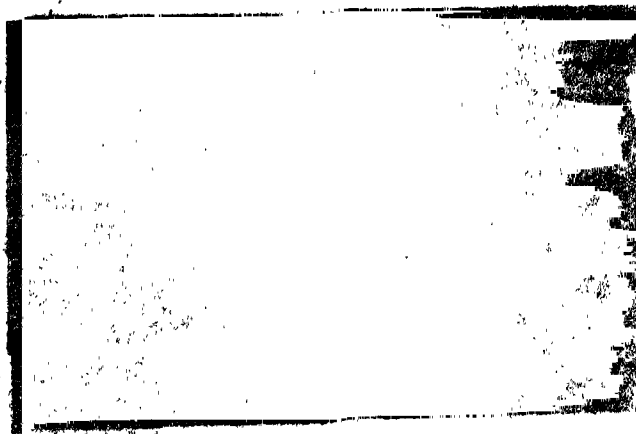
۲۲ جون [illegible]ء

پیغام

پروفیسر سید احتشام حسین رضوی اردو کے ایک جلیل القدر ادیب ہی نہیں ایک بڑے مفکر، مقرر، معلم اور بڑے انسان تھے۔ انھوں نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا اور ان کا تذکرہ اردو ادب کے ایک عظیم معمار اور فن کار کی حیثیت سے کیا جائے گا۔ انھوں نے اپنی فکر و نظر سے پوری ایک نسل کو متاثر کیا ہے جو کہ ایک معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ ان کی کاوشوں سے اردو کے فن تنقید کو بڑی عظمت حاصل ہوئی ہے۔ وہ غریب عوام کے ایک سچے دوست تھے۔ گردوپیش کے واقعات ترقی پسند نظر سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام ان کی تحریر اور تقریر سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ ان کی وفات پر جو ہندوستان گیر غم منایا گیا ہے وہ ایک طرف ان کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے تو دوسری طرف ان کی ہر دل عزیزی کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

قضا و قدر کے ہاتھوں نے ان کو جلد ہمارے درمیان سے اٹھا لیا ورنہ وہ ابھی اور کارآمد کام کرتے۔ حیدرآباد میں ایک مرتبہ میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ آزاد انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد کی طرف سے ہم لوگ اردو انسائیکلوپیڈیا ان کی رہنمائی میں تیار کرانا چاہتے تھے۔ مرحوم اس کام کے لیے تیار بھی تھے مگر افسوس موت نے ایسا ہونے نہ دیا۔ مجھ کو بڑی خوشی ہے کہ محکمۂ اطلاعات، اترپردیش کے ماہنامہ جریدہ "نیا دور" نے ان کی یاد میں ایک خصوصی نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ نمبر احتشام صاحب کی ادبی عظمت کے شایانِ شان ہوگا۔ میں اس خصوصی نمبر کی کامیابی کے لیے اپنی نیک تمنائیں پیش کرتا ہوں۔

اکبر علی خاں

(گورنر اترپردیش)

राज्य-मंत्री
सूचना और प्रसारण
भारत
MINISTER OF STATE
INFORMATION & BROADCASTING
INDIA

پیغام

مجھے یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی کہ ماہنامہ "نیا دور" اردو کے ممتاز نقاد پروفیسر احتشام حسین (مرحوم) سے متعلق ایک خصوصی نمبر شائع کر رہا ہے۔

وہ افسانہ نویس تھے، شاعر تھے، ماہر لسانیات تھے۔ لیکن ان کا اصل میدان تنقید تھا۔ جدید اردو تنقید کی صورت گری اور اسے ایک اعلیٰ و ارفع معیار عطا کرنے میں پروفیسر احتشام حسین نے جو اہم رول ادا کیا ہے وہ اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایک مخلص اور دیانتدار ترقی پسند نقاد تھے۔ ان کے علمی اور ادبی کارنامے اردو ادب کا سرمایۂ عظیم ہیں۔ اپنی تحریروں کے ذریعے انھوں نے اردو ادیبوں اور شاعروں کی دو تین نسلوں کو نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ انھیں شعر و ادب کی نئی راہیں بھی دکھائی ہیں۔

مجھے پروفیسر احتشام حسین کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور انھیں ذاتی تعلقات کی بنیاد پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ احتشام حسین جتنے بڑے ادیب اور نقاد تھے اتنے ہی بڑے انسان بھی تھے۔ ان کی شخصی ایمانداری، راست بازی اور دیانتداری ان کی تحریروں میں پہنچ کر ادب کا ایک مسلک بن گئی ہے۔

پروفیسر احتشام حسین عرصۂ دراز تک ایوان اردو میں ایک "مینارۂ نور" بنے رہیں گے۔ میری تمنا ہے کہ "نیا دور" کا یہ نمبر احتشام حسین کے فن اور شخصیت کے بارے میں ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت حاصل کرے۔

میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

(اندر کمار گجرال)
وزیر اطلاعات و نشریات

نئی دہلی ۔ جنوری [illegible]

शिक्षा मंत्री, भारत
EDUCATION MINISTER
INDIA

پیغام

مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ ادارۂ "نیا دور" لکھنؤ پروفیسر احتشام حسین کے بارے میں ایک خصوصی نمبر شائع کرنے جا رہا ہے۔

پروفیسر احتشام صاحب اردو کے ان چند ادیبوں میں ہیں جن کے نام کو ان کی زندگی ہی میں بقائے دوام کی سند مل گئی تھی۔ یوں تو انھوں نے ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اردو تنقید پر ان کا احسان کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ انھوں نے تنقید کو سماجی اور تاریخی شعور دیا اور ادب اور انسان کے مضبوط رشتوں کو ابھاگر کیا۔ تہذیب کے ارتقا کی تاریخ، انسانی جدوجہد کی تحریکات اور جمالیات کے سماجی پہلوؤں پر ان کی نظر گہری تھی۔ دوسری قوموں کے ادب پر بھی ان کا مطالعہ بیحد وسیع تھا۔ انھوں نے اپنے وسیع مطالعے اور مشاہدے کو اردو ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دیا اور ہمارے قومی ادب میں بیش بہا اضافے کیے۔ انھوں نے نئی سمتوں میں رہنمائی کی اور اردو کے رشتے دوسری ہندوستانی زبانوں سے مضبوط کیے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی ان کی اہم ہندی تصنیف "اردو ساہتیہ کا اتہاس" ہے۔

لسانیات پر بھی پروفیسر احتشام حسین کا مطالعہ وسیع و عمیق تھا۔ وہ اردو کے ہندستانی کردار کے دلدادہ تھے اور اسی لیے دوسری ہمعصر زبانوں کی تعریف اور لسانی روایتوں کو ایک سچے ادب دوست کی طرح جاننے سمجھنے اور پھیلانے کی کوشش کرتے تھے۔

وہ اردو کے شیدائیوں میں تھے اور ان کی وفات کے بعد اردو دانوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو والے بھی ان کے شیدائی تھے۔ ان کے کارناموں کو زندہ رکھنے کے لیے ہر اقدام موزوں اور مناسب ہے اور میں ادارۂ "نیا دور" کے اس خصوصی شمارے کا تہہ دل سے خیر مقدم کرتا ہوں۔

سید نور الحسن

(وزیر تعلیمات و ثقافت)

لکھنؤ ۔ ۲ جون ۷۳ء

پیغام

پروفیسر احتشام حسین صاحب اردو ادب میں ایک بڑی قد آور شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی ناوقت موت اردو ادب کے لیے بڑا جاں گداز حادثہ ہے۔ انھیں اردو دنیا میں جو بلند مقام حاصل تھا اس تک ہر ایک کا پہنچنا آسان نہیں ہے۔ ان کے افکار و خیالات نے جس طرح موجودہ نسل کو متاثر اور فیض یاب کیا اسی طرح آنے والی نسلیں بھی ان لافانی نقوش سے جو انھوں نے اردو ادب میں چھوڑے ہیں، روشنی اور رہنمائی حاصل کریں گی۔ ان کا قلم ہر صنفِ ادب میں گوہر بار تھا لیکن تنقید جدید کے تو وہ پیشواؤں میں شمار کیے جاتے تھے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ انھوں نے اردو تنقید کو ایک نیا موڑ دیا۔ اردو ادب کے مختلف ادوار اور پہلوؤں ہی پر ان کی گہری نظر نہ تھی بلکہ وہ عالمی ادب کے بھی بڑے عالم تھے۔ ادیب سے بڑھ کر وہ ایک انسان تھے۔ اور انسان کی حیثیت سے ان میں اتنی خوبیاں پائی جاتی تھیں کہ ہر شخص ان کی موت کو ایک عظیم ادیب ہی کی نہیں بلکہ ایک پیکرِ انسانیت کی موت سمجھتا ہے۔ مجھے ان سے متعدد بار ملنے کا موقعہ ملا، خاص طور سے اترپردیش اردو اکاڈمی کے سلسلے میں۔ اکاڈمی کے ایک فاضل اور پُرخلوص رکن کی حیثیت سے انھوں نے اکاڈمی کی جو خدمات انجام دیں اور جو مفید مشورے انھوں نے دیے انھیں بھلایا نہیں جا سکتا۔

مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ ماہنامہ "نیا دور" "احتشام نمبر" شائع کر رہا ہے۔ نیا دور کے اسپیشل نمبر ایک خصوصیت رکھتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ یہ نمبر بھی مثل سابق صوری اور معنوی خوبیوں کا حامل اور احتشام صاحب کے شایانِ شان ہوگا۔

میری نیک تمنائیں اس کے ساتھ ہیں۔

حامدہ حبیب اللہ

(حامدہ حبیب اللہ)
وزیر ریاست سماجی بہبود و صدر
اترپردیش اردو اکاڈمی

T, ...
MINISTER
A

صاحبِ فکر نقاد

پروفیسر سید احتشام حسین صاحب مرحوم سے میرا تعلق عرصے سے تھا اور وہ ہمیشہ مجھ سے لطف و محبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اُن کے ملنے جلنے کے انداز میں شرافت اور تہذیب کے ساتھ انکسار بھی شامل ہوتا تھا۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ وہ مجھ سے تو اس طرح ملتے تھے کہ اُس میں میری ذات سے عقیدت کا اظہار بھی ہوتا تھا، اور میری اور ان کی عمر میں جو فرق تھا اُس کا بھی اتنا لحاظ کہ مجھے ایک قسم کی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا تھا۔

وہ جب کبھی رام پور تشریف لاتے مجھ سے ملنے لائبریری یا گھر پر ضرور زحمت کرتے اور گھنٹوں مختلف مسائل پر گفتگو فرماتے۔ ان ملاقاتوں کا خوشگوار تاثر میرے ذہن پر یہ ہے کہ اُن کی رائیں، بالخصوص اردو کے قدیم سرمایے سے متعلق، بے حد متوازن اور صحت مند ہوتی تھیں۔ ان میں وہ کبھی جادۂ اعتدال سے منحرف ہوتے نہیں پائے گئے۔ اور یہ اُسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب گفتگو کرنے والے کا مطالعہ وافر اور ذہن انصاف پسند ہو۔

احتشام صاحب اپنی تحریروں میں بھی "مرنجاں مرنج" کے اصول پر قائم رہے۔ اُن کی اسی خوبی نے اُن کو ہمارے نقادوں کی صف میں ممتاز ترین مقام پر فائز کیا ہے۔

احتشام صاحب کے انتقال کے بعد اُن کے بارے میں مختلف مکاتب فکر کے لکھنے والوں کی جو تحریریں نظر سے گزر رہی ہیں ان کی حیثیت صرف یہی نہیں کہ ان میں مرنے والے کو اچھے الفاظ سے یاد کرنے کے اخلاقی اصول پر عمل کیا گیا ہے، بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ جو کچھ احتشام صاحب کے سلسلے میں لکھا گیا ہو، ہر شخص خواہ وہ اُن کا بزرگ ہو، دوست ہو یا شاگرد، اُن کے بارے میں ایک ہی طرح سوچنے پر مجبور تھا۔ میں نے بہت کم حضرات کے بارے میں ایسا اتفاق رائے دیکھا ہو۔ احتشام صاحب کی زندگی اور اُن کے کارنامے موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے نمونہ بنیں، تو یہ ہماری موجودہ اور آئندہ نسلوں کی خوش بختی ہوگی۔

احتشام صاحب کی تحریریں اپنی سنجیدہ متانت اور فکری عنصر کی بنا پر ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُن کا کلام الہام نہیں تھا۔ اس لیے اُس سے اختلاف کی گنجائش رہی ہے اور رہے گی۔ لیکن مختلف موضوعات پر لکھتے وقت انھوں نے جن نکات و اسرار و رموز کو اپنی ذہانت سے اجاگر کیا ہے وہ اردو تنقید کی تاریخ میں روشن چراغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

میں اگر یہ کہوں کہ احتشام صاحب جیسا ذہین اور صاحب فکر نقاد اردو زبان کو مدتوں نہیں ملے گا تو اسے میری قنوطیت نہ سمجھا جائے بلکہ اس سے مجھے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ احتشام صاحب اردو تنقید میں ایسی بے بدل حیثیت کے مالک تھے جس کا احساس اس وقت کچھ اور بھی زیادہ ہو رہا ہے جب کہ وہ ہمارے درمیان نہیں رہے۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں!

امتیاز علی عرشی

Dr. Shahryar Naqvi
M. A., D. Litt.
University of Isfahan

دکتر شہریار نقوی
دانشگاہ اصفہان

۵ مارچ ۱۹۷۳ء

فرزانۂ از دست رفتہ

خبر درگذشت ادیب نامور جلیل القدر و فاضل گرانمایۂ اردو پروفسور سید احتشام حسین که امروز بوسیلۂ جناب آقای سید شاہد علی نقوی از لاهور دریافت نمودم موجب کمال تاسف و تألم گردید و مرا عمیقاً تحت تاثیر اندوه فراوانی قرار داد و محزون و سوگوار ساخت۔

بدون شک فاضل مرحوم علاوه بر آنکه در رشته های ادبی اُستاد بزرگوار بودند و صاحب مقام شامخی محسوب می شدند در هنر انتقاد و پژوهش و تفحص علمی هم ید طولائی داشتند و مسافرت آن دانشمند فقید ضایعه ای بس عظیم در جهان علم و ادب بشمار میرود۔

بنابر همبستگی های زیادی که اردو با فارسی دارد ادبیات اردو در بین فارسی زبانان نیز علاقه و احترام خاصی را دارا می باشند و از این لحاظ مرگ پروفسور سید احتشام حسین نمی تواند با احساسات رنج و ملال توام نباشد۔

بعلت ضیق وقت بهمین کلماتی چند اکتفا ورزیده و با منتهای صمیمیت به شما و جمیع دوستداران فرزانۂ از دست رفته تسلیت می گویم۔ روانش شاد باد۔

شریک غم شما

[دستخط]

[ادیب نامور و جلیل القدر اور اردو کے فاضل گراں مایہ پروفیسر سید احتشام حسین کے اُٹھ جانے کی خبر لاہور سے آج مجھے جناب آقائی سید شاہد علی نقوی کے وسیلے سے موصول ہوئی جو کمال رنج و افسوس کا باعث ہوئی۔ اس خبر نے مجھے اندوہ فراواں میں مبتلا کر دیا اور محزون و سوگوار بنا دیا ہے۔

فاضل مرحوم بلاشک ادبی رشتوں میں بزرگ و برتر استاد تھے اور علاوہ اس کے کہ ان کا شمار بلند پایہ ادیبوں میں تھا، وہ فن تنقید اور علمی تفحص و تجسس میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کے ایسے دانش مند اور نایاب ادیب کا گزر جانا جہان علم و ادب میں ایک عظیم حادثہ ہے۔

اردو کو فارسی سے اتنی زیادہ ہم بستگی ہے کہ جس کی وجہ سے فارسی زبان والوں کو اردو ادیبوں سے علاقہ اور ان کا خصوصی احترام ملحوظ خاطر رہتا ہے۔ اس وجہ سے پروفیسر سید احتشام حسین کی موت کا ہمارے رنج و ملال بے پایاں کا سبب ہونا بالکل قدرتی ہے۔

قلت وقت کے سبب سے انھیں چند کلمات پر اکتفا کرتے ہوئے انتہائی صمیم قلب کے ساتھ آپ کی خدمت میں نیز ان فرزانۂ گم کردہ کے دوستوں کی خدمت میں تعزیت پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ مرحوم کی روح شادمان رہے۔

آپ کا شریک غم]

[1] ڈاکٹر شہریار نقوی شعبہ زبان و ادبیات اردو اصفہان یونیورسٹی نے یہ تعزیتی خط مرحوم احتشام حسین صاحب کے بھائی سید اعجاز حسین صاحب کے نام اصفہان سے بھیجا تھا جس سے اس سانحۂ عظیم پر موصوف کے تاثرات قلبی کا اندازہ ہوتا ہے۔
ایڈیٹر

بھائی جان

بات ۱۹۴۲ء کی ہے۔ "ادب لطیف" کے سالنامہ میں ایک مضمون "ترقی پسند ادب کیا ہے" کے عنوان سے شائع ہوا تھا اور مضمون نگار کا نام تھا "سید احتشام حسین رضوی" ——— میری احتشام صاحب سے یہ غائبانہ پہلی ملاقات تھی۔ ۱۹۴۴ء میں مجھے پہلی بار ان سے ملنے کا موقع ملا۔ لیکن اس پہلی ملاقات ہی نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے اس قدر قریب کر دیا تھا کہ وہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھنے لگے تھے۔ یہ قربت مرحوم کے آخری لمحہ تک باقی رہی اور میں شاید ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں جن کو مرحوم نے اپنے انتقال سے چند گھنٹے قبل خط کے ذریعے مخاطب کیا تھا۔

۱۹۴۹ء میں جب حکومت حیدرآباد نے میرے نام وارنٹ گرفتاری جاری کیا تو میں مسز سروجنی نائیڈو کے پاس جو اس وقت یو۔پی کی گورنر تھیں علاج کی غرض سے پہنچ گیا۔ اس موقع پر احتشام صاحب سے ہر روز نیاز حاصل ہوا کرتا تھا۔ وہ کافی ہاؤس تو بہت کم آتے تھے لیکن یونی ورسٹی میں یا پھر مکتبہ دانش محل میں ان سے ہر روز ملاقات ہو جایا کرتی تھی جس کی وجہ سے مجھے ان کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بڑے نقاد ہی نہیں بلکہ اونچے پایہ کے انسان بھی تھے۔ میرے لیے بہت مشکل ہے کہ میں اس وقت ان کے بارے میں تفصیل سے کچھ لکھ سکوں اس لیے کہ آج بھی دل اور دماغ اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ میں احتشام صاحب کو مرحوم کہہ کر مخاطب کروں۔

آزادی کے فوراً بعد رجعت پسندی اور قدامت کے دیوتاؤں نے ہر جمہوری تحریک پر حملہ کر کے اس کو ختم کرنے کی کوشش کی تو اس کی زد میں ترقی پسند ادبی تحریک بھی آئی تاکہ ملک میں دائیں بازو کا غلبہ ہو جائے مگر ہندوستانی قوم نے ان رجعت پسندوں کی ایک بھی نہیں چلنے دی۔ لیکن یہ صحیح ہو کہ اس منزل پر ترقی پسند ادبی تحریک میں اضمحلال آیا اور اس نے ادیبوں کی جو شیرازہ بندی کی تھی وہ ایک طرح سے ٹوٹ گئی ——— کچھ لوگ خاموش ہو گئے تو کچھ لوگوں نے تحریک کا ساتھ چھوڑ دیا اور کچھ لوگ مایوسی کا اس طرح سے شکار ہو گئے کہ گمنامی کے غار میں پہنچ گئے۔ مگر جو کچھ باقی بچے تھے انھوں نے حوصلے سے کام لیا اور جو شعل پریم چند اور ان کے ساتھیوں نے روشن کی تھی اور آج بھی ان فانوسوں سے ہمارا ادب ضیا بار ہا ہے اور جو کارواں رواں دواں ہے اس کی قافلہ سالاری میں احتشام حسین سرفہرست تھے۔ وہ ایک طرح سے نئی تنقید کے میر کارواں تھے جنھوں نے ہمیشہ نقطۂ نظر پر اصرار کیا اور ادب میں جانبداری کی روایت کو باقی رکھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ادیب کبھی بھی غیر جانبدار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ ادب فرد کے سماجی شعور کی عکاسی کرتا ہے اور جانبداری کے بغیر ادب کا تصور ایک ساکن اور جامد تصور ہے۔ ادب میں "جدیدیت" کے تصور کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ادب میں جدت ہونی چاہیے نئے انداز اور نئے اسالیب اپنائے جانے چاہیے لیکن ساتھ ہی ساتھ مکمل ابلاغ ضروری ہے۔

احتشام صاحب نے اپنی تحریکوں کے ذریعے اردو ادب کو ایک نیا عمرانی شعور عطا کیا جو نئی نسل کے لیے مشعل راہ کا کام دے گا اور یہی ان کی ادب کو سب سے بڑی دین ہے۔

رِحلتِ فخرِ روزگار

مولانا عبدالماجد دریابادی

اردو پر جو مخلص آج اپنا جی جان قربان کیے ہوئے ہیں اور اردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں ان میں کوئی احتشام مرحوم سے بڑھ کر تو خیر اور کیا ہوتا، کوئی ان کے برابر کا، ان کی ٹکر کا مل جائے تو یہی بڑی بات ہے۔

اردو کی خدمت بہ عنوان بہرصورت۔ یہی قال، یہی شغل، یہی دھندا، یہی جال یہی کمال۔ اردو میں ناقد تو پہلے بھی بڑے بڑے ہو چکے تھے، اور سخن فہم و سخن سنج، حالی و شبلی کے سے گزر چکے تھے، لیکن وہ سخن فہمی تمام تر ذوقی و وجدانی تھی، کسی ترکیب کی ندرت پر جھوم اٹھے، کسی فقرے کی نزاکت پر داد کے ساتھ دل دے بیٹھے لیکن تنقید بحیثیت فن کے "دورِ احتشامی" سے قبل اردو میں کہاں آئی تھی۔۔۔ اردو کا مورخ ادب اس موضوع پر جب قلم اٹھائے گا اور اس فن کے بانیوں میں جن کا نام گنائے گا، اردو والوں میں نام اس عالیشان والا احتشام کا ضرور آئے گا۔

(لکھنؤ میں آل انڈیا میر اکادمی کے زیر اہتمام تعزیتی جلسے کی صدارتی تقریر کا ایک اقتباس)

سید مسعود حسن رضوی

احتشام صاحب کی موت کی خبر نہایت افسوسناک، انتہائی المناک ہے۔ وہ اس وقت سب سے زیادہ مقبول ادیب تھے۔ ہر جگہ، خواہ کوئی ادبی تقریب ہو، اجتماع ہو، احتشام صاحب کا نام سامنے ضرور آتا تھا۔ معلوم ہوا کہ ادھر ان کی طبیعت کچھ خراب تھی لیکن کل ہی فاروقی صاحب کے پاس اُن کا خط آیا تھا کہ میں اب اچھا ہوں قدرت نے اتنا اچھا کر دیا کہ اب بیمار ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں رہا۔

فراق گورکھپوری

سید احتشام حسین کی اچانک اور بے وقت موت سے مجھے جیسا یا جتنا صدمہ پہنچا ہے میں اُسے بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے وہ زمانہ یاد ہے کہ جب وہ بحیثیت شاگرد کے میرے سیکشن میں انگریزی پڑھتے تھے اور بہت جلد انھوں نے یہ اثر مجھ پر ڈال دیا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی قابلیت کا طالب علم ہے۔ احتشام صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں، یقین نہیں آتا۔ ابھی اُن کی صورت سامنے نظر آ رہی ہے۔ اُن کی آوازیں کان میں گونج رہی ہیں۔ ان کا کردار کتنا نقش جمائے ہوئے ہے۔ اس دور میں عالمانہ تنقید کی تاریخ کبھی مکمل نہیں ہوگی بغیر ان کے کارناموں کا جائزہ لیے ہوئے۔ میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ جاتے جاتے وہ مجھے غم کی وہ دولت دے گئے ہیں کہ جس میں میں بیک وقت اُداس، ناامید اور ایک حد تک غم آلود استغنا کا احساس کرتا رہوں گا۔

بابو رام سکسینہ (وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی)

آج صبح جب میں گھر پر بیٹھا ہوا تھا اور یونیورسٹی جانے کی سوچ رہا تھا، تبھی ٹیلیفون ملا کہ احتشام صاحب گزر گئے۔ یقین نہیں ہوا کیونکہ ابھی پرسوں ہی یہیں اسی جگہ شام کو کوئی گھنٹے بھر تک ان سے بات چیت ہوئی اور یونیورسٹی کے بارے میں اور علم اور ادب کے بارے میں ان سے تبادلۂ خیال ہوا۔ احتشام حسین الہ آباد یونیورسٹی کے بہت نامی طالب علم بھی تھے اور یہاں کے شعبۂ اردو کے پروفیسر اور ہیڈ بھی تھے۔ ایسا وِدوان اپنے مضمون کا، یوں کہیں کہ تمام بھارتیہ ساہتیہ کا بھارتیہ ادب کا ملنا مشکل ہے۔ ان کے چلے جانے سے یونیورسٹی کو ہی نہیں نقصان ہوا، ملک کو بھی بڑا بھاری نقصان ہوا ہے۔

امرت لال ناگر (ہندی کے مشہور ناول نگار)

احتشام بھائی کے نِدھن کی خبر سن کر یکا یک ایسا لگتا ہے کہ میری رنگ بھری دنیا مجھ سے بچھڑ گئی۔ احتشام حسین صاحب سے میرا پریچے ۴۹-۱۹۴۸ء کے لگ بھگ ہوا تھا اور اس کے بعد پ۔ ڈبلیو۔ اے، پرگتی شیل لیکھک سنگھ کے بہت سے جلسوں میں ہم لوگ ساتھ ساتھ شریک ہوئے۔ بہت سے ایسے ساہتیک مسئلے تھے جن پر آپس میں ہم لوگوں نے باتیں کیں، بحثیں کیں اور ایسا لگتا ہے کہ وہ کتاب جو ہم پڑھ رہے تھے اس کا صفحہ یکا یک کوئی نوچ لے گیا۔ ہندی، اُردو کے پرکانڈ وِدوان، دونوں شیلیوں کے اوپر اُن کا ایسا سمان ادھیکار تھا کہ بہت ہی کم لوگ ملتے ہیں۔

رام لعل (اردو کے مشہور افسانہ نگار)

احتشام حسین صاحب کے انتقال سے اُردو ادب میں جو جگہ خالی ہو گئی ہے وہ کبھی پُر نہیں ہوگی کیونکہ وہ اردو کی تاریخ میں ایسے وقت آئے کہ اس کا ادب ایک نئے موڑ پر پہنچ ہی نہیں چکا تھا بلکہ اُس سے بھی آگے کے ایک تاریخی موڑ کا منتظر تھا۔

صباح الدین عمر (سکریٹری اتر پردیش اردو اکاڈمی)

پروفیسر سید احتشام حسین کی اچانک اور قبل از وقت موت، اردو زبان کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔ انھوں نے اردو ادب کو اتنا کچھ دیا ہے کہ اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ جدید اردو ادب کے معمار تھے۔ اردو زبان ان کے احسان سے کبھی سر نہیں اٹھا سکتی۔

امرت رائے

احتشام صاحب کی اچانک موت ایک ایسا سانحہ ہے کہ جس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا اور جس سے انکار بھی ممکن نہیں۔ بحیثیت ایک نقاد کے ان کی اردو ادب میں وہ جگہ ہے جو کہ غالباً کسی اور ناقد کی نہیں ہے اور ان کے چلے جانے سے تنقید کی دنیا میں ایک اتنا بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کے جلدی بھرے جانے کی امید نہیں ہے۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

باقی صفحہ ۱۶۸ پر

بھیّا — احتشام حسین

انصار حسین

اب جبکہ ہمارے بھیّا ہم سے جدا ہو چکے ہیں، یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم کتنی بڑی نعمت سے محروم ہو گئے ہیں۔ اللہ اللہ! وہ محبتیں، وہ شفقتیں، وہ ہمدردیاں یاد آتی ہیں تو دل بے قرار ہو جاتا ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ بھائیوں میں ایسا پیار، ایسی محبت دیکھنے میں نہیں آئی۔ اور بھیا کی محبت! اس میں تو پدرانہ شفقت کی بھی چاشنی ملی تھی۔

ویسے مجھ میں اور بھیا میں کوئی چار سال کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ لیکن شفقت و محبت کی جو جھلک میں نے والد مغفور سید ابو جعفر صاحب کے انتقال کے بعد بھیا کی آنکھوں میں دیکھی تھی وہ دل میں اترتی چلی گئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۲۴ء میں جبکہ میرا سن کوئی ۸ سال کا تھا، میں اپنے ماموں سید ظہور الحسن صاحب کے پاس جن کے کوئی اولاد نہیں تھی، پھوپھوند ضلع فیض آباد چلا گیا اور ۱۹۳۹ء تک ماموں و ممانی کے زیر سایہ پرورش اور تربیت پاتا رہا۔ کبھی کبھی اپنے وطن ماہل جاتا اور بھیا نیز دوسرے اعزا سے ملاقات ہوتی۔ مگر ۱۹۲۹ء میں جب میں ماہل گیا تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ اس سال چیچک وبائی شکل میں پھیلی ہوئی تھی۔ والد کا انتقال اسی موذی مرض میں ہوا۔ جب اس کی اطلاع ماموں کے ہاں پہنچی تو گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ ماموں اور ممانی فوراً ماہل کے لیے روانہ ہوئے۔ میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ گھر پہنچا تو میں نے بھیا کو بہت زیادہ متاثر پایا۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک یہ کہ بھیا اپنے سینے میں ایک بہت ہی دردمند دل رکھتے تھے، دوسرے بھائیوں میں سب سے بڑے ہونے اور فطرتاً ذمے داری کا زیادہ احساس رکھنے کی وجہ سے ان پر اس حادثہ کا بے حد اثر تھا۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے جس شفقت کا اظہار کیا اس نے والد کے سایہ عاطفت سے محروم ہو جانے کے غم کے بوجھ کو ہلکا کر دیا۔ چند دنوں کے بعد میں ماموں اور ممانی کے ساتھ پھوپھوند واپس چلا آیا اور جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں ۱۹۳۹ء تک مسلسل وہاں قیام رہا جس کی وجہ سے بھیا اور دوسرے اعزا سے دوری ہو گئی۔ لیکن اس دوری کے باوجود بھیا کی محبت میں کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ مثل باپ کے مجھ سے محبت کرتے تھے۔ میں بھی باپ کی جگہ ان کو سمجھتا اور اسی طرح ان کا احترام کرتا تھا۔

اپنے بھائی انصار حسین کے ساتھ

والد مغفور کے انتقال کے بعد گھر کے افراد ایک ایک کر کے چیچک میں مبتلا ہونے لگے۔ بھیا کے بھی چیچک نکلی اور والد ہی کی طرح شدید تھی کہ ان کی زندگی کے بھی لالے پڑ گئے۔ لیکن قدرت کو بھیا سے علمی اور ادبی خدمت لینا مقصود تھا اس لیے وہ اس مہلک مرض سے جانبر ہو گئے۔ خوشی اس کی زیادہ تھی کہ مرض کی اتنی شدت کے باوجود کوئی جسمانی نقصان نہیں پہنچا۔ اگلے سال یعنی ۱۹۳۰ء میں بھیا نے ویسلی ہائی اسکول اعظم گڑھ (جو مشن اسکول کے نام سے مشہور ہے) اعزاز کے ساتھ میٹرک کا امتحان پاس کیا اور مزید تعلیم کے لیے الہ آباد چلے گئے۔

والد صاحب قبلہ کے نام کئی بندوقیں اور ریوالور تھیں نیز کافی جائداد تھی جو حکومت برطانیہ کی طرف سے خیر خواہی کے صلے میں ملی تھی۔ اس پر مالگزاری بھی معاف تھی۔ یہ سب چیزیں والد کے انتقال کے بعد بھیا کے نام ہو جانا چاہیے تھیں۔ مگر بھیا مرحوم نے ۱۹۳۰ء میں حکومت برطانیہ کے خلاف زبردست مضمون لکھا تھا۔ جب اعظم گڑھ کے کلکٹر کو معلوم ہوا تو اس نے کہا کہ اگر احتشام صاحب اپنا مضمون واپس لے لیں تو تمام ہتھیار رہیں اور معافی مالگزاری کا پروانہ ان کے نام جاری کر دیا جائے۔ مگر بھیا نے مضمون واپس لینے سے انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ مضمون میں نے دیانت داری کے ساتھ لکھا ہے اس لیے اس کے واپس لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خواہ بندوقیں اور ریوالور ملیں یا نہ ملیں اور خواہ ہماری جائداد پر مالگزاری ہی کیوں نہ مقرر کر دی جائے۔

اس سے بھیا کے کردار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ایک بار دیانتداری کے ساتھ جو بات کہہ دیتے یا سوچ سمجھ کر جو قدم اٹھا لیتے اس سے پھر پیچھے نہ ہٹتے۔

۱۹۳۴ء میں بھیا نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور اتنے اچھے نمبر حاصل کیے کہ آپ کو ایک سونے کا تمغہ دیا گیا اور سرکاری وظیفہ بھی ملنے لگا۔ اپنی الٰہ آباد کی زندگی کے بارے میں مرحوم نے خود لکھا ہے:-

"۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد پہنچا جو اس وقت انگریزی حکومت کے خلاف سول نافرمانی کا مرکز تھا۔ بدیسی خاص کر برطانوی مال کا بائیکاٹ، ستیہ گرہ اور سیاسی چہل پہل اپنے شباب پر تھی میں بھی فطری طور پر آزادی کے جذبہ سے معمور ہو گیا۔" (ساحل سمندر صفحہ ۱۹)

۱۹۳۶ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی ہی سے بھیا نے اردو میں ایم اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور دو طلائی تمغے حاصل کیے۔ اس کے بعد ایل۔ ایل۔ بی میں داخلہ لیا۔ اسی زمانے میں پی سی۔ ایس اور آئی سی ایس کے امتحانات بھی دیے لیکن ان پر زیادہ زور نہیں دیا کیونکہ شروع ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق دل میں سمایا ہوا تھا اس لیے کسی سرکاری ملازمت کے لیے تیار نہ تھے۔ اسی اثنا میں لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچرر کی ایک جگہ خالی ہوئی۔ اس کا اشتہار نکلا بعض عزیزوں اور دوستوں کے اصرار پر بھیا نے بھی ایک درخواست روانہ کر دی اور ۱۹۳۸ء میں آپ لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچرر ہو گئے۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۶ء تک کا زمانہ جبکہ الٰہ آباد سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا بھیا کی تعلیمی اور سیاسی زندگی کا بھی زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

"یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران میں میں نے لکھنا شروع کیا افسانے، ڈرامے، نظمیں، غزلیں تنقیدی مقالات، علمی مضامین میں سب کچھ ادب، تاریخ، فلسفہ، سیاست، نفسیات، جنسیات سب سے دلچسپی لیتا تھا تاکہ زندگی کے مسائل پوری طرح سمجھ سکوں، آخر کار میرا پورا وقت تنقید سے دلچسپی لینے، تنقیدی مضامین لکھنے میں صرف ہونے لگا۔" (ساحل سمندر ۱۹)

۱۹۳۹ء میں جب بھیا کرسچین کالج کے سامنے بدری ناتھ روڈ پر رہتے تھے ایک مرتبہ میں بلا اطلاع آیا اور دروازہ کھٹکھٹا کر زینہ پر چڑھ گیا۔ بھیا نے مجھے نہیں پہچانا۔ ایک کرسی اٹھا کر پیش کرتے ہوئے بیٹھنے کو کہا۔ میں حیرت میں تھا۔ جب میں نے بھیا سلام کہا اور انھوں نے میری آواز سن کر پہچانا تو گلے سے لگا لیا۔ میں دو تین دن رہ کر واپس کھجوہے چلا گیا۔ ۱۹۴۰ء میں بھیا کی شادی نگرام ضلع لکھنؤ میں میر فدا حسین صاحب کی پوتی اور سید حسن عسکری صاحب کی چھوٹی صاحبزادی سے ہوئی۔ بڑی صاحبزادی کی شادی شمیم کرہانی صاحب سے ہوئی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد والدہ صاحبہ اور عم محترم جناب سید ابو محمد صاحب مرحوم کے حکم سے میں واپس ماہل آیا اور پھر وہیں رہنے لگا۔ یکایک میں ٹائیفائڈ میں مبتلا ہو گیا۔ اس زمانے میں بھیا چھٹیوں میں ماہل آئے ہوئے تھے میری طویل علالت میں بھیا نے میری تیمارداری کے فرائض اپنے ذمے لے لیے اور ایسی تیمارداری کی کہ دیکھنے والے حیرت زدہ رہ گئے۔ دن رات میرے ہی سرہانے کرسی پر بیٹھے رہتے تھے۔ آخر ان کی ان تھک تیمارداری اور اللہ کے کرم سے میں اچھا ہو گیا۔

اس کے دو سال بعد گرمیوں کی تعطیل میں بھیا معہ بھابی صاحبہ کے ماہل آئے انکے ساتھ ان کا چھ مہینے کا بچہ سید جعفر عباس سلمہٗ بھی تھا۔ وہ مجھ سے جلد ہی مانوس ہو گیا اور ایسا مانوس ہوا کہ نہ میں اس کے بغیر رہ سکتا تھا نہ وہ میرے بغیر۔ بھیا اور بھابی واپس لکھنؤ جانے لگے میں بیکار ہی تھا انکے ساتھ میں بھی لکھنؤ آ گیا اور انھیں کے ساتھ رہنے لگا۔ بھابی جب بھی نگرام جاتیں میں بھی انکے ساتھ نگرام جاتا تھا اور جب تک بھابی نگرام رہتی تھیں میں بھی نگرام ہی میں رہتا تھا۔ بھابی صاحبہ مثل اولاد کے مجھے چاہنے لگیں اور میں بھی ان کو ماں سے کم نہ سمجھتا تھا۔

مجھے بیکاری سے پریشانی ہو رہی تھی اس لیے میں نے ایک آٹا چکی کا انتظام کیا اور وطن ماہل چلا گیا۔ لیکن ناتجربہ کاری اور مزاج میں عجلت کی وجہ سے نفع کی بجائے گھاٹا ہوا۔ مجبوراً چکی فروخت کر کے بمبئی تلاش معاش میں چلا گیا۔ اس طرح کچھ عرصے کے لیے ایک بار پھر بھیا کا ساتھ چھوٹا۔ بمبئی میں ۸۔ ۹ ماہ بعد میں سخت بیمار پڑا۔ بھیا کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے تار دیکر بلوایا۔ لکھنؤ کے مشہور طبیب ڈاکٹر کچو کا علاج شروع ہوا۔ چند روز میں میں ٹھیک ہو گیا اور بھیا کے ساتھ ہی رہنے لگا۔ اس وقت سے اب تک مستقل لکھنؤ ہی میں قیام پذیر ہوں اور منیجر کی حیثیت سے سرفراز اخبار اور پریس سے متعلق ہوں۔

۱۹۵۲ء میں بھیا امریکہ گئے تھے۔ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے دوستوں اور عزیزوں سے ملنے وطن گئے۔ وہاں بھیا کے اعزاز میں ایک عظیم الشان جلسہ گاؤں پنچایت کی جانب سے ہوا۔ اس کے تاثرات انھوں نے بڑے پر اثر انداز میں اپنے سفرنامے ساحل اور سمندر میں قلم بند کیے ہیں۔ بھیا مرحوم جب امریکہ جانے لگے تو ان کا چھوٹا بچہ جعفر اقبال صرف چند ہفتوں کا تھا۔ امریکہ اور لندن کے سفر سے بھیا ۹ جولائی ۱۹۵۳ء کو واپس آئے۔ انھوں نے ایک ڈائری میں اپنے سفر کے کچھ نوٹ لکھے تھے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد میرے چھوٹے بھائی سید افتدار حسین نے تقاضا شروع کر دیا کہ آپ اپنا سفرنامہ مکمل کریں۔ تقاضوں سے عاجز آکر تھوڑا تھوڑا حصہ سفرنامے کا لکھنا شروع کیا۔ میں نے ضد شروع کی کہ یہ سفرنامہ ساحل اور سمندر میں چھاپوں گا حالانکہ اس وقت تک میں نے نہ کوئی کتاب چھاپی تھی اور نہ یہ تجربہ کہ کتاب کی نکاسی کیسے ہوتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ طباعت کے لیے میرے پاس پیسے بھی

نہ تھا۔ میں اپنے منجھلے بھائی سید وجاہت حسین صاحب کے پاس گیا جو ان دنوں کورٹ آف وارڈس میں ملازم تھے اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔ وہ فوراً میری مدد کے لیے تیار ہو گئے۔ اب کیا تھا میری دلی مراد بر آئی۔ میں نے واپس آکر بھیا سے کہا کہ اب آپ مسودہ تیار کر دیں اور پھر میرے آئے دن کے تقاضوں سے عاجز آکر بھیا نے مسودہ لکھنا شروع کر دیا۔ اگر وہ یہ کتاب کسی پبلشر کو دیتے تو انکو ہزاروں روپیہ رائلٹی ملتی لیکن انکو پیسے کی کبھی کوئی پرواہ نہیں رہی۔ بھیا مسودہ دیتے جاتے اور میں اسے کتابت کو دیتا جاتا تھا۔ جلد ہی کتاب نہایت صاف ستھری چھپ گئی اور باوجود ناتجربہ کاری کے فروخت ہونا شروع ہو گئی۔ شروع ہی سے ہم بھائیوں میں اتنی محبت تھی کہ کوئی بھائی دوسرے بھائی کی بات ٹالدے یہ ممکن نہ تھا۔ اور کسی کے پیسے کو کوئی بھائی خرچ کر ڈالتا تو دوسرا کوئی سوال نہ کرتا تھا۔ چند باتیں جو بھیا میں خاص تھیں، میں نے آج تک کسی میں بھی نہیں پائی۔ مثلاً میں نے ایسا کسی کو نہ پایا کہ برجستہ لکھتا جائے، کاتب کے حوالے کرتا جائے اور کوئی کٹ پٹ نہ ہو یا کاپی اور پروف ریڈنگ کرتے وقت کوئی جملہ گھٹا بڑھا نہ دے جیسا کہ عام طور پر مصنفوں کے یہاں ہوتا ہے۔ دوسری چیز جو حیرت ناک تھی وہ یہ کہ کوئی لکھنے والا شور و غل میں کوئی مضمون یا کتاب نہیں لکھ سکتا۔ لیکن بھیا کو دیکھا کہ ان کا قلم چل رہا ہے بچے شور کر رہے ہیں ہم لوگ باتیں کر رہے ہیں اور وہ باتوں کے جواب دیتے جاتے ہیں اور لکھ بھی رہے ہیں۔ کتابوں کی شناخت کے بارے میں ہم لوگ اکثر انکا امتحان لیتے تھے۔ الماری سے کوئی کتاب نکال کر ان کی پشت کے پاس لاتے تھے اور کہتے تھے بھیا بتایئے یہ کون سی کتاب ہے۔ موصوف پیچھے ہاتھ کر کے کتاب کو ٹٹول کر فوراً بتا دیتے تھے کہ فلاں کتاب ہے۔ دن رات ان کی چارپائی پر طرح طرح کی کتابیں رکھی رہتی تھیں اور بیچ میں جگہ خالی رہتی تھی، ایسی کہ کسی وقت وہ اسی پر لیٹ رہتے اور کبھی اس پر بیٹھ جاتے تھے۔ بس کتابیں ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھیں۔ نیند کے معاملے میں ان میں خاص خوبی یہ تھی کہ جب چاہتے سو جاتے اور جب چاہتے اٹھ بیٹھتے۔ ہم لوگ باتیں کر رہے ہیں اور وہ جواب دے رہے ہیں چند منٹ میں انکی آنکھیں بند ہو گئیں اور اندازہ ہوا کہ سو گئے۔

۱۹۵۳ء میں بھیا کے اصرار سے میں نے بچوں کو بھی لکھنؤ بلا لیا اور چھوٹر گولا گنج میں رہنے لگا۔ لیکن میرا معمول تھا کہ صبح سویرے بارود خانے بھیا کے یہاں چلا جاتا اور وہیں سے دفتر جاتا۔ شام کو واپسی کے تھوڑی دیر بعد پھر بارود خانے بھیا کے پاس پہنچ جاتا۔ اسی طرح روز و شب گزرتے رہے۔ بھیا قدم قدم پر میری رہنمائی کرتے رہے۔ یہ سلسلہ ان کے قیام لکھنؤ تک رہا۔ الہ آباد چلے جانے کے بعد بھی بھیا میری رہنمائی سے غافل نہیں رہے اور ہر مشکل میں میری مدد کرتے۔

۱۹۵۰ء میں مجھ سے بھیا نے کہا کہ تم کوئی بکڈپو قائم کرو اور اسی سے کچھ چھوٹی موٹی کتابیں چھاپو تاکہ تمہارا خرچ اس سے پورا ہوتا رہے ورنہ سرفراز کی چھوٹی سی ملازمت میں تمہارا کیا بھلا ہوگا۔ سرفراز کے کام سے میرا برابر علی گڑھ آنا جانا رہتا تھا۔ میں نے وہاں نسیم قریشی صاحب سے تذکرہ کیا موصوف نے احباب پبلشرز نام تجویز کیا اور میں نے اس کی بنیاد ڈال دی۔ احباب پبلشرز سے پہلی کتاب "اردو کی کہانی" جو بھیا کی تصنیف تھی شائع ہوئی اور بے حد مقبول ہوئی۔ دہلی کے ایک پبلشر نے اسے چوری سے چھاپ لیا۔ بڑی کوشش کی گئی مگر گرفت نہ ہو سکی۔ بھیا کو یہ باتیں سخت ناپسند تھیں۔ وہ برابر کہا کرتے تھے کہ یہ کھلی ہوئی بے ایمانی ہے۔ مجھے ہمیشہ اس سے روکتے تھے اور کہتے تھے کہ تم کبھی یہ کام نہ کرنا وعدہ کرو۔

ایک مرتبہ ایک کتاب ادارہ فروغ اردو لکھنؤ میں چھپ رہی تھی۔ اس کو انعام کے لیے داخل کر دیا گیا اور اس پر انعام بھی مل گیا۔ بہت خفا ہوئے اور کہا کہ میری کتاب انعام میں نہ داخل کیا کرو۔ اس کے بعد خود اتنی احتیاط کرنے لگے تھے کہ مسودہ ایسے وقت دیتے تھے جب انعام میں داخل کرنے کا وقت گزر جائے۔ زیادہ تر کتابیں ادارہ فروغ اردو نے چھاپیں اور میری نگرانی میں چھپیں۔ بھیا نے میرے اصرار پر ایک آسان قاعدہ مرتب کیا جس کا نام میں نے "احباب اردو ہندی قاعدہ" رکھا۔ اس کی مدد سے ہندی جاننے والا آسانی سے اردو اور اردو جاننے والا آسانی سے ہندی سیکھ سکتا ہے۔ پہلے سال پہلا حصہ چھپا جو بیحد مقبول ہوا۔ دوسرے سال دوسرا حصہ مرتب اور احباب پبلشرز سے ہی شائع ہوا۔

ہم لوگوں کا خیال تھا کہ بھیا کے لیے لکھنؤ میں مکان خرید لیا جائے۔ اس کا خیال جب بھیا بارود خانے والے مکان میں رہتے تھے اسی وقت سے تھا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اسی اثنا میں بھیا ۱۹۶۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر ہو کر چلے گئے۔ لیکن مکان کی تلاش برابر جاری رہی اور جب بھی بھیا آتے میں چند مکان ان کو دکھاتا مگر وہ ناپسند کر دیتے۔ بہرحال میں

ہمت نہ ہارا اور اس کوشش میں لگا رہا کہ کسی نہ کسی طرح بھیا کے لیے مکان خرید لیا جائے تاکہ ریٹائر ہونے کے بعد یہیں آجائیں اور ہم تینوں بھائی اکٹھا ہو جائیں۔ آخر نومبر ۱۹۶۹ء میں کامیابی ہوئی اور خواجہ اہل حسین صاحب کا مکان بھابی صاحبہ کے نام خرید لیا گیا۔ اب یہ اطمینان ہو گیا کہ ریٹائر ہونے کے بعد بھیا لکھنؤ آجائیں گے اور یہیں رہیں گے۔ من در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال۔ میرے منصوبے پر قدرت مسکرا رہی تھی۔

بھیا اپنے اصول کے اتنے پابند تھے کہ جب لکھنؤ آنا ہوتا مجھے ضرور خط لکھتے تھے۔ بغیر اطلاع کبھی بھی لکھنؤ نہیں آتے۔ جب بھی آتے میرے یہاں قیام کرتے۔ حالانکہ ہمارا گھر بہت چھوٹا ہے اور ان کو تکلیف ہوتی تھی لیکن وہ اسی میں خوش تھے۔ بہت سے لوگوں نے چاہا کہ وہ ان کے ہاں قیام کریں لیکن ہمیشہ انھوں نے جواب دیدیا بھائی میں بچوں میں رہتا ہوں۔ ویسے انصار کو رنج بھی ہوگا میں وہیں ٹھہروں گا اور آخر وقت تک وہ اسی پر کاربند رہے۔ جب بھی آتے بچے ان سے لپٹ جاتے اور طرح طرح کی فرمائشیں کرتے، میری شکایت کرتے اور کہتے کہ ابا کو آپ ڈانٹیے وہ مجھے ڈانٹتے ہیں۔ وہ بچوں کو سمجھاتے کہ اب ابا تم لوگوں کی بات مانیں گے۔

بھیا بڑے سادہ مزاج تھے اور جب بچے اپنے امتحان کا رزلٹ دکھاتے وہ انتہا سے زیادہ خوش ہوتے، انعام دیتے اور تعریفیں کرتے۔ کھانے پینے کے معاملے میں بالکل سادگی پسند تھے، حالت یہ تھی کہ اگر کوئی بچہ کوئی چیز کھاتا ہوتا اور اس میں سے توڑ کر بھیا کو دیتا تو وہ اسے لے کر فوراً کھا لیتے۔ بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ ایسے سادہ مزاج کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔

آخری مرتبہ ۲۶ اکتوبر ۷۲ء کو آئے۔ کئی دن رہے پھر واپس گئے۔ کئی دن تک کوئی خط نہ آیا۔ میں نے انتظار کے بعد لکھا بھیا آپ کا خط نہیں آیا ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا کہ آپ خط نہ لکھیں میں تو آپ کے خط کا انتظار کیا کرتا ہوں ویسے میں آپ کو آپ کے خط کا جواب بھی دے دیا کرتا ہوں۔ ان کا خط آیا کہ ہاں ضرور تمھیں تعجب ہوگا اور تم پریشان ہوگے بس یونہی خط لکھنا رہ گیا اب میں روز تم کو ایک خط لکھا کروں گا۔ مجھے کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ بھیا انفلوئنزا میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ میں نے فوری خط لکھا جواب آگیا ہاں ادھر میں بیمار ہو گیا تھا لیکن اب بالکل اچھا ہوں صرف کمزوری باقی ہے۔ مجھے ۳۰ نومبر کو لکھنؤ آنا ہے شاید آؤں اگر آنا ہوگا تو اطلاع دوں گا۔ میں ان کی اطلاع کا انتظار کرنے لگا کہ یکم دسمبر کی صبح ان کا ایک خط لیٹر بکس میں ملا جس میں مولانا شمس (فروغ اردو) کو بھی دو سطریں لکھی تھیں کہ پڑھ کر ٹیلیفون سے سنا دینا۔ میں نے ٹیلیفون سے شمس صاحب کو اطلاع دے دی۔ تھوڑی ہی دیر میں فون کی گھنٹی بجی میں نے فون اٹھایا پتہ چلا کہ الہ آباد سے ٹرنک کال ہے۔ اتنے میں برادرم محمود سلمہٗ کی بھرائی ہوئی آواز آئی اور آگے وہ کچھ کہہ نہ سکے میں چلاتا رہا۔ محمود سے فون لے کر ڈاکٹر مسیح الزماں صاحب نے مجھے بتایا کہ احتشام صاحب پر ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ میں نے گھبرا کر کہا کہ آتا ہوں لیکن انھوں نے پھر رک کر کہا ممکن ہے کہ اب وہ نہ ہوں۔ دل دماغ بیکار ہو گیا کیسے میں نے یہ سنا۔ پھر انھوں نے کہا کہ کیا کیا جائے میں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میت لکھنؤ لاؤں، میں آ رہا ہوں۔ انھوں نے فوری کہا کہ پھر آنے کی ضرورت نہیں ہے میت آ رہی ہے۔ دفتر سے میں بھاگتا ہوا گھر آیا۔ گھر میں میری اس خبر سے کہرام مچ گیا۔ تھوڑی دیر میں مولانا کلب صادق صاحب قبلہ بھی آگئے اور پھر آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ کلب صادق صاحب قبلہ نے مجھ سے دریافت کیا کہ تدفین کا کہاں ارادہ ہے میں نے ان سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ امام باڑہ غفران مآب میں دفن ہوں۔ مولانا یہ کہہ کر کہ میں چلتا ہوں اور سب انتظامات کرتا ہوں روانہ ہوئے۔ اس درمیان میں ذریعہ ٹیلیفون مجھے مطلع کیا گیا کہ میت لکھنؤ نہیں آسکتی اس لیے کہ الہ آباد سے غالباً لاش گاڑی کا انتظام نہ ہو سکے گا۔ میں نے فون پر تاکید کی کہ جب تک ہم لوگ نہ آلیں تدفین نہ ہو اور فوراً ایک لاش گاڑی کا انتظام کر لیا۔ اسی اثنا میں منجھلے بھائی وجاہت حسین صاحب کے اہل و عیال اور میرے چچازاد بھائی سید اولاد اصغر جو میرے بہنوئی بھی ہیں گھر پر آگئے اور سب لوگ اسی لاش گاڑی پر الہ آباد روانہ ہو گئے۔ خیال یہ تھا کہ اسی لاش گاڑی پر بھیا کی میت لکھنؤ لائی جائے گی۔ ہم لوگ تقریباً ساڑھے نو بجے رات میں الہ آباد پہنچے۔ سردی کا زمانہ۔ سامنے ہی نظر آیا کہ متعدد ٹیکسیاں جل رہی ہیں اور سیکڑوں آدمی سڑک پر دو رویہ کھڑے ہوئے ہیں [illegible]

(باقی صفحہ ۱۲۸ پر)

امتزاج شعلہ و شبنم

جانِ برادر

پروفیسر احتشام حسین مرحوم کی یاد میں

• شمیم کرہانی

شمیم کرہانی کے ساتھ

انسانیت کا چاہنے والا کہاں گیا
شانِ ادب تھی جس سے دوبالا کہاں گیا
گنگا کے ساحلوں کا اُجالا کہاں گیا
دھرتی اُداس ہے کہ ہمالا کہاں گیا
دنیا نگاہ و نقد کی تاراج ہوگئی
غمگیں ہے فکر ہند کہ بے تاج ہوگئی

لاؤ ذرا قریب جنازہ تو دیکھ لوں
تابوت کھول دو کہ سراپا تو دیکھ لوں
اُجڑی ہوئی بہار کی دنیا تو دیکھ لوں
رخ سے کفن ہٹا دیں چہرا تو دیکھ لوں
اللہ، یہ تو نقد و نظر کا امام ہے
جس کے لیے فنا نہیں وہ احتشام ہے

چھایا ہوا ہے ابرِ سیہ فکر و ہوش پر
نوحے لرز رہے ہیں زبانِ خموش پر
آنسو ٹپک رہے ہیں رُخِ گل فروش پر
کون اُٹھ گیا یہ کس کا جنازہ ہے دوش پر
دنیائے علم و فن میں ہے شورِ آہ آہ کا
گل ہوگیا چراغ یہ کس بارگاہ کا

وہ یارِ دل نشیں وہ عزیزِ بلند بام
اردو کا تاجدار، ادب کا فلک مقام
رنگیں تھی جس سے صبح، چراغاں تھی جس سے شام
زندہ تھی جس سے رسم و رہِ نامہ و پیام
حرفِ صبا تھا، بوسۂ موجِ نسیم تھا
گزرا وہ احتشام جو، جانِ شمیم تھا

دیر و حرم کے دل کو نہیں یہ الم قبول
گریاں ہیں مومنانِ دل افسردہ و ملول
ہندو لُٹا رہے ہیں جنازے پہ ہار پھول
اُڑ اُڑ کے آرہی ہے مری سمت کیسی دھول
ہر سو ہجومِ اشک ہے، کیوں ہے، پتہ نہیں
اتنا غبار ہے کہ مجھے سوجھتا نہیں

جو افتخارِ نوعِ بشر تھا وہ احتشام
جو ناقدِ علوم و خبر تھا وہ احتشام
جو مایہ دارِ فکر و نظر تھا وہ احتشام
جو تیشہ کار و آئینہ گر تھا وہ احتشام
جس کے قلم پہ ظلمتِ شب ٹوٹتی رہی
لیکن قلم سے فن کی کرن پھوٹتی رہی

تحریر تھی کہ کون دوا بہرِ دفعِ زہر
تقریر تھی کہ زندگیِ جاوداں کی نہر
گفتار تھی کہ لہر کے حلقے کے ساتھ لہر
رفتار تھی کہ جیسے رواں روشنی کا شہر
جب وہ چلا تو فکر کی ضَو جھومتی چلی
نقشِ قدم کو صبحِ نظر چومتی چلی

"تنقید" تھی کہ تجزیۂ طینتِ دماغ
ذہنوں میں کتنے زخم تھے، سینوں میں کتنے داغ
پامالِ بادِ حُزن تھا کیوں زندگی کا باغ
جلتا تھا کن ہواؤں میں تہذیب کا چراغ
دل کیوں تپاں تھا ضربِ سنین و شہور سے
کیوں ڈھل رہی تھی ظلمتِ شب، صبحِ نور سے

ہیئت کی وضع، فکر کی تشکیل دیکھیے
تہذیبِ حرف و لفظ کی تکمیل دیکھیے
جذبات کی صداقتِ ترسیل دیکھیے
ذہنِ رسا پہ سایۂ جبریل دیکھیے
ہم پر کھُلا، فراقِ مبارک نفس کے بعد
آتے ہیں ایسے لوگ ہزاروں برس کے بعد

ماحول ہی سے ہوتا ہے کردار کا جنم
ملتے ہیں گردشِ سے نظر کے پیچ و خم
موسم ہے سازگار تو محفل میں جامِ جم
قسمت اگر خفا ہے تو شاعر کی آنکھ نم
تحریر کیا ہے پرتوِ آلام ہی تو ہے
آئینہ دارِ گردشِ ایام ہی تو ہے

شغلِ مطالعہ میں گزاری تمام عمر
نبضِ حیاتِ ذہن اُبھاری تمام عمر
زلفِ نگارِ فکر سنواری تمام عمر
تصویر زندگی کی اُتاری تمام عمر
کیا سربسر شعور تھا، حکمت شعار تھا
رکھتا تھا وہ قلم جو حقیقت نگار تھا

ادراک جس کی فکر کا پیکر وہ احتشام
ایقان جس کے ذہن کا محور وہ احتشام
عرفان جس کے علم کا جوہر وہ احتشام
کوزے میں بھر گیا جو سمندر وہ احتشام
جدت طرازِ نقد و معانی گزر گیا
دریا نے "تراشن کے" پانی گزر گیا

دانش میں کائنات کی پہنائیاں ملیں
تخلیق میں حیات کی رعنائیاں ملیں
تنقید میں سماج کی گہرائیاں ملیں
دانا کی بات بات میں سچائیاں ملیں
ناقد تھا پھر بھی مونس و ہمدم تھا احتشام
کیا امتزاجِ شعلہ و شبنم تھا احتشام

وہ نکتہ رس ادیب وہ نقاد احتشام
تنقیدِ عصرِ تازہ کی بنیاد احتشام
تخلیقِ فن کا تیشۂ ایجاد احتشام
وہ بیستونِ نقد کا فرہاد احتشام
فن کے لیے عرق میں نہاتا چلا گیا
دیوانہ، جُوئے شیر بہاتا چلا گیا

دیناکر جیشٹھ ۱۰۹ اٹک

مشکل کشائے منزلِ پیچیدہ احتشام
دردآشنائے سینۂ تفسیدہ احتشام
دانائے روزگار و جہاں دیدہ احتشام
تہہ میں خروش، سطح پہ سنجیدہ احتشام
دل میں ہزار کربِ تلاطم لیے ہوئے
لیکن لبوں پہ موجِ تبسّم لیے ہوئے

لمحہ، دلوں کو ذوقِ سفر کا پیام ہے
لمحہ، اگر ہے خام تو دانش بھی خام ہے
ہر دور ایک قافلۂ تیز گام ہے
سمجھو کہ زندگی "جدلیت" کا نام ہے
جو اس معاشرے میں تہ دام رہ گیا
اظہار کی جدال میں ناکام رہ گیا

وہ فکرِ تخم کار وہ بیداریٔ نمو
وہ ذہنِ اعتبار وہ تخئیلِ جستجو
وہ معتدل مزاج، ملائم وہ گفتگو
جیسے رواں ہو جاگتی سوتی سی آبجو
حرفِ نوا میں عکس مفکر کے خواب کا
شبنم کے آئینے میں تبسّم گلاب کا

پیمانۂ وجود کو حرکت[1] بھی چاہیے
حرکت کو اک سلیقہ حکمت بھی چاہیے
لیکن تغیّرات کو ہمت بھی چاہیے
تھوڑی روایتوں سے بغاوت بھی چاہیے
"جنبش" بقدرِ ذوقِ تمدن ضرور ہو
لیکن بغاوتوں میں توازن ضرور ہو

جو نطق ہے تاثرِ حالاتِ وقت ہے
جو حرف ہے وہ پرتوِ جذباتِ وقت ہے
جو ذہن ہے وہ عکسِ خیالاتِ وقت ہے
جو فکر ہے وہ عہدِ ملاقاتِ وقت ہے
کم ہو سکیں نہ وقت کی پہنائیاں کبھی
پیکر کو چھوڑتی نہیں پرچھائیاں کبھی

نقاد کا وجود ہے کشّاف کی طرح
ادوار کو دھنکتا ہے ندّاف کی طرح
لمحوں کو گوندھ دیتا ہے موباف کی طرح
کھلتے ہیں راز، نکہتِ شفّاف کی طرح
ہر لفظ، فہمِ ذات کا اک زینہ ہو گیا
جو عکس آ گیا وہی آئینہ ہو گیا

کردار کیا ہیں رقصِ مہ و سالِ گم شدہ
اطوار کیا ہیں، ماتمِ افعالِ گم شدہ
افکار کیا ہیں مظہرِ احوالِ گم شدہ
اذہان کیا ہیں دفترِ اعمالِ گم شدہ
شاعر جو کہہ رہا ہے زبانِ سرور سے
ارسال ہو رہا ہے وہ تحت الشعور سے

تنہا نہیں ہے فرد، غمِ احتیاج میں
وجدان، مشترک ہے، تفکر کے راج میں
فن ہے مفاہمت کا ذریعہ سماج میں
کتنی ہے عمرِ ذہن، اسی امتزاج میں
شاعر کی ذات کیا ہے، تقاضا حیات کا
شاعر بھی ایک جزو ہے اس کائنات کا

---

[1] حرکت کی (ر) متحرک ہے۔ یہاں عام بول چال کی زبان استعمال کی گئی۔ [illegible]

رجحان ایک فرد کی تحریم تو نہیں
تخئیلِ ذات و عکس کی تقسیم تو نہیں
جمعی شمار و ضرب کی تقویم تو نہیں
فردا، شعورِ حال کی ترمیم تو نہیں
فن کار چھوٹ جائے گا کیونکر حیات سے
رشتہ جڑا ہوا ہے زمانے کا ذات سے

القصہ نقدِ فن کا تصور عظیم تھا
ہر نقطہ احتسابِ جدید و قدیم تھا
خلوت میں شمع تھا، سرِ منبر کلیم تھا
پیغام میں صبا تھا، سخن میں نسیم تھا
اس دورِ بے خلوص میں لحن اس کے پیار کا
جیسے خزاں کے دشت میں جھونکا بہار کا

لذت کو انبساط کا کیوں بانکپن ملے
عریانیوں کو پردۂ اظہارِ فن ملے
ننگے اگر ہیں تن تو انھیں پیرہن ملے
دیکھو جو کوئی لاش تو سوچو کفن ملے
ذہنوں میں دیکھ کر اسے کیوں ارتعاش ہے
آخر وہ لاش بھی تو ہماری ہی لاش ہے

چارہ تھا رنج و دردِ غریباں کے واسطے
مرہم تھا زخمِ قلبِ یتیماں کے واسطے
صبحِ وطن تھا شامِ غریباں کے واسطے
اک نعمتِ عظیم تھا انساں کے واسطے
صبحِ زمیں نواز کی ضو تھی سرشت میں
دل تھا کہ جیسے پھول کھلا ہو بہشت میں

تہ خانۂ بطونِ عوامل ہے شاعری
رودادِ کربِ خارج و داخل ہے شاعری
اسرارِ شش جہت سے مقابل ہے شاعری
تنہا اگر ہے ذہن تو مشکل ہے شاعری
ہر سمت ایک سلسلۂ صد خیال ہے
شاعر کا بے ہجوم نکلنا محال ہے

غم ہائے زندگی سے پریشاں نہیں ملا
محوِ رفوئے چاکِ گریباں نہیں ملا
گھر میں ادیب کے کوئی ساماں نہیں ملا
آخر کو دردِ دل کا بھی درماں نہیں ملا
اوروں کا زخم سی کے، جگر اپنا پھاڑ کے
مدکش[1] اٹھ کھڑا ہوا دامن کو جھاڑ کے

لہجے کو بے عمل کوئی ندرت نہ مل سکی
ہیئت کو بے مواد لطافت نہ مل سکی
افسانے کو زبانِ حقیقت نہ مل سکی
فن کار کھو کے رہ گئے، عظمت نہ مل سکی
دوراں کے واسطے ہو کہ محبوب کے لیے
پیغام کوئی چاہیے اسلوب کے لیے

علم و ادب کا رعب جماتا نہ تھا کبھی
دولت کی آب و تاب دکھاتا نہ تھا کبھی
فانوس و گل سے گھر کو سجاتا نہ تھا کبھی
احسان کر کے، سب کو بتاتا نہ تھا کبھی
کتنا بلند ظرف تھا، عالی وقار تھا
سرمایہ دارِ فن تھا، مگر خاکسار تھا

---

[1] میر انیسؔ کے مصرعہ "شبیر اٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے" سے استفادہ۔ ش۔ک

تعظیم کی نظر سے گزرتی تھی خانقاہ
کعبے کے اہلِ درد کی رہتی تھی دل میں چاہ
کاشی کے دوستوں سے بھی ملتا تھا گاہ گاہ
کچھ اشتراک سے بھی رکھتا تھا رسم و راہ
رہتا تھا گامزن جو محبت کی راہ میں
محوِ نماز بھی وہ ملا عید گاہ میں

وہ سادگی پسند براذی شعور تھا
آرائشِ عبارتِ رنگیں سے دور تھا
مقصد کے انشراح کا قائل ضرور تھا
اظہارِ انتقاد پہ اس کو عبور تھا
روکو، چلا، سنا در فکرِ رسا کہاں
پائیں گے ایسا ناقدِ رمز آشنا کہاں

وہ صلحِ کل، وہ بندۂ حق گو، وہ باخدا
وہ سوگوارِ غربتِ مظلومِ کربلا
وہ بادہ خوارِ کوثر و دستِ مے ولا
وہ اہلِ دل، وہ عاشقِ محبوبِ کبریا
دل کا غنی تھا، خوگرِ نانِ شعیر تھا
مولائے کائنات کے در کا فقیر تھا

ٹھہرا ابھی لو جنازۂ ذی احتشام کو
اس کی ابھی طلب ہے خواص و عوام کو
کہہ دو کہ لوگ آئے ہیں ذکر و پیام کو
بھائی! کرو قبول ہمارے سلام کو
کیوں ایسی بے رخی ہے کہ گردانتے نہیں
اپنے شمیم بھائی کو پہچانتے نہیں

ظلمت بدوش رات اٹھتی تھی جب نقاب
آنکھیں تمام شہر کی ہوتی تھیں محوِ خواب
شوقِ نگاہ و دل کو جگاتا تھا اضطراب
کھلتی تھی اس کے سینۂ اسرار پر کتاب
ذوقِ مطالعہ تھا کہ جامِ خمار تھا
وہ رند تھا کہ عابدِ شب زندہ دار تھا

دلی سے آرہا ہوں ملاقات کے لیے
ذکرِ مزاج و پرسشِ حالات کے لیے
تقصیرِ حاضری کی مکافات کے لیے
تم چپ پڑے ہو آیا ہوں میں بات کے لیے
منھ چادرِ سفید سے کیوں کھولتے نہیں
کیا مجھ سے کچھ خفا ہو کہ تم بولتے نہیں

دیکھو کتابِ فکر، دھڑکتا ہے اس کا دل
جو حرف ہے گماں کے لیے ضربِ مستقل
جو لفظ ہے اجل کے لیے امرِ جاں گسل
جو سطر ہے وہ صفحۂ ہستی پہ مستقل
نقشِ ابد ہوں، پرتوِ آنی نہیں ہوں میں
نقاش کہہ رہا ہے کہ فانی نہیں ہوں میں

ہر آنکھ ہے تمہاری ہی جانب لگی ہوئی
جاگو کہ غم کی دھوپ زیادہ کڑی ہوئی
آنسو بہا رہی ہے ثریا کھڑی ہوئی
سوچو ذرا تمہاری سعیدہ بڑی ہوئی
بکھرا ہوا حیات کا چہرہ تو دیکھ لو
تم اپنی آرزوؤں کا سہرا تو دیکھ لو

[illegible] بیٹیاں

دیکھو تو اٹھ کے عونؔ و محمدؔ کا حالِ زار
ارشدؔ ہے اشک بار تو اقبالؔ بیقرار
بیچین ہیں وجاہتؔ و انصارؔ و اقتدارؔ
وہ اقتدار تم کو زیادہ تھے جس سے پیار
جس پر نگاہ رکھتے تھے دلبند کی طرح
پالا تھا جس کو گود میں فرزند کی طرح

لکھا ہے خونِ دل سے جو افسانہ دیکھ لو
کیا غمزدہ ہے جلوۂ جانانہ دیکھ لو
کتنا اجاڑ ہو گیا کاشانہ دیکھ لو
ویران ہے تمہارا کتب خانہ دیکھ لو
کیا ہو گیا کہ فکر ہے تم کو نہ درد ہے
دیکھو ہر اک کتاب کے چہرے پہ گرد ہے

قسمت نے کیا لیا ہے قیامت کا امتحاں
دیکھو شریکِ زیست کی جانب کہ ناگہاں
آنچل سفید ہو گیا، ٹھنڈی ہیں چوڑیاں
آنکھیں لہو میں غرق تو چہرا دھواں دھواں
صندل نہیں ہے مانگ میں اب گردِ یاس ہے
مجنوں بچھڑ گیا ہے تو لیلیٰ اداس ہے

لکھتے تھے جس قلم سے تم افسانۂ ہنر
لپٹا ہوا غبار میں رکھا ہے میز پر
تکتا ہے خشک ہاتھ کی جانب بچشمِ تر
یعنی مجھے سنبھال لے اے دستِ دیدہ ور
زخموں سے چور، کرب سے ٹوٹا ہوا ہوں میں
کتنے بلند ہاتھ سے چھوٹا ہوا ہوں میں

کہتے تھے جس بہن کو محبت سے "آپا جان"
بیتاب و مضطرب ہے تمہارے لیے ہر آن
بیمار ہے پڑی ہوئی دلی میں خستہ جان
تم کیا گئے کہ ٹوٹ پڑا اس پہ آسمان
غم اور بھی زیادہ ہے ناچار کے لیے
آ بھی سکی نہ آخری دیدار کے لیے

کیا اب نہیں لکھے گا حکایاتِ خاص و عام
کیا زندگی کو دے گا نہ اب فکر کا پیام
تحریر کیا کرے گا نہ خط دوستوں کے نام
کتنے نقوش ہیں جو ابھی تک ہیں ناتمام
مالک! رفیقِ علم و ادب کا پیام لے
اُٹھ، اپنے سوگوارِ قلم کا سلام لے

اے شارحِ معانی و اسرار السلام
اے تاجدارِ دانش و افکار السلام
اے ناقدانہ تاج کے معمار السلام
اے لازوال میرے قلمکار السلام
حرفِ بقاست نقش و نگارِ پیامِ ما
"ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما"

۱۔ ۳۰۔۳۔۲ بیٹے ۵۔۶۔۷ بھائی شہ میری شریکِ حیات۔ ش۔ک

دیکھا ہے مجھے جن نے وہ دیوانہ ہے میرا

شخصیت

احتشام صاحب

ایک باہمہ اور بے ہمہ شخصیت

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

اپنی زندگی میں مجھے چند ہی ایسے ادیبوں کو کچھ قریب سے دیکھنے کا موقع مل سکا جنھیں فنا فی الادب کا صحیح مصداق کہا جا سکتا ہے۔ بزرگوں میں تو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور استاذی پروفیسر سید مسعود حسن رضوی صاحبان اور رفقا میں سید احتشام حسین صاحب اور آل احمد سرور صاحب۔ ان سب کا طرز کار تو ضرور الگ الگ تھا لیکن سب کا اوڑھنا بچھونا اُردو ادب ہی تھا۔

احتشام صاحب سے میری رفاقت کا آغاز فروری ۴۵ء سے ہوا جب مجھے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لیکچرر مقرر کیا گیا تھا۔ احتشام صاحب اسی شعبہ میں ۳۸ء سے کام کر رہے تھے اور اسی سال سے لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم اے (اُردو) کی تدریس شروع ہوئی تھی۔ اس سے پیشتر یہاں عربی و فارسی میں تو ایم اے کے درجات میں تعلیم ہوتی تھی لیکن اُردو میں ایم اے کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ۴۵ء سے اکتوبر ۶۱ء تک میرا اور احتشام صاحب کا اسی شعبہ میں ساتھ رہا۔ ۴۶ء میں سرور صاحب بھی بہ حیثیت ریڈر کے اس شعبے میں آگئے تھے۔ دونوں بڑے پڑھنے والے، بڑے لکھنے والے اور بہت اچھے مقرر۔ اگرچہ تنقیدی مسائل میں دونوں کے نقاط نظر میں اختلاف تھا لیکن ادب میں ترقی تو بعض اوقات اختلافات سے بھی ہوتی ہے اس سے باہمی اتفاق اور رفاقت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ سرور صاحب پہلے بیر ووڈ (متصل لال باغ) پر رہتے تھے۔ وہ ادبیات کو فروغ دینے کے سلسلے میں انجمن آرائی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے اپنے مکان پر انجمن ترقی اُردو کے

دانش محل میں بیٹھے ہوئے

ہفتہ وار جلسے کرنے شروع کیے۔ کبھی شعر و شاعری، کبھی افسانے، کبھی تنقیدی مضامین اور کبھی اُردو زبان کے تحفظ و ترویج کے مسائل۔ ان نشستوں میں لکھنؤ کے کئی ادیب، شعرا اور بہت سے شاگردوں کا مجمع ہو جاتا تھا۔ تبادلہ خیال بھی ہوتا اور کبھی کبھی بحثیں بھی۔ احتشام صاحب ان جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے اور خاصا لطف رہتا تھا۔ ان جلسوں میں یہی دو حضرات سب سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد سرور صاحب نعمت اللہ بلڈنگ (نزد امین الدولہ پارک) میں منتقل ہو گئے تھے اور ۵۲ء سے عبدالاحد خاں خلیل صاحب بھی شعبہ اردو میں آگئے تھے (ان کا قیام بھی اسی بلڈنگ میں تھا)۔ ۵۵ء تک یعنی جب تک سرور صاحب لکھنؤ میں رہے یہ جلسے اسی بلڈنگ میں ہوتے رہے۔ البتہ جب سرور صاحب علی گڑھ چلے گئے تو یہ نشستیں احتشام صاحب کے مکان (واقع بارود خانہ) پر ہونے لگیں۔ اگرچہ ان کا ڈرائنگ روم مختصر تھا مگر لوگ کسی نہ کسی طرح اپنی جگہ بنا ہی لیتے تھے۔ کوئی افسانہ پڑھا جاتا یا نظم سنائی جاتی تو اس پر تبصرے بھی ہوتے۔ بعض اوقات بعض ادیبوں میں اس سلسلے میں تیز گفتگو ہونے لگتی۔ احتشام صاحب حکم ٹھہرتے اور وہ کچھ اس انداز سے معاملے کو سلجھا دیتے کہ دونوں فریق اپنی اپنی جگہ مطمئن ہو جاتے۔ ایک مرتبہ ایک ایسی ہی نشست میں (جو احتشام صاحب کے ایک شاگرد کے مکان پر ہوئی تھی) ایک سر پھرے شاعر صاحب اپنی نظم سنا رہے تھے، نظم کیا تھی ایک طومار، جس کا شاید ہر مصرع مختلف بحر کا تھا اور مفہوم تک تو ہم میں سے شاید کسی کی رسائی

نہیں ہو رہی تھی۔ نظم ختم ہونے سے پہلے ہی ہر شخص کی طبیعت گدگدانے لگی کہ تبصرہ بھی اسی انداز کا کیا جائے۔ چنانچہ نظم ختم ہونے پر ایسا ہی ہوا۔ شاعر صاحب پھر پھر کر جواب دینے لگے اور جوش میں آ آ بے نقط سنانے لگے آخرکار جب احتشام صاحب نے انتہائی متانت کے ساتھ ان کے کلام کو غالب کے ابتدائی کلام سے نسبت دی تب ان کا غصہ فرو ہوا اور وہ خوش ہو گئے کہ کم از کم ایک بڑے نقاد سے داد تو ملی۔

احتشام صاحب میں یہ وصف خاص تھا کہ کسی کی دل آزاری کبھی نہیں کرتے تھے اور نہ کبھی بحث میں ایسا لہجہ اختیار کرتے تھے جس سے تکرار کی صورت پیدا ہو جائے۔ اپنی تحریر یا تقریر میں کبھی کبھی ایسا جملہ ہوت نہ نکالتے جس سے کسی فرد یا کسی فرقے یا کسی جماعت کو یہ محسوس ہو کہ احتشام صاحب نے یہ چبھتا ہوا فقرہ دل آزاری کے لیے کہا یا لکھا ہے۔ اخلاق وسیع تھا۔ اس میں بھی حفظ مراتب کا ضرور خیال رکھتے تھے۔ بزرگوں سے انکساری، دوستوں اور ساتھیوں سے بے تکلفی اور خندہ پیشانی اور خوردوں کے ساتھ شفقت و محبت سے گفتگو کرتے تھے۔ اگرچہ گفتگو نرم لہجے میں کرتے تھے لیکن اس میں بھی پختگی ہوتی تھی۔ بالطبع مجھے ان کی تقریریں زیادہ پسند تھیں اور خاص بات یہ تھی کہ اردو کے علاوہ ہندی میں بھی بہت آسانی سے اور بہت رواں تقریر کر لیتے تھے۔ ایک آدھ دفعہ میں نے پوچھا بھی کہ آپ نے اتنی اچھی ہندی کیسے اور کب سیکھی تو ہنس دیتے اور کہتے کہ یوں ہی پڑھنے اور سننے سے آ گئی۔ ویسے کہیں موقع ہوتا تو وہ انگریزی میں بھی خاصی اچھی تقریر کر سکتے تھے۔ لیکن انگریزی میں تحریر ان کی تقریر سے بہتر ہوتی تھی۔ ہندستانی اکیڈمی (الہ آباد) کے نائب صدر وہ عرصے تک رہے۔ دو چار مرتبہ میں نے اس کے جلسوں میں حاضری دی ہے۔ وہاں کے سالانہ یا ششماہی جلسوں میں اردو سے متعلق ادبا بلائے تو ضرور جاتے ہیں لیکن وہاں تقریریں اور دیگر کارروائیاں ہندستانی کے بجائے ایسی ہندی میں ہوتی ہیں کہ اکثر اردو والے خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ وہاں بھی احتشام صاحب جب بولتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کوئی ہندی کا عالم بول رہا ہے۔

میں نے ۱۹۶۵ء یا ۱۹۶۶ء سے سائیکل کا استعمال ترک کر دیا تھا اور یونی ورسٹی رکشے پر آنے جانے لگا تھا۔ واپسی پر ہم دونوں ساتھ واپس آتے۔ امین آباد سے وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتے (جانب مغرب) یا پھر تھوڑی دیر فروغ اردو اور دانش محل کی دکانوں پر رکتے ہوئے گھر جاتے اور میں اپنے گھر (مشرق کی طرف) چلا جاتا۔ راستے میں رکشے پر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہتیں مثلاً: سعادت علی خاں اور ان کی بیوی کے مقبروں (واقع قیصر باغ) سے گزرتے ہوئے کئی بار کہا کہ دیکھیے اتنے برسوں سے لکھنؤ میں ہوں مگر کبھی اتفاق نہیں ہوا کہ ان مقبروں کے اندر جا کر دیکھوں۔ میں بھی صاد کرتا کہ میرا بھی یہی حال ہے۔ پھر طے ہوتا کہ کسی دن ضرور چلیں گے میں بھی ہامی بھر لیتا۔ لیکن آج تک واقعی وہاں اندر جا کر دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ کبھی وہ اپنے کسی سفر کی داستان سناتے کہ فلاں جگہ ایسے ایسے دلچسپ تماشے تھے مگر امریکہ جانے لگے تو میں نے محسوس کیا کہ وہ کوئی بہت خوشی سے یہ سفر نہیں کر رہے ہیں بلکہ شاید اس لیے کہ موقع ملا ہے تو کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ ان کا سفرنامہ (ساحل اور سمندر) دیکھیے اس میں کوئی غیر معمولی دلچسپی کے بیانات نہیں ہیں۔ ویسے انھوں نے اسے بہت کچھ سنوار دیا ہے لیکن 'شوق' نظر نہیں آتا۔ کبھی شاید روزمرہ کے کام سے اکتاہٹ محسوس کر کے کہتے کہ اب کسی کام کو کرنے کا ولولہ پیدا نہیں ہوتا یا اردو کی زبوں حالی کو محسوس کر کے ایسا کہتے ہوں۔ اسی طرح کی بہت سی ادھر ادھر کی باتیں ہیں جو اب یاد نہیں۔ (کیا خبر تھی کہ انھیں لکھنے کی ضرورت پڑے گی)

احتشام صاحب ایک سنجیدہ مزاج کے آدمی تھے۔ ہر مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرتے تھے اور نپی تلی بات کہتے تھے۔ لیکن ان میں شگفتہ مزاجی بھی تھی جس کا اظہار بے تکلف دوستوں کی صحبت ہی میں ہوتا تھا یا کبھی کسی تقریر کے دوران۔ اپنی خاموش طبیعت کے باوصف احتشام صاحب آدمی بہت باخبر رہنے والوں میں تھے۔ ادبی تحریکوں اور ادبی مسائل ہی سے نہیں یونی ورسٹی کی سیاست سے بھی پوری طرح واقف ہوتے تھے۔ لیکن وہ خود 'خبر نامہ' یا 'مخبر' بننے سے ہمیشہ احتراز کرتے تھے۔ ان کی اصابت رائے اور غیر جانبداری

کے باعث ہی انھیں لکھنؤ یونیورسٹی کی ٹیچرس ایسوسی ایشن نے ایک مرتبہ ان کو اس کی مجلس عاملہ کا صدر منتخب کیا تھا لیکن وہ گھس پیٹھ کے آدمی کبھی نہ تھے، نہ کسی کی خوشامد نہ کسی کا خوف۔ ملتے ہر ایک سے خوش مزاجی اور خندہ پیشانی سے تھے۔ چونکہ بہت ذہین آدمی تھے اس لئے بیٹھنے والے خود سر اور خود بیں کے ذہن کی ساخت اور اس کے ظرف کا حدود اربعہ سمجھ جاتے تھے اور پھر اس سے اس انداز سے گفتگو کرتے تھے کہ وہ ان کا معترف ہو جاتا تھا۔ میں نے خاص طور سے یہ بھی محسوس کیا کہ باوجود اس کے کہ ان کی دوستی کا دائرہ بہت وسیع تھا اور تقریباً ان کی ہر ایک سے یاد اللہ تھی لیکن وہ کسی دوست کی دوستی کے محتاج نہ تھے۔ ایک استغنا کی شان ان کے مزاج میں ہمیشہ رہی۔ باہمہ اور بے ہمہ شخصیت ہونا اسی کو کہتے ہیں۔ اسی طرح کبھی بہت غصہ کرتے یا قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے بھی میں نے انھیں نہیں دیکھا۔ غصہ صرف ناگواری اور ہنسی صرف ہلکی ہنسی تک محدود رہتی تھی۔ ایک دفعہ انھوں نے اپنا ایک غصہ سے ڈانٹنے والا واقعہ بیان کیا تھا جو انھیں اپنے ایک پرانے شاگرد پر آیا تھا۔ لیکن واقعی ان کا وہ غصہ کس حد تک گیا تھا اس کا مجھے علم نہیں۔ البتہ جن وجوہ سے انھیں اس پر غصہ آیا تھا وہ واقعی ایسے تھے کہ جتنا غصہ وہ کہتے کم تھا۔

ادبیات ویسے تو ان کا اوڑھنا بچھونا تھا ہی لیکن تنقید اور علم لسانیات سے بالخصوص شغف رکھتے تھے ویسے انھوں نے شعر بھی کہے ہیں اور افسانے بھی لکھے ہیں لیکن فن تنقید پر لکھنا یا تنقیدی مضامین لکھنا ان کا محبوب شغل تھا۔ ترقی پسندی کے بڑے حامیوں میں سے تھے اور مارکسی نقطۂ نظر کو تنقید میں سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے جیسا کہ انھوں نے اپنے پہلے تنقیدی مضامین کے مجموعے تنقیدی جائزے کے دیباچے میں لکھا ہے:

"ان مضامین کا مصنف غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ادب جامد نہیں بلکہ سماجی ہے متحرک ہے۔ جامد نہیں تغیر پذیر ہے۔ اسے تنقید کے چند مقررہ فرسودہ اصولوں اور نظریوں کی مدد سے نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ ایک فلسفیانہ تجزیہ

یہی کام آسکتا ہے جس کی بنیاد تاریخ کی مادی ترجمانی اور ارتقا بالضد کے اصولوں پر رکھی گئی ہو۔"

یہ ان کا [illegible] کا عقیدہ ہے جب وہ ترقی پسند حضرات (سجاد ظہیر، رشید جہاں، اور ان سے کے مرشد علیم صاحب) سے بہت متاثر تھے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ فن جمالیات سے بالکل بیزار رہے ہوں یا کنارہ کشی کر لی ہو اور صرف زندگی کی مادی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی ادب پارے کی توضیح و تشریح کرنے لگے ہوں ایسا نہیں ہوا۔ مدیر ادب لطیف نے ایک دفعہ ایک سوال نامہ انھیں بھیجا تھا۔ ان میں سے ایک سوال یہ تھا "آپ گزشتہ ادب کے بارے میں کیوں لکھتے ہیں؟" اس کا جواب جو انھوں نے دیا وہ یہ تھا "میں گزشتہ ادب کے بارے میں اس لیے لکھتا ہوں کہ حال کے ادب کی طرح وہ بھی ادب ہے۔ وہ بھی پڑھا جاتا ہے اور اسے بھی پڑھا جانا چاہیے۔ میں بھی اسے پڑھتا ہوں۔ اس کو سمجھنا اور اس سے لطف لینا چاہتا ہوں میں ہر اچھے ادب کی طرح اسے بھی زندگی کی دستاویز سمجھ کر پڑھتا ہوں۔ اس کی مدد سے اس عہد کے مزاج، ذہنی کروٹوں، عقائد و خیالات کی کشمکش اور زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں اگر کبھی ادبی یا جمالیاتی حظ نہیں حاصل ہوتا تو ذہنی حظ حاصل ہو جاتا ہے۔ ماضی کے اچھے ادب نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا ہے۔ جب اس کی دنیا سے لوٹتا ہوں دامن بھرا ہوا تھا۔ اس کے متعلق اظہار خیال کیوں نہ کروں؟ میرا یہ بھی خیال ہے کہ گزشتہ ادب کے مطالعے کے بغیر جدیدادب کو سمجھنا بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ ادب تہذیب کی طرح ایک ناقابل شکست تسلسل ہے۔" (مقدمہ: اعتبار نظر مطبوعہ [illegible])

ہم میں سے بہتوں کا کہنا یہی تھا اور ہے کہ بغیر جذباتی یا جمالیاتی حظ کے کوئی ادب پارہ ادب پارہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے بنیادی حیثیت تنقید میں اسی کو دینا چاہیے اس میں دیگر اقدار کی تلاش ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن یہاں اس مسئلہ پر بحث کرنا مقصود نہیں صرف یہ بتانا ہے کہ احتشام صاحب [illegible] ذاتی پسند یا ناپسند کی چیز نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس میں ایک معروضی تجزیہ کو ضروری سمجھتے تھے۔ اس معروضی تجزیہ کی ضرورت [illegible]

تھی کہ وہ عمرانیات، فلسفہ اور دیگر متعلقہ علوم کا مطالعہ کریں۔ ایک جگہ انھوں نے خود بھی لکھا ہے کہ "ادب کا مطالعہ مذہب، فلسفہ، نفسیات، تاریخ، سماجی علوم اور دوسرے فنون لطیفہ کا مطالعہ کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا" اور یہ واقعہ ہے کہ فن تنقید کو صرف ذاتی پسند یا ناپسندیدگی کو معیار نہ بنا کر اسے ایک معروضی انداز میں پرکھنے سے یہ فن تنقید ایک ایسے مرکزی علم کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جس کے چاروں طرف دوسرے علوم اسے گھیرے ہوئے ہوں اور بغیر ان کے مطالعے کے اس علم تنقید پر دسترس حاصل نہ کیا جا سکتا ہو۔ احتشام صاحب نے اس طریقہ کار کو اپنانے، سنبھالنے اور اس کی تبلیغ کرنے کی پوری کوشش کی۔ وہ یونیورسٹی میں اپنا کافی وقت لائبریری میں صرف کرتے تھے۔ بازار میں بھی انھیں اکثر دانش محل یا فروغ اردو میں نئی کتابوں کو الٹتے پلٹتے دیکھا جاتا تھا۔ حافظہ اچھا تھا اس لیے ضروری اور کارآمد کتابوں کے نام، ان کے مصنفین اور مطابع کے نام آسانی سے انھیں یاد ہو جاتے تھے اور پوری کتاب اگر نہ پڑھ پاتے تو بھی اتنا ضرور پڑھ لیتے کہ اس کتاب سے متعلق ضروری معلومات اور مصنف کے نقطۂ نظر سے انھیں پوری واقفیت ہو جائے۔ ان کی یہ بڑی خواہش تھی کہ عربی، فارسی اور اُردو زبان کے ادیبوں اور شاعروں نے تنقید کے بارے میں جو نقاط نظر اپنی تصنیفات یا منظومات ایک دو اشعار میں بھی پیش کیے ہوں، انھیں یکجا کر کے ایک کتابی صورت میں پیش کر سکیں۔ لیکن ان کی زندگی اتنی مصروف تھی کہ وہ اس ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ فن تنقید یا لسانیات پر کوئی مکمل کتاب بھی نہ لکھ سکے۔ یقین تھا کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے پر وہ اس طرف پوری توجہ دے سکیں گے۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ بہرحال تنقید پر ان کے مضامین ہی اتنے زیادہ ہیں کہ اگر انھیں ایک ترتیب سے یکجا کر دیا جائے تو اصول تنقید و عملی تنقید پر ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

احتشام صاحب کا اسلوب بیان چونکہ نہایت مدلل و عالمانہ انداز کا ہوتا تھا اس لیے اس میں کسی قسم کی شعریت، رنگینی یا ادبیت کی گنجائش نہیں ہوتی تھی اور نہ ان کے مضامین میں عام طور سے وہ شگفتگی دکھائی دیتی ہے جو ان کی نجی گفتگو میں آشکار رہتی تھی۔ نیاز فتح پوری صاحب (جو میرے پڑوس میں رہتے تھے) احتشام صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے لیکن ان کے انداز بیان کی حد سے زیادہ خشکی کے شاکی تھے۔ ایک دفعہ نجی گفتگو میں انھوں نے مجھ سے اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ صحیح الفاظ تو یاد نہیں لیکن مفہوم اس قسم کا تھا کہ "بڑی فاضلانہ تحریر ہوتی ہے لیکن پوری پڑھی نہیں جاتی"۔ ظاہر ہے کہ فن تنقید کو جب معروضی علم کی صورت میں پیش کیا جائے تو اس میں صرف ذہن ہی کام کرے گا دل نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ادبی قسم کی تحریر لکھنے پر قادر نہیں تھے۔ ایک دو جگہ اس قسم کی مثالیں ڈھونڈنے سے ان کے مضامین میں ضرور نکل آئیں گی لیکن عام طور سے ان کے مضامین حالی کی طرح سپاٹ لیکن مدلل انداز میں لکھے گئے ہیں۔ ان کی ادبیت اور دلی جذبات کی کارفرمائی دیکھنا ہو تو ان کے اشعار اور افسانوں (جن کی تعداد زیادہ نہیں ہے) کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ حالی کے بعد جن نقادوں نے عالمانہ اور استدلالی طریقے سے تنقید کو پیش کیا ان میں احتشام صاحب کا شمار صف اول میں ہوگا۔ اسی لیے مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب نے ان کے دور کو "احتشامی دور" کہا ہے۔ اُردو میں تنقید نگاری کی تاریخ میں حالی کی طرح ان کا ذکر بھی ناگزیر ہوگا۔

۱۹۳۸ء سے ۱۹۶۱ء تک یعنی تیئیس سال احتشام صاحب کا قیام لکھنؤ میں رہا۔ یہاں ہر قسم کے لوگوں سے شناسائی اور دوستی ہوئی۔ شاید ہی کوئی ایسا اُردو نواز طبقہ ہو جس میں وہ معروف نہ ہوں۔ شاگردوں کے علاوہ شہر میں ان کے اعزا، دوست احباب اور قدردانوں کی کثیر تعداد تھی۔ اسی لیے وہ خود بھی لکھنؤ کو بہت پسند کرتے تھے اور اسی لیے انھوں نے ایک مکان گولہ گنج میں اپنے پرانے مکان (واقع بارودخانہ) کے قریب خرید لیا تھا اور ان کا قطعی ارادہ تھا کہ الہ آباد یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہونے پر وہ مستقل طور سے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لیں گے لیکن "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"......

احتشام صاحب اپنے شاگردوں سے بڑی محبت اور شفقت

(بقیہ صفحہ ۱۵ پر)

علی عباس حسینی اور صباح الدین عمر کے ساتھ

یادوں کے چراغ

علی جواد زیدی

دن پلک جھپکاتے گزر جاتے ہیں۔ ۱۸ جولائی ۱۹۳۸ء کو احتشام حسین کا لکھنؤ یونی ورسٹی میں آنا ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ حساب لگایا ہوں تو یہ واقعہ چھیالیس برس پہلے کا ہے۔ اس وقت میں لکھنؤ یونیورسٹی کا نوجوان طالب علم تھا اور احتشام صاحب نوجوان لکچرار۔ وہ لکھنؤ اور یونی ورسٹی کے لیے نسبتاً نئے تھے اور میں ان سے تقریباً چار برس کم نیا۔ لکھنؤ میں سو عیب سہی، لیکن اجنبیوں کو اپنا لینے کی زبردست صلاحیت ہے۔ جو لوگ باہر سے آکر لکھنؤ میں بستے ہیں اگر ان میں کوئی عظمتِ ذاتی نہیں ہوتی تو وہ اپنے وطنِ مالوف کے نام کے بعد "ثم لکھنوی" لکھ کر اس شہر سے نسبت دینے کو فخر سمجھتے اور جن میں فخرِ ذاتی دیکھ پاتے انھیں خود اہلِ لکھنؤ "ثم لکھنوی" لکھنے لگتے!

اس وقت کا لکھنؤ آج کے لکھنؤ سے بہت مختلف تھا۔ لہجہ کہیں زیادہ نرم، لباس کہیں زیادہ طرحدار، انداز کہیں زیادہ نزاکت آمیز، سڑکیں اور گلیاں کہیں زیادہ صاف۔ عورتیں ڈولیوں میں چلتیں اور علی قینسوں میں۔ نوابین فٹن پر سوار ہو کر ہوا کھانے نکلتے یا موٹروں میں نزہ ٹہلتے دوڑتے۔ جھک جھک کے فرشی سلام قدم قدم پر بکھرے ملتے۔ بالائی کی دوکانیں جگہ جگہ ملتیں، دو پلی ٹوپیاں بکثرت نظر آتے اور انگرکھے بھی خاصی تعداد میں دکھائی دیتے۔ بیگمات میں بڑے گھیر کے غرارے مقبول تھے۔ نقد حضرات کی بات تو الگ رہی، باہر والے لکھنؤ کے تانگے والے، اکے والوں، دوکانداروں، دھوبیوں سے لے کر کمیروں اور کمک کی بول چال پر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ لیجے کا لوچ ہی نہیں کیوں کی چاشنی خواص بھی خوب ہوتی۔ ککڑیاں بیچنے والے صدا لگاتے کہ "مجنوں کی پسلیاں ہیں، لیلیٰ کی انگلیاں ہیں، کیا خوب ککڑیاں ہیں" اور جامن فروخت کرنے والے یوں شاعری کرتے "کالی گھٹا کے کالے پھلینڈے"۔ اصغر علی محمد علی کے کارخانے کا عطر، اقتدا خان مقتدا خان کی تمباکو پینے والی اور احمد حسین دلدار حسین کی تمباکو کھانے والی بکھیں قوام اور زردہ گھر گھر رائج تھے۔ نوابین، راجے، مہاراجے، تعلقدار ایک طرف، علما، فضلا، اطبا، شعرا دوسری طرف، مدیرانِ اخبار، خطیب اور نثار تیسری طرف ثقہ محفلوں کی جان سمجھے جاتے ہیں۔ بندا دین کے گھرانے کے کتھک سے لے کر غلام حسین بھانڈ کی نقلوں تک سب کچھ رسیا موجود تھے۔ رقاصاؤں اور مغنیوں کے بھی حلقہ ہائے اثر تھے۔ آدابِ مجلس، تکلفات اور روایات پر سب جان چھڑکتے تھے۔ مجلسیں، مناصبے سالنے، میلاد کی محفلیں، مشاعرے، بیت بازیاں، مجرے یہاں کی مستند ثقافتی زندگی کی اہم نشانیاں بن گئی تھیں۔ اتوار کو نخاس کی ریل پیل، شام کو چوک کی رونقیں اور حضرت گنج کی جگمگاہٹیں، کہیں کہیں بٹیروں کی پالیاں، افیونیوں کے اڈے، دنگل، فٹ بال اور ہاکی کے میچ بھی تفریح طبع کا سامان مہیا کرتے۔ لیکن یہ سب تصویر کا ایک ہی رخ تھا۔ امین الدولہ پارک جسے جھنڈے والا پارک بھی کہتے تھے، دوسرا منظر پیش کرتا تھا۔ یہیں کانگریس پارٹی کا بھی دفتر تھا اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا بھی۔ کمیونسٹ پارٹی کے کارکن بھی یہیں جمع ہوتے تھے اور جلسے جلوس کے بھی۔ یہاں کانگریس کا جھنڈا بڑی شان سے لہراتا تھا۔ اس کے لیے سیاسی کارکنوں نے بڑی قربانیاں دے کر اس کو سر بلند رکھا تھا۔ ہم جلسے اسی پارک میں ہوتے تھے۔ علما، اشد قیاء بخاری جیسے

سامعین کو گھنٹوں دم بخود رکھتے۔ جواہر لال نہرو، راجگوپال آچاریہ، آچاریہ نریندر دیو، سروجنی نیڈو، وجے لکشمی پنڈت اور طلبہ کے نوعمر لیڈر سب یہیں تقریریں کرتے اور ایک نئی زندگی کا پیغام دیتے تھے۔ لکھنؤ والے جتنے زیادہ خوش تقریر تھے اتنے ہی اچھی تقریروں کے شائق بھی۔ جملوں اور فقروں پر جھومتے، نئے نکات کی داد دیتے۔ غرض بڑی گہما گہمی رہتی۔

یہیں ادبی اور علمی کتابوں کی دو دکانیں تھیں۔ جب تک "دانش محل" نام کی دوکان نہیں کھلی تھی، صدیق بک ڈپو کے سامنے والے برآمدے میں ادیب اور شاعر اکثر جمع ہو جاتے۔ نئی کتابیں الٹ پلٹ کے دیکھتے اور کبھی کبھی خرید بھی لیتے، علمی اور ادبی مسائل پر تبادلۂ خیالات بھی کرتے۔ چند مختصر اجتماعات عمائد ادب کے گھروں پر بھی منعقد ہوتے۔ ان میں صفی، عزیز، آرزو، نیاز، وصل بلگرامی، نسیم انہونوی کے نام ذہن میں آتے ہیں۔ تعلیمی حلقوں میں پروفیسر مسعود حسن رضوی، علی عباس حسینی، افسر میرٹھی، اختر تلہری مرکز توجہ تھے۔ ثاقب، یگانہ، بیخود موہانی نسبتاً تنہائی پسند تھے لیکن موخر الذکر دونوں حضرات محور و آفرینندۂ اختلافات بھی تھے۔ فرنگی محل میں علم و ادب کی شمع جھلملانے لگی تھی لیکن ابھی محفل میں جگ مگ باقی تھی۔ یہاں کے بزرگوں میں مولانا عنایت اللہ صاحب، نوجوانوں میں جمال میاں لیگی سیاست میں آگے آگے تھے تو قوم پروروں میں حیات اللہ انصاری، فرحت اللہ انصاری، محمد رضا انصاری (جو اب بفضلہ مفتی بھی ہیں) پیش پیش نظر آتے تھے۔ شیعہ علما میں ناصر الملت، نصیر الملت، سعید الملت، مولانا علی نقی وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے ذاکروں میں مولانا کبن صاحب اور مولانا ابن حسن کا طوطی بول رہا تھا لیکن یہ حلقہ سیاست سے کنارہ کش تھا۔ اخبار نویسوں میں انیس احمد عباسی، خواجہ اسد اللہ، اعظم حسین، عبدالروف عباسی، نیاز فتح پوری، فضل نقوی، امین سلونوی، شوکت تھانوی، نسیم انہونوی وغیرہ نمایاں نام تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی میں رہتے لیکن وہ جو کچھ لکھتے اس کا اثر سب سے پہلے لکھنؤ میں مرتب ہوتا۔ نوجوان ادیبوں میں مجاز، سردار جعفری، سبط حسن، سلام مچھلی شہری الگ دھوم مچائے ہوئے تھے۔ "انگارے" کی اشاعت کے بعد احمد علی، رشید جہاں اور سجاد ظہیر ترقی پسندوں کے ہیرو بن گئے تھے۔ سی۔ بی گپتا کی تسخیر سٹی کانگریس کمیٹی سے یونیورسٹی تک تھی بلکہ وہ یونیورسٹی کی سیاست پر حاوی تھے۔ سمپورنانند جی عالم کی حیثیت سے سوشلزم اور ویدانت دونوں کی باتیں کرتے تھے اور ان کا نام عزت سے لیا جاتا تھا۔ آچاریہ نریندر دیو کی بڑی وقعت تھی اور سوشلسٹ ان کا نام عقیدت سے لیتے تھے۔ رام منوہر لوہیا بھی آتے جاتے رہے اور تقریباً جز و لکھنؤ بن چکے تھے۔ پرشوتم داس ٹنڈن اس وقت راج رشی نہیں بنے تھے، لیکن محترم لیڈروں میں شمار ہوتے تھے اور ہندی تحریک کے پیشوا تھے۔

یہ تھا وہ عظیم محور جس کے گرد لکھنؤ کی ثقافتی اور سماجی زندگی گردش کرتی تھی۔ ان تمام حلقوں میں احتشام آتے ہی متعارف ہو گئے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ ہر رہرو کے ساتھ "چند گام" چلنے کو اچھا سمجھتے تھے یا راہبر کو پہچانتے نہیں تھے۔ ان کی راہ متعین ہو چکی تھی اور یہ بات سب کو معلوم تھی کہ وہ کھل کر ترقی پسندوں کے ساتھ ہیں اور وہ "ہم سفروں" میں گنے جاتے تھے۔ لیکن وہ جو ایک "باہمہ اور بے ہمہ" والی صفت ان میں موجود تھی اس کے باعث ان کا شمار کٹر بنتھیوں میں کبھی نہیں ہوا۔ ان سے ملنے والوں اور بات کرنے والوں کے دلوں پر ہمیشہ یہ تاثر ہوتا کہ انھوں نے ذہن کی تمام کھڑکیاں کھول رکھی ہیں تاکہ باہر کی تازہ ہوا آتی رہے۔ وہ سب کی بات سننے کو ہمیشہ تیار رہتے۔ وہ سیاست و ادب کے معاملے میں راسخ العقیدہ تھے لیکن متعصب نہیں تھے۔ ان کا شمار مذہبی لوگوں میں نہیں کیا جا سکتا لیکن مذہبی حلقوں میں وہ سب کے گوارا ترقی پسند تھے۔ عام سوشلسٹ بلکہ گاندھیائی حلقے بھی ان کا خیر مقدم کرتے تھے۔ اس وسیع النظری کا ایک سرچشمہ کثرت مطالعہ تھا۔ وہ بہت پڑھتے تھے، مسلسل پڑھتے تھے اور جو کچھ پڑھتے، سب یاد رکھتے۔ کثرتِ مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ حدیث و تفسیر و تاریخ اسلامی سے لے کر مارکس، اینگلز، لینن، ٹراٹسکی، اسٹالن تک انھوں نے سب کو کسب ضیا کیا تھا۔ روسی، فرانسیسی اور انگریزی ادب کے علاوہ اردو اور ہندی پر خاصی گہری نظر تھی۔ لسانیات، تاریخ، سوشیالوجی، علم النفس، فلسفہ، مذاہب کا تقابل، کلام، منطق، سیاست، جدید سیاسی اور سماجی تحریکیں کے بارے میں بھی ان کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ کھیلوں

سے بھی دلچسپی تھی۔ لیکن میں نے انھیں خود کچھ کھیلتے نہیں دیکھا۔ تاش سے ضرور شغل کریا کرتے تھے۔ اس رنگارنگی اور ہمہ گیری کی وجہ سے وہ کئی حلقوں میں سکۂ رائج تھے۔ پھر بھی انھوں نے کبھی اپنے کو دوسروں پر عائد نہیں کیا۔ اتوار کو نخاس ضرور جاتے تھے لیکن زیادہ وقت پرانی کتابیں تلاش کرنے میں لگاتے۔ کبھی حکیم صاحب عالم کی طرف مڑجاتے، کبھی نظر بچا کے نکل جاتے۔ اگر نہ جانے کے قطعی ارادے کے باوجود کسی طرح نگاہیں چار ہو ہی جاتیں تو پھر چند لمحے رکنے پر مجبور ہو جاتے۔ دور سے سلام کرتے ہوئے گزر جانے کو وہ دون مرتبہ قیاس کرتے تھے۔

اگرچہ شعر ہلکے ترنم سے پڑھتے تھے، لیکن موسیقی سے انھیں خاص لگاؤ نہیں تھا۔ پھر بھی حسینی صاحب کے یہاں پکّے گانوں کے رکارڈ سننا ہی پڑتے تھے۔ لیکن ایسا کم ہوتا تھا۔ مرزا جعفر حسین ایڈوکیٹ شیعہ پولٹیکل کانفرنس کے جنرل سکریٹری کیا، سبھی کچھ، بلکہ چلتا پھرتا دفتر تھے۔ قوم پرور خیالات سے متاثر تھی، کمیونزم چھو نہیں گئی تھی، فارسی اور اردو ادب پر اچھی نظر تھی۔ جوش ملیح آبادی کی شاموں کے خاص رفیق اور میزبان تھے۔ احتشام صاحب اور یہ یکجا ہوتے تو خاصا تضاد سامنے آجاتا۔ احتشام ان کے مقابلے میں زاہد تشنہ لب، مارکسزم کے گرویدہ، شیعہ سیاست سے متنفر، رقص و سرود و شراب کو صرف "دورکے جلوے" کی حد تک جائز سمجھنے والے، مگر جوش و ادب نقطۂ اتحاد بن گئے۔ پھر مرزا صاحب ہم محلہ بھی تھے۔ کار دوستی دراز ہو گیا اور احتشام صاحب اختلاف مزاج کے باوجود اس بساط کو کبھی تہ نہ کر پائے کیونکہ ان کے یہاں آشنائی کا آغاز اور خاتمہ استواری پر ہوتا تھا۔

صاحب عالم اور مرزا جعفر حسین ہی کے زمرے میں مولوی اختر علی تلہری بھی آتے تھے۔ تھے تو درس نظامی کے سند یافتہ مولوی لیکن بلا کے طباع و ذہین۔ عربی و فارسی کے جیّد عالم، اردو کے نقاد۔ نوکری کی انگریزوں کی اور طبیعت پائی قوم پرورانہ۔ ہفتہ وار "سرفراز" میں "سر دلبراں" نام کا کالم لکھتے اور انگریزوں کی سیاست پر چوٹیں کرتے۔ بعد میں مدیر سرفراز، خواجہ اسد اللہ سے ان بن ہو گئی تو انھوں نے ان کے ہاتھ کے لکھے مسودے حکام کے حوالے کر دیے۔ بڑی مشکل سے نوکری بچی لیکن لکھنؤ سے تبادلہ کر دیا گیا۔ ان کی یہ داستان احتشام

کو بھا گئی۔ پھر تلہری احتشام اس کو بھول گئے کہ تلہری نے ترقی پسندوں کے خلاف ایک پورا محاذ قائم کر رکھا تھا اور مسلسل ترقی پسند ادب پر نظریاتی اعتراض کرتے رہے۔

خود میرے ساتھ یہی ہوا۔ میں نے مارکسزم کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس کے بنیادی اصولوں پر اعتقاد بھی تھا لیکن کئی امور میں عصری پالیسی پر یا ہندستان کے حالات میں مارکسزم کے انطباق پر اختلاف بھی تھا۔ میں ان سے جوشِ جوانی میں اکثر الجھ پڑتا لیکن کبھی برا نہ مانتے بلکہ مجھے اپنے نقطۂ نظر کے قریب لانے کی کوشش کرتے رہتے۔ ان سے 'انفرادیت' پر اکثر باتیں ہوتیں۔ وہ اس کے طبقاتی کردار پر زور دے کر مجھے چونکانے اور جھنجھوڑنے کی کوشش کرتے تو میں کبھی کبھی جوابی وار بھی کر دیتا۔ عام لوگوں کو ہمارے ان جزوی انفرادی اختلافات کی خبر نہ تھی۔ ترقی پسند تحریک سے میری گہری وابستگی کی بدولت ہمارے دوست یہی سمجھتے کہ ہم دونوں ہر اعتبار سے ایک ہیں۔ جب میرا پہلا مجموعہ "رگِ سنگ"، اشاعت گھر حیدر آباد نے مجھ سے طباعت کے لیے حاصل کیا تو انھوں نے مجھ سے مشورہ کیے بغیر احتشام صاحب سے اس پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کر دی۔ یہ زمانہ تعطیلات کا تھا۔ میں ایل۔ ایل۔ بی پاس کر کے اعظم گڑھ میں وکالت کی ٹریننگ لے رہا تھا اور احتشام صاحب اپنے گاؤں ماہل میں گرمی کی چھٹیاں گزار رہے تھے۔ نہ ہم ایک دوسرے سے مل پائے نہ خط و کتابت ہی کا سلسلہ رہا۔ مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس وقت احتشام صاحب میری تصنیف کا مقدمہ لکھ رہے ہیں۔ جب کتاب چھپ کر سامنے آئی تو راز کھلا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ میری کتاب کی ابتدا ہی میں ایک نظم احتشام صاحب کے خلاف تھی۔ ماہرِ اختلاف کی نوعیت یہ تھی کہ "ادبِ لطیف" ۱۹۴۲ء کے سالنامے میں پروفیسر احتشام نے "رند نصیحت مشرب" کے عنوان سے ایک نظم شائع کرائی۔ اس میں جوش ملیح آبادی کی رندی پر اس لیے اعتراض کیا گیا تھا کہ دنیا جنگ کے غم و آلام میں مبتلا ہے اور ایسے لمحات میں رندی خوب نہیں ہے۔ احتشام نے دبے لفظوں میں اس پر بھی اعتراض کیا تھا کہ جوش شاعرانہ محفلوں میں احتشام کو بھی شریک ہے نوشی ہونے کی دعوت دیتے ہیں لیکن احتشام تشنہ لبی کو پسند کرتے ہیں کیونکہ دنیا تباہ

ہو رہی ہے۔ گویا احتشام کو مے نوشی پر کوئی اصولی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ دورانِ جنگ میں اسے بے محل سمجھتے تھے۔ جن محفلوں کا ذکر ہے وہ مرزا جعفر حسین کے مکان پر منعقد ہوا کرتی تھیں میں نے اس نظم کے جواب میں ایک نظم لکھی کیونکہ ایک شریکِ بزم کی حیثیت سے دفاع میرا بھی فریضہ ہو گیا تھا جیسے "رنگِ سنگ" میں اقرار کیا کہ "مجھے اعتراف ہے کہ اس (میری نظم) کا لہجہ بعض مقامات پر تلخ ہو گیا ہے۔ خصوصاً پہلے جز میں" لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ ناشر اس مجموعے پر احتشام کو مقدمہ لکھنے کی دعوت دیں گے۔ میری نظم اور احتشام کا مقدمہ دونوں "رنگِ سنگ" میں موجود ہیں۔ کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہونے پاتا کہ ان کی ناقدانہ پیشانی پر معمولی سی بھی شکن پڑی ہو۔ ایسی وسیع النظری بے شبہ مثالی ہے۔

احتشام کا اثر قبول نہ کرنا، ان کے اس اصول تنقید پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے کہ ذاتی تاثرات کو تنقیدی فیصلوں اور محاکموں پر اثر انداز نہ ہونے دینا چاہیے۔ جب اصول کی بات آگئی تو احتشام نے بے جھجک اسی مقدمے میں اعتراض بھی کیا۔ یہ بھی ایک دل چسپ کہانی ہے۔

جب میں جیل میں تھا اسی زمانے میں جرمنی نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے روس پر حملہ کر دیا۔ اس وقت تک جنگ کی نوعیت کے بارے میں عام طور سے یہ خیال تھا کہ یہ سامراجی جنگ ہے کیونکہ اس کے پیچھے صرف ملک گیری یا سامراج کی حفاظت کا جذبہ کارفرما تھا۔ مسٹر ایم۔ این۔ رائے اسے فسطائیت دشمن جنگ قرار دیتے تھے اور اسی لیے وہ شروع سے ان تمام طاقتوں کا ساتھ دیتے رہے جن کے خلاف ہٹلر اور مسولینی نے اعلانِ جنگ کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ فسطائی طاقتوں کو شکست دینا بہت ضروری ہے۔ اس لیے اتحادیوں کی جنگی کوششوں کو مضبوط بنا کر ہی فسطائیت کو شکست دی جا سکتی ہے۔ اس کے برعکس، تمام ترقی پسند طاقتیں جن میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا بھی شامل تھی، اس جنگ کو سامراجی قرار دے کر برطانوی جنگی کوششوں کو ناکام بنانے میں کوشاں تھیں جب ہٹلر کی طاغوتی فوجوں نے روس پر بھی حملہ کر دیا تو جنگ کی عالمگیر نوعیت میں فرق ہو گیا۔ چین اور روس جو عوامی طاقتوں کی نمائندگی کر رہے تھے اپنے ملکوں میں دفاعی جنگ لڑ رہے تھے اور وہاں یہ جنگ یقیناً عوامی تھی۔ لیکن دوسرے اتحادی جو دنیا کی ایک بہت بڑے حصّہ کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، ان کی شمولیتِ جنگ عوامی مفاد میں ہے، اس کا قبول کرنا ممکن نہیں تھا۔ جنگ اب ناقابلِ تقسیم نہ رہ کر دو حصّوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک حصّے میں یہ جنگ عوامی تھی اور دوسرے حصے میں سامراجی۔ یہ خیال ایک بڑے طبقے کا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اس جنگ کو ناقابلِ تقسیم قرار دے چکی تھی، اس لیے اس پارٹی کے نقطۂ نظر سے تمام دنیا کی جنگ عوامی ہو چکی تھی۔ سومیندر ناتھ ٹیگور کی ریولیوشنری کمیونسٹ پارٹی بھی جنگ کو ناقابلِ تقسیم سمجھتی تھی۔ لیکن وہ اس بات پر اڑی تھی کہ چونکہ جنگ کا بنیادی کردار سامراجی ہے اس لیے پوری جنگ سامراجی ہے۔ میں نے اپنے خیال میں جنگ کو دو خانوں میں بانٹ لیا تھا روس و چین میں عوامی اور باقی دنیا میں سامراجی۔ پھر اگست ۱۹۴۲ء کا تاریخی رزولیوشن پاس ہوا اور اگست اندولن چل پڑا۔ فلسفہ طرازی کی گنجائش ہی نہ تھی۔ سارے ملک نے برطانوی تسلّط کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ جب ہندی عوام برطانوی سامراج سے نبرد آزما ہوں تو برطانوی جنگ کو عوامی کون کہہ سکتا تھا؟ ملک میں ایک انقلابی تحریک چل پڑی اور یہ بحث صرف نظریاتی ہو کر رہ گئی۔ بہر حال اس بحث میں میرے اور احتشام کے مابین اختلافِ رائے تھا اور "رنگِ سنگ" کے مقدمے میں احتشام حسین نے لکھا کہ "بعض تفصیلات پر اختلافِ رائے ہے جو آل زیدی سے ذاتی طور پر میں جنگ کی نوعیت کے مسئلے پر اختلاف رکھتا ہوں ایک نظم کا شعر تھا:

یہ جنگ ہماری کب ہے، یہ جنگ کسی کی کب ہے؟
پھر بھی ہم کو لڑنا ہے، پھر بھی ہم کو مطلب ہے

احتشام نے یہ تو تسلیم کیا کہ اس نظم میں جس عام خیال کو ظاہر کیا گیا ہے اس سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کہہ گئے کہ "صرف یہ کہہ کر نجات نہیں مل سکتی کہ یہ جنگ ہماری ہے، اس جنگ میں کوئی غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔" ظاہر ہے کہ غیر جانبداری کا سوال ہی نہیں تھا۔ احتشام بھی اس جنگ کو "قوموں کی آزادی، انسانیت کی ترقی اور معاشی ناانصافی سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ" بنانا چاہتے تھے اور میں بھی طریق کار کا فرق تھا میں اسے اپنے ملک کی آزادی اور ترقی اور برطانوی سامراج کے استحصال سے نجات کا ذریعہ بھی بنانا چاہتا تھا۔ اس

سے اس عوامی جنگ کو بھی تقویت پہنچنا لازمی تھا جو روس اور چین میں لڑی جا رہی تھی۔ اسے احتشام نے بھی محسوس کیا اور انھوں نے مقدمے میں یہ بھی لکھا کہ "جاذ زیدی کے بارے میں میرا خیال ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہنے اور جنگ کا تماشائی کی حیثیت سے نظارہ کرنے کے حامی کسی حال میں نہیں ہو سکتے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ روس کی مدافعت کے معترف اور فاشزم کی تباہی کے خواہاں ہیں۔" غرض، وہ اصول اور نظریے کے معاملے میں ذرا سے انحراف کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ لیکن ان کا رویہ ہمیشہ عالمانہ رہتا۔ وہ گالی دینے، منہ چڑھانے، شور مچانے اور مرعوب کرنے کی کوشش کبھی نہیں کرتے تھے۔ بعض اوقات ذاتی معلومات کو مشعل راہ بنا کر نظموں اور ادبی تخلیقوں کو پڑھتے اور اس کا خیال نہ رکھتے کہ ممکن ہے کہ عمومی اختلاف کے باوجود کسی خاص پہلو پر وہ اور اس کے مخاطب متفق بھی ہو سکتے ہیں۔ اب اسی نظم میں شاعر نے یہ صاف لکھ دیا تھا کہ "پھر بھی ہم کو لڑنا ہے"۔ لیکن چونکہ احتشام کے ذہن کے پس منظر میں شاعر کا عام خیال و عقیدہ تھا، اس لیے وہ اس مقام سے رواں دواں گزر گئے اور اعتراض کا گوشہ نکال لیا۔ وہ سیاسی اور نظریاتی عقیدے کے بارے میں لگی لپٹی رکھنے کے قائل نہیں تھے اور جہاں انحراف کا شک بھی ہوتا وہاں بے جھجک ٹوک دیتے تھے۔ اور یہ وہ ایسی شیرینی سے کرتے کہ سننے والے کبھی بے مزا نہ ہوتے۔

اسی مجموعے میں میری ایک نظم "ترکِ عمل" تھی۔ اس کے محرک اقبال سہیل تھے۔ وہ اعظم گڑھ میں وکالت کرتے تھے اور میں نے وکالت کی ٹریننگ انھیں سے لی تھی۔ ۱۹۴۲ء کے وسط میں جب میں ان کے یہاں روز جاتا تو وہ اکثر اپنی ذہانت، طباعی اور حاضر جوابی کے مظاہرے کیا کرتے تھے۔ ایک دن ان پر کسی نے اعتراض کیا "سہیل صاحب! آپ نماز تو ایک وقت بھی نہیں پڑھتے لیکن روزہ ایک بھی قضا نہیں ہونے دیتے"۔ فوراً بولے "میں بے عمل انسان ہوں، عمل سے کوسوں دور بھاگتا ہوں۔ نماز 'عمل' ہے اس لیے اس سعادت سے محروم ہوں۔ روزہ اس لیے رکھ لیتا ہوں کہ یہ 'ترکِ عمل' ہے"۔ اسی ایک فقرے سے نظم کے خیال کو مہمیز ملی۔ میں نے "عمل برائے عمل" کے مقابلے میں "بے سوچے سمجھے ترکِ عمل" کو بہتر قرار دیا۔ بات فلسفیانہ نہیں بلکہ شاعرانہ زبان میں کہی گئی تھی۔ لیکن احتشام کی جبیں فوراً شکن آلود ہو گئی۔ اور انھوں نے ٹوک دیا کہ زیدی ترکِ عمل کے لیے بھی فلسفہ تلاش کر لیا کرتے ہیں۔ حالانکہ میں نے کلیتہً ترکِ عمل کی بات ہی نہیں کی تھی۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ بے سوچے سمجھے عمل سے عارضی ترکِ عمل بہتر ہے کیونکہ عمل برائے عمل، ایک سعیِ لاحاصل ہے۔ اس قسم کی غلط فہمیاں اس لیے پیدا ہوئیں کہ احتشام خطوطِ مستقیم سے ہٹ کر چلنے کو نظریاتی اعتبار سے غلط جانتے تھے۔ بعض اوقات ان کی گرفت بہت شدید ہو جاتی تھی۔ مثلاً میرے اس مصرعے پر کہ "غلام ملک کبھی مسکرا نہیں سکتا" ان کو یہ خیال ہوا کہ اس سے یہ گوشہ نکلتا ہے کہ رنج و ملال دائمی ہے، حالانکہ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ ملک جب تک غلام ہے وہ مسکرا نہیں سکتا۔ آزادی کے بعد ہی اس کے لب مسکراہٹ سے آشنا ہوں گے، کیونکہ غلامی کی حالت میں اس پر مسلسل بندشوں کی یلغار رہتی ہے۔

یہ گفتگو طویل ہو گئی لیکن اس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ اپنے محبوب اصولوں کے آگے کسی قسم کے تعلقات کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اس کے برعکس ذاتی معاملات میں ہر طرح کی مصالحت کے لیے آمادہ رہتے تھے۔ کسی کی سفارش کرنا ہو، کسی کو مہمان بنانا ہو، کسی کی ہمت افزائی کرنا ہو تو وہ ہر بندش کو توڑ سکتے تھے۔ دب سکتے تھے، جھپٹ سکتے تھے، لجاجت اختیار کر سکتے تھے، دوسروں کا احسان لے سکتے تھے، اپنے ذاتی اصولوں اور معیاروں میں لچک پیدا کر سکتے تھے۔ ان کی شخصیت کے دو پہلو تھے:

(۱) بھائی احتشام صاحب اور (۲) سید احتشام حسین۔

سید احتشام حسین کی شکل میں وہ سب سے یکساں ملے۔ تنقیدی معاملات میں کسی کی رو رعایت نہیں کی۔ جن سے نظریاتی اتحاد تھا ان کے بارے میں انھوں نے یقیناً زیادہ لکھا اور یہ انھیں کرنا بھی چاہیے تھا کیونکہ ان کے نزدیک شاعری صرف انبساطِ روح کا سامان نہیں بلکہ شعور کی حدیں وسیع کرنے اور پر پیچ راہوں کو واضح کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ پھر بھی خلیل الرحمٰن اعظمی کی طرح احتشام کے تنقیدی مضامین کے بارے میں یہ کہنا کہ ان کا "ایک بڑا حصہ ادبی تنقید کے دائرے سے نکل کر تاریخی و سماجی تفسیر و ترجمانی کی سرحد میں داخل ہو گیا ہے" زیادتی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اسی پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ،

عمرانیات کا کوئی محقق ادب کے مطالعے کی طرف رجوع ہوا ہے اور اردو زبان کے ادبی ذخیرے کی چھان بین محض اس لیے کر رہا ہے کہ وہ اس کے اندر سے ایسا مواد دستیاب کر سکے جو ہندوستان کے تاریخی، سیاسی اور سماجی مسائل کا تجزیہ کرنے میں اس کے لیے مفید ثابت ہو" یہ صورت یقیناً افراط و تفریط کی ہے۔ احتشام حسین نے تاریخ و عمرانیات کے میدانوں میں تحقیق کا دعویٰ کبھی نہیں کیا، اگرچہ ادب ہی کی طرح تاریخ و عمرانیات میں بھی ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کے یہاں تاریخی اور عمرانی مسائل کا مطالعہ بھی آفاقی تھا ملکی یا علاقائی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ احتشام کے مضامین سے یہ تاثر کبھی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ تاریخی اور عمرانی مسائل ادبیات پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان موضوعات کا مطالعہ ایک امتزاج کی صورت میں ان کی تنقیدوں میں نمودار ہوتا ہے۔ سچا تخلیقی ادب تاریخی اور عمرانی معنویت سے بھرپور ہوتا ہے اور ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے اور تاریخی یا عمرانی معنویت کو مقصد بنانا بھی برا نہیں ہے بعض اوقات تاریخی یا عمرانی نقطۂ نگاہ کو بالکل نظر انداز کرنے کا یہ بھی نتیجہ ہوتا ہے کہ نظیر اکبر آبادی مدتوں بے توجہی کا شکار رہے۔ اردو شاعروں نے گیتوں، قطعوں، ہجووں، طنزوں، شہر آشوبوں، واسوختوں، مخمسوں اور مسدسوں میں جو کچھ کہا اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ نعت و منقبت، قصیدہ و مثنوی اور مرثیہ کا ذخیرہ، غزلوں کے انبار کے نیچے دب گیا اور ادب کا ہمہ گیر تصور ابھر نہیں پایا۔ کم سواد نقادوں نے یہ نعرہ تک بلند کر دیا کہ اردو میں کنگھی چوٹی، گل و بلبل، شراب و ساقی، دیر و حرم کے سوا اور دھرا کیا ہے۔ "داخلیت" کا عمومی نام دے کر ساری کائنات کو شاعری میں حلقۂ بیرون در بنانے کی کوشش کی گئی۔ ترقی پسند تنقید نگاروں کا یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے "خارجیت" میں بھی شعری امکانات ڈھونڈھے اور اُسے عزت کی جگہ دلوائی۔ دراصل حالی کے بعد احتشام وہ پہلے ناقد ہیں جنھوں نے نقد کے جو اصول بنائے ان کو شدت سے برتا اور دوسروں کو بھی اس طرف مائل کیا۔ دونوں ہی کے یہاں ایک ناقابل تسخیر مقصدیت ہے جو دوسرے پہلوؤں پر حاوی ہو جاتی ہے۔ مجنوں گورکھپوری بھی، نظریاتی استحکام کے باوجود، کبھی کبھی تاثراتی تنقید کی سرحدوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ آل احمد سرور بھی ترقی پسند تنقید کے ستون ہیں لیکن ان کا رجحان طبع تاثراتی ہے۔

ترقی پسند تنقید کے ان اصحاب ثلاثہ نے مجموعی حیثیت سے کو ایک نئی دنیا میں پہنچا دیا ہے اور تینوں کے اکتسابات صرف کی نشاندہی کرتے ہیں نہ کہ نظریاتی اختلاف کی۔ ان حضرات کی کا یہ نتیجہ نکلا کہ "داخلیت" اور "خارجیت" کے مصنوعی غلاف مٹے ایسے شعری عناصر کا پتہ چلا جو داخلیت اور خارجیت دونوں ہی طور سے حاوی ہیں۔

احتشام اور مجنوں مجاہد تھے۔ انھیں بہتوں سے جنگ کر انھوں نے ترقی پسند تنقید کے لیے راہ ہموار کی اور ان کی کوشش ترقی پسند ناقدوں کا ایک پورا کارواں ابھرا۔ آل احمد سرور پہلوؤں پر تاثراتی انداز میں زور دیا اور نظریے اور تخلیقی عمل رشتے کو استوار کیا۔ احتشام کے ذمے یہ خدمت بھی تھی کہ نوجوان اور ادیبوں کا جو پورا گروہ ابھرا ہے ان کے اکتسابات و محسوسا کو اجاگر کریں اور یہ کام انھوں نے پوری ایمانداری اور خلوص دیا۔ میں نے خود دو ایک بار احتشام صاحب سے یہ گذارش کی تھی خصوصیات کلام پر توجہ نہ دینے یا کم دینے کی وجہ سے بعض اوقات ہوتا ہے کہ شاید جذبی، سردار، مخدوم، مجاز اور وامق میں کوئی نہیں۔ اس مسئلے پر وہ کبھی جم کر بحث نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ لیکن ان کا ذوقِ شعور اتنا بیدار تھا کہ وہ مبہم اشاروں میں باتیں بھی کہہ دیا کرتے تھے کہ باریک بیں نگاہیں اسے محسوس کیے رہ سکتیں کہ وہ ان ہم مشربوں کے انفرادی مرتبے کو صحیح طور سے سمجھ

بعض اوقات مثالیں دیتے وقت وہ کئی نام ایک ساتھ گنا تھے۔ اس پر خلیل الرحمٰن اعظمی نے یہ شکوہ کیا ہے کہ "ان مثالوں میں شاعر، اعلیٰ درجے کے تخلیق کار اور ادنیٰ درجے کے تک بند سب محفل میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی تو انھوں نے یہ غضب کیا تاریخی پس منظر بیان کرنے کے بعد شعراء کے ناموں کی فہرست دی اور سب کو یکساں انداز سے سندِ اعتبار عطا کر دی ہے" یہ بیان ہے، کیونکہ نام شماری انھوں نے بعض موضوعاتی جائزوں ہی کی ہے۔ مثلاً "اردو ادب میں قومیت" "اردو ادب میں گاندھی اس نام شماری میں انھوں نے سیاسی اور نظریاتی جنبہ داری سے

لیا ہے اور مجازؔ، سردار، مخدوم اور کیفی کے دوش بدوش ساغر، روش شمیم، ملاّ اور اختر وغیرہ کا نام بھی لیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نام شماری سے انھوں نے رنگا رنگی کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ یہ نام شماری صرف موضوع سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں "سندِ اعتبار" عطا کرنے کی کیا بات ہے؟ پھر انھوں نے بالکل ہی غیر مستند شعرا کا نام شاید ہی گنوایا ہو۔ ایک بات اور جو میرے ذاتی علم میں ہے اس کا اظہار ضروری ہے۔ یہ مضامین عام طور سے یوم جمہوریہ، یوم آزادی، گاندھی جینتی، نہرو جینتی وغیرہ کے موقع پر رسائل کے خصوصی نمبروں کے سلسلے میں لکھے گئے ہیں اور زیادہ تر قلم برداشتہ تحریر کیے گئے ہیں۔ اس کے باوجود احتشام سماجیات کا نہیں بلکہ اپنے وسیع ادبی مطالعے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ آج نہیں بلکہ ہر دور میں، ادبی تحقیق و تنقید کا کام کرنے والوں کو ان مضامین سے رہنمائی ملتی رہے گی۔

اس مضمون میں احتشام کے انتقادی پیکر کی بلندی پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ لیکن بات چل پڑی ہے تو ادبی مطالعے کے سلسلے میں ایک واقعہ سنانے کو جی چاہتا ہے۔ ایک بار آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے ارباب اقتدار نے مجھ سے اردو کے منظوم ترجموں" کے موضوع پر تقریر کرنے کی فرمائش کی۔ یہ موضوع کسی اور کو دیا گیا تھا۔ انھوں نے عین وقت پر مجبوری کا اظہار کیا۔ یہ مضمون چونکہ ایک سلسلے کی کڑی تھا اس لیے ریڈیو والے بہت ہی ملول و کبیدہ ہوئے اور مجھ سے اتنا اصرار شدید کیا کہ میں 'ہاں' کہنے پر مجبور ہو گیا۔ ہاں تو کر لی لیکن چوبیس گھنٹوں میں سارا مواد اکٹھا کر کے مضمون لکھ لینا آسان نہیں تھا۔ پھر، ترجموں پر میں نے نہ تو تحقیق کی تھی نہ کوئی کام کیا تھا۔ مثالوں کے بغیر بات نہ بنتی میرے حافظے میں صرف تھوڑی سی مثالیں محفوظ تھیں۔ اس زمانے میں میں بھی لکھنؤ میں تھا اور احتشام بھی۔ فرصت دیر میں فرصت پائی۔ سات بجے کے قریب میں ان کے مکان پر پہنچا۔ وہ برآمدے میں اکیلے بیٹھے تھے۔ جاتے ہی ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے آنے کا مقصد بتایا اور احتشام صاحب ان مصنفوں کے نام گنوانے لگے بلکہ بعض تصانیف کے سنہائے طباعت تک انھیں زبانی یاد تھے۔ میں نے جیب سے کاغذ نکالا اور نوٹ کرنے لگا۔ لکھتا جاتا اور کثرتِ مطالعہ اور قوتِ حافظہ دونوں پر رشک کرتا جاتا۔ پھر دل میں چھپے شک کو رفع کرنے کی غرض سے بعض ترجموں کے بارے میں میں نے ان کی رائے بھی دریافت کی۔ وہ بے تامل گویا ہو گئے۔ جس کا ادبی مطالعہ اتنا گہرا اور حافظہ اتنا قوی ہو، اسی کو ادب کی تنقید و تاریخ پر مکالمے کا حق پہنچتا ہے!

ان کی شخصیت کا دوسرا پہلو جسے میں نے بھائی احتشام صاحب" سے تعبیر کیا ہے، بالکل گھریلو ہے۔ وہ گھر، نہ ان کے وطن ماہل میں محدود تھا، نہ سسرال نگرام میں، نہ تعلیم گاہ اعظم گڑھ والہ آباد میں محصور تھا، نہ ملازمت گاہ لکھنؤ میں۔ یہ ایک وسیع گھر تھا جس میں دور دور کے ترقی پسند ادیب و شاعر بستے تھے ہر ادب دوست اس کا فرد تھا۔ دوستوں کے دوست بلکہ سیاسی مخالف اور ادبی رقیب بھی ان سے گھر والوں کی طرح ملنے پر مجبور تھے کیونکہ احتشام کو ملنے کا کوئی اور طریقہ معلوم ہی نہ تھا۔ ان کے گھریلو قسم کے تعلقات رکھنے والوں میں زاہد خشک بھی تھے اور رندِ لاابالی بھی، سیاسی کارکن بھی تھے اور شاعر بھی، چھوٹے موٹے زمیندار بھی تھے اور کسان و مزدور بھی، عالم بھی تھے اور جاہل بھی، بچے، نوجوان، بوڑھے عورتیں، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی، سنی، شیعہ، قادیانی سبھی تھے۔ وہ سب ایک طرح ملتے اور اگر ادب کے معاملے میں نہیں تو بھی زندگی میں تو یقینی طور پر سبھی کو سندِ اعتبار بخش دیا کرتے تھے۔ ان کے اٹھ جانے سے ہم میں سے اکثر کی زندگی میں ایک مرکزی نقطہ جاتا رہا۔

★

ڈاکٹر گیان چند

کچھ منتشر یادیں

موت سے کس کو رستگاری ہے

مجھے یاد نہیں کہ میں نے احتشام صاحب کو پہلی بار کب دیکھا میں [illegible]ء سے [illegible]ء تک الہ آباد یونی ورسٹی کا طالب علم رہا۔ استاذی اعجاز صاحب احتشام صاحب کا ذکر خیر کیا کرتے تھے۔ اعجاز صاحب کا ایک ادبی کلب بھی تھا۔ تھرس ڈے کلب۔ اس کے جلسے ہر جمعرات کو ان کے کمرے میں ہوتے تھے۔ میں اس کلب کا ممبر نہ تھا۔ کلب کا سالانہ جلسہ اعجاز صاحب کے دولت کدے پر دھوم دھام سے ہوتا تھا۔ اس میں اردو ایم۔ اے اور ریسرچ کے جملہ طلبا کو مدعو کیا جاتا تھا۔ غالباً میں نے پہلی بار احتشام صاحب کو ان جلسوں میں دیکھا لیکن بات کرنے کی سعادت نہ ملی۔ ریسرچ کے دوران میں لکھنؤ یونیورسٹی کی لائبریری دیکھنے گیا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب نے احتشام صاحب کو میری رہبری کے لیے لائبریری میں بھیج دیا۔ یہ سرسری دید و ملاقات اس سے زیادہ نہ تھی کہ ایک طالب علم ایک فاضل استاد کی خدمت میں نیاز حاصل کرے۔ اس قرب تفاوت آمیز سے بھی ان کی سادگی اور منکسر المزاجی کا اندازہ ہوا۔ احساس برتری یا پندارِ علم کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔

برسوں کے بعد جب میں حمیدیہ کالج بھوپال میں ملازم تھا، بھوپال میں ایک اردو کنونشن ہوا۔ اس میں احتشام صاحب بھی تشریف لائے۔ میں پروفیسرس کالونی میں رہتا تھا۔ مجھ سے ایک مکان چھوڑ کر پروفیسر شہاب اشرف رہتے تھے۔ احتشام صاحب کو ان کے پاس ٹھہرایا گیا۔ اس موقع پر دو تین دن ان کے ساتھ دن رات اٹھنا بیٹھنا ہوا۔ مغائرت کی قناتیں گر گئیں۔ اس کے بعد وکرم یونی ورسٹی اجین کی کمیٹیوں کے سلسلے میں انھیں کئی بار اجین اور بھوپال بلا گیا۔ تب وہ بھوپال میں میرے غریب خانے ہی پر قیام کرنے لگے۔ اہل بھوپال اردو والوں کی پذیرائی اس گرم جوشی اور خلوص سے کرتے ہیں کہ ان بیچاروں کو صبح سے دیر رات گئے تک دم مارنے کی فرصت نہیں ملتی۔ احتشام صاحب کے مرتبے کے عالم کی یہ آؤ بھگت ہوتی تھی کہ بھوپال کے یک روزہ قیام میں بھی تین چار ادبی صحبتوں میں شریک بزم ہونا پڑتا تھا۔

ان کے اجین و بھوپال کے ورود کے سلسلے میں دو تین باتیں یاد پڑتی ہیں۔

ایک بار وکرم یونیورسٹی اجین میں وہ کسی کمیٹی میں آئے غالباً امتحان کے پرچوں کی درستی کی کمیٹی تھی۔ میں ان کے ساتھ تھا۔ سہ پہر کی بس یا ٹرین سے بھوپال واپس ہونا تھا۔ گاڑی کا وقت قریب آ گیا تھا۔ پرچوں کو سنوارنے کے بعد انھیں لفافوں میں سربہ مہر کرکے دفتر کے سپرد کرنا تھا۔ چپراسی کو مہر لگانے کے لیے بلایا گیا۔ وقت کی تنگی تھی اس لیے احتشام صاحب ان کا ہاتھ بٹانے لگے یعنی چپراسی لاکھ لگاتا جاتا اور احتشام صاحب اس پر مہر کا ٹھپہ کرتے جاتے۔ میں نے انھیں روکنا بھی چاہا لیکن وہ نہ مانے۔ ایک یونیورسٹی کے سینیر استاد ہوکر اس طرح چپراسی کا ہاتھ بٹانا انھیں کا کام تھا۔ احساس کم تری کے مارے ہم کالج کے معلم اس مشقت کے لیے تیار نہ ہوتے۔

حمیدیہ کالج بھوپال میں ایک بار ان کے اعزاز میں بزم ادب

دیپک - جشن ۵۱ اشک

کا جلسہ کیا گیا۔ جلسے کے باضابطہ آغاز سے قبل میں ان کے پاس کی کرسی پر بیٹھا کہہ رہا تھا کہ "آج کے دور میں کئی بار یہ احساس ہوتا ہے کہ سائنس اور دوسرے علوم کی جو افادیت ہے وہ ادب کی نہیں۔ آج کے سماج کو ادیب بہت کم متاثر کر پاتے ہیں۔" جلسہ شروع ہونے پر انھیں ڈائس پر بٹھا دیا گیا۔ انھوں نے سامعین سے کہا کہ آپ جو موضوع تجویز کریں اسی پر کچھ بولوں۔ طلبا نے مختلف موضوعات کی فرمائش کی۔ مختلف فرمائشوں کے بیچ انتخاب مشکل تھا۔ احتشام صاحب نے اس کا حل یہ نکالا کہ جلسے کے قبل کی میری گفتگو کو موضوع سخن بنایا اور موجودہ دور میں ادب کی افادیت پر ایک پر مغز تقریر کر دی۔ شاعروں اور موسیقاروں کو تو فرمائشوں کی تعمیل کرتے دیکھا گیا ہے لیکن ادبی تقریر کے لیے فرمائشی موضوع پر بولتے انھیں کو سنا اور کتنی اچھی تقریر تھی۔ وہ اردو کے تمام اساتذہ میں بہترین مقرر تھے۔

ان کی شخصیت میں ایک قسم کی اداسی رچی ہوئی تھی۔ جب وہ بھوپال بارہا آچکے تھے، ایک بار میں نے شعبے کے اساتذہ اور ایم اے کے چند طلبا کے سامنے بر سبیل تذکرہ کہا کہ کبھی کسی نے احتشام صاحب کو ہنستے دیکھا ہے۔ حنیف احمد نقوی نے (جو اب ڈاکٹر ہو کر بنارس یونیورسٹی میں لکچرر ہیں) جواب دیا کہ کبھی نہیں۔ ہم سب نے بھی غور کیا تو کسی کو یاد نہ آیا کہ کبھی احتشام صاحب کو ہنستے دیکھا ہے۔ بعد میں میرا احتشام صاحب سے بہت ملنا جلنا ہوا۔ چنانچہ ایک موقع پر میں نے انھیں نہ صرف ہنستے بلکہ بے تحاشا ہنستے دیکھا۔ علی گڑھ میں ۱۹۶۸ء میں انجمن اساتذۂ اردو کی کانفرنس ہوئی۔ میں نے استادوں کے مسائل پر ایک مقالہ پڑھا۔ یہ مقالہ تھا تو دل کی ٹیس لیکن بظاہر امزاحیہ انداز میں لکھا گیا تھا۔ جموں میں ایک مرتبہ میرے ایک مسلم طالب علم نے کہا تھا کہ ایم اے اردو کی یہ کساد بازاری ہے کہ لڑکی والے رشتہ کرنے آتے ہیں تو یہ سن کر کہ لڑکا اردو کا ایم اے ہے واپس چلے جاتے ہیں۔ میں نے علی گڑھ کے اپنے مقالے میں ایم اے اردو کی کس مپرسی کے ضمن میں اسی واقعہ کا ذکر کیا تھا۔ احتشام صاحب اور میں ہوسٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ صبح تڑکے جب میں غسل خانے میں واش بیسن

پر گیا تو احتشام صاحب بھی آگئے۔ مجھے دیکھ کر بہت ہنسے اور ہنسی کے فوارے کے بیچ کہنے لگے کہ آپ نے ملک میں ضبط تولید کا بہترین علاج سجھایا ہے۔ لوگوں کو دھڑا دھڑ اردو میں ایم اے کرائیے، اردو کی بھی خدمت ہوگی اور ان کی شادی نہ ہونے کے سبب آبادی پر بھی قابو رہے گا۔

مرحوم میرے ڈی لٹ کے مقالے کے ممتحن تھے۔ میرا زبانی امتحان بھی لیا۔ اس اعتراف کے بعد میں اپنے ایک نامناسب فعل کا ذکر کیا چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں پردے کی ان باتوں سے پردہ اٹھانا مناسب ہے کہ نہیں۔ ۱۹۶۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں اردو پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی۔ میرے ایک کرم فرما پروفیسر نے مجھے رائے دی کہ میں بھی اس جگہ کے لیے درخواست دوں۔ میں نے ان کی بات مان لی۔ کچھ ہی عرصے کے بعد اردو کے ایک اور بزرگ بھوپال اسٹیشن سے گزر رہے تھے۔ میں ان سے ملنے گیا۔ انھوں نے بھی مجھ سے اصرار کیا کہ میں الہ آباد میں درخواست دوں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دونوں حضرات الہ آباد کی سلکشن کمیٹی میں ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ احتشام صاحب نے بھی اسی اسامی کے لیے درخواست دی ہے۔ میں نے اپنے محولۂ بالا کرم فرماؤں کو لکھا کہ "احتشام صاحب کے مقابلے میں میری کوئی حیثیت نہیں۔ میں ان سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں اپنی درخواست واپس لینا چاہتا ہوں۔" ان میں سے ایک نے مجھے لکھا کہ "ابھی درخواست واپس نہ لیجیے۔ اگر اس کی ضرورت ہوئی تو میں بعد میں لکھ دوں گا۔" دوسرے صاحب نے بڑے شد و مد سے لکھا کہ "درخواست واپس لینے کی غلطی ہرگز نہ کیجیے۔ میرے پاس ان کا یہ خط آج بھی محفوظ ہے۔ ادھر میں نے احتشام صاحب کو لکھا۔ انھوں نے اپنی عالی ظرفی کے ساتھ مجھے لکھا کہ "میں نے دوستوں کے کہنے پر درخواست ضرور دی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ وہاں امیدوار نہ ہوں۔" میں نے اپنی درخواست واپس نہ لی چونکہ دو ماہرین مجھے باز رکھ رہے تھے۔ میں کوئی دیوتا یا فرشتہ نہیں۔ بہر حال مجھے دلی خوشی ہے کہ ان دونوں کرم فرماؤں نے انتخاب میں میری نہیں مجھ سے بہتر امیدوار کی حمایت کی۔ انتخاب کے کچھ ہی عرصے بعد میں نے احتشام صاحب کو کسی سلسلے میں بھوپال بلایا

میرے گھر پر ٹھہرے۔ دل میں میل کا نام نہ تھا۔ میں نے انھیں ان ماہر صاحب کی مندرجۂ بالا تحریر دکھائی۔ میرا خیال ہے کہ احتشام صاحب کے مقابل موجود رہنے کی جو گستاخی میں نے کی اس کی لیے مجھ سے زیادہ وہ دو ماہرین ذمہ دار تھے۔

احتشام صاحب ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے کہاں متاثر ہونے والے تھے۔ انجمن ترقی اردو کی مجلس عام میں کوئی نشست خالی ہوئی۔ انھوں نے میرا نام تجویز کر کے مجھے منتخب کرا دیا۔ یہ سب میرے علم کے بغیر کیا۔ ہماری زبان کا پرچہ آیا تو اس سے مجھے معلوم ہوا کہ میں انجمن میں منتخب ہو گیا ہوں۔ بعد میں احتشام صاحب نے مجھے اطلاع دی کہ یہ ان کی تجویز پر ہوا تھا۔ میں نے اس اعزاز کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا۔ میں مجلس عام کا آخری لائف ممبر ہوں۔ اس کے بعد رکنیت پانچ سال کے لیے محدود کر دی گئی۔

میں نے ۱۹۶۱ء اور ۱۹۶۲ء میں ساگر اور دھارواڑ کے لسانیات کے گرمائی اسکول میں درس لیا۔ معلوم ہوا ایک نئی دنیا کا در مجھ پر کھل گیا۔ احتشام صاحب کو بھی لسانیات سے دلچسپی ہے۔ میں نے انھیں لکھا کہ "جب تک صوتیات کا مطالعہ نہ کیا جائے لسانیات کا علم ناقص رہتا ہے۔ آپ بھی کسی سمر اسکول میں صوتیات کا درس لے لیجیے۔" انھوں نے جواب دیا کہ مجھے لسانیات کے نظریاتی پہلو سے دلچسپی نہیں سماجی پہلو سے دلچسپی ہے۔ اور ان کی حد تک یہ صحیح تھا۔ ترقی اردو بورڈ کی لسانیات کمیٹی کی طرف سے انھیں گریرسن کے لسانیاتی جائزۂ ہند کی ایک جلد کے ترجمے کی ذمے داری سونپی گئی۔ میں سوچا کرتا تھا کہ احتشام صاحب سے کچھ بہتر کام کام لینا چاہیے۔ خیال تھا کہ ان سے عرض کروں گا کہ "جس طرح ہندی میں ڈاکٹر رام بلاس شرما نے بھاشا اور سماج لکھی ہے اسی طرح آپ اردو میں زبان اور سماج لکھ ڈالیے۔" ایم اے لسانیات میں ایک پرچہ زبان اور کلچر کا ہوتا ہے۔ اس کے موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے احتشام صاحب اردو میں ایک کتاب لکھ دیتے تو ایک فکری شاہکار ہوتا۔ بعد میں وہ خود لسانیات کمیٹی کے رکن ہو گئے اور انھیں ایک مزید کتاب ترجمے کے لیے دے دی گئی۔ وہ دو ترجموں کے ساتھ مزید تصنیف کا بار کہاں اٹھا سکتے تھے۔ اس طرح میرا خیال دل ہی میں رہ گیا۔ زبان اور سماج کا موضوع ایسا تھا کہ وہ اسے جس طرح سرسبز کرتے کوئی دوسرا کم کرتا۔

جموں یونیورسٹی میں انھیں دو توسیعی خطبات کے لیے بلایا گیا۔ پروگرام میں کچھ ایسی گڑبڑ ہوئی کہ دونوں خطبات ایک ہی دن رکھنا پڑے۔ پہلا خطبہ انھوں نے دوپہر کو بارہ بجے کے قریب دیا جو زبان کے موضوع پر تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ عام لسانیات کے نصابی مطالعے سے بھی کما حقہ واقف ہیں۔ شام کو دوسرا خطبہ جدید شاعری پر ہوا۔ انھوں نے تحریری مضمون نہیں پڑھا بلکہ یادداشتوں کی مدد سے زبانی تقریر کی۔ جدید شاعری کے خلاف بڑا معرکے کا خطبہ تھا۔ میں نے ان کی جو تقریریں سنی ہیں ان میں یہ بہترین اور سب سے زیادہ پُرمغز تھی۔ تمام سامعین اس سے بہت متاثر ہوئے۔ اس میں ان کی خطابت کی یاد آج تک دلوں کو گرما رہی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ تقریر وکیل استغاثہ کی طرح یک رخی تھی۔ اس تقریر کے سلسلے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ تقریر سے پہلے مجھے رجسٹرار نے بتایا کہ "الہ آباد سے تار آیا ہے کہ احتشام صاحب کے خسر صاحب نہایت علیل ہیں۔ احتشام صاحب کو فوراً لوٹ جانا چاہیے۔ لیکن ہم انھیں ابھی نہیں بتائیں گے۔ تقریر کے بعد بتائیں گے تاکہ خطبہ کی گرم جوشی میں خلل نہ ہو۔" تقریر کے فوراً بعد انھیں بتا دیا گیا۔ چونکہ ریل کے وقت میں بہت دیر تھی، انھیں میں اپنے کمرے میں لے گیا۔ وائس چانسلر اور اردو کے اساتذہ بھی ساتھ تھے۔ وہاں احتشام صاحب نے ہمیں کئی غزلیں سنائیں۔ میں نے خاص بات یہ نوٹ کی کہ ان کے اشعار میں جدید شاعری کے انداز کا واضح اثر دکھائی دے رہا تھا۔ رات کو احتشام صاحب کو موٹر سے پٹھان کوٹ بھیج دیا گیا جہاں سے وہ ریل سے واپس ہوئے۔ ان کے الہ آباد پہنچنے کے فوراً بعد ان کے خسر صاحب انتقال فرما گئے۔

حال میں حکومت ہند نے فروغ اردو کی جو گجرال کمیٹی بنائی ہے اس میں اردو کے صرف دو پروفیسر لیے گئے۔ وہ اور میں۔ اس کمیٹی کی چار ذیلی کمیٹیاں ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ تنہا رکن تھے جنھیں

(بقیہ صفحہ ۶۷ پر)

احتشام حسین —

ایک تاثر • — ظ۔ انصاری

احتشام صاحب،

آپ تو بڑے بے مروت نکلے! یوں، ہر ایک کے ساتھ، دوست دشمن کے ساتھ اتنی مروت دکھایا کرتے تھے، برتاؤ میں بھی، تنقید میں بھی — اور منھ پھیرا تو زمانے کی ناقدری کا ایک ہی لمحے میں منھ توڑ جواب دیدیا۔ آپ نے اس سے پہلے کبھی شکایتِ زمانہ تک نہ کی۔ شکایت بھی برسبیلِ حکایت ہوتی تھی ذرا مسکرا کر! یاد ہے آپنے ایک بار کہا تھا؛

"بھئی میں تو یہ سوچ کر لکھتا ہوں کہ رسالہ پڑھنے والے شروع فہرست میں ہی میرے مضمون کے صفحے گن لیتے ہوں گے۔ اور اندر اتنے ہی ورق الٹ دیتے ہوں گے بغیر پڑھے۔ کہ اسے پھر کبھی دیکھ لیں گے۔

کاش آپ ایک بار اٹھ کر دیکھ لیتے کہ ۲۵، ۳۰ برس میں ہماری غریب الوطن زبان کے کسی اہلِ قلم کا ایسا سوگ نہیں منایا گیا جتنا آپ کا۔ کوئی رسالہ، کوئی جلسہ، کوئی علمی یا ادبی محفل آپکے ذکر سے خالی نہیں ہے احتشام صاحب!

پچھلے سال پروفیسر چیلاشیف اپنے ممدوح سمترانندن پنت سے ملنے الہ آباد بھی گئے تھے۔ جب واپس ماسکو آئے تو میں نے پوچھا "اور کس کس سے ملے؟" کہنے لگے "ایک ہی دن الہ آباد ٹھہرا، لیکن جب شہر میں احتشام حسین جیسا آدمی موجود ہو تو —————— آپ جانیے ادبی جرم ہے ان کے درشن نہ کرنا۔ اس قدر متوازن رائے رکھتے ہیں وہ کہ ان کی رائے سن کر معاملات کی تہہ تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔" پھر آپ کی خوبیوں کا تذکرہ تا دیر رہا اور سوچا جانے لگا کہ کچھ عرصے کے لیے آپ کو زحمت دی جائے۔ اور جب ایکبار آپ ماسکو آجائیں تو بس پکڑ لیں، گھیراؤ کر کے سال دو سال کے لیے روک لیں۔ آپ کو کیا خبر احتشام صاحب، ہندستانی ادبیات کا مطالعہ کرنے والے روسیوں کے دل میں آپ کا کتنا احترام ہے؛ درجنوں مضامین آپکے چراغ سے چراغ جلا کر لکھے گئے ہیں، آپ کا ایک ایک لفظ پڑھا اور سمجھا گیا ہے۔ جان بیمز کے لسانیاتی مطالعے پر جو دیباچہ آپنے لکھا تھا، وہ مستقل تصنیف کا

احتشام صاحب دوران سفر محو مطالعہ

مقام رکھتا ہے۔ حالی پر آپکے مضامین، حالی کے نکتہ چینیوں کے لیے ایک مسکت جواب ہے۔ جا بجا ان کے حوالے دیے جاتے ہیں۔ ہندی میں آپ نے تاریخ ادب اردو تصنیف کی اور ملک کے گوشے گوشے میں وہ کتاب پہنچی۔ غالب پر آپ کا وہ مقالہ، جو میرے اصرار پر ماسکو بھیجا تھا، مستند تصنیف کی معنویت رکھتا ہے۔ اردو ہندی کے مسئلے پر آپ کی مدلل اور کھری تحریریں، تقریریں اہلِ فکر کو سوچنے پر اپنی رائے کی نظرِ ثانی پر مجبور کر دیتی تھیں۔ کونسا ایسا ادبی مسئلہ گزشتہ ۲۰ برس میں اٹھا قابل ذکر ادبی تصنیف ایسی نکلی جس پر آپ نے دستِ نظر، سکونِ قلب، گہرے مطالعے اور منطقی ربط کے ساتھ اپنی مفصل رائے نہ دی ہو۔ آپ ٹال جانے والے آدمی نہ تھے، بس ایک بار، اس بار تو ٹال جاتے!

احتشام صاحب، بظاہر تو آپ خطِ مستقیم کے نقاد تھے۔ ایسے شخص کے لیے سارے مسئلے طے شدہ ہوتے ہیں۔ ہر بات کا دو ٹوک جواب اس کی جیب میں دھرا رہتا ہے، مگر آپ کی سادہ سی شیروانی کے بٹنوں تلے کیا کوئی بڑا خلفشار برپا تھا؟ کیا نتیجوں پر پہنچنے سے آپ بھی پیچ در پیچ، دکھیلان دیکھی، جانی انجانی کشمکش سے دوچار ہوا کرتے تھے؟ ضرور ہوتے ہوں گے۔ آپکے "ایمان کے صراطِ مستقیم" کی راہ میں شکوک کے کتنے گوکھرو بچھے تھے یہ وہی کچھ لوگ جانتے ہیں جو نزدیکان بے بصر میں نہیں بلکہ "دوران بے خبر" میں سے ہیں۔ آپکے خطوط نے مجھے یہ شرف بخشا تھا اور کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جب آپ پہ شک نہ آیا ہو۔

سرور صاحب بیان کرتے تھے کہ ایک دفعہ آپ کا ننھا سا بچہ کھیلتے کھیلتے سامنے آیا تو آپنے پوچھا، کیا بات ہے؟ کیا چاہیے؟ اس نے کہا آبا

جان انجمن ہو رہی ہے۔ مجھے نہیں چاہیے۔ آپ بے اختیار ہنس پڑے کہ دیکھو ننھا سا بچہ۔ اسے بھی الجھن ہوتی ہے، ہونہ ہو، اس نے یہ لفظ مجھی سے سیکھا۔ میں ہر وقت انجمن کا لفظ دہرانے لگا ہوں۔

احتشام صاحب، یہ الجھن بڑی مبارک ہے۔ یہ تفکر سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ وہی تفکر ہے جس کے لیے فرمایا کہ "گھنٹے بھر کی سوچ سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے" جن لوگوں نے کسی دین یا ازم کی عبادت کو ہی نجات کا راستہ سمجھ رکھا ہے، وہ اس الجھن سے پاک رہتے ہیں۔ ان کے لمبے پر سجدوں کا داغ اور بغل میں ایک گھونسہ محفوظ رہتا ہے۔ پیٹ کے ادپر کتاب کا وہ نشان نہیں ہوا کرتا جو آپ کی بنیان کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ نیم دراز ہو کر اگر آدمی پیٹ کی ہڈیوں کے نیچے بھاری کتاب کھول کر گھنٹوں پڑھتا چلا جائے اور چالیس برس اسی پوز میں بسر کرے تو اسے یہ مبینا نہیں نصیب ہوتا یہی نشان امتیاز عطا ہوتا ہے فطرت کی بارگاہ سے۔

احتشام صاحب آپ نے کسب معاش کا جو وسیلہ اختیار کیا اس کے ساتھ ایسا انصاف کر گئے کہ باید و شاید۔ ہمارے حلقے میں تو لوگ اسی پر فخر کرتے مرے جاتے ہیں کہ پیشہ ایک ہے، کام دوسرا کرتے ہیں:

پیشہ ادب کا، محویت فلم کی، پیشہ معلمی کا، کام لیڈری کا، پیشہ صحافت کا، نام ادب میں، پیشہ انکم ٹیکس یا طبابت یونانی، اور ریشہ دوانی شاعری یا تنقید میں، پیشہ وزارت، قدم صحافت و ادب میں، یا یوں ایک سے دوسرے کو غذا پہنچاتے ہیں۔ آپ آدمی بڑے سیدھے سبھاؤ کے تھے۔ بظاہر وہی باطن، جو کام لیا اسی کی عمارت چن ڈالی۔ موٹی موٹی کتابوں سے ہم بے بضاعت لوگوں پر رعب ڈالنے کی نہ کوشش کی، نہ تمنا۔ بہت ہوا تو ایک جامع سا مضمون لکھ دیا۔ جائزہ لے لیا تمام ادبیات کا، ادبی تحریکوں اور تحریروں کا، وہی لکچر، وہی مقالہ۔ ارے آپ نے تو بارہ مجموعے تنقید کے دیے اور لگے ہاتھوں پی، ایچ ڈی تک نہ لیا۔ کتنوں نے آپ کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا اور ڈاکٹریٹ لے کر اٹھے۔ تالیف کی اور ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ لے لیا۔ روس والوں کا نہرو ایوارڈ پایا۔ مگر آپ! ——— زندگی بھر ضرورت مند رہے اور ہمیشہ بانٹ بونٹ کر خوش ہو لیے۔ احتشام صاحب! ہاتھ جھٹک کر مجھے خاموش مت کیجیے۔ میں آپ کی شیروانی کی آستین تھام لوں گا ——— دیکھیے، یہ بھی بھلا کوئی بات ہے!

مجھے سب خبر ہے کہ آپ کیسے قاش قاش ہو کر بٹے ہیں ؎

منم آں میوۂ ارزندہ بہ بستانِ کمال
کہ بدستِ ہمہ بی ذائقہ ارزاں رفتم

ہوتے رہے ہیں ——— پھر بھی آپ نے جتنا اور جیسا اور جس قدر مغز پاشی سے لکھا، اس سے کہیں کم پر یار لوگوں کو "ابھی نندن گرنتھ" (COMMEMORATION VOLUMES) نذر کیے گئے ہیں۔ مالائے مروارید، جیغہ، اور سات پارچے کے خلعت ملے ہیں۔ ذرا دیکھوں تو، کہیں اس اجلے کفن میں کوئی خلعت چھپا رکھا ہو۔ دکھاتے جایئے!

کیا "عیارِ طبعِ خریدار" سے اس قدر بدظن تھے آپ؟

تازیانہ ہے غیرت مندوں کو یہ آپ کی بدظنی اور خاموشی۔ عجب نہیں کہ علمی اور ادبی تمغوں کا راتب (راشن) بانٹنے والوں میں سے کسی کی رگ حمیت زندہ ہو جائے آپ کی اس مرگِ ناگہاں سے۔

احتشام صاحب، آپ نے جس سماجی اور انفرادی تہذیب میں سانس لیا تھا، وہ زندہ درگور ہے۔ آپ نے ان بڑوں کی آنکھیں دیکھی تھیں جو نہ مشرق سے بیزار تھے، نہ مغرب سے حذر کرتے تھے۔ اُن کے ہر نفس کی آمد و شد میں "ہر شب کو سحر کر" کا ورد لگا ہوا تھا۔ ڈی، لٹ کی ڈگری سے جو کچھ آپ کے جوہر قابل نے پایا ہوگا، اس کا اندازہ آپ کے بعد کے مضامین سے ہوتا ہے جو محض اردو، یا فارسی ادبیات کے مطالعے پر تکیہ کر کے نہیں لکھے گئے۔ اُن کے پس پشت نفسیات، فلسفہ، تاریخ، لسانیات اور معاشیات کا وسیع، اور تازہ ترین مطالعہ بھی ہے۔ حق یہ ہے کہ اس کے بغیر محض موزونی طبع اور محدود ورق گردانی کی بدولت، ادبی تنقید پر قلم اٹھانا بار ثبوت اپنے سر لینا ہے۔ اور ڈاکٹر اعجاز حسین کی صحبت، لطیفہ طرازی، خوش گوئی، نکتہ سنجی اور رواداری ——— یہ آپ کے مزاج میں نشست و برخاست میں خوب چھن کر آئی ہے۔ جدلیاتی مادیت اور تاریخی مادیت (HISTORICAL MATERIALISM)

کا فلسفہ اتنی اور صوفی کتابوں میں نہیں پانی کے اس ریلے میں رہا ہوگا جس سے آپ قلب و نظر کا وضو کرتے ہوں گے۔ مغرب کی علمی جستجو نے آپ کو آگاہی اور علمی کاوش بخشی، طلبا کو اٹھانے اور ابھارنے کی نیک خواہش نے آپ کی نیک نفسی کو بردباری اور سمائی کا درس دیا، مشرق کے نہایت ہی مہذب لوگوں سے آپ نے مجلسی آداب پائے۔ اپنے بدنصیب رفیقوں سے محبت کرنا سیکھا، اپنا نا سیکھا، اردو اور فارسی کے کلاسیکی ادب نے طبیعت میں گہرائی، لہجے میں نرمی، بات میں رچاؤ اور کردار میں لوچ بھر دیا۔ یوں آپ لمبے پھندے چلے جا رہے تھے کہ اچانک بار امانت سر سے گرا دیا۔

کچھ خبر ہے احتشام صاحب، یہ بار امانت آپ نے گرایا کس زمین پر؟ اس زمین پر جہاں ایک لاولد قبیلہ بستا ہے۔ خاکم بدہن بالکل لاولد۔ پرانے رئیسوں میں آپ نے لاولد بزرگ دیکھے ہوں گے۔ پورب کے قصبوں میں جنھیں شاہجہاں "شیراز ماست" کہتا تھا کتنے ذی علم، ذی جاہ خاندان ناپید ہو گئے اور ان کے کتب خانے گل کر چکے۔ یہاں تو اردو کے اشراف کا، اور اگر بات تہذیبوں کی نشاندہی ہو سکے تو اردو تہذیب کے وارثوں کا پورا قبیلہ لاولد ہوتا جا رہا ہے۔ بچے باپ سے جس زبان میں بات کرتے ہیں، اس زبان کی تہہ داری سے نا بلد ہیں، رسم خط سے بیگانہ ہیں اور نہیں جانتے کہ "میراث پدر" میں کیا کچھ غارت ہونے والا ہے۔

اب جبکہ ذرہ ظہور زرخیزی کے آثار نظر آرہے تھے تو آپ بھی چل دیے۔ آپ کو تو آتنی پشتینی میراث ملی تھی۔ ذرا ٹھیرتے۔ یہ تو دیکھ لیتے کہ علمی اکادمی میں آپ کی جگہ کس نام سے بھری جاتی ہے، املا اور ہجے درست کرا دیتے بعد والوں کا!

یاد ہے احتشام صاحب؟

آپ نے جب امریکہ سے واپسی پر اپنا سفرنامہ "ساحل اور سمندر" لکھا، ابھی وہ چھپا نہ تھا کہ افتخار حسین نے پڑھنے کو مجھے دے دیا۔ میں نے ایک طنزیہ خط بھیجا، خوب جلی کٹی سنائی کہ صاحب امریکہ جانا کون سا ایسا گناہ ہے کہ سا تھ صفحوں میں اس کی صفائی دی جا رہی ہے؟ کیا مارکسزم کوئی مذہب ہے کہ بس یہی فرقہ نجات پانے والا، باقی جہنمی؟ کون سا ایسا انقلابی کمیونسٹ ہے جسے امریکہ سے علمی سیاحت کا دعوت نامہ آئے، اور وہ منھ پھلا کر بیٹھ رہے یا اپنی نیت کی پاکیزگی کا ثبوت دیتا پھرے؟

مجھے تو حسرت رہ گئی کہ آپ تلخ سا، جلا کٹا جواب دیں۔ آپ ملے تو بس اتنا کہا کہ بھئی اور لوگوں نے، جو مجھے پسند نہیں کرتے، ایک یہی کتاب پسند کی۔

آپ کو غصہ دلانے میں ناکام ہو کر میں خود ہی پچھتایا۔ آپ کی بردباری میں جو پیغمبرانہ شان تھی اس کے آگے ادب سے جھک کر رہ گیا۔ آپ میں جو "شبیت" تھی، وہ ساری کی ساری اس ایک متعلق اور سلوک میں سما گئی تھی جو "بے جا" سے مصالحت بھی نہیں کرتا اور بجا مصلحت سے منھ بھی نہیں موڑتا۔ بعض منھ پھٹ جدیدیوں سے جو مناظرہ آپ نے کیا، اس نے آپ کے سلوک کا یہ پہلو بھی دکھایا۔

احتشام صاحب، آپ تو دیباچہ لکھنے والے تھے روسی شاعری کے منظوم ترجموں پر۔ اب میں یہ شبوں کی محنت کسے بھیجوں؟ کون اس پر آنکھیں ٹپکائے گا؟ اور کیوں ٹپکائے گا؟ اور بہت ایک سے ایک بہتر لکھنے والے پڑے ہیں جن کی شبوں کی دیدہ ریزی اور شمع سوزی مسودوں میں محفوظ ہے، چھپائی کی مشین تک سے نہیں گزری —— یہ بھی ایک الجھن چبھتی ہوگی آپ کو!

آپ جانتے ہیں میں آج کل کیا کر رہا ہوں؟ تقریریں! ان میں صرف مائکروفون اور ایک ہال درکار ہوتا ہے۔ کاغذ، روشنائی، چھپائی، جلد بندی اور پھر تقسیم کا دردِ سر مول نہیں لینا پڑتا۔ آپ بھی تو ہم ایک تقریری سلسلے میں بمبئی بلانے والے تھے، ادھر جانے کے بجائے ادھر آ جاتے۔ جا بجا آپ کے نام کے جلسے ہو رہے ہیں۔ یہاں پڑھنے اور سننے والوں کو تو فرصت مل بھی جاتی ہے لکھنے والے عدیم الفرصت ہیں۔ تو کیا آپ نہیں آئیں گے؟ ایسے سنگ دل؟ ایسے بے مروت!

مصائب اور تھے، پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

ایک جامع ــــ اور متوازن انسان

مرزا جعفر حسین

پروفیسر سید احتشام حسین مالی کی اہلیت، قابلیت، ان کی ہردلعزیزی اور ان کی شخصیت میں بھرپور جاذبیت کو واضح کرنے کے لیے یہ صورت حال ہی کافی ہے کہ دور معاصر میں کسی فنکار، کسی ادیب، کسی شاعر یا کسی نثرنگار کے اٹھ جانے کے بعد اس کا اتنا سوگ نہیں منایا گیا جتنا ان کا غم منایا جا رہا ہے اور غالباً ایک طویل مدت تک اردو ادب کی دنیا اور مرحوم کے اعزا و احباب ان کو بھلا نہیں سکیں گے۔ ان کے علمی اور ادبی کارناموں سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی ان کے کردار کے خصوصیات، ان کے میل ملاپ میں سادگی اور خلوص اور ان کے روابط میں مہر و وفا، یہ سب ان میں ایسے جوہر تھے جن کے گہرے نقوش نہ دلوں سے محو ہو سکتے ہیں اور نہ دماغوں سے مٹائے جا سکتے ہیں۔ ان کے اخلاق، ان کے رکھ رکھاؤ اور ان کے صلح پسند مزاج میں اس بلا کی کشش تھی کہ ہر وہ شخص جو ان سے ملاقی ہوتا ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے اٹھ جانے کا دکھ اس لیے اور روح فرسا ہے کہ انھوں نے اپنی جگہ ایسے وقت میں خالی کی جبکہ وہ خود کمال کی اعلاترین منزلت پر فائز تھے۔ راقم الحروف کے تعلقات جن میں ہماری ملاقاتوں کے حالات ثبت ہیں دوام کی حیثیت رکھتے ہیں اور واقعات کسی نہ کسی شکل میں حافظے کی سطح پر برابر ابھرتے رہتے ہیں۔

میرے عزیزترین دوست مرحوم سید حیدر مہدی ایڈوکیٹ الٰہ آبادی نے ۱۹۳۶ء میں ڈاکٹر اعجاز صاحب کے دولتکدہ پر مجھے ہمراہ لے جا کر احتشام مالی کا تعارف مجھ سے یہ کہہ کر کرایا تھا "ہماری جماعت کے یہ بہت ہونہار طالب علم ہیں، علمی قابلیت بھی ہے، اچھے مقرر بھی ہمارا اور ان کا سیاسی عقیدہ بھی ایک ہی ہے۔ لہٰذا ان کو شریک کار بنا لیجیے"۔ آل انڈیا شیعہ پولٹیکل کانفرنس کا اجلاس عام منعقد ہونے والا تھا اور میں اس کانفرنس کا جنرل سکریٹری تھا۔ میں نے احتشام صاحب کو مدعو کیا اور انھوں نے اس اجلاس میں شرکت کر کے اصل تجویز کی تائید میں ایسی زوردار تقریر کی کہ حاضرین پوری طرح متاثر ہو گئے اور وہ تقریر مدتوں تک یاد رہی۔ ہمارا مسلک وطن پرورانہ تھا۔ فرقہ واریت کے ہم ہمیشہ مخالف رہے۔ احتشام حسین کی تقریر نے اسی وقت یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ فرقہ واریت کے مخالف اور نیشنلزم کے اس وقت بھی پرستار تھے جب عصبیت و تنگ نظری کے طوفان میں ہر خشک و تر بہا چلا جا رہا تھا۔ اس پہلے تجربہ کے بعد ہی وہ ہمارے لیے نعمت غیر مترقبہ بن گئے اور ہمارے درمیان ایسا مستحکم رابطہ قائم ہو گیا کہ زندگی بھر وہ مجھے "بھائی" کی طرح عزیز رہے۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں ملازمت کے بعد اور ایک ہی محلہ میں قیام کی وجہ سے پروفیسر احتشام حسین سے روزانہ ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ جن میں زیادہ تر ادبی باتیں یا سیاسی مباحثے ہوتے تھے۔ قریب قریب ہر موضوع پر اصولاً اتفاق رائے ہونے کے سبب سے ہماری باتوں اور مباحثوں میں بڑی دلچسپی رہتی تھی۔ مرحوم کی زبان سے جو لفظ نکلتا وہ سنجیدہ اور شائستہ ہوتا، اور ان کی جو رائے ہوتی وہ سوچی اور سمجھی ہوتی تھی۔ ان بصیرت افروز مذاکروں یا بعض دوستوں سے، جن کی ابتداءً بہت کم تعداد تھی، ملاقاتوں کے علاوہ ان کا سارا وقت جو یونیورسٹی میں تعلیم دینے سے بچتا تھا، پڑھنے لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ ان کی زندگی میں کوئی تفریحی مشغلہ نہ اس وقت تھا اور نہ بعد میں، کبھی جگہ پا سکا۔ بادش بخیر جب جوش ملیح آبادی کی نشستیں میرے یہاں ہوتی تھیں تو باوجود جوش کے قدردان ہونے کے احتشام صاحب، ان صحبتوں میں شرکت کرنے سے گریز کرتے تھے۔ کبھی کبھی زبردستی بلائے جاتے تو صرف اس مدت تک ٹھہرتے جب تک جوش اپنا کلام سناتے تھے۔

اس کے فی الفور بعد کوئی نہ کوئی عذر کر کے چلے جایا کرتے تھے۔ احتشام صاحب کے تعلقات شہر والوں سے رفتہ رفتہ وسیع ہوئے تو ادیبوں، شاعروں اور بعض مقتدر ہستیوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں جن میں بیشتر صاحبان سے دوستانہ رابطہ بھی قائم ہو گئے۔ لیکن ان سے بھی بے تکلفی رسمی مگر پر خلوص و بے غرض حدود سے آگے نہیں بڑھی۔ ان کے خمیر میں سادگی، پاکیزگی اور خلوص کا بہترین امتزاج تھا جس کے سہارے وہ اپنی زندگی بسر کر لے گئے۔

ان دوستوں میں پروفیسر سید علی عباس مرحوم کو ایک مخصوص قسم کا رابطہ حاصل تھا۔ حسینی صاحب ان کے بہت سے نظریات سے اختلاف رکھتے تھے لیکن پھر بھی بزرگوں کی طرح شفیق اور برابر کے دوستوں کی طرح رفیق تھے۔ احتشام ماہلی کی زندگی کو بے کیف اور بے مزہ دیکھ کر ان کو تکلیف ہوتی تھی اور وہ ان کے روزمرہ میں خانگی ذمہ داری کا اضافہ کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ بالآخر نگرام ضلع لکھنؤ کے ایک پرانے اور مقتدر رہی سادات گھرانے میں ان کی شادی کرا دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس عقد مناکحت کے بعد دوستانہ ملاقاتوں کا طرز دفعتاً بدل گیا تھا۔ بعض لوگ احتشام صاحب سے ملاقات نہ ہونے پر شکایتیں بھی کرنے لگے تھے۔ جوش ملیح آبادی ان کو مزاحاً "اپنی جورو کا خصم میاں احتشام" کہنے لگے تھے۔ لیکن جاننے والے اس وقت بھی جانتے تھے کہ اس خانہ آبادی کو انھوں نے اپنی کتب بینی کے ذوق اور تصنیف تالیف کے شوق کو پورا کرنے کا وسیلہ بنا لیا تھا۔ شادی کے قبل ہر آنے والا بلا مزاحمت اور بغیر کسی تکلیف کے وہ جہاں بھی گھر میں ہوتے ان کے پاس پہنچ جاتا تھا اور جتنا اس کا جی چاہتا ان کے وقت پر تصرف کر لیتا تھا۔ یونیورسٹی جانے کے اوقات کے علاوہ وہ مروت میں کبھی بھی کچھ نہیں کہہ پاتے تھے۔ لیکن شادی کے بعد آنے والے "حجلۂ عروسی" تک نہیں پہنچ سکتے تھے اور احتشام صاحب وہیں بیٹھ کر اپنے پڑھنے لکھنے کے عزیز ترین مشغلے میں پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ آسودگی حاصل کرتے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی لائبریری کتب بینی اور نگارشات کے لیے عین وہی کمرہ تھا جس کو دوسرے ان کا پرائیویٹ روم سمجھتے تھے۔ راقم الحروف آج تک یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ ایسے ٹھکانے بیٹھ کر اور سکون دماغ کے ساتھ کس طرح پڑھتے لکھتے اور غور و فکر کرتے تھے۔ ان میں یہ عادت کچھ اس طرح پڑ گئی تھی کہ آخر وقت تک برقرار رہی۔ میری فرمائش پر جو آخری مضمون انھوں نے انتقال سے کچھ ہی مدت پہلے لکھا تھا وہ بھی بڈروم ہی میں لکھا گیا تھا۔ حالانکہ مردانی نشست میں برابر میں موجود رہا اور اس مضمون کے ابتدائی چند سطور اسی کمرہ میں میری موجودگی میں لکھنا شروع کر دیئے تھے۔ بعد میں اندر چلے گئے اور تھوڑی دیر کے بعد ایک طولانی مقالہ لکھ کر میرے حوالہ کر دیا۔

اردو زبان سے ان کو عشق تھا۔ وہ ادیب تھے اور فن و ادب ان کے لیے سرمایۂ حیات تھے۔ انھوں نے اردو کے نثر و نظم میں جدید طرز کی شاہراہیں نکال کر فن تنقید کو ایک نئی معراج عطا کی تھی۔ حالی نے جس کام کو شروع کیا تھا۔ احتشام ماہلی نے اس کو بہت آگے بھی بڑھایا اور دقیع قدروں کو اس فن میں شامل کر کے تنقید کا معیار بلند سے بلند تر کر دیا۔ آنے والے ناقدان فن ایک مدت تک ان کے نقش قدم پر چلنا سعادت سمجھیں گے۔ اسی طرح انھوں نے طرز تحریر میں بھی ایک ایسا جامع اسلوب اپنایا تھا جس کو ہم انھیں کا طرز تحریر کہنے پر مجبور ہیں۔ ان کی تمنا تھی کہ دوسرے ادیب بھی انھیں کی طرح اپنی کاوش فکر و نظر سے اردو کے مدارج بلند کریں۔ اسی فکر میں کہ اردو کی فلاح و ترقی میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا سارا سکون اور آرام تج دیا تھا۔ ہر مقتدر کمیٹی کے خواہ وہ کسی ریاست میں ہو۔ وہ ایک ممتاز رکن تھے اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں یہ شغف تھا کہ اپنی صحت کا لحاظ کیے بغیر وہ بڑے بڑے لمبے اور پر تکلیف وہ سفر کر ڈالنے میں زحمت نہیں محسوس کرتے تھے۔ یہ کہنا بھی بڑی حد تک صحیح ہوگا کہ اس جفاکشی کے سبب سے جو وقت ابھی نہ آنا تھا، ان کے لیے آ گیا اور وہ ہم سے جدا ہو گئے۔ ایک جلیل القدر ادیب کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس

کی نظر وسیع ہو اور اس کا مذاق و مزاج ہر خوبی کو پرکھ کر اس کو اپنا لے۔ اس معیار سے دیکھیے تو پتہ چلتا ہے کہ احتشام عروس ادب کے پرستار تھے۔ اردو ادب، ہندی ادب، انگریزی ادب اور ہر وہ ادب جس کا ترجمہ اردو ادب انگریزی میں ہوا ان کی نظر کے سامنے تھا اس کے متعلقات ان کے حافظے میں محفوظ تھے۔ قدرت نے ان کو حافظے کی دولت سے مالامال کر دیا تھا اور کسی بات کو بھولنا جانتے ہی نہ تھے۔ روسی ادب کے بھی قدردان تھے۔ اس لیے کہ اس میں رجعت پرستی سے بیزاری اور ترقی پسندی سے رغبت کی خوبیاں ان کو ملتی تھیں۔ اسی ادبی رجحان اور اسی صحیح ادبی ذوق کے صلے میں روس نے بھی بحیثیت مسلم الثبوت ادیب اور فنکار اور ناقد کے ان کی قدردانی کی۔ ان کے تبحر علمی کا حقیقی اندازہ وہ لوگ شاید کم کر سکیں جنھوں نے محض چند تقریروں اور بعض تحریروں سے ان کو جانچا ہے۔ ان کے علم کی گہرائی کا حال صرف وہی لوگ جانتے اور بتا سکتے ہیں جن کو ان سے تبادلہ خیال یا مذاکرات و مباحثات کے مواقع حاصل ہوتے تھے۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ کسی مقتدر اردو یا انگریزی مصنف کا ذکر کر کے جب بھی ان سے کچھ سوال کر لیے گیے۔ تو وہ فی الفور اسکے اہم تصنیفات، اس کے طرز فکر، اس کے اسلوب، غرضیکہ سارے متعلقات بیان کر دیتے تھے۔ ایک ایسے ہی موقع پر ایک مرتبہ بیساختہ میرے منھ سے نکل گیا تھا کہ "آپ ادیب ہیں یا کسی لائبریری کا بولتا ہوا کیٹالاگ" (CATALAGUE)."

احتشام ماہلی کو تحریر اور تقریر دونوں پر پوری قدرت تھی۔ وسعت نظر ایسی تھی کہ مناسبت کے لحاظ سے مضامین، مطالب اور معلومات ان کے سامنے ہر موقع پر اور ہر محل پر حاضر رہتے تھے۔ جن کو وہ اپنی ذہانت اور ذکاوت سے حسین اور دلفریب نقش و نگار سے مرصع کر کے سننے والوں یا پڑھنے والوں کے سامنے پیش کر دیا کرتے تھے ساتھ ہی یہ خیال بھی رکھتے تھے کہ موضوع کی افادیت کو ٹھیس نہ لگنے پائے اور ان کی تحریر موضوع سے علیحدہ نہ ہو۔ یوں تو ان کو بے شمار موضوعوں پر تقریریں کرتے میں نے سنا تھا لیکن دو تقریریں ایسی سنی تھیں جن کی یاد اب تک تازہ ہے۔ قیصر باغ لکھنؤ کی بارہ دری میں بینڈر صد سالہ یادگار حسینی تقریبات کے سلسلے میں بین الاقوامی جلسے ۱۹۴۱ء میں منعقد ہوے تھے۔ ان جلسوں میں ہر مذہب، ہر ملت ہر فرقے اور ہر طبقے کے کسی نہ کسی مقتدر بزرگ یا عالم نے تقریر کی تھی۔ اور ہر تقریر اپنی جگہ پر معرکۃ الآرا تھی۔ اس تحریک کا سکریٹری راقم الحروف تھا۔ میری خواہش پر احتشام صاحب نے بھی تقریر کی۔ مگر ایسا بولے کہ سب کو چپ کر دیا۔ اچھے اچھے مقرر اور قابل سے قابل عالم اور مستند اساتذہ کا مجمع تھا جو ان کی تقریر کو ہمہ تن گوش ہو کر سن رہا تھا اور آپ ہی نے ان کے بلندیِ خیالات جامعیت بیان اور معنویت تقریر کا اعتراف کیا تھا۔ وقت اور حالات کے پیش نظر شہدائے کربلا کے ایثار اور قربانی کی مثالیں پیش کر کے نیشلزم کا ایک ایسا درس سامعین کو دیا جو اپنی آپ مثال تھا۔ اسی قسم کی دوسری تقریر بھی لکھنؤ ہی میں ان کی زبان سے، میں نے سنی تھی۔ لکھنؤ والوں کو مخصوص اصطلاح میں احتشام ماہلی انیسیے تھے۔ وہ انیس کے پرستار تھے اور ان کے مراثی کے بند کے بند حفظ تھے۔ لیکن یوم دبیر کے موقع پر انھوں نے دبیر کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا جو انیس کے کسی پرستار کے لیے ناقابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ فن خطابت کے بیحد دل آویز طرز میں انھوں نے فرمایا کہ دبیر کا انیس سے مقابلہ نہ کیجیے۔ دونوں کے کلام کا ایک دوسرے سے موازنہ نہ فرمایے بلکہ اس کے برعکس دبیر کے کلام کا مطالعہ کر کے ان کے مخصوص فن اور طرز ادا کا جائزہ لیجیے۔ فن خطابت میں ان کی یہ تقریر، ندرت خیال کے اعتبار سے بھی بہترین مثال تھی۔ لیکن ان کی زندگی میں یہ واحد مثال نہیں تھی۔ ان کو خطابت اور تقریر میں بھی اتنا زبردست ملکہ تھا کہ کسی مجمع میں بغیر پہلے سے مطلع کیے جب بھی ان کو کوئی موضوع دیدیا گیا تو وہ برجستہ، بیساختہ اور فی البدیہہ ایسی تقریر کر دیتے تھے جو دوسروں کے لیے تیاری کے بعد بھی آسان نہیں ہوتی تھی۔ انھیں یہ قدرت اس لیے حاصل تھی کہ وہ معلومات کا لامتناہی ذخیرہ رکھتے تھے اس کے صحیح استعمال پر بھی پوری پوری قدرت رکھتے تھے۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں تخمیناً پچیس برس کی ملازمت کے بعد الٰہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر اور پروفیسر مقرر ہوئے تھے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اسی یونیورسٹی کے فیض و مکرمت کی بدولت احتشام صاحب نے شہرت حاصل کی اور مدارج ترقی طے کیے۔ لیکن لکھنؤ والے یہ سمجھنے میں یقیناً حق بجانب ہیں کہ یہ گمان خلاف واقعہ ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ خود انھیں کی ذات گرامی نے اس یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے وقار کو بلند کر دیا تھا۔ کیونکہ وہاں پہنچنے سے قبل ہی ان کی تصنیفات کا بڑا حصہ طبع ہو کر شائع ہو چکا تھا اور ان کی شہرت بحیثیت ایک گراں قدر ادیب کے نہ صرف ہندستان بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی، جن میں خصوصیت کے ساتھ امریکہ کا نام آتا ہے، پھیل چکی تھی۔ بہر حال اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی یہ حقیقت ہے کہ الٰہ آباد جانے کے بعد بھی ان کے دل میں لکھنؤ کی محبت، یہاں کے ماحول سے رغبت اور اسی شہر میں بسنے والے عزیزوں اور دوستوں سے گہری الفت رہی۔ وہ جب بھی یہاں آتے تھے اور یہ آنا بکثرت ہوتا تھا تو خواہ قیام کا وقفہ اقل قلیل ہی کیوں نہ ہو اپنے ہر دوست اور ہر عزیز سے ملاقات ضرور کر لیتے تھے۔ یہ ملاقاتیں، چاہے دو دو منٹ ہی کی کیوں نہ ہوتی ہوں، ان کو بہت عزیز تھیں۔ اگر کسی مجبوری، اتفاق یا قلت وقت کے سبب سے وہ کسی مرتبہ نہ مل پاتے تھے تو دوسرے سفر میں ضرور ملاقات کرتے اور پہلی کمی کو زیادہ وقت دے کر اور معذرت کرتے ہوئے پورا کر دیتے تھے۔ اس طرز عمل میں وضعداری، خلوص اور محسنِ اخلاق کے علاوہ یقیناً شہر لکھنؤ سے موانست کو بھی دخل تھا۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ لکھنؤ ہی میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لیں گے۔ اس لیے اپنی قیام گاہ کے لیے ایک مکان بھی خرید لیا تھا۔ لیکن آدمی کچھ چاہتا ہے اور مشیت کچھ اور کر دکھاتی ہے۔ الٰہ آباد کی سرزمین کو ان کی آخری خوابگاہ بننا تھا اس لیے ان کے اعزا ان کو مرنے کے بعد بھی لکھنؤ نہ لا سکے۔

ہر اچھے آدمی کے مر جانے پر عام طور سے لوگ یہی کہتے ہیں کہ

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

مگر ایسا کہنے والے دریافت کرنے پر اپنے مرنے والے کی خوبیاں کم ہی تعداد میں بتا سکیں گے اور یہی کہنے پر مجبور ہوں گے کہ مرنے کے بعد ہر اٹھ جانے والے کے لیے ایسا ہی کہنا رسم دنیا ہے۔ لیکن ہم تمام رسم و رواج کو بالائے طاق رکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا مرنے والا ایسا تھا جس کے بارے میں یہ کہنا بڑی حد تک صحیح ہے کہ وہ ہمہ تن خوبی تھا۔ اس کی طبیعت، اس کی طینت اس کا کردار، اس کا مزاج، اس کا دوسروں سے رسم و راہ یا اس کے کسی متعلقہ قول و فعل کی نسبت کوئی نکتہ چینی یا غیر جانبدارانہ شکایت نہ کبھی ہوئی اور نہ ایسی کوئی بات کبھی سنی گئی۔ احتشام حسین علم و ادب اور شعور و فن کے بلند ترین مراتب پر فائز ہونے کے علاوہ انسانی کردار کا بھی ایک حسین ترین مجسمہ تھے۔ وہ ایک نیک دل انسان تھے۔ حسن اخلاق کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ مروت و محبت کا عدیم المثال پیکر تھے۔ دشمنوں کے دوست اور دوستوں کے رفیق تھے، ہر بدی سے دور اور ہر نیکی سے قریب تھے۔ ناموافق ماحول میں چال بازیوں سے منزہ اور ریشہ دوانیوں سے مبرا تھے۔ اور مساعد حالات میں بھی نہ نام و نمود کی خواہش ہوئی اور نہ کسی بڑے سے بڑے عہدے کی تمنا۔ ان کے اٹھ جانے کے بعد یہ پتہ چلا کہ ان کو الٰہ آباد یونیورسٹی کی وائس چانسلری کا عہدہ پیش کیا گیا تھا۔ مگر انھوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے موجودہ وائس چانسلر بابو رام سکسینہ صاحب نے حرف بہ حرف صحیح فرمایا ہے کہ: "خاکساری ان کا جوہر تھی۔ اٹھتے، بیٹھتے ملتے جلتے، کسی بھی طریقے میں وہ یہ ظاہر نہیں کرتے تھے کہ وہ اتنے بڑے عالم ہیں۔ ایسے فرشتہ صفت انسان کی موت صرف یونیورسٹی کے لیے نہیں، بلکہ پورے سماج کے لیے ایک بڑا نقصان ہے۔"
آج ان کی روح اپنے مقام مغافرت میں اپنی زبان بے زبانی سے سماج کو مخاطب کر کے بجا طور پر یہ کہہ سکتی ہے کہ ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

★

ڈاکٹر محمد حسن

احتشام صاحب ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کی یادوں کی خوشبو چاروں طرف ہے۔ خاص طور پر ان کے نیاز مندوں اور دوستوں کے لیے جن میں ہر ایک شاید اب بھی یہی سمجھتا ہے کہ احتشام صاحب جتنا اس سے قریب تھے اور کسی سے قریب نہ تھے۔ نیاگرا شور مچاتا ہوا ہزاروں فٹ سے گرتا ہے۔ اس کی موجودگی اس کے شور کے سبب ہے۔ مگر گلاب چپکے چپکے مہکتا ہے اور لوگ صرف اس کی خوشبو سے اسے جان لیتے ہیں۔ احتشام صاحب کی ذات ہر قسم کے شور سے پاک تھی، نمود اور نمائش سے دور، ایک خاموش دردمندی ان کی شخصیت میں تھی جس میں شاید اپنے علاوہ سبھی کے لیے (کم سے کم سب جاننے والوں کے لیے) ہمدردی اور دلسوزی موجود تھی۔ جی ہاں اپنے علاوہ، انھوں نے اپنی ذات کو بالکل مولیوں کی طرح جیسے الگنی پر ڈال دیا تھا۔ میر کے لفظوں میں جیسے وہ زبانِ حال سے کہتے ہوں ع القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم۔ غالب نے تو اپنے خط میں اعتراف کیا ہے کہ اپنے کو غیر تصور کر لیا ہے۔ یہاں اپنے کو معدوم فرض کرنے کی کیفیت تھی۔ اپنے کھانے پینے سے بے پروا، اپنے آرام و راحت سے بے نیاز، اپنی پسند اور ناپسند سے گریزاں حتیٰ کہ اپنی علالت اور علاج سے بے پروا، اپنی شہرت اور نمائش سے متنفر — یہ تھے احتشام صاحب! جنھوں نے زندگی بھر اپنے آپ سے آنکھ نہیں ملائی، جو اپنے وجود سے ہمیشہ کتراتے رہے۔

ان کے اندر بھی ایک نارمل انسان موجود تھا جو جی بھر کر ہنسنا چاہتا تھا، جو زندگی کی نعمتوں سے بہرہ یاب ہونا چاہتا تھا، چاہتا تھا کہ اس کی عظمت کو لوگ مانیں، اس کی شہرت ہو، اس کو اس کا حق ملے، دنیوی عزت

دیپانکر جیشٹھ و در اتک

احتشام صاحب اپنے مطالعہ کے کمرے میں

اور عظمت میں اس کا حصہ دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ہو۔ کبھی کبھی کسی کمزور لمحے میں یہ نارمل انسان ان کے سینے کے کسی گوشے، دل کے کسی کونے سے جھانک لیتا تھا اور سکنڈ کے ہزارویں حصے میں پھر غائب ہو جاتا تھا اسی دل کے کونے میں جس نے آخر میں انھیں دغا دی اور جو اچانک دھڑکتے دھڑکتے بند ہو گیا۔ آخر دل تھا کوئی فولادی خول نہیں تھا کہ ہر قسم کے سرد و گرم کو، ہر قسم کی جانکاہ کشمکشوں کو جھیلتا رہتا اور اس پر خراش تک نہ آتی! بیماری موت کا بہانہ ہوتی ہے اور عالمِ اسباب میں بہانے کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ مگر مجھے کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ یہ نارمل انسان جو دل میں کروٹیں لیتا ہے۔ اس بار اتنا بے قرار ہوا تھا کہ اس نے اپنے قید خانے کے ٹکڑے کر دیے اور فرار ہو گیا!

اس نارمل انسان کی جھلکیاں دیکھنی ہوں تو ساحل اور سمندر میں وہ حصہ پڑھیے جس میں امریکا کی شاہراہوں اور پارکوں میں پیڑوں کے جھنڈ میں، شام کے دھندلکے میں نوجوان مرد اور عورتوں کے بوس و کنار میں مصروف ہونے کا ذکر ہے۔ ساحل اور سمندر کا آخری وہ اعتراف پڑھیے جو شیکسپیئر کے مسخرے کی زبانی کیا گیا ہے یا مجھے اس بالکل نجی خفیہ خط کا وہ جملہ یاد آتا ہے جو احتشام صاحب نے ایک مداح خاتون کو اپنی ایک تصویر کے بارے میں لکھا تھا "آواز (آل انڈیا ریڈیو کا اردو ترجمان) میں میری تصویر چھپی ہے، دیکھی ہوگی، کچھ یوں ہی سی ہے۔" ان چند سطروں میں وہ نارمل انسان رفاقت، محبت اور ستائش کے لیے تڑپتا

نظر آتا تھا۔ مگر احتشام صاحب کبھی اس نارمل انسان کو خاطر میں نہیں لائے، اسے شہزادہ گل فام کی طرح کنویں میں قید کر کے اس کے منھ پر سوا لاکھ من کا پتھر رکھ دیا۔

اس پتھر کا نام تھا تہذیب، مروت، رکھ رکھاؤ جس کے سہارے انھوں نے زہر کے گھونٹ بھی مسکرا کر پیے اور دشمنوں سے بھی اس طرح ملے جیسے ان سے ملنا مسیحا و خضر کی ملاقات سے بہتر ہو۔ میں نے انھیں کبھی غصے میں نہیں دیکھا صرف سنا ہے کہ دو چار بار وہ غصہ ہوئے تھے۔ ایک بار ریڈر کی حیثیت سے لکھنؤ یونیورسٹی میں کسی خوش قسمت طالب علم پر بگڑے تھے، ایک بار انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی دہلی کانفرنس میں اور ایک بار علی گڑھ کے "سے می نار" میں کسی اہل پند کی تقریر پر۔ مگر یہ بھی سنی سنائی ہے۔ اس کا کیا بھروسہ! مجھے ان کی ناراضگی کا یہ منظر دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ تھوڑی بہت خفگی یا سرزنش مجھ پر کبھی ہوئی تو صرف ایک موقع پر جب میں نے ان کے بارود خانہ لکھنؤ والے مکان میں ۱۹۵۸ء میں ایک گاندھی وادی ادیب سے کچھ سخت کلامی کی تھی۔ لطف یہ ہے کہ احتشام صاحب نظریاتی طور پر گاندھی وادی نہ تھے اور جو کچھ میں نے کہا تھا اس سے انھیں اتفاق بھی تھا مگر اس حق پسندی سے ایک دوست کے دل کو ٹھیس لگے یہ انھیں گوارا نہ تھا۔ اسی لیے جب عمیق حنفی کے مضمون کا انھوں نے کھل کر جواب دیا اور جدیدیت کے غلط رجحانات کی کھل کر تنقید کی تو مجھے بہت خوشی ہوئی کہ ریشم میں بھی تلوار کی کاٹ پیدا ہوئی۔

زندگی کی اچھی چیزوں سے انھیں پیار تھا مگر کبھی انھوں نے انھیں حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے اندر کا متشکک انھیں بتاتا تھا کہ یہ سب کچھ ان کے لیے نہیں ہے۔ وہ جو چاہیں گے وہ انھیں نہیں ملے گا کیونکہ ایسی چیزیں تھیں جنھیں انھوں نے چاہا اور وہ انھیں نہیں ملیں (ا اسباب تو بہرحال کچھ نہ کچھ ہوں گے ہی) ان میں وائس چانسلری کی وابستگی بھی شامل تھی اور ملازمت میں ترقی کی خواہش بھی۔ اتفاق سے دونوں خواب ایک ہی زمانے میں (۱۹۶۳ء) میں چکنا چور ہو گئے اور احتشام صاحب بجھے بجھے اداس اداس رہنے لگے ——— دل گرفتہ اور افسردہ جیسے ہر طرف راکھ ہی راکھ ہو اور زندگی سے ساری چنگاریاں چھن گئی ہوں۔

پھر آپ ہی آپ جیسے انھوں نے اس افسردہ ہونے والے نارمل انسان کو ہرا کر دل کے نہاں خانے میں قید کر دیا اور ایک بار پھر سے چونچال ہو گئے۔

مگر وہ نارمل انسان اپنی سب مسکراہٹیں بھول گیا اور اس نے قنوطیت اور تشکیک کا خول پہن لیا۔ انتہا یہ ہے کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ان کو پروفیسر ہونا بھی نصیب نہ ہوا اور الٰہ آباد ہجرت کرنی پڑی۔

جدیدیوں کو شاید کبھی علم نہ ہو کہ جو ان کی "تنہائی پرستی" پر تنقید کر رہا تھا وہ اس دور کا شاید سب سے تنہا انسان تھا جس نے اپنے دل کے کرب و درد کو گیت میں ڈھالنے کی بھی کبھی جسارت نہیں کی، سرگوشی میں اپنے آپ سے بھی کبھی ہمدردی نہیں برتی اور زندگی کا حقیقی بوجھ ایک غیر حقیقی وجود کے کاندھوں پر ڈال کر مسکراتے رہنے کی ناکام کوشش میں ٹوٹ کر رہ گیا۔

ان کی تشکیک اور قنوطیت کے قصے کوئی جمع کرے تو پورا مضمون ہو جائے۔ یہاں اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ انھوں نے ۱۹۴۸ء یا ۱۹۵۰ء میں ہندستانی لسانیات کا خاکہ کے دیباچے میں یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ اگلے پندرہ برس میں اردو ختم ہو جائے گی۔ یا وہ واقعہ جب ۱۹۴۷ء میں 'حلقہ احباب' کے سکریٹری کی حیثیت سے میں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں دہلی کی ایشیائی کانفرنس میں شرکت کرنے والے ایرانی مندوبین کو لکھنؤ آنے کی دعوت دی تھی اور بڑی دوڑ دھوپ کر کے بعد ان کے قیام اور ان کے اعزاز میں جلسے کے انتظامات مکمل کر کے صدر حلقہ احباب یعنی احتشام صاحب کو یہ خوش خبریاں سنانے گیا تھا اور انھوں نے کہا تھا "یہ تو سب ٹھیک ہے مگر جلسے میں حاضرین کہاں سے آئیں گے؟"

وہ مارکس ازم کے قائل تھے۔ لیکن مارکس ازم کی رجائیت انھوں نے نہیں اپنائی تھی۔ اس کی تاب مقاومت اور عسکریت سے بھی وہ کوسوں دور تھے۔ اسی لیے ان کے ہاں عجیب و غریب قسم کا اعتدال تھا۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا تھا کہ ۱۹۳۶ء سے پہلے کے کانگریسی نے کبھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ان کے دل میں کانگریس

سے ایک خاص لگاؤ ہمیشہ موجود تھا۔ لطف تو یہ ہے کہ ان کے معتقدات کا عکس ان کی شخصیت اور ان کی نجی زندگی میں تلاشِ بسیار کے بعد ہی مل سکتا تھا۔ ان کا گھر ہمیشہ عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھرا رہتا تھا، اتنا اور ایسا کہ یہ قیاس کرنا دشوار تھا کہ وہ خود اپنے مکان کے کس گوشے میں رہتے ہوں گے۔ جہاں بھی رہتے ہوں انھیں تنہائی یقیناً نصیب نہ ہوتی ہوگی۔ جب تک لکھنؤ میں رہے ان کی بیٹھک صوفہ سیٹ سے بھی بے نیاز رہی اور اعزا اور اقربا میں بعض اس بیٹھک یا ڈرائنگ روم میں پائے گئے۔ پھر ان کے ہاں غلط قسم کی سعی و سفارش کا گزر نہ تھا۔ وہ دوسروں کی سفارش سن لیتے تھے اور اکثر اس سے متاثر بھی ہو جایا کرتے تھے (مثال میں نہایت ادنیٰ قسم کے شعری اور افسانوی مجموعوں پر ان کے پیش لفظ پیش کیے جا سکتے ہیں جن کے بارے میں وہ خود کہا کرتے تھے "لوگ یہ تو دیکھ لیتے ہیں کہ پیش لفظ میں نے لکھا ہے، یہ نہیں دیکھتے کہ میں نے کیا لکھا ہے۔ پھر ان دیباچوں اور تقریظوں کو میں نے کبھی اپنے تنقیدی مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ اس سے بھی ان کی اہمیت ظاہر ہے۔") لیکن خود انھوں نے کسی کی سفارش شاید ہی کبھی کی ہو۔ خاص طور پر اپنے عزیزوں کے بارے میں وہ اور بھی محتاط تھے۔

محتاط بھی خوب لفظ ہے جو زندگی بھر ان کے ساتھ کھیلتا رہا۔ وہ ہمیشہ کھل کر جینے سے محتاط رہے۔ کہیں کوئی ان پر ہنسنے نہ لگے، کہیں کوئی ان کو ٹوک نہ دے، کہیں ان سے کوئی غیر شائستہ حرکت سرزد نہ ہو۔ وہ صرف نقاد اور شاعر ہی تو نہ تھے، استاد بھی تو تھے۔ بدقسمتی سے ہمارے سماج میں صرف مصنف کی حیثیت سے زندہ رہنا ممکن ہی نہیں اس لیے ہمیشہ مصنف کی آزاد شخصیت کو کسی نہ کسی مضبوط فولادی سانچے میں ڈھلنا ہی پڑتا ہے۔ مگر استاد کی زندگی تو مثالی ہونی ہی چاہیے۔ اسے عام انسان کی کمزوریوں کا کوئی حق نہیں، اسے تو فرشتہ صفت ہونا ہی پڑے گا۔ اس کا جی کیوں چاہے کہ وہ بھی ہوا سے ہنستا قہقہے لگاتا گزرے۔ اسے تو اپنے سنجیدگی کے نقاب کو ایک لمحے کے لیے بھی بھول جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اسی لیے متوازن چال، مدھم آواز میں گفتگو، معتدل رویہ اور معتدل آرا اس کے لیے ضروری

ہیں۔ اسی حلم، تدبر اور اعتدال کی بنا پر ہر شخص ان کی صحبت میں خود کو بے تکلف محسوس کرتا تھا حتیٰ کہ ان کے شاگرد اور مجھ جیسے دبو شاگرد بھی ان کے سامنے بے جھجک اور بے جھپک تھے۔ مجتہدین اور علما اور کٹر قسم کے مسلم لیگی یا اسلام پرست بھی اسی طرح بے تکلف تھے۔ عبدالماجد سے ان کے نہایت اچھے تعلقات تھے۔ ان کے ڈرائنگ روم میں اکثر پرلے درجے کے متعصب مذہبی لوگ بھی نہایت اطمینان سے گفتگو کرتے تھے۔ مجھے تو کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ اعزا، رشتہ داروں، قصبہ ماہل کے ان کے پرانی چال کے دوستوں اور ہم وطنوں میں سے شاید ہی کسی کو شبہ گزرا ہو کہ وہ جس شخص کے مہمان ہیں وہ جاگیرداری کی ان قدروں کا باغی ہے جنھیں وہ سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

انھیں اپنے شاگردوں سے بڑی محبت تھی۔ ان کی ذاتی الجھنوں میں وہ خود شریک ہو جاتے، مشورے دیتے، گفتگو کرتے، بار بار پوچھتے کہ کون کس حال میں ہے، کیا لکھ رہا ہے، کیا پڑھ رہا ہے؟ کیسے دن گزار رہا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اپنے شاگردوں ہی کی نذر کر دیا۔ جو کچھ سیکھا تھا اس کے عشر عشیر کا بھی اظہار نہ ہو پایا۔ مگر جو کچھ ہوا وہ ان کی تحریروں سے زیادہ ان کے کلاس روم لیکچروں میں ہوا۔ وہاں وہ ایک شعر کا مطلب سمجھاتے سمجھاتے دور نکل جاتے اور ایک لمحے کے لیے ایسا لگتا جیسے علم ایک وحدت ہے اور ادب پوری آگہی کا ایک ٹکڑا۔ یہیں سے لوگ مطالعے کا شوق لے کر جاتے، اظہار کی طلب پاتے اور یہیں سے علمی زندگی کا حوصلہ ملتا تھا۔ کلاس ان کے لیے محض وسیلۂ معاش نہیں تھا وسیلۂ اظہار تھا۔ یہاں جیسے ان کی شخصیت اپنے کو بے نقاب کرتی تھی اور ترنگ آہنگ کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا۔ پھر اس کلاس کے ایک ایک فرد کو گویا وہ اپنی شخصیت کا جز جان لیتے تھے، گویا وہ ان کے خاندان کا ایک فرد ہو۔ وہ ادب ہی کی نہیں تہذیب کی بھی جمہوریت کے قائل تھے جہاں ہر ایک کو اپنی رائے اور روش پر قائم رہنے کی آزادی تھی اور اس کے اظہار کی بھی۔

جب کبھی دلی یا لکھنؤ کے بازار سے گزرتے کتابوں کی دکانوں پر ٹھہرتے، دلچسپی کی ہر کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھتے، دو چار کتابیں

خریدتے اور کچھ کے نام پتے نوٹ کرتے۔ گویا کتابیں زندگی سے فرار کی سرنگ تھیں جن کے بغیر آنکھوں کو دن کی روشنی اور اپنی شخصیت کی تمازت ستانے لگتی تھی۔ وہ اچھے مقرر تھے ایسے اچھے کہ تقریر سے مخالفوں کے دل موہ لیں اور دل میں یوں اتر جائیں کہ دماغ کو خبر تک نہ ہو۔ لطف یہ کہ ان کی تقریریں گھن گرج سے عاری ہوتی تھیں۔ ان میں استدلال کی قوت اور بیان کی دل نوازی ہی سب کچھ تھی۔

وہ نقاد تھے نکتہ چیں نہ تھے۔ انھوں نے اکثر اپنی رائے ظاہر کی مگر دل آزاری کے لیے نہیں۔ جہاں کہیں اختلاف بھی ہوا وہاں اسے بہت نرم اور مدھم کرکے بیان کیا۔ وہ نقاد کو غیر جانبدار نہیں جانتے تھے اور تنقیدی محاکمے کو نقاد کا فریضہ مانتے تھے۔ رائے کو بے لاگ اور مدلل طور پر پیش کرنے کی اہمیت کے قائل تھے مگر دل دہی انھیں عزیز تھی، دوستوں ہی کی نہیں دشمنوں کی بھی، ان کی بھی جو ان کی دل آزاری میں ذرا بھی ہچکچاتے نہ تھے۔ ان کا مسلک محض تعلقات پرستی نہ تھا وہ شاید رشید احمد صدیقی صاحب کے الفاظ میں یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ اگر اللہ میاں بھی مقابل ہوں تو ووٹ تو اپنے دوست ہی کو دوں گا لیکن اتنا ضرور ہے کہ اللہ میاں کو ووٹ دیتے وقت بھی اپنے دوست کیا دشمن کی بھی دل آزاری کے مرتکب نہ ہوتے۔ رشید صاحب ہی کا قول ہے "کسی معقول اجنبی سے ملتا تو بے اختیار سوال کرتا علی گڑھ میں بھی پڑھا ہے؟ وہ کہتا نہیں تو افسوس ہوتا، کیسی کمی رہ گئی"۔ بلا تشبیہ عرض کرتا ہوں کہ جس نے احتشام صاحب سے نہیں پڑھا یا ان کے نیازمندوں یا دوستوں کی صف میں شریک نہ ہوا اس پر بھی افسوس لازم ہے، ہائے کیسی کمی رہ گئی!

میرے لیے یہ شرف کم نہیں کہ ان کی خدمت میں ۱۹۴۲ء سے باریاب تھا۔ کوئی ۱۹۶۳ء کے لگ بھگ وہ کچھ سرگراں بھی تھے جس کا اظہار صرف ان کے خطوں کے کم اور مختصر ہونے سے ہوتا تھا۔ احتشام صاحب کئی حضرات سے سرگراں ہی نہیں کبیدہ خاطر بھی تھے جن میں سے کئی ابھی زندہ ہیں۔ مگر ان کی دل کی گرہیں ہمیشہ ریشم کی ڈوری کی طرح لطیف، چھوٹی اور پیچیدہ ہوتی تھیں جن کا علم صرف انھیں کو ہوتا تھا جو ان سے بہت قریب ہوں۔ اس سرگرانی میں بھی کیسی نفاست، کیسی شائستگی تھی کہ دوسروں کی شفقت اور دوستی اس پر قربان کی جا سکتی ہے۔

احتشام صاحب بلیغ خاموشیوں کے انسان تھے، نام کو میلو ڈراما ان کی شخصیت میں شامل نہ تھا۔ ہمدردی اور دل سوزی کے الفاظ بھی اکثر ان کے لبوں پر بے آواز رہ جاتے اور سب کچھ ادا ہو جاتا۔ کیسی ٹھنڈک، کیسی فرحت، کیسی دل نوازی ــــ شعر پرسش ہے اور پاسِ سخن درمیاں نہیں۔ اسی لیے جو لوگ ان کے نیازمند تھے ان کی موجودگی ان کے لیے بڑی ڈھارس کا سبب تھی۔ بقول غالب؎

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

کیسا ہی پیچیدہ مسئلہ ہو، کیسی ہی کٹھن الجھن ہو احتشام صاحب سے مشورہ کر لینے کے بعد جی ہلکا ہو جاتا تھا۔ وہ خود کوئی راہ نہ بتاتے تھے مگر ان کی دل نوازی اور دل سوزی خود ایک مرہم تھی۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۲ء کا زمانہ میرے لیے بڑی پریشانیوں کا تھا۔ میں علی گڑھ میں تھا اور احتشام صاحب سے دور، لیکن جب بھی وہ کبھی آتے ان سے اپنی پریشانیٔ خاطر کہہ کر ایسی آسودگی ملتی جیسے ساری پریشانیاں دور ہو گئیں۔ میں نے لاتعداد ادبی مسائل میں ان سے رجوع کیا، خط لکھے یاددہانی کرائی انھوں نے ان مسائل میں سے کسی کا کوئی حل نہ لکھا۔ لکھا تو صرف اتنا کہ باقی باتوں کا جواب فرصت ملنے پر دوں گا لیکن ان مسائل کو ان کے سامنے رکھنے کے لیے جس وضاحت اور استدلال کی ضرورت پڑی خود اس نے کئی نئے راستے سجھا دیے۔

آخری ملاقات ۱۶ اگست ۱۹۷۲ء کو الہ آباد میں ہوئی تھی۔ لوگ ہر وقت گھیرے ہوئے تھے اور میں چند ساتھیوں کے لیے ان کی توجہ چاہتا تھا۔ آخر سہ پہر کو بمشکل چند منٹ ملے اور میں نے اپنی چند نثری نظموں کی سوغات ان کی خدمت میں پیش کی۔ بہت خوش ہوئے۔ اپنے منجھلے لڑکے جعفر عسکری کو بلایا۔ میں نے دو یا تین نظمیں سنائیں، تعریف کی۔ جعفر عسکری نے مجھ سے کہا کہ آپ شاعری چھوڑ نہ دیجیے گا۔ بڑی شفقت سے بولے "یہ کسی کوچے میں ٹھہرتے کہاں ہیں؟ اس کوچے سے بھی ہو کر گزر جائیں گے"۔ پھر اپنے شعری مجموعے کا مسودہ لائے اور پہلی نظم

(بقیہ صفحہ ... پر)

دانائے راز

ڈاکٹر مسیح الزماں

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

دن اور رات کا سلسلہ طرح طرح کے نقشے مرتب کرتا ہے۔ نئے نئے جال بنتا ہے اور گیر و دار کے ہنگامے کھڑے کرتا ہے۔ ان ہنگاموں میں امرت منتھن کا عمل حیات و مظاہر حیات میں کھرے کھوٹے، بُرے بھلے، سست و تیز، مضمحل و درخشندہ کو زندگی کی موجوں میں ابھارتا، اچھالتا، بہاتا جاتا ہے۔ اچھے اور بُرے کی تشکیل میں ماحول کا بڑا حصہ ہے۔ لیکن سیلاب حیات میں انسان پتھر کا وہ ٹکڑا نہیں جو موجوں کے رحم و کرم پر نکیلے سے گول یا دراز دل اور خطوں سے کوئی نہ کوئی شکل اختیار کرنے پر مجبور ہو۔ ماحول آدمی کو بہا بھی لے جاتا ہے۔ مگر اس کے ریلے کو قدم کی مضبوطی، چٹان کے سہارے یا پیراک کے ضبط و ہوش مندی کا سہارا ساز گار ثابت ہوتا ہے۔ آگ میں پھول کھلانا، خلیل اللہ کے لیے معجزۂ ربّانی ہو سکتا ہے۔ لیکن زندگی کے حقائق کا گہرا شعور رکھنے والے کے لیے گلزار ابراہیمی، عصائے موسیٰ، دم عیسوی ایک ٹھہرے ہوئے جامد ماحول میں نئی زندگی کے سرچشموں کی علامتیں ہیں جو ہر دور میں اہل نظر کے ہاتھ میں شکلیں بدل بدل کر تجربہ، انحراف (جسے بغاوت کے صحت مند معنوں میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے) سے اپنی دنیا آپ پیدا کر کے، اپنے ماحول سے جد و جہد کر کے صرف اپنے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لئے ایک نیا گلستان کھلانا چاہتا ہے۔

پروفیسر احتشام حسین نے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ

فرصت کے لمحوں میں چائنا چیکر کھیلتے ہوئے

اور تعلیم و تربیت کی ابتدائی منزلوں ہی میں تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن، ان کی پرورش و پرداخت کی منزلیں اعظم گڈھ سے الہ آباد انھیں علم کی پیاس لائی اور اس شہر میں آکر اپنے پر اُن کا اعتماد بڑھ گیا۔ اپنی اقتصادی بدحالی کا احساس، اپنے پیچھے فرائض کا بوجھ انھیں سنجیدہ ضرور بنائے رہا لیکن اس سنجیدگی نے شکست خوردگی کی شکل کبھی اختیار نہیں کی، احساس کمتری کا شکار نہیں بنایا، بلکہ عزم و عمل میں مستعد کر دیا۔ اپنی جگہ بنانے، اپنے خیالات ظاہر کرنے، اپنا راستہ نکالنے کی لگن تھی۔ جو پہلے "شیعہ مشن" اور اس قسم کی دوسری انجمنوں میں اصلاح معاشرت اور انسانی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہی۔ مذاکروں اور مباحثوں میں تیغ زبان کے جوہر نمایاں ہونے لگے۔ لیکن یہ وہ تلوار تھی جو راستے نکالتی تھی زخم نہیں لگاتی تھی عقدے حل کرتی تھی زندگیاں ختم نہیں کرتی تھی۔ عقائد اور حقائق میں مصالحت کی صورتیں نکالنے، مسلمات اور عقاید میں امتیاز کرانے میں ان کی کوششیں صرف ہوئیں اور عقلیت کی روشنی میں انھوں نے کہنہ روایات کو دیکھنے اور سمجھنے میں وقت صرف کیا لیکن تعلیم کی طرف سے وہ بے پروا نہیں ہوئے۔ نہ ان چیزوں میں انہماک نے انھیں اپنے نصاب کی طرف سے غافل کیا۔ وہ جانتے تھے کہ نظام تعلیم لاکھ ناقص سہی، ذہنی بالیدگی اور شعور کی پختگی کا راستہ اسی میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ بغاوت کو انھوں نے ہمیشہ اچھا سمجھا۔ لیکن ہر پابندی کو توڑنا، ہر قید سے آزاد ہو کی

ہوشاکر۔ سینٹرہ ۱۸۹ اشک

خواہش کرنا ان کا مسلک نہیں تھا۔

یونیورسٹی پہنچے تو ان کا دائرۂ عمل اور وسیع ہوا۔ محدود حلقے اور اس کے محدود اثرات سے نکل کر انھیں حرکت و عمل کی ایک پھیلی ہوئی دنیا نظر آئی جس میں تنگ نظری کے کانٹوں سے بچ کر انھوں نے علم کی پہنائیوں کا اندازہ کیا۔ سماجی شعور نے بنی آدم کے استحصال کا ایسا منظر ان کے سامنے کر دیا جس میں عمامۂ عبا جبّہ و دستار، محل اور ایوان سب ہی اپنے طبقے اور اپنی ذات کے لیے مساوات کا گلا گھونٹنے لوٹ کھسوٹ میں مصروف تھے۔ اور طرح طرح کی افیون سے لوگوں کو سلانے میں لگے تھے۔ طبقاتی کشمکش، مخصوص اثرات، حاصل کردہ اختیارات VESTED INTERESTS - کی ریشہ دوانیوں پر ان کی نظر گئی اور وہ ادب کو زندگی کا سب سے بڑا مظہر سمجھتے ہوئے اس کے تجزیہ و تفہیم میں لگ گئے۔ غالبًا اس لیے کہ سیاسی جد و جہد لمحاتی حل تلاش کرتی ہے اور اس کے نتائج زود اثر اور تیز ہونے کے باوجود دیرپا نہیں ہوتے۔ حالات میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں ہوتی ہیں اور آج کی تعبیر و تشریح کل کے حالات پر منطبق نہیں ہوتی۔ سیاسی جد و جہد میں عملی حصہ لینے سے پرہیز کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اس میدان میں شدت، سختی اور ایک حد تک ہیجانی عمل کی ضرورت ہے اور احتشام کی سنجیدگی، ٹھہراؤ اور نرم دلی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے انھوں نے سیاست سے دلچسپی صرف نظریاتی سطح تک رکھی اور نظریات کو پھیلانے کے لیے کبھی سیاسی تحریکوں والا راستہ اختیار نہیں کیا۔

اپنے نظریات کی وضاحت اور ان کے پھیلاؤ کے لیے انھوں نے ادب کا زیادہ پائدار اور زیادہ گہرا ذریعہ اختیار کیا۔ وہ جانتے تھے کہ ادب ہی انسانی تہذیب کی اساس ہے۔ ذہنوں پر اثر انداز ہونا، خیالات کے رخ کو موڑنا اسی کا کرشمہ ہے اور زندگی کی تبدیلی اصل میں قدروں کے احساس کی تبدیلی ہے جس میں ادب اور فنون لطیفہ بڑی حد تک اپنا حصہ رکھتے ہیں۔ حسن اور مسرت کی تلاش ادیب کا فریضہ ہے۔ لیکن حسن محض اعضا کا تناسب، رنگوں کا امتزاج، سنگ و خشت یا حرف و صوت کی ہم آہنگی پر منحصر نہیں۔ شمشیر کا عریاں ہونا عید نظارہ بھی ہو سکتا ہے اور ظلم و بربریت کی بدترین مثال بھی۔ حسین سے حسین پیکر اپنی عادتوں اور کردار کی وجہ سے قابل نفرت قرار دیا جا سکتا ہے۔ ذوق جمال کے پس پشت قدروں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف تہذیبوں کا معیار حسن بھی مختلف ہوتا ہے۔ احتشام صاحب کا تصور حسن سطحی نہیں تھا، نہ اس کی پرورش خلاء میں ہوئی تھی۔ وہ زندگی کے مادی تصور کے قائل تھے اور مظاہر حیات کو عالمگیر انسانی دوستی، مساوات اور سماجی انصاف کے پس منظر میں دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب خیر و شر، حق و باطل، ظالم اور مظلوم ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوں تو ادیب کو اپنی کھڑکیاں بند کر کے اپنے وجود کی تلاش میں سرشار نہیں ہونا چاہیے۔ حق کی حمایت اور مظلوم کی کمک میں اس کے لیے ہتھیار لینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کشمکش سے وہ بے پروا بھی نہیں رہ سکتا۔ اپنے کو غیر متعلق رکھ کر وہ اپنے فرض سے پہلو تہی کرے گا۔ استحصال کے فواروں میں اٹھتے ہوئے قہقہوں اور اٹھکیلیوں کو مسرت قرار دینا بھی ایسا ہی غلط رویہ ہے۔

لکھنؤ یونیورسٹی نے ان کی فکر کو جلا بخشی اور شہر کی عام ادبی فضا نے اس نئے مفکر کا استعجاب و مسرت سے استقبال کیا۔ دائرۂ ادبیہ، رسالہ خیابان، رسالہ ادب، پروفیسر سید مسعود حسن رضوی، مرزا محمد عسکری، عبدالباری آسی، اختر علی تلہری، شیخ ممتاز حسین جونپوری، صفی، عزیز، حکیم صاحب عالم اور اسی قسم کے ادیبوں نے جو ادبی ماحول بنا رکھا تھا اس میں احتشام حسین کی آواز نئی اور الگ تھی۔ کوئی ان کے پیچھے میں اعظم گڈھ کے اخراجات پر حرف رکھتا، کوئی ڈھیلے پاجامے اور سائیکل کی سواری کے ذکر سے دلچسپی لیتا۔ لیکن سب ان کے تجزیہ کی صلاحیت، استدلال کے انداز اور اظہار کی قدرت کے قائل تھے اور یہ مانتے تھے کہ وہ سستی شہرت یا گروہ بندی سے بہت دور ہیں۔ علی سردار جعفری لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ سبط حسن،

مجاز، وشواسترماول اور کچھ دنوں کے لیے جوش بھی وہاں رہے ۔ ڈاکٹر علیم، احمد علی، ڈاکٹر ڈی۔ پی۔ مکرجی، ڈاکٹر کالی پرشاد ڈاکٹر رشید جہاں، یہ لکھنؤ کا دوسرا ادبی ماحول تھا جس میں بعد کو آل احمد سرور بھی پہنچ کر شامل ہو گئے۔ احتشام حسین کی آواز اس نئے لکھنؤ کی آواز تھی جو پرانے ادبی ماحول کے تالاب میں ڈھیلے کی طرح پڑ کر دائرے نما لہروں کی طرح اپنا حلقۂ اثر بڑھاتی گئی۔ انجمن سازی یا کسی حلقہ میں مخصوص ہونے کی عادت نہ ہونے کے باوجود وقت کی رو اُن کے ساتھ تھی۔ چنانچہ اس قدیم ماحول میں بھی اس نئی آواز کا احترام ہوا اور ساتھ ہی ساتھ وہ لکھنؤ جو امین آباد اور اس کے ادھر بستا تھا نئے تصورات کی انگڑائیاں لینے لگا۔ یہ تصورات مارکسیت کی تلاش پر ادب کی سماجی حیثیت کا لحاظ رکھتے تھے اور جوش میں انتہا پسندی کے منزلوں پر جا پہنچنے والوں کو احتشام صاحب بریک لگانے کا کام بھی انجام دیتے تھے۔

پڑھنا، پڑھنا، مدام پڑھنا، احتشام صاحب کا مقولہ معلوم ہوتا تھا۔ ادب پر ہو یا معاشیات پر، تاریخ، سیاسیات، نفسیات تعلیم، انگریزی، اردو، ہندی، فارسی، کوئی زبان ہو، کوئی موضوع ہو کتاب ملتی اور وہ پڑھنے میں لگ جاتے۔ کبھی کبھی نوٹ بھی بنا لیتے لیکن زیادہ تر ذہن میں محفوظ رکھتے۔ قوتِ حافظہ اتنی زبردست تھی کہ بیشتر باتیں یاد رکھتے اور جب معاشیات کے لوگوں سے گفتگو کرتے تو اسی کے ماہر نظر آتے۔ جمالیات، فلسفہ، نفسیات، سماجیات، سب پر ان کی گہری نظر تھی۔ ہندی کے ادیبوں میں ہندی دانے معلوم ہوتے اور انگریزی کے ماہرین میں انگریزی ادب کے پروفیسر دکھائی دیتے تھے۔ اور اس تبحر کے باوجود انکسار اور سادگی کا مجسمہ۔ میرے یہاں بیٹھے ہوتے اور میرا چھوٹا بچہ شرارت میں صوفے پر چڑھنے لگتا۔ میں روکتا تو مجھے منع کرتے، کہ اتنے میں شوخی سے وہ پیچھے سے ان کی گردن میں ہاتھ حمائل کر کے ان پر لد جاتا۔ ۔ میں ہائیں ہائیں کرتا جاتا۔ از جمند دوڑ کر اسے الگ کرتیں اور ایک طرح سے ہم لوگ شرمندہ سے ہوتے۔ لیکن وہ مسکرا کر اسے اور چھیڑنے کی کوشش کرتے۔ پھر لطف یہ کہ اس تمام عرصے میں مجھ سے سنجیدہ گفتگو اور بچہ سے چھیڑ کرتے رہتے۔ کبھی بچے کو ڈانٹتے نہ دیتے۔ اپنے بچوں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی رویہ تھا۔ جب الٰہ آباد آئے میں تو بچے بڑے ہو گئے تھے۔ لیکن لکھنؤ میں مجھے یاد ہے کہ کرسی پر بیٹھے مجھ سے باتیں کر رہے ہیں۔ اور اقبال کود کر ان کے کندھوں پر بیٹھ جاتے، کبھی گود میں کود آتے، کبھی میز پر چڑھ جاتے اور وہ ذرا سی روکنے کی کوشش یا گر جانے کا اندیشہ ظاہر کرنے کے بعد پھر گفتگو کا سلسلہ جاری کر دیتے۔

یادوں کے ریلے میں بھٹک گیا ـــــ

احتشام صاحب کا خاندان قدامت پسند خاندان تھا۔ اقتصادی حیثیت سے کمزور، ماحول ان کا قصبہ شہر سے دور ایک پچھڑا ہوا گاؤں تھا۔ قریب ترین شہر اعظم گڑھ بھی مشکل سے شہر کہا جا سکتا تھا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی میں وہ تعلیم حاصل کر رہے تھے تو بھی ان کے کان کی لو میں دُر تھا۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچرر ہونے کے برسوں بعد تک وہ برابر شیروانی اور ڈھیلا پائجامہ پہنا کیے جس پر استری وغیرہ کی کوئی خاص فکر نہیں ہوتی تھی۔ امریکہ کے سفر سے انھوں نے سوٹ پہننا شروع کیا تھا۔ دور و نزدیک کے اعزا برابر ان کے یہاں مقیم رہتے تھے۔ تعلیم حاصل کرتے، علاج کراتے، تفریح کرتے مہمانوں کا جمگھٹ ان کے یہاں برابر نظر آتا۔ ہمیشہ معمولی مکان میں رہے، جس میں گنجائش بہت کم ہوتی تھی۔ اعزا اور مہمانوں کے قیام سے انھیں خود بھی زحمت ہوتی تھی۔ پڑھنے کے لیے الگ جگہ مشکل ہی سے مل پاتی تھی۔ مگر ان کی پیشانی پر اس کی وجہ سے کبھی کوئی شکن نہیں دیکھی گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ کتنے ہی عزیز پڑھ لکھ کر برسرکار ہو گئے اور ان کی قربانی سے ان کا خاندان پھل پھول کر مطمئن زندگی گزارنے کے قابل ہو گیا۔

وضع قطع اور ماحول کی ایک حد تک قدامت پسندی ان کے ذہن کو جکڑ نہیں سکی۔ مذہب اور سماج کے بارے میں ان کا ذہن ہمیشہ صاف رہا۔ اور ایک عام دیہاتی سید گھرانے کی محدود ذہنیت سے وہ اپنے مطالعے، اپنے تجربے اور اپنی نظر سے ایک ترقی پسند

(بقیہ صفحہ ۲۷ پر)

آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے تقریر نشر کرتے ہوئے

ملک زادہ منظور احمد

اب تو یادیں بھی دھندلی پڑ چکی ہیں —

ہم کب کب اور کہاں کہاں ملے تھے، ذہن کے پردے پر صاف اُجاگر نہیں ہو رہا ہے۔ مختلف کانفرنسیں، ادبی اجتماعات اور مشاعرے آپس میں گڈمڈ ہوتے جا رہے ہیں۔ ماہ و سال کی گردش اور صبح و شام کے چکّر نے خیالات کے دریچوں پر چلمنیں ڈال دی ہیں۔ مگر ان چلمنوں کے پیچھے ماضی کی یادیں پرچھائیوں کی شکل میں اُبھر رہی ہیں اور میں مختلف سیاق و سباق میں احتشام صاحب کو دیکھ رہا ہوں اور یہ احساس شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے کہ اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کی موجودہ نسل کی تہذیب و تربیت میں احتشام صاحب کا جس قدر ہاتھ رہا ہے اتنا شاید اُن کے معاصرین میں کسی کا بھی نہیں ہے۔ یہ امتیاز انھیں محض اپنے تبحّرِ علمی کی بنا پر حاصل نہیں ہوا، بلکہ اس میں ان کے علم سے زیادہ اُن انسانی خصوصیات کا دخل رہا ہے جو اُن کے ساتھ دفن ہو گئیں۔ علم و ادب کی دنیا میں تو اُن سے بڑی شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں اور پیدا ہو سکتی ہیں، مگر اُن کے شخصی پہلوؤں کی انفرادیت واقعی ایسی تھی جس کی تلافی مشکل ہی سے مستقبل کر سکے گا۔

میں ان کو بہت پہلے سے اور وہ مجھے سنہ ۵۱-۱۹۵۰ء سے جاننے لگے جب گورکھپور میں پہلی بار انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا اور مجھے اس کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔ مجنوں صاحب اس وقت گورکھپور میں موجود تھے۔ وہ میرے استاد بھی تھے اور ترقی پسند نظریات کے علم بردار بھی۔ مجھے پوری اُمید تھی کہ وہ ہماری سرپرستی کریں گے اور ترقی پسندوں کے جذباتی غلو کے اس دور میں ہماری رہنمائی کے فرائض بھی انجام دیں گے۔ مگر ان کی خود پرستی اور انا نے ان کے گرد ایسا حصار کھینچ دیا تھا کہ عوامی زندگی سے ان کا رابطہ بالکل منقطع ہو گیا تھا اور انھوں نے خود کو تصنیف و تالیف اور درس و تدریس تک محدود کر لیا تھا۔ اس وقت ہم کچی عمروں کے نوجوان تھے، نعرہ بازی، سیاسی ہنگامہ آرائی اور احتجاج ہماری فطرتِ ثانیہ بن چکا تھا۔ اور فحش نگاری کو ہم ترقی پسندی کی علامت سمجھتے تھے۔ مجنوں صاحب اپنے ہی نشے میں بدمست اور اپنے ہی جلوؤں میں سرشار تھے۔ انھیں وہ فرصت و فراغت ہی میسّر نہیں تھی کہ ہماری نشستوں میں آتے اور جب ہم کسی مشورہ کے لیے ان کے گھر جاتے تو وہ اپنی علمی اور ادبی فتوحات کا وہ شاہ نامہ شروع کر دیتے کہ اصل موضوع رکھا رہ جاتا اور ہم ان سے مرعوب ہو کر واپس چلے آتے۔ صحیح رہنمائی نہ ملنے کے باعث گورکھپور کی ادبی تحریک روز بروز جذباتی اور عملی سیاسی سرگرمیوں میں تبدیل ہوتی چلی جا رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اچھا ادب تو ہم تخلیق نہ کر سکے البتہ ہمارے کچھ ساتھی مختلف ہڑتالوں میں حصہ لینے کی وجہ سے جیل ضرور پہنچ گئے۔

اس دوران میں لکھنؤ اور بھیونڈی (بمبئی) میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنسیں ہو چکی تھیں جن میں ہم نے شرکت کی تھی۔ لگ بھگ یہی زمانہ رہا ہوگا جب پہلی بار میرا تعارف احتشام صاحب سے ہوا اور پہلے ہی دن سے ہم نے اپنی ذہنی قیادت کی باگ ڈور

احتشام صاحب کے ہاتھوں میں دے دی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری ادبی تحریک میں شور اور ہنگامے کے بجائے وہی متین سنجیدگی آ گئی جو اُن کی فطرت کا خاصہ تھی۔ اُنھوں نے ہمیں یہ سمجھایا کہ کف در دہاں ہو جانے کا نام ترقی پسندی نہیں ہے، بلکہ ماضی کی صالح روایات کا احترام کرنا، حال کے تقاضوں پر نگاہ رکھنا اور ایک خوش آئند مستقبل کی تعمیر و تشکیل کے لیے فن کے لوازمات کو برتنا صحت مند اور اعلیٰ ادب کا طرۂ امتیاز ہوا کرتا ہے۔ ایک ایسے ذہن کو جو نعرہ سے مرعوب ہو رہا تھا اور سوشلسٹ حقیقت نگاروں کے نام پر میکانکی انقلاب پسندی کو اختیار کر کے، اپنی رومانی اَنا کو آسودہ کر رہا تھا، احتشام صاحب کے تنقیدی نظریات اور سنجیدہ علمی لب و لہجہ نے ٹھہراؤ عطا کیا۔ انھوں نے پہلی بار یہ بتلایا کہ ماضی کو تجربے کا احترام ملنا چاہیے۔ تاریخ محض جاگیردارانہ نظام کی بے راہ روی کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے آئینے میں بھی اُبھرتی، مٹتی، ٹکراتی، ٹوٹتی عوامی آرزوؤں اور طبقاتی کشمکش کو دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف ترقی پسند تحریک سے منسلک ادیبوں اور شاعروں پر اپنے مستقل نقوش چھوڑے بلکہ اپنے ذاتی روابط اور سنجیدہ مطالعے کی بنا پر اردو پڑھنے والوں کی ایک مستقل نسل کو اپنے افکار و خیالات سے متاثر کیا اور اس نسل میں اُن لوگوں کی تعداد کم نہ تھی جو اُن سے نظریاتی اختلاف رکھتے تھے۔ اس تاثر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اُن کی تحریر اور اُن کی زندگی میں وہ چونکا دینے والا لب و لہجہ یا وہ مرعوب کرنے والا طمطراق نہ تھا جو ان کے اکثر معاصر تنقید نگاروں میں پایا جاتا ہے بلکہ اُن کا شریف النفس استدلال شبک خرامی کے ساتھ مخالفین کے دل کو چھوتا ہوا گزر جاتا تھا اور اُن کا متین اور سنجیدہ لب و لہجہ لوگوں کے ذہنوں کو منور کر دیتا تھا۔ جامعات ہند کے اردو اساتذہ کی حالیہ کانفرنس میں سید شبیہ الحسن نے تقریر کرتے ہوئے ایک بڑی ہی اچھی بات کہی تھی کہ ہمارے دَور کی تنقید کا سب سے بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ اس نے کچھ چھوٹے تنقید نگاروں کو جنم دیا جو ہمیشہ بڑی بات کہتے رہے اور کچھ ایسے بڑے تنقید نگاروں کو بھی پیدا ن

چڑھایا جو چھوٹی بات سے آگے نہ بڑھ سکے۔ احتشام صاحب اُن متوازن لوگوں میں سے تھے جو اپنے نظریات اور عقاید پر ایمان و ایقان بھی رکھتے تھے اور بغیر کسی نمائشی انداز بیان کا سہارا لیے ہوئے ان کی تبلیغ و اشاعت بھی آخری لمحے تک کرتے رہے۔ ترقی پسند تحریک کے عالم شباب کا ذکر تو چھوڑیے اس زمانے میں بھی جب ہمارے ادیبوں کی اکثریت اس بات کا تکرار اور تواتر کے ساتھ اعلان کر رہی ہے کہ اب ترقی پسند ادبی دور ختم ہو چکا ہے، احتشام صاحب پختگی کے ساتھ اپنے عقاید کی چٹان پر جمے رہے اور بغیر کسی نفسیاتی اُلجھن، ذہنی شکست اور ہیجان کے اپنے موقف کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیتے رہے۔ وہ تنہا شخص تھے جنھوں نے جدیدیت کے سیل رواں میں ادب کی بلند ترین معاشرتی، روحانی اور اخلاقی قدروں کی وکالت کی۔

احتشام صاحب کے ادبی اور تنقیدی نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر اس خلوص اور شرافت نفس کی داد دیے بغیر ان کا کوئی مخالف بھی (اگر کوئی ہو) نہیں رہ سکتا جس کا مظاہرہ انھوں نے ہمیشہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں کیا۔ وہ اپنے مخاطب کو اپنے خلوص سے پہلے اور بعد میں اپنے تبحر علمی اور منطقی استدلال سے متاثر کرتے تھے۔ گیارہ سال ادبیات انگریزی کا لکچرر رہنے کے بعد میں نے سنہ ۱۹۶۴ء میں جب اردو ادب سے ایم۔ اے کیا تو زبانی امتحان لینے کے لیے احتشام صاحب گورکھپور تشریف لائے۔ اس پورے عرصے میں میرے اور اُن کے روابط کافی بڑھ چکے تھے اور وقتاً فوقتاً خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا جس میں علمی اور ادبی مسائل کے علاوہ نجی اور ذاتی معاملات کو بھی موضوع مراسلت بنایا جاتا تھا۔ رول نمبر کے اعتبار سے جب مجھے ضابطے کے مطابق کئی طلباء کے بعد بلایا گیا تو احتشام صاحب نے سب سے پہلے معذرت کی کہ مجھے انتظار کرنا پڑا، اور پھر بڑی دیر تک میری خیریت اور اعظم گڈھ کے حالات دریافت کرتے رہے۔ میں نے سمجھا کہ شاید انھیں رسمی باتوں کے بعد میری گلو خلاصی ہو جائے گی اور امتحان کے نقطۂ نظر سے مجھ سے سوالات نہیں کیے جائیں گے۔

دیناگرہ جنیہ ۹۹ ۱۵ اشک

میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ میرے روابط کام آئے اور میرے مبلغ علم کو پرکھنے کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا گیا ۔۔ کہ یکایک احتشام صاحب بولے "بھئی ملک زادہ صاحب میں خود بہت دنوں سے چاہتا تھا کہ آپ سے ملاقات ہوتی۔ ہمارے کچھ محترم لکھنے والے امراؤ جان ادا کو محض ایک طوائف کی کہانی سمجھتے ہیں، مگر ہم اس ناول کے متعلق ایک دوسرا نقطۂ نظر رکھتے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم غلطی پر ہوں۔ آخر اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے" ۔۔ اب جو سوالات کا سلسلہ شروع ہوا تو مختلف عنوانات پر بغیر کسی رعایت کے انھوں نے مجھ پر پے در پے بوچھار شروع کر دی اور غالباً جب وہ پوری طرح مطمئن ہو گئے تب جا کے مجھے نجات ملی۔ اسی طرح جب میں نے ڈاکٹریٹ کے لیے اپنا مقالہ سپرد قلم کیا تو انھوں نے اس کے ایک ایک لفظ کو پڑھ کر محاسن اور معائب کی نشان دہی کی اور زبانی گفتگو میں کچھ مفید مشورے بھی دیے۔ ان واقعات کے تحریر کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ احتشام صاحب اگر ایک طرف تعلقات کا لحاظ کرتے تھے تو دوسری طرف اپنی منصبی ذمہ داریوں کو بھی اچھی طرح سمجھتے اور برتتے تھے اور بڑی ہی بے لوث دیانت داری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ تعلقات اور فرائض کی کشمکش سے کامیاب و کامگار نکل آنا اور وہ بھی اس طرح کہ فرض کی ادائیگی بھی ہو جائے اور تعلقات پر بھی آنچ نہ آئے ایک ایسی سعادت ہے جو احتشام صاحب کے حصے میں بدرجۂ اتم آئی تھی۔

احتشام صاحب مغربی ادب پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ مگر خود اُن کے مزاج کا خمیر مشرق کی آنچ سے اٹھا تھا۔ وہی دل وہی دل داری وہی شفقت و مروت، وہی ہمدردی اور محبت جو مشرقی مزاج کا خاصہ ہوا کرتی ہے احتشام صاحب کی شخصیت میں سرایت کر گئی تھی۔ گذشتہ سال ایک مشاعرہ کی صدارت کے لیے وہ مئو ناتھ بھنجن تشریف لائے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں ان کے ہمراہ تھے۔ انتظامی مصروفیات کے باعث بانیان تعدکنا کوئی بھی رضاکار ان کے استقبال کے لیے اسٹیشن نہ جا سکا۔ وہ لیمنڈ میں شرابدار دیاسے تھے۔ ہمارے قیام کا پتہ لگا کر جب وہ آئے تو ایک نوکر نے ایک کیفیت سے پر تق

میں لا کر پانی دیا اور وہ بڑی ہی خندہ پیشانی کے ساتھ اس کو پی گئے۔ میں سوچنے لگا ۔۔ کتنا عظیم ہے یہ شخص۔ دنیاوی عزت و جاہ اور منصب شہرت کے باوجود وہ خود کو ہر ماحول میں ڈھال لیتا ہے اور کبر و تمکنت کا کوئی بھی شائبہ اُس کے دامن عجز و انکسار کو ملوث نہیں کرتا۔ میں نے ان کو ادبی اجتماعات میں دیکھا ہے، وہ اپنے سے چھوٹے اور کم عیار دانش وروں کی تقریروں کو بھی بڑے ہی انہماک اور توجہ سے سنتے تھے۔ گویا وہ ایسے رموز و نکات کا انکشاف کر رہے ہوں جو احتشام صاحب کے مبلغ علم میں اضافے کا سبب بن سکتے ہوں۔ خوردوں کی احترام آمیز حوصلہ افزائی اور بزرگوں کا عقیدت مندانہ احترام ۔۔ یہ دونوں محاسن احتشام صاحب کے ساتھ لازم و ملزوم تھے۔ جیب فلیش لائٹ الہ آباد کا مشاعرہ تھا، صدارت کے فرائض ان کے ذمے اور شعراء کے تعارف و ترتیب کا کام میرے سپرد تھا۔ دوران مشاعرہ میں ایک بار میں نے ان کو بے چین اور مضطرب پایا۔ وجہ میں سمجھ نہ سکا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھے، ڈائس سے نیچے اُترے جہاں مرزا پور کے ایک سن رسیدہ اور معمر شاعر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کو وہاں سے اُٹھا کر اپنے پاس لا کر بٹھلایا اور پھر مطمئن ہو کر مشاعرہ سننے لگے۔ بزرگوں کے ساتھ اتنی عقیدت اور اُن کا اتنا احترام، ترقی پسند دور کو احتشام صاحب کا تحفہ ہے۔ انھوں نے مارکس کے جدلیاتی فلسفے کو اپنایا ضرور تھا مگر ہندستانی تہذیب اور اس کی روایات کا دامن کبھی بھی نہیں چھوڑا۔

احتشام صاحب کی سنجیدگی اور متانت کا تذکرہ بار بار کیا گیا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ ہنسنے اور ہنسانے کے ذوق سے عاری تھے غلط ہوگا۔ جادۂ اعتدال اور نارمل طریق زندگی سے ہٹے ہوئے لوگ اُن کی دل چسپی اور توجہ کا مرکز بنتے تھے۔ وہ ان کی حرکتوں سے لطف اندوز بھی ہوتے تھے اور چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ لطف اٹھا سکیں۔ مگر اُن کے تمسخر اور طنز میں کبھی بھی استہزائی کیفیت پیدا نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے پس پشت ہمدردی کے جذبے کا ایک سیلاب ہوا کرتا تھا۔ جب ان کے اندر کا ظریف انسان

دیشا گو۔ جینت۔ وندا شک

زندگی کے مضحک پہلوؤں کو دیکھ لیتا تھا تو علم و فضل کی تمام تر سنجیدگی بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتی تھی۔ یونی ورسٹی کے ایک استاد کی بے پناہ معصومیت سے ان کو خصوصی طور پر دلچسپی تھی۔ مختلف کمیٹیوں میں شرکت کے لیے وہ جب بھی آتے تو ان کے علمی اور ادبی اکتسابات کا تذکرہ کرتے ہوئے بڑی ہی معصومیت کے ساتھ گفتگو کا رُخ اُن چند دلچسپ واقعات کی طرف موڑ دیتے جو اکثر و بیشتر موصوف سے سرزد ہو جایا کرتے تھے اور مجھ سے پوچھتے "بھئی ملک زادہ صاحب ادھر آپ لوگوں نے ان سے کتنی دعوتیں کھائی" اور جب میں ان کی معصومیت کا کوئی نیا واقعہ سناتا تو خوب ہنستے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اپنا دامن بچاتے ہوئے کہتے "بھئی یہ سب غلط بیانی ہے، وہ بھلا ایسا کر سکتے ہیں۔ آپ لوگ بلاوجہ کی داستانیں گڑھ لیتے ہیں۔" آپ یقین فرمائیں اس فرشتہ صفت معصوم استاد کے ایک ایک واقعہ کو وہ تواتر اور تکرار کے ساتھ مجھ سے بار بار سنتے اور محظوظ ہوتے۔ اور پھر یکایک ان کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف طنز ملیح میں کرتے ہوئے واقعات کی روایت کی ساری ذمہ داری میرے سر پر ڈال دیتے۔" ایک پروفیسر کو مہمان بنانے کا واقعہ"، "شعبۂ اردو کے دروازے کے پردہ کے گم ہو جانے کا قصہ" "طلباء کی عدم موجودگی میں ٹائم ٹیبل کی پابندی اور خالی کلاس میں بیٹھے رہنے کی کہانی" ـــ یہ سارے واقعات جو ان معصوم استاد سے متعلق تھے۔ تمام اساتذہ کی موجودگی میں مجھے اکسا اکسا کر سنتے، لطف لیتے اور جب کبھی وہ صاحب سامنے آجاتے تو ان کی ادبی تخلیقات کی تعریف کرتے اور اُن کی شرافت نفس کی داد دیتے ـــ مگر وہ جس قدر اُن سے محظوظ ہوتے تھے اتنی ہی زیادہ اُن کی ہمدردیاں بھی موصوف کے ساتھ تھیں۔ اور اسی قدر وہ ان کی محنت اور دیانت داری کے معترف و مدّاح بھی تھے۔

موت سے کئی ماہ قبل میری ان کی ملاقات الٰہ آباد میں ہوئی جہاں میں ریڈیو کے مشاعرہ میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ دوران گفتگو میں کسی سفر کا تذکرہ کرنے لگے جس میں ریل گاڑی کا انجن خراب ہو گیا تھا اور کئی گھنٹوں کے بعد درست ہوا، سارے مسافر اُتر کر کھیتوں میں چلے گئے، گنے چوسنے لگے اور گانا بجانا شروع ہو گیا۔ بولے "میں عمر کی ان منزلوں میں ہوں جہاں نہ نوجوانوں کی تفریح میں حصہ لے سکتا تھا اور نہ بڈھوں کی طرح الگ رہ سکتا تھا۔ اسی لیے گاڑی کی تاخیر بہت گراں گذری تھی" ـــ آج وہ جب ہمارے درمیان میں نہیں ہیں، میں ان کے ان جملوں کی معنویت پر غور کر رہا ہوں "۔ ریل گاڑی کی تاخیر گراں گذر رہی تھی۔ کیا معلوم تھا کہ وہ اتنی جلد سفر آخرت پر روانہ ہو جائیں گے۔

★

تزک احتشام ـــ (صفحہ ۴۷ کا بقیہ)

سنائی جسے پیش لفظ کے طور پر لکھا تھا۔ مجموعے کا نام اور شاید اس نظم کا عنوان تھا" آوازیں "مفہوم یہ تھا کہ یہ کس شخص کی نظمیں ہیں یہ جاننا بے کار ہے۔ البتہ بے نام سا کوئی ایسا شخص ہے جو کسی موہوم جستجو میں سرگرداں ہے۔

آخر یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو انھوں نے موت کی کالی ردا اپنے لوپر ڈال لی۔ زندگی کتنی سفاک ہو سکتی ہے! اس کا اندازہ دشوار ہے کہ ایک لمحے کو بھی اس وجود کو سانس لینے کی مہلت نہ دے، ایک ارمان کی بھی تکمیل کی آسودگی نہ پاسکے، خواب دیکھنے کو راحت اور تعبیر کے پیچھے افتاں و خیزاں بھاگنے کی فرصت نہ ملے۔ صدمہ ہے تو اس کا کہ جو ذہنی صلاحیتیں انھیں قدرت سے ملی تھیں ان کا دسواں حصّہ بھی اظہار نہ پاسکا ـــ تنقیدی مضامین اور کتابیں اردو ادب کا بڑا قابل قدر سرمایہ ہیں ـــ ان کے اکثر مقالے کتابوں پر بھاری ہیں۔ مگر احتشام صاحب کے علم و فضل کا یہ ایک محض حقیر سا حصّہ ہیں جن کے ذریعے سے ان کے فضل و کمال کا اندازہ بھی پوری طرح نہیں لگایا جاسکتا۔

ان کی شخصیت پر کوئی لکھے تو کیوں کر، ان کی "نقاب پوش" شخصیت پوری طرح ظاہر ہی کہاں ہوئی! ان کی موت کا صدمہ عظیم ہے لیکن اس صدمہ سے عظیم تر یہ جذبۂ افتخار ہے کہ کبھی ایسا آدمی بھی ہمارے درمیان زندہ تھا!

★

احتشام صاحب

ایک تاثراتی خاکہ

فراق گورکھپوری کی ۸۰ویں سالگرہ کے موقع پر
فراق صاحب کے ساتھ

اکتوبر کے اواخر میں احتشام صاحب ایک دن کے لیے علی گڑھ آئے۔ دن میں مجھ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ شام کو اُن سے ملنے نکلا تو یقین نہ تھا کہ وہ ہیں یا چلے گئے ہیں۔ مجھ سے کسی نے کہا "احتشام صاحب تو اکثر آتے رہتے ہیں۔ اگلی بار ملاقات تو ہو سکتی ہے۔" مگر مجھے اچھا نہ معلوم ہوا کہ احتشام صاحب آئیں اور اُن سے ملاقات بھی نہ ہو۔ میں بڑے لوگوں سے ملنے کے معاملے میں بہت کاہل ہوں۔ دوستوں، ہم عمروں سے ملنے میں خوشی ہوتی ہے، مگر اُن سے جو دنیاوی منصب کے لحاظ سے بڑے سمجھے جاتے ہیں، اچھی خاصی شناسائی اور بے تکلفی بھی ہو تو طبیعت اِبا کرتی ہے۔ احتشام صاحب کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ اُن سے مل کر کبھی ایسا احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ کسی ایسے شخص سے مل رہے ہیں جو منصب، اثر، اختیار اور وجاہت کے لحاظ سے ہم سے بڑا ہے ـــ یہ سب رکھتے ہوئے، وہ اتنے سادہ، ملنسار، خلیق اور محبت والے تھے کہ ہر بار مل کر خوشی ہوتی تھی ـــ میں نسیم قریشی صاحب کے گھر گیا، احتشام صاحب موجود تھے اور محفل جمی ہوئی تھی۔ اساتذہ بھی تھے اور طلبا بھی۔ وہ بھی جن سے احتشام صاحب بے تکلف تھے اور وہ بھی جن سے شاید وہ پہلی بار مل رہے ہوں۔ مگر ہر ایک اُن کے سامنے یکساں طور پر بے تکلف تھا۔ اُن کی موجودگی ہی ہر تکلف اور اجنبیت کے احساس کو دُور کر دیتی تھی۔ سب کے ساتھ ٹہلتے ہوئے وہ اسٹاف کلب آئے۔ راستے بھر چھوٹے بڑے بہت عقیدت و احترام سے ملتے رہے۔ کلب میں اُن کے گرد جاننے والوں کا ہجوم ہو گیا۔ ہر طرح کے مسائل پر بات ہوتی رہی، ادب، فلسفہ، اصطلاحات کا مسئلہ، اردو میں فرنچ، جرمن، روسی اور دوسری یورپی زبانوں کے ادیبوں کے ناموں کے تلفظ کا مسئلہ، مشترک ملنے والوں کے حالات و واقعات، شخصیتوں، جلسوں، اردو کے شعبوں اور شاعروں کے لطیفے ـــ گہرا علمی مسئلہ ہو یا محض فقرے بازی اور لطیفہ گوئی، احتشام صاحب ہر گفتگو میں شریکِ غالب۔ لیکن اُن کی غالب شرکت زیادہ بولنے سے عبارت نہ ہوتی تھی۔ وہ دوسروں کو خوب بولنے کا موقع دیتے تھے، خود عام طور سے چپ رہتے، لیکن ان کی مسکراتی ہوئی روشن آنکھیں، اور سوچتا ہوا شاداب چہرہ بولتا ہوا محسوس ہوتا ـــ کوئی دو گھنٹے بعد یہ نشست برخاست ہوئی۔ ترقی اردو بورڈ (حکومت ہند) کے زیر اہتمام اصطلاحات کا سمینار حیدرآباد میں ہونے والا تھا۔ احتشام صاحب لسانیات کی کمیٹی کے رُکن تھے۔ مجھ سے رخصت ہوتے ہوتے حیدرآباد میں ملنے اور سمینار کے آٹھ دس دن کے دوران تفصیل سے بہت ساری باتیں کرنے کا خیال ظاہر کیا۔

چلتے وقت یہ خیال بھی نہ گزر سکتا تھا کہ احتشام صاحب سے یہ آخری ملاقات ہو گی۔

دسمبر کی پہلی تاریخ، جس روز ہم لوگوں کو حیدرآباد کے سمینار کے لیے روانہ ہونا تھا۔ پہلے تو معلوم ہوا کہ سمینار ملتوی ہو گیا۔ پھر اچانک غیر متوقع طور پر یہ روح فرسا خبر آئی کہ حرکتِ قلب بند ہونے سے احتشام صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اُن کے مرنے کی خبر تو ایک بار ملی مگر اُس خبر کی تردید بار بار ہوتی۔ ریڈیو پر احتشام صاحب کی تقریر نے تصدیق کر دی۔ اُن کی

سکا، شک کی ہوتی آواز نے بار بار تردید کی۔ حیدرآباد گیا تو کئی بار یہ گمان ہوا کہ احتشام صاحب کسی اور مصروفیت کی وجہ سے نہیں آئے ہوں گے۔ الہ آباد گیا تو اس برآمدے نے جہاں اُن کی نشست ہوتی تھی، اُس کمرے نے جہاں وہ رہتے تھے، اُن کتابوں نے جنھیں وہ پڑھتے تھے، اُن لوگوں کی باتوں نے جو اُن سے ملتے تھے، یونی ورسٹی کے چپے چپے نے، شعبۂ اردو میں اُن کے نام کی تختی نے، اُن محفلوں میں جن کی وہ جان ہوا کرتے تھے، اُن مباحثوں میں جہاں اُن کی آواز روشنی کرتی تھی، ہندستانی اکیڈمی کے منعقد کیے ہوئے اُس مذاکرے نے جس کا پورا پلان انھوں نے ہی بنایا تھا، بار بار اُن کے مرنے کی خبر کو جھٹلایا۔ علی گڑھ میں اقبال پر سمینار ہوا، جس میں وہ مدعو تھے۔ سمینار نے اپنے چار روزہ مباحث سے یہی یقین دلایا کہ احتشام صاحب یہیں کہیں ہمارے درمیان موجود ہیں، اگر نہیں ہیں تو آتے ہی ہوں گے ــــ کہیں کوئی ادبی بحث ہو، علمی مسئلہ ہو، کسی نئی کتاب کا تذکرہ ہو، کسی سمینار کا پروگرام بنے، کسی جریدے کے تازہ شمارے کا چرچا ہو، یہی خیال آتا ہے کہ احتشام صاحب کی شرکت کے بغیر گفتگو ادھوری ہے۔ ان کی لکھی ہوئی کتابیں اور مضامین، اُن کی تقریروں کی سنجیدگی اور گہرائی، اپنی غزلوں کو ترنم سے پڑھنے کا اُن کا شائستہ اور معصوم طرز، ہماری آنکھوں اور سامعے سے متقاضی ہیں کہ انھیں مرا ہوا نہ سمجھو، اُن کی زندگی کا انکار کفرانِ بصارت وسماعت ہے۔

وہ لوگ جو علم انسانی کے ورثہ دار اور اپنے عہد کی روح کے امانت دار ہوتے ہیں، مر کر بھی مرا نہیں کرتے۔ اُن کی آواز فضا کی لہروں میں محفوظ، اُن کی تحریر وقت کے سینے پر ثبت اور اُن کے دل کی دھڑکن تغیر وارتقا کے قافلے کی نقیب ہوتی ہے۔ اردو کے ادیبوں میں اس معیار سے بہت کم ادیب اس طرح زندہ رہنے کے اُتنے حق دار ہوں گے جتنے احتشام صاحب ہیں۔

احتشام صاحب الٰہ آباد میں اُردو کے پروفیسر تھے۔ پروفیسری اکثر حضرات کے لیے واقعی اعزاز ہوتی ہے، مگر احتشام صاحب کے لیے کوئی اعزاز نہیں تھی۔ اسی لیے انھوں نے کبھی اس عہدے کے لیے نہ کوشش کی نہ سازش۔ نہ کسی کے در پر جبیں سائی کی نہ کسی پر دباؤ ڈالا۔ اپنی تدریسی زندگی کا بڑا حصہ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی کی لکچررشپ میں قناعت کے رکھ رکھاؤ اور علم کی بے نیازی کے ساتھ گزار دیا۔ اُن سے پہلے اُن سے علم وتجربہ و عمر میں جونیر حضرات کو یہ منصب مل گیا لیکن بے منصبی کی وجہ سے احتشام صاحب کا وقار کبھی کم نہ ہوا۔ اکثر اساتذہ کا وقار اُن کے عہدے سے وابستہ ہوتا ہے مگر احتشام صاحب کا وقار اُن کے علم اور نظر سے تھا۔ انھوں نے لکچررشپ میں وہ اہمیت، عزت، شہرت اور وقار حاصل کیا جو بہتوں کو اونچے سے اونچے منصب کے باوجود نصیب نہیں ہو سکتا۔ ہمارے تعلیمی نظام کی سب سے بڑی خرابی اور بدبختی یہ ہے کہ علم کو عہدے سے تولا جاتا، اور نظر کی قیمت کو تنخواہ سے پرکھا جاتا ہے۔ اسی لیے کم علم اور کم نظر منصب ہی کو مقصدِ زندگی سمجھ لیتے ہیں۔ جو شخص علم کی بے لوث خدمت کرے، ترقی ومنصب سے بے نیاز ہو کر، اُسے عام طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں بلند تعلیمی مناصب بھی اُس وقت تک نہیں ملتے جب تک اُن کے حصول کے لیے طرح طرح کے غیر علمی حربے استعمال نہ کیے جائیں۔ احتشام صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کام سے یونیورسٹیوں کے اس جھوٹے معیارِ علم اور اس مصنوعی بلندی کو جھٹلایا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بھی جن کی نظر میں عہدہ ہی سب کچھ ہے اُن کا احترام کرنے پر مجبور ہوے۔ جب انھیں پروفیسرشپ ملی تو اس منصب سے اُن کا اعزاز تو کیا بڑھتا البتہ یہ منصب صاحبانِ نظر کی نگاہ میں معزز ومحترم ہو گیا اور اس منصب کی گرتی ہوئی ساکھ کو کچھ دن کے لیے سہارا سا مل گیا۔ ادب میں تو احتشام صاحب کی وسعتِ مطالعہ ذوق اور عارفانہ نظر اپنی مثال تھی ہی، ہندستان یونیورسٹیوں کے تعلیمی نظام اور معیار کو بھی ان کی شخصیت نے ایک ایسے معیار سے آشنا کیا، جس پر پورا اُترنا منصب کوشوں کے لیے بھاری پتھر ہے، اور جس کے تقاضوں کی تکمیل اتنی دشوار ہے کہ اُن سے پہلے اور اُن کے بعد بہت کم اس معیار کو چھو سکتے ہیں ــــ استاد کے علم اور علم کی جاہ سے بے نیازی کی یہ مثال انھوں نے جس سادگی،

قلندری اور فقر کی پیمبرانہ صفات کے ساتھ قائم کی وہ صرف اردو کے عالموں اور ادیبوں ہی کے لیے نہیں بلکہ دوسری زبانوں اور دوسرے علوم کے ماہروں کے لیے بھی برسوں قابلِ رشک رہے گی۔

آزادی کے بعد کے برسوں میں کیسے کیسے مثالی مجاہد، انقلابی اور اعلیٰ اصولوں کے علمبردار ترقی کی اندھی خواہش کے ہاتھوں خود کو بیچنے پر مجبور ہوئے جس کی گرہ میں سوت کی انٹی ہی تھی، وہ بھی یوسف اقتدار کے خریداری میں شامل ہو کر اپنے ضمیر کی بولی لگانے لگا جس کے دامن میں قربانی کے خون کا ایک قطرہ ہی تھا، وہ بھی ایثار و قربانی کے دعوؤں و جیبوں سے اپنا رشتہ جوڑنے لگا جس کے ذہن میں علم کی ایک بجھتی ہوئی چنگاری ہی تھی، وہ بھی معبدِ علم کی ابدی آگ پر اپنا حق جتانے لگا۔ جس کی بساط میں فن کا ایک پٹا ہوا مہرہ ہی رہ گیا تھا، وہ بھی بساطِ تخلیق کے شاہ و فرزیں سے آنکھ لڑانے لگا۔ یہ اور ایسے ہی کتنے تماشے عبرت کی آنکھوں کے سامنے دکھلائے گئے۔ مگر احتشام صاحب اپنی گرہ میں علم کے لعل و جواہر لیے اپنے دامن میں بے نفسی و بے غرضی کے دعوؤں و جیبوں سمیٹے، اپنے ذہن میں انسانی اور سماجی علوم کی طور آشنا تجلیاں سنبھالے، اپنی بساطِ تخلیق میں شاہ و فرزیں کی سربلندی پر ہنسنے والی سادگی و پرکاری کی آبرو سجائے اس بیچنے اور خریدنے والی دنیاداری سے الگ ایک یونیورسٹی کے چھوٹے سے تدریسی منصب پر قانع، اپنے گھر کے تنگ و تاریک حجلے میں علم کی روشنیوں کے نگہدار، اور ادب کی دنیا میں متاعِ لوح و قلم کی گہرائی کے امانت دار رہے۔ مناصب اُن کے گھر تک آئے، اقتدار و اختیار نے ان کے دروازے پر دستک دی، تقسیمِ مناصب کی میزان نے اُن کے ہاتھوں کو چوما، مگر وہ ذہن جو دنیائے علم کی وسعتوں سے آشنا، منصب کوشی و تقسیمِ مناصب کی بے وقعتی کا رازداں اور با اقتدار و اختیار کی علم و ادب سے بے خبری کا محرم تھا، دعوتِ نمائشِ علم کے ہنگاموں کا دمساز نہ بنا، اور اپنے کو چراغ راہ گزر بنانے پر آمادہ نہ ہوا۔ وہ ایسا چراغ نہ بن سکے جسے دنیا طلبی کی راہ کے رہبر و رہرو اپنے مقصد کے لیے جہاں تک چاہتے لے جاتے، اور جہاں چاہتے پٹک دیتے، وہ ایسا چراغ بنے رہے جو کٹیا میں جلنے کے باوجود تلاشِ علم کی دشوار گزار منزلوں کے مسافروں کے لیے قبلہ نما بن جاتا ہے۔

احتشام صاحب کے لیے یہ شاعرانہ استعارات و علائم اپنی معنی آفرینی کے سارے امکانات ختم کر دیں تب بھی ان کے کردار کی بلندی، آگہی، بے نیازی، شرافت اور بے نفسی کی حقیقی تصویر کی صرف ایک جھلک ہی دکھا سکتے ہیں — اتنی سادہ شخصیت میں رنگ بھرنے کے لیے بڑے بڑے مصوّر کا موئے قلم عاجز ہو سکتا ہے۔ رنگوں کی تصویر اُتارنا آسان ہے۔ اس بے رنگ سادگی کا مرقع کھینچنا ناممکن جس میں تمام ممکنہ رنگ جذب ہو کر سادگی کی شان اختیار کر لیتے ہیں۔ اس سادگی کے رنگوں کو دیکھنے کے لیے وجود کے تجربے کی آنکھ کے علاوہ نہ کسی دوسرے کی آنکھ بینائی کا کام دے سکتی ہے، نہ کسی اور کی دی ہوئی روشنی، اس کی چمک دمک زرق برق سے محروم جلوہ سامانیوں کو سمجھنے کے لیے وسیلہ بن سکتی ہے۔

اپنے عہد کے قحط الرجال میں عہد آشوب تو بہت لکھے جا سکتے ہیں، مگر قصیدہ لکھنے کے لیے ممدوح کو تلاش کرنا بہت دشوار ہے مجھے بارہا خیال ہوا کہ اگر آج کے انسان کی شرافت اور بڑائی کا قصیدہ لکھنا ہو تو احتشام صاحب ایسے کسی سادہ انسان ہی کو نمونہ بنایا جا سکتا ہے، ان کی اچانک موت نے اس خیال پر مہرِ توثیق ثبت کی۔ وہ نظروں سے دُور ہو کر دل سے جتنے قریب محسوس ہونے لگے، اُتنی ہی اُن کی بڑائی اور بلندی بھی منکشف ہوتی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اُن کا مرثیہ یا نوحہ نہیں لکھ سکا۔ نوحہ مرثیہ اُس کا لکھا جاتا ہے جس کے لیے یہ یقین ہو جائے کہ اب وہ ہم میں نہیں رہا — جو اب بھی ہمیں ہر لمحہ اپنے درمیان موجود محسوس ہو، اُسے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش تو کی جا سکتی ہے، اُس کی تعزیت کرنا قلم و زبان کا زیاں ہے۔

• • •

میں اپنی کتاب جہد کے اوراق اُلٹتا ہوں تو سب سے پہلے جس صفحہ پر احتشام صاحب کا عکس نظر آتا ہے وہ [illegible]

کے ... ایک خزاں آلودہ دن ہے، مگر اس ایک عکس نے آج کے بہاروں کے اوراق سے زیادہ تابندہ و پائندہ بنا دیا ہے۔

حیدرآباد میں ایک کل ہند کانفرنس ہوئی تھی۔ اردو کے کچھ سربرآوردہ شعراء، ادبا اور ناقدین و قائدین ملک کے مختلف حصوں سے شرکت کے لیے آئے تھے۔ میرا طالب علمی کا زمانہ تھا، اس عمر میں دور سے نظر آنے والا ہر شخص دیو قامت نظر آتا ہے۔ اکثر عمائدین نے ہم ایسے نو واردان بساطِ علم و ادب سے دوری کو ہی اپنی بلند قامتی کا بھرم رکھنا مناسب سمجھا۔ صرف ایک احتشام صاحب ایسے تھے، جو اتنے قریب آ گئے کہ وقتی طور پر ان کی بڑائی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور وہ اپنے ایسے ہی عام انسان نظر آنے لگے۔ ہمارے بڑوں میں کتنے ایسے افراد ہیں جو اس انسانی سطح پر آکر بھی چھوٹے نظر نہ آئیں؟ یہ کہنا تو شاید چھوٹا منہ بڑی بات ہو کہ ایسا ایک بھی نہیں، مگر اتنا کہنا تو گناہ نہیں ہوگا کہ ایسے بہت کم ہیں، اور احتشام صاحب ایسوں میں سب سے نمایاں تھے۔

دوسرے حضرات تو بڑے لوگوں کے اونچے ایوانوں یا اونچے دام والے شاہانہ ہوٹلوں میں مقیم ہوئے مگر احتشام صاحب ایک اوسط سے ہوٹل کے ایک بہت عام سے کمرے میں ٹھہرے۔ اسی لیے اُن سے ملنا بھی ہمارے لیے آسان تھا۔ دوسروں سے ملنے کے لیے اتنی بلندی پر جانا پڑتا کہ راستے ہی میں سانس پھول جاتی اور اُن کے حضور پہونچ کر اپنی اُلجھی ہوئی سانسوں پر قابو پانے ہی سے اتنی فرصت نہ ملتی کہ ایک نظر ہی انھیں برابر کی سطح سے دیکھ لیتے۔ جو بلندی کی چڑھائی ہو یا اونچے داموں کی سیڑھیاں طالبِ علم کی پیادہ پائی وہاں تک پہنچنے کا خیال بھی نہ کر سکتی تھی پھر ہمارے دامن میں تھا ہی کیا۔ چند ناپختہ نظموں غزلوں کے کچھ شوخ بے رنگ پھول، کچھ بکھرے ہوئے پتے اور علم کے سمندر کے کنارے سے چنے ہوئے کچھ سنگریزے اور ایک دو صدف۔ اس مفلس کی پونجی کو کون پوچھتا۔ احتشام صاحب کی علم آموز نظر نے انھیں دیکھا، ٹٹولا، تولا، پرکھا اور ہمت افزائی کے کلمات سے اُن کی قیمت ہماری نظر میں بڑھا دی۔ احتشام صاحب اردو کے پہلے

مستند اور معتبر ناقد ہیں جنھوں نے اُسی زمانے میں میرا نام اردو کے قابل ذکر نظم نگاروں کی فہرست میں شامل کرنے کی جرأت مندانہ غلطی کی تھی۔ اس فہرست میں میرے ساتھ ہی کچھ اور بھی نئے نام پرانے مشہور ناموں کے پہلو بہ پہلو انھوں نے رکھ دیے تھے۔ اس وقت مجھے یہ یاد نہیں کہ اُن کا یہ مضمون اس پہلی ملاقات سے قبل شائع ہوا تھا یا اس کے فوراً بعد آیا۔ بہر حال وہ تین دن اُن کی قربت میں گزرے۔ ان ہی کے ساتھ اردو کے بزرگ افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ سہیل صاحب اُس وقت نئی نسل کے لکھنے والوں کے ساتھ خصوصی شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے، اسی لیے ہم لوگوں سے وہ پہلی ملاقات ہی میں کافی بے تکلف ہو گئے تھے۔ ایک روز مجھے سہیل صاحب کے ساتھ اُن کے کچھ پرانے ملنے والوں کے گھروں تک رہنمائی کے لیے جانا تھا۔ صبح جب میں ہوٹل پہنچا تو وہ احتشام صاحب کے کمرے میں بیٹھے ملے۔ وہاں ایک خاتون پہلے سے اپنے رشحاتِ قلم کی اتھاہ دولت کے ساتھ موجود تھیں۔ گفتگو سے اندازہ ہوا کہ دونوں حضرات کئی گھنٹے سے اُن کے قلم کی جولانیوں کی داد دے رہے تھے۔ سہیل صاحب نے میری آمد کو لمحۂ غنیمت جان کر اُن سے اجازت لی۔ اُس وقت احتشام صاحب نے ہم لوگوں کو جس بے بسی اور بے کسی سے دیکھا، وہ آج تک یاد ہے۔ ہم لوگ "سپردم بہ تو مایۂ خویش را" کہہ کر، اللہ کے حفظ و امان میں انھیں دے کر روانہ ہو گئے۔ سہیل صاحب کے ملاقاتیوں کا سلسلہ طویل اور اسی کے ساتھ پرسشِ حال کی حکایت لذیذ اور طویل تر ہوتی ہے، اس مہم سے ہم لوگ شام کو چاق و چوبند، ایک دو جگہ دعوتیں کھا کر سیر و سیراب ہوٹل پہنچے تو احتشام صاحب کو اسی کمرے میں اُسی کرسی پر، انھیں ادیبہ کے سامنے ناطقے کی طرح سر بہ گریباں بیٹھا پایا۔ احتشام صاحب کے اضمحلال کا راز اُس وقت کھلا جب قریب جاکر دیکھا کہ رشحاتِ فکر کا پشتہ کلام خواں کے سامنے کھلا ہوا تھا اور ابھی آدھا دفتر ناخواندہ تھا۔ سہیل صاحب نے کسی خوش اسلوب حیلے سے انھیں دوسرے دن کے وعدے پر رخصت کیا تو

وشاکھا پٹنم ۱۹۸۰ء تک

احتشام صاحب نے اپنے دن کے زیان کی داستان سنائی اور کوئی ایسی ترکیب پوچھی کہ دوسرے روز سورج نکلنے سے پہلے وہ کمرے سے کہیں دور بھاگ جائیں ۔۔ یہ تو پتہ نہیں کہ دوسرے دن انھیں پائے رفتن اور گوشۂ عافیت میسر آیا یا نہیں لیکن برسوں بعد بھی میں نے انھیں اس طرح کے حوصلہ مندوں کے سامنے کئی بار شکستہ اور دل شکستہ دیکھا ۔۔ ایک بار علی گڑھ میں ایک صاحب علم کے جویا، رموزِ ادب کے متلاشی، دن بھر اُن کے ساتھ لگے رہے، رات گئے جب وہ رخصت ہوئے اور دوسرے دن صبح پھر حاضر ہونے کا وعدہ کر گئے تو احتشام صاحب نے بڑی معصومیت سے پوچھا کہ "بے چارے بہت ہمدرد اور ملنسار آدمی ہیں ۔۔ ان کا نام کیا ہے؟" ۔۔ خبر نہیں زندگی میں ان کا کتنا وقت ایسے حضرات کی نذر ہوا ہوگا، مگر اُن کی خندہ پیشانی نے کسی کو شاید ہی کبھی یہ احساس ہونے دیا ہو کہ وہ بارِ خاطر ہو رہا ہے۔

ایک بار میری طالب علمی کے زمانے میں ایک شاعر صاحب اپنا زندگی بھر کا سرمایۂ کلام اُٹھائے ہاسٹل میں میرے کمرے پہ آ گئے ۔۔ ڈیڑھ دو گھنٹے ان کا کلام سننے کے بعد جب تابِ مقاومت نہ رہی تو میں نے اپنے کمرے کی چابیاں اُن کی خدمت میں پیش کیں اور عرض کیا کہ آپ تو کئی دن تک، اپنا کلام ختم کیے بغیر یہاں سے رخصت ہونے والے نہیں، میں ہی کوئی اور ٹھکانا تلاش کرتا ہوں۔ فرصت کے اوقات میں آ کر آپ کا بقیہ کلام سن لیا کروں گا۔ میں نے احتشام صاحب کو اپنا یہ واقعہ سنایا تو مسکرا کر کہا۔ "آپ تو اپنے ہم عمروں کے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں، میں ایسا کروں تو ان کی دل شکنی ہوگی۔"

نئے لکھنے والوں اور طلبا کے ساتھ اُن کی یہ فراخدلی اور تحمل ہمیشہ برقرار رہا۔ اسی لیے وہ طلبا بھی جو ریسرچ اسکالر بھی ہوا کرتے، پروفیسران سے کچھ پوچھتے ہوئے گھبراتے ہیں، بلا تکلف انھیں اپنی تحقیق و تعلیم میں مشیر بنا لیتے اور وہ حتی الامکان ان کی پوری پوری مدد کرتے۔ اُن کے خطوط کا پابندی سے جواب دیتے اور ان کی روزمرہ کی زندگی کے مسائل سے بھی قریب ترین بزرگوں کی طرح دل چسپی لیتے۔ وہ جب علی گڑھ آتے ہر اُس طالب علم کی فرداً فرداً خیریت پوچھتے جو اُن سے کبھی ملا ہو۔ کئی بار یہ ہوا کہ وہ کسی طالب علم سے ملنے بے تکلف ہاسٹل چلے گئے۔ ایک بار تو وہ ایک لڑکے کے لیے اُس کے کسی بزرگ کی دی ہوئی سوغات، جو دیہاتی انداز کی گٹھری کی شکل میں تھی، خود اُٹھائے ہوئے اُس کے کمرے پر چلے گئے لیکن تحفے کی محبوبیت کی وجہ سے کسی اور کے ذریعے اُسے بھیجنا شاید اس لیے مناسب نہ سمجھا کہ کسی طالب علم کو بھی غریبانہ کی یہ عجیب الوضع زنبیل اُٹھانے میں تکلف ہوتا۔ وہ چھوٹوں کے پاس جس بے تکلفی سے چلے جاتے تھے، بڑوں کے گھر بھی اُسی بے نیازی سے جاتے۔ اُن کے دل میں نہ چھوٹوں کی چھوٹائی کا احساس تھا نہ بڑوں کی بڑائی کا امتیاز۔ کپڑے سادہ، لباس میں بے پروائی، وضع قطع میں بے نیازی، رفتار گفتار میں ذرّوں کا دل نہ توڑنے اور آفتابوں کو گرد سمجھنے والی شانِ استغنا۔ علم کا کوئی دقیق نکتہ ہو تو اُن کی زبان موجیں مارتا ہوا سمندر، کوئی کچھ سنائے تو ان کی آنکھیں سب کچھ سمیٹ لینے کے باوجود ٹھہرا ہوا دریا، اختلاف کا موقع آئے تو اُن کا انداز دو ٹوک مگر متوازن اور مدلل اور تحسین و تائید کا مقام آئے تو ان کی ہر ہر ادا ابرِ سخا کی طرح ہمت افزا۔ یہ تھے احتشام صاحب۔ پہلی ملاقات میں جو نقش قائم ہوا وہ آخری ملاقات تک گہرا ہی ہوتا گیا۔ اور اب جبکہ ملاقاتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا کچھ اور بھی دل نشین ہوتا جا رہا ہے۔

حیدرآباد میں اور ایک دوبار کانفرنسوں کے موقع پر سرسری صاحب سلامت ہوئی۔ اکثر بڑے لوگ اپنے سے چھوٹوں کو بار با تفصیل سے ملنے کے باوجود بھول جاتے ہیں۔ احتشام صاحب ایک بار کی سرسری ملاقات کے بعد بھی یاد رکھتے تھے یا کم از کم ملنے والے کو یہ احساس نہ ہونے دیتے تھے کہ وہ اسے بھول گئے ہیں ۔۔ عام طور سے لوگ اپنے حافظے کی قوت کو بڑی باتوں اور بڑے لوگوں ہی کے لیے کام میں لاتے ہیں، احتشام صاحب چھوٹی باتوں اور چھوٹے لوگوں کے لئے بھی اپنے حافظے میں جگہ نکال لیتے تھے، شاید

اسی لیے اُن کے حافظے میں بہت بڑی بڑی باتوں کے لیے بھی بہت گنجائش تھی۔

احتشام صاحب سے میری دوسری ملاقات جون ۱۹۶۱ء میں اُن کے گھر پر لکھنؤ میں ہوئی۔ مجھے علی گڑھ آئے چند ماہ ہوئے تھے۔ پہلی گرمائی چھٹیاں گزارنے کے لیے اپنے آبائی وطن نصیرآباد (جائس) جاتے ہوئے دو تین دن کے لیے میں لکھنؤ میں رُکا تھا۔ شہر لکھنؤ میرے لیے آبا کی وابستگی کے باوجود اُس وقت بھی اجنبی تھا، اب بھی ہے۔ اس وقت یہ اجنبیت اس لیے زیادہ تھی کہ لکھنؤ میں میرے جاننے والے گنتی کے دو تین افراد ہوں گے، وہ بھی سرسری شناسا یا غائبانہ متعارف۔ احتشام صاحب سے ملے برسوں ہو چکے تھے۔ شارب ردولوی احمد جمال پاشا منظر ایک دو دوستوں کے ساتھ میں اُن کے گھر گیا۔ سیدھا سادا غریبانہ مکان۔ برآمدے میں معمولی پُرانی کرسیوں کی نشست، حبس اور گرمیوں کا موسم، شام کا وقت۔ یہ محض حسنِ اتفاق تھا کہ اس روز احتشام صاحب امین آباد تشریف نہیں لے گئے تھے۔ بہت تپاک سے ملے۔ مجھے یہ احساس تھا کہ حیدرآباد کی ملاقات کو وہ بھول چکے ہوں گے کیونکہ پتہ نہیں ہر سفر میں ہر شہر میں اُن سے کتنے ہی نئے لکھنے والے اور طلبا ملتے ہیں، کس کس کو کوئی یاد رکھ سکتا ہے۔ مگر گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ احتشام صاحب نے اُس ملاقات کو یاد رکھا ہو یا نہ رکھا ہو، مجھے میری شاعری اور نثری تحریروں کے توسط سے یاد رکھا ہے "صبا" کی ادارت کے ساتھ ترقی پسند نظریے کی انتہاپسندی اور یک طرفہ پن کے خلاف میری بغاوت اور قلمی جہاد کو زیادہ مدت نہ گزری تھی۔ احتشام صاحب نے حیدرآباد کے ایک ادبی جلسے میں نئے لکھنے والوں کے غصے کو ہمدردی سے سمجھنے کو ضروری قرار دیا تھا، مگر وہ کھلی ہوئی بغاوت سے خوش نہ تھے۔ اُنھوں نے بہت نرمی سے مجھے اُن تحریروں کی شدت کا احساس دلایا جو ادبی مناظرے میں میرے قلم سے نکلی تھیں۔ لکھنؤ کے ادیب میرے لیے ایک شعری نشست کرنا چاہتے تھے، یہ مسئلہ احتشام صاحب کے سامنے پیش کیا گیا تو فوراً انھوں نے دوسرے روز اپنے گھر پر نشست کی دعوت دے دی۔ نشست میں انھوں نے بہت غور سے میری کئی نظمیں سنیں۔ ترقی پسندی کے بندھے ٹکے انداز سے انحراف کر کے نظمیں لکھنے کا یہ ابتدائی دور تھا۔ انھوں نے دبے لفظوں میں صرف اتنا کہا کہ "آپ نے اپنا رنگ بدل کیوں لیا ہے؟" بعد کے برسوں میں احتشام صاحب نے اس نئے رنگ کو بھی ایک حد تک قبول کر لیا، مگر اُس وقت وہ اس سے کچھ خوش نہ تھے — ایک معنی میں اُس وقت میں اُن کے مخالف کیمپ میں تھا۔ ترقی پسند ناقدوں کی انتہاپسندی کے ضمن میں ایک دو جملے کبھی اُن کے خلاف بھی لکھ دیے تھے — لیکن احتشام صاحب نے شاید اسے یاد رکھنا فضول سمجھا ہو۔ نگاہِ نقد میں یہ نرمی اور معصومی بڑی مشکل سے آتی ہے کہ لکھنے والے کی اچھائیاں تو یاد رکھی جائیں اور ستم آرائی کو بھلا دیا جائے۔

۱۹۶۴ء، ۱۹۶۵ء کے بعد جدید تر لکھنے والوں سے احتشام صاحب کا ادبی مناظرہ بھی ہوا، جس میں تلخیاں بھی پیدا ہوئیں، مگر اختلافِ مسلک کے باوجود وہ نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی، قدرشناسی اور شخصی سطح پر ان سے ملنے جلنے اور ان کے مسائل کے حل میں ہمیشہ گہری دلچسپی لیتے رہے — ادب سے یہ بےلوث شغف سچے ادبی ذوق کا ثبوت ہے کہ اپنے مخالفوں کے ذوقِ ادب اور شوقِ فضول کی بھی قدر کی جائے — ادب خصوصاً اردو سے انھیں اتنا عشق تھا کہ جسے بھی وہ اس عشق میں شریک دیکھتے، خواہ وہ لاکھ دشمنِ جاں ہو، اس کی بُرائی بھی انھیں اچھی دکھائی دینے لگتی تھی۔ پُرانی نسل کے بزرگوں میں نہ تو کسی میں ادب کے مارکسی اور ترقی پسند نظریے سے یہ راسخ والی وابستگی ہے، اور نہ ہی کسی میں اس شدت کے باوجود اتنی فراخدلی ہے کہ وہ متخالف اور متقاطع ادبی میلانات اور دھاروں کو بھی دلجمعی اور توجہ کے ساتھ پڑھنے اور سمجھنے کی ویسی فراخ حوصلہ کوشش کرے جیسی احتشام صاحب نے کی۔

احتشام صاحب سے میری ملاقاتوں کی تعداد مختصر ہے اور ان سے شخصی قربت کا افسانہ مختصر تر — وہ ہر سال دو تین بار علی گڑھ آتے۔ اکثر اردو ڈپارٹمنٹ کی میٹنگوں یا سیمیناروں میں

رگا ہے گا ہے کسی اور سلسلے سے۔ وہ کبھی میرے گھر نہیں آئے نہ کبھی ان سے خلوت میں میری ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ جب ملے جلوں میں، جلسے، مباحثے، مشاعرے یا دوستوں کے ہجوم میں۔ ایک معنی میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شخصی سطح پہ مجھے کبھی اُن کی قربت میسر ہی نہیں آئی۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ انھیں مجھ سے اور مجھے ان سے مخصوص تعلق خاطر تھا۔ وہ محفل میں بھی یوں ملتے رہتے جیسے محفل میں موجود ہر ہر فرد سے خصوصیت کے ساتھ مِل رہے ہوں۔ یہی اُن کی شخصیت کی مقناطیسی طلسم کا راز تھا کہ ایک دو بار ملنے والا بھی خود کو ان سے قریب محسوس کرنے لگتا تھا۔ جن سے انھیں دلی تعلق ہوتا، ان سے کم بات کرنے کے باوجود وہ اُن کا غیاب میں بھی ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ ان کے انتقال کے کئی ماہ بعد مارچ میں مجھے الٰہ آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ ہندستانی اکیڈمی نے شاعری کی زبان کے مسئلے پر ایک ملا جلا ہندی اردو کا مذاکرہ کیا۔ سنا اس کی ساری اسکیم احتشام صاحب کی مرتب کی ہوئی تھی۔ میں پہلی بار الٰہ آباد گیا۔ الٰہ آباد میں میرے والد نے تعلیم حاصل کی تھی، وہاں میرے بہت سے قریبی اعزا رہتے تھے، لیکن ان وابستگیوں کے باوجود اس شہر سے مجھے حقیقی دل چسپی احتشام صاحب کی ذات کی بنا پر تھی۔ ان کی زندگی میں مجھے کبھی وہاں جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ میری آمد کی خبر پاکر احتشام صاحب کے صاحبزادوں محمد میاں (جعفر عباس) اور عون (جعفر عسکری) نے مجھے اپنے گھر ٹھہرنے کی دعوت دی۔ اسٹیشن سے یہ دونوں مجھے اپنے گھر لے گئے۔ وہ برآمدہ دیکھا جہاں احتشام صاحب کی لاش آخری دیدار کے لیے رکھی گئی تھی اور جہاں ان کی نشست رہا کرتی تھی۔ اُس کمرے میں گیا، جو اُن کی خواب گاہ بھی تھی اور مطالعہ خانہ بھی۔ احتشام صاحب کی غیر موجودگی میں اُن کے گھر میں قیام میرے لیے ایک نفسیاتی آزمائش ہوتا، اگر وہ بچے اس طرح یہاں مجھے اپنے گھر نہ لے جاتے۔ احتشام صاحب کی نسبت سے اُن کا گھر اُن کے عزیز میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ اور احتشام صاحب کے خلوص کا اندازہ اس طرح ہوا کہ میں بھی اُن کے گھر کا ایک عزیز سمجھا گیا۔ الٰہ آباد میں بیسیوں ایسے حضرات سے ملاقات ہوئی جو احتشام صاحب کے وسیلے سے مجھ سے غائبانہ متعارف تھے اور متعارف بھی ایسے گویا مجھے برسوں سے جانتے ہوں۔ اس خوشگوار تجربے سے مجھے اندازہ ہوا کہ احتشام صاحب کی ذات کے توسط سے الٰہ آباد کے ادبی علمی حلقوں میں اردو کا ہر قابلِ ذکر ادیب یا شاعر اچھی طرح جانا پہچانا جاتا تھا۔ اُن کی شخصیت وہ جامِ جم تھی جس میں الٰہ آباد والے اردو کے ہر ادیب کی جھلک اور ہر ادبی واقعے کا عکس دیکھ لیتے تھے۔

الٰہ آباد میں احتشام صاحب کی مرکزیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اُن کی موت پر نہ صرف یونی ورسٹی بلکہ شہر کے سارے تعلیمی ادارے، دفاتر اور بازار تک بند ہو گئے۔ میں نے ان کے تعزیتی جلسے کا ریکارڈ سنا تو معلوم ہوا کہ وہ اردو میں جتنے محبوب تھے ہندی میں بھی اتنے ہی محبوب تھے۔ فراق نے ہندی کے بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کے مجمع میں کہا کہ احتشام ہندی اتنی جانتے تھے کہ وہ ہندی کے بڑے سے بڑے پنڈت اور ودوان کو ہندی پڑھا سکتے تھے۔ اوپندر ناتھ اشک نے اپنی مشکلوں کی عقدہ کشائی کے حوالے سے احتشام صاحب کی غیر معمولی ہندی دانی کا ثبوت پیش کیا۔ یونیورسٹی کے اربابِ اختیار کی تقریروں سے معلوم ہوا کہ وہ یونی ورسٹی کے ہر مشکل مسئلے کے حل کرنے میں سب سے زیادہ مستند اور معتبر مانے جاتے تھے۔ یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے لیے اُن کا نام تجویز ہو رہا تھا، مگر انھوں نے یہ کہہ کر کہ "میرا راستہ یہ نہیں"، "وہ میرا ہے"، خود کو منصب کوشی کے اس جھمیلے سے آزاد رکھا۔

احتشام صاحب یونیورسٹی کے لیے کیا تھے، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اُن کی موت کی خبر سنتے ہی وائس چانسلر، رجسٹرار اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس نے پہلا کام یہ کیا کہ اُن کے بڑے بیٹے جعفر عباس کا اردو کی لکچررشپ پر تقرر کیا۔ احتشام صاحب برسوں سے اساتذہ کے تقررات میں صاحبِ اختیار حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے بیٹے نے اردو سے درجۂ اول میں ایم اے کیا۔ لیکن نہ تو کسی کو یہ ضرورت محسوس ہوا کہ احتشام صاحب کے بیٹے

کسی کا حق ملے، نہ احتشام صاحب نے کبھی اپنے بیٹے کے لیے کسی سے سفارش کی۔ اُردو کے صاحب اثر ادیبوں میں مجھے کم ہی شخصیتیں ایسی نظر آئیں جنھوں نے اپنے وسیع حلقۂ اثر کے باوجود اپنے گھر والوں کے لیے کچھ نہیں کیا۔ ایک مخدوم تھے، جو اس طرح کے ذکر پر بھی خفا ہو جاتے تھے، اور دوسرے احتشام صاحب کہ اُن کا بیٹا ایم۔ اے کرکے بےروزگار رہا، دلّی میں چھوٹے موٹے کام کرتا رہا، مگر انھوں نے اس کے لیے نہ کسی سے کہا، نہ کچھ کیا۔ اُن کی اس بےنفسی کا حق الٰہ آباد یونی ورسٹی نے بھی ایک حد تک ادا کرنے کی کوشش کی۔ بڑے آدمیوں کے بیٹوں اور عزیزوں کے لیے ان کے عہد اختیار اور زندگی میں تو کوشش کرنے والے بہت نکل آتے ہیں، کیونکہ یہ لین دین کا کاروبار ہوتا ہے، مگر مرنے کے بعد اُن کا خیال کرنے والے کم ہی ہوتے ہیں۔ احتشام صاحب کی شخصیت کا افسوں ایسا تھا کہ غیروں کو بھی اُن کی موت کے بعد اُن کے گھر کا خیال رہا۔ جو زندگی بھر اپنے لیے نہ کسی سے کچھ مانگے، نہ کوئی امید کرے، اُس کی ذمہ داری سب کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ مگر یہ احساس کتنوں کو ہوتا ہے؟

احتشام صاحب بڑے کنبہ پرور آدمی تھے۔ ہمیشہ اُن کا گھر دور و نزدیک کے عزیزوں کی پناہ گاہ، تعلیم گاہ، اور علاج گاہ رہا۔ ہمارے عہدِ ترقی میں کنبہ پروری کے معنی بدل گئے ہیں۔ اس وقت کنبہ پروری کی جو شکل عام ہے وہ یہ کہ لوگ اپنے اثر اور حکومت یا اداروں کے وسائل سے اپنے کنبے والوں کو جائز ناجائز غلط صحیح ہر طرح کا فائدہ مستحقوں کی حق تلفی کرکے پہنچاتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ایسے حضرات جن کی کمی نہیں، عام طور پر کنبہ پرور کے تحسین آمیز خطاب سے خیر کے ساتھ یاد کیے جاتے ہیں۔ احتشام صاحب پرانی وضع کے کنبہ پرور تھے۔ وہ اپنی محدود آمدنی سے اپنے غریب ضرورت مند، بیمار عزیزوں کی مدد کرتے تھے۔ اُن کی اپنی ضرورتیں محدود تھیں اور شوق نہ ہونے کے برابر۔ وہ اپنے اوپر تکلیف اٹھاکر دوسروں کی ضرورتیں اور شوق پورا کرتے تھے۔ وہ چاہتے تو جدید انداز کے کنبہ پرور بن سکتے تھے، مگر اُن کی ترقی پسندی کا نظریات اور سماج کی ترقی کی خواہش سے عبارت تھی، اپنی اور اپنے خاندان کی معاشی اور سماجی ترقی کی کوشش کے مترادف نہ تھی۔ اُن کی عظمت اس میں ہے کہ ادب اور سماجی علوم میں اُنھوں نے جن اعلیٰ اقدار اور اُصولوں کو ڈھونڈا، انھیں اپنی زندگی میں بھی برتا۔ ہمارے معاشرے میں ایسے غازیانِ گفتار تو بہت ہیں جن کی زبانیں اعلیٰ قدروں، مثالی تصورات اور بلند اصولوں کے ذکر سے روشن رہتی ہیں، مگر عمل ہر گام پیمان کی تکذیب کرتا ہے، احتشام صاحب کے ایسے شہیدِ کردار کم یاب ہیں جو اپنے عمل کو اپنے قول، اپنی زندگی کو اپنے اصول، اور اپنی سیرت کو اپنی تحریر کا آئینہ بنا کر دکھا سکیں۔

احتشام صاحب کی شخصیت کو میں نے جتنا دیکھا اور سمجھا اُس کے لحاظ سے یہ واقعات اور باتیں "شنیدہ" ہونے کے باوجود "دیدہ" کا درجہ رکھتی ہیں۔ ایک تو ان واقعات کے عینی شاہد اس تعداد میں اور ایسے معتبر ہیں کہ اُن کی تردید ممکن نہیں، دوسرے احتشام صاحب کی زندگی کو دور سے دیکھنے والا بھی اُن کی بےنفسی درویشی، بلند حوصلگی، بےنیازی اور شرافت کردار کی خوشبو سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

احتشام صاحب نے غربت اور تنگ دستی میں تعلیم حاصل کی۔ میں نے اُن کی پہلی کتاب کا انتساب، اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں پڑھا تو میرے سامنے ایسا غریب طالب علم آیا جو میٹرک میں اپنی فرسٹ کامیابی پر باپ سے سائیکل پانے کا متمنی تھا۔ وہ غریب طالب علم زندگی بھر کثیر العیال اور کنبہ پرور رہا۔ یونیورسٹی کا پروفیسر یوں بھی سرمایہ دار نہیں ہوتا، احتشام صاحب تو ہمیشہ مالی لحاظ سے غریب ہی رہے۔ اُن کی یہ غربت اُن کے قلب کی امارت اور اُن کی یہ بےمائیگی سلطنتِ فقر میں اُن کی شاہی کی دلیل تھی۔ احتشام صاحب نے غربت سے جبیں سائی نہیں غیرت سیکھی، اپنی ناکامیوں سے غصہ اور مردم بیزاری نہیں، بلکہ دردمندی اور انسانی دوستی کا سبق سیکھا۔ اس طرح انھوں نے اپنے ماحول کے لیے غریبی میں امیری اور ناکامی میں کامیابی کی ایک روشن مثال

چھوڑی ہے۔

احتشام صاحب کی بظاہر سادہ شخصیت حقیقتاً بہت تہ دار اور کثیر الابعاد تھی۔ اردو کے تو وہ عہد ساز ناقد اور ادیب تھے ہی۔ ہندی اور انگریزی ادب کے بھی عالم ہی نہیں عارف تھے۔ سماجیات، معاشیات، تاریخ، فلسفہ، نفسیات اور فنونِ لطیفہ پر اُن کی گہری نظر تھی۔ مارکسزم اور مارکسی نظریۂ تاریخ و ادب کا اُن سے بڑا شارح اردو میں کوئی اور نہیں۔ اپنی اس وسعت مطالعہ کے ساتھ وہ جس محفل میں ہوں، جس موضوع پر بات کریں، چھا جاتے تھے۔ اُن کی تقریر کا انداز سنبھلا ہوا، دھیما، مگر پُر اثر ہوتا تھا۔ انگریزی بھی اُردو ہی کی طرح روانی اور قدرت کے ساتھ بولتے اور لکھتے تھے۔ فارسی ادب پر انھیں اتنا عبور تھا کہ فارسی کے طلبا اپنے اساتذہ کو چھوڑ کر اُن سے کسب فیض کرتے تھے۔ وہ صحیح معنی میں عالم تھے اور دانشوری ان کا اوڑھنا بچھونا تھیں۔ لیکن انھوں نے اپنے آپ کو کتابوں کی دنیا کا قیدی نہیں بنایا، زندگی سے ان کا رشتہ بہت گہرا اور زمینی تھا۔ انھیں قریب سے جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ لکھنے پڑھنے کا کام راہبانہ عزلت اور تعشقانہ سکون و متانت کی فضا کے بجائے بچوں کے شور و شغب، ضد اور ناز برداری کی فضا میں رہ کر کرتے تھے۔ وہ گھریلو آدمی تھے، انھوں نے کبھی اپنے آپ کو علم کی آسمانی بلندیوں اور متانت کی خلا کا باسی نہیں بنایا۔ اس کے باوجود انھوں نے مختلف موضوعات پر جتنا اور جس معیار کا لکھا ہے، اُن کے ہم عصروں میں کم نے اتنا لکھا ہوگا۔ علم و ادب کی دنیا میں سانس لیتے، کتابوں کی روح کو جذب کرتے اور اتنے علوم پر یکساں قدرت رکھنے کے باوجود اُن میں موجود نمائش، نخوت و تعلّی تکبر نام کو نہ تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ کوئی ایسا مسئلہ چھڑا، یا کسی ایسے موضوع پر بات نکل آئی، جو اُن کے لیے تھوڑا سا اجنبی ہو تو وہ طالب علمانہ شوق اور عالمانہ تجسس کے ساتھ اپنے مخاطب کی بات سنتے اور سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک سیمینار میں میں نے اردو ناول پر جدیدیت کے اثرات پر ایک مقالہ پڑھا۔ بہت سے ایسے حضرات، جو وجودیت سے محض سماجی اور سطحی واقفیت رکھتے تھے اور زیرِ بحث ناول (آگ کا دریا) سے ناآشنائے محض تھے۔ خوب خوب بولے۔ احتشام صاحب ان سب سے زیادہ اس موضوع پر بولنے کا حق رکھتے تھے مگر وہ صرف سنتے رہے۔ چائے کے وقفے میں اور اجلاس کے خاتمے کے بعد وہ گھنٹوں وجودیت کے متعلق اور میرے مقالے کے بعض پہلوؤں کے بارے میں اپنے شکوک کا اظہار کرتے رہے۔ وجودیت سے ہمارے بہت سے ناقدین و ادیب محض اس لیے للّٰہی بغض رکھتے ہیں کہ وہ اسے بھی جدیدیت کی کوئی بدعت سمجھتے ہیں۔ احتشام صاحب کا رویّہ ان سے مختلف تھا۔ اردو کے ایک سربرآوردہ ناقد نے جدیدیت کو وجودیت کے مترادف قرار دے کر وجودیت کو اپنی ایک مختصر اور سرسری تحریر میں، بغیر اسے جانے اور سمجھے ہوئے مطعون و معتوب قرار دیا تھا۔ میں نے احتشام صاحب کے سامنے اس بات میں اُن صاحب کی جہالت کا ذکر کیا تو احتشام صاحب کے چہرے پر وہ کیفیت پیدا ہوئی، جو اپنے دل کی بات دوسرے کی زبانی سے سن کر پیدا ہوتی ہے۔ فرمایا "مجھے تیس برس سے یہ گمان ہے کہ ہر موضوع پر اُن کی واقفیت اتنی ہی سرسری اور سطحی ہے۔" کہنے لگے "آپ ان کی تنقیدوں کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ کیوں نہیں لیتے؟" میں نے عرض کیا "احتشام صاحب! مجھے تو یہ احساس ابھی ہوا ہے، آپ کو جب تیس برس سے یہ احساس ہے تو آپ ہی یہ جائزہ لے لیجیے۔" قہقہہ مار کر ہنسے اور کہا "جب میں تیس برس خاموشی سے اُن کی تحریروں کو جھیلتا رہا تو اب کیا لکھوں۔"

احتشام صاحب عموماً تلخ بحثوں اور ادبی مناظروں سے بچتے تھے۔ ان کی اس کمزوری سے لوگ فائدہ اٹھاتے تھے۔ ان کی مروّت کسی کی دل آزاری گوارا نہ کرتی تھی۔ اُن کی اس مروّت کا استحصال کر کے کمزور سے کمزور شاعر اور ادیب بھی اُن سے اپنی کتاب تعریفی پیش لفظ اور آرا لکھوا لیتے تھے۔ ایک زمانے میں اپنی اس تنقیدی مروّت کی وجہ سے بدنام بھی ہوئے۔ اُن کی اس انتہائی شریفانہ کمزوری کا ایک رُخ یہ بھی تھا کہ وہ جدید ادب و شعر پر تو عمومی اور نظریاتی نوعیت کی سخت تنقید لکھ دیتے تھے، مگر شاعروں اور ادیبوں کے انفرادی ذکر میں ہمیشہ تعریف ہی کا پہلو نکال لیتے

تھے۔ آخر زمانے میں جدیدیت کے بعض منفی میلانات کی بنا پر وہ اس سے خاصے برگشتہ خاطر تھے۔ اور انھوں نے کچھ مضامین میں اس شدت اور تلخی کا بھی اظہار کیا جو ان کے تنقیدی مزاج کے توازن سے ہم آہنگ نہ تھی۔ لیکن وہ پڑھتے سب کچھ تھے اور ادب میں تجربے اور جدید میلانات کو اختلاف کے باوجود قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور شخصی سطح پر ہر ایک سے محبت و شفقت کا برتاؤ کرتے۔

احتشام صاحب کی ذہنی زندگی اور بیداری کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ کانفرنسوں اور مذاکروں کے موقع پر نوجوانوں اور نسبتاً نئے لکھنے والوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے تھے۔ دوسرے جغادری پروفیسروں اور نام نہاد بزرگوں کی طرح انھوں نے خود کو اولمپیا بلندی کی فصیل کا اسیر کبھی نہیں بنایا۔ گورکھپور میں فراق پر ایک سمینار ہوا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، شمیم حنفی، اور میں ان کے بعد وہاں پہنچے! احتشام صاحب تقریباً سارا دن ہم لوگوں کے کمرے ہی میں بیٹھے ہر طرح کے مسئلے پر سنجیدہ اور غیر سنجیدہ گفتگو کرتے رہے۔ نہ انھوں نے یہ انتظار کیا کہ ہم لوگ پہلے ان کی خدمت میں سلام کو حاضر ہوں، نہ آرام کا عذر کر کے اپنے آپ کو جھوٹی بڑائی کے خول میں بند کرنے کی راہ نکالی۔ حیدرآباد میں ۱۸ برس پہلے اُن کا جو رویّہ پہلی ملاقات میں دیکھا وہ آخر تک برقرار رہا۔ وہ بہت جلد بے تکلف ہو جاتے سطحیت یا مصنوعی خوش دلی کا اظہار کیے بغیر۔ ان میں مزاح کی بہت ہی لطیف حس تھی۔ اُن کے چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے مگر معنی خیز فقرے موقع پر کبھی کبھی بڑا لطف دے جاتے۔ ایک جدید محقق سے اپنی ایک جھڑپ کا واقعہ انھوں نے بڑی تفصیل سے کئی بار بے تکلف محفل میں سُنایا۔ وہ اپنی غیر معمولی علمی ادبی فتوحات کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے تھے لیکن ان چھوٹی چھوٹی بے ضرر اور معصوم ادبی فتوحات کے ذکر میں بہت لطف لیتے تھے۔ یہ بھی ان کی سادگی اور معصومیت ہی کا ایک رُخ تھا۔

وہ خود نقاد تھے، مگر انھوں نے افسانے بھی لکھے اور شاعری بھی کی۔ اگر وہ نقاد کی حیثیت سے اتنے اہم نہ ہوتے تو شاعری میں یقیناً ان کو بہت سے مشہور و مقبول شعرا سے کہیں زیادہ اہمیت مل سکتی تھی۔ اُن کے تخلیقی میلان کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ وہ شاعری کو تنقید سے افضل سمجھتے تھے۔ انھوں نے کئی بار مجھ سے کہا کہ تنقیدی اور علمی مضامین کی رَو میں شاعری سے بے توجہی نہ کیجیے۔ "شاعری تنقید پر مقدم ہے اور ہم آپ کو نقاد سے زیادہ شاعر کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں۔" تنقید ایک ایسا چکر ہے کہ جو ایک بار اس میں پڑ گیا، پھر اس سے باہر نہیں نکل سکتا۔ کانفرنسوں، سمیناروں، رسالوں کی فرمائشیں، ہم عصر لکھنے والوں کے تقاضے ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتے ہیں۔ جب ہم جیسوں کے ساتھ یہ ہوتا ہے تو احتشام صاحب پر تو اس سے کہیں زیادہ یورش ہوتی ہوگی۔ انھوں نے تنقید کو وقت کی ضرورت اور ایک نئے سماجی سیاسی نظریے کی ادبی تفسیر کے طور پر اپنے عہد میں فنکار کا سب سے اہم منصب سمجھ کر قبول کیا۔ اسی طرح تنقید اُن کے لیے فرمائشوں کی محض تکمیل نہ تھی، بلکہ ادب کا لازمی جز تھی۔ اگر اُن کو اس منصب کی اہمیت کا اتنا زیادہ احساس نہ ہوتا تو یقیناً اُن کی تخلیقی صلاحیتیں زیادہ بروئے کار آسکتی تھیں۔

جدید علوم اور ادب کے ساتھ احتشام صاحب کا مذہب خصوصاً اسلام اور تصوف کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا۔ سُنا ہے ایک زمانے میں وہ مجلسیں بھی پڑھتے تھے۔ حدیث، تفسیر اور تاریخ اسلام پر اُن کی گہری نظر تھی۔ آخری ملاقاتوں میں سے ایک موقع پر ذاکروں کے قحط اور ان کی آمدنی کا ذکر نکلا تو احتشام صاحب نے ہنستے ہوئے کہا "اگر ہم یہی کام کرتے تو شاید پروفیسری سے زیادہ کما لیتے"۔ زندگی نے اُنھیں نوکری سے سبکدوشی کے بعد کی فکر کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ زندہ رہتے تو اُنھیں بڑے سے بڑا منصب مل سکتا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُن کا شوق علم نئی ذمہ داریوں کے مقابلے میں قناعت کے فقر کو ترجیح دیتا۔ اُن کے مزاج میں یہ بات ہی نہیں کہ وہ اپنے کسی علم کے گوشے یا صلاحیت کو محض وسیلۂ معاش بنا لیتے۔ اُن کے لیے اقتدار و ثروت کے بہت سے دروازے کھلے ہوئے تھے اور آئندہ بھی کھل سکتے تھے۔ مگر وہ جس نے زندگی بھر اربابِ اقتدار کا کوئی احسان گوارا نہ کیا، یہ موقع آنے سے پہلے ہی بے نیاز زمانہ اس طرح چلا گیا کہ لوگ سوچتے ہی رہ گئے کہ احتشام صاحب کے لیے کیا کیا جا سکتا تھا اور اُن سے کیا کام لینا تھا۔

پچھلے چند برسوں میں اردو کے بہت سے ادیب اور شاعر مرے ہیں لیکن کسی کا اتنا سوگ نہیں منایا گیا، جتنا احتشام صاحب کا ہوا۔ یو۔ پی کے قصبات سے لے کر ہندوستان کے دور افتادہ علاقوں کے چھوٹے چھوٹے شہروں [illegible] اور انجمنوں نے اُن کے سوگ میں جلسے کیے۔ اسی طرح پٹنہ، حیدرآباد، بمبئی مختلف مقامات کے اردو اخبارات و جرائد اب تک ان کے تعزیتی جلسوں کی خبروں سے بھرے رہتے ہیں — اُن کی سادہ، اقتدار سے گریزاں خودنمائی سے بری، ثروت و جاہ سے تہی زندگی میں ایسی کون سی کشش تھی جو بڑے بڑے اصحابِ اختیار و ثروت کو نصیب نہیں ہو سکتی؟ — عالم اور بھی ہیں، ادیب اور ناقد بہت سے ہیں، پروفیسر آٹھ دس نہیں ملک میں ہزاروں ہیں، لیکن احتشام صاحب کی انفرادیت اور امتیازی شان یہ تھی کہ علم اُن کی زندگی تھا، ادب اُن کا دستار اور جوہر تھے اور کھتے تھے اپنے ہر ہر فعل سے اس کی تصدیق کرتے تھے۔ اسی لیے اُن کی سادگی نے بڑے بڑوں کے طمطراق سے زیادہ خراجِ عقیدت حاصل کیا اُن کی بے نمائشی نے سیاسی تماشوں نعاروں اور اقتدار کے تام جھام کے ساتھ علم و ادب میں اپنی اہمیت منوانے والوں کے لاف و گزاف سے کہیں زیادہ دلوں کو مسخر کیا۔ وہ اپنے فلسفیانہ اور سیاسی مسلک کے لحاظ سے چاہے جو سوچتے اور مانتے ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی زندگی اولیائے خدا کی بے نفسی اور درویشانہ بے نیازی کا اس عہد میں سب سے روشن نمونہ تھی — جاہ اُن کے علم سے بے خبر نہیں رہا، مگر اُن کا علم جاہ سے ضرور بے نیاز رہا۔ احتشام صاحب نے علم کے وقار اور ادیب کی خودداری کو اپنی زندگی اور عمل سے ایک نئے معنی دیے، ایسے معنی جو کبھی غلط نہیں ہو سکتے۔

★

احتشام حسین — ایک باہمہ اور بے ہمہ شخصیت

(صفحہ [illegible] کا بقیہ)

ے پیش آتے تھے اور اگر کوئی شاگرد صلاحیت والا مل جاتا (جس کی آج کل بہت کمی ہو گئی ہے) تو اس کے ساتھ ان کی شفقت اور محبت غیر معمولی ہو جاتی تھی بلکہ اپنے افرادِ خاندان کی طرح اسے چاہنے لگتے تھے۔ اور اس کی مدد کرنے میں بعض اوقات تو وہ اپنے حسبِ معمول اعتدال سے تجاوز کر جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے شاگرد بھی ان سے بہت عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ ان کی شرافتِ طبع کا یہ پہلو خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔

نومبر ۱۹۶۱ء سے احتشام صاحب مجبوراً الہ آباد یونیورسٹی چلے گئے اس لیے کہ اس وقت تک یہاں اُردو میں پروفیسری کے ملنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ تبھی سے ان سے ملاقات کم ہونے لگی تھی اور جب سے میں یونیورسٹی کے علاقے میں منتقل ہو گیا جو امین آباد سے بہت دور ہے ملاقات کے مواقع اور بھی کم ہو گئے تھے۔ پھر بھی جب کبھی وہ یونیورسٹی آتے یا الہ آباد، علی گڑھ، دہلی کسی یونیورسٹی میں کہیں ملاقات ہو جاتی تو وہ اسی مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ملتے اور خیریت و مزاج پرسی کے بعد گفتگو کا سلسلہ آغاز ہو جاتا۔ دو سال ہوئے سری نگر جا رہا تھا۔ دہلی کے انڈین ایرلائنز کے دفتر میں مل گئے۔ فوراً خوش ہو کر کہنے لگے "اچھا، ہاشمی صاحب آپ آ گئے؟ (وہ جانتے تھے کہ میں سفر سے بہت گھبراتا ہوں) میں نے کہا کہ ابھی بھروسے پر ہمت کر لی کہ آپ کے ساتھ سفر، سفر نہ معلوم ہوگا۔ ہنسنے لگے اور واقعی ان کی وجہ سے سری نگر کا سفر بھی دشوار نہ ہو سکا۔ احتشام صاحب کو گزرے ہوئے پانچ مہینے ہو گئے مگر اب بھی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احتشام صاحب سے اسی دنیا میں کہیں نہ کہیں دفعتاً ضرور ملاقات ہو سکے گی۔ وہ لکھنؤ میں ہوں یا کسی اور یونیورسٹی میں اور وہ حسبِ معمول خندہ پیشانی سے کہیں گے "اچھا ہاشمی صاحب آپ آ گئے؟" — یہی وجہ ہے کہ اب تک انھیں "مرحوم" لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔

★

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ

ڈاکٹر شمیم حنفی

کبھی کبھی موت سے زیادہ اندوہناک حقیقت زندگی نظر آتی ہے یہ احساس اس روز مجھے انتہائی شدت کے ساتھ ہوا تھا جب اچانک احتشام صاحب کے انتقال کی خبر ملی تھی۔ موت آسان تھی کہ احتشام صاحب چپ چاپ اس مرحلے سے گذر گئے۔ ان کے بغیر زندگی کتنی مشکل نظر آئی تھی۔

لکھنا میری ایک نفسیاتی مجبوری ہے۔ حواس پر جب بھی اس مجبوری کی گرفت ہوتی ہے میں لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ اس وقت کوئی بھی مصروفیت ماحول یا فضا مجھے اس عمل کی مجبوری سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوتی لیکن احتشام صاحب پر کچھ لکھنے کی ہر کوشش میرے لیے اب تک لا حاصل ثابت ہوئی۔ اب کہ اس سانحے کو تقریباً پانچ ماہ گذر چکے ہیں، یہ مدت ایک پوری کتاب لکھنے کے لیے کافی ہو سکتی تھی۔ خاص طور سے اس صورت میں کہ موضوع احتشام صاحب ہوں جن کی شخصیت کا ہر نقش نگاہ میں روشن ہے۔ اس عرصے میں انگریزی اور ہندی اخبارات کے علاوہ اردو رسائل اور اخبارات کے سیکڑوں صفحے ان کے ذکر سے بھرے ہوئے دکھائی دیئے۔ دوستوں میں ہزاروں بار ان کی باتیں ہوئیں متعدد رسائل کی طرف سے فرمائش ہوئی کہ ان پر کچھ لکھوں۔ لیکن یہ کیسی مجبوری ہے جو لکھنے کے نام پر چپ کا ایک بھاری پتھر میرے حواس کے شانوں پر رکھ دیتی ہے اور میری رگ رگ میں حزن آمیز بے یقینی کی ایک لہر رواں ہو جاتی ہے۔ الہ آباد کے ایک قبرستان میں وہ قبر بھی نگاہوں کے سامنے ہے جس کی آغوش میں احتشام صاحب سو رہے ہیں۔ ان کے گھر کا سوگوار ماحول، بچوں کے اترے ہوئے چہرے، دوستوں اور شاگردوں کی متجسس نگاہیں بھی سامنے ہیں۔ لیکن یہ سارا منظر مجھے فراموش کاری کی ایک دھند میں رفتہ رفتہ تحلیل ہوتا

لڑکے کے ساتھ

ہوا دکھائی دیتا ہے اور جو تصویریں ابھرتی ہیں ان میں احتشام صاحب اپنے اداس لیکن تابناک چہرے، سوچتی ہوئی روشن آنکھوں، مہذب اور متین آواز کے ساتھ اب بھی رواں دواں دکھائی دیتے ہیں۔ جذباتی طور پر ان کی موت کی حقیقت سے اب تک میں سمجھوتہ نہیں کر سکا ہوں۔

انتقال کے دوسرے دن مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بھی تعزیتی جلسہ ہوا۔ سرور صاحب نے رندھے ہوئے گلے سے نکلتی ہوئی اشک ریز آواز میں بڑی مشکل سے تعزیتی قرارداد پڑھی۔ پھر انھوں نے مجھ سے بھی کچھ کہنے کا اشارہ کیا۔ لیکن، میں سوچتا ہوں کہ کیا کہنے کے لیے الفاظ ناگزیر ہوتے ہیں؟ اس روز ایک سرد اور سفاک سکوت میری آواز تھا اور کتنی شدت سے مجھے احساس ہوا تھا کہ لفظ جو ایک ننھے سے سانچے میں آفاق کو سمیٹنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں دراصل کتنے کمزور بے بضاعت اور حقیر ہیں کہ سکوت کا حصار انھیں ایک لمحے کے لیے بھی باہر نہیں جانے دیتا۔ میری زبان سے ایک جملہ بھی نہیں نکل سکا تھا۔ شاید اس لمحے میں جب سوچ بیکراں ہو جائے اس کا موثر وسیلہ اظہار خاموشی ہی ہو سکتی ہے۔

کسی کتاب میں یہ قول نظر آیا تھا کہ اپنے ہیرو کے بہت قریب نہ جاؤ، کہیں اس کی روشنی تمہاری آنکھوں کو خیرہ نہ کر دے۔ احتشام صاحب کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کا ذہن، ان کی طبیعت اور ان کی پوری شخصیت پیچیدگیوں سے عاری، تضادات سے دور اور ابہام

سے یکسر خالی تھی، بہت صاف، شفاف اور روشن۔ لیکن انھیں قریب سے دیکھنے والوں کی آنکھیں بھی کبھی خیرہ نہیں ہوئیں۔ احتشام صاحب دلوں میں اتر جانے کا سلیقہ رکھتے تھے۔

ان کے انتقال کے دوسرے یا تیسرے دن ان کا ذکر ہو رہا تھا۔ اچانک خلیل صاحب (خلیل الرحمن اعظمی) نے کہا: "احتشام صاحب بظاہر اتنے سادہ، عام اور مانوس نظر آتے تھے جیسے ہوا، جس کے بغیر زندگی ممکن نہیں، لیکن جس کے وجود کی اہمیت کا کبھی خیال بھی نہیں آتا۔ اب کہ احتشام صاحب نہیں ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ کتنے غیر معمولی اور اہم تھے"

نومبر ۱۹۶۱ء میں احتشام صاحب الٰہ آباد گئے تھے، شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے۔ میں ان دنوں ایم۔اے فائنل کا طالب علم تھا۔ چھ مہینے باقاعدہ طور پر ان سے پڑھنے کا موقع ملا۔ ایم۔اے کے بعد میں نے یو۔جی۔سی کا ایک وظیفہ ملنے پر ریسرچ میں داخلہ لے لیا۔ احتشام صاحب نے میرے لیے ایک موضوع منتخب کیا اور اس سے پہلے کہ میں ان سے اپنے کام کی نگرانی کی درخواست کرتا انھوں نے یہ ذمے داری بھی خود ہی قبول کر لی۔ پھر تقریباً ڈھائی برس ان کے ساتھ گزرے۔ بظاہر یہ مدت زیادہ طویل نہیں۔ الٰہ آباد میں طالب علمی کے زمانے میں بعض اساتذہ کے ساتھ اس سے زیادہ وقت گزرا لیکن بیشتر چہروں کو دیکھنے کے لیے ماضی کی طرف لوٹنا پڑتا ہے۔ احتشام صاحب اب بھی ساتھ دکھائی دیتے ہیں ۱۹۶۵ء میں ملازمت ملی تو الٰہ آباد چھوٹ گیا۔ احتشام صاحب پھر بھی ساتھ رہے۔ اب کہ وہ دنیا چھوڑ چکے ہیں پھر بھی ان کا ساتھ نہیں چھوٹتا۔ ان کی نیکیاں، ان کی شفقت اور سادگی، ان کی علمیت اور وقار، ان کی شان استغنا اور قلندری، ان کے خلوص کی گرمی اور طبیعت کی نرمی، آنکھیں تھک جاتی ہیں لیکن ان کی شخصیت کے رنگ رنگ مظاہر کا یہ سلسلہ نہیں ٹوٹتا۔

احتشام صاحب سے پہلی ملاقات ۱۹۶۱ء میں ہوئی تھی جب وہ شعبۂ اردو کی پروفیسر شپ کے لیے امیدوار کی حیثیت سے الٰہ آباد آئے تھے۔ اس روز [illegible] صاحب، [illegible] صاحب، سروری صاحب، ڈاکٹر اختر اورینوی اور بعض دوسرے اکابر ادب اور عالم بھی الٰہ آباد میں موجود تھے۔ میں نے [illegible] کی طرف سے ایک جلسے کا اہتمام کیا۔ وہ دن ان تمام حضرات کے لیے بہت مصروفیت کا تھا چنانچہ کچھ نے معذرت بھی کر لی۔ سرور صاحب اور احتشام صاحب نے ایک طالب علم کی معمولی سی اصرار کو بھی ناقابل التفات نہیں سمجھا۔ جلسے میں آئے اور کم و بیش تین گھنٹے ساتھ گزارے۔ اس روز دل و دماغ پر احتشام صاحب کی شخصیت کے تاثر کا پہلا نقش ثبت ہوا۔ ان سے آخری ملاقات انتقال سے کوئی ڈیڑھ مہینے پہلے یہیں علی گڑھ میں ہوئی۔ شام کا بیشتر حصہ انھوں نے ساتھ گزارا۔ اس روز میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ احتشام صاحب رات کی ایک گاڑی سے واپس الٰہ آباد جانے والے تھے۔ میں نے اسٹیشن تک ساتھ جانے کا ارادہ کیا تو بار بار روکتے رہے۔ جی نہیں مانا۔ اس رات اسٹیشن پر انھیں رخصت کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ احتشام صاحب آج آئندہ کبھی نہ ملنے کے لیے ملے تھے۔

۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۲ء تک اتنی ساعتیں احتشام صاحب کے ساتھ گذریں کہ ان کا شمار بھی ممکن نہیں۔ شام کو ساتھ ٹہلتے ہوئے، کلاس روم میں ان کے لیکچر سنتے ہوئے، ان سے بحثیں کرتے ہوئے، سفر میں، ان کے گھر پر، اپنی رہائش گاہ پر، چائے خانوں اور سول لائنز، الٰہ آباد کے کافی ہاؤس میں، ادبی جلسوں اور تماشوں میں، اس کہانی کے ہر صفحے کا ایک ایک نشان مجھے اب بھی ہواؤں کی تختی پر لکھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

اس وقت مجھے ہر لمحہ یہ خیال آرہا ہے کہ احتشام صاحب کے تذکرے میں بار بار اپنی پرچھائیں سامنے کیوں آجاتی ہے؟ احتشام صاحب کے بارے میں تاثرات کی احاطہ بندی کرتے ہوئے شاید اس جبر سے رہائی میرے لیے ممکن ہی نہیں۔ میری کمزوری یہ رہی ہے کہ میں نے بڑی سے بڑی شخصیت کو بھی اس کے رتبے، منصب اور کروفر کے بجائے ہمیشہ اپنے انفرادی ذہنی فیصلوں کے وسیلے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان فیصلوں کی روشنی میں بہت سے فرشتوں کے سر گنجے نظر آئے اور کئی قلندروں کے سر پر تاج شہی دکھائی دیا۔ احتشام صاحب میرے لیے ایک لائق استاد کے علاوہ ایک شفیق بزرگ اور بزرگ دوست کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ انھیں رشتوں کی روشنی میں ان کی شخصیت کا ایک روپ سامنے آیا، اس طرح کہ میرے اپنے وجود کا ایک حصہ بن گیا۔ ان کی موت اس وجہ سے ایک حصے کی موت بھی ہے۔ ان کی موت کا خیال آتا ہے تو ایک غم آلود سکوت کا احساس

بھی ہوتا ہے کہ اب اور کچھ کھوتے ہوئے اذیت کی تے شاید اتنی نہ تیز نہ ہوگی۔

احتشام صاحب اپنے ادبی اور تہذیبی نظریات کے باب میں جتنے انتہا پسند اور ان کے اظہار میں جس قدر بیباک تھے خود اپنی ذاتی زندگی مسائل اور الجھنوں کے ذکر میں اتنے ہی محتاط اور مختصر گفتار تھے۔ ان کی گفتگو بہت دلنشیں ہوتی تھی کیونکہ وہ گفتگو کے آداب کا بہت لحاظ رکھتے تھے اور ملنے والوں کو محض سامع نہیں سمجھتے تھے اور ان کی باتیں سننے کا سلیقہ بھی رکھتے تھے۔ ان کے چہرے پر افسردگی کی ہلکی سی دھند ہمیشہ دکھائی دی لیکن وہ طبیعتاً شگفتہ خصلت تھے۔ گفتگو میں سب سے زیادہ سرگرم اس وقت دکھائی دیتے تھے جب مسئلہ ادبی یا علمی ہو اور سب سے زیادہ بیزار ان لمحوں میں جب کوئی ان کے سامنے کسی کا ذکر عیب جوئی کے ساتھ شروع کر دے۔ وہ ہم عمر دوستوں ہی میں نہیں شاگردوں اور نوجوانوں کے درمیان بھی گھنٹوں بیٹھے رہتے، باتیں کرتے اور پیشانی پر کبھی ناگواری کی کوئی سلوٹ نہ ابھرتی۔ اندور اور علی گڑھ سے وطن کو جاتے ہوئے یا ادھر سے آتے ہوئے کئی بار ایسا ہوا کہ میں محض احتشام صاحب سے ملنے کے لیے چند گھنٹوں کے واسطے الٰہ آباد میں رک گیا۔ یہ اتفاقات گرمیوں کی ان دوپہروں میں بھی ہوئے جب الٰہ آباد کی سڑکیں ویران اور گنجان گلی محلے بھی سنسان دکھائی دیتے ہیں۔ احتشام صاحب تھکن یا مصروفیت کے باوجود دوپہر کا وقت بھی باتیں کرتے ہوئے گذار دیتے تھے۔ ادب اور سماجی علوم پر نئی کتابوں کی باتیں رسائل میں چھپی ہوئی نظموں، غزلوں، مضامین اور افسانوں کی باتیں۔ ایسے موقعوں پر اکثر خیال آیا کہ فراق صاحب بات چیت کو دماغ کا تنفس کہتے ہیں تو درست کہتے ہیں۔

احتشام صاحب کی موت کے بعد ایک روز میں نے اپنے کاغذات کے انبار کو کھنگالنا شروع کیا تو دوسرے ممتاز ادیبوں اور دانشوروں کے ساتھ احتشام صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریروں اور خطوط کا ایک بڑا ذخیرہ دکھائی دیا۔ احتشام صاحب جب بھی کوئی نئی کتاب دیکھتے یا کسی خاص موضوع پر میں کچھ پڑھنا چاہتا تو اس سے متعلق کتابوں کے نام کی چھوٹی چھوٹی فہرستیں بنا کر بھیج دیتے۔ ایسی کئی فہرستیں میرے پاس ہیں، انھیں کے قلم سے لکھی ہوئی۔ اسی سے زیادہ ان کے خطوط ملے، ان کی کئی غزلیں، چند مضامین اور متعدد تصویریں۔ خطوط پر از سر نو نظر ڈالی تو انکشاف ہوا کہ احتشام صاحب کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کا اظہار واضح اور بے لاگ طور پر شاید ان کے خطوط ہی میں ہوا ہے۔ وہ عام گفتگو کے علاوہ ملنے جلنے میں بھی لیے دیے رہنے کے عادی تھے۔ گرمجوشی کے رسمی اظہار سے ان کی طبیعت کوئی علاقہ نہیں رکھتی تھی اگرچہ ان کی شائستگی اور نرمی پہلی بار ملنے والے کو بھی ان سے قریب کر دیتی تھی۔ وہ دنیا بھر کے موضوعات پر باتیں کر سکتے تھے۔ اگر ان کے سامنے کوئی انھیں کا ذکر شروع کر دیتا تو اتنے پریشان دکھائی دیتے گویا آنکھوں کے سامنے کوئی جرم ہو رہا ہے۔ خود بھی اپنے بارے میں باتیں کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ بیمار ہوں، کوئی ذاتی الجھن ہو، کسی سے رنج پہنچا ہو، کوئی نجی ضرورت درپیش ہو، وہ گھر والوں سے تذکرہ کرتے ہوئے بھی جھجکتے تھے۔ یہ کچھ ان کے فطری شرمیلے پن کا نتیجہ تھا اور کچھ ان کی شعوری کوششوں کا۔ البتہ خطوط میں وہ کسی قدر آزاد دکھائی دیتے ہیں۔ بعض اوقات اپنے چھوٹے چھوٹے تجربوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ صحت کی خرابی یا مزاج کی کسی مخصوص کیفیت کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ وہ بڑے سے بڑے جذباتی اور ذہنی حادثوں کا تذکرہ عام گفتگو میں نہیں آنے دیتے تھے۔ خط میں ایک چھوٹے سے حادثے کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

> ادھر کا ایک حادثہ یہ ہے کہ ۱۰ فروری کی شام کو میں لیڈر روڈ پر رکشے سے جا رہا تھا، پیچھے سے آکر جیپ نے ٹکر دی، رفتار سست تھی اس لیے جھٹکا بھی ہلکا رہا، میں گرا نہیں، لیکن رکشے کا داہنا پہیہ جیپ میں پھنس گیا اور دو چار قدم گھسٹتا ہوا چلا پھر ٹوٹ گیا، مجبوراً مجھے گرنا پڑا، میں کچھ گرا، کچھ کودا، بچ گیا لیکن بایاں پاؤں رکشے سے اتر نہ سکا اور گھٹنے کے سامنے پٹھے اور اعصاب بری طرح کھنچ گئے۔ نہ زخم ہے نہ ٹوٹ پھوٹ، لیکن درد اور تکلیف خاصی ہے۔ چند دن پڑا رہنا ہے، گھبرانے کی کوئی بات نہیں لیکن اس طرح بیٹھے رہنا عجیب ہے
>
> (خط بنام راقم الحروف ۱۴ فروری ۱۹۷۰ء)

اسی طرح ۱۹۷۰ء کی شدید گرمیوں میں برسات دیر سے آئی اور اندور میں پہلی بارش کا علم ہوا تو مجھے لکھا:

> آج اخبار یا ریڈیو کی خبر ہے کہ اندور میں پہلی بارش ہو گئی۔ اندور

باسیوں کو مبارک ہو۔ یہاں بھی بقول کسی کے "امساکِ باراں" ہے سخت گرمی ہے، کل تو لُو چل رہی تھی۔

(۱۲ر جولائی ۱۹۶۶ء)

یاد آتا ہے، ایک بار الہ آباد میں طبیعت کی خرابی کے باعث احتشام صاحب نے پوری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ بہت بے چین ہوئے تو ٹہلتے رہے لیکن گھر میں کسی کو جگانا تو دور رہا دوسرے دن صبح کو بھی کسی سے تفصیل نہیں بتائی۔ مجھ سے ملاقات ہوئی تو بس روا روی میں ذکر کر دیا۔ میں نے کہا: "آپ نے کسی کو جگایا کیوں نہیں؟" بولے: "کیا فائدہ؟ نیند خراب ہوتی؟" اب میں اس بات کا کیا جواب دیتا۔ اس کے برعکس کسی عزیز دوست یا گھر کے کسی فرد کو معمولی سی تکلیف بھی ہوتی تو بار بار مزاج پرسی کرتے، ڈاکٹروں کے پاس جاتے اور ملنے جلنے والوں سے ذکر کرتے، خود میری صحت کی معمولی سی خرابی پر بھی خطوط میں بار بار مجھے دلاسہ دیتے، مشورے لکھ بھیجتے اور تفصیل سے لکھنے کی ہدایت کرتے۔ انھیں دوسروں کے لیے ذرا ذرا سی باتوں کی فکر رہتی۔ کسی کی ملازمت کا مسئلہ ہو، کوئی علمی سوال ہو، کوئی ذاتی پریشانی ہو، احتشام صاحب حتی الامکان ہر مسئلے کا حل ڈھونڈنے کی سعی کرتے۔ لیکن جہاں خود ان کا کوئی مسئلہ آیا زبان خاموش اور ہونٹ بند۔ ان کی زندگی میں ایک رسالے نے ان کا نمبر نکالنے کا ارادہ کیا۔ مدیر میرے جاننے والے تھے۔ مجھ سے اصرار کیا کہ احتشام صاحب کو اس سلسلے میں تعاون پر آمادہ کروں۔ میں نے سفارش کی تو یوں جواب دیا:

آپ جانتے ہیں کہ مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہو سکتی کہ کوئی میرے لیے خاص نمبر نکال رہا ہے۔ جیسا کچھ بھی نکلے گا، میں بھی دیکھ لوں گا۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ میں نہ تو کسی سے کہوں گا اور نہ ذکر کروں گا۔ نہ کوئی نئی تصویر کھنچواؤں گا اور نہ الگ سے کچھ لکھوں گا۔

(۱۶ر فروری ۱۹۷۲ء)

دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی خط میں آگے چل کر انھوں نے ایک رسالے کی خصوصی اشاعت کے لیے ایک بزرگ اہلِ قلم پر خود مجھ سے لکھنے کا اصرار بھی کیا ہے۔

احتشام صاحب الہ آباد آئے تو وہاں اسکول میں بچوں کے داخلے کا مسئلہ بھی سامنے آیا۔ اچھے اسکولوں میں یوں بھی داخلہ آسان نہیں ہوتا پھر بھی احتشام صاحب کے جاننے والوں نے کہا آپ فلاں صاحب کو بس ایک خط لکھ دیجیے، داخلے ہو جائیں گے۔ لیکن احتشام صاحب کسی نہ کسی بہانے سے ٹالتے رہے: "بھئی! یوں کسی کو پریشان کرنا اچھا نہیں لگتا۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ داخلے مجبوراً دوسرے درجے کے اسکولوں میں کرانے پڑے۔ لیکن دوسروں کے لیے وہ چھوٹی چھوٹی سفارشوں پر بھی آمادہ ہو جاتے تھے۔ الہ آباد کے ایک تجارتی ادارے میں میرے ایک عزیز ملازمت کے لیے کوشاں تھے۔ میں نے احتشام صاحب کو لکھا۔ جواب میں لکھتے ہیں:

بھائی۔۔۔ (ادارے کا نام) کا یہ حال ہے کہ کتنے آدمیوں کے لیے کہہ چکا ہوں، آج تک ایک کام بھی نہیں ہوا حالانکہ یہ جانتا ہوں کہ سعی و سفارش سے ہر کام ہو جاتا ہے۔ میں وہاں صرف۔۔۔ صاحب کو جانتا ہوں۔ وہ براہ راست تقرر نہیں کر سکتے۔ وہاں کے قاعدے قانون ایسے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ پہلے عرضی، پھر فیصلہ کہ اسے ٹسٹ کے لیے بلایا جائے یا نہیں، ٹسٹوں کی تعداد معین نہیں، ایک، دو، تین، چار، دس، جتنے بھی ہو جائیں۔۔۔ یہ ساری باتیں کئی بار جاننے، دیکھنے اور بھگتنے کے باوجود چونکہ آپ نے لکھا تھا میں۔۔۔ صاحب سے ملا۔ وہی ہوا کہ عرضی بھجوا دیجیے، جیسا کچھ ہوگا بتاؤں گا۔ اس کا مطلب مہینوں کی دوڑ دھوپ اور پھر بھی بے یقینی۔ تاہم عرضی بھجوا دینا چاہیے۔

(۲۹ر نومبر ۱۹۶۸ء)

ملازمت کے سلسلے میں اندور جانا ہوا تو یونیورسٹی کے لیے پہلی بار نصابات کی تیاری کا سوال بھی درپیش تھا۔ اردو، فارسی اور عربی کے بورڈ آف اسٹڈیز کی نگرانی میرے سپرد تھی۔ میرے لیے اپنی قسم کا یہ پہلا تجربہ تھا چنانچہ الجھن تھی کہ کیونکر یہ مرحلے طے ہوں گے۔ میں نے احتشام صاحب کو لکھا کہ بورڈ کے بیرونی رکن کی حیثیت سے وہ میٹنگ میں شریک ہو جائیں تو یہ مشکلیں حل ہو جائیں گی۔ محض ایک شاگرد کی دلجوئی کی خاطر [illegible] خطوط کے ذریعے بہت سی باتیں سمجھاتے رہے۔ [illegible]

حرکت کے بعد ایک لمبا سفر کیا اور انند رگئے۔ میں ان دنوں ایک چھوٹے بھائی کے ساتھ دو کمروں کے ایک مختصر سے فلیٹ میں رہتا تھا۔ احتشام صاحب کی آمد سے پہلے میں نے انھیں لکھا کہ ان کے قیام کا انتظام کسی بہتر جگہ کر دوں جہاں انھیں آرام مل سکے۔ جواب آیا کہ کہیں اور کوئی انتظام کرنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ میرے ساتھ ٹھہرے۔ دو روز قیام کیا۔ واپسی میں میرا چھوٹا بھائی بھی ان کے ساتھ ہو لیا جو چند دنوں کے لیے وطن جانا چاہتا تھا۔ راستے میں ایک جگہ گاڑی بدلنا ہوتی تھی۔ مشکل سے پانچ منٹ کا وقت ملتا تھا۔ اسٹیشن کی ہماہمی میں دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ دونوں جلدی میں الگ الگ ڈبوں میں بیٹھ گئے تھے۔ بظاہر ایسی کوئی پریشانی غیر ضروری تھی لیکن احتشام صاحب پریشان تھے۔ لکھتے ہیں۔

میں کل دوپہر کو پہنچا اور شام کو لکھنؤ چلا آیا۔ سب سے پہلے تماشہ یہ ہوا کہ کمھنؤ میں مجھے ایک سیکنڈ کلاس میں جگہ مل گئی، وسیم سلیپر کی فکر میں تھے غالباً انھیں اس میں جگہ نہیں ملی اور وہ سوار نہیں ہوئے۔ بعد میں کسی گاڑی سے آئیں گے۔ میں نے راستے میں بعض اسٹیشنوں پر دیکھا، پھر الہ آباد میں دیکھا۔ اب مجھے فکر ہے کہ وہ کس گاڑی سے آتے ہیں۔ گھر پر کہہ آیا ہوں۔ آپ کو انھوں نے سلطان پور سے کوئی خط لکھا یا نہیں۔ مجھے بھی مطلع کیجیے۔ میں ۲۴ر کو الہ آباد پہنچ جاؤں گا ..... خط مجھے الہ آباد کے پتے پر فوراً لکھیے۔ فکر ہے۔

(۲۱ر اکتوبر ۶۶ء)

وطن سے چھوٹے بھائی نے خیریت کا خط لکھا تو یہ اطلاع بھی ملی کہ احتشام صاحب نے میرے والد کو بھی اس سلسلے میں لکھا تھا جبکہ دونوں میں اس وقت تک دید و تعارف بھی نہیں تھا۔ اس طرح کی ذمہ داری یا نیکی کا اظہار کوئی عجوبہ یا معجزہ نہیں لیکن مجھے یہ بات ضرور عجیب نظر آتی ہے کہ احتشام صاحب جس علمی رتبے اور سماجی منصب پر فائز تھے اس کی اخلاقیات میں مجھے بالعموم ایسی باتیں کمیاب دکھائی دیتی ہیں بہت سے پڑھے لکھے ذہین لوگ بھی یہ نہیں سمجھ پاتے کہ عام انسانی مسائل اور معاملات میں بعض اوقات معمولی نظر آنا بھی ایک غیر معمولی وصف ہے۔

احتشام صاحب کی ایک ہفتے کی ڈاک مجموعی طور پر میری ایک مہینے کی ڈاک سے بھی شاید زیادہ ہوتی تھی۔ میں ایک چھوٹا سا خط لکھنے میں بھی ہفتے اور کبھی کبھی مہینے لگا دیتا ہوں۔ احتشام صاحب نہ صرف یہ کہ خطوط کے جواب بہت پابندی سے دیتے تھے بلکہ ان کا کوئی عزیز یا شاگرد اگر کچھ عرصے تک انھیں خط نہ لکھے تو خفا بھی ہوتے تھے۔ ایک بار میں الہ آباد پہنچا تو احتشام صاحب کہیں سفر پر تھے میں اسی شام کو علی گڑھ کے لیے روانہ ہو گیا۔ مصروفیتوں میں کچھ دن ایسے گذرے کہ انھیں خط نہ لکھ سکا۔ احتشام صاحب کا خط اس دوران میں آگیا۔ لکھتے ہیں۔

میں ۳۰ر مئی کو واپس آگیا۔ معلوم ہوا کہ اس درمیان میں آپ آئے تھے اور علی گڑھ گئے، کہہ گئے تھے کہ خط لکھوں گا۔ مجھے بھی فکر تھی اور خط کا انتظار کر رہا تھا لیکن آج جون کی ۱۳ر ہو گئی اور کوئی خبر نہیں کہ آپ کہاں ہیں، کیسے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ بھائی شاعر ہونے کے معنی یہ تو نہیں کہ آدمی زندگی کے دوسرے ضروری مشاغل کو خیرباد کہہ دے!

(۱۳ر جون ۶۹ء)

دوستوں اور شاگردوں کے ذاتی مسائل سے قطع نظر علمی اور ادبی مسائل کے سلسلے میں اجنبیوں کے لیے بھی احتشام صاحب کے گھر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ رسائل کی طرف سے ان سے بار بار مضمون کی فرمائشیں ہوتیں اور حتی الامکان وہ سب کا دل رکھتے۔ موت سے پہلے والی رات بھی انھوں نے کسی کے اصرار پر ایک مضمون پورا کیا تھا۔ وہ ان دنوں اپنی یونی ورسٹی کے شاید سب سے اہم اور مصروف استاد تھے۔ شعبۂ اردو کی صدارت کے علاوہ یونی ورسٹی کی انجمن اساتذہ کے صدر، یونیورسٹی لائبریری کے اعزازی لائبریرین، سرکاری اور غیر سرکاری، مقامی اور بیرونی کتنی ہی انجمنوں سے وہ وابستہ تھے، آئے دن انھیں دور دراز علاقوں کا سفر کرنا پڑتا۔ الہ آباد میں ہوتے تو یونیورسٹی اور طالب علموں کے علاوہ دوسرے شعبہ ہائے حیات سے متعلق لوگ بھی اپنی ضرورتوں کے سلسلے میں انھیں پریشان اور مصروف رکھتے۔ جنھوں نے احتشام صاحب کے جنازے کا جلوس دیکھا تھا شاہد ہیں کہ الہ آباد یونی ورسٹی کی تاریخ میں شاید ایسا مجمع نظر نہیں آیا۔ پورے شہر نے ان کا سوگ منایا، کارپوریشن کی عمارت پر قومی جھنڈا بھی سرنگوں تھا اور ان کے جنازے میں پروفیسر اور طالب علم، ہائی کورٹ کے جج اور وکلا، مزدور اور

دھاکہ۔ حبثیرہ ۱۸/۹ اٹک

دانشور اور عام انسان، مختلف سیاسی پارٹیوں کے رہنما اور باہم متضاد نظریات رکھنے والے ادیب اور عالم، سبھی شریک تھے۔ یہ نظریے، عقیدے اور طرزِ فکر پر ایک انسان کی فتح کا استعارہ تھا کہ اس کے غم نے بھانت بھانت کے لوگوں کو درد کی ایک زنجیر میں پرو دیا تھا۔ یونی ورسٹی دو روز کے لیے بند کر دی گئی۔ یہ اعزاز شاید الٰہ آباد یونی ورسٹی نے بڑے سے بڑے قومی رہنما کو بھی نہیں بخشا تھا۔ ان کے جنازے میں شریک ہر شخص کے لیے اس سانحے کی نوعیت ذاتی تھی۔ کتنوں نے انھیں موت دور سے دیکھا تھا۔ بعض یہ بھی جانتے تھے کہ احتشام صاحب ان کے سیاسی یا تہذیبی نظریات کے مخالف ہی نہیں دشمن بھی تھے۔ لیکن کوئی ان کی علمیت اور وقار اور شریف النفسی کا منکر نہیں ہوا۔ یہ خوش خلقی احتشام صاحب کے لیے دوسروں کو خوش کرنے یا دوسروں میں مقبول ہونے کا آلۂ کار نہیں تھی۔ یہ ان کی شخصیت کا باطن تھی اور ان کی سب سے بڑی کمزوری بھی کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ نیکیاں کرتے رہے جن تک کسی نیکی کا حق نہیں پہنچتا اور جو احتشام صاحب کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے رہے اور درپردہ انھیں ہر طرح نقصان پہنچانے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ یہ ان لوگوں کی مجبوری تھی اور نیکی احتشام صاحب کی مجبوری تھی۔ پچھلے چند برسوں کے خطوط میں افسردگی کی لَے خاصی تیز ہے۔ احتشام صاحب کے لیے افسردگی کی یہ دولت بھی شاید ایک تہذیبی قدر کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ غم و غصے کا اظہار چیخ کر نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ خاموشی سے اداس ہو لیتے تھے کہ یہی غصے کا شائستہ اظہار ہے۔

لیکن مصروفیت ہو یا صحت کی خرابی یا طبیعت کی بے کیفی اور بیزاری، احتشام صاحب تعلیم و تعلم کے مسائل سے ایک لمحے کے لیے بھی کبھی بے نیاز نہیں ہوئے۔ علم ہی ان کا پہلا اور آخری عشق تھا اور شاید اسی کو وہ اپنی عاقبت بھی سمجھتے تھے۔ زمانۂ طالب علمی میں ہم سب کو یہ آزادی حاصل تھی کہ بلا وقت طے کیے ہوئے جب چاہیں ان سے مل سکتے ہیں۔ چند برس پہلے ایک موضوع پر کام کرنے کے لیے میں نے احتشام صاحب سے کچھ مشورے چاہے اور بلا تکلف یہ بھی لکھ دیا کہ موضوع کا مناسب خاکہ بھی آپ ہی مرتب کر دیجیے۔ مجھے اس سلسلے میں کچھ جلدی تھی اور میرا خط احتشام صاحب کو جس وقت ملا وہ پابہ رکاب تھے۔ لیکن جواب حسبِ توقع جلدی آیا۔ لکھتے ہیں:

کل جب میں دہلی آنے کے لیے رکشے پر بیٹھ رہا تھا اسی وقت خط ملا۔ آج یہاں ایک میٹنگ میں آیا ہوں ...... ابھی بیٹھے بیٹھے یہ چند سطریں لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ دوبارہ نہیں دیکھا ہے اسے بہتر بنا لیجیے گا۔ اب یہ سب کام آپ لوگوں کو خود کرنا چاہیے۔ میرے ذہن پر اتنے بادل چھائے ہیں کہ بعض اوقات اپنے کو بالکل اندھیرے میں پاتا ہوں۔ یہ بات شاعرانہ نہیں ہے واقعی ہے۔ میں نے موضوع کا ایک خاکہ سا بنا دیا ہے۔ اسے اور پھیلا لیجیے گا، خاص کر ابواب میں اور PADDING کی ضرورت ہے۔

میں آج یا کل الٰہ آباد واپس جاؤں گا۔ وہاں امتحانات شروع ہو چکے ہیں۔ لائبریری کمیٹی کی تین میٹنگیں، ٹیچرز ایسوسی ایشن کی دو میٹنگیں کرانا ہیں۔ کچھ امتحان کے کام ہیں۔ غرض لکھنے پڑھنے کا کام برائے نام ہے۔ بعض اوقات تو ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ ادب میں جس قسم کی گروہ بندی ہوتی جا رہی ہے، وہ سوچ سمجھ کر لکھنے کے لیے کوئی ماحول ہی نہیں پیدا ہونے دیگی۔ لوگ اپنے اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں ہی دلیلیں ڈھونڈ رہے ہیں۔

(۲۳ر اپریل ۱۹۷۲ء)

اس خط میں احتشام صاحب نے چند سطری خاکے کا ذکر کیا ہے وہ فل اسکیپ کے تین صفحات پر پھیلا ہوا تھا اور اس عالم میں لکھا گیا تھا کہ احتشام صاحب سفر میں تھے، طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور مصروف تھے۔ اب مجھے رہ رہ کر میر کا شعر یاد آ رہا ہے ؎

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

میں اب مزید لکھنے کا حوصلہ خود میں نہیں پاتا بجز اس کے کہ پچھلے چار پانچ برس سے احتشام صاحب کی صحت اندر ہی اندر خراب ہوتی جا رہی تھی۔ انھیں بخوبی اس کا علم تھا۔ دوسروں کو انھوں نے حتی الامکان اس واقعے سے غافل رکھا۔ خطوط میں کبھی کبھی ذکر کر دیتے تھے:

کل یونی ورسٹی کو کھلنا چاہیے تھا۔ نہیں کھلی NON-TEACHING عملہ زبردست ہڑتال کر رہا ہے۔ دیکھیے اس میں کتنے دن لگتے ہیں۔

میں کشمیر سے آیا تو تھکا ہوا تھا۔ افسوس ہے کہ آرام کا کوئی وقت نہیں ملا۔ گزشتہ دنوں گھٹنے میں پھر تکلیف ہوگئی تھی۔ دہلی میں X-RAY کرایا تھا۔ لکھنؤ میں میڈیکل کالج کے ڈاکٹر کو دکھایا۔ انھوں نے کسی قدر تشویش کا اظہار کیا اور کئی دوائیں تجویز کیں۔ بعض جاری ہیں، تین چار دن ہوئے لکھنؤ کے بلرام پور ہسپتال میں دکھایا، انھوں نے بھی بعض دوائیں بتائیں۔ خرابی خاصی معلوم ہوتی ہے۔

(۱۸ اگست ۷۶ء)

میں ٹھیک تو ہوں لیکن کمزوری نہیں جاتی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ بلڈ پریشر LOW ہے۔

(۲۵ جولائی ۷۷ء)

علی گڑھ میں بہت ذرا سی ملاقات ہوئی۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور پروگرام ایسے تھے کہ میں بھی گھر تک نہ پہنچ سکا۔ پرسوں واپس آیا تو آپ کا پہلے کا لکھا ہوا کارڈ بھی ملا۔ خدا کرے طبیعت ٹھیک ہو۔ وہاں کی بد پرہیزیوں اور مصروفیتوں کے بعد میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ یونیورسٹی میں ہڑبونگ ہے۔ پڑھائی نہیں ہو رہی ہے لیکن جانا ہوتا ہے۔ آرام کروں تو شاید ٹھیک ہو جاؤں۔

(۵ ستمبر ۱۹۷۷ء)

پہلی دسمبر کی دوپہر کو ریڈیو نے خبر دی کی پروفیسر احتشام حسین کا انتقال ہوگیا۔ ۵ ستمبر کے خط میں انھوں نے لکھا تھا "آرام کروں تو شاید ٹھیک ہو جاؤں"۔ الہ آباد میں خسرو باغ سے کچھ آگے سڑک کے بائیں طرف نئی پرانی قبروں کے ساتھ ایک نئی قبر دکھائی دیتی ہے احتشام صاحب کی آخری آرام گاہ۔

حرفِ آخر:

مرنے والے سے زندگی کے عناصر الگ ہوگئے،
اس کے مقدس حقوق کی نگہبانی اب ہمارے حصے میں آئی ہے،
موت کی اس چٹان کے اُس پار وہ ہزاروں فصلوں کا سہاگ دیکھے
اور یہ چٹان ہماری آنکھوں کو اندھا نہ کردے، کہ ہم بھی
ان فصلوں کا نکھار دیکھ سکیں۔

"رگ وید: ۱۰-۱۸"

★

دانائے راز (صفحہ ۵ کا بقیہ)

مفکر اور نکتہ رس ادیب بن گئے جن کی نگاہ کی بلندی افق کو سنگ میل اور ستاروں کو گرد کارواں سمجھتی تھی۔ چاہیے تو اسے عشق کی ایک جست کہہ لیجیے۔ لیکن میں تو برسوں کی فکر و تعمق، گہرا مشاہدۂ حیات اور سماجی عوامل کی کارفرمائیوں کی واقفیت سے تعبیر کروں گا جس نے انہیں وہ جرأت و حوصلہ بخشا کہ اپنے جامد ماحول سے اوپر اٹھ کر زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں چار کریں اور وقت کے تقاضوں کو محسوس کرکے ایک نئے فکری نظام سے اپنے کو وابستہ کرلیں۔ ان کی اس وابستگی نے چاہے بغاوت کے عام مفہوم میں روایت سے انحراف نہ کیا ہو لیکن فکر کی وہ شمعیں ضرور روشن کردیں جو اندھیرے میں روشنی، بربریت میں انسان دوستی اور زندگی میں حسن کی پہچان کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔

★

کچھ یادیں کچھ باتیں

——— ساغر مہدی

یادش بخیر ذکر سنہ ء کا ہے۔ احتشام صاحب اُس وقت الہ آباد نہیں گئے تھے اور لکھنؤ ہی میں بارود خانہ والے مکان میں رہتے تھے۔ لیکن ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا تھا یا شرف نیاز حاصل کرنے کی ہمت نہ پڑی تھی۔ ویسے ان کی تنقیدی کتابیں، متفرق علمی ادبی مضامین وغیرہ کا مطالعہ کرنے کے بعد ذہن میں احتشام صاحب کی جو تصویر یا نقش بنا تھا وہ بہت ہی پرشکوہ قد آور اور علمی اور ادبی اعتبار سے انتہائی عظیم الشان تھا۔ لکھنؤ اکثر جانا ہوتا، مگر شرف نیاز حاصل کرنے کی ہمت نہ پڑتی سنہ ۱۹۶۰ء کی ایک خوبصورت شام تھی۔ تاریخ یاد نہیں رہی۔ غالباً مارچ کا مہینہ تھا اور اتوار کا دن تھا۔ میں اسی روز علیگڈھ سے لوٹا تھا۔ دوپہر کو امین آباد کا ایک گشت لگا کر دانش محل کی طرف جا رہا تھا کہ ایک رکشہ قریب سے گزرا اور "بھئی روکنا، رُکنا" کی آواز نے مجھے رکشے کی طرف متوجہ کر دیا۔ رکشہ رکا اور اس میں سے ایک سفید شیروانی میں ملبوس بھاری بھرکم شخصیت نے سر نکالا۔

"ارے ساغر! کب آئے۔ بھئی شام کو آجاؤ۔ آج میٹنگ ہے۔ راہی (راہی معصوم رضا) بھی آگئے ہیں۔" اور میری کوئی بات سنے بغیر رکشہ اپنی منزل کی جانب روانہ ہوگیا۔ اور میں دیر تک ان الفاظ کی سادگی، بے تکلفی اور اپنائیت پر غور کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اچانک سامنے سے آکر احمد جمال پاشا نے مجھے دبوچ لیا۔ پھر ہم لوگ واپس امین آباد کے چوراہے پر آگئے۔ میں نے احمد جمال پاشا سے میٹنگ کا ذکر کیا تو بولے "ہاں ہاں شام ۵ بجے احتشام صاحب کے گھر چلنا ہے۔"

پروگرام طے ہوگیا اور ہم لوگ شام ۵ بجے سے کچھ قبل ہی کچے احاطے کے اندر ہوتے ہوئے کئی چکردار گلیوں اور راستوں کو کاٹتے بارود خانہ احتشام صاحب کی قیام گاہ پر پہونچ گئے جہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کی میٹنگ شروع ہوچکی تھی کمرے میں دھیمی دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ مرحوم سید علی عباس حسینی صاحب اپنی کوئی تازہ کہانی سنا رہے تھے۔ رضیہ سجاد ظہیر، مسیح الحسن رضوی، پنڈت آنند نرائن ملاّ، راہی معصوم رضا، ڈاکٹر آفتاب اختر، ڈاکٹر محمود الحسن رضوی، حسن کمال، ڈاکٹر سید محمد سعید اور کئی دیگر حضرات سے کمرہ بھرا ہوا تھا۔ ہم لوگ بہت خاموشی کے ساتھ احتشام صاحب کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔

رضیہ آپا کے سامنے رکھا ہوا سگریٹ کا ٹن احتشام صاحب نے میزبانی کے طور پر ہم لوگوں کی طرف بڑھا دیا اور ہم لوگ شرمندہ ہوتے رہے۔ مگر احتشام حسین صاحب نے از راہ خورد نوازی ہم لوگوں کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھنے کا ایک ایسا زاویہ اختیار کیا کہ ہم لوگ سگریٹ نوشی میں آزاد ہوگئے۔ علی عباس حسینی صاحب (مرحوم) نے کہانی ختم کی تو رضیہ آپا نے اس کے متعلق چند جملے کہے اور پھر احتشام صاحب نے مجھ سے شعر کی فرمائش کر دی جو میرے لیے حکم سے کم نہ تھی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا سناؤں۔ اس غور و فکر میں دو تین منٹ لگے۔ یہ تو یاد نہیں کہ میں نے کیا سنایا تھا۔ مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ احتشام صاحب ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے۔ شاید اس طرح اتنی توجہ سے شعر سننے میں ان کے اخلاق، وضعداری، اور شرافت نفس کا دخل زیادہ تھا۔ ورنہ اس طرح اس ہیچمداں قسم کے شاعر کی شاعری ہی کیا تھا۔ غرضکہ دھڑکتے دل اور لرزتی آواز کے ساتھ کسی طرح میں نے یہ منزل طے کی۔ راہی معصوم رضا صاحب نے "اردو شاعری میں ہیئت" کے موضوع پر ایک تقریر کی تھی پنڈت آنند نرائن ملا صاحب نے ایک غزل سنائی اور پھر جلسہ ختم ہوگیا۔ اس جلسے میں حالانکہ محترم سید علی عباس حسینی مرحوم، ملاّ صاحب، رضیہ آپا۔ اور مسیح الحسن رضوی صاحب جیسے

قدآور، دانش ور دل سے پہلی بار شرف نیاز حاصل ہوا تھا۔ مگر احتشام صاحب کی شخصیت، عظمت، خلوص، شفقت بزرگی وانکساری کے میرے ذہن پر جو نقوش مرتب کیے وہ ناقابل فراموش تھے۔ رخصت ہوتے وقت وہ دیر تک شانوں پر ہاتھ رکھے ایک مشفق بزرگ کی طرح باتیں کرتے رہے۔ کہاں ٹھہرے ہو۔ ابھی کب تک لکھنؤ میں ہو۔ کیا کر رہے ہو۔ تمہاری چیزیں ادھر کئی پرچوں میں دیکھیں وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ ایک ایک جملہ ہمدردی، محبت، سرپرستی اپنائیت اور خلوص کا غماز تھا۔ دوسرے روز شام کو گیا تو احتشام صاحب گھر پر موجود نہ تھے۔ میں ایک سلپ چھوڑ آیا۔ بہرائچ واپس آنے کے دوسرے ہفتہ ایک خط موصول ہوا۔

بارود خانہ۔ لکھنؤ

عزیزم۔ دعائیں۔

خط ملا تھا۔ لیکن میں ادھر بہت پریشان رہا۔ میری بیوی سخت بیمار ہو گئی تھیں۔ آپریشن کر کے مردہ بچہ پیدا ہوا۔ اب بہتر ہیں ......

آپ جب لکھنؤ آئیے تو ضرور ملیے، عام طور سے صبح کو گھر ہی پر رہتا ہوں۔ شام کو دیر میں

خیر طلب۔ احتشام حسین

آج جب احتشام صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں تو ان کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ذہن میں بڑے بڑے دائرے بناتی چلی جا رہی ہیں۔ الہ آباد میں، ہندی اُردو ادیبوں کی انجمن "پرگتی" کے زیر اہتمام جدیدیت پر ایک کانفرنس ہوئی تھی۔ لکھنؤ پہنچا تو میرے ہمسفر شہاب سرمدی اور رام لعل بھی تھے۔ الہ آباد پہنچا تو رام لعل ریلوے اسٹیشن ہی پر رٹائرنگ روم میں ٹھہر گئے۔ شہاب سرمدی صاحب کی وجہ سے مجھے بھی حبیب احمد صدیقی صاحب کے یہاں قیام کرنا پڑا۔ کانفرنس میں احتشام صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بہت خفا ہوئے کہ ان کو اطلاع کیوں نہ دی۔ ٹھہرے کہاں ہو۔ گھر کیوں نہیں آئے۔ مختصر یہ کہ ہر ہر قدم پر ہر ہر بات کا اتنا خیال رکھنا اتنے بڑے، معروف اور قدآور نقاد وادیب میں ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ کیسی تقویت اور کیسی توانائی تھی ان کے دم سے، اُردو کے کاز کو، اُردو کے ادیب وشاعر کو، اُردو کے معمولی سے معمولی خادم کو۔ اردو ادب کے ٹھوس مسائل ہوں، اردو تعلیم کے مراحل ہوں یا نجی زندگی کے معاملات، ہر جگہ وہ معاون ومددگار ثابت ہوتے۔ مروّت کا یہ عالم کہ کسی کو خفا کرنے کی ان میں ہمت نہ تھی۔

غالب صدسالہ تقریبات کے سلسلے میں بہار یونیورسٹی مظفرپور میں ملاقات ہوئی۔ دن میں غالب پر ایک مذاکرہ اور شب میں مشاعرہ تھا۔ مذاکرہ میں بھی احتشام صاحب نے سب سے زیادہ سرگرمی سے حصہ لیا اور مشاعرہ میں بھی غالب پر ایک بھرپور اور جامع تقریر کی۔ رات گئے ڈاکٹر ظفر حمیدی کی کار سے ہم لوگ ریلوے اسٹیشن آ گئے۔ رزرویشن شام ہی کو ہو گیا تھا۔ اتفاق سے احتشام صاحب کو اوپر کی برتھ، مجھے اور نشور واحدی صاحب کو نیچے کی برتھ الاٹ ہوئی تھی۔ میں نے لاکھ لاکھ کہا کہ احتشام صاحب آپ کو زحمت ہوگی۔ آپ نیچے کی برتھ پر آ جائیے۔ مگر احتشام صاحب نے یہ پیش کش قبول نہ کی اور اصرار کے باوجود اپنا بستر اوپر برتھ ہی پر لگوا دیا۔ صبح ہوتے مظفرپور کانپور ایکسپریس گورکھپور پہنچا۔ احتشام صاحب کو گورکھپور میں کسی ضرورت سے رکنا تھا۔ میں نے جلدی جلدی ان کا ہولڈال باندھ کر رکھ دیا۔ اور رزرویشن وغیرہ کے سلسلے میں ان کے جو روپے میرے اوپر واجب الادا تھے، ان کو پیش کیے۔ مگر وہ کسی طرح اس پر رضامند نہ ہوئے۔ گورکھپور اسٹیشن پر چائے اور ناشتہ وغیرہ کا بل بھی خود ہی ادا کیا اور الہ آباد یونیورسٹی کے یوم غالب میں شرکت کا وعدہ لے کر رخصت ہو گئے۔ الہ آباد گیا تو اسٹیشن ہی پر یونیورسٹی کے طلباء مل گئے۔ اور مجھے مسلم بورڈنگ ہاؤس لے آئے۔ احتشام صاحب کو فون سے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ اپنی غیر معمولی مصروفیت کے باوجود وہ مسلم بورڈنگ ہاؤس آ گئے۔ ہر طرح خیر وعافیت دریافت کی اور

ہاسٹل کے لڑکوں کو کچھ ضروری ہدایات دیکر چلے گئے۔ اس وقت الہ آباد یونیورسٹی میں لندن کے ایک ادیب ڈیوڈ میتھوس آئے ہوئے تھے۔ نوجوان آدمی تھے اور بڑی خوبصورت اور رواں اردو بولتے تھے۔ ملاقات کے دوران فراق صاحب اعجاز صاحب، ہندی ادیب سمترا نندن پنت اور الہ آباد کی دیگر ادبی شخصیات کا ذکر رہا۔ مگر احتشام صاحب کی شخصیت سے وہ غیر معمولی طور پر متاثر معلوم ہوئے ایسا نہیں تھا کہ ان کا یہ رویہ اور شرافت نفس کسی خاص حلقہ تک محدود رہا ہو، بلکہ غیر معمولی لوگوں پر بھی ان کی شرافت نفس، خوش اخلاقی و وضع داری کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔

شب میں رات گئے الہ آباد یونیورسٹی کا مشاعرہ ختم ہوا۔ ہال کے ایک گوشہ میں چائے کا انتظام تھا۔ ڈاکٹر جعفر رضا، پروفیسر ڈیوڈ میتھوس (انگریز ادیب) اور اردو کے ایک جرمن اسکالر، (نام یاد نہیں رہا)، ہم لوگ اس گوشہ میں جاکر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چائے وغیرہ کا دور ختم ہوا تو احتشام صاحب نے مجھے اشارہ سے بلایا۔ سیاہ شیروانی سے ایک خوبصورت سا نیلے رنگ کا لفافہ نکالا اور میری جیب میں یہ کہہ کر رکھ دیا کہ "صرف کرایہ ہے۔ کچھ خیال نہ کرنا۔" اسٹیشن پر جب میں نے لفافہ کھولا تو اس میں ایک بڑی رقم تھی۔ میں دیر تک سوچتا رہا کہ اتنی بڑی رقم کے باوجود احتشام صاحب نے صرف کرایہ کہکر معذرت کیوں کی تھی۔ مختصر یہ کہ وہ کہیں بھی اپنی وضعداری اور رکھ رکھاؤ کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔

کئی بار ہم لوگوں نے ان کو بہرائچ کے ادبی پروگراموں میں شرکت کی دعوت دی۔ مگر ہمیشہ اپنی غیر معمولی مصروفیات یا کسی اتفاقی ضرورت کی بنا پر نہ آسکے۔ مئی ۱۹۶۲ء کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا:

بارود خانہ۔ لکھنؤ۔ ۲۳ر مئی ۱۹۶۲ء

عزیزی ساغر مہدی صاحب۔ تسلیم

خط ملا۔ آپ کو یہ معلوم ہوا ہوگا کہ میں نومبر سے الہ آباد چلا گیا ہوں۔ ادھر چھٹی میں آیا ہوں لیکن شروع جون میں چند دنوں کے لیے پھر جانا ہے۔ ۲ر جون کو مجھے الہ آباد میں ہونا ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو آنے کی ضرور کوشش کرتا۔ حالانکہ ایسی گرمی ہے کہ اگر یہی حالت رہی تو کوئی وعدہ وعدہ نہیں رہ سکتا تھا۔

بہر حال، ۲ر جون کو تو آنا ناممکن ہے۔ میں ۳۱ر مئی یا پہلی جون کو چند دنوں کے لیے الہ آباد جاؤں گا۔ امید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔

خیر اندیش ۔ احتشام حسین

ستمبر ۱۹۶۲ء میں ایک مشاعرہ کی صدارت کے لیے تحریر کیا تو اس کے جواب میں خط آیا۔

الہ آباد یونیورسٹی ۔ الہ آباد ۱۷ر ستمبر

عزیزم۔ تسلیم

ابھی آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ واقعی بہرائچ میں مشاعرہ ہے۔ اور میری صدارت میں۔ بعض حضرات نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔ لیکن مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ سعید[1] صاحب کا مجھے کوئی خط نہیں ملا۔ جواب کا کیا سوال ہے۔ اس وقت تو میرا آنا محال ہے۔ اس ستمبر کے مہینے میں میں دہلی، علی گڑھ، اجین جانے کے لیے چھٹیاں لے چکا ہوں۔ اجین سے آج ہی صبح کو آیا ہوں۔ اب اس مہینے میں نکلنا محال ہے۔ یہ محض رسمی معذرت نہیں۔ واقعی مجبوری ہے

مخلص ۔ احتشام حسین

آخری بار سومناتھ بھنجن کے ایک مشاعرہ میں ملاقات ہوئی

---

[1] محمد سعید خاں شفیق بریلوی

تھی جس کی صدارت کے فرائض کی انجام دہی کے علاوہ احتشام صاحب نے اپنی ایک غزل بہت ہی پرسوز اور مہذب دھیمے ترنم کے ساتھ سنائی تھی۔ جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔ ؎

کیوں یورشِ طرب میں بھی غم یاد آ گئے
سوچا ترے کرم کو، ستم یاد آ گئے
اے دوست میکدہ میں یہ کیسی ہوا چلی
سب فتنہ ہائے دیر و حرم یاد آ گئے
اب کیا دکھا رہا ہے رہِ ماہ و کہکشاں
ناصح کسی کے نقشِ قدم یاد آ گئے
روشن ابھی ہوا تھا سرِ جادۂ حیات
اک کاکلِ سیاہ کے خم یاد آ گئے

رات میں تقریباً ڈھائی بجے مشاعرہ ختم ہوا تو شعرائے کرام کی جائے قیام کی کھلی چھت پر چاندنی بچھا دی گئی۔ اور ڈاکٹر مسیح الزماں، جاں نثار اختر، شمیم کرہانی، نازش پرتاپ گڈھی، رفعت سروش، زبیر رضوی، مسعودہ حیات، ہلال سیوہاردی، بشیر بدر اور راقم الحروف وغیرہ (کئی نام اس وقت ذہن سے اتر گئے ہیں) کے حلقے میں ایک گاؤتکیہ کی ٹیک لگائے احتشام صاحب تمام رات کی جاگ اور صدارت کی طویل بوریت کے باوجود مقامی شاعر فضا ابن فیضی سے ان کا کلام پوری توجہ اور ذہنی بیداری کے ساتھ سنتے رہے یہاں تک کہ سپیدۂ صبح نمودار ہو گیا۔ وہ الہ آباد سے بنارس ہوتے ہوئے ایک ایش کلر کی کار پر سوناتھ بھیجن آئے تھے۔ سب سے فرداً فرداً رخصت ہوئے۔ یہ کیا معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ رخصت ہوتے وقت ہم لوگوں نے خدا حافظ کہا اور چھت کے زینوں سے نیچے سڑک تک ان کو رخصت کرنے آئے تھے۔ پھر سرمئی کار صبح کے سرمئی دھندلکوں میں گم ہو گئی تھی اور پھر یکم دسمبر ۷۲ء کو آل انڈیا ریڈیو نے یہ منحوس خبر سنائی کہ آج پروفیسر سید احتشام حسین کا الہ آباد میں انتقال ہو گیا۔ ؎

"ہوائے غم کا کہیں ختم سلسلہ ہو گا
چراغ بجھتے چلے جا رہے ہیں کیا ہو گا۔"

★

احتشام صاحب، کچھ منتشر یادیں

(صفحہ ۳۶ کا بقیہ)

دو کمیٹیوں یعنی ادبی کمیٹی اور تعلیمی کمیٹی میں رکھا گیا۔ دونوں ذیلی کمیٹیوں اور بڑی کمیٹی میں وہ بڑے فعال رکن تھے۔ ان کی ذات گجرال کمیٹی کے لیے بیش بہا متاع تھی۔ ان سے بہت مدد ملتی۔ اب اس خلا کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اس کمیٹی کے سلسلے میں مجھے ان سے اور زیادہ ملنے جلنے کا موقع ملا۔ وہ اردو یونیورسٹی کو بالکل غیر مفید جانتے تھے۔ ایک بار گجرال کمیٹی کے اجلاس کے باہر مجھ سے اس موضوع پر بات کرنے لگے اور پھر چار پروفیسروں کا نام لے کر کہا کہ معلوم نہیں یہ چاروں اردو یونیورسٹی کے پرجوش وکیل کیوں ہیں۔

متعدد کمیٹیوں اور کانفرنسوں میں ان سے ملنے، ان کے خیالات سننے اور ان کے قریب آنے کے مواقع روز افزوں ہوتے گئے۔ سری نگر کی اساتذۂ اردو کانفرنس میں تین دن تک ان کے ساتھ ایک کمرے میں قیام کرنے کا حسن اتفاق ہوا۔ ان سے متعلق متعدد یادیں ذہن میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے کئی ایسی ہیں جن میں زندہ دوستوں کے نام درمیان میں آتے ہیں۔ فی الحال ان کا ذکر نہ کرنا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔

یقین نہیں آتا کہ احتشام صاحب ہمارے درمیان میں نہیں رہے۔ ان سے کبھی ملنا نہ ہو گا۔ کبھی کبھی تو یہ سوچ کر دم گھٹنے لگتا ہے۔ یہ تمام کمیٹیاں اور کانفرنسیں اور زندگی کی تمام دوڑ دھوپ غیر مفید اور بے مصرف معلوم ہونے لگتی ہے۔ ان جیسا عالم اور ان جیسا نیک اور انکسار پسند آدمی پھر کہاں ملے گا؟ یونیورسٹیوں میں بہت سے پروفیسر ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک اور دوسرے پروفیسر ہیں۔ اپنے مایۂ علم کو دیکھ کر ان کے بڑے پن کا اندازہ ہوتا ہے۔

غ جو بادہ خوار پرانے تھے، اٹھتے جاتے ہیں۔

★

دبناکہ۔ جنیٹو ۵۰۹۸۱ اشک

دامنِ اشک ہے شفق آلود
گلہائے عقیدت

(قطعہ)

احتشام کی یاد میں

جمیل مظہری

یہ بلاؤں کا نزول اور یہ مصائب کا ہجوم — ابنِ آدم متردّد متفکّر مغموم
کوئی سمجھا نہ جمیل اس چمنستاں کا مزاج — لالہ و گل کے لیے بادِ صبا بھی ہے سموم
احتشام آہ! وہ انسان کہ سیرت جس کی — حرف شائستگی و لفظ وفا کا مفہوم
آہ! وہ شاعر و دانشور و نقّاد و خطیب — زیب کرسیِ ادب زینتِ ہر بیتِ علوم
عارف نبض سخن مالکِ فن سالکِ فن — خادم دانش و دیں اہلِ ادب کا مخدوم
ہوسِ مرگ کا لقمہ ہوا وہ بھی ناگاہ — دل بھر آتا ہے کیونکر اسے کہیے مرحوم
طلبا مضطرب الحال، اعزا بے آس — آسماں ہی نہ رہا جب تو کہاں جائیں نجوم
اپنی لو تیز کریں کیا مہ و انجم کے چراغ — پرتوِ مہرِ درخشاں سے ہوے ہیں محروم
سوگوارانِ تجلّی کہیں اناللہ — کہ اندھیرا ہی حقیقت ہے اجالا معدوم
صبر اک جبرِ طبیعت دلِ نالاں مجبور — موت ایک ظلمِ مشیّت ہی محبّت مظلوم

مظہری شدّتِ جذبات سے ماؤف تھا ذہن
کس طرح ہو گئے افکارِ پریشاں منظوم

یہ نظم احتشام حسین صاحب کے سانحہ ارتحال پر غلام احمد فرقت کاکوروی نے نیا دور کو بغرض اشاعت بھیجی تھی۔ کیا معلوم تھا کہ نظم کی اشاعت سے قبل وہ خود بھی ہمیں سوگوار بنا جائیں گے۔ ذیل میں وہ خط بھی بجنسہٖ شائع کیا جا رہا ہے جو نظم کے ساتھ مرحوم فرقت بھائی نے راقم الحروف کو بھیجا تھا۔ نظم سے متعلق نوٹ بھی مرحوم ہی کا لکھا ہوا ہے۔ ایڈیٹر

۱۷۰۵ بہادر گڑھی پیو جلہ۔ دلی
۲۲ دسمبر ۷۲ء

ڈیر خورشید!
احتشام صاحب کے بارے میں چند اشعار بھیج رہا ہوں۔ چھاپ دو۔ آج کل دوروں کا زور ہے۔ احتشام صاحب کے بارے میں ابھی اس قابل نہیں ہوں کہ ایک حرف لکھ سکوں۔ ان کے انتقال کی خبر سن کر دو روز تک مسلسل دورہ پڑا رہا۔

مخلص
فرقت کاکوروی

پروفیسر مرحوم

غلام احمد فرقت کاکوروی

کس کو یقین آئے کہ یوں احتشام حسین ... دنیا سے بے بتائے ہوئے روٹھ جائیں گے
کیسے یقیں کروں کہ جو جان حیات ہوں ... وہ کس طرح حیات سے آنکھیں چرائیں گے
دانش محل[1] کو آج تک اس کا یقیں نہیں ... اب احتشام تا بہ ابد پھر نہ آئیں گے
کہتے ہوئے سنا ہے سبھوں نے شمیم[2] کو ... کچھ بھی ہو سیر کو وہ بہر حال آئیں گے
شاید یہ ہو گیا ہے ہویدا کسی پہ راز ... اب احتشام ملک بقا سے نہ آئیں گے
ہے اہل لکھنؤ کو بھی سوچ رات دن ... اب کس کے انتظار میں پلکیں بچھائیں گے
ہیں سینہ چاک شمس[3] کلیجہ مسوس کر ... دانشوروں میں گیت وہ اب کس کے گائیں گے
فرقت کو اس کا غم ہے کہ ہر سال آہ وہ ... کس کی کریں گے دعوتیں کس کو بلائیں گے

---

[1] پروفیسر احتشام مرحوم سے میری سب سے پہلی ملاقات مکتبہ دانش محل لکھنؤ میں ۱۹۳۸ء میں جب وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں پہلے پہل اردو کے لکچرر مقرر ہوئے تھے۔ یہ مکتبہ ڈاکٹر اعظم کریوی مرحوم کے چھوٹے بھائی اسرار احمد آزاد نے قائم کیا تھا جسے بعد میں جناب نسیم احمد صاحب نے اسرار احمد صاحب سے خرید لیا۔ جب تک احتشام صاحب لکھنؤ میں رہے ان کے کسبِ سعت کے اوقات یہیں گزرتے۔ مقامی شعرا اور ادبا بھی شام کو یہاں آکر بیٹھتے تھے۔ بعد میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے جو لکھنؤ کے اپنے قیام میں اپنے فرصت کے اوقات اپنے استاد پروفیسر احتشام ہی کے ساتھ مکتبہ میں گزارتے تھے، دانشوروں کی ایک انجمن بھی حلقہ ارباب دانش کے نام سے قائم کر دی تھی جس کی نشستیں ایک زمانے تک ہوتی رہیں۔ مقامی شعرا اور ادبا میں جو لوگ اکثر و بیشتر آنے والوں میں تھے ان میں سے چند خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین، مولانا اختر علی تلہری، نجم الدین شکیب۔ وجاہت سندیلوی، افتخار احمد۔ مجیب سہالوی، صباح الدین عمر موجودہ سکریٹری یو۔ پی اردو اکیڈمی، شمیم کرہانی، پروفیسر نسیم قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، مسیح الحسن رضوی، سید خورشید احمد موجودہ ایڈیٹر نیا دور لکھنؤ، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، پروفیسر نجم الدین نقوی، شفاعت علی سندیلوی، شبیہ الحسن نونہروی، انسر میرٹھی، سید علی عباس حسینی مرحوم، جناب اثر لکھنوی مرحوم، پروفیسر مسیح الزماں، پنڈت کشن پرشاد کول آنجہانی، مجاز ردولوی، مولانا امیر حسن نورانی اور اسی پایہ کے اور بہت سے۔ ان کے علاوہ باہر سے جتنے بڑے بڑے شعرا اور ادبا آتے وہ بھی ادیبوں کا انکوائری آفس سمجھ کر سب سے پہلے دانش محل میں آتے اور یہ چیز محض نسیم احمد صاحب دانش محلی کی خوش اخلاقی کی وجہ سے تھی۔

[2] شمیم کرہانی جو احتشام صاحب کے ہم زلف ہیں اور آج کل دلی میں راقم الحروف کے ساتھیوں میں ہیں۔

[3] مولانا محمد حسین شمس پروپرائٹر انوار بکڈپو و ادارۂ فروغ اردو جس کی بنیاد پروفیسر احتشام، مولانا امیر حسن نورانی، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، انصار حسین برادر حقیقی پروفیسر احتشام حسین اور ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی وغیرہ کے مشورے سے رکھی گئی۔

یہ سوچ کر حبیب[4] کی آنکھوں میں اشک ہیں — ہر سال کس کو آم[5] بلا کر کھلائیں گے
غالب میں اور آم میں جو ربط خاص تھا[6] — اب کیسے احتشام سبھوں کو بتائیں گے
غالب کی بزم[7] انیس کا بانی نہیں رہا — اب کس کے ساتھ بیٹھ کے سب آم کھائیں گے
اس سوگ میں نسیم[8] کی آنکھیں ہیں خوں فشاں — اب خیریت کو ڈاک سے خط کس کے آئیں گے
لاری[9] کو اس کا غم ہے کہ اب بزم میر میں — دانش وروں کا صدر کسے وہ بنائیں گے
کس کی نوازشوں کی انھیں یاد آئے گی — اب کس کے مشوروں کو گلے سے لگائیں گے
نقوی[10] کو اس کا غم ہے کہ غم خوار اٹھ گیا — اب کس کو غم گسار وہ اپنا بنائیں گے
ہر سال رام پور[10] کی بزم ادب میں وہ — نقد و نظر کے واسطے کس کو بلائیں گے
اور ہم کو اس کا غم ہے کہ دانش محل میں ہم — اب چھٹیوں[11] میں بیٹھ کے کس کو ہنسائیں گے

اے احتشام تم کو یقیں آئے یا نہ آئے
جب تک ہے زندگی نہ تمھیں ہم بھلائیں گے

---

[4] راقم الحروف کی حقیقی بہن حبیب بانو ایم اے جو احتشام صاحب کو اپنا محسن اور حقیقی بھائی سمجھتی تھی اور جس کی تحریک پر "غالب اور آم" کے نام کی سالانہ دعوت پروفیسر احتشام کے اعزاز میں ہر سال ہوتی تھی اور اس تقریب کے صدر بھی پروفیسر احتشام ہی ہوتے تھے۔ پہلے اسی قسم کی تقریب مولانا محمد حسین شمس کے دولت کدہ پر احتشام صاحب کے اعزاز میں ہوتی تھی، رحیم آباد میں مشتاق اختر صاحب نے بھی دو ایک مرتبہ اس قسم کی تقریب کی تھی جس میں پروفیسر احتشام حسین شریک ہوئے تھے۔ پروفیسر نجم الدین صدر شعبۂ اردو، رام پور ڈگری کالج سے سال بھر تک اس تقریب کے سلسلے میں خط و کتابت رہی۔ راقم الحروف کے یہاں جو تقریب ہوتی تھی اس میں بہترین قلمی اور تخمی آموں کا انتظام میری بہن کرتی۔ آئس کریم کا انتظام میرے حقیقی بھائی عزیزی احمد توفیق علوی کرتے اور بقیہ انتظام راقم الحروف کرتا۔ اس تقریب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ہر شاعر اور ادیب خواہ وہ مقامی ہو یا بیرونی بغیر دعوت نامہ کے تقریب کے دن مدعو رہتا۔ جناب نسیم احمد صاحب دانش محلی تمام ادبا اور شعراء کو تقریب کی تاریخ سے مطلع کرتے رہتے تھے۔

[5] آموں کا انتظام حبیب بانو کرتیں۔ [6] اس تقریب کا نام غالب اور آم ہوتا۔ [7] بزم انیس اسی دعوت کی طرف اشارہ ہے [8] نسیم احمد پروپرائٹر دانش محل، لکھنؤ، جن سے احتشام صاحب کے الہ آباد جانے کے بعد سال بھر تک خط و کتابت رہتی۔ [9] مقبول احمد لاری رئیس لاری جن کی کوٹھی اقبال منزل لکھنؤ میں ہے اور جو اکثر لکھنؤ ہی میں قیام فرماتے ہیں۔ میر اکیڈمی اور دوسری ادبی تقریبوں میں وہ اپنے استاد پروفیسر احتشام حسین ہی سے مشورہ لیتے تھے اور الہ آباد جانے کے بعد جب احتشام صاحب لکھنؤ آتے تو ان کے اصرار پر اکثر انھیں کے ہاں قیام فرماتے۔ [10] پروفیسر نجم الدین نقوی راقم الحروف کی طرح گرمیوں کی چھٹی میں بیشتر وقت پروفیسر احتشام کی معیت میں گزارتے۔ [11] ہم لوگ پروفیسر احتشام کے ساتھ شام کا وقت ہنسی مذاق میں گزارتے ادیب صلاح الدین عمر صاحب جو میرے مخلص ترین دوست ہیں اور جو سے بقول ان کے میری چال میں چند ماہ تک لڑائی رہتی، آجاتے اور کوئی زبردستی کا اختلافی مسئلہ اٹھا کر مجھ سے لڑائی شروع کر دیتے تو ثالث احتشام صاحب ہوتے اور اکثر و بیشتر جرمانہ مجھی پر ہوتا اور جرمانے کی ادائیگی کسی ہوٹل میں دعوت کی شکل میں ہوتی۔

فضا ابن فیضی

(بیادِ احتشام حسین)

امینِ حرف و معانی
متاعِ لوح و قلم
نگاہدارِ بصیرت
ضمیرِ فکر و نظر
ترا شعور ہے آغوشِ اعتبارِ نظر
ترا خیال ہے گہوارۂ نمودِ ہنر
ز فرق تا بہ قدم تھا ترا وجود حسین
سوادِ لوحِ بصیرت، بیاضِ چشمِ ہنر
تو جس کی سطح سے سو آفتاب اچھال گیا
تری وہ رات تھی معیار سنجِ حسنِ سحر
صدف صدف تو رہا بن کے آبروئے گہر
دھواں دھواں ادب و فن کے غبار دار نقوش
ترے قلم سے بہارِ خجستہ پیدا کی
فروغِ رنگ تھا پرتو تری ذہانت کا
چمک رہی ہے جبیں شاہدانِ معنی کی
وہ جوشِ ابرِ قلم، وہ جواں خرامیِ ذہن
گزر رہی ہے رگِ پے سے موجِ دریا کی
کلاہِ شعر و ادب میں سجا دیا اس کو
وہ لالہ تھا جو امانت نگارِ صحرا کی

ترے قلم نے سنواری بصیرتوں کی شفق
چراغِ انجمنِ حیرتِ نظر تھا تو
روایتوں کو دیا تو نے تجربوں کا گداز
کفِ شعور پہ بکھری ہوئی سحر تھا تو
یہاں کوئی بھی تری رفعتوں کو چھو نہ سکا
نشانِ عظمتِ خلاقیِ ہنر تھا تو
ترا وہ ذوقِ سلامت روی و نکتہ رسی
جدید ہو کے روایت کا پاسدار بھی تھا
عطا کی جائزۂ فن کو فن کی حیثیت
ادب سے جوڑے حیات اور سماج کے رشتے
زباں کو عصری مسائل سے روشناس کیا
یہ کاوشیں ہیں تری کس قدر خیال افروز
تو مطمئن تھا کہ یہ فرض خوشگوار بھی تھا
کہاں تھی اردو زباں میں یہ نقدِ فن کی ادا
چھڑک کے مغربی افکار انتقاد کا رس
زمینِ شعور کو گل ریز و لالہ زار کیا
تری گرفت میں تھی مشرقی شعور کی رو
ترا قلم نئی قدروں کا اعتبار بھی تھا
نگاہِ حالی و شبلی جہاں پہنچ نہ سکی
اُتر گیا تھا تو ایسی تہوں کے اندر بھی
تراشے تو نے نئے فلسفوں کے پیکر بھی
مری نظر میں تو ساحل بھی تھا سمندر بھی

ــ اور قلم چلتا رہا

احتشام صاحب اپنی تحریر پر نظرثانی کرتے ہوئے

زمانۂ طالب علمی میں (١٩٣٤ء)

احتشام حسین

(اوپر وسط میں) لکھنؤ یونیورسٹی کی ملازمت میں آنے کے بعد
(اوپر بائیں) دانشور اور ممتاز نقاد کی حیثیت سے
(نیچے وسط میں) افراد خاندان کے ساتھ۔ بائیں کنارے پر احتشام صاحب کے خسر بیٹھے ہیں

تصویروں کے آئینے میں

(اوپر دائیں) لکھنؤ کے قیام کے ابتدائی دور میں ریڈیو سے تقریر نشر کرتے ہوئے
(اوپر بائیں) آل انڈیا ریڈیو الٰہ آباد سے تقریر نشر کرتے ہوئے (١٩٦٩ء)
(نیچے) لندن میں اپنے عزیز قریب آل حسن صاحب کے ساتھ ١٨ جون ١٩٥٢ء

کہاں چمن میں تھا پہلے یہ سوز و درد فروغ
بلند شعلۂ محلِ گلاب تجھ سے ہوا
یہ تجربوں کا رویہ، یہ تجربے کا خلوص
نقادوں کا یہ سنجیدہ و بلیغ اظہار
تپا ہوا یہ تفکر کی آنچ میں لہجہ
یہ بولتی ہوئی تحریر، جاگتا احساس
غبارِ راہ، زرِ آفتاب تجھ سے ہوا
مری زباں میں یہ تنقید کا جدید اسلوب
رواج یافتہ و کامیاب تجھ سے ہوا

وہ تیری صلح پسندی وہ نرم گفتاری
تجھے پسند نہ تھا شیوۂ دل آزاری
مزاج و ذہن کچھ اتنا لطیف رکھتا تھا
کبھی گلہ نہ رہا اپنے معترض سے تجھے
حریف کو بھی بنا کر حلیف رکھتا تھا
لہو سے فصلِ معانی تجھے اگانا تھی
تو انتیاز ربیع و خریف رکھتا تھا

کسے ملا ترے فکر و مشاہدہ کا عمق
تو اپنی ذات سے اک بحرِ بے کرانہ تھا
"سفینۂ زرِ گل"[1] آج منتظر ہے ترا
کہ تو بہار کا عنوان دلبرانہ تھا
یہ بلبلانِ زبان و قلم کہاں جائیں
وہ شاخ ٹوٹ گئی جس پہ آشیانہ تھا
وہ پھول اب ہیں نہ وہ خوشبوؤں کی ہمسفری
ترے بغیر ہے بوجھل فضائے دیدہ وری
سرورِ خوش سخنی ہے نہ کیف خوش نظری
نظر خموش، لبِ گفتگو اداس ہے آج

ہوا ہے مدرسۂ آگہی میں سناٹا
یہاں ہے کون جو اس ریخت و شکست کے بعد
ہمیں سلیقہ و آدابِ فن سکھائے گا
چراغ فکر کی محراب میں جلائے گا
قریب بیٹھے گا اور تشنگی بجھائے گا
تمام کارگہِ فکر و فن ہے ماتم زار
یہی نہیں کہ فقط لکھنؤ اداس ہے آج
یہ کس نے پھاڑ دیے دل کے صفحے بکھرے کیا
سخن غمیں، قلم مشکبو اداس ہے آج

نازِ قرطاس وقلم

• سید اولاد اصغر رضوی اصغر ماہلوی[2]

اک نگاہِ لطف نے تیری بنا دی زندگی
آدمی گر تجھ کو کہیے، اتنا مکمل آدمی
اللہ اللہ خلق کا تیرے تصرف احتشام
سادگی پاس آکے تیرے بن گئی پاکیزگی
شاعر و نقاد، عالم، نازِ قرطاس و قلم
اک سراپا انکسار، اک پیکرِ روحِ خودی
کہتے ہیں اس کی ہزاروں سال تک تھی جستجو
ہوگئی تھی تجھ سے آسودہ مگر یہ دوری
فخرِ دوراں! تیرے اس دنیا سے اٹھنے کی خبر
مجھ کو کیا معلوم تھا ایسے اچانک آئیگی

یاد تیری درد بن کر آج ہر اک دل میں ہے
رہنمائے علم و دانش اب تو کس منزل میں ہے

اے خدائے پاک برتر یہ تو بتلا دے ہمیں
جو جدا ہوتا ہے اسکی یاد تڑپاتی ہے کیوں
کیوں نقوشِ زندگی بنتے ہیں مٹنے کیلیے
جاگنے کی جب ضرورت ہو تو نیند آتی ہے کیوں
کیوں اندھیری رات آتی ہو ڈرانے کیلیے
روشنی پھیلانے والی شمع بجھ جاتی ہے کیوں
منتظر ہوں جب جگہ گرداب منہ کھولے ہوئے
زندگی کی ناؤ ایسے موڑ پر آتی ہے کیوں
یہ معمہ فکرِ انساں سے سلجھ سکتا نہیں
جسکو سب چاہیں وہی تصویر مٹ جاتی ہے کیوں

ہو سکے لیکن کسی کا زور چل سکتا نہیں
دل میں وہ کانٹا چبھا ہے جو نکل سکتا نہیں

•

[1] میرا مجموعۂ کلام جو طباعت کے مراحل میں ہے (فضا)

[2] احتشام صاحب کے چھوٹے بھائی

(عمر انصاری)
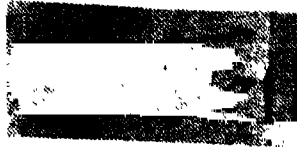
(قطعہ)

جادو فلک کا پھر مری دنیا پہ چل گیا
جھپکی ہی تھی بس آنکھ کہ منظر بدل گیا
شاید کہ احتشام کے پیکر میں اے عمر
ٹکڑا تھا اک ابر کا برسا نکل گیا

(نظم)

ادب نواز، ادب دوست، اور ادب پرور
خطاب ختم یہ سب احتشام صاحب پر
لبوں پہ حسن تبسم کی جلوہ ارزانی
نظر میں خلق و محبت کی حد امکانی
مزاج، جس میں کہ خوش بو گلاب و ریحاں کی
کلام، جیسے پھواریں ہوں ابر نیساں کی
دماغ، علم و ذہانت کا مخزن نایاب
مذاق، سارے زمانے میں آپ اپنا جواب
لباس، سادہ و پر نور، دل کش و دل شاد
خیال، جس پہ تصدق ہوں غنچہ ہائے مراد
ادا ادا میں تھا آباد اک جہان طرب
سخن سخن کہ قسم کھائیں جس کی اہل ادب
زمانے بھر میں تھا مشہور اُن کا طرز بیاں
وہ باغ علم تھے وہ جس کا خوشہ چیں ہے جہاں
خیال اُن کا بلند اور نگاہ ان کی عمیق
ادب کی جان تھے وہ، رُوح اُن کی ہر تحقیق
کتابیں اُن کی خزینہ ہیں علم و حکمت کا
ریسرچ اُن کی نمونہ ہے باغ جنت کا
نگاہ عیب تعصب سے تھی بری اُن کی
ہر ایک کے لیے تھی شاخ گل ہری اُن کی
وہ ایک غنچۂ نورس تھے ہر چمن کے لیے
وہ اک چراغ ہدایت تھے اہل فن کے لیے
اندھیری رات میں اب بھی چراغ طور تھے وہ
نئے زمانے، نئی نسل کا شعور تھے وہ

وینکہ۔ جیٹھ ۱۸۹۵ شک

تصویر دیکھ کر

جعفر عسکری

والد محترم
تیری تصویر کی خامشی دیکھ کر
فرشِ احساس پر
حرفِ گویائی کے
گل بکھرنے لگے

پھر یوں ہی
بامِ لب پہ خیالوں کے پیکر سنورنے لگے

تیری تصویر صدق و صفا دیکھ کر
دشت احساس میں
بحر اخلاص و پاکیزگی موج زن ہو گئے
دل کی ویراں گزرگاہ پر
صورت کوہ آتش فشاں
آرزوں، امیدوں، تمناؤں کا
سرخ لاوا اُبلنے لگا

دل مچلنے لگا
تیری تصویر کی سادگی دیکھ کر
عرشِ احساس پر
سات رنگوں کی قوس قزح کا تصور اُبھرنے لگا

اور پھر یوں لگا
جیسے تو رکھ کے بستر پہ سادہ ورق
لے کے ہاتھوں میں شاخ قلم
ندرتِ نقد و افکار کے
رنگ بھرنے لگا
جانے کیوں آج پھر
تیری تصویر کی سادگی دیکھ کر
خامشی دیکھ کر
رنگِ تحریر و تقریر
دل کے سادہ ورق پر
اترنے لگا

یادِ احتشام

بجھ گئی وہ شمع جس سے تھی منور انجمن
پھول وہ مرجھا گیا، جو تھا بجائے خود چمن

انقلاب آیا فضا بدلی ہوا سورج نہاں — ہوگئی بیدار اداسی بڑھ گئیں تاریکیاں
شورِ دریا تھم گیا نبضِ زمانہ رک گئی — سر برہنہ ہو گیا ہوش و خرد کا کارواں
غم کی بجلی نے جلا ڈالی سکوں کی کائنات — بے توقع بے ارادہ بے یقین و بے گماں
شدتِ غم سے گریباں چاک ہے اردو ادب — سینۂ تنقید سے اٹھتا ہے رہ رہ کر دھواں
غنچہ و گل نکلے ہیں پہنے ہوئے غم کا لباس — ظلمتوں کی ہے جہاں بانی جہانِ ندرِ جہاں
موت کے بے رحم ہاتھوں نے کیا ایسا ستم — ہوگئے اہلِ ادب کی آنکھ سے آنسو رواں
اس خبر پر اور کیا اس کے سوا ہو تبصرہ — ایک کوہِ غم تھا جو ٹوٹا ہے ہم پر ناگہاں
ہوگئی ہے اس ادیب و شاعر و ناقد کی موت — عالمِ دانش پہ جو کرتا رہا دارائیاں
توڑ ڈالا بے مروت موت نے وہ آئینہ — دیکھتا تھا جس میں اپنا منہ ادب کا کارواں
یوں اداسی بن کے چھایا ہے فراقِ احتشام — جیسے رونق سے عبارت ہی نہ تھا اپنا جہاں

چھٹ گیا ہم سے ہمارے قافلے کا سربراہ
مدتوں نظارۂ منزل کو ترسے گی نگاہ

بے مروت موت ظالم موت تو نے کیا کیا — روشنی لے لی، زمانے کو اندھیرا دے دیا
ہوگئی ہر آنکھ نم ہر دل میں مکیں افسردگی — گھر گیا تاریکیوں میں ہر اجالا گھر گیا
تھم گئی ہے چلتے چلتے نبضِ عصرِ تیز گام — وقت کا چہرہ تغیر کا نمائندہ بنا
پھول ہنسنے کے بجائے آبدیدہ ہوگئے — اختیار ایسا کیا ظالم قضا نے راستا

عالمِ فہم و فراست میں تھا جو اپنا جواب — مانتے تھے اہلِ دانش جس کو اپنا رہنما
وائے بر تو موت! اے خود کام اے بے درد موت — کرگئی تیری روش دنیا کو دل غم آشنا
تیرے تیز و تند جھونکے ہوگئے تمہیدِ حشر — موجِ طوفانِ قضا، اے موجِ طوفانِ قضا
کاکلِ اردو کے پیچ و خم کیے ہیں جس نے صاف — آج ہم سے تو نے اس عالی نظر کو لے لیا
احتشام ایسے شریف النفس دانشور کی موت — نسلِ نو کو خون کے آنسو رلائے گی سدا
جس کی صدیوں میں تلافی کی کوئی صورت نہیں — وقت سے پہلے ہوا ہے رونما وہ سانحا

احتشام ایسے عظیم انساں کی رحلت ہوگئی
مصحفِ اردو ادب سے کم اک آیت ہوگئی

اپنے جھونکوں سے بجھا کر شمعِ عمرِ احتشام — موت نے ہم سے لیا ہے کتنا سنگیں انتقام
اپنی فطرت اپنی خود کامی پہ اتنا خوش نہ ہو — کتنے دل توڑے ہیں یہ بھی دیکھ لے محشر خرام
ایک ایسے منفرد ناقد کو ہم سے لے لیا — اپنی تحریروں سے بدلا جس نے فرسودہ نظام
اب دیارِ نور و رحمت میں ہوا ہے وہ مقیم — جس کو کہیے ساقیِ میخانۂ علم و کلام
کر دیا جس نے ادب کو زندگی کا آئنہ — بھیجتا ہے اس کی خدمت میں عقیدت کا سلام
جس کی فرقت کے اثر چھلکا گئے ہر جامِ چشم — صدرِ بزمِ اہلِ بینش خیر خواہِ خاص و عام
اس کے غم کی نذر کرتا ہوں یہ کہہ کر نظم میں — جس نے بلقیسِ ادب کے ناز اٹھائے صبح و شام

اب نئی تاریخِ ادب کی جب بھی لکھی جائے گی
تیری چوکھٹ چومنے چشمِ مورخ آئے گی

اُسے تحریریں دیکھو

پروفیسر
سید احتشام حسین
کی
وفات پر

وقار خلیل

وہ سرچشمہ کہ جس سے کتنی ہی نہریں ابلتی ہیں

وہ موجِ خوں گزر جائے جو سر سے

روشنی ہی روشنی، فکر و نظر، تہذیب و دانش

وہ خوشبو جو نئے ذہنوں کو مہکاتی رہی برسوں

وہ اک مکتب کہ جس سے علم و فن کی سربلندی تھی

——— کچھ ایسا ہے کہ پردہ کر گیا ہے

اسے تحریر میں دیکھو،

اُسے تنقید میں ڈھونڈو

اُسے ابلاغ کی پگڈنڈیوں پر ضوفشاں پاؤ

وہ موتی جو ڈھلک کر آنکھ سے دامن میں لرزاں ہے

وہ موتی اک صحیفہ ہے

وہ موتی اک دبستاں ہے

وہ موتی آبروئے فکر و فن کی اک علامت ہے

ادب، تاریخ اور تہذیب کی راہوں میں زندہ ہے

قلم چلتا رہا

پروفیسر
سید احتشام حسین کی
یاد میں

کلیم تسنیم

قلم چلتا رہا، لکھتا رہا نقد و نظر، تنقید و افسانہ

کبھی شعر و ادب، حرف و حکایت

سوختہ جاں — تشنہ کام و دہن افراد کے قصے

کبھی محنت، محبت، فلسفہ، منطق

نظر کی روشنی ماحول کو، تحریک کو، تجدید کو جانچے

کھرا کھوٹا بتائے، آگہی بانٹے

وہ آئینہ جو ہر چہرے کے خال و خد سے واقف تھا

جو آئینہ در آئینہ رموزِ حکمت و دانش بتاتا تھا

وہ ٹوٹا ہے:

تو کرچیں ریزہ ریزہ

ظلمتوں میں جگنوؤں کی طرح روشن ہیں:

ثمر ھلوری

ترقیِ بشریت کی عبث ہیں تدبیریں — نہ مٹ سکیں گی یہ لوحِ جبیں کی تحریریں
سمجھ میں خواب تضاد تک نہیں آتا — حدودِ فہم میں ہوتی ہیں لاکھ تعبیریں
جو عکس وقت کے آئینے میں ابھرتا ہے — اُسے مطابق ہیں تو آشکار تنویریں
بہ اعتبارِ نظر ہیں مسائل و افکار — غمِ حیات کی سمجھے گا کون تفسیریں
جو اک زمانہ کو دیتا تھا درسِ فکر و نظر — کہو اب اس کے جنازے پہ پانچ تکبیریں

نہ خلق ہوگا کوئی اور احتشام حسین
ہے سوگوار نیا دور احتشام حسین!

جہانِ علم کے سورج کو لگ چکا ہے گہن — اندھیرے دشت کی مانند ہے سوادِ فن
کہوں میں کیسے غمِ ہجرِ احتشام میں آج — گلوں نے چاک کیے اپنے اپنے پیراہن
صدائے آہ نکلتا بہ دشت جاتی ہے — لپٹ کے روتی ہے بادِ صبا سے بوئے چمن
کھلیں نہ غنچے تبسم کے باغِ ہستی میں — غموں کی فوج ہے شہرِ خوشی میں خیمہ زن
مسلمہ یہ حقیقت ہے احتشام کی ذات — تھی وجہ نازشِ بھارت کہ وہ تھا فخرِ وطن

جگہ جگہ چلے خورشید انتقاد کی بات
فروغِ حسنِ سخن ہے کسی کی یاد کی بات

ہر طرح جو حسینی تھا احتشام حسین — نہیں وہ ہم میں ہے اب خادمِ زہیر و قین
مذاکراتِ ادب میں ادیبِ غالب تھا — وہ احتشام بہ فیضانِ شاہِ بدر و حنین
اداس اداس ہے شہرِ سخن دیارِ ادب — غمِ فراق اسی کا ہے آج باعثِ بین
خیالِ مصرعۂ تاریخ میں تھا سرگرداں — یہ فکر وہ تھی کہ ملتا نہ تھا دماغ کو چین
ثمر یہ آئی دلِ یاس سے صدا کہ لکھو — حدودِ قبر میں ہے سید احتشام حسین
۲+۱۳۹۱=۱۳۹۲ھ

صدائے آہ سے کہرام ہے زمانے میں
غضب کا درد ہے مرحوم کے فسانے میں

تیرا لکھا مستند تیرا کہا معتبر
تنقیدات

احتشام حسین

اور

جدید اردو تنقید

ڈاکٹر شارب ردولوی

تاریخی اعتبار سے اردو تنقید کی ابتدا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے کی جاتی ہے اس لیے کہ حالی نے سب سے پہلے ادب کی تفہیم کے سلسلے میں بعض اصولوں اور نظریات کو مرتب کرنے کی کوشش کی۔ مقدمہ میں انھوں نے پہلی بار ایک ایسا پیمانہ پیش کرنے کی کوشش کی جس پر ادب کے محاسن و معائب کو پرکھا جا سکتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مقدمہ شعر و شاعری نے اردو میں ایک ایسے دور کا آغاز کیا جس میں تنقید کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اور جس نے اردو تنقید کو خالص جمالیات یا ادب کو شخصی پسند و ناپسند کے دائرے سے نکال کر ایک ایسی فضا دی جس میں صرف فنکاری یا مرصع سازی کے مقابلے میں مواد، تجربے اور مشاہدے کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ اردو تنقید کی اسی روایت کو جس کا پودا حالی نے لگایا تھا احتشام حسین نے آگے بڑھایا اور اسے ایک فن کی صورت دی۔

موجودہ عہد میں مغربی علوم سے واقفیت، نئے نفسیاتی اور سائنسی انکشافات، انسان اور سماج کے رشتوں کی اہمیت، حسن اور فن کے بدلتے ہوئے معیار نے تنقید کو بھی مختلف خانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ادب کے بارے میں اب صرف یہ تصور کہ اس کا مقصد صرف حظ یا لطف اندوزی اور تفریح کا سامان بہم پہنچانا ہے نہیں رہا۔ زندگی اور ادب کے اٹوٹ رشتوں کو مان لینے کے بعد اس کا احاطہ اتنا وسیع ہو گیا کہ تمام علوم و فنون، نئے تجربات و مشاہدات اور ان کے اثرات ادب کے مطالعے اور اس کی پرکھ کا جز بن گئے۔ صرف انتخاب الفاظ، تشبیہ و استعارات محاوروں کا برمحل استعمال، رعائتِ لفظی، ندرتِ بیان، قوافی اور ردیف کو مختلف انداز سے نظم کرنے کی ذہنی کسرت، عروض اور فن شعر گوئی پر غیر معمولی زور ہی تنقید نہیں رہی بلکہ جدید دور میں تنقید کے مختلف دبستان وجود میں آگئے اور ان دبستانوں کو اپنے اپنے حلقوں میں کافی عروج ہوا لیکن ادب کی تفہیم، پرکھ اور تنقید کے سلسلے میں جس نظریے نے سب سے زیادہ مقبولیت اور اعتبار حاصل کیا وہ ادب کا سماجی نظریہ تھا۔

اردو میں اس نظریے کو سب سے زیادہ تقویت احتشام حسین کی تحریروں سے ملی انھوں نے پچھلے تیس سال میں اپنی نظریاتی تنقید اور عملی تنقید دونوں میں پورے خلوص کے ساتھ اس نظریے کو برتا ہے۔ ان کی تحریروں نے اردو ادب و تنقید کو اس طرح متاثر کیا ہے کہ ان کی شخصیت خود ایک مکتبۂ فکر کی ہو گئی ہے۔ اس دور کے ادیبوں اور ناقدوں پر ان کے گہرے اثر کے پیش نظر شاید یہ کہنا صرف جذباتی اظہار بیان نہ ہو کہ اس عہد کو "عہد احتشام" کا نام دینا چاہیے۔

احتشام صاحب لکھنؤ یونیورسٹی میں
احتشام حسین اردو تنقید کا ذہن تھے جو فکر اور فلسفیانہ گہرائی انھوں نے تنقید کو دی اس سے اردو تنقید کا دامن یکسر خالی تھا۔ انھوں نے اس کو فلسفیانہ فکر اور فن کی معراج پر پہنچایا۔ وہ اردو کے پہلے نقاد تھے جنھوں نے سماجی نقطۂ نظر پر اردو میں سائنٹفک تنقید کی بنیاد رکھی اور سماجی نقطۂ نظر کو انتہا پسندی اور افراط و تفریط کے الزام سے بچایا۔ وہ لوگ جو ادب کے سماجی نظریے کو نہیں مانتے وہ ہو سکتا ہے کہ ان کے بعض نظریات سے اختلاف کریں۔ لیکن جس طرح انھوں نے ادب کو ایک وسیع فنی، جمالیاتی اور سماجی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی

جن سے اختلاف کرنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر مکتبۂ فکر میں مقبول اور ان کی تحریروں کو ہر دبستان میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ان سے پہلے کسی نقاد نے واضح طور پر تنقید کے اصول و نظریات کو نہیں پیش کیا تھا۔ جن لوگوں کے مضامین میں اس کی طرف کچھ اشارے ملتے ہیں وہ اتنے واضح نہیں ہیں جن پر جدید تنقید کی عمارت تعمیر کی جا سکتی۔ احتشام حسین نے پہلی بار اس کی کوشش کی۔ یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے، ورنہ اردو میں نئے رجحانات کے تحت مختلف دبستانِ نقد تو ممکن ہے نظر آتے لیکن کوئی فلسفیانہ سائنٹفک نظریۂ تنقید نہ ہوتا۔

اردو تنقید کی تاریخ جن کے ذہن میں ہے انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ترقی پسند تحریک کے شروع ہونے کے بعد اردو میں مارکسی نظریات کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے واضح نقوش اس وقت کی عام تخلیقات نظم و نثر میں نظر آتے ہیں۔ یہ نظریات رومانیت، ادیب کی ماورائیت، تخیل پرستی، تصور کی تخلیق کی ہوئی جنت میں جینا اور حقیقت سے فرار پر ضربِ کاری کی طرح پڑے جس کا اثر یہ ہوا کہ افسانہ ہو یا نظم، ناول ہو یا غزل، انشائیہ ہو یا طنز و مزاح ہر جگہ عام زندگی کی تصویر اور عام زندگی کے مسائل جگہ پانے لگے۔ ان مسائل کے ادبی موضوع بننے کی دو سطحیں تھیں ایک 'راست بیان' اور دوسرے فن کے دائرے میں ادبی اندازِ اظہار —— جس میں ایک کو انتہا پسندی یا پروپگنڈہ کا نام دیا گیا اور دوسرے کو نئے ادب یا ادب و زندگی کے بہترین نمونوں میں شمار کیا گیا۔ اس نئے ادب یا ترقی پسند ادب اور نظریات نے ادیبوں اور شاعروں اور شعریات و ادبیات سے دلچسپی رکھنے والوں پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ وہ ادیب و شاعر جو براہِ راست اس تحریک سے وابستہ نہیں تھے، وہ بھی اپنی نظم و نثر میں انھیں مسائل کو پیش کر رہے تھے جنھیں ترقی پسند تحریک نے پیش کیا تھا۔ ادبی فضا کی اس شدید تبدیلی کے زمانے میں تنقیدی نظریات کا تبدیل ہونا بھی ضروری اور لازمی تھا۔ جب تخلیق کا موضوع خیال سے نکل کر حقیقت ہوا، جب ہئیت کی اہمیت کے بجائے مواد کسی فن پارے کی اہمیت کی بنیاد قرار پایا، جب صرف گل و بلبل، عارض و رخسار یا دہان و کمر کے بیان کے بجائے زندگی کے تجربات و مشاہدات کو پیش کیا جانے لگا، جب زندگی کے خالص رومانوی تصور کے بجائے سماجی حقیقت نگاری ادب کا موضوع بنی اور یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ ادب زندگی اور سماج سے توانائی، حسن اور دلکشی حاصل کرتا ہے اور اسی حسن و دلکشی کو پیش کرتا ہے جو ہمارے ماحول، سماج اور زندگی کی دین ہے تو اس وقت تنقید کا پرانا انداز اور نئی پرکھ کا نتیجہ بھی تبدیل ہوا۔ یہ نیا نظریۂ تنقید وہی تھا جس نظریہ کے تحت نیا ادب تخلیق ہو رہا تھا اور جس کی بنیاد تاریخیت، روحِ عصر اور جدلیاتی مادیت پر تھی۔ اس عہد میں جہاں تخلیقی سطح پہ دو رجحان نظر آتے ہیں جن کا اوپر ذکر آ چکا ہے وہیں تنقید اور ادب کے اقدار کے تعین کے سلسلے میں بھی دو نظریے ملتے ہیں۔ کچھ ناقدین وہ ہیں جو ادب کو سمجھنے کے لیے صرف طبقاتی کش مکش، ذرائعِ پیداوار اور جدلیاتی مادیت پر زور دیتے ہیں۔ یہ ناقدین مارکس کے معاشی اور سماجی نظریات کو بعینہٖ ادب پر منطبق کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی تنقید ادب اور فن سے بحث کرنے کے بجائے معاشی اور سماجی عمل اور ردِ عمل کا ایک بورا نظر آتی ہے۔ ان کے فیصلوں اور رایوں میں شدت ہے۔ اسی لیے انھیں انتہا پسند مارکسی نقاد کہا گیا ہے۔ شاید مارکس نے بھی ادبی تفہیم کو اس طرح خاص جدلیت اور تاریخیت سے وابستہ نہیں کیا ہے جس طرح ان ناقدین نے کیا۔ اس انتہا پسندی سے ادب اور تنقید کسی کو زیادہ فائدہ نہیں ہوا۔ لیکن احتشام حسین نے اس انتہا پسندی کو توازن، فلسفیانہ انداز اور سائنٹفک نقطۂ نگاہ دیا۔

احتشام حسین بنیادی طور پر سماجی نظریات کے ماننے والے ہیں اور ادب کو اس کے گرد و پیش اور ماحول کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ ادب میں حسن، دلکشی اور جاذبیت، اس کا تاثر اور قبول سب اسے سماج سے ملتا ہے۔ فن کار جس سماج میں رہتا ہے اسی سے اپنی تخلیق کا مواد حاصل کرتا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

"ادیب کے تخلیقی کارنامے ان حقیقتوں کا عکس ہوتے ہیں جو سماج میں پائی جاتی ہیں"...... "ادیب کے گرد و پیش کی دنیا اس کا حسن اس کی بدصورتی، اس کی کشمکش اور اس کا الحاد، اس میں بسنے والوں کی امیدیں اور مایوسیاں، خواب اور امنگیں، رنگ اور روپ، بہار اور خزاں اس کے موضوع ہوتے ہیں......"

اس اقتباس سے ان کے ادبی نظریے کی بڑی حد تک وضاحت ہو جاتی ہے۔ ادب کے اس نظریے پر انھوں نے سائنٹفک تنقید کی بنیاد رکھی۔ اصول تنقید یا نظریاتی تنقید کے سلسلے میں ان کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ لیکن تنقیدی نظریات کو مرتب کرنے اور نظریاتی تنقید کا ایک راستہ بنانے کے سلسلے میں انھوں نے اتنے مضامین لکھے ہیں کہ اگر انھیں یکجا کر دیا جائے تو کسی مبسوط تصنیف سے کہیں زیادہ اہم ہوں گے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ آج تک اردو کے کسی نقاد نے نظریاتی اور عملی تنقید پر اتنا کام نہیں کیا جتنا احتشام حسین نے کیا ہے۔ ان کا تنقیدی نظریہ فلسفیانہ ہونے کے باوجود بہت سلجھا ہوا ہے۔ وہ موضوع اور فن کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑتے۔ وہ کسی فن پارے کے سلسلے میں اس طرح بات نہیں کرتے جس سے کئی پہلو نکالے جا سکیں۔ وہ قاری کو فن اور فنی تخلیق کے سلسلے میں ایک نتیجے تک لے جاتے ہیں۔ ان سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے بعض باتوں میں ان سے اختلاف تو کر سکتے ہیں لیکن اس کی شکایت نہیں کر سکتے کہ ان کے نظریات فن پارے کے بارے میں کسی واضح رائے کے قائم کرنے یا ادب کے اقدار کے تعین کے سلسلے میں رہنمائی نہیں کرتے۔

مارکسی انتہا پسندی کے ساتھ ہماری تنقید رومانی انتہا پسندی جمالیاتی انتہا پسندی، تاثراتی انتہا پسندی، نفسیاتی انتہا پسندی، مغرب پرستی اور راے زنی کا بھی شکار رہی ہے۔ کسی نے ادب کے مطالعے میں صرف لذتیت اور کیفیت و مسرت کی ناز آفرینی، لفظی حسن اور فنی صناعی پر سارا زور صرف کیا۔ کسی نے فن پارے سے ذہن پر مرتب ہونے والے اثرات کے بیان کو تنقید کا معیار بنایا۔ کسی نے فن کار کے نہاں خانوں میں جھانک کر اس کی کمزوریوں، مایوسیوں، جنسی کجرویوں، شعور و لاشعور کے پیچیدہ اور تاریک گوشوں کی تلاش کو فنی تفہیم کے لیے سب سے زیادہ اہمیت دی۔ کسی نے مغربی اصولوں اور مغرب کے ادب سے اردو ادب کا موازنہ کر کے اور اس پر فنی تخلیقات کو منطبق کر کے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا اور کسی نے صرف تشریح اور تلخ و تند راے زنی کو اپنی تنقید کے اسلحوں کے طور پر استعمال کیا۔ لیکن اس طرح کا کوئی نظریہ قطعی یا مکمل طور پر ادب کی پرکھ یا اس کی قدروں کے تعین کے لیے صحیح نہیں تھا۔ نظریوں یا اصولوں کی کش مکش میں احتشام حسین نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ اقدار و معیار کے سلسلے میں ایک ایسے سائنٹفک نظریۂ تنقید کی ضرورت ہے جو ادب کے محاسن، اس کی افادیت، اس کے حسن اور اس کی فنی خوبیوں کو بہتر طریقے پر واضح کر سکے اس لیے انھوں نے ایک ایسے مدرسۂ فکر کی بنیاد ڈالی جو ادب کے مطالعے کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ معاونت کر سکے اور ان اصولوں پر ادب کو پرکھنے کے بعد فن اور فنکاری کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین سے اگر ہم ادبی تنقید کے کچھ بنیادی اصول وضع کرنا چاہیں اور انھیں کوئی نام دینے کی کوشش کریں تو اسے صرف فلسفیانہ سائنٹفک تنقید کا نام دیا جا سکے گا۔ شروع میں اس کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ ان کے نظریے میں بنیادی اہمیت تاریخ، ماحول اور سماج کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سے الگ کر کے نہ اچھے ادب کا تصور کیا جا سکتا ہے اور نہ ادب اور اس کے حسن سے پورا لطف لیا جا سکتا ہے۔ احتشام حسین کے ابتدائی مضامین میں ان باتوں پر کچھ زیادہ ہی زور ملتا ہے۔ شاید اس کی وجہ اپنے نظریے کی زیادہ سے زیادہ وضاحت تھی ورنہ مجموعی طور پر ان کے نظریاتی اور عملی تنقید کے مضامین کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کے تنقیدی اصولوں کی جو شکل بنتی ہے اسے کسی صورت میں بھی انتہا پسندانہ مارکسیت یا خشک سماجیت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ انھوں نے سب سے پہلے ادب کی فنی قدروں اور اس کی صحت مندی کی اہمیت پر زور دیا اور بار بار اپنی تحریروں سے اس بات کو واضح کیا کہ اچھے ادب کی تخلیق میں ادب کی جمالیاتی اور فنی قدروں کی بہت

بڑا حصہ ہے اور ان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ادب کے روایتی اصناف، خصوصیت کے ساتھ غزل کی کبھی مخالفت نہیں کی جبکہ ایک طرف ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں اسے معتوب قرار دیا گیا اور دوسری طرف اس گروہ سے الگ لوگوں نے اسے گردن زدنی سمجھا۔ احتشام حسین نے اپنے نظریے کے مطابق اس کی تحلیل کی اور اس کی اہمیت پر زور دیا۔ ان کا خیال تھا کہ غزل ہماری زندگی کی تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی قدروں اور مطالبات کی پوری طور پر ترجمانی نہیں کر سکتی۔ لیکن وہ اپنے انداز اور حدود میں، ہماری زندگی کی، ہمارے احساسات، تجربات اور ہمارے مشاہدات کی تصویر پیش کرتی ہے۔ انھوں نے کبھی نظم کو غزل کا رقیب نہیں قرار دیا اور دونو کی اپنی حدود میں یکساں اہمیت پر زور دیا۔

احتشام حسین نے فنکار اور ادب کی نفسیات کو بھی اپنے نظریے میں اہمیت دی۔ وہ لاشعور کے کرشموں یا تحلیل نفسی کے معجزات کے قائل نہیں تھے اور نہ خالص لاشعور کی بنیاد پر ادب کو سمجھنے کی کوشش کرنے والوں کو صحیح سمجھتے تھے۔ لیکن ادبی تفہیم اور فنکار کی ذات یا تخلیق کے عمل کو سمجھنے میں جس حد تک نفسیات مدد کرتی ہے اس کو انھوں نے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اسی طرح مغربی ادب کی صحت مند قدروں یا مغربی اصولوں سے ادبی مطالعے میں جو مدد مل سکتی ہے اس کو اہم سمجھا۔ لیکن خالص مغربی پیمانوں پر اپنے ادب کے پرکھنے کو درست نہیں سمجھا۔ ادب کا مقصد ان کے نزدیک اجتماعی اور سماجی ہے جو زندگی کو فلاح و بہبود، حسن و مسرت اور دلکشی و شادمانی عطا کرنے کے لیے ہے۔ اپنے اس تنقیدی نظریے کی تعمیر میں انھوں نے مغرب کے فلسفیوں اور ناقدین کے افکار و خیالات سے استفادہ ضرور کیا ہے لیکن اسے اپنے ذوق و شعور، اپنے تفکر و گہرائی اور دروں بینی و گیرائی، بالغ نظری اور وسعت نگاہ سے ایک نیا اور دلکش رنگ دے دیا ہے جس کے وہ خود بانی ہیں۔

احتشام حسین کی تنقیدوں میں شاعرانہ انداز بیان، خوبصورت گڑھی ہوئی ترکیبیں، بے مقصد تراشے ہوئے جملے اور تشبیہ و استعارات کی زبان نہیں ملتی بلکہ سادگی، وضاحت، قطعیت اور ایک جچا تلا طرز بیان ان کے اسلوب کی خصوصیت ہے۔ احتشام حسین سے پہلے تنقید تشریح، توضیح، موازنہ، فن کاری کا مطالعہ سب تھی لیکن فلسفیانہ عمل نہ تھی۔ تنقید کو جس سنجیدگی، توازن اور جس فلسفیانہ نقطۂ نگاہ کی ضرورت تھی، وہ اسے احتشام حسین ہی نے دیا جس کے بانی اور پیش رو سب ہی کچھ وہی تھے۔ بعض لوگوں نے ان کی سماجیت پر اعتراض کیا ہے۔ بعض لوگوں کو ان کی تنقید خشک معلوم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ فلسفہ میں جو لوگ غزل کی تازگی یا تنقید میں شاعرانہ زبان تلاش کرنا چاہتے ہیں وہ ادب کو دل بہلانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور تنقید کو بھی تفنن طبع یا افسانے اور ناول کی طرح وقت گزاری کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ تنقید میں یہ لطف بعض تاثراتی نقادوں کے یہاں مل بھی جائے گا۔ لیکن تنقید قدر و معیار کی بات کرتی ہے اور ایسے تاثراتی مضامین میں لطف تو آسکتا ہے لیکن اقدار و معیار کی بات نہیں کی جا سکتی۔ جب کسی فن پارے کو بہتر طریقے پر سمجھنا یا اس کی قدروں کا تعین کرنا ہو تو اس پر فلسفیانہ انداز سے غور کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر ہمارا مطالعہ سائنٹفک نہیں ہو سکتا۔ احتشام حسین اسی سائنٹفک نقطۂ نظر کو پیش کرتے اور اسی نقطۂ نظر کو مکمل اور ہمہ گیر سمجھتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

"...... سائنٹفک نقطۂ نظر وہ ہے جو ادب کو زندگی کے معاشی، معاشرتی اور طبقاتی روابط کے ساتھ متحرک اور تغیر پذیر دیکھتا ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر نقطۂ نظر ہے اور ادبی مطالعہ کے کسی اہم پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا...."

سائنٹفک نقطۂ نظر کی یہ تعریف بہت جامع ہے اور تمام علوم و فنون، جمالیاتی و فنی خوبیوں، انداز و اسالیب اور روایت و تجربات کا احاطہ کر لیتی ہے۔

احتشام حسین نے صرف تنقیدی اصولوں کو ہی اپنے مضامین میں نہیں پیش کیا بلکہ اپنی عملی تنقید میں انھیں کامیابی اور دیانتداری کے ساتھ برتا بھی ہے۔ تنقید کو ایک عرصے تک تحقیق سے بالکل الگ رکھا گیا۔ اب بھی بعض ناقدین اور محققین دونوں کو الگ الگ خیال

(بقیہ صفحہ ۱۰۹ پر)

احتشام حسین کا تنقیدی رویہ

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

اردو ادب میں تنقید کو سرسبز و شاداب کرنے، سربلندی اور سرفرازی عطا کرنے اور وقعت و وقار کا حامل بنانے میں جو چند نام ہمیشہ جلی حرفوں میں تحریر کیے جائیں گے ان میں ایک نام پروفیسر سید احتشام حسین کا ہے۔ احتشام حسین نے تنقید کو، آرٹ بنا دیا۔ ایک سائنٹفک آرٹ، انھوں نے موضوعات کے انتخاب، اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے ان کے تجزیے اور اپنے سنجیدہ اسلوب سے تنقید کو ادب سے اس قدر مربوط اور ملزوم کر دیا کہ وہ ادب کے لیے اوپر سے لادی ہوئی کوئی چیز نہیں رہی بلکہ ایک ایسا جز بن گئی کہ اس کے بغیر ہم ادب کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ ادب کی تکمیل کے لیے گویا تنقید لازمی ہو گئی۔

کچھ ان ہی دنوں کی بات نہیں، اب تو خاصے طویل عرصے سے "ادب برائے ادب" کا نظریہ الخطاطی، مریضانہ بلکہ مردہ قرار پا چکا ہے۔ احتشام حسین نے بھی "ادب برائے ادب" کے فرسودہ نظریے کو "انحطاطی تصورِ ادب" سے تعبیر کیا ہے (روایت اور بغاوت ص ۱۹۵)۔ وہ ادب برائے زندگی کے نقطۂ نظر کو تسلیم کرتے ہوئے تنقید کے اس مکتبِ خیال کے حامی ہیں جو مارکسی نظریات پر ایقان رکھتا ہے۔

احتشام حسین مارکسی نقاد ضرور ہیں لیکن صرف مارکسی نقاد کہہ کر ان کے تنقیدی موقف کا صحیح تعین نہیں کیا جا سکتا۔ اردو ادب میں مارکسی نقاد کئی ہیں لیکن احتشام حسین اپنے مزاج، اپنی انفرادیت اور اپنے لب و لہجے کے باعث ان سب میں بآسانی ممیز کیے جا سکتے ہیں۔ احتشام حسین نے سب سے پہلے تو مارکسی تنقید کو ہندستانی بلکہ اردو کے مزاج سے نزدیک تر کر دیا۔ اس میں انتہاپسندی کو رد کرتے ہوئے اعتدال اور توازن پیدا کیا۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز کے کئی سال بعد تک مارکسی تنقید کمیونزم کا مرادف قرار دی جاتی تھی۔ ترقی پسند ادیبوں کو مارکسی نظریۂ حیات اور کمیونسٹ حکومت سے جو بھی ہمدردی رہی ہو لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ ترقی پسند تحریک میں کئی ایسے ادیب، شاعر اور نقاد شامل تھے جو کمیونسٹ نہیں تھے لیکن جو ترقی پسند تحریک کے ساتھ اس لیے رہے کہ اس کی وساطت سے ایک ایسا نظریہ ملا جو زندگی دوست تھا اور جس نے شعر و ادب کو حکمرانوں کی قلمرو سے نکال کر عوام کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ کر دیا۔ کمیونزم سے اپنی دلچسپی کے باوجود، احتشام حسین نے ترقی پسند تحریک کے اس تصور کو اردو میں عام کرنے میں جس خوش اسلوبی اور شائستگی کا مظاہرہ کیا وہ ان کی اپنی خصوصیت ہی رہی ہے۔ احتشام حسین ترقی پسند تحریک کے موید ہی نہیں مجاہد بھی رہے۔

زبان کو سماجی پیداوار کہا جاتا ہے اور سماج انسانوں کا مجموعہ! ادب کا موضوع انسان ہے، انسان کی زندگی ہے۔ انسان کی سرگرمیاں ہیں، اس کے افکار و خیالات ہیں، اس کے جذبات و احساسات ہیں، اس کی مسکراہٹیں ہیں، اس کے آنسو ہیں، اس کی مسرتیں اور اس کے غم ہیں، لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم ادب کو زندگی اور معاشرے سے دور رکھ کر دیکھیں۔ آپ اس کو ادب کے مارکسی نقطۂ نظر کا نام نہ دیں، کوئی اور نام دے لیں۔ کسی طرح موسوم کر لیں لیکن ہے یہی کہ ادب اور زندگی کا تعلق بے حد گہرا، بے حد شدید اور بے حد مضبوط ہے! میرا خیال کچھ ایسا ہے کہ احتشام حسین اگر مارکس کے افکار و خیالات اور اس کے نظریات کا مطالعہ نہ بھی کرتے، تب بھی وہ ادب اور زندگی کے رشتہ کو مانتے، اس پر ایمان لاتے، کیونکہ یہ تو اٹوٹ تعلق ہے، ازلی تعلق ہے۔ اور جب ادب کا زندگی سے یہ تعلق ہو تو تنقید کا تو لامحالہ ہوگا ہی۔ احتشام حسین کتنے معقول اور مدلل انداز میں اس طرف متوجہ کرتے ہیں:

"ادب کی تنقید، زندگی اور زندگی کی قدروں کی تنقید ہے۔ کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے کی تنقید ہے۔ ادب کے اندر عقیدے اور بہتر نظامِ زندگی کی تلاش ہے۔ تنقید نہ تو تاریخ ہے نہ فلسفہ سیاست ہے۔ نہ سائنس لیکن یہ علوم جس حد تک انسانی ذہن میں داخل ہوتے، اسے متاثر کرتے اور شعور کا جز بنتے ہیں، اس کی جستجو ہے۔"[1]

اپنے انتہا پسندوں کے باعث ترقی پسند تحریک کا جو تصور عام ہوا اسے تضاد بھی کہا جا سکتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کی ترویج و اشاعت میں ایک طرح سے مانع رہا۔ ایسے انتہا پسند دو طرح کے

جانشین بلکہ مارکس اور انیگلز ہی متصور کرتے ـــــ ان دونوں کے مابین توازن پیدا کرنا ضروری تھا، احتشام حسین نے یہی کیا۔ انھوں نے مارکسی تنقید کو کچھ اور نہیں، ہندستان میں اور اردو ادب میں اپنے وقت کے ایک اہم تقاضے اور ایک بنیادی سماجی ضرورت کے بطور پیش کیا۔ مارکسی تنقید میں خیال و عمل کی یکسانیت اور ادیب کی سماجی حیثیت پر زور دیا جاتا ہے۔ مارکس نے ادبی ہی نہیں، سیاسی و سماجی ارتقا کا انحصار بھی معاشی ارتقا پر رکھا ہے۔ احتشام حسین نے اس بات کو اس خوب صورتی اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا کہ مارکسی تنقید، ہندستانی قالب

احتشام صاحب سرپرست انجمن ادب اطفال لکھنؤ کے سالانہ جلسے منعقدہ ۲ر فروری ۱۹۵۸ء میں چودھری حیدر حسین صدرِ جلسہ (بائیں) اور شری موہن لال گوتم وزیر امداد باہمی یو۔پی کے ساتھ

تھے۔ ایک وہ جو ترقی پسند تحریک کو سمجھنے کے باوجود انتہا پسندی کا شکار تھے اور دوسرے اس کے کورانہ مقلد جن کا مارکسزم کا مطالعہ یا تو تھا نہیں اور اگر تھا بھی تو بیحد سطحی اور برائے نام۔ ترقی پسندی اور مارکسزم پر جو لوگ اپنے ایقان کو ثابت کرنے اور غالباً اس کا اشتہار بھی دینے کے لیے وقتاً فوقتاً اور بے جا مارکس اور انیگلز وغیرہ کے ناموں اور اقوال سے اپنی تحریروں کو مزین کرتے، یہ افراد خود کو اردو میں مارکس اور انیگلز کے

میں ڈھل جاتی اور اردو معاشرہ کی آواز بن جاتی ہے۔ اس ضمن میں ان کے وہ مضامین خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں جو انھوں نے ترقی پسند تحریک کے بارے میں رشید احمد صدیقی، فرقت کاکوروی اور سید اختر علی تلہری کے تنقیدی مضامین کے جواب میں لکھے تھے۔ ایسے دو ایک اقتباسات کا مطالعہ ضروری ہے:

"ادب میں ترقی پسندی زندگی میں ترقی پسندی سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ ہر ترقی پسند کے سامنے ایک مخصوص فلسفہ

---

[1] (مضمون: "اردو تنقید کا ارتقا") ذوق ادب اور شعور، ص ۲۵۴

حیات ہے جس سے زندگی کے ہر شعبے میں حرکت اور تغیر کو سمجھا جا سکتا ہے۔[1]

"ترقی پسند ادیب، ادب کو مقصود بالذات نہیں سمجھتا بلکہ زندگی کی ان کشمکش کی توجیہہ، تشریح اور اظہار کا آلہ سمجھتا ہے جن سے زندگی کی نشو و نما ہوتی ہے اور اسے ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے، جن سے آزادی، امن اور ترقی عبارت ہے۔ ادب اس کے لیے اسی جد و جہد، اسی کشمکش حیات کا مظہر ہے۔ ادب زندگی ہی کی طرح تغیر پذیر ہے"[2]

اسی کے ساتھ احتشام حسین کے تنقیدی رویے کو سمجھنے کے لیے ان کے سفرنامہ امریکہ و انگلستان ساحل اور سمندر کا مطالعہ بھی ضروری ہے جس میں انھوں نے مختلف امریکی اور برطانوی ادیبوں سے اپنی ملاقات اور گفت و شنید کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی شکایت کی ہے کہ خصوصاً امریکی نقاد، خواہ وہ کتنے ہی اونچے منصب و مقام کے حامل کیوں نہ ہوں۔ ادب کی ادبی حیثیت پر تو زور دیتے ہیں لیکن سماجی حیثیت کو فراموش کر جاتے ہیں۔ سماجی بنیادوں پر فن پارے کا تجزیہ کرنا ان کا رجحان نہیں۔

مارکسی نقطۂ نظر سے نہ وہ ادب، ادب ہوگا اور نہ وہ ادیب جس نے سماجی اقدار اور زندگی کی کشمکش کو نظر انداز کر دیا ہو۔ اس طرح ادب کی تخلیق شاید ممکن بھی نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے اور نہ لیا جانا چاہیے کہ مارکسی اور ترقی پسند تنقید میں ادیب کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ مارکسی تنقید کے نام پر بعض نقادوں نے کچھ ایسا میکانکی انداز اختیار کر لیا کہ کمیونسٹ مینی فیسٹو کو ادب پر منطبق کرنے لگے۔ احتشام حسین نے ادب کی سماجی قدروں پر ایقان رکھنے کے باوجود اس ٹھیٹ میکانکی رویے کو رد کیا ہے۔ ان کے ہاں معقولیت بھی ہے اور اعتدال بھی۔ انہی کے الفاظ میں:

"ادب کی سماجی حیثیت کو ماننے والے اور اس کے مخالف دونوں ادب کے مطالعے میں میکانکی انداز نظر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایک سارے مادی اور تاریخی تغیرات کا پتہ شعر و ادب میں لگانا چاہتا ہے اور کھینچ تان کر ادب کو معاشی اور اقتصادی عمل کا بھی کھاتہ بنا دیتا ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ دیکھو فلاں واقعہ ہو گیا اور ادب میں اس کا ذکر نہیں آیا، اس لیے ادب کا کوئی تعلق روزمرہ کے دنیوی حادثات اور واقعات سے نہیں ہو سکتا۔"[3]

احتشام حسین اگر سماجی اقدار کی اہمیت و عظمت کے قائل ہیں تو اسی کے ساتھ انھوں نے ایک سچے ترقی پسند کی طرح فرد کی اہمیت و عظمت کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا تنقیدی رویہ خاصا لچکدار اور توجیدار ہے۔ وہ ادب اور تنقید کو چونکہ زندگی سے وابستہ رکھتے ہیں۔ اور زندگی کو تغیر پذیر مانتے ہیں۔ اس لیے وہ نہ تو ترقی پسندی کے اٹل اصولوں کے قائل ہیں اور نہ تنقید کے۔ اس کا اندازہ انکے ان خیالات سے ہوگا۔ جو انھوں نے ترقی پسند تحریک کے بارے میں ظاہر کیے ہیں:

"ترقی پسندی کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر وہ کسی بندھے ٹکے اصول کے ماتحت ہر مسئلے کا فیصلہ کر دیتی ہے یا اگر وہ ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانک دیتی ہے۔ ترقی پسند تنقید کا خیال ہے کہ ہر ادیب اپنے سماجی شعور کی بناء پر اپنے طبقاتی رشتے میں، اپنے معاشرتی عقاید اور فنی تصورات کی روشنی میں ایک نیا مسئلہ پیش کرتا ہے۔ ہر ادیب کے خیالات کا کوئی پس منظر ہوتا ہے۔ اس کے تخیل کا کوئی خزانہ ہوتا ہے۔ اس کے انتخاب اور اجتناب کا کوئی اصول ہوتا ہے۔ اس کے خاص مسائل پر زور دینے کا کوئی سبب ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں پر

---

[1] (مضمون "نیا ادب اور ترقی پسند ادب" ایک مباحثہ) روایت اور بغاوت ص ۲۶۶ [2] (مضمون: اردو ادب، انقلاب ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں) عکس اور آئینے ص ۱۱۴

[3] روایت اور بغاوت، ص ۹۳، ۲۹۲

نظر رکھنے کے بعد ہی کوئی رائے قایم کی جا سکتی ہے اور جیسے ہی ان تمام باتوں کو کسی ادیب کے ادبی کارناموں کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، نازک تجزیہ اور ترکیب کی وہ منزل آجاتی ہے جہاں صرف ایک چابکدست نقادی کا ذہن کام دے سکتا ہے۔ انسانی شعور کی پیچیدگیوں کو سلجھا کر فن کار کے اصل مقصد کو ڈھونڈھ نکالنا اور اس کے فن کے محرکات کا پتہ لگا لینا اچھے ترقی پسند نقاد کا کام ہے۔[1]"

اسی طرح تنقید کے بارے میں ان کا نقطہ نظر کتنا آزادانہ اور روپے دلچک کا حامل ہے:

"تنقید کا وجود علمی دنیا میں ایک فن کی حیثیت سے بہت قدیم ہے جو سماجی ضرورتوں اور تقاضوں کے لحاظ سے بدلتا ہے۔[2]"

لیکن ان بدلتے ہوئے سماجی تقاضوں اور ضرورتوں کا احساس و ادراک اسی وقت ممکن ہے جب کہ ادیب یا نقاد، صاحب فہم ہو، باشعور ہو اور اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتا ہو۔ یہاں پھر سماجی حقایق، ضروریات اور تقاضوں کے باوصف ادیب اور نقاد کے منصب کی اہمیت مسلّم ہو جاتی ہے۔ خصوصاً ایسے معاشروں میں جو ایک عرصے تک سرمایہ دارانہ نظام کی گرفت میں رہے ہوں، پسماندہ ہوں اور جہاں عوام کی اکثریت جاہل اور علوم جدیدہ سے بے بہرہ اور عصری تقاضوں سے ناآشنا ہو، نقاد کا زیادہ سے زیادہ باشعور اور ذمے دار ہونا ازبس ضروری ہو جاتا ہے۔ اس پس منظر میں احتشام حسین کے مندرجہ ذیل خیالات کا جائزہ لیجیے۔

"ادب کی سماجی اہمیت اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک ہم ادیب کو باشعور نہ جانیں۔"[3]

"وہ ادیب ہو یا نقاد سماجی حقائق کو سمجھے بغیر ذمہ داری کے ساتھ ان کی ترجمانی کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔"[4]

سماجی حقائق کو سمجھنے، ان کی ترجمانی کرنے اور ادیب کے باشعور ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ نقاد، رجعت پسند اور بورژوا طبقات کی بھی ترجمانی کرے، ظالم کو بھی دوست رکھے، استحصالی طاقتوں کا بھی ساتھ دے اور جارحیت کے ہاتھ کو مضبوط کرے ـــــ کون اس سے انکار کرسکتا ہے کہ یہ سب بھی سماج کا جز ہیں، سماج کے ایک رخ کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک "حقیقت" ہیں۔ اگر نقاد اس جز ہی کو کل سمجھ لے، اس رخ کے نظارے ہی میں کھو جائے اس حقیقت ہی کا ہو جائے تو وہ اپنے راستے سے بہکا ہوا اور بھٹکا ہوا ہوگا۔ سرمایہ دارانہ سماج میں نقادوں نے اسی طرح سماجی حقائق کو سمجھا اور ان کی ترجمانی کی ہے ـــــ یہ سب سماج کا جز سہی لیکن جذام زدہ جز ہیں، سماج کا ایک پہلو سہی، لیکن گھناؤنا پہلو ہیں اور ایک حقیقت سہی مگر کھوکھلی حقیقت ہیں جن پر حقیقت کا محض لبادہ اڑھا دیا گیا ہو، ایک ذمہ دار باشعور اور حساس نقاد ان سب سے قطع نظر کرے گا۔ وہ صالح اور صحت مند قدروں کی تلاش کرے گا ـــــ وہ حقیقت تک پہنچنے کی کوشش میں ہوگا۔ وہ ان رجعت پسند اور ظالم و جابر طاقتوں کا ساتھ نہیں دے گا۔ وہ ایک محدود طبقے کا نہیں، عوام کا ساتھ دے گا۔ وہ ان طاقتوں کا ساتھ دے گا جو ابھر رہی ہیں، ابھرنے والی ہیں اور جن کو بہرکیف ابھرنا ہے۔ وہ ڈوبتی رات کا نہیں، ابھرتے دن کا ساتھ دے گا۔ امن کا ساتھ دے گا، انصاف کا ساتھ دے گا، مسکراہٹوں کا ساتھ دے گا۔ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"ادب" تہذیبی زندگی سے اسی وقت تعلق رکھتا ہے جب وہ اندر قوم کی منصفانہ اور انسان دوست تمناؤں کا اظہار کرے، اس کے کسی ایک طبقے کی جارحانہ اور ظالمانہ خواہشات کبھی تہذیب اور ادب کا جز نہیں بن سکتیں۔[5]"

---

[1] تنقید اور عملی تنقید، ص۱۶۱ [2] مضمون: ادبی تنقید کے مسائل، روایت اور بغاوت ص۲۴ [3] مضمون: ادب کا مادی تصور، ذوق ادب اور شعور ص۔ [4] مضمون: تنقید نظریہ اور عمل، تنقیدی نظریات ص۳۹، ص۱۳۸ [5] مضمون: ادب اور تہذیب، ذوق ادب اور شعور، ص۲۶

دیناگھ جشید ۵۰۰ شک

ادیب ہو کر نقاد، اگر قوم کی منصفانہ اور انسان دوست تمناؤں کا اظہار کر رہا ہو تو یہی چیز اہمیت رکھتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تنقید کے مسلمہ اصولوں اور ترقی پسند نظریات سے تھوڑا بہت انحراف کر رہا ہو۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ سماج کی صالح قدروں اور اثباتی رجحانات کا کہاں تک ساتھ دے رہا ہے۔ اگر وہ اپنے اس مقصد کے حصول میں کامیاب ہے اور اس کا فن اپنے وقت کے صحت مند عوامی اور نمائندہ میلانات کا آئینہ دار ہے، تو یہی کافی ہے۔ ترقی پسندی یہی چاہتی ہے اسی کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس سلسلے میں احتشام حسین کے تنقیدی موقف کا جائزہ لینا ہو تو ان کے مضمون "اردو ناول اور سماجی شعور" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس مضمون میں انھوں نے ڈپٹی نذیر احمد اور ان کی ناول نگاری کے بارے میں تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ نذیر احمد زوال آمادہ معاشرہ کے فرد تھے۔ ان کا ٹوٹتا بکھرتا سماج تھا۔ بوڑھ وا عقائد کا حامل تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ نذیر احمد کا بحیثیت فنکار کے کیا رویہ رہا۔؟ وہ ان بوڑھ وا عقائد اور زوال آمادہ معاشرہ کے ہاتھوں کٹ پتلی بن گئے یا انھوں نے اپنے شعور اور احساس کا ثبوت دیا، اپنی ذمے داری کو نبھایا؟ یہاں کچھ اور نہیں، احتشام حسین ہی کے الفاظ درج کرنا مناسب ہوگا:

"بہت سے نقاد نذیر احمد کو ناول نگار نہیں مانتے، لیکن یہ محض اصطلاح کا چکر ہے۔ میں ان کی سماجی بصیرت اور تاریخی شعور پر نظر رکھ کر انھیں اردو کا پہلا اور بہت اہم ناول نگار تسلیم کرتا ہوں۔ مراۃ العروس، توبۃ النصوح، فسانۂ مبتلا، ایامیٰ، اور ابن الوقت ہر ایک میں گہرے سماجی حقائق پیش کیے گئے ہیں۔ ہر ایک میں انیسویں صدی کے وسطی دور کا کوئی اہم مسئلہ بنیادی مقام رکھتا ہے۔"[1]

اس اقتباس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ معاشرہ خواہ کیسا ہی ہو اگر فنکار کو اپنی ذمے داری کا احساس ہے تو وہ لائق ستائش ہے۔ دوسرے کلاسیکی ادب کے بارے میں احتشام حسین کا رویہ!

کیونزم کے ارباب لبست وکشاد نے کلاسیکی ادب کی کبھی بھی محض اس لیے تحقیر نہیں کی وہ کلاسیکی ہے یا ماضی سے تعلق رکھتا ہے۔ خود لینن نے روس اور یورپ کے بیشتر کلاسیکی ادیبوں کا نام احترام سے لیا ہے۔ جن میں پشکن، لرمونٹ، ہیگل، اور گوئٹے وغیرہ شامل ہیں۔ اردو میں ایسے ترقی پسند مصنفین، جنھوں نے مارکسزم کی کورانہ تقلید کی ہے، جن کے معلومات مارکس اور لینن کی دو چار تصانیف کے ناموں تک محدود ہیں اور جو سمجھتے ہیں کہ مارکسی اور ترقی پسند ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ماضی کو رد اور کلاسیکی ادب کی نفی کی جائے۔ انھوں نے اردو کے کلاسیکی ادب کو بھی در خور اعتنا نہیں سمجھا۔ یہ بے بنیاد ادیب، ادب کی کوئی خدمت نہ کر سکے، کچھ دن افق ادب پر جھلملائے اور پھر خاموش ہو گئے۔ احتشام حسین ترقی پسند تحریک کے وہ نامور نقاد ہیں جنھوں نے مارکسزم کو صرف دور سے دیکھا اور سنا نہیں بلکہ اس کے دروں میں جھانکا بھی ہے۔ یا بایں وجہ وہ انسان کے حال کو پیچیدگیوں، آلائشوں اور مصائب سے دور کرتے ہوئے ایک خوشگوار اور خوشحال مستقبل کے حالات کو سازگار بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ ان افراد میں سے نہیں جن کی نظروں میں ماضی کی وقعت نہیں۔ بیشتر ترقی پسندوں نے کبھی ماضی کو از کار رفتہ قرار دیا تھا۔ ماضی کے خواب کو بھی، زشت کو بھی، احتشام حسین بالغ فکر و نظر کے حامل رہے۔ ان کو "حال" میں بھی کچھ پہلو اگر منفی اور فرسودہ نظر آئے تو انھوں نے اس کو نظر انداز کر دیا۔ وہ حال کے اندھے پرستار نہیں رہے اور نہ ماضی کے تعلق سے ذہنی تعصب کا شکار، انھوں نے حسن کو حسن کہا اور عیب کو عیب۔ خواہ اس کا تعلق ماضی سے ہو یا حال سے۔ ماضی کے تعلق سے ان کا یہ رویہ کتنا جلایا یا ہوا، کتنا توانا،

---

[1] (مضمون: اردو ناول اور سماجی شعور) ذوقِ ادب اور شعور۔ صفحہ ۲۵)

اور وسیع ہے ۔

" ہمارے سامنے مستقبل ایک سادہ ورق کی طرح ہے۔ گر غور کیا جائے تو مستقبل، ماضی ہی کا تسلسل ہے اور اسی کا زائیدہ ہے اور اس کے اثرات سے بالکل محفوظ نہیں رہ سکے گا۔[1]

احتشام حسین، اُردو کے کلاسیکی ادب کی عظمت و قوت سے آگاہ ہیں۔ اس کا احترام کرتے ہیں۔ ایک نہیں کئی مواقع پر انھوں نے اس کا اظہار کر کے ترقی پسند تحریک کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔ نقاد کے لیے تو جدید کے ساتھ قدیم کی آگہی اور ماضی کی پہچان، احتشام حسین کے نزدیک ناگزیر ہے۔ لاعلمی تو کجا، اس ضمن میں بھی کم علمی سے کام نہیں چل سکتا۔ ان کے الفاظ ہیں:

" شاعری کو سمجھنے اور اس کے افادی یا حسن کارانہ پہلو سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ، دونوں کا علم ضروری ہے۔ کیونکہ آج کا انسانی شعور ماضی کے شعور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے آج بھی کئی حیثیتوں سے ماضی کے علم کے بغیر حال کا مکمل علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ لیکن نئی شاعری کے قدیم تصور رکھنے والے نقاد جن چیزوں کو خود جانتے ہیں صرف انھیں کو اہمیت دیتے ہیں اور اگر کوئی بات ان کے علم کے باہر کی جائے تو یا اسے مبہم کہتے ہیں یا پھر اس کو شاعری کا موضوع ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ لاعلمی یا کم علمی کے ساتھ تنقید نگاری نہیں چل سکتی ؛[2]

تنقید میں احتشام حسین کی کوئی مبسوط تصنیف نہیں ہے لیکن اس طرح ان کی عظمت کم نہیں ہوتی۔ ان کا تنقیدی سرمایہ ان کے تنقیدی مضامین کے کئی مجموعے ہیں۔ ان کا قلم تنقید کے تمام گوشوں کو محیط کر لیتا ہے۔ ان کے تمام مضامین میں ان کے نقطۂ نظر کی جھلک ملتی ہے۔ انھوں نے کئی ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں اور شعری مجموعوں کے پیش لفظ وغیرہ تحریر کیے ہیں۔ ان میں خیال خاطر احباب ہے۔ جو ان کی شرافتِ طبع اور مزاج کی دلنوازی کی دلیل ہے۔ اسی نوع کی تحریروں کی روشنی میں ان کے تنقیدی منصب کا تعین کچھ ٹھیک نہ ہوگا۔ لیکن ایک بات جو واضح ہوتی ہے یہ ہے کہ انھوں نے بنیادی طور پر اپنے تنقیدی موقف کا سودا نہیں کیا۔ اور تو اور فورڈ فاونڈیشن کی طرف سے انھوں نے امریکہ میں کم و بیش آٹھ ماہ گزارے لیکن کہیں انھوں نے ادبی دیانت داری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اور نہ اپنے ادبی نظریے سے سرِ مو انحراف کیا۔ امریکی ادیبوں اور نقادوں سے گفت و شنید کے دوران اپنے تنقیدی رجحانات کی جرأت اور بے باکی کے ساتھ ترجمانی کی کہ آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی رہا ہے۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں بھی ترقی پسندی پر اپنے ایقان کو نکھار، سدھار کر، مہذب اور شگفتہ طریقے پر اور بڑے متین اور شائستہ اسلوب میں پیش کیا۔ اس وقت جب کہ ترقی پسند تحریک پر اس کے اپنوں سے لے کر کٹر مخالفین تک زبردست حملے کر رہے تھے اور بعض ترقی پسندوں ہی کی جانب سے ترقی پسند تحریک کو مبہم اور نامناسب طریقے سے پیش کیے جانے کی وجہ سے اس کو اپنے ابتدائی دور ہی میں کشمکش اور بحران سے گزرنا پڑا تھا، انھوں نے مدلل اور معقول طرز پر ان مخالفوں کا سامنا کیا اور اعتراضات کا مسکت جواب دیا۔ اس طرح احتشام حسین نے ترقی پسند تحریک کو سہارا دیا۔ اور اس کو تقویت پہنچائی خصوصاً ترقی پسند تنقید جس آب و تاب اور وزن و وقار کی حامل ہوئی ہے اس میں احتشام حسین کے علاوہ اوروں کا جو بھی حصہ رہا ہو۔ لیکن احتشام حسین سے بڑھ کر تو کجا ان کی سطح کا بھی کوئی نہیں۔

★

---

[1] ساحل اور سمندر، ص ۲۱۳، [2] تنقیدی نظریات، ص ۴۴،۲۵

دیپالکہ ۱۸۹۵ اشک

نقدِ معنی کا گنجدان

شجاعت علی سندیلوی

احتشام صاحب نے تنقیدی جائزے کے دیباچہ (طبع دوم) میں اپنے تنقیدی نقطۂ نظر کے متعلق لکھا ہے کہ

" اردو دانوں میں تنقیدی ادب کے مطالعے کا صرف شوق ہی نہیں بڑھ رہا ہے بلکہ وہ نقطۂ نظر بھی عام ہو رہا ہے جسے میں نے اپنی تحریروں میں برے بھلے پیش کرنے کی کوشش کی ہے "[1]

" وقت کے ساتھ ساتھ میرا خیال پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ اعلیٰ ادب اور اعلیٰ تنقید کی پہچان یہی ہے کہ اس سے زندگی کے حسن اور توانائی کو سمجھنے اور اسے ابھارنے میں مدد ملتی ہے اس طرح عوام کا رشتہ، عوامی جدوجہد کرنے والی طاقتوں سے مضبوط ہوتا ہے۔ زندگی ادب کو سنبھالتی ہے اور ادب زندگی کو سہارا دے کر آگے بڑھاتا ہے۔ اچھے ادب کے مطالعے سے انسان کا سماجی شعور بڑھتا ہے اور وہ سماج کو بہتر بنانے اور فطرت کو اپنے قابو میں لانے کا اہل بن جاتا ہے۔ اگر کوئی ادبی کارنامہ یہ کام پورا نہیں کرتا اس میں مدد نہیں دیتا، تو وہ صرف ان لوگوں کی نگاہ میں ادب ہوگا جو زندگی کو بہتر بنانے کے کمی نہیں ہیں "[2]

احتشام صاحب کا تنقیدی نقطۂ نظر کیا رہا ہے؟ وہ تنقید سے کیا کام لینا چاہتے تھے؟ تنقید نگار کے لیے کون کون باتیں ضروری ہیں؟ اردو میں تنقید کس منزل پر ہے؟ تنقید کا ادب، سماج اور انسان سے کیا تعلق یا رشتہ ہے؟ یہ اور اسی قسم کے مباحث کا مختصر جائزہ، ان سطور میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مباحث ایسے نہیں ہیں کہ جو کسی مختصر مضمون میں وضاحت کے ساتھ بیان کیے جا سکیں، ان کے لیے تو دفتر درکار ہے۔ تاہم اس بات کا ضرور خیال رکھا گیا ہے کہ احتشام صاحب کے تنقیدی نظریات کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ عرض کر دیا جائے۔

تنقیدی جائزے کے پہلے دیباچہ میں ادب کے متعلق رائے ظاہر کرتے ہوئے احتشام صاحب لکھتے ہیں:

" بعض لوگوں کے لیے ادب روحانی، الہامی اور مابعد الطبیعاتی ہے۔ بعض کے لیے مادی ہے۔ بعض ادب کی قدروں کو ناقابلِ تغیر مانتے ہیں، بعض تغیر پذیر، بعض لفظوں کو سب کچھ سمجھتے ہیں، بعض خیالات کو الفاظ پر ترجیح دیتے ہیں "[1]

لیکن خود احتشام صاحب کس نتیجے پر پہنچے؟ اور وہ ادب کو کیا سمجھتے ہیں، اس کے متعلق انھوں نے واضح طور پر لکھا کہ

" ادب مقصد نہیں، ذریعہ ہے۔ ساکن نہیں متحرک ہے۔ جامد نہیں تغیر پذیر ہے۔ اسے تنقید کے چند فرسودہ اصولوں اور نظریوں کی مدد سے نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ ایک فلسفیانہ تجزیہ ہی کام آ سکتا ہے جس کی بنیاد تاریخ کی مادی ترجمانی اور ارتقا بالضد کے اصول پر رکھی گئی ہو "

" میں ادب کو زندگی کے عام شعور کا ایک حصہ سمجھتا ہوں جس میں طبقاتی رجحانات سانس لیتے اور تمدن کے مظاہر اثر انداز ہوتے ہیں "[2]

تنقیدی جائزے احتشام صاحب کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جو پہلی مرتبہ ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۴۴ء تک لکھے ہوئے مضامین شامل ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ احتشام صاحب نے تنقیدی مضامین لکھنے کا آغاز ۱۹۳۹ء سے کیا اور ۱۹۷۲ء تک مسلسل، وہ تنقید کو اپنے افکار و خیالات سے مالا مال کرتے رہے۔ انھوں نے

---

[1] تنقیدی جائزے۔ صفحہ ۱۰ (تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۰ء) ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ [2] تنقیدی جائزے تیسرا ایڈیشن صفحہ ۸

[1] تنقیدی جائزے صفحہ ۷ (تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۰ء) ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ

سیکڑوں مضامین لکھے اور ہر مضمون، تنقید کے کسی نہ کسی گوشے پر روشنی ڈالتا ہے۔ بعض مضامین تو تنقید کی مکمل کتاب ہیں۔ احتشام صاحب نے جس زمانے میں لکھنا شروع کیا، وہ جدید و قدیم ادب کی کشمکش کا زمانہ تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام ۱۹۳۶ء میں ہو چکا تھا۔ انگارے سے ادبی دنیا آگ بگولا ہو چکی تھی۔ ادبی اختلافات نے مخالفت کی شکل اختیار کر لی تھی، اس کے باوجود ادب میں 'آزادیِ رائے' اور 'غور و فکر' کو اہمیت حاصل ہوتی جا رہی تھی۔ احتشام صاحب کے خیال میں یہ کشمکش، غیر علمی اور جذباتی تھی۔ وہ قدیم اور جدید ادب کی تقسیم کو ادب کے لیے مفید نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں

"ادبیات کے وہ شیدائی جنھوں نے ادب کو جذبات اور محسوسات کے راستے سے پسند کرنا سیکھا ہے، جنھوں نے دماغ نہیں دل کو رہنما بنایا ہے، جنھوں نے فنون لطیفہ کو کوئی الہامی چیز سمجھ رکھا ہے، جو ادب کو سماجی زندگی کا مظہر نہیں سمجھتے، جو اُن روابط کو نہیں دیکھتے، جن سے صرف ادب ہی نہیں بلکہ انسانوں کے دوسرے افعال بھی بندھے ہوئے ہیں، ان کے لیے قدیم اور جدید، دو ایسے لفظ ہیں جو ادب کے جسم کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ شاید یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ قدیم ادب کے ایسے پرستار جدید ادب کو 'بدگوشت' اور جدید ادب کے عاشق، قدیم ادب کو سوختنی سمجھتے ہیں۔ ایسے حضرات فنون لطیفہ میں مستقل قدروں کے قائل ہوتے ہیں۔ ادب کو ٹھہرا ہوا، پائیدار اور جامد ماننے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادب کی تاریخی اہمیت بالکل نظر انداز ہو جاتی ہے[1]"

احتشام صاحب نے ادب کی تاریخی اہمیت پر بھی زور دیا اور اس کی سماجی اور جمالیاتی اہمیت پر بھی۔ وہ ادب کو زندہ، متحرک، ترقی پذیر سمجھتے ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جو ادب زندگی کی گتھیاں نہ سلجھائے، اس کو صحیح راستہ نہ دکھائے، وہ حقیقت میں ادب نہیں ہے۔ لیکن ایسا ادب بغیر تنقید کے وجود میں نہیں آتا اور تنقید اس وقت تک مفید اور صالح نہیں ہو سکتی جب تک کہ نقاد اپنے فرائض اور منصب سے بخوبی واقف نہ ہو۔ احتشام صاحب کے خیال میں:

"اس کا مقصود و منتہا صرف ان کیفیات کی باز آفرینی نہیں ہے جو شاعر پر گزر چکی ہیں۔ نقطۂ نظر کی یہ حد بندی نقاد کی تخلیقی صلاحیتوں کو سلب کر لیتی ہے اور نقد و نظر بے معنی فعل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ نقاد کا ایک اپنا ضمیر، اس کی اپنی خودی، اس کا اپنا وجود ہوتا ہے جو مفسر اور شارح کی طرح کچھ دور چل کر شاعر اور تصنیف کے سائے میں پناہ نہیں لیتا بلکہ شاعر کا سینہ اور ادیب کا دل چیر کر اندر جھانکتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس نے کہاں تک حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت کی تھی[2]"

یہی نہیں بلکہ

"نقاد کسی طرح بھی آنکھیں بند کر کے کیفیات اور محسوسات کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔ نقاد کی اپنی نظر، اس کی اپنی بصیرت، اس کے نقد کو تخلیقی بنا سکتی ہے۔ یہ اپنی نظر ہی نقاد کا وہ حربہ ہے جسے الگ رکھ کر وہ نقاد باقی نہیں رہ سکتا[3]"

نقاد کی یہ اپنی 'نظر' بڑی محنت اور ریاضت چاہتی ہے۔ جب تک اس کا مطالعہ وسیع نہ ہو، جب تک اس کی عالمی ادب پر گہری نظر نہ ہو، جب تک وہ عصرِ حاضر کے تقاضوں سے واقفیت نہ رکھتا ہو، جب تک وہ فن اور فنکار دونوں کا راز آشنا نہ ہو، جب تک وہ تغیراتِ زمانہ، سماج کے حالات اور ماحول کا رمز شناس نہ ہو، اس وقت تک اس کے اندر تنقید کی صلاحیت و بصیرت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ

"کسی ادیب یا شاعر یا فنکار میں زندگی کے نقش کیسے ملتے ہیں؟ حقیقتوں پر اس کی کتنی نظر ہے؟ اس کا فن انسانی زندگی کی رہنمائی کس طرف کرتا ہے؟[4]"

اس لیے اس کو ہر لمحہ اور ہر حال میں

"فن کار اور اہلِ ہنر کے خیالات کی درستی پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے[5]"

---

[1] تنقیدی جائزے صفحہ ۱۴ [2] تا [5] روایت اور بغاوت، صفحہ ۷۹ تا ۸۲

شاعری پر تنقید کرتے وقت نقاد کا فریضہ کیا ہے؟ اس کو کن کن باتوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"نقاد کا فریضہ ان حالات کا تجزیہ کرنا ہے جن میں شاعری پیدا ہوتی ہے' ان خیالات کی تنقید ہے جو شاعر کے تجربے میں آکر فنی شکل میں پیش ہوتے ہیں' ان تصورات کا احتساب ہے جنھیں وہ ایک ذمہ دار فن کار' ایک ذمہ دار انسان کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے۔ ایسی حالت میں تنقید نگاری ان تمام علوم سے وابستہ ہو جاتی ہے جن سے انسانی تہذیب و تمدن کی تخلیق اور تعمیر ہوئی ہو یا غیر شعوری طور پر جو خیالات کبھی افراد میں اور کبھی جماعتوں میں پیدا ہو کر جذبات کی دنیا بناتے ہیں اور شعر و ادب میں ظاہر ہو جاتے ہیں[1]"

فلسفیانہ اور علمی انداز میں' اپنے تنقیدی خیالات ظاہر کیے' وہ اردو ادب اور تنقید کے لیے منارۂ نور ہیں۔ انھیں اس کی مطلق پروا نہیں تھی کہ ان کے 'خیالات' کی مخالفت کی جائے گی یا ان کا مذاق اڑایا جائے گا بلکہ ان کی یہ دلی خواہش رہتی تھی کہ ان کے خیالات پر بحث علمی انداز میں کی جائے تاکہ اس سے وہ استفادہ کر سکیں۔

روایت اور بغاوت کے سرورق پر ان کی ایک مختصر تحریر 'چند سطریں' موجود ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ "عالمانہ مخالفت" کو اپنے لیے مفید سمجھتے تھے۔ لکھتے ہیں:

"مجھے معلوم نہیں کہ آپ میرے خیالات سے متفق ہوں گے یا نہیں لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ آپ ان سے اختلاف بھی کریں تو علمی
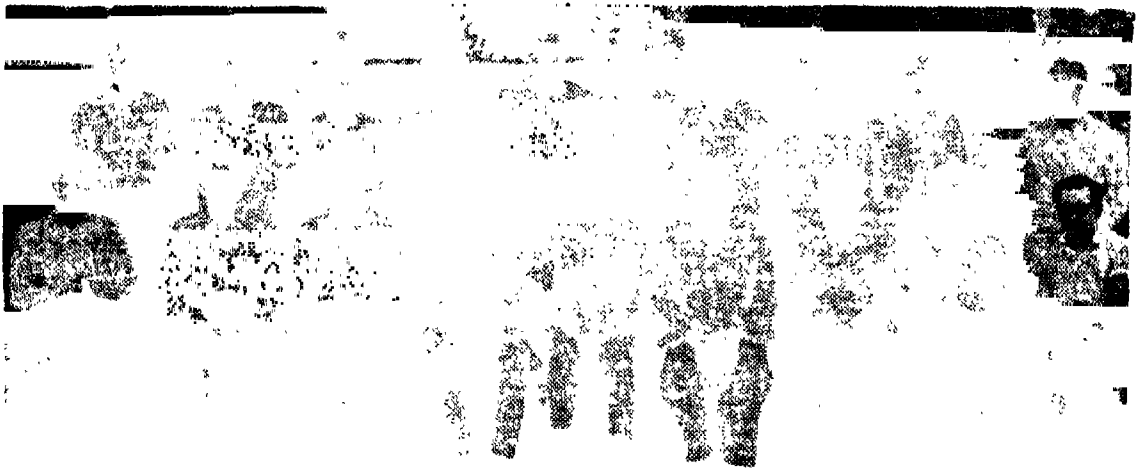
احتشام صاحب انجمن ترقی ادب لکھنؤ کی جانب سے ہونے والی ادبی نشست میں پروفیسر ال احمد سرور صدر شعبہ اردو علی گڑھ یونیورسٹی کے ساتھ۔ پروفیسر سرور احتشام صاحب کے داہنے اور مشہور افسانہ نگار رام لعل بائیں بیٹھے ہیں

انداز میں اس سے مجھے فائدہ ہوگا[2]"

ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں اور نہ ہر نقاد کے بس کا ہے۔ قدرت نے احتشام صاحب کو ایسی تنقیدی بصیرت و صلاحیت عطا کی تھی جس کی مثال بیسویں صدی میں کم از کم اردو دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ان کا ذوقِ ادب و شعور' ادبی افکار و مسائل کو جس غور و فکر کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کرتا تھا' ادب اور سماج کو جس نظر سے دیکھتا تھا اور جس قابلیت کے ساتھ انھوں نے

ادبی اور تنقیدی دنیا میں یہ کشادہ قلبی' یہ وسعت نظر' یہ علمی تشنگی' ادب کو ہمہ گیری اور آفاقیت عطا کرتی ہے' اس کو زندہ جاوید بنا دیتی اور ایسا ادیب اور اس کا ادب زندہ و پائندہ رہتا ہے۔ احتشام صاحب نے متعدد ادبی' علمی' تنقیدی اور تحقیقی مسائل میں اختلاف کیا۔ لیکن انھوں نے ہمیشہ علمی انداز اور سنجیدگی کو ہاتھ

[1] تنقیدی جائزے صفحہ ۴۱ [2] روایت اور بغاوت، سرورق

سے جانے نہیں دیا۔ ان کے مخالفین اور معترضین نے بھی اس کا خیال رکھا لیکن کہیں کہیں اور کبھی کبھی وہ جذبات اور ذاتیات کا شکار بھی ہو گئے۔ یہاں اس بحث کو چھیڑنا مقصود نہیں ہے ورنہ ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں ادبی مسئلہ ذاتی مسئلہ بن گیا۔

احتشام صاحب جن مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار پورے اعتماد کے ساتھ فلسفیانہ انداز میں کر رہے تھے، ان میں اختلاف ہونا لازمی تھا۔ ترقی پسند ادب، ترقی پسند تنقید، جدید ادب، ادب میں ہیئت اور مواد کی اہمیت، ادب اور تہذیب، ادب اور اخلاق، قدیم ادب اور ترقی پسند نقاد، ادب اور افادیت، یہ اور اسی قسم کے بہت سے عنوانات پر احتشام صاحب نے بڑے غور و فکر کے بعد، بڑے وسیع مطالعے کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے ہر عنوان ایسا ہے جس پر اختلاف کیا جا سکتا ہے اور کیا گیا۔ لیکن احتشام صاحب نے ان اختلافات سے فائدہ ہی اٹھایا۔ اگر ان کے ذہنی، ادبی اور تنقیدی ارتقاء کا جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے ادبی اور تنقیدی شعور میں تدریجی ترقی اور پختگی آئی۔

ترقی پسند ادب، تنقید اور نقاد کے سلسلے میں احتشام صاحب نے بہت کچھ لکھا۔ یہ تینوں موضوع، ان کے پسندیدہ موضوع تھے۔ وہ ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۷۲ء تک برابر ان پر لکھتے رہے۔ ترقی پسند ادب کے زاویۂ نظر کے متعلق لکھتے ہیں:

"ترقی پسند ادب کا زاویہ نظر مواد اور ہیئت کے تعلق کے بارے میں بہت واضح ہے۔ وہ تمام شعراء اور نقاد جو زندگی کو نامیاتی مانتے ہیں، جو مقدار سے خصوصیتوں کے بدلنے کے قائل ہیں، جو شاعری کو زندگی کا مظہر مانتے ہیں، جو ادب کو سماجی ترقی کا ایک آلہ سمجھتے ہیں اور جو تمدن کو عام کرنا اور فنون لطیفہ کو عوام کی چیز بنانا چاہتے ہیں وہ کسی حالت میں بھی ہیئت اور اسلوب کو مواد پر اہمیت دینے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتے۔ ترقی پسند شاعروں کا خیال ہے کہ دنیا کو ترقی کی راہ دکھانے میں ادب کا بھی ہاتھ ہے اور یہ رہنمائی ہیئت سے نہیں صحت بخش خیال ہی سے ہو سکتی ہے۔ ہیئت کا کام یہ ہے کہ وہ خیال اور مواد کو بہترین شکل میں پیش کر دے لیکن اگر شاعر بہترین شکل کی جستجو میں مبہم، غیر واضح، یا محض صناع ہو کر رہ جائے گا تو اس نے اچھا ادب نہیں پیدا کیا۔"[1]

صحت بخش خیال، صحت بخش معاشرہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر معاشرہ صحت مند نہیں ہے تو پھر ادیب، شاعر، نقاد، اور فنکار کا کیا فرض ہے؟ وہ اس فرض کو کس طرح ادا کر سکتا ہے؟ کیا وہ ان جراثیم سے محفوظ رہ سکتا ہے جو معاشرہ میں موجود ہیں؟ یہ مسئلہ بحث طلب ہے۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ جب کبھی معاشرہ متعفن ہوا جب بھی اس کے اندر مہلک بیماری پیدا ہوئی تو کوئی نہ کوئی ایسی ہستی ضرور پیدا ہوئی جس نے اسی معاشرہ اور ماحول میں پرورش پا کر نہ صرف ان بیماریوں اور خرابیوں کو دور کیا بلکہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو نئی زندگی بخشی اور پورے معاشرہ کو، بیماری، بدبختی اور موت سے نجات دلائی۔ ادیب، شاعر، نقاد، سب انسان ہی ہوتے ہیں۔ وہ سوسائٹی سے متاثر بھی ہوتے ہیں اور سوسائٹی کو متاثر بھی کرتے ہیں۔ لیکن ہر ادیب یا شاعر میں یہ صلاحیت و قدرت یہ توانائی و پختگی، یہ معاملہ فہمی و دوراندیشی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے خیالات کے ذریعے سے اپنی تخلیق کو دلکش، مفید اور جامع بنا کر پیش کرے۔ میر و غالب، حالی، اقبال ادبی دنیا میں مدتوں بعد پیدا ہوتے ہیں، مگر یہ ہستیاں یوں ہی نہیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ احتشام صاحب کے الفاظ میں:

"جب حیات و کائنات کا تصور بدلتا ہے، جب زندہ رہنے اور مرنے کا مقصد بدلتا ہے تو نیا انسان وجود میں آتا ہے، نیا ذہن پیدا ہوتا ہے اور نئے تخلیقی کارنامے جنم لیتے ہیں۔"[2]

ترقی پسند ادب اور تنقید کا وجود بھی کچھ اسی قسم کے حالات میں ہوا۔ انقلاب روس نے دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔ ہندوستانی ادب خصوصاً اردو ادب اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ احتشام صاحب

---

[1] تنقیدی جائزے: مواد اور ہیئت صفحہ ۱۳۳ [2] روایت اور بغاوت صفحہ ۲۴۲

ترقی پسند نظریات کے اتنے اور ایسے سرگرم حامی رہے کہ کچھ ہی عرصے کے بعد وہ کم از کم اردو ادب میں ترقی پسندی کی علامت اور اس کے سنجیدہ با شعور سربراہ تسلیم کیے جانے لگے۔ انھوں نے اپنے خون جگر سے اردو ادب کو سیراب کرکے اس کو سرسبزی و شادابی، حرارت، گرمی، زندگی و توانائی عطا کی۔ ان کے خیال میں:

"ادب پر نئے افکار و تصورات کا جادو بڑے پیچیدہ انداز میں ملتا ہے" اور ادب کی تنقید زندگی اور زندگی کی قدروں کی تنقید ہے، کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے کی تنقید ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ادب کے اندر عقیدے اور بہترین نظام زندگی کی تلاش ہوتی ہے[1]"

لیکن تنقید کا مسئلہ کیا ہے؟ اس کا فرض کیا ہے؟ اس کی حدود کیا ہیں؟ ان امور پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس وقت تنقید کا مسئلہ محض ادب کی پرکھ کا مسئلہ نہیں، اپنی زبان اور اپنے ادب سے دلچسپی لینے کا مسئلہ بھی نہیں ہے، بلکہ ادب کے عالمی معیاروں کو پیش نظر رکھ کر ہر اس علم و فن سے کام لینے کا مسئلہ ہے جن سے انسانی ذہن، عمل اور محرکات عمل کو سمجھا جا سکتا ہے[2]"

عالمی اور اعلیٰ معیاری ادب کے لیے، کتنے مطالعے کی ضرورت ہے، کتنی محنت و ریاضت کی ضرورت ہے؟ کتنے مشاہیر ادب کے تنقیدی خیالات اور ادبی تجربات سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے اور ان سب باتوں کے لیے کتنا وقت، عمر کا کتنا حصہ صرف ہوگا، اتنے وسیع مطالعے کے لیے عمر بھی وفا کرے گی یا نہیں؟ یہ سوالات ہیں جو کسی ادیب یا شاعر یا نقاد یا فن کار کے ذہن میں ضرور پیدا ہوتے ہوں گے لیکن وہ ان سے بے نیاز ہوکر اپنے فن کی تخلیق کرتا ہے اور اپنے خون جگر سے فن میں اعجاز پیدا کرتا ہے۔ بہرحال احتشام صاحب کے الفاظ میں:

"اگر تنقید کوئی علمی کام ہے اور محض تاثرات کا بیان نہیں ہے تو ان تمام جدید علوم سے کام لینا ہوگا جن سے زندگی اور ادب کو سمجھا جا سکتا ہے[3]"

لیکن زندگی کے مسائل سمجھنے سے پہلے، ادب کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ ادب کیا ہے؟ اور اس کا زندگی سے کیا تعلق ہے؟ اس کی تشریح و توضیح قریب قریب ہر ایک دانشور نے کی ہے لیکن احتشام صاحب کے الفاظ میں:

"ادب اظہار خیال کا ایک مخصوص فن ہے جس کی تشکیل و ترتیب میں کئی ابعاد کا یکجا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ انھیں کے ناقص تناسب یا ناقص ترتیب سے ادب اپنی سطح سے نیچے گر جاتا ہے۔ ادب میں خیال، موضوع، مواد، اور فکر کی موجودگی کی وجہ سے کوئی خالص ادبی نظریہ بن بھی نہیں سکتا۔ اس لیے ادب کے شعور، ارادہ اور انتخاب کو بنیادی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر جہاں موضوع اور فکر کو جگہ ملتی ہے وہیں شعور فن کو بھی[4]"

لیکن

"شعور کی رفتار خط مستقیم میں نہ ہوتی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ یہ آہستہ آہستہ تجربے اور مشاہدے کے ساتھ ساتھ کبھی کم، کبھی زیادہ حاصل ہوتا رہتا ہے، ادب کے صحیح مطالعے کے لیے ضروری ہو کہ سماجی نظام کی مادی تبدیلیوں کو مد نظر رکھا جائے، مادی وسائل کی مقدار اور خصوصیتیں تخیل کا ڈھانچہ بناتی ہیں اور فن کار انھیں کی عکاسی کرکے زندگی کی قدروں کی تخلیق اپنے طور پر کرتا ہے[5]"

اور فن کار کی تخلیق کی اہمیت و افادیت کیا ہے؟ اس کو بتانا تنقید کا کام ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ تنقید فلسفہ کے دائرے کی چیز ہے، جو شخص اس کی اس فلسفیانہ حیثیت کو سمجھے بغیر تنقید کرتا ہے اس کی حیثیت اس ملاح کی ہے جو سمتوں اور ہواؤں کا علم حاصل کیے بغیر کشتی کھینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ادبی تنقید مکمل طور پر ایک آزاد علم نہیں ہے بلکہ اس کا رشتہ کئی دوسرے علوم سے جڑا ہوا ہے اور انھیں کے تانے بانے سے اس کا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے، تاہم جب فلسفہ، اخلاقیات، نفسیات، جمالیات، عمرانیات، تاریخ، لغت، قواعد، علم معانی و بیان، لسانیات وغیرہ کے اشتراک سے ادب فہمی کے کچھ اصول ترتیب پا جاتے ہیں تو علم تنقید خود ایک آزاد علم کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور اس کی منطق الگ بن جاتی ہے[6]"

اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ:

---

[1] ذوق ادب و شعور، صفحہ ۱۵۷ [2] ذوق ادب و شعور، ۲۵۹ [3] عکس اور آئینے، ۲۳۶ [4] روایت اور بغاوت، ۱۳۲ [5] عکس اور آئینے، صفحہ ۲۳۸

"اعلیٰ ادبی تنقید ایک فلسفیانہ شغل ہے جس میں فکر اور فن کے متعلق پیدا ہونے والے ہر سوال کا جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس سلسلے میں جن دوسرے علوم سے مدد مل سکتی ہے، نقاد ان سے کام لیتا ہے[1]"

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ترقی پسند نقادوں نے یہ اہم فریضہ ادا کیا ہے۔ انھوں نے ادب کی جمالیاتی، سماجی، عمرانی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ادیب کے جذبات و احساسات اور شعور کو پرکھا ہے۔ اس کی "جانچ پڑتال کا پیمانہ بہت بڑا ہوتا ہے اور وہ چند سطحی لفظوں کی مدد سے کتاب اور مصنف کے بارے میں رائے دینا پسند نہیں کرتا بلکہ پوری چھان بین اس امر کی کرتا ہے کہ مصنف کی کاوش، زندگی کے دھارے میں کیا اہمیت رکھتی ہے[2]"۔

"ترقی پسند نقاد جمالیات، لفظی خوبیوں اور دوسری چیزوں کا احساس رکھتے ہیں، اس سے متاثر ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں بھولتے کہ خود ان کا احساس جمال مادی رشتوں اور رابطوں سے اثر پذیر ہوتے ہیں[3]"

ترقی پسند نقاد نے مادی رشتوں اور رابطوں کو اتنی زیادہ اہمیت دی جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ وہ قدیم ادب کا دشمن ہے، اس کو مٹا دینا چاہتا ہے، اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے، تا نہ باشد چیزکے مردم نہ گویند چیزہا کے بمصداق اس میں کسی حد تک صداقت بھی ہے، لیکن جہاں تک معیاری ترقی پسند تنقید کا سوال ہے اس میں یہ بات نہیں ہے۔ احتشام حسین صاحب کے الفاظ میں:

"ایک بات جسے اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ ترقی پسند نقاد قدیم ادب کا دشمن نہیں ہے۔ وہ اسے، اس کے صحیح ماحول میں سمجھنا اور سمجھانا چاہتا ہے۔ وہ تاریخ کا بہت خیال رکھتا ہے۔ اس کا معیار نقد چیزوں کے پرکھنے اور دیکھنے کا طریقہ دوسرے نقادوں سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ زمانے کو منجمد، ساکن اور ٹھہرا ہوا نہیں مانتا[4]"

اگر یہ صحیح ہے کہ ادب، زندگی کا آئینہ دار اور ترجمان ہوتا ہے وہ اپنے زمانے اور ماحول کی عکاسی کرتا ہے تو اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس میں اس عہد کے افکار و خیالات، رجحانات و احساسات کی جھلک نہیں موجود ہوگی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ

"عام انسانوں کے خیالات اور جذبات، ادیب اور فن کار کے یہاں پہنچ کر گہرائی، تاثر اور لطافت کا سرچشمہ بن جاتے ہیں۔ قوموں اور ملکوں کی حیات اجتماعی ادب اور آرٹ میں زندہ ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں ایک نقاد کیونکر لفظی یا لسانی خصوصیات ہی کو اپنی تنقید کا مرکز بنا کر مطمئن ہو سکتا ہے۔ وہ اس ملک کی تاریخ جاننا چاہتا ہے وہ فرد اور جماعت کے رشتے کو سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ مصنف کے نقطۂ نظر کو معلوم کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس زمانے کے مروج فلسفۂ حیات اور مختلف نظریات کی چھان بین کر کے یہ معلوم کرنے کا متمنی ہوتا ہے کہ مصنف کا تعلق کس گروہ سے تھا۔ ان باتوں کے علاوہ ان مرکبات کو حل کرنا چاہتا ہے جنھوں نے جنسی یا دوسری سماجی بیماریوں کی وجہ سے اختلاف اور مذہب کے خوف زدہ علامات و اشارات کی شکل اختیار کر لی[5]"

ترقی پسند نقاد کی یہی کوشش و کاوش اردو تنقید و ادب کو مالا مال کر رہی ہے۔ حقیقت پسندی اور حقیقت نگاری کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ شعر و ادب میں اعلیٰ نصب العین، فنی حسن کاری، اور خلوص کو اہمیت دی جا رہی ہے۔ اردو زبان و ادب مخالفت کے باوجود سیاسی و سماجی کش مکش سے آنکھیں چار کر رہا ہے احتشام صاحب کے نزدیک

"سماجی کش مکش سے پیدا ہونے والے ادب کا جتنا ذخیرہ اردو میں فراہم ہو گیا ہے اتنا شاید ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں نہیں ہے[6]"

اور شاید اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ

"اردو ادب میں اشتمالی حقیقت نگاری کا دور آ گیا ہے اور اس میں زندگی بجلی کی طرح کوند رہی ہے[7]"

احتشام صاحب کے تنقیدی نظریات سے میں نے یہ چند باتیں، بطور تعارف کے عرض کر دیں۔ ان میں کوئی خاص ترتیب بھی نہیں ملے گی۔ لیکن احتشام صاحب کے تنقیدی نظریات کو سمجھنے کے لیے ہلکے ہلکے اشارے ضرور مل جائیں گے۔

★

[1] عکس اور آئینہ: صفحہ ۲۰۵ [2] تنقیدی جائزے: صفحہ ۱۹۰، ۱۹۱ [3] تنقیدی جائزے: صفحہ ۱۹۷ [4] روایت اور بغاوت: صفحہ ۱۶۱ [5] ... روایت اور بغاوت: صفحہ ۱۹۶

دیشاکھ جیٹھ ۱۸۹۵ شک

سید احتشام حسین

ایک دیدہ ور

سید نواب افسر

پروفیسر سید احتشام حسین کی عظمت اور بین الاقوامی شہرت ایک عظیم نقاد کی حیثیت سے ہے۔ اردو میں باقاعدہ تنقید کی ابتدا حالیؔ اور شبلیؔ سے ہوتی ہے۔ ان دونوں ادیبوں نے شاعری کے معیار و مسائل پر اتنی سنجیدہ گفتگو کی ہے حتیٰ کسی زبان کے سب سے پہلے نقاد نے نہیں کی ہوگی۔ وہ بصیرت رکھتے تھے۔ ان کی نظر ادبی مزاج کی تغیر پذیری پر بھی تھی۔ اور بعض آفاقی قدروں کی توانائی سے بھی واقف تھے۔

احتشام صاحب کا دور اردو ادب کا سنہرا دور ہے۔ اور اس دور میں فنِ تنقید بامِ عروج تک پہنچا۔ انگریزی ادب سے استفادہ کرنے والے بڑے بڑے نقادوں نے گراں بہا تصانیف پیش کیں تقریباً ایک چوتھائی صدی کے اندر اردو تنقید پر جتنا کام ہوا اتنا دوسری زبانوں میں نہیں ہوا۔ اس پورے قافلے میں احتشام صاحب سب سے زیادہ اثر انداز ہوئے۔ شاید حالیؔ، اور شبلیؔ کے بعد کوئی اتنا اثر انداز نہیں ہوا۔ درحقیقت احتشام صاحب میں کوئی ایسی وہبی صلاحیتیں تھیں جو ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتیں۔ کوئی کتنا ہی عالم و فاضل ہو۔ اگر جینیس (GENIUS) نہیں تو وہ پڑھی پڑھائی باتوں کو دہرا سکتا ہے۔ ذاتی وجدان و شعور کی بنیاد پر اجتہادی رائے قائم کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اس کو بیچ کا وہ اعتماد بھی حاصل نہیں ہو سکتا جو ایک مجتہد کو اپنی زبان پر ہوتا ہے۔ ادب ایک ایسا جامع شعبۂ حیات ہے جس سے تمام دوسرے شعبوں کے رشتے ملتے ہیں۔ البتہ ان رشتوں کو سمجھنا اور ان کی نشان دہی کرنا کسی دیدہ ور ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ احتشام صاحب ایسے ہی دیدہ ور تھے۔ انھوں نے وسیع مطالعے اور ذوقِ جستجو سے اپنی صلاحیتوں کو توانائی دی اور ان سے پورا کام لیا۔ انھوں نے تنقید کو فلسفیانہ انداز میں ایک علم کی طرح برتا۔ انھوں نے زندگی کو ادب کی روشنی میں اور ادب کو زندگی کی روشنی میں دیکھا۔ انھوں نے ادب اور دوسرے شعبہ ہائے حیات کے درمیان رشتوں کو ابھارا۔ انھوں نے نئی اور پرانی قدروں کو بجائے خود سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کی۔ ان کے فیصلوں میں اتنا توازن اور اتنا رچاؤ ہے کہ پڑھنے والے کو قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ ان کی تحریروں میں نہ سخت کلامی ہے نہ زیادہ جوش ہے۔ بس علمی مباحث کا ایک پرسکون دریا ہے جو بہتا چلا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ ان کے طرزِ تحریر میں شگفتگی کم ہے لیکن یہ ویسے ہی سطحیت پسند لوگ ہیں جن کو غالب سے مشکل گوئی کی شکایت ہے۔ ظاہر ہے کہ پیچیدہ مسائل کی گہرائیوں تک جانا اور فلسفیانہ طرز پر ان کا تجزیہ کرنا سخت خشک اور دشوار گزار وادی ہے۔ اس کو گل و گلزار تو بنایا نہیں جا سکتا۔

احتشام صاحب کے مزاج کی ایک خصوصیت اعتدال اور رواداری ہے۔ وہ دوسروں کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے تھے۔ ان کو شدید اختلافات کی منزلوں سے بھی گزرنا پڑا۔ لیکن ہر موقع پر صرف استدلال اور افہام و تفہیم سے کام لیا۔ تحریر ہو یا تقریر کبھی جذبات سے بے قابو نہیں ہوئے۔ کبھی لہجہ میں تلخی نہیں آئی۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے معماروں میں تھے۔ لیکن عصری، اور جذباتی نعرہ زنی سے بالاتر رہے۔ وہ اس تحریک کو جماعتی سیاست اور تبلیغی نعروں کے بجائے فکر و نظر کی بنیادوں پر آگے بڑھانے والے تنہا رہنما تھے۔ انھوں نے ادب اور مقصد کا جائزہ لے کر ایک واضح اور روشن راستہ معین کیا۔ درحقیقت وہ تحریک کے نقیب نہیں تھے۔ بہترین وکیل تھے۔ ان کے مضبوط دلائل اور دل نشین طرزِ ادا نے تحریک کو سنجیدگی اور توانائی بخشی۔ انھوں نے انتہا

پسندی کی کبھی حمایت نہیں کی۔ نہ شاعری میں ہیئت کو یکسر نظر انداز کر دینے کی بات کبھی کہی۔ انھوں نے روایت سے بغاوت ضرور کی۔ لیکن بغاوت برائے بغاوت نہیں۔ ان کے مزاج میں سمجھوتہ کی گنجائش بھی تھی۔ وہ اسلوب بیان کو وسعت دینے کے لیے نئے نئے راستوں کے متلاشی تھے۔ لیکن آخر تک غزل بھی کہتے رہے۔

ان کو جیسا سلیقہ لکھنے کا تھا ویسا ہی سلیقہ بولنے کا بھی تھا۔ ان کی نظر ادبی موضوعات میں محدود نہیں تھی۔ وہ تعلیمی مسایل پر بھی اک ماہر تعلیمات کی طرح اظہار خیال کرتے تھے اور مذہبی مجالس میں بھی پر مغز تقریریں کرتے تھے۔ ان کی تقریر میں کچھ ایسا ہی جادو تھا کہ سامعین ہمہ تن گوش ہو کر سنتے تھے اور کم از کم اس وقت تو کسی کو اختلاف کی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔

ان کا اخلاق اتنا وسیع تھا کہ جو بھی ان سے ایک بار ملا ان کا گرویدہ ہو گیا۔ کسی کو بھی ان سے شکایت نہیں ہوئی۔ وہ حتی الامکان کسی کی بات ٹالتے نہیں تھے چاہے وہ موجب زحمت ہی کیوں نہ ہو۔ وہ بہ ایں عظمت و شہرت انتہائی سادگی کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کی شخصیت کے پیچھے کوئی دوسری شخصیت نہیں تھی۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ ان کی زندگی صداقت تھی۔ اشتراکیت کی طرف مائل ہونے والی ترقی پسندی کے باوجود ان کو مذہب بھی عزیز تھا اور تہذیبی زندگی کی لطافتیں بھی عزیز تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ مسائل پر غور کرتے کرتے وہ اک مفکر بن گئے تھے۔ وہ ہمیشہ سنجیدہ رہتے تھے۔ باتیں کم کرتے تھے۔ بہت ہنستے بھی نہیں تھے۔ ان کے چہرہ پر علم کا ایسا جلال تھا جو ہر نگاہ کو متاثر کرتا تھا۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ بات ماننا پڑے گی کہ ان کے جذبات کسی نہ کسی حد تک مجروح ضرور تھے۔ حالانکہ انھوں نے کبھی خلوت و جلوت میں یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی۔ ایک ایسا دانشور، ایسا نقاد جس کی شہرت ملک کے حدود سے نکل کر اطراف عالم میں پہونچی ہو، جسے روس اور امریکہ نے اپنے ملکوں میں مدعو کیا۔ اس کے لیے کیا یہ تکلیف کی بات نہیں ہے کہ اس کی زندگی کا بہترین دور ترقی ایک لکچرار کی حیثیت سے گزر جائے۔ آخر جب پہاڑ صبر لبریز ہو گیا تو لکھنؤ جو اردو کا مرکز ہے اسے چھوڑ کر الہ آباد چلے گئے۔ جہاں یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو او پروفیسر کی حیثیت سے انھیں بلایا گیا تھا لیکن لکھنؤ چھوڑنے کا یقیناً صدمہ ہوا ہوگا۔ پھر جس اردو کے لئے زندگی تج دی اور جس انجمن (ترقی پسند مصنفین) کو خون دل دیا تھا اس کی بے اثری بھی دیکھی، انتشار بھی دیکھا۔ شاید اسی شکستہ خاطری کا نتیجہ تھا کہ الہ آباد میں انھوں نے بڑی خاموشی سے زندگی گذاری۔ وہ مختلف سرکاری اور غیر سرکاری اداروں اور کمیٹیوں کے ممبر ضرور رہے لیکن مباحث میں حصہ لینے کی وہ چونپ نظر نہیں آتی۔

احتشام صاحب کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ حالیؔ اور شبلیؔ کی طرح وہ بھی شاعر تھے۔ بلکہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار بھی تھے۔ ایک باذوق شاعر اور افسانہ نگار اپنے فن کے مضمرات پر جس طرح روشنی ڈال سکتا ہے وہ دوسروں سے متوقع نہیں۔ جن نقادوں کی طبیعت میں فطری طور پر شاعرانہ کیفیت موجود ہوتی ہے وہ زیادہ نکتہ رس ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو شاعری سے مس نہیں ہوتا وہ پڑھ لکھ کر نقاد تو ہو جاتے ہیں لیکن بقول جوشؔ ملیح آبادی ان کی انگلیاں نبض رنگ و بو پر نہیں ہوتیں۔ وہ کبھی کبھی شاعرانہ اسلوب کی گرفت نہیں کر پاتے اور الفاظ کے پھیر میں الجھ جاتے ہیں۔ مجھے اپنی طالب علمی کے دور میں خود ایسے تجربے ہوئے ہیں کہ بعض نامور اساتذہ نے بعض اشعار کی ایسی تاویلیں کیں جو ایک طالب علم ہوتے ہوئے بھی میرے دل کو نہیں لگیں۔ احتشام صاحب خود شاعر تھے لہٰذا فن کی نزاکتوں سے زیادہ واقف تھے۔ اور شاعری کے امکانات کا جائزہ لینے کے زیادہ اہل تھے۔ وہ مقصدیت اور شعریت کے امتزاج کے لیے بہت کچھ کر سکتے تھے۔

افسوس کہ احتشام صاحب کی موت نے ہم سے ایک عظیم سرمایہ چھین لیا۔ ان کے اٹھ جانے سے اردو تنقید کا شعور مضمحل ہو گیا۔ ان کی جگہ عرصے تک خالی رہے گی۔

"ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

★

لیکن ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد اردو تنقید میں نمایاں تبدیلی آئی۔ قدیم اثرات برائے نام باقی رہ گئے۔ اصطلاحات مغرب سے وضع کی جانے لگیں۔ تنقید کے اس متحرک رویے میں، اس کے طرزِ فکر میں معاشی نظام کی تبدیلی کا اثر پڑا اور ادب میں سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل کو حل کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

آزاد نے شاعری کی ماہیت، خیال اور الفاظ کے تعلق اور شعر کی افادیت پر غور کیا۔ حالی نے عقلیت اور سائنٹفک نقطۂ نظر سے بحث کی۔ شبلی نے جمالیاتی تاثر پذیری اور اندازِ بیان کی خوبیوں سے کام لیا۔

اس دور کے متعلق احتشام حسین فرماتے ہیں:

"جس عہد کو ہم حالی کا عہد کہتے ہیں وہ تنقید کے نقطۂ نظر سے تین بڑی شخصیتوں یعنی آزاد، حالی اور شبلی کا عہد ہے۔ یوں تنقیدی اشارے سر سید، نذیر احمد اور تہذیب الاخلاق کے دوسرے مضمون نگاروں کے یہاں مل جاتے ہیں لیکن جن لوگوں نے تنقید کو ایک مستقل فن کی حیثیت سے استعمال کیا ہے اور چند اصولوں کی روشنی میں عملی تنقید کی طرف توجہ کی وہ یہی تین ہیں۔"

آزاد کے تنقیدی نظریے کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں:

"آبِ حیات عملی تنقید کا بہت ہی اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے اور اپنے حدود کے اندر اردو میں پہلی دفعہ شاعری کی نشو و نما اور شعرا کی زندگی اور کارناموں کا جائزہ لینا سکھاتی ہے۔"

حالی کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حالی اس عہد کے سب سے بڑے اور سب سے اہم نقاد ہیں۔ ان کے شعور میں اس دور میں پیدا ہونے والی عقلیت اور سائنٹفک نقطۂ نظر کی جھلک ملتی ہے۔ وہ جب نفسِ شاعری پر غور کرتے ہیں تو اس کی سماجی بنیاد کا پتہ بھی لگانا چاہتے ہیں اور تخیل کے سرچشمہ کی جستجو کرتے ہیں اور شاعری کے عہد بہ عہد تغیرات میں سطحی طور پر ہی تاریخی اور سماجی تبدیلیوں کی کارفرمائی دیکھتے ہیں۔"

جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد اردو تنقید نے ایک اور نیا موڑ لیا۔ حیات ایک جلوۂ صد رنگ کی صورت میں نظر آنے لگی۔ زندگی، تمدن اور مظاہرِ تمدن میں رشتہ مضبوط تر ہوا۔ زندگی اور ادب اور اس کے متعلقہ جزویات کے مطالب میں زیادہ ہمہ گیری اور وسعت پیدا ہوئی۔ نظریاتی تنقید شروع ہوتے ہی عملی تنقید کی جڑیں کھوکھلی ہونے لگیں۔ ہندوستان میں قومی تحریک روز افزوں ترقی کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی طنزیاتی تجرباتی اور نفسیاتی تنقید بھی اپنا دائرہ بڑھانے لگی۔ اسی عہد میں چکبست، اثر اور مولوی عبدالحق نے اپنی تنقیدی زندگی شروع کی۔ اس عہد کے ناقدین کے متعلق احتشام صاحب نے لکھا ہے کہ:

"ان بزرگوں نے اردو کو ایک ایسی نثر دی جس میں نئی لچک پائداری، شگفتگی، حسن اور افادیت ہے۔ تنقید ادب کے لیے ضروری تھی انھوں نے لوگوں کو نئی زندگی اور نئے خیالات کا خیر مقدم کرنا سکھایا۔"

اسی کے بین بین نئے خیالات اور نئے تغیرات سے متاثر ہو کر اردو ادب میں رومانی تحریک بھی شروع ہوئی جو مغرب سے مستعار کی گئی تھی۔ اس عہد کے ممتاز ناقدوں میں۔ بجنوری، سروری، زور، یلدرم، مہدی افادی، سجاد انصاری، نیاز فتحپوری وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ تمام لوگ مختلف نظریاتی دبستانوں کے ممتاز ناقد ہیں۔ سروری، بجنوری اور زور کے یہاں مغربی اور مشرقی نقد و نظر کا مساوی امتزاج ملتا ہے۔ نیاز اور سجاد انصاری وغیرہ جیسے ناقدوں کے یہاں عقلیت تجربیت اور استدلالیت کی مخالفت، جذبہ و احساس کی شدت اور جمالیاتی حس کی تلاش و جستجو ملتی ہے۔ ان لوگوں نے رومانی تحریک کو باقاعدہ تحریک دینے کی کوشش کی لیکن روس کے انقلاب اور جنگِ عظیم کے اثرات نے اس تحریک کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا۔

اشتراکی فلسفے نے ایک نئے اجتماعی نظام کی داغ بیل ڈالی اور ایک غیر طبقاتی سماج کی تشکیل پر زور دیا۔ ابتدائی دور میں اختر علی تلہری اور کلیم الدین احمد وغیرہ نے اس تاریخی اور انقلابی تبدیلی کو روکنے کی ناکام کوشش کی لیکن دوسرے ناقدین اور ترقی پسند

ادیبوں نے اس نظریے کو پھیلانے کی اپنی تخلیقی توتیں صرف کر دیں۔ انھیں لوگوں کے متعلق پرکاش چند گپت نے لکھا ہے کہ:

"اشتراکی فن کے لیے بے شمار فنکار بھی جدو جہد کر رہے ہیں۔ فن کی فنکارانہ وراثت، لوک گیتوں کی شکل میں موجود ہے۔ فن پر ان کی دسترس روز بروز بڑھتی جائے گی اور انھیں کی صفوں میں سے کل کے بڑے اشتراکی فنکار نکلیں گے۔ گو تکنیک کا سوال اہم ہے لیکن اسے ہم فن کے لیے جدوجہد کرتی ہوئی جنتا کے سامنے ہوا بنا کر بھی کھڑا نہیں کر سکتے۔"

۱۹۳۶ میں اردو تنقید نے صحت مند روایت کی بنیاد ڈالی اور تجدید نظریہ، عقلیت و تجربیت کے ساتھ سائنسی طریقۂ فکر کی ابتدا ہوئی۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کو نئے نئے زاویئے دیئے۔ نقد و نظر کے نئے پیمانے بنے اور نئے معیار کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس تحریک نے سب سے زیادہ زور ادب اور زندگی کے اٹوٹ رشتہ پر دیا۔ سماجی اور معاشرتی رجحانات کے مطالعے کے ساتھ شخصی، انفرادی اور داخلی کیفیات کے مطالعہ کو اہمیت دی گئی۔ ادب کی افادیت اور اس کی مقصدیت کو واضح تر کیا گیا۔ رومانیت کے سیلاب کو اور جنسی ہیجان کو ختم کرنے پر پورا زور صرف کیا گیا۔ ان نقادوں میں سجاد ظہیر، اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر عبدالعلیم، سید احتشام حسین سردار جعفری، مجنوں گورکھپوری، عزیز احمد اور فیض احمد فیض قابل ذکر ہیں۔

ترقی پسند تنقید کا خاص عنصر اشتراکی حقیقت نگاری ہے۔ اس کا خاص رجحان مادیت کی طرف ہے جو تاریخی حیرت کو ایک اہم درجہ دیتی ہے اور ایک تغیر پذیر معاشرے کی تشکیل میں مدد کرتی ہے اور جو خارجی حالات سے اپنا رشتہ جوڑتی ہے۔ ترقی پسند ناقد ادیب کے ذہن کو سمجھنے اور ادب پارے کو پرکھنے میں سائنٹفک اور نفسیاتی طریقۂ فکر کو بروئے کار لاتی ہے۔

ترقی پسند ناقدین میں احتشام حسین کی شخصیت سب سے زیادہ ممتاز اور فکر کی حامل ہے۔ انھیں مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم پر مکمل دسترس حاصل تھی یہی سبب ہے کہ ان کی تحریریں جاندار، حقیقت پسند اور سائنٹفک ہیں۔

(۳)

عہد حاضر کی تنقید میں جو پیش رفت ہوئی ہے اس میں ترقی پسند تنقید کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس نے ادبی افادیت کی ضرورت پر زور دیا۔ مادرایت اور فراریت کے خلاف ایسی تحریریں لکھیں کہ عینیت پسندی کے رجحان کو ختم کر کے ادب اور زندگی کے تعلق کو اس کے رشتے کو مضبوط تر کیا۔

پروفیسر سید احتشام حسین نے ان اصولوں کو زیادہ سے زیادہ تشہیر کرنے میں اور اس کو بروئے کار لانے میں نمایاں رول ادا کیا۔ انھوں نے زندگی اور ادب کو ایک متحرک شے سے تعبیر کیا اور ادب کے مادی کردار کو اور اس کی جدلیاتی حیثیت کو واضح طور پر جاننے، سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ ایسے ہی ناقدوں کے بارے میں روسی ادیب طبنگی نے کہا ہے کہ:

"وہ فنکار جو ادب کو سماجی اور معاشرتی رشتوں کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، تنقید میں نہ تو تحت الشعور کی بھول بھلیوں میں کھو جانا پسند کرتے ہیں اور نہ محض ہیئت پرستی کے میکانکی عمل کو جامع تنقید تصور کرتے ہیں۔ وہ تاثراتی تصویروں کی عکاسی پر ہی قناعت نہیں کرتے ہیں۔"

احتشام حسین نے ادب کو اجتماعی ادب بنانے کی اپنی ناقدانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ادب کو روایت اور ہیئت پرستی کے دائرے سے باہر نکالا اور اسے نئے تجربوں اور نئی کیفیتوں اور نئے موضوعات سے روشناس کیا۔

احتشام حسین کی تنقید میں سائنٹفک رو اور مارکسی رو بین بین چلتی دکھائی دیتی ہے وہ دونوں کے امتزاج سے ایک تیسری رو کی تشکیل کرتے ہیں جسے ہم احتشامی رو کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے سائنٹفک نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے:

"سائنٹفک نقطۂ نظر وہ ہے جو ادب کو زندگی کے سماجی معاشرتی اور طبقاتی روابط کے ساتھ متحرک اور تغیر پذیر دیکھتا ہے اور ادبی مطالعے کے کسی پہلو کو نظرانداز نہیں کرتا۔"

براڈ فیلڈ کے نزدیک سائنٹفک تنقید کو تجزیاتی ہونا چاہیے کہ وہ ایسا طریقۂ کار اختیار کرے جس کے توسط سے کسی فن پارے کو جانچنے اور پرکھنے میں منطقی طریقہ اختیار کر سکے اور ساتھ ہی ایک مقصد کے تحت اپنے مواد کے پیش نظر استقرائی طریقۂ کار (INDUCTIVE METHOD) کو لازمی قرار دے کر کوئی نتیجہ برآمد کرے اور ایک ایسے کلیہ کی اختراع کرے جس کے توسط سے ادبی تخلیقات جانچی اور پرکھی جا سکیں۔

براڈ فیلڈ کے اس نظریے میں حقیقت پسندی، ادب و فن کا افادی پہلو، افادی نقطۂ نظر، وسیلۂ اظہار اور ترتیب و تنظیم کی اعلیٰ خصوصیتیں نظر آتی ہیں جو اپنی انھیں خوبیوں کی بنیاد پر ادب اور زندگی کو ایک دوسرے سے زیادہ قریب کرتی ہیں۔

احتشام حسین کا یہی مسلک تھا کہ ادب کا رشتہ زندگی سے اور اس کے تمام شعبوں سے جڑا ہونا چاہیے تاکہ ادب زندگی کی اعلیٰ قدروں اور اس کی مخصوص روایتوں کی تشہیر کر سکے اور اپنے مثبت رویے سے سماجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی ماحول کی ادب میں عکاسی کر سکے۔

احتشام حسین کی تنقیدی بصیرت اور شعوری کوششوں نے سائنٹفک تنقید کو مارکسی تنقید سے ہم آہنگ کر کے ایک صحت مند شکل دی۔

انھوں نے کارل مارکس اور اینگلز کے فلسفۂ حیات کا مطالعہ بہ نظر غائر کیا تھا۔ اور اشتراکی خیالات کو اپنے اندر سمو لیا تھا۔ انھوں نے ایک ایسے ادب کی نشو و نما میں حصہ لیا جس میں جمال پرستی اور رومانیت کی جگہ مادیت کا عنصر شامل تھا۔ انھوں نے نہ صرف ادب اور آرٹ کے سماجی کرداروں پر زور دیا بلکہ ایسے ادب کی تخلیق پر زور صرف کیا جو ایک طرف انسان اور سماج کے رشتے کو سمجھے اور دوسری طرف اس رشتہ کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنے میں کلیدی رول ادا کرے۔

احتشام حسین نے اپنی تحریروں سے مواد کی اہمیت کو پوری شدت سے ابھارنے کی کوشش کی اور اپنے انداز فکر اور سائنسی نقطۂ نظر کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

"جب ادب کے مادی تصور پر غور کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ ادب میں جن جذبات، خیالات اور تجربات کا اظہار کیا گیا ہے ان کے مادی سماجی پس منظر کو پیش نظر رکھا جائے تاکہ حقائق کی اصل بنیاد کا علم ہو سکے۔"

ایسا ادب جس میں حقیقت پسندی، اجتماعیت، سائنٹفک انداز فکر اور روح عصر کی ترجمانی کی گئی ہے، اس کو ایک انقلابی ادب سے تعبیر کیا گیا۔ یہ ایک ایسا ادب تھا جس نے بورژوا ذہنیت اور بورژوا ادب سے بیزاری کا اظہار کیا اور اس کی جگہ عوامی ادب کا نعرہ بلند کیا۔ مارکس (۱۸۸۳-۱۸۱۸) اور اینگلز نے ایک ایسے ادب کی داغ بیل ڈالی تھی جس میں مادیت کو اولیت حاصل تھی۔ مارکس نے اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

"سماج اور سیاسی رجحانات، طریقۂ کار، پیداوار اور مادی وسائل سے متعین ہوتے ہیں اور تاریخ کی ایک خاص سمت میں حرکت کرتے رہتے ہیں۔ انسان کا شعور سماجی حقیقتوں کو منضبط نہیں کرتا بلکہ سماجی حقیقتیں شعور کو متعین کرتی ہیں۔"

اینگلز نے کہا ہے کہ:

"سیاسی، قانونی، فلسفیانہ، مذہبی، فنی اور ادبی ارتقا، دراصل معاشی ارتقا کا رہین منت ہوتا ہے۔ معاشی قوت کو بنیاد بنا کر یہ ایک دوسرے پر عمل کرتے ہیں اور آخر کار معاشی ترقی اپنی قوت کو نمایاں کر کے رہتی ہے۔"

مارکس نے اس مادی جدلیت پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ اس کے اس نظریے نے ادب کو بھی متاثر کیا اور ایسے ادب کی تخلیق پر زور دیا جانے لگا۔ ترقی پسند ادیبوں نے ایسی تخلیقات پیش کیں جو فکر و عمل کو مہمیز کرتی اور افراد و جماعت دونوں کی زندگی میں اٹوٹ رشتے پر زور دیتی تھیں۔

احتشام حسین اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ ہر دور اور ہر زمانے کا ادب اپنے مخصوص طبقے کی، اپنے مخصوص ذہن

کی ترجمانی کرتا ہے اور یہ کہ دنیا کا کوئی ادیب اپنے ماحول و معاشرے سے نہ بیگانہ رہ سکتا ہے نہ حالات و واقعات کی جانب سے آنکھیں بند کرسکتا ہے۔ وہ بالواسطہ اور دانستہ یا نادانستہ طور پر اپنے ماحول سے، اپنے معاشرے سے اثر ضرور قبول کرتا ہے۔ وہ سوسائٹی کے جس طبقہ سے متعلق ہوتا ہے اس کی حمایت کرتا ہے اور ان کے نظریات اور اصولوں کی تائید کرتے ہوئے وہی بات کہتا ہے جو ماحول یا معاشرہ اس سے کہلوانا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ کہتے ہیں:

"کسی عہد کے تمام ادیب شعور کی ایک ہی سطح پر نہیں ہوسکتے۔ ذہنوں پر خاندانی، طبقاتی، اور سماجی روایتوں کا بوجھ ہوتا ہے جسے زندگی کی کشمکش کو سمجھے بغیر اتار پھینکنا تقریباً ناممکن ہے۔"

احتشام حسین اپنی زبردست علمی اور ادبی بصیرت اور عملی تنقیدی بصیرت کے سبب عصر حاضر کے سب سے بڑے ادیب اور ناقد تھے۔ ان کے غور و فکر کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ان کی تحریروں میں توازن اور اعتدال تھا۔ جدید تنقید کے وہ مستند ناقد تھے۔ انھوں نے اشتراکی اور ترقی پسند تنقید کو اپنی مفکرانہ تحریر سے ایک سائنس بنا دیا اور ایک ایسی تنقید کی طرح ڈالی جو اشتراکی فلسفے، سائنٹفک نقطۂ نظر، نفسیاتی تجزیے، عمرانی رویے اور جمالیاتی تقاضے کے امتزاج کے باعث احتشامی تنقید کی شکل میں ظاہر ہوئی اور جو متوازن ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی فکر انگیز اور حکیمانہ شعور سے آراستہ و پیراستہ ہے۔

★

احتشام حسین اور جدید اردو تنقید — (صفحہ ۹۰ کا بقیہ)

کرتے ہیں اور تنقید و تحقیق کے رشتہ کو اہمیت نہیں دیتے۔ اس طرح کے ناقدین یا محققین ادب کے ساتھ پورا انصاف نہیں کرتے، اسی لیے بعض موقعوں پر گمراہی یا غلطی کا شکار رہتے ہیں۔ نقاد کے فیصلوں کے لیے تحقیق ناگزیر ہے اور اس کے بغیر صحیح نتیجے تک اس کا پہنچنا بہت دشوار ہے۔ احتشام حسین نے تحقیق و تنقید کے رشتوں پر زور دے کر اس کی وضاحت کی کہ "اصول نقد کا تعین کرنے میں تحقیق کے پرکشش نگاہ کو جانا چاہیے۔" اس طرح انھوں نے نقاد اور تنقید کی ان کوتاہیوں کا سدباب کیا جو تحقیق پر نگاہ نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی تھیں۔ یہ ایک ایسی کوشش تھی جس سے اردو تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ احتشام حسین نے اردو تنقید کو پہلی بار فلسفیانہ انداز نظر، سماجی بصیرت اور واضح انداز بیان دیا۔ ان کے اسلوب میں تازگی، قطعیت، صفائی اور تنقیدی جرأت ہے۔ انھوں نے اپنے حکیمانہ انداز اور فلسفیانہ ذہن، علمی گہرائی اور وضاحت سے اردو تنقید کو جمالیاتی، نفسیاتی اور مغالطوں کی تشریح اور توضیح کے دائرے سے نکال کر سائنٹفک بنایا جس کے پیش نظر بجا طور پر انھیں اردو میں جدید سائنٹفک تنقید کا بانی اور صحت مند ادبی اقدار کا علمبردار کہہ سکتے ہیں۔

★

کی
افسانہ نگاری

اکبر رحمانی جل گانوی

طالب علمی کے زمانے میں ادبی زندگی کے آغاز کے ساتھ ہی احتشام حسین نے جہاں دیگر اصناف ادب کو اپنا موضوع بنایا وہاں اس مقبول عام صنف ادب یعنی افسانہ نگاری کو بھی اپنے تجربات، مشاہدات، خیالات اور جذبات کی ترجمانی کے لیے منتخب کیا افسانہ نگاری کی طرف ان کے رجحان کا خاص سبب کیا تھا یہ تو معلوم نہیں لیکن جس دور میں انھوں نے افسانہ نگاری شروع کی وہ دور ترقی پسند تحریک کا ابتدائی دور تھا۔ اس تحریک کے علمبردار اور ادیبوں نے مختصر افسانے کو جو مقبولیت عطا کی وہ اس سے قبل اس صنف کو حاصل نہ ہوئی تھی۔ ادب اور زندگی کا تعلق قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ قصوں اور داستانوں کے مافوق الفطرت عناصر اور ادب لطیف کی حسن آفرینی اور دلآویزی سے لوگ اکتا چکے تھے۔ ادب میں داخلیت کی بجائے خارجیت نے اپنا اثر جمانا شروع کر دیا تھا۔ ادب میں شہزادوں شہزادیوں، بادشاہوں، وزیروں اور پریوں کی جگہ مزدوروں، طوائفوں، کلرکوں، محنت کشوں کسانوں اور متوسط طبقے نے لے لی تھی۔ عوامی ادب کا دور شروع ہو چکا تھا۔ ادب زندگی کا ترجمان بننے کے ساتھ ساتھ زندگی کا ناقد بھی بنتا جا رہا تھا۔ 'کیا ہے' کے ساتھ 'کیا ہونا چاہیے' پر بھی زور دیا جا رہا تھا۔ غرضیکہ ترقی پسند تحریک نے شعر و ادب کی مردہ رگوں میں نیا خون دے کر اسے نیا جوش اور ولولہ عطا کیا۔

احتشام حسین طالب علمی کے زمانے ہی میں اشتراکی نظریات اور خیالات سے متاثر ہو چکے تھے۔ اشتراکیت کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد انھوں نے اسے شعوری طور پر اپنایا تھا اور آخر تک ان کے اس ایمان و ایقان میں ذرا بھی تنزل نہ آیا۔ ترقی پسند تحریک کے جلسوں میں وہ باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید یہ ترقی پسندی تحریک ہی کا اثر تھا کہ وہ افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ اس صنف میں طبع آزمائی کی ایک وجہ ان کی حساس طبیعت اور حد سے بڑھی ہوئی افسردگی بھی ہو سکتی ہے۔ حادثات زمانہ کے تھپیڑوں نے احتشام صاحب کو بہت زیادہ حساس بنا دیا تھا۔ ان کی شخصیت میں گداختگی پیدا کر دی تھی۔ وہ سوز دروں کی آگ میں تپا کیے۔ کتنی حسرتیں اور تمنائیں تھیں جو تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ گئیں۔ آرزوؤں کا خون ہوتے دیکھ کر ان میں بے دلی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ دل پر افسردگی کی فضا چھا گئی۔ ان کی آنکھیں نمناک رہتیں۔ دوسروں کی تکلیف دیکھ کر بے قرار ہو جاتے اور ان کی محرومیاں ان کے دل میں نشتر چبھوتیں۔ خود بھی زندگی میں بڑے بڑے صدمے اٹھا چکے تھے۔ اس لیے دوسروں کو رنجیدہ دیکھ کر خود بھی رنجیدہ ہو جاتے۔ خوشیاں انھیں زیادہ خوش نہ کرتیں بلکہ خوشی کے موقع پر بھی غم ان کے ذہن پر اپنا تسلط جمائے رکھتا۔ اس طرح زندگی میں پیہم محرومیوں سے دوچار ہونے کی وجہ سے وہ غم و آلام کو جھیلنے کے عادی ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیشتر افسانوں میں غم اور افسردگی کی چھاپ ملتی ہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا اور آخری مجموعہ 'ویرانے' حیدرآباد سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کے بیشتر افسانے ان کے ذاتی مشاہدات، تجربات اور احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان کی ذاتی محرومیوں اور ناخوشگوار حالات کی کہانی سناتے ہیں۔ ان افسانوں میں صرف ان کا ذاتی غم اور ذاتی محرومیاں ہی نہیں ہیں بلکہ ماحول اور سماج کا غم بھی ہے جس نے ان کہانیوں کو پُرتاثیر بنا دیا ہے۔" ان میں ہزاروں دکھی دلوں کی دھڑکنیں بھی صاف سنائی دیتی ہیں اور ویران تمدن کی پرچھائیاں بھی ہیں۔"[۲] اسی لیے احتشام حسین نے اس مجموعے کا نام 'ویرانے' رکھا۔

معاشی بدحالی، سماجی عدم مساوات، طبقاتی ناانصافی، مفلسی،

بے چارگی، محبت میں ناکامی اور دیگر ایسے تمام موضوعات جو ترقی پسند افسانہ نگاروں کے یہاں عام ہیں، احتشام حسین کے افسانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ تمام کردار نچلے اور متوسط طبقوں سے لیے گیے ہیں۔ ان افسانوں کے ماحول پر افسردگی اور مایوسی کی فضا طاری ہے۔ "وانگارے" کی طرح بغاوت نہیں ملتی بلکہ ماحول کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کی کیفیت موجود ہے "دوسرا نکاح" اور جزئیات سے گریز کیا ہے۔ افسانے میں دل کشی اور دلچسپی کے عنصر کا موجود ہونا ضروری ہے۔ احتشام حسین نے مختلف افسانوں میں دل کشی پیدا کرنے کے لیے کبھی پلاٹ، کبھی انداز بیان اور کبھی رومانوی قسم کے موضوع کے انتخاب سے کام لینے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانے زندگی کی عکاسی تو ضرور کرتے ہیں لیکن رہنمائی نہیں۔ ان افسانوں میں واضح قسم کا فکری نظام
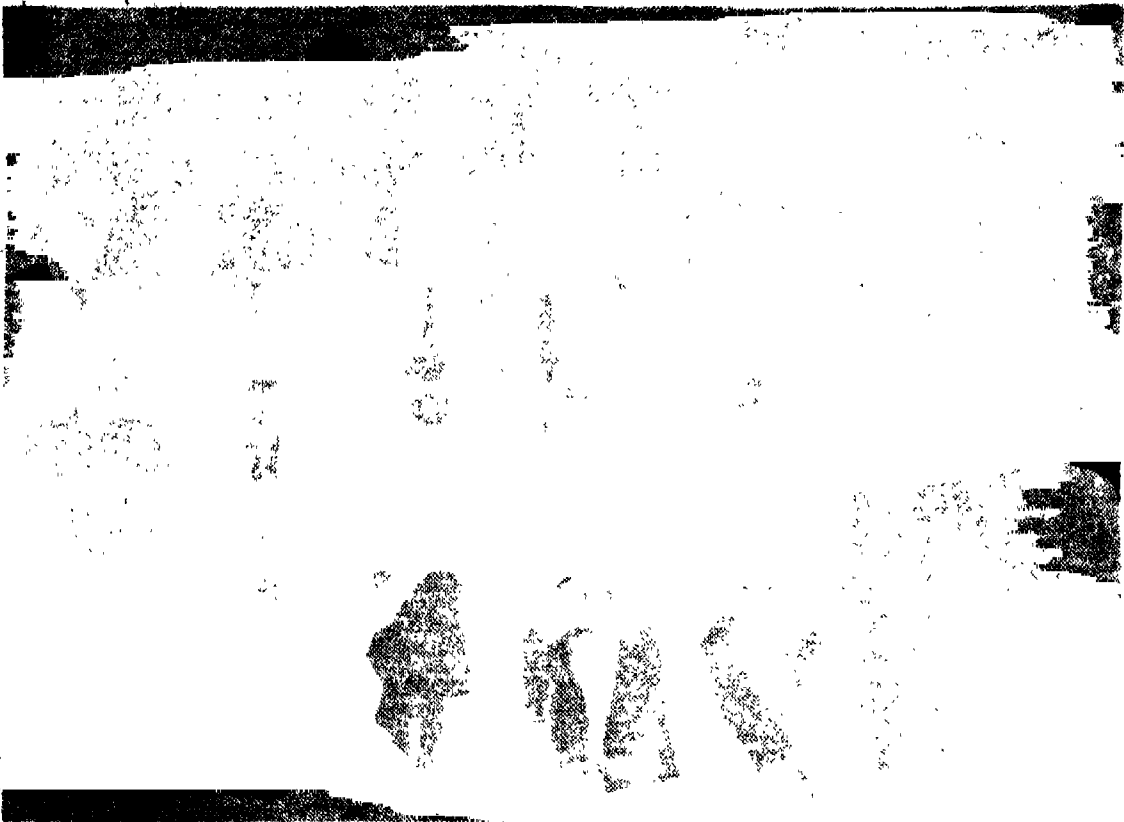
احتشام صاحب انجمن ترقی ادب لکھنؤ کے زیر اہتمام مہمان شاعر حسین منیر علوی کے اعزاز میں ہونے والی ادبی نشست میں
احتشام صاحب کے داہنے ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی اور بائیں پنڈت آنند نرائن ملا بیٹھے ہوئے ہیں (۱۹۶۴ء)

ایک ایسا افسانہ ہے جس میں سماج کے ظلم و استبداد کے خلاف اعلان بغاوت ہے۔ ورنہ اکثر افسانوں پر رومان پرور فضا چھائی ہوئی ہے جو ان کے ابتدائی زمانے کی رومانوی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ ان کے افسانوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے مرکزی تاثر کو قائم رکھنے کے لیے غیر ضروری تفصیلات نہیں ملتا جو کرداروں کو مایوس کن فضا سے باہر نکلنے میں مدد کر سکے۔

• "کھنڈر" میں ایک بوڑھے اور بے سہارا بھکاری کی زندگی کے آخری ایام کا حال بیان کیا گیا ہے جو بیماری اور ضعف پیری کے سبب مفلسی کی حالت میں جان دے دیتا ہے۔ تاقتینہ گدھ اس کی موت اور بے چارگی سے فائدہ اٹھا کر بیٹھ جاتے ہیں

[illegible] میں انسان کی خود غرضی پر بھرپور طنز ہے۔ افسانہ بہت مختصر ہے لیکن المیہ فضا نے اُسے پر تاثیر بنا دیا ہے۔ پورے ماحول پر حزن و ملال کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ کھنڈر، گدھ، درخت اور بھکاری غرض تمام ماحول اثر انگیز ہے۔ پلاٹ اور انداز بیان کی سادگی نے منظر کو آنکھوں کے سامنے ہو بہو پیش کر دیا ہے۔

"دوسرا نکاح" دل چسپ افسانہ ہے۔ یہ ایک مفلوک الحال نوجوان شکور اور اس کی بیوی فخرن کی سماج کے ظلم و استبداد کے خلاف بغاوت کی کہانی ہے۔ شکور شادی کے بعد حالات کو بہتر بنانے کے لیے بمبئی جاتا ہے۔ اس کی فرمانبردار بیوی فخرن فراق کی گھڑیاں نہایت بے چینی سے گذارتی ہے۔ وصال کے بعد جب حالات بہتر ہوتے ہیں تو فخرن کے بھائی کی ناروا حرکت کے باعث اس طبقہ کے با اثر اشخاص ظلم و استبداد کا مظاہرہ کرتے ہوئے شکور اور فخرن کو طلاق پر مجبور کرتے ہیں مگر ان کی باہمی محبت اور سماج کے اس نادروا ظلم کے خلاف بغاوت اور آخر میں دائمی ملاپ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس افسانے میں احتشام حسین کے نقطۂ نظر کی ترجمانی ملتی ہے۔ ظلم کے خلاف بغاوت اور ہار نہ ماننے کا جذبہ ملتا ہے۔ افسانہ کامیابی کے ساتھ تمام مراحل سے گزرتا ہے۔

"بیزاری" میں ایک ایسے نوجوان کی تصویر کشی کی گئی ہے جس میں طبقاتی احساس شدید ہے۔ وہ اپنی ذاتی محرومیوں، ماحول کے دل شکن حالات اور مایوسی کی فضا کے باعث دوستوں کی محفلوں سے بے تعلق ہو جاتا ہے اور سیاسی و سماجی تحریکوں سے اس کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے لیکن ایک پرانے رفیق کی موت اس میں دوبارہ زندگی و حرکت پیدا کر دیتی ہے۔ اس طرح مایوسی کے اندھیروں سے امید کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔

"مجبوریاں" میں ایک بیکس اور مقروض مزدور گیا دین اور اس کی محنت کش اور حسین بیوی لکھیا کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ میاں بیوی خوب محنت اور مزدوری کرتے ہیں۔ گیا دین بیمار ہو جاتا ہے۔ اپنے شوہر کے علاج و معالجہ کے لیے لکھیا عصمت فروشی پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس طرح معاشی بدحالی، غربت اور مجبوری ایک عورت کو عصمت بیچنے پر مجبور کر دیتی ہے احتشام حسین نے سماج کو مورد الزام ٹھہرایا ہے جو ان کے ترقی پسند نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے۔ سماج کے خلاف نفرت تو ضرور پیدا ہوتی ہے لیکن اس کے خلاف بغاوت کرنے اور لڑنے کا جذبہ بیدار نہیں ہوتا۔ پلاٹ خط مستقیم کی طرح چلتا ہے کہیں پیچیدگی نہیں انداز بیان بھی سادہ اور موضوع کے مطابق ہے۔

"اس کا بچہ" میں نوجوان شاکر مفلسی کے خلاف جنگ کرنے کے لیے بیوی بچوں کو چھوڑ کر کلکتہ چلا جاتا ہے اور وہاں ایک مل میں مزدوری کرنے لگتا ہے۔ وہاں مزدور تحریک سے متاثر ہو کر اس میں عملی حصّہ لینا شروع کر دیتا ہے۔ وہ مزدور تحریک میں اتنا منہمک ہو جاتا ہے کہ اسے اپنے گھر والوں کی معاشی پریشانیوں کا بھی خیال نہیں آتا۔ اپنے ذاتی غم کو بھول کر سماج اور اپنے جیسے لاکھوں مزدوروں کا غم اسے بے چین کر دیتا ہے۔ ادھر اس کی بیوی عصمت فروشی پر مجبور ہو جاتی ہے۔ بیوی کی پریشان حالی کو بھی دیکھ کر شاکر کے عزم میں کمی نہیں آتی بلکہ وہ اپنی جدوجہد کو اور تیز کر دیتا ہے۔ اس افسانہ کا پلاٹ دوہرا ہے اور انجام تک کامیابی سے پروان چڑھتا ہے۔ افسانے میں جوش، ولولہ اور تحریکی عناصر پائے جاتے ہیں۔

"حرارت" میں جنسی جذبہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ حکمراں طبقہ کو عیاشی اور بد اخلاقی کا ثمرہ کلّو اس افسانے کا ہیرو ہے نوجوان خادمہ نوران جنسی جذبہ سے مغلوب ہو کر کلّو کے ساتھ ناجائز تعلق قائم کر لیتی ہے

"دعوت" اس مجموعہ کا اچھا افسانہ ہے۔ ایک بخیل اور خود غرض مولوی کی وفات کے بعد مجید جائداد کا وارث بنتا ہے وہ ایک دعوت کا اہتمام کرتا ہے۔ فاقہ زدہ یتیم بچے آخر میں اپنی باری آنے پر ضرورت سے زیادہ کھا لیتے ہیں اور ہیضے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس افسانے میں مولوی کے بخل اور [illegible] شادی کے معاملے میں ماہی لالچ، یتیم خانوں کے ناقص انتظام اور سماجی برائیوں پر گہرا طنز کیا گیا ہے۔ افسانہ انسانی ہمدردی کے جذبات سے مملو ہے۔ [illegible] ماحول سے گہری واقفیت ہے۔ پلاٹ سادہ اور کہانی دلچسپ ہے۔

"گورکن" میں غم و الم کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ ایک بوڑھا گورکن اپنی محبوبہ کی موت اور ماضی کی حسین یادوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ نوجوان گورکن کو اپنی محبوبہ یاد آتی ہے اور اس پر وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ اسے اسی قسم کے انجام سے تشویش ہوتی ہے۔ اور جنازے والے پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح غم، محبت اور محرومی کے ملے جلے تاثرات مرتسم ہوتے ہیں۔

"رانی" میں ایک گداگر کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ وہ ایک بھکارن سے ایک لڑکی حاصل کر کے اس کا نام رانی رکھ لیتا ہے اس کی انتہائی کوششوں کے باوجود جب رانی چند ٹکوں کے عوض اپنی عصمت بیچ دیتی ہے تو اس کو احساس ہوتا ہے کہ گرتے ہوئے مکان کی طرح رانی کی بنیاد بھی کمزور تھی۔ احتشام حسین نے جو تجزیہ کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ کمزور بنیاد، غلط ماحول اور غلط تربیت انسان کو اونچا نہیں اٹھنے دیتی۔

"جنگ" کا پلاٹ پیچیدہ ہے۔ افسانہ نگار ایک افسانہ لکھتا ہے۔ ایک بیوہ بڑی مجبوریوں اور مشکلوں سے بچے کی زندگی اور اس کی بقا کے لیے مزدوری کرتی ہے۔ ذخیرہ اندوز سرمایہ دار معاشی بدحالی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بھوک اس قدر غالب جاتی ہے کہ ایک سوکھے ٹکڑے کو دیکھ کر بھوکا بچہ، کوّے، کتّے اور بھوکا کسان للچاتے رہتے ہیں۔ پھر افسانہ نگار کی ڈائری کے اقتباسات دیتے ہیں اور آخر میں احتشام حسین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بھوک ہی جنگوں کا سبب بھی ہے اور نتیجہ بھی۔ اگرچہ مبالغہ آمیزی کچھ زیادہ ہے تاہم حقائق کا کچھ نہ کچھ شائبہ ضرور ہے۔

"ردعمل" کا کردار ایک نوجوان حبیب ہے جو اپنے باپ کی وصیت اور عقیدے کے مطابق ایک عامل صاحب کے ہتھکنڈوں کا شکار ہو گیا۔ وہ عامل کی عیارانہ کرامتوں سے مرعوب ہو کر ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ لیکن جب سنی سنائی باتوں کی بجائے دکیل کی صاحب زادی ہاجرہ کی مرضی کے خلاف شادی کے سلسلہ میں اس کی تقدیر نہ بدل سکا تو وہ قدرے متنفر ہوا۔ پھر عامل سے تعلق جوڑنے کے لیے گیا اور اپنے بیمار بچے کا کھلونا عامل کے بچے کو دے دیا گھر پہنچا تو حبیب کا اپنا بچہ مر چکا تھا۔ عامل کی جعل سازیاں اب اس پر کھل چکی تھیں۔ اس طرح احتشام حسین نے متوسط طبقے میں پھیلی ہوئی اس عام برائی پر سخت چوٹ کی ہے۔

"اس کا کیا قصور تھا" یہ ایک ایسا سوال ہے جو آج بھی فرقہ پرستوں سے پوچھا جا سکتا ہے۔ اس افسانہ میں شیام اور طاہر دو گہرے اور مخلص دوست ہوتے ہیں۔ اچانک فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑتا ہے۔ فرقہ پرست انسانیت کا خون بہانا شروع کر دیتے ہیں۔ طاہر جو کہ شیام کی بچی کی تیمارداری کرنے آتا ہے اسے بھی فرقہ پرست مار ڈالتے ہیں۔ شیام جو اپنی بیمار لڑکی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور ادھر بیمار اور معصوم بچی جس کا کوئی قصور نہیں تھا وہ بھی دم توڑ دیتی ہے۔ اس طرح احتشام حسین نے بڑے موثر انداز میں فرقہ پرستی اور مذہبی تعصب کی بنا پر ہونے والی خوں ریزی کی مذمت کی ہے۔ مذہبی تعصب میں انسان کس قدر اندھا ہو جاتا ہے کہ وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو بھی بھول جاتا ہے۔ دوست اور دشمن کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ ان واقعات اور مناظر کو احتشام صاحب نے خود دیکھا تھا اس لیے افسانہ میں اس قدر تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ اسلوب میں سادگی اور بے تکلفی ہے۔

"رجونتی" میں رجونتی کی کوشل اور ستیل کے ساتھ ناکام محبت کا بڑے رومانی انداز میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ بالآخر خودکشی کر لیتی ہے۔ اس میں منظر نگاری اچھی کی گئی ہے۔

"ایثار" میں نثار اور ہاشم دو دوستوں کی رضیہ کے ساتھ محبت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ نثار اپنے دوست ہاشم کے لیے قربانی دیتا ہے اور اس کے راستے سے ہٹ جاتا ہے لیکن رضیہ کی شادی کہیں اور ہو جاتی ہے۔ کہانی کی فضا رومانی ہے۔ پلاٹ سادہ اور انجام غیر متوقع اور اس میں سسپنس نہیں رہتا۔

"قطرے میں طوفان" میں ایک برہمن نوجوان کی ایک تباہ حال نندی سے محبت کی داستان بیان کی گئی ہے لیکن برہمن کی شادی کہیں اور کر دی جاتی ہے۔ نندی غائب ہو جاتی ہے اور بعد میں اس کی ایک رشتہ دار کے لڑکے سے شادی ہو جاتی ہے۔ افسانہ طویل ہے لیکن اس میں تسلسل نہیں ہے

بعض مقامات پر کہانی رک کر آگے بڑھتی ہے۔ انجام بھی کوئی اچھا نہیں اور اسلوب میں بھی کوئی خاص دلکشی نہیں۔

"ہنگامہ ہستی سے دور" میں کپتان فرحت کی جمیلہ سے ایک طرفہ محبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس کی تمام زندگی تنہائی، افسردگی اور ناکامی میں گزری۔ جمیلہ سے محبت اس کے بیٹے احمد کی خدمت پر منتج ہوئی اور اسی میں اسے تسکین ملتی ہے۔ تمام افسانے پر رومانی فضا چھائی ہوئی ہے اور ذہن فرار کی طرف مائل ہے۔

"مقناطیس" کہیں سے اخذ کیا ہوا افسانہ ہے۔ اس میں ایک ڈرامہ نگار شکیب کے ڈرامے کا تذکرہ ہے۔ شکیب کو اپنے خود ساختہ کردار زمرد سے عشق ہے۔ ایک ایکٹریس نورجہاں اس پارٹ کو انتہائی کامیابی سے ادا کرتی ہے تو اس سے بھی عشق ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ مایوس کر دیتی ہے کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ شکیب کو زمرد سے انتہائی لگاؤ اور عشق ہے۔ اس افسانے میں بھی اول کے افسانوں کی طرح رومانیت چھائی ہوئی ہے اور ایک قسم کی فراری ذہنیت کا نتیجہ ہے۔

ان افسانوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ احتشام حسین نے اپنے افسانوں کے لیے موضوعات اس معاشرتی اور سیاسی زندگی سے لیے ہیں جو ان کے گرد و پیش بکھری پڑی تھی۔ آئے دن اس قسم کے واقعات ہو رہے تھے۔ آنکھیں ان مناظر سے آشنا ہو چکی تھیں۔ ان افسانوں میں احتشام نے زندگی کا مشاہدہ مخلصانہ طور پر پیش کیا ہے لیکن ان میں رومانیت بھی ہے اور حقیقت پسندی بھی۔ حقائق بھی ہیں اور حقائق پر خیالی اور جذباتی غلاف بھی۔ لیکن عصری سماجی زندگی کے نقوش ہر جگہ ملتے ہیں۔

احتشام حسین نے اپنی ایک تقریر میں افسانہ نگار کی کامیابی کے متعلق کہا تھا کہ "ایک افسانہ نگار کی اہمیت، عظمت اور کامیابی کا تعین زندگی پر اس کی گرفت، فنی چابکدستی اور مقصد کی بلندی سے ہوتا ہے"۔ اس حیثیت سے دیکھا جائے تو احتشام حسین کے افسانوں میں کوئی انفرادیت نظر نہیں آتی۔ جس مقصد کو انہوں نے تنقید میں ہمیشہ پیش نظر رکھا افسانوں میں اوجھل رہا۔ پریم چند کی طرح عام زندگی کو احتشام نے افسانوں کا موضوع ضرور بنایا لیکن ان کے یہاں وہ فنی چابکدستی نہیں ملتی۔ فکر و فن، مواد اور ہیئت کا دلکش امتزاج نہیں ملتا جیسا پریم چند کے یہاں ملتا ہے۔

احتشام حسین کے افسانوں میں جو "رومانوی فضا" ملتی ہے وہ نیاز کی رومانیت سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے، انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا۔ اور اس ابتدائی دور میں جیسا کہ خود انھوں نے بیان کیا ہے کہ نیاز فتحپوری کے اسلوب سے بہت متاثر تھے۔ اور اپنی تحریروں میں اس کی پیروی کرنے کی بھی کوشش کرتے تھے۔ اگر نیاز نے بقول احتشام حسین زندگی کے حزن و طرب کو شعر بنا کر آسودگی حاصل کی ہے تو خود احتشام نے بھی زندگی کے صرف مزاحیہ والمیہ نقوش سے آسودگی حاصل کرنے کی کوشش کی۔

اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ "اصل افسانہ فن کار کی شخصیت کا پرتو ہوتا ہے" تو احتشام کے تمام افسانوں میں ان کی شخصیت پر چھائی ہوئی افسردگی اور غم کی فضا کی جھلک ملتی ہے۔ ان کی شخصیت تنقیدوں میں اتنی واضح نظر نہیں آتی جتنی افسانوں میں۔ تنقیدوں میں رجائی انداز کی جھلک ملتی ہے لیکن افسانوں میں ذہنی ناآسودگی، محرومیت اور یاسیت کے گہرے نقوش نظر آتے ہیں۔ ایک مرتبہ عابد سہیل نے انٹرویو کے دوران اس فکری تضاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے احتشام صاحب سے دریافت کیا تھا کہ "آپ کے اس آئینہ در آئینہ رجحان کا سبب بھی زندگی کا کوئی واقعہ ہے یا نقطۂ نظر میں تبدیلی یا وسیع مطالعے نے علم و یقین کے ایوان میں تشکیک کی کھڑکیاں کھول دی ہیں؟" احتشام حسین نے اس مشاہدہ کی تردید نہیں کی لیکن اس کی توجیہ صرف اتنی ہی کی کہ "میرے اندر کوئی جنگ جاری ہے وہی قدیم جنگ ——— جنون و خرد کی" آخر تک یہ جنگ جاری رہی لیکن فیصلہ نہ ہو سکا۔ انھوں نے اپنی اس کیفیت کی غمازی ایک شعر میں نہایت خوبی سے کی ہے ———

یقیں کی خلد طربناک تک پہنچے ہیں ہزار منزل وہم و گماں سے گزرے ہیں

★

اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج
گلہائے عقیدت و قطعہ تاریخ

گلہائے عقیدت اور سلام

(پروفیسر سید احتشام حسین کی وفات پر)

حیات وارثی

ساقیِ میخانۂ اردو ادب، فن کا امام
جس کی کاوش سے ملا تنقید کو حسنِ دوام
جب سے تھک کر سو گیا ہے موت کی آغوش میں
درہم و برہم ہے میخانے کا سارا انتظام

ساغر و مینا ہیں نم دیدہ، تو ہے خاموش ہے
کھوئی کھوئی ہے صراحی اور افسردہ ہے جام
نثر کے گیسو پریشاں، نظم کا چہرہ ہے فق
یوں لگے شہرِ غزل جیسے کہ ویرانے کی شام

پیکرِ اخلاص و الفت، نغمۂ حسن و وفا
نیک سیرت، نیک صورت، نیک طینت نیک نام
جس نے جامِ علم سے بخشا شعور و آگہی
معترف جس کے خواص اور معتقد جس کے عوام
آفتابِ علم و دانش، ماہتابِ فکر و فن
محسنِ اردو زباں ہے، نام جس کا احتشام
زندگی بھر جس نے کی خدمت زبان و ملک کی
اس عظیم انساں کو گلہائے عقیدت اور سلام

قطعۂ تاریخ

(پروفیسر سید احتشام حسین کے سانحۂ انتقال پر)

میکش غازیپوری

ذات آپ کی اردو کے لیے باعثِ صد ناز
اربابِ قلم کرتے ہیں اس بات کی تائید

احسانِ عظیم آپ کا ہے علم و ادب پر
سچائی ہے، سچائی بھی ناقابلِ تردید

دم آپ کا بھرتی رہی سلمائے تغزل
مصروفِ قدمبوسی شب و روز تھی ناہید

ہر ایک تھا گرویدۂ اخلاق و شرافت
توحید کا قائل ہو کہ ہو منکرِ توحید

انسان کا چلتا نہیں بس پیکِ اجل پر
ہنگام ہو عاشور کا یا شورِ شبِ عید

جس درد سے انسان کے معمور تھا سینہ
وہ درد ہی اک روز بنا موت کی تمہید

میکش یہ گھڑی سخت ہے ہر اہلِ نظر پر
اس وقت اندھیرے میں ہے گم جادۂ تقلید

تاریخ کی تھی فکر تو اردو نے صدا دی
گل ہو گیا لکھ دیجے "چراغ درِ تنقید"

۱۹۷۲ء

آہ احتشام حسین

خضر برنی

بزم رنگا رنگ میں سود و زیاں کی ہر یہ بات
اپنی ہی اس انجمن کی گلستاں کی ہر یہ بات

پھول کا ہے تذکرہ ناز چمن کا ذکر ہے
رنگ نکہت کی قبا میں علم و فن کا ذکر ہے

نازش علم و ادب اک ناقد رنگ بیاں
ہو گیا رخصت جہاں سے چھوڑ کر اپنے نشاں

اپنی قدروں میں یقیناً تھا بہت آراستہ
عمر بھر جس کو رہا علم و ہنر سے واسطہ

آج بھی اوراق زریں پر سجا ہے احتشام
وقت کی بانہوں نے گرچہ لے لیا ہے زیر دام

ذہن میں رچ بس گئی تھی اسکے اک تنویر فن
اسکی ہستی بن گئی تھی اصل میں تنویر فن

پھول مرجھاتا ہے اپنی شاخ سے گرتا نہیں
آدمی مرتا ہے اسکا فن کبھی مرتا نہیں

وقت کی انگڑائی کھاتی ہی رہی کچھ بیچ و خم
اسکا بڑھتا ہی رہا ہر روز کچھ زور قلم

یوں تو ہیں اب بھی ہزاروں قیمتی لعل و گہر
کم ہوئے پیدا چمن میں لیکن ایسے دیدہ ور

ذکر کی یلغار میں جب فکر فرماتا ہے لطف
باتوں میں اک بات پیدا ہو تو آجاتا ہے لطف

اسکے انداز نگارش کا چلن کچھ اور تھا
فن علیحدہ ہے مگر عنوان فن کچھ اور تھا

ذکر جب صبح بنارس کا کہیں ہونے لگا
دور تک پہنچا کیا شام اودھ کا سلسلہ

تاج کی عظمت کو شاعر نے کیا جا کر سلام
ہو گیا جا کر اجنتا سے کبھی وہ ہمکلام

اک صحافی نے کیا گنگ و جمن کا کچھ بیاں
جب ایلورا پر ہوا کوئی مصور مہرباں

خود کوئی تاریخ کی منزل سے آگے بڑھ گیا
چھوڑ کر سطح زمیں زینے کے اوپر چڑھ گیا

تیرے انداز نگارش نے سنوارا ہے اسے
ناقدانہ فن کے تیور نے نکھارا ہے اسے

مسند علم و ادب پر لکھ چکا ہے تیرا نام
ہر زباں پر نام ہے باعزت و صد احتشام

ایک اردو نواز تھا نہ رہا

ڈاکٹر لکشمی پتے سہائے بلگرامی

رخصت نازش بہار ہے آج
"رحلت فخر روزگار ہے آج"

جس کو دیکھو وہ اشکبار ہے آج
نہیں گریہ پہ اختیار ہے آج

کس کو دو گھڑی نہیں قرار ہے آج
دامن صبر تار تار ہے آج

صدمۂ مرگ احتشام حسین
سب کے چہرے سے آشکار ہے آج

ہے فسردہ دیار اعظم گڑھ
ہر طرف سوگ شہریار ہے آج

لکھنؤ ہو کہ ہو الہ آباد
غمکدہ فن کا ہر دیار ہے آج

ہر ادیب[1] و مسیح[2] کے دل پر
فرقت احتشام بار ہے آج

اس کی فکر و نظر کا آئینہ دار
اس کا ہر ایک شاہکار ہے آج

ایک اردو نواز تھا نہ رہا
جس پہ اردو کو ناز تھا نہ رہا

قدر فن بعد احتشام کہاں
اب ادب کا وہ احترام کہاں

محفلیں اب وہ صبح و شام کہاں
وہ ادب کی صلائے عام کہاں

اب وہ نقاد و نکتہ سنج و ادیب
شاعر قادر الکلام کہاں

مطلع علم جس سے تھا پر نور
اب وہ روشن مہ تمام کہاں

جس سے سیراب ہو جدید ادب
اب وہ دریائے فیض عام کہاں

نظم آزاد میں خیال کہن
اب وہ بادہ کہاں وہ جام کہاں

حسن اخلاق سے زمانے میں
کر لے دشمن کو بھی جو رام کہاں

ساقی خلد آشیاں یہ بتا
جائیں آخر یہ تشنہ کام کہاں

بس دعا ہے یہی کہ پائے چین
خلد میں روح احتشام حسین

---

[1] سید مسعود حسن رضوی - ادیب [2] سید مسیح الزماں

(قطعات)

★ شہر بسوانی

فن و ادب کی سبھی پستیوں کو اے رضوی
ترے شعورِ نگارش نے عظمتیں دیدیں
فلک کے چاند ستاروں کو فرش پر لا کر
زمیں کو اوجِ ثریا کی رفعتیں دیدیں

ہزار ہند میں نقّاد جنم لیں تو کیا
نہ کوئی گیسوئے تنقید یوں سنوارے گا
زباں کا پرچم ناموس تھامنے والے
زمانہ روز تری آرتی اتارے گا

آج پھر ایک دیدہ ور نہ رہا

واحد پریمی

(پروفیسر سیّد احتشام حسین کے سانحۂ ارتحال پر)

جو وعدہ کا بھی یار بن کے رہا
جو ہمیشہ ہی پیار بن کے رہا
گلشنِ زندگی میں ہر لمحہ
جو سراپا بہار بن کے رہا

جس کے درسوں سے کامیاب ہو کر
جس کی صحبت سے فیضیاب ہو کر
سیکڑوں لوگ ہو گئے ضو بار
علم و حکمت کے آفتاب ہو کر

جس نے تنقید کو ادا بخشی
جس نے تحقیق کو ضیا بخشی
عمر بھر خدمتِ ادب کر کے
جس نے ہر صنف کو جلا بخشی

ایک انسانِ باکمال تھا وہ
ایک استادِ خوش خصال تھا وہ
سچ تو یہ ہے عصرِ حاضر میں
ایک فنکارِ بے مثال تھا وہ

آہ وہ فردِ معتبر نہ رہا
باصفات اور باہنر نہ رہا
چشمِ نرگس ہے آج پھر غمناک
آج پھر ایک دیدہ ور نہ رہا

بزمِ احتشام

کمال لکھنوی

ہوگیا کون یہ دنیائے ادب سے روپوش
گنگ الفاظ ہیں جلوں کی زباں ہے خاموش
ہم سے رخصت ہوا وہ ساقیِ میخانۂ ہوش
جو پلاتا تھا تفکر کی شرابِ سرجوش

بادہ خواروں سے وہ پیمانہ دہن روٹھ گیا
لبِ عالم سے نیا طرزِ سخن روٹھ گیا

پیرِ فن چپ ہوا ایسا کہ ہیں سکتے میں مرید
چھن گئے کشتِ ادب خیز سے گلہائے جدید
موشگافی کو ہے اِس بات کا احساسِ شدید
کہ گم ہوگئی مٹی میں کلیدِ تنقید
قفلِ گنجینۂ نو خاک بسر ہے یارو!
زندگی ماتمیِ ذوقِ نظر ہے یارو!

ماتیِ نثر کے فن سے ہوئے محروم جو ہم
لب بہزادِ عبادت نظر آتا ہے عجم
کھا گئی شوخیِ تحریر کو بیماریِ غم
چھٹ گیا ندرتِ تحریر کے ہاتھوں سے قلم
یک بیک نبضِ ترقیِ نظر چھوٹ گئی
دانشِ نقد دنگارش کی کمر ٹوٹ گئی

آج سناٹا سا ہے شہرِ ادب میں ہر سو
ڈھونڈھتی رہتی ہیں نظریں تجھے ملتا نہیں تو
الجھے الجھے سے ہیں اب لفظ دبیاں کے گیسو
نرطاس میں دلِ فنکار سے بہتا ہے لہو
آنکھیں تصویر ہیں چھلکے ہوئے پیمانوں کی
سرخیاں دل پہ لکھی ہیں ترے افسانوں کی

دیشاکھ۔ جیشٹھ ۱۸۹۵ شک

نذرِ احتشام

افروز نظامی لکھنوی

ہمدوشِ فلک رتبۂ فنکار کیا
قدروں کو جواں، فکر کو ہموار کیا
اے علم کے احتشام تو نے بڑھ کر
خوابیدہ جسارتوں کو بیدار کیا

ہر تلخیِ غم کو قند کر کے چھوڑا
فن کا پرچم بلند کر کے چھوڑا
تحقیق و تلاش و تبصرہ و تنقید
ہر صنف کو ارجمند کر کے چھوڑا

نرغے میں شعاعوں کے نظر ہو جیسے
طوفان کی یورش میں شرر ہو جیسے
انساں رواں دواں ہے یوں زیست کے ساتھ
آندھی میں چراغ کا سفر ہو جیسے

رخ سب سے پھیرتے چلے جائیں گے
آلام میں گھیرتے چلے جائیں گے
کب جانا تھا، احتشام یوں محفل سے
سناٹے بکھیرتے چلے جائیں گے

قصہ رہا ناتمام، افسوس افسوس
آدھا رہا دورِ جام افسوس افسوس
ہر قلب پہ اک برق سی لہرا کے گری
اے مرگِ احتشام، افسوس افسوس

فغاں کہ ساقی مے خانہ ہو گیا رخصت

رباب رشیدی

وہ احتشام کہ راز آشنائے نظم و غزل
وہ احتشام کہ نکتہ سرائے نظم و غزل
وہ احتشام کہ منزل برائے نظم و غزل
وہ احتشام کہ عقدہ کشائے نظم و غزل
وہ احتشام ہمیں راستے میں چھوڑ گیا
ادب کے کتنے تقاضوں کی آس توڑ گیا

وہ احتشام کہ آئینۂ دیارِ ادب
وہ احتشام کہ گلدستۂ بہارِ ادب
وہ احتشام کہ مجموعۂ وقارِ ادب
وہ احتشام کہ کاشانۂ نگارِ ادب
فغاں کہ ساقیِ میخانہ ہو گیا رخصت
جنوں پرستوں کی کچھ اور بڑھ گئی وحشت

وہ احتشام جو راہی بھی، رہ نما بھی تھا
وہ احتشام جو کشتی کا نا خدا بھی تھا
وہ احتشام جو مقصد بھی مدعا بھی تھا
وہ احتشام جو اردو کا آسرا بھی تھا
خیالِ رعنا اس اہل نظر کو روتے ہیں
کنائے فکر کے اس دیدہ ور کو روتے ہیں

وہ آج روٹھ کے ہم سے چلا گیا افسوس
کچھ اور تیرگیِ غم بڑھا گیا افسوس
خزاں کا دور بہت جلد آ گیا افسوس
امیدیں اپنے دلوں سے مٹا گیا افسوس
زمیں پہ ایسا کہاں آسمان پائیں گے
بس اب کتابوں میں اس کے نشان پائیں گے

کچھ اتنا سہل قدم جادۂ بقا کرنا
مسرت ابدی سے تو آشنا کرنا
خدایا روح کو اس کی سکوں عطا کرنا
ہمارا فرض ہے دن رات یہ دعا کرنا
لحد پہ رحمتیں نازل ہوں اے خدا ہر دم
وہاں بھی ہو اسے حاصل تری نگاہ کرم

آہ!
پروفیسر احتشام حسین

تاج اورنگ آبادی

ادیب شاعر و نقاد احتشام حسین
شعور و فن کا سمینار احتشام حسین

شعور و فکر کو بخشی ہے تازگی جس نے
وہ قصر اردو کا مینار احتشام حسین

امام نقد و نظر رہبر قدیم و جدید
نئے ادب کا تھا معمار احتشام حسین

نئے علوم کو بخشے گا روشنی ہر دم
حسیں کلام کا معیار احتشام حسین

مبالغہ کوئی اظہار مدعا میں نہیں
گوارہ اس پہ ہے کردار احتشام حسین

رہے گا مرجع دانشوراں قیامت تک
قرارِ مطلعِ انوار احتشام حسین

دعائے مغفرتِ پُرخلوص ہو مقبول
سلام تاج کا صد بار احتشام حسین

غالب اقبال و حالی کی زبان خاموش ہے

علی شبیر حسین کرہانی

علم و تنقید و زباں کا رازداں جاتا رہا
احتشام نادر ہندوستاں جاتا رہا

جو ادب کی جان تھا جو علم کا تھا افتخار
صنعت تنقید کا جس کو سمجھتے تاج دار

اس کا وہ طرز نگارش نقد کا وہ التزام
مستند تحریر میں اس کا قلم تھا لا کلام

اپنے سینے میں لیے تھا وہ خزانہ علم کا
پیکر خاکی میں دریا موج زن تھا حلم کا

آبروئے علم و فن تھا پیکر اخلاق تھا
اپنی طرز خاص میں جو شہرۂ آفاق تھا

خطۂ یوپی کے اعظم گڑھ کو یہ عزت ملی
موضع ماہل کو دانائی کی یہ دولت ملی

جس طرح رنگینیاں ابھریں سواد شام سے
اس طرح پائی شریک زندگی نگرام سے

صاحب دانش بنا عالم بنا فاضل بنا
سینۂ علم و ادب کا اک دھڑکتا دل بنا

حیف کھینچا دست قدرت نے اجل کی توس سنو
پڑ گئی شاید ضرورت دفعتاً فردوس کو

کون ہے اب کس سے پوچھیں آہ فکر و فن کی بات
کون ہے اب کس کو سمجھیں حامل جملہ صفات.

کون ہے جو رزم تنقیدوں سے پرکھے کا غزل
تبصرے سے کس کے جل اٹھیں گے لفظوں کے کنول

کون اسرار معانی بیٹھ کر سمجھائے گا
لیلئ شام غزل کی زلف کو سلجھائے گا

اب طلسم معنی و ہیئت کے در کھولے گا کون
مرحلہ جات ادب پر شعر کے اب ٹوکے گا کون

کس کی ندرت آہ کھولے گی گرہ ادراک کی
کون بڑھ کر خاک کو دے گا خبر افلاک کی

اک سعر ایک ناقد موت در آغوش ہے
غالب و اقبال و حالی کی زبان خاموش ہے

---

۱ ماہل ضلع اعظم گڑھ وطن تھا ۲ قصبہ نگرام ضلع لکھنؤ میں شادی ہوئی تھی

لمحہ گزر گیا

ج۔ رحمان جوہر

حادثے کا یہ لمحہ
مرگ ناگہاں بن کر
کس کے دل کا طالب تھا
جان فلسفہ تھا جو
نقد و تبصرہ جس کا، شمع بزم اہل فن
جس کی آنکھوں کے آنسو سینچا کرتے تھے گلشن
وہ مزاج داں غم کا
سچا رازداں غم کا
اب نشان کی صورت
جو سوالیہ ہوگا!
آئے گا تصور میں
سامنے سے گزرے گا اور گزرتا جائے گا
زندگی کے افسانے
آگہی کے پروانے
عالموں کے میخانے
روشنی کے دیوانے۔ اس کی منو کو ترسیں گے
اور پھر یہی لمحہ
مثل اشک بے مایہ
روز و شب میں ضم ہوگا
اور پھر یہ روز و شب ماہ و سال میں ڈھل کر
بے کسی کے دامن میں
اپنے کو چھپالیں گے
احتشام کے غم میں
ہم بھی کھو گئے یارو
جیسے اک سمندر میں کوئی قطرہ مل جائے

کچھ یادیں
کچھ تصویریں

احتشام حسین

آل احمد سرور

احتشام میرے ساتھی تھے. میرے دوست تھے. وہ رفاقت
آداب اور دوستی کے فن کو سمجھتے بھی تھے اور برتتے بھی تھے. ان
اچانک رحلت سے دل کی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے شاید
کبھی پُر ہوسکے.

احتشام سے میری ملاقات سب سے پہلے ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ کے
قی پسندوں کے ایک جلسہ میں ہوئی تھی. ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی
ان کا تقرر لکچرر کی حیثیت سے ہوا تھا جس میں ان کو مجنوں گورکھپوری
روقار عظیم کے مقابلے میں ترجیح دی گئی تھی. اس پر ادبی حلقوں میں
ہ میگوئیاں بھی ہوئیں کیونکہ اس وقت احتشام کے مقابلے میں
وں کی ادبی حیثیت زیادہ مسلم تھی اور وقار عظیم بھی زیادہ معروف
ے. بہرحال جس جلسہ کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر
جاز حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم، جوش ملیح آبادی اور احتشام حسین بھی
سے حضرات کے ساتھ موجود تھے. جلسے کے بعد چائے کے لیے
ب لوگ ڈاکٹر حسین ظہیر کے مکان پر آئے جو لال باغ میں واقع تھا.
اجب داخل ہوا تو ایک میز کے گرد ہجوم زیادہ تھا. اس لیے قریب کی
سری خالی میز کے پاس بیٹھ گیا. یہیں کچھ دیر کے بعد احتشام حسین
ی آگئے اور دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں. باتوں میں 'ظاہر ہے'
قی پسند تحریک، نئی کتابوں، یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم اور بعض
یبوں اور شاعروں کے متعلق اظہار خیال ہوا. اس گفتگو کے بعد
اطمینان ہوگیا کہ لکھنؤ یونیورسٹی کا یہ تقرر بہت مناسب ہوا کیونکہ اس
ت بھی احتشام اپنے مطالعے کی وسعت، علمی شغف اور سنجیدہ اور
گہری نظر کے لیے ہم چشموں میں ممتاز تھے.

۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک احتشام حسین سے بعض ادبی اجتماعوں
میں ملاقات ہوئی. ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ تنقیدی جائزے
میرے مضامین کے پہلے مجموعے تنقیدی اشارے کے بعد شائع
ہوا. شروع اگست ۱۹۴۵ء میں مجھے 'یوم حالی' کی ایک تقریب میں
کلکتے جانا تھا. راستے میں لکھنؤ کے اسٹیشن پر ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ
لکھنؤ میں اردو کے ریڈر کی جگہ نکلنے والی ہے. اگست کے آخر میں
میں پٹنے گیا. واپسی میں ایک دن لکھنؤ ٹھہرا اور لکھنؤ کے نوجوانوں کی ایک
ادبی انجمن میں ڈاکٹر محمد حسن کی دعوت پر اردو افسانے پر ایک تقریر
کی. یہ جلسہ لکھنؤ یونیورسٹی یونین میں ہوا تھا. احتشام حسین نے اس جلسہ
کی صدارت کی تھی. بعد میں ہم لوگ شعبۂ اردو و فارسی میں آئے جہاں
پروفیسر مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر عبدالعلیم، سید محمد حسین مرحوم لکچرر شعبۂ اردو
اور نورالحسن ہاشمی سے ملاقات ہوئی. احتشام دن بھر میرے ساتھ رہے.
ان کی تقریر و تحریر دونوں کو اس زمانے میں ادبی حلقے میں عزت کی
نگاہ سے دیکھا جاتا تھا. ترقی پسند تحریک پر ان کے مضامین ترقی پسند
حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور ان کے مخالفوں
میں ان پر اعتراض بھی خاصی شد و مد سے ہونے لگے تھے. مجھے یاد
پڑتا ہے کہ ۱۹۴۲ء میں جب روح اقبال شائع ہوئی تھی تو اس
پر میرا خاصا مفصل تبصرہ رسالہ اردو میں نکلا تھا. احتشام حسین کا
تبصرہ جہاں تک یاد پڑتا ہے رسالہ جامعہ میں شائع ہوا تھا.
دونوں کے نقطۂ نظر میں خاصا فرق تھا. میں اقبال کی عظمت کا

زیادہ بحث نہیں کرتے تھے ہاں اپنی بات صفائی اور اعتقاد سے کہہ دیتے تھے۔

احتشام نے افسانے بھی لکھے تھے اور نظمیں بھی کہی تھیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ دیوانے کے نام سے شائع ہوا تھا۔ شعر وہ کم کہتے تھے اور مخصوص صحبتوں میں ہی سناتے تھے۔ ان کا پڑھنے کا انداز بہت دلکش تھا شعر ترنم سے پڑھتے تھے اور ترنم میں گداز بھی تھا۔ ان کا یہ شعر مجھے اکثر یاد آتا ہے اور جب یاد آتا ہے تو احتشام کی آواز کی گونج ایک شیریں گداز کی طرح دل میں بس جاتی ہے:

کل تو غیراں کی یاد آتی تھی　　آج کیوں ہو فضا اداس اداس

بارودخانے میں ان کا مکان رشتہ داروں سے بھرا رہتا تھا۔ ایک کمرے میں ایک بڑی سی میز تھی جس پر احتشام کی کتابیں اور کاغذات رکھے رہتے تھے۔ میز کے گرد آنے جانے والوں کے لیے کرسیاں ہوتی تھیں۔ امریکہ سے واپسی کے بعد اس کمرے میں ایک صوفہ آگیا تھا مگر کا ماحول قدیم رنگ کے شرفا کا سا تھا۔ بیوی پردہ کرتی تھیں۔ احتشام ہمیشہ اچکن اور چوڑے پائنچے کے پائجامے میں ملبوس نظر آئے۔ لباس وغیرہ کے معاملے میں ایک بے نیازی رہی اگرچہ لباس ہمیشہ صاف ستھرا رہا۔ سوٹ پہننے کا سلسلہ امریکہ سے شروع ہوا لیکن انھوں نے سوٹ بہت کم پہنا۔ زیادہ تر شیروانی پر قناعت کی۔ جب جولائی ۱۹۵۰ء میں میں نے اُردو ادب نکالا تو احتشام نے اس کے لیے "غالب کا تفکر" کے عنوان سے مضمون لکھا جو میرے نزدیک ان کے بہترین مضامین میں سے ہے۔ یہ مضمون انھوں نے مجھے بغیر کسی تقاضے کے دیدیا تھا۔ مجھے اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ ان کی خوبیوں کا اور زیادہ احساس ہوا اور بعض معاملات میں ان کی کوتاہی بہت معمولی نظر آنے لگی۔ مثلاً وہ شعبے کے جلسوں میں زیادہ تر خاموش رہتے تھے۔ فیکلٹی اور اکیڈمک کونسل میں شاید ہی انھوں نے کبھی بحث میں حصہ لیا ہو۔ ٹیچرس ایسوسی ایشن کے جلسوں میں بھی بہت کم شریک ہوتے تھے۔ سینیر اساتذہ سے انھوں نے کبھی کسی معاملے میں بحث نہیں کی۔ ہاں ادبی موضوعات پر ان کی تقریریں اردو سوسائٹی اور یونیورسٹی کی دوسری سوسائٹیوں میں برابر ہوتی تھیں۔ دوستوں کے مجمع میں وہ ہنستے بھی تھے اور قہقہے بھی لگاتے تھے لیکن عام طور پر چہرے پر ایک اداسی کی کیفیت رہی۔

وہ بڑے بامروت آدمی تھے۔ ہم لوگ اکثر ان کے دیباچوں اور مقدموں کا مذاق بھی اڑایا کرتے تھے۔ اس لیے کہ اس معاملے میں ان کی فیاضی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ وہ انکار کر ہی نہیں سکتے تھے۔ مطالعے کا بہت شوق تھا اور کوشش کرتے تھے کہ ادب کے علاوہ تاریخ، سیاست، فلسفے اور فنون لطیفہ میں جدید رجحانات سے باخبر رہیں۔ جس زمانے میں ممتاز حسین لکھنؤ میں تھے تو کبھی کبھار بنیادی مسائل کے سلسلے میں ان سے بہت دلچسپ گفتگو ہوتی تھی۔ وہ کہتے تھے احتشام صاحب فلاں کتاب پڑھیے جواب دیتے کہ آپ کے کہنے سے کیوں پڑھوں، میرا جی چاہے گا تو پڑھوں گا۔ لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں نئی کتابوں کے لیے ایک الگ کمرہ تھا جہاں یہ کتابیں ایک مہینہ تک رکھی رہتی تھیں۔ پروفیسر منین (شعبہ سیاسات) احتشام اور میں خاصا وقت یہاں گزارتے تھے۔ پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی کی سفارش پر غالباً ۱۹۵۲ کے شروع میں راکفیلر فاؤنڈیشن کے نمائندے گل پیٹرک لکھنؤ تشریف لائے۔ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی کے پندرہ بیس استادوں کو چائے پر مدعو کیا۔ ایک سہ ماہی انگریزی رسالہ نکالنے کی تجویز تھی۔ گل پیٹرک چاہتے تھے کہ پالیسی میں کچھ ان کا بھی دخل رہے کیونکہ اخراجات کی ساری ذمے داری راکفیلر والوں کی تھی۔ ڈی۔ پی مکرجی پالیسی میں کوئی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے بات آگے نہ بڑھ سکی۔ مگر ڈی۔ پی مکرجی کی سفارش پر گل پیٹرک نے احتشام کو بلایا اور انھیں راکفیلر فاؤنڈیشن کی طرف سے فیلوشپ کے لیے درخواست کا ایک فارم دیا۔ احتشام نے شروع میں تو رازداری سے کام لیا لیکن جب فیلوشپ مل گئی تو انھوں نے مجھے بتایا کہ شروع میں ان کو اس معاملے میں خاصا تامل تھا۔ وہ اپنے خیالات میں مخلص اور ایماندار تھے اور ان خیالات کو راز بھی رکھنا چاہتے تھے۔ اس وقت راکفیلر فاؤنڈیشن لبرل اشخاص کے ہاتھوں میں تھی اور وہ

احتشام حسین

کچھ یادیں
کچھ تصویریں

آل احمد سرور

احتشام میرے ساتھی تھے۔ میرے دوست تھے۔ وہ رفاقت کے آداب اور دوستی کے فن کو سمجھتے بھی تھے اور برتتے بھی تھے۔ ان کی اچانک رحلت سے دل کی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے شاید ہی کبھی پُر ہو سکے۔

احتشام سے میری ملاقات سب سے پہلے ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ کے ترقی پسندوں کے ایک جلسہ میں ہوئی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ان کا تقرر لکچرر کی حیثیت سے ہوا تھا جس میں ان کو مجنوں گورکھپوری اور وقار عظیم کے مقابلے میں ترجیح دی گئی تھی۔ اس پر ادبی حلقوں میں کچھ چہ میگوئیاں بھی ہوئیں کیونکہ اس وقت احتشام کے مقابلے میں مجنوں کی ادبی حیثیت زیادہ مسلّم تھی اور وقار عظیم بھی زیادہ معروف تھے۔ بہرحال جس جلسہ کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم، جوش ملیح آبادی اور احتشام حسین بھی دوسرے حضرات کے ساتھ موجود تھے۔ جلسے کے بعد جانے کے لیے سب لوگ ڈاکٹر حسین ظہیر کے مکان پر آئے جو لال باغ میں واقع تھا۔ میں جب داخل ہوا تو ایک میز کے گرد ہجوم زیادہ تھا۔ اس لیے قریب کی دوسری خالی میز کے پاس بیٹھ گیا۔ یہیں کچھ دیر کے بعد احتشام حسین بھی آ گئے اور دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ باتوں میں 'ظاہر ہے' ترقی پسند تحریک، نئی کتابوں، یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم اور بعض ادیبوں اور شاعروں کے متعلق اظہار خیال ہوا۔ اس گفتگو کے بعد یہ اطمینان ہو گیا کہ لکھنؤ یونیورسٹی کا یہ تقرر بہت مناسب ہوا کیونکہ اس وقت بھی احتشام اپنے مطالعے کی وسعت، علمی شغف اور سنجیدہ اور گہری نظر کے لیے ہم چشموں میں ممتاز تھے۔

۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک احتشام حسین سے بعض ادبی اجتماعوں میں ملاقات ہوئی۔ ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ تنقیدی جائزے میرے مضامین کے پہلے مجموعے تنقیدی اشارے کے بعد شائع ہوا۔ شروع اگست ۱۹۴۵ء میں مجھے 'یوم حالی' کی ایک تقریب میں کلکتے جانا تھا۔ راستے میں لکھنؤ کے اسٹیشن پر ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ لکھنؤ میں اردو کے ریڈر کی جگہ نکلنے والی ہے۔ اگست کے آخر میں میں پٹنے گیا۔ واپسی میں ایک دن لکھنؤ ٹھہرا اور لکھنؤ کے نوجوانوں کی ایک ادبی انجمن میں ڈاکٹر محمد حسن کی دعوت پر اردو افسانے پر ایک تقریر کی۔ یہ جلسہ لکھنؤ یونیورسٹی یونین میں ہوا تھا۔ احتشام حسین نے اس جلسہ کی صدارت کی تھی۔ بعد میں ہم لوگ شعبۂ اردو و فارسی میں آئے جہاں پروفیسر مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر عبدالعلیم، سید محمد حسین مرحوم لکچرر شعبۂ اردو اور نورالحسن ہاشمی سے ملاقات ہوئی۔ احتشام دن بھر میرے ساتھ رہے۔ ان کی تقریر و تحریر دونوں کو اس زمانے میں ادبی حلقے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ترقی پسند تحریک پر ان کے مضامین ترقی پسند حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور اس کے مخالفوں میں ان پر اعتراض بھی خاصی شدومد سے ہونے لگے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۴۲ء میں جب روح اقبال شائع ہوئی تھی تو اس پر میرا خاصا مفصل تبصرہ رسالہ اردو میں نکلا تھا۔ احتشام حسین کا تبصرہ جہاں تک یاد پڑتا ہے رسالہ جامعہ میں شائع ہوا تھا۔ دونوں کے نقطۂ نظر میں خاصا فرق تھا۔ میں اقبال کی عظمت کا

زیادہ بحث نہیں کرتے تھے اِس اپنی بات صفائی اور اعتقاد سے کہہ دیتے تھے۔

احتشام نے افسانے بھی لکھے تھے اور نظمیں بھی کہی تھیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ویرانے کے نام سے شائع ہوا تھا۔ شعر وہ کم کہتے تھے اور مخصوص صحبتوں میں ہی سناتے تھے۔ ان کا پڑھنے کا انداز بہت دلکش تھا۔ شعر ترنم سے پڑھتے تھے اور ترنم میں گداز بھی تھا۔ ان کا یہ شعر مجھے اکثر یاد آتا ہے اور جب یاد آتا ہے تو احتشام کی آواز کی گونج ایک شیریں گداز کی طرح دل میں بس جاتی ہے:

کل تو غیر ان کی یاد آتی تھی آج کیوں ہو فضا اداس اداس

بارود خانے میں ان کا مکان رشتہ داروں سے بھرا رہتا تھا۔ ایک کمرے میں ایک بڑی سی میز تھی جس پر احتشام کی کتابیں اور کاغذات رکھے رہتے تھے۔ میز کے گرد آنے جانے والوں کے لیے کرسیاں ہوتی تھیں۔ امریکہ سے واپسی کے بعد اس کمرے میں ایک صوفہ آگیا تھا۔ گھر کا ماحول قدیم رنگ کے شرفا کا سا تھا۔ بیوی پردہ کرتی تھیں۔ احتشام ہمیشہ اچکن اور چوڑے پائنچے کے پاجامے میں ملبوس نظر آئے۔ لباس وغیرہ کے معاملے میں ایک بے نیازی رہی اگرچہ لباس ہمیشہ صاف ستھرا رہا۔ سوٹ پہننے کا سلسلہ امریکہ سے شروع ہوا لیکن انھوں نے سوٹ بہت کم پہنا۔ زیادہ تر شیروانی پر قناعت کی۔ جب جولائی ۱۹۵۰ میں میں نے اُردو ادب نکالا تو احتشام نے اس کے لیے "غالب کا تفکر" کے عنوان سے مضمون لکھا جو میرے نزدیک ان کے بہترین مضامین میں سے ہے۔ یہ مضمون انھوں نے مجھے بغیر کسی تقاضے کے دیدیا تھا۔ مجھے اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ ان کی خوبیوں کا اور زیادہ احساس ہوا اور بعض معاملات میں ان کی کوتاہی بہت معمولی نظر آنے لگی۔ مثلاً وہ شعبے کے جلسوں میں زیادہ تر خاموش رہتے تھے۔ فیکلٹی اور اکیڈمک کونسل میں شاید ہی انھوں نے کبھی بحث میں حصہ لیا ہو۔ ٹیچرس ایسوسی ایشن کے جلسوں میں بھی بہت کم شریک ہوتے تھے۔ سینیر اساتذہ سے انھوں نے کبھی کسی معاملے میں بحث نہیں کی۔ ہاں ادبی موضوعات پر ان کی تقریریں اردو سوسائٹی اور یونیورسٹی کی دوسری سوسائٹیوں میں برابر ہوتی تھیں۔ دوستوں کے مجمع میں وہ ہنستے بھی تھے اور قہقہے بھی لگاتے تھے لیکن عام طور پر چہرے پر ایک اداسی کی کیفیت رہی۔

وہ بڑے بامروت آدمی تھے۔ ہم لوگ اکثر ان کے دیباچوں اور مقدموں کا مذاق بھی اڑایا کرتے تھے۔ اس لیے کہ اس معاملے میں ان کی فیاضی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ وہ انکار کر ہی نہیں سکتے تھے۔ مطالعے کا بہت شوق تھا اور کوشش کرتے تھے کہ ادب کے علاوہ تاریخ، سیاست، فلسفے اور فنون لطیفہ میں جدید رجحانات سے باخبر رہیں۔ جس زمانے میں ممتاز حسین لکھنؤ میں تھے تو کبھی کبھار بنیادی مسائل کے سلسلے میں ان سے بہت دلچسپ گفتگو ہوتی تھی۔ وہ کہتے تھے احتشام صاحب فلاں کتاب پڑھیے جواب دیتے کہ آپ کے کہنے سے کیوں پڑھوں، میرا جی چاہے گا تو پڑھوں گا۔ لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں نئی کتابوں کے لیے ایک الگ کمرہ تھا جہاں یہ کتابیں ایک مہینہ تک رکھی رہتی تھیں۔ پروفیسر مبین (شعبہ سیاسات) احتشام اور میں خاصا وقت یہاں گزارتے تھے۔ پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی کی سفارش پر غالباً ۱۹۵۲ کے شروع میں راکفیلر فاؤنڈیشن کے نمائندے گل پیٹرک لکھنؤ تشریف لائے۔ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی کے پندرہ بیس استادوں کو چائے پر مدعو کیا۔ ایک سہ ماہی انگریزی رسالہ نکالنے کی تجویز تھی۔ گل پیٹرک چاہتے تھے کہ پالیسی میں کچھ ان کا بھی دخل رہے کیونکہ اخراجات کی ساری ذمے داری راکفیلر والوں کی تھی۔ ڈی۔ پی مکرجی پالیسی میں کوئی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے بات آگے نہ بڑھ سکی۔ مگر ڈی۔ پی مکرجی کی سفارش پر گل پیٹرک نے احتشام کو بلایا اور انھیں راکفیلر فاؤنڈیشن کی طرف سے فیلوشپ کے لیے درخواست کا ایک فارم دیا۔ احتشام نے شروع میں تو رازداری سے کام لیا لیکن جب فیلوشپ مل گئی تو انھوں نے مجھے بتایا کہ شروع میں ان کو اس معاملے میں خاصا تامل تھا۔ وہ اپنے خیالات میں مخلص اور ایماندار تھے اور ان خیالات کو راز بھی رکھنا چاہتے تھے۔ اس وقت راکفیلر فاؤنڈیشن لبرل اشخاص کے ہاتھوں میں تھی اور وہ

اگ چاہتے ہے کہ ہندوستانی زبانوں کے ادیب امریکہ آئیں اور وہاں کے ادیبوں سے ملیں اور وہاں کی ادبی فضا کا مطالعہ کریں۔ بہر حال احتشام نے تھوڑے سے تذبذب اور ہچکچاہٹ کے بعد یہ پیش کش قبول کرلی۔ "ساحل اور سمندر" کے نام سے انھوں نے جو سفرنامہ لکھا ہے اس میں ان کے تاثرات واضح اور روشن ہیں۔ اس زمانے میں انھوں نے مجھے امریکہ سے کئی خط لکھے۔ وہ وہاں کے علمی کاموں سے اور بعض ادیبوں اور نقادوں سے متاثر ہوئے تھے مگر امریکہ کے متعلق ان کے عام نقطۂ نظر میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ سفرنامہ اور دوستوں کے نام خطوط دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گھر کی یاد انھیں برابر ستاتی تھی۔ AS YON LIKE IT کے کردار (JAQUES) ژاک کے حزن کا انھوں نے بڑی ذہنی ہمدردی کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔

امریکہ جانے سے پہلے انھوں نے میری شاعری پر ایک مضمون رسالہ آجکل کے لیے لکھا تھا۔ دراصل آجکل والے میرے متعلق ان سے ایک مضمون چاہتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ احتشام نے میری تنقید پر کچھ نہیں لکھا، میری شاعری پر لکھا۔ اس کی شاید یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ میرے تنقیدی نقطۂ نظر سے متفق نہ ہوں اور اس اختلاف کو ظاہر نہ کرنا چاہتے ہوں۔ میں بہر حال اپنی تنقید کو اپنی شاعری سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں، گو میرے نزدیک میری شاعری بھی ناقابل اعتنا نہیں۔

۱۹۵۲ء میں مجھے پروفیسر ابو بکر احمد حلیم وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی کا ایک خط ملا جس سے یہ معلوم ہوا کہ میرا تقرر مولوی عبدالحق کی سفارش سے کراچی یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے ہو گیا ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ تقرر کیسا جبکہ نہ میں نے اس کے لیے کوئی خواہش ظاہر کی تھی نہ میرا ارادہ پاکستان جانے کا تھا۔ چند روز کے بعد مولوی عبدالحق کا خط آیا جس میں انھوں نے لکھا کہ ان کی تحریک پر یہ تقرر ہوا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ میں اس پیش کش پر غور کروں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر میں کراچی پہنچ جاؤں تو ان کے بعد انجمن کا کام بھی سنبھال سکوں گا۔ پاکستان جانے کا ارادہ نہ ہونے کے باوجود کراچی یونیورسٹی کی پروفیسری اور بعد میں انجمن ترقی اردو پاکستان کی نظامت، ان کی وجہ سے میں نے مناسب سمجھا کہ اپنے والدین اور کچھ احباب سے مشورہ کروں۔ جن لوگوں سے مشورہ کیا ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین بھی تھے اور احتشام حسین بھی۔ احتشام نے امریکہ سے لکھا کہ پیش کش یقیناً قابل غور ہے اور فیصلہ تو آپ خود بھی بہتر کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ کو میں جتنا سمجھ سکا ہوں اس کی روشنی میں مجھے یقین ہے کہ آپ وہاں خوش نہ رہ سکیں گے۔ ذاکر صاحب کا جواب بہت دلچسپ تھا، اگر آپ کا دل گواہی دے تو ضرور جائیے۔ میں آپ کو روکوں گا نہیں، میرے ایک بھائی محمود چلے گئے تو میں نے ان کو بھی نہیں روکا، لیکن آپ کے جانے سے مجھے یہ محسوس ہوگا گویا میرا داہنا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ بہر حال کچھ عرصے کے بعد میں نے معذرت لکھ بھیجی۔ مولوی عبدالحق صاحب کو اس کا واقعی رنج ہوا۔

جون ۱۹۵۴ میں مسعود حسن رضوی ریٹائر ہو گئے۔ شعبہ کا چارج سب سے سینیئر ہونے کی وجہ سے میں نے لے لیا اور فروری ۵۵ء تک صدر رہا۔ اس زمانے میں سب رفیقوں، بالخصوص احتشام، کا بھرپور اور پر جوش تعاون مجھے حاصل رہا۔ میں ہر معاملہ میں ان سے مشورہ کرتا تھا اور ہم لوگ یعنی احتشام، نورالحسن ہاشمی، عبدالاحد خاں خلیل اور میں کئی گھنٹے ساتھ گزارتے تھے۔ اس وقت اچاریہ جگل کشور وائس چانسلر تھے۔ جنوری ۵۵ء میں اچانک وزیر بنا دیے گئے اور ان کی جگہ ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی وائس چانسلر مقرر ہوئے۔

یونیورسٹی کا قاعدہ یہ تھا کہ اگر کسی شعبہ میں دو ریڈر ہوں تو وائس چانسلر ان میں سے کسی کو صدر بنا سکتا ہے۔ رادھا کمل مکرجی نے فروری ۱۹۵۲ء میں یہ حکم بھیجا کہ شعبہ کا صدر فارسی کے ریڈر یوسف حسین موسوی کو مقرر کیا جاتا ہے۔ یوسف حسین موسوی اگرچہ پرانے آدمی تھے لیکن ریڈر

پرکمیونسٹ پارٹی سے قریب رہے گو انھوں نے سیاسی سرگرمیوں میں کوئی حصہ نہیں لیا اور نہ کبھی اس پارٹی کے ممبر ہوئے۔ ادبی تنقید میں وہ سماجی معنویت پر برابر زور دیتے رہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ سماجی معنویت اور ادبی معنویت میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ میرے نزدیک یہ پوری حقیقت نہیں، حقیقت کا ایک اہم پہلو ضرور ہے۔ جدیدیت کے میلان سے وہ کچھ خوش نہ تھے اور تنہائی کے احساس یا عرفانِ ذات کو انھوں نے ہمیشہ شبے کی نظر سے دیکھا۔ وہ تنگ نظر نہیں تھے اس لیے اس نئے میلان کی انھوں نے اس شد و مد سے مخالفت نہیں کی جس طرح ترقی پسند ادب کے کچھ اماموں نے کی۔ ادب کی سماجی معنویت اور سماجی نقطۂ نظر سے ادب کی پرکھ بلاشبہ اہم ہے لیکن بقول RENE WELLEK سماجی معنویت کا نظریہ ادب کے سارے پیچ و خم کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ یہاں ادب کی سیاست پر فوقیت ثابت کرنا مقصود نہیں۔ دونوں کے راستوں اور منزلوں کے فرق کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

احتشام حسین کی نثر ہماری علمی نثر کا اچھا نمونہ ہے۔ ان کا اسلوب حالی کے اسلوب کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ اس میں بڑی سادگی بھی ہے اور گھلاوٹ بھی۔ لیکن میں احتشام کو "صاحبِ اسلوب" نہ کہوں گا اور اس بات سے ان کے ادبی مرتبے میں کوئی کمی بھی نہیں آتی ہے۔

اردو تنقید کو احتشام حسین نے بہت کچھ دیا ہے۔ ایک سنجیدہ اور علمی نقطۂ نظر، ایک سماجی شعور، ایک تہذیبی بصیرت اور ایک سلجھا ہوا اور ہموار اسلوب۔ ادبی معاملات میں کسی کی رائے حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ احتشام حسین کی رایوں سے بھی جا بجا اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ ادب کی دنیا میں جمہوریت ہوتی ہے آمریت نہیں۔ لیکن یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ احتشام حسین نے جیسا اردو تنقید کو پایا تھا اس سے بہت بہتر حالت میں اس کو چھوڑا۔ وہ ہمارے ادب کی بڑی محترم اور محبوب شخصیتوں میں سے تھے۔ انھوں نے کبھی اپنا پروپگنڈا نہیں کیا اور جو لوگ اس میدان کے شہسوار ہیں ان پر بے تکلف دوستوں کی محفل میں دلچسپ انداز میں تبصرہ بھی کرتے رہتے تھے۔ اردو ادب عموماً اور اردو تنقید خصوصاً ان کو محبت اور احترام کے ساتھ یاد کرے گی لیکن ان کے اچانک رخصت ہوجانے پر ان کے قریبی دوستوں کے دلوں میں اس کے علاوہ ایک کسک بھی باقی رہے گی۔

★

بھیّا ــــ احتشام حسین ــــ

(صفحہ ۱۶ کا بقیہ)

ٹھنڈک میں بیٹھے ہیں اور اسی قدر مجمع اندر صحن اور پیش دروازہ ہے۔ ہم لوگ مکان کے اندر داخل ہوئے اور اپنے پیارے بھائی کو ابدی نیند سوتے ہوئے دیکھ کر کلیجہ شق ہوگیا۔ چادر ہٹا کر چہرہ دیکھا۔ چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور معلوم ہو رہا تھا کہ سکون کی نیند سو رہے ہیں۔

میں نے جب میت لکھنؤ لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو مجھے بتایا گیا کہ قبر تیار ہے۔ میں نے جواب دیا کہ جو قبر کھودی جاچکی ہے اس میں مجھے دفن کر دیا جائے اور میت لکھنؤ روانہ کر دی جائے۔ لیکن ہمدردوں نے سمجھایا کہ دہلی اطلاع دی جاچکی ہے۔ چھوٹے بھائی اقتدار حسین بھیا کے بڑے لڑکے جعفر عباس نیز والدہ اور بہن سب صبح کو پہنچ رہے ہیں تو اس وقت کیا ہوگا۔ اس کے علاوہ کچھ اور مسائل اور دشواریاں سامنے آئیں نیز اہلِ الہ آباد کی طرف دیکھ کر کہ لوگ اس ٹھنڈک میں کس طرح پروانہ وار جمع ہیں، اگر میت لکھنؤ چلی گئی تو ان پر کیا گزرے گی میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ منجھلے بھائی وطن گئے ہوئے تھے ان کو بر وقت تمام اطلاع دی گئی تھی کہ لکھنؤ آئیں۔ درمیان میں جگہ کی جو تبدیلی ہوئی اس کے باعث وہ بر وقت الہ آباد نہ پہنچ سکے اور جب پہنچے تو مٹی دی جا رہی تھی۔

الہ آباد میں تدفین کی اطلاع فون سے شب ہی میں لکھنؤ کر دی گئی تھی مگر شہر میں اس کی اطلاع صبح اخبار سے ہوئی۔ اس طرح سیکڑوں آدمی جو لکھنؤ سے آنے کے لیے تیار تھے مایوس ہوگئے۔ صبح ۸ بجے دہلی سے سب لوگ آگئے اور جنازہ اٹھایا گیا۔ جنازہ کے ساتھ اتنا بڑا مجمع تھا کہ لوگوں کو کہتے سنا گیا کہ الہ آباد کی تاریخ میں کسی جنازہ کے ساتھ اتنا بڑا مجمع نہیں دیکھا گیا۔ بالآخر قریب ساڑھے ۱۰ بجے دن کو کربلا میں بھیا کو سپردِ خاک کر دیا گیا اور اب وہ وہاں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

★

لوگ چاہتے تھے کہ ہندستانی زبانوں کے ادیب امریکہ آئیں اور وہاں کے ادیبوں سے ملیں اور وہاں کی ادبی فضا کا مطالعہ کریں۔ بہر حال احتشام نے تھوڑے سے تذبذب اور ہچکچاہٹ کے بعد یہ پیش کش قبول کر لی۔ "ساحل اور سمندر" کے نام سے انھوں نے جو سفرنامہ لکھا ہے اس میں ان کے تاثرات واضح اور روشن ہیں۔ اس زمانے میں انھوں نے مجھے امریکہ سے کئی خط لکھے۔ وہ وہاں کے علمی کاموں سے اور بعض ادیبوں اور نقادوں سے متاثر ہوے تھے مگر امریکہ کے متعلق ان کے عام نقطۂ نظر میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ سفرنامہ اور دوستوں کے نام خطوط دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گھر کی یاد انھیں برابر ستاتی تھی۔ AS YON LIKE IT کے کردار (JAQUES) ژاک کے حزن کا انھوں نے بڑی ذہنی ہمدردی کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔

امریکہ جانے سے پہلے انھوں نے میری شاعری پر ایک مضمون رسالہ آجکل کے لیے لکھا تھا۔ دراصل آجکل والے میرے متعلق ان سے ایک مضمون چاہتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ احتشام نے میری تنقید پر کچھ نہیں لکھا، میری شاعری پر لکھا۔ اس کی شاید یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ میرے تنقیدی نقطۂ نظر سے متفق نہ ہوں اور اس اختلاف کو ظاہر نہ کرنا چاہتے ہوں۔ میں بہر حال اپنی تنقید کو اپنی شاعری سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں، گو میرے نزدیک میری شاعری بھی ناقابل اعتنا نہیں۔

۱۹۵۲ء میں مجھے پروفیسر ابو بکر احمد حلیم وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی کا ایک خط ملا جس سے یہ معلوم ہوا کہ میرا تقرر مولوی عبدالحق کی سفارش سے کراچی یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے ہو گیا ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ تقرر کیسا جبکہ نہ میں نے اس کے لیے کوئی خواہش ظاہر کی تھی نہ میرا ارادہ پاکستان جانے کا تھا۔ چند روز کے بعد مولوی عبدالحق کا خط آیا جس میں انھوں نے لکھا کہ ان کی تحریک پر یہ تقرر ہوا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ میں اس پیش کش پر غور کروں۔ ان کا

خیال تھا کہ اگر میں کراچی پہنچ جاؤں تو ان کے بعد انجمن کا کام بھی سنبھال سکوں گا۔ پاکستان جانے کا ارادہ نہ ہونے کے باوجود کراچی یونیورسٹی کی پروفیسری اور بعد میں انجمن ترقی اردو پاکستان کی نظامت، ان کی وجہ سے میں نے مناسب سمجھا کہ اپنے والدین اور کچھ احباب سے مشورہ کروں۔ جن لوگوں سے مشورہ کیا ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین بھی تھے اور احتشام حسین بھی۔ احتشام نے امریکہ سے لکھا کہ پیش کش یقیناً قابل غور ہے اور فیصلہ تو آپ خود بھی بہتر کر سکتے ہیں لیکن آپ کو میں جتنا سمجھ سکا ہوں اس کی روشنی میں مجھے یقین ہے کہ آپ وہاں خوش نہ رہ سکیں گے۔ ذاکر صاحب کا جواب بہت دلچسپ تھا، اگر آپ کا دل گواہی دے تو ضرور جائیے۔ میں آپ کو روکوں گا نہیں، میرے ایک بھائی محمود چلے گئے تو میں نے ان کو بھی نہیں روکا، لیکن آپ کے جانے سے مجھے یہ محسوس ہو گا گویا میرا داہنا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ بہر حال کچھ عرصے کے بعد میں نے معذرت لکھ بھیجی۔ مولوی عبدالحق صاحب کو اس کا واقعی رنج ہوا۔

جون ۱۹۵۴ء میں مسعود حسن رضوی ریٹائر ہو گئے۔ شعبہ کا چارج سب سے سینیئر ہونے کی وجہ سے میں نے لے لیا اور فروری ۱۹۵۵ء تک صدر رہا۔ اس زمانے میں سب رفیقوں، بالخصوص احتشام، کا بھرپور اور پر جوش تعاون مجھے حاصل رہا۔ میں ہر معاملہ میں ان سے مشورہ کرتا تھا اور ہم لوگ یعنی احتشام، نورالحسن ہاشمی، عبدالاحد خاں خلیل اور میں کئی گھنٹے ساتھ گزارتے تھے۔ اس وقت اچاریہ جگل کشور وائس چانسلر تھے۔ جنوری ۱۹۵۵ء میں اچانک وزیر بنا دیے گئے اور ان کی جگہ ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی وائس چانسلر مقرر ہوے۔

یونیورسٹی کا قاعدہ یہ تھا کہ اگر کسی شعبہ میں دو ریڈر ہوں تو وائس چانسلر ان میں سے کسی کو صدر بنا سکتا ہے۔ رادھا کمل مکرجی نے فروری ۱۹۵۲ء میں یہ حکم بھیجا کہ شعبہ کا صدر فارسی کے ریڈر یوسف حسین موسوی کو مقرر کیا جاتا ہے۔ یوسف حسین موسوی اگرچہ پرانے آدمی تھے لیکن ریڈر

پروگریسیو پارٹی سے قریب رہے گو انھوں نے سیاسی سرگرمیوں میں کوئی حصہ نہیں لیا اور نہ کبھی اس پارٹی کے ممبر ہوئے۔ ادبی تنقید میں وہ سماجی معنویت پر برابر زور دیتے رہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ سماجی معنویت اور ادبی معنویت میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ میرے نزدیک یہ پوری حقیقت نہیں، حقیقت کا ایک اہم پہلو ضرور ہے۔

جدیدیت کے میلان سے وہ کچھ خوش نہ تھے اور تنہائی کے احساس یا عرفانِ ذات کو انھوں نے ہمیشہ شبہے کی نظر سے دیکھا۔ وہ تنگ نظر نہیں تھے اس لیے اس نئے میلان کی انھوں نے اس شد و مد سے مخالفت نہیں کی جس طرح ترقی پسند ادب کے کچھ اماموں نے کی۔ ادب کی سماجی معنویت اور سماجی نقطۂ نظر سے ادب کی پرکھ بلاشبہ اہم ہے لیکن بقول RENE WELLEK سماجی معنویت کا نظریہ ادب کے سارے پیچ و خم کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ یہاں ادب کی سیاست پر فوقیت ثابت کرنا مقصود نہیں۔ دونوں کے راستوں اور منزلوں کے فرق کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

احتشام حسین کی نثر ہماری علمی نثر کا اچھا نمونہ ہے۔ ان کا اسلوب حالی کے اسلوب کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ اس میں ہڈی بھی ہے اور گودا بھی۔ لیکن میں احتشام کو "صاحبِ اسلوب" نہ کہوں گا اور اس بات سے ان کے ادبی مرتبے میں کوئی کمی بھی نہیں آتی ہے۔

اردو تنقید کو احتشام حسین نے بہت کچھ دیا ہے۔ ایک سنجیدہ اور علمی نقطۂ نظر، ایک سماجی شعور، ایک تہذیبی بصیرت اور ایک سلجھا ہوا اور ہموار اسلوب۔ ادبی معاملات میں کسی کی رائے حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ احتشام حسین کی رایوں سے بھی جا بجا اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ادب کی دنیا میں جمہوریت ہوتی ہے آمریت نہیں۔ لیکن یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ احتشام حسین نے جیسا اردو تنقید کو پایا تھا اس سے بہت بہتر حالت میں اس کو چھوڑا۔ وہ ہمارے ادب کی بڑی محترم اور محبوب شخصیتوں میں سے تھے۔ انھوں نے کبھی اپنا پروپگنڈا نہیں کیا اور جو لوگ اس میدان کے شہسوار ہیں ان پر بے تکلف دوستوں کی محفل میں دلچسپ انداز میں تبصرہ بھی کرتے رہتے تھے۔ اردو ادب عموماً اور اردو تنقید خصوصاً ان کو محبت اور احترام کے ساتھ یاد کرے گی لیکن ان کے اچانک رخصت ہو جانے پر ان کے قریبی دوستوں کے دلوں میں اس کے علاوہ ایک کسک بھی باقی رہے گی۔

★

بھیا ـــــ احتشام حسین

(صفحہ ۱۶ کا بقیہ)

ٹھنڈک میں بیٹھے ہیں اور اسی قدر مجمع اندر صحن اور پیش دروازہ ہے۔ ہم لوگ مکان کے اندر داخل ہوئے اور اپنے پیارے بھائی کو ابدی نیند سوتے ہوئے دیکھ کر کلیجہ شق ہوگیا۔ چادر ہٹا کر چہرہ دیکھا۔ چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور معلوم ہو رہا تھا کہ سکون کی نیند سو رہے ہیں۔

ہم نے جب میت لکھنؤ لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو مجھے بتایا گیا کہ قبر تیار ہے۔ میں نے جواب دیا کہ جو قبر کھودی جا چکی ہے اس میں مجھے دفن کر دیا جائے اور میت لکھنؤ روانہ کر دی جائے۔ لیکن ہمدردوں نے سمجھایا کہ دہلی اطلاع دی جا چکی ہے۔ چھوٹے بھائی اقتدار حسین بھیا کے بڑے لڑکے جعفر عباس نیز والدہ اور بہن سب صبح کو پہنچ رہے ہیں تو اس وقت کیا ہوگا۔ اس کے علاوہ کچھ اور مسائل اور دشواریاں سامنے آئیں نیز اہلِ الٰہ آباد کی طرف دیکھ کر کہ لوگ اس ٹھنڈک میں کس طرح پروانہ وار جمع ہیں، اگر میت لکھنؤ چلی گئی تو ان پر کیا گزرے گی میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ منجھلے بھائی وطن گئے ہوئے تھے ان کو بدقت تمام اطلاع دی گئی تھی کہ لکھنؤ آ جائیں۔ درمیان میں جگہ کی جو تبدیلی ہوئی اس کے باعث وہ بروقت الٰہ آباد نہ پہنچ سکے اور جب پہنچے تو مٹی دی جا رہی تھی۔

الٰہ آباد میں تدفین کی اطلاع فون سے شب ہی میں لکھنؤ کر دی گئی تھی مگر شہر میں اس کی اطلاع صبح اخبار سے ہوئی۔ اس طرح سیکڑوں آدمی جو لکھنؤ سے آنے کے لیے تیار تھے مایوس ہو گئے۔ صبح ۸ بجے دہلی سے سب لوگ آ گئے اور جنازہ اٹھایا گیا۔ جنازہ کے ساتھ اتنا بڑا مجمع تھا کہ لوگوں کو کہتے سنا گیا کہ الٰہ آباد کی تاریخ میں کسی جنازہ کے ساتھ اتنا بڑا مجمع نہیں دیکھا گیا۔ بالآخر قریب ساڑھے ۱۲ بجے دن کو ہمارے بھیا کو سپردِ خاک کر دیا گیا اور اب وہ وہیں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

★

انسان اور دانشور

سید شبیہ الحسن نونہروی

احتشام صاحب کا خیال آتے ہی ذہن کے افق پر یادوں کی ایک کہکشاں کھل پڑتی ہے۔ حافظے کی فصیل پر قطار در قطار یادوں کے چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔ سارا منظر مل جل کر ایک ایسے ہالہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس میں ان کا شاداب و سنجیدہ چہرہ آپ کے کردار کے تمام نقوش کے ساتھ اس طرح نمودار ہوتا ہے کہ عارضی طور پر یہ یقین بھی ختم ہو جاتا ہے کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے یہ یادداشتیں میرے حقیر اکتسابات و تجربات کے خزانے کا بیش قیمت جز ہیں اور میرے لیے احتشام صاحب کا تحفۂ بعد از مرگ ہیں۔ کاش کہ میں نہ صرف انھیں محفوظ رکھوں بلکہ ان سے ویسا ہی فائدہ بھی اٹھا سکوں کہ جیسا کہ فائدہ پہنچانے کی ان میں اہلیت ہے۔

گزشتہ بیس پچیس سال کے عرصے میں مجھے انھیں بہت قریب سے دیکھنے پرکھنے اور ان سے استفادہ کرنے کے وافر و متواتر مواقع فراہم رہے ہیں بالخصوص وہ چند سال جو لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ان کی رفاقت میں میں نے گزارے ان کے متعلق میرے مشاہدات کو وسیع اور زیادہ بامعنی بنانے میں بہت مفید ثابت ہوئے۔ اس دوران میں ان کی انسان دوستی، ایثار، مروت اور دانشوری کی ایسی حیرت انگیز مثالیں برابر دیکھنے کو ملتی رہیں کہ جن کی وجہ سے میں کم از کم اتنا دعویٰ کر سکتا ہوں کہ ان کے متعلق میرے خیالات [illegible] یا عقیدت مندانہ [illegible]

[illegible]

نہیں بلکہ فطرت تھی اس معاملے میں تکلفات و ملاقات کی بھی کوئی قید نہ تھی۔ وہ ایک اجنبی کا حق بھی اپنے اوپر تقریباً ویسا ہی سمجھتے تھے جیسا کسی دوست اور ملاقاتی کا۔ گرچہ اس افراط کی وجہ سے رہا اکثر بڑی پریشانی میں بھی مبتلا ہو جاتے تھے اس لیے کہ بعض لوگ بڑی بے تکی چیزوں کی فرمائش کرتے تھے مگر ان کی سوجھ بوجھ کا یہ کمال تھا کہ وہ ان بے تکی فرمائشوں میں بھی معمولی رد و بدل کے ساتھ تُک اور سلیقہ پیدا کر کے کارفرمائی کی راہ نکال دیتے تھے اور مشکل کو کبھی نہ کسی صورت سے حل کر دیتے تھے۔ اگرچہ زندگی اور اس کے حقائق و مسائل کے سلسلے میں ان کے نہایت مستحکم نظریات تھے مگر ہر نظریہ سے بلند ہو کر وہ انسان اور انسانیت کو خالص شکل میں بھی محسوس کرنے کا سلیقہ رکھتے تھے اسی لیے وہ لوگوں کے دکھ درد، مشکلات، مجبوریوں اور لاچاریوں کو ہمیشہ ہمدردانہ زاویہ نظر سے دیکھتے تھے۔ مجھے یہ واقعہ خوب اچھی طرح یاد ہے کہ یونیورسٹی سے واپسی پر ایک دن ہم دونوں امین آباد کے چوراہے کو عبور کرنے کی کوشش کر رہے تھے جہاں اس دن سواریوں کی آمد و رفت اور بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے غیر معمولی ہل چل تھی اور ایک نہایت خستہ حال، بڈھا بڑی بے بسی کے ساتھ اس ہیجان کو عبور کرنے کی پرخطر مگر بے فائدہ کوشش کر رہا تھا۔ احتشام صاحب چشم زدن میں اس کے پاس پہنچ گئے اور اس کی لٹھیا پکڑ کے اسے سہارا دیتے ہوئے بھیڑ بھاڑ سے بچاتے ہوئے نہ صرف سڑک کے پار لے گئے بلکہ اس کی فرمائش پر کافی دور لے جا کر ایسی جگہ چھوڑ آئے جہاں نہ صرف سڑک پُرسکون تھی بلکہ راستہ بھی اس کا سمجھا ہوا تھا۔ یا در اس طرح کے واقعات اتنے تسلسل کے ساتھ مشاہدہ میں آئے ہیں کہ اگر سب کو لکھا جائے تو ایک دفتر بن جائے۔

کسی مشکل کو دور کرنے کے لیے اگر اپنے بلند منصب اور حیثیت سے اترنے کی ضرورت درپیش ہوتی تھی تو وہاں کا کبھی خیال ہی نہیں کرتے تھے اور جو کچھ ان سے ممکن ہوتا تھا کر گزرتے تھے۔ ایک مرتبہ [illegible] وقت شعبے کے مصروفیات سے جب میں فارغ ہو [illegible] ہوا کہ [illegible] ایک امتحان کی [illegible]

تیسرے دن مجھے ایسی ضرورتیں درپیش تھیں اور وہ احتشام صاحب کے علم میں بھی تھیں کہ نگراں کا کام انجام دینا میرے لیے ممکن ہی نہ تھا میں عجلت کے ساتھ شعبے سے باہر نکلا کہ لائبریری یا اسٹاف کلب میں اپنے ساتھی اور معاصر اساتذہ میں سے کوئی مل جائے تو اُسے اپنا عوضی بننے پر تیار کروں مگر کوئی دستیاب نہیں ہوا اور میری الجھن بڑھ گئی۔ اِدھر اُدھر گھوم پھر کے بالآخر دوبارہ اسٹاف کلب کا رخ کیا تو دیکھا وہاں کسی میٹنگ سے فرصت پاکر احتشام صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی پوچھنے لگے کہ جس اسی نگرانی کے لیے ایک نوٹس لیے پھر رہا تھا کیا مل گیا؟ میں نے کہا ہاں مل گیا۔ پوچھا، پھر کیا انتظام کیا۔ میں نے کہا تمام ساتھی مستغرق ہو چکے اور ابھی تک کوئی نہیں ملا۔ کہنے لگے مگر کوئی نہ کوئی انتظام تو ضرور ہی کرنا ہوگا۔ میں نے کہا اب پھر کسی کو تلاش کروں گا۔ احتشام صاحب کی بزرگی اور منصب کو دیکھتے ہوئے اس بات کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ میں ان سے کوئی فرمائش کرسکتا مگر یہ ان کی انتہائی عالی ظرفی تھی کہ میری کمک کے لیے اپنے منصب سے اترنے میں انھیں ذرہ برابر جھجک نہیں ہوئی۔ میں لاکھ انکار کرتا رہا بہانے کرتا رہا اور یقین دلاتا رہا کہ میں کسی نہ کسی شخص کو تلاش کر لوں گا مگر وہ نہیں مانے اور کہنے لگے کہ تمہارے عوض میں نگرانی کر دوں گا۔ میں نے کہا کہ تھوڑی دیر کا موقع اور دیجیے ایک مرتبہ میں اور تلاش کر لوں شاید کوئی مل جائے۔ آپ کے لیے یہ بات شایانِ شان نہیں ہے۔ یہ سن کر خوب ہنسے اور کہنے لگے پریشانی میں پڑنے سے کوئی فائدہ نہیں، تبدیلی کی درخواست دے کر چپکے سے گھر چلو۔ یہ کہہ کر انھوں نے یہ بھی انتظار نہیں کیا کہ میں کچھ کہوں۔ خود ہی جلدی سے درخواست لکھ دی، مجھ سے دستخط کروا لے اور اپنی رضامندی لکھی اور چپراسی کے حوالے کی کہ دفتر میں دے آئے۔ نوعیت کے اعتبار سے یہ واقعہ بھی مشتے نمونہ از خروارے کا مصداق ہے اور صرف میں ہی نہیں بلکہ اس طرح کی مہربانیوں کی داستان بیان کرنے والے بہت ملیں گے۔

اسی طرح کے اوصاف و اقدام کا باعث حقیقتاً ان کا وہ ہمہ گیر اور آفاقی انسانی نقطۂ نظر تھا جس کی پرداخت اور رکھ رکھاؤ سے وہ کبھی غافل نہیں ہوئے۔ وہ عقیدتاً انسان دوست تھے اسی لیے جن لوگوں کے افکار و خیالات سے انھیں اختلاف رہتا تھا یا جو اُن کے نظریات و تصورات سے اختلاف رکھتے تھے ایک دوسرے سے قریب آنے اور دوست بننے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرتے تھے۔ ان سے متفق نہ ہونے والے بھی ان کی طرف سے شائستگی اور باہمی احترام کی ایسی کشش محسوس کرتے تھے کہ جس کی منافرت کرنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔ اس کے حلقۂ تعارف و ملاقات پر اگر نظر ڈالیے تو ایک "نیرنگ بوقلمونی" معلوم ہوگا جس میں رندانِ بادہ خوار اپنی سرمستی کے ساتھ، پندار پرستانِ بادہ خوار اپنے تقشف کے ساتھ، فرزانگانِ خوش ذوق اپنی فکر سلیم کے ساتھ اور مجادلہ پسندانِ بدافکار اپنی طبع سقیم کے ساتھ برابر نظر آئیں گے اور احتشام صاحب اپنے موقف سے ہٹے بغیر ہر ایک سے نباہ کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ اور بغیر کسی کی دل آزاری کیے پورے طوفان سے دامن تر کیے بغیر گزر جائیں گے۔ اس لیے کہ اختلاف کے باوجود احترام کرنا اور احترام کے باوجود شائستگی سے اختلاف کر لینا احتشام صاحب کی فنکاری اور کردار کے اہم گوشے ہیں۔ اپنے رویے اور برتاؤ میں بھی وہ اتنے باسلیقہ اور ہمہ جہتی احساس کے مالک تھے کہ چاہے ان کے گرد و پیش بہت لوگ موجود ہوں مگر وہ ہر ایک کو اپنی نگاہ التفات سے گرفتار کر لینے میں بڑے مشاق تھے۔ خواہ کوئی شخص ان کے پاس گھنٹوں بیٹھے مگر اُسے اکتاہٹ کبھی نہیں پیدا ہوسکتی تھی اور اگر کبھی وہ خود اکتا جاتے تھے تو ہرگز کوئی اُسے محسوس نہیں کرسکتا تھا۔ ان کی اکتاہٹ کے خاص مواقع وہ تھے کہ جب کوئی بسیار گو اپنی کج بحثی سے انھیں پریشان کر ڈالتا تھا یا کسی جلسے میں بے مغز تقریروں کی بے ربط طوالت صبر و تحمل کی ہر کوشش کو شکست دینے کے باوجود اپنی حماقت بیانی اختتام پہ پہنچانے کے لیے کسی طرح تیار نہیں ہوتی تھی تو ایسے عالم میں بھی احتشام صاحب اتنے پرسکون رہتے تھے کہ ان کے ضبط و تحمل پہ رشک ہوتا تھا۔ وہ کسی شخص سے بھی نفرت نہیں کرسکتے تھے۔ قابلِ نفرت اشخاص سے

ان کا سلوک ہمدردانہ رہتا تھا۔ ایسے لوگوں سے وہ اپنے اختلاف کو بیزاری کے بجائے بے آزاری کے ساتھ ظاہر کر دیتے تھے اور بڑی دلجوئی کے ساتھ انھیں خود اپنا جائزہ لینے اور اپنی اصلاح کرنے پر آمادہ کر دیتے تھے۔ اسی لیے ان سے متعارف ہونے والا شخص ان کی پرخلوص ہمدردی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ یہ بھی ان کی حیرت انگیز شخصیت کا ایک سحر کن پہلو تھا کہ ان سے سب ہی ربط رکھنے والے ان کی بے پایاں عنایتوں، پرخلوص قدر دانیوں اور موثر راہ نمائیوں کی وجہ سے اپنے اور ان کے مابین تعلقات، مراسم کو خصوصی نوعیت و اہمیت کا حامل سمجھنے پر مجبور رہتے تھے۔ خصوصی تعلقات کا فیض عام اور وہ بھی اتنے بڑے پیمانے پر ایک ایسی حیرت انگیز بات ہے کہ جس کی مثال ڈھونڈنا بہت مشکل ہے۔

احتشام صاحب کے ایسے شریف، مہذب اور معتدل انسان میں نے زندگی میں شاذ و نادر ہی دیکھے ہیں۔ اس دعوے میں نہ کوئی مبالغہ ہے نہ کوئی انکشاف۔ جو لوگ ان سے تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ بلا تکلف اس کی تصدیق کریں گے۔ تہذیب انسان کی فطرت نہیں بلکہ عادت ہے۔ انسان مہذب پیدا نہیں ہوتا ہے بلکہ تربیت سے مہذب بنایا جاتا ہے۔ مہذب ہونا ایک ایسا تکلف اور جبلتوں کی ایک ایسی فاقہ کشی ہے جسے سماجی زندگی کے فرائض کی تکمیل کے لیے کم و بیش ہر شخص کو گوارا کرنا ہوتا ہے۔ مگر احتشام صاحب کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب ان کے لیے تکلف نہیں بلکہ راحت ہے، تصنع نہیں بلکہ جبلت ہے، عادت نہیں فطرت ہے۔ بڑے بڑے مہذب افراد بھی عالم سرخوشی و بے تکلفی میں تہذیبی لبادہ کو اتار کر ایک ایسے معیار تک پہنچ جاتے ہیں جو ان کی سیرت کے معروف و مشہور اوصاف کے مطابق نہیں ہوتا ہے۔ در اصل عیش و نشاط کا عالم ہی تہذیبی اقدار پر انسان کی کوئی گرفت کا مظہر ہوتا ہے۔ میں نے احتشام صاحب کو ایسے گوناگوں حوالم و کیفیات میں دیکھا ہے کہ جس کے بعد شاید ہی کسی نئے عالم اور ذہنی کیفیت میں انھیں دیکھنے کی ضرورت باقی رہ گئی ہو۔ وہ انسان تھے خوش بھی رہتے تھے غمگین بھی ہوتے تھے ان پر افسردگی بھی طاری ہوتی تھی اور انھیں طیش بھی آتا تھا لیکن پناہ بخدا کبھی انھیں ان غیر معمولی حالتوں میں بھی اعتدال کے دائرے سے خارج ہوتے ہوئے دیکھا ہی نہیں۔ ان کی نرم روی اور خوش مزاجی میں کبھی کوئی فرق محسوس ہوا ہی نہیں۔ ایک معمولی سی بات یہ ہے کہ اتنے طویل عرصے میں کہ جب سے میں انھیں دیکھتا رہا ہوں اور قریب سے دیکھتا رہا ہوں کبھی کسی فحش کلمہ کا تو ذکر ہی کیا معیار سے گرے ہوئے کسی فقرے کو بھی ان کے منہ سے برآمد ہوتے ہوئے نہیں سنا۔ حالانکہ اچھے خاصے مہذب لوگ ضرورتاً اور عادتاً سبھی نگرہیجان اور بحران میں کیا کیا کچھ نہیں کہہ ڈالتے ہیں اور کیا کیا نہیں کر ڈالتے۔

انھوں نے بڑا پرسکون اور شفاف ذہن و مزاج پایا تھا جس کی گہرائی اور دور رسی کا اندازہ کرنا آسان نہیں تھا۔ ان میں کبھی ابال آتا ہی نہیں تھا اسی لیے ادب و زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق ان کے رویے سے ہیجانی عمل و ردعمل کے خوگر لوگوں کو کبھی کبھی کوفت بھی ہوتی تھی لیکن اسے کیا کیا جائے ہیجان و طوفان کے عارضی ہنگامے جب سکون پذیر ہوتے تھے تو احتشام صاحب کا غیر جذباتی نقطۂ نظر ٹھوس چٹان کی طرح طوفان میں بہنے والوں کو پناہ دینے کے لیے موجود رہتا تھا۔ وہ بہت سی تحریکیں جن کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے جن میں احتشام صاحب نے شرکت کی یا جن کی قیادت کی ان کی اصابت رائے اور فکری استحکام کی شہادت دینے کے لیے مثال میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ زندگی کی کسی شاہراہ پر احتشام صاحب ایجی ٹیشن کرنے کے قائل نہیں تھے، نہ ان کے پاس ہنگامہ آرا مزاج تھا اور نہ ہیجان خیز ذہن۔ اسی لیے ان کی شہرت کسی سستی کمائی کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ چلتے پھرتے حالات کے ساتھ اس کے مضمحل ہو جانے کا کوئی اندیشہ ہے۔

اپنی پوری زندگی میں انھوں نے نفع اندوزی کی فکر کبھی نہیں کی۔ دوسروں کو فائدہ پہنچانے میں انھوں نے کبھی دریغ نہیں کیا لیکن اپنے مسائل سے قابل اعتراض حد تک غافل

منافع کے دروازے بار بار ان کے سامنے کھلتے رہے مگر اپنی بے نیازی سے انھوں نے جھانک کر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی وہ اسی رزق پر قائم رہے جو خود انھیں ڈھونڈتا ہوا ان تک پہنچ جاتا تھا انھیں تلاش میں سرگرداں اور سرگرم کبھی نہیں دیکھا۔ یہ بات کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ بہت سے سوشلسٹ ممالک کے سفارت خانے عرصہ دراز سے ایک خاص طبقے کے لیے جلب منفعت کا بہترین ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ میری مراد یہ نہیں ہے کہ منفعت کے یہ ذرائع نادرست ہوں گے لیکن احتشام صاحب نے اس بہتی ہوئی گنگا سے کبھی پیاس بجھانے کی کوئی فکر نہیں کی۔ وہ صرف ترقی پسند نہیں بلکہ ترقی پسندوں کے راہنما ہونے کی وجہ سے بڑی آسانی کے ساتھ اتنا نفع حاصل کر سکتے تھے جو دوسروں کے لیے بڑی مشکل سے بھی شاید حاصل نہ ہوتا لیکن ان تک کیا پہنچا — وہ بہت معمولی بلکہ ناقابل ذکر منفعت جو اس میدان سے ترک تازوں کی دست برد سے اتفاقاً کبھی بچ رہی ہو۔ اسی بے فکری اور بے نیازی کی وجہ سے ان کا مالیاتی میزانیہ زندگی بھر نا موافق رہا۔ اخراجات کا بوجھ ان پر ہمیشہ زیادہ رہا اور اکثر انھیں شدید سے شدید تر حالات کے درمیان زندگی گزارنی پڑی لیکن کبھی حرف شکایت ان کے لبوں پر نہیں دیکھا۔ پریشانیوں کے باوجود وہی آسودہ مزاجی ان پر حاوی رہی جو ان کی شخصیت و سیرت کا ہمیشہ سے جزو اعظم رہتی تھی

زندگی میں انھیں جو بھی حاصل ہوا اس میں سوائے ان کے جوہر ذاتی کے اور کسی چیز کا دخل نہیں ہے۔ جوڑ توڑ، شخصی سفارش، پارٹی بازی اور اسی طرح کے دوسرے رائج الوقت سکوں سے ان کی جیب ہمیشہ خالی رہی۔ انھیں ارباب اقتدار کے دروازوں پر جبہہ سائی کرتے ہوئے میں نے کیا کسی نے بھی کبھی نہیں دیکھا۔ یہی سبب ہے کہ عرفی اعتبار سے ان کی رفتار ترقی سست رہی اور جن مناصب پر انھیں بہت پہلے پہنچ جانا چاہیے تھا وہ ان تک بہت دیر میں پہنچے۔

ذہن و مزاج کی ان خصوصیتوں کے ساتھ وہ زندگی کی کسی بھی شاہراہ پر چلتے اور کوئی بھی مشغلہ اور پیشہ اختیار کرتے اور چاہے عام معیاروں کے مطابق وہ کامیاب ہوتے یا ناکام ہوتے لیکن ہر جگہ وہ اپنی عظمت اور برتری کے نشان ضرور چھوڑتے۔ اسے بھی ہماری ملکی زندگی کے پس منظر میں کہ جس میں راہوں کے حسب مرضی انتخاب کی زیادہ گنجائش نہیں ہے، ایک خوش قسمتی سمجھنا چاہیے کہ انھیں ایک ایسا پیشہ اور مشغلہ اختیار کرنے کا موقع ملا کہ جو ان کی صلاحیتوں اور طبیعت کے عین مطابق تھا۔ میں نہیں تصور کر سکتا ہوں کہ معلمی سے زیادہ کوئی موزوں پیشہ ان کے لیے ہو سکتا تھا اور تنقید نگاری سے بہتر ان کی صلاحیتوں کے ظہور کے لیے کوئی دوسرا میدان فراہم ہو سکتا تھا۔ وہ محض اپنے علم کی بنا پر اچھے معلم اور اچھے نقاد نہیں تھے بلکہ اپنے استوار مزاج اور جوہر شرافت کی بنا پر تھے۔ اکثر پڑھے لکھے افراد بھی مناسب مزاج نہ رکھنے کی بنا پر اچھے معلم نہیں ثابت ہوتے۔ ایک معلم کی حیثیت سے ان کی برتری کا سبب یہی تھا کہ وہ اپنے طلبہ پر علم کی بوچھار کر کے کوئی فخر نہیں محسوس کرتے تھے بلکہ جو کچھ بتاتے تھے اسے ان کے وجدان و ادراک بلکہ مجموعی شخصیت و سیرت کا جز بنانے کی فکر کرتے تھے۔ وہ محض تعلیم نہیں دیتے تھے بلکہ ذوق سلیم کی تربیت و ترویج کرتے تھے۔ اسی لیے ان کی تعلیم کی پڑھائی ہوئی نسل پر ان کی چھاپ بہت گہری دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح تنقید نگاری کا مسئلہ بھی خوب پڑھ کے تنقید کر ڈالنے تک محدود نہیں ہے۔ تنقید نگاری سے زیادہ خطرناک شاید ہی کوئی دوسرا فن تصور میں آ سکے۔ یہ فن جس قدر خطرناک ہے، اتنا ہی شرافت کا متقاضی بھی ہے۔ غیر شریف انسان خواہ وہ کتنا ہی پڑھا لکھا ہو، اچھا نقاد کبھی نہیں بن سکتا۔ احتشام صاحب کی تنقیدی میزان کو ان کے نظریات کے علاوہ ان کا وافر علم اور اسی کے متوازی وافر شرافت متوازن رکھتی ہے۔ انھوں نے علم کا غلط استعمال کبھی نہیں کیا اور چاہے کوئی شخص ان کے نظریات اور تنقید سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کرے، لیکن اس کا قائل اسے بہر حال ہونا ہوگا انھوں نے تنقید کے فن کو غلط یا غیر شریفانہ طور پر استعمال کرنے کا ارتکاب بھی کبھی نہیں کیا۔ تعلیمی اور تنقیدی میدان میں ان کی عظمت کا راز اس میں مضمر نہیں ہے کہ انھوں نے کبھی کوئی غلط بات کہی یا لکھی نہیں

ہوئی بلکہ اس خلوص، شرافت اور ظرف میں مضمر ہے جس سے عالم اور نقاد ہونے کے باوجود انسان کبھی کبھی محروم رہ جاتا ہے۔

انھیں معلومات کا دائرۃ المعارف کہنا حق بجانب ہے۔ تازہ ترین کتابوں، اہم مصنفین، مسائل اور تحریکات کے متعلق خواہ ان کا تعلق دنیا کے کسی گوشہ سے ہو، ان کی واقفیت اکثر تحیر کا باعث ہوتی تھی۔ ان کے خاص اور پسندیدہ موضوعات کا تو خیر ذکر ہی کیا، اپنے موضوعات اور مسائل کے متعلق بھی کہ جن سے ان کی دلچسپی یا ربط کا احتمال بھی نہیں ہو سکتا تھا، ان کی درست واقفیت اور صحیح شعور اکثر ان موضوعات کے ماہرین کو بھی اچنبھے میں ڈال دیتا تھا۔ کسی مسئلے پر بھی گفتگو چل پڑے، احتشام صاحب کو کبھی خالی الذہن نہیں پایا۔ کوئی نہ کوئی مفید اطلاع یا اہم نکتہ وہ ضرور بہم پہنچا دیتے تھے۔ جہاں تک ان کے خاص دلچسپی کے موضوعات کا تعلق ہے تو پھر کہنا ہی کیا ہے۔ بات چلی نہیں کہ تازہ ترین حوالے موج در موج سامنے آنے لگے اور وہ تمام اہم گوشے کہ جن میں سے کثر کی طرف عام طور سے ذہن کی رسائی نہیں ہوتی ہے، قطار در قطار سننے والوں کے سامنے موجود ہو جاتے تھے۔ تحقیق اور تفتیش کرنے والوں کے لیے ان کی صحبت چند لمحہ بھی کم و کیف کے اعتبار سے مدت مدید کی، ہم پلہ بن جاتی تھی۔ وہ چند نشستوں میں اتنا بتا سکتے تھے کہ جتنا برسوں میں بتانا اور تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے اس وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ تدقیق و تعمق میں بھی وہ اپنی آپ مثال تھے۔ وہ ضخیم سے ضخیم کتابوں اور وسیع سے وسیع موضوع کے بنیادی نکتوں اور جوہری عناصر کو چند لمحوں میں بیان کر سکتے تھے۔ اضافی چیزوں کو نظر انداز کر کے کسی بھی مسئلے کی روح اصلی کا ادراک کر لینا ان کی حیرت انگیز ذہانت کا ایسا کرشمہ تھا جو کثرت توقع کی بنا پر ان کی نسبت سے حیرت کا باعث نہیں ہوتا تھا۔ اکثر اہم کتابوں کا تفصیلی مطالعہ اور ان کتابوں کے متعلق احتشام صاحب سے تھوڑی دیر بات چیت کر لینا، حصول اور افادیت کے اعتبار سے یکساں ثابت ہوتا تھا۔ کسی کتاب یا مصنف کے متعلق بنیادی باتوں کے علاوہ اگر تفصیلات کا ذکر آ جاتا تھا تو خیر وہ ان تفصیلات کو تو گنوا ہی دیتے تھے جو کتاب میں موجود ہوتے تھے لیکن اس کے علاوہ وہ بہت سے ایسے تفصیلات بھی بتا ڈالتے تھے کہ جنھیں کتاب میں ہونا چاہیے تھا مگر مصنف نے اپنی نارسائی یا کسی اور سبب سے انھیں نظر انداز کیا۔

ان کی واقفیت اور اطلاع کا دائرہ محض علمی چیزوں تک محدود نہیں رہتا تھا۔ وہ سماج کو کھلی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان کے ذہن میں ہر طرح کے مشاہدے اور تجربات مسلسل درآمد کی وجہ سے نامیاتی اور تازہ تر شکل میں محفوظ رہتے تھے۔ ان کے وسیع اطلاعات کے متعلق ایک حقیقت آگیں لطیفہ سن لیجیے۔ کئی برس ہوئے علی گڑھ میں میرے زمانہ طالب علمی کے پرانے دوست ڈاکٹر مثنیٰ رضوی میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور علی گڑھ اور وہاں کے قدیم و مشترک دوستوں کی یاد چھڑی ہوئی تھی کہ رفتہ رفتہ ایک پرانے دوست کا ذکر آ گیا جن کے متعلق ہم دونوں ہی بے خبر تھے کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ بہت سوچنے کے بعد بھی کوئی ایسی تدبیر یا ذریعہ سمجھ میں نہیں آیا کہ جس سے ان کا تازہ حال دریافت ہو سکے کہ اتنے میں ڈاکٹر مثنیٰ نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا کہ احتشام صاحب سے ملاقات ہوگی تو ان سے دریافت کریں گے۔ میں نے کہا کہ احتشام صاحب سے اس شخص کا کہیں دور دور کا بھی رابطہ نہیں ہے وہ کیسے بتا سکیں گے۔ مثنیٰ نے کہا کہ نہیں تمھیں کسی شخص کے متعلق بھی اگر یہ اطلاع حاصل کرنی ہو کہ وہ آج کل کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے تو پورے اعتماد کے ساتھ تم احتشام صاحب سے پوچھ سکتے ہو، وہ کچھ نہ کچھ تازہ اطلاع فوراً دے دیں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ مثنیٰ نے اس ضمن میں احتشام صاحب سے پوچھا یا نہیں پوچھا لیکن پھر میں نے بارہا تجربہ کیا اور ڈاکٹر مثنیٰ کی کہی ہوئی بات کو حرف بہ حرف صحیح پایا۔

انھوں نے بے حد جستجو پسند ذہن پایا تھا۔ نئی کتابوں کا جاسوس کہنا بجا ہے معلوم نہیں کہ وہ کیونکر اتنا صبر کر لیتے تھے کہ کوئی نئی کتاب بازار یا یونیورسٹی لائبریری تک پہنچ لے تو

وہ مطالعہ کریں۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ نئی کتابوں کو چھپتے وقت پریس میں جا کر پڑھ آیا کرتے جب وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں موجود تھے تو مجھے یہ اتفاق نہیں ہوا کہ متعلق موضوعات کے متعلق کوئی کتاب نکلواتا اور اس پر احتشام صاحب کے مطالعہ کے نشانات نہ پاتا۔ ٹیگور لائبریری کی نئی کتابوں کے مطالعہ کرنے والوں میں بیشتر سبقت انھیں حاصل رہتی تھی اور بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ اگر کوئی نئی کتاب پہلے میرے ہی ہاتھ پڑ گئی اور بعد میں انھوں نے وہ کتاب میرے پاس دیکھ لی تو بغیر کچھ کہے سنے اپنے بیگ میں رکھ لی اور چند دنوں کے بعد مجھے واپس کی۔ مجھے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ اگر پڑھنے کے بعد کتاب ان تک پہنچتی تھی تو واپسی کے وقت اس کتاب کے متعلق ان کے نہایت مفید خیالات بھی مجھ تک پہنچ جاتے تھے اور اگر میرے پڑھنے سے پہلے وہ کتاب ان تک پہنچ جاتی تھی تو واپسی کے وقت وہ یہ ضرور بتا دیتے تھے کہ اس کتاب کے کون سے حصے مفید ہیں کون سا جز فضول ہے کہاں تک پڑھنا چاہیے اور کون سے حصے چھوڑ دینا چاہیے۔ جس سے پڑھنے میں محنت آدھی رہ جاتی تھی اور فائدہ پورا حاصل ہو جاتا تھا۔

اپنے نفع اور نقصان کے معاملات میں وہ جتنے قانع بلکہ جمود پسند تھے علمی بازیافت کے سلسلے میں اتنے ہی فعال و تحقیق نورد تھے۔ اسی لیے علمی اور فکری جمود سے وہ کبھی دوچار نہیں ہوئے۔ اس معاملہ میں ان کے نمو اور سفر میں کبھی کوئی خلل نہیں پڑا۔ شاید ہی کوئی دن ایسا ناغہ ہوا ہو کہ جس میں انھوں نے اپنے فکری ذخیرہ میں کوئی اضافہ نہ کیا ہو۔ گنجینۂ گوہر رکھنے کے باوجود انھوں نے غواصی کبھی ترک نہیں کی، خرمن کے مالک ہونے کے باوصف انھوں نے کسی دن دانہ چینی سے غفلت نہیں برتی۔

ہیچ گہ ذوق طلب از جستجو بازم نہ داشت (کلیم)
دانہ می چیدم من آن روزے کہ خرمن داشتم

وسیع معلومات رکھنے کے باوجود اگر انھیں کوئی بات نہیں معلوم ہوتی تھی تو اس کے پوچھنے اور دریافت کرنے میں انھیں کبھی تکلف نہیں ہوتا تھا۔ اکثر وہ اپنے سے بہت چھوٹے لوگوں سے بھی کسی بات کو معلوم کر لینے میں شرمندگی نہیں محسوس کرتے تھے۔ اس طرح کی دانش جوئی اسی ذہن و مزاج کا خاصہ ہے جس میں علم کی سچی لگن اور جمود سے واقعی نفرت موجود ہو۔ انھوں نے عربی کی باقاعدہ تعلیم نہیں حاصل کی تھی۔ اردو ادب کے سمجھنے میں کہیں کہیں عربی سے ناواقفیت جو کرشمے دکھاتی ہے اس کی تفصیل میں اس وقت جانے کی ضرورت نہیں ہے، صاحبان وقوف اس امر سے خوب آگاہ ہیں۔ ان دقتوں میں احتشام صاحب بھی کبھی کبھی مبتلا ہوتے تھے اور مجھ سے برابر یہ کہتے تھے کہ زندگی میں اگر کسی بات کا افسوس رہ جائے گا تو وہ عربی نہ پڑھنے کا اور زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ اب وقت اتنا گزر چکا ہے کہ تلافی بھی نہیں ہو سکتی ہے۔ میں نے کہا نہیں اس عمر میں تو لوگ بالکل نئی زبانیں سیکھ لیتے ہیں اور آپ کو تو لخت لخت عربی آتی ہے اگر آپ قواعد کی طرف تھوڑی توجہ کر لیں تو یہ بکھرا ہوا شیرازہ منظم ہو جائے۔ اس کے علاوہ لسانیات آپ کا خاص موضوع ہے اور تقابلی قواعد کے مسئلے سے آپ کو خاص دلچسپی ہے۔ اس کا بھی تقاضا یہی ہے کہ آپ کم از کم کاربراری بھر عربی سیکھ لیں۔ ہنسے اور کہا کہ اب میں کہاں تک پڑھوں گا میری طرف سے تم نے تو عربی پڑھ ہی لی ہے۔ پھر انھوں نے چند کتابوں کے نام پوچھ کر نوٹ کیے اور وقتاً فوقتاً نہ صرف پڑھتے رہے بلکہ صرف و نحو کے مختلف مسائل پر گفتگو بھی کرتے رہے اگرچہ یہ سلسلہ بہت دنوں تک نہیں چلا پھر بھی میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ بہت مختصر وقفے میں انھوں نے عربی میں بھی اتنی دسترس پیدا کر لی کہ کم از کم ان ارتے ان HOWLERS (سخت بھول چوک) کا صدور ناممکن ہو گیا جو عربی سے ناواقف طبقے کے سلسلے میں کبھی کبھی معرکے کے لطائف کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

موت نے انھیں ایک ایسے وقت میں چھین لیا کہ جب وہ ہر اعتبار سے اپنی شخصیت کے پورے سائز پر پہنچ چکے تھے اور اپنی زندگی کے سب سے زیادہ افادی عہد کو گزار رہے تھے۔ اپنی حیات کے دوران بھی وہ عظیم تھے اور اب تو بعد وفات عظیم تر دکھائی دیتے ہیں۔ زمانے کے ساتھ ساتھ ہر زخم مندمل

(بقیہ صفحہ ۱۳۲ پر)

ہوشمند انقلابی

احتشام حسین

• فرحت اللہ انصاری

آزادی کی صبح کاذب ہو چکی تھی۔ صبح صادق ہونے والی تھی۔ یعنی ۳۸ء کا زمانہ تھا۔ کانگریس نے ۳۵ء کے قانون کے تحت حکومتیں بنانا قبول کر لیا تھا جواہر لال جی اس ایکٹ کی انتہائی مخالفت کرنے کے بعد اکثریت کے فیصلے کے سامنے چپ تھے۔ یہ جمہوریت مزاجی ان کی خوبی بھی تھی اور خامی بھی مختصر یہ کہ اتر پردیش میں پنت جی کی وزارت قائم ہو گئی تھی۔

حسین انقلاب یہ آج کے نوجوانوں کے لیے جو آزادی میں پیدا ہوئے۔ آزادی میں پروان چڑھے اور جب سے آنکھ کھلی ہے کانگریس ہی کی حکومت دیکھتے آئے ہیں، کوئی بڑی بات نہیں ہوئی۔ وہ محسوس ہی نہیں کر سکتے کہ جب پہلی بار کانگریس حکومت بنی تھی تو اس وقت کے نوجوانوں کے کیا جذبات تھے۔ مگر ان کے لیے جو پنت جی پر پولیس کے ڈنڈے برستے دیکھ چکے تھے۔ اور رفیع احمد صاحب کو کبھی یہاں سے کبھی وہاں سے اور کبھی بالکل ہی انجان جگہ سے گرفتار ہوتے اور جیل جاتے دیکھ چکے تھے، کانگریس حکومت کا قیام بلاشبہ ایک حسین انقلاب تھا۔

پھر بھی بعض حلقوں میں یہ بحث جاری تھی کہ کانگریس نے برطانیہ کی چھتر چھایا میں حکومتیں بنا کر اچھا کیا یا برا کیا۔ اس سے کچھ ہی دن پہلے کانگریس کے باغی لیڈر سبھاش چندر بوس نے اسی لکھنؤ میں عوام کو بتایا تھا کہ حکومت برطانیہ اتنی کھوکھلی ہو چکی ہے کہ ہماری ہلکی سی چوٹ بھی نہیں برداشت کر سکتی ہمیں فوراً اٹھنا چاہیے اور اس کے ہاتھ مروڑ کر اپنی آزادی چھین لینا چاہیے۔

ہوشمند انقلابی اس باغیانہ تعلیم کے پس منظر میں کانگریس کی حکومت سازی ایک دلچسپ موضوع بن گئی تھی۔ پھر بھی جب پنت جی یا رفیع صاحب کی کار کانگریس حکومت کا جھنڈا لہراتی گزرتی تھی اور پولیس والے اسے دیکھتے تھے تو اٹینشن (ATTENTION) ہو جاتے تھے تو باغی، انقلابی سب ہی کے چہرے پر خوشی کی ایک بے اختیار لہر دوڑ جاتی تھی۔ ان ہی سنجیدہ، اور ہوشمند انقلابیوں میں احتشام بھی تھے۔

بارود خانہ کے محلے اور "ماموں سید صاحب" کے مکان میں انقلاب پسندوں کی بے راہ روی پر گرما گرم بحث ہو رہی تھی، اور جے پرکاش نرائن جی سے لے کر مقامی انقلابیوں تک ہر ایک پر مارکسزم اور لینن ازم کے تیر چلائے جا رہے تھے کہ ایک نوجوان نے حقیقت پسندی کو مارکسزم اور لینن ازم کا اصل جوہر قرار دیتے ہوئے ہندستان کے حالات اور روس کے زار کے حالات کا ایسا تقابل کیا اور کانگریس کے مقبول عام پلیٹ فارم سے سوشلزم کا پیغام بھی عوام تک پہنچانے کی کوشش کو اس خوبصورتی سے ایک نیک اقدام بنا کر پیش کیا کہ تھوڑی دیر کے لیے ساری محفل پر جوش کی جگہ ہوش آ گیا۔ ایسا لگا کہ جیسے سیاسیات کے ایک پروفیسر نے ذہین اور شوخ طالب علموں

کو اپنے پچھڑے ساکت اور مطمئن کر دیا۔ اس کے بعد سے جب تک یہ انکشاف نہیں ہوا کہ احتشام صاحب اردو کے لکچرر ہیں، میں انھیں سیاسیات ہی کا استاد سمجھتا رہا۔ اردو کا ایک ادیب اور فلسفہ، تاریخ، معاشیات، سیاسیات سے علوم پر اتنی گہری نظر احتشام صاحب کی وہ پہلی خوبی تھی جس نے مجھے ان کی طرف مائل کیا۔

خوبیوں کا مرقع

اس کے بعد جب بھی ملاقات ہوئی اور ملاقاتیں اکثر و بیشتر ہوئیں، کبھی حلقۂ ادب کے سلسلے میں، جس کے روح رواں سردار جعفری تھے، کبھی نیا ادب کے سلسلے میں جسے سبط حسن نے نکال تو کر دم لیا حالانکہ نہ رہنے کا ٹھکانا تھا، نہ کھانے کا ٹھکانا، بس کانگریس حکومت نے اتنی سرپرستی ضرور کر دی تھی کہ آزادی کی نظمیں خرید لی تھیں۔ کبھی بابائے اردو مولوی عبدالحق کی آمد کے سلسلے میں جو متشرع داڑھی کے باوجود بیٹے کر۔ قاضی عبدالغفار کے ساتھ ہی حیدر آباد میں رہنے کے زمانے سے بہت مانتے تھے۔ کبھی ترقی پسند ادیبوں کے سلسلے میں جو اس زمانے میں چڑھتا ہوا سورج تھے، جس کی پوجا سبھی کرتے تھے۔ چنانچہ اثر صاحب تک جو رفتار گفتار کردار ہر لحاظ سے خالص لکھنوی تھے، ان غیر لکھنوی بانکے ادیبوں کی قدر دانی فرماتے تھے۔ لکھنؤ کے دوسرے ممتاز شاعر ملا صاحب کا تو کہنا ہی کیا۔ وہ ہمیشہ سے بس نام کے ملا رہے ہیں۔ وضع قطع میں کٹر لکھنوی۔ اور عقیدہ و مسلک میں ترقی پسند۔ ان کی ہمگت نرائن روڈ کی لال کوٹھی پر جسے عام طور پر لوگ ان کا آبائی مکان سمجھے تھے، ترقی پسندوں کی اکثر نشست ہو جایا کرتی تھی۔ جس میں احتشام صاحب بڑی خوشی سے شریک ہوتے تھے اسلیے کہ ان کا گھر پاس ہی تھا۔

غرض جس موقع پر بھی احتشام صاحب سے ملاقات ہوئی چاہے کسی پروگرام کے تحت یا محض اتفاقاً راہ چلتے، ہر بار انکی ایک نئی خوبی سامنے آئی۔ یہاں تک کہ میری نظر میں وہ ان تمام خوبیوں کا مرقع بن گئے۔ جن میں سے کچھ علم و فضل، متانت و سنجیدگی، مروت و اخلاق اور رواداری و وسیع النظری سے تعبیر کی جا سکتی ہیں۔ ان سب سے بڑھ چڑھ کر احتشام حسین میں یہ خوبی تھی کہ وہ اختلاف رائے کو بڑے ٹھنڈے دل سے سن سکتے تھے۔ چنانچہ ترقی پسند ادب کے محقق و مفسر ہونے کے باوجود دوسرے مسلک کے ممتاز ادیبوں سے بھی ان کے اچھے تعلقات تھے جن میں غلام احمد فرقت مرحوم قابل ذکر ہیں۔ اس لیے کہ وہ ردِ ترقی پسندی میں خاص شہرت رکھتے تھے اور مصنف ملا واحدی۔ دوسرے بلند پایہ بالشان ادیب حیات اللہ انصاری ہیں جن سے احتشام صاحب کے برابر اچھے تعلقات رہے حالانکہ دوسرے ترقی پسند اُن سے کتراتے ہی رہے، بلکہ ان کو کچھ اس طرح دیکھتے رہے جیسے سیاست میں حزب مخالف کے لیڈر کو دیکھا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ احتشام صاحب کے مزاج میں عالمانہ ٹھہراؤ زیادہ تھا اور جذباتی ابال کم۔ اس لیے اختلاف کی بات بھی ان کی نظر میں غور و خوض کی چیز تھی، ناگواری و ناراضگی کی نہیں۔

احتشام صاحب عہد رندی و بیباکی کی پیداوار تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شراب و شعر کا الگ الگ تصور ہی نہیں کیا جاتا تھا۔ خصوصاً نوجوان اور ترقی پسندوں میں احتشام صاحب کو ترقی پسندوں کے حلقہ میں شروع ہی سے ممتاز حیثیت حاصل رہی۔ مگر نہ جانے کیوں شراب ان کے لیے اتنی ہی حرام سمجھی جاتی تھی جتنی حیات اللہ انصاری کے لیے۔ رقص و سرود کے معاملے میں بھی احتشام صاحب کو کوسوں دور پایا۔ کیسی کیسی مقتدر ہستیوں کو گانے کی محفل میں دیکھا، پینے کی محفل میں دیکھا۔ مگر نہیں دیکھا تو احتشام صاحب کو۔ اہم بات یہ نہیں ہے کہ وہ ایسی محفلوں میں ہوتے ہی نہیں تھے بلکہ یہ ہے کہ انھیں شرکا میں شمار ہی نہیں کیا جاتا تھا۔ ہر ایک کے تحت الشعور میں یہ سمایا ہوا تھا کہ احتشام صاحب کو ایسی محفل میں بلانا ان کے مرتبے کے خلاف ہے۔ ہم عصروں میں یہ عزت کسی کو شاذ ہی نصیب ہوتی ہے۔

مگر رقص و موسیقی سے اتنی بے تعلقی کے باوجود میرا خیال

دیپاکر بھیشوند ۱۸۹ اشک

ہے کہ اگر معارف النغمات تبصرہ کرنے کو دیدی جاتی تو احتشام صاحب کے قلم سے وہ دریائے معنی رواں ہوتے کہ راجہ نواب علی کی روح پھڑک اٹھتی۔ محکمۂ اطلاعات سے تعلق کی بنا پر احتشام صاحب کے پاس بارہا وقت و موضوع کے تعین کے ساتھ مضمون کی فرمائش لے کر جانا پڑا اور ہر مرتبہ مضمون کو دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ جیسے یہ ان کا اپنا موضوع تھا۔ یہ ہمہ گیری اور ہمہ جہتی احتشام صاحب کا طرۂ امتیاز تھا۔

احتشام صاحب افسانہ نگار بھی تھے، شاعر بھی، مضمون نویس بھی اور تنقید نگار بھی۔ مگر بنیادی طور پر وہ ایک بلند پایہ نقاد تھے۔ موجودہ نسل میں جو پچھلے تیس بتیس سال میں جوان ہوئی ہے اردو جاننے والا کوئی شخص اس وقت تک پڑھا لکھا نہیں مانا جا سکتا جب تک کہ وہ احتشام کو نہ جانتا ہو، بلکہ اس کی استعداد کا پیمانہ ہی یہ قرار پائے گا کہ وہ احتشام صاحب کو کتنا جانتا ہے۔

فنی اعتبار سے احتشام صاحب نقاد تھے اور اس پائے کے نقاد کہ فن تنقید ان پر ناز کرے گا۔ اگر حالی نے تنقید کی بنیاد رکھی ہے تو احتشام صاحب نے اس پر عمارت کھڑی کی ہے اور یہ عمارت جدید تنقید کے کسی بھی عالیشان محل کے سامنے حقیر نہیں ہے۔ جیسے مرثیہ انیس کے نام سے زندہ رہے گا اور انیس شبلی کے موازنہ سے تابان و درخشان رہیں گے، اسی طرح تنقید احتشام کے نام سے زندہ بھی رہے گی اور تابندہ بھی رہے گی۔ مگر ان تابندگیوں کا احاطہ کرنا آسان نہیں ہے۔ احتشام صاحب کی تنقید میں وہی متانت و سنجیدگی ہے جو ان کی شخصیت میں رچی بسی ہے۔ وہ نہ اپنی علمیت کا رعب ڈالتے ہیں، نہ عقیدہ کا غیظ و غضب یا چمک دمک دکھاتے ہیں۔ بس ساری بات استدلال کے میٹھے سروں میں کہتے جاتے ہیں اور پڑھنے والا اسے شربت کی طرح پیتا چلا جاتا ہے۔

احتشام صاحب کی موت

میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ سورج ڈوب گیا اور دنیائے اردو ادب پر ہمیشہ کے لیے اندھیرا چھا گیا۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ احتشام صاحب کی موت نے جو خلا پیدا کر دیا ہے وہ آسانی سے پُر نہیں ہو سکتا۔ جب ایک دم سے یہ خبر سنی تھی کہ احتشام صاحب نہیں رہے اور ایسے آدمی سے سنی تھی کہ ماننے کے سوا چارہ ہی نہیں تھا تو موت کی ناقدری اور بے شعوری پر وہ غصہ آیا کہ تھوڑی دیر کے لیے رنج و غم پیچھے رہ گئے تھے۔ اب کافی وقت گزر چکا ہے اور لکھنؤ میں احتشام صاحب کا بہت بڑا سوگ بھی منایا جا چکا ہے، پھر بھی دل و دماغ پر اتنا اثر ہے کہ احتشام صاحب پر مضمون لکھنے کے لیے طبیعت موزوں نہیں ہو رہی ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ لکھنا نہیں احتشام صاحب کا احسان اتارنے کی ایک ناکام کوشش ہے۔

احتشام صاحب۔ انسان و دانشور

(صفحہ ۱۴۳ کا بقیہ)

ہو جاتا ہے مگر وقت جیسے جیسے گزر رہا ہے احتشام صاحب کی یاد اور زیادہ بڑھتی جا رہی ہے جب بھی کوئی دقت اور مشکل درپیش ہوتی ہے اور وہ کب نہیں درپیش ہوتی ہے تو احتشام صاحب بے ساختہ یاد آتے ہیں۔ اب یہ اعتماد اور آسائش کہاں میسر ہے کہ ادب و تنقید، فلسفہ و سماجیات اور اسی طرح کے بہت سے علوم سے متعلق جب بھی کوئی دشواری درپیش ہوگی تو احتشام صاحب سے فوراً پوچھ لیا جائے گا۔ اردو ادب اور فن تنقید کو ان کی وفات سے جو رخنہ و صدمہ پہنچا ہے اس کی تلافی مدتوں نہیں ہو سکے گی۔ ان کے ایسے انسانِ دانش مند اور دیدہ ور کہاں پیدا ہوتے ہیں ان کی اچانک موت ایک ایسا سانحہ ہے جو میری ہی طرح نہ معلوم کتنے لوگوں کے لیے شخصی اور ذاتی حادثہ ہے۔ وہ جب بھی یاد آئیں گے دل میں ایک ہوک اٹھے گی اور محرومیوں کی یاد تازہ ہو جائے گی۔ ان کے لیے اگر آنسوؤں کے خزانے خالی بھی کر دیے جائیں جب بھی تسکین نہیں ہوگی۔

اشکے نماند باقی از فرط گریہ غالبؔ
سیلے رسید و گوئی از دیدہ شست ما را

★

ڈاکٹر نیر مسعود

اگر آپ لکھنؤ کے اخباروں میں مقامی خبروں کے کالم دیکھتے ہیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ادھر چند سال سے اس شہر میں ادبی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ ایک ایک دن میں کئی کئی جگہ مشاعرے کی محفلیں اور ادبی نشستیں ہوتی ہیں، لیکن ان سرگرمیوں کی اطلاعات کے ساتھ ساتھ یہ عام رائے بھی بار بار آپ کے سننے میں آتی ہوگی کہ لکھنؤ کا ادبی درجۂ حرارت صفر تک بلکہ اس سے بھی کچھ نیچے پہنچ گیا ہے، شہر میں ادب سے دل چسپی رکھنے والے لوگ وہی ہیں جو پہلے تھے، ادب کے نام پر اجتماع اس سے زیادہ ہوتے ہیں جتنے پہلے ہوتے تھے لیکن اس سب کے باوجود شہر کے ادبی افق پر بے کیفی کے بادل جو کئی سال سے چھائے ہوئے ہیں، کسی طرح چھٹنے میں نہیں آتے

شہر کی ادبی صورت حال میں یہ تبدیلی کس وقت سے آنا شروع ہوئی، آپ نہیں بتا سکتے اس لیے کہ اس قسم کی تبدیلیوں کی تاریخ متعین نہیں کی جا سکتی، زمانے کا تعین البتہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ چاہیں تو اس خصوص میں تاریخ کا خطِ فاصل بھی کھینچ سکتے ہیں، اس لیے کہ یہ تبدیلی اس وقت سے شروع ہوئی جب سے احتشام صاحب نے لکھنؤ کی سکونت ترک کرکے الہ آباد کا قیام اختیار کیا۔

لکھنؤ کی ادبی محفلیں اور احتشام صاحب لازم و ملزوم تھے کوئی ادبی محفل احتشام صاحب کے بغیر ادبی محفل نہیں لگتی اور احتشام صاحب کی شرکت ہر محفل کے وقار اور معیار کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی تھی۔ احتشام صاحب کے جانے کے بعد ان محفلوں کا سلسلہ کم نہیں ہوا بلکہ کچھ بڑھ گیا لیکن ان کی کیفیت ختم ہو گئی اور ان میں شرکت کے بعد یہ احساس ہونے لگا کہ احتشام صاحب کے الہ آباد جانے کے ساتھ ہی لکھنؤ کے روزِ سیاہ کا آغاز ہو چکا ہے:

کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

○

لکھنؤ اور الہ آباد میں بارہا احتشام صاحب سے ملنے ان کے گھر پر جانا ہوا۔ اطلاع کرانے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ باہر کے کمرے یا برآمدے میں آجاتے تھے۔ اب خیال کرتا ہوں تو ایک عجیب اتفاق کی طرف ذہن جاتا ہے جو ابھی تک صرف احتشام صاحب کی ذات سے مخصوص ہے۔ اور وہ اتفاق یہ ہے کہ مجھے ایسا کوئی موقع یاد نہیں آتا جب میں احتشام صاحب سے ملنے گیا ہوں اور ان سے ملاقات نہ ہو سکی ہو۔ شاید یہ اتفاق دوسروں کو بھی پیش آیا ہو اور شاید یہی سبب ہو کہ احتشام صاحب ہر وقت ہر ایک کو اپنی دسترس میں محسوس ہوتے تھے اور شاید اسی لیے کسی کا ذہن یہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ احتشام صاحب اب اس کی پہنچ سے باہر ہیں۔

احتشام صاحب کی وفات کے بعد سے ابھی تک میرا الہ آباد جانا نہیں ہو سکا ہے، مگر جب جاؤں گا تو ان کے مکان پر بھی جاؤں گا۔ جانتا ہوں کہ اطلاع کرانے پر وہ باہر نہیں آئیں گے، لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ جب مکان کے اندر سے قدموں کی کوئی آہٹ

باہر آتی سنائی دے گی تو یہی سمجھوں گا کہ احتشام صاحب آ رہے ہیں۔

○

الہ آباد میں احتشام صاحب زیادہ خوش نہیں تھے ان کی فطری بشاشت اگرچہ وہاں بھی برقرار رہی لیکن اسی کے ساتھ وہ کچھ پریشان پریشان سے بھی لگتے تھے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان کو ذہنی یکسوئی حاصل نہیں ہے، میرانیس صد سالہ تقریبات کے موقع پر لکھنؤ کی تقریبات کمیٹی کی طرف سے انیس پر مضامین کا جو مجموعہ شائع ہونے جا رہا ہے، اسکے لیے احتشام صاحب نے بھی مضمون دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن توقع اور معمول کے خلاف جب عرصے تک ان کا مضمون نہیں آیا تو والد صاحب کی طرف سے انھیں یاد دہانی کرائی گئی۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ ایک مہینے کے اندر مضمون تیار ہو جائے گا ایک مہینا گزر گیا مگر مضمون نہیں ملا۔ الہ آباد میں ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے مضمون کے لیے تقاضا کیا۔ انھوں نے کہا:

"کیا بتاؤں، کئی مرتبہ یہ ارادہ کر کے بیٹھا کہ مضمون لکھ کر اٹھوں گا لیکن کسی طرح قلم آگے نہیں بڑھا کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے لکھنے کی صلاحیت ہی ختم ہو گئی لمبے لمبے مضمون ایک نشست میں قلم برداشتہ لکھ دیا کرتا تھا اب دیر دیر تک سوچنا پڑتا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔ دیکھو شاید کچھ دن میں یہ کیفیت ختم ہو تو سب سے پہلے یہی مضمون لکھنا شروع کروں گا۔"

اس کے بعد اس مضمون کے قریب ختم ہونے کی اطلاع بھی ملی تھی لیکن غالباً وہ مکمل نہیں ہو سکا۔ دراصل احتشام صاحب نے اپنے لیے بہت سے تصنیفی کام تجویز کر رکھے تھے (جن میں فن تنقید پر ایک مستقل کتاب بھی تھی) ان کا ارادہ تھا کہ الہ آباد یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد لکھنؤ آ جائیں گے جہاں انھوں نے ایک مکان خرید لیا تھا اور وہاں جم کر تصنیف و تالیف میں لگ جائیں گے:

کس کو سناؤں حسرت اظہار کا گلہ
دل فرد جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

○

لکھنؤ میں اپنا ذاتی مکان ہو جانے سے احتشام صاحب کی ایک بڑی خلش رفع ہو گئی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں تقرر ہو جانے کے بعد کچھ عرصے تک ان کا قیام والد صاحب کے ساتھ رہا۔ (جو اس زمانے میں ان کے شعبے کے صدر تھے) اس کے بعد انھوں نے الگ رہنا شروع کیا۔ بارود خانے والے کرایے کے مکان میں وہ ایک زمانے تک سکون سے رہے لیکن اس کے بعد مالک مکان کو خود اس مکان کی ضرورت لاحق ہو گئی، یہ احتشام صاحب کے لیے بڑی پریشان کن صورتِ حال تھی۔ میں اس زمانے میں دیوان غالب کا ایک عمدہ جیبی ایڈیشن شائع کرنا چاہ رہا تھا اور احتشام صاحب نے اس کا پیش نامہ لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں مقررہ تاریخ پر ان کے گھر گیا تو پیش نامہ تیار نہیں تھا[1] اس ملاقات میں احتشام صاحب نے معذرت کے طور پر اس تازہ خلجان کا ذکر کیا تھا کہ اگرچہ مالک مکان نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ مکان کے تخلیے کی بہت جلدی نہیں ہے۔ آپ اطمینان کے ساتھ دوسرا مکان تلاش کیجیے، لیکن احتشام صاحب کی فطری مروّت کے لیے یہی بہت بڑا بار تھا۔ انھوں نے یہ حالات بتاتے ہوئے کہا تھا: "مستقل یہ احساس رہتا ہے کہ ایک شخص کی مرضی کے خلاف اس کے مکان میں رہ رہا ہوں۔

○

[1] کچھ دن بعد احتشام صاحب نے "روزنِ در" کے خوبصورت نام سے ایک بہت خوبصورت پیش نامہ لکھ کر خود اپنے آدمی کے ہاتھ بھجوا دیا تھا جو دیوان غالب کے ساتھ چھپ گیا ہے۔ (نیّر)

احتشام صاحب کا نام آتے ہی مروّت کا لفظ مجسّم ہو کر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اکثر اس مروّت کی وجہ سے احتشام صاحب کو خاصی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا ایک بار میں ان سے ملنے گیا تو دیکھا ایک ضخیم رجسٹر نما چیز سامنے رکھے بیٹھے ہیں اور کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھ رہے ہیں۔ معلوم ہوا ایک بزرگ قسم کے طالب علم کا پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ ہے جس کا موضوع دو شاعروں کا تقابلی مطالعہ ہے، اور احتشام صاحب اس مقالے کے ممتحن مقرر ہوئے ہیں کہنے لگے: "سخت پریشان ہوں کہ اس تھیسس پر رپورٹ کیا لکھی جائے۔ ان حضرت نے کچھ کیا ہی نہیں ہے۔" میں نے کہا کہ تھیسس کی ضخامت تو خاصی ہے۔ انھوں نے کہا:

"ہاں، مگر انھوں نے تقابلی مطالعے کا انداز یہ رکھا ہے کہ پہلے ایک شاعر کے یہاں سے مثلاً صبح کے منظر کی طویل مثال دیں گے اور آخر میں لکھیں گے "سبحان اللہ!" پھر دوسرے شاعر کے یہاں سے بھی صبح کے منظر کی اتنی ہی طویل مثال مہیّا کر کے لکھیں گے۔ "اس کا بھی جواب نہیں"۔ ایک شاعر کے لیے لکھیں گے۔ "جنگ کا بیان ملاحظہ ہو"۔ اور کئی صفحوں کا اقتباس دینے کے بعد تبصرہ کریں گے"۔ واہ واہ! تعریف نہیں ہو سکتی"۔ اس کے بعد دوسرے شاعر کے لیے لکھیں گے "اب دیکھیے وہ کس طرح جنگ کا بیان کرتا ہے"۔ اور پھر اتنا ہی لمبا اقتباس دے کر آخر میں رائے دیں گے "کیا کہنے ہیں!" غرض ان کی اپنی کاوشوں کو یکجا کیا جائے تو پورے تھیسس میں "واہ واہ"، "سبحان اللہ!" "جواب نہیں"، "ذرا صبح کا منظر ملاحظہ ہو" "ذرا رات کا منظر دیکھیے" کے سوا کچھ نہ نکلے گا۔"

لیکن احتشام صاحب کی مروّت کو گوارا نہیں تھا کہ اس تنقیدی و تحقیقی شاہکار کو بہ یک جنبش قلم مسترد کر دیا جائے۔ اس لیے کہ طالب علم نے مشکل حالات میں مقالہ لکھا تھا اور طالب علم کے نگراں صاحب احتشام صاحب سے اس کی منظوری کی سفارش کر چکے تھے۔ لہٰذا اس مقالے کو یکسر نامنظور کرنے کے بجائے انھوں نے رائے دی کہ اس پر نظر ثانی کر لی جائے اور طالب علم اپنے خیالات کے اظہار میں کچھ وسعت اور تنوع سے کام لے۔ اس پر بھی نگراں صاحب کو احتشام صاحب سے شکایت ہو گئی تھی۔

اسی مروّت کے سلسلے میں ایک یونیورسٹی کے لکچرر صاحب نے بتایا کہ ایک بار احتشام صاحب ان کی یونیورسٹی کی کسی میٹنگ میں آئے۔ لکچرر صاحب نے میٹنگ کے بعد انھیں اپنے یہاں سرپہر کی چائے پر مدعو کیا لیکن ایک دوسرے لکچرر صاحب بضد ہو گئے کہ وہ احتشام صاحب کو چائے پلائیں گے اور سخت اصرار کر کے انھیں اپنے ساتھ رکشے پر بٹھا کر لے گئے۔ اور دعوت کا انجام یوں ہوا کہ ان صاحب نے سرِ راہ پھونس کی چھت والے ایک ریسٹوراں کے سامنے رکشا رکوایا، کچھ دیر بعد دیکھا گیا کہ احتشام صاحب سڑک کے کنارے رکشے پر بیٹھے ہیں، ایک ہاتھ میں چائے کا کلھڑ، دوسرے میں جلیبی کا دونا ہے، نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لکچرر صاحب سے باتیں کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں "بڑی زحمت کی آپ نے!"

ایک بار میں نے بھی احتشام کی مروّت کا فائدہ اٹھانا چاہا تھا مگر ناکام رہا۔ احتشام صاحب کے پاس نئی کتابیں کثرت سے آتی تھیں جن میں سے اکثر کتابیں لوگ ان سے مانگ لے جاتے تھے اور واپس نہیں کرتے تھے۔ جب عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" شائع ہوا تو مجھے اس کی تلاش ہوئی۔ کہیں نہ ملا تو احتشام صاحب کا خیال آیا۔ ان سے دریافت کیا۔ معلوم ہوا ناول ان کے پاس آچکا ہے اور وہ اسے پڑھ بھی چکے ہیں۔ پھر انھوں نے خود ہی کہا کہ اگر پڑھنا چاہو تو لے جاؤ۔ چنانچہ میں ناول لے آیا اور کئی سال تک اسے اپنے پاس رکھے رہا۔ اس پر احتشام صاحب کے دستخط بھی تھے اس لیے میرا ارادہ اسے واپس کرنے کا قطعی نہیں تھا۔ کئی سال بعد ایک اور صاحب نے احتشام صاحب کی طرف سے اس کی واپسی کا تقاضا شروع کیا۔ کئی تقاضوں کے بعد آخر ایک بار جب

احتشام صاحب الہ آباد سے لکھنؤ آئے تو میں نے ناول ان کو واپس کر دیا۔ میں نے اس کی جلد کی خاصی آرائش بھی کر رکھی تھی۔ اسے دیکھ کر احتشام صاحب نے کہا: "واہ واہ تم نے تو اسے خوب سجا دیا ہے۔" اس کے بعد انھوں نے بتایا کہ مجھ سے تقاضا کرنے والے صاحب ہی احتشام صاحب سے بھی تقاضا کر رہے تھے اور ناول کی ضرورت دراصل انھیں صاحب کو تھی۔ مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ پہلے سے معلوم ہوتا تو ہرگز واپس نہ کرتا، لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

O

علمی اور ادبی موضوعات پر تو احتشام صاحب کی گفتگو سننے کے قابل ہوتی ہی تھی، ان کی عام گفتگو بھی نہایت دلچسپ ہوتی تھی۔ ایک بار "ادبستان" کی ایک صحبت میں برمحل اور بے محل اشعار پڑھنے کا تذکرہ چھڑ گیا۔ شوکت تھانوی کا ذکر آیا جنھوں نے اپنے والد کے نام ایک خط میں کچھ درخواستیں پیش کرنے کے بعد یہ شعر لکھا تھا:

مانو نہ مانو جان جہاں اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

مختلف لوگوں نے اس قسم کے دلچسپ واقعات سنائے۔ احتشام صاحب نے ایک صاحب کا قصہ سنایا جن کے ایک نوکر سے کام کے سلسلے میں کوئی کوتاہی ہو گئی تھی۔ ان کی باز پرس پر نوکر نے عذر کیا کہ حضور رات کو بالکل یاد نہیں رہا۔ اس پر ان صاحب نے بہت جھلا کر کہا:

"جی ہاں، جی ہاں!
رات کی بات الہٰی توبہ
آپ سنیئے گا تو شرمایئے گا"

خصوصاً جب احتشام صاحب کوئی انوکھا واقعہ بیان کرتے تو سننے والے کی پوری توجہ کو جذب کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ ٹیلی پیتھی کا ذکر نکل آیا۔ احتشام صاحب نے اپنے عزیزوں میں ایک صاحب کا واقعہ بیان کیا جو کسی مغربی ملک میں رہنے لگے تھے۔ ایک بار ان کے پاس بہت دن تک وطن سے کوئی خط نہیں آیا۔ اور وہ اپنے گھر والوں کی خیریت نہ معلوم ہونے کی وجہ سے پریشان تھے۔ ایک دن اسی فکرمندی کے عالم میں وہ ایک پارک کے کٹہرے کے پاس خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر ایک عورت کھڑی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے آگے قریب آ کر پوچھا کہ کیا اپنے گھر والوں کی خیریت نہ ملنے سے پریشان ہو؟ ان صاحب کو حیرت ہوئی تو عورت نے کہا کہ میں ٹیلی پیتھ ہوں اور دوسروں کے خیالات پڑھ سکتی ہوں، بلکہ ان لوگوں کو دیکھ بھی سکتی ہوں جو میری نظر سے دور ہیں۔ اگر تم بہت زیادہ پریشان ہو تو میں یہیں سے تمھارے گھر کا حال دیکھ کر بتا سکتی ہوں۔ وہ صاحب اس پر خوشی سے راضی ہو گئے۔ عورت نے اپنی ٹیلی پیتھی کو کام میں لا کر ایک مکان کا نقشہ بیان کرنا شروع کیا اور ان کے اپنے گھر کے نقشے کے عین مطابق تھا۔ پھر اس نے بتایا کہ اس مکان میں فلاں جگہ پر ایک اس عمر کی خاتون ایسا ایسا لباس پہنے بیٹھی ہیں۔ ان کے سامنے زرد پیلے رنگ کا ایک صندوقچہ سا رکھا ہے۔ اس صندوقچے میں کسی چیز کے سبز پتے ہیں۔ ان خاتون کے ہاتھ میں ایک اوزار ہے جس سے وہ لکڑی کے گول گول ٹکڑوں کو کاٹ رہی ہیں۔ ان کے قریب ہی ایسی ایسی صورت شکل کی ایک لڑکی بھی بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ حلیے ان صاحب کی والدہ اور ہمشیرہ کے تھے۔ ان حلیوں اور خصوصاً پاندان کے بیان سے ان کو اس عورت کے فن پر ایمان لانا پڑا۔ اس کے بعد اس نے بتایا کہ اب ایک اور عورت اس مکان میں داخل ہوئی ہے۔ اور خاتون کے پاس آ کر بیٹھی ہے۔ خاتون نے اپنے سامنے والے صندوقچے کے کچھ پتوں پر سفید اور کتھئی رنگ کے لیپ سے لگا کر ان پر اپنے کاٹے ہوئے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چھڑک کر اس عورت کو دیے اور (اس نے حیرت کے ساتھ بتایا) اس عورت نے وہ پتے اپنے منھ میں رکھ لیے ہیں اور اب دونوں باتیں کر رہی ہیں۔ لڑکی اچانک شرما گئی ہے اور وہاں سے اٹھ کر اندر ایک کمرے میں چلی گئی ہے۔ اس طرح ٹیلی پیتھی کی وہ ماہر دیر تک ان صاحب کو ان کے گھر کی سیر

گراں رہی۔ انھوں نے اس ملاقات کی تاریخ کو یاد رکھا۔ کچھ دن بعد گھر سے خط آیا تو معلوم ہوا کہ ٹھیک اسی تاریخ کو فلاں عورت ان کی بہن کی نسبت لے کر آئی تھی۔

احتشام صاحب نے یہ واقعہ اتنے دلکش پیرایے میں بیان کیا تھا کہ میں مسحور سا ہو کر رہ گیا تھا۔

○

یہ ممکن نہیں تھا کہ احتشام صاحب سے دیر تک باتیں ہوں اور کسی نہ کسی شکل میں غالب کا نام درمیان میں نہ آئے۔ غالب کی اس خصوصیت کی طرف مجھے سب سے پہلے احتشام صاحب ہی نے متوجہ کیا تھا کہ دیوان غالب جب بھی پڑھو کوئی نہ کوئی شعر ایسا ضرور نکل آتا ہے جسے دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ یہ شعر پہلی مرتبہ نظر کے سامنے آیا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ اتنا خوبصورت شعر متداول دیوان میں موجود تھا لیکن اس سے پہلے کبھی اس کی طرف توجہ نہیں ہوئی تھی۔ اسی سلسلے میں انھوں نے اپنا ایک تجربہ بیان کیا کہ جب وہ امریکہ میں تھے تو اکثر انھیں یہ خیال پریشان کرتا تھا کہ اس طول طویل سفر کا حاصل کیا ہے۔ اسی زمانے میں ایک بار انھوں نے دیوانِ غالب کھولا تو گویا پہلی دفعہ اس شعر پر نظر پڑی:

دل مت گنوا، خبر نہ سہی، سیر ہی سہی
اے بے دماغ، آئینہ تمثال دار ہے

اس وقت احتشام صاحب کے سامنے [illegible] نے کچھ نہیں کہا لیکن اپنی جگہ پر مجھے یقین تھا کہ ان کا [illegible] دھوکا دے رہا ہے۔ یہ شعر غالب کے متداول دیوان کا نہیں ہے۔ لیکن جب گھر آکر دیوانِ غالب دیکھا تو شعر اس میں موجود تھا اور وہ بھی اس غزل میں جو اپنے داخلی آہنگ کی وجہ سے مجھے بہت پسند اور بخیالِ خود پوری یاد تھی:

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے — نافہ دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے
کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا — آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے
ہے ذرہ ذرہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق — گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

احتشام صاحب نے اپنے سفرنامے میں بھی یہ شعر دیا ہے لیکن اس کا پس منظر نہیں بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے اس کا موقع بھی نہیں تھا۔ سفرنامے کی عبارت یہ ہے:

"یہاں کا زمانۂ قیام ختم کے قریب ہے، لیکن اب بھی کبھی جب دل سوال کرتا ہے کہ یہاں آنے سے کیا فائدہ ہوا اور جب سود و زیاں کا یہ جھگڑا نہیں چکتا تو غالب کا ایک شعر تسکین کے لیے آجاتا ہے: ؎

دل مت گنوا، خبر نہ سہی، سیر ہی سہی
اے بے دماغ، آئینہ تمثال دار ہے"

یہ سفرنامہ "ساحل اور سمندر" (جسے احتشام صاحب کی بہترین کتابوں میں شمار کیا جانا چاہیے) میرے سامنے ہے۔ اس میں غالب کے کئی شعر اور ان کے حوالے اس قدر برمحل ملتے ہیں کہ ان سے ایک طرف غالب کے کلام کی حیرت خیز معنویت اور دوسری طرف احتشام صاحب کی زبردست غالب فہمی کا اظہار ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز میں آلپس کے سلسلۂ کوہ پر سے گزرنے کا بیان یوں ہوا ہے:

"آلپس پر برف سفید رنگ کے پاؤڈر کی طرح بچھی ہوئی ہے۔ اس کی چوٹیوں کے نشیب و فراز دیکھ کر غالب کے "جوہرِ تیغِ کہسار" کی یاد آتی ہے۔"

مدراس میں تھیاسوفی کے مرکز اڈیار کی سیر کی حال میں لکھتے ہیں:

"اس بڑے احاطے اور چمن زار میں مسجد، مندر، گرجا، بیکل، پگوڈا، آتش خانے، سبھی ہیں۔ ایک بہت بڑا برگد کا درخت گوتم بدھ کے نروان حاصل کرنے کی یاد دلا رہا ہے۔ غالب کا شعر بار بار یاد آرہا تھا:

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں"

اس سفر کے شروع میں احتشام صاحب کا پیچش کا پرانا مرض عود کر آیا تھا۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں،

"پیچش کا سلسلہ آج بھی رہا مگر تکلیف میں کمی ہے۔

وقت گزاری کے لیے اسکرین بمبئی کا تازہ پرچہ دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ فلم اسٹار ثریا کو نجیبش ہو رہی ہے۔ غالب کا شعر یاد آ گیا:

کم نہیں نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا"

احتشام صاحب کی وفات کئی حیثیتوں سے غیر متوقع تھی۔ ان کی صحت بہت اچھی تو نہیں تھی لیکن قلبی تکلیف کا کسی کو گمان بھی نہ تھا۔ اسی لیے ان کے انتقال کی خبر کے ساتھ ساتھ یہ اطلاع بھی توقع کے خلاف تھی کہ ان کی موت کا سبب دل کا دورہ تھا۔ سب کو حیرت تھی کہ احتشام صاحب کو دل کی تکلیف! حالانکہ دل کی تکلیف احتشام صاحب کو نہ ہوتی تو اور کس کو ہوتی۔ بہر حال اسی سفرنامے میں ۷ اپریل ۱۹۵۳ء کو احتشام صاحب نے لکھا تھا:

"کل سے طبیعت سست سی ہے۔ بیمار ہونے کا احساس ہے۔ نہ جانے کیوں بار بار خیال دل کی طرف جاتا ہے۔ دل کی بیماری، شاعرانہ مفہوم میں نہیں، واقعی۔"

اور اسی سفرنامے کے شروع میں یہ عبارت نظر آتی ہے:

"میں اپنے متعلقین سے اور وہ سب مجھ سے بہت زیادہ وابستہ ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں نہ رہوں تو شاید ان لوگوں کو تکلیف ہو۔"

یہ ایک بے غرض اور مہربان انسان کا اندیشہ تھا جو حقیقت بن چکا ہے۔

★

"یہ درست ہے کہ رونے سے یا اظہارِ غم کرنے سے نقصان کی تلافی نہیں ہوتی۔ لیکن احساس کی لطافت اور شدت انسانی رشتوں کی نزاکت اور طاقت، سماجی روابط کی اہمیت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔"
—— احتشام حسین

نجم الدین نقوی

پروفیسر سید احتشام حسین جنھیں ان کے دوست اور عقیدت مند محبت سے احتشام صاحب کہتے تھے، ہم سے جُدا ہو گئے۔ غالب نے کہا تھا ؎

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

لیکن احتشام صاحب کی موت ایک ایسا سخت واقعہ ہے جس کی تاب لائے نہیں بنتی اور جانِ عزیز جیسی شے بھی بے مزہ ہو کر رہ گئی ہے۔ تعزیتوں کا ایک سلسلہ ہے جو چلا آ رہا ہے۔ کچھ دنوں بعد یہ سلسلہ کاغذ پر تو ختم ہو جائے گا لیکن آنکھوں سے داغ کھلتے رہیں گے اور دوستوں کے ہاتھ نرگس کے دستے بنتے رہیں گے۔ مرنے والے کی ذات میں کچھ ایسی کشش تھی جس نے ہم سب کو ان کا گرویدہ بنا لیا تھا اور وہ گرویدگی آج بھی باقی اور قائم ہے۔

عالم، نقاد، انشا پرداز اور دانش ور تو آج بھی بہت سے ہیں اور آئندہ بھی پیدا ہوتے رہیں گے لیکن ان صفات کے ساتھ ساتھ شرافت کا مجسمہ، حلم کا پتلا اور خلوص کا پیکر بہت دنوں میں دریافت ہو سکے گا۔ تاریخ اپنے کو دہراتی ہے مگر کم اور بہت دیر میں۔ میر تقی میر نے جن کا انتقال ۱۸۱۰ء میں ہوا، کہا تھا ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

احتشام صاحب مرحوم بھی انھیں مغتنمات روزگار میں تھے۔ علم جس کے بہت سے محاسن بتلائے گئے ہیں، کبھی کبھی کچھ برائیاں بھی ساتھ لاتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ نمرود اور انا کے سائے بھی اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ حلم اور انکسار رخصت ہو جاتا ہے۔ بات بات پر اور خواہ مخواہ "میں" کی کارفرمائی دیکھنے میں آتی ہے۔ مگر احتشام صاحب علم کا ایک ایسا پیکر تھے جن میں غرور کی بُو بھی نہ تھی۔ وہ بات کرتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سمندر کی طرح گہرے ہیں، لیکن اسی کی طرح ساکن بھی۔ چھوٹی موٹی ندیوں کی طرح نہ تو وہ ابلتے تھے اور نہ بہنے لگتے تھے۔ سنجیدگی کا جو ٹھہراؤ اور علم کا جو وقار ہیں نے احتشام صاحب میں پایا وہ بہت کم عالموں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

انھوں نے اب سے چالیس برس پہلے جب اُن کی عمر مشکل سے بیس سال رہی ہوگی، اپنی زندگی کا ایک نصب العین بنایا تھا اور وہ تھا حصولِ علم اور اُس کی ترویج۔ جلبِ منفعت ان کی زندگی میں ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ اب سے چالیس سال پہلے افق میں علم و دانش کی پری کا جو چہرہ انھوں نے دیکھا تھا، زندگی بھر اُس کے شیدائی رہے اور علمی ارتقا کے منازل طے کرتے رہے۔ پلٹ کر دیکھنا اُن کے مسلک سے خارج تھا۔ چاہے وہ اپنے خطوں میں اور اپنی گفتگو میں تھکن کا اظہار کرتے رہے ہوں لیکن عملاً ان کی زندگی میں اس کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ زندگی کو امروز فردا کے پیمانے سے ناپنے کے قائل نہ تھے۔ وہ اسے جاودانہ اور ہر دم جواں سمجھتے تھے۔ [illegible] کی راہ میں کوئی ایسی منزل نہ آئی جہاں وہ مطمئن اور قانع ہو کر بیٹھ جاتے۔ وہ منزلوں کو سنگِ میل سے زیادہ حیثیت نہ دیتے تھے

اور غالب کے اس شعر کے پورے پورے مصداق تھے ؎

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

اور ہر بڑے عالم کی طرح ان کی رفتار سے بھی یہ بیاباں بھاگتا ہی رہا اور منزل انھیں کبھی نہ ملی۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ایک عالم کے لیے منزل کبھی آتی بھی نہیں۔

وہ ساری زندگی لکھتے رہے، تقریریں کرتے رہے، ان کی کتابوں کی تعداد کثیر ہے، ان کے مقالے بے شمار ہیں جن میں سے کچھ شائع ہو چکے ہیں اور بہت کچھ ابھی شائع ہونا ہیں۔ ان مقالوں اور کتابوں کے علاوہ میں سمجھتا ہوں کہ احتشام صاحب نے ہزاروں خطوط بھی لکھے ہوں گے جن میں ادبی اور سیاسی مسائل پر گفتگو کی ہوگی۔ ایسے خطوط بھی ہوں گے جن کی حیثیت نجی ہوگی اور جن کے متعلق ہر نارمل انسان کی طرح انھوں نے بھی یہ سمجھا ہوگا کہ شاید یہ اشاعت پذیر نہ ہوں، وہ ان خطوط کو غالب کی طرح "بے رنگ من است" سمجھتے رہے ہوں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ نجی خطوط ہی کسی شخصیت کی صحیح عکاسی کرتے ہیں اس لیے کہ وہ بے تکلفی اور خلوص کے عالم میں لکھے جاتے ہیں۔

غالب کو جب ان کے اردو خطوط کی اشاعت کی طرف متوجہ کیا گیا تو انھوں نے ابتداً اپنے دوستوں کی یہ درخواست قابل اعتنا نہ سمجھی۔ لیکن بعد میں جب ان کی اہمیت کا احساس ہوا تو لوگوں نے اصرار کر کر کے یہ خطوط منگائے جن کی اشاعت سے غالب کی شخصیت اور ان کی ادبی اہمیت متعین ہونے میں بے حد مدد ملی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر احتشام صاحب کے خطوط جو انھوں نے اپنے بزرگوں، عزیزوں، دوستوں اور نیازمندوں کو لکھے ہیں، جمع کر کے شائع کر دیے جائیں تو مشاہیر کے خطوط میں ایک گرانقدر ادبی اضافہ ہوگا اور مرحوم کی شخصیت اور ان کی عظمت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

اس مختصر سی تقریب کے ساتھ میں نیا دور کے قارئین کے لیے احتشام صاحب کے کچھ خطوط کے اقتباسات پیش کرتا ہوں جو انھوں نے امریکہ اور لندن سے مجھے بھیجے تھے اور جنھیں میں نے حرزِ جاں بنا کر رکھا ہے۔ واشنگٹن سے بھیجا ہوا خط تمام و کمال نقل کر رہا ہوں اور لندن کے خطوط کے اقتباسات درج کرتا ہوں:

واشنگٹن ۱۴ر اکتوبر ۱۹۵۲ء

"شاید آپ اس درمیان میں لکھنؤ آئے ہوں اور میرے سفر کا حال کسی سے معلوم ہو گیا ہو۔ مختصر یہ ہے کہ جب میں ۲۹ر اگست کو دہلی پہنچا تو معلوم ہوا کہ جہاز جانے کے بجائے نو کو جائے گا اور جب مدراس پہنچا تو خبر ملی کہ نو ستمبر کے بجائے بارہ کو جائے گا۔ وہیں یہ طے ہوا کہ اب میں ہوائی جہاز سے سیدھے نیویارک چلا جاؤں۔ چنانچہ دس ستمبر کو بمبئی پہنچا اور بارہ کی رات کو وہاں سے روانہ ہو گیا، چودہ کی صبح کو نیویارک میں نازل ہو گیا۔ سفر میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ تھوڑی تھکن ضرور ہوئی کیونکہ ایک دن اور دو راتوں میں آٹھ ہزار میل پرواز کرنا پڑا۔ نیویارک میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا دیا گیا جس کا محض کرایہ ساڑھے پانچ ڈالر روزانہ تھا۔ ایک ہفتہ کے بعد وائی ایم سی اے میں چلا گیا۔ وہاں بہت آرام تو نہ تھا لیکن اتنی گرانی نہ تھی۔ یکم اکتوبر تک نیویارک میں رہا پھر پرنسٹن یونیورسٹی گیا، وہاں سے فلاڈلفیا یعنی پن سل وینیا یونیورسٹی میں لوگوں سے ملا اور ۱۱ر اکتوبر کو امریکہ کے دارالسلطنت واشنگٹن میں آ گیا۔ یہاں دس بارہ دن قیام کر کے نیویارک واپس جاؤں گا پھر ذرا باقاعدہ پروگرام بنے گا — یہ ہے اب تک کی مختصر روداد۔

اپنے تاثرات کیا لکھوں! جو آپ لوگ سمجھتے ہوں گے اس کے برعکس ہیں، جو تعصبات لے کر آیا ہوں ممکن ہے کچھ ان کا بھی عمل ہو رہا ہو۔ مجھے نیویارک بالکل ہی پسند نہیں آیا۔ پرنسٹن خاموش جگہ تھی۔ فلاڈلفیا میں ایک عالم پروفیسر مل گئے اس لیے جی لگ گیا۔ واشنگٹن دیکھنے کے قابل جگہ ہے۔ کل سے گھوم رہا ہوں۔ ابھی چند ہی چیزیں دیکھی ہیں۔ یہاں کے چپہ چپہ پر امریکہ کی جنگ آزادی اور ترقی کی تاریخ رقم ہے۔ اسے دیکھ کر واقعی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں کی لائبریری دنیا

کی سب سے بڑی لائبریری کہی جاتی ہے۔ اس میں رسائل اور اخبارات وغیرہ کے علاوہ ۸۶ ہزار مطبوعہ نسخے ہیں۔ قلمی کتابیں مختلف زبانوں کی ایک کروڑ دس لاکھ سے اوپر ہیں۔ خود عمارت، تصاویر، مجسمے، تاریخی نوادر دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں کئی میوزیم ہیں اور متعدد تاریخی مقامات۔ خیال ہے کہ اس وقت تو یونہی دیکھ لوں گا، مارچ یا اپریل میں پھر آؤں گا تو تین چار ہفتہ رہ کر لائبریری سے کچھ فائدہ اٹھاؤں گا۔

میرے کام کی نوعیت وہاں جتنی غیر واضح تھی کم و بیش اب بھی ویسی ہی ہے۔ لوگوں سے مل رہا ہوں شاید کچھ کام کی باتیں نکلیں اور اس کی بنیاد پر کچھ کام ہو جائے۔ میرا جی یہاں لگ نہیں رہا ہے اور کسی کسی وقت تو خیال ہوتا ہے کہ قفس کے گوشہ ہی میں بہت آرام تھا۔ یہ سب بیہودگیاں میرے بس کی نہیں ہیں۔ اگر کسی ایک جگہ رہ کر کسی ایک موضوع پر کام کرنا ہوتا تو شاید آسانی بھی ہوتی اور جی بھی لگتا کہ اس طرح ایک کام کر رہا ہوں۔ ابھی تو یہاں لوگوں سے ملنا ہی جاری ہے۔ آپ مجھے جانتے ہیں میں کم آمیز اور تقریباً (UNSOCIAL) قسم کا آدمی ہوں بس جن لوگوں سے تعلقات ہیں ان سے ہیں۔ ہر شخص سے ملنا، ریاکارانہ طور پر خوشی کا اظہار کرنا، الٹی سیدھی باتیں کرنا، احتیاط مدنظر رکھنا اور اجنبی کی طرح مارے مارے پھرنا بہت سے لوگوں کے لیے لطف کا سبب ہو سکتا ہے میرے لیے نہیں ہے۔ اگر میں نے پہلے سے ان باتوں کو سمجھا ہوتا تو اتنی مدت کے لیے نہ آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب یہ دیکھتا ہوں کہ نہ کوئی ڈگری ملنا ہے اور نہ کوئی کام کی کتاب تیار کرنا ہے اور نہ مستقبل میں اس کی وجہ سے فائدہ ہے تو اور الجھن ہوتی ہے۔ مگر خیر اب آ گیا ہوں تو سال گزارنا ہی ہے۔ درمیان میں چلے آنے میں بھی تو خرابیاں ہیں۔ میں یہ سب کچھ کسی خاص موڈ میں نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ واقعی یہ خیال ہوتا ہے کہ کوئی اہم کام نہیں کر رہا ہوں۔

ویسے لکھنؤ ہی میں کون سا اہم کام کرتا تھا مگر پھر بھی کام کی اسکیم تو بنتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی کچھ لوگوں سے مل کر اور باتیں کر کے تھوڑا سا اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے اور بس۔ اس کے بعد پھر وہی تنہائی اور اجنبیت کا احساس۔ آج ہندستان کے سفارت خانے گیا تھا۔ شعبۂ تعلیم کے انچارج پروفیسر سندرم ہیں جو پانچ چھ سال پہلے آگرہ کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ تھوڑی دیر باتیں ہوئیں۔ آدمی تیز اور ہوشیار معلوم ہوتے ہیں۔

اور کیا لکھوں! یہاں کے صدر کے انتخاب کا حال؟ اخبارات بھرے ہوتے ہیں۔ مجھے تو خطرہ ہے کہ شاید آئزن ہاور ہی ہو جائے۔ یہاں سنڈے ایڈیشن تقریباً ڈھائی سو صفحوں کا ہوتا ہے۔ قیمت بیس سنٹ یعنی تقریباً ایک روپیہ۔ ہزاروں اخبار رسالے نکلتے ہیں۔ کام کی باتیں کم ہوتی ہیں۔ لوگوں کی نظر میں وسعت اور گہرائی نہیں ہے مگر اچھی حالت میں ہیں۔ یہی کیا کم ہے۔ نہ جانے کتنی یونی ورسٹیاں ہیں اور کس کس قسم کی۔ بعض میں چالیس ہزار طلبا اور ساڑھے چار ہزار اساتذہ ہیں۔ شعبوں کی انتہا نہیں۔ پڑھائی بھی اچھی ہوتی ہے۔ اسکول وغیرہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اور کیا لکھوں! کھانے پینے کا حساب بھی ٹھیک سے بیٹھ نہیں رہا ہے۔ گرانی کافی ہے، ویسے چیزیں سستی بھی مل جاتی ہیں مگر ارزاں بہ علت والا معاملہ ہے۔ مجھے جو اسکالرشپ ملتا ہے اس میں سے کچھ ہی بچایا جا سکتا ہے۔ کتابیں نہیں خرید رہا ہوں، کہاں رکھوں گا اور کہاں لیے لیے پھروں گا۔ چلتے وقت کچھ خرید سکا تو لے لوں گا۔

اب اپنا حال سنایئے۔ بیگم صاحبہ کو تسلیم کہیے اور بچوں کو دعا، پیار۔ پرنسپل شکور صاحب سے تسلیم کہیے گا۔ میرا پتہ لفافے کے اوپر ہے۔ جواب لکھیے گا تو پتہ صاف لکھیے گا۔ لکھیے کہ مستقلی اور گورنمنٹ کی منظوری کس منزل میں ہے۔ مجھے گھر کی بھی فکر ہے جتا[1] کو اور بیوی کو بیمار چھوڑ کر آیا تھا۔ مارے مارے

[1] اقتدار حسین عرف جتا احتشام صاحب کے سب سے چھوٹے بھائی۔

پھرنے کی وجہ سے خط بھی دیر سے ملتے ہیں۔ ڈائری پابندی سے لکھ رہا ہوں۔ اگر چھپ سکی تو شاید دلچسپ چیز ہو۔

آپ کا
احتشام

لندن ۲ر اپریل

لندن سے آداب عرض۔

میں ۲۱ر مارچ کو نیویارک سے چل کر ۲۶ر کو انگلستان کے ساحل پر اور ۲۷ر کی دوپہر کو لندن پہنچا۔ آل حسن کے ساتھ قیام ہے۔ وہ اسٹیشن ہی پر مع اپنی بیوی کے مل گئے اور مانوس چہروں کے دیکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ لندن پہنچکر جو حیرت ہونا چاہیے تھی وہ نہ ہوئی۔ پھر سالہا سال سے لندن کے متعلق پڑھتے سنتے تصویریں دیکھتے چلے آنے کا نتیجہ بھی یہ تھا کہ عمارتیں دور سے پہچانی جا سکتی تھیں۔ مختصر یہ ہے کہ یہاں وہ اجنبیت نہیں ہے جو امریکہ میں تھی۔ یہ شہر بھی وہاں کے شہروں، خاص کر نیویارک سے بہت مختلف ہے۔ اس میں بڑھاپے کی عظمت ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ نیویارک میں جوانی کا سنگار بھی نہیں ہے۔ چمک دمک، آرائش اور زیبائش بہت ہے۔ ابھی تو میں آرام کر رہا ہوں۔ معمولی طرح لندن کے بعض حصے دیکھے ہیں۔ بہت سے جاننے والے ہیں۔ بعض سے مل سکا ہوں۔ یونیورسٹی، برٹش میوزیم کی طرف ابھی نہیں گیا۔ موسم بہتر ہو رہا ہے لیکن بارش تقریباً روزانہ ہو رہی ہے۔

یہاں پہنچنے سے پہلے ہی بہت سے عزیزوں، دوستوں کے خطوط پہنچ گئے تھے۔ آپ کا خط بھی ملا اور پڑھ کر آپ کی پریشانیوں پر دل دکھا حالانکہ میں اس قسم کی پریشانیوں سے اچھا خاصا مانوس ہو گیا ہوں۔ لکھنؤ میں تو سب تقریباً ٹھیک ہیں لیکن اور اعزا کے خطوط آئے وہ بیمار بھی ہیں اور پریشان حال بھی۔ خدا کرے اب آپ بالکل مطمئن ہوں اور امتحان کی کاپیوں کا انتظار کر رہے ہوں۔

آموں کے آنے کے ساتھ ساتھ یہ کاغذی سکے بھی اسی موسم میں آتے ہیں۔

میں نے تو بہت پہلے طے کر لیا تھا کہ شروع جولائی میں واپس پہنچ جاؤں گا مگر درمیان میں ایک چھوٹا سا لطیفہ ہوا۔ معلوم نہیں میں نے پچھلے خط میں آپ کو اس کے متعلق لکھا تھا یا نہیں۔ بہرحال ہے دلچسپ۔ میں نے جنوری ہی کے مہینے میں ایک درخواست یونی ورسٹی کو بھیج دی تھی کہ میں شروع جولائی میں آنا چاہتا ہوں۔ میری دو مہینے کی رخصت منسوخ کر دی جائے اور جو ایک ہفتہ بڑھ جاتا ہے اسے رخصت اتفاقیہ میں بدل دیا جائے۔ آپ کو یاد ہوگا میری چھٹی سال بھر کی تھی آخر کے دو مہینے بغیر تنخواہ کے تھے۔ فروری میں یونی ورسٹی سے خط آیا کہ وائس چانسلر نے بمشورہ خزانچی درخواست نامنظور کر دی ہے بس اتنا ہی تھا کچھ الجھن ہوئی کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ میں یہاں راک فیلر سے دو مہینے کا وظیفہ کم کرا چکا تھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ یونی ورسٹی دو مہینے کی تنخواہ بچانا چاہتی ہے۔ پھر بھی میں نے طے کر لیا تھا کہ واپس آؤں گا اور اگر واقعی یونیورسٹی نے چھٹی منسوخ نہ کی تو دو مہینے آرام کروں گا۔ میں نے ایک خط مسعود صاحب اور ایک خط ڈاکٹر رام دھر مصرا کو لکھا کہ قصہ کیا ہے۔ لندن پہنچکر دونوں کے خط ملے۔ رام دھر نے تو لکھا کہ تمہارا جب جی چاہے آؤ اور باقی مجھ پر چھوڑ دو، فکر نہ کرو۔ مسعود صاحب نے لکھا کہ دفتر والے شرمندہ ہیں غلطی ہو گئی رخصت اتفاقیہ نامنظور کی تھی، تنسیخ کی درخواست نہیں۔ یہ ہے نا! چھوٹا سا لطیفہ۔ چونکہ آپ ان باتوں سے دلچسپی لیتے ہیں اس لیے یہ خبر لکھ رہا ہوں۔ مقصد یہ ہے کہ سات جولائی تک لکھنؤ پہنچ جانے کا پروگرام ہے۔

یہاں وہ الجھن اور گھبراہٹ نہیں جو امریکہ میں تھی پھر بھی چاہتا ہوں کہ اب جلد سے جلد وطن واپس آؤں۔ اعجاز کو میں نے کئی خط لکھے کوئی جواب نہیں ملا۔ سب سے زیادہ حیرت

٭ عزیز قریب جو بی بی سی لندن میں ہیں۔

نسیم صاحب کے خطوط نہ ملنے پر سے۔ وہ بھیجتے ہیں اور مجھے آج تک ان کا ایک خط تک نہیں ملا۔ بیگم صاحبہ کی خدمت میں تسلیم کہیے، بچوں کو پیار۔

آپ کا
احتشام

لندن
۱۰ر مئی ۱۹۵۲ء

کئی دن سے سوچتے سوچتے آج خط لکھنے کی نوبت آئی۔ امید ہے کہ آپ معاف کریں گے۔ کچھ کاہل اور آرام طلب سا ہوگیا ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ موڈ بھی عجیب سا ہوگیا تھا۔ امید ہے کہ آپ غم دوراں اور غم جاناں دونوں کی طرف سے مطمئن ہوں گے۔ معلوم نہیں کس مٹی سے بنایا گیا ہوں کہ کہیں وہ مسرت نہیں ہوتی جو عام حالات میں ہونا چاہیے۔ زندگی میں وہ ولولہ اور وہ حوصلہ مفقود ہے جو اکساتا ہے۔ جذباتی حیثیت سے میری زندگی بہت پیچیدہ ہے اور میرا المیہ یہ ہے کہ نہ تو میں اس المیہ کو شعروں میں ڈھال سکا اور نہ میں کسی سے کہہ سکا، نہ کہنے کا ارادہ ہے کیونکہ اس میں کسی کا مشورہ بھی کام نہیں آسکتا۔ نہ جانے کیوں اور کس موڈ میں یہ لکھ رہا ہوں۔ اس پر قطعے اور افسانے نہ بن سکے گا۔ یونہی لکھ دیا ہے۔

یہاں بہت کچھ دیکھا اور بہت کچھ دیکھنے کو رہ گیا ہے۔ چند چیزیں اور دیکھ لوں گا لیکن وہ جو خیال تھا کہ یہاں کے کتب خانوں سے فائدہ اٹھاؤں گا اور آئندہ لکھنے کے لیے کچھ نوٹ لے لوں گا وہ پورا نہ ہوسکا۔ اس کا سبب کچھ تو یہ ہے کہ اطمینان کے ساتھ برٹش میوزیم یا انڈیا آفس میں جس طرح مسلسل وقت گزارنا چاہیے وہ نہ کرسکا اور نہ ممکن ہے۔ دوسرے یہ کہ کوئی مخصوص موضوع پیش نظر نہیں، یوں کتابوں کی صورت دیکھ لی ہے۔ بہت سی کتابیں ایسی نظر پڑی ہیں جو اب پھر کبھی دیکھنے کو نہ ملیں گی۔ لیکن انھیں پڑھ نہ سکا۔

بہت سے میوزیم، پکچر گیلریاں، نمائشیں، تاریخی مقامات دیکھ لیے ہیں، ہائڈ پارک میں کافی وقت گزارا ہے۔ آپ تو دور ہی سے لطف اندوز ہوئے ہیں، نہ جانے کہنے والے نے آپ سے کیا کیا باتیں کہی ہیں۔ میں ایک افسانہ "ہائڈ پارک" شروع کر رہا ہوں، ممکن ہے اس میں وہ باتیں آجائیں جس کو آپ جاننے کے متمنی ہیں۔ میں نے ضامن صاحب کو مزاج پرسی کا خط اسی دن لکھ دیا تھا، جس دن آپ کے خط سے موصوف کی علالت کا حال معلوم ہوا تھا۔ اعجاز صاحب نے بھی لکھا تھا۔ میں نے اعجاز صاحب کو بھی لکھا ہے۔ اس سے قبل اعجاز صاحب کو جو خطوط لکھے تھے وہ انھوں نے نگار رواں میں شائع کر دیے اور پسند کیے گئے مگر مجھے خبر نہیں کہ ان میں کیا تھا۔

آپ تو لکھنؤ کی گرمی کا مقابلہ کر رہے ہوں گے۔ یہاں تین دن سے بارش ہو رہی ہے۔ بغیر جسٹر کے باہر نکلنا ناممکن ہے۔ یہاں بہت سے لوگوں سے مل لیا ہوں۔ کچھ سے اور ملنا ہے۔ چند دنوں میں ایک ہفتہ کے لیے آکسفورڈ اور کیمبرج جا رہا ہوں پھر جی چاہا تو پیرس۔ رجنی پام دت سے پرسوں مل لیا کافی باتیں ہوئیں۔

اتفاقاً اپنے استاد مکرم دیب صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ وہ کچھ مہینوں کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ بیگم صاحبہ کو تسلیم بچوں کو دعا و پیار، دانش محل میں دوستوں سے تسلیم کہیے۔ غلام حسنین صاحب کو تسلیم، ان کے بچوں کو دعا۔

آپ کا احتشام

★

احتشام صاحب

ایک استاد، نقاد، اور انسان کی حیثیت سے

ڈاکٹر خلیق انجم

احتشام صاحب نے ایک استاد، ایک نقاد اور انسان کی حیثیت سے کم سے کم دو نسلوں کی ذہنی تربیت کی ہے۔ اگر استاد اور شاگردی کے رشتے کے لیے کلاس روم کا ہونا ضروری ہے تو میں ان کا شاگرد نہیں ہوں لیکن اگر اس رشتے سے مراد زندگی میں رہنمائی اور ذہنی تربیت ہے تو وہ میرے مشفق استاد تھے۔ میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اور جو کچھ برا بھلا لکھا ہے اس میں بالواسطہ طور پر احتشام صاحب کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کو بھی خاصا دخل ہے۔

میں طالب علمی ہی کے زمانے سے احتشام صاحب کو پڑھ رہا تھا۔ نقاد کی حیثیت سے جن لوگوں نے مجھے غیر معمولی طور سے متاثر کیا ان میں احتشام صاحب کا نام سرفہرست ہے۔ میں لیکچرر ہو چکا تھا اور میری دو کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ جب پہلی بار دلی میں ان سے میری ملاقات ہوئی یہ ۱۹۵۹ء کے اواخر کی بات ہے۔ احتشام صاحب دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تشریف لائے۔ وہاں شعبہ کے تمام اساتذہ اور طلبا موجود تھے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے احتشام صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ اس محفل میں غالباً میں اکیلا ہی تھا جسے احتشام صاحب کے نیاز حاصل کرنے کا موقع پہلی بار ملا تھا۔ اس لیے دوسروں کے مقابلے میں انھوں نے نہ صرف مجھے کچھ زیادہ ہی اہمیت دی بلکہ دوسرے دن ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ وہ میرے گھر سے بہت قریب اپنے بھائی خورشید صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں وقت مقررہ پر پہنچ گیا مرحوم میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ میرے ساتھ اسلم پرویز بھی تھے۔ تقریباً تین گھنٹے ہم لوگ

خلیق انجم کے ساتھ

ان کی خدمت میں حاضر رہے۔ گفتگو کی ابتدا میری کتابوں سے ہوئی۔ انھوں نے غیر معمولی الفاظ میں میری ہمت افزائی کی اور کتابوں کی خوبیوں اور خرابیوں پر خاصی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ حوصلہ افزائی کے خیال سے جب مرحوم خوبیاں بیان کرتے تو بعض اوقات ان کے لب و لہجے میں ہلکا سا مبالغہ بھی شامل ہو جاتا (معمولی معمولی کتابوں پر پیش لفظ لکھنے کی بھی یہی وجہ ہے) پیش لفظ پر ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک دفعہ انھوں نے بالکل ہی کسی نوجوان کے مجموعۂ کلام پر پیش لفظ لکھا۔ ایک تو کلام تیسرے چوتھے درجے کا اور پھر کتاب ایسی چھپی جیسے انیسویں صدی کی ابتدا میں چھپی ہو۔ ایسی واہیات کتاب پر احتشام صاحب کا نام بہت ناگوار گزرا۔ ملاقات ہوئی تو میں نے دبے لفظوں میں عرض کیا

کہ ایسی کتابوں پر پیش لفظ آپ کے شایان شان نہیں۔ فرمانے لگے کہ ہر ادیب اور شاعر کو ابتدا میں تنقید کی نہیں حوصلہ افزائی کی ضرورت ہوتی ہے اور حوصلہ افزائی کا یہ فریضہ بھی نقاد ہی کا کام ہے۔
بہرحال میں اپنی ملاقات کا ذکر کر رہا تھا۔ میں اس زمانے میں پی ایچ ڈی کے لیے مرزا مظہر جان جاناں پر کام کر رہا تھا۔ مرحوم نے اس موضوع کے تنقیدی پہلوؤں پر اس تفصیل سے گفتگو کرنی شروع کی کہ میں نے ان کی میز پر سے کاغذ اٹھا کر نوٹس لینے شروع کر دیے۔ جو مقالہ لکھتے ہوئے میرے کام آئے۔ علم و ادب احتشام صاحب کی زندگی تھی۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ دو چار ادیب مل کر بیٹھے اور دوسروں کی غیبت شروع ہوئی۔ میں نے احتشام صاحب کو کبھی کسی کو بھلا برا کہتے نہیں دیکھا۔ جب کبھی زبانی یا تحریری طور پر وہ کسی سے اختلاف کرتے تو ہمیشہ اس رکھ رکھاؤ اور اس انداز کے ساتھ کہ کسی کو ناگوار نہ گزرتا۔ وہ کبھی معمولی سے معمولی ادیب یا نقاد کے بارے میں بھی سخت الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے۔

احتشام صاحب دہلی صرف ایک دو دن کے لیے آتے تھے۔ اور یہاں ان کی غیر معمولی مصروفیات ہوتی تھیں۔ اس کے باوجود جب کوئی ادیب انھیں چائے پر مدعو کرتا تو وہ ضرور تشریف لے جاتے۔ اکثر ادیب انھیں دریا گنج کے امیر ریسٹوران میں بلاتے چائے تو ایک بہانہ ہوتی اصل مقصد تو ادبی موضوعات پر گفتگو کرنا ہوتا۔ ریسٹوران میں کچھ ہی دیر میں ماحول کلاس روم کا بن جاتا۔ احتشام صاحب کسی موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں اور ہم سب ہمہ تن گوش ہیں۔ اگر کسی کتاب کا ذکر آ جاتا تو مرحوم اس کی پوری تفصیل ضرور بیان کرتے۔ مصنف کا نام، کتاب کہاں سے چھپی ہے، کہاں سے مل سکتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے وہ اصل موضوع سے ہٹ کر اس کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں اس طرح گفتگو ہو جاتی کہ اصل موضوع غائب ہو جاتا۔ وہ خود کبھی نہ کہتے تھے یہ کتاب پڑھو۔ لیکن اپنی گفتگو سے ہمیں اتنا شائق بنا دیتے کہ ہم میں سے کوئی شخص وہ کتاب ضرور لاتا۔ باری باری سب پڑھتے اور پھر آپس میں بحث و مباحثے ہوتے۔

میں جس زمانے میں "مرزا محمد رفیع سودا" لکھ رہا تھا تو مرحوم نے شروع سے آخر تک میری مدد کی بلکہ موضوع کا انتخاب بھی تقریباً انھیں کا تھا۔ میرے ذہن میں دو تین موضوعات تھے۔ احتشام صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان کا ذکر کیا۔ انھوں نے "مرزا سودا" پسند فرمایا۔ مواد اکٹھا کرنے میں انھوں نے میری کافی مدد کی۔ لکھنؤ میں تذکرہ "خوش معرکہ" کا قلمی نسخہ تھا۔ اس وقت تک یہ شائع نہیں ہوا تھا۔ اس کے متعلقہ اقتباسات اپنے شاگردوں سے نقل کرا کے انھوں نے ہی بھیجے تھے۔ اس دوران میں جب وہ دہلی آتے تو اس موضوع پر ضرور گفتگو کرتے۔ جب کتاب چھپ کر آئی اور میں نے ان کی خدمت میں پیش کی تو جس خوشی اور مسرت کے آثار ان کے چہرے پر تھے وہ اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ مرحوم مجھ سے غیر معمولی محبت کرتے تھے۔ اور ہمیشہ میری غیر معمولی ہمت افزائی بھی کرتے تھے۔ لکھنؤ میں "کمیٹی برائے فروغ اردو" کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ جس میں شرکت کے لیے میں بھی گیا ہوا تھا، پروفیسر مجیب بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ میٹنگ کے دوران جب چائے کا وقفہ ہوا تو سب لوگ باہر لاؤنج میں چائے پینے آ گئے۔ مجیب صاحب مجھے ایک طرف لے گئے اور بغیر تمہید کے بولے "میں چاہتا ہوں کہ "ترقی اردو بورڈ" کی طرف سے تاریخ ادب اردو کا پروجیکٹ تم لے لو۔ اس تاریخ کا خاکہ بنا لو اور ان لوگوں کی فہرست مرتب کر لو جنھیں تم اپنے ساتھ لگانا چاہتے ہو۔ پھر مجھ سے دہلی میں ملو۔ اس کے بعد مجیب صاحب کافی دیر تک میری دو کتابوں "مرزا محمد رفیع سودا" اور "تنقید" کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ ان کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ انھوں نے یہ دونوں کتابیں شروع سے آخر تک پڑھی ہیں۔ مجھے علم تھا کہ میری یہ دونوں کتابیں مجیب صاحب کی دلچسپی کی نہیں ہیں پھر انھوں نے کیوں پڑھیں۔ ظاہر ہے کہ اس کام کے لیے کسی نے میرا نام تجویز کیا تھا۔ میرا ذہن اس میں الجھ گیا کہ میرا نام کس نے تجویز کیا؟ مجیب صاحب سے میرے تعلقات محض رسمی تھے۔ انھیں بذات خود یہ خیال آ نہیں سکتا۔ بہرحال کئی دن تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ دہلی پہنچ کر میں نے تاریخ کا خاکہ بنایا اور مجیب صاحب کی خدمت میں ان کے

گھر حاضر ہوا۔ ان کی میز پر میری دونوں کتابیں رکھی تھیں۔ میں نے جب ورق الٹ کر دیکھا تو دونوں کتابیں وہ تھیں جو میں نے احتشام صاحب مرحوم کو پیش کی تھیں۔ اب یہ راز کھلا کہ میرے کرم فرما احتشام صاحب تھے۔ لطف یہ ہے کہ مرحوم نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا کہ میرا نام انھوں نے تجویز کیا تھا۔ اگر میں مجیب صاحب کی میز پر وہ کتابیں نہ دیکھتا تو شاید زندگی بھر مجھے اس حقیقت کا علم نہ ہوتا۔

احتشام صاحب کے متعلق دو تین واقعات ایسے ہیں جن کا میں پہلے بھی ایک مقالے میں ذکر کر چکا ہوں۔ مگر یہاں بھی ان کا اعادہ ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ ان سے مرحوم کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ احتشام صاحب کو زندگی میں جو کچھ ملا اپنے علم اور صلاحیتوں کی بنا پر۔ کم سے کم میرے علم میں نہیں کہ کسی کمیٹی کا ممبر بننے کے لیے یا کوئی ذاتی مفاد حاصل کرنے کے لیے انھوں نے جوڑ توڑ سے کام لیا ہو۔ ان کے ایک صاحب زادے جعفر عباس نے دلی یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا ان کی نہ صرف فرسٹ ڈویژن تھی بلکہ فرسٹ پوزیشن بھی تھی۔ چونکہ وہ طالب علم تھے اس لیے ان کی ملازمت کے سلسلے میں مجھے خاصی پریشانی تھی۔ علی گڑھ میں "ترقی اردو بورڈ کی لسانی کمیٹی کا سمینار ہو رہا تھا۔ احتشام صاحب بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ ایک دن میں نے احتشام صاحب سے کہا کہ "ترقی اردو بورڈ میں کچھ جگہیں نکلی ہیں۔ آپ فلاں صاحب سے کہہ دیں تو جعفر کا تقرر ہو جائے گا۔ مسکرانے لگے۔ میں نے پھر بات دہرائی۔ کہنے لگے بھئی وہ میرا بچہ ہے مگر کسی سے کیسے کہہ سکتا ہے۔ یہ تو غلط بات ہے۔ اپنی اہلیت اور قابلیت کے اعتبار سے اسے خود ہو جانا چاہیے۔ ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ "ترقی اردو بورڈ" کے ڈائرکٹر شہباز حسین صاحب تشریف لے آئے میں نے شہباز صاحب سے کہا کہ حضرت آپ کے ہوتے ہوئے جعفر بے روزگار پھرے۔ میری یہ بات احتشام صاحب کو پسند نہیں آئی جب عادت فوراً موضوع بدل دیا۔ بظاہر یہ بہت معمولی بات ہے لیکن ایسی معمولی باتوں کے لیے انسان کو فرشتہ بننا پڑتا ہے۔ اسی سمینار کا ایک واقعہ اور سن لیجئے۔ میں نے مکتبہ جامعہ کے معیاری ادب کے سلسلے میں ڈپٹی نذیر احمد کی "ابن الوقت" مرتب کی تھی۔ میں نے اس کے مقدمے میں کچھ نئی باتیں لکھنے کی کوشش کی تھی۔ میں اس سمینار میں وہ مقدمہ بھی ساتھ لایا تھا تاکہ احتشام صاحب کو دکھاؤں۔ پہلی ملاقات ہی میں میں نے یہ مقدمہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ انھوں نے کچھ کہے بغیر اپنے کاغذوں میں رکھ لیا۔ سمینار ختم ہونے کے بعد جب ہم لوگ باہر نکلے تو میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا "آپ سے کچھ بات کرنی ہے" اور ایک طرف لے گئے، جب ہم سب لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو انھوں نے وہ پیش لفظ واپس کرتے ہوئے کہا: "اس کے بارے میں جو بہتر خیالات تھے وہ آخری صفحہ پر لکھ دیے ہیں" وہ نہیں چاہتے تھے کہ دوسروں کو معلوم ہو کہ میں ان سے استفادہ کرتا ہوں۔ میں ان کے اس انداز پر ہنس پڑا میں نے کہا قبلہ میری اس سے زیادہ خوش نصیبی اور کیا ہوگی کہ لوگ مجھے آپ کا شاگرد سمجھیں۔ اس واقعہ سے میرے دل میں ان کی کتنی عزت بڑھی ہے وہ شاید بیان نہ کر سکوں۔

ان کی عظمت کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ وہ کبھی کسی کو محض اس لیے چھوٹا نہیں سمجھتے تھے کہ وہ عمر میں چھوٹا ہے یا اس کی سماجی حیثیت کچھ کم ہے۔ ایک دفعہ اردو کے ایک مقتدر ادیب باہر سے تشریف لائے ہوئے تھے میرے ساتھ ان کا قیام تھا۔ دلی کے ایک ایسے صاحب نے جو ادبی اعتبار سے تو مجھ جیسے حقیر کے مقابلے میں بھی حقیر تر ہیں لیکن جن کی سماجی حیثیت مجھ سے کہیں زیادہ تھی میرے برگزیدہ مہمان سے یہ کہہ دیا کہ آپ خلیق کے ہاں کیسے ٹھہرے۔ یہ آپ کے شایان شان نہیں۔ اتفاق سے انھیں دنوں احتشام صاحب دلی تشریف لائے ہوئے تھے۔ میں اسلم پرویز اور وہ صاحب احتشام صاحب سے ملنے گئے۔ ان صاحب نے یہ قصہ احتشام صاحب کو بھی سنایا۔ کچھ دیر تک وہ خاموش رہے —— چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ احتشام صاحب کو یہ بات ناگوار گزری ہے۔ پہلے تو کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا لیکن جب اور کچھ دیر تک یہ موضوع چلتا رہا تو ان سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ بے ساختہ کہہ اٹھے کہ وہ صاحب گدھے ہیں۔ کچھ اور بات کیجئے۔

(بقیہ صفحہ ۱۵۰ پر)

ایک غیر مطبوعہ کتاب کا پیش لفظ

محمد یونس خالدی
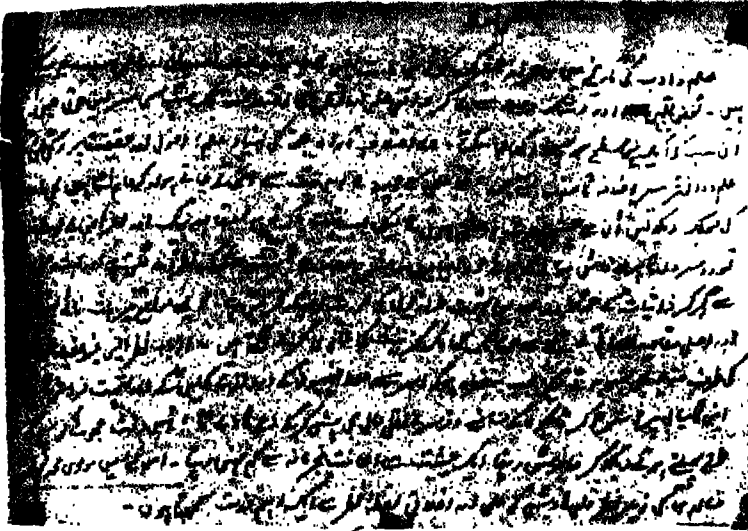
سنہ ۱۹۴۴ء کی بات ابھی کل کی بات ہے کہ جب پروفیسر سید احتشام حسین صاحب سے (جنھیں مرحوم لکھتے ہوئے انتہائی دکھ ہوتا ہے) دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی۔ میں احتشام صاحب کے نام سے تو عرصہ ہوا واقف ہو چکا تھا، اور دور سے صورت آشنا بھی تھا۔ وہ میرا نام تو جانتے تھے، لیکن میرا چہرہ ان کے لیے اجنبی چہرہ تھا۔ یہ زمانہ احتشام صاحب کے عروج کا ابتدائی زمانہ تھا۔ مگر ادب کی دنیا میں ان کا شمار ایک باثر دانشمند اور ایک صاحب بصیرت نقاد کی طرح ہونے لگا تھا، اور ان کی علمی، ادبی اور تنقیدی تحریریں وقیع نظروں سے دیکھی جانے لگی تھیں۔ بھائی نسیم احمد صاحب (دانش محل) نے تعارف کے فرائض انجام دیئے، یہیں سے تعلقات کا دروازہ کھلا۔ ان کا روز کا معمول کہ وقت مقررہ پر دانش محل آنا، اور تھوڑی دیر بیٹھنا اور مختلف موضوعات پر احباب سے گفتگو کرنا۔ گفتگو کا انداز دل کش اور عالمانہ۔ اس نے نہیں معلوم کتنے انسانوں کو متاثر کیا۔ ان متاثر ہونے والوں میں میں بھی تھا۔ میں نے بھی دانش محل حاضری کے لیے وہی وقت مقرر کیا۔ اب کیا تھا، روز ملاقات ہونے لگی اور ہم ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئے۔ یہ وابستگی سنہ ۱۹۴۹ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد حالات نے مجھے علی گڑھ پہنچا دیا اور میں انجمن ترقی اردو ہند سے وابستہ ہو گیا۔ یہ وابستگی حضرت مولانا آزادؒ کے اشارے پر ہوئی تھی اور میں انجمن کے لٹے ہوئے کارواں کو قاضی عبدالغفار صاحب مرحوم کی رہنمائی میں دہلی سے علی گڑھ لے آیا تھا۔ علی گڑھ سے مراسلت کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ یہ مراسلت رسمی، یا انجمن کے کاروبار سے تھی۔

پیش لفظ کا عکس

جنوری سنہ ۱۹۵۲ء کے فاران (کراچی) میں اس کے مدیر جناب ماہر القادری صاحب کا ایک طویل مقالہ زیر عنوان "پردہ اٹھتا ہے" شایع ہوا۔ یہ مقالہ جن حضرات کی نظروں سے گزر چکا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس میں کیا ہے، اور جن حضرات کو دیکھنے کا شرف نہیں حاصل ہوا، ان کی معلومات کے لیے صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ مقالے کا مقصد مولانا ابوالکلام آزادؒ کی صداقت کو مجروح کرنا، اور ان کو عصر حاضر کا "واقدی" ثابت کرنا تھا۔ اس مقالے کا مولانا کے عقیدت کیشوں پر کیا اثر ہوا، یہ داستان بے انتہا تکلیف دہ ہے، مگر اس داستان کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ خود پاکستان میں الاعتصام (لاہور) کے مدیر مولانا محمد حنیف ندوی نے جامع انداز میں فاران کے اس مقالے پر ایک نظر ڈالی۔ لیکن ہندستان میں مولانا کے عقیدت مندوں کے ہیجان میں کوئی کمی نہ واقع ہوئی۔ انھوں نے آپس میں خط و کتابت کے سلسلے کا آغاز کیا اور بعض نے مولانا سے رجوع فرمایا۔ اسی سلسلے میں ملک

کے مختلف گوشوں سے میرے پاس بھی خطوط آنے شروع ہوئے۔ ان دنوں علی گڑھ میں میری مصروفیات جان لیوا تھیں مگر (ڈاکٹر) ریاض الرحمٰن خاں شروانی اور محبی سعید اختر ایم اے (موجودہ مدیر سہ روزہ مدینہ بجنور) کے شدید اصرار پر اس مقالے کے جواب کے لیے اپنے کو آمادہ کرنا پڑا اور "قضیہ نامرضیہ" کے زیرعنوان اس مضمون کی پہلی قسط مدینہ بجنور مورخہ ۱۷ر فروری ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی۔ دوسری قسط نے ۲۱ر فروری کے شمارے میں جگہ پائی۔ باقی قسطیں یکم مارچ، ۵ر مارچ اور ۹ر مارچ ۱۹۵۲ء کے شماروں میں شائع ہوئیں۔ اس کے بعد مراسلے نکلتے رہے اور اس بحث کا سلسلہ یکم جون تک چلتا رہا۔ ملک کے طول وعرض سے بے شمار تہنیتی خطوط آئے۔ ان خطوط میں پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کا بھی گرامی نامہ تھا۔ اس میں میرے طرز استدلال کو سراہا گیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ یہ مشورہ بھی دیا گیا تھا کہ اس کو کتابی شکل میں شائع ہو جانا چاہیے۔ اس مشورہ میں احتشام صاحب منفرد نہ تھے، بلکہ یہی خواہش دوسرے حضرات کی بھی تھی۔ مگر میں نے احتشام صاحب کے مشورے کو بے انتہا وقیع سمجھا اور اس کی طباعت کے لیے یہ شرط رکھی کہ "پیش لفظ" آپ کو لکھنا پڑے گا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس پر کسی طرح آمادہ نہ ہوں گے۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میرے اس عریضے کے جواب میں جو ان کا گرامی نامہ آتا ہے وہ اپنے ساتھ پیش لفظ لے کر آتا ہے، جس نے مجھے بے انتہا متاثر کیا اور میرے قلب پر ایسے نقوش چھوڑے کہ جن کو میں کبھی بھلا نہیں سکتا۔

مجھے متاثر کرنے والوں میں پہلی شخصیت حضرت امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کی جامع شخصیت تھی، جن کو میں ۱۹۳۶ء سے دور اور نزدیک سے دیکھتا رہا اور جنھیں میں آج تک ایک غیر معمولی انسان سمجھتا ہوں اور ہمیشہ سمجھتا رہوں گا۔ ان کے بارے میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ اپنے فضل و کمال کے لحاظ سے علامہ نیاز فتح پوری کے لفظوں میں "وہ ایک ایسا کل تھے کہ جس کا کوئی جزو اس سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔" ان کے بعد دوسرا نام مولانا غلام رسول مہرؔ صاحب مرحوم کا آتا ہے۔ پھر مولانا امتیاز علی خاں عرشی (رام پور) اور پروفیسر سید احتشام حسین کی جامع شخصیات ہیں۔ میں قاضی عبدالغفار صاحب سے بھی متاثر ہوا اور مالک رام صاحب نے بھی کچھ ایسے گہرے نقوش چھوڑے ہیں کہ جن کو نظرانداز کرنا میرے لیے مشکل ہے۔

میں جس وقت ان عدیم المثال شخصیات سے متاثر ہونے کی حقیقت پر غور کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا سبب قدروں کا اشتراک اور مولانا آزاد سے جذبۂ خلوص وعقیدت ہے۔

یہ بات تو سرِراہے آنے والی بات تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان مضامین کا کیا حشر ہوا؟ اور وہ "پیش لفظ" کہاں ہے؟ جہاں تک ان مضامین کا تعلق ہے تو وہ مولانا غلام رسول مہرؔ صاحب کے مفید مشوروں کی روشنی میں نظرِثانی کے بعد کتابت کے لیے کاتب کے حوالے کر دیے گئے تھے۔ اسی زمانے میں بارگاہ امام الہند میں حاضری کا اتفاق ہوا۔ مولانا نے مخصوص انداز میں جو کچھ ارشاد فرمایا اس کا میرے لفظوں میں خلاصہ یہ ہے کہ:

"ایسے کاموں میں وقت ضائع کرنا، عمرِ عزیز کو گنوانا ہے۔ آپ کے سپرد جو کام ہے اس کو انجام دیجیے۔ تمام دنیا کی فکروں سے آزاد ہو جائیے۔ کسی نے کسی کے متعلق کیا کہا اور کیا لکھا، اسے دیکھنے اور سننے کی فرصت کہاں۔ پھر میرے متعلق، تو میں سب کو معاف کر چکا ہوں؛ میرے بھائی ساری باتیں دل سے تعلق رکھتی ہیں؛ آپ بھی انھیں معاف کر دیں۔"

اندازِ تکلم میں بزرگانہ شفقت کے ساتھ ساتھ جلال بھی تھا۔ میں نے علی گڑھ واپسی کے بعد کتابت شدہ اوراق ضائع کر دیے۔ لیکن مسودہ کے ساتھ وہ پیش لفظ ایک امانت کے طور پر محفوظ رکھا اور سید احتشام حسین صاحب سے معذرت کر لی۔ اس کے بعد احتشام صاحب نے میرے لیے دو پیش لفظ اور لکھے، جن میں ایک مطالعۂ حضرت غمگین دہلوی کے لیے تھا۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے زیرِ اہتمام ۱۹۶۳ء میں شائع ہو چکی ہے اور وہ پیش لفظ اس کے اوراق کی زینت ہے، اور دوسرا انتخاب کلام جرأت کے لیے جو اب کبھی ان کے نام سے شائع نہ ہو سکے گا کیونکہ اس کا مسودہ دوسرے اہم کاغذات کے ساتھ، جس میں مولانا آزادؒ، مولانا عبدالماجد دریاآبادی، مولانا غلام رسول مہرؔ، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالغفار اور سید احتشام حسین صاحب کے اہم مکتوبات بھی تھے، ایک کرم فرما کی کرم فرمائیوں کی نذر ہو گیا۔ میں ان کا نام جانتا ہوں، وہ اب مرحوم ہو چکے ہیں، اگر وہ مرحوم نہ بھی ہوتے ہوتے تو بھی میں ان کے نام کو ظاہر کر کے ان کی رسوائیوں کا سامان نہ فراہم کرتا۔

رہا احتشام صاحب کے پیش لفظ کا مسئلہ، تو اب نہ امام الہند ہیں، اور نہ سید احتشام حسین صاحب، نہ وہ کتاب چھپ سکتی ہے، اور نہ اس کی اشاعت کے لیے میں اپنے کو آمادہ کر سکتا ہوں۔ مگر اب وہ امانت ادبی دنیا کی امانت ہے، جسے میں ماہ نامہ نیا دور لکھنؤ کے ذریعے اس کے وارثوں کی خدمت میں حاضر کر رہا ہوں۔ وہ امانت یہ ہے۔

پیش لفظ

"علم وادب کی تاریخ میں معاصرانہ چشمک کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس کے مختلف نفسیاتی اور علمی سبب ہو سکتے ہیں۔ بغض ملّتی اور رشک و حسد سے لے کر واقعی علمی اور نظریاتی اختلاف تک بہت سی منزلیں ہوتی ہیں۔ ان سب کو ایک ہی سطح پر نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ اختلافات آرا جن کی بنیاد علم، اصول اور حقیقت پر رکھی گئی ہو، علم و دانش میں اضافے کا سبب بنتے ہیں، لاعلمی کے جو پردے اس نیت سے اٹھائے جاتے ہوں کہ عام نگاہیں بھی اصلیت کی جھلک دیکھ لیں، ان سے چشم بصیرت روشن ہوتی ہے لیکن جب نیت پاک نہ ہو، مقاصد نیک اور اغراض بے لوث نہ ہوں تو دوسروں کا پردہ فاش ہونے کے بجائے خود اپنا پردہ فاش ہو جاتا ہے، نیت مشکوک نظر آنے لگتی ہے اور بحث علمی سطح سے گر کر ذاتیات کے جھگڑوں اور بیجا تہمت طرازیوں کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ایسے مواقع پر بات بنائے نہیں بنتی اور اصلی مقاصد الفاظ کے پیچھے سے جھانک کر نیت کی غمازی کرنے لگتے ہیں۔ ارباب نظر ایسی غیر مفید علمی کاوشوں کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوتے لیکن جب یہ خطرہ ہو کہ اس سے غلط فہمیوں کے دروازے کھلیں گے اور تہمت فروشی کا تاجر اپنی کامیابی پر خوش ہو کر گاہکوں کے سامنے دوسرے نقلی مال بھی پیش کر کے دھوکا دے گا، اس وقت جھوٹ کو سچ کی طرح پھیلتے ہوئے دیکھ کر خاموش رہنا ایک حیثیت سے اعانت مجرمانہ سے کم نہیں رہتا۔ اس لیے میں مولوی محمد یونس خالدی کی زیر نظر تلمی کاوش کو علمی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے ایک اہم خدمت سمجھتا ہوں۔

تفصیلی باتیں تو ان مضامین کے مطالعے سے معلوم ہوں گی لیکن تعارف کے طور پر اتنا بتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ چند مہینے پہلے ماہر القادری صاحب نے اپنے رسالے فاران (کراچی) میں ایک طویل مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "پردہ اٹھتا ہے"! بہت سی معذرتوں اور حق پرستی کی یقین دہانیوں کے بعد اس مضمون میں مولانا ابو الکلام آزاد کے متعلق چند باتیں کہی گئی ہیں کہ اگر وہ درست ہوں تو مولانا آزاد دروغ گو اور دوسروں کے خونِ جگر کو اپنی تحریریں کہہ کر دھوکا دینے والے ثابت ہوتے ہیں مثلاً بعض الزامات یہ ہیں:-

۱۔ مولانا آزاد نے مولانا سلیمان ندوی کے بعض مضامین کو اپنا لیا ہے۔

۲۔ انھوں نے اپنے سفر ایران اور لبنان وغیرہ کا جو ذکر غبار خاطر میں کیا ہے، وہ جھوٹ ہے۔ انھوں نے یہ سفر کیے ہی نہیں۔

۳۔ مولانا کا وطن دہلی نہیں، وہ الہلال میں اپنے نام کے ساتھ دہلوی لکھتے تھے۔

۴۔ مولانا نے لکھا ہے کہ ان کے بزرگوں میں ایک بزرگ مغل دربار میں رکن المدرسین کے عہدے پر فائز تھے، یہ غلط ہے کیونکہ ایسا کوئی عہدہ تھا ہی نہیں۔

ایسے ہی بعض اور چھوٹے چھوٹے اعتراضات ہیں۔ بادی النظر میں یہ باتیں علمی تحقیق سے تعلق رکھتی ہیں اور کوئی غیر معمولی اہمیت نہیں رکھتیں لیکن جب انھیں بعض دوسرے حقائق کے پس منظر میں دیکھا جاتا ہے تو معترض کا اصل مقصد علمی تحقیق نہیں رہ جاتا۔ اس کی طرف خالدی صاحب نے اپنے مضامین میں واضح اشارے کیے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بہت سے ایسے لوگوں نے جنھیں مولانا ابو الکلام آزاد کے سیاسی نقطۂ نظر سے اختلاف تھا، آہستہ آہستہ ان کے علم و فضل سے بھی انکار کرنا شروع کر دیا، تاکہ ان کا اختلاف حق بہ جانب نظر آئے، اور بہت سے دلوں میں، ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے نہ سہی، ایک فاضلِ عصر کی حیثیت سے جو عزت مولانا آزاد کی ہے، اسے نقصان پہنچے۔ اس طرح اپنی رہنمائی اور رہبری کے لیے راستہ صاف ہو، لیکن جب نیت صاف نہ ہو، دلائل بودے اور الزامات جھوٹے ہوں تو کہاں تک کامیابی کی امید ہو سکتی ہے! چنانچہ ماہر القادری صاحب کے مضمون کا بھی یہی حال ہے۔ ذرا ذرا سی باتوں کو اس طرح بڑھا چڑھا کر غیر علمی انداز میں لکھا گیا ہے اور اصل نیت کو عذر و معذرت کے لفظی پردوں میں چھپانے کی اس طرح کوشش کی گئی ہے کہ لکھنے والے کا مقصد نمایاں

ہو جاتا ہے۔

خالدی صاحب نے نہ صرف ان الزامات کی تردید کی ہے جو ماہر القادری صاحب نے مولانا آزاد پر لگائے تھے بلکہ بین السطور میں ان خیالات کے پڑھنے کی کوشش بھی کی ہے جو اس مضمون کا اصل مقصد کہا جا سکتا ہے۔ خالدی صاحب نے مولانا آزاد کی تمام تحریروں کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور موصوف کے متعلق ان کے پاس اچھا ادبی اور تنقیدی ذخیرہ موجود ہے۔ مولانا سے ان کی وابستگی کی نوعیت سیاسی نہیں علمی ہے اس لیے انھیں فطری طور پر ماہر القادری صاحب کے اس غلط فہمی پھیلانے والے مضمون کو پڑھ کر دکھ ہوا اور انھوں نے بعض غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے قلم اٹھایا۔ افسوس یہ ہے کہ اس سلسلے میں مولانا سلیمان ندوی صاحب کا نام بھی آتا ہے لیکن یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ مولانا ندوی کے بعض خیالات کی سخت تنقید کی ضرورت پیش آئی ہے۔ موجودہ ہند و پاکستان میں مولانا سلیمان ندوی کی جو عزت ہے، اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ موصوف اپنا دامن چھوٹے چھوٹے مناقشات سے بچائے رکھتے لیکن ایسا نہیں ہے۔ موصوف نے بزرگوں کے اس قول کو بھلا دیا کہ جو شخص شیشے کے مکان میں رہتا ہو اسے دوسروں کے مکان پر پتھر نہیں پھینکنا چاہیے۔ خالدی صاحب کو بھی کچھ ناخوشگوار باتیں کہنی پڑی ہیں اور میرا خیال ہے کہ بحث کے سیاق و سباق کو دیکھتے ہوئے وہ ناگزیر تھیں۔

میرا خیال ہے کہ خالدی صاحب کے یہ مضامین صرف دلچسپی کا سامان فراہم نہیں کرتے بلکہ بہت سی معلومات بھی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ باتیں بہت سے لوگوں کے لیے عبرت انگیز اور سبق آموز ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جس مقصد سے یہ لکھے گئے ہیں وہ ان سے پورا ہوتا ہے اور لوگ ان صفحات کو دلچسپی سے پڑھیں گے:

سید احتشام حسین، لکھنؤ یونیورسٹی

(نوٹ) اس پیش لفظ کی کوئی تاریخ تحریر درج نہیں ہے۔ لیکن یہ مجھے علی گڑھ میں ۱۵ر جون ۱۹۵۲ء کو موصول ہوا تھا۔

★

ذکرِ احتشام

(صفحہ ۱۵۱ کا بقیہ)

میں نے پچھلے بارہ تیرہ برسوں میں انھیں صرف دو بار غصہ میں دیکھا تھا۔ ایک تو اس وقت جس کا ذکر میں بھی کر چکا ہوں۔ اور دوسرے جب دو تین سال پہلے ایک خاتون کا پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ خاتون پروفیسر تو کجا لیکچرر ہونے کے قابل بھی نہیں تھیں۔ ستم یہ ہوا کہ ان کے مقابلے میں ایک مشہور ترقی پسند نقاد کو رد کر دیا گیا تھا۔ احتشام صاحب سے جب اس موضوع پر گفتگو ہوئی تو میرے اور ڈاکٹر اسلم پرویز کے علاوہ اور بھی چند حضرات موجود تھے۔ خاموش بیٹھے سب لوگوں کی گفتگو سنتے رہے۔ بہت دیر بعد بہت غصے اور دکھ کے ساتھ بولے "اگر یہی روش رہی تو تمام یونیورسٹیاں جاہلوں سے بھر جائیں گی" اور پھر موضوع بدل دیا۔

مجھے یہ فخر ہے کہ مرحوم نے اپنی زندگی کا آخری مقالہ میری فرمائش پر لکھا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک شام وہ اچانک "سیکولر ڈیموکریسی" کے دفتر میں تشریف لے آئے۔ ہمارا "قومی شاعری نمبر" تیاری کی آخری منزل میں تھا۔ میں نے فرمائش کی کہ قومی شاعری پر ایک مقالہ تحریر فرما دیجئے۔ فرمانے لگے "میں کل الٰہ آباد جا رہا ہوں وہاں سے لکھ کر بھیج دوں گا۔" میں نے عرض کیا کہ پرچہ پریس جا رہا ہے۔ بہت دیر ہو جائے گی۔ اگر آپ آج رات لکھ دیں تو عنایت ہوگی۔ میرے اصرار سے وہ مجبور ہو گئے۔ ہنس کر فرمانے لگے کہ آپ ضد کرتے ہیں تو میں رات کو لکھ دوں گا۔ دوسرے دن ایک صاحب تین صفحے کا نامکمل مضمون دے گئے۔ ایک چھوٹا سا خط منسلک تھا جس میں احتشام صاحب نے لکھا تھا "رات میں میری طبیعت خراب ہو گئی تھی الٰہ آباد جاتے ہی باقی مضمون بھی بھیج دوں گا۔" بعد میں معلوم ہوا کہ اس رات ان کی طبیعت غیر معمولی طور پر خراب ہو گئی تھی چونکہ وعدہ کیا تھا جب تک جسم نے ساتھ دیا لکھتے رہے۔

موت نے اردو کے ایک نقاد اور عالم ہی کو نہیں چھینا بلکہ قدم قدم پر حوصلہ افزائی اور رہنمائی کرنے والے ایک کرم فرما اور شفیق بزرگ کو بھی مجھ سے جدا کر دیا ہے۔

★

نقوشِ احتشام

مرزا احسن بیگ

کچھ ایسے بھی اُٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو
تم ڈھونڈھنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

دسمبر کی دو تاریخ تھی اور راقم الحروف اپنے وطن کے قریبی اسٹیشن کٹھیا سرائے سے بنارس جانے کے لیے ۲ بج کر ۳۰ منٹ پر بنارس جانے والی دہرہ دون ایکسپریس کا منتظر تھا۔ عموماً مسافر ٹرین کے انتظار میں اوقات گزاری کے لیے اخبار اور رسائل کا سہارا لیتے ہیں۔ راقم الحروف نے بھی اسٹیشن ماسٹر کی میز سے ہندی کا آج اخبار اٹھایا۔ اخبار کی ورق گردانی کے دوران جب نظر اس سرخی پر پہنچی کہ "پروفیسر سید احتشام حسین کا اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا"، نظر اس سرخی پر جمی کی جمی رہ گئی۔ چند لمحے کے بعد عجیب سی کیفیت ہونے لگی۔ دل اور ذہن اس واقعے کو باور کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا کہ یہ عظیم شخصیت اب دنیائے ادب سے ملک عدم کو سدھار چکی ہے۔ بلاشبہ ہم سب کو وہیں جانا ہے جہاں مرحوم تشریف لے گئے مگر یقین مانیے کسی طرح یہ یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا کہ مرحوم نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کا پیکر، شگفتہ چہرہ آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگا اور اردو کے ایک عظیم شاعر سید انشاء اللہ خاں انشاؔ کے حسب ذیل اشعار میرے جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

ٹرین آئی اور روانہ ہو گئی۔ میں اس پر سوار بھی ہوا لیکن کب اور کیسے سفر تمام ہوا یہ نہیں معلوم۔ البتہ ٹرین جب ایک جھٹکے کے ساتھ رکی تو پتہ چلا کہ بنارس کا اسٹیشن آ گیا۔ بادل ناخواستہ ٹرین سے اترا اور اپنی قیام گاہ پر پہنچا۔ بعد ازاں اپنے مشفق استاد ڈاکٹر حکم چند نیر کے دولت کدہ پر حاضری کے لیے پہنچا۔ استاد کا غمگین، پژمردہ چہرہ اور آنکھوں کو اشکبار دیکھ کر بعینہٖ وہی کیفیت اپنی بھی ہو گئی۔ استاد نے رُندھے ہوئے الفاظ میں فرمایا کہ عزیزم دنیائے ادب میں بہت بڑے بڑے ادیب، نقاد، شاعر اور فلسفی ہیں اور ہوتے رہیں گے لیکن احتشام صاحب جیسے انسان پھر پیدا ہوں یہ ممکن نہیں۔

مرحوم خلوص، محبت اور حسن سلوک کا مجسمہ تھے۔ ان کا چہرہ شگفتہ، مسکراتی ہوئی آنکھیں، خندہ زیر لب، وجیہ پیکر اور مجسم محبت و اخلاق تھے۔ دن رات کے جن اوقات میں مکان پر پہنچ کر آواز دیجیے اگر موجود ہیں تو فوراً اسٹڈی روم یا ڈرائنگ روم میں پہنچ جائیں گے۔ یہ حسن سلوک ہر کس و ناکس کے لیے تھا۔ وہ سب سے ملتے اور سب کا کام کرنے کے لیے حتی الوسع کوشش کرتے۔ اگر ادیب دوست یا شاعر آ جاتا تو اس سے بھی تپاک سے ملتے۔ مرحوم کو اپنے شاگردوں سے بے لوث محبت تھی۔ جب بھی ان کا شاگرد ان کے دولت کدہ پر حاضر ہوتا تو اس سے تپاک سے ملتے۔ اس کے حالات

سنتے اور تعلیم سے متعلق جو بھی دقتیں ہوتیں اُسے رفع کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ غرضیکہ مرحوم کو اپنے شاگردوں سے بے پناہ اُنس تھا۔ مرجع خلائق تھے اور اپنے کو ہر محفل میں سمو لیتے۔

مرحوم کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ ایک بار ملاقات کے بعد دوسری بار تعارف کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ آج کے دور میں جب کہ ملازمت حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں مرحوم کو اپنے شاگردوں کی ملازمت کے سلسلے میں بڑی فکر رہتی تھی۔ راقم الحروف کسی کام کے سلسلے میں الٰہ آباد گیا تھا۔ مرحوم سے ملاقات کے دوران اسی موضوع پر گفتگو چل رہی تھی تو انھوں نے اپنے ایک عزیز سے پوچھا کہ فلاں فلاں طالب علموں کا کیا حال ہے کہیں لگ لگا گئے کہ نہیں۔ وہ اپنی ان تمام خصوصیات کی بنا پر شاگردوں میں بہت مقبول تھے۔

مرحوم علم و فضل کا ایک دریا تھے۔ تحریر و تقریر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ جب تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے فوارے کا پانی بغیر کسی رکاوٹ کے نکل رہا ہے۔ ادبی موضوع علمی ہو یا تنقیدی ہو غرضیکہ بغیر کسی رکاوٹ کے مسلسل بولتے تھے۔ وہ افسانہ نگاری میں منفرد، تنقید نگاری کے امام اور علمی و ادبی مباحث میں یکتا تھے۔ غزلیں بھی کہیں، نظمیں بھی کہیں، سفرنامے بھی قلم بند کیے اور لسانیات کی باریکیوں کو بھی بے نقاب کیا علم و ادب کا کوئی ایسا موضوع نہ رہا جس پر ان کا اشہب قلم نہ دوڑا ہو۔ اُردو کی کوئی بڑی انجمن، کوئی تحریک اور کوئی سرکاری کمیٹی ایسی نہیں جہاں احتشام صاحب کی شخصیت جلوہ گر نہ ہو۔

احتشام صاحب نے اپنی زندگی کو ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کا مشاہدہ قوی اور مطالعہ وسیع تھا۔ مشرقی اور مغربی دونوں ادب پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ ہندستان کی مختلف زبانوں پر بھی ملکہ تھا۔ احتشام صاحب اس ادب کے حامی تھے جس کا تعلق زندگی سے ہو۔ ساتھ ہی ترقی پسند ادب سے ان کا تعلق زندگی بھر قائم رہا۔ اس سلسلے میں اُن کے جو مضامین چھپ کر شائع ہوئے ہیں ان سے ان کے اس خیالات کی ترجمانی ہو جاتی ہے۔

ان کے نظریے کے مطابق ادب کی تخلیق انسان دوستی کے مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کرنا چاہیے۔ اپنی کتاب روایت اور بغاوت میں انھوں نے لکھا ہے:-

"اعلیٰ ادب اور اعلیٰ مقصد کی پہچان یہی ہے کہ اس سے زندگی کے حسن اور توانائی کو سمجھنے اور اُبھارنے میں مدد ملتی ہے۔ زندگی ادب کو سنبھالتی ہے اور ادب زندگی کو سہارا دے کر آگے بڑھاتا ہے۔"

احتشام صاحب جدید ترین نظریات کے حامی ہونے کے ساتھ ساتھ قدماء کی فنی اور فکری صلاحیتوں کو ناقابل اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں اس امر کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ "گزشتہ ادب کے مطالعے کے بغیر جدید ادب کو ٹھیک طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔"

پروفیسر احتشام صاحب قصبہ ماہل ضلع اعظم گڑھ میں سنہ ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اعظم گڑھ کا علاقہ بہت مردم خیز ہے۔ یہاں سے بہت بڑے بڑے مفکر، ادیب اور شاعر پیدا ہوئے اور انھوں نے اردو ادب کے چمن کی آبیاری کی۔ مولانا شبلی، اقبال سہیل، یحییٰ اعظمی، عبدالسلام ندوی، سید سلیمان ندوی اور اسلم جیراجپوری وغیرہ حضرات اسی سرزمین پر رہ کر ادب کے گل کھلاتے رہے۔ بقول اقبال سہیل ؎

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضان تجلی ہے یکسر
جو ذرّہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر اعظم ہوتا ہے

احتشام صاحب نے بھی اسی سرزمین پر جنم لیا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد ویسلی انٹر کالج اعظم گڑھ سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا اور سنہ ۱۹۳۶ء میں چوبیس سال کی عمر میں انھوں نے الٰہ آباد یونی ورسٹی سے ایم اے امتیاز سے پاس کیا۔ دو سال بعد لکھنؤ یونی ورسٹی میں شعبۂ اردو میں بحیثیت لکچرار ان کا تقرر ہوا۔ ترقی کرتے کرتے الٰہ آباد یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر اور پروفیسر تک پہنچے۔ سنہ ۱۹۵۲-۵۳ء میں انھوں نے یورپ اور امریکہ کا سفر کیا۔ احتشام صاحب نے قدیم و جدید ادب نیز لسانیات پر متعدد تحقیقی [illegible]

تنقیدی مضامین لکھے جو کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی
اہم تصانیف حسب ذیل ہیں:-

۱۔ عکس اور آئینے ۲۔ تنقیدی جائزے ۳۔ روایت
اور بغاوت ۴۔ ادب اور سماج ۵۔ تنقید اور عملی
تنقید ۶۔ ذوق ادب اور شعور ۷۔ اعتبار نظر
۸۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ۹۔ تنقیدی نظریات

اس کے علاوہ انھوں نے اردو ادب کی تاریخ ہندی زبان میں
لکھی۔ بچوں کے لیے ان کی ایک کتاب اردو کی کہانی بھی ہے۔
احتشام صاحب کے افسانے چھپ چکے ہیں لیکن ان کے اشعار کا
مجموعہ ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا۔ سفرنامہ میں ساحل اور سمندر
ان کی تخلیق کا شاہکار ہے۔ انھوں نے اردو ادب پر انگریزی زبان
میں بھی مقالے تحریر کیے ہیں۔

احتشام صاحب اردو کے سب سے بڑے ترقی پسند نقاد
تھے۔ انھوں نے اردو تنقید کو جدید خیالات و رجحانات سے آشنا
کیا۔ احتشام صاحب نے تنقید نگاری کی ابتدا ۱۹۳۹ء میں کی۔
ان کی تنقیدی کاوشوں کو حسب ذیل خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ تنقید کے نظریاتی اور اصولی مباحث و مسائل۔
۲۔ عملی تنقید جس کے ذیل میں وہ مضامین آتے ہیں جن میں
ادب کی کسی صنف یا تحریک پر روشنی ڈالی گئی ہے یا کسی شاعر یا ادیب
کے اکتسابات کا جائزہ لیا گیا ہے۔
۳۔ سیاسی، سماجی اور قومی مسائل
۴۔ اردو کے علاوہ ادبیات کے کسی گوشہ کا مطالعہ
۵۔ لسانیات

ان سارے موضوعات میں اگرچہ وہ اپنے بنیادی موقف سے
انحراف نہیں کرتے لیکن موضوع کے اختلاف کی وجہ سے ان کے
نقطۂ نظر میں یکساں شدت نہیں رہ جاتی۔

تنقیدی جائزے سے لے کر تنقید اور عملی تنقید کا سفر انھوں
نے تنقید کے نظریاتی اور اصولی مباحث اور مسائل کے سہارے
طے کیا۔ اس مدت میں انھوں نے عملی تنقید کے نمونے بھی پیش کیے
لیکن ان میں بھی نظریاتی مباحث کا رجحان ہے۔ "اردو ادب میں ترقی
پسندی کی روایت" "ادب اور اخلاق" "قدیم ادب اور ترقی
پسند نقاد" "مواد اور ہیئت" "ادبی تنقید کے مسائل" "افسانہ
اور حقیقت" "اصول نقد" "اردو ادب میں آزادی کا تخیل"
ایسے مقالے ہیں جن پر اردو ادب کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

مولانا الطاف حسین حالی کی تنقید کے بعد احتشام صاحب اردو
کے پہلے نقاد ہیں جنھوں نے ادب و تنقید کے اصول و ضوابط پر اس
طرح بحث کی کہ فکر کو روشنی اور ذہن کو بالیدگی ملی عموماً یہ سوال
ہر طرف سے اٹھتا ہے کہ احتشام صاحب یا ادب کے دوسرے
نقاد اصول تنقید پر کوئی کتاب کیوں نہیں لکھتے۔ اس سے زیادہ
حیرت کی بات یہ ہے کہ ناقدین بشمول احتشام صاحب اس پر
معذرت کر لیتے تھے۔ بات کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے۔ سوال
کرنے والے تنقید کو صرف نحو یا عروض کے مماثل کوئی فن مانتے
ہیں جن کی تحلیل، ترکیب، تقطیع کے لیے کچھ اصول اور قاعدے
مقرر کیے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تنقید میں اصول عبارت ہے
ان بحث و مسائل سے جن سے ایک نقاد عمل تنقید سے پہلے دوچار
ہوتا ہے اور جن پر قابو پا لینے کے بعد ہی وہ آگے بڑھتا ہے تنقید
میں ایک نقطۂ نظر اور ایک انداز گرفت کی ضرورت ہوتی ہے اور
ان کی توضیح و تشریح کرنا۔ ادب کیا ہے؟ مواد اور ہیئت میں کیا
اور کتنا رشتہ ہے؟ ادب کا سماج سے کیا تعلق ہے؟ اخلاق
کو ادب کا پاسبان ہونا چاہیے کہ نہیں یا اور اس قسم کے دوسرے
سوالات اور اصول تنقید کے ذیل میں آتے ہیں اور ان پر بحث
کر کے نتیجہ نکالنا ہی اصول تنقید کا دوسرا نام ہے۔ یہ سارے سوالات
احتشام صاحب کے سامنے بھی آئے اور ان کا جواب تلاش کرنے
کی انھوں نے کوشش بھی کی۔ اس طرح یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں کہ ان کے
مضامین اصول تنقید کا درجہ رکھتے ہیں۔ یوں تو ان مسائل پر حالی
کے بعد اب تک بعض لکھنے والے کبھی کبھی قلم اٹھاتے رہے ہیں لیکن
احتشام صاحب نے متعلقہ علوم کے مطالعے کے بعد اور معترضین
کے اقوال پر نظر رکھتے ہوئے جتنے انہماک اور خلوص سے قلم

اٹھایا اتنا اور کسی کے حصے میں نہیں آیا۔ ان کی ہی کوشش رہی ہے کہ وہ اصول تنقید کی ذمہ دارانہ تدوین کریں۔ انھوں نے تنقید کے بارے میں جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے اس سے اختلاف کیا گیا ہے اور کیا جائے گا لیکن ان مضامین کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ اُردو میں اصول تنقید پر کوئی کتاب نہیں حقیقت سے انحراف کرنا ہو۔

گزشتہ بیس یا اکیس سال کی ادبی تخلیقات پر احتشام صاحب کے نظریاتی مباحث کے واضح اثرات ملتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے متوسلین ادب میں جن سیاسی نعروں کو در آمد کر رہے ہیں ان کا زور اس تحریک کے مخالفین نے نہیں بلکہ احتشام صاحب کے مضامین نے توڑا۔ مارکسی نقطۂ نظر سے اپنی تمام تر دلچسپیوں کے باوصف انھوں نے ادب کو کمتر درجے کی چیز نہیں سمجھا۔ وہ صرف نقاد ہی میں نہیں بلکہ ادیب اور شاعر میں بلندی فکر، وسعت مطالعہ اور پختگی شعور دیکھنا چاہتے تھے۔ آج انجمن ترقی پسند مصنفین نہ تو ایک تحریک کی صورت میں زندہ ہے اور نہ اس کی مخالفت میں پہلی سی صف آرائی ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ وہ آواز ایک ہنگامی دور کی پیداوار تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو گئی بلکہ آج وہ آواز جزو ادب بن چکی ہے اور انجمن کے مطالبات ادبی سانچے میں ڈھل چکے ہیں۔ اُردو میں ایسی تخلیقات کا قابل لحاظ ذخیرہ ہے جو نغمہ کے لحاظ سے مارکسی اور لے کے اعتبار سے ہندستانی ہے۔ مارکسی تنقید نگاروں کی صف میں صرف احتشام صاحب کی شخصیت ایسی نظر آتی ہے جن کے مضامین توازن اور سنجیدگی قائم رکھنے پر زور دیتے رہے اور ہر ایسی تخلیق کو ترقی پسندی کے دائرے سے خارج سمجھتے رہے جو ادبی بے راہ روی کی حامل تھی۔

احتشام صاحب نظریاتی مباحث کے ساتھ ساتھ عملی تنقید کے نمونے بھی پیش کرتے ہیں۔ ان مباحث میں نظریاتی کشمکش نمایاں ہے اور انھیں عملی تنقید سے زیادہ نظریۂ تنقید کے خانے میں جگہ ملنی چاہیے۔ ان میں بعض ایسے مضامین بھی ملتے ہیں جن میں یا تو وہ نمایاں طور پر افراط و تفریط کے اسیر ہو گئے ہیں یا اپنے نظریے سے دور ہوتے نظر آتے ہیں۔ "فانی بدایونی"، "سحر البیان پر ایک نظر"، "اقبال بحیثیت شاعر اور فلسفی"، "حسرت کا رنگ سخن"، "اختر شیرانی کی رومانیت"، "سجاد ظہیر ادیب کی حیثیت سے"، "علی سردار جعفری رومان سے انقلاب تک" ان کے ایسے مضامین ہیں جن پر عدم توازن، جذباتیت اور نقطۂ نظر سے اغراض کی پرچھائیاں آ جاتی ہیں۔

احتشام صاحب کا قلم کبھی جمود کا شکار نہیں ہوا۔ تنقید اور عملی تنقید کے بعد ان کے چار اور مجموعۂ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ تنقید اور عملی تنقید احتشام صاحب کے نظریاتی سفر کی آخری منزل ہے۔ اس کے بعد ان کے یہاں کیفیت کا واضح زوال ملتا ہے۔ یہ زوال بتدریج آیا ہے اور ہر مجموعہ پہلے مجموعہ سے کم نظر آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے نقطۂ نظر انحراف کر چکے ہیں۔ دراصل تنقید کے جن اصول و ضوابط کی وہ وضاحت کر رہے تھے اب ان کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

احتشام صاحب ایک فلسفی نقاد ہیں ان کے قلم کا جوہر اس وقت کھلتا ہے جب وہ اصول و نظریات پر بحث کرتے ہیں۔ اب بھی جب کبھی وہ ان مباحث کو چھیڑتے ہیں تو وہ اقدام اُردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ بن جاتا ہے۔ تنقید میں ان کی برتری انھیں نظریاتی مباحث کی وجہ سے ہے۔ اُردو تنقید کے مورخ کو صرف خزف ریزے نہیں ملیں گے کچھ گوہر نایاب بھی ہاتھ آئیں گے جن میں احتشام صاحب کے نظریاتی مضامین سب سے زیادہ آب و تاب کے حامل ہوں گے۔

مختصر یہ کہ احتشام صاحب کے یہاں ادب میں حیرت انگیز گہرائی، حیرت انگیز توازن اور حیرت انگیز شدت اثر موجود ہے۔ افسوس ہے گل چین اجل نے چمنستان ادب سے اس پھول کو چن لیا تھا ورنہ اس میں شک نہیں وہ کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو اُردو ادب کے تاج میں بیش بہا جواہر اور آویزاں کرتے۔ بقول ایک شاعر

عمر بھر حسن عمل تیرا بھلا سکتے نہیں
داغ تیری یاد کا دل سے مٹا سکتے نہیں

★

دیناکر جیٹھ ۱۹۵۸ء اشک

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا.....!

ایس، ایم، عباس رضوی

اعظم گڈھ کی سرزمین نے اُردو کے جو بہت سے لعل و گہر پیدا کیے ہیں اُن پر فخر کرتے ہوئے اور قدرت کے اس عظیم فیضان کا ذکر کرتے ہوئے اقبال سہیل نے کہا ہے ع

جو ذرہ یہاں کا ہوتا ہے وہ نیرِ تاباں ہوتا ہے

اس خطۂ ارض سے جو ہستیاں شعر و ادب کے اُفق پر اُبھریں، چمکیں اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمانِ ادب پر چھا گئیں اُن میں احتشام حسین کا نام بھی ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

ایک معزز گھرانا، جس کے افراد کا شمار مضافات اعظم گڈھ میں شرفاء میں ہوتا رہا، جس کا گھریلو ماحول اعلیٰ تہذیب تمدن کا نمونہ تھا اور جہاں آن بان، شان و شوکت کے ساتھ غیرت خودداری، شرافت اور وادودہش ہر فرد کے مزاج میں رچی بسی تھی۔ اُسی گھرانے میں سنہ ۱۹۱۲ء میں احتشام حسین نے آنکھیں کھولیں۔ مشہور انگریزی شاعر ملٹن نے کہا ہے :-

CHILD HOOD, SHOWS THE MAN HOOD

AS MORNING SHOWS THE DAY.

یعنی جس طور پر صبح یہ پتہ دیتی ہے کہ دن کیسا ہوگا اُسی طرح انسان کا بچپن یہ بتاتا ہے کہ اس کی زندگی کس طرح کی ہوگی۔ اس مقولے کی روشنی میں اگر ہم احتشام حسین کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ انھیں شروع ہی سے اردو ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ صرف چوبیس ۲۴ سال کی عمر میں انھوں نے سنہ ۱۹۳۶ء میں الہ آباد یونی ورسٹی سے اُردو ادب میں امتیاز کے ساتھ ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ دو سال بعد یعنی سنہ ۱۹۳۸ء میں اُن کا تقرر لکھنؤ یونی ورسٹی میں ہو گیا۔ ایک عرصے تک لکھنؤ میں ادب کی خدمت میں مصروف رہنے کے بعد وہ الہ آباد چلے آئے اور آخر دم تک الہ آباد یونی ورسٹی میں صدر شعبۂ اُردو کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے۔

پروفیسر احتشام حسین تنہا ایک شخصیت کا نام نہیں تھا وہ اپنے اندر نہ جانے کتنی شخصیتیں سموئے ہوئے تھے۔ وہ ایک اچھے معلّم تھے۔ ایک اچھے ادیب، شاعر و نقاد تھے۔ غرض جس پہلو سے دیکھیے ان کی ایک الگ شان نظر آتی تھی۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ احتشام حسین نے خود بھی آبروئے فن کی جان و دل سے قدر کی، ادب کی بقاء و تحفظ کی فکر کی اور اپنے باشعور شاگردوں کو بھی فن اور ادب کی قدر و منزلت سکھائی۔ انھوں نے ادب کو دور سے نہیں دیکھا، بلکہ خود ادب کے میدان میں مردِ مجاہد بن کر اُترے، زمانہ کی ہوا ناموافق ہوتے ہوئے بھی اس میدان میں ایک عملی کردار ادا کرنے کی ٹھان لی۔ انھوں نے ادب میں خاص طور پر تنقید کی روایت کو آگے بڑھانے کے لیے جدوجہد کی۔ احتشام حسین نے یہ جدوجہد خود ہی نہیں کی، بلکہ اپنے ہمنواؤں، دوستوں اور لائق شاگردوں کو بھی اپنے شانہ بشانہ چلنے کا حوصلہ بڑھایا۔ اُن کا عزم زمانہ کے

ناساعد حالات سے ہمیشہ سرگوشیاں کرتا رہتا

زندگی کی مشکلوں سے حوصلہ لیتے ہیں ہم
آندھیوں میں بھی چراغ اپنا جلا لیتے ہیں ہم

احتشام حسین ایک اچھے ادیب تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اُن سے ادب کو بہت کچھ ملا۔ تنقید اُن کا مخصوص موضوع تھا لیکن اس کے علاوہ انھوں نے بہت سے دلچسپ کارآمد اور مفید مقالے لکھے ہیں۔ اُن کے لکھنے کا انداز سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ یہ مضامین ادبی بھی ہیں، سماجی، اخلاقی اور مذہبی بھی۔ جس موضوع کو بھی موصوف نے لیا ہے اُس کے ہر گوشے پر انھوں نے اچھی خاصی روشنی ڈالی ہے۔ جس بات کو انھوں نے اٹھایا ہے اُسے مناسب دلائل سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر احتشام کو ادبی مسائل سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ جب کبھی شائقین ادب نے ان کے سامنے کوئی مسئلہ رکھا، انھوں نے بڑے خلوص سے اسے سمجھنے اور سمجھانے میں وقت دیا۔ جدید ادب کے مسائل ہوں، یا قدیم ادب کی باتیں، دونوں پر ان کی نگاہ یکساں رہتی تھی۔ ان کی نظر بلند اور ذہن وسیع تھا۔ دل میں پاکیزگی اور دماغ میں شگفتگی ہونے کی وجہ سے انھوں نے کبھی مسئلے کو ایک دائرے میں رہ کر نہیں سوچا۔ نہ وہ ادب میں گروپ بندی کے قائل تھے اور نہ انھوں نے کسی مکتب فکر سے اپنے کو وابستہ کیا۔

ادب کیا ہے۔ ادب اور سماج کا کیا تعلق ہے؟ ایسے دقیق سوالات پر احتشام حسین کی نگاہ ہمیشہ رہی۔ اُن کے نکتہ رس ذہن نے ایسے موضوعات پر نہایت ہی سنجیدگی اور گہرائی سے سوچا ہے۔ ادب سماج کا آئینہ دار ہے۔ ادب وہ عکاس ہے جس پر سماج کی ہر آواز سنی جا سکتی ہے۔ وہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں قوموں کے عروج و زوال، تعمیر و ترقی کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ ادب کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ قوم کے سامنے وہی تصویر پیش کرے جو نسلوں کے شعور کو ابھارے۔ اس کی حس کو تیز کرے۔ قوت عمل کو مہمیز عطا کرے اور زندگی کے ان اچھے پہلوؤں کو سامنے رکھے جن سے قوموں کی تعمیر ہوتی ہے، جن سے ملکوں کا تحفظ ہوتا ہے۔ جن کی بدولت انسان و انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتی ہے۔ ادیب کی یہ بہت ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے تاریک ہی نہیں روشن پہلوؤں کی بھی نشاندہی کرے۔ انسان کو اس کی عظمت و مرتبہ سے آگاہ کرے۔ چاہے وہ ایک ہی لمحے کے لیے لکھے لیکن وہ ایک لمحے کی قلم کی گردش ملک و قوم کی قسمت سنوارنے کے لیے کافی ہو اور ساتھ ہی اس کی آواز میں وقت کے تقاضوں کی بھی جھنکار ملتی رہے۔

اس بڑی ذمہ داری سے گزرنے کے لیے دنیا کے ہر ادب میں فکر و فن کی پختگی ایک نہایت ضروری چیز رہی ہے۔ اگر اس بات کی کمی ہوگی تو ہمارا ادب بھٹک بھی سکتا ہے، ٹھوکریں بھی کھا سکتا ہے۔ ادب کے آئینے میں عصری میلان ضرور ہو، اس میں وقت کی جھنکار بلاشبہ سنائی دے لیکن ساتھ ہی ادب سماج میں صالح ذہن کی تخلیق میں مدد دے۔ اعلیٰ و صحت مند شعور پیدا کرے۔ احتشام حسین انھیں خیالات کے زبردست حامی تھے۔ ان کا نظریۂ ادب مثبت اور رجائی رہا ہے۔ انھوں نے ادب میں نیک، صالح، صحت مند، پاکیزہ رجحانات پر بہت زور دیا۔ زندگی کی اعلیٰ تعمیر، معاشرہ کی صحیح اصلاح و تربیت، پاکیزہ و صحت مند شعور کی بیداری ایک ترقی پسند و ترقی پذیر ادب کی ذمہ داری ہے۔ احتشام حسین نے اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھا تھا۔ مثال کے طور پر آج کے ایٹمی ہنگاموں نے اس جہان نو کا چہرہ مسخ کر رکھا ہے۔ ہر طرف ایک عجیب سا ہیجان و اضطراب کا عالم ہے۔ ہر شخص یہ محسوس کر رہا ہے کہ سائنس نے اگر کچھ دیا ہے تو بہت کچھ ہم سے چھین بھی لیا ہے۔ زندگی کی یکسانیت و ہم آہنگی مفقود ہو گئی ہے۔ معاشرہ میں انفرادیت کا زہر پھیلتا جا رہا ہے۔ اجتماعی زندگی کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ ہر شخص انفرادیت کے مضبوط شکنجے میں جکڑتا جا رہا ہے۔ آج ہر آدمی کو بس اپنی فکر ہے، دوسرے کی نہیں۔ یہی سبب ہے کہ آج ہر شخص کو ایک

سنے احساس نے گھیر لیا ہے اور وہ ہے احساس تنہائی، یہ احساس (تنہائی) ادب کا بھی ایک اہم موضوع بنا ہوا ہے۔ کہیں کہیں یہ جذبہ اتنا شدت اختیار کر گیا ہے کہ کچھ لوگ اسے آج کے انسان کی تقدیر سمجھنے لگے ہیں۔ ان کے نزدیک فرد کو معاشرہ میں فطری زندگی بسر کرنا مشکل ہی نہیں غیر ممکن ہو گیا ہے۔ ایک طرف مشینی دور نے اس کے سکون کو درہم وبرہم کر رکھا ہے تو دوسری جانب معاشی و اقتصادی بدحالی کا وہ بُری طرح شکار ہے۔ کچھ لوگ ان حالات سے اس قدر مایوس و دل شکستہ ہیں کہ انسانیت کا مستقبل انھیں قطعی تاریک نظر آنے لگا ہے ؎

ہزار چہرے ہیں موجود آدمی غائب
یہ کس خرابے میں دنیا نے لا کے چھوڑ دیا!

اب اس اہم موضوع پر احتشام صاحب کی رائے ملاحظہ فرمائیں جو یقینی طور پر مفید بھی ہے اور صحت مند بھی —

"...... تنہائی عام انسانوں کی مستقل کیفیت نہیں ہے۔ ایسے لوگ جو عوام سے خود کو الگ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اپنے کو تنہا پاتے ہیں اور نفسیاتی طور پر اسے اپنی برتری قرار دیتے ہیں ..... بعض انفرادیت پسند اور وجودی فلسفیوں نے اس کو انسان کی تقدیر قرار دیا ہے۔ یورپ و امریکہ کے بعض مفکروں نے اس خیال کو عام کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ ان میں سے اکثر وہی عیسائی مفکر ہیں جو انسان کے اولین گناہ کے احساس کو ہر انسان پر مستولی کرنا چاہتے ہیں، یہی ان کے لیے انتشار طبع، فکرمندی، احساس پشیمانی، تنہائی اور قنوطیت کا خالق ہے۔ اس کو ایک طبع کا فلسفیانہ لباس پہنا کر بعض ماہرین تحلیل نفسی نے عام سماجی زبوں حالی، صنعتی ترقی، شہروں کی ہما ہمی سائنسی ارتقاء اور حاکمانہ اقتدار کے سامنے فرد کی بے بسی اور بے چارگی سے وابستہ کر دیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہی فرد کی قسمت ہے لیکن تاریخ اور روزمرہ کے واقعات اس کی نفی کرتے ہیں۔ یوں بھی انسان کا تنہا، بے بس، بے حقیقت بے یار و مددگار ہونا ایک بات ہے اور احساس تنہائی دوسری بات، جب سماجی حالات فرد کو بے بس اور مجبور کر دیتے ہیں اس وقت اُس کے لیے دو راستے رہ جاتے ہیں، گھٹنا، کڑھنا، یاسیت کا شکار ہو کر خودکشی یا موت کا انتظار، دوسرا راستہ اس حالت کو بدلنے کے لیے جدوجہد کا ہے۔ پہلے طرزِ عمل کی حمایت رجعت پسند مفکروں کی طرف سے ہوتی ہے جو طرح طرح سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ جدوجہد کے بعد بھی کچھ حاصل نہ ہوگا، اس فلسفہ کی مدد سے تقدیر پرستی، انسانی قوت کی بے حقیقتی اور عمل سے گریز کی تعلیم دی جاتی ہے۔ دوسرے قسم کے فلسفیوں نے فرد کی بے بسی، تنہائی، کمزوری اور پستی کو سماجی حالات کا نتیجہ بتا کر اپنی تقدیر کے بدلنے کی راہیں بھی بتائی ہیں اور تاریخ اس کی گواہ ہے کہ ہر انتشار و بحران کی صورت میں ہمیشہ یہی دوسرا راستہ عام انسانوں کا راستہ رہا ہے۔"[۱]

احتشام حسین نے ایک جگہ اور بھی بہت ہی واضح طور پر لکھا ہے :-

"..... تنہائی پسندی اور اس کی تبلیغ درحقیقت دوسرے انسانوں سے نفرت کی ایک معکوس اور بگڑی ہوئی شکل ہے اس کا قابلِ پرستش قرار دیا جانا انسان کی تذلیل ہے۔ یہ ایک خاص گروہ کا سماجی اور شعوری احساس ہے اور بعض حالات میں اپنے اوپر طاری کیا ہوا احساس ہے۔"[۲]

یہی کیفیت احتشام حسین کی شاعری کی بھی رہی ہے۔ گو کہ انھوں نے شعر کم کہے ہیں لیکن جو کچھ بھی بصورت نظم ادب میں پیش کیا ہے وہ کم مایہ نہیں بلکہ گراں مایہ ہے۔ احتشام حسین کے کلام میں عجیب سی لطافت، شیرینی، شستگی و شگفتگی ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اُن کے کلام میں زندگی کی دھڑکنیں ہیں۔ ان کے پاس ایک حسین اور گہرا ادبی شعور بھی ہے اور یہی شعور ان کے

---

۱ جدید ادب کا تنہا آدمی۔ شب خون صفحہ ۷۔ نومبر ۱۹۶۶ء ۲ نئے معاشرے کے ویرانے میں۔ شب خون صفحہ ۱۱۔ نومبر ۱۹۶۸ء

کلام میں بھی جھلکتا ہے۔ تنہائی کے موضوع پر یہی ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو ۔

یہ آج کیا ہے کوئی راستہ نظر میں نہیں
میرا وجود مری جستجو میں تنہا ہے !

احتشام حسین اردو ادب کے جید عالم اور تنقید نگار تھے! ان کا شمار ہمیشہ صف اول کے نقادوں میں ہوتا رہے گا۔ انھوں نے تنقید کے اصول وضوابط پر خاصی توجہ دی۔ تنقید کی راہیں معین کیں۔ اس کی بنیادوں کو استوار کیا اور ان روایات کو جنم دیا جن پر چل کر فن تنقید ایک کارآمد باوقار صنف بن سکے اور دوسرے ادب کے شانہ بشانہ چل کر اردو تنقید کی صنف بھی اپنا ایک مقام بنا سکے ۔ بقول اعجاز حسین ـــــ

"اردو تنقید کی بڑھتی ہوئی روش کو احتشام حسین نے اپنے وسیع مطالعہ اور پُرمغز تحریر سے بڑی توانائی عطا کی۔ ابتدا ہی سے ان کی تحریر میں غور وفکر کا عنصر نمایاں تھا۔ جیسے جیسے مطالعہ وسیع ہوتا گیا۔ سوجھ بوجھ میں اضافہ ہوتا گیا ...... احتشام حسین نے فن تنقید پر حسن اتفاق سے اسی زمانے میں دل چسپی لی جب ان کے سامنے تیزی سے نئے مسائل آرہے تھے اور یہ فن اردو میں ہمیشہ سے زیادہ اہمیت حاصل کرنے لگا تھا۔ خیال، ہیئت، مواد پر فنی لحاظ سے تبصرے ہونے لگے تھے۔ آزاد، شبلی، حالی کی کاوشوں سے فائدہ اٹھا کر اہل قلم مغرب کے طرز تخیل وفکر سے اردو ادب پر ترقی یافتہ انداز میں تنقید یں پیش کرنے لگے تھے۔ احتشام حسین نے اپنے وسیع مطالعے سے اس ادبی تحریک کو فائدہ پہنچانے کی کامیاب کوشش کی۔ انھوں نے متعدد مضامین ایسے لکھے جن سے یہ بات ذہن نشین ہوتی رہے کہ ہیئت ومواد کی اہمیت وضرورت کیا ہے۔ شاعری جمالیاتی اقدار کا کیا مطلب ہے۔ سماج اور ادب میں کیا رشتہ ہے۔ تنقید وعملی تنقید کا مطلب کیا ہے؟"[1]

بات ادھوری رہ جائے گی اگر اس سلسلے میں احتشام حسین کی عام انسان دوستی، ان کے خلوص، محبت، ہمدردی، اور بھائی چارگی کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ احتشام حسین ایک خوش مزاج، خوش اخلاق اور خوش ذوق انسان تھے۔ ان کی طبیعت مرنجان مرنج اور ان کا دل باغ وبہار تھا۔ شعر وادب کی محفل ہو یا ان کا اپنا کمرہ یونیورسٹی کا ماحول ہو یا اساتذہ کا ساتھ، ان کا ہمیشہ ایک حال، ایک رنگ رہا کرتا تھا۔ "کوئی بزم" "کوئی انجمن" ہو جہاں بھی "روشنی کی کمی" ملتی احتشام حسین اپنی جوش طبع سے "ایک چراغ" ضرور جلا دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ یونیورسٹی سے گھر تک، احباب سے اعزا تک اور ملک سے بیرون ملک تک ہمیشہ ہر دل عزیز رہے۔

احتشام حسین جہاں بھی رہے وہ اردو کی ترویج وترقی، تبلیغ واشاعت کے لیے جد وجہد کرتے رہے۔ انھوں نے تنقیدی ادب کی راہیں استوار وروشن کیں اور 'عکس اور آئینہ'، 'تنقیدی جائزے'، 'روایت اور بغاوت'، 'ادب اور سماج'، 'اعتبار نظر'، 'ہندستانی لسانیات کا خاکہ'، ذوق ادب اور شعور، 'تنقیدی نظریات' وغیرہ نہایت اہم اور مستند کتابیں لکھ کر تنقید کے دامن کو مالا مال بنا یا۔ اسی طرح ۱۹۵۳ء میں سفر یورپ وامریکہ کے بعد 'ساحل وسمندر' سپرد قلم کر کے احتشام حسین نے ادب کو ایک نادر، واچھوتا تحفہ پیش کیا۔

آج احتشام حسین ہمارے درمیان میں نہیں ہیں لیکن انھیں مرحوم کہتے ہوئے کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ وہ ایک اچھے فن کار تھے اور فن کار کو کبھی موت نہیں آتی۔ اس کے ہونٹ ضرور بند ہو جاتے ہیں۔ قلم کی جنبش ضرور رک جاتی ہے لیکن اس کا فن کبھی نہیں مرتا۔ اس کا پیغام کبھی مردہ نہیں ہوتا، اس کی روح کبھی نہیں فنا ہوتی۔ احتشام حسین نے تنقید کی جو روایات ہمیں سونپیں، ادب کی جو قدریں ہمیں عطا کی ہیں وہ ان کی یاد ہمیشہ دلاتی رہیں گی، ان کی جلائی ہوئی شمعیں ادب کی راہ کو ہمیشہ منور کریں گی اور ان کے چھوڑے ہوئے نقوش آئندہ آنے والی نسلوں کو نیا عزم وشعور دیتے رہیں گے۔

★

[1] مختصر تاریخ ادب اردو (فروغ اردو ایڈیشن) ڈاکٹر اعجاز حسین صفحہ ۵۱۲۔

کلام و افکارِ احتشام

[ان صفحات میں پروفیسر احتشام حسین صاحب کی کچھ نظمیں اور غزلیں شائع کی جا رہی ہیں جن سے قارئین احتشام صاحب کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ لگا سکیں گے۔ ان میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں نگارشات شامل ہیں۔]

مایوسی کے لمحوں میں

وقت کی گود میں سوتے تھے ہزاروں فتنے
اب جو بیدار ہیں یہ ان کو سلائے گا کون
جن ہواؤں میں الجھ جاتے ہیں امید کے خواب
راہ پر ایسی ہواؤں کو لگائے گا کون

کیوں ہوئی جاتی ہے سرخی میں سیاہی شامل
کیوں گھٹی جاتی ہے روحِ طربِ انسانی
قوتیں خیر کی سہمی ہوئی کیوں بیٹھی ہیں
کیوں بڑھی جاتی ہے فتنوں کی جنوں سامانی

یہ مچلتے ہوئے بادل یہ اندھیری راتیں
کب افق چمکے گا کب دورِ اندھیرا ہو گا؟
دل ہے تاریک تو ہر وقت یہ اٹھتا ہے سوال
رات ہی رات رہے گی کہ سویرا ہو گا؟

جس طرف دیکھیے تاریک فضا ہے اب تک
دیکھیں کس سمت سے ہوتا ہے اجالا پہلے
نزع میں لوٹ رہے ہیں کئی اژدر اک ساتھ
دیکھیے لیتا ہے کون ان میں سنبھالا پہلے

بربریت، بھوک، ستم کیش غلاموں کے لیے
کوئی دولت نہیں کیا ظلم کی دولت کے سوا؟
ہر طرف مٹتے ہوئے شہر تڑپتی مخلوق
کیا زمانے میں نہیں کچھ بھی مصیبت کے سوا

دل کے ویران کھنڈر میں ہیں مٹی سی راہیں
کچھ ارادے ہیں کہ ہر بار بھٹک جاتے ہیں
کتنی مایوسی کے جذبات ہیں سینے میں مرے
کتنے کانٹے ہیں کہ رہ رہ کے کھٹک جاتے ہیں

رقص کرتا ہے سرِ راہ جنونِ وحشت
خون جیبوں میں بھرے ہیں ابھی خونخواروں کے
یہ جہاں آگ بھی ہے اور یہی گلزار بھی ہے
پھول جلتے نظر آتے ہیں چمن زاروں میں

چاہتا ہوں کہ غم و یاس کی باتیں نہ کروں
آہ اس طرح کروں میں کہ نہ سن پائے کوئی
یوں صنم توڑ دوں ظلمت کے کہ تا حشر تلک
روشنی کے لیے محتاج نہ رہ جائے کوئی

لیکن اب تک یہ سمجھ میں نہیں آیا اے دوست
کیسے مرجھائے ہوئے دل کو شگفتہ کر لوں
روشنی لاؤں کہاں سے کہ یہ اندازِ طرب
صبح کے سر پہ اندھیرے کو ضیا سے بھر دوں

۱۹۴۷ء

کون ہے خالق اِن نظموں کا

معمولی سا اک انساں ہے
جس نے کرب و مسرّت کی دنیا میں
مرگ و زیست کا زہر پیا ہے
جس نے تخلیقی لمحات میں اکثر
پھولوں کی آواز سنی ہے، لفظوں کی خوشبو سونگھی ہے
چاند کی کرنوں کی ٹھنڈک کو چکھ کر بھی محسوس کیا ہے
بانہیں جو آنکھوں نے سنگیت کی لہریں دیکھی ہیں
کون ہے خالق ان نظموں کا
اس کو جان کے کیا پاؤ گے
کیا وہ ان لفظوں میں نہیں ہے
جن کے لمس سے ذہن و قلب تمہارے جاگ اُٹھے ہیں ؟
فرض کرو وہ کوئی نہیں ہے
رنگوں کا اک مجموعہ ہے، موسیقی ہے رقصِ صدا ہے
آوازوں کا اک طوفاں ہے
(کیا نہیں سمجھے ؟ اچھا پھر کچھ ایسا سمجھو!)
وقت کے دریا میں بہتا اک زندہ شعلہ
نورِ ازل کی ایک علامت، وارثِ ذوقِ گناہِ آدم

جس نے
رقص کو اک پیچیدہ نظم کی صورت
بحر و وزن میں ڈھلتے کا نظارہ کیا ہے
اس کو جان کے کیا پاؤ گے، اس کو دیکھ کے کیا سمجھو گے
اس کے درد و کرب کو دیکھو
اس کے لفظ و خیال کو سمجھو
پھول اور پتھر ہاتھوں میں لے کر شہر کی گلیوں میں پھرتا ہے
چہروں کی شکنیں پڑھتا ہے، نظروں کی باتیں سنتا ہے
اس کی فکر کے آئینے میں ہر تصویر چمک جاتی ہے
اس کے ذہن کی دھرتی میں ہر بیج سے کونپل پھوٹتی ہے
وہ نغمہ ہے، وہ دھرتی ہے
وہ طائر ہے، جسم بھی ہے اور رُوح بھی ہے
وہ شاعر ہے، وہ انساں ہے
تم نے اسے دیکھا بھی ہوگا
اور اگر وہ حرفِ صدا ہے
اس کو جان کے کیا پاؤ گے، اس کو دیکھ کے کیا سمجھو گے!
کیا وہ ان شعروں میں نہیں ہے.

غزلیات

محفلِ دوست میں گو سینہ فگار آئے ہیں
صورتِ نغمہ بہ اندازِ بہار آئے ہیں

اس نظر سے کہ ترے ظلم کی تشہیر نہ ہو
بے قراری میں لیے دل کا قرار آئے ہیں

ایک پندارِ خودی جس کو بچا رکھا تھا
آج ہم وہ بھی تری بزم میں ہار آئے ہیں

قلّتِ شامِ خزاں یاد کرے گی برسوں
ہم جب آئے ہیں گلستاں کو نکھار آئے ہیں

دیکھنا لوٹ گئی کون سی بستی یارو
اُڑ کے دل تک جو گزرگہ کے غبار آئے ہیں

زندگی روز نئی ہوتی ہے دل والوں کی
گرچہ ہر موڑ پہ ہم لیل و نہار آئے ہیں

اپنے انجام سے خوش اپنی وفا پہ نازاں
مسکراتے ہوئے ہم جانبِ دار آئے ہیں

اے رفیقانِ رہِ شوق کہاں ہو بولو
تم کو ہم شہرِ وہ بیاباں میں پکار آئے ہیں

ویشاکھ جیشٹھ ۱۸۹۵ شک

رگوں میں غم کا لہو بن کے جو مچلتے ہیں — وہ گیت ہیں کہ مری شاعری میں ڈھلتے ہیں
یہ کس نے دیکھ لیا اجنبی نگاہوں سے — دیارِ دل میں امیدوں کے تیر چلتے ہیں
نئی ہیں پیچ و خمِ زیست کی گزرگاہیں — جنھیں گرایا تھا غم نے وہ اب سنبھلتے ہیں
وہ راہ جس پہ کئی بار بچھ چکیں لاشیں — اسی پہ روز نئے کارواں نکلتے ہیں
تلاشِ نور میں ظلمت ہی کام آتی ہے — خزاں کی گود میں نخلِ بہار پلتے ہیں
تری نگاہ جگاتی ہے شوق کا جادو — جو اک چراغ بجھے سو چراغ جلتے ہیں
کبھی تو مڑ کے انھیں دیکھ، پوچھ لے کوئی بات — جو دو قدم پہ ترے ساتھ ساتھ چلتے ہیں
حصارِ شوق کی ٹوٹی ہوئی فصیلوں پر — بجھے بجھے سے چراغ آرزو کے جلتے ہیں

تلاشِ گل میں نکل آئے گھر سے دیوانے — جھلک کچھ ایسی دکھائی غبارِ صحرا نے
نہ دردِ زیست نہ حسنِ نظر نہ ذوقِ جمال — جنوں کے کلی نہ ہوئے کچھ خرد سے بیگانے
حصارِ عہد سے باہر بھی گونج جاتے ہیں — حدودِ وقت میں لکھے گئے جو افسانے
حقیقتوں نے جو رکھا شکارِ تشنہ لبی — تصوّرات میں چھلکا کیے ہیں پیمانے
وفا کی فصل اُگے گی اس اک تمنا میں — لہو سے سینچ رہا ہوں دلوں کے ویرانے
انھیں سلا دو پلا کر شرابِ کم نظری — کہ سنگِ وحشت سے رکتے نہیں یہ دیوانے
سکوں عجیب یہ آشوبِ آگہی سے ملا — خود اپنے ہی سے نظر آ رہے ہیں بیگانے
سبھی حدودِ زمان و مکاں کے ٹوٹ گئے — تمھارے پاس ہی رکھا امیدِ فردا نے

آسان راہِ فکر حریفوں نے ڈھونڈھ لی — میرے جنوں کی منزلِ دشوار دیکھ کر
سوچا تھا اب کریں گے گل و یاسمن کی بات — لب سی لیے ہیں حالتِ گلزار دیکھ کر
بجھتے ہیں اور بھڑکتے ہیں شعلے حیات کے — روئے سحر پہ شام کے آثار دیکھ کر
ضبطِ الم کا آج بھرم اپنے کھل گیا — اہلِ ستم کو درد میں غمخوار دیکھ کر
سورج چڑھا تو دھوپ کی لہروں میں غرق ہوں — جی خوش ہوا تھا سایۂ دیوار دیکھ کر
موجِ خیال پھیلتی جاتی تھی تا فلک — اب رک گئی ہے وقت کی رفتار دیکھ کر
آنسو ہیں یا ستارے ہیں کیا فیصلہ کریں — شہرِ طرب میں غم کی شبِ تار دیکھ کر

فطرت نے سونپ دی مجھے دنیائے آرزو
شائستگیٔ غم کا سزاوار دیکھ کر

★

روشنی کے نقطے

ان تحریروں کو احتشام صاحب کی ڈائری کے اوراق تصور کیجئے۔ اس عنوان کے تحت جس وقت بھی کوئی خیال ان کے ذہن میں آتا یا کوئی اچھا مقولہ نظر سے گزرتا وہ اسے نوٹ کر لیتے۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ ڈائری ہی پر نوٹ کریں کاغذ کا کوئی ٹکڑا یا کوئی رسالہ سامنے مل جاتا تو اسے ہی نوٹ کر لیتے۔ بہت سی نظمیں اور غزلیں بھی اسی انداز میں ملی ہیں۔ (ایڈیٹر)

ادب، ادیب اور قاری دونوں کے لیے زندگی کو سمجھنے اور اس کے رشتے قائم کرنے میں معین ہوتا ہے۔ ادیب اظہار خیال و جذبات کے ذریعہ اپنی بہترین تخلیقی اور فنی کاوشوں سے اس عمل میں شریک ہوتا ہے اور قاری اس تحریک کے ذریعے جو فن اور ادب اس کے لیے مہیا کرتے ہیں۔ اگر ادب متاثر نہیں کرتا تو کمزور ادب ہے اور اگر قاری کے شعور میں اس سے روشنی اور گرمی نہیں آتی تو اس کا مطالعہ محض وقت گزاری ہے۔

●

اگر اس بات کو سقراط کی نقل پر محمول نہ کیا جائے تو یقیناً میرے دل سے بھی بار بار یہی آواز آتی ہے کہ میں صرف ایک بات جانتا ہوں وہ یہ کہ کچھ نہیں جانتا۔ بس سقراط میں اور مجھ میں فرق یہ ہے کہ وہ سب کچھ جاننے کے بعد یہ کہتا تھا اور میں کچھ نہ جانتے ہوئے یہ کہتا ہوں۔ اور یہ فرق معمولی نہیں ہے۔ سقراط اپنی لاعلمی کا اظہار کرکے بڑے بڑے عالموں اور پنڈتوں کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیتا تھا کہ وہ جاہل ہیں اور اپنی جہالت کا احساس نہیں رکھتے۔ مجھ میں یہ صلاحیت بھی نہیں ہے کہ دوسروں کو ان کی جہالت ہی کا احساس کرا دوں۔

●

فن میں فن کار حقیقت کو چھپاتا ہے تاکہ تلاش کرنے والا اس کوشش میں لذت محسوس کرے۔ صنائع بدائع اور علامتوں کا استعمال اسی کا شعوری اور غیر شعوری نتیجہ ہے۔

●

احساس حسن کا مرکز عقل ہے یا تخیل کا جذبہ ہے یا علم؟ یہ طے ہو جاتا تو فلسفۂ جمالیات کی بہت سی مشکلات کی توجیہہ کی جا سکتی ہے۔

★

رحلت فخر مشرق نگار ——— تاثرات

(صفحہ [illegible] کا بقیہ)

ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی (سابق صدر یو۔پی۔جی۔سی، سکریٹری الہ آباد یونیورسٹی ٹیچرس ایسوسی ایشن)

احتشام صاحب سے میرے تعلقات ایک لکچرر کی حیثیت سے سب سے پہلے ہیں۔ اکثر مسئلے اور بہت سی باتوں پر میرا ان سے اختلاف ہوتا تھا لیکن میں نے ہمیشہ ان کو پرسکون متوازن اور سنجیدہ پایا۔ کوئی دوسرا آدمی ان حالات میں ان کی طرح نہیں رہ سکتا تھا۔ اساتذہ کی حالت کے سدھار کے بارے میں ان کی رائے ہمیشہ نپی تلی اور ان کی تجویزیں بہت ہی مفید اور قابل قبول ہوتی تھیں۔ وہ اپنی بات ہمیشہ وزن کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ڈاکٹر رگھوونش (ممتاز نقاد اور ہندی کے پروفیسر)

احتشام صاحب کو میں کچھ عرصے سے جانتا تھا۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس بیٹھنا ہی ایک طرح کی تحریک کا باعث ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس آدمی سے کوئی قربت ہے۔ احتشام صاحب ان لوگوں میں تھے جن سے مل کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ہمارے سچے ہمدرد اور ہم سے محبت کرنے والے ہیں۔ ادھر جب سے وہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہو کر آئے ان سے میرے گہرے تعلقات ہوئے اور ان سے برابر نئی تحریک ملتی رہی۔ میں نے ان کی گفتگو سے اکثر یہ محسوس کیا کہ وہ ہندی ادب اور اردو ادب دونوں پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ ان کے اٹھ جانے سے یونیورسٹی کے حلقوں میں جو دوسری کمی ہو گئی ہے وہ پوری نہیں کی جا سکتی۔

ڈاکٹر ہردیو باہری (ممتاز ماہر لسانیات)

میں بہت عرصے سے تو نہیں لیکن آٹھ برسوں سے احتشام صاحب کو بہت نزدیک سے جانتا ہوں جب سے وہ یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے آئے۔ اس وقت سے ان سے برابر میرے تعلقات رہے ہیں اور میں نے ان کو کئی پہلوؤں سے دیکھا ہے۔ اردو زبان و ادب کے وہ بڑے عالم اور نقاد تھے۔ اردو کی یقیناً انھوں نے بڑی خدمت کی لیکن آپ کو جان کر شاید کم ہی لوگ جانتے ہوں گے کہ وہ کئی زبانوں کے عالم تھے۔ کئی مرتبہ ہندی الفاظ کی اصل کے بارے میں ان سے بحث ہوئی اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ ہندی ہی نہیں سنسکرت کے بھی بہت بڑے پنڈت تھے۔ ایسے ممتاز ادیب و نقاد اور ایسے صلح جو اور عظیم انسان کا جس کا کسی کو دشمن نہیں پایا، اس زمانے میں ملنا مشکل ہے۔

شری کرشن داس

احتشام صاحب کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ وہ بہت بڑے ادیب، مفکر اور دانشور تھے۔ ان سب سے بڑھ کر وہ بہت بڑے انسان تھے، شرافت کا ایک بڑا ہی دلکش مجسمہ تھے۔

(ہندستانی اکیڈمی اتر پردیش الہ آباد کے جلسہ تعزیت کی بعض تقریروں کے اقتباسات)

★

دیکھئے صفحہ [illegible]

REGD. No. L. 319

احتشام حسین صاحب ماسکو میں ایشیائی عوام کے ادارے کے زیر اہتمام ۲۶ مئی ۱۹۶۹ء کو منعقدہ یوم غالب کی تقریب میں۔
مالک رام صاحب احتشام صاحب کے دائیں بیٹھے ہوئے ہیں

عنوانا

جلد ۲۹ نمبر ۴

اشاڑھ ۱۸۹۵ شک

جولائی ۱۹۷۳ء

چندہ سالانہ: پانچ روپے

فی پرچہ: پچاس پیسے

ایڈیٹر

خورشید احمد

پبلشر

شرومنی شرما

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات، اترپردیش

پرنٹر

اشوک ور

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اسٹیشنری یوپی

مطبوعہ

نیوگورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ

محکمۂ اطلاعات، اترپردیش

اپنی بات

اتر پردیش میں ۱۳؍جون ۱۹۷۳ء سے صدر راج نافذ ہو جانے کے بعد گورنر اتر پردیش شری اکبر علی خاں نے منجانب صدر ریاست کا نظم و نسق سنبھال لیا ہے اور شری ششتیش چندر چیف سکریٹری، شری بی بی لال اور شری منظور عالم قریشی گورنر کے مشیر مقرر ہوئے ہیں۔ ریاستی حکومت کے چیف سکریٹری کے عہدے پر شری گیان پرکاش مامور ہوئے ہیں۔ ریاست میں صدر راج کی ضرورت پی۔ اے۔ سی کی حالیہ سرکشی سے پیدا ہونے والی صورت حال کے باعث محسوس کی جا رہی تھی۔ چنانچہ وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی نے نظم و نسق کے احترام کی جانب سے لاپرواہی کے بڑھتے ہوئے رجحان کے پیش نظر خود صدر جمہوریہ سے ریاست کا نظم و نسق فوری طور پر سنبھال لینے کی درخواست کی اور اپنی وزارت کا استعفا گورنر کو پیش کیا۔ شری ترپاٹھی نے اپنے خط میں جو انھوں نے اپنی وزارت کے استعفیٰ کے سلسلے میں گورنر کو بھیجا تھا لکھا کہ پی۔ اے۔ سی کی نظم و ضبط کے منافی کارروائیوں نے ریاستی پولیس فورس کے سول اور دیگر عملے کی ڈسپلن اور کارکردگی پر بہت خراب اثر ڈالا ہے۔ اس لیے خود ریاست کے اور ملک کے مفاد میں اب یہ انتہائی ضروری ہو گیا ہے کہ سول اور مسلح پولیس کی تنظیم اس طرح کی جائے کہ وہ عوام کی خدمت کا زیادہ موثر اور منضبط وسیلہ بن جائے نیز یہ کہ مرکز اس معاملے میں سریع اور مناسب کارروائی کر سکتا ہے۔

اگرچہ صدر راج کی میعاد کا تعین خود صدر کے اعلان میں بھی نہیں کیا گیا ہے لیکن گورنر اتر پردیش شری اکبر علی خاں نے صدر راج کے اعلان کے بعد آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے عوام کے نام ایک پیغام نشر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی پوری کوشش یہی ہوگی کہ نظم و نسق کی ذمے داریاں جلد سے جلد عوامی حکومت کو منتقل کر دی جائیں۔ گورنر کے نشری پیغام کو اس کی اہمیت کے پیش نظر یہاں درج کیا جا رہا ہے:

"میرے دوست شری کملاپتی ترپاٹھی نے اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ میرا ایک ناخوشگوار فرض تھا کہ مجھے اس کو منظور کرنا پڑا اور صدر سے سفارش کرنا پڑی کہ اتر پردیش میں صدر راج قائم کیا جائے۔

یہ استعفیٰ ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ ترپاٹھی جی کو نہ صرف رولنگ پارٹی کا پورا اعتماد حاصل ہے بلکہ ابھی حال میں پی۔ اے۔ سی کے ایک غلط کام سے جو مشکل مسائل اٹھ کھڑے ہوئے تھے ان پر بھی ترپاٹھی جی نے بڑی خوبی سے قابو پا لیا تھا۔ پھر بھی وہ اپنی مرضی اور اپنے تمام ساتھیوں کی متفقہ رائے سے حکومت سے الگ ہو گئے۔ عوام کی بھلائی کا یہ خیال جمہوریت کی تاریخ میں جلی حرفوں میں لکھا جائے گا۔ راشٹرپتی نے میری سفارش منظور کر لی اور صدر راج کا اعلان کر دیا۔

اب اتر پردیش کی حکومت کا یہ بھاری بوجھ میرے اوپر آ پڑا ہے اور صدر کی ہدایت پر چل کر مجھے انجام دینا ہے۔

میں ہمیشہ سے عوام کا خادم رہا ہوں۔ اسی خدمت کے نتیجے میں مہاتما گاندھی کے قدموں میں بیٹھا ہوں۔ مجھے جواہر لال جی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی خدمت میں بھی حاضری کا شرف حاصل رہا ہے۔ اسی لیے میں امکانی کوشش کروں گا کہ جو فرائض میرے سپرد ہوئے ہیں انھیں ذمے داری کے ساتھ انجام دوں۔

میں اپنی سرکار کے تمام ذمہ دار عہدیداروں سے عرض کروں گا کہ وہ سچے دل سے خدمت میں لگ جائیں اور جو کام بھی ان کے ذمے ہے اسے لگن کے ساتھ پورا کریں۔ جن مسئلوں سے نپٹنا ہے وہ پیچیدہ بھی ہیں اور نازک بھی۔ اس لیے کوئی بھی سرکاری ملازم اپنے کام کو ہلکا نہ سمجھے اور اس کی طرف سے غافل نہ رہے۔ ہر شخص چوکنا رہے اور پورے اعتماد اور ہمت سے کام کرے۔

مجھے یقین ہے کہ لگن، ایمانداری اور مستعدی سے کام لیا جائے تو کوئی مشکل ایسی نہیں ہے جو حل نہ ہو سکے۔

میں نے اس تھوڑے سے وقفے میں، جب سے کہ میں نے موجودہ ذمے داری سنبھالی ہے، اتر پردیش کے ۴۸ ضلعوں کا دورہ کیا ہے۔ مجھے ہر جگہ محسوس ہوا کہ عوام حکومت کا ساتھ دینے اور ہاتھ بٹانے کے لیے تیار ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ لوگ پریشان ہیں، ان کی بستیاں گندی ہیں، پھر بھی ان کے دل پاک، ان کی نیت صاف اور ان کی آنکھیں محبت کے نور سے چمک رہی ہیں۔ اگر ہم ان کا دل ہاتھ میں لے کر کام کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم کامیاب نہ ہوں اور یہ مشکلیں دور نہ ہوں جن میں چھوٹے بڑے سبھی الجھے ہوئے ہیں۔

وقت کا سب سے بڑا مسئلہ غذا کا ہے۔ اناج کو سماج میں ہمیشہ سے بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مگر اس وقت اسے ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ وہ اس لیے کہ ہم نے سماج واد کی طرف ایک ایسا قدم بڑھایا ہے جس سے ان تمام بیوپاریوں میں جن کا سلسلہ ایک چھوٹے سے گاؤں سے لے کر پردیش اور دیش کی سبھی منڈیوں اور بازاروں میں پھیلا ہوا ہے ایک کھلبلی مچ گئی ہے۔

یہ لوگ کچھ اپنی غلط روش سے اور کچھ دوسروں کے اشاروں پر چل کے پوری طاقت سے کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارا یہ اقدام ناکام ہو جائے اور ہم سماج واد کے راستے سے ہٹ جائیں۔

یہ ان کی بھول ہے اور ہمیں اس بھول کو پریم اور پیار سے دور کرنا ہے۔ یہ پریم اور پیار ہندستان کا سب سے اونچا نشان ہے۔ ہمارا سماج واد بھی اسی نشان کو لے کر آگے بڑھ رہا ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ ہم اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوں گے۔

میں اس موقع پر اپنے نوجوان دوستوں سے اپیل کروں گا کہ وہ ملک کی مشکلات کے پیش نظر ایسی باتوں سے الگ رہیں جن سے تعلیمی اداروں میں نامناسب صورت حال پیدا ہو۔ آئندہ ملک کو چلانے والے آپ ہی نوجوان ہیں۔ میں آپ سے بڑے پیار سے کہوں گا کہ یہ سب آپ ہی کا ہے۔ آپ انھیں تباہ کریں گے تو کون انھیں بنائے گا۔ آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں اور صحیح راستے پر چلیں۔ اس میں آپ کا بھی فائدہ ہے اور سارے دیش کا بھی فائدہ ہے۔

مجھے اس موقع پر اتر پردیش کی جنتا سے اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ ہماری منزل جمہوریت اور سماج واد ہے۔ اس کے لیے آج ہم کو پھر سے عہد کرنا ہے، نئی ہمت اور نئے حوصلے سے کام کرنا ہے اور ان سب ہی مشکلوں کو دور کرنا ہے جو ہمارے پردیش کے سامنے ہیں۔

آخر میں یہ صاف طور سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میری یہ ممکنہ کوشش رہے گی کہ حالات جلد سے جلد سدھر جائیں اور یہ امانت پھر جنتا کے نمائندوں کے سپرد کر دی جائے۔"

اس وقت ہم ایک نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ اس میں ریاست کے ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ فرض شناسی سے اور دیانت داری سے کام لے اور نظم و نسق میں اصلاحات کرنے، پولیس اور پی۔ اے۔ سی میں نظم و ضبط کو سختی کے ساتھ نافذ کرنے اور ان مسائل کو حل کرنے میں جو یو۔ پی کی وزارت کے سامنے تھے اور جن کے نتیجے کا اثر بہت دور تک پڑ سکتا تھا، موجودہ انتظامی مشینری کا ہاتھ بٹائے۔ یہ صحیح ہے کہ گورنر کی مدد کے لیے بہت ہی لائق اور مسلمہ اہلیت کے مالک افسروں کو بحیثیت مشیر مقرر کیا گیا ہے لیکن اصلاحات کے نفاذ، مسائل کے حل اور تبدیلیوں میں استحکام لانے کے لیے عوام کا تعاون اور ان کی مدد اشد ضروری ہے۔ اور یہ مدد و تعاون جتنا زیادہ اور بے لوث ہوگا اتنا ہی جلد ریاست میں عوام کے نمائندوں کو دوبارہ ذمے داریاں سونپنے کے لیے راستہ ہموار ہوگا۔

—— ایڈیٹر

غزل

سیّد حامد

کہیں زباں سے، اگر دل پہ اختیار چلے
عجیب لوگ تھے پہلے ہی دل جو ہار چلے

مچی ہے دھوم چمن میں خزاں کے آنے کی
خوش آمدید کو گلشن سے برگ و بار چلے

پہاڑ کاٹ کے ہم جوئے شیر لائے ہیں
کیا سکون کو پیدا ہوس کو مار چلے

بپا ہے حُسن و وفا میں نفاقِ آتش و آب
گئے جہاں سے تو عشاق یہ پکار چلے

جُنوں میں ہاتھ کا چلنا بجا، مزا جب ہے
ہوا کے دوش پہ دامن کا تار تار چلے

انھیں شکایتِ پنہاں کی لذتیں معلوم
جو تیرہ روز پئے لطفِ آشکار چلے

یہ دھوپ چھاؤں انوکھی ہے شکوہ کرنے پر
شکن جبیں پہ، نظر سوئے اعتذار چلے

گھٹائیں جھوم کے اُٹھی ہیں صاعقہ بردوش
مئے شباب سے سرشار جیسے نار چلے

چلی یہ کیسی ہوا ہے، شگوفۂ گلِ تر
چمن کو چھوڑ، بہ سودائے کوکنار چلے

رہیں حیات کو ہم سے شکایتیں کیا کیا
ہمیں یہ فخر کہ ہم زندگی گزار چلے

جو بات ٹھیک سے کرنے نہ پائے وہ حامد
بساطِ شعر پہ مثلِ شگرف کار چلے

جگر مرادآبادی کی شاعری میں خود پسندی

ڈاکٹر سلام سندیلوی

خود پسندی (VANITY) نرگسیت کا ایک اہم عنصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کیرن ہارنی نے نرگسیت کی تعریف میں سب سے پہلے خود پسندی کا ذکر کیا ہے۔ خود پسندی اور خودداری دونوں کا تعلق داخلی شخصیت (INNER SELF) سے ہے۔ مگر خودداری اور خود پسندی میں فرق ہے۔ خودداری کو ماہرین نفسیات نے معیوب جذبہ نہیں قرار دیا ہے۔ مگر خود پسندی کا رجحان ایک ناخوشگوار رجحان ہے۔ اس رجحان کے بارے میں مکڈوگل نے اپنے خیالات کا اظہار بہت واضح طور پر کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ عام انسان میں خود ادعائی (SELF ASSERTION) اور فروتنی (SUBMISSION) کے درمیان توازن ہوتا ہے۔ اور اس توازن سے خودداری پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جب اس قسم کا توازن ختم ہو جاتا ہے تو خود ادعائی کی کیفیت میں اضافہ ہو جاتا ہے اگر اس ادعائی کا مقصد صرف طمانیت قلب ہو تو ہم اس کو خود پسندی (VANITY) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ لیکن جب خود پسندی اپنے حدود سے تجاوز کر جاتی ہے تو اس کو ہم تکبیر (CONCEIT) کی اصطلاح سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ لیکن جب یہ احساس اور بھی شدید ہو جاتا ہے تو اس کو جذبۂ برتری (MAGALOMANIA) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

الفریڈ ایڈلر نے خود پسندی کے بارے میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کا قول ہے کہ جب جذبۂ قدر شناسی (STRIVING FOR RECOGNITION) کی خواہش انسان پر غالب آجاتی ہے تو وہ پریشانی (ANXIETY) میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ وہ ہر وقت اپنی شخصیت کو ابھارنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے یہاں تک کہ وہ خود پسندی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔[3]

جب خود پسندی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ایسا شخص فضول کاموں میں وقت ضائع کرتا ہے اور سعیٔ لاحاصل میں اسیر رہتا ہے۔ وہ حقیقت (REALITIY) کو فراموش کر دیتا ہے۔ کچھ لوگ خود پسندی کو اولوالعزمی (AMBITION) کے مترادف سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کو پھرتیلاپن اور چستی (ACTIVITY AND ENERGY) تعبیر کرتے ہیں۔ بیشک یہ خوبیاں قابل ستائش ہیں البتہ اس قسم کے جذبات اگر سماج کے لیے ہیں تو ان کو مستحسن نظروں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ جذبات خود غرضی پر مبنی ہیں تو یقیناً قابلِ مذمت ہیں۔

گارڈنر کا قول ہے کہ انسان خود پسندی کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتا ہے۔ اس نے اس قسم کے دس طریقوں کا ذکر کیا ہے جن کو یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

---

1. NEW WAYS IN PSYCHOANALYSIS BY KAREN HORNEY P.88
2. AN OUTLINE OF PSYCHOLOGY BY MCDOUGALL P.428
3. UNDER STANDING HUMAN NATURE BY ALFRED ADLER P.191

۱ ۔ انسان اپنے کو ایسے حالات میں ڈال دیتا ہے جس میں اس کی کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ اپنی انا کا اظہار کرتا ہے۔

۲ ۔ بعض انسان عظیم مقاصد کو سامنے رکھتے ہیں۔ اگر وہ ان مقاصد کے حصول میں ناکام رہتے ہیں تب بھی ان پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا ہے۔

۳ ۔ انسان خود پسندی کے اظہار کے لیے اعلیٰ طبقے کے افراد سے تعلقات پیدا کرتا ہے۔

۴ ۔ انسان بعض اوقات خود کو کسی طاقتور شخص سے مماثل کر دیتا ہے اور اس طرح اپنی خود پسندی کا اظہار کرتا ہے۔

۵ ۔ انسان جب کسی کام کو کرنے سے معذور نظر آتا ہے تو وہ یہ کہتا ہے کہ مجھ کو ان کاموں سے دلچسپی نہیں ہے۔ اس طرح اول تو وہ اپنی ندامت پر پردہ ڈالتا ہے، دوسرے وہ خود پسندی کا بھی اظہار کرتا ہے۔

۶ ۔ خود پسندی کے اظہار کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ انسان ان تمام باتوں کو یاد کر کے دل بہلا سکتا ہے جو اس کی موافقت میں ہیں۔

۷ ۔ خود پسند انسان ایک اور طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنے مداحوں کا ایک حلقہ بنا لیتا ہے اور اس طرح اپنے جذبۂ خود پسندی کو تسکین دیتا ہے۔

۸ ۔ انسان کی خود پسندی کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ وہ اپنی اخلاقی قدروں کا اظہار کرے۔ مگر ایسی صورت میں وہ مبلغ نہیں بنتا ہے بلکہ اپنی شخصیت کو اخلاق کی روشنی میں نمایاں کرتا ہے۔

۹ ۔ انسان زندگی کی حرکات و سکنات سے لطف حاصل کرتا ہے۔ ایسی صورت میں بھی وہ خود پسندی کا اظہار کرتا ہے۔

۱۰ ۔ انسان دوسروں سے محبت کرتا ہے اور اس کے معاوضہ میں خود بھی محبت کا خواہاں ہے۔ خود پسندی کی یہ صورت بھی اہم ہے۔[1]

خود پسندی شعرا میں بھی پائی جاتی ہے۔ جس کا اظہار وہ مختلف طریقوں سے کرتے ہیں۔ اردو شعرا نے بھی خود پسندی کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً محمد قلی قطب شاہ، حاتم، سودا، میر، انشا، شاہ نصیر، ناسخ، مومن، غالب، میر انیس، داغ، ریاض اور یگانہ چنگیزی کے یہاں خود پسندی کے مختلف روپ ملتے ہیں، اسی زمرے میں ہم جگر مرادآبادی کو بھی رکھ سکتے ہیں۔

جگر کی شاعری کی فضا میں خود پسندی کی تابانی ملتی ہے۔ مگر جگر کی خود پسندی یگانہ چنگیزی کی خود پسندی کی طرح انگاروں کی شکل میں نمودار نہیں ہوتی ہے بلکہ اس میں تاروں کی جیسی ہلکی روشنی پائی جاتی ہے۔ جگر کی خود پسندی ان کی شہرت اور مقبولیت کی مرہون منت ہے۔ جگر اپنے دور کے مقبول ترین شاعر تھے۔ مشاعروں میں ان کے مقابلے میں اور کوئی نہیں جم سکتا تھا، بلکہ مشاعروں میں سامعین کا مجمع صرف جگر مرادآبادی کا نام سن کر سمندر کی لہروں کی طرح ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا تھا۔ جب جگر اپنی ہلکی پھلکی غزل مستانہ انداز میں پڑھتے تھے تو در و دیوار جھوم اٹھتے تھے۔ جگر کی خود پسندی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔

جگر کی خود پسندی کے مختلف پہلو ہیں۔ مثلاً جگر کے یہاں تعلّی کے بھی اشعار ملتے ہیں۔ مگر ان کی تعداد کم ہے۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے ان کی تعلّی ظاہر ہوتی ہے۔

گلوں سے مستی چھلک رہی ہے سراپا بلبل چہک رہی ہے
جگر کسی گوشۂ چمن میں، غزل کوئی اپنی گا رہے ہیں

شاعرِ فطرت ہوں میں جب شعر فرماتا ہوں میں ۔۔۔ روح بن کر ذرے ذرے میں سما جاتا ہوں میں

شاعر ہوں میں شاعر ہوں میرا ہی زمانہ ہے ۔۔۔ فطرت مرا آئینہ قدرت مرا شانہ ہے

واہ کیا مست غزل تو نے پڑھی آج جگر ۔۔۔ ایک اک لفظ چھلکتا ہوا پیمانہ ہے

بزمِ مشاعرہ ہے، یا گلشنِ تخیل ۔۔۔ بلبل چہک رہا ہے یا حضرتِ جگر ہیں

کیونکر بہار شعر سے ٹپکے نہ اے جگر ۔۔۔ رنگِ کلامِ حضرتِ اصغر نظر میں ہے

جگر کی شاعری میں خود پسندی کے دیگر عناصر بھی ملتے ہیں۔ مثلاً

1. AN INTRODUCTION TO PSYCHOLOGY BY GARDNER MURPHY P. 412 - 417

ان کے یہاں خود شناسی کی بھی مثالیں موجود ہیں۔ ان کے کلام میں خود شناسی دو صورتوں میں نمودار ہوتی ہے۔ خود شناسی کی پہلی شکل وہ ہے جس میں انھوں نے خود اپنی ذات کا عرفان کیا ہے اور اس میں انھوں نے واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

مجھ سے لگے ہیں عشق کی عظمت کو چار چاند خود حسن کو گواہ کیے جا رہا ہوں میں

اللہ اللہ یہ عرفانِ جنوں کی تاثیر آج جس خار سے کہدوں وہ گلستاں ہو جائے

صیاد میرے دم سے ہیں سارے یہ چہچے جب میں نہیں تو رونقِ گلزار بھی نہیں

مجھ سے قائم ہیں جنوں کی عظمتیں میں نے صحرا کو جگر۔ صحرا کیا

یہ مہر و ماہ مرے ہم سفر رہے برسوں پھر اس کے بعد مری گرد کو بھی پا نہ سکے

وہ گلوں تازگی رونق وہ گلشن میں نہیں خاک سی اڑتی ہے میں جب سے نشیمن میں نہیں

جگر نے ایک غزل "مجذوب کی صدا" کے عنوان سے کہی ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی ذات کی عکاسی کی ہے:

کمالِ بے بصری پر بھی کیا بلا ہوں میں وہ مجھ کو دیکھ رہا ہے یہ دیکھتا ہوں میں
تمام اصل و حقیقت کا آئینہ ہوں میں خدا نہیں ہوں مگر مظہرِ خدا ہوں میں
مٹائے لاکھ زمانہ میں مٹ نہیں سکتا اگر یہ سچ ہے کہ تیری ہی اک ادا ہوں میں
ہر ایک شے نظر آتی ہے خود مری تصویر جہاں سے منظرِ فطرت کو دیکھتا ہوں میں
تمام صفحۂ ہستی سے میرا نقشِ وجود کہ فخرِ عاشقی و نازشِ وفا ہوں میں

جگر کی مثنوی "عرفانِ خودی" بھی ان کی خود شناسی کو نمایاں کرتی ہے:

میرا نہیں غیر کوئی محرم سب مجھ میں ہے کائناتِ عالم
غنچوں میں نہاں ہیں میرے اسرار پھولوں میں نہاں ہیں میرے انوار
ذرّوں میں چمک ہے میرے دم سے قطروں میں جھلک ہے میرے دم سے
ہر بام ہے کوہِ طور میرا عالم پہ محیط نور میرا
میں جسم بھی اور جان بھی ہوں میں دل بھی ہوں اور زبان بھی ہوں
یعنی یہ جہاں نہیں ہے میں ہوں یہ کون و مکاں نہیں ہے میں ہوں

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں "میں" بنی نوع انسان کی صحیح نمائندگی کرتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس "میں" کا تعلق جگر کی ذاتِ خاص سے بھی ہے۔

جگر کی شاعری میں خود شناسی کی دوسری شکل وہ ہے جس میں انھوں نے بنی نوع انسان کی عظمت پر زیادہ واضح انداز میں روشنی ڈالی ہے اسی لیے ان اشعار میں انھوں نے جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں:

عشق میں لاجواب ہیں ہم لوگ ماہتاب آفتاب ہیں ہم لوگ
ہم پہ نازل ہوا صحیفۂ عشق صاحبانِ کتاب ہیں ہم لوگ

کبھی کبھی تو اسی ایک مشتِ خاک کے گرد طواف کرتے ہوئے ہفت آسماں گزرے

ہماری رفعتوں کا پوچھنا کیا جہاں ہم پاؤں رکھ دیں آسماں ہے

جگر کی خود پسندی میں ان کی نازک دماغی بھی شامل ہے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

اللہ اللہ میں بھی کیا نازک دماغِ عشق ہوں نکہتِ گل بھی ہے وجہ دردِ سر میرے لیے

نکہتِ گل کا بھی دماغ نہیں کتنا آزردۂ بہار ہوں میں

نہ چھیڑ ان کے تصور میں اے بہار مجھے کہ بوئے گل بھی ہے اس وقت ناگوار مجھے

اٹھ سکا ہم سے نہ بارِ التفاتِ ناز بھی مرحبا وہ جس کو تیرا غم گوارا ہو گیا

وقت آتا ہے اک ایسا بھی محبت میں جگر دل پہ احساسِ محبت بھی گراں ہوتا ہے

بہت لطیف مناظر بھی حسنِ فطرت کے نہ جانے آج طبیعت پہ کیوں گراں گزرے

جگر کی خود پسندی بہت نرم و نازک ہے۔ اس میں انگاروں کی دہکتی ہوئی گرمی نہیں محسوس ہوتی ہے، بلکہ اس پر گلاب کے پھولوں کی ہلکی سی آنچ کا گماں ہوتا ہے۔ اردو شاعری میں خود پسندی کا یہ لہجہ نہایت نازک اور لطیف ہے۔

جگر کی خود پسندی کا ایک نہایت نازک اور حسین پہلو ہے جس کو ہم جوابی محبت (RECIPROCAL LOVE) کہہ سکتے ہیں۔ عام طور سے اردو شعرا نے محبوب کو ظالم اور ستمگر قرار دیا ہے، اور اس کی بے رُخی اور بے اعتنائی کا شکوہ کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ زیادہ تر قدیم شعرا کا محبوب کوئی لڑکا رہا ہے۔ چونکہ ایک مرد کی محبت ایک لڑکے سے غیر فطری ہے اس لیے لڑکا کسی مرد کی محبت کا جواب نہیں دیتا ہے۔ دراصل لڑکے کے دل میں کسی مرد کی محبت کا جذبہ بیدار ہی نہیں ہو سکتا ہے، کیونکہ دونوں کا تعلق ایک ہی جنس سے ہے۔ اس بنا پر اردو شعرا نے اپنے محبوب کی سفاکی پر آنسو بہائے ہیں۔

اردو کے قدیم دور میں دہلی میں لڑکوں سے محبت کرنے کا عام رواج تھا۔ نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں سالار جنگ نے "مرقع دہلی" میں دہلی کے کچھ حسین لڑکوں کا ذکر کیا ہے، جن سے اس عہد میں دہلی کے امرا اور رؤسا محبت کرتے تھے۔ مثلاً اس دور کے محبوبوں میں دلی میں سلطانہ، اللہ بندی، رجی، ہینگا، کال کنکا، رحمان بائی، اور رمضانی وغیرہ کا شمار کیا جاتا تھا[1] چنانچہ شاہ مبارک آبرو رمضانی لونڈے کے بارے میں فرماتے ہیں۔

غلط دھرتے ہیں سارے مل کے اس کا ناؤں رمضانی
کیا ہے ذبح سب کو عیدِ قربانی ہے وہ لونڈا

شاہ مبارک آبرو مکھن میاں لڑکے پر بھی عاشق تھے۔ چنانچہ الکا شعر ہے۔

مکھن میاں غضب ہیں فقیروں کے حال پر آتا ہے ان کو جوش جمالی کمال پر

آبرو کا قول ہے کہ وہ عورت پر لونڈے کو ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

جو لونڈا چھوڑ کر رنڈی کو چاہے کوئی عاشق نہیں ہے بوالہوس ہے

عبدالحئی تاباں بذات خود نہایت حسین تھے، جن کے عاشقوں کا دہلی میں ایک گروہ تھا۔ اس کے باوجود سلمان نامی لڑکے پر مرتے تھے۔ سراج اورنگ آبادی ایک لالہ جی کے لڑکے کے عشق میں گرفتار تھے، جس کی محبت میں انھوں نے مثنوی "بوستانِ خیال" کہی ہے۔ اس کے علاوہ وہ عبدالرسول خاں سپاہی سے بھی محبت کرتے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

صبا میرے جوان لشکری کوں جا خبر کرنا دلِ بیدردی اس یار کے جا کر اثر کرنا

میر عطار کے لونڈے پر مرتے تھے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

مصحفی بھی لڑکوں کے دلدادہ ہیں۔ چنانچہ وہ مکتب کے لڑکوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

کبھی ہم تم پہ گل کھاتے پھرتے تھے ادمیاں لڑکے
سبق تم جن دنوں مکتب میں پڑھتے تھے گلستاں کا

مصحفی ان لڑکوں پر بھی جان دیتے تھے جو گلی میں گولیاں کھیلتے تھے۔ چنانچہ ان کا قول ہے ؎

ہم دل بکف نہادہ تھی اس کے گرد تھے
وہ جن دنوں کہ کھیلے تھا لڑکوں میں گولیاں

غرض کہ قدیم دور کے شعرا میں لڑکوں سے محبت کرنے کا رواج تھا جو بالکل غیر فطری تھا۔ دورِ متوسط کے شعرا نے باقاعدہ لڑکوں سے محبت نہیں کی ہے مگر رسمی اور قیاسی طور پر ان کے یہاں بھی ہم جنسی کے رجحان کی جھلک موجود ہے۔ یہاں تک کہ غالب جیسا حقیقت پسند شاعر اس روگ میں مبتلا ہے اور کہتا ہے۔

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

دورِ متاخرین میں بھی اس رجحان کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ چنانچہ امیر مینائی کہتے ہیں ؎

ہے سبزہ رنگ خط بھی بنا اب تو بوسہ دے
بیگانہ تھا جو سبزہ چمن سے نکل گیا

انھیں تمام اسباب کی بنا پر اردو شعرا نے محبوب کی سفاکی کا ذکر رسمی اور قیاسی طور پر کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اس کے پہلو میں دل کے بجائے پتھر ہے۔ مگر اس کے مقابلے میں عاشق ہر وقت اس پر اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ یعنی ان شعرا نے یک طرفہ محبت دکھائی ہے۔ ان شعرا کا نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ وہ تو محبوب پر اپنی جان چھڑکتے ہیں مگر محبوب نہایت بے وفا اور ظالم ہے مثلاً میر فرماتے ہیں ؎

---

[1] مرقع دہلی۔ نواب درگاہ قلی خاں۔ ص ۸۲

جو جو ظلم کیے ہیں تم نے سو سو ہم نے اٹھائے ہیں
داغ جگر پہ جلائے ہیں، چھاتی پہ جراحت کھائے ہیں

میر نے اس شعر میں محبوب کو ظالم قرار دیا ہے۔

غالب کہتے ہیں ؎

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

غالب کی نظر میں ان کا محبوب قاتل ہے، جو ان کے قتل کرنے کے لیے آرہا ہے۔

داغ بھی محبوب کو قاتل تصور کرتے ہیں ؎

ناز سے کھینچ نہ مجھ پر تلوار غیر مشتاق ہوا جاتا ہے

دورِ جدید کی شاعری میں لڑکے سے عشق کا رجحان ختم ہو گیا ہے۔ اگرچہ اس دور کی شاعری میں بھی محبوب کو مذکر بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اب سبزۂ خط والا محبوب غائب ہو گیا ہے۔

جہاں تک جگر کی شاعری کا تعلق ہے۔ اس میں واضح طور پر عورت محبوب کی صورت میں جلوہ گر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ایک نیا تصور ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں "جوابی محبت" کا رجحان پایا جاتا ہے یعنی اگر جگر محبوب سے محبت کرتے ہیں تو محبوب بھی جگر سے محبت کرتا ہے۔ جگر کی زندگی کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں مختلف عورتوں سے محبت کی ہے۔ مثلاً جگر نے اپنے بچپن میں "لکھنؤ والی" سے محبت کی جو عمر میں ان سے بڑی تھیں پھر وہ اپنی کسی عزیز کو دل دے بیٹھے۔ یہ بھی عمر میں ان سے زیادہ تھیں۔ مین پوری میں جگر حسن تحصیلدار صاحب کے یہاں مقیم تھے، ان کی بیوی سے اظہارِ عشق کیا اور جب راز کھل گیا تو بھنگ کھا کر خودکشی کی کوشش کی مگر بکھ ہمدردوں نے ان کی جان بچائی۔ جگر نے وحیدن بیگم (پنجابی) سے بھی محبت کی پینگ بڑھائے، جن سے ۱۹۰۸ء میں شادی ہو گئی۔ پھر جگر نے نسیم بیگم سے محبت کی اور ۱۹۲۰ء میں ان سے عقد کر لیا۔ یہ سارے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ جگر نے ہمیشہ عورت سے محبت کی ہے اس لیے عورت نے بھی ان کی محبت کا جواب دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو جگر کی شاعری میں "جوابی محبت" کا رجحان ملتا ہے۔ مثلاً جگر فرماتے ہیں ؎

بے ساختہ آج ان کے بھی آنسو نکل پڑے   دیکھا نہ گیا حال غضب زار کسی کا

جب محبوب نے جگر کا برا حال دیکھا تو اس کے بھی بے ساختہ آنسو نکل آئے۔ یعنی جس طرح جگر کو محبوب سے محبت ہے اسی طرح محبوب کو جگر سے بھی محبت ہے۔

جگر کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

مرے ناشاد رہنے پر وہ جب ناشاد ہوتا ہے
بتاؤں کیا جو میرا عالمِ فریاد ہوتا ہے

جب جگر ناشاد ہوتے ہیں تو ان کو دیکھ کر ان کا محبوب بھی ناشاد ہو جاتا ہے۔ یعنی محبوب کی محبت جوابی ہے

جگر تو یہاں تک کہتے ہیں کہ محبوب کی مجبوری ان کی مجبوری سے بھی زیادہ ہے ؎

اِدھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی، ان سے آہ بھی نہ ہوئی

جگر کا محبوب بھی ان کے ہجر میں بے تاب ہے۔ اس سے بڑھ کر جوابی محبت کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے

مری ہی طرح وہ بھی نہ ہو ہجر میں بیتاب
ہر سانس کے ساتھ آج اک آوازِ حزیں ہے

جوابی محبت کا عالم مندرجہ ذیل شعر میں بھی ملاحظہ فرمایئے ؎

پردۂ شوق سے اک برق تڑپ کر نکلی   یاد کرنے کی طرح سے انھیں جب یاد کیا

جگر نے جب قرینے سے محبوب کو یاد کیا تو اس نے بھی ان کو اپنا چہرہ برق کی طرح دکھا دیا ؎

مہرباں ہم پہ رہی چشمِ سخن گو ان کی   جب ملی آنکھ نگاہوں نے کچھ ارشاد کیا

جب جگر نے محبوب سے اپنی آنکھ ملائی تو اس نے بھی نگاہوں سے کچھ ارشاد کیا۔ یعنی اس نے بے اعتنائی نہیں برتی۔

یکساں ہے حسن و عشق کی سرمستیوں کا رنگ
ان کی خبر انھیں ہے نہ میری خبر مجھے

عاشق و معشوق دونوں ایک دوسرے کی محبت میں غرق ہیں یعنی "دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی"۔

ذرا سا اک دفعۂ محبت اٹھا گیا اور ہی قیامت
ابھی ہم آنسو بہا رہے تھے ابھی وہ آنسو بہا رہے ہیں

عاشق و معشوق دونوں ایک دوسرے کی محبت میں آنسو بہاتے ہیں جوابی محبت کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

اس طرح نہ ہوگا کوئی عاشق بھی تو پابند
آواز جہاں دو اسے، وہ شوخ وہیں ہے

محبوب زیادہ تر عاشق سے کتراتا ہے مگر جگر کا محبوب ان کی آواز پر فوراً آجاتا ہے۔ جگر کے محبوب کی وفا کا عالم ملاحظہ فرمایئے ۔

آنکھیں تو کھول، سر تو اٹھا، دیکھ تو ذرا
کب سے جگر وہ چاند سا چہرہ نڈھال ہے

محبوب کی وفاداری اس شعر سے بھی ظاہر ہے ۔

ہم کو گرفتارِ بلا دیکھ کر   خود بھی گرفتارِ بلا ہو گئے

محبوب کو جگر کے حالِ زار پر رحم آتا ہے ۔

ان سے بھی ہو سکا نہ ضبط، انکو بھی رحم آ گیا
پائے برہنہ دیکھ کر، جسمِ فگار دیکھ کر

جگر کے محبوب کو ان پر کس طرح پیار آتا ہے، ملاحظہ فرمایئے ۔

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا   دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آ ہی گیا

محبوب پر جگر کی یاد میں کس طرح اداسی چھا جاتی ہے غور فرمایئے ۔

اداسی طبیعت پہ چھا جائے گی   انھیں جب مری یاد آ جائے گی

جگر کے مندرجہ ذیل اشعار میں بھی جوابی محبت موجود ہے ۔

اس چشمِ مست نے مجھے مخمور کر دیا   میں نے نظر ملا کے اسے چور کر دیا
نہ ہوگا ہمارا ہی آغوش خالی   کچھ اپنا بھی پہلو تہی پائیے گا

میں عشقِ بے نیاز ہوں، تم حسنِ بے پناہ
میرا جواب ہے نہ تمہارا جواب ہے

وہ آئے ہیں اے دل ترے کہنے کا یقین ہے
لیکن میں کروں کیا مجھے فرصت ہی نہیں کچھ

حسن کے ہر جمال میں پنہاں   میری رعنائی خیال بھی ہے
تجھ یار خود تڑپ اٹھی   شرطِ اوّل خراب ہونا تھا

اے حسن اپنی حوصلہ افزائیاں تو دیکھ
مانا کہ چشمِ شوق بہت بے حجاب ہے

تو میرے حالِ پریشاں پہ بہت طنز نہ کر   اپنے گیسو بھی ذرا دیکھ کہاں تک پہنچے
تڑپ کر دل انھیں تڑپا رہا ہے   قیامت پر قیامت ڈھا رہا ہے
نگاہوں سے چھپ کر کہاں جایئے گا   جہاں جایئے گا ہمیں پایئے گا
ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگِ محفل   کسے دیکھ کر آپ شرمایئے گا

میں تو اس چھینٹے کے صدقے کہ یہ اب ضد پہ انھیں
حسن کو عشق کی صورت میں جگر دیکھ لئے

عشق کا سحر کامیاب ہوا   میں ترا تو مرا جواب ہوا
عشق بے امتیاز کے ہاتھوں   حسن خود بھی شکست یاب ہوا
وہ کب سے مضطرب ہیں اے غمِ عشق   خدا جانے تری غیرت کہاں ہے
تھا باعثِ رسوائی ہر چند جنوں میرا   ان کو بھی نہ چین آیا جب تک نہ ادھر دیکھا
ماتھے پہ پسینا کیوں آنکھوں میں نمی کیسی   کچھ خیر تو ہے تم نے کیا حالِ جگر دیکھا

اب تو آنکھیں کھول دے، افتادہ کوئے حبیب
جھانکتا ہے کوئی دروازے سے شرمایا ہوا

وفورِ کیف سے دل اتنا بے قرار نہ ہو
میں ڈر رہا ہوں کہ مضطر نگاہِ یار نہ ہو

عرضِ نیازِ عشق کا چاہے اور کیا صلہ
میں نے کہا یہ چشمِ نم، اس نے بنا یہ چشمِ تر

وہ عشق ہی نہیں ہے، وہ دل ہی نہیں جگر
لبیک خود کہا نہ جسے حسنِ یار نے

غرضیکہ جگر کی خود پسندی کا ایک نہایت واضح اور دلکش پہلو جوابی محبت ہے۔ اس قسم کے اشعار دیگر شعراء کے یہاں کم ملیں گے جگر نے "جوابی محبت" کو ایک موضوع کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ دیگر شعراء کے یہاں یہ پہلو ایک ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ بہرحال جگر کی خود پسندی نرم و نازک اور حسین و دلکش ہے۔ اس میں گلاب کی شگفتگی، شبنم کی چمک اور چاندنی کی روشنی جیسا حسن پایا جاتا ہے۔

★

شاعر

شیام موہن جگر بریلوی

یہ کیا بتاؤں کسی کو میں کون ہوں کیا ہوں
نظر تو آتا ہوں لیکن سمجھ سے بالا ہوں

ملا ہے حسنِ حقیقت خمیر میں میرے
بھرا ہے طورِ تجلی ضمیر میں میرے

حریمِ قدس کی قندیل ہے دماغ مرا
چراغِ جلوۂ بیرنگ ہے چراغ مرا

ملی ہے دل کی جگہ برقِ بیقرار مجھے
بنا دیا غمِ عالم کا سوگوار مجھے

جو کوئی روئے تو میں زار زار روتا ہوں
ہنسے جو کوئی تو میں شادکام ہوتا ہوں

جو شب کو اشک مری آنکھ سے ٹپکتا ہے
سحر کو مہرِ فلک بن کے وہ چمکتا ہے

بلند عرشِ بریں سے بھی ہے نظر میری
محیطِ ہر دو سرا فکرِ مختصر میری

مری کتاب ہے تفسیرِ رازِ فطرت کی
مری حدیث ہے تعبیرِ رمزِ قدرت کی

بجز حبیب مجھے کچھ نظر نہیں آتا
سوائے حسن پرستی ہنر نہیں آتا

امینِ رازِ محبت ہوں روزِ اوّل سے
لگے ہوں دہر کو روشن وفا کی مشعل سے

فراق و وصل کا میرے جہاں میں نام نہیں
سوائے سوز مجھے عاشقی سے کام نہیں

شرابِ میکدۂ عشق ہے شباب میرا
غروب ہو نہیں سکتا ہے آفتاب میرا

حریفِ حسن ہے داغِ دلِ حزیں میرا
جمالِ دوست کا آئینہ ہے نگیں میرا

وفورِ حزن سے گو چاک چاک دل میرا
بہ ربِّ عشق! تمنا سے پاک دل میرا

فرشتے بھی مری معصومیت پہ نازاں ہیں
مرے خیال کے جلوے بنائے ایماں ہیں

ہمیشہ محو خود آرائیوں میں رہتا ہوں
مقامِ دل کو میں آئینہ خانہ کہتا ہوں

وقار کے لیے ممنون ہے بشر میرا
کہ دیر و کعبہ میں جھکتا نہیں ہے سر میرا

نماز و سجدہ کی یہ منتہائے منزل ہے
سرِ نیاز ہے اور آستانۂ دل ہے

نفس نفس ہے مرا صوتِ سرمدی کا ساز
نہاں ہے میرے ترنم میں غیب کی آواز

غم و الم ہیں مرے واسطے وجہِ تسکیں ہیں
وفورِ عیش میں نغماتِ عبرت آگیں ہیں

مرے سرور سے عالم میں کیف و مستی ہے
مری نگاہ کی محتاج بزمِ ہستی ہے

جگر ہے نام غمِ عشق کا اسیر ہوں میں
جو بے نیازِ دو عالم ہے وہ فقیر ہوں میں

عرب کے ہندو علما

ڈاکٹر محمد رضوان علوی

عرب اور ہندستان کے درمیان تجارت کا آغاز پہلی صدی ہجری کے اواخر سے قبل ہی ہو چکا تھا۔ محمد بن قاسم کی آمد نے دونوں ملکوں کے سیاسی تعلقات کو مزید قوت بخشی۔ اس کے چند سال بعد جب وقت کے سیاسی نقشہ سے بنو امیہ کا نام مٹ کر عباسیوں کا نام آگیا اور دمشق کے بجائے بغداد ان کے خاندان کا پایۂ تخت بن گیا تو عرب و ہند کے تعلقات میں ایک نیا موڑ آیا۔ ابوجعفر منصور عباسی کے زمانے سے دونوں ملکوں کے مابین تعلقات برابر بڑھتے گئے۔

عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس نے عربوں کی علمی بیداری اور ذہنی ارتقا میں بیرونی علماء و فضلاء کا بھی تعاون حاصل کیا۔ چونکہ وہ خود علوم عقلیہ و نقلیہ کا بڑا ماہر تھا، اس لیے اس نے ہندستان سے بغداد پہنچنے والے ایک ریاضی داں منجم پنڈت کی بڑی آؤ بھگت کی۔ یہ واقعہ ۱۵۵ھ کا ہے۔ یہ منجم سندھی ہندوؤں کے ایک ثقافتی وفد کا رکن تھا۔ اس کے پاس سنسکرت زبان کی ایک کتاب بھی تھی جس میں حرکات نجوم، کسوف و خسوف (سورج و چاند گرہن) اور اجرام فلکی کا نہایت مکمل و مفصل حال تحریر تھا۔ جر حقیقت کی دائروں اور شکلوں سے تشریح کی گئی تھی۔ اس ہندستانی پنڈت کی کتاب کئی ابواب میں منقسم تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ یہ کتاب ایک اور کتاب کا نچوڑ ہے۔ جو ہندستان کے راجہ بے فریا بے گر کی تصنیف تھی۔ بعض مورخین نے اس کتاب کا نام براھسپھطر ھانت بتایا ہے اور مصنف کا نام راجہ بے فرکی بجائے "برھمگپت" لکھا ہے۔ غرض یہ کتاب جب خلیفہ منصور عباسی کو سنائی گئی تو اس نے اس کو بہت پسند کیا۔ خلیفہ کے حکم سے محمد بن ابراہیم بن حبیب الفزاری نے اس کا ترجمہ عربی میں کیا جو سندھند (السند ھند) کے نام سے پوری دنیا میں مشہور ہوا[۲] یہ مذکورہ بالا سنسکرت لفظ کے آخری جز سدہانت کا اختصار تھا[۳]

محمد بن ابراہیم الفزاری کو علم نجوم میں جو دسترس حاصل تھی اس کا ذکر تقریباً سب ہی مورخین نے کیا ہے۔ شاید اسی کتاب کے ترجمہ نے الفزاری کو وہ شہرت دوام بخشی کہ آگے چل کر مسلمانوں میں وہی پہلا منجم کہلائے جانے کا مستحق قرار پایا۔ اس نے جس توجہ اور دلچسپی سے ہندستانی پنڈت سے سنسکرت کی تعلیم حاصل کی وہ اس وقت کے علماء کے لیے نہایت حیرت انگیز بات تھی۔

اس ہندستانی منجم ریاضی داں کا دوسرا عرب شاگرد یعقوب بن طارق تھا جو ترجمہ میں الفزاری کا ہاتھ بٹاتا تھا[۴] یعقوب بن طارق کا حال کتابوں میں بہت کم درج ہے مگر جس قدر

---

[۱] فہرست صفحہ ۲۱۰ [۲] قفطی صفحہ ۱۰۰ [۳] فہرست صفحہ ۲۰۸ [۴] کتاب الہند بیرونی صفحہ ۲۰۳

ملتا ہے اس سے یہ اندازہ ہو ہی جاتا ہے کہ وہ بھی اپنے وقت کا ایک جید عالم نجوم تھا۔

سدہانت کے علاوہ سنسکرت کی دوسری کتاب جس کی طرف عربوں کا خیال گیا وہ آریہ بھٹ تھی اور عربی لباس پہن لینے کے بعد ارجبند کہلائی جانے لگی تیسری کتاب عربی میں منتقل ہونے کے بعد ارکند کہلائی جس کا اصل سنسکرت نام کھنڈ اکھنڈیک تھا۔ یہ برہم گپت ہی کی تحریر کردہ تھی۔ کس زمانے میں ترجمہ ہوئی یہ صحیح طور پر معلوم نہیں۔ مورخ یعقوبی نے ابوالحسن اہوازی کو اس کا مترجم بتلایا ہے[1] اہوازی کے تفصیلی حالات بہت کم ملتے ہیں۔ منکا ھندی سے سلیمان بن اسحاق نے ایک ایسی سنسکرت کتاب کا عربی میں ترجمہ کرایا تھا جو جڑی بوٹیوں سے متعلق تھی۔ کہتے ہیں کہ اس کتاب میں ایک ایک جڑی بوٹی کے دس دس نام درج تھے۔[2] اس کتاب کا نام اسماء عقاقیر الہند تھا[3]

مذکورہ بالا کتابوں کے ترجمے سے ہندوستان کی علمی فوقیت اور عظمت عربوں کے دل ودماغ میں اتنی رچ بس گئی تھی کہ تقریباً سب ہی مورخین کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا۔

عربی تحریروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربوں کو ایام جاہلیت سے ہی ستاروں اور ان کی رفتار سے دلچسپی تھی مگر عہد عباسی سے قبل انھوں نے علمی طریق پر علم نجوم کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ دنیا اب کہیں سے کہیں پہنچ چکی تھی۔ علوم کے نئے نئے راستے نکل آئے تھے۔

الغرض خلیفہ منصور اور خلیفہ ہارون رشید کی شاہانہ سرپرستی اور برمکی خاندان کی جدوجہد کا ہی نتیجہ تھا کہ ہندوستان سے نہ جانے کتنے علماء اور اطباء بغداد چلے گئے اور خلافت کے اسپتالوں اور علمی اداروں سے منسلک ہوگئے۔ حساب، نجوم، ہیئت، طب، ادب اور اخلاق کی بہت سی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کے جن عالموں اور طبیبوں نے شہرت پائی ان میں منکا، کنکا، بھلا، صالح بن بھلا، منجھل، شاناق، ابن دہن، راسے اور روسا تھے۔

منکا ہندوستانی عالموں میں منکا ایک خاص شخصیت کا حامل تھا۔ بیرونی نے اس کا نام مانک بتایا ہے جو صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اپنے معصروں میں غالباً منکا واحد شخص تھا جسے فلسفہ سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ ہندوستانی علوم میں اس کو جس قدر دخل تھا اس کا تو ذکر ہی کیا۔ اسے فارسی زبان میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ منکا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے ایک ہم زمانہ ہندوستانی ماہر طبیب شاناق کی کتابوں میں کتاب فی السموم (سانپوں کے زہر کے بارے میں) کو فارسی زبان میں منتقل کیا تھا[4] ان کے انھیں اوصاف کے باعث اس کی شہرت بغداد تک پہنچی جس سے علمائے بغداد بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

سنسکرت کی جن طبی کتابوں کے ترجمے عربی میں ہوئے ان میں ششرت کی کتاب سسسرو کا ترجمہ یحییٰ بن خالد برمکی کی ایما پر منکا نے کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ کتاب دس ابواب پر مشتمل تھی اور بیماریوں کی علامات، ان کے علاج اور دواؤں سے متعلق بڑی سیر حاصل بحث کی گئی تھی جس کا مقصد معلوم ہوتا ہے کہ برامکہ کے شفاخانے میں وہ ایک طبی گائیڈ کی حیثیت سے کام میں لائی جانے لگی تھی۔

فن طب میں منکا کی حذاقت ومہارت جانچنے کا موقع اس وقت آیا جب خلیفہ ہارون رشید ایک موذی مرض میں مبتلا ہوا۔ بغداد اور آس پاس کے اطباء نے لاکھ جتن کیے مگر کوئی دوا کارگر نہ ہوئی خلیفہ کے اعزا، اس کی بیماری سے کافی متفکر ہونے لگے تو ایک درباری ابوعمر عجمی نے منکا کا ذکر خلیفہ سے کیا،

---

[1] یعقوبی ج ۱ صفحہ ۱۱۵ [2] الفہرست، صفحہ ۴۲۱ [3] کتاب الہند صفحہ ۸۸
[4] عیون الانباء ج ۲ صفحہ ۳۲

نے کہا کہ ہندستان میں ایک ایسا طبیب (وید) موجود ہے جس کی حذاقت کا لوہا ہندستان والے مانے ہوئے ہیں۔ اگر خلیفہ ہارون رشید کی اجازت ہو تو کسی کو بھیج کر اسے طلب کیا جائے۔ عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ سے شفا نصیب فرمائے۔ غرض ادھر کی تجویز پر صاد کیا گیا اور منکا کو خلیفہ کے علاج کے لیے دعوت دی گئی۔ منکا نے بخوشی علاج کرنے پر رضامندی ظاہر کی اور خلیفہ کو اس کے علاج سے مکمل شفا ہو گیا۔ پھر منکا کے چرچے چاروں طرف ہونے لگے اور دربار خلافت میں خصوصیت سے اس کی آؤ بھگت ہوئی۔ خلیفہ ہارون رشید نے اسے خلعت بے بہا سے نوازا اور درہم و دینار سے مالا مال کر دیا۔ [۱]

یحییٰ برمکی کو بھی ہندستانی طب سے بہت شغف تھا۔ اس نے منکا ہی سے اس کی ایک کتاب کا ترجمہ کرایا اور ایک شخص کو اسی مقصد کے لیے ہندستان جانے کی خلیفہ ہارون رشید سے اجازت دلائی کہ وہ منکا سے ان جڑی بوٹیوں کی صحیح تفصیلات دریافت کر کے آئے جن کا ذکر منکا نے اپنی کتاب میں کیا تھا۔ منکا کے نام یحییٰ بن مکی نے جو تحریر ارسال کی تھی اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ وہ ہندستان کے تمام مذاہب کے حالات اور ان کے سربراہوں کے نام بھی اسے لکھ کر روانہ کرے۔ چنانچہ منکا نے جڑی بوٹیوں اور تمام مذاہب کا حال شرح و بسط کے ساتھ لکھ کر یحییٰ برمکی کے پاس بغداد بھیج دیا۔ [۲]

ہارون رشید نے منکا کو اس کی علمی صلاحیتوں کا یہ صلہ دیا کہ یحییٰ برمکی کی سفارش پر اسے بغداد کے بڑے شفاخانوں کا نگراں مقرر کر دیا۔ [۳] بعضوں کا کہنا ہے کہ اسے بغداد کے تمام اسپتالوں کا افسر اعلیٰ مقرر کر دیا تھا۔ [۴] بعد میں وہ خلافت کے دارالترجمہ میں سنسکرت کی کتابوں کا مترجم بھی بنا دیا گیا تھا۔ شنکا نے بہت سی مفرد و مرکب دوائیں تیار کیں جو بخار، چیچک، پیٹ کے درد، بواسیر، جوڑوں کے درد کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی تھیں۔ [۵]

صالح بن بہلہ خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں بہلہ کے بھی بڑے چرچے تھے۔ یہ بھی ایک ماہر طبیب تھا اور ہندستانی طریق علاج کا تو اس سے بہتر کوئی دوسرا ہندستانی طبیب شاید ہی ہوا ہو۔ اسی وجہ سے ہارون رشید کے عم زاد بھائی ابراہیم بن صالح کے علاج کے لیے جعفر برمکی نے اس کے بیٹے صالح بن بہلہ کی پر زور سفارش کی تھی۔ [۶]

واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ابراہیم بن صالح کو سکتہ ہو گیا تھا۔ ہارون رشید کے درباری اطبا نے اس کے مردہ ہونے کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ خلیفہ کو یہ سن کر بہت رنج ہوا اور رونے لگا۔ لیکن آخری تدابیر اختیار کرنے کے لیے جعفر برمکی سے صلاح و مشورہ کیا اور طے پایا کہ صالح بن بہلہ سے رجوع کیا جائے۔ ابن بہلہ نے نبض پر ہاتھ رکھا اور جعفر سے دل لگی کی باتیں کرنے لگا۔ عشاء کا وقت تھا کہ ہرکارہ ابراہیم کی خبر مرگ لے کر دربار خلافت میں حاضر ہوا۔ خلیفہ نے فرط غم میں نہ معلوم کیا کیا کہہ دیا۔ وہ طب ہندی پر اپنی لعن طعن ختم نہ کر پایا تھا کہ جعفر برمکی نے صالح بن بہلہ سے اپنی بات چیت کا حال خلیفہ کو سنایا کہ یہ طبیب ہندی انتہائی وثوق و اعتماد سے ابراہیم کے علاج کی حامی بھرتا ہے اور قسم کھا کر اعلان کرتا ہے کہ وہ مرا نہیں، اگر معاملہ اس کے برعکس ہوا تو اس کی بیویاں مطلقہ سمجھی جائیں۔ [۷] خلیفہ نے کہا صالح! تم غیب سے متعلق باتوں پر قسم کھاتے ہو۔ صالح نے کہا میرے نزدیک غیب یہ ہے کہ اس

---

۱ عیون الانباء ج ۲ ص ۳۳ ۲ الفہرست ص ۲۶ ۳ عیون الانباء ج ۲ ص ۳۳ ۴ علوم العربیہ ص ۲۲۱ ۵ عیون الانباء ج ص ۳۳ ۶ الفہرست ص ۲۲۱ ۷ علوم العربیہ ص ۲۲۱ ۸ تمدن [illegible]

پر کوئی دلیل اور حجت نہ قائم کی جائے اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کے متعلق میرا پختہ یقین ہے اور اسے ثابت کرنے کے لیے میرے پاس منطقی دلائل موجود ہیں[1] اس کے اس طرح یقین دلانے پر خلیفہ فرطِ مسرت سے اچھل پڑا اور طبیب ہندی کو ابراہیم کے پاس جانے کی اجازت دیدی۔ صالح بن بہلا اس کمرے میں جہاں ابراہیم لیٹا ہوا تھا، گیا اور ایک سوئی نکال کر ابراہیم کے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن اور گوشت میں پیوست کر دی۔ ایسا کرنا تھا کہ ابراہیم نے ہاتھ سکوڑا۔ خلیفہ کی جانب صالح نے متوجہ ہو کر کہا کیا مردے کو بھی درد کا احساس ہوتا ہے۔ پھر کُندس نام کی جڑی ابراہیم کی ناک میں پھونکی۔ اس نے اپنا بدن جھنجھوڑا، چھینک لی اور خلیفہ سے باتیں کیں، بلکہ اس کے ہاتھوں کا بوسہ بھی لیا۔ وجہ پوچھنے پر صالح بن بہلا نے بتایا کہ ابراہیم ایک رات گہری نیند سو رہا تھا کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک کُتّا ہے جسے اس نے ڈرایا کہ بھاگ جائے مگر اس نے ابراہیم کے ہاتھ میں کاٹ لیا۔ یہ مرض اسی وجہ سے تھا، ورنہ اور کوئی بات نہ تھی[2]

صالح بن بہلا نے جس معرکہ کا علاج کیا تھا سچ تو یہ ہے کہ اس سے خلیفہ کے علاوہ دوسرے ماہرینِ طب بھی اس کی ذہانت اور قابلیت کے معترف اور اس کے طریق علاج سے بےحد متاثر ہوئے۔ کہتے ہیں کہ صالح بن بہلا اپنے مختصر دورانِ قیام میں اسلامی تہذیب سے اس درجہ متاثر ہوا کہ جب واپس ہوا تو ایمان کی دولت سے مالا مال ہو کر وطن پہنچا[3]

کَنکَا: فنِ طب میں کنکا کو بھی بہت دخل تھا۔ اس کا شمار بھی اپنے وقت کے بہترین اطباء میں کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ علم نجوم سے بھی اسے اچھا خاصا لگاؤ تھا[4] عربی میں سات کتابیں کی تصنیف کنکا سے منسوب کی گئی ہے جن میں کتاب فی الطب، کتاب النموا فی الاعمار (عمروں کے بیان میں) کتاب اسرار المَوالید (پیدائشوں کے راز) زیادہ مشہور ہوئیں۔ کنکا کے حالات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندستان کے تمام پنڈتوں کے نزدیک علم نجوم کا سب سے بڑا ماہر تھا[5]

صنجہل (سنگھل): صنجہل بھی ہندستان کے عالموں میں شمار ہوتا ہے اور کتاب اسرار المسائل کے علاوہ کتاب موالید الکبیر کی تصنیف بھی اس سے منسوب ہے[6] ہندستان کے ماہرین علم طب کی صف میں صنجہل کو بھی رکھا گیا ہے۔ پیدائش کے بارے میں اس کی کتاب المَوالید الکبیر بڑے مرتبے کی کتاب لکھی گئی ہے۔ اس کا ترجمہ فارسی زبان میں بھی ہوا ہے[7]

دوسرے جن ہندستانی ماہرین علم طب و نجوم کی کتابوں کو عربی میں منتقل کیا گیا اور جنھوں نے اپنے زمانے میں بڑی شہرت پائی ان میں باکرہ، حکا الہندی، انکو، زنکل، جبہر، اندی، جاری اور داہر تھے۔ یہ سب کے سب مصنف تھے اور ہندستان کے چوٹی کے حکماء اور اطباء میں انھیں بھی جگہ حاصل تھی[8] ان میں سے کسی ایک مصنف کی کتاب سرک یا شرک تھی جس کی تفسیر عبد اللہ بن علی نے پہلے سنسکرت سے عربی میں منتقل کیا اور پھر سنسکرت ہی سے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا[9]

شاناق (چانکیہ؟): ہندستانی اطباء میں شاناق بھی بڑی شہرت کا مالک ہوا ہے۔ علاج معالجے میں اس کی رائے بہت وزن رکھتی تھی۔ فنِ طب میں اس جیسا تجربہ کار شاید اس کے ہم عصروں

---

[1] عیون الانباء ج ۲ ص۳۲ [2] قفطی ص[illegible] [3] عیون الانباء ج ۲ ص۳۲ [4] قفطی ص[illegible] [5] عیون الانباء ج ۲ ص۳۲ [6] الفہرست ص[illegible] [7] عیون الانباء ج ۲ ص۳۳ [8] علوم العرب بیئہ ص[illegible] [9] عیون الانباء ج ۲ ص۳۳ [10] یعقوبی ج ۱ ص۱۱۱ [11] علوم العرب بیئہ ص[illegible]

میں کوئی ثانی نہ تھا۔ علم نجوم میں اس کی معلومات بہت وسیع تھیں اور جو تقدیم شاناق کو زندگی بھر حاصل رہا اس تک کا کوئی ہم زمانہ پہنچ نہ پایا۔ ہندستانی راجاؤں میں بھی اسے بڑا تقرب حاصل تھا۔ شاناق نے آلاتِ حرب کے بارے میں بھی ایک کتاب لکھی تھی جو جنگی معاملات سے متعلق تھی۔ اس میں یہ بھی تحریر تھا کہ بادشاہ کو کس موقع کے لیے کس قابلیت کا انسان منتخب کرنا چاہیے۔ اس نے غذا اور زہر پر بھی ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام کتاب فی السموم تھا۔ اس کی تشریح منکا نے یحییٰ برمکی کے حکم سے سنسکرت سے فارسی زبان میں کی تھی[1] اس کے صرف پانچ ابواب کی شرح لکھی گئی۔ پھر اس کا ترجمہ ابو حاتم بلخی کی مدد اور نگرانی میں ہوا جس نے خالد برمکی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کی شرح بھی لکھی تھی۔ نظر ثانی کی خدمت خلیفہ مامون عباسی کے زمانے میں عباس بن سعید الجوہری نامی اس کے ایک غلام نے انجام دی تھی[2] اس کتاب کو پھر دربار میں سنانا بھی اسی غلام کے سپرد تھا[3] کئی کتابوں کی تصنیف شاناق سے منسوب کی گئی ہے جن میں کتاب فی منتحل الجوھر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ کتاب ایک ہندستانی راجہ کے لیے لکھی گئی تھی جس کا نام بن قمالقں تھا[4] دو اور کتابوں کے بھی حوالے ملتے ہیں جو کتاب البیطرہ (چوپایوں کے علاج میں) اور کتاب فی النجوم کے نام سے مشہور ہوئیں[5]

جودر ہودر کو بھی ہندستان کے عالموں میں شمار کیا گیا ہے جو علم نجوم و طب میں بڑا درک رکھتے تھے۔ ایک کتاب بھی اس موضوع پر اسی کے نام سے منسوب ہے۔ اس کے تفصیلی حالات معلوم کرنے کے لیے بڑی کوششیں کی گئیں لیکن اس کی شخصیت کے اکثر گوشے پردۂ خفا ہی میں رہے جو کچھ بھی دستیاب ہو سکا ہے اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندستان کے فہیم اور دانشور لوگوں میں تھا اور ارباب علم میں اسے امتیازی مقام حاصل تھا۔ فن طب پر اس کی نظر گہری اور وسیع تھی۔ علم و حکمت پر جو کتابیں اس نے لکھی ہیں ان میں سے صرف ایک کتاب کا حوالہ ملتا ہے جو کتاب الموالید کے نام سے تھی اور جس کا ترجمہ بھی سنسکرت سے عربی میں ہوا تھا[6] اس کا مترجم کون تھا؟ کس خلیفہ کے زمانے میں اسے عربی کا جامہ پہنایا گیا؟ ان میں سے کسی ایک بات کا بھی جواب مورخین نے نہیں دیا ہے۔ ابن ندیم کی الفہرست میں چونکہ اس کا ذکر ہے اس لیے یقین کرنا پڑتا ہے کہ ہارون رشید یا پھر مامون رشید میں سے کسی ایک کے زمانۂ خلافت میں کسی نے اس کا عربی ترجمہ کیا ہوگا۔

ابن دہن خلیفہ مہدی اور ہارون رشید کے زمانۂ خلافت میں ابن دہن کی بڑی دھوم تھی سنسکرت تو اس کی مادری زبان ہی تھی۔ مگر عربی زبان میں جو اسے قدرت تھی وہ واقعی حیرت انگیز ہے۔ فن طب میں اس کی قابلیت اور حذاقت سے خاندان برامکہ بہت متاثر تھا۔ چنانچہ انھوں نے ابن دہن کو اپنے شفاخانہ کا افسر اعلیٰ مقرر کر دیا تھا۔ مورخین نے اس کا شمار بھی ان لوگوں میں کیا ہے جو سنسکرت سے بلا تکلف عربی ترجمہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اس ضمن میں ابن دہن کی سند ہشاث[7] یا سند ستاق نامی کتاب کا ذکر ملتا ہے جس کے معنی صفوۃ النجح[8] (رفاہ عامہ کا بیان) کے ہیں اور جو سنسکرت میں سدھستان یا سند ہیست[9] کے ناموں سے جانی جاتی ہے۔ اس کی تشریح ابن دہن نے بڑی خوش اسلوبی سے عربی زبان میں کی تھی۔ سنسکرت کی ایک اور کتاب استانگر کا نام بھی ملتا ہے جس کا ترجمہ بھی ابن دہن

---

[1] عیون الانباء ج ۲ ص۳۳ [2] علوم العربیہ ص۲۴۲ [3] کشف الظنون حاجی خلیفہ ج ۱ ص۳۳ [4] علوم العربیہ ص۲۴۲ [5] حاجی خلیفہ ج ۱ ص۳۳ [6] عیون الانباء ج ۲ ص۳۲ [7] ایضاً ص۳۳ [8] یعقوبی ج ۱ ص۱۱ [9] الفہرست ص۲۷۱ [10] علوم العربیہ ص۲۴۲

وسنسو جھار سانپوں کی اقسام اور ان کے زہروں کے بیان میں) کا معرب نام ہے۔ شاناق (چانک) نے سانپوں پر ایک کتاب السموم لکھی تھی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ایک اور کتاب عربی میں منتقل ہوئی جس میں ہندستانی اور یونانی اطباء کی دواؤں کے سرد و گرم ہونے، دواؤں اور ان کی قوتوں اور سال کے موسموں کے جو تضادات ہیں ان کی پوری تفصیل درج تھی۔[۱]

روسا۔ فن طب میں کچھ ہندو عورتوں کے نام بھی کہیں کہیں ملتے ہیں جن میں روسا یا روسی نام کی ایک طبیبہ بھی گزری ہے۔ دیگر مورخین نے کوئی خاص بات تو کہی نہیں البتہ ایک جگہ مسعودی[۲] نے سرسری طور پر اس کا ذکر کیا ہے کہ روسا اپنے وقت کی زبردست علم طب کی ماہر تھی اور صنف نازک کے امراض میں اس کی تشخیص آخری سمجھی جاتی تھی۔[۳] یہ نہ معلوم ہو سکا کہ آیا روسا بغداد گئی تھی یا صرف اس کی تحریر کردہ کتابیں ہی عباسیوں کی راج دھانی میں پہنچی تھیں۔ ابن ابی اصیبعہ نے دو کتابوں کی تصنیف اس سے منسوب کی ہے۔ ایک کا نام کتاب فی علاجات النساء (عورتوں کے علاج میں) اور دوسری کا نام کتاب السکر (نشہ کے بیان میں) مسعودی نے چار کتابوں کے نام لکھے ہیں جن میں ان دو کے علاوہ کتاب العقاقیر للہند (ہندستان کی جڑی بوٹیوں کے حال میں) اور کتاب علاجات الحبالی للہند (ہندستان کی حاملہ عورتوں کے علاج) ہیں یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ بغداد کے شاہی دارالترجمہ میں سنسکرت سے عربی میں منتقل ہوئی ہوں گی۔

عربوں کی تمام ذہنی بیداری میں ہندستان نے جو بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس سے کسی عرب تاریخ نویس نے انکار نہیں کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ ادب، نجوم، موسیقی، ریاضیات اور سیاسیات میں عربوں کو ہندستان علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا پڑا۔ وہ ہندستانی سیاح جو خلیفہ منصور عباسی کے عہد خلافت میں سدھانت لے کر بغداد پہنچا تھا ایک کتاب فن ریاضی پر بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ اعداد ہندسی اسی کتاب سے اخذ کیے گئے تھے جو مغرب میں "ارے بک نیومرل" یعنی عربی ہندسے کہلائے اور خود عرب انھیں ہندی یا ہندسہ کہتے ہیں۔ آگے چل کر نویں صدی عیسوی میں عربی ریاضیات کو کسور اعشاریہ کا اہم قاعدہ بھی ہندستانیوں سے ملا۔ نامی گرامی محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے اپنی مشہور زیچ کی طرح کتاب سندھند پر رکھی جسے ابراہیم بن حبیب الفزاری نے خلیفہ منصور کی ایما سے عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ یونانی اور ہندستانی علم نجوم کی تطبیق میں اس کتاب سے بڑا کام لیا گیا۔[۴]

فن موسیقی سے ہندستانیوں کو جو دلچسپی تھی اس کا بھی ذکر کئی عرب مورخین نے کیا ہے جن میں جاحظ کے علاوہ تغلبی کا بھی نام لیا جا سکتا ہے۔ جاحظ نے تو اتنا ہی ذکر کیا کہ ہندستانیوں کو قدیم زمانے سے فن موسیقی سے لگاؤ رہا ہے۔ ان میں اس نے ایک تار باجے کا ذکر خاص طور سے کیا ہے۔[۵] صاعد اندلسی نے ایک کتاب کا بھی حوالہ دیا ہے جو سنسکرت میں تھی جس کا نام نافر تھا نافر کے لغوی معنی دانائی کے پھل ہوتے ہیں۔ اس میں راگوں اور سروں کا بیان بڑی تفصیل سے دیا گیا ہے۔[۶] اس کتاب کی ایک شرح بھی لکھی گئی تھی جو عربی میں اس کے متن کے ساتھ تھی یشار

(بقیہ صفحہ ۲۷ پر)

---

[۱] الفہرست ص۲۲۲ [۲] یعقوبی ج ۱ ص۱۱۰ [۳] مروج الذہب ج ۱ ص۱۶۲ [۴] علوم العربیہ ص۲۹۳
[۵] عیون الانباء ج ۲ ص۳۳ [۶] ہسٹری آف دی عربس حتی ص۳۵۷ [۷] البیان والتبیین ج ۱ ص۲۸
[۸] طبقات الامم ص۱۵

چلو پرنگ چلیں[1]

جگن ناتھ آزاد

ہجومِ شہر سے دل ہو گیا ہے تنگ چلیں
فسردگی میں بھریں سرخوشی کا رنگ چلیں
خوشیوں میں مثالِ نوائے چنگ چلیں
دلوں میں اپنے لیے اک نئی ترنگ چلیں
اُتارنے جو ہے فکر و نظر پہ زنگ چلیں
چلو پرنگ چلیں

کنارِ آبِ رواں سبزہ زار کی دنیا
جہانِ غنچہ و گل شاخسار کی دنیا
وہ کوہ، اُس پہ وہ اک برگ و بار کی دنیا
وہیں کہیں ہے دلِ بے قرار کی دنیا
اسی کی سمت چلیں، بن کے اک اُمنگ چلیں
چلو پرنگ چلیں

سکوتِ روزِ ازل سے ہے نغمہ ریز جہاں
ہر ایک ذرّۂ خاکی ہے کیف بیز جہاں
ترانۂ دلِ دریا ہے درد خیز جہاں
پیامِ دوست سُنانے ہوائے تیز جہاں
زمیں ہے شوخ، جہاں آسماں ہے شنگ چلیں
چلو پرنگ چلیں

وہاں چلیں کہ جہاں گردشِ زمانہ نہیں
ہیں اختیار میں اپنے جہاں زمان و زمیں
جہاں نگاہ کا دامن ہے دامنِ گلچیں
ہر ایک ذرّہ جہاں ہے تجلیوں کا امیں
جہاں ہے طور کا عالم ہر اک سنگ چلیں
چلو پرنگ چلیں

ڈھکا ہو برف کی چادر سے کوہسار جہاں
اور اُس کے پاس ہی بہتی ہو جوئبار جہاں
ہو قطعہ خاک کا اک تختِ زر نگار جہاں
غرض کہ جمع ہو سب لشکرِ بہار جہاں
جہاں ہے خاک بھی خاشاک بھی قشنگ چلیں
چلو پرنگ چلیں

[1] پرنگ کشمیر میں دریائے سندھ (ایک دریا جہلم) کے کنارے ایک دلکش مقام ہے۔ ابھی تک سیاحوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے لیکن خوبصورتی اور رعنائی میں کسی طرح پہلگام یا گلمرگ سے کم نہیں۔ (آزاد)

کس کے اجالے کس کے اندھیرے

اقبال متین

جب جیپ روانہ ہوئی تو سعید نے کہا:

"آج کچھ نہ کچھ تو مار کر ہی رہے گا جاوید۔ ہرن ہی شکار ہی سہی ——"

جاوید کہنے لگا "میری بندوق میں کوئی بلٹ کسی شکار کے لیے نہیں ہے۔ میری بندوق کو آج تک یہ توہین گوارہ نہ ہوئی۔ جانے کتنے بچے آج ہرنیوں کے غول سے کم ہو جائیں گے۔ جانے کتنی ہرنیاں اپنے پیاروں کے لیے جنگل جنگل تڑپتی پھریں گی۔ ہرنیوں کو اس طرح تڑپانے سے مردوں کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ میری بلٹ اسی سینے کو چھیدتی ہے جس سینے میں اتر جانے سے ہرنیوں کے کلیجے دہل اٹھتے رہیں۔"

زبیدہ نے جھٹ سے لڑائی شروع —— "ہرنیوں پر گولی چلانا بھی تو کوئی بہادری نہیں ہے۔ ان کو اس طرح تڑپا کر گویا تم ایک خوشی کا خون کرتے ہو۔ ایک امید کا خون کرتے ہو۔ ایک اجلے خواب کا خون کرتے ہو —— تم کبھی کالے ہرن کی آنکھوں کے بے زبان کرب کو سمجھتے ہو اس کر بے شمار ہرنیوں کی آنکھوں کا نور نہیں چھینتا ہے اور اس خود ساختہ اصول پر اتراتے ہو —— میں کہتی ہوں چن چن کر ایک ایک ہرنی کو مار دو۔ جب تم اپنے خونی کھیل سے اکتا جاؤ تو آخری گولی کالے کے سینے میں اتار دو اور اپنی نشانہ بازی پر ناز کرتے پھرو۔ کیا کبھی تمھارے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ جنگل میں چوکڑی بھرتی ہوئی یہ خوبصورت ہرنیاں بالکل ہندوستانی عورت کی طرح بے زبان ہیں۔ تم کالے کو مارتے ہو تو میں سوچتی ہوں جیسے تم نے کسی عورت کا سہاگ چھین لیا —— میں دل مسوس کر رہ جاتی ہوں —— کاش تم مسکرانے کی بجائے اس وقت شرم محسوس کرسکتے۔"

جاوید نے بالکل غیر متوقع طور پر اپنی بندوق اٹھائی اور ہوا میں فیر کر دیا۔ لمحے بھر کے لیے سب سہم گئے تو اس نے قہقہہ لگا کر جیپ کی رفتار بڑھا دی۔

تاریکیوں کے سینے کو چیرتی ہوئی جیپ کچی سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ گائیڈ نے ایک سیدھی جانب موڑنے کے لیے جاوید سے کہا۔ جاوید نے اسی رفتار سے جیپ موڑی تو زبیدہ اچھل کر گائیڈ کے کندھے سے جا لگی —— سیدھی ہوئی تو بڑی نخوت سے اس نے کہا:

"جاوید صاحب جیپ چلائیے تو اس کا بھی پاس رکھیے کہ ایک خاتون بھی اس میں سوار ہے۔"

جاوید نے طنز سے مسکرا کر کہا: "جی ہاں جنگل کی سادی ہرنیاں بھی اس کا خیال رکھیں گی کہ جو جیپ ان کے پیچھے دوڑ رہی ہے اس میں ایک شہری ہرنی بھی ہے جو ان کا شکار کرنے کے لیے ان کا تعاقب کر رہی ہے۔"

جیپ کھیتوں کی ناہموار زمین پر اچھلتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ گائیڈ کے ہاتھوں میں گھومتی ہوئی سرچ لائٹ جنگل کی بے پناہ تاریکیوں کو ہر سمت سے مجروح کر رہی تھی۔ پہیوں کے نیچے دب کر کھیتوں کی ناہموار زمین پر چٹختے ہوئے مٹی کے ڈھیلے جیسے فریاد کر رہے تھے اور ان کی یہ فریاد صاف سنائی دے رہی تھی

زبیدہ نے جیپ روکنے کے لیے کہا تو جاوید نے جیپ روک

لی۔ ناہموار زمین پر جیب چلتے ہوئے ڈھیلوں نے جیب ساودھی اور سناٹوں کو گدگدانے کے لیے صرف جیب کے انجن کی آواز اکیلی رہ گئی تو زبیدہ نے کہا:

"جاوید صاحب مجھے شہری ہرنی کہنے کا آپ کو کس نے حق دے دیا؟"

جاوید نے بھی لہجے میں درشتی پیدا کرتے ہوئے کہا:

مسز زبیدہ یہ حق مجھے آپ ہی نے دیا ہے۔ کچھ ہی دیر پہلے آپ ہی نے تو کہا تھا کہ ہرنیاں بالکل ہندستانی عورتوں کی طرح ہوتی ہیں۔" ڈاکٹر نے مصالحت کرانے کے انداز سے قہقہہ لگایا۔

جاوید نے پوچھا: "اچھا تو یہ بتلایئے کہ آپ نے جیب رکوا کیوں لی؟"

زبیدہ نے کچھ جواب نہیں دیا اور ہاتھ کے اشارے سے گائیڈ کو نیچے اتر جانے کو کہا ــــ وہ اتر گیا تو زبیدہ جاوید کے برابر بیٹھ گئی اور گائیڈ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ "یہاں کونے میں بیٹھے ہوئے مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں اچھل کر نیچے نہ گر جاؤں۔"

جب گائیڈ نے کونہ سنبھال لیا تو جیب پھر روانہ ہو گئی۔ گھٹا ٹوپ اندھیروں اور بے پناہ سناٹوں کو درہم برہم کرتی جیب اس شان سے رواں دواں تھی جیسے سارے جنگل کی حکمراں ہو۔ ایک کھیت کو پیچھے چھوڑ کر جب وہ چھوٹی سی حصار پھلانگ جاتی اور دوسرے کھیت میں دوڑنے لگتی تو سب لوگ اچھل کر پھر سنبھل جاتے۔ کٹائی چونکہ ہو چکی تھی اس لیے سوکھے ٹھنٹھ اپنے اپنے نیزوں کی انی اپنے سروں پر رکھ کر جیسے اوپر سے آنے والی ہر مصیبت کے لیے تیار تھے لیکن جوں جوں جیب گزرتی جاتی وہ سرنگوں ہوتے جاتے اور جو جیب کی زد سے بچ جاتے وہ گویا اپنی جان کی خیر مناتے۔ فضا میں اڑتے ہوئے جگنو آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کا جواب تو تھے لیکن آسمان کی جانب دیکھنے کی فرصت کس کو تھی ــــ جگنوؤں نے اندھیروں کی حکمرانی میں ننھی ننھی چنگاریاں اس طرح جلا رکھی تھیں جیسے موت کے مہیب سناٹوں میں زندگی کے آثار چمک رہے ہوں۔ ستاروں کو دیکھ کر یہ احساس کہاں پیدا ہوتا ہے۔ نرم گھاس کے خشک ... [illegible]

اور سنگریزے اڑا اڑا کر جیب کی مسحور کن ہلکی روشنیوں میں رقص کرتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے ہمارا سواگت کر رہے ہوں۔ جاوید نے ہیڈلیمپس کے علاوہ دونوں بازوؤں اور پیچھے کی روشنیاں بھی جلا رکھی تھیں۔ بے پناہ اندھیروں میں گویا اجالوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ دراتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ اندھیرے چھٹ رہے تھے، ہٹ رہے تھے، راستہ بنا رہے تھے۔ بات یہیں ختم ہو جاتی تو وہ جانور جو جیب سے دور تھے، دور ہی بیٹھے تماشہ کرتے۔ لیکن گائیڈ کی سرچ لائٹ جنگل کے ہر ڈھکے چھپے ذی نفس خزانے کو اپنے حلقے میں جکڑ لیتی تھی۔ بے شمار ستارے جیسے زمین پر یکایک چمک اٹھے کبھی بالکل ساکت کبھی متحرک۔ سعید خوشی سے اچھل پڑا۔ یار اب تو ہاتھ لگ گیا کچھ ــــ سب کے سب ان ٹمٹماتے دیوں کو تکنے لگے جو ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو رہے تھے۔

ڈاکٹر نے زبیدہ کو پچھلی سیٹ سے گدگدایا، جوان جھلملاتے ستاروں اور چیختے ہوئے سناٹوں کی دنیا سے دور کہیں اور ہی تھی۔ اور شاید جیب کے اچھل جانے کی وجہ سے ابھی ابھی جاوید سے بالکل قریب ہو گئی تھی۔

زبی دیکھ رہی ہو ــــ ان ٹمٹماتے دیوں میں سے تابناک چراغوں کو چن چن کر جاوید کی بندوق پھونک دے گی اور تمھاری آنکھوں کے سامنے ہی ان جنگل کی شہزادیوں کا سہاگ لٹ جائے گا۔

لیکن زبیدہ نے ڈاکٹر سے کچھ نہ کہا۔ راست جاوید سے مخاطب ہو گئی:

"مسٹر جاوید اگر ہرنی خود آپ تک چل کر آگے آئے اور آپ کے آگے کھڑی ہو کر التجا کرے کہ آپ اس کا سینہ اپنی گولیوں سے چھلنی کر دیجیے تب بھی آپ اس کو نہیں ماریں گے؟"

جاوید نے کہا ــــ میں بڑے چاؤ سے اس ہرنی کو اپنی گود میں اٹھاؤں گا اور آہستہ آہستہ اس کے لبوں کی طرف بڑھوں گا۔ جو حسرت سے اپنی مادہ کو میری گود میں دیکھ رہا ہو گا جب وہ ... قریب پہنچ جاؤں گا تو اس کو اپنی گود سے اتار دوں گا۔ جیسے ... دونوں انتہائی خوشی کے عالم میں چوکڑیاں بھرنے لگے ...

بندوق اٹھے گی اور تمہارے سینے کو چھید دے گی اور میں آپ کی زبان میں جنگل کی شہزادی کی حسرتوں کو دیکھا کروں گا۔"

زبیدہ نے قریب قریب چیخ کر کہا: "تو پھر تم یہی سب کر گزرو جاوید!"

جاوید مسکرایا۔ گائیڈ سے مخاطب ہو کر اس نے کہا: "سرچ لائٹ داہنی جانب گھماتے رہو۔"

پھر وہ زبیدہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ــــ "یہی سب کچھ کر گزرتا لیکن اس بدنصیبی کو کیا کروں کہ آپ جن کو ہرنیاں سمجھ رہی ہیں، وہ چرواہے کا ریوڑ ہے جس میں بکریاں اور دنبے اطمینان سے جگالی کر رہے ہوں گے۔ ان کا رکھوالا کوئی چرواہا ضرور ان کے قریب ہی کہیں سو رہا ہوگا۔ آپ کو شاید اتنا معلوم ہی ہوگا کہ میں بکریوں یا دنبوں کا شکاری نہیں ہوں۔"

"لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کسی بپھری ہوئی شیرنی کے شکاری بھی نہیں ہیں۔"

"کوئی بپھری ہوئی شیرنی یہاں ہوتی تو میری بندوق سب کچھ سمجھا دیتی لیکن کوئی مغرور ہرنی میرے آگے آکر یہ سمجھ لے کہ اسے شیرنی سمجھ لوں گا تو یہ غلط ہے۔ اس لیے بھی کہ میں غلطی کر بھی جاؤں تو میری بندوق مجھے ٹوک دیتی ہے۔"

زبیدہ نے جل کر کہا ــــ "شکریہ جو آپ نے مغرور کتیا نہیں کہا۔"

سعید پھر مسکرایا: "اس میں شکریے کی کیا بات تھی مسز زبیدہ ــــ میرا مخاطب کوئی آپ تو نہ تھیں ــــ آپ اس طرح غلط فہمیوں کا شکار کیوں ہو جاتی ہیں۔"

ڈاکٹر نے مداخلت کی ــــ شیکھر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ جیپ ایک جھٹکے سے رک گئی۔

کانٹوں کی باڑھ کے متصل ایک خشک باولی تھی۔ بمشکل ڈیڑھ گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس بار سعید چوک جاتا تو جیپ اپنے سارے اجالوں اور زندگی کی حرارتوں کے ساتھ موت کی آغوش میں منہ چھپا لیتی ــــ لیکن سعید جیپ سے کھلونے کی طرح کھیلتا تھا۔ اس لیے بھی کہ وہ اپنی ہر پسندیدہ شے سے کھلونے کی طرح کھیلنے کا عادی ہو گیا تھا۔ اس کو شکار کرتا ہوا دیکھ کر لوگ کہتے تھے کہ وہ خود اپنی زندگی سے کھیل رہا ہے۔

جیپ پیچھے ہٹی اور پھر تیزی سے آگے بڑھ گئی ــــ سرچ لائٹ ظلمتوں کے سینے میں بھالا بن کر پیوست ہو گئی تھی۔ تاریکیاں قدم قدم پر مجروح ہو رہی تھیں۔ گائیڈ سرچ لائٹ آف کر دیتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے اندھیرے اجالوں پر اور ناامیدیاں، امیدوں پر فتح پا رہی ہیں، لیکن دوسرے ہی لمحے سرچ لائٹ سے ہر سمت اجالے پھینک کر گائیڈ پورے جنگل کو اپنی گرفت میں لے لیتا۔ کبھی کوئی خرگوش ایک جھاڑی سے نکل کر بے تحاشہ بھاگتا اور دوسری جھاڑی میں دبک جاتا۔ کبھی اجالوں کی محبت میں رک کر اپنی ہی زندگی سے بے نیاز ہو جاتا اور جیپ روشنی کے ہالے سے منٹ بھر میں اسے پھینک کر گزر جاتی۔ کبھی کہیں آنکھیں چمک اٹھتیں تو گائیڈ فوراً فوکس ملا کر ان چمکتی ہوئی آنکھوں کو روشنی کے احاطے میں محصور کر لیتا تب پتہ چلتا کہ کوئی بیل اطمینان سے بیٹھا ہوا جگالی کر رہا ہے یا کوئی گوالا چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ہراساں ہے۔ آس پاس درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے ذرا کی ذرا پر پھڑپھڑاتے اور جیپ کے گزرتے ہی پھر اسی درخت پر بیٹھ رہتے۔

گائیڈ کی سرچ لائٹ چاروں طرف گھوم کر جنگل کے ہر منظر کو اجالوں میں جکڑ لیتی اور پھر منٹ بھر میں یہ منظر اندھیروں کی آغوش میں پھینک دیے جاتے۔ جیپ آگے بڑھتی رہی۔ اجالوں کا کارواں اندھیروں پر گرد و غبار پھینک کر اس طرح رواں دواں تھا جیسے رات کی سیاہ تاریکیوں میں ان کا ایک ٹکڑا جیپ کے اطراف کٹ کر گر گیا ہو۔ جیپ کالے بادلوں کے سمندر میں چاند کی کشتی کی طرح رواں تھی لیکن اس کی رفتار ٹوٹتے ہوئے تارے کی طرح تھی۔

گائیڈ نے ایک مرکز پر سرچ لائٹ کے اجالوں کو ٹھہرا دیا۔ پھر اس نے لائٹ کو اس طرح حرکت دی کہ روشنیاں تھرکنے اور ناچنے لگیں اور پھر چمکتے دمکتے ہیرے روشنی کے احاطے میں چاروں طرف بکھر گئے۔

"ہرنیاں ہیں" سعید نے دو لفظ ہی ادا کیے اور جیپ تیزی

سے اس سمت روانہ ہوگئی۔ روشنیوں کے یلغار سے ہرنیوں کی آنکھوں کے چمکتے دمکتے ہیرے بے ترتیبی سے ادھر ادھر لڑھکنے لگے۔ چوکڑیاں بھرتی ہوئی ہرنیاں بے تحاشہ ایک ہی رخ کو نکل پڑیں۔ سعید نے جیپ پیچھے ڈال دی، یوں لگتا تھا جیسے ہرنیاں گائیڈ کی سرچ لائٹ کے ذرکس سے نکل کر اندھیروں میں کود جانا چاہتی ہیں۔ چوکڑیاں بھرتی ہوئی ہرنیاں اندھیروں کے لیے بے تاب تھیں۔ انھیں اندازہ تھا، یہ اجالے موت کے ایسے اندھیروں کی طرف انھیں لے جا رہے ہیں جہاں اجالے کی ایک کرن کے لیے بھی ان کی آنکھیں ترس جائیں گی۔

سعید نے جیپ کی رفتار تیز کر دی تھی۔ جیپ اب ہرنیوں کے بالکل قریب آگئی تھی۔ سعید کی نظریں اس کالے پر جمی تھیں جو ہرنیوں کی ٹکڑی میں سب سے سجیلا تھا۔ ہراساں ہو کر بھاگتے وقت بھی اس پر ایک بانکپن تھا۔ ایک ہرنی جیپ کے مڈگارڈ سے ٹکرا کر گری تو سعید نے اسٹیرنگ گھما کر اس کی جان بچائی اور کالے کے تعاقب میں آگے نکل گیا۔ وہ اپنی کہنی اسٹیرنگ میں دھنسائے جیپ کو ادھر ادھر گھما رہا تھا اور بندوق اس کے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں کالے کو نشانہ بنا رہی تھی۔

گولی چلی۔ ایک چیخ فضاؤں کو چیر کر اندھیرے میں کہیں کھو گئی۔ لمحے بھر کو کسی کی کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ اوسان بجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ جیپ ایک کھنڈ میں الٹتے الٹتے رہ گئی تھی۔ ہرنوں کی ٹکڑی اندھیروں میں کہیں کھو گئی تھی۔ سعید جیپ میں نہیں تھا۔ ڈاکٹر اچھل کر اگلی سیٹ پر آگیا تھا۔ سرچ لائٹ گائیڈ کے ہاتھ میں کانپ رہی تھی اور لائٹ کی ساری روشنیاں اس بلب کی تلاش میں تھیں جسے سعید کی بندوق نے ٹھوک دیا تھا۔ زبیدہ کے سینے سے خون رس رہا تھا اور وہ سعید کے سینے پر سر رکھے ہانپ رہی تھی۔ ڈاکٹر یہ بھول گیا تھا کہ زبیدہ اس کی بیوی ہے اور وہ سینہ اس کا نہیں ہے جس پر زبیدہ کا سر ہے۔ اور وہ آنکھیں بھی اس کی نہیں ہیں جن میں زبیدہ آخری بار جھانکنے کی کوشش کر رہی ہے۔

★

نیا دور کا احتشام نمبر اپنی آب و تاب کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔
- جسے ملک کے ممتاز ادیبوں، نقادوں اور شاعروں کا قلمی تعاون حاصل ہے۔
- جس میں متعدد نایاب تصویریں، اسکیچ اور عکس تحریر شامل ہیں۔ ضخامت: ۱۶۸ صفحات

قیمت فی کاپی صرف: ایک روپیہ

ملنے کے پتے: (۱) سوچنا کیندر، حضرت گنج لکھنؤ۔
(۲) انفارمیشن ڈپارٹمنٹ اتر پردیش لکھنؤ۔

بھلا دو میرے تصور کو جو چھوڑا جائے
تو لو عہدِ وفا تم سے جو توڑا جائے
آئینہ دل کا اگر ٹوٹا تو پھر ٹوٹ گیا
یہ وہ شیشہ نہیں جو توڑ کے جوڑا جائے
یادِ جاناں غمِ دوراں طلب جام وشبو
ایک چھالا ہوا گر دل میں تو پھوڑا جائے
شکوہ ایمانِ محبت ہے محبت میں مگر
ساتھ آدابِ محبت کا نہ چھوڑا جائے
لاکھ آئینے نگاہوں کو نظر آتے ہیں
ایک آئینہ اگر ہاتھ سے چھوڑا جائے
ہر طرف آپ کی زلفوں کے گھنے سائے ہیں
قافلہ زہد کا کس راہ پہ موڑا جائے
دل کو تو ہیں محبت نہیں برداشت مگر
اُن کا دامن بھی تو ہاتھوں سے چھوڑا جائے
جاگنے والوں کو طوفاں سے بچانا ہے محال
کوئی سوتا ہو تو بازو کو جھنجھوڑا جائے
جام گل میں نہیں باقی کہیں اک قطرہ شراب
کیسے دامنِ شبنم کو نچوڑا جائے

آتشِ سوزاں نہ بن آتشِ مسجود بن
بن نہ دلی دیپ راگ، نغمۂ داؤد بن
کاہ زمیں سا نہ بن، کوہ فلک سود بن
چھوڑ دے طرزِ ایاز شانِ محمود بن
تجھ سے رخِ زندگی پر ہو نئی تازگی
زہرِ ہلاہل نہ بن آتشِ بے دود بن
ہے تری فطرت ہی جب عبدیت و بندگی
بندۂ انساں نہ بن، بندۂ معبود بن
آبِ رواں بن تو وہ، جس پہ نہ کف چھا سکے
شعلہ بنا ہے اگر، شعلۂ بے دود بن
ڈھونڈھ رہا ہے جسے خود وہ تیرے دل میں ہے
زائرِ کعبہ نہ بن، کعبۂ مقصود بن
رنگِ جہاں پر نہ جا، روحِ جہاں کو سمجھ
بن نہ رخِ شادماں قلبِ غم آلود بن

اُن آنکھوں سے آنسو چھلکے
بہہ نکلے پتھر بھی پگھل کے
مظہر ہیں اس نورِ ازل کے
یہ نظارے دشت وجبل کے
پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی ہیں
رہروِ راہِ عشق سنبھل کے
وہ مخمور گلابی آنکھیں
جیسے ہوں دو پھول کنول کے
ہوتی ہے تکمیلِ محبت
فرقت کے سانچے میں ڈھل کے
مہر و وفا آدابِ محبت
ہو گئے سب افسانے کل کے
بن ہی گئی رسوائی الفت
منہ سے دل کی بات نکل کے
سن کر میرا حالِ شبِ غم
انکا ہنسنا بات بدل کے
مجھ کو دیکھا یوں سرِ محفل
دیکھنے والے رہ گئے جل کے
سعیٔ وفا بھی راس نہ آئی
دیکھا ہم نے انداز بدل کے
جذبِ صادق ہو تو اے دل
خود آ جائے منزل چل کے
دیکھ سکیں گے ان کے جلوے
دیر و حرم کی حد سے نکل کے
میری وفائیں، ان کی جفائیں
ہیں عنوانات منزل کے
نرگسی آنکھوں کا یہ جادو
دنیا بدل دی آنکھ بدل کے
پھولوں کی اتنی پامالی
ارمانوں کی گود میں پل کے
دیتے ہیں تسکین ابھی تک
چند حسیں یادوں کے دھندلکے

توڑ دی ہے مہری ساحل
پچتائے طوفاں سے نکل کے

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی میرٹھ میں ۱۸۵۷ء کے امر شہیدوں کی یادگار پر پھول مالا چڑھا رہی ہیں

شریمتی اندرا گاندھی گورکھپور تا
سمستی پور کے درمیان ریلوے
کی چھوٹی لائن کو بڑی لائن میں
تبدیل کرنے کے کام کا ۱۴ اپریل
کو افتتاح کر رہی ہیں
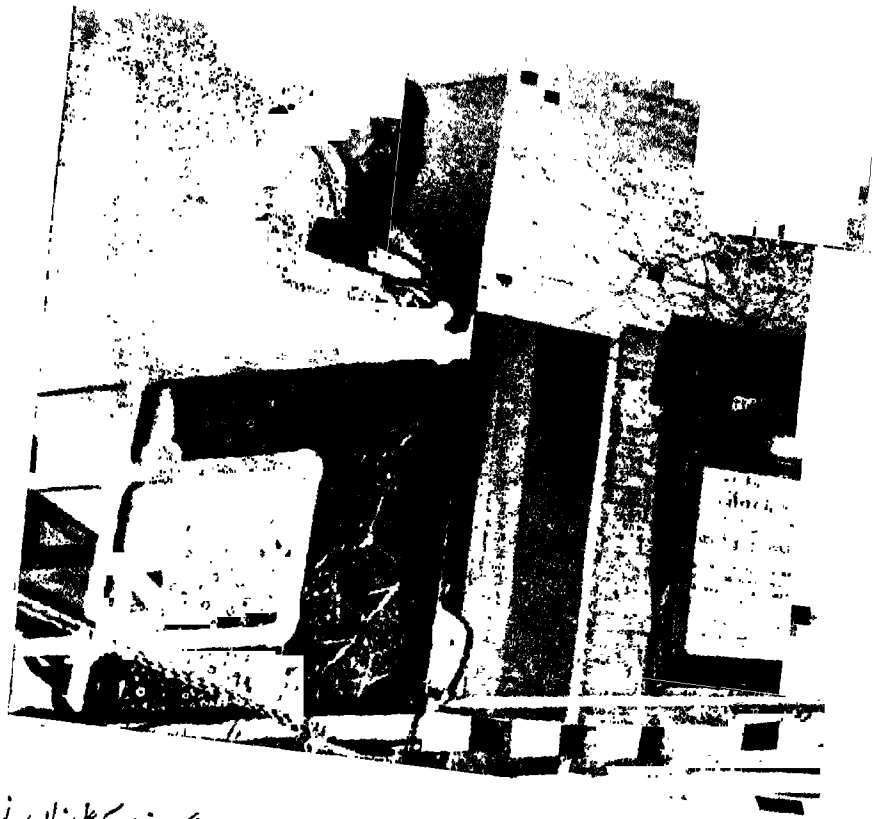
گورنر شری اکبر علی خاں نے راج بھون لکھنؤ میں ۲۷ اپریل ۱۹۷۲ء
عطا کیا (بائیں) اور (دائیں) دو ٹیچر بیٹھے ہوئے ہیں جنھیں

بسواں (سیتاپور) میں یوم قومی یک جہتی
جلسے کا ایک منظر۔ ڈائس پر (دائیں سے
بائیں) شری عمار رضوی پرنسپل شیعہ ڈگری
لکھنؤ، پنڈت آنند نرائن ملا، اکبر علی خاں گو
اتر پردیش، ڈاکٹر گردیال سنگھ ڈھلوں اسپ
لوک سبھا، راج کوی پدم شری اندر جیت سنگ
تلسی، خورشید افسر جنرل سکریٹری قومی یک جہ
فورم اور شری شفاعت علی پروگرام اگزیکیٹو
انڈیا ریڈیو لکھنؤ بیٹھے ہوئے ہیں

یکم مئی ۱۹۷۲ء کو کانپور میں مزدور انجمنوں کے زیر اہتمام یوم مئی کا جلوس

ایک ملک ایک قوم

جی۔ ایل۔ مہتا

پچیس سال پہلے جب ہمارے ملک نے آزادی حاصل کی تو قنوطیت پسند لوگوں نے یہ پیشین گوئی کی کہ یہ ملک کئی خطّوں میں تقسیم ہو کر انتشار کا شکار ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تو انھوں نے ہزیمت محسوس کی اور بہت سے غیر دوست دوستوں کو مایوسی ہوئی۔ نہ صرف یہی نہیں بلکہ اس ملک نے بہت سے بحران کا مقابلہ کیا۔ تین بار فوجی حملے ہوئے جنگیں ہوئیں، نئی ریاستیں وجود میں آئیں اور اقتصادی پس روی پیش آئی۔ یہ کوئی معجزہ نہیں۔ یہ بہت سی باتوں کا نتیجہ ہے مثلاً قیادت، عوام کا مزاج، اقتصادی حالات اور دستورِ ہند۔ انڈین یونین میں مہاجاؤں کی ریاستوں کا الحاق خصوصاً سردار پٹیل کی بصیرت اور عزم کا نتیجہ تھا۔ دوسری سب سے اہم بات یہ تھی کہ دستورِ ہند کی تشکیل ہوئی اور اسے اپنایا گیا۔ یہ دستور اس طرح تیار کیا گیا تھا کہ اس میں اختیار کی تقسیم وفاقی طور پر ہوئی تھی تاکہ ملک کی وحدت کو برقرار رکھا جا سکے۔

گرچہ ہمارے نظام کو شکل و صورت کے لحاظ سے پورے طور پر وفاقی نہیں کہا جا سکتا لیکن اسپرٹ میں یہ وفاقی ہی ہے اور اسے ایسا ہی ہونا ہے کیونکہ مختلف علاقائی، تہذیبی، مذہبی عناصر کو ایک وفاقی نظام میں متحد رکھنے کے لیے کوئی اس سے بہتر طریقہ نہیں ہے۔ مختلف علاقائی [illegible] اور لسانی وفاداریوں کو ملک میں ایک دوسرے کے قریب لانے میں دستورِ ہند کی حیثیت بنیادی رہی ہے۔ [illegible] اس طرح تعمیر [illegible] ہے کہ ان کے [illegible] کی گنجائش پیدا ہو جائے۔

لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تنظیم [illegible] اور اس صورت پر [illegible] کے قیام [illegible] کے تصور کے لیے ایک چیلنج اور ہندوستانی رہنمائی کے لیے ایک امتحان بن گیا۔ جو ان کے ساتھ یہ اندیشہ محسوس ہوا کہ رسمی اور دستوری اظہار کے ذریعہ یہ علاقائی قوتوں کے درمیان علیحدگی پسند رجحانات کی ہمت افزائی کرے گا۔ اس کے برخلاف یہ احساس موجود تھا کہ زبردست جذباتی قوتوں سے انکار نہ صرف غیر جمہوری ہوگا بلکہ قومی مفاد کے لیے ضرر رساں بھی۔ کسی فرد کے لیے زبان کی اہمیت بنیادی ہے اور اجتماعی زندگیوں اور ان کی قوتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ گرچہ لسانی ریاستوں کی تخلیق نے بہت صورتوں سے تنگ نظر قوتوں اور علاقائی غلط فہمیوں اور رقابتوں کو بڑھاوا دیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس نے بہت سی زبانوں کے ثقافتی احیا کو زندگی بخشی ہے۔ ریاستوں میں لسانی [illegible] بدقسمتی سے چھوٹی اور بڑی برائیوں کے درمیان ہوتی ہے مسئلہ یہ ہے کہ کانٹوں سے بچ کر کس طرح پھول حاصل کیے جائیں۔

دستورِ ہند کے ایک بانی ڈاکٹر بی آر امبیدکر نے ایک بار کہا تھا کہ صوبہ کی سرکاری زبان وہی ہونی چاہیے جو مرکزی حکومت کی سرکاری زبان ہو۔ اسی بنیاد پر وہ لسانی صوبوں کے مطالبوں کو تسلیم کرنے کے لیے تیار تھے۔ بدقسمتی سے ان کے اس مشورہ پر عمل نہیں ہوا ہے۔

تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اس صدی کے ایک [illegible] بلکہ ایک سے زیادہ بار ملک کے اتحاد کو خطرہ پیش آیا [illegible] [illegible] گذشتہ سال یہ قومی [illegible] امتحان [illegible] [illegible] کی طرف مائل ہیں [illegible]

میں عام حالات میں عوام میں بھی جذبہ کارفرما ہو۔ الیکشن میں امیدوار کے سلسلہ میں پسند یا وزیر کی حیثیت سے عہدہ یا سیاسی عہدوں پر تقرریوں کے وقت ذات اور فرقہ کا خیال پیش نظر نہ ہو۔ پیدائش سے زیادہ صلاحیت پر نظر رہے تب ہی قومی اتحاد ایک حقیقت ہوگی محض تمنا نہیں۔

فتح کے بعد المیہ۔ چرچل نے بالکل بجا فرمایا تھا۔ قومی آزادی کو حاصل کرنے کے لیے مختلف علاقوں اور فرقوں، عقیدوں اور خیالوں کے لوگ متحد ہو جاتے ہیں لیکن مقصد کی حصولی کے بعد ان میں شگاف پڑنے لگتا ہے۔ اس کے بعد کوئی بھی مشترکہ مقصد ان کے احساس وحدت کو فروغ نہیں دیتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بجائے لازمی طور پر قومی ترانے کی نغمہ سرائی اور جھنڈے کو لہرانے کے مشترکہ مقاصد میں سب حصہ دار ہوں اور زندگی کو بہتر بنانے سے متعلق مشترکہ کوششوں میں شریک ہوں۔ یہ بات قومی ترقی سے متعلق منصوبوں کی متقاضی ہے۔ بلاشبہ جواہرلال نہرو قومی منصوبہ بندی پر اس لیے زور دیتے تھے کہ وہ مغربی سماجی طرز اور سویت پنجسالہ منصوبہ سے متاثر تھے لیکن لیکن اگر ارادتاً نہیں تو درحقیقت ان کی اس طرز فکر نے مردوں اور عورتوں کو سیاسی، فرقہ وارانہ، صوبائی اختلافات کے امتیاز کے بغیر اتحاد کے لیے ایک مشترکہ سماجی مقصد عطا کیا۔ ایسے منصوبے معاشی تفاوت کو کم کر سکتے ہیں اور اس طرح قومی یکجہتی کی قوتوں کو تقویت بخش سکتے ہیں۔ اگر یہ امید ٹھیک سے پوری نہیں ہو سکی ہے تو قصور اس نظریہ کا نہیں ہے جتنا کہ طریقۂ عمل کا ہے جو سیاسی دباؤ اور رسہ کشی اور انتظامی نااہلی کا شکار رہا ہو۔ کسی بھی زمانے میں ملک کے اقتصادی اتحاد کو برقرار رکھنے اور مضبوط کرنے کی ضرورت اتنی اشد نہیں ہوئی جتنی کہ بحران کے اوقات میں۔ جن کا سامنا ہم لوگ کر چکے ہیں۔ چاہے یہ بحران غذا کی سخت قلت یا سرحدی جنگوں یا اقتصادی پس روی کی وجہ سے پیدا ہوا ہو۔ غذا کی تقسیم کا سوال اور قیمتوں پر کنٹرول سرمایہ کاری میں فوقیت اور صنعتوں کا قیام ـــــ یا دیگر بہت سے معاملات تقاضہ کرتے ہیں کہ ان کی تنظیم اور ترقی علاقائی حدوں اور صوبائی رقابتوں کی بنیاد پر طے ہونے کے بجائے کل ہند پیمانہ پر ہو۔ اہم اقتصادی مسائل اور قومی دفاع کے معاملات اس بات کے متقاضی ہیں کہ ان سے متعلق تفصیلی اور مربوط پالیسیاں اختیار کی جائیں تاکہ نہ صرف مادی ترقی حاصل ہو بلکہ ہمارے قومی وجود کا اظہار بھی ہو۔ بہت سے شعبوں میں ضرورت اس بات کی ہے کہ عام اور یکساں معیار قائم کیے جائیں مثلاً دفاعی فوجوں ٹرانسپورٹ ایٹمی طاقت کی پیداوار کی کوالٹی تکنیکی ترقی وغیرہ وغیرہ کے معاملات ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مقامی ضروریات یا ایسے مفادات کو قربان کر دیا جائے جن پر توجہ خاص طور سے ضروری ہے۔ اقتصادی ترقی کی ہی ضرورت ریاستوں کی طرف سے زیادہ اختیارات کے مطالبہ کی وجہ سے ملک میں اقتصادی تفرقات ہیں علاقائی منصوبہ بندی کے ذریعہ دور کرنا ہیں۔ کوئی بھی سمجھ دار شخص یہ صلاح نہیں دے گا کہ اس وسیع ملک پر جس میں مختلف قسم کے لوگ بستے ہیں اور جس میں تنوع ہے، کسی سخت وحدانی بنیاد پر حکومت ہو سکتی ہے۔

فرانس کے ایک سیاسی فلسفی نے کہا تھا کہ ضرورت سے زیادہ مرکزیت انتہاؤں پر اینیمیا اور مرکز میں اپاپلیکسی پیدا کرتا ہے۔ بے ضرورت مرکزیت سے اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا۔ جمہوری طریقہ کے لیے اقتدار کا انتشار ایک تحفظ ہے جب فیڈریشن اور صوبائی تعلقات سے متعلق کناڈا میں رائل کمیشن نے لکھا "شہریوں کی وفاداری کے لیے قومی اتحاد اور صوبائی آزادی کو ایک دوسرے کا رقیب نہیں سمجھنا چاہیے۔ چونکہ دونوں ایک ہی چیز، مضبوط وفاقی نظام کے دو رُخ ہیں۔ قومی اتحاد کی بنیادی صوبائی خود مختاری پر ہونی چاہیے اور صوبائی خود مختاری اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتی جب تک پورے ملک میں قومی اتحاد سے متعلق مضبوط احساس پیدا نہ ہو جائے۔"

ہم لوگوں کو بھی یک جہتی کے خلاف برسر پیکار اور علیحدگی پسند قوتوں کو روکنا ہے جو قومی اتحاد کے لیے مسلسل خطرہ ہیں۔ ایسا اتحاد جسے ہم حاصل کر چکے ہیں اور جس کی ہمیں اپنے ایک گراں بہا سرمایہ کی حیثیت سے حفاظت کرنی ہے۔

ایک غیر مذہبی نظریہ ہمارے قومی اتحاد کے لیے کم ضروری نہیں ہے نسل، عقیدہ، ذات یا جنس کی بنیاد پر امتیاز کی ہمارے دستور نے ممانعت کی ہے۔ لیکن اصل بات یہ نہیں ہے کہ دستور میں کیا درج ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ ہم اس کا نفاذ کس طرح کرتے ہیں اور اس کے بنیادی اصولوں پر کس طرح عمل درآمد ہوتا ہے یہاں ہم لوگوں کو ضرور اعتراف کرنا چاہیے کہ گاندھی جی کے اصولوں اور مثالوں اور سیکولرازم میں جواہر لال نہرو کے سخت عقیدے کے باوجود ہم لوگ ہمیشہ اپنے نظریات اور اصولوں پر قائم نہیں رہے ہیں۔ گذشتہ سال کے المناک اور تاریخی واقعات نے بہت سے جھوٹے بتوں کو پاش پاش کر دیا ہے۔ لیکن کوئی بت بھی اتنا تاراج نہیں ہوا جتنا کہ دو قومی نظریہ اور مذہبی ریاست کا عقیدہ۔ بنگلہ دیش کی بغاوت اور آزادی نے یہ دکھا دیا ہے کہ یہ مذہبی رشتہ جس کا خوب ڈنکا پیٹا جاتا ہے کتنا کمزور ہے۔ اسلامی ریاست کا نظریہ اس ناشاد اور بہادر ملک کے سبز میدانوں کے کھنڈرات اور دریاؤں کی نذر ہو چکا ہے لیکن اپنے ملک میں ایک واقعی غیر دینی سماج کی تعمیر میں ہماری ناکامی اس بات کی یاددہانی کرتی ہے کہ ہم اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔ جبکہ ہم اس بات پر اظہار اطمینان کر سکتے ہیں۔ ہیں حتیٰ کہ فخر بھی کر سکتے ہیں کہ جب گزشتہ سال اس ملک میں جسے اب تک مسٹر بھٹو "مشرقی پاکستان" یا "مسلم بنگال" کے نام سے پکارنے پر مصر ہیں، ہندوؤں پر مظالم ڈھائے جا رہے تھے اور ان کا قتل عام کیا جا رہا تھا ہمارا ملک فرقہ وارانہ فسادات یا مسلمانوں پر ظلم و ستم سے پاک تھا لیکن جیسا کہ حالیہ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے ہم لوگ خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔ اور اس کا تعلق نہ صرف ایک اقلیت سے ہے بلکہ پس ماندہ ذاتوں اور قبیلوں سے بھی ہے۔

قومی اتحاد کا مطلب خیالات کی صف آرائی مخالفت کی عدم تحمل اور اقلیتی نظریوں پر پابندی نہیں ہے۔ غیر موافقت کا مطلب غداری نہیں ہے۔ مطابقت کے لیے اصرار مطلق العنانیت کا خاصہ ہے جمہوریت کا نہیں۔

ہماری وفاداری ملک کے لیے ہونی چاہیے کسی حکمراں پارٹی کسی نظریہ یا کسی رہنما کے لیے نہیں ہم لوگوں کو قوم اور ریاست، حکومت اور پارٹی کے مابین فرق کو سمجھنا ہے۔ گزشتہ سال عالمی جنگ میں برطانیہ میں ذمہ دار شخصیتوں نے جنگ اور داخلی معاملات سے متعلق اپنی حکومت کی پالیسیوں پر شدید تنقید کرنے میں جھجک محسوس نہیں کی لیکن ان کو غیر محب وطن نہیں قرار دیا گیا۔ آج امریکہ میں ہزاروں لوگ صدر نکسن کی ویٹ نام سے متعلق پالیسی کی مذمت کرتے ہیں اور وہاں کے ہوئے صدر صاحبان پر عدم یقین کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان کو غدار نہیں کہا جاتا۔ اگر ہم دباؤ کے بجائے مرضی کی بنیاد پر اتحاد کے خواہش مند ہیں، اگر ہم چاہتے ہیں کہ مشترکہ کاموں میں باصلاحیت اور ذمہ دار اصحاب حصہ لیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم تحمل، برداشت، صبر اور مفاہمت اپنے اندر پیدا کریں۔ امریکی سپریم کورٹ کے ایک ممتاز جج مسٹر جسٹس بلیک نے کہا ہے کہ اتحاد خود سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونا چاہیے جو اپنے ملک سے محبت اور اپنی حکومت کی عزت کرتے ہیں قطعی تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ اتحاد کو ٹھونسا نہیں جا سکتا قومی اتحاد کو فروغ دیتا ہے اس کی نشو و نما کرتی ہے اور اسے برقرار رکھتا ہے۔ آزادی کی طرح اتحاد کی قیمت دائمی نگہبانی ہے۔

★

جشن یک جہتی

راشد قریشی

دوستو آؤ کہ مل کر جشن یک جہتی منائیں
پرتوِ نورِ محبت سے دلوں کو جگمگائیں
سارے عالم کو بتا دیں رازِ تنظیمِ حیات
ساری دنیا کو ترقی کی نئی راہیں دکھائیں
ہر تصور صرفِ تعمیرِ جہانِ نو کریں
ہر نفس سے ہر نظر سے اک نئی دنیا بنائیں
جو ہیں تاریکی میں ان کو بھی دکھائیں روشنی
خوابِ غفلت میں جو ہیں مدہوش ان کو بھی جگائیں
عام ہو جائے جنونِ عشق و احساسِ وفا
سازِ یک جہتی پہ ایسے دل نشیں نغمے سنائیں
پھر رہِ ارتقا کی ہمتیں کر دیں بلند
روک دیں ان کو جو ہر ہر گام پر فتنے اٹھائیں
کوئی منزل ہو مگر احساسِ ناکامی ہو کیوں
کوئی جادہ ہو مگر اپنے قدم کیوں ڈگمگائیں
اپنا کردار اک نمونہ ہو جہاں کے واسطے
ہر عمل کو اپنے ایسا ارفع و اعلیٰ بنائیں
آج دنیا کو ضرورت ایسے انسانوں کی ہے
خود بھی جو ہنستے [illegible] اوروں کو بھی جینا سکھائیں

میرے لیے

عزیز مراد آبادی

وادیِ کشمیر ہے باغِ جناں میرے لیے
مثلِ جنت ہے مرا ہندوستاں میرے لیے
اس کے صحرا ہیں مثالِ گلستاں میرے لیے
اور ہر ذرہ ہے ماہِ ضوفشاں میرے لیے
ہند ہے ہم پلۂ فردوس تو گنگ و جمن
کوثر و تسنیم ہیں ہر دم رواں میرے لیے
لہلہاتی کھیتیوں میں کام کرتے نوجواں
ہیں یہ تقدیرِ وطن کے پاسباں میرے لیے
تاز کیوں کر ہو نہ مجھ کو از ہمالہ تا دکن
وقف ہیں قدرت کی سب رعنائیاں میرے لیے
نانک و چشتی و گوتم اور کرشن و اولیاء
بزمِ عالم کے ہیں یہ پیرِ مغاں میرے لیے
جس نے درسِ امن و الفت ساری دنیا کو دیا
مرکزِ فیضِ رواں، ہندوستاں میرے لیے
ہم نے سیکھا ہے سلیقہ زندگی اور موت کا
ہے سپاہی ہند کا ہر اک جواں میرے لیے
احترامِ مذہب و ملت ہے روحِ اتحاد
اس لیے یکساں ہیں ناقوس و اذاں میرے لیے
سب کے یکساں ہیں فرائض اور حقوقِ زندگی
ہے یہیں جمہور کی روحِ رواں میرے لیے
ہند کے ادوار کی تاریخ کے روشن ورق
عظمتِ تہذیب کی ہیں کہکشاں میرے لیے
کس طرح [illegible] زباں کے [illegible]
سب کی ہے اردو زباں اور [illegible] میرے لیے
تم ہی اب انصاف سے کہہ دو [illegible]
ہند سے اچھی جگہ ہوگی کہاں میرے لیے

دور اندیشی اور سلیقہ مند کیڑا

کے۔ صلاح الدین

چیونٹی کی رہائش، سلیقہ، کفایت شعاری، دور اندیشی، ایثار، قربانی، احساس ذمہ داری، محنت، لگن، ہمت، جستجو، آپس میں ہمدردی، یکجہتی اور فرض شناسی۔ یہ ایسی خصوصیات ہیں جن کی مثال ہم انسانوں میں مشکل سے ملتی ہیں۔ انسان جب بڑی بڑی اسکیمیں بنا کر ان پر کام کرتا ہے تو اسے منصوبوں کے کام کی نگرانی کے لیے نگراں مقرر کرنا پڑتا ہے۔ لیکن چیونٹی جب کام پر لگ جاتی ہے تو اس پر نگرانی کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ اسے یہ پورا پورا احساس ہوتا ہے کہ اس کا فرض کیا ہے ذمہ داری کیا ہے۔ جب بھی آپ کسی چیونٹی کو اناج کا دانا یا اسی قسم کی کوئی اور شے لے جاتے ہوئے دیکھیں تو یہ خیال نہ کیجیے کہ وہ صرف اپنی ذات یا اپنے گھر کے لیے یہ گراں بار فرض انجام دے رہی ہے۔ وہ جب بھی کوئی ایسی چیز لے جاتی ہے تو اس کے پیش نظر ساری بستی کی بہبودی ہوتی ہے۔ چیونٹی کی زندگی میں بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جب وہ اپنے ساتھیوں کی زندگی کے لیے اپنی جان کی بازی تک لگا دیتی ہے۔

میں یہ بتا کر آپ کا قیمتی وقت نہیں لوں گا کہ چیونٹی کا جسم ان تین حصوں سر، سینہ اور پیٹ میں تقسیم ہوتا ہے۔ پیروں میں تین جوڑ ہوتے ہیں۔ سر پر دو ساختیں ہوتی ہیں جن سے وہ راستہ اور اندھیرے [illegible] ہے۔ البتہ یہ بتا کر حیران ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ چیونٹی کے سامنے اور دونوں طرف آنکھیں ہوتی ہیں اور بعض صرف [illegible] آنکھوں سے محروم ہوتی ہیں۔ آپ حیران ہوں گے آنکھیں کیسے [illegible] ہو سکتی ہیں مگر [illegible] ایک حقیقت ہے [illegible] ہزار آنکھوں کا [illegible] ہوتا ہے [illegible] دونوں جانب پایا جاتا ہے۔ ایسی آنکھوں سے وہ چاروں طرف [illegible] دیکھ سکتی ہے [illegible] تعداد میں پائی جاتی ہیں [illegible]

کا صرف ہونا پڑتا ہے۔ گرم ممالک کی چیونٹیوں کے جبڑے بڑے طاقتور اور مضبوط ہوتے ہیں جن سے یہ چیونٹیاں حسب ضرورت ہتھیار اور اوزار کا کام لیتی ہیں۔ ان زبردست جبڑوں کے ساتھ دو چھوٹے جبڑے بھی ہوتے ہیں جن سے وہ نازک کام لیتی ہے۔ ہونٹ کے نیچے ایک انتہائی چھوٹی تھیلی ہوتی ہے جس میں غذا کے ٹھوس ذرات ہوتے ہیں تاکہ وہ رس جذب کر سکیں۔ بعض چیونٹیوں میں ڈنک ہوتا ہے اور بعض میں ایسی ساختیں جن میں جلن

پیدا کرنے والی یا تھوڑی دیر کے لیے آنکھوں کو بیکار کر دینے والی گیس ہوتی ہے۔ چیونٹیوں کا خاندان ہمارے خاندان کی طرح مختصر نہیں ہوتا بلکہ پورے ایک شہر پر مشتمل ہوتا ہے جس میں ہزاروں چیونٹیاں ہوتی ہیں جو عموماً ایک ہی ماں یعنی ملکہ کی اولاد اور ایک ہی کنبہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ملکہ کا کام صرف انڈے دینا ہوتا ہے جو کئی ہزار کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ پہلے حمل میں صرف سپاہی چیونٹیاں نکلتی ہیں۔ اس کے بعد کے حمل میں رانیاں اور نر پیدا ہوتے ہیں۔ ان انڈوں کو خاص مدت تک صرف مخصوص درجہ کی حرارت پہنچانے سے بچے نہیں نکل آتے بلکہ انھیں ایک [illegible] پڑتا ہے تب کہیں چیونٹی عالم وجود میں آتی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ان چیونٹیوں کی رہائش [illegible]

گھر بنانا، بچوں کی تربیت، ان کی غذا کی فراہمی، انڈوں، رانی اور نر چیونٹیوں کی حفاظت یہ تمام اہم کام سپاہی چیونٹیوں ہی کے ذمے ہوتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ کسی ناگہانی حادثے یا کسی اور وجہ سے "شہر" کی رانیاں یا نر نیست و نابود ہو جائیں تو بقائے نسل کے لیے ان سپاہی چیونٹیوں میں کچھ ماداؤں میں تبدیل بھی ہو جاتی ہیں اور اس طرح نسل مٹنے نہیں پاتی۔

سپاہی چیونٹیوں کی عمر بہ نسبت دوسری چیونٹیوں کے زیادہ ہوتی ہے (سوائے ملکہ کے۔ اس لیے کہ ملکہ کی عمر پندرہ سال تک ہوتی ہے) یہ سات آٹھ سال تک زندہ رہتی ہیں اور غیر جنسی ہوتی ہیں جسامت کے لحاظ سے رانی سے کم ہوتی ہیں مگر جسمانی ساخت بڑی مضبوط اور حالات کا مقابلہ کرنے کی ان میں صلاحیت ہوتی ہے۔ سرد ممالک میں ان سپاہی چیونٹیوں کو سارے موسم خزاں میں ایثار سے کام لینا پڑتا ہے۔ یعنی یہ جمع شدہ غلے میں سے ایک دانہ بھی خود نہیں کھاتیں۔

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ ملکہ کا کام صرف انڈے دینا ہوتا ہے۔ انڈوں کی حفاظت، خبر گیری اور ان انڈوں سے بچے نکلنے کے بعد ان کی پرورش یہ سب سپاہی چیونٹیاں کرتی ہیں۔ اگر بغور دیکھا جائے تو ملکہ کو قدرت نے جسمانی لحاظ سے اس قابل ہی نہیں بنایا ہے کہ وہ کوئی اور کام انجام دے۔ اس کا اندازہ آپ کو تصویر سے ہو جائے گا۔

میکسکو میں ایک قسم کی مادہ چیونٹی چربی اور غذائی مادوں سے اس قدر شکم پر ہوتی ہے کہ وہاں کے لوگ ان چیونٹیوں کو خشک میوہ کی طرح چباتے پھرتے ہیں — جب رانیاں جوان ہو جاتی ہیں تو باضابطہ اور دھوم دھام سے ان کا سوئمبر رچایا جاتا ہے۔ سارے انتظامات مکمل ہو جانے کے بعد انھیں سپاہی چیونٹیاں سہارا دے کر شہر سے باہر نکال لاتی ہیں اور کسی اونچی جگہ چڑھا دیتی ہیں جہاں سے یہ ملکہ "عروسی پرواز" کرتی ہے۔ اس کے بعد یہ عموماً اپنے "شہر" کم واپس ہوتی ہیں اس لیے کہ یہاں سے انھیں نئی زندگی کا آغاز کرنا ہوتا ہے۔

نر چیونٹی، ملکہ اور سپاہی سے چھوٹی ہوتی ہے اور اس کی عمر بھی بہت کم ہوتی ہے، اس لیے کہ یہ رانی کی آخری اولاد ہوتی ہے اور اس وقت پیدا ہوتی ہے جب غذا کا اسٹاک قریب الختم ہوتا ہے۔ یہ رانیوں کی طرح بیکار محض تو نہیں ہوتیں لیکن سپاہی کی طرح مستعد اور مضبوط بھی نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی کا انحصار بھی سپاہیوں پر ہوتا ہے۔ یہ شادی کے دنوں میں پرواز کرتے ہیں اور دوسرے "شہر" کی ماداؤں سے ملاقات کے بعد انھیں اپنے گھر واپس ہونا نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی وجہیں ہیں۔ چڑیاں، مکڑیاں، ہوا، دھوپ وغیرہ ان کے خاص دشمن ہیں اور جو ان دشمنوں سے محفوظ رہتے ہیں وہ راستے کی طوالت سے ختم ہو جاتے ہیں۔

انڈوں سے جب بچے نکلتے ہیں تو وہ انتہائی بے بس اور مجبور ہوتے ہیں۔ ان کے آنکھیں بھی نہیں ہوتیں، اور نہ پیر ہی ہوتے۔ وہ انتہائی ننھے کیڑوں کی مانند ہوتے ہیں جو خود سے غذا بھی نہیں کھاتے۔ ایسے بچے سپاہیوں کے حوالے کر دیے جاتے ہیں سپاہیوں کی فرض شناسی ملاحظہ فرمایئے کہ جس کمرے میں یہ بچے رکھے جاتے ہیں وہ نہ صرف ہوادار، محفوظ اور خشک ہوتے ہیں بلکہ پندرہ بیس سپاہی ہمہ تن اور ہمہ وقت وہاں موجود رہتے ہیں۔ ان بچوں کی خاطر وہ پہلے ہی سے غذا کھا لیتے ہیں اور جب وہ ہضم ہونے کے قریب پہونچتی ہے تو اسے بچوں کے منہ میں اگل دیتے ہیں۔ ہر روز ان بچوں کو دھوپ اور ہوا پہنچانا، مناسب درجہ حرارت کا خیال کرتے ہوئے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں منتقل کرنا سپاہیوں کے فرائض میں داخل ہے۔

انڈا

ان مجبور و بے بس بچوں کو سروہ کی منزل (LARVA STAGE) کہتے ہیں یہ کیفیت دو تین ہفتوں تک رہتی ہے۔ اس کے بعد ایک عظیم انقلاب آتا ہے۔ یعنی یہی معذور بچہ اپنے اطراف جال بننے لگتا ہے جیسا کہ ریشم کا کیڑا کرتا ہے۔

پھر اس جال میں وہ اپنی مرضی سے قید ہو جاتا ہے۔ موسم بہار میں آپ کسی باغ میں چلے جائیے اور کوئی پتھر اٹھا کر دیکھیے تو اس کے نیچے ایسے ہزارہا سفید اور ہلکے رنگ کے اجسام نظر آئیں گے جنھیں لوگ چیونٹیوں کے انڈے کہتے ہیں حالانکہ یہ بچے ریشمی غلاف میں بند کیے ہوتے ہیں جنھیں شرنقہ PUPA کہتے ہیں۔ یہ بچے چونکہ اس منزل میں بھی بے بس ہوتے ہیں اس لیے سپاہی ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ آپ نے بھی بیسیوں مرتبہ چیونٹیوں کو کسی وقت PUPA اٹھائے تیزی سے بھاگتے دیکھا ہوگا۔ یہ ان شرنقوں کو دھوپ کھلانے بلوں سے باہر لاتی ہیں۔ یہ حالت بھی تقریباً تین ہفتوں تک رہتی ہے کیونکہ شرنقہ پختہ ہونے کے بعد اس غلاف کو پھاڑ کر باہر نکل آتا ہے۔ تعلیم و تربیت کا آغاز عنفوان شباب سے شروع ہوتا ہے۔ سپاہی انھیں "شہر" کے آداب، رہن سہن کے طریقوں، رسم و رواج اور خفیہ راستوں سے واقف کرتے ہیں۔ ان کی تعلیم اس قدر مکمل اور جامع ہوتی ہے کہ مزید تربیت کی قطعی ضرورت نہیں پڑتی۔ عمدہ بات تو یہ ہے کہ نوجوان چیونٹیاں ہمارے نوجوان کی طرح اپنے مطالبات منوانے کے لیے نہ تو توڑ پھوڑ کرتی ہیں، نہ ہڑتالیں کرتی ہیں نہ ہی شہری قانون کو اپنے ہاتھ میں ۔۔۔۔۔ لے کر "شہر" کا نظام درہم برہم کرتی ہیں۔ اس ننھے سے کیڑے کی سماجی اور گھریلو زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بظاہر حقیر سا کیڑا جو کسی اعتبار سے انسان کی نگاہوں میں نہیں سماتا، اس قدر اعلیٰ تہذیب اور تمدن کا مالک ہے کہ انسان سے قوی مشابہت رکھتا ہے۔

نوعمر چیونٹے

چیونٹیوں کے "گھر" کسی ایک کی نہ تو میراث ہوتے ہیں اور نہ ہی ملکیت۔ ان گھروں اور گھر کی ہر چیز پر سب کا یکساں حق ہوتا ہے۔ اس ننھی سی مخلوق کے ننھے سے "شہر" (جو اسّی اسّی گز کے احاطے پر محیط ہوتے ہیں) میں متعدد شاہراہیں، لاتعداد گلی کوچے، بچہ گھر NURSARIES، کھیل کے میدان، گودام، طویلے، گؤ سالے، مہمان خانے سب ہی کچھ ہوتے ہیں۔ ان شہروں کی صفائی کا انھیں اتنا خیال ہوتا ہے کہ سپاہی چیونٹیوں کا ایک دستہ ہمیشہ اسی کام پر متعین رہتا ہے۔ جن کمروں میں بچے رکھے جاتے ہیں ان کا فرش بڑا عجیب ہوتا ہے۔ گھاس یا درخت کے ملائم پتوں کو سپاہی چبا چبا کر نرم کر لیتے ہیں اور ان کمروں میں بچھا دیے جاتے ہیں۔

ذخیرہ کیے ہوئے اناج کو سڑنے اور پھپھوندی سے بچانے کے لیے ایسے کمروں میں رکھا جاتا ہے جو انتہائی خشک اور گرم ہوتے ہیں۔ ان بستیوں میں سرد اور گرم محل بھی ہوتے ہیں جنھیں شدید سرما اور گرما کے موسم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ چیونٹیاں اپنے ملک اور وہاں کی آب و ہوا کو پیش نظر رکھ کر گھر بناتی ہیں۔ جن ممالک میں بارش کثرت سے ہوتی ہے وہاں وہ اپنے "شہر" ڈیڑھ دو فٹ سے زیادہ گہرے نہیں بناتیں۔ اس کے برخلاف گرم و خشک ممالک میں ان کے گھر دس گیارہ فٹ کی گہرائی میں دیکھے گئے ہیں۔ ان شہروں کے متعدد پھاٹک ہوتے ہیں جنھیں رات کے وقت سپاہی کنکروں، لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں وغیرہ سے بند کر دیتے ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر یہ سپاہی رات بھر کے لیے بڑے عجیب و غریب دروازے لگاتے ہیں مثلاً دروازے کی بجائے اپنے سر استعمال کرتے ہیں۔ ان سپاہیوں کے سر بڑے مضبوط اور سخت ہوتے ہیں۔ اس لیے بعض وقت یہ سوراخ میں دروازے کے بدلے اپنے سر پھنسا دیتے ہیں اور صبح ہوتے ہوتے یہ جاندار دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔

آپ یہ جان کر یقیناً حیران رہ جائیں گے کہ یہ چیونٹیاں ایک قسم کی "گائیں" پالتی ہیں اور شہد نما دودھ سے مستفید بھی ہوتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ ان سبز کیڑوں کو گرفتار کرتی ہیں جو بارش کے ختم پر درختوں کے پتوں کے نچلے حصوں پر نظر آتے ہیں۔ ان سبز کیڑوں کو APHIDES یا GREEN FLIES کہتے ہیں۔ ان کیڑوں کے پیٹ کی پچھلی جانب دو لانبی نلیوں سے شہد کی قسم کا میٹھا رس ٹپکتا ہے اور بعض اوقات یہ اس کثرت سے نکلتا ہے کہ پتوں کی نوک سے شبنم کے قطروں کی طرح ٹپکتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں "شہد کی شبنم" HONEY DEW کہتے ہیں۔ چونکہ یہ شہد چیونٹیوں کو بے حد مرغوب ہوتا ہے اس لیے اس کے حصول کے واسطے یہ بڑا عجیب طریقہ استعمال کرتی ہیں یعنی ان کیڑوں کو گرفتار کر کے اپنے گھر لے جاتی ہیں اور انھیں گؤ سالوں میں قید کر دیتی ہیں۔ یہ قید با مشقت نہیں ہوتی بلکہ اسے آپ قید با شفقت

سکتے ہیں اس لیے کہ سپاہی چیونٹیاں ان کیڑوں کی غذا اور آرام کا بھرپور دھیان کرتی ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح ہم اپنے پالتو جانوروں کی دیکھ بھال اور خبر گیری کرتے ہیں۔ جب بھی چیونٹیوں کو اس شہد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ ان "گایوں" کے قریب جا کر پچھلی نالیوں کو اپنی مونچھوں سے سہلاتی ہیں تو میٹھے عرق کے دو قطرے نکل پڑتے ہیں۔ ان گایوں نے تا دم زیست فائدہ اٹھانے کے لیے ان کے انڈوں کی حفاظت اور پھر بچوں کی خبر گیری کرتی ہیں۔ بچے جب ذرا بڑے ہو جاتے ہیں تو انھیں درخت کے پتوں پر چھوڑ آتی ہیں اور جب وہ کھا پی کر تنومند ہو جاتے ہیں تو انھیں پھر گھر لے آتی ہیں اور "قید با شفقت" کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔

اب چیونٹیوں کے خاص خاص قسموں کے بارے میں جو ذکر کیا جا رہا ہے اس سے آپ اندازہ لگائیں گے کہ ان کیڑوں کی سماجی زندگی اور رہن سہن کس درجہ انسانوں کے رہن سہن سے ملتا جلتا ہے اور آج کا متمدن انسان اپنی بعض کمزوریوں اور خامیوں کی وجہ سے کس قدر مجبور اور اپنے معیار سے گر گیا ہے۔ اسی قسم کی بعض کمزوریوں کا یہ چیونٹیاں بھی شکار نظر آتی ہیں۔

جلاہا چیونٹیاں ۔ جنوبی افریقہ، مغربی ایشیا، نیو گنی اور آسٹریلیا میں پائی جاتی ہیں۔ انھیں تیلیا چیونٹیاں بھی کہا جاتا ہے۔ یہ چیونٹیاں انڈے دینے کے لیے درخت کے پتوں کو ایک لیس دار مادے سے جوان کے بچوں کے جسم سے خارج ہوتا رہتا ہے جوڑتی ہیں اور اس "گھر" میں رانی دوسری نسل کی ابتدا کرنے کے لیے انڈے دیتی ہے۔

شہد سے بھری چیونٹیاں ۔ شہد ان چیونٹیوں کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے اور انھیں وقتاً فوقتاً اس کی ضرورت لاحق ہوتی رہتی ہے اور وقت ضرورت شہد کا دستیاب ہونا ضروری تو نہیں۔ یہاں بھی سپاہی چیونٹیوں کے شکم اس قدر لچکدار ہوتے ہیں کہ وہ اپنے حجم سے تیس چالیس گنا پھیل سکتی ہیں۔ کام کرنے والی چیونٹیاں بہار میں پھولوں سے شہد اکٹھا کر کے لاتی ہیں اور ان سپاہی چیونٹیوں کو کھلا دیتی ہیں جنھیں یہ سپاہی چیونٹیاں اپنے شکم میں ذخیرہ کرتی جاتی ہیں اور پھر اپنے گھر کی چھت سے چپک کر بیٹھ جاتی ہیں۔ یہ جان لیوا خدمت وہ محض اپنی ساتھی چیونٹیوں کے لیے انجام دیتی ہیں۔ یہ خدمت جان لیوا نہیں تو اور کیا ہے کہ سارا موسم انھیں اس کے سوا کوئی کام نہیں رہتا کہ اپنے شکم میں شہد بھر کر یوں ہی چھت سے لٹکی رہیں۔ آپ کو یہ جان کر یقیناً حیرت ہوگی کہ یہ شہد مکھی والے شہد سے زیادہ خوش ذائقہ ہوتا ہے۔

غلام بنانے والی چیونٹیاں ۔ ان کا کام بس دوسری چیونٹیوں کی آبادی پر دھاوا بول دینا اور جتنے انڈے یا بچے ہاتھ لگیں انھیں مال غنیمت کے طور پر اٹھا لانا اور جوان ہونے کے بعد ان سے غلامی کروانا ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ جنگ جو چیونٹیاں آرام و آسائش کی اتنی عادی ہو جاتی ہیں کہ غذا تک حلق سے اتارنا انھیں بار معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس کے بعد ان کی غلام چیونٹیوں کے رحم و کرم پر بسر ہوتی ہے۔ غلاموں کی نا اہلی بھی ان کی موت کا باعث بن جاتی ہے۔ اس قسم کی چیونٹیاں دریائے نیل کی وادی میں پائی جاتی ہیں۔

گیس پھینکنے والی چیونٹیاں ۔ اکثر جانوروں کے بارے میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ خود کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لیے وہ خطرے کے وقت گیس یا زہریلا مادہ خارج کرتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی حرکت یہ ننھی سی جان اپنے بچاؤ کی خاطر کرتی ہے۔ اس قسم کی چیونٹیوں کی دریافت زیادہ پرانی نہیں ہے۔ کیونکہ ایک فرانسیسی سائنسداں نے انھیں ۱۹۲۲ء میں ڈھونڈھ کر دریافت کیا تھا۔ اس گیس سے حملہ آور کی آنکھیں وقتی طور پر بیکار ہو جاتی ہیں۔

کسان چیونٹیاں ۔ امریکہ کی جنوبی سرزمین ٹیکساس میں ایک قسم کی چیونٹیاں پائی جاتی ہیں جو باضابطہ کھیتی باڑی کرتی ہیں۔ اسی لیے انھیں کسان چیونٹیاں کہا جاتا ہے۔ موسم برسات سے قبل یہ چیونٹیاں اپنے شہر کے اطراف کی زمین کو ہر قسم کے کوڑا کرکٹ سے صاف کر کے چکنا کر لیتی ہیں اور جب زمین تیار ہو جاتی ہے تو ایک قسم کے گھاس کے بیج بو دیتی ہیں۔ فصل تیار ہونے تک سپاہی چیونٹیاں ان پودوں کی دن رات حفاظت کرتی رہتی ہیں۔ فصل پکتے ہی کٹائی شروع ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر کچھ سپاہی ان پودوں پر چڑھ کر اپنے تیز نوکیلے جبڑوں سے دانے توڑ توڑ کر نیچے پھینکتے جاتے ہیں اور نیچے منتظر سپاہی انھیں اکٹھا کر کے گودام تک پہنچاتے جاتے ہیں۔

آخر میں جنوب مشرقی ایشیا اور افریقہ کی ان جنگجو چیونٹیا

کا حال بھی کسن لیجیے جنھیں خانہ بدوش اور ڈرائیورز (DRIVERS) کہتے ہیں۔ یہ ہر ذی حیات کے خون کی پیاسی ہوتی ہیں۔ جب بھی کوئی بدنصیب جاندار (خواہ انسان ہو یا شیر، ہاتھی ہو یا چوہا) اس دَل کی راہ میں آجاتا ہے تو چند سکنڈ میں اس کا ڈھانچہ پڑا نظر آتا ہے۔ ان چیونٹیوں کا دَل جو کروڑوں کی تعداد پر مشتمل ہوتا ہے، نکلتا ہے تو جنگل کا ہر چرند و پرند عالم بدحواسی میں بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ بِلوں میں رہنے والے جانور بھی راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔ جو جانور ان سے بچنے کے لیے درختوں پر چڑھ جاتے ہیں ان کے تعاقب میں ہزارہا چیونٹیاں درختوں پر پہنچ کر اس بدنصیب جانور سے اس بری طرح چمٹ جاتی ہیں کہ وہ بیچارہ زمین پر آرہتا ہے۔ جہاں پہلے سے کروڑوں چیونٹیاں اپنے بھیانک جبڑے کھولے منتظر رہتی ہیں اور پھر...... بس ہڈیوں کا ڈھیر رہ جاتا ہے۔ جب بھی یہ کسی جانور پر حملہ کرتی ہیں تو سب سے پہلے اس کی آنکھیں ضائع کر دیتی ہیں۔ ان کی آمد کی خبر جنگل کے باسیوں کو پہلے سے ہو جاتی ہے۔ اس لیے وہ اپنے پالتو جانوروں کے ساتھ بستی خالی کر دیتے ہیں۔ ان کی تعداد کا صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے کیونکہ شمار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بیترن نامی سائنسدان نے گیانا میں ان چیونٹیوں کے دَل کو دیکھا تھا جو بیس گز کی چوڑائی میں پھیلی ہوئی تھیں اور انھیں ایک مقام سے گزرنے کیلیے نصف گھنٹہ لگا (اس سے اس دَل کی لانبائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے) ان چیونٹیوں کی مادائیں اور سپاہی آنکھوں سے محروم ہوتے ہیں صرف نر چیونٹیوں میں بینائی کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ان چیونٹیوں کے سپاہی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا کام صرف جنگ و جدل ہوتا ہے اور جن کے جبڑے نہایت ہی مضبوط اور تیز ہوتے ہیں اور ان کی جسامت عموماً ایک انچ کے قریب ہوتی ہے اور دوسری قسم ان سے ہر لحاظ سے کم ہوتی ہے۔

اگر موسم گرما ہو اور دھوپ تیز ہو تو یہ دوسرے کیڑوں کی بلوں میں پناہ لیتی ہیں اور اگر ایسی کوئی جگہ نہ ملے تو بڑی ہی عجیب و غریب ترکیب دھوپ سے بچنے کی نکال لیتی ہیں۔ سپاہی دو دو یکطرف ہو جاتے ہیں اور اپنے جبڑوں اور اگلی ٹانگوں سے ایک دوسرے کو اس طرح پکڑ لیتے ہیں کہ کئی فٹ لانبی اور اونچی کمان بن جاتی ہے۔ باقی سپاہی اس جاندار کمان پر اطراف سے مٹی تھوپ دیتے ہیں۔ پورا قافلہ دن بھر اس کمان ما رواق کے اندر پناہ لیتا ہے اور رات ہوتے ہی سپاہی الگ ہو جاتے ہیں اور کمان ٹوٹ جاتی ہے۔

یہاں یہ بھی بیان کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان کے راستے میں اگر ندی یا نالہ پڑ جائے تو یہ کیا کرتی ہیں۔ اکثر ندی کے کنارے درخت ہوتے ہیں۔ درخت کی کسی شاخ کو ایک چیونٹی پکڑ لیتی ہے۔ اس چیونٹی کو دوسری اور دوسری کو تیسری۔ اس طرح ایک زنجیر زمین تک پہنچ جاتی ہے اور ہوا کے جھونکوں کے ساتھ یہ زنجیر جھولتی رہتی ہے۔ ہوا کا کوئی بیباک جھونکا اسے ندی کے دوسرے کنارے کے درخت تک پہنچا دیتا ہے۔ اس وقت سب سے نیچے والی چیونٹی ادھر کی شاخ کو پکڑ لیتی ہے جس سے ندی یا نالے پر ایک پل سا بن جاتا ہے اور اس پل پر سے سارا قافلہ دوسرے کنارے پر پہنچ جاتا ہے۔ پھر پہلے کنارے کے درخت کو چھوڑ دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ زنجیر دوسرے کنارے پر پہنچ جاتی ہے۔ اب زنجیر کو الگ کرنا کونسا مشکل کام ہے۔ اور اگر وہ کبھی سیلاب سے دو چار ہوں تو کئی چیونٹیاں مل کر گولا بن جاتی ہیں اور یہ گولے پانی کی سطح پر تیرتے پھرتے ہیں اور پانی اترنے کے ساتھ ہی یہ الگ ہو جاتی ہیں۔ چیونٹیوں سے متعلق اور بھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ لیکن ان تفصیلات کا نہ یہاں موقع ہے اور نہ گنجائش۔

★

غزل

روشن قریشی

ماضی کی یادیں بھرا دو ذہنوں کو ہلکا کر لو
کیسے کیسے خواب گھڑے ہیں مستقبل کو دیکھو تو

زندہ دل ہو تھک جاؤ تو گھبرانے کا نام نہ لو
تنہا چلنے سے کیا ہوگا سب کو لیکر ساتھ چلو

لفظوں کے انبار لگا کر حیرت سے نہ یوں دیکھو
معنی اور مطالب سے پھر راہوں کو ہموار کرو

گمنامی کی غار میں چھپ کر بیٹھ رہے تو بیٹھ رہے
آنے والی نسلیں پوجیں ایسا کوئی کام کرو

ہم سب شہر فن کے باسی لیکن ہم میں فرق بھی ہے
اپنے اپنے افسانے میں اپنا اپنا رنگ بھرو

محنت کا سورج گہنایا امیدوں کا دن ڈوبا
رات مگر کیسے بیتے گی میں سوچوں تم بھی سوچو

ہر اک موڑ پر اندھے سائے ہاتھ پسارے بیٹھے ہیں
ان راہوں کو روشن کرنا ہی تو دیپک بن کے چلو

غزل

نصیر پرواز

موسم غم تو ملا راس نہ آیا وہ بھی
منتشر جسم ہوا رہ گیا سایا وہ بھی
وحشتیں ذہن سے آندھی کی طرح ٹکرائیں
جس کو دیکھا ہی نہیں دل میں سمایا وہ بھی
زندگی اتنی اکیلی بھرے بازاروں میں
کون مانے گا ہمیں یاد نہ آیا وہ بھی
آئینہ چاٹ گیا جتنے بھی تیکھے تھے نقوش
ایک چہرہ ہی تھا اپنا تو نہ بھایا وہ بھی
صرف اک خواب بچا لایا تھا شہر غم سے
آنسوؤں نے مرے مٹی میں ملایا وہ بھی
سب ہی سمجھاتے تھے حالات بدل جاتے ہیں
وقت نے مجھ کو تماشہ نہ دکھایا وہ بھی
ہم نے تو صرف دہکتا ہوا سورج مانگا
سر پہ چمکا تو لگا دھوپ میں سایا وہ بھی
اس خرابے میں کوئی مجھ پہ ہنسا کرتا تھا
ایک جذبہ تھا زمانے نے مٹایا وہ بھی
خاک میں خود کو ملا دینے کی بات آئی تھی
کام آساں تھا مگر کر کے دکھایا وہ بھی
وہ کہ ہر شکل کو پڑھنے میں بہت ماہر تھا
میرا اک بھید مگر جان نہ پایا وہ بھی
غم نقطہ یہ تھا کہ پرواز بھلا دیں اس کو
اور جب یاد کیا یاد نہ آیا وہ بھی

غزل

توقیر قمر دت پوری

دیکھ کر زندگی کے تیور میں
چھپ کے بیٹھا ہوں گھر کے اندر میں

عکس میرا بھی میرے ساتھ نہیں
کتنا تنہا ہوں میں بھرے گھر میں

تیرگی گہری نیند سوئی ہے
اک شکن بھی نہیں ہے بستر میں

میں کہ شبنم کا ایک قطرہ تھا
کس لیے بن گیا ہوں پتھر میں

شام سورج کو قتل کر بیٹھی
خون سا گھل گیا ہے منظر میں

تم بہت باشعور ہو یارو
خود کو کیسے کہوں گا بہتر میں

اے قمر زندگی کی راہوں میں
خود ہی رہرو ہوں خود ہی رہبر میں

ڈرامہ

ناپ تول اور وزن

اظہر افسر

- مسٹر وزن
- گلاب
- بڑا لڑکا
- چھوٹا لڑکا
- ایک آدمی

پردہ اٹھتا ہے تو تین دوکانیں نظر آتی ہیں۔ گلاب گرین اسٹور، گلاب کلاتھ اسٹور، گلاب پیور آئیل اسٹور، تینوں دوکانوں کے آگے پردے پڑے ہیں گویا وہ بند ہیں۔

ذرا سی دیر اسٹیج خالی رہتا ہے پھر گلاب، ململ کا کرتہ پہنے نفیس دھوتی باندھے، مونچھوں پر تاؤ دیتا جماہیاں لیتا ہوا داخل ہوتا ہے۔ پھر آستین چڑھاتا ہوا ٹہلنے لگتا ہے۔ دو چکر مکمل ہونے نہیں پاتے کہ دہنی جانب سے مسٹر وزن شیروانی پاجامہ پہنے بال الجھائے گنگناتا ہوا داخل ہوتا ہے:

وزن صراحی جھومتی ہے وجد میں پیمانہ آتا ہے۔

گلاب بھائی صاحب!

وزن ٹھہریے ٹھہریے پہلے آداب نمستے تسلیمات تو ہو جائے پھر کوئی دوسری بات ہونی چاہیے۔

گلاب جی۔

وزن خیر ابتدا میں ہی کرتا ہوں۔ میں نے کہا نمستے آداب اور تسلیمات۔

گلاب جی جی نمستے آداب اور تسلیمات بھی۔ حضور شاعر سے واپس آرہے ہیں شاید۔

وزن جی ہاں شاعر و شاعرہ کر آرہا ہوں۔

گلاب السلام علیکم آپ شاعر بھی ہیں۔

وزن اور حضور کیا شغل فرماتے ہیں۔

گلاب شغل؟ ہم تو صرف شام میں ذرا سی بھنگ پیتے ہیں کسی سے کہیے مت۔

وزن توبہ توبہ توبہ۔

گلاب ہائے ہائے آپ کو اس رسیلی کی کیا خبر ہے۔

وزن شغل سے میرا مطلب تھا کہ آپ کیا دھندہ کرتے ہیں۔

گلاب وہ دیکھیے سامنے پان کی ایک چھوٹی سی دوکان ہے۔

وزن مگر آپ یہاں۔

گلاب دوکان پر بچہ بیٹھا ہے، ہم ذرا ابھی کر سیدھی کرنے کو باہر آگئے ہیں۔ کہیے تو پان پیش کروں۔

وزن پان ؟

گلاب جی پان۔

وزن آپ کو معلوم ہے پان کھانا دھوکا دینا ہے۔

گلاب پان کھانا دھوکا دینا ہے ؟

وزن اور کیا بالکل دھوکا۔

گلاب وہ کیسے ؟

وزن دیکھیے جب ہم پان کی گلوری منہ میں رکھتے ہیں تو ہمارا منہ
چلنے لگتا ہے صحیح ہے ؟

گلاب جی ہاں بالکل صحیح ہے۔

وزن اور جب ہمارا منہ چلنے لگتا ہے تو ہمارا معدہ اوپر کی طرف
دیکھتا ہے کہ اب کچھ آئے گا اب کچھ آئے گا مگر آتا وتا کچھ نہیں
پان کھانا پیٹ کو دھوکا دینا ہے یا نہیں۔

گلاب واہ واہ شاعر صاحب کیا بات پیدا کی ہے آپ نے
مگر خدا کے لیے یہ بات آپ سب کو بتاتے نہ پھریے ورنہ ہمارا
دھندا تو بالکل چوپٹ ہو جائے گا۔

وزن آپ گھبراتے کیوں ہیں ۔ کہیے تو پان کی تعریف میں کچھ شعر
لکھ دوں۔

گلاب ضرور ضرور، یہ بات ہوئی ہے نا کام کی، آپ کا نام ؟

وزن ماجد کو وزن کہتے ہیں، حضرت وزن۔

گلاب خوب خوب، ٹھہریے میں آپ کے لیے مونڈھا لاتا ہوں، آپ
اپنا سارا وزن اس پر رکھیے۔

وزن نہیں نہیں اس کی ضرورت نہیں۔

گلاب ارے واہ کیوں ضرورت نہیں صاحب (بائیں جانب
جاتا ہے اور آتا ہے) یہ لیجیے بیٹھیے اب فرمائیے۔ کچھ ایسے
شعر لکھیے کہ ہماری دوکان یوں چل جائے (چٹکی بجاتا ہے)

وزن اپنی دوکان پر آپ یہ شعر لکھ کر لگا دیجیے۔ دستِ نازک
بڑھایے صاحب۔

گلاب واہ واواہ۔

وزن پورا شعر تو سنیے۔

گلاب ہاں فرمایے۔

وزن دستِ نازک بڑھایے صاحب
پان حاضر ہے کھایے صاحب

گلاب واہ واواہ ۔ واہ۔

وزن آداب عرض ہے آداب عرض ہے۔ دوسرا شعر سنیے۔

گلاب جی۔

وزن سلونے ہونٹ آپ کے۔

گلاب جی!

وزن سلونے ہونٹ پھر سے آپ کے گلنار ہو جائیں۔

گلاب سلونے اونٹ پھر سے باپ کے خلنار ہو جائیں۔

وزن خدا کے لیے شعر کا خون مت کیجیے۔

گلاب فرمایے فرمایے۔

وزن سلونے ہونٹ پھر سے آپ کے گلنار ہو جائیں
ہم اپنے پیارے کو ہاتھوں سے چوبنا دیں پان

گلاب نہیں صاحب اس میں تو لڑائی ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

وزن اچھا تو یہ سنیے۔ وہ ان کا پان دینا ہمیں یاد ہے جناب
منہ پھیر کر اُدھر کو بڑھا کر اِدھر کو ہاتھ

گلاب آداب عرض ہے اداب عرض ہے۔

وزن سنیے سنیے۔

گلاب ۔ جی۔

وزن آداب مجھے کرنا چاہیے، آپ تعریف کیجیے صرف۔

گلاب اچھا پھر شعر پڑھیے۔

وزن اپنی مثال آپ ہے عالم میں ایک ہے۔

گلاب (دہراتا ہے) اپنی مثال آپ ہے عالم میں ایک ہے

وزن شہرہ کہاں کہاں نہ ہوا اپنے پان کا

گلاب آداب عرض ہے آداب عرض ہے

وزن پھر وہی، میں نے کہا نا آپ کو تعریف کرنی چاہیے صرف
آداب و تسلیمات تو ہمارا حق ہے

گلاب لیکن جناب پان تو ہمارا ہے۔

وزن پھر تو مجبوری ہے۔
گلاب آپ شعر پڑھیے۔
وزن اپنی مثال آپ ہے عالم میں ایک یہ
شہرہ کہاں کہاں نہ ہوا اپنے پان کا
گلاب آداب عرض ہے آداب عرض ہے تسلیمات لیکن، لیکن کچھ شک ہو رہا ہے۔
وزن شک کیسا شک؟
گلاب آپ نے اپنا نام وزن بتایا ہے، نام تو کافی وزنی ہے مگر کہیں آپ تول باٹ والے دفتر کے آدمی تو نہیں؟
وزن شعر سنو شعر
ہے تھالی میں کوئی لیے پھول پان
کھڑا ہے وہ رستے میں رستے کی جان
گلاب واہ واہ واہ۔ پان۔ جان کیا وزن ہے واہ۔ ہماری بڑی لڑکی کا سسر ہیں کام کرتا ہے۔
وزن کہاں؟
گلاب اسی ناپ تول وزن والے دفتر میں، ان لوگوں نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔
وزن کیوں کیوں خیریت، ناپ تول وزن والوں نے آپ کا ناک میں دم کس طرح کر دیا ہے۔ وہ لوگ تو بس اتنا کہتے ہیں کہ ساری چیزیں نئے باٹ سے خریدو کیونکہ سارے پرانے وزن بدل گئے ہیں۔
گلاب یہی تو مصیبت ہے۔
وزن اب یہ بات تو سبھی لوگ جان چکے ہیں کہ ساری چیزیں میٹرک نظام کے تحت خریدنی چاہییں، سیر پاؤ سیر آدھ سیر کے بجائے ہمیں دکاندار سے کہنا چاہیے کہ وہ کیلو، آدھا کیلو یا ڈھائی سو گرام میں دے۔
گلاب او ہو ہو آپ سمجھے نہیں۔
وزن اگر دودھ یا تیل یا کوئی اور ایسی ہی چیز لینی ہے تو لیٹر کے حساب سے لیجیے اسی طرح کپڑا بھی پرانے حساب گزوں یا فٹوں سے نہیں میٹر کے حساب سے لینا چاہیے اور خریدار کو پرانے باٹوں اور نئے میٹروں کو اچھی طرح دیکھ لینا چاہیے کوئی بھی دکاندار اگر اس سے ہٹ کر عمل کرے تو اس کی اطلاع افسران متعلقہ کو دے دینا چاہیے۔
گلاب او ہو ہو ذرا رکیے رکیے، پولس تک کیوں جا رہے ہیں آپ۔
وزن کوئی خواہ کھانے پینے کی یا ضرورت کی چیز ہو، آپ پرانے حساب کو چھوڑ کر بالکل نئے نظام کے مطابق خریدیے اور دوکاندار سے اصرار کیجیے کہ وہ نئے باٹوں سے ہر چیز دے۔
گلاب آپ اپنی ہی کہے جاتے ہیں میری تو سنتے ہی نہیں۔
وزن فرمائیے۔
گلاب ارے بھائی ہم خریدار نہیں دوکاندار ہیں۔
وزن دوکاندار ہیں۔
گلاب جی ہاں۔
وزن کیا آپ پان تول کر بیچتے ہیں۔
گلاب نہیں بابا اس چھوٹی سی پان کی دوکان سے ہم نے تین دکانیں اور کر لی ہیں۔
وزن تین دوکانیں؟
گلاب جی۔
وزن وہ کہاں ہیں۔
گلاب یہ جو آپ کے سامنے کھل رہی ہیں۔
بڑا لڑکا (داخل ہوتے ہوئے) نمستے پتاجی۔
گلاب جیتے رہو بیٹا، یہ گلاب گرین اسٹور ہے غلہ کی دوکان، پرانے باٹ سامنے رکھو نئے باٹ پیچھے رکھ کر اسے کسی تھیلے سے ڈھک دو، یہ میرا بڑا لڑکا ہے۔
چھوٹا لڑکا نمستے پتاجی۔
گلاب یہ میرا چھوٹا لڑکا ہے، گلاب کلاتھ اسٹور چلاتا ہے۔ بیٹا پرانے گز کو نمایاں کر دو اور نیا میٹر غور سے دیکھ کر ایک طرف چھپا دو۔
چھوٹا لڑکا جی پتاجی۔

ایک آدمی: نمستے بھائی صاحب۔

گلاب: یہ ہمارا سالا ہے تیل بیچتا ہے۔ گلاب پیور آئیل اسٹور۔

وزن: یہاں بالکل پیور آئیل ملتا ہے۔

گلاب: صاحب نام ہے دوکان کا۔

وزن: اچھا اچھا۔

گلاب: بھیا سالے صاحب لپ کے پرانے ناپ سامنے رکھو اور نئے ماپ الگ رکھو، کوئی سرکاری آدمی آئے تو فوراً یہ چیزیں سامنے لے آنا۔

وزن: اور پرانے ماپ؟

گلاب: کہہ دینا خریدار اصرار کرتا ہے پرانے ماپ لینے کے لیے

وزن: ہوں تو یہ گڑبڑ سڑبڑ ہے۔

گلاب: گڑبڑ سڑبڑ کا ہے کی بھائی صاحب، پرانے وزن اور باٹ خریداروں کے لیے ہیں نئے وزن اور ناپ تول سرکاری لوگوں کے لیے بس ان لوگوں نے بڑا تنگ کر رکھا ہے یہی تو کہہ رہا تھا۔

وزن: تنگ کیا کر رکھا ہوگا یہی کہتے ہوں گے کہ مول تول برابر رکھو اور نئے باٹوں سے ہر چیز دو۔

گلاب: یہی تو ساری مصیبت ہے، نئے باٹوں کو نکلے اتنے دن ہو گئے مگر لوگ اب تک غافل ہیں اور یہ سرکاری لوگ ہیں کہ ان لوگوں کو ہوشیار بنانے پر تلے ہوئے ہیں کہتے ہیں گاہک کو کیلوگرام اور کنٹل کے حساب سے تول کر دو، سیر آدھ سیر پاؤ سیر کے بجائے لیٹر کے حساب سے ناپ کر دو، اور پرانے گز کے بجائے میٹر کے حساب سے کپڑا پھاڑ کر دو۔

وزن: ذرا سا جھوٹی سی پان کی دوکان سے تین دوکانیں بنا لیں آپ نے۔

گلاب: ان سالا دوکانوں میں کوئی مگر یہ ناپ تول والے جینے ہی نہیں دیتے۔

وزن: جینے نہیں دیتے یا لوٹنے نہیں دیتے۔

گلاب: مجھے پھر شک ہو رہا ہے بھیا۔

وزن: شک کبھی نہیں کرنا چاہیے۔ شک بُری چیز ہے۔

گلاب: پھر ایسی ترکیب بتاؤ بھیا کہ یہ ناپ تول والے کسی دن چھاپہ نہ ماریں، اچانک چیکنگ نہ کریں، پبلک کو یہ نہ سکھائیں کہ وہ سیروں میں نہ بولیں، کیلوگرام اور کنٹل بولیں، گزوں میں نہ مانگیں، میٹر سے خریدنے کا سبق دیں۔

وزن: ایک ترکیب ہے۔

گلاب: ترکیب ہے؟

وزن: ہاں ہے، گورنمنٹ کے لوگ اور انسپکٹر آپ کی دوکانوں پر کبھی چھاپہ نہ ماریں گے۔

گلاب: اچھا وہ کیا ترکیب ہے۔

وزن: سارے گاہکوں کو صحیح ناپ تول اور وزن سے دیا کرو، اور نئے باٹ اور نئے میٹر رکھو۔

گلاب: واہ بھیا واہ۔ اس کے تم نے بھی وہ داؤ پیچ نکالے ہیں کہ گورنمنٹ بھی کیا یاد کرے گی

وزن: خیر گورنمنٹ تو بعد میں یاد کرے گی پہلے آپ پولس اسٹیشن چلیے۔

گلاب: پ پ پولس اسٹیشن؟

وزن: ہاں آپ بھی اور آپ کے یہ سالے بھی، اور آپ بھی چلیے سالے صاحب، میں دفتر اوزان و پیمانہ جات ویٹس اینڈ میژرز ڈپارٹمنٹ کا انسپکٹر ہوں۔

آدمی: ای ای۔ انسپکٹر!

گلاب: پ پ پولس۔ پولس۔

(پردہ گرتا ہے)

★

حضرت کاتب

ایم۔ اے۔ حنان

حضرت کاتب کے نام نامی سے سب پڑھے لکھے اور غیر پڑھے یکساں طور پر واقف ہیں کہ وہ غریب جو مضامین کے مضامین تحریر کرنے کے بعد بھی ادیب کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا، دیوان کے دیوان لکھنے پر بھی اسے کوئی صاحب دیوان تو کجا ادنیٰ شاعر بھی کہہ کر نہیں پکارتا اور جو کہانیوں اور افسانوں کو ایک افسانوی تعداد میں سپرد قلم کرنے کے بعد بھی ایک معمولی کہانی کار یا افسانہ نگار نہیں سمجھا جاتا، بلکہ نام ونمود سے دامن بچانے اور شہرت سے کتراتے والا شخص "کاتب" کہلاتا ہے۔ حالانکہ جو فن کتابت پر زبردست ملکہ رکھنے کے باوجود وہ اتنا مشہور نہیں جتنا کہ کتابت کی غلطیوں سے چار دانگ عالم میں شہرت حاصل کر چکا ہے اور زبان زد خاص و عام ہے۔

حضرت کاتب کی بے لوث خدمات سے تو زمانہ واقف ہے کہ جہاں یہ بیدردی کے ساتھ خزانۂ علم وحکمت کو قوم کی فلاح وبہبود میں لٹا دیتے ہیں، اہل جہاں کو کتنی دریا دلی سے ساتھ علم کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے بیکراں سمندر کی گہرائیوں میں لیے جاتے ہیں اور قوموں کو علم ودانش کے ابلتے ہوئے چشموں سے فیضیاب کر کے بلند منزلت اور سرخروئی عطا فرماتے ہیں وہاں قارئین کرام کی توجہ اور دلچسپی کی خاطر خاص سے خراب خط اور بدصورت تحریر کو خوبصورت پیکر میں ڈھال دیتے ہیں اور اسے حسن و نزاکت کے پیرہن سے آراستہ فرما کر ہمارے اور آپ کے مطالعے کے لیے نظر نواز بنا دیتے ہیں۔ ورنہ آپ ان شاعروں اور ادیبوں کی تحریروں سے تو خوب واقف ہیں جو "رسوائے زمانہ" ڈاکٹروں کی طرز تحریر سے بھی سبقت لے جانے لگی ہیں۔ چنانچہ ایسے آڑے وقت میں اگر کاتب صاحب مصنف اور قاری کے درمیان ثالث کا کردار ادا کرنے سے انکار کر دیں اور قارئین کرام کو ان شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات ان کے اصل خط میں پڑھنا پڑے تو مارے خوف کے شاید وہ اس مطالعے کے مبارک شوق کو خیرباد کہہ دیں اور آنے والی نسلیں علم وادب سے (مع کتابت کی غلطیوں کے) محروم ہو جائیں۔

غرض کہ ساری برادری بلکہ خاص کر ادب برادری پر حضرت کاتب کے بے شمار احسانات ہیں اور قاری اُن کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہے کہ جن کی دیدہ زیب کتابت جہاں دعوت قلب ونظر کا باعث ہوتی ہے وہیں کتابت کی غلطیاں تک انتہائی روح پرور اور باعث لطف وقرار ہوتی ہیں۔ بعض اوقات تو یہ غلطیاں اتنی دلگداز، "ہنس مکھ" اور قہقہہ بدوش ہوتی ہیں کہ محفلیں زعفران زار ہو جاتی ہیں، نہ صرف محفلیں بلکہ ماتمی محفلیں بھی۔ ماتمی محفلوں کا لفظ ہم یوں ہی استعمال نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ ہمارا تجربہ ہے کہ کس طرح ہمارے ایک عزیز دوست کے سانحۂ ارتحال کے زبردست صدمہ کا کاتب صاحب نے ذرا بھی احساس ہونے نہیں دیا بلکہ الٹے ہمارے غم میں لوگ سوگوار ہو گئے۔ واقعہ یہ تھا کہ ہم نے اپنے ایک دوست کے اس جہانِ فانی سے کوچ کر جانے کی خبر ایک

مقامی روزنامہ کو دی تھی۔ تحریر کچھ یوں تھی کہ "جناب رحمت حسین صاحب اطلاع دیتے ہیں کہ جناب احمد حسین صاحب کا سہ پہر بروز منگل اچانک انتقال ہو گیا۔"

لیکن دوسرے روز کاتب صاحب کی ذرہ نوازی سے تن بے روح میں جان پڑ گئی تھی اور ہم زندہ درگور ہو گئے تھے، کاتب صاحب کی بموجب ہم نے اپنی بے نور آنکھوں سے یہ چھپا دیکھا: "جناب احمد حسین صاحب (یعنی مرحوم) اطلاع دیتے ہیں کہ جناب رحمت حسین صاحب (یعنی خاکسار) کا اچانک انتقال ہو گیا۔"

زندگی میں ہی اپنی موت کے زبردست صدمہ کو ہم برداشت بھی نہیں کر پائے تھے کہ ادھر ہمارے "انتقال" کی روح فرسا خبر پا کر دوست احباب اور رشتہ دار جوق در جوق ہمارے دولت کدہ کو ماتم کدہ میں بدلنے کے لیے تشریف لانے لگے۔ تعزیتی پیامات اور خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ تعزیتی پیاموں اور خطوط کو تو ہم نے بہ کمال ہوشیاری اصل مرحوم کے گھر کو "ری ڈائریکٹ" (RE DIRECT) کر دیا لیکن ان نوحہ خوانوں اور ماتم گساروں کو دلاسہ دیتے دیتے حقیقت میں ہمارا جنازہ نکل گیا جو ہماری بے وقت موت پر سخت بے حال تھے۔ دوسرے دن ہم نے اس خبر کی تردید بھی کر دی لیکن صاحب جس کی زندگی میں اس پر فاتحہ درود ہو چکا ہو ایسے جینے سے کیا فائدہ؟

یہ تو خیر ایک افسوس کی بات تھی لیکن ایک انتہائی پرمسرت موقع پر کاتب صاحب کی عنایت سے سارے شہر والوں میں غلط فہمی پیدا ہو گئی اور باپ اور بیٹے کے بیچ نفرت اور بغض کی ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی۔ اس مرتبہ بھی بدقسمتی سے مجرم ہم تھے اور تحریر کرنے والے وہی کاتب صاحب۔ خبر ہمارے خسر کے نورِ چشم سلمہ کی شادی خانہ آبادی کی تھی۔ جس کو وہ بذریعہ اخبار سب شناساؤں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ حالانکہ ہم نے کافی محنت اور احتیاط سے اس شادی کی خبر والا مسودہ تیار کیا جو یوں تھا: "۶ دسمبر جمعرات جناب رفیق محی الدین (بی ایس سی) فرزند جناب شفیق محی الدین (ریٹائرڈ میر منشی) کی شادی مس شمیم سلطانہ (ایم ایس سی) کے ساتھ مسرت باغ میں بخیر و خوبی انجام پائی جس میں کنڈکٹروں، انجینئروں، دوست احباب، رشتہ داروں اور معززین کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔" لیکن دوسرے دن نوشہ نے یہ خبر پڑھی۔

"۶ دسمبر جمعرات۔ جناب شفیق محی الدین (ریٹائرڈ میر منشی) کی شادی "مس شمیم سلطانہ" (ایم۔ ایس۔ سی) کے ساتھ مسرت باغ میں انجام پائی۔ جس میں کنڈکٹروں، انجینئروں، دوست احباب، رشتہ داروں اور محررین کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔"

کاتب صاحب کی یہ موشگافیاں صرف شریک غم اور رونقِ شادی ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ چنانچہ حال ہی کی بات ہے کہ کاتب صاحب کی ذرا سی فروگذاشت سے شہر کی ساری خواتین و حضرات میں خوف و دہشت کی ایک لہر دوڑ گئی اور ایک ذی مرتبہ بارزگار بے روزگار ہوتے ہوتے بچا۔ واقعہ یہ تھا کہ کسی زمانے کے ستائے ہوئے پریشان حال نے مقامی روزنامہ کے ایڈیٹر کو ناظم تعلیمات کے تعلق سے ایک مراسلہ بھیجا اور شکایت کی کہ انھوں نے عرصہ سے بہت سے معاملات کو دبا رکھا ہے۔ لیکن کاتب صاحب نے اپنے زورِ قلم سے یہ لکھ کر اس مراسلہ کو دو آتشہ کر دیا کہ "ناظم صاحب نے عرصہ سے بہت سی "معلمات" کو دبا رکھا ہے۔" اس مراسلہ کو پڑھ کر نہ جانے بے چارے شریف النفس ناظم صاحب پر کیا گزری لیکن مراسلہ نگار کی مراد بر آئی اور فوری عمل درآمد ہوا۔

بالکل اسی طرح ایک متمول موٹر نشین لیڈر صاحب کو کتابت کی غلطی کا بھاری خمیازہ بھگتنا پڑا۔ جو ان کی محبوب لیکن ذرا مشتعل عوام کے بیچ بیہوشی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس دل شکن واقعہ سے ایک دن قبل موصوف نے شہر کے ایک زبردست جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ جب تک ملک سے غریبی کو نہیں ہٹایا جائے گا اس وقت تک ملک میں خوشحالی نہیں آ سکتی۔ لیکن لیڈر صاحب کے دل کا چور کاتب

صاحب کے قلم سے نکل گیا اور یہ چھپ گیا کہ جب تک ملک سے "غریبوں" کو نہیں ہٹایا جائے گا۔ اس وقت تک ملک میں خوشحالی نہیں آسکتی۔ اسی طرح ایک نامزد صدر کی خبر کا تذکرہ کرتے ہوئے صرف ایک نقطہ غائب کر کے نہ صرف بے چارے نامزد صدر کو نامرد صدر لکھ دیا بلکہ ساری مردانہ خصوصیات غائب کر دیں۔

کاتب صاحب کی ان نوازشوں اور عنایات نے ایک مرتبہ ہمارے ظرف کو بھی سخت دھکا پہنچایا اور ہمارا کرایہ کا گھر نیلام ہوتے ہوتے بچا۔ بات دراصل یہ تھی کہ ہمارے بازو والا مکان نیلام کیا جانا تھا اور مسلسل پندرہ دن سے اخبارات میں اسکی تشہیر کی جا رہی تھی۔ اور مسلسل پندرہ روز سے ہمارے مکان کا نمبر تحریر کیا جا رہا تھا (کتابت کی غلطی سے) اور ہم اس سے قطعی بےخبر تھے۔ ہمیں تو اس کا علم اس وقت ہوا جب نیلام کے قد آدم پوسٹروں سے دیوار و در رنگین ہو گئے۔ اور اس کی تعریفوں کے پل باندھے جانے لگے۔ اگلے دن نیلام ہوا چاہتا تھا۔ لیکن ہم پوری طرح مطمئن تھے اور ہمیں اس بات کا پورا یقین تھا کہ گھر تو وہی نیلام ہوگا جس کو دراصل نیلام ہونا ہے۔ لیکن اسی اثناء میں کسی ستم ظریف نے مالک مکان کو خبر کر دی کہ "کرایہ دار صاحب آپ کے مکان کو نیلام کر رہے ہیں"۔ اب کیا تھا اس اندوہناک واقعہ کی خبر پاکر مالک مکان صاحب تین چار وکیلوں اور ایک دستہ مسلح پولیس کے ہمراہ وارد ہو گئے۔ پولیس کیس بنتے دیکھ کر ہمارے بازو والے صاحب کچھ دیر کے لئے انجان ہو گئے اور صاحب ہماری وہ پرسش ہوئی کہ الامان والحفیظ، قانون کی کتابوں میں موجود و غیر موجود تمام طریقوں سے ہم سے جرح کی گئی۔ بڑی مشکل سے ہم نے بڑی بڑی قسمیں کھا کر انھیں کتابت کی غلطی کا یقین دلایا۔ لیکن ہمارے مالک مکان صاحب کو آج بھی ہماری نیت پر شبہ ہے۔ اس لیے انھوں نے ہم ۲۴ گھنٹوں کے اندر مکان چھوڑ دینے کا الٹی میٹم دیدیا ہے۔

لیکن جہاں یہ کتابت کی غلطیاں سوہانِ روح اور عذاب جان واقع ہوتی ہیں کبھی کبھی نوید مسرت بھی بن کے آتی ہیں۔ چنانچہ ہمیں اس واقعہ کی رہ رہ کر یاد آتی ہے۔ جب ہم میٹرک میں زیر تعلیم تھے۔ اور کاتب صاحب کی کرم فرمائی سے ایک عدد موٹر سیکل حاصل ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ مٹھائی بھی سیر ہو کر کھانے کو ملی تھی اور ہماری کثرت سے گل پوشی کی گئی تھی۔ حالانکہ یہ تمام چیزیں اس واقعہ کے پورے چار سال بعد ہونی چاہیے تھیں۔ کیونکہ کتابت کی غلطی سے چار سال قبل ہمارا نمبر شہر کے سارے اخبارات میں شائع ہو گیا تھا (وہ بھی فرسٹ کلاس میں)

کاتبوں سے فیضیاب ہونے والی شخصیات میں ایک ہم ہی خوش نصیب نہیں بلکہ اللہ کے بیشمار بندے ان سے حسب ضرورت کسب فیض حاصل کر رہے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مستفید ہونے والی شخصیت ادیبوں اور شاعروں کی نئی پود ہے جو انھیں دفاعی اغراض کے لیے انتہائی کامیابی کے ساتھ استعمال کر رہی ہے۔ چنانچہ جب کبھی کسی نوعمر و نوخیز شاعر سے کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے اور جب کسی گوشہ سے اس کی سخت مذمت کی جاتی ہے تب وہ بڑی صفائی کے ساتھ اس فاش غلطی کو کاتب کے سر باندھ دیتے ہیں اور اپنی ساکھ کو پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط کر لیتے ہیں۔ دوسری طرف کہنہ مشق شعرا اور بزرگ ادیب اس بات کے شاکی ہیں کہ ان کاتبین کی وجہ سے ان کی عظیم اور معرکۃ الآرا تخلیقات تنقید کی زد سے نہیں بچ سکتیں اور ہدف ملامت بنتی ہیں۔ ناقدین کا پہلا ریمارک ہوتا ہے کہ کتابت ٹھیک نہیں، کتابت ناقص ہے، کتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں وغیرہ وغیرہ۔

کاتب صاحب کی مندرجہ بالا غلطیوں کی طرح ان کے عادات و اطوار اور مزاج عالی بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ ان کی عجیب و غریب عادات اور حیرت انگیز خصوصیات پڑھنے اور لطف اٹھانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ ایک ایسے کاتب صاحب دنیائے ادب میں عرصہ سے آباد ہیں جو حزن پسند مشہور ہیں۔ جب کبھی موصوف کے پاس کوئی مضمون یا کہانی کتابت کے لیے لائی جاتی ہے، وہ انجام کو پہنچتے پہنچتے ایک المیہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے چاہے

تخلیق کتنی ہی مزاحیہ کیوں نہ ہو اس کا اختتام اس قدر دردناک ہوتا ہے کہ مصنف اور قاری دونوں ہی آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔

ایک ایسے کاتب صاحب سے بھی ہماری جان پہچان ہے جو اپنی خوشخط کتابت کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ باوجود اخلاق و آداب مروت و انکساری جیسی صفات اعلیٰ کی غیر موجودگی کے ان کی کافی مانگ ہے۔ چنانچہ ہر شاعر و ادیب ان کے دست مبارک سے کتابت کروانے کی فکر میں ان کے در دولت پر جوتیاں چٹخاتا نظر آتا ہے۔ خصوصاً ایسے شاعر و ادیب جن کی شعر و شاعری اور مضامین میں زیادہ جان نہیں ہوتی۔ ان کی شاندار کتابت کے ذریعہ قارئین کرام کا دل جیت لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مصنفوں، پبلشروں، اور ایڈیٹر حضرات کا اتنا اژدہام رہتا ہے اور کتابوں اور رسالوں کی اشاعت میں اتنی تاخیر ہو جاتی ہے کہ بیشتر مصنفین دنیا سے گزر جاتے ہیں اور رسائل کے سالانہ خریدار "چندہ" لوٹا دینے کا شدت سے مطالبہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اور ان استادِ سخن سے بھی ہم خوب واقف ہیں جو کتابت پر اصلاح کو ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ جب کبھی ان کے یہاں تخلیقات بغرض کتابت لائی جاتی ہیں۔ تو وہ کتابت سے پہلے اصلاح دینے شروع ہو جاتے ہیں۔ اصلاح بھی اس شان کی کہ مصرعے کے مصرعے اڑا دیتے ہیں اور شعر کے شعر بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ بسا اوقات تو بحریں بھی بدل جاتی ہیں۔ جس میں ان کی تخیل کی اڑان یا واردات قلبی کا ذرا بھی دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ یادداشت اور قوت حافظہ کی زبردست صلاحیت کے بل بوتے پر ان نظموں اور غزلوں کے اشعار جو اس سے قبل کتابت کے لیے لائے جاتے ہیں بلا تکلف ہماری غزلوں اور نظموں میں شامل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاتھوں ہماری ہر نظم اور غزل نزاعی بن جاتی ہے۔ اور ہم سرقہ اور توارد کے الزام میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ اُن شاعروں سے الگ جھگڑا چلتا رہتا ہے جن کے اشعار کاتب صاحب کی عنایت سے ہمارے کلام کی رونق بڑھاتے رہتے ہیں۔ اگر وہ صرف اس پر ہی اکتفا کرتے تو بہتر ہوتا۔ لیکن یہ تو ایڈیٹر اور مصنف کے بیچ دخل درمعقولات کے بھی مرتکب ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں جب کبھی اس واقعہ کی یاد آجاتی ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ کہ کس طرح ایڈیٹر صاحب نے ہمارے مضمون کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے بغرض کتابت روانہ کیا تھا اور اس خوشخبری کی ہم کو اطلاع بھی دی تھی ــ لیکن افسوس صد افسوس کہ کاتب صاحب نے اسے روک لیا تھا اور ناقابل اشاعت قرار دیا تھا۔!

بحیثیت مجموعی کاتب صاحب کے بیسیوں احسانات اور بیش بہا خدمات کے پیش نظر ان کی گئی چنی غلطیاں قابل درگزر ہیں اور ہم بھی ان سے قطعی خائف نہیں ــ لیکن وہ شخص انھیں کیسے معاف کر سکتا ہے جس کی زندگی میں پہلی بار بعد از کوشش بسیار پہلی غزل شائع ہوئی ہو۔ لیکن اس کے نام کے آگے "مرحوم" چھپ گیا ہو۔ اور اس شخص کے رنج و غم کا اندازہ کیسے کر سکتے ہیں جس کی غزل مطلع سے مقطع تک جوں کی توں درج ہو۔ لیکن نام سرے سے غائب پایا گیا ہو لیکن پھر بھی ہم کو ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انھوں نے صرف نام غائب کر دیا یا مقام تبدیل کر دیا لیکن جنس تبدیل نہیں کی۔ اگر وہ ہماری جنس بھی تبدیل کر دیتے تو ہم ان کا کیا بگاڑ لیتے!

★

غزلیں

انور سلونوی

ہر شئے جہاں کی مجھ کو حسین و جواں لگے
تیری نظر نہ اس پہ کہیں آسماں لگے

مُہر سکوت ہے یہاں تنظیم زندگی
کیوں کر کہیں کہ کوئی ہمیں ہم زباں لگے

یہ بھی تو ایک حسنِ عقیدت کی بات ہے
ان کی ہر ایک بات ہمیں داستاں لگے

طغیانیوں کا جوش ہے موجوں کا زور و شور
کشتی ہماری دیکھئے بہہ کر کہاں لگے

دورِ حیات یوں بھی بدلتا ہے ہم نشیں
میں جس کو دیکھتا ہوں وہی بدگماں لگے

نیرنگئ حیات کی اللہ رے روشنی
دل کا ہر ایک داغ ہمیں کہکشاں لگے

انورؔ اب ایسے دور میں جینا محال ہے
بدلا ہوا سا جب کہ نظامِ جہاں لگے

بسنت کمار بسنت

بارِ غم ہم سے کسی طرح ہٹایا نہ گیا
ہم سے احسان مسرت کا اٹھایا نہ گیا

تا حیات ایک کشاکش کا تھا عالم دل پر
ساز چھیڑا نہ گیا، سوز مٹایا نہ گیا

لوگ آتے رہے دامن میں بہاریں لے کر
لیکن اس دہر کو گلزار بنایا نہ گیا

فطرتِ شر نے کیا خیر کو ٹکڑے ٹکڑے
اور یہ جبر کسی سے بھی مٹایا نہ گیا

جستجو کوہ و بیابان میں کیا کیا بھٹکی
آفرینش کا سراغ اس سے لگایا نہ گیا

دستِ افکار میں کھویا رہا تنہا تنہا
دل کو کردار کا دیوانہ بنایا نہ گیا

اے جنوں، تو نے کیا رازِ ازل کو عریاں
عقل سے تیر نشانے پہ لگایا نہ گیا

کتنی چاہت سے بنایا تھا نشیمن ہادی
برقِ تقدیر جو لپکی تو بچایا نہ گیا

منوہر لال ہادی

الجھے گیسو، آنکھیں پرنم
ہو تو ہمیں ہو آپ کو کیا غم

عارض پر یوں اشک رُکے ہیں
پنکھڑیوں پر جیسے شبنم

وہ اپنے تو دنیا اپنی
وہ برہم تو دنیا برہم

بادل میں مہتاب ہو جیسے
پردے میں وہ حسن کا عالم

بیٹھے بٹھائے کیا یاد آیا
ہو گئیں خود ہی آنکھیں پرنم

آپ نے جب سے اپنایا ہے
سب سے الگ ہیں سب سے جدا ہم

ختم بسنتؔ ہے اب کے افسانہ
کاٹے نہیں کٹتی ہے شبِ غم

اتر پردیش شاہ راہ ترقی پر

اتر پردیش کا ۵۳۰ کروڑ روپے کے پانچویں منصوبے کا مسودہ منظوری کے لیے مرکزی منصوبہ بندی کمیشن کے سامنے پیش ●●● سرکاری ایجنسیوں کو گیہوں فروخت کرنے والے کسانوں کو کنٹرول قیمت پر کپڑا ●● پولیس فورس کے لیے ۳۰ کروڑ روپے کی لاگت سے تعمیر مکان کا زبردست منصوبہ ●●● ادائیگی کلینک میں اسپتال کے اوقات کے بعد کام شروع ہوا کرے گا ●● سرکاری ملازمتوں کے واسطے جسمانی طور پر معذور افراد کی جانچ کی سہولتیں ●●● جسمانی طور پر معذور افراد کے لیے کانپور میں پیشہ ورانہ بحالی مرکز کا قیام ●●● سوت کی تقسیم سے متعلق امور کے لیے ایک خصوصی افسر کی تقرری ●●● یکم اکتوبر ۱۹۶۴ء سے قبل سبکدوش ہونے والے ٹیچروں کو پنشن ●●● تنخواہ کمیشن کی رپورٹ فروخت کے لیے دستیاب

اتر پردیش کے پانچویں پنج سالہ منصوبہ کا مسودہ ریاستی منصوبہ بندی کمیشن اور معاشی مشاورتی کونسل کی منظوری کے بعد ریاستی حکومت کی جانب سے مرکزی منصوبہ بندی کمیشن کو رسمی طور پر پیش کر دیا گیا۔

منصوبہ کے مسودہ میں ۵۳۰ کروڑ روپے کے مصارف کی تجویز ہے جس میں سرکاری زمرے میں ۲۵۳۰ کروڑ روپے۔ مرکزی زمرے میں ۱۵۰۰ کروڑ روپے۔ نجی زمرے میں ۱۵۰۰ کروڑ روپے اور ادارہ جاتی سرمایہ کاری کے ذریعے ۱۰۰۰ کروڑ روپے صرف کیے جائیں گے۔

ملک میں اتر پردیش ہی وہ پہلی ریاست ہے جس نے اس وقت تک مرکزی منصوبہ بندی کمیشن کو اپنے منصوبہ کا مسودہ پیش کیا ہے۔

× × ×

گیہوں خریدنے والی سرکاری ایجنسیوں کو ۲۵ کوئنٹل تک گیہوں فروخت کرنے والے کسان اپنے عام کوٹہ کے علاوہ کنٹرول قیمت پر مزید ۱۰ میٹر کپڑا خرید سکتے ہیں۔ اسی طرح ۲۵ کوئنٹل سے زیادہ گیہوں فروخت کرنے والے کسان اپنے عام کوٹے کے علاوہ ۲۰ میٹر کپڑا خرید سکیں گے۔ اس مقصد کے لیے کسانوں کو کوئی پرمٹ حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ انھیں صرف فروخت شدہ گیہوں کی رسید پیش کرنا ہوگی اور بیوپاری رسید کے پیچھے کپڑے کی لمبائی اور تاریخ کا اندراج کرنے کے بعد انھیں کنٹرول قیمت پر کپڑا فروخت کر دے گا۔

تاہم کنٹرول قیمت پر کپڑا خریدنے کی یہ سہولت کسانوں کو اسی مہینے حاصل رہے گی جس مہینے میں وہ اپنا گیہوں سرکاری خریداری ایجنسیوں کو فروخت کریں گے۔ ریاستی حکومت نے تمام ضلع مجسٹریٹوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ مذکورہ احکامات پر سختی سے عمل درآمد کریں اور یہ دیکھیں کہ کسانوں کو کنٹرول قیمت پر کپڑا بغیر کسی دشواری کے حاصل ہو رہا ہے۔

× × ×

اتر پردیش میں گذشتہ دس سال کی مدت میں ماتحت پولیس عملہ کے لیے جس میں کانسٹیبل اور ہیڈ کانسٹیبل شامل ہیں، ۲۶۰۰۰ سے زیادہ کوارٹر اور بیرکیں تعمیر کی گئی ہیں۔ ریاستی حکومت پولیس کے ملازمین کے لیے مکانات کی تعمیر سے متعلق ایک اسکیم پر گذشتہ مارچ تک ۱۳ء۸۷ کروڑ روپے سے زیادہ کی رقم خرچ کر چکی ہے۔ اس رقم میں مرکزی حکومت سے قرضہ کی شکل میں موصول شدہ ۴ء۱۶ کروڑ روپیہ کی رقم بھی شامل ہے۔

ریاست میں ان کوارٹروں اور بیرکوں کی تعمیر کے نتیجہ

میں ۷۰ فی صد سے زیادہ کانسٹبلوں اور ۶۰ فی صد سے زیادہ ہیڈ کانسٹبلوں کے لیے رہائش کی سہولتیں حاصل ہوگئی ہیں۔

اترپردیش پولیس کمیشن ۱۹۶۰ء کی سفارش کی بنیاد پر پولیس فورس کے ارکان کی کل تعداد میں سے ۳۸۷۰۰ ماتحت ملازمین رہائش کی سہولت کی فراہمی کے حق دار ہیں۔ ریاست میں پولیس کے عملہ کے لیے ۱۲۰۰۰ سے زیادہ کوارٹروں اور بیرکوں کی کمی ۳۰ کروڑ روپے کی لاگت کے تعمیر مکانات پروگرام کے تحت دور کرنے کی تجویز ہے۔

پولیس کے ۴۷۰۰۰ سے زیادہ ملازمین میں سے جن میں بیشتر کانسٹبل اور ہیڈ کانسٹبل ہیں، تقریباً ۴۴۳۰۰ کو رہائش کی سہولتیں فراہم کردی گئی ہیں۔ بقیہ ملازمین میں سے ۱۸۰۸ کو کرایہ کی عمارتوں میں بیرکیں فراہم کردی گئی ہیں اور عنقریب ۱۲۷۱ ملازمین کے لیے بیرکوں میں رہائش کی سہولتیں فراہم کردی جائیں گی۔ بقیہ ۹۵۳۲ افراد کو یا تو خیموں میں رکھا گیا ہے یا دیگر محکموں میں ڈیوٹی پر مامور کردیا گیا ہے۔ ریاست میں کل ۹۶۳ تھانوں میں سے ۶۹۶ میں رہائشی سہولتیں مکمل طور پر فراہم کی گئی ہیں۔ ریاست میں سالِ رواں کے دوران ۱۲۵ پولیس تھانوں میں رہائشی عمارتوں کی تعمیر کا کام تیز تر کیا جا رہا ہے۔

ریاست میں پی۔ اے۔ سی کی ۲۶ بٹالینوں میں سے ۱۳ میں ماتحت پی۔ اے۔ سی عملہ کو صد فی صد رہائش کی سہولتیں دستیاب ہیں۔ اترپردیش میں ۳۷۰ انسپکٹروں، ۸۱ سب انسپکٹروں، ۱۹۴ ہیڈ کانسٹبلوں اور ۳۴۳۰ کانسٹبلوں اور ۶۲۷ فالوروں کو رہائشی سہولتیں فراہم کرنے کے لئے تعمیراتی کام جاری ہے اور آئندہ چند ماہ کے اندر اس کی تکمیل متوقع ہے۔

× × ×

ریاستی حکومت نے ضلع اسپتالوں اور ریاستی میڈیکل کالجوں سے ملحق اسپتالوں کے علاوہ دیگر ۱۶ بڑے اسپتالوں میں بھی ادائیگی کلینکوں کے قیام کے احکام جاری کردیے ہیں۔ ان تمام اسپتالوں میں ادائیگی کلینکوں کے علاوہ مریضوں کو اسپتال کے اوقات میں خصوصی طبی مشورہ کی سہولت بھی ایک گھنٹہ کے لیے حاصل ہوگی۔ بہرحال ان خصوصی انتظامات کا اسپتالوں میں چوبیس گھنٹے دستیاب ہنگامی خدمات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

یہ بڑے اسپتال غازی آباد اور ہاپڑ (میرٹھ) ہردوار، سہارنپور ہاتھرس (علی گڑھ) چندوسی (مرادآباد) خورجہ (بلند شہر) فیروز آباد (آگرہ) رام نگر۔ وارانسی۔ بھوالی۔ ہلدوانی اور کاشی پور (نینی تال)، رشی کیش، مسوری اور چکراتا (دہرہ دون) اجودھیا (فیض آباد) اور بلرام پور (گونڈہ) میں واقع ہیں۔ یہ کلینک اسپتال کے اوقات کے بعد کام کریں گے۔ ادائیگی کلینک سے حاصل ہونے والی آمدنی میں حکومت۔ مریض کو دیکھنے والے ڈاکٹر اور پیرامیڈیکل اسٹاف کا حصہ ہوگا جس کا تناسب بالترتیب ۵۰۔ ۴۰ اور ۱۰ ہوگا۔ خصوصی صلاح و مشورہ کے مقررہ اوقات کے دوران جو فیس وصول کی جائے گی وہ پوری کی پوری سرکاری کھاتہ میں جمع کردی جائے گی۔ ادائیگی کلینک کی خدمات اور خصوصی طبی صلاح و مشورہ کی خدمات کے سلسلے میں مریض کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اپنی پسند کے ڈاکٹر کو دکھا سکے گا اور اس کے لیے حکومت کی مقرر کردہ فیس اس سے وصول کی جائے گی۔

مریض سے مقررہ شرح کے مطابق جو فیس وصول کی جائے اس کی لازمی طور پر رسید مقررہ فارم پر دی جانا چاہیے۔ کسی بھی اسپتال میں "ادائیگی کلینک" کی مناسب کارکردگی کی پوری ذمہ داری سول سرجن یا متعلقہ سپرنٹنڈنٹ پر ہوگی صرف ایسے "ڈاکٹر" "ادائیگی کلینک" پر کام کرنے کے حق دار ہوں گے جو اس مقصد کے لیے مقررہ مدت کے اندر اپنے حق اختیار کو استعمال کریں گے۔

× × ×

جسمانی طور پر معذور افراد کو اپنی جسمانی جانچ کرانا ہوگی تاکہ وہ ریاستی حکومت کے تحت ملازمتوں کے لیے درخواست

دینے کے اہل ہو سکیں۔ انھیں اس مقصد کے لیے کانپور میں جسمانی طور پر معذور افراد کے لیے مخصوص خصوصی روزگار دفتر سے وابستہ میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔ اگر ایسے امیدوار کو متعلقہ اسامی کے لیے موزوں قرار دے دیا جائے گا۔ اسے اپنی درخواست کے ساتھ بورڈ کا موزونیت سرٹیفکیٹ بھی پیش کرنا ہوگا۔ اگر جسمانی موزونیت کے بعد بھرتی کے لیے ہونے والے امتحان میں اسے کامیاب قرار دے دیا جاتا ہے تو اس کی پہلی تقرری سے قبل دوبارہ طبی جانچ ضروری نہیں ہوگی۔

عام طور پر ریاستی حکومت کے تحت تمام ملازمتوں میں کامیاب امیدواروں کو ان کی تقرری سے قبل یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ کسی میڈیکل بورڈ یا سول سرجن سے اپنی جسمانی جانچ کرائیں۔ لیکن جسمانی طور پر معذور افراد کے معاملہ میں اس طریقہ کار پر عمل کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ کسی مخصوص روزگار کے لیے پہلے سے ہی ان کی جسمانی موزونیت کا پتہ لگانا ضروری ہے۔ یاد ہوگا کہ ریاستی حکومت نے اپنے تحت تمام ملازمتوں میں جسمانی طور پر معذور افراد کے لیے دو فی صد نشستیں محفوظ کی ہیں۔

× × ×

مرکزی وزارت محنت و روزگار و بحالی نے سنٹرل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ فار انسٹرکٹرس۔ اُدیوگ نگر کانپور کے احاطہ میں جسمانی طور پر معذور افراد کے لیے ایک پیشہ ورانہ بحالی مرکز قائم کیا ہے۔ اتر پردیش ملک میں چھٹی ریاست ہے جہاں اس قسم کا ایک مرکز قائم کیا گیا ہے۔ جن دیگر ریاستوں میں اس قسم کا ایک ایک مرکز قائم کیا گیا ہے وہ آندھرا پردیش۔ مہاراشٹر۔ مدھیہ پردیش۔ دہلی اور پنجاب ہیں۔

اس مرکز کا خاص مقصد ہڈی کے نقائص میں مبتلا معذور افراد نیز اندھوں۔ بہروں اور گونگوں کو ان کی پیشہ ورانہ بحالی میں مدد دینا ہے۔ اس مقصد میں مذکورہ بالا زمروں کے معذور افراد کے جو معاملات بھیجے جاتے ہیں ان میں سے ہر شخص کی طبی سماجی نفسیاتی اور پیشہ ورانہ ضروریات کا جدید ترین سائنسی طریقوں اور ترکیبوں کی مدد سے جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس مرکز میں داخلہ کے خواہش مند فرد کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی عمر قابل ملازمت ہو اور اس کی جسمانی بحالی مکمل ہو چکی ہو۔ وہ اس مرکز میں ایک ماہ تک قیام کر سکتا ہے جس کے دوران اسے وظیفہ کے طور پر ۴۵ روپیہ دیا جائے گا۔ وہ مفت رہائش کی سہولتوں سے بھی مستفید ہو سکتا ہے۔

× × ×

بورڈ آف ریونیو۔ الہ آباد کے جوڈیشل ممبر شری ایم۔ ایس۔ حق کی تقرری چیف سکریٹری برانچ میں سوت کی تقسیم اور اس سے متعلق دشواریوں کو دور کرنے کے لیے بحیثیت آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی کی گئی ہے۔ شری حق کمشنر کے مرتبہ کے افسر ہوں گے اور ان کا دفتر لکھنؤ میں ہوگا۔

ریاستی حکومت نے ایسے تمام بقید حیات ٹیچروں اور دیگر ملازمین کا اکسگریشیا پنشن دینے کا فیصلہ کیا ہے جو یکم اکتوبر ۱۹۶۴ء سے قبل لوکل باڈیز یا غیر سرکاری منتظمین کے زیر انتظام چلنے والے سرکاری امداد یافتہ پرائمری اور جونیئر ہائی اسکولوں اور ہائر سیکنڈری اسکولوں۔ ٹریننگ کالجوں اور ڈگری کالجوں سے ریٹائر ہوئے تھے۔ یہ پنشن یکم نومبر ۱۹۷۲ء سے واجب الادا ہوگی۔ ان ٹیچروں اور ملازمین کا ان کی آخری تنخواہ کے پانچویں حصہ کے برابر اس شرط کے تحت ان ٹیچروں اور ملازمین کے لیے مقررہ انتہائی حد سے زیادہ نہ ہوگی جو مساوی اسامیوں پر یکم اکتوبر ۱۹۶۴ء کے بعد ریٹائر ہوئے تھے۔

پنشن کی منظوری کے سلسلہ میں اس قسم کا ایک سرٹیفکیٹ ضروری ہوگا جس میں متعلقہ ٹیچر یا ملازم کی آخری ادا شدہ تنخواہ نیز اس امر کی تصدیق کی گئی ہو کہ وہ ایسے زمروں کے اداروں میں مستقل ملازم تھا جن میں پنشن دی جاتی تھی۔ اس سرٹیفکیٹ کے پیش کرنے کے بعد ڈگری کالجوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کے ڈائرکٹر ہائر سیکنڈری اسکولوں اور ایل۔ ٹی۔ ٹریننگ کالجوں کے لیے ثانوی تعلیم کے ڈائرکٹر کی طرف سے ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولوں اور

پرائمری اور جونیر ہائی اسکولوں کے لیے بنیادی تعلیم کے ڈائرکٹر کی طرف سے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسران یہ پنشن منظور کریں گے۔

× × ×

اترپردیش کے دوسرے تنخواہ کمیشن کی رپورٹ کے شائع شدہ ہندی اور انگریزی نسخے دستیاب ہیں۔ ہندی نسخہ کے حصہ اول کی قیمت ۱۴ روپے اور حصۂ دوم کی ۸ روپیہ ہے۔ اسی طرح انگریزی نسخہ کی حصہ اول کی قیمت ۱۶ روپیہ اور حصہ دوم کی ۱۰ روپیہ ہے۔ خواہش مند افراد مذکورہ رپورٹ کے نسخے سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری اترپردیش۔ الہ آباد کے دفتر سے براہ راست حاصل کرسکتے ہیں۔

★

عربی کے ہند و علماء — (صفحہ ۱۸ کا بقیہ)

الحکمۃ فی اصول اللحون اس شرح کا نام رکھا گیا تھا[1]۔ مشرق میں لکھی جانے والی عربی تاریخوں میں خاص کر جو بغداد میں عباسی خلافت کے زیر سایہ لکھی گئیں، کسی ایک میں بھی ہندستانی موسیقی پر کسی کتاب کا حال نہیں ملتا۔

بہلا۔ معنی و بیان میں عربوں کو جو مدد ہندستانی علما نے دی اس کا ذکر گو بہت کم ملتا ہے لیکن جتنا بھی ملتا ہے وہ مشہور انشاء پرداز جاحظ نے ایک شخص معمر ابوالاشعث کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ اس زمانے میں جب کہ یحییٰ بن خالد برمکی کے یہاں ہندستانی اطبار کی بڑی قدر کی جاتی تھی: نامور ہندستانی عالم بہلا سے دریافت کیا گیا" ما البلاغۃ عند اھل العرب "؟ (ہندستانیوں کے خیال میں بلاغت کی کیا تعریف ہوسکتی ہے؟) بہلا نے جواب دیا کہ میں اس موضوع پر ایک کتابچہ اپنے ساتھ لایا ہوں — معمر ابوالاشعث کا کہنا ہے کہ میں اس کتابچہ کو لے کر مترجموں کے پاس گیا۔ انھوں نے اس کا ترجمہ عربی میں کردیا جس میں بلاغت کی تعریف اس طرح کی گئی تھی:

" بلاغت میں سب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ سامان بلاغت جمع ہوں منجملہ سامان بلاغت کے ایک یہ ہے کہ جب کوئی بلیغ خطابت کے فرائض انجام دے رہا ہو تو اس کو چاہیے کہ خود کو پوری طرح قابو میں رکھے۔ اس کے اعضاء و جوارح میں نامناسب اور ناملائم حرکات و سکنات نہ ہوں اور ادھر ادھر ضرورت سے زیادہ نظریں نہ دوڑائے۔ چیدہ الفاظ اور ترکیب استعمال کرے۔ ایسا نہ ہو کہ آقا کی گفتار کا جو لہجہ اور طریق ہے اس میں غلامانہ گفتگو کا انداز ہو۔ شاہانہ کلام میں عام اور عوامانہ کلام اختیار نہ کرے اور اتنی استعداد رکھتا ہو کہ ہر طبقے میں اپنی گفتگو سے الگ الگ طرز اختیار کرے۔ الفاظ کی چھان بین میں اتنا التزام نہ ہو کہ آورد کا رنگ آجائے بلکہ آمد معلوم ہو[1]۔"

بہلا بھی ان پنڈتوں میں تھا جنھیں یحییٰ بن خالد برمکی نے بغداد بلوایا تھا کہ سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کرنے میں اس سے بھی مدد لی جائے[2]۔

★

---

[1] البیان والتبیین ۱ص۹۲ [2] عشاوم العربیہ ص۳۰۵

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

دامن کی آگ

مصنف: مانک ٹالا۔ پبلشر: پی کے پبلکیشنز ۱۵۱۷، آریہ سماج روڈ، قرول باغ نئی دہلی ۵

قیمت: چھ روپیہ۔

مانک ٹالہ اردو کے سلجھے ہوئے، مشاق اور صاحب نظر افسانہ نگار ہیں۔ ان کے مختصر افسانوں کا مجموعہ (جو اٹھارہ دلچسپ اور زندگی آموز کہانیوں پر مشتمل ہے) منظر عام پر آچکا ہے۔ اور مانک ٹالہ کا نام دنیائے افسانہ میں محتاج تعارف نہیں۔ اب ان کا ناول "دامن کی آگ" منظر عام پر آیا ہے۔ یہ بھی ان کے افسانوں کی طرح زندگی کے محور پر گھومتا ہے۔ زندگی کے مسائل پر مانک ٹالہ کی گہری نظر رہتی ہے جس کا ثبوت زیر نظر ناول کو پڑھتے ہوئے صفحے صفحے پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ البتہ انھوں نے اس ناول کے ساتھ ساتھ "ماڈرن قصۂ چار درویش" بھی شامل کر دیا ہے جس کا اس ناول سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ ایک الگ موضوع ہے۔ لہٰذا ان چند سطروں میں "ماڈرن قصۂ چار درویش" کے بارے میں کچھ کہنا بے محل ہوگا۔

جہاں تک دامن کی آگ کا تعلق ہے وہ نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ درس حیات بھی دیتا ہے۔ مانک ٹالہ ہمارے نئے لکھنے والوں میں ایک سمجھدار فن کار ہیں اس لیے ان کے قلم سے اردو فکشن میں خوشگوار اضافوں کی مزید توقع کی جا سکتی ہے۔

سخن در سخن

یہ نواب مظفر الدین خاں صاحب کی رباعیات و قطعات کا مجموعہ ہے۔ شروع میں ولا اکیڈمی کے صدر حسن الدین احمد نے "حرف اخلاص" کے عنوان سے صاحب کا تعارف کرایا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر سلام سندیلوی کا پیش لفظ ہے جس میں صاحب کی رباعیات اور قطعات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

ان رباعیات و قطعات میں بہ لحاظ تنوع مضامین حسن و عشق کے علاوہ اخلاقیات حمد و نعت اور مختلف بزرگان دین کی مدح بھی شامل ہے۔ ان کے علاوہ حضرت امجد حیدرآبادی اور غالب ایسے دو مقتدر شعراء کی مدح بھی ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کی خصوصیات کی طرف بھی لطیف پیرائے میں اشارے پائے جاتے ہیں۔ ان رباعیات میں جوش بھی ہے اور ولولہ بھی۔ ملاحظہ ہو:

مشکل میں کامیاب ہونا ہے تجھے تاریخ کا ایک باب ہونا ہے تجھے
شاباش ہو اس دور کے انساں شاباش افلاک پہ فتحیاب ہونا ہے تجھے

اسی طرح درج ذیل رباعی بھی سلاست، روانی اور بےساختہ پن کے لحاظ سے اپنا جواب آپ ہے:

پیمانے نگاہوں کے چھلک جاتے ہیں گل عارض رنگیں کے دہک جاتے ہیں
اک مہر محبت کے نکل آنے پر ذرّوں کے مقدر بھی چمک جاتے ہیں

عشقیہ رباعیوں میں رنگینی، روانی، دلکشی اور بےساختگی کے لحاظ سے یہ رباعی بہت خوب ہے:

کیوں یاد بہت آتے ہیں کھوئے ہوئے دن مہکی ہوئی راتوں میں ڈبوئے ہوئے دن
انفاس کی خوشبو میں مہکتی راتیں گفتار کی لذت میں سموئے ہوئے دن

مختصر یہ ہے کہ صاحب کی رباعیات و قطعات میں زندگی ہے، سنجیدگی ہے، روانی ہے، بےساختگی ہے، مزہ ہے اور بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی کے:

"یہ بات قابل تحسین ہے کہ شاعری کے اس مزاجی دور میں سید مظفر الدین خاں صاحب ...... زمین شور میں تخم عمل ضائع نہیں کر رہے ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کی روایت کو برقرار رکھا ہے۔"

سخن در سخن میں تیسری رباعی ہے:

بندہ ہے تو رکھ اپنا تعلق قائم تجھ کو نہ ستا سکے گا پھر کوئی غم
سمجھا بھی ہے ناداں، یہ ہے دنیا فانی اللہ سے لو لگا یہ ہے رشتہ محکم

قائم میں حرف روی یعنی ہمزہ بالکسر ہے اس لیے قائم کسی طرح غم اور محکم کا قافیہ نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح یہ رباعی:

مشکل میں کامیاب ہونا ہے تجھے تاریخ کا ایک باب ہونا ہے تجھے
شاباش ہو اس دور کے انساں شاباش افلاک پہ فتح یاب ہونا ہے تجھے

اس میں کامیاب اور فتح یاب کے قافیے ایطائے جلی کا عیب رکھتے ہیں۔

ایک اور رباعی ہے:

جتنے بھی مرے جام سے مخمور ہوئے موسیٰ عیسیٰ ہوں یا کہ منصور ہوئے
تھی بات سر دار سر طور رہی حاصل جو ہوا قرب نہ پھر دور ہوئے

اس رباعی کے دوسرے مصرع میں ردیف نہیں [illegible] ہونے کے "ہوں یا ہو" درست ہے۔

رباعی نمبر ۱۱ کا پہلا مصرع:

دلگیر نہ ہو بستۂ زنجیر حیات

بستۂ زنجیر حیات کی ترکیب بے معنی ہے۔

بہرحال بہ حیثیت مجموعی سخن در سخن ایسا باغ ہے جس میں مختلف رنگ و بو کے پھول نظر نواز ہوتے ہیں۔

قیمت چار روپے۔ ملنے کا پتہ: ولا اکیڈمی، عزیز باغ سلطان پورہ، حیدرآباد ۲۴ ہے۔ ——— قمر صدیقی

یوم آزادی
(۱۵ اگست ۱۹۷۳ء)

۷۹ (ک)

نیا دور

جلد ۲۹ | نمبر ۵

شراونڑ ۱۸۹۵ اشک
اگست ۱۹۷۳ء

چندہ سالانہ: پانچ روپے
فی پرچہ: پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
شرومنی شرما
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اُتر پردیش

پرنٹر
اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یو۔پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اُتر پردیش

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اُتر پردیش اُن سے بہرحال متفق ہو

اپنی بات

پندرہ اگست ۱۹۷۳ء کو ہماری آزادی کے ۲۶ سال پورے ہو جائیں گے۔ یہ گویا ۲۶ قدم ہیں جو ہم نے اپنی آزادی کے تحفظ اور اس کی بقا نیز ملک کو غذائی، صنعتی، اقتصادی، تعلیمی اور صحتی اعتبار سے خود کفیل و ترقی یافتہ بنانے کے سلسلے میں باوجود انتہائی دشواریوں اور مشکلات کے اعتماد و یقین اور عزم و استقلال کے ساتھ اٹھائے ہیں۔ یہاں ان ۲۶ برسوں میں جو مشکلات پیش آئیں اور ان پر ہم نے جس طرح قابو حاصل کیا ان کی تفصیل میں جانا مقصود نہیں اور نہ ان سطور میں اس کی گنجائش ہی ہے۔ لیکن یہ سب ہی جانتے ہیں کہ ملکی اور بین اقوامی معاملات میں ہماری جو پالیسی رہی ہے، مسائل کو حل کرنے اور چیلنجوں کا مقابلہ کرنے میں ہم جس پامردی، استقلال اور سوجھ بوجھ کا ثبوت دیتے رہے ہیں، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ عالمی برادری میں ہمیں ایک ممتاز جگہ حاصل ہو گئی ہے اور ہماری بات وزن رکھتی ہے۔ اسی کے ساتھ ملک نے اس قلیل مدت میں جو ترقی کی ہے اس کی مثال بھی اس اعتبار سے نہیں ملتی کہ ہندستان میں جمہوری نظام قائم ہے اور جو کچھ کیا گیا ہے اسی نظام کے تحت کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ملک کی تعمیر و ترقی کے سلسلے میں بہت کچھ ہوا ہے مگر ہمارا سب سے بڑا نصب العین ہے ملک سے غریبی مٹانا اور اقتصادی نابرابری دور کرنا۔ اس ضمن میں حال ہی میں ایک انتہائی اہم اور دلیرانہ قدم اٹھایا گیا ہے اور حکومت نے گیہوں کی تجارت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ دھان کی تجارت کو بھی قومیانے کی اسکیم تقریباً مکمل ہو چکی ہے۔ سماج دشمن اور مفاد پرست عناصر اس اسکیم کو ناکام بنا دینے میں اپنی پوری قوت اور اپنے تمام وسائل صرف کر رہے ہیں۔ اس طرح ہمارے سوشلزم کے نصب العین کے لیے یہ ایک کھلا ہوا چیلنج ہے جس کا مقابلہ ہمیں اسی طرح عزم و استقلال کے ساتھ کرنا ہے جس طرح ہم اس سے پہلے مشکلات اور دشواریوں کے موقعوں پر کرتے رہے ہیں۔

یوم آزادی ہمیں ہر سال یہ موقع دیتا ہے کہ ہم اپنا محاسبہ کریں اور دیکھیں کہ ہم پر جو ذمے داریاں ہیں انھیں ہم نے کس حد تک پورا کیا ہے اور عہد کریں کہ جو کمیاں رہ گئی ہیں انھیں دور کریں گے اور ایسی کوئی بات نہ کریں گے اور نہ دوسروں کو کرنے دیں گے جس سے ریاست اور ملک کے امن و امان، ضبط و نظم اور پیداواری ذرائع و وسائل کو کوئی نقصان پہنچے۔ اس وقت بھی ملک مصنوعی افراط زر، گرانی، خشک سالی، غذائی قلت اور دیگر ضروریات زندگی کی کمی سے پیدا ہونے والی انتہائی دشوار صورت حال سے دوچار ہے۔ چنانچہ صدر جمہوریہ شری وی۔ وی۔ گری نے ۲۸ جولائی کو لکھنؤ میں زیر تعمیر عالی شان گاندھی بھون کا افتتاح کرتے ہوئے اپنی تقریر میں اس دشوار ترین صورت حال کو آزادی کے بعد کے ۲۵ برسوں کا سب سے بڑا بحران قرار دیا اور کہا کہ موجودہ معاشی مسائل کو گھریلو صنعتوں کو ترقی دے کر حل کیا جا سکتا ہے۔ حکومت موجودہ بحران کو ختم کرنے اور عوام کو راحت پہنچانے کے لیے کوشش کر رہی ہے لیکن کوئی بھی اسکیم یا پروگرام اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک عوام حکومت کا ہاتھ نہ بٹائیں۔ اس لیے آیئے یوم آزادی کے اس مبارک موقع پر ہم عہد کریں کہ ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، ضبط و نظم اور ڈسپلن کی خلاف ورزی، بددیانتی، ملاوٹ، تعصب اور فرقہ واریت کے خلاف کی جانے والی نہ صرف سرکاری کارروائیوں میں اشتراک و تعاون کریں گے بلکہ خود بھی ان لعنتوں اور برائیوں سے دور رہیں گے اور دوسروں کو بھی اس پر آمادہ کریں گے تاکہ ملک کا نظم و ضبط اور اتحاد قائم رہے اور وہ ترقی کے راستے پر آگے بڑھے۔

● نیا دور کا مئی۔ جون کا مشترکہ شمارہ اردو کے عظیم ادیب اور نقاد پروفیسر احتشام حسین کی یاد میں خصوصی نمبر کی حیثیت سے شائع کیا گیا تھا۔ ادب دوستوں نے احتشام نمبر کو جس پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اس سلسلے میں جو خطوط ہمیں موصول ہو رہے ہیں وہ بڑے ہمت افزا ہیں۔ ہم نیا دور کے ہر نمبر کی کامیابی پر اپنے قلمی معاونین کو ہدیہ تہنیت پیش کرتے ہیں کہ دراصل یہ کامیابی انھیں کی وجہ سے ہمیں حاصل ہوتی ہے۔ احتشام نمبر کی کامیابی پر بھی ہم اپنے قلمی معاونین کو مبارک باد دیتے ہیں۔ احتشام نمبر کی پسندیدگی کا اندازہ ہمیں رسم اجرا کی تقریب کے موقع ہی پر ہو گیا تھا جو گورنمنٹ ہاؤس میں گورنر شری اکبر علی خاں کے ہاتھوں انجام پائی تھی۔ اس تقریب اجرا کی تفصیلی رپورٹ آپ ستمبر کے شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ نیا دور کے سابق نمبروں کی طرح احتشام نمبر بھی شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ نکلنا شروع ہو گیا اور اس کی مانگ جس طرح جاری ہے اس کے پیش نظر تعمیل فرمائش دشوار ہو رہی ہے۔ اس لیے جو حضرات خواہش مند ہوں انھیں چاہیے کہ بلاتاخیر ہمیں مطلع کریں ورنہ بعد میں ہم کاپیاں فراہم نہ کر سکیں گے۔ وی۔ پی کے ذریعے دو ایک کاپی بھیجنے کی جو زحمت آتی ہے اس کی تعمیل سے ادارہ قاصر ہے۔ اس نمبر کی ایک روپیہ قیمت ذریعہ منی آرڈر پیشگی موصول ہونا چاہیے۔ کاپی "انڈر سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ" روانہ کی جائے گی مگر اس کے راستے میں ضائع ہو جانے کی کوئی ضمانت نہیں لی جا سکتی اس لیے احتشام نمبر ذریعہ رجسٹری منگوایا جائے تو بہتر ہے اور رجسٹری کے اخراجات بھی قیمت کے ہمراہ منی آرڈر سے بھیج دیے جائیں۔

——— ایڈیٹر

فراقؔ گورکھپوری

غزل

ہمارے عشق کا عالم کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
ہر اندازِ نشاط و غم کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

فضائے دشت سے اس راز کو دریافت کرنا ہے
اک آہو کی ادائے رم کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

تغیر سے کہاں آزاد سوز و سازِ پنہاں بھی
گہے تیز اور گہے مدھم کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

نہیں اک رنگ پر قائم پریشانیِ خاطر بھی
دلوں کی شورشِ پیہم کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

کبھی آزادیاں دے دے بٹھا دے گاہ زنجیریں
مزاجِ گیسوئے برہم کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

کبھی غم کے ترانے ہیں سرخوشی کے ہیں کبھی نغمے
ربابِ دل کا زیر و بم کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

بھر آئی آنکھ شادی سے گہے، دکھ درد سے گاہے
کہ وجہِ دیدۂ پرنم کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

ہم اس کا ساتھ دیں کیسے نبھائیں کس طرح اس سے
کہ تیرے عشق کا عالم کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

گہے سازِ طربیہ، گاہ اک پرسوز المیہ
بس اک افسانۂ آدم کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

یہی اک زندگی رہ رہ کے کیا کیا سوانگ بھرتی ہے
یہی جانا ہوا عالم کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

گہے اشکوں میں ڈوبی گاہ صد ہا خندۂ رنگیں
کہ رودادِ گل و شبنم کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

بشر رشکِ ملائک ہے بشر رشکِ شیاطیں ہے
کہ خیر و شر کا یہ سنگم کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

ہر اک عالم نیا عالم ہے بزمِ رقص و نغمہ کا
یہ حال و قال و کیف و کم کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

کچھ ان اشعارِ رنگارنگ پر یارو نظر کر لو
ہمارے ساز کی سرگم کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

کوئی حالت ہماری رہ سکی کب ایک حالت پر
مسرت اپنی اپنا غم کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

وہی آئینہ خانہ ہے وہی ہے عکسِ آئینہ
جمالِ شعلہ و شبنم کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

فراقؔ اشعار کو میرے پہناتے ہیں کئی معنی
ہر اک کا مطلبِ مبہم کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

۱۹۳۰ء کی وہ رات جب آزادی کا خواب دیکھا تھا

جے۔ این۔ ساہنی

ممتاز صحافی ساہنی نے بھارت کی جدوجہد آزادی کے ایک عظیم لمحے کی یاد تازہ کی ہے۔ یہ ۱۹۳۰ء میں کانگریس اجلاس کی بات ہے جب کانگریس نے مکمل آزادی کے حصول کا یادگار عہد کیا تھا۔

بھارت کی آزادی کے خواب نے ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء اور یکم جنوری ۱۹۳۰ء کی درمیانی شب میں لاہور کے باہر دریائے راوی کے کنارے جنم لیا اور نہ صرف جنم لیا بلکہ قوم کی طرف سے اس کی توثیق بھی کی گئی۔ بھارت کو آزادی اگرچہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی نصف شب کو حاصل ہوئی تھی مگر یہ وقت کی ستم ظریفی ہے کہ آزادی کے ساتھ لاہور اور راوی کا وہ حصہ ہندستان میں باقی نہیں رہا جہاں آزادی کے خواب نے جنم لیا تھا۔

انڈین نیشنل کانگریس کا ۱۹۲۹ء کا اجلاس کانگریس کی تاریخ میں مختلف پہلوؤں سے اگر انوکھا نہ تھا تو کم از کم نہایت ہی یادگار اجلاسوں میں سے ایک تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ میں نے تیس برسوں کے دوران پنجاب میں منعقد ہونے والے یکے بعد دیگرے انڈین نیشنل کانگریس کے تین جلسوں میں شرکت کی۔

یہ اجلاس ۱۹۰۹ء میں پنڈت مدن موہن مالویہ ۱۹۱۹ء میں پنڈت موتی لال نہرو اور ۱۹۲۹ء میں شری جواہر لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوئے تھے۔

ایک ممتاز مندوب کی حیثیت سے میرے والد نے ۱۹۰۹ء میں لاہور کے اجلاس میں شرکت کی تھی۔ پنجاب کے صدر مقام میں کرسمس کی چھٹیاں گزارنے کے خیال سے میں اور میرے دو بڑے بھائی ان کے ہمراہ ہو گئے تھے۔ وہاں ہمارے لیے دلچسپی کے بہت سے اسباب مہیا ہو گئے تھے۔ مثلاً وہاں ہم نے انارکلی کے بازار کی بھیڑ بھاڑ دیکھی شاندار مال روڈ کا نظارہ کیا، ہارس شو اور کرکٹ کے میچ دیکھے اور دیوہیکل کیکر سنگھ اور غلام محمد کے درمیان کشتی دیکھی اور راتوں کو تھیٹر سے محظوظ ہوئے۔ ہم گاہے بگاہے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لیے جاتے رہے مگر ان میں ہمیں کوئی دلچسپی کی بات نظر نہ آئی۔ میرے ذہن میں ابھی تک ان مقتدر ہستیوں کی جھلکیاں محفوظ ہیں جو پائجاموں زردار اچکنوں اور دھوتیوں میں ملبوس ہوتے۔ ان کے سروں پر پگڑی بندھی ہوتی تھی۔ سنہرے پٹکوں اور سرخ ارغوانی اور خاکستری وردیوں میں ملبوس چپراسیوں کی بہتات تھی۔ کثیر تعداد میں خالی کرسیاں تھیں۔ ہماری طرح بچوں کی ٹولیاں گلی ڈنڈا یا گولیاں کھیلنے کے لیے ایک محفوظ کونے کی تلاش میں ادھر ادھر گھومتی رہتی تھیں اور ساتھ ہی ہر وقت بے صبری سے دوپہر کے کھانے کے وقفے کا انتظار کیا کرتی تھیں یا اس وقفے کا انتظار رہتا تھا جبکہ گرم گرم دودھ

اور چائے کے بڑے بڑے سماوار کیک پیسٹری اور مٹھائیوں کے ساتھ نظر آتے تھے۔

کئی سال بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ اجلاس کس قدر تاریخی اہمیت کا حامل تھا اس لیے کہ انڈین نیشنل کانگریس نے جو اس وقت تک ایک بھکاری کی طرح کشکول ہاتھوں میں لیے ہوئے رعایتوں اور اصلاحات کی مانگ کر رہی تھی، اب راست اقدام (DIRECT ACTION) کی دھمکی دی تھی۔

خون کی ہولی کے بعد

۱۹۱۹ء کا دور اس سے مختلف تھا۔ یہ اجلاس امرتسر میں منعقد ہوا تھا۔ پنجاب نہایت ہی بے رحم مارشل لا سے ابھی ابھی آزاد ہوا تھا۔ طلبا پر ہنٹر اور گولیاں برسائی گئی تھیں اور انھیں مارا پیٹا گیا تھا۔ انھیں اپنے بستر لے کر چار سے آٹھ میل تک مارچ کرنے کے بعد برطانوی پرچم کو زبردستی سلامی دینے کے ذلت آمیز کام کے لیے مجبور کیا جاتا تھا۔ خود امرتسر اور یہاں تک کہ سارے پنجاب میں کوئی لیڈر باقی نہیں رہا تھا۔ مارشل لا حکومت نے سیاسی اثر و رسوخ رکھنے والے ہر شخص کو قید خانوں میں جھونک دیا تھا۔ امرتسر ہی میں جنرل ڈائر نے جلیان والا باغ کی جنگ لڑی تھی جس میں اس نے چند منٹ کے اندر سینکڑوں محصور نہتے اور معصوم مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل عام کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ خنجروں کی نوک اور فوجی جوتوں کے بل پر شہریوں کو ایک گلی میں چھپکلیوں کی طرح رینگنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ یہ وہی گلی تھی جہاں چند مشتعل افراد نے دو یورپین خواتین کو چھیڑنے کے "ناقابل معافی" جرم کا ارتکاب کیا تھا۔

رضا کار کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے نوجوانوں کی ایک ٹولی کے ساتھ میں امرتسر کانگریس اجلاس میں گیا تھا۔ پنجاب کے سیاسی افق پر اس وقت تک کالے بادل چھائے رہنے کے باوجود امرتسر کا اجلاس کانگریس کی تاریخ میں منعقد ہونے والے سنسنی خیز، یادگار اور ولولہ انگیز اجلاسوں میں سے ایک ثابت ہوا۔ یہ قومی جدوجہد کا ایک نیا موڑ تھا۔

درجنوں مشاہیر

تھوڑے ہی عرصے کے بعد غیر متوقع طور پر حکومت نے مصالحتی رویہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ جنرل ڈائر اور لفٹننٹ گورنر مائیکل اوڈوائر کے وحشیانہ جرائم کے عوض حکومت نے عام معافی کا اعلان کیا تاکہ بعد ازاں مانٹیگو چیمس فورڈ اصلاحات کو ترتیب دینے والے سکریٹری آف اسٹیٹ مانٹیگو کے دورے کے لیے سازگار ماحول تیار کیا جائے۔

صوبۂ پنجاب کے تمام قائدین اس پنڈال میں جمع ہو گئے تھے۔ محمد علی اور شوکت علی کو چھندواڑہ سے رہا کیا گیا تھا۔ یہ دونوں خصوصی ٹرین کے ذریعے رات تک پہنچے اور اپنی منفرد شخصیتوں سمیت یعنی داڑھیوں اور عربی لباس میں نظر آئے۔ مولانا آزاد اپنی طویل نظربندی سے رہا ہو کر آئے۔ ان کے علاوہ دیگر مشہور سیاسی شخصیتوں کا بھی اجتماع تھا مثلاً لوک مانیہ تلک، مسز اینی بیسنٹ، مدن موہن مالویہ، بپن چندر پال، سی۔ آر۔ داس، ایم۔ اے۔ جناح، وجے راگھو چاریہ، سر دجبنی نائیڈو اور بیسیوں دیگر افراد موجود تھے جنھیں آنے والے برسوں کے دوران قومی جدوجہد میں ایک اہم کردار ادا کرنا تھا۔

لوک مانیہ تلک اس وقت بھی ایک ممتاز شخصیت تھے۔ سرخ مراٹھی انداز کی زرد ار پگڑی اور کنی دار دھوتی پر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ہوئے وہ نہایت شاندار نظر آ رہے تھے۔ مگر کانگریس کے افق پر ایک نیا ستارہ نظر آنے لگا تھا اور جس کی جانب سب کی نظریں مرکوز تھیں۔ دبلے پتلے، چہرے پر ہڈیاں ابھری ہوئیں، کان باہر نکلے ہوئے، داڑھی مونچھ منڈے، کمزور نظر آنے والے اور معمولی دھوتی کرتہ اور پگڑی پہنے ہوئے گاندھی، برطانوی افسر شاہی کے لیے ایک شریر لڑکا، ہم وطنوں کے لیے ایک سیاسی معمہ اور عوام کے لیے روحانی مسیحا بن چکے تھے۔

لڑائی کی تیاری

میں ۱۹۲۹ء میں ایک رضا کار سے ترقی پا کر مکمل لیڈر بن گیا

تھا اور قومی جد و جہد میں شریک ہوگیا تھا نیز ایک مدیر کی حیثیت سے قومی واقعات کا واقعہ نویس بھی بن گیا تھا۔ کانگریس مطالبات اور قراردادوں سے راست اقدام پر اتر آئی تھی۔ پہلی لڑائی مہاتما گاندھی کی قیادت میں اور اس مقصد کے تحت کہ برطانوی دولت مشترکہ میں بھارت کے لیے ریاست کا درجہ حاصل کیا جا سکے، ستیہ گرہ کے ہتھیار سے لڑی گئی تھی۔ عدم تعاون ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ختم ہوگیا تھا۔ اس حالت میں کانگریس نے موتی لال نہرو، سی آر داس، لالہ لاجپت رائے، مدن موہن مالویہ، سری نواس آئینگار اور دیگر افراد کی قیادت میں لڑائی کو مجلس قانون ساز تک پہنچا دیا تھا۔ وقفے وقفے سے حکومت کی کارروائیوں کو بے اثر کیا جا رہا تھا مگر حکومت بھی مضبوطی سے جمی ہوئی تھی۔

بم کا دھماکہ

قانون سازی کا پروگرام بیکار ہوگیا۔ معمر لوگوں کی لفظی لڑائی سے نوجوان قیادت اکتا سی گئی تھی ـــــــ نوجوانوں کی بڑی تعداد نے تشدد کا راستہ اپنایا۔ مائیکل او ڈوائر کو انگلینڈ میں قتل کیا گیا۔ پونا میں ایک گورنر پر گولی چلائی گئی اور بنگال میں متعدد پرتشدد واقعات پیش آئے۔ بھگت سنگھ اور بھکتیشور دت نے اسمبلی کے ایک اہم اجلاس کے دوران اسمبلی ہال میں بم پھینک کر معمر لوگوں کو اپنی قانونی مخالفت کی نیند سے جگانے کی کوشش کی۔ سانڈرس کے قتل کے الزام میں بھگت سنگھ، راج گورو اور سکھ دیو کو موت کی سزا سنائی گئی۔

جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس، رفیع احمد قدوائی، سبھے پرکاش نارائن، آچاریہ نریندر دیو اور دیگر نوجوان قائدین ریاست کے درجے سے متعلق کانگریس کی پابندی قبول کرنے پر اعتراض کرنے لگے۔ انھوں نے مکمل آزادی کی مانگ کے لیے عوام میں ایک نیا جوش بھر دیا۔

باپ اور بیٹے

مہاتما گاندھی کی قیادت اور موتی لال نہرو کی رہبری میں ۱۹۲۸ میں کلکتہ کانگریس میں معمر لوگوں نے آخری لڑائی لڑی۔ نہرو رپورٹ نے ریاست کے درجے کے تحت ایک عارضی ہندستانی دستور مرتب کیا تھا۔ معمر لوگوں کو توقع تھی کہ انگلینڈ اعلیٰ ظرفی کے ساتھ اس کا جواب دے گا۔ سی۔ آر۔ داس اس جذبہ کی توقع کرتے ہوئے انتقال کر گئے۔ لیکن کسی مفاہمتی جذبے کا اظہار ان کی طرف سے نہیں ہو رہا تھا اس لیے مہاتما گاندھی نے عہد کیا کہ "ریاست کے درجے" کی مانگ کو اگر ایک سال کے اندر منظور نہیں کیا گیا تو وہ اور دوسرے معمر افراد نوجوان قائدین کے ساتھ مل کر نہ صرف مکمل آزادی مانگیں گے بلکہ ایک طاقتور اور ختم نہ ہونے والی جد و جہد کا آغاز بھی کریں گے۔

بحران کا وہ سال دسمبر ۱۹۲۹ میں ختم ہوگیا۔ برطانیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سائمن کمیشن ایک اشتعال انگیز سوانگ تھا۔ لاہور کانگریس کی صدارت کے لیے سردار ولبھ بھائی پٹیل کو منتخب کیا گیا تھا۔ مخالفت کے باوجود گاندھی جی نے قومی قیادت کا بوجھ جواہر لال نہرو کے نوجوان کندھوں پر ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ ڈومینین اسٹیٹس پر اکتفا نہ کرتے ہوئے آزادی کی لڑائی لڑی گئی اور اس میں نوجوان قیادت کو فتح حاصل ہوئی۔

کانگریس کا اجلاس لاہور میں دریائے راوی کے کنارے منعقد کیا گیا۔ اب وہ ۱۹۰۹ء یا ۱۹۲۹ کی کانگریس نہیں رہی تھی۔ اجلاس کی فضا امید و بیم اور جذبات سے معمور تھی۔ عدم تشدد کی افادیت ثابت کرنے کے لیے یہ گاندھی جی کے واسطے آخری موقع تھا اور اس وقت اگر گاندھی جی سے وابستہ توقعات پوری نہ ہوتیں تو عوام پرتشدد انقلاب کے لیے تیار تھے۔

ان عبوری دس برسوں میں کانگریس نے چرخہ اور کھادی کو اپنایا تھا اور برطانوی اشیاء کا بائیکاٹ کیا تھا۔ ملک بھر میں غیر ملکی کپڑوں کو جلایا گیا تھا۔

کھادی بریگیڈ

اجلاس میں شریک ہونے والے بیس ہزار افراد کے لیے کھادی

پہننا لازمی تھا۔ گاندھی ٹوپی قومی جد و جہد کا ایک نشان بن گئی تھی۔ پورے پنڈال میں بیماروں کے سوا اور کسی کے لیے کرسیاں نہیں تھیں۔ ۱۹۱۹ء میں ڈائس پر بیٹھنے والے بیشتر قائدین یا تو انتقال کر گئے تھے یا پھر ان کے اعتدال پسندانہ نظریات کے مقابلے میں کانگریسی سیاست کو بہت زیادہ گرم ہوتا دیکھ کر علاحدہ ہو گئے تھے۔ اعلیٰ درجوں پر فائز سبھی افراد ہمہ وقتی کارکن تھے جنھوں نے ملک کے مفاد کی خاطر اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا وہ قربانیاں دینے کے متمنی تھے اور طویل قید و بند اور صعوبتیں سہنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

اکیلا سوار

کانگریس کی تاریخ میں صدارت کا تاج پہننے والوں میں سب سے نوجوان جواہر لال نہرو تھے۔ ابتدائی برسوں میں کانگریس کے صدر کو ہاتھیوں پر یا متعدد گھوڑوں کے ساتھ سجی سجائی گاڑیوں پر جلوس کی صورت میں لایا جاتا تھا۔ بعد ازاں سبھاش چندر بوس کا ۵۲ بیلوں والی گاڑی میں جلوس نکالا گیا۔ جواہر لال نہرو نے گھوڑے پر سوار ہو کر ایک نوجوان اور نمایاں طور پر عوامی طرز کا آغاز کیا۔ وہ گھوڑوں، سائیکلوں اور پیدل چلنے والے رضاکاروں کے دستے کے آگے گھوڑے پر سوار تھے اور سڑک کے دونوں طرف ہزاروں افراد انھیں دیکھ کر مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ دستے میں بینڈ اور ڈرم بجانے والے بھی ہوتے تھے۔ مگر سب سے زیادہ قابل دید پٹھان سرخ پوشوں کی رجمنٹ اور خود اُن کا بیگ پائپ بجانے والا دستہ تھا۔ وہ صوبہ سرحد سے خصوصی طور پر اجلاس میں شریک ہونے کے لیے اپنے ۶ فٹ، ۴ انچ اونچے قد کے رہبر خان عبدالغفار خاں کے ساتھ آئے تھے، جو بعد میں سرحدی گاندھی کہلائے۔ وہ ایک باوردی اور منظم افراد کا باقاعدہ گروہ تھا جس کی موجودگی سے کانگریس اجلاس میں پوری کارروائی کے دوران ایک قسم کی رنگینی اور دلکشی چھائی رہی۔

جواہر لال نہرو اور قومی قائدین کے علاوہ تین دیگر اشخاص لاجپت رائے نگر میں بڑی شخصیتوں کی حیثیت سے رونما ہوئے۔ جہاں کانگریس کا اجلاس ہو رہا تھا اس کو شیر پنجاب لالہ لاجپت رائے کے نام سے موسوم کیا گیا تھا جو لاہور میں سائمن کمیشن کی مخالفت کے دوران لاٹھیوں کی ضربوں سے شہید ہو گئے تھے۔ عدم ادائیگی محصول کی بردولی جد و جہد کے ہیرو کی حیثیت سے سردار ولبھ بھائی پٹیل نے عوام سے خوب خراج تحسین حاصل کیا۔ عظیم سی۔ آر۔ داس کی موت کے بعد بنگال کی قیادت کا بوجھ سبھاش چندر بوس پر پڑا تھا۔ سرحدی صوبہ میں خان عبدالغفار خاں برطانوی طاقت کے لیے ایک مسئلہ بن گئے تھے۔ انھوں نے ایک نہایت ہی باقاعدہ اور با مقصد رضاکاروں کی فوج "خدائی خدمت گار" تیار کی تھی۔

یہ کانگریس کی تاریخ میں پہلی بار ہوا کہ قومی قیادت کا تاج باپ سے بیٹے کو حاصل ہوا تھا۔ موتی لال نہرو نے نہ صرف امرتسر کانگریس بلکہ ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کانگریس اجلاس کی بھی صدارت کی تھی۔

نہرو کا چیلنج

جیسا کہ توقع کی جانی چاہیے تھی جواہر لال نہرو نے ایک جذباتی تقریر کی۔ پہلی بار صدر کانگریس نے طبع شدہ تقریر سے ہٹ کر غیر روایتی انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا جو اُن کے بعض دقیانوسی ساتھیوں کے لیے جھنجھلاہٹ کا باعث ثابت ہوا۔ اس اچانک دھمکی نے کہ کانگریس نہ صرف آزادی چاہتی ہے بلکہ یورپ کے مفاد پرستوں کو برطانیہ کی جانب سے دی گئی تمام رعایتیں، اور غیر مجاز زمین، دین، قرضہ جات اور پابندیوں کو نہ تسلیم کرنے کا نوٹس بھی دیتی ہے، منفعت و اقتدار پرستوں اور ملک کا مال غنیمت کھا کر موٹے ہونے والے یورپی اجارہ داروں کو ہلا کر رکھ دیا۔

اجلاس چار دن تک جاری رہا۔ ڈومینین اسٹیٹس کی حمایت کرنے والوں اور ان لوگوں کے درمیان جو یہ چاہتے تھے کہ کانگریس مکمل آزادی کا اعلان کر کے اپنے گزشتہ سال کے وعدہ کو پورا کرے، ایک آخری لڑائی لڑی گئی۔ تمام آنکھیں گاندھی پر مرکوز تھیں۔ انھوں نے نہایت ہی دھیمی آواز میں تقریر کی۔ مگر ان کے ہر لفظ پر داد و تحسین کا ایک شور برپا ہوتا تھا۔ آخر میں انھوں نے قومی الٹی میٹم ترتیب دیا۔ انھوں نے کہا کہ کانگریس کو جیسا کہ گزشتہ سال

اس نے تنبیہ کیا تھا اس کے مطابق مکمل آزادی کا اعلان کرنا چاہیے مگر اس کے ساتھ ہی پُرامن اور جائز طریقوں کے ذریعے اس آزادی کو حاصل کرنے کا عہد بھی کیا جانا چاہیے۔

درحقیقت وہ "عدم تشدد اور جائز طریقہ کار" کے حق میں تھے۔ نوجوان قائدین نے صرف "جائز طریقہ کار" اپنانے پر اصرار کیا۔ آخر کار آدھی رات کے قریب اتفاق رائے ہوا اور انقلاب زندہ باد کے پرشور نعروں کے ساتھ انڈین نیشنل کانگریس نے متفقہ طور پر اعلان کیا کہ "مکمل آزادی" بھارت کا مدعا ہے جو مہاتما گاندھی کی قیادت میں "پرامن اور جائز طریقہ کار" سے حاصل کیا جائے گا۔

راوی کے پار سرد برفیلی ہوا چل رہی تھی۔ جمع شدہ ہزاروں نمائندے اور تماشہ دیکھنے والے پنڈال سے باہر نکلنے لگے۔ صدر کانگریس جواہر لال نہرو نے چرخے کے نشان سے آراستہ ترنگا جو آزادی کا جھنڈا تھا، ایک ۳۰ فٹ اونچے کھمبے پر لہرایا۔ بیگ پائپ بجانے والے سرخ پوشوں کی قیادت میں مختلف بینڈ تھے، سینکڑوں مردوں اور عورتوں کے آگے جواہر لال نہرو ناچتے ہوئے جھنڈے والے کھمبے کے چاروں طرف گھومنے لگے۔ "مہاتما گاندھی کی جے" "نہرو کی جے"، "انقلاب زندہ باد" اور "بھگت سنگھ زندہ باد" کے نعرے ہوا میں ارتعاش پیدا کرنے لگے۔ رضاکار لڑکیاں کورس میں قومی گیت گاتے ہوئے ناچنے لگیں۔ ان میں سب سے زیادہ جذباتی رام پرشاد بسمل کی مشہور نظم "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے" تھی۔ وہ ایک عظیم اور ناقابل فراموش نظارہ تھا۔ بہرہ کر دینے والی بازگشت راوی کے پرسکون پانی کے اوپر ارتعاش پیدا کرنے لگی۔

آزادی نہیں ملی تھی اور نہ ہی ڈومینین اسٹیٹس۔ مگر پہلی بار ۲۰۰ سال تک غلامی میں جکڑے رہنے کے بعد ہندستانی عوام سبھی پرامن اور جائز طریقوں کو استعمال میں لاکر اور قربانیوں کے ثمرے یا نتائج کی پروا کیے بغیر برطانوی طوق غلامی کو اتار پھینکنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

یہ ایک عظیم جدوجہد کا آغاز تھا۔ گاندھی جی نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ بھارت کو ان کی قیادت میں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی آدھی رات کو آزادی حاصل ہوئی ـــــ سترہ سال بعد نہایت ہی پرامن اور قانونی طریقوں سے جن پر کسی بھی ملک کو فخر ہو سکتا ہے اور جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ ایسی جدوجہد تھی جس نے غیر ملکی سامراجیت کے تحت کچلی جانے والی دوسری قوموں کے لیے امید کی ایک نئی مشعل روشن کی۔

- شرازہ ۱۸۹۵ اشک

نازش پرتاپ گڑھی

ہر راہ مصیبت سے پٹی جاتی ہے
دنیا ہے کہ مرکز سے ہٹی جاتی ہے
دھرتی پہ بڑھے جاتے ہیں جتنے انساں
انسانیت اتنی ہی گھٹی جاتی ہے

●

ہوتے ہیں مصیبتوں کے طوفاں پیدا
کرتے ہیں تباہیوں کے ساماں پیدا
ہیں نسل بڑھانے میں تو مصروف سبھی
جب جانوں کرے کوئی اک انساں پیدا

●

چپکے رہو، روؤ یا کراہو یارو!
جس طرح بھی بن پڑے نباہو یارو!
انسانوں کی تعداد بڑھانے کے بجائے
جتنے ہیں انھیں کی خیر چاہو یارو!

●

شعلوں میں گھری جھلس رہی ہے دنیا
ہر آن اپنے کو ڈس رہی ہے، دنیا
انسانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی میں
انساں کے لیے ترس رہی ہے دنیا

الطاف حسین ترمذی

مواد اور ہیئت

کوئی ادب پارہ خواہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ اور اس کا تعلق سفلی جذبات سے ہو یا روحانی احساسات سے، اس کی تخلیق میں دو پہلو کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ادب پارے کی تخلیق کا ساز و سامان اور اس کا اثاثہ مواد کیا ہے، وہ فنکار کے کن کن ذہنی تجربات و مشاہدات اور اس کے کن کن تخیلی حقائق و واقعات پر مشتمل ہے۔ دوسرے یہ کہ فنکار ان حقائق و واقعات اور خیالات و تجربات کو کس شکل اور کس صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ ان میں سے اول الذکر پہلو کو مواد کا نام دیا جاتا ہے اور موخر الذکر کو ہیئت کہا جاتا ہے۔ مواد اور ہیئت تنقید کے اہم مباحث میں شمار ہوتے ہیں۔

مواد سے مراد وہ سب کچھ ہے جسے ادیب اپنے ذہنی مشاہدات اور جذباتی تجربات کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ اس ضمن میں اس کے ذاتی رجحانات، اس کے قلبی احساسات اور اس کے نظریۂ حیات کو بڑا دخل حاصل ہے۔ دوسری طرف ادیب کا علم و شعور اور اس کا شوق و خلوص بھی ایک اہم عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح ہیئت کا مطلب اظہار کی وہ شکل ہے جس میں ادیب اپنے جذبات و تجربات اور مشاہدات و خیالات پیش کرتا ہے۔ ہیئت کے اندر مانوس و موثر طریق نگارش اور طرزِ ادا بھی داخل ہے۔ اندازِ بیان کی اثر پذیری اور طرزِ ادا کے حسن میں زبان کی موزونیت، اس کی صحت اور بیان کی شگفتگی و لطافت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس اعتبار سے ہیئت کا دائرہ اپنے اندر بہت سی خصوصیات کو سمیٹ لیتا ہے۔

مواد اور موضوع دو مختلف چیزیں ہیں۔ ان دونوں میں کسی قدر فرق ہے۔ مواد کسی تخلیق کے پورے ڈھانچہ کو کہتے ہیں اور موضوع اس کی اصل یا روح کو کہتے ہیں۔ اصل موضوع کو فنکار جس طرح ترتیب دیتا ہے اور اس کے ذہن میں وہ جس طرح تشکیل پاتا ہے دراصل وہی مواد ہے۔ مواد میں عام طور سے زندگی کے تجربات اور مشاہدات ہوتے ہیں۔ ادیب کی شخصیت، اس کی صلاحیت اور اس کے شعور و احساس کے لحاظ سے ان کا دائرہ محدود یا وسیع ہوتا رہتا ہے۔ ادیب کا علم جتنا وسیع، اس کا قد و قامت جتنا بلند اور اس کی خلاقانہ قوت جتنی زبردست ہوگی، اس کا تجربہ اتنا ہی عظیم ہوگا۔ مثال کے طور پر عشق و محبت کے موضوعات پر بہت سی مثنویاں ملتی ہیں۔ نظامی گنجوی کی یوسف زلیخا کا موضوع بھی یہی ہے۔ لیکن اس کے اور دوسری مثنویوں کے مواد میں خاصا فرق نظر آتا ہے۔ اس فرق کی اصل وجہ ادیب کی شخصیت کے زیادہ قد آور اور کم قد آور ہونے میں مضمر ہے۔ یہ تفاوت فنکار کی تخلیقی قوت کی مکمل بیداری اور ناقص بیداری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جس طرح ہر ادیب کی خلاقانہ صلاحیت کامل درجہ کی نہیں ہوتی، اسی طرح یہ صلاحیت ہمہ وقت مکمل طور پر بیدار بھی نہیں رہتی۔ ـــــ یہی وجہ ہے کہ **سبعہ معلقات** کے شاعروں نے عربی میں اور بھی اچھے قصائد کہے مگر وہ **سبعہ معلقات** کے پایہ کو نہیں پہنچ سکے۔ اردو میں منشی پریم چند نے ایک سے ایک بہتر کہانی لکھی لیکن ہر کہانی "کفن" کا درجہ حاصل نہ کر سکی۔ اسی لیے خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں کہ تخلیقی جوہر عام طور پر دبا ہوا یا سویا ہوا ہوتا ہے، جب پورے طور پر بیدار ہوتا ہے تو ادب پارہ وجود میں آتا ہے یا کوئی شعری یا نثری تحریر مکمل تخلیق بنتی ہے۔[1]

---

[1] زاویہ نگاہ، صفحہ ۱۵

ادیب کی شخصیت، افتادِ طبع، علمی وسعت اور خلاقانہ قوت ہی سے اس کا ذہنی تجربہ غذا حاصل کرتا ہے اور پرورش پاتا ہے۔ پھر ذہنی تجربہ کا سہارا لے کر ہیئت وجود میں آتی ہے۔ تجربہ اور تخیل کو ہیئت کے پھیلاؤ اور اس کی تنگی میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ تخیل اور تجربہ کے محرکات کی وسعت اور ہمہ گیری سے ہیئت میں کشادگی پیدا ہوتی ہے۔ اگر ان کا دائرہ محدود رہتا ہے تو ہیئت لامحالہ تنگی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ذہنی تجربہ مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ وہ کبھی رباعی کبھی مثنوی اور کبھی مرثیہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور کبھی افسانہ و ناول کی ہیئت میں جلوہ گری کرتا ہے۔ اُردو میں طوائف کے موضوع پر بہت سے ادیبوں نے قلم اٹھایا ہے۔ ان میں مرزا ہادی رسوا اور سعادت حسن منٹو بھی شریک ہیں۔ ان دونوں کا موضوع اگرچہ مشترک ہے مگر ایک کا ذہنی تجربہ ناول میں صورت پذیر ہوتا ہے اور دوسرے کا افسانہ کی شکل میں نمو پاتا ہے۔

مواد اور ہیئت باہمی طور پر ایک دوسرے سے متحد ہیں۔ یہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب ادیب مواد کے بارے میں فکر کرتا ہے تو اسی کے ساتھ ہیئت بھی ذہن میں آتی ہے۔ مواد اور ہیئت مل کر ہی اجتماعی طور پر ادب کی تخلیق سرانجام دیتے ہیں۔ ادیب کے ذہن میں تشکیل پاتے وقت، مواد اپنی نوعیت کے اعتبار سے خود ایک مخصوص ہیئت اختیار کرنے لگتا ہے اور فطری طور پر کسی مناسب سانچہ میں ڈھل جاتا ہے۔ ہیئت کی تلاش میں ادیب کو زیادہ سرگرداں ہونا نہیں پڑتا۔ احساسات اور تجربات اپنی ضرورت کے مطابق خود موزوں صورت کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ ادیب کے شعور و احساس اور اس کے تجربے سے ہیئت کا گہرا تعلق ہے۔ ہم اسے کسی مخصوص خیال کے لیے کوئی مخصوص سانچہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ متعلقہ خیال کے لیے جو شکل اور صورت اسے سب سے زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے وہ اسی کو اختیار کرتا ہے۔ اس کی تمام تر کوششوں کا ماحصل دوسروں تک اپنے تجربات بہتر سے بہتر شکل میں پہنچانا ہوتا ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ تجربات و مشاہدات اس بات کے محتاج نہیں ہوتے کہ وہ اسی لباس اور پوشاک میں پردۂ ظہور تک آئیں جو پہلے سے ادیب نے اُن کے لیے تیار کر رکھی ہے۔ وہ اپنی راہ خود بناتے ہیں اور جس لباس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اسی کو زیب تن کر لیتے ہیں۔

مواد اور ہیئت کے باہمی ربط اور ان کے فطری تعلق کو ممتاز شیریں[۱] نے بڑے اچھے ڈھنگ سے واضح کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کوئی برتن بنانا ہو تو پہلے مٹی چاہیے۔ یہ خام مواد ہوا پھر اس میں رنگ ملایا جائے گا۔ یہ اسلوب تحریر ہے۔ پھر کاریگر (فنکار) اسے اچھی طرح گوندھ کر لیے توڑتا مروڑتا ہے۔ کہیں دباتا ہے اور کہیں کھینچتا ہے۔ کسی حصہ کو گول اور کسی کو چوکور کرتا ہے۔ اس میں کہیں لمبائی لاتا ہے اور کہیں گہرائی پیدا کرتا ہے۔ غرض ایک مخصوص شکل کے آنے تک اسی طرح ڈھالتا جاتا ہے۔ ٹکنک کے لیے یہ ایک موٹی تشبیہ ہے اور آخر میں جو شکل نکل آئی وہ ہیئت ہوئی، اور جو چیز بنی وہ فن پارہ کہلائی۔

اس مثال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مواد اور ہیئت میں وحدت کا ہونا ناگزیر ہے۔ صحیح ادب اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جبکہ مادّہ اور صورت میں ہم آہنگی ہو۔ اگر ان میں صحیح تناسب اور فطری ربط قائم نہ ہو سکے گا تو اعلیٰ ادب کی تخلیق ممکن نہ ہو سکے گی۔ اعلیٰ ادب اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب ادیب اپنے تخیلات، تجربات اور مشاہدات کو پوری طرح پروان چڑھنے کا موقع دیتا ہے اور تخلیقی عمل کو بھرپور طور پر انجام تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ تخلیقی عمل کی کامیابی کے لیے عمیق مشاہدہ، گہری معلومات اور تیز تخیل اگرچہ ضروری عناصر ہیں لیکن اصل دارومدار اس بات پر ہے کہ مشاہدات اور تجربات کا نشو و نما فطری طریقہ پر ہو۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی لازمی ہے کہ مواد اور ہیئت ایک عضویاتی کُل کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئیں۔ تخلیقی عمل چونکہ کلی طور پر ہوتا ہے اس لیے اس میں تمام جزئیں باہمی اشتراک کے ساتھ ترقی کرتی ہیں اور پھر مواد خاص تکنیک

[۱] ٹکنک کا تنوع۔ ممتاز شیریں

آہنگ، علامات اور استعارات وغیرہ کے ساتھ ایک مخصوص ہیئت میں صفحۂ قرطاس پر ظاہر ہوتا ہے۔

ادب کی تخلیق کے لیے ذوق کی تربیت اور تجربہ و مشاہدہ کی پرورش بھی ایک ضروری شرط ہے۔ ناقص تجربہ اور خام ذوق کی وجہ سے تخلیق میں نقص پیدا ہو جاتا ہے اور مواد و ہیئت میں وہ ناگزیر تعلق اور فطری ربط پیدا نہیں ہو پاتا جس سے ان میں وحدت قائم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر مولوی نذیر احمد کے ناولوں کو لیجیے۔ وہ ناول تو ہیں لیکن تجربات اور مشاہدات کے مکمل نشو ونما کے فقدان اور تخلیقی عمل کے خام حالت میں انجام پانے کی وجہ سے تشنہ ہیں۔ ان کے اندر مواد اور ہیئت میں وہ یگانگت نظر نہیں آتی جو حقیقت میں ہونی چاہیے۔ ایسا شاید اس لیے ہوا کہ مولوی نذیر احمد سے پہلے اور ان کے عہد میں تنقید کا صحیح شعور کم تھا۔ اُدبا اور ناقدین مواد اور ہیئت کو الگ الگ دو چیزیں تصور کرتے تھے۔ اسی ثنویت اور علیحدگی کے تصور کی بنا پر ناقدین افراط و تفریط میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ہمارے متقدمین میں ایک طبقہ ایسا گزرا ہے جو صورت اور ہیئت کی اہمیت کا زیادہ قائل تھا۔ یہ معنی اور مواد سے کوئی خاص سروکار نہ رکھتا تھا۔ علامہ ابن خلدون، قدامہ ابن جعفر اور بعض دوسرے لوگ اس طبقہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ علامہ ابن خلدون کے نزدیک الفاظ کی حیثیت پیالہ جیسی ہے اور معانی کا درجہ پانی کے مانند ہے۔ پانی کو خواہ سونے کے پیالہ میں بھر دیا جائے اور چاہے چاندی کے پیالہ میں۔ اسی طرح اس کے لیے بلور یا سیپ کا پیالہ استعمال کیا جائے خواہ مٹی کا۔ ان کی وجہ سے پانی کی ذات میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ جس طرح سونے یا چاندی کے پیالہ میں پانی کی قدر بڑھ جاتی ہے اور مٹی کے پیالہ میں گھٹ جاتی ہے، اسی طرح ماہر اور فصیح ادیب اپنے الفاظ و بیان سے معانی کی قدر کو بڑھا دیتا ہے اور غیر فصیح کے یہاں اُن کی اوقات گھٹ جاتی ہے۔[1]

قدامہ ابن جعفر نے اپنی مشہور تصنیف نقد الشعر میں لکھا ہے کہ شعر ایک موزوں اور مقفّیٰ قول ہے جو کسی معنی پر دلالت کرتا ہے۔ شعر کا موضوع ادنیٰ ہو یا اعلیٰ، اس کا اعلیٰ طور پر ادا ہو جانا ہی شعر کا کمال ہے۔ اپنے اس دعوے کی تائید میں وہ بڑھئی اور سُنار کی مثال پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہوشیار اور ہنرمند بڑھئی ایک کمزور اور پرانی لکڑی سے بھی ایک نفیس اور خوبصورت میز بنا سکتا ہے اور اسے حسین شکل دے کر اپنی کاریگری کی داد حاصل کر سکتا ہے۔ اسی طرح سونا کھرا ہو یا کھوٹا، جب ایک سلیقہ مند سُنار کے ہاتھ لگتا ہے تو وہ اسے اپنی تراش خراش اور زرگری کے سہارے ایک موزوں صورت عطا کرتا ہے۔ وہ اس میں آب و تاب پیدا کر کے لوگوں کی نگاہوں کو خیرہ کر دیتا ہے اور اپنی صناعی کا سکہ جما دیتا ہے۔ ابن وکیع بھی قدامہ کی تقلید کرتے ہیں اور مواد و ہیئت کے رشتہ کو جسم اور لباس کے مانند قرار دیتے ہیں۔ اُن کا قول ہے "مَثَلُ المَعنیٰ بِالصُّورَۃِ وَاللَّفظِ بِالکِسوَۃِ" یعنی معنی و مواد کی مثال جسم جیسی ہے اور لفظ و ہیئت لباس کی طرح ہیں۔ جسم خواہ سڈول اور تندرست ہو یا لاغر اور نحیف، اگر لباس دیدہ زیب اور مناسب ہے تو اس سے جسم کی رونق اور شان و شوکت دوبالا ہو جائے گی۔ اس لباس کے اندر جسم بارعب اور پُر وقار معلوم ہوگا۔ لیکن اگر لباس ہی ڈھیلا ڈھالا اور بے ڈھنگا ہو تو پھر حسین سے حسین شخصیت بھی غیر جاذب نظر آئے گی۔ کوئی باذوق ناظر اس کے حسن سے متاثر نہیں ہو سکے گا۔

اردو میں مولانا حالی کے یہاں بھی اسی قسم کے خیالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ وہ علامہ ابن خلدون، ابن جعفر اور ابن وکیع سے پوری طرح متاثر نظر آتے ہیں۔ حالی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ لفظ اور معنی دو الگ الگ اکائیاں ہیں۔ لیکن بیان کی جادوگری اور الفاظ کی ساحری کے ساتھ ساتھ وہ معانی و مواد کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ معانی سے قطع نظر کرنا ان کے نزدیک ایک ناروا فعل ہے۔ اس سے ادیب کے خیالات محدود ہو جاتے ہیں اور وہ غیر معمولی ادب کی تخلیق سے قاصر رہتا ہے۔ ادب میں وسعت اور

[1] مقدمہ شعر و شاعری۔ صفحہ ۱۶۰۔ مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی

ندرت لانے کے لیے حالی نے معلومات میں وسعت پیدا کرنے، صحیفۂ فطرت کا مطالعہ کرنے اور قوتِ متخیلہ کے لیے مسالہ جمع کرنے پر زور دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں

"ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ شاعری کا مدار جس قدر الفاظ پر ہے اس قدر معانی پر نہیں۔ معنی کیسے ہی بلند اور لطیف ہوں اگر عمدہ الفاظ میں بیان نہ کیے جائیں گے، ہرگز دلوں میں گھر نہیں کر سکتے اور ایک مبتذل مضمون پاکیزہ الفاظ میں ادا ہونے سے قابلِ تحسین ہو سکتا ہے۔ لیکن معانی سے یہ سمجھ کر کہ وہ ہر شخص کے ذہن میں موجود ہیں اور ان کے لیے کسی ہنر کے اکتساب کی ضرورت نہیں، بالکل قطع نظر کرنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ اگر شاعر کے ذہن میں صرف وہی چند محدود خیالات جمع ہیں جن کو اگلے شعرا باندھ گئے ہیں یا صرف وہی معمولی باتیں اس کو بھی معلوم ہیں جیسی کہ عام لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں اور اس نے شاعری کی تکمیل کے لیے اپنی معلومات کو وسعت نہیں دی، اور صحیفۂ فطرت کے مطالعہ کی عادت نہیں ڈالی اور قوتِ متخیلہ کے لیے زیادہ مسالہ جمع نہیں کیا، گو زبان پر اس کو کیسی ہی قدرت اور الفاظ پر کیسا ہی قبضہ حاصل ہو، اس کو دو شکلوں میں سے ایک شکل ضرور پیش آئے گی۔ یا تو اس کو وہی خیالات جو اگلے شعرا باندھ چکے ہیں تھوڑے تھوڑے تغیر کے ساتھ انھیں کے اسلوب پر بار بار باندھنے پڑیں گے یا ایک ایک مبتذل اور پامال مضمون کے لیے نئے نئے اسلوبِ بیان ڈھونڈنے پڑیں گے۔[1]"

حالی کے بعد اس نظریۂ ثنویت کو نفسیاتی تنقید کے علمبرداروں نے اپنایا۔ یہ لوگ بھی مواد اور ہیئت اور موضوع و طرزِ بیان کی وحدت سے بیگانہ رہے۔ اس بیگانگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ہیئت ہی کو سب کچھ سمجھ لیا اور تخلیقی عمل میں مواد و ہیئت کے صحیح رشتہ کو برقرار نہ رکھ سکے۔ اس سلسلے میں میراجی کی مثال کافی ہوگی۔

تنقید کی دنیا میں ایک دوسرا طبقہ ہے جو مواد کی اہمیت کا زیادہ قائل ہے اور ہیئت کو ادب کی تخلیق میں کوئی خاص درجہ نہیں دیتا۔ اردو کے اندر اس ضمن میں اختر حسین رائے پوری اور پروفیسر احتشام حسین وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ یہ لوگ پہلے اس بات کو دیکھتے ہیں کہ فنکار یا ادیب کیا کہتا ہے۔ کس طرح کہنے کا سوال ان کے یہاں بعد میں آتا ہے۔ یہ ہر حال میں مواد کو ہیئت پر فوقیت دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں مقصدیت اور افادیت کو اولین مقام حاصل ہے۔ فن کے نکات اور الفاظ کی ہیئت کی یہ زیادہ پرواہ نہیں کرتے۔ "ادب اور انقلاب" اور "ادب اور سماج" میں اسی نقطۂ نظر کی وضاحت ملتی ہے۔

مواد اور ہیئت کی اس ثنویت اور تقسیم سے ادب کو نقصان اٹھانا پڑا اور بہت سا غیر ادب بھی ہمارے ادبی سرمایہ میں داخل ہو گیا۔ ایسا اس لیے ہوا کہ جن لوگوں نے ہیئت پر زور دیا وہ فکر و خیال کا حق ادا کرنے سے قاصر رہے۔ ان کی تمام تر توجہ پیرہن کی زیب و زینت پر مرکوز رہی اور انھوں نے اسی کو زیادہ سے زیادہ دلکش و خوشنما بنانے میں محنت صرف کی۔ اس کی وجہ سے ادب میں صناعی اور کاریگری تو پیدا ہوئی، اور ہر بڑا فنکار بقول میر انیس یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ثابت ہوا:

تعریف میں چشمہ کو سمندر سے ملا دوں	قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرّے کی چمک مہرِ منوّر سے ملا دوں	کانٹوں کو نزاکت میں گلِ تر سے ملا دوں

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

لیکن ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کے باوجود ادب میں دبیت اور پائیداری پیدا نہ ہو سکی اور وہ تخلیقی جوہر سے خالی رہا۔ وجہ ظاہر ہے۔ ایک کمزور اور پرانی لکڑی سے خوبصورت میز تو ضرور بن گئی مگر اس میں مضبوطی اور پائیداری کہاں سے آتی۔ نقلی اور خراب سونے کے زیورات پر اصلیت کا گمان تو ہوا اور کم عیاروں نے دھوکا بھی کھایا لیکن جن میں سونا پرکھنے کا جوہر موجود تھا وہ اس کے فریب میں نہ آسکے۔ پھر ظاہری حسن کے شیدائیوں کے نزدیک

[1] مقدمہ شعر و شاعری، صفحہ ۱۶۰-۱۶۱، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی

بلور کے صاف و شفاف پیالے میں پانی بے شک وقعت کی نگاہوں سے دیکھا گیا لیکن حقیقت میں نگاہوں میں آب حیات کی قدر و قیمت اس لیے کم نہیں ہوئی کہ وہ مٹی کے پیالے میں رکھ دیا گیا ہے۔ بہر حال اچھے ادب کے لیے اچھے مواد کا ہونا لازمی ہے۔ اس کے بغیر کسی ادبی تخلیق کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ صورت اور ہیئت کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔ چنانچہ جن ادیبوں نے مواد ہی کو سب کچھ سمجھا اور ہیئت کو نظر انداز کیا۔ وہ عمدہ اور اعلیٰ ادب کی تخلیق میں خاطر خواہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے یہاں نظریات اور خیالات کا غلبہ ہے اور ادب مغلوب ہے۔ اس سے ادب میں حرارت، مقصدیت جوش اور خطابت کے عناصر تو ضرور شامل ہو گئے لیکن ادب کے اصل جوہر سے ہاتھ دھونا پڑا۔ نمونہ کے طور پر "یلغار" نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو:

اب آؤ منحوس زرگری کی نقصانِ ظلم و ستم مٹا دیں
جو ارتقا میں ہمارے حائل ہیں توپخانے انھیں ہٹا دیں
نگاہ کی بجلیوں سے بارود کے خزانوں کا دل جلا دیں
بجھا دیں خوں کے چراغ محفل سے زہرابِ غم اٹھا دیں
نہیں ہے جیون سے پیار، مرنے سے انکار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

ادب کی تخلیق میں نہ تنہا مواد کی کوئی اہمیت ہے اور نہ محض ہیئت کا کوئی مقام بلکہ ان دونوں کے ناگزیر ربط، حسین امتزاج اور متوازن اشتراک سے ہی اعلیٰ، پائیدار اور صحت مند ادب جنم لیتا ہے۔ اسی لیے تنقید کا صحیح شعور رکھنے والے ناقدین مادہ اور صورت میں چولی اور دامن یا مٹی اور پیالہ کا تعلق بتلاتے ہیں۔ اس بارے میں سب سے زیادہ مستحکم اور متوازن خیال ابن رشیق کے یہاں ملتا ہے وہ اپنی شہرۂ آفاق کتاب "العمدۃ" میں لکھتے ہیں:

اَللَّفظُ جِسْمٌ وَرُوحُهُ المَعنیٰ وَارتِبَاطُهُ بِهٖ کَارتِبَاطِ الرُّوحِ بِالجِسمِ يَضعُفُ بِضَعفِهٖ وَيَقوىٰ بِقُوَّتِهٖ [1]

اس عربی عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ "لفظ" کی حیثیت جسم کے مانند ہے اور معنی، اس کی روح ہے۔ دونوں کا باہمی رشتہ ایسا ہے جیسا کہ جسم اور روح کا رشتہ ہے۔ ایک کی کمزوری سے دوسرا کمزور اور ایک کی قوت سے دوسرا قوی ہوتا ہے۔

ابن رشیق نے لفظ اور معنی یا ہیئت اور مواد دونوں کو ادب کی تخلیق کے لیے لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ اصل حقیقت یہی ہے کہ جس طرح روح اور جسم کا باہمی ربط ایک زندہ اور متحرک شخص کے لیے لازمی ہے اسی طرح زندہ اور متحرک ادب کا وجود مواد اور ہیئت کے باہمی اشتراک و ارتباط کے بغیر ناممکن ہے۔ الفاظ کے جسم سے معانی کی روح نکال لی جائے تو ادب بے جان ہو جائے گا اور روحِ معانی سے الفاظ کا جسم چھین لیا جائے تو اس کی مثال بہرے اور گونگے شخص جیسی رہ جائے گی۔ مواد و ہیئت میں اسی توازن و اعتدال اور ان میں فطری تعلق اور ناگزیر ربط کا احساس پروفیسر آل احمد سرور کے یہاں واضح طور پر ملتا ہے۔ وہ نہ محض صورت کے پرستار ہیں اور نہ مطلق معنی کے غلام۔ وہ اگرچہ یہ جانتے ہیں کہ "ادب میں جان زندگی سے ایک گہرے اور استوار تعلق سے آتی ہے، لیکن ادب میں ادبیت پہلے دیکھتے ہیں، بعد میں کچھ اور۔ ادب میں ادبیت کے لیے ضروری ہے کہ ادیب کو تخلیقی عمل کا صحیح ادراک حاصل ہو اور وہ لفظ و معنی کی یگانگت سے آشنا ہو"۔ "نئے اور پرانے چراغ" اس ادراک کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اس معاملہ میں رشید احمد صدیقی اور خلیل الرحمن اعظمی وغیرہ بھی ابن رشیق کے ہم خیال ہیں۔ ان کی مختلف تصانیف سے ان کے خیالات کی تائید ہوتی ہے۔

کوئی بھی خیال یا فکر جب کسی فنکار کے ذہن میں آتا ہے تو وہاں وہ پہلے پرورش پاتا ہے اور پروان چڑھتا ہے۔ اپنے ارتقا کی منزلیں طے کرتے وقت یہ خیال مختلف الفاظ کا جامہ پہن کر ایک صورت اختیار کرنے لگتا ہے۔ خیال و فکر کا ارتقا اور اس کی صورت پذیری کا عمل الگ الگ نہیں ہوتا بلکہ بیک وقت ہوتا ہے۔ فکر اور

(بقیہ صفحہ ۸۰ پر)

[1] کتاب العمدۃ، صفحہ ۱۲۳

غزل

نہ موجِ بادہ، نہ زلفوں، نہ ان گھٹاؤں نے
مجھے ڈسا ہے مری شعلہ زا نواؤں نے

غمِ حیات سے ٹکرا کے گیت بن جانا
سکھا دیا ہے مجھے آپ کی دعاؤں نے

جو کج کلاہِ دیارِ طرب ہیں، سب کچھ ہیں
مجھے تو لوٹ لیا ہے مری وفاؤں نے

کبھی کبھی تو سنا ہے ہلا دیے ہیں محل
ہمارے ایسے غریبوں کی التجاؤں نے

تمھارا حسن ہو یا میری شاعری، ان کو
امر کیا ہے محبت کی آتماؤں نے

غمِ حیات و غمِ دل بہت سہی لیکن
کوئی سوال کیا ہے ابھی گھٹاؤں نے

کسی چمن ــــ کسی گل پیرہن کے گھر جائیں
مجھی کو تاک لیا مد بھری ہواؤں نے

عجیب بات ہے، میں جب بھی کچھ اداس ہوا
دیا سہارا حریفوں کی بد دعاؤں نے

میں بت کدوں سے مقابر میں گرنے والا تھا
مگر سنبھال لیا خوش نظر خداؤں نے

خبر ہے گرم کہ اک ترکِ لکھنؤ کو سلام
اسیر کر لیا دلی کی اپسراؤں نے

پھر اگست آیا ہے

مہدی بیرتا سگڈھی

پھر اگست آیا ہے، پیغامِ بہار آیا ہے — بن پیے آج تو رندوں کو خمار آیا ہے
فصلِ گل آگئی، کانٹوں پہ نکھار آیا ہے — قافلہ زیست کا جنت بہ کنار آیا ہے

نئے انداز سے ہم جشنِ بہاراں کرلیں
طائرِ ذوقِ سخن اپنا غزل خواں کرلیں

ہاں مگر زیست کا یہ موڑ بہت نازک ہے — ٹوٹ جائے نہ کہیں بیچ سے پھر گیت کی لَے
کہیں مستی میں چھلک جائے نہ پھر جام سے مَے — موج میں اپنی گنوا بیٹھیں نہ ہم قیمتی شے

طبلِ بیداریِ ہستی سے عبارت ہے اگست
یومِ آزادیِ بھارت کی ضمانت ہے اگست

اک محاسب کی طرح سامنے آتا ہے اگست — فرض کیا آپ کا ہے، یاد دلاتا ہے اگست
اک اک ذہن کو آئینہ دکھاتا ہے اگست — کتنے بھولے ہوئے افسانے سناتا ہے اگست

لغزشیں ماضی کی دہرائی نہ جائیں اب کے
ہم کسی غیر کا احساں نہ اٹھائیں اب کے

کچھ اس انداز سے تعمیرِ گلستاں ہو جائے — ایک اک راہگذر رشکِ بہاراں ہو جائے
حکمتِ ذہنِ بشر ایسی نمایاں ہو جائے — گردشِ وقت جسے دیکھ کے حیراں ہو جائے

راہ دشوار سہی، دل میں ہو جب عزم جواں
راستہ روک نہ پائے گا کبھی کوہِ گراں

بادِ مسموم چمن سے نہ گزرنے پائے — کوئی غنچہ نہ کسی شاخ پہ مرنے پائے
کسی تخریب کا سراب نہ ابھرنے پائے — کوئی ہنگامہ یہاں رہ نہ ٹھہرنے پائے

پاسباں تم جو وطن کے ہو تو بیدار رہو
تم پہ لازم ہے کہ ہر لمحہ خبردار رہو

پھر اگست آیا ہے، پھر رقص میں جام آیا ہے — ہر طرف امن و مسرت کا پیام آیا ہے
پھر ہمیں زیست کی قدروں کا سلام آیا ہے — غور و فکر کا پھر آج مقام آیا ہے

عام ہے دیش میں ہر سمت اگر حسنِ عمل
چپے چپے پہ نظر آنے لگیں تاج محل

شمارہ نمبر ۱۸۹۵ انک

رتن سنگھ

اپنی اپنی زندگیوں کا بوجھ اپنے سروں پر لادے خانہ بدوشوں کا کارواں سورج کی دھوپ کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ وہ کارواں ایسی جگہ پر پڑاؤ کرنا چاہتا ہے، جہاں دھوپ ہو، زندگی کی گرمی ہو، ہری بھری گھاس ہو، کسی ندی کا کنارہ ہو، جہاں زندگی بہتے پانی کی طرح رواں دواں رہ سکے۔

لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ کبھی ندی کا کنارہ نہیں ہوتا تو کبھی ہری بھری گھاس نہیں ہوتی۔ اور اگر یہ دونوں چیزیں کہیں ایک ساتھ مل بھی گئیں تو سورج کی دھوپ نہیں ہوتی۔

صبح جب انھوں نے پہاڑ کے غار کے اندھیرے سے باہر نکل کر اپنے سفر کا آغاز کیا تھا تو مطلع ابر آلود تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی جس کی ٹھنڈک ان کے جسموں کو تیخ کیے دے رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ چلتے پھرتے جاندار انسان نہیں، لمبے لمبے برف کے تودے ہوں، جن کو تیز ہوا اپنی لپیٹ میں لیے کسی سمت بہائے لیے جا رہی ہو۔

اور وہ چلے جا رہے تھے۔ ان کے سروں پر ان کی زندگیوں کا بوجھ تھا اور اس بوجھ کے مارے ان کے سر جیسے پتھر کے ہو گئے تھے، جیسے انھیں احساس ہی نہیں تھا کہ جب سر پر بوجھ ہوتا ہے تو درد ہوتا ہے، درد ہوتا ہے تو آدمی ہائے کرتا ہے اور یہ ہائے دل سے ہوک بن کر اٹھتی ہے تو ہونٹ کانپ اٹھتے ہیں۔ اور ہونٹ تب کانپتے ہیں جب زبان پتھر کی ہو جاتی ہے اور گلا رندھ جاتا ہے۔ اور پھر ہونٹوں سے آواز نکل کر فضا میں پھیلنے سے پہلے انسان کے چہرے پر بل چلاتی ہے تو نرم نرم گالوں پر اور حسین ماتھے پر جو نقش ابھرتے ہیں تو چہرے کی شکل ہی بدل جاتی ہے، آدمی ہی بدل جاتا ہے اور اسے اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ انسان کے درد بھرے چہرے کو چھو کر جب ہوا آگے بڑھنے لگتی ہے تو ہوا کے بھی درد ہونے لگتا ہے۔ اور اس طرح انسان کا درد ساری فضا، ساری کائنات میں پھیل جاتا ہے، اور درد کے مارے ہوا چیخ اٹھتی ہے تو اس کی چیخ کو سن کر وہ درد کا مارا انسان خوف سے کانپ اٹھتا ہے۔

لیکن اس کارواں کے انسانوں کے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ جیسے وہ تمام احساسات اور جذبات سے عاری ہو گئے تھے۔ وہ تو صرف آگے بڑھتے جا رہے تھے، اس امید میں کہ بادل چھٹیں گے، آسمان پر سورج نمودار ہوگا اور اس کی دھوپ کائنات میں پھیلے گی۔ اس دھوپ میں گرمی ہوگی، جس کا لطف وہ زندگی میں پہلی بار اٹھانا چاہتے تھے وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ سورج کتنا عظیم ہوتا ہے، دھوپ کتنی حسین ہوتی ہے اور اس کی گرمی کتنی لطیف ہوتی ہے۔

سفر کے آغاز کے وقت ان کے خدا نے ان کو بشارت دی تھی کہ اے انسانو! تم زندگی کے سفر پر چل دو۔ چل دو اس زمین پر اور بکھر جاؤ اس زمین کے شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک اور ایک دن ایسا آئے گا جب سورج، اس کی دھوپ اور اس کی گرمی تمھاری زندگیوں کو روشن کر دے گی۔

اور وہ تب سے چل رہے ہیں۔ راستے میں بڑے بڑے جنگل آئے۔ بڑے بڑے پہاڑ آئے۔ گہری کھائیاں آئیں۔ اور وہ سب کو پار کرتے چلے آئے ہیں۔ ان مشکلوں سے گزرتے ہوئے ان کے ہزاروں لاکھوں ساتھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ لیکن کارواں والوں نے اپنے

سفر کو نہ روکا۔ وہ اسی جگہ پڑاؤ کرنا چاہتے ہیں جہاں سورج ہو، دھوپ پڑ رہی ہو۔

اور ابر نہیں چھٹتا۔ کبھی کبھی ابر چھٹتا ہے۔ دور بہت دور ذرا دیر سورج کی دھوپ دوری پہ نظر آتے ہی ان کی تھکی آنکھوں میں روشنی آجاتی ہے۔ ان کے بے جان وجود میں جان آجاتی ہے اور وہ اپنے سروں پر زندگیوں کا بوجھ اٹھائے اس دھوپ کی طرف دوڑتے ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ جیسے ہی وہ دھوپ کے قریب پہنچتے ہیں تو کالا ابر پھر کہیں سے ان کے آسمان پر آکر پھیل جاتا ہے اور دھوپ دور بھاگ جاتی ہے۔

آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ کارواں والوں نے دیکھا کہ قریب ہی دھوپ ان کی آنکھوں کے سامنے، قریب ایک فرلانگ کے فاصلے پر موجود ہے۔ وہاں ریل کی پٹری پر ریل دھوپ میں نہائی ہوئی، خوشیوں سے سیٹیاں دیتی ہوئی تیز تیز دوڑتی جا رہی تھی۔

قافلے والوں کے چہروں پر دھوپ کی طرح کی روشنی چمک اٹھی۔ اس سے پہلے چونکہ انھوں نے دھوپ کو اتنے قریب سے نہیں دیکھا تھا اس لیے جیسے جیسے وہ تیز تیز قدموں سے دھوپ کے نزدیک ہو رہے تھے ویسے ویسے ان کے چہروں سے ان کے سفر کا درد مٹ رہا تھا۔

یہاں تک کہ وہ دھوپ ایک قدم پرے رہ گئی۔ قافلے والوں نے اپنے سروں پر سے اپنا اپنا بوجھ اٹھا کر زمین پر گرانے کے لیے بازو اٹھائے۔ بوجھ کو اپنے اپنے بازوؤں پر تولا اور قریب تھا کہ اسے چمکتی دھوپ میں گرا دیں، اسی وقت بادل ایک مرتبہ پھر کہیں سے آئے اور آن کی آن میں دھوپ اس طرح دور بھاگ گئی جیسے ریل کی گاڑی ان کی نظروں سے کب کی دور ہو چکی تھی۔

اب پھر وہ قافلے والے ہیں، ان کی زندگیوں کا بوجھ ہے۔ اور ان کے درد بھرے چہرے ہیں، جس کی عکاسی اس وقت مشکل ہو رہی ہے کیونکہ اب حدِ نظر تک بادل ہی بادل ہیں۔ کالے گھنے بادل اور دھوپ کا کوئی نشان باقی نہیں رہا ——— لیکن وہ مایوس نہیں، ان کا عزمِ سفر جوان ہے اور وہ پر امید ہیں کہ ایک نہ ایک دن بادل چھٹیں گے اور دھوپ نکلے گی ——— ندی کا کنارہ بھی ہوگا اور ہری بھری گھاس بھی۔

★

شمارہ ۹۵ ۱۸ اشک

کرشن بہاری نور

ہمارا دھرم

ہمارے دھرم کے پھیلاؤ پر نظر ڈالو
ہمارا دھرم محبت ہے اے وطن والو

○

ہمارے دھرم کے پیغمبروں کی صف ہے بڑی
اشوک، اکبر و گوتم بخاری و خلجی
رفیع، جوہر و اقبال، نہرو و گاندھی
کبیر، خسرو و چیتنیہ نانک اور چشتی
یہ چند نام جو یاروں زباں پہ آتے ہیں
ذرا بتاؤ یہ اپنے ہیں یا پرائے ہیں
ہر اک نے گیت مساوات ہی کے گائے ہیں
چراغ پیار کے کس نے نہیں جلائے ہیں

○

ہمارے دھرم کی سیما کوئی نہ حد بندی
نہ کوئی ہندو نہ مسلم نہ سکھ نہ عیسائی
کوئی بھی موڑ نہیں اتنی راہ ہے سیدھی
ہر اونچ نیچ نشیب و فراز سے خالی
نہ یہ غرض کے لیے ہے نہ یہ طلب کے لیے
نہ بس عجم کے لیے ہے نہ بس عرب کے لیے
نہ ایک نسل کی خاطر نہ اک نسب کے لیے
ہیں آفتاب کی کرنیں زمیں پہ سب کے لیے

○

کیا ہوا جو چلے دیکھ کر غریب امیر
وہ کیا صبا جسے پہنا سکے کوئی زنجیر
وہ کیا بہار جو سوچے یہ شاہ ہے یہ فقیر
وہ کیا گھٹا کہ جسے روک لے کوئی رہگیر
ہوا محل کے لیے ہے نہ جھونپڑی کے لیے
صبا ہمارے لیے ہے نہ آپ ہی کے لیے
بہار آتی نہیں ایک آدمی کے لیے
گھٹا ٹھہر کے برستی نہیں کسی کے لیے

○

نگاہ اپنی جگہ ہے خیال اپنی جگہ
صدی ہے اپنی جگہ ماہ و سال اپنی جگہ
مسرت اپنی جگہ ہے ملال اپنی جگہ
فراق اپنی جگہ ہے وصال اپنی جگہ
کبھی بھی رات کا حق چھینتی نہیں ہے سحر
کسی کے پاؤں پکڑتی نہیں ہے راہ گزر
جسے بھی دیکھو چلا جا رہا ہے اپنی ڈگر
کہ اپنی اپنی حدوں پر ہر ایک کی ہے نظر

○

○

زمانہ کہتا ہے اے دوست جس کو جشن بہار
ہمارا دھرم مناتا ہے سال میں دو بار
بہت بلند ہے چھبیس جنوری کا وقار
بڑا حسین ہے پندرہ اگست کا تہوار
ہمارے پاس یقین وعمل کی طاقت ہے
خلوص، پیار، اہنسا، وفا، صداقت ہے
یہاں غریب نہ ہے وہ جس کے پاس دولت ہے
یہاں رئیس ہے وہ جس میں آدمیت ہے

○

بہار دیوی ہے اپنی تو دیوتا بادل
ہماری آنکھ کے آنسو ہی ہم کو گنگا جل
ہمارے مندر و مسجد اجنتا تاج محل
ہمارے کعبہ و کاشی ہیں ٹرامبے ننگل
ان آئینوں میں ذرا عکس آگہی دیکھو
جفا کشی کے چراغوں کی روشنی دیکھو
جو غم کے بعد ملی لب کو وہ ہنسی دیکھو
اسیر کرلی جو ہم نے وہ زندگی دیکھو

○

یہاں چراغ کدورت کے جل نہیں سکتے
مصیبتوں میں ارادے بدل نہیں سکتے
حسد میں، بغض میں، نفرت میں ڈھل نہیں سکتے
یہ کھوٹے سکے کسی طرح چل نہیں سکتے
مزہ تو جب ہے کہ ہم پہ تمہارا قابو ہو
تمہاری آنکھ میں جب ہو ہمارا آنسو ہو
وہی ہے پھول کہ جس میں مہک ہو خوشبو ہو
لہو رگوں کا مسلمان ہو نہ ہندو ہو

○

کسی کو مار کے کچھ روز جی لیے تو کیا
کسی کو روک کے آگے اگر بڑھے تو کیا
کسی کے لب کی ہنسی چھین کر ہنسے تو کیا
ضمیر بیچ کے جنت بھی پا گئے تو کیا
مزہ تو جب ہے کہ اپنا وطن ہی جنت ہو
غلط نہ صرف ہو جو بازوؤں میں طاقت ہو
حصولِ زیست مشقت ہو اور محنت ہو
یہی ہو پوجا ہماری یہی عبادت ہو

○

مراد یہ ہے نہ کوئی کسی کا دشمن ہو
مراد یہ ہے کسی قسم کا نہ بندھن ہو
مراد یہ ہے کوئی فکر ہو نہ الجھن ہو
مراد یہ ہے کہ سکھ شانتی کا جیون ہو
دعائیں کیجیے شب ختم ہو سحر آئے
ہر ایک بھٹکا ہوا اپنی راہ پر آئے
بہار چل دی ہماری طرف خبر آئے
جدھر نگاہ اٹھے زندگی نظر آئے

ہمارے دھرم کے پھیلاؤ پر نظر ڈالو
ہمارا دھرم محبت ہے اے وطن والو

★

شریمتی نیلی سین گپتا

یادش بخیر

۱۹۲۹ء کے وسط میں میرے شوہر سورگیہ جتیندر موہن سین گپتا ۶ ماہ کی سزا کاٹ کر جیل سے باہر آئے تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ ممکن ہے کہ وہ ایک ہفتہ کے اندر ہی پھر جیل چلے جائیں اس لیے میں ان کے ساتھ مسوری چلوں جہاں وہ کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ اپنے شوہر کے حسب خواہش میں مسوری چلنے پر تیار ہو گئی۔

کانگریس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو ان دنوں سخت بیمار تھے اس لیے وہ آرام کرنے کی غرض سے مسوری گئے ہوئے تھے۔ جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو پنڈت موتی لال نہرو نے بتایا کہ ایسے میں جب کہ باہر بہت سے کام کرنے ہیں میٹنگ کرنا اور گرفتار ہونا عقلمندی کے خلاف ہے اس لیے انھوں نے میٹنگ نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مسوری میں یہ معلوم ہوا کہ جواہر لال نہرو کو آزاد کر دیا گیا ہے اس لیے ہم لوگ جواہر لال نہرو سے ملنے اور آئندہ کے پروگرام کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کرنے الٰہ آباد چلے گئے۔

الٰہ آباد پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں معلوم ہوا کہ رہائی کے بعد گھر پہنچنے سے پہلے ہی جواہر لال نہرو کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اگلے دن ہم کمیٹی کے سبھی ممبران دوسرے لوگوں کے ساتھ جواہر لال نہرو سے ملنے جیل گئے اور ہمیں اس بات سے بے حد تکلیف پہنچی کہ جواہر لال جی سے ان کی بیوی کو بات کرنے کا شاید ہی ایک لمحہ میسر ہوا ہو۔

سفر اور مسلسل سفر

ہمارے الٰہ آباد کے ساتھیوں نے ہمیں دلی جانے کا مشورہ دیا جہاں یہ طے پایا کہ ہم دونوں ایک جگہ سے دوسری جگہ کے لیے اس وقت تک سفر کرتے رہیں جب تک کہ میرے شوہر گرفتار نہ کر لیے جائیں۔ کانگریس کو میٹنگ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ میٹنگ کا مطلب تھا گرفتاری ـــــ اور یہ کانگریس کے پروگرام کا ایک حصہ تھا۔

میرے شوہر نے دلی میں ایک جگہ تقریر کی لیکن انھیں گرفتار نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد ہمارا پروگرام کانپور جانے کا تھا۔ اس رات موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ باہر کسی جگہ جلسے کا انتظام کرنا ممکن نہ تھا اور کوئی اتنا بڑا ہال بھی نہ تھا جہاں جلسہ کیا جا سکے۔ اس لیے جلسہ ملتوی کرنا پڑا۔ تقریباً ایک مہینے تک ہم لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے رہے۔ کانپور، لکھنؤ، بمبئی، کراچی، حیدرآباد سندھ اور امرتسر کا چکر لگاتے رہے۔ جب ہم امرتسر پہنچے تو ہمیں معلوم ہوا کہ اسی صبح ڈاکٹر کچلو کو، جن کے یہاں ہم لوگ ٹھہرنے والے تھے، گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس لیے ہمیں کسی اور شخص کے گھر لے جایا گیا جہاں ایک بہت بڑا کمرہ تھا جس کے چاروں

طرف گیلری تھی۔ ہم جلسے کی تیاری کر رہے تھے کہ گیلری کی طرف لوگوں کی بھیڑ دیکھی۔ میرے شوہر بھی باہر پہنچے اور سبھی نوجوان اس جگہ سے باہر چلے گئے۔

جلیان والا باغ کا جلسہ

جلیان والا باغ میں جلسہ ہونے والا تھا۔ وہاں جاتے ہوئے راستے میں مجھے یہ خبر ملی کہ میرے شوہر گرفتار کر لیے جائیں گے۔ مجھے اس وقت تیز زکام تھا اور میں بہت پریشانی محسوس کر رہی تھی۔ مجھے امید تھی کہ میرے شوہر گرفتار نہیں کیے جائیں گے۔ جلسے میں مجھے ایک عورت بھی دکھائی نہیں دی۔

ہم جلیان والا باغ پہنچے۔ میرے شوہر نے تھوڑی ہی دیر تقریر کی تھی کہ وہ گرفتار کر لیے گئے اور انھیں جیل بھیج دیا گیا۔ میں ایک ہوٹل میں چلی گئی۔ اگلے دن میں اپنے شوہر سے ملنے جیل گئی جہاں باہر چند اچھے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ دوسری رات جب میرے شوہر سو رہے تھے تو ایک پولیس افسر نے انھیں جگا کر کہا کہ ان کی گرفتاری کا وارنٹ ہے۔ میرے شوہر نے جھنجھلا کر کہا کہ "کیا مذاق ہے میں گرفتار ہونے کے بعد جیل میں پڑا ہوں اور تم مجھے نیند سے جگا کر بتا رہے ہو کہ میری گرفتاری کا وارنٹ ہے۔" پولیس افسر نے بتایا کہ دلی میں انھوں نے جو تقریر کی تھی اس سلسلے میں ان کے پاس گرفتاری کا وارنٹ ہے۔ پولیس افسر نے یہ بھی بتایا کہ وہ انھیں اسی رات دلی لے جائیں گے۔ میرے شوہر نے مجھے اکیلا چھوڑ کر دلی جانے سے انکار کر دیا۔ پولیس افسر نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے ساتھ لیتے ہوئے اسٹیشن جائیں گے۔ میں نے اپنے شوہر کو "نیلی! نیلی! جلدی اٹھو" کہتے سنا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ رہا کر دیے گئے ہیں۔ تب انھوں نے مجھے بتایا کہ ہم لوگوں کو اسی وقت دلی جانا ہے۔ ہمیں ایک ساتھ سفر کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ دلی پہنچتے ہی میرے شوہر کو جیل بھیج دیا گیا اور میں اپنے ساتھیوں کے ہاں سول لائن چلی گئی۔

میری پہلی گرفتاری

اپنے کسی عزیز سے جیل میں ملنے کے لیے جانا ہمت اور حوصلے کا کام ہے۔ اس لیے میں نے باہر رہنے کے مقابلے میں جیل میں رہنے کا ارادہ کر لیا۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ میرے شوہر کو سخت سزا دی جائے گی اس لیے میں دلی نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ میرے دلی کے ساتھیوں نے ایک جلسے کا انتظام کیا جس کا مطلب گرفتاری تھا۔ جلسے کی کارروائی شروع ہونے ہی والی تھی کہ کسی نے پولیس پر ایک پتھر پھینکا۔ چند ہی منٹ میں سینکڑوں پولیس والے وہاں پہنچ گئے اور افراتفری کا عالم پیدا ہو گیا۔ کچھ وجوہ کے تحت میرے ساتھی فکرمند ہو گئے اور انھوں نے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ جب مجھے احساس ہوا کہ ہم لوگ جلسہ گاہ سے کہیں اور آ گئے ہیں تو میں نے پوچھا کہ آخر ہم نے ایسا کیوں کیا۔ میرے ساتھیوں نے بتایا کہ میرے شوہر جیل میں ہیں اور میرے لڑکے کلکتہ میں ہیں اس لیے وہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ میں گرفتار ہوں۔ اس پر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے ایک دوسرے جلسے کا انتظام کرنے کو کہا۔ جلسے کا انتظام کر کے وہاں سے بھاگ جانا بہت ہی شرمناک بات تھی۔ دو دن بعد ہم نے ایک اور جلسہ کیا۔ مجھے امید تھی کہ مجھے اسی وقت گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس لیے میں نے تقریر کے لیے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ میں اپنے شوہر سے یہ بھی دریافت نہ کر سکی تھی کہ میں تقریر میں کیا کہوں۔ اس لیے کہ انھیں جلسے کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ میں نے ایک مختصر تقریر کرنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ میرے پاس اور کچھ کہنے کو نہیں رہ گیا۔ اس کے باوجود مجھے گرفتار نہیں کیا گیا۔ میں نے کچھ بہت ہی خطرناک باتیں کہنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ جس سے پولیس کو مجھے گرفتار کرتے ہی بنے کہ میں اور میرے ساتھی گرفتار کر لیے گئے۔

میرے شوہر کو میری گرفتاری کی پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی اور جب میں ان کی کوٹھری کے سامنے سے گزری تو انھوں نے مجھ سے بات بھی کی۔ وہ بہت زیادہ فکرمند تھے۔ جیل کے افسران کا خیال تھا کہ میرے شوہر نوجوانوں کو سول نافرمانی کے لیے اکسائیں گے اس لیے انھیں چھوت کی بیماری والے قیدیوں کے واسطے مخصوص نئی عمارت میں رکھا گیا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں جیل کے افسران کو پتہ چلا کہ وہ جیل کے سبھی قوانین پر پابندی سے عمل کرتے ہیں۔ انھیں یہ اندازہ بھی ہوا کہ میرے شوہر مشکل اوقات میں ان کے لیے کافی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

جیل کی زندگی

مجھے اس کوٹھری میں رکھا گیا جہاں مسز آصف علی پہلے ہی سے موجود تھیں۔ اگلے دن ہمیں چاندی کی خوبصورت ٹرے اور چائے دانی وغیرہ میں چائے پیش کی گئی۔ اس پر مجھے تعجب ہونا قدرتی بات تھی۔ مسز آصف علی نے کہا کہ "یہ جیل کی طرف سے نہیں ہے۔" چونکہ میرے شوہر اور میں بعد لوں ہی جیل میں ہیں اس لیے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ گھریلو استعمال کے برتن وغیرہ بھی یہیں لے آؤں۔ اس سے کیا فائدہ ہوتا کہ یہ برتن چوری چلے جاتے۔ ایسا یہ کام تو آپ سے میں

دلی کی جیل میں بہت ہی گندگی تھی اور انتظامات بھی بہت ڈھیلے ڈھالے تھے۔ ہم سبھی قیدیوں پر ابھی مقدمے چل رہے تھے، اس لیے ہم لوگوں کو کچھ خاص مراعات حاصل تھیں۔ ہم لوگ دوپہر بعد مرد قیدیوں کے ساتھ والی بال کھیلتے تھے اور کمرے کے باہر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ ڈاکو قیدیوں کی تندرستی اور قد دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے پیروں میں لوہے کی کڑیاں اور زنجیریں بندھی ہوئی تھیں پھر بھی وہ آسانی سے گھوم پھر سکتے تھے۔ جہاں میں بیٹھا کرتی تھی وہیں وہ ورزش کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی تو میں سوچا کرتی تھی کہ اگر وہ مجھے دیکھ کر ناراض ہو جائیں اور تھپڑ مار دیں تو؟ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

دلی جیل انسانوں کے رہنے کے قابل نہیں تھی۔ ایک دن شام کو میرے شوہر نے میرے پاس پیغام بھیجا کہ میں اپنا سارا سامان لے کر ان کے پاس چلی آؤں۔ میں اور شریمتی آصف علی دونوں ان کے پاس گئے اور اس کا سبب دریافت کیا۔ میرے شوہر نے بتایا کہ "سبھی عورتوں کو لاہور جیل بھیجا جا رہا ہے اور میں وہاں تنہا رہ جاؤں گی اس لیے ہیڈ جیلر نے مجھے ایک ساتھ رہنے کی اجازت دے دی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس سے پہلے کہ ہیڈ جیلر کا خیال بدل جائے مجھے فوری آجانا چاہیے۔" پہلے تو میں نے یہ پسند نہیں کیا کہ میں شریمتی آصف علی کو چھوڑ کر جاؤں۔ لیکن شریمتی آصف علی نے کہا کہ چونکہ ایک دو دن میں وہ خود جانے والی ہیں اس لیے انھیں فوراً منتقل ہو جانا چاہیے۔

جب عورتیں لاہور چلی گئیں تو مجھے خبر ملی کہ انھیں عام مجرموں کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ جیل میں جو لوگ رہ گئے تھے وہ بہت ہی نالاں اور غصے میں تھے اور فوری بھوک ہڑتال کرنے والے تھے۔ میرے شوہر جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے ملے۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے بتایا کہ جلدی ہی سب کچھ ٹھیک کر دیا جائے گا۔ چنانچہ میرے شوہر نے سب سے بھوک ہڑتال نہ کرنے کی اپیل کی۔ میں اس سے پہلے کبھی جیل نہیں گئی تھی۔ ان دنوں سردی بہت پڑ رہی تھی۔ میرے شوہر کا خیال تھا کہ اگر بھوک ہڑتال ہو گئی تو اس وقت تک یہ ہڑتال جاری رکھنی پڑے گی جب تک کہ یہ مسئلہ حل نہ ہو جائے۔ جوان سال قیدی اسے کوئی خاص اہمیت نہ دیں گے لیکن ہمیں اسے جاری رکھنا ہوگا۔ اتفاق سے مسئلہ ایک ہی دن میں حل ہو گیا اور ہمیں صرف ایک دن تکلیف اٹھانی پڑی۔ مجھے یاد ہے سب سے پہلے تقریباً آٹھ بجے مجھے چاکلیٹ کا ایک ٹکڑا ملا تھا بعد میں ہلکی گرم چائے۔

جیل کے شب و روز

شروع میں جیل میں سونا بہت مشکل تھا اس لیے کہ ساری رات چاروں طرف تیز روشنی رہتی تھی اور پہرے دار "ہندو پانی" "مسلم پانی" کی آواز لگا کر شور کیا کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ہم سبھی اس کے عادی ہو گئے اور آرام کی نیند سونے لگی۔ جیل میں کوئی بات پردے میں نہیں رہتی۔ ایک دن میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ میں جب علی الصباح اٹھی میں نے اپنے بستر کے پاس ڈاکٹر اور ہیڈ جیلر کو پایا جو میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے جھجک سی محسوس ہوئی۔ ایک بار مجھے اپنے کچھ ساتھیوں سے جو ملاقات کے دن باہر آئے ہوئے تھے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ میرے شوہر نے اسے بہت محسوس کیا اور اس سلسلے میں سخت شکایت کی۔ تو مجھے باہر کے لوگوں سے ملنے سے کبھی نہیں روکا گیا۔ میرے ساتھی میرے لیے حلوہ لایا کرتے تھے۔ جب میں جیل سے رہا ہوئی تو میرے پاس تقریباً کئی پونڈ حلوہ تھا۔ جیل کی ملاقات کے دن میرے ایک ساتھی نے بتایا کہ وہ میرے لیے ایک پلّا (کتے کا بچہ) لانا چاہتے ہیں۔ رات کے وقت حسب دستور جب جیلر راؤنڈ پر آئے تو میں نے کتے کا بلّہ پالنے کی اجازت مانگی۔ جیلر نے فوراً اجازت دے دی۔ یہ خوشخبری میں نے اپنے ساتھیوں کو پہنچا دی۔ وہ لوگ پلّا میرے پاس چھوڑ گئے، جو جیل کے قیام میں برابر میرے ساتھ رہا۔

میرے شوہر کو دو سال کی اور مجھے چار ماہ کی سزا دی گئی تھی۔ وہاں یہ بات بھی چل رہی تھی کہ ممبران ورکنگ کمیٹی کو جیل سے رہا کر دیا جائے۔ میرے شوہر اس بات سے نہایت فکرمند تھے کہ صرف انھیں کیوں رہا کیا جا رہا ہے، اور میں تنہائی کے خیال سے الگ پریشان تھی۔ لیکن یکایک ہم دونوں ہی کو رہا کر دیا گیا۔

میری جیل کی زندگی بڑی انوکھی گزری ہے۔ میں نے کبھی جیل میں شوہر اور بیوی کو دوسرے قیدیوں سے الگ ایک ساتھ رہتے نہیں سنا تھا۔ درحقیقت وہ ایک طرح کا ہمارا دوسرا ہنی مون تھا کیوں کہ مجھے ان دنوں اپنے شوہر کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جو مجھے ان کی مصروف ترین سیاسی زندگی میں کبھی نہیں ملا تھا۔

زندگی کا دوسرا دور

دوسری بار جیل میں میرا قیام بہت مختصر رہا۔ ۱۹۳۲ء میں جلیانی گوری

میرے شوہر کو ۹ ماہ جیل میں رکھنے کے بعد علاج کے لیے میڈیکل کالج لایا گیا۔ میں اور میری بھابھی دس بجے صبح سے ایک بجے دوپہر تک اور شام کو ۴ بجے سے سات بجے رات تک انھیں روزانہ دیکھنے جایا کرتے تھے۔ میرے بہنوئی اور لڑکے بھی شام کو دیکھنے کے لیے آتے تھے۔

انڈین نیشنل کانگرس کمیٹی کی میٹنگ اس سال کلکتہ میں ہونے والی تھی مجھے اور میرے کنبے کے افراد کو گھر نہ چھوڑنے کا ایک نوٹس ملا۔ لیکن میں کسی قیمت پر اسپتال جانے سے باز نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لیے ہم سب نے اس حکم کی تعمیل نہ کی حالانکہ میں اس وقت سیاست میں کوئی حصّہ نہیں لینا چاہتی تھی۔

اس اطلاع پر کہ میں نے حکم ماننے سے انکار کر دیا ہے کچھ لوگ مجھے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا صدر بنانا چاہتے تھے۔ اوّل تو میں نے انکار کر دیا۔ آخر میں مجھے رضامند ہونا پڑا۔

صدر بننے کے بعد میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ ڈلہوزی اسکوائر کے ایک حصے میں گئی۔ وہاں کچھ لوگ میری آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کی اطلاع پاتے ہی سب لوگ مجھ سے ملنے کے لیے جمع ہو گئے۔ میں نے کانگرس مینی فسٹو (منشور) پڑھنا شروع کر دیا۔ پولیس بہت ہی مستعدی سے میرا پیچھا کر رہی تھی۔ وہ فوراً ہم لوگوں تک پہنچ گئی۔ میں کاغذ کو سر سے اونچا کر کے جہاں تک ممکن ہو سکا پڑھتی رہی۔ لیکن اس وقت چاروں طرف بندوقوں کے دستوں کی مار شروع ہو چکی تھی مجھے کسی نے بچوا لک نہیں۔ میرے کچھ ساتھی سخت زخمی ہو گئے۔ جس وقت بندوقوں کے دستے جسموں پر پڑتے تھے تو ان ضربوں سے بڑی ہولناک آواز پیدا ہوتی تھی۔ ہم سب کو گرفتار کر لیا گیا مجھے ایک پولیس آفیسر کے گھر لے جایا گیا جہاں چائے اور ناشتے سے میری تواضع کی گئی۔ مجھ سے کہا گیا کہ معافی مانگ لوں اور آئندہ کسی کارروائی میں حصّہ نہ لینے کا انھیں یقین دلاؤں۔ یہ میرے لیے ناممکن تھا۔ میں نے صاف انکار کر دیا چنانچہ میں جیل بھیج دی گئی۔ مجھے تمام رات اسپتال میں رکھا گیا۔ اسپتال جاتے ہوئے میں نے سی۔ آر۔ داس کی بہن ارملا کو دیگر قیدی بہنوں کے ساتھ دیکھا۔ انھیں ایسی جگہ رکھا گیا تھا جہاں چینی قیدی دن میں چمڑے کا کام کرتے تھے۔ اس وجہ سے وہاں بے حد بدبو پھیلی ہوئی تھی۔

جیل وزیٹر کو سیاسی قیدیوں سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن میری دوست شریمتی اے چودھری کو مجھ سے ملنے کی اجازت دے دی گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے مل کر رو پڑے۔ مجھے جیل میں دیکھ کر انھیں بہت دکھ ہوا جب میرے بچے مجھ سے ملنے کے لیے آئے تو میری حالت کچھ سنبھلی۔

مجھے چار یا پانچ دن بعد رہا کر دیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب میں انڈین نیشنل کانگرس کی صدر تھی۔

★

شرادنڑہ ۱۹۵۸ اشکٹ

خضر برنی

یہ شہیدوں کا وطن ہے جاں فروشوں کا نشاں
پتے پتے پر لکھی ہے جن کے خوں کی داستاں
کر دیا ہے اس چمن کو خود لہو نے ضوفشاں
باغ کو اپنے سجا کر چل دیے ہیں باغباں
ہم کو لازم ہی نہیں ان کو بھلانا دوستو
بن نہ جائے ایک عبرت یہ فسانا دوستو

آج آزادی کے دن اتنا رہے پیش نظر
ہم نے مشکل سے بچایا ہے رقیبوں سے یہ گھر
دیکھیے یہ ہے بزرگوں کی دعاؤں کا اثر
ہو نہ جائیں عیش میں اچھے عمل سے بے خبر
عزم سے کردار کو اپنے نبھانا دوستو
بن نہ جائے ایک عبرت یہ فسانا دوستو

عزم ٹیپو ہو تو رضیہ کا چلن بھی ہو ضرور
ذہن میں شامل رہے باپو کا اندازِ شعور
لکشمی کے روپ میں شاہِ ظفر کا رنگ و نور
بوس اور آزاد و نہرو کا ہے دل میں سرور
شوق سے پھر جشن آزادی منانا دوستو
بن نہ جائے ایک عبرت یہ فسانا دوستو

آج بے حد یاد آئے ہم کو عثمانِ شہید
چندر شیکھر اور بھگت سنگھ اک طرف عبدالحمید
آج آزادی کے دن جن کی ضرورت تھی شدید
ہو تصور جب کہ ان کا پھر تو ہو جائے گی عید
دیپ ہر گھر میں دوالی کے جلانا دوستو
بن نہ جائے ایک عبرت یہ فسانا دوستو

گرچہ ہے روداد ساری اک ہمارا امتحاں
دور تک پھیلی ہوئی ہے داستاں در داستاں
سر سراتی ہے فضاؤں میں ہمیشہ بے گماں
یادِ ماضی خود بھی ہو جاتی ہے اکثر مہرباں
شادکامی کا ہے سایہ تازیانا دوستو
بن نہ جائے ایک عبرت یہ فسانا دوستو

یاد ہے ظلم و ستم دار و رسن کی واردات
ہے نظر کے روبرو عہد کہن کی واردات
نقش دل پر ہو گئی اپنے وطن کی واردات
زخم کم اندازِ میں رنج و محن کی واردات
ذہن میں رکھنا ہے وہ گزرا زمانا دوستو
بن نہ جائے ایک عبرت یہ فسانا دوستو

اب نہیں پابند غیروں کے یہ ہے اپنا وطن
لہلہاتے ہیں خوشی میں دیکھیے برگ و سمن
جگمگاتی ہے ہر اک سو روشنیِ علم و فن
ہے بہاروں کے جلو میں اپنی ساری انجمن
اب سجانا چاہیے خود آشیانا دوستو
بن نہ جائے ایک عبرت یہ فسانا دوستو

وسعت قلب و نظر سے مل ہی جاتے ہیں قدم
اتحاد باہمی سے دور ہو جاتے ہیں غم
بغض و نفرت کو مٹا کر ہی تو رہتا ہے بھرم
آدمیت کی بقا ملحوظ ہو لطف و کرم
پھر نہیں لازم کسی کا دل دکھانا دوستو
بن نہ جائے ایک عبرت یہ فسانا دوستو

ظفر ادیب

اردو شاعری میں جدیدیت کی تحریک

ایک جائزہ

شعور کی پختگی ضروری ہے، ہر ایک تحریک کی کامیابی اور گیرائی کے لیے۔ یہ شعور کی پختگی اکتسابی بھی ہوتی ہے اور وہبی بھی، صرف روایت یا موجودہ روش سے بغاوت کا جذبہ کام نہیں آتا۔ یوں کچھ نہ کچھ وقت کے لیے ہر نئی بات چاہے وہ شعور کی پختگی کا نتیجہ ہو یا نہ ہو ایک اچھے خاصے طبقے کو متوجہ کر لیتی ہے، اور بہت سے لوگ کسی نہ کسی وجہ سے اس کے گرویدہ ہو ہی جاتے ہیں بلکہ علمبردار بھی بن جاتے ہیں۔ لیکن صرف وقت ہی اس شے کی افادیت اور اہمیت تسلیم کرواتا ہے، اور وقت ہی اس کی رنگینیوں کے نقاب اٹھاتا ہے، کیونکہ اس وقت تک نگاہیں اس کی تہیں کھنگالنے لگتی ہیں اور اس کی سطح اپنی چمک دمک میں اسیر رکھنے یا اپنی نظری رنگینی تک محدود رکھنے کی جاذبیت کھو بیٹھتی ہے۔

وہبی شعور ابھی جسے وجدان یا ذوق سلیم کا نام دیا جاتا ہے اپنے گرد و پیش سے اخذ و استعارکرتا ہے، اور اپنے دائرۂ عمل کو وسعت و استحکام بہنچاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس کا اخذ و استعار مختلف ہوتا ہے اور اس کا استفادہ بھی اس سے مختلف ہوتا ہے جو اکتسابی شعور کا ہوتا ہے۔ چونکہ اکتسابی شعور خارجی ہوتا ہے جبکہ وہبی شعور داخلی۔ فنون لطیفہ جگمگا اٹھتے ہیں، اسی لیے وہبی شعور سے اور صرف خانہ پوری یا صنف فن لطیف کے تقاضوں کی تعمیل تک محدود نہیں رہتے۔ لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ اکتسابی شعور کچھ زیادہ مفید نہیں ہوتا۔ یہ جس معیار اور جس درجے کا ہوتا ہے اسی قدر مفید ہوتا ہے اگرچہ "چیزے دیگر" اس کے احاطے میں نہیں آتی۔ یہ جادو تو اسی سرچشمے سے روانی حاصل کرتا ہے جو ہر ایک کرشمے کا موجب ہے۔

عجوبۂ فن وجود میں آتا ہے جب وہبی شعور اور اکتسابی شعور کا قدرتی فطری اور ذوقی امتزاج عمل میں آ جاتا ہے۔ یہی عجوبۂ فن کوئی نئی راہ نکالتا ہے اور اس کی زندگی میں بیشتر اس راہ کو اختیار کر لیا جاتا ہے اور پھر وہ راہ شاہراہ بن جاتی ہے۔ وہ راہ شاہراہ نہیں بنتی جو اس کے سوا اور کوئی نکالتا ہے۔ ہاں، اگر کسی وقت کسی ایسے کی نئی راہ کو کوئی قلب رواں مل جاتا ہے، تو پھر اس راہ میں شاہراہ بن جانے کے آثار رونما ہو جاتے ہیں۔ علم، مطالعہ اور جدیدیت کے جوش اور زور سے کوئی نئی راہ نہ بنتی ہے نہ مقبول ہوتی ہے، وہ تو کچھ اسی کی نقالی ہو جاتی ہے۔ اس کا سرچشمہ اپنا گرد و پیش نہیں ہوتا، اس کی سوت اپنی ارض سے نہیں پھوٹتی اور اس میں حقیقی جذبات کی کمی بھی ہوتی ہے۔ ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ اپنے عوام، اپنے عوام نہیں تو اپنے خواص کی زندگی بنیاد بنے ورنہ اپنی دھرتی میں جڑیں نہ ہونے کی وجہ سے سب کاروبار پادر ہوا ہوگا، اور اسے اپنے جذبات اور احساسات سے تعلق نہیں ہوگا۔

میر کی داخلیت ہی غالباً ایسی واحد چیز ہے، جسے اس دھرتی سے تعلق رہا ہے۔ اسی لیے ہم سب اسی طرف لوٹ لوٹ جاتے ہیں اور دوسرے سب ہی اطراف سے ہٹتے رہتے ہیں،

چاہے وہ غالب کی روش ہو، چاہے وہ ترقی پسند ادب کے لیے ہو اور چاہے وہ آزاد نظم کی جل ترنگ ہو۔ جدیدیت تو ابھی تک کسی واضح صورت میں نہیں آسکی ہے، اور پھر ابھی اسے کچھ ایسے زیادہ دن بھی نہیں ہوئے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اسے ایک حد تک اسی دھرتی سے تعلق ہے لیکن اس میں یہ سوز دروں کہاں جس سے آب آتی ہے اور جس سے دل گزینی پیدا ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابھی یہ ابتدائی مراحل میں ہے اور تجرباتی دور سے گزر رہی ہے۔ کیا میرؔ کے یہاں بھی یہ سب کچھ تھا؟ کیا میرؔ سے پہلے ہندستانی شاعروں کے یہاں بھی اپنے کوائف تھے؟ بات یہ ہے کہ اس میں کوئی ایک لے نہیں ہے۔ کہیں تو یہ راشدؔ کے قدموں پر قدم دھرتی ہوئی خرام انگیز ہوتی ہے اور کہیں میراجی کی شہروں میں سر ملاتی ہے یہی کشمکش ہے کہ اس کا آہنگ ہندستانی نہیں ہونے پایا ہے۔ اس کے علاوہ تمثیل در تمثیل کا سلسلہ کہیں رکنے نہیں پاتا، اور سب کچھ کہنے کے باوجود کچھ بھی کہا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔

پہلے کے مقابلے میں زمانے کی تیز رفتاری کی نسبت سے ارتقاء کی رفتار بھی تیز ہوگئی ہے۔ اب ایک روایت اور دوسری روایت کے درمیان مدت بہت کم ہوگئی ہے۔ اس بات کو ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں دیکھیے:

"ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ادب میں ہر دس برس کے بعد ایک نئی پود جنم لیتی ہے جو اپنی پیشرو نسل سے منحرف ہوتی ہے لیکن اس سے اگلے دس برس کی پود ان پیشروؤں کو از سر نو دریافت کرنے کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وقت کی گرد کے بیٹھتے ہی فضا صاف ہو جاتی ہے اور دیکھنے والے حقیقت کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے لگتے ہیں۔"

("عظیم ادب اور پُرامن دور" تحریک، جولائی ۱۹۶۲ء)

کہا جاتا ہے کہ یہ بات انگلستان جیسے ملک میں پیش آسکتی ہے، کیونکہ وہاں کوئی دس برس دانشور سے خالی نہیں رہتا بلکہ ایک ایک دس برس میں کئی کئی دانشور ہوتے ہیں جو نئی روایت دینے کے اہل ہوتے ہیں یا پہلی روایت کو نئے خد و خال دینے کے لیے دل و دماغ رکھتے ہیں اور شاید ایشیا میں ایسا نہیں ہو سکتا اگر ایسا سوچا جائے تو یہ درست نہیں ہے۔ ہاں نئی روایت دینے والی پود کے جنم لینے کی مدت میں کچھ زیادہ فاصلہ واقع ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے کے تھوڑے تھوڑے فرق کو کوئی زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔ اہمیت تو صرف اس فرق کو حاصل ہوتی ہے جو ولیؔ اور میرؔ میں تھا، جو میرؔ اور غالبؔ میں تھا، جو غالبؔ اور اقبالؔ اور فیضؔ میں ہے، جو فیضؔ، مخدومؔ، سردار جعفری اور راشدؔ، میراجی میں ہے اور جو فرق راشدؔ، میراجی اور بعض جدیدیت پسند شاعروں میں ہے، اگرچہ اُن میں اصحاب جوش بہت ہیں اور اہل ہوش کم۔

ہر نئی بات سے اختلاف ہر دور میں ہوتا ہے اور ہر دور میں نئی بات کو سراہنے والے پہلے لوگوں میں سے بہت سے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں۔ جو کچھ آج جدیدیت پسندی سے سلوک کیا جا رہا ہے وہ سلوک ترقی پسندی سے بھی روا رکھا گیا تھا اور آزاد شاعری کے علمبرداروں سے بھی۔ توازن اور اعتدال پہلے بھی سراہا گیا ہے اور آج بھی سراہا جا رہا ہے لیکن اُن لوگوں کو سراہا نہیں جا سکتا جا ہے "وہ شعر مرا بمدرسہ برد" یا "جو نہ سمجھے سمجھے جو نہ سمجھے وہ اپنی ناسمجھی کے حوالے" پھبتیاں کستے رہیں[1] وقت کا فیصلہ بھی ایسے لوگوں کے خلاف ہی ہوتا ہے۔[2]

---

[1] تلسی داس، کبیر وغیرہم [2] اس معیار و میزان کے پیش نظر جب ہم ان شاعروں اور ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں جنھوں نے گذشتہ ۳۰، ۳۵ سال سے شاعری کے تصور اور شعر کی ہیئت اور مطالب کے اظہار و ابلاغ کے نئے راستے اور نئے وسیلے پیش کیے ہیں یا دریافت کرتے رہے ہیں، تو معلوم ہوگا کہ ضرورت کے وقت ان کا کلام ہماری مدد نہیں کرتا (ص۔ ۸۸ غالب کی شخصیت اور شاعری)

اور بات ہے کہ وہ اپنی انوکھی اٹھکھیلیوں سے چند لوگوں کو متاثر یا مرعوب کر سکیں۔ ابہام و تفہیم کا مسئلہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو پریشان کن ہو اور جسے ہوّا کہا جائے، بشرطیکہ قریب یا بعید کوئی تو اشاریت موجود ہو ورنہ مفہوم تو بطن شاعر ہی رہ جائے گا اسے نہ سمجھنے پر یا نہ تلاش کر لینے پر کسی بیچارے کو اوسط ذہن یا ابہام و تفہیم کا اہل نہ ہونے کا طعن کہاں تک مناسب اور انصاف پر مبنی ہے۔ میر کے اشعار کی شرح اس وقت نہیں کیا کبھی نہیں لکھی گئی تھی لیکن اس وقت بھی میر کے اشعار سمجھے جاتے تھے، ان کے لیے ابہام و تفہیم کا مسئلہ کوئی ایسا نہیں تھا۔ ہاں، میر کے جذبات کی گہرائی کو پالینا اور انھیں میر کی طرح محسوس کر لینا ایک بات تھی۔ لیکن یہ نہیں کہ ان میں اس سمجھ کے لیے اشاریت نہیں تھی۔ پھر اب تو پہلے کے مقابلے میں ابہام و تفہیم کا مسئلہ کچھ زیادہ ہی سہل ہے کیونکہ معلوماتی پس منظر کہیں زیادہ ہی وسیع ہے اور ذہن و فہم کے کشادہ ہونے کے بہت سے مواقع ہیں اگر خواہ مخواہ کی پیچیدگیاں حائل نہ کر دی جائیں۔ اور اپنے زعم میں انھیں کو جدّت نہ قرار دیا جانے لگے۔ اس طرح الفاظ کا ایسا گورکھ دھندا بھی نہیں ہونا چاہیے کہ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا والی بات بن جائے۔ بات بھی تو کچھ ہونی چاہیے اچھوتی اور دل میں اترتی ہوئی سی، فضا میں لہریں دوڑا دینے والی، سوجھ بوجھ کی بستیوں میں ایک کرن اتار دینے والی اگر

کہہ کے لرزیدہ ہاتھوں میں کشر
تلسی اور ادرک کی چائے چھلکتی ہے

کہا جائے اور جیسے تیسے گتھیاں سلجھا بھی لی جائیں تو سامنے آئے تو صرف یہ کہ "بیوہ بوڑھی ماں، اور اس کی خوف زدہ ممتا کہ جب وہ اپنی اونٹی ہوئی چائے پلاتی ہیں تو میرا انکار شور تک پہنچتا ہے۔" یوں تاویل ہر ایک بات کے لیے گھڑلی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے :

"جدید نظم و غزل کے تشریح و تجزیہ کی اور زیادہ ضرورت ہے اس لیے کہ یہاں، روایت کی سیدھی سادی توسیع ہی نہیں ہے بلکہ جہاں توسیع بھی ہے اس میں گھماؤ، پیچ اور فاصلہ ہے اور کہیں ماضی کی روایت سے انحراف ہے اور کسی نئی روایت کا آغاز ہے۔"

یہ گھماؤ، پیچ اور فاصلہ بھی تو قاعدے قرینے کا ہی ہونا چاہیے۔ یکسر بے قاعدہ و بے قرینہ گھماؤ، پیچ اور فاصلہ کا جواز پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ "علامتی شاعری کا کبھی مقررہ مفہوم نہیں ہو سکتا۔" اگر ایسا مان بھی لیا جائے تو علامتی شاعری میں علامتوں میں شبیہہ کی جھلک ہونی چاہیے۔ اس کی عدم موجودگی کی صورت میں ابہام و تفہیم کا مسئلہ صرف مسئلہ ہی نہیں رہتا بلکہ معمّہ بن جاتا ہے، اور وہ بھی محذوفات کا مرکب[2]۔

یہ کہنا درست ہے کہ "عام طور سے لوگ ہمدردی سے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں" لیکن اس کوشش کے لیے اگر راہ منزل میں نقش جیسی کوئی شے نہ ہو تو پھر۔

جدیدیت پسندوں میں بھی بہت سے ایسے ہیں جو اس قسم کی روش کو مستحسن نہیں قرار دیتے۔ مجھے بہت سے ایسے لوگوں سے اس پہلو پر گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے۔ ان میں سے سبھی اس خیال سے متفق پائے گئے۔ اس بات کی خوبی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ نئی بات کہی جائے اور نئے انداز سے کہی جائے اور گرد و پیش سے تشبیہیں اور استعارے لیے جائیں جیسے بہت سے جدید شاعر کہہ رہے ہیں۔

جدیدیت پسندوں کے یہاں بہت اچھے اشعار بہت ہی اچھے انداز میں پائے جاتے ہیں جن کی تعریف کرنا ہی پڑتی ہے۔ تشبیہیں بھی نہایت پیاری ہوتی ہیں اور خیالات بھی نہایت خوبصورتی سے پیش کیے جاتے ہیں۔ مجھے ظفر اقبال کا پہلا مجموعہ ایک دوست کے یہاں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ مجموعہ مجھے ہر اعتبار سے پسند آیا بلکہ میں نے اس کا ذکر بھی کئی اصحاب سے کیا۔ انھوں نے بھی میرے خیال سے اتفاق کیا۔ اسی طرح مصور سبزواری کے یہاں بھی اچھے اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اسی طرح گذشتہ برس قیصر قلندر صاحب سے سرنگر میں کچھ غزلیں سننے کا اتفاق ہوا۔ ان کا اسلوب بھی مجھے پیارا نظر آتا ہے۔ اسی طرح کچھ اور شاعر بھی ہیں، جو نئے انداز

---

[1] المعنی فی بطن الشاعر

[2] وہ (غالب) اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ ابہام کے کتنے اقسام ہیں کب شعر کے لیے یہ زلف گرہ گیر کا حکم رکھتا ہے اور کب زنجیر پا بن جاتا ہے۔ کہتے ہیں ؎
بسکہ ابہام پر ہوتی ہے تصدق توضیح   میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل (ص ۱۰۔ غالب کی شخصیت اور شاعری۔ رشید احمد صدیقی)

سے ادبی افق پر ابھرے ہیں۔

جذبی جدید شاعری کے بارے میں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جدید شاعری کی بنیاد محض بغاوت پر ہے یہ لوگ ہر قدیم اور پرانی چیز سے بغاوت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں ان کے نزدیک نہ صرف مروّجہ موضوعات و مضامین ہی قابل ترک ہیں بلکہ یہ اس کو بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ قدیم الفاظ اور معانی سے بھی گریز کیا جائے (انھوں نے کہا) کوئی زندہ زبان اپنے دور اس کے تقاضوں اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل سے گریز کر کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ زبان کے مروّجہ الفاظ و معانی سے بغاوت اور اصطلاحات سے گریز ناممکن العمل ہے۔"

یہ بات کسی حد تک تو درست ہی ہے لیکن پورے طور پر اسے درست نہیں مانا جا سکتا۔ اگر جدید شاعری کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ہر ایک کے یہاں محض بغاوت نہیں ملے گی۔ نئی بات نئے انداز سے کہنے کی کوشش اور فرسودگی، غیر تازگی، بے جانداری سے انحراف محض بغاوت نہیں۔ نئی زندگی، نیا خون اور نیا جذبہ مناسب اور جائز انحراف اور دامن کشی کے بغیر ممکن نہیں۔ ہر دور میں ایسا ہوا ہے کہ جو باتیں کثرتِ استعمال سے اپنی کشش کھو بیٹھی ہیں ان سے دامن کشی کی گئی ہے۔

سردار جعفری نے ریڈیو پر انٹرویو میں بہت سی کام کی باتیں اس سلسلے میں کہی ہیں:

"موضوع کے مطابق ماحول سے تشبیہہ و استعارہ لینے کی روش جو میں نے اپنی نظموں میں مروج کی تھی اس بات کو جدید شاعری نے آگے بڑھایا ہے۔ ترقی پسند شاعروں نے ملک کی آزادی کے ساتھ ساتھ اقتصادی آزادی کو بھی پیش نظر رکھا تھا۔ جدید شاعر جو دروں بینی کر رہے ہیں ان پر وہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو اپنشد کے فلسفیوں پر عائد ہوئی تھی اور جس سے انسان کی نئی جستجو حاصل کی تھی۔ اس سلسلے میں جدید شاعروں کی یہ کوشش پوری طرح تسلی بخش نہیں ہے لیکن اس کی ابتدا ضرور ہو چکی ہے۔ ان کے یہاں کلاسیکی شعور کم ہے۔ میں کلاسکیت کو اٹھا کر پھینک دینے کا قائل نہیں ہوں اگر ہمارے تخلیق کار اپنے اندر ہی کھو جائیں تو یہ ایک بڑی خامی ہو گی کیونکہ اس سے سماج کا مسئلہ، تعمیر نو کا مسئلہ، فرد کی اکائی گم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ شعور کے بغیر میں جذبات کو خطرناک چیز سمجھتا ہوں۔

بعض جدید شاعروں کی تخلیقی سطح بہت اونچی نہیں ہے۔ ایسے شاعروں کے یہاں میں NOSTALGIA کا رجحان پاتا ہوں لیکن اب جدید شاعری کے ذریعے اردو زبان کے اور زیادہ حلقوں تک پہنچنے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔"

الفاظ کچھ اور ہو سکتے ہیں لیکن بات کم و بیش یہی کہی گئی تھی۔ میں نے ارتجالاً یہ چند جملے نوٹ کر لیے تھے اور اس انٹرویو کے درمیان میں یہ محسوس کر رہا تھا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے (غالب)

مجھے یاد پڑتا ہے کہ سردار جعفری صاحب نے شہریار کے پہلے مجموعہ شاعری پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ان کی روش کی مدلل کوششوں کو سراہا تھا اور اسے صحیح سمت میں سفر بتایا تھا۔ شہریار کی شعری تخلیقات میرے مطالعے میں کچھ زیادہ نہیں رہی ہیں۔ ان کے تنقیدی خیالات نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ ان کی بصیرت اور بیباکیِ اظہار واقعی قابلِ ستائش خوبیاں ہیں۔

بعض جدید شاعروں کے یہاں دیومالا سے گہری دلچسپی بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن ایسے شاعروں کے یہاں اس بات کا بھی اندیشہ ہوتا ہے کہ انھوں نے دیومالا کا ضروری حد تک مطالعہ بھی کیا ہے یا نہیں، یا صرف سطحی مطالعہ پر ہی اکتفا کر لیا ہے۔ اکثر دیومالا سے واقفیت کم ہی پائی جاتی ہے۔ اس وجہ سے عام قاری مرعوب سا بھی ہو جاتا ہے اور سمجھنے لگتا ہے کہ شاعر کا مطالعہ نہایت گہرا ہے اگرچہ اس میں واقعیت نہیں ہوتی۔ دوسرے اس رجحان میں ماضی کی جانب مراجعت کا عنصر اعتدال سے گذرا ہوا بھی محسوس ہونے لگتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ماضی سے بالکل چشم پوشی یا کنارہ کشی درست نہیں لیکن ماضی سے گہری وابستگی جدیدیت پر ایک طرح کا حرف بھی ہو جاتی ہے اس لیے اگر اس رجحان میں اعتدال کو پیش نظر رکھا جائے تو تحسین ہی ہو گا۔ ورنہ زمانے کے تقاضے اور اس کے مسائل پس پشت پڑ جائیں گے۔ نہ جانے اس رجحان کے شاعر اس امر کا احساس رکھتے ہیں یا نہیں۔

وزیر آغا "نئی اردو غزل" (سطور۔ شمارہ ۲) میں غزل کا سفر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

میر اور غالب کے زمانے میں غزل کا امتیازی نشان تحفظ ذات کا نقش تھا۔ — مگر حالی اور اقبال کا عہد اثبات ذات کا زمانہ تھا (اثبات ذات کا یہ میلان یگانہ کے ہاں ایک انتہائی صورت اختیار کرکے قریب قریب ایک نفسیاتی عارضے میں مبدل ہوا) — جدید دور میں غزل نے ایک بار پھر خود کو نئے زمانے کی آواز بنا کر پیش کیا۔ بیشک جدید دور اس قدر قریب ہے کہ ہم اس کے خد و خال کو پوری طرح دیکھ بھی نہیں سکتے تاہم اس کے بعض نقوش ابھی سے واضح ہونے لگے ہیں اور یہ دیکھنا ممکن ہو گیا ہے کہ نئی غزل ان نقوش کی عکاسی کر رہی ہے یا نہیں۔ مثلاً ان میں سے ایک نقش تو "نفیِ ذات" کا غماز ہے اور یہ مزاجاً بین الاقوامی ہے۔ اٹھارہویں یا انیسویں صدی کے برعکس جو انسان کے لیے یقین اور اعتماد کا دور تھا بیسویں صدی تشکک، خود اذیتی اور گو مگو کا زمانہ ہے۔ سائنس نے مادّے کی ٹھوس حقیقت پر کاری ضرب لگا کر اور آسمان کی حدود کو کئی گنا پھیلا کر انسان کی خود اعتمادی اور یقین کو مجروح کیا ہے اور عظیم جنگوں نے اس کے تہذیبی حصار میں جگہ جگہ دراڑیں سی ڈال دی ہیں۔ نتیجتہً انسان کا باطن شکست و ریخت میں مبتلا ہے اور باطن کا اظہار "تجریدی مصوری" سے لے کر ٹوٹی پھوٹی ہوئی شاعری تک اور ہپی ازم سے لے کر ایل۔ ایس۔ ڈی کے استعمال تک پھیل گیا ہے۔ مجموعی طور پر ذات کی نفی کا رجحان عام ہے — دوسرا نقش ایک مثبت عمل ہے اور مزاجاً قومی سطح سے منسلک ہے۔ یہ نقش پاکستان میں لکھی نئی غزل میں خاص طور پر نمایاں ہے۔

(جدید تر غزل میں پیڑ، جنگل، پتھر، برت، گھر، شہر، پتے، شاخیں، دھوپ، سورج، دھواں، زمین، آندھی، کھڑکی، دیوار، منڈیر، گلی، کبوتر، دھول، رات، چاندنی اور درجنوں دوسرے الفاظ اپنے تازہ علامتی رنگوں میں ابھر آئے ہیں۔ ان لفظوں کی اہمیت اسی بات میں ہے کہ یہ اپنے ماحول کے عکاس ہیں اور زمین کی باس، رنگ (اور ذائقہ) کو قاری تک پہنچاتے ہیں۔ زمین، جس پر سال کے بیشتر حصے میں تیز سورج چمکتا ہے آندھیاں آتی ہیں، دھواں اور غبار چھا جاتا ہے اور پھر اچانک ساون کی برکھا ہر شے پر سبز رنگ انڈیل دیتی ہے۔ - - - - - - - - - - - - - - -

- - - ظاہر ہے کہ اگر علامتیں اسی ماحول سے اخذ کی جائیں تو ان میں شاعر اپنی ذات کا اظہار نسبتاً آسانی سے کر سکے گا۔ اردو غزل میں غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ شعرا کی ایک پوری جماعت نے اپنے احساسات کو ارد گرد کی اشیا، مظاہر اور علائم کی زبان میں پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے، درآنحالیکہ اس نے پرانے علائم سے بھی اپنا رشتہ قائم رکھا ہے)

(اقتباس از "اردو شاعری کا مزاج")

"نئی غزل کی ایک اور اہم خصوصیت (میرے خیال میں اہم ترین خصوصیت) یہ ہے کہ اس میں ایک نیا پیکر جنم لے رہا ہے۔ نفسیات کی زبان میں اس نئے پیکر کو شاید WISE OLD MAN کا نام ملے میں اسے دوسری ہستی (THE OTHER) کہہ کر پکاروں گا . . . . سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو نئی غزل میں ایک "دوسری ہستی" ظاہر ہوئی ہے یا کم سے کم جس کے مخفی ہاتھ کا دباؤ شاعر نے اپنے شانے پر محسوس کیا ہے، کون ہے؟ اس کی بے قراری اور کسمساہٹ کی نوعیت کیا ہے؟ نیز اس کی آواز میں وہ کون سا کرب ہے جس نے شاعر کی ذات کو محض دو نیم نہیں کیا بلکہ ریزہ ریزہ کر دیا ہے . . . نئی غزل میں اس دوسری شخصیت نے اپنے وجود کا اعلان کر کے پہلی شخصیت میں دراڑیں سی پیدا کر دی ہیں . . . یوں کہنا بھی غلط نہیں کہ پہلی شخصیت شاعر کی ذات کا وہ اجتماعی رخ ہے جو صدیوں کے جزر و مد کے بعد ایک اکائی کی صورت میں مرتب ہوا تھا۔ لیکن جواب نئے زمانے کی بے پناہ کلبلاہٹ کی زد میں آکر جگہ جگہ سے تڑخنے لگا ہے . . . . . . شخصیت کے بجائے نقاب بن جانے کے اس کرب ناک احساس نے آج کے نئے غزل گو شاعر کے وجود کو گویا توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے، اور وہ ایک بے پتوار کشتی کے مانند بری طرح ڈولنے لگا ہے مگر اصل بات شاید یہ نہیں ہے کہ خول یا نقاب ٹوٹ یا پھٹ رہا ہے بلکہ یہ ہے کہ اندر کی نئی ہستی باہر آنے کے لیے بیتاب ہو گئی ہے اور اپنے زور میں باہر کے نقاب کو تار تار کر رہی ہے . . . . آج کے نئے شاعر نے تخلیق کے اس نازک مقام پر کھڑے

ہو کر غزل کہی ہے ایک طرف تو وہ چھال (اجتماعی رخ یا معاشرہ) کے ٹوٹنے کا منظر دکھاتا ہے اور اس کے لیے دھوپ، صحرا، زلزلہ، سوکھی دھرتی، پت جھڑ، راکھ کا ڈھیر، کھڑکتے پتے، ترچھا سورج اور لاتعداد دوسرے مظاہر کو علامت کے طور پر استعمال کرتا ہے اور دوسری طرف وہ بار بار اپنے اندر کی کسمساہٹ اور بے قراری کا ذکر کرتا ہے اور آسیب زدہ مکان یا اندھے کنوئیں میں جھانک کر اور جنگل اور صحرا کی جانب مراجعت کر کے اپنی تلاش کرنے لگتا ہے۔ تیسری طرف وہ اس نئی ہستی کے ظہور کا احساس دلاتا ہے جو اندھے کنوئیں، جنگل یا آسیب زدہ مکان سے رہائی پانے کے لیے بیتاب ہے۔ واضح رہے کہ یہ نئی ہستی شاعر کی ذات کے اجتماعی رُخ کے پیچھے سے ابھر کر باہر کو لپک رہی ہے اور اس کی یہ لپک غزل کی اس بنیادی جہت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے جس کا رخ ہمیشہ اندر سے باہر کی طرف رہا ہے۔"

اس اقتباس کی طوالت شاید کھلی معلوم نہ ہو لیکن ایک بڑی حد تک ناگزیر تھی۔ اس لیے کہ اس میں جدید شاعری کا منشور ہے جو ہر اعتبار سے خوش آئند ہے۔ جیسا کہ ہر تحریک کا منشور ہوا کرتا ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس منشور پر جدید شاعری کس حد تک عمل پیرا ہے اور کتنے جدید شاعر ہیں جو اسے واقعی پیش نظر رکھے ہوئے ہیں۔ آزاد نظم کا منشور بھی اتنا ہی دل پذیر پایا جاتا تھا لیکن بہت کم آزاد نظم نگاروں نے اس پر واقعی عمل کیا۔ آزاد نظم میں مصرعوں کی تشکیل اور تعبیر تخیل اور جذبہ کے زیر و بم کے مطابق ہونی چاہیے۔ یہ تھا، جواز آزاد نظم کے لیے۔ لیکن کہاں ہے آزاد نظموں میں یہ اہتمام۔ صرف چند ایک شاعر ہیں جن کے یہاں یہ صورت رونما ہو جاتی ہے اگرچہ کبھی کبھی ان کے یہاں بھی یہ انتظام نہیں رہنے پاتا۔ یہی صورت جدید شاعری میں آپڑتی ہے، اور وہ منشور جو جدید شاعری کے علمبردار نقاد اور شاعر نہایت خوبصورت انداز سے پیش کرتے ہیں اکثر و بیشتر جدید شاعروں کے ہاں پس پشت جا پڑتا ہے[۱]۔ سبب کیا ہے؟

یہ درست ہے کہ ولی یا سراج سے میر سے غالب تک تحفظ ذات اور حالی اور اقبال اور ان کے بعد بھی اثبات ذات کی رَو پاتے ہیں اور جدید غزل میں نفی ذات کو ان نقوش میں سے ایک نقش قرار دیتے ہیں جو ان کے قول کے مطابق نئی غزل میں نمایاں ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ 'نفی ذات' کی کاوش کتنے نئی غزل والوں کے یہاں ہے، ان میں سے تو بیشتر ذات کی شکست و ریخت سے بلند ہیں اور انھیں یہ خطرہ بھی درپیش نہیں ہے۔ میر کی شاعری کے لیے میر کی زندگی ضروری ہے ورنہ وہ آہنگ اور وہ لہجہ نہیں آسکے گا۔ اس بات کو آج کے بہت سے شاعروں کے یہاں دیکھا جا سکتا ہے جو میر کے لب و لہجہ کو قائم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے غزلیں کہتے ہیں۔ یہی صورت ہر منفرد شاعر کے یہاں پائی جاتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے غالب نے ایسا کیوں کہا جیسا انہوں نے کہا۔ کچھ تو خاص امور ہوں گے جو صرف غالب سے وابستہ رہے ہوں گے۔ یہ باطن کی شکست و ریخت عالمگیر ہی سہی لیکن سب کے لیے کہاں۔ بہت سے تو ہر شکست و ریخت سے بیگانہ ہیں۔ شعرا میں بھی ایسے بہت سے ہیں نہ ان کے احساسات جھنجھوڑے جاتے ہیں اور نہ ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ شاعری ہر پہلو سے مختلف ہے، اثرات قبول کرنے میں بھی اور انھیں صورت پذیر کرنے میں بھی۔ اگر خارجیت سے متاثر ہوتی ہے تو بھی مختلف انداز سے پھر سب کی شاعری کہاں واقعی خارجیت سے متاثر ہوتی ہے۔ علامتوں کی معنویت بھی طبائع کے اعتبار سے تنوع اختیار کرتی ہے۔ ایک صاحب طبع کے لیے کوئی علامت کوئی معنویت رکھتی ہے اور دوسرے کے لیے کوئی اور ـــ

یہ دوسری ہستی بعض پہلے شاعروں کے ہاں بھی پائی جاتی ہے یہ ضرور درست ہے کہ اس کی صورت ایسی نہیں جیسی کہ آج کے بعض شاعروں کے ہاں۔ اس دوسری

---

[۱] ہمارے آج کے شاعر اور ادیب اپنی تہذیب کے بالخصوص اور تہذیب انسانی کے بالعموم ان عناصر کی تلاش میں اتنی کاوش کیوں نہیں کرتے جن کے انکشاف اور بازیافت سے شاعر اور شاعری دونوں گراں مایہ اور تازہ کار رہتے ہیں۔ کیا انسانی زندگی میں عصری رجحانات یا ہیجانات اتنے اہم ہیں کہ ہم کلیتہً انہی کی عکاسی میں سرگرداں یا اسیری میں بے دست و پا رہیں اگر نری تقلید ایک جامد اور مجہول ذہن کی غمازی کرتی ہے تو اس کا بھی امکان ہے کہ نری جدیدیت (اس لفظ کو عام معنوں میں استعمال کر رہا ہوں کوئی اصطلاح پیش نظر نہیں ہے) فکر کے انتشار و اختلال کا اظہار کرتی ہو اگرچہ اوّل الذکر گلدستۂ طاق نسیاں ہو جاتے ہیں اور موخر الذکر آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک۔ (ص ۵۰ "غالب کی شخصیت اور شاعری" رشید احمد صدیقی)

ہستی کو نہایت آسانی سے میرؔ اور غالبؔ کے ہاں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ صرف نئی غزل کی خصوصیت نہیں ہے۔ اسی طرح ارد گرد سے علامتیں اخذ کرنے کا رجحان پہلے شاعروں کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ پھر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض نئی سوچیں رونما ہوتی ہیں اور انھیں نیا لباس بھی دیا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ابہام اتنی شدّت سے داخل ہو گیا ہے کہ اچھی خاصی دماغی ورزش کے بعد بھی بعض اوقات کوئی سر پیر نہیں ملتا۔ اگرچہ یہ سب ہی کے یہاں نہیں ہے، بعض لوگوں کے یہاں موضوع بھی اور بیان بھی لطف دیتا ہے۔ ان کے یہاں اعتدال ہے، جدّت کی بے راہ روی نہیں اور انھوں نے جدید شاعری فیشن کے طور پر بھی اختیار نہیں کی ہے بلکہ ان کے اندر کی آواز ہے۔ ایسے لوگوں کی شاعری قابلِ ستائش ہے، اور ان کے نئے پن کی داد دینی ہی پڑتی ہے۔

جہاں خلوص ہے، اعتدال ہے، اصلیت ہے وہاں جدید شاعری نہایت مستحسن انداز سے سامنے آتی ہے اور اپنا جلوۂ معنی دکھنے کے لیے دامن تھام لیتی ہے۔

"یہ واضح رہے کہ وہ آزادیاں جن پر وہ (شاعر) عمل پیرا ہو، صرف قرینے کی خاطر ہونی چاہئیں۔

"ہمیں ابھی تھیٹر کے لیے شعری میڈیم کی ایجاد میں کافی آگے بڑھنا ہے۔ ایک ایسا میڈیم جس میں ہم عصر انسانوں کی بات چیت اور ان کی آواز سن سکیں، جس کے ذریعہ ڈرامائی کردار خالص ترین شاعری کا اظہار کر سکیں اور ساتھ ساتھ عام باتیں بغیر نامعقولیت کے ہم تک پہنچا سکیں۔"

[ترجمہ: ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (آہنگ شمارہ ۲۱)]

یہ اقتباس بالواسطہ بلکہ بلاواسطہ میری بات کی تائید کرتا ہے جس قرینے اور معقولیت کی ضرورت پر ایلیٹ نے توجہ دلائی ہے، میں بھی وہی چاہتا ہوں اور جدید شاعروں سے کچھ اور نہیں چاہتا۔

احتشام اختر آہنگ کے اسی شمارے میں اپنے ایک مضمون "جدید نظم ۔ ایک جائزہ" میں اس سلسلے میں کچھ باتیں کہتے ہیں۔ ان کی بعض باتوں سے اختلاف کے باوجود ان کی بعض باتوں کو تسلیم کرنا پڑتا ہے، اور زیادہ طوالت کے خوف سے اس کی باتیں نہیں لکھتا جن سے اتفاق نہیں ہے۔

"ادبی جدیدیت طرزِ اظہار اور طرزِ احساس کی جدّت کا نام ہے۔ فرد کی آزادی اس کی دردمندی اور داخلی درد و کرب کی عکاسی کے سلسلے میں جدید شاعری نے اقبال سے استفادہ ضرور کیا ہے لیکن ان کے لہجہ کی گھن گرج اور خطابت کو قبول نہیں کیا۔

جدید شاعری میں صرف ایک رجحان نہیں ملتا ہے بلکہ کئی رجحانات ملتے ہیں۔

نئی نظم میں رومانی لَے کے ساتھ اینٹی رومانی لَے بھی ابھری ہے اور بعض کھردری نظمیں لکھنے کا رجحان بھی عام ہوا ہے۔

نثری نظموں کو بھی فروغ ملا ہے اور گرامر سے عاری شاعری بھی لکھی جانے لگی ہے یہ شاعری ابہام سے گزر کر اہمال کی حد میں داخل ہو گئی ہے اور یہ لغویت اور اہمال (ABSURDITY) جدید شاعری کا ایک عادی رجحان ہو گیا ہے۔

اگرچہ جدید شاعری کے رجحانات کو شاعری کے اجتہادات سے تعبیر کیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا لیکن اس سلسلے میں جذباتی عقیدت سے کام لینا نقصان دہ ہوگا۔

اردو شاعری پرانی ڈگر سے ہٹ کر اب ایک نئے موڑ پر آ گئی ہے جہاں سے وہ ایک نیا سفر شروع کر رہی ہے جو اس کے حق میں روح فرسا نہیں بلکہ مسرّت و سرخوشی کا سرچشمہ ثابت ہوگا۔ اور اسے نئی بصیرت اور ایک مخصوص نظر عطا کرے گا اور مخصوص نظر اور بصیرت اردو ادب کو آفاقی اور ابدی قدروں کی ترجمانی کا اہل بنائے گی۔"[1]

جدید شاعری میں طرزِ اظہار میں اپنے انداز کی جدّت آئی ہے، لیکن طرزِ احساس کی جدت کہاں تک مصنوعی اور کہاں تک فطری ہے اس سلسلے میں کوئی واضح بات نہیں کہی جا سکتی میرا خیال ہے کہ یہ جدّت محض اضافی ہی ہے اور اس پر تصنع کا رنگ غالب ہے۔ احتشام اختر صاحب کی آخری بات نہایت خوش آیند ہے 'خدا کرے کہ ایسا ہی ہو' احتمالات تو ہیں ہی۔ کیونکہ جوشِ جدّت میں بے راہ رویوں کے امکانات بہت زیادہ

[1] کیا اتنی بصیرت اور ایسی مخصوص نظر کا بھی امکان ہے؟ "اس غزل میں (لے ذوقِ نوا سنجی، بازم بخروش آور) کہیں عورت، انقلاب، آگ، خون اور نظم کی ہئیت کو معرضِ بحث میں نہیں لایا گیا ہے لیکن یہ ان تمام نظموں پر بھاری ہے جن کے سیلِ بے امان کی زد میں ہم ہیں (ص ۔ ۹۵، غالبؔ کی شخصیت اور شاعری : رشید احمد صدیقی

اسلوب احمد انصاری صاحب، میرا صفحہ، ہماری زبان ۸ جولائی ۱۹۷۲ء میں ادب کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ادبی تنقید کے سلسلے میں دو متضاد نقطۂ نظر عام طور پر برتے جاتے ہیں۔ پہلا تو یہ ہے کہ ادب کا مقصد سیاسی اور سماجی حقیقتوں کو شعر و ادب کے پیکر میں براہ راست پیش کر دینا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اچھی شاعری کسی نظریے یا ایما کی پابند نہیں ہوتی بلکہ ہمارے اندر یہ رغبت پیدا کرتی ہے کہ ہم ان سب سے منھ موڑ کر مسرت کی ایک ان دیکھی کائنات میں سانس لینے لگیں۔ پہلے نقطۂ نظر کو اپنانے میں ایک بڑی خامی یہ ہے کہ ایسا کرنے سے ہم شاعری اور سائنس، شاعری اور جرنلزم اور شاعری اور سیاسی اور سماجی تحریروں کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں قائم کر سکتے۔ ادب کا وظیفہ خاص کسی ضابطے یا پروگرام کا براہ راست پرچار کرنا نہیں ہے، اس کے ردعمل کے طور پر یہ سوچنا بھی درست نہیں ہے کہ شعر و ادب کس خلا میں پرورش پاتے ہیں یا ادب کی کائنات اس حد تک مکتفی بن سکتی ہے کہ وہ باہر کی دنیا سے جس میں سیاست، فلسفہ اور فلسفہ سب ہی شامل ہیں، کلیۃً منقطع ہو جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سب عناصر بہت سی چھلنیوں میں چھننے کے بعد ہی ادب کی دنیا میں اپنی جلوہ گری دکھاتے ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ یہ سارا عمل اتنا پیچیدہ ہے اور اتنا غیر محسوس طور پر واقع ہوتا ہے کہ اسے کوئی واضح منطقی ڈھانچہ نہیں دیا جاسکتا۔ ہاں اشارے ضرور کیے جاسکتے ہیں۔ فکر تہ نشین کی بنیاد میں جو بصیرت ہوتی ہے اور جو 'چیزے دگر' کا نام پاتی ہے، وہی بڑی شاعری اور بڑے ادب کو وجود میں لاتی ہے۔ یہ بصیرت جدید شاعروں کے ہاں کس حد تک آئی ہے، یا ابھی آئی ہی نہیں ہے، اس مرحلے پر اس سلسلے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں، کیونکہ جدید شاعری ابھی عبوری مرحلے اور تجرباتی ہی دور میں ہے۔ اس سے تو جدید شاعری کے علمبردار بھی انکار نہیں کرتے۔ لیکن جدت کے زعم میں جو بوالعجبیاں ہوتی رہتی ہیں اس پر وہ کیوں خاموش رہتے ہیں یا آواز اٹھاتے بھی ہیں تو غیر آوازی سے۔

★

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

کا

احتشام نمبر

صفحات ۱۶۸ ——— قیمت صرف ایک روپیہ

شائقین اور ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر جلد بھیجیں۔ صرف تھوڑی کاپیاں باقی رہ گئی ہیں۔

بعد میں ہم تعمیل فرمائش سے قاصر رہیں گے۔

——— ایڈیٹر

"غالب، حالی اور اقبال کے بارے میں جو باتیں عرض کی گئی ہیں ان کو ذہن میں رکھ کر آج کل کی اردو شاعری اور ادب پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے نئے شعراء، ادیب اور فنکار ہمارے شعر و ادب کو کہاں سے کہاں لیے جا رہے ہیں اور انھوں نے نئے ذہن کی کیسی رہبری یا قیادت کی ہے۔"

(غالب کی شخصیت اور شاعری۔ صفحہ ۹۲، رشید احمد صدیقی)

میرے ہندوستان

جوہر ہاشمی

میرے پیارے وطن میرے ہندوستان
میرے پیارے وطن میرے ہندوستان
آج تو اپنے خوابوں کی تعبیر ہے
امن و الفت کی رنگین تصویر ہے
شادکامی کی پرکیف تفسیر ہے
جگمگاتا ہے تیری ضیا سے جہاں
میرے پیارے وطن میرے ہندوستاں

تو نئی زندگی کا حسیں خواب ہے
تو شجاعت کی تاریخ کا باب ہے
تو زمرد کی الماس کی آب ہے
تو شراب کہن، تو ہے حسن جواں
میرے پیارے وطن میرے ہندوستاں

تاج کیا ہے ترا جگمگاتا نشاں
یہ اجنتا تمدن کا ہے ترجماں
ہے ہمالہ محافظ ترا پاسباں
تجھ میں گنگا رواں تجھ میں جمنا رواں
میرے پیارے وطن میرے ہندوستان

تیری صبح بنارس ہے آنکھوں کا نور
تیری شام اودھ ہے دلوں کا سرور
تیرا کشمیر ہے رشک حور و قصور
ہو نہ کیوں خلد زاروں کا تجھ پر گماں
میرے پیارے وطن میرے ہندوستاں

تو وفا کا دھڑکتا ہوا دل بھی ہے
کاروانِ محبت کی منزل بھی ہے
تو سفینے کی قسمت بھی ساحل بھی ہے
تجھ کو خائف کرے گا بھلا کیا جہاں
میرے پیارے وطن میرے ہندوستاں

تو کسانوں کا دل تاجروں کی ہے جاں
ہیں فدا مرد و زن تجھ پہ پیر و جواں
روحِ مزدور تو جانِ شیشہ گراں
چمنیوں سے ملوں کی نکلتا دھواں
میرے پیارے وطن میرے ہندوستاں

مسکراتی ہیں آنکھیں سویرا ہوا
دل میں سب کی خوشی کا بسیرا ہوا
دور میرے وطن سے اندھیرا ہوا
رُت بدلنے لگی ہے نیا اک سماں
میرے پیارے وطن میرے ہندوستاں

کس نے ٹیپو سے زور آزمایا یہاں
چاند بی بی نے پرچم اُڑایا یہاں
خوں بھگت سنگھ کا کام آیا یہاں
نام جھانسی کی رانی نے پایا یہاں
میرے پیارے وطن میرے ہندوستاں

درد تیرا ہے دل، تیرا غم جان ہے
ہندو شیدا ہے، عاشق مسلمان ہے
تجھ پہ بھارت کا ہر فرد قربان ہے
کرشن اس جا یہاں خواجۂ خواجگان
میرے پیارے وطن میرے ہندوستان

○

افسانہ

رفیعہ منظور الامین

چناروں کے پتے سرخ پڑنے لگے تھے۔ سب کہتے تھے کہ پچھلے تین سال سے ایسی سخت سردی نہیں پڑی تھی۔ لیکن برسوں سے میں یہی سنتی آرہی تھی۔ ہر طرف برف ہی برف دکھائی دے رہی تھی۔ دوسرے کمزور اور ناتواں درخت تو کبھی کے ہتھیار ڈال چکے تھے۔ آخر چناروں کے پنجوں پر بھی حنا کی سرخی چھانے لگی تھی جیسے ہتھیلیوں سے محنت کش زندگی کا خون رس رہا ہو۔ اس روز کالج کا آخری دن تھا دوسرے دن سے چھٹیاں شروع ہونے والی تھیں۔ پڑھائی وڑھائی تو کیا خاک ہوتی کالج ایک بہت بڑا مینا بازار لگ رہا تھا۔ اس روز مجھے پتہ چلا کہ واقعی ہم عورتیں بہت بولتی ہیں۔ اسٹاف روم میں کافی کی آدھی خالی۔۔ یا شاید آدھی بھری ہوئی پیالی چھوڑ کر میں باہر برآمدے میں نکل آئی۔ میں ابھی طے بھی نہ کر پائی تھی کہ میں نے آدھی بھری ہوئی پیالی چھوڑی ہے یا آدھی خالی کہ پیچھے سے سکینڈ ایر کی ایک ٹولی گزری۔ "نوشین مبارک۔" انھوں نے موسم کی پہلی برفباری کی مبارک باد دی اور میرے ہاتھ میں برف کی گولی تھما دی

"لیکن کل سویرے تو میں جارہی ہوں۔ اب پارٹی کا کیا ہوگا؟" میں کشمیری رواج سے واقف تھی کہ "نوشین" ــــ یعنی نئی برف کا تحفہ ہاتھ میں لے لو تو دینے والوں کو دعوت کھلانی پڑتی ہے۔"

"WISH YOU HAPPY VACATIONS, MISS KHAN"

(مس خان آپ کو چھٹیاں مبارک ہوں) چند ایک نے اپنی نیک تمنائیں اچھالیں۔

"SAME TO YOU" (آپ کو بھی) میں نے جواب دیا۔

"آج تیری یہ بے چینی بلا وجہ نہیں ہے۔" نفیس کا لہجہ مشکوک تھا۔

"پھر تو نے کیا سوچا ہے؟" ــــ پریا نے پوچھا۔

"کس بارے میں کیا سوچا ہے؟" میں نے بخاری کی راکھ کریدتے ہوئے سوال لوٹا دیا

"آ ا ــــ ا ــــ بن مت" ــــ پریا نے دانت پیس کر کہا "کیا جواب دے گی کل عارف کو؟"

اوہو ــــ گویا میرا راز اب راز نہیں رہا تھا ــــ لیکن میں نے اسے راز رکھا ہی کب۔ یہ چوری چھپے کا انس تو صرف نئی نویلی چھوکریوں کا ہی حصہ ہوتا ہے۔

"کرلے شادی اب ــــ ورنہ کوئی دیکھے گا بھی نہیں تیری طرف۔

ساکت و جامد بیٹھی مسز سلیمان گویا مجھ سے نہیں سامنے والی دیوار سے مخاطب تھیں۔

"تو کیا میں اتنی گئی گزری ہوں؟" میں نے جل کر للکارا۔

"چل اسی گھمنڈ میں تو تو نے بعض اچھے PROPOSALS (رشتے) ٹھکرا دیے۔" شادی شدہ نفسیں نے آڑے ہاتھوں لیا۔

"یہ جوانی اور یہ نکھار تو دو دن کا ہے" ــــ مسز سلیمان کی آرام کرسی سے لاسلکی لہریں اٹھیں۔ میں کامن روم سے باہر نکل آئی۔

"پتہ نہیں کل فلائٹ ہو نہ ہو" ــــ میں نے سرمئی آسمان کو تکتے ہوئے سوچا۔ اس بار می نے بڑے اصرار سے چھٹیاں گزارنے کی دعوت دی تھی۔ ان کے امریکہ پلٹ بھائی بھی شاید آنے والے تھے۔ ہر قدم کے ساتھ پچھلی زندگی کا ایک ایک ورق الٹنے لگا۔ اماں کے انتقال کے بعد ابا نے دوسری شادی کر لی اور نتیجے کے طور پر میں بورڈنگ ہاؤس بھجوا دی گئی۔ تب مجھے حالات سے سمجھوتہ کرنا نہ آتا تھا۔ چھٹیاں شروع ہوتیں، ہاسٹل کی ساری لڑکیوں کو لینے کے لیے کوئی نہ کوئی آتا ــــ جب آخری لڑکی کا لہراتا جسم میری نظروں سے اوجھل ہو جاتا تب اپنے کمرے کی کھڑکی سے لگی میں سوچتی کہ مجھے بھی لینے کے لیے ابا آئے ــــ وہ آئے۔ آئے ــــ لیکن کوئی نہ آتا اور تین مہینے کی طویل سرد چھٹیاں، نئوں کے براق پیراہنوں کے تھپیڑے کھاتی ایک تتلی کی طرح میں گزار جاتی۔ پڑھائی ختم کرنے کے بعد مجھے کالج میں نوکری مل گئی۔ اور ابا کی اجازت سے پہلی بار چھٹیاں گزارنے گھر گئی۔ میں نے ہمیشہ کوشش یہی کی کہ ابا کی نئی زندگی میں کسی طرح میرا دخل نہ ہو۔

گھر آ چکا تھا ــــ جھیل ڈل کے کنارے میرا چھوٹا سا فلیٹ ــــ دروازہ کھولا تو ایک لفافہ ملا۔ کسی نے دراز میں سے اندر ڈھکیل دیا تھا۔ ایسا لگا جیسے میں عارف سے ٹکرا گئی۔ اسی کی چٹھی تھی۔ ایک پل کے لیے میں ٹھٹکی ــــ آج عارف میرا جواب لینے کے لیے آنے والا تھا لیکن چٹھی میں لکھا تھا کہ ہوائی سروس میں بھیڑ کی وجہ سے اگلے کئی دنوں تک پلین میں سیٹ ملنے کی امید نہیں تھی اور اتفاق سے آج اسے ایک کینسل شدہ سیٹ مل گئی اس لیے وہ جا رہا ہے اور دلی میں مجھ سے ملے گا۔

رات میں سیاہی گھلتی گئی ــــ میں نے اپنا مختصر سا سامان پیک کیا اور دیر تک کھڑکی میں کھڑی روئی کے گالوں کی طرح گرتی برف کو دیکھتی رہی۔ "کل شاید فلائٹ نہ ہو" ــــ میں نے سوچا۔

سویرے ایرلائنس آفس میں پہنچی تو پتہ چلا کہ برفباری اور کہرے کی وجہ سے واقعی پلین نہیں جائے گا۔ اتفاق سے وہیں پریا کے ڈیڈی مل گئے۔

"تو میرے ساتھ چل ــــ پٹھانکوٹ میرا آج جانا لازمی ہے۔ ہم اپنی کار سے چلیں گے۔"

بانہال تک ہر جگہ برف ہی برف تھی لیکن بانہال کے پرے دنیا کچھ اور ہی تھی۔ وہاں سبزہ تھا۔ ہوا کے خنک جھونکے تھے۔ رات گئے ہم پٹھانکوٹ پہنچے۔

"میں تجھے ٹرین میں بٹھا دوں۔" پریا کے ڈیڈی نے کہا "کل لوٹ جاؤں گا ــــ دلی میں وقت ملے تو پریا کے منگیتر سے مل لینا۔"

تھوڑی دیر میں ٹرین پلیٹ فارم پر آ گئی ــــ ساری کی ساری ٹرین چھان ماری۔ لیکن کہیں جگہ نہ ملی۔ بغیر ریزرویشن ٹرین میں جگہ ملنا تقریباً ناممکن تھا۔ لوگ زیادہ سفر پسند ہوتے جا رہے ہیں۔ میں ناامید ہونے ہی لگی تھی کہ پریا کے ڈیڈی نے آواز دی۔

"جلدی آ نسرین" ــــ جب میں وہاں پہنچی تو ایک کوپے میں صرف ملٹری کا ایک افسر بیٹھا تھا۔ "BE KIND ENOUGH TO ACCOMODATE THIS NAUGHTY GIRL" (مہربانی کر کے اس شریر لڑکی کو جگہ دے دیجیے) پریا کے ڈیڈی نے اس سے کہا۔

"OH, SURE" یقیناً! افسر اپنی جگہ کسمسایا۔

قلی نے میرا سامان اندر پھینکا اور میں داخل ہوئی ہی تھی کہ ٹرین چل پڑی۔ پہلے جھٹکے کے ساتھ ہی میرے ذہن پر ایک سایہ سا گزرا۔ میں نے کنکھیوں سے اپنے ہمسفر کو دیکھا۔ وہ ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ ملٹری کا گرم اوورکوٹ اپنے شانوں پر ڈالے مجھ سے بے اعتنا اپنے خیالات میں گم وہ بیٹھا رہا۔

دل میں ایک ہلکا سا ڈر ابھرا۔ اس طرح کسی اجنبی مرد کے ساتھ اکیلے رات میں میں نے کبھی سفر نہیں کیا تھا۔

"دروازہ بند کر لیجیے" ــــ اس نے بڑی شائستگی سے کہا۔

"ہائیں ــــ!" میرا دل اچھلا۔

"ورنہ اگلے اسٹیشنوں پر اور مسافر تنگ کریں گے۔"

اوہ ـــــ "میں نے سوچا ـــــ دروازہ تو بند کرنا ہی تھا۔ اپنے آپ میں خود اعتمادی پیدا کرتے ہوئے میں نے دروازہ بند کر دیا۔

"آئی ایم ساری" ـــــ میں نے کہا اور پلٹی ـــــ تو اس نے سر سے پیر تک ایک بار مجھے دیکھا

"بالکل اکیلی سفر کر رہی ہیں آپ ؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"ظاہر ہے" ـــــ ہلکا سا طنز تھا میرے لہجے میں۔

"ڈر نہیں لگتا ؟" ـــــ مسکراہٹ زیادہ گہری ہو گئی۔

"آج تک کسی انسان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں پیش آئی" میں نے بن کر کہا ـــــ حالانکہ اپنے دل کا حال میں ہی جانتی تھی۔

"اوہ ـــــ" ـــــ اور وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"آپ کہاں سونا پسند کریں گی ؟"

"میں اوپر ہی سوؤں گی" ـــــ میں نے فوراً فیصلہ کیا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا اور میں اپنا ہولڈ آل کھولنے لگی۔

"عجیب بدتمیز ہے" ـــــ میں نے سوچا ـــــ "اٹھ کر مدد تک نہیں کرتا۔ لیکن اچھا ہی ہے یہ جناب دور ہی رہیں اور سفر بغیر کسی 'اہم واقعے' کے گزر جائے۔"

اوپر والی برتھ پر پہنچ کر میں ایک گونہ محفوظ ہو گئی۔ لیکن پھر بھی میرا دھیان اپنے ہم سفر کی طرف لگا ہوا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ لاکھ ہمت والی سہی پھر بھی عورت کبھی کبھی غیر محفوظ ہو سکتی ہے۔

میرے ساتھی نے کوئی ناشائستہ حرکت نہیں کی تھی۔ پھر بھی میرا دل دھڑکے جا رہا تھا اور میں بار بار جھانک کر نیچے اسے دیکھ لیتی۔ وہ اسی طرح بظاہر کسی گہری سوچ میں بیٹھا رہا۔

"میں نہیں جانتا تھا کہ خوبصورت لڑکیاں بھی چین کی نیند نہیں سو پاتیں۔" اس نے اچانک ہنس کر اوپر دیکھا۔

میں کٹ گئی کیونکہ اس نے مجھے تاک لیا تھا۔

"سنبھل" میرے دل نے للکارا ـــــ یہ تو کھلنے لگا۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ٹرین بہت تیزی سے جا رہی تھی۔ اس سے آگے میرا دماغ اڑا جا رہا تھا۔ اپنے بے سبب ڈر پر جھلاہٹ بھی ہو رہی تھی۔ "کوئی مسافر اور آ جائے" ـــــ میں نے دل ہی دل میں دعا کی۔ "لیکن" اب یہاں کوئی نہیں آئے گا" ـــــ مجھے مایوسی ہوئی۔ گیارہ بج رہے تھے اور کوپے کی بتّیاں بجھی ہوئی تھیں۔ میں دم سادھے پڑی رہی لیکن رفتہ رفتہ میرے خوف میں کمی آ رہی تھی۔ "آخر کو انسان ہی تو ہے" میں نے خود کو ہمت دلائی "بس تھوڑا سا ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے" ـــــ ٹرین ٹھہرانے کی زنجیر میرے سر کے پاس ہی تھی۔

ٹرین کی رفتار میں کمی آ رہی تھی ـــــ کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔

چھوٹے چھوٹے جھٹکے لیتی ہوئی ٹرین رک گئی۔ اسٹیشن پر معمولی بھیڑ تھی۔ مختلف چہرے کھلی کھڑکیوں سے اندر جھانکتے ہوئے گزر جاتے ـــــ ایک چہرے نے اندر جھانکا، ٹھٹکا اور دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے اس نے کھولنے کی اپیل کی۔

"RESERVED" (ریزروڈ) ـــــ میرے ساتھی نے کہا۔

"ٹرین چھوٹنے والی ہے، جلدی کھولیے۔" اس عورت نے شکستہ ریزی میں کہا "میرا بچہ بیمار ہے ـــــ مجھے اس کے پاس پہنچنا ہے جلدی کھولیے ـــــ پلیز ـــــ"

مجھے ایک دم خیال آیا کہ یہ عورت اندر آ جائے تو سفر بے کھٹکے گزر جائے گا" اور پھرتی سے اتر کر اپنے ہم سفر کے منع کرنے کے باوجود میں نے دروازہ کھول دیا۔ اور وہ اندر آ گئی۔

"اب آپ کہاں سوئیں گی" ـــــ افسر نے کہا "یہاں تو جگہ نہیں ہے" اس کے لہجے میں ناگواری تھی۔

"آپ فکر نہ کیجیے ـــــ مجھے نیند آئے گی ہی نہیں" ـــــ وہ ہانپتی ہوئی بولی

"آپ ایسا کیوں نہ کریں" میں اس افسر کی بے چینی سے خوش تھی "میرا ہولڈ آل فرش پر لگا کر کچھ آرام کر لیجیے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے ـــــ سفر ہی ایسا کون لمبا ہے" اس نے ہولڈ آل بچھاتے ہوئے کہا "تھوڑی دیر میں صبح ہوتی ہے" وہ مطمئن سی ہو گئی۔ ٹرین چل پڑی ـــــ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ اس بچاری عورت نے آ کر مجھے بے فکر کر دیا تھا ـــــ لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی

اچانک میری آنکھ کھل گئی ـــــ ٹرین اپنی رفتار سے جا رہی تھی لیکن

کمپارٹمنٹ میں کچھ ہنگامہ سا برپا تھا ــــــ میں نے ہڑبڑا کر نیچے دیکھا اور دہشت سے میری آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ میری ہمسفر اور ملٹری کے افسر میں تکرار ہو رہی تھی۔ میں نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ فضا کافی ناخوشگوار تھی۔ اس عورت کے گال آنسوؤں سے تر تھے۔

"کمینے، ذلیل تو نے مجھے اکیلا دیکھ کر ناجائز فائدہ اٹھایا"

اس کے بلاؤز کی دھجیاں اڑ رہی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے، چہرہ غصے اور یاس سے تمتایا ہوا تھا۔

"شور نہ مچاؤ" ــــــ افسر نے سختی سے کہا۔ وہ عورت اور بھی چلانے لگی۔

"شریف عورتوں کی عزت پر حملہ کرتا ہے۔ کمینے! لیکن میں بھی تجھے چھوڑوں گی نہیں ــــــ کتنوں ہی کی زندگیاں تو نے تباہ کی ہوں گی ــــــ یہ تم سے کہہ رہا تھا کہ مجھے اندر نہ آنے دو" اس نے مجھے تاکتے ہوئے کہا: "لو تمہاری بلا شاید مجھ پر ٹلی ہے" ــــــ اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

"تمہاری جیسی عورتوں کو میں خوب جانتا ہوں" ــــــ افسر نے طنز سے کہا "میرے پاس پیسے ہوتے تو تو ے بھی دیتا ــــــ لیکن..."

اتنا سننا تھا کہ اس مرتعش جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔

"کتے! الٹے مجھ پر الزام لگاتا ہے ــــــ" عورت کو اتنا بے بس اور مجبور مت سمجھ، میں تجھے سبق پڑھا کر ہی دم لوں گی"

"بکواس بند کرو ــــــ انبالہ آ رہا ہے" ــــــ

عورت کی سسکیاں چیخوں میں بدل گئیں ــــــ وہ اپنا سر پیٹے جا رہی تھی۔

"میں تیری بوٹیاں نوچ لوں گی ــــــ اپنی جان دے دوں گی"

میں نے حقارت بھری نظروں سے افسر کو دیکھا۔ وہ اپنی گھبراہٹ کو دبانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ یہ مرد اپنے چہروں سے پوری طرح الگ ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا ــــــ ٹرین نے آخری سسکی بھری اور انبالے کے پلیٹ فارم پر رک گئی۔ کیپٹن اٹھا اور کھڑکی میں سے قلی کو آواز لگائی ــــــ لیکن اس سے پہلے ہی اس عورت نے دروازہ گھیر لیا تھا۔ اس کی حالت زار اور چیخوں نے سب ہی کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اتنی سردی میں بھی افسر کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں ــــــ کمپارٹمنٹ کے باہر بھیڑ لگ رہی تھی اور میں اسی طرح دبکی اوپر والی برتھ سے تماشہ دیکھ رہی تھی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

گارڈ اور اس کے پیچھے پولیس انسپکٹر دروازہ کھلوا رہے تھے۔ اس عورت نے دروازہ کھول دیا اور وہ لوگ اندر چلے آئے۔

"کیا معاملہ ہے؟" ــــــ گارڈ نے معاملہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"اس سے پوچھو" ــــــ اس نے افسر کی طرف انگلی اٹھا

گارڈ نے کمپارٹمنٹ کا جائزہ لیا۔ مجھے دیکھتے ہی کہا "اے میم صاحب، آپ وہاں لیٹی ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہی ہیں۔ بتاتی کیوں نہیں کیا بات ہوئی۔ آپ بھی تو اسی کمپارٹمنٹ میں تھیں"

ایک دم میرے دماغ نے جست لگائی۔ ابھی تک میں خود کو اس حادثے سے بالکل الگ محسوس کر رہی تھی۔ میں نے سوچا یہ معاملہ بڑھے گا ضرور اور بیکار عدالتوں میں کھنچائی ہوگی۔

"میں کچھ نہیں جانتی" ــــــ اور واقعی مجھے کچھ نہیں معلوم تھا

"تم خود بھی عورت ہو" اس عورت نے احتجاج کیا ــــــ "اس طرح خود کو الگ کیوں رکھ رہی ہو۔ کیا تم موت کی نیند سو رہی تھیں جو کشمکش سنائی نہیں دی" ــــــ وہ جھلا کر بولی: "انسپکٹر صاحب۔ اس ظالم نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا ــــــ دیکھیے میری کلائیوں پر اس کے ناخون کے زخم ــــــ میں ایک منٹ کے لیے باتھ روم گئی اور اس نے مجھے پیچھے سے دبوچ لیا۔

"یہی کچھ ہوا ہوگا" ــــــ میرا قیاس بھی بولا۔

اچانک بھیڑ کو چیرتے ہوئے ملٹری کا کوئی بڑا افسر اندر آیا۔ یہ برگیڈیر مان سنگھ تھے۔ میں نے کئی بار انھیں کلب کی پارٹیوں میں دیکھا تھا! ان کی گہری نظروں نے تھوڑی ہی دیر میں بہت کچھ سمجھ لیا ــــــ سامنے رکھے ٹرنک اور کیس پر لکھے نام پر انھوں نے ایک نظر ڈالی۔

"کیپٹن بترہ! YOU DONT DESERVE THEM" (تم ان کے اہل نہیں ہو) برگیڈیر نے ہاتھ بڑھا کر بڑے کوٹ کے اندر سے کیپٹن کے کالر۔ چاہے۔ اور ساتھ ہی کوٹ کھینچ کر اس کے شانوں سے نیچے گرا دیا۔ وہاں کوئی نہیں تھے۔ وہ عورت آنسو پونچھ رہی تھی اور ساڑی سے اپنے جسم کو چھپانے کی ناکام کوشش میں لگی تھی۔ اب کیپٹن کے آنسو بہہ رہے تھے اور مجمع کو چپ

سانپ سونگھ گیا تھا۔ میں نے ذرا سی گردن اور آگے بڑھائی۔ وہ عورت
قدم پیچھے ہٹی اور اس نے اپنی ابھرتی ہوئی چیخ کو ہاتھ سے روک لیا۔
آنکھوں سے دھنکے جا رہی تھی کیونکہ کیپٹن کے دونوں ہاتھ شانوں سے کٹے ہوئے تھے۔
"OH MY BOY, MY BOY." برگیڈیر نے کیپٹن کو گلے سے لگا لیا۔
"سر" ــــــ کیپٹن کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ کھو کھلے آستین نہ
کیا پوچھتے "ان ہی کٹے ہوئے ہاتھوں نے مجھے ایک دن خون کے آنسو رلائے
تھے۔ آج انھوں نے ہی میری عزت بچائی ہے۔" قلی نے اس کا سامان سر پہ
رکھا اور وہ خاموشی سے اتر کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ شرمسار چہرے لیے
تکے جا رہے تھے۔ ٹرین مخالف سمت میں چلنے لگی ــــ ٹرین ہمیشہ مخالف
سمت میں ہی چلتی ہے۔

پتہ نہیں کب تک میرے آنسو بہتے رہے ــــ زندگی میں پہلی بار مجھے
اپنے عورت پن کا احساس ہو رہا تھا ــــ اس خالی کمپارٹمنٹ میں اب بس
وہی چہرہ ہر طرف نظر آ رہا تھا۔ کبھی بانکا، متین اور ہلکی مسکراہٹ لیے اور
کبھی آنسوؤں سے تر ــــ اس چہرے نے مجھ سے بہت سی ... میں نے
بہت کچھ سمجھایا۔ میں نے سوچا صرف میدانِ جنگ ہی نہیں ہے جہاں
زندگی کے سودے ہوتے ہیں۔ یہ بازار تو ہر جگہ سجے ہوئے ہیں۔ کہیں روح
بکتی ہے تو کہیں جسم بکتے ہیں۔ بیچنے والا ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے۔ لیکن
گاہک بھی کچھ خاص فائدے میں نہیں رہتے۔ یہ چہرہ عارف کا بھی ہو سکتا
تھا، مدلل اور سلجھی ہوئی باتیں کرنے والا ــــ زندگی کے سیدھے سادے
اصول سمجھانے والا۔ دل پر سے ایک بوجھ سا ہٹنے لگا۔ یہاں تک کہ دہلی
کا پلیٹ فارم آ گیا۔ ابا اور ممی مجھے لینے آئے تھے اور ممی کے بھائی بھی۔ ہم دونوں کی نظریں ملیں
ممی نے کہا "میرے بھائی عارف سے ملو نسرین!"

★

غزلیں

مسعودہ حیات

رہینِ درد ملے کچھ جگر فگار ملے
تری گلی میں سبھی ہم سے بیقرار ملے

غمِ جہاں میں دلوں کو ذرا قرار ملے
جدھر نگاہ اٹھے تیری رہ گذار ملے

جنونِ عشق کو سود و زیاں کا ہوش کہاں
سحر کا نور ملے یا فضائے دار ملے

رہے جو رنگِ لطافت پہ بھی خزاں بدوش
چمن میں ایسے بھی پروردۂ بہار ملے

ہمارے شوق نے روشن کیا ہے راہوں کو
ہزار طور سرِ شام انتظار ملے

سنوار دے کوئی اب یوں نظامِ ہستی کو
دلوں کو زندگی روحوں کو اعتبار ملے

مری نگاہِ طلب تک کوئی پہنچ نہ سکا
اگرچہ دہر میں اہلِ خرد ہزار ملے

رُخِ حسیں پہ تبسم کی یوں لکیریں ہیں
چمن کو جیسے مہکتی ہوئی بہار ملے

حیاتؔ راہِ محبت ہے سوزشِ پیہم
جہاں بھی اہلِ محبت گئے شرار ملے

شہرادنزہ ۹ ۱۸۵ انک

سیف الحق سیف بجنوری

خاطر میں تلخیِ غمِ دوراں نہ لائیے
ساقی سے جام لیجیے اور مسکرائیے

پردہ بہ پردہ چہرۂ زیبا دکھائیے
جلوہ بہ جلوہ مجھ کو تماشا بنائیے

جی بھر کے ظلم کیجیے پیہم ستائیے
خوب آزمائیے مجھے خوب آزمائیے

پیمانِ دوستی نہ کہیں بھول جائیے
محکم رہے یہ عہدِ وفا ہاتھ لائیے

میری تباہیوں پہ نہیں آپ منفعل
ہاں ہاں مجھے یقیں ہے نظر تو ملائیے

پردے سے اور حسن کے جلوے ہیں آشکار
اس شرم اس حجاب کے قربان جائیے

ساقی گری کا لطف نہیں بے نظر ملے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ساغر پلائیے

میں ہوں رہینِ موجِ بلا، ناخدا ہیں آپ
طوفانِ غم سے پار یہ بیڑا لگائیے

دل داغدار ہے تو نظر ناشناسِ حسن
بزمِ جمالِ دوست میں کس منہ سے جائیے

یہ دلکشی حیا کی، یہ دلچسپی حیات
اس انجمن سے کس طرح دامن بچائیے

کس نے قسم نباہ کی کھائی تھی سیفؔ سے
کس نے دیا تھا قولِ وفا یہ بتائیے

اتر پردیش میں صدر راج نافذ ہونے کے بعد ۱۵ رجون کو گورنر شری اکبر علی خاں ودھان بھون میں
پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے

شری اکبر علی خاں گورنر و چانسلر ۲۸ رجون کو یو۔پی کی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں کو خطاب کرتے ہوئے

لکھنؤ میں ۳۰ رجون کو پہلی جنگ آزادی کی یاد منانے کے سلسلے میں سکندر باغ سے جہاں انگریزی فوجوں سے گھمسان کی لڑائی ہوئی تھی ایک جلوس نکالا گیا جو ریذیڈنسی تک گیا (اوپر) جلوس کا ایک منظر (نیچے) جلوس ریذیڈنسی پہنچ کر جلسے میں تبدیل ہو گیا۔ اس تقریب میں تانتیا توپے کے پرپوتے اور برجیس قدر کے پرپوتے نے بھی جو ڈائس پر دیکھے جا سکتے ہیں، شرکت کی۔

گورنر شری اکبر علی خاں ۵ ر جولائی ۱۹۷۳ء کو لکھنؤ۔ بارہ بنکی شرک پر واقع ہندستان ایرونا ٹکس کے احاطے میں ۲۴ ویں ون مہوتسو کا افتتاح کرتے ہوئے

ون مہوتسو

شری اکبر علی خاں ۴ ر جولائی کو ون مہوتسو کے موقع پر راج بھون میں ایک پودا نصب کرتے ہوئے

گورنر شری اکبر علی خاں یہ رجوت کومتاز انٹر کالج، لکھنؤ میں اتر پردیش ریاستی انجمن ترقی اردو کے
جلسے کو خطاب کر رہے ہیں

گورنر شری اکبر علی خاں فارسٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، دہرہ دون میں مرکزی سینچائی اور بجلی بورڈ
کے تحقیقاتی سیشن کا افتتاح کر رہے ہیں

لاونی

اظہر علی فاروقی

لوک سماج میں لاوَنی نے کئی صورتوں سے دخل پایا ہے۔
(۱) ایک سنگیت اُپ راگ (ضمنی نغمۂ موسیقی) (۲) ایک عروضی بحر (۳) عوامی شاعری (۴) لوک گیت۔ اس مقالے میں انھیں پہلوؤں کی کچھ جھلکیاں دکھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ایک سنگیت اُپ راگ

جب ایرانی اور افغانی مسلمان ہندستان آئے اور یہاں آکر بس گئے اور اسی سرزمین کو اپنا وطن سمجھنے لگے تو انھوں نے اپنی سماجی روایات سے یہاں کے باشندوں کو جیسا کچھ متاثر کیا اس سے کہیں زیادہ وہ یہاں کی روایات اور رسومات سے متاثر ہوئے اور انھیں اس طرح اپنایا کہ وہ انھیں کی معلوم ہوتی ہیں۔ اس اختلاط اور ارتباط کے اثرات زندگی کے ہر شعبے پر پڑے اور ہندستانی سنگیت بھی اس سے الگ نہ رہ سکا اور ہندستانی موسیقی کے فن میں نئے نئے موڑ پیدا ہوئے۔

اس سلسلے میں خاص الخاص نمائندگی کا شرف حضرت امیر خسروؒ (۶۵۳ھ تا ۱۲۵۳ء ۱۳۲۴ء) کو ہے۔ وہ نہ صرف ایک عظیم شاعر تھے بلکہ الحانی اور سُر لاتی موسیقی کے ایک زبردست ماہر اور ایک بہت زبردست مخترع فنکار تھے۔ انھوں نے ایرانی اور ہندستانی موسیقی میں ایک خوشگوار امتزاج پیدا کیا۔ کئی ساز اور راگ اختراع کیے جن میں کلاسیکی اور جدید دونوں روپ نمایاں ہیں۔ خیال گائیکی کا وجود بھی اسی عظیم شخصیت کا رہین منت ہے۔ چونکہ وہ دور "دھرپد یگ" تھا اس لیے اس وقت اس طرز موسیقی کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو بعد میں نصیب ہوئی۔ خیال کا جنم دھرپد کے لیے ایک ردِّ عمل تھا۔ اس لیے شروع میں خیال پر دھرپد کا اثر بہت کچھ باقی رہا لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ اسے اچھی خاصی مقبولیت حاصل ہو گئی۔ اس راگ میں کافی وسعت اور لچک ہونے کے باعث موسیقار کو نہ صرف فنی حیثیت سے اس میں اپنے جوہر دکھانے کے مواقع حاصل تھے، بلکہ انسانی جذبات کی ترجمانی کرنے میں بھی کچھ زیادہ سہولت تھی۔ دھرپد کی سخت پابندیوں کے باعث موسیقار بہت سی چیزوں میں اپنے آپ کو عاجز سا محسوس کرتا تھا۔ جب کہ خیال میں اپنی شخصیت سمو دینے کی کافی گنجائش تھی۔

دھرپد کے اصولوں میں کچھ ایسی پابندیاں ہیں کہ موسیقار دھرپد گاتے وقت الاپ میں تو اپنے آپ کو ضرور شامل کر سکتا تھا لیکن اس کے علاوہ وہ دھرپد کے قیود میں گھرا رہتا تھا۔ خیال میں مُرکی، چھندوں اور تانوں کا استعمال بہت کثرت سے ہوتا ہے۔ تانیں ہی دراصل اس راگ کی زیبائش اور زینت ہیں۔ جب کہ دھرپد میں یہ سب سختی سے ممنوع ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ خیال کے اصول نہیں ہیں اور کسی قسم کی پابندیاں بھی نہ ہوں۔ وہاں دونوں چیزیں ہیں۔ لیکن دھرپد کے مثل نہیں ہیں اور پابندیوں کی اسی لچک کے سبب یہ راگ آہستہ آہستہ مقبول ہو گیا۔

مغل اعظم شہنشاہ اکبر کا دور سنگیت کی دو راہوں کا سنگم سمجھنا چاہیے۔ یعنی کلاسیکی میوزک اور لوک سنگیت۔ یہ دونوں بھی

تحریک اور تصوف میں گڈمڈ ہو کر اپنے لیے ایک نئی راہ اور نیا رنگ پیدا کر رہی تھیں۔ مہاتما سورداس کی شاعری اور میرا بائی کے بھجن دونوں کلاسیکی موسیقی اور لوک سنگیت کے ملاپ کا ایک خوش آہنگ طرز پیش کرتے ہیں۔

شہنشاہ جہانگیر اور شاہجہاں کے دور میں موسیقار اور موسیقی کا وقار اور رکھ رکھاؤ تو اپنے حال پر رہا لیکن فنی حیثیت سے ان کو کوئی نئی زندگی نہیں ملی۔ اس اعتبار سے مغلیہ حکومت کے انحطاطی دور میں محمد شاہ کا زمانہ خاصی اہمیت رکھتا ہے نعمت خاں سدا رنگ نے راگ کو بڑی ترقی دی جو شاہی بین کار تھے۔

اس طرز کو سلطان حسین شرقی والی جونپور نے نئی تراش اور نکھار دے کر دھرپد کا اثر کم کر کے بچدا (عوام اسی کو بچرا کہتے ہیں) کا رنگ چڑھا کر خیال کو ایک نیا روپ دیا۔ بچدا ہمارے صوبہ اتر پردیش میں عورتوں کے گیتوں کی نغمہ سرائی میں بہت مقبول رہا ہے۔

لوگ گیت کی یہی قسم آگے چل کر لاؤنی کہی جانے لگی۔ اگرچہ اچھے گائکوں خصوصاً مسلمانوں میں یہ طرز خیال کے نام سے ہی مشہور اور مستعمل ہے۔ البتہ ہندو سنتوں اور سائیں لوگوں اور کم سواد مسلمان درویشوں اور ملنگوں میں لاؤنی مُرکی اور مرے بھی کے نام سے رواج پذیر رہی۔

اُپ راگ کے روپ میں اس کا فروغ سترھویں صدی عیسوی میں لون پردیش (موجودہ لور کے قرب و جوار) میں ہوا اور ہندو سنتوں نے اسی مناسبت سے لاؤنی نام کو بچدا اور خیال پر ترجیح دی اور یہی نام مسلمان درویشوں میں بھی رواج پا گیا۔

خیال کی ایک ترمیم شدہ صورت سمجھتے ہوئے موسیقی کی ایک مشہور تصنیف "کلپ دُرم" کے صفحہ ۱ پر ایک اُپ راگ (ضمنی نغمہ) کے روپ میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"لاوڑیں (لاونی) جوگیا جنگی آہنگ سہادنا کول لکا"

(لاونی جوگیوں کا ایک مدھر اور سہانا راگ ہے) اور اس کا شمار دیسی راگوں میں کیا گیا:

دیسی دیشتے بھرتی نام تد دیشی گان مچ تیے۔

راگ کے اس طرز کو خواص میں کوئی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی اور اس کو دیہی اور عوامی ہی سمجھا جاتا رہا دیسے کہا تو جاتا ہے کہ ماہر موسیقار تان سین نے جن راگوں کو فنی کسوٹی پر پرکھا ہے اور جن میں نغمہ سرائی کی ہے، ان میں لاؤنی بھی ایک راگ رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی مقبولیت صرف عوام تک محدود رہی اور لاونی شاعری کرنے والے شاعروں کے ذریعے لاونی اکھاڑوں (جماعتوں) کے گائکوں کے ذریعے ہی اس کا رواج ہوا۔

(۲) ایک عروضی بحر۔ عروضی نقطۂ نظر سے لاؤنی کاروں نے اس میں بائیس ماتراؤں کی شرط لگائی اور اسے بائیس حرفی بحر بنایا۔

اے پیارے نبی آپ کی ہر سعی بخدا بے سہاروں کے

۱ ۲ ۳ ۴ ۵،۶ ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷ ۱۸

کام آ گئی۔

۱۹، ۲۰ ۲۱ ۲۲

کوشش آپ کی بخششیں آپ کی شکر ہے غم کے

۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹ ۱۰ ۱۱،۱۲ ۱۳ ۱۴ ۱۵

ماروں کے کام آ گئی

۱۶ ۱۷ ۱۸ ۱۹، ۲۰ ۲۱ ۲۲ (شکور خلیفہ الہ آباد ۳)

زحاف کے طور پر ایک دو ماتراؤں (حرفوں) کی کمی زیادتی کی اجازت بھی رہی۔ بائیس حرفی والی بحر دراصل مراٹھی زبان کی ایک بحر سے لی گئی ہے جس کو "رادھا دستی کرن" کہتے ہیں۔

ہیئت کے لحاظ سے لاونی کو ایک طرح کا مسدس سمجھنا چاہیے مگر لاونی کے شاعر پہلے چار ہم قافیہ و ردیف مصرعوں کو مربع یا چوبائی کے بجائے چوک یا چوکا کہتے ہیں۔ پانچویں مصرعے کو اڑان اور چھٹے کو ٹیک کہا جاتا ہے۔ کم از کم چار چوکوں پر مشتمل لاونی ایک طرح سے مکمل سمجھی جاتی ہے۔

رفتہ رفتہ بائیس حرفی بحر میں کچھ وسعت پیدا ہونے لگی اور

اس کی پابندی اٹھنے لگی۔ سمجھدار پڑھے لکھے لاونی شاعروں نے فارسی بحروں میں لاونیاں کہنا شروع کر دیا۔ ہندی میں بھی یہی ہوا کہ ہندی کے مروّجہ چھندوں میں لاونیاں بنائی جانے لگیں۔

لاونی کاروں اور لاونی گائکوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ فارسی اور سنسکرت کی بحروں سے کام لینے لگے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کیا کہ اپنے تخیل، اپنی ذہنیت، اور اپنی ضرورت کے مطابق بہت سی دوسری بحریں بنا لیں یا فارسی کے مروّجہ نام بدل دیے۔ یہ وہ بحریں ہیں جو چنگ اور رباب جیسے سازوں اور لاونی گائکوں کے ساتھ دے سکیں۔ برج بولی یا اردو میں لاونی کہنے والوں نے ایسی بحروں کو چھند یا بحر کے بجائے رنگت یا صرف رنگ کا نام دیا یہ وہ رنگتیں ہیں جن کا ذکر نہ اردو عروض میں ہے اور نہ ہندی میں۔ ان رنگتوں میں سے کچھ ایسی رنگتیں ہیں جو لاونی کی قسمیں بن گئیں۔ مسلمان لاونی بنانے والوں نے رنگت حقانی اور رنگت قوال (اس کو رنگ شریف بھی کہا جاتا ہے) الگ الگ بحریں بنائیں اور یہ دونوں لاونی کی قسمیں بھی ہیں۔ اسی طرح قوالی کو بھی آپ اس ضمن میں لا سکتے ہیں۔

چند رنگتوں کے دلچسپ نام پڑھیے۔ ہم ان کے ساتھ رنگت کا لفظ چھوڑے دیتے ہیں۔ آپ ہر ایک کے ساتھ رنگت لگا لیجے:

کھڑی، لنگڑی، سنگیت لنگڑی، بچی
دیپتا، لولی، سفتیل، برہمنی
بیرنگ، حقانی، قوال، ڈیڑھ گُمی (مستزاد)
دو کڑیا (دو لختی)، تکڑیا (مثلث)، چوکڑیا (مربع)
چھ کڑیا (مسدس)، طویل (بحر طویل)، طویل مکھتیا (طویل مخفف)، شکستہ وغیرہ۔

(۳) عوامی شاعری۔ لاونی طرز پر گائی جانے والی کہہ مکرنیوں نے عوامی شاعری کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے جنم کے کوئی ڈیڑھ سو سال بعد اواخر اٹھارھویں صدی اور اوائل انیسویں صدی میں ہندوستان کے اکثر صوبوں خصوصاً راجستھان

مدھیہ پردیش، بہار، بنگال اور اتر پردیش میں اس کا زور بڑھ گیا اور ایک مستقل صورت پیدا ہو گئی، جو ہندو سنتوں اور مسلمان کم سواد درویشوں کی دلچسپی اور شوق کا نتیجہ تھی۔

لاونی کی شاعرانہ حیثیت کا اندازہ کرنے کے لیے ہمیں اس دور میں جانا چاہیے جب ہندو سنتوں اور مسلمان صوفی درویشوں کی بدولت ہندو اور مسلمان عوام کی ذہنیتیں نفسیاتی طور پر بہت کچھ بدل رہی تھیں اور ایک دوسرے سے قریب تر ہو رہی تھیں۔ دھرم اور شریعت کی روایاتی پابندیاں ٹوٹتے ٹوٹتے اپنے لیے نئی راہیں ہموار کر رہی تھیں۔ مسلمانوں کے ورود کے ساتھ اور اس سے زیادہ تیرھویں صدی عیسوی میں دلی سلطنت کی بنیاد پڑ جانے کے بعد جب مسلمان زیادہ تعداد میں یہاں رہ بس گئے اور ہندوستان کی سرزمین کو اپنا وطن سمجھنے لگے اس وقت سے باہمی میل جول میں اضافہ ہوا اور ایک دوسرے کے مذہبی جذبات آپس میں گھلنے ملنے لگے۔

اسی دوران میں عوام (ہندو اور مسلمان) کو صوفیاء اور درویشوں نے ایک طرف اور ہندو سنتوں نے دوسری طرف بعض ایسی راہیں دکھائیں۔ جن میں کچھ لچک تھی اور عوام کے لیے ہموار اور کشادہ بھی۔ ایسے درویشوں، صوفیوں اور سنتوں کو اپنے عقائد و نظریات کی تلقین کے لیے ایسی شاعری (خواہ وہ تک بندی ہی کیوں نہ ہو) کی ضرورت تھی جو عوام کی سمجھ میں آ جائے اور ان کے دلوں میں گھر کر جائے اور اسے گا بجا کر زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اس لیے کہ ان سب کی تبلیغ اور تلقین کا حلقہ عوام پر مشتمل تھا۔ کاشتکار، دست کار، محنت کش و

ان کے اس فعل کو اہل شریعت نے بدعت سیئہ سے تعبیر کر کے نفرت کا اظہار کیا اس کے باوجود مذہب کی یہ راہیں زیادہ سے زیادہ عوام پسند بنتی گئیں۔ اور اس سلسلے کی شاعری میں دوہے بھجن، ساکھیوں وغیرہ کے ساتھ ساتھ لاونی جیسی شاعری بھی وجود میں آئی۔

اس قسم کی شاعری سے ایک اور مسئلہ کچھ حل ہوتا تھا

آتا ہے جو زبان کا مسئلہ تھا اور مرکزی اتحاد پیدا کرنے میں رکاوٹ بنا ہے۔ صوفیاء اور سنتوں نے عوامی زبان اختیار کرکے اسے سلجھانے کی کوشش کی۔ حضرت امیر خسروؒ کی پہلی عظیم شخصیت ہے جس نے یہاں کی عوامی زبان کو آلہ ترسیل بنایا۔

چھٹی کے دانا باتر بندی
ہمرے گھر آئے بنرا محمدؐ

دھیرے بہو مدیا دھیرے بہو
اور گھونگھٹا موں آگ لگا دیتی، قسم کے بہت سے گیت عوام کی زبان اور لب ولہجہ میں خود انھوں نے لکھے اور دوسرے لوگوں نے بھی اس طرف توجہ کی۔

لاونی شاعروں کی تنظیم

لاونی اسوسی ایشن کو اکھاڑا کہا جاتا ہے اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس تنظیم کا سلسلہ سترہویں عیسوی میں "دس نام" سنتوں کے اکھاڑوں سے شروع ہوا جن کے نام قدرتی چیزوں کی مناسبت سے گری (پہاڑی) بن پربت، ساگر، سرسوتی (علم وفن کی دیوی) سورج، وغیرہ تھے جو اکھاڑوں اور اس کے ممبروں کے ناموں کے ساتھ لقب کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ ان میں سب سے نمایاں شخصیت مہاتما ترکن گری کی تھی اور مسلمانوں میں شاہ علی کی۔

لاونی یا خیال گائکوں کی انجمنوں (اکھاڑوں) کے درمیان مقابلے ہوتے رہتے ہیں جن کو ان کی اصطلاح میں دنگل کہا جاتا ہے۔ ہر اکھاڑے کا (خواہ وہ سنتوں کا ہو یا مسلمان درویشوں اور ملنگوں کا) ایک خلیفہ اور ایک استاد ہوتا ہے۔ خلیفہ کا باقاعدہ انتخاب ہوتا ہے اور جو شخص منتخب ہوتا ہے اس کے معتقدین اور پرستاروں کی طرف سے اس کے سر پر پگڑی باندھی جاتی ہے۔

طرّا اور کلغی جماعتیں

لاونی کے پرستاروں کی دو جماعتیں مشہور ہیں۔ (۱) طرّا (۲) کلغی اپنی اپنی جماعت کے لحاظ سے پگڑی پر طرّا اور کلغی لگاتے ہیں۔

یہ دو جماعتیں کس طرح پیدا ہوئیں اس کے بارے میں ایک دنت کتھا یوں مشہور ہے: " مہاتما ترکن گری اور درویش شاہ علی دونوں بڑے گہرے دوست تھے۔ لاونی دنگلوں میں جہاں کہیں بھی جاتے دونوں ساتھ جاتے۔ ایک بار دونوں الور کے مرہٹہ راجاؤں کے دربار میں پہنچے۔ راجا نے بڑی آؤ بھگت کی اور ایک رات لاونی کا دنگل جما۔ دونوں نے بڑی خوبصورت لاونیاں اپنے اپنے گروہوں کے ذریعے پیش کیں۔ راجا اور تمام درباری اور سامعین بہت خوش ہوئے اور بڑی عزت افزائی کی۔ فرمانروا راجہ نے سنت ترکن گری کو ایک بیش قیمت طرّا اور شاہ علی درویش کو ایک بیش بہا کلغی بطور انعامی نذرانہ عنایت کی۔ اس طرح طرّا اور کلغی دو جماعتیں بن گئیں۔ یہ دونوں محمد شاہ مغل تاجدار دہلی کے زمانے کے ہیں۔ ترکن گری متھرا اور شاہ علی درویش لکھن پور ضلع کانپور میں پیدا ہوئے تھے۔ مگر ان دونوں کا دورہ عمل زیادہ تر راجپوتانہ اور ممالک متوسط (مدھیہ پردیش) میں رہتا تھا۔

لاونی انجمن (اکھاڑے) کے تمام ممبر اپنے خلیفہ کا حکم مانتے ہیں اور مذہبی عقیدت رکھتے ہوئے پرستاری کرتے ہیں۔ اسکی نافرمانی کرنے کی کسی کی ہمت نہیں ہوتی۔ خلیفہ کو پورا اختیار رہتا ہے کہ وہ اپنے اکھاڑے کے ممبروں کی ناشائستہ حرکت پر اسے سرزنش کرے اور سزا دے۔ یہاں تک کہ اکھاڑے سے ان کا اخراج کر دے اور دوسرے ممبروں کو اس سے مقاطعہ کرنے کا فرمان جاری کر دے۔

خلیفہ کے بعد ایک استاد ہوتا ہے۔ وہ بھی خلیفہ کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا اور اکھاڑے کے اصولوں کی پابندی کرتا ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ لاونی گائک دنگل میں لاونی گانے سے پیشتر خلیفہ کے بجائے استاد سے اجازت لیتا ہے، تب گانا شروع کرتا ہے۔

جب کوئی شخص کسی اکھاڑے (لاونی انجمن) کا ممبر بننا چاہتا ہے تو اس کو اتنی مٹھائی لانا پڑتی ہے کہ اکھاڑے کے تمام ممبروں کے علاوہ دوسرے اکھاڑوں تک بھی پہنچائی جا سکے۔ اسے ان کی اصطلاح میں "میٹھا" کہتے ہیں۔

لاونی گاتے وقت سنگت کا آلاتی ساز چنگ اور ربانہ

ہے اور نہ ہونے پر (جو شاذ و نادر ہی ہوتا ہے) کسی کڑی میں لوہے کے چند موٹے موٹے کڑے ڈال لیے جاتے ہیں۔ چِمٹا کرتار، اور جھانجھ یا جھال بھی بجالی جاتی ہے۔ دست پناہ (چمٹا) کے موڑ پر ایک موٹا کڑا ڈال کر بجایا جاتا ہے جس کو چمٹا کہا جاتا ہے۔

لاؤنی کے دنگل عام طور پر بسنت کی تقریب پر ہوا کرتے ہیں اور اس موقع پر ہونے والے دنگلوں کو بہت مبارک سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد برساتی مہینوں ساون، بھادوں میں ایسے دنگل ہو جاتے ہیں۔ دنگلوں کی خبریں ایک اکھاڑے سے دوسرے اکھاڑے اور دوسرے سے تیسرے اکھاڑے کو۔ بھی لوگ جا جا کر پہنچا دیا کرتے تھے۔ بسنت پنچمی پر آگرہ میں لاؤنی کا جو دنگل ہوتا تھا وہ بڑا شاندار ہوا کرتا تھا۔ اس دنگل میں دلّی، میرٹھ، شکوہ آباد، ہاتھرس، علی گڑھ، بجنور، رامپور، متھرا، بریلی، کمن پور، پھپھوند، انور، گوالیار، اندور، برہان پور وغیرہ۔ دور دور مقامات سے لاؤنی گوئیے پہنچ کر شرکت کرتے تھے۔

لاؤنی کی ہر انجمن میں دو چار شاعروں کا ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ایسے شاعر زیادہ تر بالکل ابجد خواں یا کم سواد ہی ہوا کرتے تھے جن کے پاس تخیل تھا، الفاظ اور بندشوں کا خنیدہ ذخیرہ بھی تھا لیکن قواعد و عروضی اصولوں سے بے نیاز الفاظ کی صحت اور تلفظ کی درستی کی طرف ان کی کوئی خاص توجہ نہ تھی۔ اس عالم میں بھی کبھی کبھی عربی اور فارسی الفاظ کا برمحل استعمال اور موزونیت لائق ستائش نظر آتی ہے۔ ایک لاؤنی گو گوپی ناتھ (۱۸۶۵ء تا ۱۹۳۰ء) کی ایک طنزیہ ٹیک میں نقط کا کا استعمال ملاحظہ فرمایئے۔

پڑھے لکھے کچھ نہیں پھر شاعری سے کیوں کام لیا
خود خال نگور نقط اور نام رکھ گل فام لیا

لاؤنی گانے والے خود بھی اتنے مشاق ہو جاتے تھے کہ برجستہ مصرعے نکال لیتے تھے۔

ہر اکھاڑے کا ایک نشان (جھنڈا) ہوتا ہے۔ طرّے والی جماعت کے جھنڈے کا رنگ بھگوا اور کلغی والوں کا سبز ہوا کرتا ہے۔ بھگوا غالباً گیروی یا زعفرانی رنگ کو کہتے ہیں۔

دنگل کا آغاز سکھی دوڑ سے ہوتا ہے۔ یہ اصطلاح سنتوں اور درویشوں دونوں میں رائج ہے۔ سکھی دوڑ (ساقی دور) دور ساقی کی بگڑی صورت ہے۔ اس کے دو حصّے ہوتے ہیں (۱) مناجات، نعت، حمد یا منگلا چرن (۲) ذاتی تعارف پہلے حصّے میں مسلمان خدا اور رسول کی حمد اور نعت اور ہندو زیادہ تر گنیش اور شیو کی بندنا کرتے ہیں۔ سکھی دوڑ کا یہ حصّہ اردو شاعری کے ساقی ناموں کی بدلی ہوئی صورت سمجھنا چاہیے۔ ایک لاؤنی جو مسلمان دھوبیوں میں بہت عام ہے، اس میں سرسوتی ماتا کی بندنا کی گئی ہے۔ اسی طرح بادل میاں (۱۸۰۱ء تا ۱۸۶۵ء) اور سوامی محمد (۱۸۱۵ء تا ۱۸۷۰ء) نے اپنی لاؤنیوں میں کہیں کہیں دشنو جی کی بندنا کی ہے:

خدا تیری بڑی خدائی کل عالم کیا پیدا
ربّا تجھ سے لگایا دھیان
سمروں ماتا سرسوتی پھر دشن کا کروں بیان
وہ روشن درویش بڑے اللہ کے پیارے
خدا تیری بڑی خدائی سب کام تیرے ہیں نیارے

سکھی دوڑ کا ایک نمونہ گنیش بندنا میں پڑھئے:

سکھی:
لاڈلے گرجا کے دیجے آن شکت تال جی
لاج رکھ لیجے گجانن گن شنکر لال جی
لال چندن کا تلک یک دنت جڑ ہے لال جی
لال رنگ ہے انگ جن کا ناچتے دے تال جی

دوڑ:
لال گرجا کے برسے ہنال، لگا ہے چندن کا تیکا سا
لکھتی چلے گن جی چال، لیا ہیرن کا ہار گل ڈال
لے کر کھانڈا، ایسی ڈھال لاانسا سینہ کریں تت کال
لاڈلے گرجا کے لال لاج رکھ لیجے، جڑ دیجے تال جی

آخری انیسویں صدی کے لاؤنی گو تجمّل کی ایک لاؤنی پڑھیے

جو گیتی دوڑ کا ایک نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ دو باتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ (۱) نام گاؤں (تعارف) اور (۲) رام اور رحیم کے اتحاد کی تبلیغ،

گیتی؛
رام رحیم تیرے دونوں جس نے اس کا نام رٹا
رہا شاد دونوں جگ میں دکھ دور ہوا اور پاپ کٹا
بھگتوں پر ہو کر سہائے بھگتی دی اور بھگوان بنا
رحم کیا ظالم پے اس سے رحیم اور رحمان بنا

دوڑ؛
بھائی گوری استاد دیال چند کی راہیں بتلائیں
بابو عبدالغفور نے مطلب کی ان سے باتیں پائیں
قادر بخش کا بچن سدا یاد، رجب خاں نے یوں فرمایا
محمد ہادی نے بتلایا رام رحیم محمد گایا
کہیں کچل ہاتھ اٹھا
رام رحیم تیرے دونوں ہیں جس نے اس کا نام رٹا

ذاتی تعارف والا حصہ "نام گاؤں" کہا جاتا ہے۔ اس میں لاؤنی گو اپنے اکھاڑے، خلیفہ اور استاد کا تعارف کراتا ہے۔ یہ حصہ رجز کی بگڑی صورت سمجھنا چاہیے۔ خلیفہ اور استاد کی ستائش والے حصے کی پرچھائیاں تو ایک طویل عرصے تک ہمارے اردو شاعروں پر بھی پڑتی رہیں، یہاں تک کہ آج فلمی گانوں میں بھی کہیں کہیں اس کی بدنما سی صورت نظر آجاتی ہے۔

مرا نام راجو گھرانا ہے نام   بہتی ہے گنگا جہاں میرا دھام

ایک لاؤنی گائک اپنا نام گاؤں اس طرح دیتا ہے:

آیا ہوں بجنور سے رجب میرا نام
درویشوں کے ساتھ پھروں یہی ہے میرا کام
درویش بڑے ہیں ایک ہٹیلے شاہ
اڑ جائیں جس بات پر کریں اسی پہ نباہ
کریں اسی پہ نباہ، خلیفہ [illegible] متوالے
رحیم استاد ہمارے جھنڈے دو ر گڑوائے

میرا جھنڈا لہراتا میرا کلغی میری چھاؤں
بول سنانے پر آجاؤں کیسے دکھاؤں داؤں

دوسرا اس کے جواب میں کہتا ہے:

دیکھ لیے ترے داؤں رجب بھائی میرا
یک ادنیٰ شاگرد حسن بیچ اکھاڑے للکارے
نا کر ایسی بات جو ٹھن جائے میرے تیرے
تم کو وہ للکارے اور شیر نمط دہاڑے
خلیفہ نور محمد متوالے عالی جن کی شان
طرہ کلغی دونوں کو ایک سمجھ لے نشان
خلق خدا میں مشہور صمد استاد ہمارے
دکھا اپنے داؤں کچھ دیکھوں تو پیارے
تم کو وہ للکارے اور شیر نمط دہاڑے

(رحمان فقیر بیلی بھیت محلہ درگا پرشاد)

اس کے علاوہ دوسرے طریقے سے بھی اپنے استاد اور اپنی پارٹی کے ممبروں کے نام لینے کا رواج رہا ہے۔ لاونی راگ پر گایا جانے والا سندر گوری اور رسیا لی کا قصہ جو دو صوبوں میں بہت مقبول ہے اور بہت طویل ہے اس کے دو چوک (بند) ملاحظہ فرمائیے۔

شنکر نے پکڑ لیا ہاتھ دلاسا دے کے لگی سمجھانے
کہ سن نا استاد پوچھتے کیا کیا ہیں دیوانے
کہہ کیا ٹھہری ان دونوں کی بتاتے سن استاد گن مانے
رہی سندر پڑی باغوں میں یا پہنچی اپنے ٹھکانے
رتن دیا رام، کھمک سنتے منشی جی کے [illegible] چھیڑے
ہم ہاں سنگھ بھیئے، پر خیر بخش کی بھائی
چال پر خیال کہا بھرے رس کا
نادر حسین [illegible] باغ کا
[illegible] پیارے [illegible] تا اب رام [illegible]

(۱) رحمان فقیر بیلی بھیت محلہ درگا پرساد۔ (۲) لاونی

بھٹکے بازی

اسی سلسلے میں کسی دوڑ میں یا کسی دوسرے موقع پر دو اکھاڑوں میں باہمی طنزیہ چشمکیں ہونے لگتی ہیں جن کو لاونی والوں کی اصطلاح میں بھٹکے بازی (پھبتی) کہتے ہیں۔ مگر بڑی خوبی یہ ہے کہ بھٹکے بازی کی طعن تشنیع ان کے برتاؤ میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتی۔ دنگل کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اگر کسی طرح ایسا محسوس کیا جاتا ہے کہ کسی کی دل شکنی ہوئی ہے تو اکھاڑے کا استاد فوراً شکررنجی دور کرا دیتا ہے۔ نام گاؤں کے تحت ابھی آپ ایک طنز پڑھ چکے ہیں۔

لاونی کے مضامین

لاونی کے مضامین میں بڑی وسعت ہے عوام ان پڑھ سہی مگر اپنے سینوں میں وہ بھی ایسے دل رکھتے ہیں جہاں ہر طرح کے جذبات انگڑائی لیتے ہیں۔ ان کی زندگیاں خواہ کتنی ہی سادہ اور بے حس سی نظر آئیں مگر وہاں جذبات اور احساسات کی کمی نہیں۔ وہ بھی تخیل کے مالک ہیں وہ جس طرح سوچتے ہیں اسے عملی جامہ پہنا دیتے ہیں اور ان کا ردعمل جس طرح ان پر ہوتا ہے وہ اس کا اظہار کیے بغیر نہیں رہتے۔ مذہب، موسم، عشق و محبت، رقابت، ظرافت و طنز، روزانہ زندگی کی واردātیں اور ان کا ردعمل سبھی کچھ لاونی شاعروں کے پیش نظر رہتا ہے اور سب لاونی کے مضامین بن جاتے ہیں۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ صوفیائے کرام اور سنتوں نے مذہب کے وہ پہلو پیش کیے جو عوامی زندگی سے بہت قریب تھے اور عوام کے لیے ناقابل قبول۔ انسانی اخوت اور محبت کے وہ جذبات پیش کیے جو مذہبی قیود سے آزاد ہیں۔ مذہبی منافرت دور کرنے کی کوشش کی جس سے ہمارا سماج پریشان ہو رہا تھا اور آج بھی ہو رہا ہے چنانچہ لاونیوں میں انسانی اخوت و محبت کی وہ تصویریں نظر آتی ہیں جو سنت کبیر نے پیش کی ہیں۔

یوں ہی بھاگے برہمن و شیخ پھرے کوئی سوئے حرم کوئی سوئے کنشت
ذرا غور تو کیجیے حصول کیا ہے انھیں غیر نظارۂ سنگ یا خشت
(استاد ننھا گری)

خدا ہمارے دلوں میں موجود ہے:

نہ دیر و کعبہ کی سمت شکل برہمن و شیخ جائیں گے ہم
خدا کو خود ہی میں دیکھ لیں گے خودی کا پردہ اٹھائیں گے ہم
(سوامی محمد)

نہ سنکھ باجے نہ سنکھ ہووے مڑھی ہی میں سنسان ہو رہا ہے
جگا لے اے من الکھ پرش کو گپھا میں جوگیت سو رہا ہے
(سوامی محمد)

یوں ہی دیر و حرم میں بھٹکے پھرے، جہاں جانا ہے واں کی خبر ہی نہیں
وہ تو گھٹ ہی کے پٹ میں نہاں ہے، وے اندھوں کو آتا نظر ہی نہیں
(مہاتما اننت گری)

ہے پاس دلدار ڈھونڈتا تو پھرے ہے دشت و جبل کے اندر
وہی مثل ہے ڈھنڈورا ملکوں میں لڑکا اپنی بغل کے اندر
(استاد ننھا گری)

ہری کو ہر میں دیکھ رے مورکھ ہری دیکھے تو نے[1]
دیکھ دکھاؤں دیکھ رہی کا دیکھے موہے
نین بیچ جوت[2] نہ پاؤں کان کے بیچ رہیں
بیچ اونچ راز[3] نہ جانے ہر دے بیچ کا ہوئے[4]

اسی طرح ویدانت کی باتیں بھگتی، ہٹ یوگ، کبیر پنتھ، تصوف وغیرہ کے مسائل اور نظریات کی بہتیری جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ان سب کے ساتھ ساتھ ہندو لاونی کاروں نے دھارمک اشر کتھاؤں (مذہبی تلمیحات) مثلاً دروپدی چیر ہرن، سیتا ہرن، مرگ بدھ (ہرن کا شکار) راون کا چھل کپٹ، اوتاروں کے مختلف روپ، لنکا داہن (لنکا کا جلنا) رام چرن رج (خاک پائے رام) اور اس کا اثر، بھاسکر دیوتا (سورج) اور

(۱) ایشور۔ خدا۔ (۲) روشنی (۳) راز بر لیوی (۴) کیا؟

جنتی کی کتھا، دشنو بھگوان ادمان کا بادن انگل کا بن جانا وغیرہ وغیرہ پر لادنیاں بنائی ہیں۔ مسلمان لادنی شاعروں نے اکثر و بیشتر قرآنی قصوں خصوصیت سے حضرت یوسف اور زلیخا کا قصہ، بھائیوں کی بے وفائی، معراج، حادثہ کربلا، حضرت موسیٰ کا آگ لینے جانا، اولیاء اور صوفیاء کی کرامتوں پر بڑی طویل اور زوردار لادنیاں کہی ہیں۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، سید سالار مسعود غازی وغیرہ کے علاوہ بہتیرے غیر معروف اولیاء کی کرامتوں کا بیان کیا ہے جن کی شہرت مقامی اور ہنگامی رہی ہے۔

گوتم رشی (گوتم بدھ نہیں) کی بیوی اہلیا، جو اپنے شوہر کی بددعا سے پتھر بن گئی تھی، رام چندر کے پیروں کی خاک اس پر پڑ جانے سے پتھر کی وہ مورت اپنی اصلی حالت میں آجاتی ہے۔ ہندو لادنی کار نے خاک پائے رام کی کرامات دکھائی ہے۔ ایک مسلمان لادنی گو عبدالرزاق (۱۹۰۵ء تا ۱۹۶۵ء) اٹالا۔ الہ آباد خاک پائے محمدؐ کا معجزہ اس طرح دکھاتا ہے کہ ایک اندھا یہودی اس خاک کے اثر سے پھر بینائی حاصل کرتا ہے۔

خودداری رخسا نے مہ کامل کے ٹکڑے کر ڈالے
(معجزہ شق القمر)
شانِ حیدری تھی ہاتھوں سے اکھاڑ پھینکا درِ خیبر
(زورِ بازوئے جناب حیدرؓ)
زہے کربل پہ راہِ حق میں کٹائی گردن
(حادثہ کربلا)
سر کو کٹا زورِ بازوئے قاتل کے ٹکڑے کر ڈالے
(شجاعت حضرت امام حسینؓ)
دریا بردشدہ باراتوں اور دولہا کا دریا سے برآمد ہونا
(کرامت حضرت عبدالقادر جیلانیؒ)

جلتی دیگ میں کسی عقیدت مند بی بی کا اپنا بچہ پھینک دینا اور بچے کا صحیح سالم اور زندہ رہنا (کرامت حضرت معین الدین چشتیؒ) افطار صوم اور حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کا قصہ وغیرہ ایسی لادنیاں ہیں جن میں سے بعض تو فقیروں کو ازبر ہیں اور وہ دست پناہ بجا بجا کر گاتے پھرتے ہیں۔ تلمیحات سے پُر ایک لادنی پڑھیے:

دوڑ
صدہا پیمبر گزرے پر اس رتبے کا پانا مشکل ہے
بجز محمدؐ کسی نبی کا عرش پہ جانا مشکل ہے
براق خوش رفتار در دولت پہ بھیجا نا مشکل ہے

اڑان
خدا سے باتیں کر کے اپنی امت کا بخشانا مشکل ہے

توڑ
بجز حضرت عیسیٰ کے، مُردوں کو جلانا مشکل ہے
مُردے جلانا سہل ہے لیکن پتھر کو بلانا مشکل ہے
مثل شمس تبریز کسی کا یہ فرمانا مشکل ہے
قم باذنی کہہ کر اپنی کھال کھنچانا مشکل ہے
یہ سب سہل ہے لیکن قلب منصور میں آنا مشکل ہے
دار کے اوپر چڑھ کے انا الحق حق چلانا مشکل ہے

(شمس الدین خاں ۱۸۶۵ء — ۱۹۴۰ء۔ بیدن ٹولا۔ الہ آباد ۳)

مجازی عشق و محبت

جاگیردارانہ دور کی غزلوں کا پورا پورا چربا لادنیوں میں آپ کو ملے گا۔ وہاں بھی محبوب بے وفا ہے، ہرجائی ہے، رقیب ہے، محبوب کی گلی ہے، ایفائے وعدہ نہ کرنا، وعدے سے مکر جانا، عاشق کی ہجوری، مجبوری، اضطراب اور بے چینی وغیرہ سب کچھ آپ دیکھیں گے۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ غزل کا موسیقار خیال کی بکی دھنوں کو اپناتا ہے اور لادنی گانے والا خیال کی تبدیل شدہ صورت لادنی راگ پر گاتا ہے۔

عاشق کی حالت ملاحظہ فرمائیے:

آنکھ لگی پر نیند کہاں اور سب جانیں یہ سوتے ہیں
منہ پر اپنے ڈال دوپٹا چپکے چپکے روتے ہیں
کبھی عشق میں نیند نہ آوے کبھی بے خبر سوتے ہیں
مستانوں کا حال یہی ہے کبھی ہنستے ہیں کبھی روتے ہیں
(سوامی محمد)

یہ صبر دل کو نہ تاب جی کو نہ آب چشم تر آب میں ہے
یہ چشم گریاں مری جاں عجب طرح کے عذاب میں ہے
(گوپال سنگھ گرجی)

موسمی فضاؤں اور تیوہاروں میں بسنت کا مضمون لاونی گو شاعروں کے لیے بہت عام ہے اور مقبول رہا ہے اور وجہ صاف ظاہر ہے کہ اسی تقریب پر لاونی کے دنگل بڑی شان سے منعقد ہوا کرتے تھے اور اسی لیے منی لال (اواخر انیسویں صدی) ادنی گو اور گائک کو یہ بول سنائی دیتے ہیں:

زباں پہ ہر اک مرد و زن کی جو خوش صدائے بسنت آئی
جدھر کو دیکھو نظر اٹھا کر، نظر ادائے بسنت آئی

اس موسمی کیفیت پر بہت سی لاونیاں ہیں، اس لیے کہ یہ تیوہار تو خانقاہوں کا تیوہار بنا لیا گیا۔

آؤ بھائی ہم سب بھی بسنت منائیں
پیلا نورانی جامہ پہن سب کو دکھلائیں
مورے مکھ مل دینو رنگ بسنتی

ڈیڑھ تکی رنگت میں برسات کی بہار دیکھیے:

گھر رہی گھٹا گھنگور
رے مور شور جل گرے گھور[1] ناساجن مورسی[2] پیوں گھور[3]
ن پھنگ[4] رہے بہو[5] بول رت پاوس کی رہی لوکن ڈول
گھر رہی گھٹا گھنگور

مستزاد اور ڈیڑھ تکی میں اتنا فرق ہے کہ لاونی گائک پہلے چھوٹا مصرعہ گاتا ہے اس کے بعد طویل مصرعہ اور مستزاد میں اس کے برعکس ہوتا ہے:

از خونِ جواناں کہ شدہ کشتہ در ایں راہ رنگین طبق ماہ
خونیں شدہ صحرا و تل و دشت و دمن ولے اے وائے وطن وائے
(اشرف رشتی)

اسی طرح برسات، ہولی وغیرہ پر آپ کو لاونیاں ملیں گی جو امی فرشی کھیلوں پر بھی آپ کو لاونیاں مل سکتی ہیں، جو گوشیا، بارہ گوٹی، تاش وغیرہ۔ ایک لاونی گو شطرنج کھیلنا سکھا رہا ہے:

عقل سے تو کام کھیلو شطرنج، پیدل یک یک قدم چلے
غلط نہ ہو چال کوئی بھائی، گھوڑا ڈھائی قدم چلے
فیل کی چال ہو آڑا ترچھا جا ہے جتنے قدم چلے
قریب ہو رخ آگے پیچھے جا ہے جتنے قدم چلے
کھیل میں وزیر اچا ہے جس منزل کے ٹکڑے کر ڈالے
ے تو خبر شاہ کی ہوا لولا لنگڑا ایسے چارا
مات ہوئی گھوڑے کی شہ پر رہا نہ کوئی چارا

لاونی کی زبان اور پیرایہ بیان

اگر آپ لاونی اکھاڑوں کی سیر کریں اور لاونی گو اور لاونی گائک مہربانی بھی کریں (لاونی گو کو فرصت نہیں ہوتی اور لاونی گویا کا گلا خراب رہتا ہے) تو آپ کو ان سے لاونیاں سن کر اندازہ ہو جائے گا کہ لاونی گو کم سواد ہونے کے باوجود (خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو) اپنی شاعری کے لیے کھڑی بولی ہی یا اردو کو پسند کرتے رہے ہیں۔ اکثر و بیشتر لاونیوں کی زبان (سوامی ترکن گری، شاہ علی درویش اور بادل نیاں سے لے کر اب تک) کھڑی بولی یا اردو ہی ہے (سنسکرت الفاظ کو نظر انداز کر دیجیے) وہ برج اودھی اور بھوج پوری وغیرہ بولیوں کے بجائے کھڑی بولی ہی میں لاونیاں بنانے کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔

زبان صرف اردو ہی نہیں، بلکہ بعض مسلمان لاونی گو شاعروں کے ہاں پرتکلف زبان ملتی ہے جس میں تصنع اور آورد صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے۔

اس قسم کی عوامی شاعری محض تفریح نظر آتی ہے اور اس عنصر کی تکمیل کے لیے صرف یہی نہیں کیا گیا کہ اردو اور ہندی کا میل جول روا رکھا گیا ہو، بلکہ دوسری زبانوں کے نہ صرف الفاظ، بلکہ مصرعے کے مصرعے اور بندشیں کھپا دی جاتی رہی ہیں:

(۱) بہت۔ پانی زوروں میں گر رہا ہے (۲) زہر (۳) گھول کر (۴) پرندے (۵) بہت سے طرح طرح کے۔

نگارِ زیبا بباغ دیدم سروپ سندر انوپ جوبن
تادم بپرسی گفتہ حور نادم [illegible]

گوپال سنگھ لاونی گو اور رنگا رنگ [illegible] پر فخر ہے کہ انھوں نے اپنے دلبر جان کو لبھانے کے لیے چار زبانوں میں ایک خیال (لاونی) باندھا۔ انگریزی، فارسی، پنجابی اور اردو۔

انگریزی میں فرماتے ہیں:

کم سون کم سون مائی ڈیر آئی سی تو یو ڈیل کم ہیئر
مائی ونڈر فل ڈیر ناٹ کم ہیئر یو دل گو اینگ سو فار

فارسی میں استدعا کرتے ہیں:

ظلم مکن ہر بار نزدمن بیا دلدار

اپنی حالت پنجابی میں پیش کرتے ہیں:

رہ رہ ساڈا دل گھبراوندا مینو پیا کہیں نظر نہ آندا
کیڈی جدائی وچ جیا جاندا
ساڈے دل وچ چاہ تو ہوڈی میڈی کال آجا یک بار
ظلم مکن ہر بار نزدمن بیا دلدار

جب کوئی اثر نہیں ہوتا تو بیچارے سیدھی سادی زبان میں التجا کرتے ہیں:

گوپال سنگھ کہے آؤ جانی تیرے عشق میں ہے حیرانی
خیال بنایا چار زبانی

لاونی میں زبان کی یہ نشتر گری بھی اس وقت ایک بڑی صناعی کا کام دیتی ہوگی جو آج ہمیں مضحکہ خیز نظر آتی ہے۔

پیرایہ بیان معنوی اور بناوٹی سا دکھائی دیتا ہے۔ لاونی کے شاعروں نے جہاں تک ہو سکا صنائع لفظی کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ تھوڑا بہت صنائع معنوی سے بھی کام لیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ دوسرے شاعروں سے پیچھے نہیں دکھائی دیتے ہیں ہندو لاونی کار بھی النکار کے بجائے صنعت کا لفظ ہی استعمال کرتے رہے ہیں۔ نام زیادہ تر اردو ہی کے ہیں۔ البتہ بعض بعض جگہ کچھ بدل دیے ہیں۔ مثلاً صنعت معکوس کو گتا گت کا نام دیا ہے۔ اسی طرح کچھ صنائع ایسے ہیں جو اردو میں نہیں ہیں، مثلاً:

(۱) ماترادار جس میں ہر لفظ میں کوئی نہ کوئی ماترا ہوتی ہے۔

(۲) اماترا جس میں ماترا نہیں ہوتی۔ ان کو آپ اردو کی صنعت مقطع اور موصل کا چربہ سمجھیے۔ جس طرح صنعت موصل میں سب حروف ملے ہوتے ہیں اسی طرح ماترادار میں کوئی لفظ بلا ماترا نہیں ہوتا ہے:

درد و داغ رخ زرد اور وہ دل
فیض مٹی میں گئے ہیں سب مل
بھولی بھالی تو تری پیشانی ہے
تو خوبی خاصانِ خوباں لاثانی ہے

(۳) ککہرا (۴) الٹی ککہرا۔ ککہرا کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک مصرع میں ابتدا ک سے ہوتی ہے تو دوسرا مصرع کھ اور تیسرا گ سے شروع ہونا چاہیے۔ اسی طرح سارے حروف آجائیں۔ اردو میں اسے تیس حرفی اور الٹی تیس حرفی کہتے ہیں:

الف آہ کی جو میں نے تو اس دل کے ٹکڑے کر ڈالے
ب بات زبان سے نکلی تھی کہ تن کے ٹکڑے کر ڈالے

اس لاونی میں سارے حروف تہجی آجاتے ہیں۔

صنعت منقوطہ کو نقطے دار اور غیر منقوطہ کو بے نقط کہا جاتا ہے۔ لاونی گو بھی ے کو بے نقطہ مانتے ہیں:

اردو غیر منقوطہ:

سرور ہو اور کو مسرہ کامل
دکھ ہو اور درد ہو سوا اس دل کو

لاونی بے نقط

ملال ہو دور سارا اگر دم وصل آئے گا
مراد کا گل ہرا ہمارا ادا دکھا کر کھلائے گا

گتا گت (صنعت معکوس یا قلب) تیس حرفی (ککہرا) الٹی

---

(۱) جس کے نازک اور کومل بدن کو دیکھ کر اپسرائیں شرمندہ ہو جاتی ہیں

تیس حرفی (الٹا کھرا) بے نقط (غیر منقوط) نقطہ دار (منقوطہ) رکتا (صنعت رقطا) کھیما (صنعت خیفا) ، اترادار (صنعت موصل) ، اَاترادار (صنعت مقطع) یہ سب کی سب لزوم مالایلزم (غیر ضروری چیزوں کو ضروری سمجھ لینا) کی قسمیں ہیں اور لادنی گو شاعر لزوم مالایلزم کو تلازمہ کہتے ہیں۔ لزوم مالایلزم جیسے طویل اور نامانوس نام کے لیے ایک مفرد لفظ تلازمہ بنا لینا یقیناً لائق ستائش ہے اور ان کی ذہانت کے لیے داد طلب ہے۔

غور کیجیے۔ ایک وقت تھا جب ایسی صنعتوں کا استعمال عوامی شاعری میں بے تکان کیا جاتا تھا جن کو آج ہم بالکل فراموش کر چکے ہیں۔ صنعت۔ رقطا، اور خیفا!

۴۔ لوک گیت۔ لادنی کی چوتھی حیثیت لوک گیت کی ہے۔ لادنی سے عوام کی دلچسپی اور اس کے بارے میں تھوڑا بہت جان لینے کے بعد یہ مسئلہ ذرا پیچیدہ سا بن جاتا ہے کہ لادنی کو لوک گیتوں کے دائرے میں لانا بھی چاہیے یا نہیں؟

اس میں تو ذرا بھی شبہ نہیں کہ لادنی ایک صنفی نغمہ موسیقی کے روپ میں نہ صرف عوام اور لوک جن کی چیزیں بن گئی ہے، بلکہ عورتیں لوک گیت زیادہ تر اسی راگ میں گاتی رہی ہیں۔ فقیر دھوبی۔ کنگریلے۔ دفالی۔ مجاور وغیرہ اپنے اپنے گیت اسی راگ اور دھن پر اکثر و بیشتر گاتے ہیں۔

اب رہی اس راگ میں گائی جانے والی شاعری! اگر اس کی ہیئت، لوازمات، اس کی پابندیوں، زبان اور پیرایہ بیان کے تکلف، تصنع اور تلازمہ (لزوم مالایلزم) والی باتوں کو پیش نظر رکھا جائے جو سراسر آورد کے ضمن میں آتی ہیں تو لادنی شاعری کو لوک گیتوں کے زمرے میں داخل نہ ہونا چاہیے اس لیے کہ لوک گیتوں میں جذبات اور کیفیات کی ترجمانی سادے۔ وہ بھی مقامی الفاظ اور لب و لہجہ میں کی جاتی ہے، جہاں نہ کوئی پابندی ہے اور نہ تلازمہ کا خیال نہ تخلص ہے نہ استاد کی شان میں، مدح سرائی ہے نہ نام و نمود ہے اور نہ شہرت کی خواہش۔

یہ سب کچھ ہونے کے باوجود ہمارا ذاتی خیال ہے کہ ایسی عوامی شاعری کا شمار لوک گیتوں میں ہونا چاہیے۔ لادنی لوک جن کی چیز ہے اس لیے کہ ہم شہر والے تو اس کا نام تک نہیں جانتے مگر عوام نہ صرف اس کا نام جانتے ہیں، بلکہ اس کے دنگلوں میں اسی طرح شریک ہونے کے لیے بیتاب رہتے ہیں جس طرح کسی نئی فلم کی آمد پر شہر والے بے چین ہو جاتے ہیں۔ لادنی گویوں کی چٹکلے بازی سے اس سے زیادہ محظوظ ہوتے ہیں جتنا مہذب طبقہ لارل، ہارڈی اور محمود کی مزاحیہ اداکاری سے۔ وہ داد دیتے ہیں تنقید کرتے ہیں اور ہفتوں لادنی دنگل کا ذکر رہتا ہے۔ ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں۔ ہمیں اس سے سابقہ پڑا ہے ان کی باتیں سنی ہیں لادنی گانے والوں اور بنانے والوں کے مکانوں کا طواف کیا ہے۔ ٹوٹی چٹائی اور ٹاٹ پر بیٹھے ہیں۔ ان کی وہ باتیں برداشت کی ہیں جن پر ہم دل ہی دل میں کڑھے ہیں اور اسی لیے لوک جن کی دلچسپی اور بے پناہ گرویدگی کو دیکھتے ہوئے اس عوامی شاعری کو ہم لوک گیتوں میں شمار کر سکتے ہیں۔

★

خواب کی تعبیر

— برج ناتھ پرشاد مخمورؔ لکھنوی

خواب جو دیکھا تھا بھارت کے پرستاروں نے
آج اس خواب کی تعبیر نظر آئی ہے
لے کے آزادی کی چھبیس برس کی عظمت
حسن میں ڈوب کے رنگین سحر آئی ہے

یہ سحر اپنی تواریخ کا ہے سیمیں ورق
نور ہی نور ہے جس سمت نظر جاتی ہے
جس طرف دیکھیے بھارت کے ترنگے کے تلے
آج جے ہند کی کانوں میں صدا آتی ہے

رائگاں ہو نہیں سکتا تھا شہیدوں کا لہو
ظلم اور جور کے دامن پہ چمکنا تھا اسے
کس طرح دبتا بھلا جذبۂ حب الوطنی
پھول کی طرح سے گلشن میں مہکنا تھا اسے

دورِ ماضی تو تمھیں یاد ہی ہوگا یارو
جب تھا ہنسنا بھی خطا اور تھا رونا بھی خطا
عزم و ایثار کے کتنے ہی جلے ہیں دیپک
تب کہیں جا کے اندھیرے میں اجالا سا ہوا

جل گئی شمع تو لازم ہے حفاظت کیجے
کوئی آندھی نہ کبھی اس کو بجھانے پائے

آج ہر گوشہ وطن کا ہو منور اتنا
کہ اندھیرے کا تصور بھی نہ آنے پائے

دیپ سے دیپ جلیں گے تو اجالا ہوگا
دل سے دل اپنا ملانا ہے وطن کی خاطر
راستہ دھرم کا ہو یا ہو سیاست کی ڈگر
ہر قدم مل کے بڑھانا ہے وطن کی خاطر

جس کے ماتھے پہ چمکتا ہے ہمالہ کا مکٹ
جس کے دامن میں بہا کرتی ہے نرمل گنگا
کتنی پاکیزہ ہے اس دیش کی دھرتی سوچو
رام اور کرشن نے جس دیش میں اوتار لیا

اے جوانانِ وطن مادرِ گیتی کے سپوت
آؤ یہ عہد کریں آج ترنگے کے تلے
ہم محبت کے چراغوں کو نہ بجھنے دیں گے
چاہے اب اشک جلیں دیپ میں یا خون جلے

متحد ہو کے رہیں اہلِ چمن یوں مخمورؔ
کوئی بدلی ہوئی نظریں نہ اٹھانے پائے
خون کا آخری قطرہ بھی ٹپک جائے تو کیا
ماں کی آنکھوں میں کوئی اشک نہ آنے پائے

ہندستانی سینما کی ترقی اور پیش رفت

ادارہ

ہندستان میں فلمی صنعت کا فروغ بہت معمولی ابتدا سے ہوا ہے۔ گذشتہ ۶۰ برسوں کے دوران ہندستانی سینما نے مختلف سماجی، ثقافتی اور اقتصادی طاقتوں کے اثرات قبول کرتے ہوئے بے حد ترقی کرلی ہے۔ ہندستان میں ۱۹۷۱ء میں ۴۳۸ فلمیں بنائی گئیں جو اپنی جگہ خود ایک ریکارڈ ہے۔ اس تعداد کو شامل کر لینے کے بعد اب تک بنائی گئی فلموں کی کل تعداد تقریباً ۱۱ ہزار ہوگئی ہے۔ ان میں سے تقریباً ۴۵۰۰ فلمیں ہندی میں اور باقی بنگالی

خواجہ احمد عباس کی بنائی ہوئی فلم "سات ہندستانی" کا ایک منظر

تامل، تیلگو، ملیالم، کنڑ، مراٹھی، گجراتی اور دیگر زبانوں میں بنی ہیں۔ کسی بھی پیمانے سے ناپیے، آج ہندستان کی فلمی صنعت ایک زبردست کاروبار کی حیثیت حاصل کرچکی ہے جس میں تقریباً ۱۱۰ کروڑ روپے کا سرمایہ

ہیں اوسطاً روزانہ ایک فلم اور ہر تیسرے دن ایک مختصر فلم تیار ہو جاتی ہے۔ اس طرح امریکہ جاپان اور امریکہ کے بعد سب سے زیادہ فلمیں بنانے والے ملکوں میں سے ایک ہے۔

لگا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے مختلف صلاحیتوں کے حامل ایک لاکھ سے زیادہ مردوں اور عورتوں کو روزگار میسر ہے اور یہ تین کروڑ افراد کے لیے ہر ہفتہ تفریح کا وسیلہ بنتی ہے۔

ہمارے اس طویل و عریض ملک میں سات ہزار سے زیادہ سینما گھر ہیں ان سینما گھروں میں نشستوں کی کل تعداد ۱۹۷۰ء کے آخر میں ۴۲،۶۰۵۰ تھی۔ سینما ہمارے عہد کا سب سے زیادہ موثر تفریحی اور ترسیلی ذریعہ بن گیا ہے، اور اس تفریح کے خواہشمندوں کی بڑی سے بڑی تعداد کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ انسانی زندگی کے جملہ پہلوؤں اور اعمال پر بھی اس کا ہمہ رس اور گہرا اثر پڑتا ہے۔

فلمی صنعت کی بنیاد

ہندستان میں پہلی فلم لومیر برادران نے ایک سینماٹوگراف کے ذریعے ۷ جولائی ۱۸۹۶ء کو ممبئی کے واٹسن ہال میں دکھائی تھی۔ بھارت میں پہلی مختصر فلم 'ریسلز' ۱۸۹۹ء میں شری ایچ۔ ایس بھٹ واڈیکر نے بنائی تھی۔ ایف۔ بی۔ تھانا والا نے ۱۹۰۰ء میں اپنی نجی فلم بنائی تھی۔ شری تھانا والا اور ساوے دادا نیز ہیرا لال سین ـــــ یہ پہلے ہندستانی تھے جنھوں نے اس میدان میں ابتدائی کوششیں کیں۔ ہندستان کی پہلی خاموش فلم "پنڈلک" شری آر۔ جی۔ تورنے اور شری ایم۔ جی۔ چترے کی ایک کہانی کی بنیاد پر بنی تھی جو ممبئی میں ۱۸ مئی ۱۹۱۲ء کو دکھائی گئی تھی۔

سینما کے فروغ و ترقی کی تاریخ میں ۳ مئی ۱۹۱۳ء کا دن ہندستانی سینما کی ترقی کا مطالعہ کرنے والے طالب علم کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس روز شری دادا صاحب پھالکے کی تیار کی ہوئی فلم 'ہریش چندر' ممبئی میں دکھائی گئی تھی۔ یہ مکمل طور پر پہلی ہندستانی فیچر فلم تھی۔ اس فلم میں تمام فن کار مرد ہی تھے۔ ہندستانی سینما کے باوا آدم شری پھالکے بڑی صلاحیتوں کے حامل تھے وہ مسودہ (اسکرپٹ) خود لکھتے تھے خود ہی ایڈیٹنگ کرتے تھے، فلم کے مناظر کے ڈیزائن خود ہی بناتے تھے اور فوٹوگرافی، ہدایت سب کچھ خود ہی کرتے تھے۔ ان کی فلموں کے مرکزی خیال دیومالائی قصوں، مذہبی اور لوک کہانیوں پر مبنی ہوتے تھے۔

شری جے۔ ایف مدان نے بھی ۱۹۱۷ء میں اسی موضوع پر بنگال میں ایک فلم بنائی۔ انھوں نے جگہ جگہ تھیٹر قائم کر کے سینما کی مقبولیت کو بڑھایا۔ جنوب میں سب سے پہلی فلم "کیچک ودھن" شری این۔ مدالیر نے ۱۹۱۹ء میں مدراس میں بنائی تھی۔

اس طرح ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۴ء تک کل ۱۲۷۹ خاموش فلمیں بنائی گئیں۔ یہ فلمیں تاریخ ساز شخصیتوں کے سوانح، تصوراتی اور سماجی موضوعات اور دیومالائی قصوں پر مبنی ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں مار دھاڑ کی فلمیں بھی کافی بنتی تھیں۔

اس صنعت کا جائزہ لینے کے لیے ۱۹۲۷ء میں فلم انکوائری کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ چنانچہ اس وقت یہ اندازہ کیا گیا تھا کہ فلموں کا عوام اور ان کے اخلاق پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس سے دس برس قبل سینما گھروں کو لائسنس دینے اور عام نمائش کے لیے فلموں کو سند دینے کی غرض سے انڈین سینماٹوگرافی ایکٹ پاس کیا گیا تھا۔

ہندستان میں سب سے پہلی گویا فلم "عالم آرا" شری اردشیر ایرانی نے ممبئی میں ۱۹۳۱ء میں بنائی تھی۔ یہ ایک تاریخ ساز واقعہ تھا کیونکہ اس طرح ہماری فلموں میں موسیقی، رقص اور مکالموں کو پہلی مرتبہ یکجا کیا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ہماری فلموں کے موضوع اور ہیئت ہی میں نہیں بلکہ صنعت کے پورے ڈھانچے اور اس کے تمام شعبوں میں بھی زبردست تبدیلیاں آئیں۔ بھارتی عوام میں فلمی موسیقی بے حد مقبول ہوئی ہے۔ ہماری فلموں کی زبان اور ہماری اپنی موسیقی یہ دونوں ہی اتنی مختلف ہیں کہ ہم حقیقی عالمی سینما سے بالکل الگ تھلگ ہو گئے ہیں۔ تاہم شری پی۔ ایس بروا، دیوکی بوس، نیتن بوس، وی شانتا رام، ونائک، ہمانسو رائے، محبوب، جے۔ بی۔ ایچ واڈیا جیسے ممتاز فلم سازوں نے بہت سی اچھی فلمیں بنائی ہیں۔ شری ستیہ جیت رے نے بھارتی سینما کو عالمی سینما کا ہم پلہ بنا دیا ہے۔

تکنیکی ترقی

نئی تکنیکیں اپنانے، فوٹوگرافی کے جدید ساز و سامان کا استعمال کرنے اور فلم سازی کے نئے طریقے اپنانے کے نقطۂ نظر سے ہندستان میں فلمیں بنانے کے فن اور سائنس کے میدان میں قابل ذکر ترقی ہو گئی ہے۔ فلیش بیک، کلوز اپ، ڈزالو اور جمپ آؤٹ جیسی فوٹوگرافی کی تکنیکیں اب ہماری فلموں میں استعمال کی جاتی ہیں۔

ہندستان میں پہلی رنگین فلم "کنیا کماری" ۱۹۳۷ء میں بنائی گئی تھی۔ اب تک ۳۰۰ سے زیادہ رنگین فلمیں بن چکی ہیں جن میں سے زیادہ تر ہندی میں بنائی گئی ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں 'کرم' ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں میں بنائی گئی تھی جس کی ہیروئن دیویکا رانی تھیں۔ شری گورودت نے ۱۹۵۹ء میں سب سے پہلی سنیما اسکوپ فلم "کاغذ کے پھول" بنائی تھی۔ سنیما اسکوپ میں پہلی رنگین فلم "پیار کی پیاس" ۱۹۶۱ء میں بنی شری کے آصف کی تخلیق "مغلِ اعظم"، پہلی فلم تھی جس کی تیاری پر عظیم سرمایہ خرچ ہوا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں ایک بنگالی فلم "انگتے" بنائی گئی جس میں گانے نہیں تھے۔ شری سنیل دت نے ۱۹۶۴ء میں اپنی تجرباتی فلم 'یادیں' بنائی تھی جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس معیاری فلم میں محض ایک اداکار تھا۔ "راؤنڈ دی ورلڈ" پہلی بھارتی ٹیکنی کلر فلم تھی جو ۷۰ ملی میٹر میں اسٹوریو فونک ساونڈ میں ۱۹۶۷ء میں بنائی گئی تھی۔ "ہمیوں شے" پہلی فلم تھی جو گیوا کلر میں تیار کی گئی تھی اور پہلی ٹیکنی کلر فلم "جھنک جھنک پائل باجے" تھی جسے ایک بھارتی ڈائرکٹر نے تیار کیا تھا۔

بابو راؤ پینٹر، بمل رائے، گورودت، کے۔ آصف، بی۔ این سرکار اور دیگر کئی ہندستانی فلم ساز ایسے ہیں جنھوں نے ہندستانی فلم سازی کی دنیا میں شاہکار فلمیں بنائیں اور ثابت کر دیا کہ فلم سازی کے فن میں ہمارے کارنامے کس قدر گرانقدر ہیں۔ ہمیں ان فلم سازوں پر ناز ہے جنھوں نے سنیما کے فن میں گوناگوں کارنامے کر دکھائے۔

پربھات ٹاکیز، بمبئی ٹاکیز، نیو تھیٹرز لمیٹڈ۔ وی۔ ایم۔ جیمنی، یہ کچھ ایسے نام ہیں جنھوں نے ملک میں متعدد بامقصد فلمیں بنائی ہیں۔ بامبے ٹاکیز کی بنائی ہوئی فلم "قسمت" ۱۹۴۳ء سے کلکتہ میں مسلسل ساڑھے تین سال تک چلی اور ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ فلم کی کہانی، دلکش موسیقی اور منجھے ہوئے فنکاروں نے اس کو بیحد خوبصورت اور دلفریب فلم بنا دیا تھا۔

ہندستان میں بڑی تعداد میں فلموں کی تیاری کے باوجود ہمارے پرانے اور مشہور فلمساز عموماً اس بات پر افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ ہماری فلموں کا عام معیار بہت اچھا نہیں ہے۔ متعدد فلمساز آج کل غیر ملکی فلموں کی عریاں بے خراب باتوں کی نقل کر لیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کے مناظر اور واقعات فلم بینوں کے لیے اچھی تفریح کا سبب ہوں گے اور اس سے انھیں غور و فکر کرنے اور کسی نئی چیز کی جستجو کرنے کی تکلیف سے نجات مل جائے گی۔ اچھی کہانی، اچھی موسیقی اور اچھے اجزا کی جانب جن سے ایک عمدہ فلم تیار ہو سکتی ہے کوئی دھیان نہیں دیا جاتا فلمی صنعت بھی اب ایک سٹے بازی کا سا کاروبار بن گئی ہے اس کے ساتھ کالا دھن، نجی مفاد کے لیے متعدد سینما گھروں پر چند لوگوں کا قبضہ اور موجودہ اسٹار سسٹم وغیرہ ایسی برائیاں بھی اس صنعت میں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زیادہ لوگوں کی محنت کے بل بوتے پر تھوڑے سے لوگ زیادہ دولت جمع کر لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ فلمیں بناتے وقت ان کے ملحوظ خاطر صرف یہی رہتا ہے کہ وہ خوب چلیں اور عوام میں بے حد مقبول ہوں۔ کبھی کبھی تو اس مقصد کے لیے فن کو بھی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ سماجی فلاح کا دھیان رکھے بغیر ان فلموں میں جرائم، جنسیات اور مخربِ اخلاق عناصر بھر دیے جاتے ہیں۔

— ستیہ جیت رے

اس وقت شری ستیہ جیت رے دنیا میں سب سے زیادہ باصلاحیت

فلمسازوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ والٹ ڈزنے کو چھوڑ کر شاید اب کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کو موجودہ فلمی دنیا میں اتنے بڑے پیمانے پر فلمی نقادوں اور فلم بینوں نے عزت دی ہو اور سراہا ہو۔ ان کی پہلی فلم "پاتھر پنچالی" ساری دنیا میں پسند کی گئی۔ ان کے فلمسازی کے انداز میں جدت اور ندرت ہے اور اسی لیے وہ خیالات کی حقیقی عکاسی کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ کہانی کی تہیں کھلتی جاتی ہیں، واقعات کا تسلسل پہلے سے متعین ہوتا ہے اور زندگی کی چھوٹی سی چھوٹی خوشی اور دکھ، کسک، دیکھنے والوں کو براہ راست متاثر کرتا ہے۔ ان کی فنکارانہ مہارت حقیقت کو غنائیت سے ہم آہنگ کر دینے میں پوشیدہ ہے اور اب فلمیں بنانے کا ان کا یہ ڈھنگ "ستیہ جیت رے سینما" کے نام سے مشہور ہے۔

فلمز ڈویژن ۲۰ برس قبل قائم کیا گیا تھا۔ یہ اپنی قسم کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ عوام کو آگاہ کرنے اور انھیں معلومات فراہم کرنے کی غرض سے یہ زیادہ تر ڈاکومنٹری فلمیں تیار کرتا ہے۔ کچھ ڈاکومنٹری فلمیں پرائیویٹ فلمسازوں سے بھی تیار کرائی جاتی ہیں تاکہ پرائیویٹ سیکٹر میں ڈاکومنٹری فلموں کی حوصلہ افزائی ہو۔ متعدد ڈاکومنٹری اور تجرباتی فلمیں دنیا بھر میں تحسین کی نگاہ سے دیکھی گئی ہیں۔ فلمز ڈویژن ایک ہفتہ واری نیوز ریل بھی تیار کرتا ہے تاکہ اندرون و بیرون ملک رونما ہونے والے اہم واقعات سے عوام کو متعارف کرایا جا سکے۔ یہ فلمیں انگریزی اور علاقائی زبانوں میں بنائی جاتی ہیں۔ نیوز ریل اور ڈاکومنٹری فلموں کے علاوہ یہ ڈویژن کارٹون، تعلیمی، تدریسی، ہدایتی، سیاحتی اور ریکارڈ کے لیے بھی فلمیں تیار کرتا ہے۔ یہ ادارہ ہر برس ۵۰ فلمیں بناتا ہے جو مختلف علاقائی زبانوں میں بھی "ڈب" کی جاتی ہیں۔

۱۹۵۱ء میں مقرر کی گئی فلم تحقیقاتی کمیٹی نے دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ درج ذیل باتوں کی سفارش کی تھی:

(۱) فلم سازوں کے لیے ایک تربیتی ادارہ قائم کیا جائے۔
(۲) فنی اہمیت کی فلموں کی تیاری میں مالی امداد دینے کے لیے ایک ادارہ قائم کیا جائے اور
(۳) فلم کونسل قائم کی جائے۔

ہندوستان اور آس پاس کے ملکوں کے ابھرتے ہوئے فلم سازوں کو تربیت دینے کے لیے ہندوستان فلم اور ٹیلی ویژن ادارہ (FILM AND TELEVISION INSTITUTE OF INDIA) قائم کیا گیا ہے جو ایشیا میں اپنے طرز کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اس ادارے نے فلمی صنعت کو اداکارائیں، اہل اور تربیت یافتہ ہدایت کار اور منظر نامہ لکھنے والے، فلم ایڈیٹر اور آواز ریکارڈ کرنے والے اور دیگر تکنیکی ماہر دیے ہیں۔ اب اس میں یہ انتظام بھی کیا جا رہا ہے کہ ٹیلی ویژن کے لیے لوگوں کو تربیت دی جا سکے۔

حال ہی میں کچھ ایسے نئے فلم ساز سامنے آئے ہیں جو کم لاگت سے عام روش سے ہٹ کر فنی اور تجرباتی فلمیں بنانے کے خواہشمند ہیں۔ مثلاً ایسی فلمیں جو سماجی تعلقات، رواجوں اور ہم عصر رویے کے مطابق ہوں اور جن سے لوگوں کی جذباتی ضروریات پوری ہو سکتی ہوں۔ فلم فائنس کارپوریشن نے سینما کو ایک بامقصد اور مثبت انداز میں فروغ دینے کے لیے کافی جرأت مندانہ کوششیں کی ہیں۔ یہ کارپوریشن ہمارے سینما دیکھنے والوں کی دلچسپی کا رُخ بدلنے کی کوششیں بھی کرتا ہے اور ہونہار نیز باصلاحیت فلم سازوں کو ضروری مالی امداد دیتا ہے۔ 'بھوون شوم'، 'سارا آکاش'، 'دستک' اور 'بدنام بستی' وغیرہ فلموں کی خصوصیت اور فن کاری کی بڑی تعریف کی گئی ہے اور یہ فلمیں مذکورہ کارپوریشن کی مالی امداد سے بنائی گئی ہیں۔

پونا میں نیشنل فلم آرکائیوز قائم کیا گیا ہے تاکہ ملک اور بیرون ملک کی شاہکار فلمیں یہاں لا کر محفوظ طریقے سے رکھی جا سکیں۔ یہاں فلموں کی درجہ بندی کی جاتی ہے، اور تحقیق نیز فلموں کے مطالعے اور اس صنعت کے بارے میں نشر و اشاعت کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

اسی طرح بھارت کی چلڈرن فلم سوسائٹی بچوں کی دلچسپی کی فلمیں بنانے کا فرض پورا کرتی ہے اور ملک میں بچوں کے لیے فلم بنانے میں امداد دیتی ہے۔

بھارت کے متعدد ممالک کے ساتھ ثقافتی تبادلے کے معاہدے ہیں اور مختلف بین الاقوامی فلمی میلوں میں ہماری فلموں نے حصہ لیا ہے۔

سرکار نے فلموں کے سنسر کرنے کے سوال کے بارے میں ایک کمیٹی مقرر

(بقیہ ص ۶۱ پر)

عزیز سلونوی

صد شکر کہ دل خوگرِ آلام بہت ہے
تکلیف کے عالم میں بھی آرام بہت ہے

اس دیدۂ مخمور کا اک جام بہت ہے
شیشوں سے جو ڈھلتی ہے وہ بدنام بہت ہے

ہے درد مگر درد میں ہے فرق نمایاں
اب آپ کے آجانے سے آرام بہت ہے

ساقی ترے رندوں کو تکلف سے غرض کیا
ٹوٹے ہوئے مے خانے کا اک جام بہت ہے

معلوم ہے جو زیست کا انجام ہے لیکن
اے موت ٹھہر جا کہ ابھی کام بہت ہے

اس دور میں جانبازِ محبت نہیں کوئی
گو تذکرۂ دار و رسن عام بہت ہے

ہم اہلِ محبت سے نہیں کوئی بھی واقف
اور حسن کی دنیا میں ترا نام بہت ہے

کچھ خوف ہے بجلی کا نہ صیاد کا کھٹکا
ان معنوں سے آرام تہہِ دام بہت ہے

ہاں ہاں وہ عزیز آپ کا بیمارِ تمنا
آوارگیٔ عشق میں بدنام بہت ہے

ساحر بھوپالی

آپ کی محفل سے کوئی اور کیا لے جائے گا
مدعا آئے گا لے کر، مدعا لے جائے گا

کیوں کسی سے بیر رکھوں دل ہے میرا آئینہ
پاس میرے جو بھی آئے گا دعا لے جائے گا

خود بخود پھر جائے گا رخ زندگی کا اس طرف
جس طرف بھی سیلِ غم دل کو بہا لے جائے گا

جس قدر چاہے مصیبت میں پھنسائے زندگی
ایک دن دستِ تصور سے چھڑا لے جائے گا

ہم کہاں ہیں جو بتائیں گے پتہ اپنا اسے
پوچھنے والا ہمیں، اپنا پتہ لے جائے گا

دل جلوں کی بد دعائیں، لعنتیں اور نفرتیں
بوالہوس، دنیا سے اب تو اور کیا لے جائے گا

ہم جسے سمجھے تھے نادانی سے اپنی پاک باز
کیا خبر تھی دل وہی ظالم چرا لے جائے گا

جب بھی راہِ زیست سے گزرے گا کوئی کارواں
اس کو منزل تک ہمارا نقشِ پا لے جائے گا

مدعا اب یہ ہے ساحرؔ، ہو نہ کوئی مدعا
پھر کدھر دیکھیں، دلِ بے مدعا لے جائے گا

افسانہ

اشراز احمد

اس نے قریب رکھا ہوا دفتی کا ٹکڑا اٹھایا اور چہرے پر پھیلی ہوئی پسینے کی چادر کو سکھانے لگا۔

"اُف! کتنی گرمی ہے۔ دن بھر جھلساتی رہتی ہے۔ آفس میں فائلیں بھی تو جھلساتی رہتی ہیں۔

فائلیں ——— جو سچ بولتی ہیں۔
فائلیں ——— جو جھوٹ بولتی ہیں۔
فائلیں ——— جو سچ اور جھوٹ دونوں بولتی ہیں!"

وہ اٹھا اور غسل خانے کی طرف بڑھ گیا ساتھ میں بڑبڑاتا بھی جا رہا تھا، "ہونہہ وہی چوری . . . . . . وہی ڈکیتی . . . . . وہی عیاشی . . . . وہی رشوت . . . . . . "

اس نے پانی کی چند چھینٹیں منھ پر ڈالیں اور تولیے سے منھ پونچھنے لگا۔ سڑک کے اس پار سامنے والے گھر سے شرابی کریم کی چلانے کی آواز آ رہی تھی۔

بے ہودہ کہتا ہے کہ شراب پینے سے غم دور ہوتا ہے۔ لیکن شراب پی کر تو اور بھی روتا ہے۔ کتنا عجیب ہے وہ ———!

مگر کریم کی لڑکی تو بالکل عجیب نہیں۔ کتنی اچھی ہے ———! کتنی خوبصورت ہے ———! اسے کتنا چاہتی ہے ———!

اس لڑکی کی بوڑھی اور اندھی نانی بھی تو اسے بہت چاہتی ہے ——— بے چاری دن بھر کھانسا بھی تو کرتی ہے۔

لیکن یہ کریم اتنی شراب کیوں پیتا ہے؟

بے وقوف پی کر کہتا ہے کہ مری ہوئی بیوی کو بھلانے کے لیے پیتا ہوں۔ شراب پی کر تو اور بھی روتا ہے۔

کچھ بھی ہو کریم کی لڑکی رشیدہ تو بہت اچھی ہے۔ اسے کتنا چاہتی ہے۔ کتنی خوب صورت ہے ———!

خوبصورت تو وہ لڑکی بھی ہے جو آفس میں اس کے ساتھ کام کرتی ہے۔ صاحب اس لڑکی پر کتنا مہربان ہے۔ اکثر کار سے گھر بھی چھوڑنے چلا جاتا ہے۔

لیکن صاحب دن بھر دوسروں کو ڈانتا کیوں ہے؟ اس لڑکی سے ہنس ہنس کر باتیں کیوں کرتا ہے؟

وہ لڑکی ہے بھی تو بہت خوبصورت۔ کسی کو لفٹ بھی نہیں دیتی۔ مجھے بھی نہیں ———!

مگر یہ صاحب ——— ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ خوبصورت تو اس کی بیوی بھی ہے۔ کتنی اچھی ہے۔ بالکل جاپانی گڑیا جیسی۔ اسے کتنا یاد کرتی ہوگی۔ لیکن وہ اسے پسند کیوں نہیں؟ اس کی اس سے بنتی کیوں نہیں؟ وہ اپنے کو بڑا کیوں سمجھتی ہے؟

سنا ہے کہ اس کے باپ نے نیا گھر لیا ہے ——— لیا ہوگا ——— اسے کیا؟

کتنے دن ہو گئے بیوی کو دیکھے ہوئے ——— پپو کو دیکھے ہوئے ——— پپو ——— اس کا لاڈلا ——— اس کا بیٹا۔

کتنا پیارا ہے ——— گول مٹول سا ——— گورا گورا بالکل ماں پر گیا ہے۔ ماں بھی تو خوبصورت ہے۔ بالکل جاپانی

گڑیا جیسی ——— اور وہ ——— کالا ——— بدصورت سا۔

مگر مس شفرڈ تو کہتی تھی کہ وہ بڑا خوبصورت ہے۔ وہ خود بھی تو کالی تھی۔ لیکن اس کا دل تو بالکل کالا نہیں تھا ——— سفید بھی نہیں تھا۔ اس سے شادی بھی تو کرنا چاہتی تھی۔

بے وقوف ——— !

وہ اس کے لیے عیسائی بن جاتا ——— جبرشین تھی نا ——— امریکن مشن ہاسپٹل کی نرس۔

اُف ! یہ غریبی ——— !!

وہ تو اپنے پپو کو خوب پڑھائے گا۔ پیسہ لیے بغیر کسی کا کام نہیں کرے گا۔ صاحب بھی تو لیتا ہے۔ کہتا ہے مجھے مت دو۔ جی چاہے تو جیب میں ڈال دو۔ اب وہ بھی جب ہی میں ڈلوائے گا۔ لیکن صاحب والی لڑکی تو جیب میں نہیں رکھنے کو کہتی بلکہ صاحب کے جیب سے نکالتی ہے۔

ضرور کچھ گڑبڑ ہے ——— ہوگا ——— اسے کیا ——— !!

جیب سے پیسے تو مس شفرڈ بھی نکال لیتی تھی۔ کتنی شوخ تھی ——— کتنی چنچل تھی ——— گانا گاتے گاتے پیار سے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیتی تھی۔

مگر وہ عیسائی کیسے بن جاتا۔ کتنا دکھ ہوا تھا اسے ——— اس کا شوہر کتنا خوش نصیب ہے۔ مس شفرڈ کتنی اچھی تھی۔

خوش قسمت تو وہ بھی ہے۔ اس کی بیوی کتنی خوبصورت ہے لیکن اس کی اس سے بنتی کیوں نہیں۔ اس کی بیوی اتنا احساس برتری میں کیوں مبتلا ہے ؟

پپو ——— اس کا بیٹا ——— اس کا لاڈلا۔ کتنا اچھا ہے۔ وہ اسے خوب پڑھائے گا۔

وہ اٹھا۔ کمرے کی کھڑکی کھولی اور کریم کی طرف دیکھنے لگا ننگا ننگا ہوا ——— ٹوٹا پھوٹا سا ——— بغیر قلعی کا گھر۔ اسے بیوہ کی مانگ لگا۔

کریم کا گھر اسے سونا سونا کیوں لگ رہا ہے۔ لگتا ہے کریم بس گیا ہے۔ اپنے ساتھ اپنی آواز بھی لے گیا ہے۔ یہ کریم اتنی

شراب کیوں پیتا ہے ——— ؟

——— پاگل ——— !

کہتا ہے۔ بیوی کو بھلانے کے لیے پیتا ہوں۔ دن بھر گھومتا رہتا ہے۔ رشیدہ کتنا کام کرتی ہے۔ سارے گھر کا خرچ بھی تو پورا کرتی ہے کتنی اچھی ہے ——— !

کام تو اسے بھی بہت کرنا پڑتا ہے۔ دن بھر فائیلیں ——— اور صرف فائیلیں۔

وہی چوری .... وہی ڈکیتی .... وہی عیاشی .... وہی رشوت۔ وہ کتنا تھک جاتا ہے۔

لیکن یہ رشیدہ کیوں نہیں تھکتی ؟

آج یہ اس کے کمرے کی کھڑکی بند کیوں ہے ؟ شاید کہیں کام سے گئی ہوگی۔ کتنا کام کرتی ہے۔ مگر رشیدہ کی نانی تو دن بھر کھانسا کرتی ہے۔ کوئی بھی کام نہیں کرتی۔

کھانستی تو اس کی ماں بھی تھی۔ لیکن کتنا کام کرتی تھی۔ کتنی اچھی تھی۔ اسے کتنا چاہتی تھی۔ جب پیار سے لپٹا لیتی تھی تو سارے غم دور ہو جاتے تھے۔

لپٹاتی تو اس کی بیوی بھی ہے۔ مگر تھکن دور کہاں ہوتی ہے۔ کتنی بڑھ جاتی ہے۔ فرمائشوں کا بوجھ کتنا بھاری ہوتا ہے ——— !!

مگر ماں اب کہاں چھپ گئی۔ اسے کتنا چاہتی تھی ——— ماں ——— ماں تو اب کہاں ہے ؟

اس نے کھڑکی بند کر دی۔ جیسے ماں کی یاد کو روکنا چاہتا ہو۔ اور کونے میں رکھی ہوئی میز کی طرف مڑ گیا جس پر اسٹوو اور کیتلی میں چائے کا پانی رکھا ہوا تھا۔

اسٹوو میں ہوا بھرتے وقت گدگدی کے ایک عجیب احساس کے ساتھ اس کے چہرے پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ اس طرح ہانپنے لگا جیسے بہت تھک گیا ہو۔

وہ ایک دم سے اسٹوو چھوڑ کر الگ کھڑا ہو گیا۔ اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

اسے کتنا کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ کتنا تھک جاتا ہے۔ مگر یہ دفتر

والا صاحب کیوں نہیں تھکتا۔ چھٹیوں میں بھی دفتر جاتا ہے۔ اور وہ دفتر والی لڑکی بھی تو چھٹیوں میں دفتر جاتی ہے۔ وہ بھی کتنا کام کرتی ہے۔

لیکن دوسرے لڑکے تو چھٹیوں میں دفتر نہیں جاتے وہ بھی اس طرح سے تھک جاتے ہوں گے۔

تنہائی میں آفس والی لڑکی اور صاحب کتنا کام کرتے ہوں گے کتنے محنتی ہیں ——!

آج یہ شکیل اب تک کیوں نہیں آیا۔ کتنا جھوٹا ہے۔ کتنا پکا وعدہ کرتا ہے۔ کہیں پھنس گیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کو کہیں اس کی محبوبہ مل گئی ہو۔ کتنا آوارہ ہے وہ ——!

یہ شکیل۔ بیوی بچوں والا ہے پھر بھی ادھر ادھر عشق کیوں کرتا پھرتا ہے —— کتنا آوارہ ہے —— مگر اس کی محبوبہ تو بہت اچھی ہے۔

ابھی تو رشیدہ بھی ہے۔ جب بلاؤ چپکے سے آجاتی ہے۔ اس کا جسم تو بالکل ربر کی گڑیا جیسا ہے —— گدگدا سا —— اسفنج کا ڈھیر سا —— جب اسے باہوں میں بھرلو —— دل کیسا دھک دھک کرتا ہے۔ کتنا ڈھیر سا پسینہ نکل آتا ہے۔

لیکن رشیدہ ادھار لے کر کبھی واپس نہیں کرتی۔ آتی ہے تو ادھار بھی ضرور لیتی ہے۔ کیسی عجیب ہے —— اس کا باپ بھی تو عجیب ہے۔ شراب پی کر کتنا روتا ہے۔

بے وقوف ——! بیوی کو بھلانا چاہتا ہے۔

آج یہ شکیل اب تک کیوں نہیں آیا۔ ضرور کہیں پھنس گیا ہوگا۔ جھوٹا کہیں کا —— پکا وعدہ کرتا ہے۔

مس شفرڈ تو کبھی جھوٹ نہیں بولتی تھی۔ مگر آج یہ مس شفرڈ اسے کیوں یاد آرہی ہے ——؟

وہ رات اسے کبھی نہیں بھول سکتی۔

شام ہی سے کتنا ڈٹ کر پانی برسنا شروع ہوا تھا۔ شفرڈ جب اس کے گھر پر پہنچی تھی تو پانی سے شرابور تھی اور وہ پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔

شفرڈ نے اپنے تمام کپڑے اتار کر سوکھنے کے لیے ڈال دیے تھے اور خود بغیر کپڑوں کے لحاف میں سو کر رہی تھی۔

کتنی عجیب تھی وہ —— سہیلی کے گھر سونے آئی تھی —— کیسا خوبصورت بہانہ تھا —— اس کی سہیلی اکیلی ہے۔

شفرڈ شائد رات بھر جاگتی رہی تھی اس کا جسم جاگتا رہا تھا —— اور وہ خود —— وہ خود بھی تو پسینے سے چپ چپا رہا تھا۔ صبح اسے کتنی تھکن محسوس ہوئی تھی۔

تھکن تو اس وقت بھی اسے محسوس ہو رہی ہے۔ آفس سے آیا ہے نا۔ دن بھر کام ہی کام ——!

نہ جانے آج یہ شکیل اب تک کہاں رہ گیا۔ جھوٹا کہیں کا۔ پکا وعدہ کرتا ہے۔

وہ اٹھا اور ٹیری کاٹ کی پینٹ جو ہپ پر گھس چکی تھی پہننے لگا۔ وہ کتنا جچتا ہے اس پینٹ میں۔ جب اس نے بنوایا تھا تو گھر کے لوگ کتنا خوش ہوئے تھے۔ ماں نے بھی تو خوش ہو کر اس کی پیشانی چومی تھی۔ کتنی اچھی تھی وہ ——

مگر یہ پینٹ تو اس کے باپو نے نہیں دیکھی تھی۔ اس نے بھی تو اپنے باپو کو نہیں دیکھا تھا۔ شائد اس کے باپو تو بچپن میں ہی مر گئے تھے۔ اگر ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔ اسے کتنا چاہتے۔ پیار سے باتیں کرتے —— پیار سے ڈانٹتے —— پیار سے مارتے۔

اسے کتنا دکھ ہے اس بات کا —— اس نے اپنے باپو کو تو دیکھا ہی نہیں۔

لیکن آفس والا صاحب تو اس کی پینٹ دیکھ کر جل ہی گیا تھا۔ اس روز کتنی ڈانٹ پڑی تھی ——!

بس ذرا سی ہی تو غلطی ہوئی تھی۔ کام کرتے کرتے کتنا تھک گیا تھا۔ اب بھی تو تھک جاتا ہے۔ فائلیں اور صرف فائلیں۔

فائلیں —— جو آتی ہیں
فائلیں —— جو جاتی ہیں

فائیلیں ——— جو کھلتی ہیں۔
فائیلیں ——— جو بند ہوتی ہیں۔
وہ ان فائلوں سے کتنا گھبرا گیا ہے ———!
لگتا ہے کہ آج شکیل نہیں آئے گا۔ جھوٹا کہیں کا
شاید رشیدہ ہی آگئی ہو۔

اس نے کپڑے بدل کر پھر کھڑکی کھول لی۔ بے قلعی کا ٹوٹا پھوٹا سا گھر ——— اب بھی سنسان پڑا تھا ——— جیسا بیوہ کی مانگ۔

اسے بڑی حیرت ہوئی۔

آج یہ رشیدہ کی کھڑکی بند کیوں ہے؟ روز تو نہیں بنا رہتی تھی۔

کہاں گئی وہ ———؟
کیا آج دن میں ہی اسے کوئی نیا گاہک مل گیا ———؟
شاید ایسا ہی ہو ———!!
اس کی بوڑھی، اندھی نانی تو اب بھی کھانس رہی ہے۔
شائد کریم بھی ابھی واپس نہیں آیا۔ کہیں شراب پی رہا ہوگا ——— بے وقوف ———!!

جانے رشیدہ کب آئے گی ———؟
کتنا کام کرتی ہے۔ اکثر رات رات بھر غائب رہتی ہے۔ صبح

کریم کتنا چلاتا ہے۔ مگر شراب کے پیسے پاکر چپ بھی تو ہو جاتا ہے ——— کتنا عجیب آدمی ہے وہ ———!
رشیدہ بھی تو کتنی عجیب ہے ———!
ادھار کے پیسے لے کر کبھی نہیں واپس کرتی۔

اس نے کھڑکی دوبارہ بند کردی۔ جب مڑا تو سامنے شکیل چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔

وہ ایک دم سے جھلا گیا اور شکیل نے گھبرا کر وقت سے نہ آنے کی صفائی پیش کرنی شروع کر دی۔

"پارٹنر غلطی ہو گئی۔ پلیز معاف کر دو۔ فلم دیکھنے چلا گیا تھا۔ یار تمھارے بغیر بڑا بور ہوا۔ پلیز مائنڈ مت کرنا۔ فلم کی ہیروئن بڑی جمتی ہے۔ ڈیر آئندہ ضرور وعدے کا خیال رکھوں گا۔ بولو معاف کر دیا نا ———؟"

وہ شکیل کی گھبراہٹ دیکھ کر بے ساختہ ہنس پڑا ——— مگر فوراً ہی جبڑے بھینچ کر غرّایا۔

"پاجی! میرے بغیر بور ہوئے۔ جھوٹے کہیں کے۔ ہیروئن جم رہی تھی یہ نہیں کہتے کہ اس کی ننگی ننگی ٹانگیں جم رہی تھیں؟"
شکیل کے چہرے پر جھینپی جھینپی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
چند لمحوں بعد وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے سڑکوں پر ٹہل رہے تھے۔

★

ہندوستانی سنیما کی ترقی اور پیش رفت ——— (صفحہ ۵۷ کا بقیہ)

کی تھی تاکہ وہ اس بات کا مطالعہ کرے کہ عام نمائش کی فلموں کا سماج کی بدلتی ہوئی ضروریات کے ضمن میں لوگوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔

کھوسلہ کمیٹی نے سرکار کو اپنی رپورٹ دے دی ہے۔ کمیٹی نے تفصیل سے موجودہ قوانین، مشینری اور بھارتی نیز غیر ملکی فلموں کو نمائش کے لیے سرٹیفکیٹ دینے کے طریق کار کا مطالعہ کیا ہے۔

سرکار نے فنی اور ثقافتی نقطۂ نظر سے اعلیٰ قسم کی فلمیں بنانے کے لیے فلم سازوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی غرض سے نیشنل ایوارڈ دینے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ فیچر فلموں، ڈاکومنٹری، تجرباتی اور تعلیمی فلموں کے لیے الگ الگ ایوارڈ دیے جاتے ہیں۔

رابطۂ عامہ کے اس موثر ذریعے کو نیا رخ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے، کیونکہ ہماری فلمیں تعلیم اور بامقصد تفریح کا اہم ذریعہ ہیں۔ کسی دوسرے وسیلے کی طرح اس وسیلے کو بھی ان تمام سماجی مسائل اور نئے چیلنجوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا جو آج ملک کو درپیش ہیں۔

★

راکھی

اختر بستوی

میں آج ایک پارک میں پھولوں کے درمیاں
بیٹھا ہوا تھا صبح کو مسرور و شادماں

فطرت کی دل فریب اداؤں میں تھا مگن
پیش نظر تھا صبح کے جلووں کا بانکپن

ایسے میں اک حسین سی لڑکی مرے قریب
آئی کچھ اس ادا سے کہ مجھ کو لگی عجیب

احساس و فکر پر وہ مرے چھا کے رہ گئی
بجلی سی قلب و ذہن میں لہرا کے رہ گئی

چاہا کہ اس سے عشق کا اظہار میں کروں
ہوش و حواس کھونے کا اقرار میں کروں

ناگاہ اس نے بڑھ کے کہا: "ہاتھ لایئے!
بہنوں کا دن ہے آج، یہ راکھی بندھایئے"

[illegible]

قطعات

مظفر حیات نیر

تھم تھم کے برستی ہیں گھٹائیں اے دل
چلتی ہیں طرب ناک ہوائیں اے دل
وعدے کی تو جب بات ہے وہ رک نہ سکیں
سہمے ہوئے بھیگے ہوئے آئیں اے دل

پیغام طرب آکے سنایا تونے
سینوں کے جہنم کو بجھایا تو نے
شہروں کو دیا تو نے بہاروں کا پیام
صحرا کو بھی گلزار بنایا تو نے

بالوں سے یہ کس شوخ نے جھٹکا پانی
گھر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی
ہاں آتش دل کا یہ کرشمہ دیکھا
جو آگ لگی آنکھ سے نکلا پانی

ہاتھوں سے دبا لیتی ہیں سینے ڈر کر
جھولا جو کبھی جاتا ہے حد سے اوپر
یہ باغ، یہ برسات، یہ دوشیزائیں
جیسے کسی رنگین فلم کا منظر

چھائی ہوئی گھنگھور گھٹاؤں کو سلام
مخمور و طرب ناک ہواؤں کو سلام
مفلس کے لیے بند ہے میخانے کا در
ساقی تری قلاش اداؤں کو سلام

——— اور ہماری ذمہ داریاں

● ——— شری دھری

آج ہم اپنے ملک کی آزادی کی چھبیسویں سال گرہ منارہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ عوام کو اس وقت طرح طرح کی دقتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، لیکن یہ دقتیں عارضی ہیں اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ عوام اور حکومت کی متحدہ کوشش اور جد وجہد سے ہم ان پر جلد سے جلد قابو پالیں گے۔ آزادی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص باہمی اختلافات سے بالاتر ہو کر ملک کی خدمت میں تن من دھن سے لگ جائے اور اس کی مالی حالت کو مضبوط بنانے میں اپنا فرض منصبی ادا کرے۔ آزادی کو حاصل کرنے سے بھی زیادہ مشکل کام ہے اس آزادی کو مستحکم اور مستقل بنانا۔ ہماری یہ آزادی پائیدار اور مستحکم اسی حالت میں ہو سکتی ہے جبکہ ملک کی دولت میں کم سے کم اس حد تک اضافہ ہو جائے کہ ہر شخص کو زندگی گزارنے کے لیے ضروری چیزیں آسانی کے ساتھ میسر ہو سکیں۔

اگر ہم آزادی کے گزشتہ چھبیس سال کا جائزہ لیں تو آزاد ہندستان کی جو تصویر ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے اس پر ہر ہندستانی بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ یہ تصویر ہمیں پست ہمت کرنے کی بجائے ہمارا حوصلہ بڑھاتی ہے۔ کھیتی باڑی اور صنعت کے میدان میں ہم نے جو ترقی کی ہے اس کی تعریف دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کے اقتصادیات کے ماہرین نے کی ہے۔ عام طور پر لوگوں کا کہنا ہے کہ اتنے کم وقت میں ہمارے ملک نے اقتصادیات کے مختلف میدانوں میں جو نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں ان کی مثال ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔ امریکہ اور برطانیہ جیسے ملک سیکڑوں سال کی انتھک محنت اور جد وجہد کے بعد یہ درجہ حاصل کر سکے ہیں۔ روس ایک ایسا ملک ضرور ہے جس نے تقریباً نصف صدی کے اندر ہی دنیا کی اول درجہ کی طاقتوں میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ روس کے اندر ایک ایسی حکومت برسر اقتدار ہے جسے "ڈکٹیٹر شپ آف دی پرولے تاریت" کہتے ہیں اور جس کے تحت ہر انسان کو کمیونسٹ پارٹی کے اشاروں پر چلنا ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے ملک میں جمہوریت کارفرما ہے اور اس کے اصول و ضوابط کا پابند رہتے ہوئے ملک کی مالی حالت میں تبدیلی لانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ہمارا ملک ایک زرعی ملک ہے اور تقریباً ۸۰ فیصد لوگ کھیتی باڑی سے ہی روزی حاصل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہی سے کھیتی باڑی کے طور طریقوں کو ایک نیا موڑ دینے کی کوشش شروع کردی گئی تاکہ مختلف اجناس کی پیداوار میں اضافہ ہو سکے اور کسانوں کی مالی حالت سدھر سکے۔ پنج سالہ منصوبے کے تحت اب تک اربوں روپیہ لگا کر آبپاشی کا مکمل بندوبست کیا گیا، کیمیاوی کھاد کے کارخانے قائم کیے گئے اور دیہی علاقوں میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کا ایک جال بچھا دیا گیا۔ ان تمام کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ تقریباً ہر سال خشک سالی اور سیلاب کی نذر ہو کر غلے کی پیداوار کم ہونے کے باوجود کہیں کسی کے بھوک سے مرنے کی نوبت نہیں آئی جبکہ آزادی سے پہلے ۱۹۴۳ء میں بنگال میں قحط پڑنے سے تقریباً تیس لاکھ آدمی مر گئے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر قدرت ہمارا ساتھ دیتی رہے تو ہمیں غلے کے معاملے میں اب کسی کا محتاج نہیں بننا پڑے گا۔ لیکن یہ ملک اتنا بڑا ہے اور اس کی آبادی اتنی تیزی سے بڑھتی جارہی ہے کہ صرف

کھیتی پر منحصر رہ کر ہم اس کی خوشحالی اور بہبودی کی بات نہیں سوچ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۶ء میں ہمارے یہاں ایک صنعتی ریزولیوشن پاس کیا گیا جس کے تحت یہ طے کیا گیا کہ جتنی نئی بنیادی صنعتیں قائم کی جائیں گی ان کو نجی زمرے میں ہی رکھا جائے گا اور نجی زمرے کو ہر ممکن طریقے سے پنپنے اور ترقی کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ حکومت کی پالیسی کے مطابق پٹرول، کوئلہ فولاد، سیمنٹ، بھاری الیکٹرانکس اور دوسرے قسم کی بڑی بڑی مشینیں تیار کرنے والے کارخانے سرکاری تحویل میں رکھ کر ملک کو ایک ایسی صنعتی بنیاد پر کھڑا کیا گیا جس سے ہمیں بیرونی حملہ آوروں کو منہ توڑ جواب دینے میں بے انتہا مدد ملی۔

دنیا کی تاریخ میں ایسی مثال شاید ہی مل سکے جب کسی ملک کو آزاد ہونے کے فوراً ہی بعد سے متواتر ایک کے بعد دوسرے حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا پڑا ہو ہم ۱۹۴۷ء میں اپنی آزادی کا جشن منا رہے تھے کہ پاکستان نے کشمیر پر حملہ کر دیا۔ اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں چین نے ہم پر دھوکے سے حملہ کر دیا پھر ۱۹۶۵ء میں پاکستان ہماری مغربی سرحد پر حملہ آور ہوا۔ ۱۹۶۵ء کی اپنی زبردست شکست کا بدلہ لینے کے لیے ۱۹۷۱ء میں ایک بار پھر پاکستان نے بڑے پیمانے پر لڑائی چھیڑ دی۔ ان سبھی جنگوں میں اگر ہمارے ملک کی فتح ہوئی تو صرف اس لیے کہ ہمارے یہاں صنعتوں کی ایک پختہ بنیاد ڈالی جا چکی تھی اور دفاع کے ضروری ساز و سامان زیادہ تر ہم اپنے ہی کارخانوں میں تیار کرنے کے قابل ہو چکے تھے تیل، کوئلہ فولاد وغیرہ کی ہمارے ملک میں کافی پیداوار ہو رہی تھی اور ہماری مرکزی حکومت ہر طرح سے مستحکم اور چاق و چوبند تھی۔

انگریزوں نے ۱۹۴۷ء میں جب ملک کا بٹوارہ کر کے پاکستان بنایا اسی وقت ہمارے ملک کے رہنماؤں نے سمجھ لیا تھا کہ سامراجی طاقتوں کی یہ ایک بہت بڑی سازش ہے، اور ایک نہ ایک دن وہ پاکستان کو ابھار کر ہندستان سے متصادم کر کے دم لیں گے۔ اس لیے ہم اپنے ملک کی فلاح و بہبود اور خوشحالی کے لیے جو بھی کوششیں کر رہے تھے ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ پاکستان کی جانب سے حملہ ہونے پر ہم کیسے اپنی اقتصادیات کو کوئی خطرہ درپیش ہوئے بغیر کامیابی کے ساتھ اس حملہ کا مقابلہ کریں گے۔ ہمارے لیڈروں کا یہ منصوبہ اور دور اندیشی پوری طرح کامیاب ہوئی اور اس کامیابی پر پورے ملک کے عوام کو فخر کرنے کا حق حاصل ہے۔

۱۹۶۲ء میں چین کے ساتھ ہماری جو لڑائی ہوئی اس میں ضرور ہم کو کچھ نقصان پہنچا تھا لیکن اس لڑائی کے لیے دراصل ہم تیار نہیں تھے۔ ہم نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ جس ملک کا وزیر اعظم دہلی آ کر باہمی دوستی کو مستحکم بنانے کی بات چیت کر رہا ہے اس کی توپیں اچانک ہی شمالی مشرقی سرحد پر آگ اگلنے لگیں گی۔ یہ لڑائی دھوکے اور فریب کی لڑائی تھی۔ پھر بھی جگہ جگہ ہندستانی نوجوانوں نے چینی حملہ آوروں کے دانت کھٹے کر دیے تھے۔ اور اس واقعہ کے پانچ سال بعد ۱۹۶۷ء میں ناتھو لا کے مورچہ پر جو جھڑپ ہوئی تھی اس میں ہندستان میں بننے والی پہاڑی توپوں نے پہلی بار اپنی کارگزاری دکھائی جس کے نتیجے میں سرحد اس پار چینی فوج کا ایک بھی بنکر صحیح سالم نہ بچ سکا۔ اس مڈبھیڑ کے بعد پھر چین کی ہمت ہندستان سے متصادم ہونے کی نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ ادھر پاکستان نے جو حملے کیے اور ان میں جو مسلح تصادم ہوئے ان میں بھی اپنے نئے دوست کی مدد کے بہانے وہ دخل اندازی کی جرأت نہ کر سکا حالانکہ اس دخل اندازی کو خارج از امکان نہیں سمجھا جا رہا تھا۔ لیکن چین کو یہ بخوبی معلوم ہو گیا ہے کہ ہندستانی قوم کس فولادی خمیر سے بنی ہے اور یہ کہ اس پر غالب آنا کوئی بچوں کا کھیل یا منہ کا نوالہ نہیں ہے۔

یہاں یہ واضح کر دینا بے محل نہ ہو گا کہ پاکستان سے ہماری آخری جنگ جو ۱۹۷۱ء میں ہوئی اس کی ابتدا مثل سابق اس بار بھی پاکستان ہی کی جانب سے ہوئی یعنی ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو اس نے اچانک ہماری سرحدوں پر حملہ کر دیا اور ہمیں اپنے دفاع اور ملک کی آزادی کی بقا کے لیے مجبوراً ہتھیار اٹھانا پڑا، مگر بن گئی یہ اصولوں اور موقف کی جنگ جس میں شریک ہونے کے لیے ہندستان بالکل حق بجانب بھی تھا اور ملک کی سالمیت کی حفاظت کے لیے ضروری بھی۔

ملک کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے باوجود ہمارے ملک میں مختلف عقیدوں اور مذہبوں کے ماننے والوں کی خاصی تعداد موجود ہے خصوصاً مسلمانوں کی بڑی تعداد نے ترک وطن کر کے پاکستان جانا پسند نہیں کیا بلکہ ہندستان ہی میں قیام کو انھوں نے ترجیح دی۔ ہندستان کی اسی رنگارنگی اور گوناگونی کے باعث ہم نے سیاست کے معاملے میں مذہب کو دخل انداز نہیں ہونے دیا اور ایک نا مذہبی یا سیکولر پالیسی

اختیار کرکے ہم ملک کو ترقی اور خوش حالی کی جانب بڑھانے میں منہمک ہو گئے۔ ہم نے نہ صرف اپنے ملک میں سیکولرزم کو اپنی بنیادی پالیسی قرار دیا ہے بلکہ عالمی سیاست میں بھی ہم نے غیر جانبداری، عالمی امن، قوموں کی آزادی کی حمایت اور ظلم و تشدد، کمزوروں کے استحصال اور جنگ و جدل نیز جارحیت کی مخالفت کا موقف اختیار کیا ہے اور یہ ہمارے اسی موقف کی صحت کی دلیل ہے کہ ۱۹۷۱ء کی تاریخی جنگ کے نتیجے میں دو قومی نظریے کا تصور پاش پاش ہو گیا اور ساڑھے سات کروڑ مسلمانوں کی ایک نئی قوم وجود میں آ گئی جس کو بنگلا دیش کہتے ہیں۔ بنگلا دیش کا پیچیدہ مسئلہ حل کرنے میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے جس سیاسی سوجھ بوجھ اور دور اندیشی کا ثبوت دیا، وہ نہ صرف ایشیا بلکہ ساری دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بنگلا دیش مستقبل قریب میں ایک طاقتور اور مستحکم قوم بن کر پاکستان ہی نہیں مغربی ایشیا کی تمام مسلم قوموں کی سیاست میں ایک انقلابی تبدیلی لانے میں مددگار ہوگا۔

مذکورہ بالا حقائق سے صاف ظاہر ہے کہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ہماری برّی، بحری اور ہوائی فوجیں ہماری سرحدوں کی حفاظت میں ہر وقت مستعد اور بڑے سے بڑے دشمن کو بھی منھ توڑ جواب دینے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کی اقتصادی حالت کو بہتر سے بہتر بنانے کیلیے ہماری تمام کوششیں بھی کامیابی کے راستے پر گامزن ہیں۔ ہم اپنے یہاں صنعت اور انجینیرنگ کے کام میں آنے والی بڑی سے بڑی مشینیں تیار کرنے لگے ہیں۔ ہمارے یہاں کے تیار شدہ مال کی مانگ غیر ملکوں کے بازاروں میں برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ ہماری برآمدی تجارت بھی ترقی پر ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اب ہم بحالت مجبوری بھی غیر ملکوں سے غلہ امداد کے طور پر نہیں منگواتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہماری منصوبہ بند اقتصادی اور ناوابستگی کی پالیسی کی وجہ سے ممکن ہو سکا ہے اور ہم سبھی ملکوں سے دوستانہ تعلقات بڑھانے میں کامیابی حاصل کرتے جا رہے ہیں۔

لیکن ان تمام کوششوں اور کامیابیوں کے باوجود آزادی کا جشن منانے میں جس امنگ اور جوش کا مظاہرہ ہونا چاہیے وہ خصوصاً اس بار شاید دیکھنے میں نہ آئے اس لیے کہ قدم قدم پر پریشانیوں اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ غذائی اشیاء کے ساتھ ساتھ دیگر ضروریاتِ زندگی کی گرانی نے سبھی کو پریشان کر رکھا ہے۔ لیکن اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ضروری اشیا کی یہ کمی اور گرانی کچھ تو قدرتی آفتوں کی وجہ سے ہے، کچھ عالمی حالات کے باعث اور کچھ اس جنگ کے اثرات ہیں جو ۱۹۷۱ء میں پاکستان سے ہوئی تھی اور جس کے نتیجے میں اب بھی ہمیں بھاری اقتصادی بوجھ برداشت کرنا پڑ رہا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کمی اور گرانی خود ہماری اپنی لائی ہوئی ہے جو ذخیرہ اندوزی، منافع خوری، رشوت ستانی اور بدعنوانیوں کی صورت میں عوام کو چوس رہی ہے۔ اس لیے ہم کو اپنے آپ سے محاسبہ کرنا چاہیے اور اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر سوچنا چاہیے کہ ہماری آزادی اپنے ساتھ جو ذمہ داری لائی ہے ان کو ہم کس حد تک پورا کر رہے ہیں۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ صرف آزادی حاصل کرنے کے لیے ہی قربانیوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آزادی حاصل کرنے سے بھی زیادہ مشکل کام ہوتا ہے آزادی کی حفاظت کرنا۔ اسی لیے آزادی کی حفاظت کے واسطے کہیں زیادہ قربانی درکار ہوتی ہے۔ سوویت روس کا آج اگر دنیا کے طاقتور ترین اور ترقی یافتہ ملکوں میں شمار ہوتا ہے تو محض اس لیے کہ وہاں کے لوگوں نے زار شاہی سے نجات حاصل کرنے کے بعد برسوں تک آدھا پیٹ کھانا کھا کر اور ہر طرح کی تکلیفیں برداشت کرکے اپنے ملک کی دولت بڑھانے میں بے مثال لگن اور مستعدی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہماری فوجیں چاہے جتنی طاقتور ہوں، اگر ہم اقتصادی حیثیت سے کمزور رہیں، باہمی جھگڑے اور اختلافات کا شکار رہیں، ایک دوسرے سے ہمدردی نہیں رکھتے، فیکٹری اور کارخانوں میں پیداوار بڑھا کر ملک کی دولت میں اضافہ نہیں کرتے، اپنے مفاد کو ملک کے مفاد سے بالاتر رکھتے اور ہر خرابی، ہر پریشانی اور مصیبت کے لیے صرف حکومت کو یا ایک دوسرے کو ذمے دار ٹھہراتے ہیں تو ان حالات میں ہماری آزادی ہرگز محفوظ نہیں رہ سکتی۔ جیسا کہ نجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کہا کرتے تھے کہ ہمارے ملک کی موجودہ نسل کو سخت محنت کرنے کی سزا ملی ہے۔ سخت محنت و مشقت کرکے جب تک ملک کی دولت میں اضافہ نہیں کیا جاتا اس وقت تک

(بقیہ صفحہ ۱۷ پر)

احترام اسلام اشک

سکون دیتے نہیں ساغر و سبو ساقی
ترے بغیر اندھیرا ہے چار سو ساقی

عجیب لوگ ہیں کہتے ہیں مجھ کو دیوانہ
جو تجھ کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں کو بہ کو ساقی

اداس اداس ہے دل کا چمن بغیر ترے
اڑا اڑا سا ہے پھولوں کا رنگ و بو ساقی

گلہ زمانے سے کیا ہو کہ ہجر میں تیرے
ہوا ہے خود مرا دل بھی مرا عدو ساقی

ترے کرم ہی سے کوئی کہیں کا رہ نہ سکے
ترے کرم ہی سے کوئی ہو سرخرو ساقی

کسی کی یاد جب آئی تو تیرے ہوتے ہوئے
ٹپک پڑا ہے مری آنکھ سے لہو ساقی

تری نگاہ میں بنا تھی اشک کی تقدیر
دگر نہ کتنے ہی تھے تیرے روبرو ساقی

شکیل احمد عاصم بریلوی

گل محبت کے کھلے دل کے نہاں خانے میں
آپ کیا آئے بہار آگئی ویرانے میں

جب تصور میں ترا چاند سا چہرہ ابھرا
نور سا پھیل گیا دل کے سیہ خانے میں

مذہب بادہ پرستی میں ہے تفریق حرام
ساتھ پیتے ہیں سبھی بیٹھ کے میخانے میں

ہے یہ ناواقف آداب محبت شاید
کچھ ابھی ہوش کے آثار ہیں دیوانے میں

اختلافات ہیں پھر شیخ و برہمن میں یہ کیوں
ہے خدا ایک ہی جب کعبہ و بت خانے میں

یوں ہیں روشن مرے دل میں تری یادوں کے دیے
جیسے ہو جشن چراغاں کسی ویرانے میں

کون کافر، اسے پینے سے کرے گا انکار
آب کوثر ہے چھلکتے ہوئے پیمانے میں

عمر ساری کٹی تپتے ہوئے صحرا کی طرح
آئے رنگینی کہاں سے مرے افسانے میں

یہ فقط میری وسیع النظری ہے کہ مجھے
عکس کعبہ نظر آتا ہے صنم خانے میں

اس میں عاصم کا کہیں نام نہ آیا اے دوست
ہے یہ تنقید کا پہلو ترے افسانے میں

جشنِ آزادی

ودود قمر

بزم میں فرشِ ستاروں کا بچھایا جائے
اور چراغِ مہ و خورشید جلایا جائے
خلد کو عرش سے اس فرش پہ لایا جائے

ہمسرِ جنتِ فردوس بنایا جائے
اپنے بھارت کو کچھ اس طرح سجایا جائے
کہ جو آجائیں فرشتے تو نہ جایا جائے

نورِ ادراک و یقیں اور بڑھایا جائے
ذہن سے سارے حجابوں کو اٹھایا جائے
فرقہ بندی کا جو ہے ہم پہ وہ سایا جائے

جس میں ہوں رنگ کئی اور کئی خوشبو ہوں
اپنے گلزار میں وہ پھول کھلایا جائے
اور اسے سارے زمانے کو دکھایا جائے

عام ہو جائے رہ و رسمِ مروّت یارو
بغض و نفرت کے اندھیرے کو مٹایا جائے
شمعِ الفت کو ہر اک سمت جلایا جائے

کوئی اعلیٰ ہو کہ ادنیٰ ہو، غنی ہو کہ فقیر
سب کو اس انجمن میں بٹھایا جائے
سب سے اس محفلِ ہستی کو سجایا جائے

ہندو و سکھ ہوں کہ وہ مسلم و عیسائی ہوں
ایک ہی صف میں ہر انسان کو لایا جائے
سب کو پیغامِ مساوات سنایا جائے

راستے میں کوئی بھٹکا ہو تو ٹوکیں اس کو
تھک کے بیٹھا ہو جو کوئی تو اٹھایا جائے
خواب میں کوئی اگر ہو تو جگایا جائے

ایک قوم ایک وطن ایک ہے مقصد بھی فقط
ایک لے اور اک آواز میں گایا جائے
اپنی آزادی کا یوں جشن منایا جائے

آزادی

بسنت کمار بسنت

بہار آئی ہے گلشن شادماں ہے
بہت رنگیں چمن کی داستاں ہے
ہجومِ نازنین و مہوشاں ہے
ترنگے کو ذرا اونچا اٹھاؤ
رفیقو! جشنِ آزادی مناؤ

تمھیں سے ہے وطن کی شان و عظمت
تمھیں دینا ہے سب کو درسِ عبرت
پیامِ دوستی، اخلاص و الفت
قدم اک ساتھ سب مل کر بڑھاؤ
رفیقو! جشنِ آزادی مناؤ

مٹا دو بغض و کینہ، فتنہ و شر
وہ غنچہ ہو کہ کانٹا یا گلِ تر
برابر سب کا حق ہے گلستاں پر
یہی سب سے کہو سب کو بتاؤ
رفیقو! جشنِ آزادی مناؤ

سنوارو اس طرح سے نظمِ گلشن
رہیں مل جل کے سب شیخ و برہمن
بنا دو ہند کو وادیِ ایمن
اہنسا کا سبق سیکھو سکھاؤ
رفیقو! جشنِ آزادی مناؤ

مٹا دو ہند سے بے روزگاری
نیا فن ہو، نئی ہو دستکاری
تجارت میں بڑھے شہرت ہماری
وطن کو اپنے اک جنت بناؤ
رفیقو! جشنِ آزادی مناؤ

محافظ ہو، نگہبانِ چمن ہو
تمھیں تو جان و روحِ انجمن ہو
سکھانا کیا تمھیں تم اہلِ فن ہو
چراغِ فکر و فن سے نور لاؤ
رفیقو! جشنِ آزادی مناؤ

منی پوری رقص

کپلا واتسائن

منی پور کے ناچوں کا سلسلہ قبائلی ناچوں سے لے کر انتہائی اعلیٰ طرز کے تنہا ناچے جانے والے فنی ناچوں تک چلتا ہے۔ عام زبان میں منی پور کے رقص کی ویشنو روایت کو منی پوری کہا جاتا ہے لیکن خود منی پور کے لوگ منی پور کے کسی بھی ناچ کو منی پوری ناچ نہیں کہتے، ان کے ہاں بے شمار ناچ رائج ہیں۔ مثلاً لائی ہر وبا، مائیبا اور مائیبی ناچ، راس نرتیہ، سنکیرتن اور چولوم لیکن وہاں کے بھی ناچ کو منی پوری ناچ نہیں کہا جاتا۔ اس لیے اس خطے کے ناچوں کا تذکرہ کرتے وقت وہاں کے علاقوں اور ناچ کی سطح کا بھی خاص دھیان رکھا جانا چاہئیے، خصوصاً اس وجہ سے کہ قبائلی اور لوک ناچ کے طور پر نیز کلاسیکی ناچوں کی حیثیت سے

منی پور کا ایک لوک ناچ

مشہور وہاں کے ناچوں کے درمیان کوئی خطِ امتیاز نہیں ہے۔

ہندستان کی شمالی سرحدوں پر واقع یہ چھوٹی وادی اور اس کے گرد و نواح کی پہاڑیاں قدیم زمانے ہی سے قدرتی حسن کا ایک بیش قیمت خزانہ رہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بھگوان شو بھی اس وادی کی خوبصورتی سے یہاں کھنچے چلے آئے تھے اور ایک جھیل کی تخلیق خود انھوں نے کی تھی۔ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے علما نے اس علاقے کا تعلق ارجن سے قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ارجن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس سرزمین کی ایک یاترا کے دوران وہ یہاں کی راجکماری "چترا نگدا" کو دل دے بیٹھے۔

علم الاقوام کی رُو سے اس خطے کے لوگوں کا رابطہ دو زمروں کی نسلوں سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ لوگ جو پہاڑی علاقوں میں رہتے ہیں اور دوسرے وہ جو وادی میں رہتے ہیں۔ ان لوگوں کی تہذیب اور تمدن دونوں نے آپسی تال میل سے ایک دوسرے کو متاثر کیا ہے۔ اور وادی کے تمدن کو فروغ دینے میں پہاڑی قبیلوں نے بھی اتنا ہی حصّہ لیا ہے جتنا کہ وادی کے تمدن نے پہاڑی لوگوں کی نشو و نما اور ترقی میں۔ اس وادی کے لوگ اپنے آپ کو میتی کہتے ہیں۔

مائبیا ناچ

منی پوری یا منی پوریا یا میتی کی اصطلاح عموماً وادی کے باشندوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ میتی لوگ اپنے ماضی کا رشتہ ویدک عہد سے جوڑتے ہیں اور میتی پوران وادی کے لوگوں کے ایک طویل اور سلسلے وار ورثے کا ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ جہاں تک ناچوں کا تعلق ہے وشنو عہد سے قبل کے سب سے زیادہ رسمی ناچ مائبیا اور مائبی ناچ ہیں۔ یہ ناچ ناچنے والے منی پور کے پشتینی پجاری اور پجارنیں ہوتی ہیں جن کا اپنا ایک خاص طبقہ ہے اور عبادتی رقص کرتے ہیں۔ ان ناچوں میں تھرکنے کا ایک غیر معمولی اور باضابطہ معیار قائم رکھا جاتا ہے۔ سفید دودھیا پوشاکوں میں ملبوس مائبیے اور مائبیاں دھیمی دھیمی تال پر بار بار ہلکے ہلکے تھرکتے ہیں اور یہ تھرکن رفتہ رفتہ تیز ہوتے ہوتے عروج تک پہنچ جاتی ہے اور وجد کا عالم طاری کر دیتی ہے۔

لائی ہروبا

مائبیوں اور مائبیوں کے ان عبادتی ناچوں کے علاوہ ایک اور اہم عبادتی رقص وہ ہے جو لائی ہروبا کے عام زمرے میں آنے والے ناچوں کا حصّہ ہے۔ لائی ہروبا لمبے وقفہ تک چلنے والا ایک ناچ میلہ ہوتا ہے۔ جو تنہا یا اکیلے ناچے جانے والا یا دو رقاصوں کے گروپ پر مشتمل ناچ ہوتا ہے۔ اس موقع پر کئی قسم کے کھیل وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ وادی کے باشندوں کے لیے لائی ہروبا، ایک علامتی واقعے کی حیثیت رکھتا ہے جو ساری تخلیق کے ڈرامے کو اس کے پورے وقار اور شان کے ساتھ نیز اس کی خوشیوں اور جوش و خروش کو پوری طرح برقرار رکھتے ہوئے پیش کیا جاتا ہے۔ منی پور میں وشنو مت کی آمد کے بعد بھی لائی ہروبا میلہ منی پور کے لوگوں کی زندگی میں ایک نہایت ہی اہم کردار ادا کرتا آ رہا ہے۔ اب لائی ہروبا ناچوں میں سے ان ناچوں کو جو مل کر ناچے جاتے ہیں اسٹیج اور ڈرامہ کے ناچوں میں بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

کھمبا تھوئیبی ناچ ایک اور روایتی ناچ ہے جس میں شیو اور پاربتی کے روپ میں کھمبا اور تھوئبی کے محبت کے عظیم افسانے کو پیش کیا جاتا ہے۔

راس نرتیہ

منی پور کے ناچوں میں سے جو ناچ سب سے زیادہ مشہور ہیں اور جن کا سب سے زیادہ تذکرہ کیا جاتا ہے وہ ہیں سنکیرتن اور راس نرتیہ۔ راس ناچوں میں وشنو مت کی آمد سے پہلے اور بعد کے عناصر کے درمیان کوئی واضح خط کھینچنا زیادہ آسان نہیں۔ البتہ عنصر خالصتاً وشنو ہوتا ہے اور مخصوص پوشاکوں کے ساتھ ناچ کی شکل میں ایک راس لیلا کو پیش کیا جاتا ہے جو منی پور کے ایک حکمراں شری راجہ رشی نے خواب میں دیکھی تھی۔ اس راجہ کے پیشرو نے اس سے پہلے ہی وشنو مت کو سرکاری مذہب قرار دے رکھا تھا اور چیتنیہ کے ایک پیرو کا رسنت داس

کا وہاں پر گہرا اثر پڑ چکا تھا منی پور میں ویشنو مت کی جڑیں جب
ایک بار جم گئیں تو ساری وادی شری مد بھگوت کے گیتوں سے
گونجنے لگی۔ چنانچہ کرشن اور رادھا کی محبت نے جتنی زندۂ جاوید
شکل منی پور میں اختیار کی ہے۔ اتنی غالباً کسی اور جگہ نہیں
کی ہے۔

ان نرتیوں (ناچوں) کو عام طور پر پانچ زمروں میں تقسیم
کیا گیا ہے۔ یہ زمرے سال کے ان اوقات کی ترجمانی کرتے ہیں۔
جب یہ ناچ ناچے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک وسنت راس ہے
جو ہولی پورنیما کے دنوں میں ناچا جاتا ہے اور ایک مہا راس
ہے جو کارتکی پورنیما کے موقع پر ناچا جاتا ہے۔ اسی طرح نیتہ
راس کا ایک مقررہ وقت ہے اور گوپ راس "گوپال بالوں"
کے لیے مخصوص ہے۔ جس میں سکھیاں حصہ نہیں لیتیں یہ راس
نرتیہ شری گوبندجی مندر میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان ناچوں
کے لیے بڑی سخت تربیت اور مشق کی ضرورت ہوتی ہے اور
اس تربیت و مشق کا عرصہ پانچ برس سے ۲ برس تک کا
ہوتا ہے۔ راس نرتیہ کو صرف پیشہ وارانہ رقاص ہی نہیں
ناچ سکتے بلکہ وادی کا کوئی بھی باشندہ ان ناچوں میں
حصہ لے سکتا ہے اور کچھ عرصے پہلے تک تو یہ حالت تھی کہ
مندر کے اس راس نرتیہ میں شرکت کی اجازت مل جانے کو ایک
سماجی اعزاز تصور کیا جاتا تھا۔

راس نرتیوں کے علاوہ وہاں کئی روایتی راس لیلائیں بھی
رائج ہیں۔ انھیں بھی مندر کے اندر اور اس کے اردگرد ہی
پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیلا میں سے ایک نٹ سنکیرتن ہوتا
ہے۔ اس طرح راس لیلا کی تمہید یعنی نٹ سنکیرتن اور راس
نرتیہ دو مخصوص اور الگ الگ دھارائیں ہیں۔

سنکیرتن نرتیہ

سنکیرتن میں ایک خاص اور واضح قسم کے سُر تال اور راگ
(دُھن) کی پابندی اسی طرح کی جاتی ہے جس طرح ہر راس
نرتیہ میں اس کا آغاز رقص کرنے والے گروپ کے لیڈر کی
طرف سے مُرنگ (منی پور مردنگ) پر وندنا (تمہید) سے ہوتا ہے۔
اس کے بعد مردنگ پر دوسرے رقاص بھی اس قسم کی وندنا
کرتے ہیں۔ سنکیرتن کے لیڈر کو ایشی ہوبا کہا جاتا ہے۔
اس کے بعد ستیہ وندنا (بول کے ساتھ وندنا) اور ایک بنیادی گیت
کے ساتھ اصل سنکیرتن شروع ہوتا ہے۔ جس کے بعد رقاص کا
گروپ پھر مردنگ بجاتا ہے اور بالآخر وہ کچھ اور گیتوں کے ساتھ
نقطۂ عروج کو پہنچتا اور پھر ختم ہو جاتا ہے۔ بیچ بیچ میں صرف
مردنگ اور دیگر سازوں کا استعمال گیتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے
منی پور کے ہر ناچ کے آخر میں، خواہ وہ راس کے زمرے کا ہو یا
سنکیرتن کے زمرے کا، وجد سا طاری ہو جاتا ہے اور اس میں رقص
کرنے والے اپنے آپ کو مکمل طور پر بھگوان کو سمرپن (سپرد) کرنے کی
مُدرا انداز میں آجاتے ہیں۔

سنکیرتن اور اس قسم کے دوسرے طرز رقصوں کو موٹے طور
پر دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک زمرہ پیرنگوں کا ہے
اور دوسرا چولوموں کا۔ ان دونوں کی مشابہت ہندستانی ناچوں
کے دیگر اسٹائلوں کے تانڈو اور لاسیہ حصوں کے ساتھ قائم کی جاسکتی
ہے۔ رقاص کو ان پیرنگوں کی تربیت اس وقت دی جاتی
ہے جب وہ چالی اور بھنگی کے بنیادی طریقوں کو خوب اچھی
طرح سے سیکھ لیتا ہے۔
سنکیرتن میں تمام چولوموں کو بھی استعمال میں لایا جاتا ہے۔

تانڈو نرتیہ

چولوموں کا گہرا تعلق مختلف قسم کے تانڈو نرتیوں (ناچوں)
سے بھی ہے۔ یہ جنگی جوش و خروش پیدا کرنے والے رقص ہیں اور
انھیں تلواریں اور بھالے لیکر ناچا جاتا ہے۔ اچھل کود اور پینتروں
کی خوب تیز پھرتی ان ناچوں کی خصوصیت ہوتی ہے۔

ناچوں کی جن قسموں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے وہ صرف اس
بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ اس خطے میں ناچوں کی ایک بڑی تعداد
مقبول ہے جنھیں ایک ہی نام "منی پوری" دیا جاتا ہے۔ ان میں
ناگاؤں اور دیگر قبائل کے ناچوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ جو

قبائل کے مخصوص علاقوں میں رائج ہیں۔

نئی روشنی کے آنے اور سابقی ہندستان اور منی پور کے درمیاں رسل و رسائل کے ذرائع کے فروغ پانے کی وجہ سے منی پور نے اپنے مختلف ناچوں کو ہندستان کے دیگر حصّوں میں پہنچا دیا ہے۔ اس خطّے کی موسیقی اور رقص کی بیش قیمت روایت کو برقرار رکھنے اور انھیں فروغ دینے کے لئے تربیتی ادارے قائم کیے گئے ہیں اس قسم کے ادارے غالباً اجتماعی ناچوں کی پرانی روایت اور رقاصوں کی تربیت "گورو شِشیہ پرمپرا" کے روائتی طریقے کی جگہ لے سکتی ہے۔ اس سلسلے میں جہاں رضا کارانہ طور پر موثر کوشش کی گئی ہے وہاں سنگیت ناٹک اکیڈمی نے بھی "جواہر لال ہنرو اسکول آف منی پوری ڈانسنگ" قائم کر کے ایک دیرینہ ضرورت کو پورا کیا ہے۔ نامور گوروؤں مثلاً "راسس نرتیوں" کے لیے گورو اموبی سنگھ اور سنکیرتن کے لیے گورو جوا بانگھو سے درخواست کی گئی کہ اس اسکول میں وہ طلباء کی رہنمائی کریں۔ اس اسکول میں طلبا کو منی پوری رقص کی تمام روایتوں کی تربیت دی جاتی ہے۔ پچھلے کچھ عرصے میں ان ناچوں کے کچھ تجربے کیے گیے ہیں اور نئے نئے طریقے نکالے گئے ہیں نیز بیلے بھی تیار کیے گئے ہیں اس طرح سے اس وادی میں شکوہ اور مسرت آنسو اور مسکراہٹ، جاندار کھیل اور دیوتاؤں اور انسانوں کی گہری محبت کی ایک دنیا سمائی ہوئی ہے۔

★

آزادی ___ اور ہماری ذمّہ داریاں ___ (صفحہ ۲ کا بقیہ)

ہماری موجودہ مصیبتیں باقی رہیں گی۔

اس وقت مہنگائی، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی وغیرہ جیسی سماجی برائیاں عام ہیں۔ لیکن یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ مٹھی بھر افراد ملک کی ساری دولت اور صنعت کے اجارہ دار بنے ہوئے تھے اور اس طرح ملک کی اقتصادیات کو اپنے اشاروں پر چلایا کرتے تھے۔ اب جبکہ ہم وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت و رہنمائی میں تیزی کے ساتھ سوشلزم کی جانب بڑھنا چاہتے ہیں کیونکہ سوشلزم ہی میں ہمارے ملک اور یہاں کے عوام کی بھلائی ہے تو یہی مٹھی بھر اجارہ دار اس راہ میں مشکلات اور رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں اس لیے کہ غریبی اور اقتصادی نا برابری دور کرنے کے لیے اس وقت جو حوصلہ مندانہ قدم اٹھایا گیا ہے اس سے ان خود غرض اور مفاد پرست لوگوں کے ذاتی مفادات پر کاری ضرب پڑتی ہے۔ اس لیے وہ اس پروگرام کو ناکام بنا دینے کے لیے نہ صرف طرح طرح کی غلط افواہیں پھیلا کر اور پروپیگنڈے کر کے عوام کو بہکا رہے ہیں بلکہ ذخیرہ اندوزی کر کے غذائی اشیاء کے ساتھ دیگر ضروریات زندگی کی مصنوعی قلت بھی پیدا کر دی ہے۔ یہی نہیں بلکہ کسی نہ کسی بہانے سے کارخانوں میں پیداوار میں بھی کمی کر دی ہے جس سے اگر ایک طرف قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی ہیں تو دوسری طرف چور بازاری، نفع خوری وغیرہ کا رجحان عام ہو رہا ہے۔ اس طرح سارے ملک کے عوام پریشانی میں مبتلا ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سماج دشمن عناصر کی ریشہ دوانیوں اور سیاہ منصوبوں کو خاک میں ملا دینے کے لیے ہم سب متحد ہو کر اٹھ کھڑے ہوں اور اس لوٹ کھسوٹ کے خلاف آواز بلند کریں۔ ملک کے ان دشمنوں اور غداروں کی حقارت آمیز حرکتوں سے عوام کو باخبر بنانے اور ان میں ان کے خلاف بیداری پیدا کرنے کی سب سے زیادہ ذمے داری ہمارے نوجوان طبقے پر ہے۔ اس لیے اسے فوراً آگے بڑھنا چاہیے۔ آج اپنی آزادی کی چھبیسویں سالگرہ کے موقع پر ہم کو ایک بار پھر ہندستان اور ہندستان میں بسنے والے تمام لوگوں کی خدمت نیز ان کی مشکلات، پریشانیوں اور مصیبتوں کو دور کرنے کے لیے اپنے کو وقف کر دینے کا عہد کرنا چاہیے۔ ہماری آزادی کا جشن منانے کا سب سے صحیح اور شاندار طریقہ یہی ہوگا۔

★

قومی یکجہتی میں طلبا کا حصہ

فیروز احمد جاوید

دنیا کا کوئی دوسرا ملک اس قدر رنگا رنگ اور گوناگوں تہذیب تمدن کا گہوارہ نہیں ہے جتنا کہ ہندستان۔ یہاں زمانۂ قدیم سے مختلف قومیں، مختلف گوشہ ہائے ارض سے پناہ لینے یا تجارت کی غرض سے آتی رہی ہیں۔ یہ قومیں مختلف زبان، رنگ روپ، طرزِ معاشرت، اخلاق و عادات، عقائد و نظریات رکھتی تھیں۔ باہر سے آنے والی ان قوموں کے تہذیبی سرمایے کا یہاں کی تہذیب سے اختلاط و امتزاج ایک ناگزیر اور یقینی امر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم ہندستان کی تہذیبی اور تمدنی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں قدم قدم پر ایک موڑ ہے جس سے مختلف تہذیبوں کا کارروان اپنے نظریات و عقائد، مذہبی اخلاق و عادات، طرزِ معاشرت اور زبان کے اثرات یہاں کی تہذیبی زندگی پر چھوڑتا اور یہاں کے تہذیبی اثرات قبول کرتا آگے بڑھا ہے۔ آج بھی ہندستان میں مختلف قومیں آباد ہیں، اور وہ اپنا اپنا عقیدہ، مذہب، اپنی اپنی معاشرت اور اپنے اپنے نظریات و خیالات رکھنے اور برتنے میں آزاد ہیں، تاہم ہندستان کی وہ تہذیبی روح جو اس کی اپنی تھی اور جس پر کوئی بھی بیرونی تہذیب اثر انداز نہ ہو سکی، باقی ہے۔

اس رنگا رنگ اور بوقلمونی تہذیب کے حامل ہندستان کے سامنے آج جہاں بہت سے دوسرے مسائل ہیں وہاں ایک بڑا اہم اور پیچیدہ مسئلہ قومی یک جہتی اور میل ملاپ کا ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جو ہر ملک اور قوم کے سامنے کھڑا ہو سکتا ہے، مگر اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ مسئلہ آج یکایک پیدا ہو گیا ہے۔

در اصل یہ بات اتنی ہی پرانی ہے جتنی ہماری شناختی تاریخ۔ اس لیے قومی معاشرے کے تخریبی عناصر کی بیخ کنی کے لیے انتھک کوششیں اور غیر معمولی جد و جہد درکار ہے۔ اس غیر معمولی جد و جہد اور سعئ پیہم سے یگانگت اور یک جہتی کو فروغ دینا جہاں اس ملک کے مختلف طبقوں کا فرض ہے وہاں یہ ذمہ داری سماج کے اس طبقہ پر خاص طور سے عائد ہوتی ہے جو مستقبل کے ہندستان کا معمار ہے اور جس کے شانوں پر ملک کی تعمیر و ترقی کا بار آنے والا ہے۔ میری مراد طلبا سے ہے۔ چنانچہ ہمارا فرض ہے کہ ہم گہری نظر سے اس بات کا مطالعہ کریں کہ ہم طلبا آزاد ہندستان کی تعمیرِ نو میں ملک قوم کو کس قدر مستحکم، یک جا، ہم خیال اور ہم فکر بنا سکتے ہیں۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ہر ملک کی آئندہ زندگی میں اس کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ بڑی ہی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ یہی نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے اور تعلیم اس کی روح رواں۔ یہاں تعلیم سے وہ تعلیم مراد نہیں ہے جو لوگوں کو مشین یا کلرک بنا دیتی ہے بلکہ اس سے وہ تعلیم مراد ہے جو لوگوں کو اعلیٰ تخلیقات اور نئی ایجادات پر اکساتی ہے اور جو انسان کو تعمیر و ترقی کی شاہراہوں پر گامزن کرتی ہے جس سے ان کے دل و دماغ میں قوم و وطن سے محبت اور ایثار و قربانی کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ ہر ملک کی تاریخ بڑی حد تک اس کے عظیم مردوں اور عورتوں کی تاریخ ہوتی ہے اور یہ بات تو ہندستان جیسے جمہوری ملک کے لیے اور بھی وثوق سے کہی جا سکتی ہے، کیونکہ یہاں کے

جمہوری آئین کی رو سے ہر فرد "قوم کی قسمت کا ستارہ" ہے۔

ہندستان میں موجودہ سماجی تبدیلیاں جس تیز رفتاری سے ہو رہی ہیں اس سے بحث نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ہمارا ملک اس وقت غیر معمولی حالات سے گذر رہا ہے، نئے نئے قوانین کے ذریعے سماجی، معاشی، تہذیبی اور سیاسی قدریں بڑی تیزی سے بدلتی جا رہی ہیں۔ شخصی آزادی، جمہوریت اور مساوات کو بڑی اہمیت دی جا رہی ہے مگر کچھ عناصر ہماری سوسائٹی پر متواتر اور موثر طور پہ اثر انداز ہوتے رہتے ہیں جس سے امتیاز و اختلاف نشو و نما پاتا ہے اور اتحاد و اتفاق کی فضا مسموم ہوتی ہے۔ اس خطرناک دھارے کو موڑنے کے لیے تہذیبی یگانگت (CULTURAL INTEGRITY) کی ضرورت ہے۔ مدرسہ سے لے کر یونی ورسٹی کی سطح تک تعلیم کے زمانہ میں ہر طالب العلم مختلف مذہب کے ماننے والے طلباء کے ساتھ اپنے اوقات گذارتا ہے، سب ایک دوسرے کے جذبات سے متاثر ہوتے ہیں، ان کا مطمح نظر بھی تقریباً ایک سا ہوتا ہے۔ اگر سماج کی ان خامیوں، برائیوں اور لعنتوں کو دور کرنے کا عہد طلبا کر لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایک خوش گوار ہم آہنگی اور یک جہتی کی فضا قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے ملک کی فلاح و بہبود کے لیے متحد ہو کر راسخ عزم کریں اور میل ملاپ، بھائی چارے کے جذبہ کو فروغ دینے کی کوشش کریں تاکہ زندگی کے ہر شعبۂ حیات میں سکون و یک جہتی کی فضا قائم ہو سکے۔ اس لیے اگر تعلیم کے بنیادی مقصد کے ساتھ ساتھ طلبا اس "قومی کارِ اتحاد" میں بھی اپنی کوششیں جاری رکھیں تو ایک دور وہ آئے گا جب خود بخود ایسا ماحول پیدا ہو جائے گا جس میں لوگ امن و امان سے سانس لے سکیں گے۔

ملک اور سماج کے اس وسیع دائرے میں طالب علموں کا جو موقف ہونا چاہیے وہ ظاہر ہے۔ سچ پوچھیے تو انسانی معاشرے کے ایوان عالی شان کا سنگ بنیاد رکھنے والے طلباء ہی ہوتے ہیں۔ آج قوموں کا انداز فکر اور طریقۂ زندگی بالکل بدلتا جا رہا ہے، ہر چیز بین الاقوامی نقطۂ نظر سے دیکھی جانے لگی ہے کیونکہ اب ہر ملک "عالمی کل" کی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے وہ زمانہ گذر گیا جب ہر قوم اپنے اپنے محدود قطعہ ارض پہ حکمراں ہوا کرتی تھی اور دوسروں کی ترقی و مفاد سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا، لیکن اب ہر قوم کا دائرہ عمل وسیع ہو چکا ہے، زندگی کے ہر شعبہ سے دوسروں کا تعلق و اثر لازمی ہے۔ عمل اور ردعمل کے اس سلسلے کو وسیع تر بنانے میں طالب علم بخوبی مفاہمت پیدا کر سکتے ہیں۔

ہماری سماجی قدروں میں بلندی اور لچک پیدا کرنے میں طلبا کا بڑا حصہ ہو سکتا ہے۔ وہ ان جذبوں اور اعلیٰ اقدار کو مستحکم و مضبوط بنا سکتے ہیں جن پر ایوان اتحاد سربلندی پاتا ہے۔ اس کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ طلبا خود میں وسیع النظری اور وسیع القلبی پیدا کریں کسی چیز یا واقعہ کو محدود نقطۂ نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کے بجائے دور اندیشی اور دیرپا نتائج کی فکر کریں تاکہ ان کی جلد بازی سے کوئی ایسا غلط کام نہ ہو جائے جس سے قومی اتحاد و اتفاق کی دیوار میں شگاف پڑنے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔

یوں تو اس وقت ملک کے سامنے بیشتر مسائل ایسے ہیں جن سے چشم پوشی ممکن نہیں لیکن قومی یک جہتی ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے ذرا بھی غفلت ملک و قوم کے سکون و سالمیت کو بہت ہی عظیم نقصان پہنچا سکتی ہے، یہ سب جانتے ہیں کہ اتحاد و اتفاق بڑی قوت ہے، مگر اس اتحاد و اتفاق کے پودے کو کوئی اپنے خون جگر سے سینچنا نہیں چاہتا ہے موجودہ صورت حال میں قومی یک جہتی کا سب سے بڑا اور اہم عنصر جذباتی ہم آہنگی (EMOTIONAL INTEGRITY) اور دلوں کا میل ہے، حقیقتاً اسی جذباتی ہم آہنگی سے قومی ہم آہنگی اور جذبۂ حب الوطنی کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ در اصل نفاق و عناد کے محرکات اثرات کو دور کر کے اخوت و مروت کی فضا قائم کرنے ہی میں ملک و قوم کی فلاح و خوش حالی پوشیدہ ہے اور وطن کی شیرازہ بندی کا استحکام و قیام اسی صورت میں ممکن ہے۔ اس سلسلے میں طالب علم گراں قدر خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ اپنے پاس پڑوس کے رہنے والوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جو خوف اور ڈر سمایا ہوا ہے، اسے میل محبت کا ماحول پیدا کر کے، سبھی تہواروں اور کھانے پینے میں

نیز شادی بیاہ اور غمی میں شریک ہو کر دور کر سکتے ہیں اور ان کے
دلوں میں ایک دوسرے کی عزت و عظمت قبول کرنے کا جذبہ پیدا
کر سکتے ہیں۔

نسلی اور مذہبی اختلافات، لسانی اور تہذیبی امتیازات
پیدا کرنے والے عناصر ملک کی یک جہتی اور سالمیت کے لیے
خطرناک ہوتے ہیں۔ اس سے لوگوں کا جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرزم
سے اعتماد ہٹ جاتا ہے اور ایک دوسرے کے دلوں میں تعصب اور
فرقہ پرستی کے جذبات گھر کرنے لگتے ہیں۔

ماہرین نفسیات نے تعصب کو دلوں سے دور کرنے کے لیے پہلی شرط
یہی بتائی ہے کہ لوگوں کے مابین امتیاز نہ برتا جائے اور ایک دوسرے
میں تفریق نہ کی جائے۔ چونکہ ادارے قومی ہوتے ہیں اس لیے
ایسے جذبے طلبا کو تعلیمی سطح پر ہی پیدا کرنے چاہئیں۔ اگر اس اسٹیج
پر ہم میں اس قسم کے مہلک جذبوں سے نفرت
اور ان کے خلاف جدوجہد کرنے کی قومی عادت پڑ جائے
تو یقیناً مستقبل میں جب یہی طلباء ملک و قوم کے رہنما بن کر
عوام کے سامنے آئیں گے تو لوگ ان کے کردار کی عظمت سے
سبق حاصل کریں گے۔ اس طرح ایک چراغ سے دوسرے
چراغ روشن ہوتے جائیں گے، قوم کی کھیتی ہری بھری سرسبز و
شاداب ہوتی جائے گی اور ہماری قومی ترقی و فلاح کے لیے یکجہتی اور
میل ملاپ کے سوتے پھوٹتے رہیں گے۔

یہ بات بار بار دہرانے کو جی چاہتا ہے کہ ہم طلباء کو علاقائی
تعصب، فرقہ واریت، ذات پات کی تفریق، لسانی مغائرت کے مہلک
اثرات سے خود کو محفوظ رکھنا چاہیے۔ قومی یک جہتی کا تصور
اور راز ہمارے نظریات کی استواری میں ہی پوشیدہ ہے

اور تعلیم اپنے وسیع معنی میں وہ سب سے زیادہ موثر ذریعہ ہے
جس سے خیالات و احساسات اور تصورات کو استوار کیا جا سکتا
ہے۔ طلباء کو صحیح معنوں میں اپنی معراج حاصل کرنا چاہیے اور
وہ معراج جب ہی حاصل ہو سکتی ہے جب ہم میں ایک دوسرے
کے لیے جینے اور مرنے کا جذبہ بیدار ہو جائے، جب ہم دوسرے
کے غم کو اپنا غم اور دوسرے کی خوشی کو اپنی خوشی متصور کرنے لگیں۔
اس سے باہمی اتحاد و اتفاق اور یک دل و یک جان ہو کر آگے بڑھنے
کا جذبہ پیدا ہوگا۔ ہمیں اس وقت ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے
جو صرف ذہنی نشوونما پر اکتفا نہ کرے، بلکہ جذبات کو سدھارنے
صاف اور ستھرا مذاق پیدا کرنے اور اعلیٰ ثقافتی و تہذیبی اقدار کا
تابع بنانے اور پھر ایسے کردار کی تشکیل کرنے میں معاون ہو جس سے ہم
ماضی کے صالح روایات کے سچے امین کہلائیں اور عظمت وطن کے حقیقی
علمبردار اور پاسبان ہوں۔ طلباء کو ہمیشہ ماضی کی اس روشن تاریخ کا یہ باب
اپنے پیش نظر رکھنا ہے کہ اسی سرزمین پر "کرشن نے بنسی بجائی"
ہے۔ یہیں پر "چشتی نے پیغام حق" اور گرو نانک نے "وحدت کا
گیت گایا ہے۔ یہیں پر گاندھی نے "پریم اور اہنسا" کا پرچار کیا ہے
اسی سرزمین کے "بھگتوں کے گیتوں میں شکتی اور شانتی کے نغمے
گونجے" ہیں اور ساری دنیا کو یہیں سے یہ پیغام ملا ہے کہ "دھرتی
کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے"۔ مختصر یہ کہ اگر ان زریں تعلیمات
کو ہم طلباء دل نشین کر لیں تو یقیناً ہم ایسا نظام حیات بنانے میں
کامیاب ہوں گے جس کی بنیاد خلوص نیت، اخوت و محبت اور اشتراک
اتحاد پر قائم ہوگی۔ اس سے خود بخود جوش قومی اور جذبۂ حب الوطنی
پیدا ہوگا جس کا لازمی نتیجہ ایک طرف قومی یک جہتی کی شکل میں نمودار
ہوگا اور دوسری طرف ملک و قوم کی فلاح و بہبود کا ضامن و امین ثابت ہوگا۔

تصویرِ ہند

روشن پٹیالوی

ہو رہی ہے فیضِ آزادی سے اب تعمیرِ ہند
خوش نصیبی سے ہوئی بیدار پھر تقدیرِ ہند

اوج پر آئی ہوئی ہے آج کل تقدیرِ ہند
کارگر ہوتی ہے ہر اک کام میں تدبیرِ ہند

اس کی عزت کا محافظ ہے ہر اک ہندی جواں
بھول کر بھی کر نہیں سکتا کوئی تحقیرِ ہند

کام اگر مل جل کے کرنا سیکھ لیں اہلِ وطن
پھر سے ہو جائے حقیقی طور پر تعمیرِ ہند

رنگ آزادی کے بھرنے سے چمک پیدا ہوئی
خوب صورت بن گئی ہے واقعی تصویرِ ہند

اپنے پُر اخلاص مسلک کی بدولت واقعی
ہو گئی ہے بزمِ دنیا میں فزوں توقیرِ ہند

جنگ کی ظلمت کا باقی رہ نہیں سکتا نشاں
ہے پیامِ امن دنیا کے لیے تنویرِ ہند

آ گیا ہے جشنِ آزادی کا پھر یومِ سعید
کیوں نہ ہو مستِ مسرت ہر جوان و پیرِ ہند

یومِ آزادی

تابش صدیقی

ہر طرف رنگ ہے ہر طرف نور ہے
زندگی کیف و مستی سے معمور ہے

وسعتِ فکر بخشی ہے آزادی نے
حسنِ تعمیر ہر دل میں مستور ہے

ہے فضاؤں میں اک نشۂ زندگی
بن پئے ہر بشر آج مخمور ہے

ہر قدم ہے ترقی کی جانب رواں
منزلِ آگہی اب کہاں دور ہے

عزمِ تعمیر لے کے اٹھو ساتھیو
کون کہتا ہے انسان معذور ہے

ہم ہیں سوشلزم کی راہ پر گامزن
اپنا مسلک امن! پیار دستور ہے

منحرف ہے جو اس راہ سے دوستو
اس سے ہشیار وہ ایک ناسور ہے

فرض اپنا ہے یہ بھی کہ دیکھیں یہاں
کون مجبور ہے، کون رنجور ہے

یومِ آزادی مرہم ہے اے ساتھیو
آج ساری جلن دل کی کافور ہے

اُتر پردیش شاہراہِ ترقی پر

لکھنؤ میں ۱۸۵۷ء کی یاد میں نکالے گئے شاندار جلوس کے موقع پر گورنر اتر پردیش کا پیغام . . . وائس چانسلروں کی جانب سے یونیورسٹی آرڈی ننس کا خیر مقدم . . . ریاست میں گیہوں خریداری کی رفتار تیز تر کرنے کے لیے غیر سرکاری کمیٹیوں کی تشکیل . . . سیاحت مشاورتی کمیٹی کی تشکیل . . . قومی شاہراہوں کی لمبائی دوگنی کرنے کے لیے ریاستی حکومت کی تجویز . . . متھرا میں ٹورسٹ بنگلے کی تعمیر . . . عوامی لائبریریوں کی ترقی کے لیے مرکزی امداد . . . ریاستی جیلوں میں تقریباً پونے تین لاکھ روپیے کی مالیت کا سامان تیار کیا گیا . . . طبی اداروں کو امداد دینے کے لیے درخواستیں طلب . . . ریاست کے ۶۶ بلاکوں میں جانوروں کا شکار ممنوع . . . پسماندہ طبقوں کے طلباء کو وظائف

اُتر پردیش کے گورنر شری اکبر علی خان نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی یاد میں آج یہاں نکالے گئے شاندار جلوس کے موقع پر عوام کے نام ایک پیغام جاری کیا ہے جس کا متن حسب ذیل ہے ـــــ

"۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی وطن پرستی، جانبازی اور ہندو مسلم اتحاد کا وہ کارنامہ ہے جس کی تابندگی کبھی ماند نہیں پڑے گی۔

"اسے عام طور پر غدر کہہ کر بدنام کیا گیا ہے لیکن بعض انگریز مورخ بھی نانا صاحب اور اُن کے مشیر خاص عظیم اللہ خاں کی تنظیمی کوششوں اور رجیاتی تحریک کی کامیابی کو دیکھ کر یہ ماننے پر مجبور ہوئے ہیں کہ یہ جنگ آزادی تھی۔"

"بہرحال آج جب ہم خدا کے فضل سے آزاد ہیں اور پچھلے پچاس سال سے دنیا میں باعزت و باوقار زندگی بسر کر رہے ہیں ہماری احسان مندی کا تقاضا ہے کہ ہم ان بے شمار جاں نثاروں کو یاد کریں جنھوں نے سب سے پہلے آزادی کا جھنڈا بلند کیا اور اس کے لئے پروانہ وار جانیں دیں۔"

"لکھنؤ نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس کی ایک یادگار تو ریزیڈنسی کے ٹوٹے پھوٹے در و دیوار ہیں۔ مگر دوسری یادگار سکندر باغ کے بارے میں یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ یہ اس وقت کیا تھا۔ یہاں جتنے لوگ تھے سب نے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ ان میں ایک وہ سپاہی عورت بھی تھی جس کی لاش جب پیڑ پر سے گری ہے تو خود قاتل انگریز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔"

"خوشی کی بات ہے کہ لکھنؤ میں آج دوسرے سال اس شاندار جنگ آزادی کی یاد میں سکندر باغ سے عوامی جلوس نکالا جا رہا ہے جس میں ہندو مسلمان سکھ، عیسائی سب شانہ سے شانہ ملا کر چل رہے ہیں۔"

میری دعا ہے کہ ساری قوم اسی اتحاد اور اسی شان کے ساتھ تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن ہو یہاں تک کہ غریبی ہٹے اور خوشحالی عام ہو۔"

× × ×

اُتر پردیش کے گورنر اور چانسلر شری اکبر علی خان کی زیر صدارت راج بھون میں منعقدہ ریاست کے وائس چانسلروں کی کانفرنس میں آج یہاں اتر پردیش ریاستی یونیورسٹی آرڈی ننس ۱۹۷۳ء کے اعلان کا متفقہ طور پر خیر مقدم کیا گیا۔

چانسلر نے زور دیتے ہوئے وائس چانسلروں سے کہا کہ وہ وضع کئے جانے والے پہلے قانون کے سلسلہ میں اپنے مشورے حکومت کو بھیجیں اور آرڈی ننس پر عملدرآمد کے سلسلہ میں اگر کوئی دشواری پیش آئے تو اس دشواری کو حکومت کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ دشواریاں دور کرنے سے متعلق حکم جاری کیا

جا سکے ۔ جب تک پہلا قانون مرتب نہیں ہوتا ہے وہ قوانین جو مذکورہ آرڈی ننس سے قبل نافذ تھے اور آرڈی ننس کے منافی نہیں، بدستور نافذ رہیں گے ۔

ریاست کی چھ یونیورسٹیوں میں گذشتہ ۱۸ جون سے نافذ کئے جانے والے مذکورہ آرڈی ننس کے بموجب اِن یونیورسٹیوں میں انتظامیہ اور تعلیمی کمیٹیوں کی تشکیل کر دی گئی ہے ۔ ایگزیکیوٹیو کونسل اور کورٹ کا کام انتظامیہ کمیٹی اور تعلیمی کونسل کا کام تعلیمی کمیٹی انجام دے گی ۔

ریاست کے وائس چانسلروں کے علاوہ گورنر کے تینوں مشیر چیف سکریٹری اور ریاستی حکومت کے دیگر سینیر افسران نے اس یک روزہ کانفرنس میں شرکت کی ۔

کانفرنس کی یہ متفقہ رائے تھی کہ ریاست کی بعض یونیورسٹیوں میں صورت حال کے بگڑ جانے سے جو امتحانات ملتوی کر دینے پڑے تھے انھیں فوری طور پر منعقد کیا جانا چاہیے اور نتائج کا اعلان جلد کیا جانا چاہیے تاکہ آئندہ سال کی تعلیم میں خلل نہ پڑے ۔

وائس چانسلروں نے عام طور پر اس خیال کا اظہار کیا کہ داخلہ سے متعلق پالیسی ایسی ہونا چاہئے جو یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تعلیمی ماحول کو بہتر بنانے میں معاون ثابت ہو سکے ۔ اس سلسلے میں اہلیت کی بنا پر داخلے کے لیے کم سے کم معیار کے بارے میں بھی غور و خوض کیا گیا ۔ اس کے علاوہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کی بڑھتی ہوئی تعداد کو ملحوظ رکھتے ہوئے فیل ہونے والے طلبا کے دوبارہ داخلہ کے لیے مناسب بندوبست کرنے سے متعلق معاملے پر بھی غور کیا گیا ۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس سلسلے میں بھی تبادلہ خیالات کیا گیا کہ ڈاک کے ذریعے اور نجی طور پر تعلیم حاصل کرنے کی سہولتوں میں بھی اضافہ کرنا ہوگا ۔

وائس چانسلروں نے اساتذہ اور طلبا کے درمیان تعلقات قائم کرنے کے لیے ضروری اقدامات کی ضرورت پر بھی زور دیا تعلیم کے موجودہ نظام اور امتحانات کے طریقہ کار میں اصلاح کے پیش نظر ایک پانچ رکنی کمیٹی کی تشکیل کی گئی ہے ۔ کمیٹی میں کانپور، میرٹھ، لکھنؤ و پنت نگر یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی شامل ہوں گے ۔ اعلیٰ تعلیم کے ڈائرکٹر اس کمیٹی کے ممبر سکریٹری ہوں گے ۔

کانفرنس میں اس حقیقت پر بھی غور کیا گیا کہ طلبا کی بے چینی کے اسباب میں ایک سبب روزگار کی عدم دستیابی سے متعلق ان کی مایوسی بھی ہے ۔ اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ روزگار مہیا کرنے سے متعلق مناسب اور صحیح معلومات فراہم کرنے کے پیش نظر یونیورسٹیوں میں قائم شدہ روزگار دفتروں کو مزید مستحکم بنانے کے لئے فوری اقدامات کئے جائیں کانفرنس میں امید ظاہر کی گئی کہ مذکورہ روزگار دفتر نہ صرف روزگار کے مواقع مہیا کرنے میں بلکہ ایسی اسکیموں کے سلسلہ میں بھی طلبا کی رہنمائی کر سکتے ہیں جن کے لئے ریاستی اور مرکزی حکومتیں مالی امداد دیتی ہیں کانفرنس میں یونیورسٹیوں میں طلبا کو دی جانے والی علاج اور صحت سے متعلق سہولتوں میں سدھار کرنے کی ضرورت پر بھی کانفرنس میں زور دیا گیا ۔

کانفرنس میں سول انجینیروں کی کمی کے سوال پر بھی غور کیا گیا اور اس رائے کا اظہار کیا گیا کہ دیگر انجینیرنگ برانچوں کے طلبا کے لیے مناسب مختصر مدتی کورس تیار کئے جائیں تاکہ وہ سول انجینیروں کی حیثیت سے بھی کام کر سکیں ۔

چانسلر نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ یونیورسٹیوں میں گاندھی جی کے وچار اور فلسفہ کی تعلیم کا مناسب بندوبست کیا جائے ۔

× × ×

اتر پردیش کے چیف سکریٹری کی طرف سے ضلع مجسٹریٹوں کے نام جاری کردہ ایک مراسلہ کے بموجب ریاستی حکومت نے ریاست بھر میں گیہوں کی خریداری کی رفتار تیز تر کرنے کے پیش نظر غیر سرکاری افراد پر مشتمل ضلع اور منطقائی سطح پر کمیٹیوں کی تشکیل کی ہے ۔

ان کمیٹیوں میں ممتاز افراد کے علاوہ پارلیمنٹ اور ریاستی مجالس قانون ساز کے ایسے ممبروں کو بھی شامل کیا گیا ہے جنھوں نے گیہوں کی خریداری پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے بھرپور تعاون کا وعدہ کیا ہے ۔

ضلع مجسٹریٹوں کو ضلع و منطقائی سطح کی کمیٹیوں کے غیر سرکاری کارکنوں کے لیے آمد و رفت کی سہولتیں فراہم کرنے، عوامی جلسوں کے انعقاد کے سلسلہ میں لاؤڈ اسپیکر کا بندوبست کرنے اور عوام سے رابطہ

قائم کرنے کے سلسلے میں درکار دیگر سہولتیں مہیا کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

چیف سکریٹری نے ضلع افسران کو ہدایت کی ہے کہ گیہوں کی خریداری کی رفتار تیز تر کرنے کے سلسلے میں غیر سرکاری ممبران جو مشورے دیں ان پر وہ پوری توجہ دیں اور ان مشوروں سے غذائی کمشنر اور محکمہ غذا کے سکریٹری کو باخبر رکھیں۔

× × ×

ریاستی حکومت نے منطقائی سیاحت مشاورتی کمیٹی کی نو تشکیل کی ہے تاکہ لکھنؤ ڈویژن میں سیاحت کے نقطۂ نظر سے اہم مقامات کو ترقی دے کر لکھنؤ کو ہندوستان کے سیاحت کے نقشہ پر ایک ممتاز مقام دلایا جا سکے۔
نو تشکیل کمیٹی کے ممبران حسب ذیل ہیں ــــ

شری اطہر حسین۔ کمشنر۔ لکھنؤ ڈویژن۔ (چیرمین)۔ سرد شری بی۔ ایس ملکانی۔ ڈائرکٹر محکمۂ سیاحت۔ اترپردیش۔ جی این سنگھ اترپردیش کے محکمۂ جنگلات کے چیف کنزرویٹر ای۔ ایس سکسینہ۔ ناردرن ریلوے کے ریجنل سپرنٹنڈنٹ۔ اجیت مجمدار۔ ڈائرکٹر جنرل۔ محکمۂ آثار قدیمہ۔ حکومت ہند۔ این۔ پی ڈٹل۔ ٹرانسپورٹ کمشنر اترپردیش اور جے سی پانڈے۔ مینجنگ ڈائرکٹر۔ ریاستی پہاڑی ترقیاتی بورڈ۔

غیر سرکاری ممبران میں سرد شری موہن سنگھ ایم۔ ایل۔ اے۔ امتیاز حسین۔ ایم۔ ایل۔ اے سندر سنگھ چوہان۔ ایم۔ ایل۔ سی سنکٹا پرشاد۔ ایم۔ پی اور شریمتی شیلا کول۔ ایم۔ پی شامل ہیں۔

× × ×

حکومت اترپردیش نے مزید آٹھ ریاستی سڑکوں کو جن کی کل لمبائی ۲۴۸۸ کیلومیٹر ہے۔ قومی شاہراہیں قرار دینے کے لیے ایک تجویز مرکزی حکومت کو پیش کی ہے۔ ریاست میں موجودہ شاہراہوں کی مجموعی لمبائی ۲۴۶۳ کیلومیٹر ہے جن کی نگہداشت کے مصارف مرکزی حکومت فراہم کرتی ہے۔

اسی اثنا میں ریاستی حکومت چوتھے پنجسالہ منصوبہ کی اسکیموں کے تحت قومی شاہراہوں کی جدید کاری پر مالیاتی سال رواں کے دوران ۸ اکروڑ روپیہ خرچ کرنے کی تجویز رکھتی ہے۔ سال رواں کے لیے مجوزہ مصارف گذشتہ سال کے اخراجات کے مقابلہ میں دوگنے اور چوتھے منصوبے کے اول تین برسوں کے اخراجات کے مقابلہ میں تین گنے سے زیادہ ہیں۔ موجودہ منصوبہ میں قومی شاہراہوں کی جدید کاری پر ہونے والے اخراجات کی رقم ۷۶ء۵ کروڑ روپیہ تھی۔ جدید کاری میں قومی شاہراہوں کی تہہ کو زیادہ دبیز اور ان کی چوڑائی کو دوگنا کرنا شامل ہیں تاکہ وہ ۰۰ا کیلومیٹر فی گھنٹہ کی متوقع رفتار سے چلنے والی بھاری موٹر گاڑیاں آسانی کے ساتھ شاہراہوں سے گذر سکیں۔

× × ×

ریاستی حکومت شری کرشن جی کی جائے پیدائش "برج بھومی" (متھرا) میں غیر ملکی سیاحوں کے لیے قیام کی سہولتیں فراہم کرنے کے پیش نظر ایک "ٹورسٹ" بنگلہ تعمیر کر رہی ہے جس پر تخمیناً ۲۴۸۷۰۰ روپے کی لاگت آئے گی۔ "ٹورسٹ" بنگلہ کا تعمیراتی کام تیز رفتاری سے جاری ہے اور موجودہ مالیاتی سال کے آخر تک اس کی تکمیل متوقع ہے۔
یاد ہوگا کہ اس وقت متھرا میں کوئی ٹورسٹ بنگلہ نہیں ہے اور سیاحوں کو آگرہ یا دہلی میں قیام کرنا پڑتا ہے۔ مذکورہ بنگلہ کی تعمیر سے یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ملکی سیاحوں کو بھی اس بنگلہ میں قیام کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

× × ×

ریاستی حکومت نے ثانوی تعلیم کے ڈائرکٹر کو ہدایت کی ہے کہ وہ عوامی لائبریریوں کی ترقی کے لیے مالی امداد فراہم کرنے سے متعلق حکومت ہند کی ایک اسکیم کے تحت ۷۴-۱۹۷۳ء کے دوران مرکزی امداد دینے کے واسطے رضاکار تعلیمی تنظیموں سے مقررہ فارم پر درخواستیں طلب کریں۔
حکومت ہند کی مذکورہ اسکیم کے تحت یہ امداد ایسی رضاکار تنظیموں کو جو پچاس ہزار یا اس سے زیادہ آبادی کو اپنی خدمات سے مستفید کر رہی ہیں ساز و سامان، فرنیچر اور کتابوں کی خریداری اور عمارتوں کی تعمیر کے لیے دی جائے گی۔
اس اسکیم کے تحت مرکزی امداد کے لیے ریاستی حکومت

چار سے زیادہ درخواستوں اور مرکزی حکومت کے زیر انتظام علاقے دو سے زیادہ درخواستوں کی سفارش نہیں کر سکتے۔ عوامی لائبریریوں کی ترقی کے لیے رضاکار تنظیموں کو ۷۴ ۔ ۱۹۷۳ء کے دوران مالی امداد کی فراہمی کے واسطے بجٹ میں ایک لاکھ روپیہ کی رقم کا بندوبست کیا گیا ہے۔

جن عوامی لائبریریوں نے ۷۳ ۔ ۱۹۷۲ء کے دوران یا اس سے قبل کوئی درخواستیں بھیجی تھیں لیکن جنھیں مذکورہ اسکیم کے تحت منظور نہیں کی گئی تھی انھیں اس سلسلے میں نئی درخواستیں پیش کرنا ہوں گی۔

× × ×

اتر پردیش کے جیلوں میں قیدیوں نے گذشتہ سال تقریباً ۲۷۸۳۱۲ روپیہ کی مالیت کی مختلف چیزیں تیار کیں جن میں ۹۸۶۹ ۳ روپیہ کی مالیت کی ۶۸۹۶ ۲ کیلوگرام مونج کی رسیاں ۔ ۹۹۷.۷ روپیہ کی مالیت کی ۲۱۷۲ ۱ کیلوگرام سوتی رسیاں اور ۲۵.۳۴ روپیہ کی مالیت کی ۸۹۳۵ کیلوگرام سن کی رسیاں شامل ہیں۔

اسی مدت کے اندر ۹۴ ۶۶۵ روپیہ کی مالیت کے مونج کے ۴۸.۷ ایورٹ اور ۱۴۸۳۷ روپیہ کی مالیت کے شامیانوں کے استعمال کے لیے سن کے ۱۱۵۴ سلیتے بھی تیار کیے گئے۔ اس کے علاوہ مونج و سن کی رسیاں اور چٹائیاں بھی تیار کی گئیں۔

× × ×

علاج و صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کے ڈائرکٹر نے ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک غیر سرکاری طبی اداروں کو امداد فراہم کرنے کے پیش نظر سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ اداروں سے ۷۴ ۔ ۱۹۷۳ء کے لیے درخواستیں طلب کی ہیں۔

یہ امداد اسپتالوں کی نگہداشت عمارتوں کی تعمیر ساز و سامان کی خریداری دواؤں کی مفت تقسیم اور دیگر ضروری چیزوں کا بندوبست کرنے کے لیے دی جائے گی۔

خواہشمند تنظیموں کو اپنی درخواستیں مقررہ فارم پر ڈائرکٹر علاج و صحت لکھنؤ کو متعلقہ ضلع کے سول سرجن کی سفارش کے ساتھ بھیجنا چاہئیں۔ مقررہ فارم سول سرجن کے دفتر سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اگر کوئی دشواری سامنے آئے یا کوئی بات وضاحت طلب ہو تو علاج و صحت و خاندانی منصوبہ بندی کے سینیر اکاؤنٹس افسر سے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

× × ×

ریاست میں جنگلات کے درج ذیل ۶۶ بلاکوں میں گذشتہ یکم جون سے مکمل طور پر جانوروں کے شکار کو ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔

شکار کے لیے مکمل طور پر بند کیے جانے والے بلاک یہ ہیں ـــــ

سکوڑھہ (سوالک) تملی (مغربی) یتملی (مشرقی)۔ جھانجرہ۔ رام گڑھ اور ریلھان (مغربی دہرہ دون) میدان۔ گولات گڑھ۔ لچھی والا۔ تھانا اور چلا (مشرقی دہرہ دون) سبل گڑھ (جنوبی بجنور) کالو شہید (کالا گڈھ)۔ کوٹا۔ (رام نگر)۔ پور۔ بھاگرا اور رباره کولی (ترائی اور بھابر) جولاسال (ہلدوانی)۔ بیلی اور ڈانڈیا (روہیلکھنڈ) مصطفےٰ آباد (پیلی بھیت) بن کٹی (مغربی)۔ بن کٹی (مشرقی) بلرایان (جنوبی)۔ بلرایان (شمالی) اور بلیا (شمالی کھیری)۔ گولا مہرنیا۔ میلانی۔ ہیرا پور اور کشن پور (جنوبی کھیری)۔ جنک پور۔ نند ریہرہ۔ سہیلوا (مشرقی) اور سہیلوا (مغربی) چندن پور اور سونا گڑھ (شمالی گونڈہ) ٹکری (جنوبی گونڈہ) کٹرنیا گھاٹ۔ نشان گڑھا۔ دھرم پور۔ چودا۔ چکیا۔ موتی پور اور بھنگا (بہرائچ) رام گڑھ۔ بنکی۔ پکوئی۔ پھرینڈا۔ لکشمی پور۔ کشمہوا۔ مدھولیا۔ دائی بھلو اور ڈوما (گورکھپور) ہلیا اور رابرٹس گنج (شمالی مرزا پور)۔ کوہلوا۔ سلات۔ متدار۔ مجھگواں۔ رانی پور۔ کلیان پور۔ چاوری۔ دادری۔ بڑ گڑ۔ (باندہ) اور بینو گنج (وارانسی)۔

× × ×

ریاستی حکومت نے پسماندہ طبقوں سے تعلق رکھنے والے ایسے طلبا کو جو ریاست کے صنعتی تربیتی مرکزوں میں تربیت حاصل کر رہے ہیں وظائف دینے کے واسطے پانچ لاکھ روپیہ کی رقم منظور کی ہے۔

مذکورہ اسکیم کے تحت تربیت حاصل کرنے والوں کو فی کس ۲۵ روپیہ ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا۔ اگر کوئی شخص تربیت مکمل کرنے سے پہلے ہی ٹریننگ چھوڑ دیتا ہے تو اُسے بطور وظیفہ ملنے والی کل رقم واپس کرنا ہوگی۔

★

مواد اور ہیئت — (صفحہ ۷۱ کا بقیہ)

مواد اپنے نشو و نما کے وقت فنکار کے جذبات اور احساسات میں حرکت پیدا کرتے ہیں اور اپنے اظہار کے لیے کوئی نہ کوئی شکل تلاش کر لیتے ہیں۔ اسی کو تجربہ کی تکمیل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس تکمیل کے بعد فنکار کو کسی خاص ہیئت کی جستجو کرنا نہیں پڑتی بلکہ فکر اور تجربہ خود ایک مخصوص سانچے میں ڈھل جاتے ہیں اور تخلیقی عمل مکمل ہو جاتا ہے۔ ادبی تخلیق کی مثال انسانی تخلیق سے دی جا سکتی ہے۔ رحم مادر میں نطفے سے جو ہیولیٰ تیار ہوتا ہے وہ روز اول ہی سے انسانی شکل میں نمودار ہونا شروع ہوتا ہے اور جیسے جیسے اس کا نشو و نما ہوتا جاتا ہے اس میں ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ناک، کان اور دیگر اعضاء کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ یہاں نطفہ اور اعضائے انسانی علاحدہ علاحدہ کبھی پروان نہیں چڑھتے اور نہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو کر تکمیل کے مدارج طے کرتے ہیں، بلکہ دونوں ایک ساتھ مل کر صورت آدم میں جلوہ گر ہوتے ہیں اور انسانی تخلیق کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ نطفہ کی جلوہ گری اعضاء و جوارح کے بغیر اور اعضاء و جوارح کی تکمیل نطفہ کے بغیر ناممکن ہے۔

یہی معاملہ ادب کی تخلیق کا ہے۔ اس کے لیے بھی مادہ اور صورت یعنی مواد اور ہیئت کا باہمی اشتراک اور باہمی نشو و نما لابدی ہے۔ اس نشو و نما کے سلسلے میں اس بات کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے کہ ادیب اپنے ساتھ پورا خلوص برت رہا ہو۔ جو خیالات اور مشاہدات اس کے ذہن میں گزر رہے ہیں وہ خود بھی ان کو محسوس کر تا ہو۔ کسی لالچ اور دکھلاوے کی خاطر وہ ایسا نہ کر رہا ہو۔ خیالات اور جذبات کی نوعیت عشقیہ و مدحیہ ہو یا ان کا تعلق انسان کی دیگر کیفیات سے ہو، ان کی صحیح تکمیل اسی وقت ہو گی جب ادیب ان کے اظہار میں مخلص ہو گا۔ ورنہ عورت کی بے احتیاطی، صحت کی خرابی یا کسی اور بنا پر جس طرح کبھی کبھی بچّہ کا اسقاط ہو جاتا ہے اور وہ ظاہری مشابہت کے باوجود مکمل انسانی وجود نہیں ہوتا اسی طرح بعض اوقات فنکار کی لاپروائی، خلوص کی کمی اور اس کی جلد بازی کی وجہ سے کوئی فکر یا خیال اس کے ذہن میں مکمل تجربہ نہیں بن پاتا۔ وہ ارتقا کی انتہائی منزلیں سے گزرنے کے قبل ہی مچل جاتا ہے اور ذہن سے خروج اختیار کر لیتا ہے۔ گو ایسا تجربہ اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے ادب ہی معلوم ہوتا ہے لیکن نام نہاد ہوتا ہے۔ جب خیال و فکر کی پرورش ادھوری رہتی ہے اور مواد و ہیئت کا نشو و نما ناقص ہوتا ہے تو ایسی حالت میں فکر اور الفاظ کے اندر مکمل ہم آہنگی پیدا نہیں ہوتی۔ ادیب کا خیال کچھ ہوتا ہے اور الفاظ اسے کہیں اور لے جاتے ہیں۔ اسی لیے اس کی سطح معمولی ہوتی ہے۔ ایسے ادب کو اصلی ادب سے جدا رکھنا ہی بہتر ہے۔ اسی کی شناخت اور پرکھ دراصل تنقید کا فرضِ منصبی ہے۔ رچرڈس کے نزدیک ایک اچھا نقاد تین خوبیوں کا مالک ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ وہ تجربات اور تجربات میں امتیاز کرنے کی لیاقت رکھتا ہو۔ جو نقاد اس وصف سے محروم ہوتا ہے وہ اصلی اور نقلی، مکمل اور ناقص تجربات کے مابین فرق کرنے سے معذور رہتا ہے۔ کسی ادب پارے کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے نقاد میں اس صلاحیت کا ہونا ناگزیر ہے۔

★

لہ مقدمہ 'نئے اور پرانے چراغ'

REGD NO. L. 319

رویندرالیہ، لکھنؤ میں لاٹری کی ۲۶ ویں قرعہ اندازی جس میں ٹکٹ نمبر ایم ۰۶۷۴۹۸ کو پہلا انعام ملا

[library stamp]

جلد ۲۹ نمبر ۶
بھادرہ ۱۸۹۵ شک
ستمبر ۱۹۷۳ء
چندہ سالانہ: پانچ روپے
فی پرچہ: پچاس پیسے
ایڈیٹر
خورشید احمد
پبلشر
شرومنی شرما
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اُتر پردیش

پرنٹر
اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یو۔پی
مطبوعہ
گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اُتر پردیش

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو

اپنی بات

ہندستان اور پاکستان کے درمیان حالیہ سمجھوتے کو پائدار امن کی جانب ایک اہم قدم سمجھنا چاہیے۔ یہ سمجھوتہ دونوں ملکوں کے خصوصی وفود کے درمیان دہلی میں ۱۱ روزہ طویل گفتگو کے بعد ہوا جس پر ۲۸ ستمبر کو سات بج کر پانچ منٹ پر دستخط ہوئے۔ ہندستانی وفد کے سربراہ شری پی۔ این ہکسر اور پاکستانی وفد کے سربراہ شری عزیز احمد تھے۔ ہندستان اور پاکستان کی ۱۹۷۱ء کی جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے انسانی مسائل کے حل کی تلاش کے سلسلے میں بات چیت کا یہ دوسرا دور تھا۔ پہلا دور کچھ دنوں قبل راولپنڈی میں ہوا تھا۔ اس بار دہلی میں ہونے والی گفتگو دونوں وفود نے اس عزم کے ساتھ شروع کی تھی کہ کوئی نہ کوئی حل بہرحال نکالنا ہی ہے۔ اس اہم معاہدے کی کامیابی میں خصوصیت کے ساتھ شیخ مجیب الرحمان وزیر اعظم بنگلہ دیش نے جس جذبۂ مفاہمت اور دوراندیشی و دانش مندی کا مظاہرہ کیا اس کے لیے یقیناً وہ مستحق مبارکباد ہیں۔ ہندستان کی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کو بھی اس سمجھوتے سے خاص طور پر مسرت ہوگی کہ اس کامیابی میں ان کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ گفتگو کے دوران کئی بار ایسے حالات پیدا ہوئے کہ گفتگو کے ناکام ہوجانے کا اندیشہ پیدا ہوگیا تھا لیکن ہماری وزیر اعظم کی مداخلت سے وہ خطرہ ٹل گیا اور سمجھوتہ ہوا۔ یہی نہیں انھوں نے پاکستان سے دوستی کرنے اور تعلقات کو خوش گوار بنانے اور اس طرح کل برِ اعظم میں پائدار امن قائم کرنے کی ہمیشہ کوشش کی اور اس کے لیے برابر مفاہمت اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور معاملات کو طے کرنے کے لیے پہل کی۔ خوشی کی بات ہے کہ ان کی یہ کوششیں بالآخر بارآور ہوئیں اور دونوں ملکوں کے درمیان یہ سمجھوتہ ہوا۔ اس سمجھوتے کا جو شملہ معاہدے کے مقاصد کی بنیاد پر ہوا ہے نہ صرف ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں پرجوش خیر مقدم کیا گیا ہے بلکہ دنیا کی بڑی طاقتوں اور دوسرے ملکوں نے بھی اس پر خوشی و مسرت کا اظہار کیا ہے اور اس سے نیک توقعات وابستہ کی ہیں۔ امید ہے کہ ہر فریق سمجھوتے پر عمل درآمد میں پرخلوص کوشش کرے گا اور ایسی کوئی بات نہیں ہونے دے گا جس سے اسے عملاً کامیاب بنانے، پائدار امن قائم کرنے اور دوستی و مفاہمت کی فضا کو استوار رکھنے میں رکاوٹ پڑے۔ اسی طرح تینوں ملکوں کے شہری اپنے اپنے ملک کو مستحکم ترقی یافتہ اور خوش حال بنا سکیں گے۔

● نیا دور کے قلمی معاونین کو اکثر و بیشتر خطوط کے ذریعے مطلع کرتے رہنے کے علاوہ کئی بار ان سطور میں بھی اس کا اعلان کیا جا چکا ہے کہ نیا دور میں صرف وہی تخلیقات شائع کی جاتی ہیں جو خاص طور سے نیا دور کے لیے لکھی اور اس میں اشاعت کے لیے بھیجی گئی ہوں۔ یعنی وہ کہیں دوسری جگہ نہ شائع ہوئی ہوں اور نہ ریڈیو سے نشر کی گئی ہوں۔ حتیٰ کہ کسی ادبی نشست یا مذاکرہ میں پڑھی بھی نہ گئی ہوں۔ ہمارے اس صاف اور واضح اعلان کے باوجود کبھی کبھی یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض حضرات اپنی تخلیقات اشاعت کے لیے بیک وقت کئی رسائل و اخبارات کو دے دیتے ہیں۔ یہ ایک انتہائی غیر ذمے دارانہ فعل ہے جس سے متعلقہ قلم کار کی ادبی شخصیت مجروح ہوتی ہے یا نہ ہوتی ہو لیکن ایک معیاری رسالے کی ساکھ یقیناً مجروح ہوتی ہے۔ اس سے بڑی قیامت یہ ہے کہ بعض لکھنے والے ادبی سرقہ سے تجاوز کرکے "ادبی ڈاکہ زنی" پر اتر آتے ہیں اور نہایت دلیری کے ساتھ مشہور و معروف ادیبوں کے مضامین، افسانوں یا کتابوں کے صفحے کے صفحے اپنے بنا کر پیش کر دیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ڈاکہ کا رنگ نہ آئے۔ اس کی جس قدر بھی مذمت کی جائے کم ہے چنانچہ اس سے قبل بھی ہم ان سطور میں اس طرح کے ادبی ڈاکہ کی پر زور مذمت کر چکے ہیں۔ آج پھر اس جرأت و بے باکی کو زیر بحث لانے اور اظہار بیزاری کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ نیا دور کے احتشام نمبر (مئی۔ جون ۱۹۷۳ء کے مشترکہ شمارہ) کے ایک "قلمی معاون" نے 'چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد' کے مصداق ملک کے ایک ممتاز ادیب و دانش ور کی مطبوعہ کتاب کے پانچ چھ صفحات کو حاجا لفظی ردوبدل کے ساتھ اور چند سطریں یا ایک آدھ پیراگراف حذف کرکے اپنے اس مضمون کا جز بنا لیا ہے جو اسی احتشام نمبر میں شائع ہوا ہے۔ ہم پروفیسر محمود الٰہی صاحب کے شکر گزار ہیں کہ موصوف نے اس طرف ہمیں متوجہ کیا اور اس کتاب کی نشان دہی کی جہاں سے مذکورہ بالا اجزا "قلمی معاون" صاحب نے نقل کرکے اپنے مضمون کا جز بنا لیا ہے۔ اس طرح کے معاملات جب بھی ہمارے علم میں آتے ہیں، ہم سب سے پہلے مضمون نگار کو پیش کیا جانے والا نذرانہ رد کر دیتے ہیں اور آئندہ ان کی تخلیقات نیا دور میں شائع کرنے میں پوری احتیاط برتتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ان سطور میں اس قبیح حرکت کی مذمت کرتے ہوئے نیا دور کی پوزیشن کو بروقت صاف کر دیتے ہیں۔

لیکن اس سے پہلے بھی ہم عرض کر چکے ہیں اور ایک بار پھر عرض کرتے ہیں کہ یہ تنہا نیا دور یا اس جریدے اور رسالے ہی کا کام نہیں ہے جس میں اس طرح کی قابل گرفت چیز شائع ہوئی ہے بلکہ صحافتی تہذیب و اخلاق کا تقاضا ہے کہ پوری صحافتی برادری متحد ہو کر اس طرح کے ادبی ڈاکہ کے خلاف محاذ بنائے اور جیسے ہی کسی جریدے کے ساتھ ہونے والے اس فریب کا علم ہو ہر اخبار، ہر رسالہ اس کی مذمت کرے اور اپنے ہاں ایسے لوگوں کی تخلیقات کی اشاعت بند کر دے۔ اب ریاستی سطح پر صحافتی انجمنیں اور ایسوسی ایشنز نیز آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کا انعقاد ہو چکا ہے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ ان تنظیموں کے اجلاسوں میں "ادبی ڈاکہ زنی" اور اس قسم کی مذموم حرکت کے مرتکب لوگوں کی مذمت میں تجاویز پاس کی جائیں اور ان تجاویز کی نمایاں طور پر نشر و اشاعت کی جائے تاکہ آئندہ اس کا سد باب ہو سکے اور خصوصیت کے ساتھ مبتدیوں اور نئے لکھنے والوں کی ہمت ایسی حرکت کرنے کی نہ پڑے۔

● نیا دور کے احتشام نمبر میں اپنی بات کے ذیل میں چند امور کی جانب ہمارے بعض کرم فرماؤں نے توجہ دلائی ہے جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ سب سے پہلے تو مرحوم احتشام حسین صاحب کے منجھلے صاحبزادے کے نام کا معاملہ ہے جو جعفر عسکری کی بجائے عسکری جعفر لکھ دیا گیا ہے۔ یہ کتابت کی غلطی ہے۔ بہر حال قارئین نوٹ فرمالیں۔ برادر موصوف کا صحیح نام جعفر عسکری ہے۔ دوسری بات مرحوم کی ایک تصنیف سے تعلق رکھتی ہے۔ احتشام صاحب کی تنقیدی تصنیفات کی فہرست میں ایک تصنیف روشنی کے دریچے (۱۹۶۴ء) درج کی گئی ہے جب کہ مرحوم کی کوئی تصنیف اس نام سے شائع نہیں ہوئی ہے۔ دراصل یہ غلطی اس کتابچہ کی بنا پر پیدا ہوئی جو مرحوم کی مجلس چہلم کے موقع پر ان کے بھائیوں جناب فیاض حسین صاحب، جناب الطاف حسین صاحب اور جناب اقتدار حسین صاحب کی جانب سے چھاپ کر تقسیم کیا گیا تھا۔ حقیقتاً یہ مسودہ مرحوم کی زندگی ہی میں ترتیب دیا جا چکا تھا لیکن چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ اب معلوم ہوا ہے کہ برادرم جعفر عسکری اسے عن قریب شائع کرنے والے ہیں۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے بھی تھی کہ تصنیفات کی فہرست میں اس کتاب کا ذکر مرحوم پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے نہ صرف الجھن کا سبب بن سکتا ہے بلکہ اس کا بھی اندیشہ ہے کہ اس کتاب کا نام مع سنِ اشاعت مختلف تحریروں میں نقل ہوتا رہے اور ادبی تاریخ کی کتابوں میں یہ غلطی ہمیشہ کے لیے راہ پا جائے۔

——— ایڈیٹر

اکبر کا ایک شعر

عبد الماجد دریا بادی

زمانہ آج سے کوئی ۶۶، ۶۷ سال قبل ۱۹۰۶ء کا ہے، مہینہ دسمبر کا۔ رامپور آج کا ضلع رامپور نہیں، نواب صاحب کا "دار السرور" رامپور تھا۔ مشاعرہ ایک خاص اہتمام اور بڑی ہی دھوم دھام کے ساتھ ہو رہا ہے، برات کے نوشہ صاحبزادہ مصطفےٰ علی خاں شر رہیں پرائیوٹ سکریٹری نواب صاحب رامپور کے ۔ اہتمام بلیغ اس کا ہے کہ اردو کا کوئی اچھا شاعر چھٹنے نہ پائے، اور نواب صاحب کی مہمان نوازی کی شہرت نے بڑے بڑے اگلی کھرے استادوں کو بھی کھینچ لائی ہے۔ مصرعہ طرح یہ تھا:

> کھینچنے والے کی ادا کھنچ گئی تصویر کے ساتھ

کہنے والوں نے سارا زور تصویر کے قافیہ پر لگایا اور خوب خوب مضمون اس ایک لفظ کی مناسبت سے پیدا کر لیے۔

استاد جلالؔ نے فرمایا:

> اے مصوّر ترا احسان رہے، جذب کا بھی
> کھنچ لا صاحبِ تصویر کو تصویر کے ساتھ

خاندان مینائی کے ایک "امیر" زادہ نے کہا:

> میں نے چاہا تھا کہ تصویرِ خیالی کھینچوں
> آپ ہی دل میں اتر آئے ہیں تصویر کے ساتھ

اسی خاندان کے دوسرے "امیر" زادہ نے خوب فرمایا:

> دل یہ کہتا ہے کہ اب جان بھی پڑ جائے گی
> روح کھنچتی ہے مرے یار کی تصویر کے ساتھ

اور خود بانیِ مشاعرہ شرر کا یہ شعر آج بھی کسی کو بھولنے والا نہیں:

> ترے نقشے میں قیامت کا اثر ہو ظالم
> خود تصوّر میں کھنچا آتا ہو تصویر کے ساتھ

ایسے اشعار آبدار و گہر بار کے بعد تصویر کے قافیہ کے ساتھ اب رنگ کس کا جم سکتا تھا۔ لیکن جب صبح کے وقت حضرت اکبر الٰہ آبادی کی غزل پڑھی گئی تو اس شعر نے اونگھنے والوں کو اٹھا دیا اور جو ہنسنے ہنسانے پر تلے ہوئے تھے، ان کو لٹا لٹا دیا:

> ناتوانی مری دیکھی تو مصوّر نے کہا
> ڈر ہے خود آپ ہی کھنچ آئیں نہ تصویر کے ساتھ

سب نے تصویر کا تعلق محبوب ہی کی تصویر سے قرار دیا تھا، اور جو کچھ بھی کہا، تصویرِ یار ہی کے سلسلہ میں کہا تھا۔ یہ ذہانت صرف اکبر کو عطا ہوئی تھی کہ مضمون کا رخ ہی سرے سے پھیر دیا۔ اور ان کی زبان سے ایسی بات کہلا دی کہ اس سے قبل کسی کا بھی ذہن ادھر منتقل نہ ہوا۔

مزاحیہ نظمیں اکبر کا حصہ تھیں ہی، غزل گوئی میں بھی جن اہل نظر نے اکبر کی انفرادیت کو تسلیم نہیں کیا ہے، انھوں نے اپنے حق میں خود ناانصافی کی ہے۔

★

عزمِ محکم

اسلم لکھنوی

تجلیوں سے اندھیروں کو جگمگانا ہے
فضا میں پرچمِ امن و اماں اڑانا ہے
وطن کو رشکِ باغِ ارم بنانا ہے
ہر ایک غنچۂ افسردہ کو ہنسانا ہے

شہنشہی گئی جمہوریت کا دور آیا
مسرّتوں کا ہر اک لب پہ اب ترانا ہے
خدا کا شکر ملی ہم کو رہزنوں سے نجات
ترقیوں کی طرف اب قدم بڑھانا ہے

نظامِ نو نے چمن کا بدل دیا نقشہ
گلوں کے سایہ میں اب اپنا آشیانہ ہے
جو اٹھ چکے انھیں دینا ہے دعوتِ اقدام
جو سو رہے ہیں ابھی تک، انھیں جگانا ہے

گلوں سے بھرنا ہے اہلِ وطن کے دامن کو
نگاہِ برق سے اپنا چمن بچانا ہے
گزر گیا وہ زمانہ کہ تھے اسیرِ قفس
اب آج اپنا چمن اپنا آشیانہ ہے

بہار آئی ہے پھولوں کا کارواں لے کر
عروسِ نو کے لیے ہر روش سجانا ہے
بلندیوں کی طرف ہم اٹھا چکے ہیں نظر
ہمارے سامنے اک خوش نما زمانہ ہے

یہ مانا منزلِ مقصود مل گئی ہم کو
مگر کچھ اور بھی آگے قدم بڑھانا ہے
جدید دور کی رعنائیوں کے سایے میں
فسانۂ غمِ ماضی کو بھول جانا ہے
ہر اک کو کرنا ہے مسرور ہم کو لے اسلم
وطن سے غربت و افلاس کو مٹانا ہے

فضا ابن فیضی

زندگی ہے چھاؤں جیسی، وقت بدلی کی طرح
ہاتھ سے لمحے پھسل جاتے ہیں مچھلی کی طرح

سنگِ محرومی کی بارش میں بھی اب محفوظ ہوں
اوڑھ رکھا ہے ترے وعدوں کو کملی کی طرح

اک مدھر رچنا ہے اس کا شہد میں ڈوبا بدن
گیت کی چھایا ہے وہ ساون کی کجلی کی طرح

رشتۂ الفاظ میں تم کو نہ کوئی باندھ لے
چوس کر معنی کا رس اُڑ جاؤ تتلی کی طرح

ہاتھ میں دنیا کے میں نے خود ہی پتھر دے دیا
کیا یونہیں بے کار پھرتی ایک پگلی کی طرح

اندر آؤ تو مجھے آئینہ خانہ پاؤ گے
یوں تو ہوں باہر سے اک خستہ حویلی کی طرح

ظرف جو تھوڑا بہت رکھتے ہیں وہ سنجیدہ ہیں
ہیں جو اندر سے تہی، بجتے ہیں ڈفلی کی طرح

میں خود اپنی ذات کے اندر خلا بیہودہ ہوں
مجھ کو بادل میں نہ ڈھونڈے کوئی بجلی کی طرح

اعتبارِ خانہ ویرانی ہے شہرِ دل تمام
یہ نگر بھی بارہا اُجڑا ہے دلّی کی طرح

ہوں امانت خاکِ اعظم گڑھ کی پہچانو مجھے
احتشامؔ و کیفیؔ و اقبالؔ و شبلیؔ کی طرح

پڑ گئی ہے اس غزل پر کس کی چشمِ انتخابؔ
ایک اک مصرع پھڑک اٹھا ہے بسملی کی طرح

دین اسی کی ہے فضاؔ یہ میرے لہجے کی مٹھاس
وہ جو میرے گھر میں ہے اک رس کی ڈبلی کی طرح

امراؤ جان ادا — کردار کا تجزیاتی مطالعہ

بشیر بدر

نیا عہد، ماضی کے تاریخی افراد کو جب اپنی نفسیات کی روشنی میں دیکھتا ہے تو ان کے اعمال، اچھائیوں، برائیوں، کامیابیوں اور ناکامیوں کا تعین از سر نو ہوتا ہے اس لیے کہ زندگی کے علاوہ نیکی اور بدی کی تمام قدریں وقتی اور عصری ہیں۔ ادب کے مطالعے کے لیے بھی یہی رویہ ضروری ہے۔ ناول اور افسانے کے کردار اپنے عہد کی قدریں اور ان کے مفروضے اور مسلمات کے دائروں میں اکثر پرکھے جاتے ہیں لیکن پڑھنے والے کو اپنے عہد کی حیثیت کی روشنی میں اُن کے اعمال کا جائزہ لینا چاہیے اس طرح مفروضہ طے شدہ نتائج کے علاوہ زندگی سے قریب تر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

امراؤ جان آدا کے کردار پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جو بہت سے گوشوں کو اجاگر کرتا ہے لیکن جدید عہد میں اخلاق، عزت اور محبت کے تصور میں جو تبدیلی ہوئی ہے اس کی وجہ سے یہ چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) اگر ایک عورت جسمانی اور ذہنی برتری کا نمونہ ہے۔ رقص و نغمہ کی ماہر ہے، شعر و ادب کا رچا ہوا مذاق رکھتی ہے لیکن رقص و موسیقی سے کسب معاش کرتی ہے کیا یہ عورت اس عورت سے بہرحال کمتر رہے گی جس میں سوائے اس کے اور کوئی خوبی نہیں ہے کہ وہ کسی کی بیوی ہے ؟

۲۔ کیا ایک انسان کا پوری زندگی میں صرف ایک ہی شخص سے روحانی اور جسمانی محبت کرنا، محبت ہے اور ایک سے زیادہ لوگوں سے مختلف اوقات میں یہ رشتہ قائم رکھنا صرف ہوس پرستی ہے؟

امراؤ جان آدا کے لیے اکثر نقادوں کا یہ فیصلہ ہے کہ امراؤ جان آدا ایک چھوٹے سے گھر، ا جبی سے شوہر کے لیے ترستی رہی۔ کیا یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ زندگی کی ایسی منزل میں جب وہ اپنی عہد کا ایک تہذیبی پیکر ہو چکی تھی اس کا فن اور ذوق شعر و اَدَب کسی نیک بندے کو اپنا مجازی خدا بنا کر مطمئن ہو سکتا تھا ؟

(۴) کئی نقاد جن میں احسن فاروقی بھی شامل ہیں۔ اس بات پر متفق ہیں کہ امراؤ جان آدا طوائف تھی اور وہ کسی سے محبت نہیں کر سکتی تھی کیا یہ لوگ حق بہ جانب ہیں؟

امراؤ جان آدا اس جاگیردارانہ معاشرے کی پیداوار ہے جو کسی زمانے میں متحرک اور فعالی قوتیں رکھتا رہا ہوگا لیکن اُس وقت روایت زدہ، فرسودہ اور مجہول ہو گیا تھا۔ اچھی طوائف اس دور کی ایسی عورت ہوتی تھی جس میں جسمانی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس عہد کی تہذیبی خوبیاں بھی یکجا ہو جایا کرتی تھیں، عورت کے لحاظ سے وہ اس دور کی افضل عورت تھی کہ اس کے پاس حسن، علم، موسیقی و رقص، شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق، بناؤ سنگار کی ادا اور گفتگو کرنے کا دلکش سلیقہ بھی تھا۔ اچھی طوائف خوب صورت جسم، کمال فن اور مجلسی ذہانت کی اچھی مثال ہوتی تھی۔ طوائف کا کوٹھا ایک تہذیبی دربار، وہ ادارہ ہوتا تھا جہاں مختلف شعبوں کے لوگ آتے تھے۔ سماج سے اس کا تعلق گہرا مضبوط اور دور دور تک تھا۔ باپ، بیٹے، شریف، امیر، غریب، عیاش، مولوی، چور اور لٹیرے سب ہی اس کے یہاں آتے تھے بالکل ایسے جیسے آج فلم دیکھنے تقریباً یہ سب ہی لوگ جاتے ہیں۔ ان حقائق کے

پیشِ نظر طوائف کی سماجی حیثیت کم ازکم اتنی تو ہونی چاہیے تھی جیسی کہ آج اچھے اور محترم فلمی فنکاروں کی ہوتی ہے کہ سیاسی اکابرین ان کے ساتھ تصویریں کھنچوا کر خوش ہوتے ہیں اور عام لڑکے لڑکیاں ان کے فیشنوں کی تقلید کرتے ہیں لیکن حقیقت افسوس ناک حد تک برعکس تھی۔ طوائفوں کے بارے میں عجیب روایتی تصور تھا۔ گھر کی عورتیں انھیں فوقِ فطری قوتوں کی مالک سمجھتی تھیں اور ان کی برتری کو جادو، اور ٹونے کا زور سمجھتی تھیں۔ گھر کی بیگمات کے سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ ان چھوٹی باندیوں میں ایسا کون سا ذائقہ ہے کہ ان کا مجازی خدا ان کے حسن و جمال، نیاز و خدمت سے منہ موڑ کر اپنا سب کچھ لٹانے طوائف کی بارگاہ میں چلا جاتا تھا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ ان میں چڑیلوں جیسی طلسمی فنکاری ہے اور اپنے جادو اور سحر کی وجہ سے وہ ان کے گھروں کو سنسان کر دیتی ہیں۔ دھیرے دھیرے لکھنؤ کی ساری تہذیبی معاشرت پر طوائف چھاتی چلی گئی۔ خود پردہ نشین بیگمات کی زنانہ تقریبوں میں بھی طوائف کا ہونا ضروری ہوگیا لیکن طوائف کا سماجی رتبہ، چمار، بدمعاش اور دنیا کے سب سے ارذل کام کرنے والوں سے بھی نیچا رہا۔ طوائف وہ غلاظت تھی جو شرفا کی شرافت کی پرورش کرتی تھی اور خود ذلیل رہتی تھی۔

امراؤ جان خاندانی طوائف نہ تھی، وہ ایک جمعدار کی لڑکی تھی اور اس کا نام امیرن تھا۔ ۹ برس کی عمر میں اس کی شادی طے ہو چکی تھی اور اپنے ہونے والے دولھا کا معصوم سا تصوّر رکھتی تھی۔ دلاور خاں، ایک جرائم پیشہ جسے امراؤ جان ادا کے باپ کی گواہی پر سزا ہوگئی تھی اسے یہ کہہ کر کہ "چلو بیٹا تمھارے ابّا پیسے دے گئے تھے؛ کبوتر لے لو" اغوا کر لے جاتا ہے اس کا ارادہ تھا کہ اسے قتل کر دے مگر اس کا ایک دوست اسے بیچ کر پیسے کھرے کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ امیرن کو خانم خرید لیتی ہیں۔ خانم لکھنؤ کی رچی ہوئی طوائف ہے اور اپنی ملازمہ بوا حسینی کی فرمائش پر امیرن کو اس کے سپرد کر دیتی ہے۔ بوا حسینی کا تعلق ایک قابل اور عالم مولوی صاحب سے ہے وہ امیرن کو فارسی، فلسفہ اور منطق وغیرہ کی تعلیم دینے لگتے ہیں۔ خانم کی سرپرستی میں اس کی خفتہ صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ ایک فن کار کی پوری ریاضت سے وہ اپنی صلاحیتوں کو چمکاتی ہے۔ امراؤ جان ادا میں بہت کچھ فطری اور خداداد تھا۔ اور ایسے ہی موقعوں پر حادثات کی بے رحمی کا خوب صورت پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ امیرن جس کے اندر ایک فن کار موجود تھا اسے اگر دلاور خاں اٹھا کر نہ لاتا تو اسے خانم کے وسیلے سے اپنے اندر کے فن کار کو جگانے اور اس کی تہذیب و تربیت کرنے کا کیسے موقع ملتا۔ دو چار سال بعد اس کی شادی ہو جاتی اور وہ ایک گھر آنگن میں نیک بیوی اور شفیق ماں بن کر وقت کے دھارے میں گمنام تنکوں کی طرح بہہ جاتی لیکن فطرت کی بے رحمی نے ایک شریف بچی کو اس معاشرہ کا فن کار بنا دیا۔ جہاں "طوائف" ہونا ناقابلِ معافی گناہ ہے اور ایک کنوار لڑکی کا شعر و نغمہ کا بولتا پیکر ہو جانا اس کے سماجی رتبے کو اور کم کر گیا۔ امراؤ جان ادا کی اپنی ذہانت، شوق، جستجو اور ریاضت کے ساتھ خانم جیسی ماہرِ فن کی سرپرستی نے اسے رقص و نغمے کا نمونہ بنا دیا تھا۔ ایک بار اس کا مقابلہ بڑودہ کی مشہور تجربہ کار بائی جی سے ہوگیا۔ جمی ہوئی محفل تھی۔ بڑودہ کی بائی جی کی پختہ کاری کا جادو چھایا ہوا تھا۔ خانم کی تجربہ کاری نے امراؤ جان ادا کے فن کی تازگی کو اس طرح پیش کیا کہ بڑودہ کی بائی جی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ یہ امراؤ جان ادا کی صلاحیتوں اور ریاضت کا پہلا مظاہرہ تھا۔ اہلِ نظر میں دھوم ہوگئی سارے شہر میں شہرہ ہوگیا۔ اپنے فن میں ادا نے کمال حاصل کیا۔ بے حد شہرت اور اپنے پیشے کی عزت اسے ملی۔ نواب ملکہ کی سرکار میں سوز خوانی کی مجرائیوں میں اس کا اسم ہوا یہ کوئی معمولی رتبہ نہ تھا۔ اپنے فن میں مہارت کے ساتھ ساتھ اس میں ایسی ذہانت، شوخی، تیزی تھی جو زندگی میں یکسرا پن پیدا نہیں ہونے دیتی۔

کان پور کی ایک مسجد کے مولوی صاحب جو مسجد میں عورت دیکھ کر بوکھلا گئے تھے ان سے دلچسپی لینے میں امراؤ جان ادا کی شگفتہ ذہانت اس طرح نظر آتی ہے:

مولوی ۔ اچھا تو آپ کا کہاں سے آنا ہوا۔

امراؤ ۔ جی کہیں سے آنا ہوا ہو مگر بالفعل تو یہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔

مولوی۔ (بہت گھبرا کے) مسجد میں؟
امراؤ۔ جی نہیں آپ کے حجرے میں۔
مولوی۔ لاحول ولا قوۃ۔
امراؤ۔ اوئی مولوی صاحب مجھے تو آپ کے سوا کوئی اور نہیں نظر آتا۔

امراؤ جان ادا کو شعر و ادب کا اچھا ذوق تھا اور کم از کم ریختہ اور ریختی کے فرق کو سمجھتی تھی۔ ایک محفل میں امراؤ جان ادا نے جب یہ شعر پڑھا

کعبہ میں جا کے بھول گیا راہ دیر کی
ایمان بچ گیا مرے مولا نے خیر کی

تو حاضرین میں ایک خاں صاحب نے فقرہ کسا "یہ بھول گیا کون؟" امراؤ جان نے جواب دیا۔ "تو کیا خاں صاحب میں ریختی کہتی ہوں"؟

ان چند اشاروں سے یہ ثابت ہو گیا کہ امراؤ جان ادا رقص و نغمہ کی ماہر تھی، ذہین تھی، شعر و ادب کا اچھا ذوق رکھتی تھی ایک انسان کی حیثیت سے وہ اس لیے قابل احترام تھی کہ اس کے اندر اعلیٰ اور فنکارانہ خوبیاں تھیں جن کو اس نے اپنی ریاضت سے چمکایا تھا لیکن اس معاشرے کی نگاہ میں اس کی کیا وقعت تھی اس کا اندازہ امراؤ جان ادا کے ہمدرد مرزا ہادی اور ان کے نظریے کی روشنی میں خود امراؤ جان ادا کے خط سے ہوتا ہے۔ مرزا رسوا عورتوں کو تین خانوں میں تقسیم کرتے ہیں اول نیک بختیں دوسری خرابیں، تیسری بازاریاں طوائفوں کو وہ تیسرے خانہ میں رکھتے ہیں اور طوائف کو کبھی وہ عورت کا بنیادی درجہ دینے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ حسن، صحت، تعلیم، رقص، موسیقی، شعر و سخن سے رچی طوائف کو ایک معمولی، کند ذہن، گنوار اور کھانا پکانے والی عورت کے مقابلے میں حد درجہ رذیل سمجھتے ہیں اس لیے کہ امراؤ جان ادا نے مختلف مردوں کو دیکھا ہے اور اس نیک بخت نے اپنے میاں کے علاوہ کسی اور کا منہ نہیں دیکھا۔

مرزا رسوا کی یہ عصری حقیقت پسندی ہے اس ماحول کا ذہین سے ذہین اور باغی سے باغی فرد اس معاشرے کے اس مفروضے سے انحراف کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ مرد بہتا پانی ہے، ہزار گندگی ڈالو، ہوا لگی اور پاک۔ اور عورت مٹی کی صراحی ہے ایک ہاتھ کے علاوہ دوسرے ہاتھ نے اسے چھوا اور ناپاک وہ گھورے کی چیز ہو گئی۔ امراؤ جان ادا کی زندگی کا تجربہ بھی یہی ہے۔

"اے بے وقوف رنڈی کبھی اس بھلاوے میں نہ آنا کہ تجھ کو سچے دل سے کوئی چاہے گا تیرا آشنا جو تجھ پر جان دیتا ہے، چار دن کے بعد چلتا پھرتا نظر آئے گا وہ تجھ سے ہرگز نباہ نہیں کر سکتا اور نہ تو اس لائق ہے۔ سچی چاہت کا مزہ اس نیک بخت کا حق ہے جو ایک منہ دیکھ کر دوسرے کا منہ کبھی نہیں دیکھتی، تجھ جیسی بازاری ___ کو یہ نعمت خدا نہیں دے سکتا۔"

امراؤ جان کے اسی اعتراف سے غالباً ڈاکٹر احسن فاروقی نے یہ نتیجہ نکالا ہے:

"وہ رنڈی ہے اور اس سے نہ کوئی محبت کرنے والا ہے اور نہ وہ کسی سے محبت کر سکتی ہے"

خود امراؤ جان ادا، اور مرزا رسوا بھی اپنے عہد کے اس مفروضے کے حصار سے نہیں نکل پاتے کہ طوائف کسی کی نہیں ہوتی۔ امراؤ جان کا بیان اویس احمد ادیب کے ریمارکس کے ساتھ دیکھئے:

"میرا رنڈی کا پیشہ ہے اور یہ ہم لوگوں کا چلتا ہوا فقرہ ہے جب کسی کو دام میں لانا چاہتے ہیں تو اس پر مرنے لگتے ہیں۔ ہم سے زیادہ مرنا کسی کو نہیں آتا۔ ٹھنڈی سانسیں بھرنا۔ بات بات پر رو دینا۔ دو دو دن نہ کھانا۔ کنویں میں پیر لٹکا کر بیٹھ جانا۔ سنکھیا کھا لینا۔ سب کچھ کیا جاتا ہے؟"

"حقیقت تو یہی ہے کہ وہ اپنے پیشے کی وجہ سے مجبور ہے کسی ایک شخص سے کس طرح محبت کر سکتی ہے" ملاحظہ ہو "آپ سچ کہتی ہوں نہ مجھ سے کسی کو عشق ہوا اور نہ مجھ کو کسی سے"

اس وقت تک آپ نے جو کچھ پڑھا۔ یہ سب گویا چال بازیاں تھیں۔ آخر تھی نہ طوائف" (تنقیدیں)

احسن فاروقی اور اویس احمد ادیب امراؤ جان ادا کے بیان پر اس لیے ایمان لے آئے کہ یہ خود امراؤ جان کا اپنے بارے میں خیال ہے تو عرض یہ ہے کہ زندگی اور ادب کے تمام بدکردار چلا چلا کر خود کو علی

اور ارفع بتاتے ہیں کیا آپ اُن پر یقین کر لیں گے۔ فرد یا فنکار کی بات کو اگر آپ درست مانیں تو اس دلیل سے کسی دن یہ اعلان بھی کیا جاسکتا ہے کہ میر شاعر نہیں تھے کہ انھوں نے خود ہی کہا ہے کہ:"ہم کو شاعر نہ کہو" انسان کے ناول اور افسانے کرداروں کے اپنے بیانات پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان کے طرز عمل، گفتار اور کردار کی روشنی میں ہی کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے۔

امراؤ جان کے جسم اور روح، دل یا دماغ نے جن چند مردوں کو خاص طور پر کسی نہ کسی حالت میں قبول کیا وہ یہ لوگ ہیں (۱) گوہر مرزا (۲) نواب سلطان (۳) نواب جعفر (۴) فیضو (۵) مرزا رسوا۔ آیئے امراؤ جان کے اور ان لوگوں کے معاملات پر ایک نظر ڈالیں۔

گوہر مرزا ذلیل ہے۔ اس کے کسی عمل میں شرافت اور انسانیت اُبھر کر نہیں آتی مگر سوال یہ ہے کہ سوسائٹی کی بے رحمی اور تضاد سے اس کا وجود ہوا ہے۔ وہ طبقۂ اعلیٰ کی شرافت کی غلط کاری کا قابلِ رحم فرد ہے۔ اس کا المیہ یہ ہے کہ وہ جسے اپنا باپ کہے وہ اسے اپنی اولاد نہ سمجھے۔ امراء و رؤساء کے ایسے کتنے بچے جو طوائف کی بیٹی سے پیدا ہوتے تھے ان کا مقدر اپنی ماں اور بہنوں کے کاروبار میں دلالی کرنا ہو جاتا تھا۔ ایسے فرد سے کسی اعلیٰ اور شریفانہ رویے کی توقع فضول ہے۔ وہ اس تضادات بھرے سماج کا پیدا کردہ ہے اور اپنے طبقہ کی بے بسی، کس مپرسی اور تنہائی اور اس سے پیدا ہونے والے کمینہ پن کی علامت ہے۔ امراؤ جان آدا جب خود تشکیلی منزلوں میں تھی تو موسم کے اندھیرے پن میں وہ ان کا گل چین اول بنا، جلد ہی امراؤ جان آدا کو اس کی رذالتوں کا اندازہ ہو گیا۔ امراؤ جان کو اچھے اچھے لوگ ملتے گئے' اپنے پیشہ کا وقار اور شہرت اسے روز بروز ملتا گیا لیکن امراؤ جان آدا گوہر مرزا کی کمینگی سے متنفر رہنے کے باوجود ساری زندگی اس سے بے تعلق نہیں ہوئی۔ کوئی جسمانی رشتہ نہ رکھنے کے باوجود ہمیشہ کڑھ کڑھ کر اس کی مدد کرتی رہی کیا یہ امراؤ جان کی اپنی مروت اور محبت کی مجبوری نہیں تھی کہ وہ اپنے گلچین اول کو اس کی تمام کمینگیوں کے باوجود ہمیشہ کے لیے یکسر نہیں بھلا سکی۔ میرا خیال ہے کہ اللہ کے کچھ ہی نیک بندوں کو اس پر اصرار ہوگا کہ

امراؤ جان آدا اسی بچے کے لیے تمام زندگی دیوانی رہتی۔ لیکن فعال، متحرک ذہن اور اپنی آنکھوں سے دیکھنے والوں کو بے حسی کی یہ نعمت نہیں ملتی۔

نواب سلطان سے محبت اس کی ذہنی آسودگی ہے امراؤ جان کو نواب سلطان کی صاف ستھری اور رئیسانہ صحبت کو زندگی بھر ترستی رہی کہ وہ شعر و سخن، حسن و نفاست کی پیاس سیراب کرتے تھے۔ نواب سلطان صورت کے دلکش اور سیرت کے شریف نواب تھے۔ ان کے لیے یہ امراؤ جان نہ تھی وہ آدا تھی۔ ان میں کچھ ذاتی اور فطری خوبیاں ہیں۔ لیکن اس مصنوعی معاشرے میں اپنی خوبیاں جاگ نہیں سکتی تھیں۔ امراؤ جان آدا کی تہذیبی اور سماجی تشنگی تمام عمر نواب سلطان کی صورت اور ان کی صحبتوں کی یادوں سے اپنی پیاس بجھاتی رہی۔

قرۃ العین حیدر نے آگ کے دریا میں صنفِ نازک کا یہ عیب بتایا ہے کہ وہ فن اور اس کی صورت کو ہمیشہ گڈمڈ کر دیتی ہے لیکن امراؤ جان آدا پر یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ نواب جعفر علی جان جو ستر کے پیٹے میں ہیں۔ منہ میں نہ ایک دانت ہے اور نہ پیٹ میں ایک آنت۔ وہ امراؤ جانِ آدا کو پابند کر لیتے ہیں۔ امراؤ جان ایک جوان اور بیدار ذہن فنکارہ ہے اسے بوڑھے نواب سے شدید نفرت کرنی چاہیے کہ وہ دولت کے بل بوتے پر حسن و جوانی کے خزانے پر مریل سانپ بن کر بیٹھے ہیں لیکن امراؤ جان اُن سے نفرت نہیں کرتی اس لیے یہ مردہ عیش کوشی، مصنوعی تہذیب، مصنوعی عیاشی ہی اس وقت شرافت کی پہچان تھی دوسرے بوڑھے نواب میں ایک ہنر ہے جس پر امراؤ جان عاشق ہے . . . . اس کا خود کہنا ہے

"کہ ان کی ملازمت سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ سینکڑوں سوز یاد ہو گئے اور دور، دور، میری شہرت ہو گئی . . . . . .
بے شک بوڑھے نواب پیار کرنے کے قابل تھے۔ اس بڑھاپے میں جس وقت سوز پڑھتے تھے دل لوٹ جاتا تھا۔"

میں یہاں یہ اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ امراؤ جان آدا کے اندر ایسا فن کار تھا جو اچھے فن کار سے اکتساب فن کرتا تھا اور اس میں

ایسی شریف مروت اور محبت تھی کہ ستر سال کے بوڑھے نواب میں وہ فن کارانہ حسن دیکھ لیتی تھی اور ان کو پیار کے لائق سمجھتی تھی۔

فیض علی جسے امراؤ جان نے اپنی یادوں میں "فیضو" ہی کہا ہے، ایک مردانہ اور فعال کردار ہے۔ اگر کوئی فعال اور متحرک معاشرہ ہوتا تو ممکن ہے کہ فیض علی ڈاکو کے بجائے فوجی افسر ہوتا۔ لیکن وہ عہد مجہول وضعداری اور مفلوج شرافت کا دور ہے اس لیے فیض علی جیسے مرد کہ جن کے سامنے امراؤ جان جیسی نفیس و نازک ذوق رکھنے والی عورت اپنا سب کچھ تھوڑی دیر کو بھول جاتی ہے اور اس کی مرضی کے تابع نظر آنے لگتی ہے شہر کے بانکے ترچھے اس کے مطیع بن جاتے ہیں، کوتوال لکھنؤ اس کی سرپرستی کرتا ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود فیض علی کی انفرادیت ڈاکو اور لٹیرے کے روپ ہی میں ابھرتی ہے۔ وہ اس لیے کہ اس معاشرے میں کسی ذہانت، بہادری اور فعالیت کو شرافت کی سند اس وقت تک نہیں مل سکتی تھی جس وقت تک وہ اس معاشرے کا نمونہ نہ ہو جو مصنوعی روایات اور ان سے ابھرنے والے تضادات کا نمونہ ہے۔ بقول امراؤ جان ایسے دل چالاک رئیسوں میں دیکھا نہ شہزادوں میں۔ اس کے باوجود امراؤ جان ادا نہ اس کی مستقل پابند ہو سکتی تھی اور نہ ہی فیض علی میں وہ تہذیبی نفاستیں اور سماجی وقار ہے جو امراؤ جان کا آئیڈل ہے۔ فیضو کی گرم جوشی اور مردانہ پن، بدن کی علامت ہیں۔ حساس ذہنوں پر بدن کی حکومت ہمہ وقت نہیں رہ سکتی، لیکن کوئی بدن کی لذتوں اور برکتوں سے یکسر بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ امراؤ جان اس سلسلے سے "فیضو" کو اپنی یادوں میں بسائے رہتی ہے۔

امراؤ جان ادا کی جوانی، حسن، فن، حوصلوں اور خوابوں کے توڑ کے وقت کے سب سے بڑے رئیس خود مرزا رسوا ہیں۔ وہ لکھنؤ کے ایک ذہین فن کار ہیں۔ اس تضاد سے بھرپور معاشرے میں ان کی یہ جرأت ہی قابل ذکر ہے کہ وہ ایک طوائف کو اتنی اہمیت دیں کہ ادبی قصہ کا مرکزی کردار بنائیں یا ایک طوائف کی سوانح عمری لکھیں۔ طوائف جو اس معاشرے کا سب سے اہم کردار ہے اس عزت کا مستحق نہیں ہے کہ اسے ادبی قصہ کا مرکزی کردار بنایا جائے جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ہے کہ وہ لکھنؤ کے ذہین فن کار ہیں یعنی جدید علوم سے آگاہ ہیں، نظم و نثر پر عبور رکھتے ہیں۔ حالی اور سرسید کی اصلاحی تدبیروں سے ضرور واقف ہوں گے لیکن دل میں شام اودھ کی رنگین روشنیاں ہیں۔ عاشق مزاج ہیں، حسن پرستی ان کی فطرت ہے خود کہتے ہیں:

"سنو امراؤ جان میری ایک بات یاد رکھنا۔ جہاں کوئی حسین عورت نظر پڑے مجھے ضرور یاد کر لینا اور اگر ممکن ہو تو امیدواروں میں نام لکھوا دینا اور جو میں مر جاؤں، میرے نام پر فاتحہ دے دینا۔" لیکن اس حسن پرستی کے ساتھ ساتھ مروجہ اخلاقی قدروں کی پاسداری کو اپنا اصول سمجھتے ہیں۔

"امراؤ جان میری زندگی کا ایک اصول ہے نیک بخت عورت کو میں اپنی ماں بہن کے برابر سمجھتا ہوں مگر فیاض عورتوں سے مستفید ہونا میرے نزدیک گناہ نہیں۔" وہ اس خیال کو بار بار دہراتے ہیں اور جب عورتوں کی تین قسمیں بتاتے ہوئے بازاریوں کو اس حد تک حقیر قرار دیتے ہیں کہ انھیں عورت کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیتے ہیں۔ امراؤ جان پر ان کی مار فیضو سے زیادہ گہری ہے۔ امراؤ جان اگر فیضو کی "دل چالاکی" پر لکھنؤ چھوڑ سکتی ہے تو مرزا رسوا کو بھی وہ فن آتا ہے کہ وہ ان کے سامنے کھلی کتاب ہو جائے فیضو کی دل چالاکی اور مرزا رسوا کی ذہنی چالاکی کے سامنے امراؤ جان ادا اپنی تمام ذہنی تجربہ کاری کے باوجود محبت کی آنچ میں پگھل جانے والی عورت ہے، امراؤ جان اور مرزا رسوا میں دلی یگانگت ہے۔ مرزا رسوا جو کچھ کر سکتے ہیں بغیر چیخے چلائے امراؤ جان کے لیے کرتے ہیں۔ امراؤ جان بھی من و تو کے پردے بغیر کسی اعلان کے چپکے سے اٹھا دیتی ہے لیکن اس یگانگت کا ہنگامہ اس لیے نہیں ہو پاتا کہ امراؤ جان اور رسوا عمر کی پختگی کے اس دور میں ملے ہیں جہاں جنون خیزی فلسفہ و فکر کی طرح سوچ سوچ کر باتیں بنانے لگتی ہے۔ یہ لوگ جب بہت زیادہ جذباتی ہوتے ہیں تو ان کی باتوں کی تہ میں آہ کی لکیر اور گفتگو میں درد کی زنجیر محسوس کی جا سکتی ہے یہ

ذہنی درستی، جسم کی وقتی لمک اور لپک سے کہیں زیادہ دیرپا ہے۔ اس ذہنی رفاقت میں وہ طاقت ہے کہ مرزا ہادی رسوا ہو جاتے ہیں اور امراؤ جان ادا اپنی زندگی کا ورق ورق ان کے حوالے کر دیتی ہے۔ دو ہستیوں میں اتنی یکتائی اور بے حجابی شاید انھیں کو ملتی ہو جو بہت معصوم اور جنم جنم کے ساتھی ہوتے ہیں۔ عورت اور پھر تجربہ کار اپنے تجربوں، آرزؤں کامرانیوں اور ناکامیوں کے سارے رازوں سمیت کسی کے حوالے کر دے، یہ صرف محبت کا اعجاز ہے۔

امراؤ جان ادا کے چند جملے۔ مرزا رسوا کے اخلاقی ریمارکس اور امراؤ جان ادا پر بیشتر تنقید اس حصار سے باہر نہیں نکل پاتی کہ عورت اور طوائف دو الگ الگ چیزیں ہیں اور طوائف کسی سے محبت نہیں کر سکتی اور تعجب کی بات یہ ہے کہ ہمارے عہد کے چند نقادوں نے بھی اسی نظریے کی تائید کی ہے اور وہ شاید اس لیے کی ہے کہ امراؤ جان ادا کی زندگی میں مختلف مرد آتے رہتے ہیں۔ بہت زیادہ کسی نے ہمدردی کی تو اتنا کہا کہ امراؤ جان ادا، نوسالہ امیرن کے اس خواب کی تعبیر تلاش کرتی رہی جس میں وہ کسی نیک انسان کے کچے آنگن اور کھپریل کے سائبان کے تلے ایک گھریلو عورت کا درجہ پا سکے۔ میرے خیال میں مسئلہ اتنا سیدھا اور سادہ نہیں ہے۔ مرزا رسوا کی کامیابی یہ ہے کہ انھوں نے معاشرے کی REPORTING تہہ داریوں کے ساتھ اس طرح کر دی ہے کہ اس دور کے یہ کردار اپنی تمام نفسیات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہیں اور اس دور کے اخلاق کے جابر مفروضوں سے آزاد ہو کر اب ہم نتائج نکال سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ امراؤ جان ادا بڑی شخصیت ہے۔ اس کا ارتقا بہت ہی پیچیدہ، خوش گوار اور کربناک تجربوں کی آمیزش سے ہوا ہے۔ محبت اس کی بڑی شخصیت کا ایک اہم عنصر ہے وہ اپنے خوابوں کے آئیڈیل کو جی سے چاہنا چاہتی ہے لیکن بڑی شخصیتوں کا رومانی آئیڈیل اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہوتا ہے۔ امراؤ جان کا بدن خوب صورت، حساس اور جاندار ہے۔ اس کی روح دلکش، وسیع، مضطرب اور بے قرار ہے۔ ذہن میں خوب سے خوب تر کی تلاش اور جستجو ہے مولانا حالی تک کا بھی یہی رویہ۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

ایسی شخصیت اپنی تکمیل کے لیے جو ساتھی تلاش کرتی ہے وہ بآسانی نہیں مل سکتا۔ کم از کم امراؤ جان ادا کی دسترس سے باہر رہا۔ نواب سلطان، مرزا جعفر، فیضو اور بالآخر مرزا رسوا اس کے آئیڈیل کے بکھرے ہوئے ٹکڑے ہیں۔ ان میں کوئی ایسا نہیں جو مکمل آئیڈیل ہو۔ ان سب کو وہ اپنی شخصیت میں یکجا کرنے کی کوشش کرتی ہے اس لیے میں یہ عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ وہ ان سب سے محبت کرتی ہے کہ ان کے بغیر اس کی ادھوری شخصیت کا خلا پر نہیں ہوتا۔ مرزا جعفر کی فنکاری سے اس کے اندر کا فنکار محبت کرتا ہے۔ نواب سلطان میں وہ اس معاشرے کا دلکش تہذیبی پیکر دیکھتی ہے فیض علی بدن کی طلب ہے۔ مرزا رسوا ایک خاص عمر میں اس کے ذہنی رازدار ہیں۔ وہ مختلف سیاق و سباق میں ان سبھوں کو چاہتی ہے اور یہ سب اس کی یادوں میں یکجا ہو کر اس کے آئیڈیل کی تکمیل کرتے ہیں۔

بچی امیرن نہیں، بالغ امراؤ جان ادا کی تشکیل و تعمیر ایسی ہو چکی تھی کہ زندگی کی درمیانی منزلوں میں اگر کوئی معمولی سا نیک آدمی اسے شریک حیات بنا لیتا تو اس کے جسم، روح، ذہن اور دل کی تشنگی اور بڑھتی، بلکہ میرا تو یہ تجزیہ ہے کہ اپنی فنکارانہ شخصیت کی وجہ سے اس کی پسند اتنی معیاری ہو گئی تھی کہ اگر اسے نواب جعفر کے ساتھ مستقل کر دیا جاتا تو نواب جعفر سے اس کی ساری عقیدت ہوا ہو جاتی اور وہ صبح سے پہلے مرجھا جاتی۔ نواب سلطان کی صورت ضرور پیاری ہے، ان کا ذوق بھی نکھرا رہا ہے لیکن ان کے مزاج میں اس معاشرے کی ایسی سرد مہری آگئی ہے کہ چند دن کی رفاقت کے بعد امراؤ جان کو حبس کا احساس ہوتا۔ فیض علی کی گرم جوشی محبت اور طاقتور بدن میں امراؤ جان کے اندر کی عورت کو بیدار کرنے کی صلاحیت ہے لیکن بدن گھنٹے دو گھنٹے، ہفتہ دو ہفتہ، مہینہ دو مہینہ، سال دو سال کے بعد سو جاتا ہے اور اس کے بعد اپنے ہی بدن

ہیں سمٹے ہوئے کتنے ذہنی اور تہذیبی پیکر بیدار ہوجاتے ہیں۔
مرزا رسوا اور امراؤ جان کی تادیر رفاقت کی وجہ یہ ہے کہ امراؤ جان نے زندگی کو ہزار رنگوں میں دیکھ کر حقائق کو کھرد رے رنگوں میں قبول کرنا شروع کر دیا ہے اب اس کا جسم اور فن خوابوں کی تتلیوں کے ساتھ نہیں دوڑ سکتا تاہم اسے اپنی محبت کے تمام پیکر عزیز ہیں اور ان کی یاد میں وہ کبھی کبھی ایسا کھو جاتی ہے کہ وقت کا کھنکھجورا اس کے آنچل پر رینگنے لگتا ہے اور اسے خبر ہی نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ امراؤ جان آدا کی اہم خوبی یا کمزوری یہی ہے کہ وہ محبت کے بغیر نہیں چل سکتی۔ اکثر نقاد جو امراؤ جان آدا کو محبت سے عاری سمجھتے ہیں ان کے ذہن میں انیسویں صدی کے وہ مفروضات ہیں جو ان کے لیے آج بھی مسلمات کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس قدیم ذہن کا یہ بھی ایک مفروضہ ہے کہ ایک انسان کا تمام زندگی صرف ایک انسان سے خواہ وہ کتنا ہی قابل نفرت کیوں نہ ہو یا ہو جائے محبت کرتے رہنا ہی محبت ہے اور جہاں کسی نے اپنی زندگی میں ایک سے زیادہ انسانوں سے جنسی وجسمانی محبت کی وہ ہوس کار اور بدکردار ہوگیا۔ دنیا میں ایسے خوش نصیب اور صابر لوگ ضرور ہوتے ہیں جن کی زندگی دو اور دو چار کے اصول پر چل کر بمت بالخیر تک پہنچ جاتی ہے لیکن زندگی اور ادب میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ دو افراد کے جسمانی اتصال کے بعد اپنے اندر روحانی، ذہنی، جسمانی ناآسودگی کے نتیجے میں ایک یا دونوں کو ذہنی اور روحانی طور پر سخت شکست وریخت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی حالات وحادثات ایسی صورتیں پیدا کر دیتے ہیں کہ دو محبت کرنے والے جدا ہوجاتے ہیں۔ پہلے کم اور اب زیادہ ایسے لوگ ملیں گے جن کی محبت ایک سے زیادہ لوگوں سے وابستہ ہوتی ہے اس لیے کہ ان کی فطرت کی یہ مجبوری کہ وہ بغیر کسی زندہ پیکر سے محبت کیے بغیر رہ نہیں سکتے۔ ادب میں سیکڑوں ایسی مثالیں ہیں یہاں ایک آدھ کی طرف اشارہ کروں گا۔

سارتر کی INTIMACY کی ہیروئن لولو نے اپنے شوہر ہنری میں پادریوں کی سی نرمی محسوس کی، یہ نرمی دھیرے دھیرے ایسے کیچوے کا لجلجا پن محسوس ہونے لگی، اپنی تمام ذہنی، عقلی اور اخلاقی رفاقتوں کے باوجود اس کے ناآسودہ بدن نے اسے ہنری سے دور کر کے ایک بدن توڑ شخص پیئر کی آغوش میں پہنچا دیا۔ بدن کی آسودگی کے بعد جلدی اسے دوبارہ روح کی تشنگی کا ایسا شدید احساس ہوا کہ وہ پہلے سے زیادہ ادھوری ہوگئی۔

لیڈی چیٹرلیز لوور میں لیڈی چیٹرلی کو عزت، آرام اور آسائش سب کچھ میسر تھا مگر اس کے افسانہ نگار شوہر کے پاس صرف عزت، دولت اور شہرت تھی۔ لیڈی چیٹرلی کے پاس بڑا باغی جسم تھا اس کے شوہر نے اسے اجازت بھی دے دی تھی کہ وہ کسی باعزت شخص سے جنسی تعلقات قائم رکھ سکتی ہے اور اس کی عزت مآب بیوی بھی رہ سکتی ہے اس نے ایک نوجوان اور جونیئر افسانہ نگار سے جنسی تعلق قائم کیا لیکن وہ بھی مغرب کی IMPOTENT ہوتی ہوئی تہذیب کی علامت تھا پھر ایک نچلے طبقے کا GROCER علاوہ اس کے بدن کا آئیڈیل مرد تھا اس کی چاہ میں اس نے ساری سماجی عزت اور مرتبے کو خیرباد کہنے میں اپنے جسم و جان کی آسودگی محسوس کی۔

ممکن ہے کہ کسی کو یہ خیال ہو کہ شاعر وافسانہ نگار نارمل نہیں ہوتے اور پھر تخیل ہی میں ایسے کردار ڈھالے جا سکتے ہیں، زندگی میں ایسا نہیں ہوتا تو صرف ایک مثال پر غور کریں، امریکہ کے صدر جان کینیڈی محبوب مردانہ شخصیت کے پیکر تھے۔ مردانہ دلکشی، عظمت، وقار اور پھر ان کے المناک قتل نے ان کی شخصیت کو اور زیادہ قابل احترام اور محبوب بنا دیا تھا۔ ان کی بیوی جیکولین کینیڈی کو ان سے محبت کرنی ہی چاہیے تھی لیکن اب ان کی بیوی نے ایک یونانی کروڑپتی سے شادی کرلی ہے۔ رسالہ تحریک میں جیکولین کی ایک تصویر چھپی تھی جس کے ساتھ یہ نوٹ بھی تھا۔

امریکہ کے مرحوم صدر کینیڈی کی بیوی جیکولین کینیڈی، جس نے یونان کے کروڑپتی اوناسس سے شادی کر کے آدرش وادیوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی۔ گذشتہ ماہ ۱۵ مئی کے

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر)

صدر جمہوریہ ہند شری وی۔ وی گری لکھنؤ میں ۲۸ جولائی ۳ ۱۹۷ء کو گاندھی بھون کا افتتاح کرتے ہوئے۔

گورنر اتر پردیش شری اکبر علی خاں رائے بریلی میں چھوٹی صنعتوں کے کارپوریشن کی جانب سے قائم کیے جانے والے بلڈنگ میٹریل اور
سینی ٹری ویرس کامپلکس کا سنگ بنیاد رکھ رہے ہیں۔
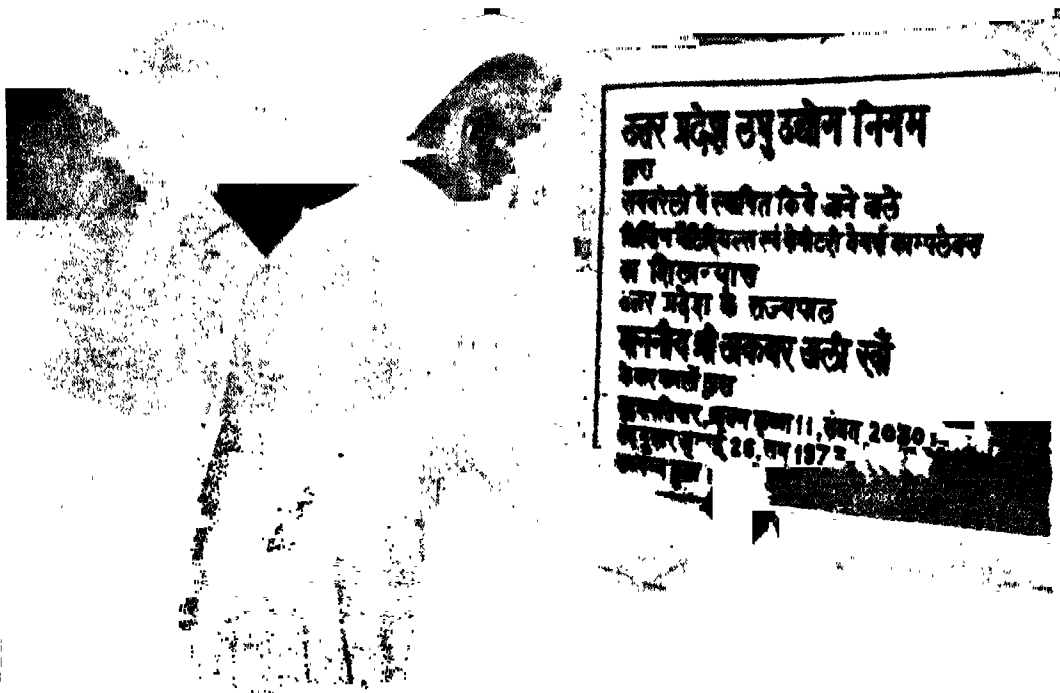
میجر دھیان چند ۲۹ جولائی کو صدر جمہوریہ شری وی۔ وی۔ گری سے محو گفتگو۔ تصویر میں بائیں جانب ڈائرکٹر کونسل آف اسپورٹس یوپی شری کے۔ ڈی۔ سنگھ (بابو) کسی خاص نکتے پر اظہار خیال کرتے ہوئے۔

عالمی شہرت کے مالک پدم بھوشن میجر دھیان چند جو ہاکی کی دنیا میں "جادوگر" کے نام سے مشہور ہیں حال ہی میں لکھنؤ آئے تھے۔ یہاں یوپی کونسل آف اسپورٹس کی جانب سے میجر دھیان چند کا پرتپاک خیر مقدم ۲۴ جولائی کو سنٹرل اسپورٹس اسٹیڈیم میں کیا گیا۔ اس خیر مقدم میں انھیں ایک گارڈ آف آنر بھی پیش کیا گیا۔ میجر دھیان چند صدر جمہوریہ شری گری سے جو ان دنوں لکھنؤ میں قیام فرما تھے نیز گورنر اتر پردیش شری اکبر علی خاں سے ملنے راج بھون گئے ان موقعوں کی تصویریں ان صفحات پر دی جا رہی ہیں۔

نغمے، افسانے اور خواب

حرمت الاکرام

خامشی پھیلتی جاتی ہے نظر سے دل تک
میں ہوں اور تلخیِ احساس کی پہنائی ہے
چشمِ بے خواب کہاں جاؤں، یہ کس سے پوچھوں؟
چاندنی کیوں مرے کمرے میں چلی آئی ہے؟

نقرئی کرنوں سے کھیلوں، یہ ضرورت ہی کیا
ہر دیا محفلِ عشرت کا بجھا ڈالا ہے
کیا خبر، پیار اجالوں سے ہے کیوں اتنا خفا
درد، کیا جانیے کس رات کا متوالا ہے

وقت کی اجنبی راہوں میں (ابھی کل کی ہے بات)
اک نئے موڑ سے راہی کوئی ٹکرایا تھا
اس نئے موڑ پہ (کیا کیا نہ دیے غم جس نے)
دل کو اک شمع کی تنویر نے اپنایا تھا

اور یہ شمع حوادث کی گزرگاہوں میں
مسکراتی رہی تاروں کی ضیائیں لے کر
مسکراتی رہی راتوں کی سیہ کوشی پر
ایک بھٹکے ہوئے راہی کی بلائیں لے کر

راتیں کہتی رہیں راہی سے کہ دھوکے میں نہ آ
راستہ تیرا اندھیرے میں بھی کٹ سکتا ہے
راتیں کہتی رہیں، محتاج نہ بن کرنوں کا
دکھ اندھیرے کا اندھیرے سے بھی بٹ سکتا ہے

پیچ و خمِ وقت کے طے بھی ہوئے بڑھتے بھی گئے
راتیں آتی رہیں اور راتیں گزرتی بھی رہیں
کئی نغمے، کئی افسانے، کئی خواب لیے
ساعتیں، وقت کے سینے سے ابھرتی بھی رہیں

چاندنی کمرے میں آتی رہی خنجر تولے
مہرباں اتنا ہو دشمن تو کوئی کیا بولے

لکشمی نرائن جوہر بدایونی

مبشر علی صدیقی

بدایوں کا مردم خیز خطہ اردو شعر و ادب کا ہمیشہ سے مرکز رہا ہے۔ اسی سرزمین سے مذاق، بیخود، ذاتی، جامی، قمر اور شکیل اٹھے اور آسمانِ شاعری پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ اسی سرزمین نے ملا عبدالقادر بدایونی جیسا جید عالم اور جلیل القدر تاریخ نویس پیدا کیا۔ شعر و ادب کے چمن کی آبیاری میں ہندو اور مسلمان دونوں کا ہاتھ رہا ہے۔ آج بھی بزم مشاعرہ ہو یا ادبی نشست اس میں مسلمان اور ہندو شاعر و ادیب شانہ بہ شانہ حصہ لیتے نظر آئیں گے۔ لیکن بدایوں کی سرزمین نے چند ایسے ادیب اور شاعر بھی پیدا کیے ہیں جو شہرت کے دربار میں جگہ نہ پا سکے البتہ جب تک وہ زندہ رہے شعر و سخن کی دیوی کے گیسو آراستہ کرتے رہے۔ خود فنا ہو گئے لیکن اپنی بعض لافانی نظمیں صفحۂ قرطاس پر لکھی ہوئی یا چھپی ہوئی اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ ایسے ہی شعراء میں بابو لکشمی نرائن جوہر بدایونی بھی تھے جن کا انتقال ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ آپ کے والد منشی مکٹ نرائن مرحوم تھے جو خود ایک اچھے شاعر تھے اور احقر تخلص کرتے تھے۔ سرکاری ملازم تھے اور بدایوں کی کلکٹریٹ میں پیشکار کی اسامی پر فائز تھے۔ لکشمی نرائن جوہر ۲۵ جون ۱۸۹۳ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے فارسی اور علم عروض میں مہارت بہم پہنچائی۔ مشاعروں میں کلام سنانے کے بجائے رسالوں میں شائع ہونے کے لیے بھیجنے لگے۔ منشی مہاراج بہادر برق کے شاگرد رشید تھے۔ عمر کے آخری حصے میں آپ نے اپنا منتخب کلام جون ۱۹۶۲ء میں نظامی پریس بدایوں سے آئینۂ جوہر کے نام سے شائع کیا۔ اس وقت آپ کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام پر ایک طائرانہ نظر ذیل کی سطروں میں اختصار کے ساتھ ڈالی جا رہی ہے۔

نظمیں

لکشمی نرائن جوہر کی طویل ترین نظمیں دو ہیں۔ ایک "مہابھارت کا ایک سین ——— ابھمنو" اور دوسری "رامائن کا ایک سین ——— اشوک واٹکا، سندر کانڈ"۔ دونوں نظمیں اپنی جگہ پر اہم ہیں۔ تاریخی واقعات کو نظم میں بیان کرنا ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر کا کام ہے۔ تاریخی حقائق کا خون نہ ہو اور شعریت اپنی جگہ پر قائم رہے۔ تشبیہ، استعارہ اور دیگر صنائع بدائع کا سلیقہ سے استعمال اولین شرط ہے اور جوہر اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ "مہابھارت کا ایک سین" کے بارے میں وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں "یدھشٹر نے لڑکے کی بھولی بھالی تقریر سن کر کہا کہ بیٹا جس تاج پر دل کا خون اور آنکھوں کی روشنی نثار کرنا پڑے اس تاج پر لعنت۔ تم ابھی لڑکے ہو، دنیا کی اونچ نیچ سے واقف نہیں۔ اپنے پرائے کی تمھیں پہچان نہیں، عداوت کی نگاہوں کی پرکھ نہیں۔ کیسے میں دشمنوں میں تم کو اکیلا بھیج دوں۔ یہ سن کر بھیم خاموش نہ رہ سکے۔ کہنے لگے کہ آپ نے جو کچھ فرمایا صحیح ہے مگر اپنوں کی لاگ اور غیروں کی آگ نے ہمیں برباد کر دیا۔ ہم کہاں تک اپنے دل کے داغ اور دشمنوں کے سبز باغ دیکھیں۔ دشمن اپنی فتح پر گھی کے چراغ جلا رہے ہیں۔ اگر اس موقع پر کسی کو نہ بھیجا گیا تو ہار ماننا پڑے گی۔ اور ویرتا میں فرق آ جائے گا" چنانچہ ابھمنو کو لڑائی میں جانے کی اجازت مل جاتی ہے اور یہیں سے اس

نظم کا جو مسدس کی شکل میں ہے آغاز ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

میدانِ رزم، اُف وہ کشاکش کا اہتمام — پانی جہاں پہ مانگتی تھی تیغِ بے نیام
دن حشر کا تھا اور قیامت تھی صبح و شام — تکتی تھی منہ اجل کا جہاں گردشِ مدام
قطرے تھے خون کے کہ شرارے تھے آگ کے
ذرّے اگل رہے تھے لہو رزم گاہ کے

بیوی کا ہوش تھا نہ تھی الفت نگاہ میں — ماں باپ کا خیال نہ شفقت نگاہ میں
کچھ تاج کی ہوس تھی نہ دولت نگاہ میں — پھرتی تھی رزم گاہ کی صورت نگاہ میں
ارجن کی آج شان میں ارجن کا دیر تھا
اک ہاتھ میں کمان تھی ترکش میں تیر تھا

"ارجن کا مورچے سے دور جانا، گرد کا چکر دیو بنانا، کوروں کی چال، پانڈوں کا رنج، پانسوں کی چال، ترکِ وطن، لاکھ کا مکان اور افتاد ناگہاں کی طرف اشارہ کر کے شاعر نے کتنی بڑی داستان کو چند مصرعوں میں سمو دیا ہے کہ کوتاہی کا شبہہ تک نہیں ہوتا۔ حقیقت میں دریا کو کوزہ میں بند کرنا مکمل فن کار کا کام ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔ ابھمنو اپنی سرگزشت تین مصرعوں میں اپنی بیوی اترا سے بیان کرتا ہے۔"

پھر کے رن کا کیا ماجرا سب یاں — ہونٹوں کو چومنے لگیں معصوم شوخیاں
دہرائی ایک ایک وہ افتادِ ناگہاں — ارجن کی وہ کہانی، یدھشٹر کی داستاں
وہ بے رخی گرو کی وہ چڑھ کے غنیم کے
جانا وہ رزم گاہ میں ہمراہ بھیم کے

رن میں جانے کے لئے ابھمنو کی ماں سبھدرا اپنے لڑکے کو کس طرح تلقین کرتی ہے۔ جوہر کے یہ اشعار کردار نگاری کا اچھا نمونہ ہیں۔

لے میرے لال لے شبِ غم کو سحر تمام — زیور ہو راجپوت کا شمشیرِ بے نیام
بھارت کے جو سپوت ہیں رہتے نہیں غلام — مرنا ہے اپنے حق کے لئے زندگی کا نام
گنگا نہاؤ خون سے دشمن کو مار کے
یا پھینک دو زمیں پہ یہ بانا اتار کے

ان کی دوسری اہم نظم "رامائن کا ایک سین ——— اشوک واٹکا۔ سندر کانڈ" ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں برج نرائن چکبست کو فوقیت حاصل ہے۔ چکبست کی مشہور نظم "رامائن کا ایک سین" عوام و خواص سے خراجِ عقیدت حاصل کر چکی ہے۔ اس کی روانی جذبات کی عکاسی اور استدلال ——— وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے جدید اردو شاعری میں اس نظم کو ایک اہم مقام حاصل ہو گیا ہے۔ جوہر نے رامائن کا ایک اور سین لیا ہے۔ اس میں دیا شنکر نسیم کی "گلزار نسیم" کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ کامیاب تقلید کی گئی ہے۔ ہنومان جی کو سیتا جی کی تلاش ہے۔ چند اشعار نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہوں ———

سب ڈھونڈ کے کوہ اور بیاباں — گنگا کی طرف چلے ہنوماں
اک جست میں پار کر کے ساگر — آبادی میں آ کے گھومے در در
آنکھوں نے برائے گل فشانی — پلکوں سے گھروں کی خاک چھانی
ہر گوشے سے جانکی کو پوچھا — ہر ذرّہ کی وسعتوں میں ڈھونڈا
نرگس سے نظر ملا کے پوچھا — سوسن کو قسم دلا کے پوچھا
بلبل نے ہزار کی رسائی — نکہت نہ چمن کے ہاتھ آئی
غنچہ نہیں کوئی گل کھلاتا — پتہ بھی نہیں پتہ بتاتا
ہر پھول ہے خار جو جہاں ہے — پتہ بھی چمن کا پاسباں ہے
آساں نہیں ہے جبہ سائی — مشکل ہے خیال کی رسائی

دیکھئے راون کس شان سے اشوک واٹکا میں داخل ہوتا ہے، حالانکہ یہ غرور کا پہلو لئے ہوئے ہے۔

تلوار لیے وہ سوختہ تن — شاہانہ ادا سے آیا راون
مندودری ہم عقیل اس کی — سایہ کی طرح سے ہم قدم تھی
کچھ اور تھیں ساتھ سیم پیکر — کچھ صندلی رنگ کچھ سمن بر
کچھ زہرہ جمال کچھ پری رو — مشاطہ سی گرد عنبریں مو

جوہر کی دیگر نظموں میں نوحہ وفات مہاتما گاندھی، گلاب کا پھول، قوسِ قزح اور میں، کلیجے کا داغ اور سال نو سے خطاب اہم ہیں۔ ان میں سے آخر الذکر نظم خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جوہر نے یہ نظم ۱۹۲۵ء میں بدایوں کے ایک جلسے میں پڑھی تھی جو جلیان والا باغ کے قتلِ عام کے سلسلہ میں بطور یادگار منایا گیا تھا۔ جوش ملیح آبادی نے ۱۹۴۲ء میں "زندانِ ایسٹ انڈیا کمپنی سے خطاب" نظم لکھی تھی جو اس وقت کی انگریزی سرکار نے ضبط کر لی تھی۔ اس نظم کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے اور پھر جوہر کے اسی نوعیت کے اشعار سے موازنہ کیجئے۔ اولیت

کا فخر جوہر کو حاصل ہے۔

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج یہ سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر بھیڑیا ہے بھیڑیا
بھیڑیے کو مار دو گولی ہے امن و بقا
ہاتھ ہٹلر کا ہے رخش خودسری کی باگ پر
تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر
جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوع انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے
ہندیوں کے جسم میں کیا روح آزادی نہ تھی
سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی
دستکاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم
صنعت ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی تمھارے ہاتھ کی لائی ہوئی
تیسرے فاقہ میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کس کے تم لائے تھے سر شاہ ظفر کے سامنے
یاد تو ہوگی وہ مٹیا برج کی بھی داستاں
اب بھی جس کی خاک سے اٹھتا ہے رہ رہ کر دھواں
تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بارہا
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا
سچ کہو کیا حافظہ میں ہے وہ ظلم بے پناہ
آج تک رنگون میں اک قبر ہے جس کی گواہ
وہ بھگت سنگھ جس کے غم میں دل ابھی ناشاد ہے
اس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمھارے خون کی
وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں
وقت ٹل سکتا ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

جوہر بدایونی کے اشعار یہ ہیں :

مغربی جبر و تشدد سے ہر اک بیزار ہو — جو ادا مشق ستم کی ہو گلے کا ہار ہو
خون ناحق سے زمین ہند لالہ زار ہو — زندگی اب ہندیوں کی ہند میں دشوار ہو
ذرہ ذرہ ہے یہاں ایذا رسانی کی جگہ
بے گناہوں کا لہو بہتا ہو پانی کی جگہ

مادر ہندوستاں کے آہ! وہ دامن کے داغ — تختۂ مشق ستم جلیان والا رام باغ
غم نصیبوں کے ہوئے جس میں جلانا ہی چراغ — عقل کھو کر جس جگہ ڈائر ہوا تھا بدماغ
شہرۂ آفاق وہ تاریخ غم کا باب ہے
شاہد خون شہیداں عالم اسباب ہے

کون بھولا ہے ابھی وہ آپ کی کھلی جفا — وہ بھگت سنگھ کی کہانی جو رمٹیا برج کا
یاد ہے جھانسی کی رانی کا فسانہ غم ربا — آہ وہ شاہ ظفر اور بخت دل کا سامنا
صبر کر اے جذب دل اک وقت ایسا آئیگا
خون کی سرخی سے یہ افسانہ لکھا جائیگا

آہ اے مغرب یہ چھانیوالی اندھیری شام — راستے میں ہٹلر اعظم سے ہونا ہی کلام
پہلے کہنا عاجزی سے ہند والوں کا سلام — پھر اسیر دام کا دینا ادب سے یہ پیام
رو رہے ہیں اپنی آزادی کو ناکام بہار
گزرے جاتے ہیں قفس میں ہائے ایام بہار

آخری بند جوہر نے غالباً بعد کو اضافہ کیا ہے کیونکہ ۱۹۲۵ء میں ہٹلر جرمنی میں برسر اقتدار نہیں تھا۔

غزلیات

جوہر نے غزلیں بھی معیاری کہی ہیں۔ ان کی غزلوں میں ایک تیکھاپن ہے۔ محاوروں کا صحیح استعمال اور زبان کی چاشنی ہے۔ ان کی غزلوں کے بعض اشعار تو بہت ہی اچھے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

میں رسوا ہوں سر محشر مگر مجھ سے فزوں وہ بھی
کھڑا ہوں دم بخود میں بھی کھڑے ہیں سرنگوں وہ بھی
طیور باغ کی سرگوشیاں صیاد کے طعنے
مری تقدیر میں لکھا تھا میں یہ بھی سنوں وہ بھی
برائے برق مضطر چار تنکے تھے نشیمن میں
ہنس دیکھے گئے آئے با دصرصر بجھ کہوں وہ بھی

ستا اتنا نہ صیادِ فلک جوہر کو دنیا میں
تری پہ قہر اک میں ہے فتنہ گر صید زبوں وہ بھی

اُسے کیف فصل چمن سے کیا کہ قفس میں جس کا قیام ہو
ہمیں لطف سوزِ جگر میں ہے ہمیں دل کے درد سے کام ہو
سرِ حشر دیکھو نہ کہہ اُٹھے کہیں دل کا راز یہ خاموشی
ذرا اپنی نظروں کو روکیے یہاں آج مجمعِ عام ہے

نہ جانے ظرف سے زائد ہے یا اپنے مقدر سے
لبوں تک آتے آتے ہے چھلک جاتی ہو ساغر سے
نہیں دیکھے گئے وہ بھی نگاہِ برقِ مضطر سے
جو تنکے بچ رہے تھے آشیاں کے بادِ صرصر سے
بہارِ صحنِ گلشن ہے اگر اپنے مقدر میں
قفس کی تیلیاں سرسبز ہوں گی دیدۂ تر سے
خدا شاہد ہے یاد آجاتی ہے کھوئے ہوئے دل کی
جو رہ جاتا ہے دامن پر کوئی آنسو مقدر سے
ارے صیاد مجبوری اسی کا نام ہے شاید
نشیمن جل رہا ہے دیکھتے ہیں ہم ترے گھر سے

پرستش کر رہا ہے ہر جوان و پیر پتھر کی
صنم خانے میں آ کر جاگ اٹھی تقدیر پتھر کی
تصور دل میں، اشک آنکھوں میں، لب پر مہرِ خاموشی
بنا بیٹھا ہوں ان کی یاد میں تصویر پتھر کی
پہ قسامِ ازل نے خوب ہی انصاف فرمایا
تمھیں پتھر کا دل بخشا، مجھے تقدیر پتھر کی
ادب سے زاہدِ کعبہ نشیں بھی چوم لیتا ہے
تمھارے در سے لگ کر بڑھ گئی توقیر پتھر کی

تضمین

جوہر نے فانی کی کئی غزلوں پر تضمین کی ہے۔ کامیاب تضمین کرنا ہر شاعر کا کام نہیں۔ قادر الکلام شاعر ہی اس منزل سے کامیابی کے ساتھ گزر سکتا ہے۔ فانی کی دو مختلف غزلوں پر نمونہ کے طور پر تضمین ملاحظہ ہو:۔

نہیں ممکن بڑھاپے کیوں ہو جوہر کی پریشانی
کہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے صورت جائے پہچانی
خلافِ شانِ جانبازی ہے، وقتِ نزع آ جاتی
نہ آئیں گے وہ تب بھی دم نکل ہی جائے گا فانی
مگر مشکل سے نکلے گا بڑی مشکل سے نکلے گا

کھل گئی تقدیر جب ان پر شباب آنے لگا
مجھ کو امیدوں کے بر آنے کا خواب آنے لگا
اب مری بیتابیوں کا کچھ جواب آنے لگا
مجھ کو مضطر دیکھ کر ان کو حجاب آنے لگا
ہو چکی ہیں اب نگاہیں رازدانِ اضطراب

قطعات

جوہر نے اس صنف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ایک قطعہ نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو:۔

زندگانی وہ عذابِ جان ہے — جس سے مر کر بھی نہ فرصت پائیں گے
قبر میں ہوگا حسابِ زندگی — حشر میں اعمال دیکھے جائیں گے

غرضکہ جوہر مثنوی، مسدس، غزل، قطعہ، رباعی، تضمین، نظم کی ہر صنف پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔

جوہر مرحوم حکیم تھے اور شہر میں ان کا مطب تھا۔ مریض اور شاگرد دونوں ہی فیضیاب ہوتے تھے۔ میری ان سے آخری ملاقات شری دیریندر پرشاد سکسینہ بدایونی کے مکان پر ۹ فروری ۱۹۶۲ء کو ہوئی تھی اور اس ملاقات میں مرحوم نے اپنا تازہ کلام بھی سنایا تھا۔ کافی دیر تک ان کی نظم "مہابھارت کا ایک سین" پر گفتگو ہوتی رہی۔ اب یہ سب باتیں قصۂ پارینہ ہو کر رہ گئی ہیں اور میر کا یہ شعر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے ؎

باتیں ہماری یاد رہیں، پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
پڑھتے کسو کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

★

انتظار

شوکت پردیسی

پھر اٹھیں کالی گھٹائیں چرخ پہ دیوانہ وار
پھر چلی پھولوں کی دنیا میں ہوائے خوشگوار
پھر گلستاں ہم کنارِ رنگ و بو ہونے لگا
پھر تبسم کے لیے ہے شاہدِ گل بے قرار
پھر نگاہِ شوق میں کچھ زاویے بننے لگے
پھر یکایک ڈوب کر ابھری ہے صبحِ انتظار
پھر بساطِ ذہن پر آنچل سے لہرانے لگے
پھر فضائیں ہو رہی ہیں رفتہ رفتہ مشک بار
پھر ہر اک آہٹ پہ دل کی دھڑکنیں بڑھنے لگیں
پھر نظر اٹھنے لگی رہ رہ کے سوئے رہ گزر
پھر تمنا مستِ کیف و بیخودی ہونے لگی
پھر گماں نے کر لیا رنگِ حقیقت اختیار
پھر برستی رات میں آنکھوں سے نیند اڑنے لگی
پھر کسی کی یاد ہے، بے چینیوں سے ہم کنار
پھر ریاضِ آرزو میں نغمہ خواں ہے عندلیب
پھر صبا کے دوش پہ رقصاں ہے سیلابِ بہار
پھر جنونِ عشق کو ہے کوئے جاناں کی تلاش
پھر ہجومِ آرزو ہے دشمنِ صبر و قرار
پھر جوانی گرمیِ جذبات سے معمور ہے
پھر قیامت ہیں ہوائیں پھر قیامت کی پھوار
زندگی برسوں سے ہے گہوارۂ رنج و الم
کچھ بتا اے وقت تیرا اور کب تک انتظار

بہار ۱۸۹۵ اشک

(رباعیات)

فیملی پلاننگ

نصیر نادان کانپوری

یوں کثرتِ اولاد ستم ڈھاتی ہے
داماں غم و فکر میں لے آتی ہے
اے ہم نفسو کثرتِ گل سے جیسے
نازک سی کوئی شاخ لچک جاتی ہے

کانٹوں سے نہیں پھول سے دامن بھر لیں
کیوں تہمت بیجا کوئی اپنے سر لیں
سو تاروں کا احسان اٹھائیں کیوں کر
اک چاند سے کیوں گھر کو نہ روشن کر لیں

اب نفس کی آزادی کو روکو یارو
اندیشۂ بربادی کو روکو یارو
ہو جائے کہیں دیش نہ تخریب کی نذر
بڑھتی ہوئی آبادی کو روکو یارو

شاداب چمن کو نہ کہیں لے ڈوبے
الفت کی کرن کو نہ کہیں لے ڈوبے
اے دوستو! پیدائشِ طفلاں کا جنوں
تزئینِ وطن کو نہ کہیں لے ڈوبے

دنیا نہ سمجھ لے ستم ایجاد تمہیں
ہونا نہ پڑے زیست سے ناشاد تمہیں
اے دوستو! برباد نہ کر ڈالے کہیں
دیوانگیِ کثرتِ اولاد تمہیں

ہندی شاعری میں تلسی داس کا مقام

سیّد فضل امام رضوی

ہندی شاعری کی تاریخ میں سولہویں صدی، عہد زرّیں سے عبارت ہے کیونکہ اسی عہد میں تلسی داس، سور داس، کیشو داس، وغیرہ ہوئے اور انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے ہندی کے عہد متوسطین کے شعرا کو آفاقی شاعری کی طرف متوجہ کیا۔ سوامی را مانند نے جس رام بھکتی تحریک کا آغاز کیا تھا اس کی بھرپور نمائندگی صرف تلسی داس کے یہاں ملتی ہے۔ اسی لیے اس تحریک کے اہم شاعر تلسی داس مانے جاتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملکی اور غیر ملکی سبھی ادبی شغف رکھنے والی شخصیتوں نے ان کی شاعرانہ اہمیت اور قدر و قیمت کا جائزہ لینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ابھی تک دوہے اور چوپائیوں کے ذریعے رام کی یاد قائم کرنے میں تلسی داس کو شرفِ قدامت حاصل تھا مگر اب مزید تحقیق و تجسس نے ساتویں صدی میں چیتر بھج سوم اور بھوپت۔ سمبت ۱۲۸۵ کا بھی انکشاف کیا ہے۔ تلسی داس سے کچھ ہی عرصے پہلے بھگوان داس اور چند مشہور شاعروں کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن رام بھکتی میں جو والہانہ عقیدت اور جذبۂ سرشاری و بیخودی تلسی داس کے یہاں ہے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں۔

جس دور میں تلسی داس نے ہندی شاعری کے میدان میں قدم رکھا اس میں رزمیہ شاعری میں ودیاپتی کا لب و لہجہ، بھکتی تحریک میں سور داس کے بھجنوں اور گیتوں کی گونج، گنگ وغیرہ بھانٹ کویوں کے کبت اور سَوَیے، صوفی شاعروں کے دوہے اور چوپائیاں، مقبول خاص و عام ہو چکی تھیں۔ ایسی فضا میں انھوں نے اپنے اعلیٰ ذہن کی اختراعی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ہندی شاعری کو مالا مال کر دیا اور مروجہ اقسام شاعری پر مکمل دسترس حاصل کر کے ودیاپتی اور سور داس کے رنگ کو پھیکا کر دیا۔ سور داس کے رنگ کی شاعری ان کی تخلیقات "ونے پتریکا" (विनय पत्रिका) اور "گیتاولی" (गीतावली) میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ سور داس کے رنگ کا ایک بند ملاحظہ ہو جس میں تلسی داس نے ماں (کوشلیا) کی ممتا، پیار اور الفت کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے:

ہوے ہو لالی کبنہو بڑے بلی میّا،
رام لکھن بھاوتے رِپ دون چارُو، چاریو بھیّا،
بال دکھو کھن، بن منوہر انگنی درچی بسنیہو،
شوبھا نرکھ نچھاور کری اُرلائی وارنے جیہو،
بھگن مگن آنگن کھیہو ل ٹھمک ٹھمک کب دھیہو،
کل بل بچن توترے منجل کہہ ماں، موہ بلیہو،

(اے مرے لال (یعنی رام چندر) تو کب بڑا ہوگا میں تیرے صدقے جاؤں، رام لچھمن، بھرت اور شتروگھن چاروں بھائی گھر کی رونق بڑھائیں گے، تمہارے خوبصورت بال، دلکش پیراہن، جسم نازنین کو اور بھی جمال بخشیں گے اور میں اس دل کش منظر کو دیکھ کر سینے سے چمٹا لوں گی، وہ دن کب آئے گا جب تم اور لچھمن آنگن میں کھیلو گے اور ٹھمک ٹھمک چھوٹے چھوٹے پاؤں سے دوڑو گے)

تلسی داس نے اپنے مجموعۂ کلام کبتاولی (कवितावली) میں سَوَیے (सवैये) کی صنف میں جو نادر تشبیہات و استعارات استعمال کیے ہیں وہ سور داس اور ان کے ہم عصر شعرا کا کیا ذکر کسی بھی ہندی شاعر کو نصیب نہیں۔ جب کیکئی کی ضد پر رام چندر کا بن باس ہو جاتا ہے اور رام، سیتا کے ہمراہ جنگل کی طرف روانہ ہوتے ہیں،

راہ میں سیتا کی سکھیاں اور کمسن لڑکیاں، انھیں رام کے ساتھ دیکھ کر دریافت کرتی ہیں تو اس شرم و حیا کے انداز دل ربائی کی جتنی اعلیٰ تصویر تلسی داس کے یہاں ملتی ہے اس کی مثال دنیائے ادب میں مشکل سے نظر آئے گی۔ ملاحظہ ہو:

سُن سُندر بین سدھا رس، سانے، سیانی ہیں جانکی جانی بھلی
ترچھے کری نین دے سین تنہیں سمجھائی کچھو، مسکائی چلی
تلسی تیہہ اوسر، سوہیں سبتے اولوکت لوچن لاہو الی
انراگ تڑاگ میں بھان اودے بگسیں ما نو منجل کنج کلی

(سکھیوں کے ذریعہ رام چندر کے بارے میں دریافت کیے جانے پر جانکی (سیتا) نے ان کی شوخی و شستگی کو سمجھ لیا اور ترچھی نگاہوں سے اشارہ کرتے ہوئے حسین انداز سے اپنا رشتہ بتلایا اور مسکرا کر چل دیں۔ تلسی داس کہتے ہیں کہ اس وقت کے فرحت بیز، نشاط انگیز لمحات طرب افزا کی سحور کن فضاؤں کے عالم کو نہ پوچھو سب کے سب اس نرگس شہلا کو دیکھ کر مسرور ہو گئے جیسے تالاب میں ادھ کھلے کنول سورج کی ایک کرن سے کھل اٹھتے ہیں)

دوہے تو تلسی داس کے رام چرت مانس میں بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن دوہاولی (दोहावली) نامی ان کا مجموعۂ کلام صرف دوہوں پر مشتمل ہے۔ تلسی داس سے پہلے کبیر داس نے دوہے لکھے ہیں مگر جو کیفیت اور سرشاری رام بھکتی میں تلسی کو ہے وہ کبیر نہیں پیدا کر سکے ہیں۔ عام طور سے دوہے پند و نصائح اور اُپدیش کے لیے لکھے جاتے ہیں۔ اس طرح اخلاقی طور کے آجانے پر صنعتوں کا دخل کم ہو جاتا ہے مگر تلسی داس نے اپنی صناعی کا اعلیٰ کمال اس صنفِ سخن میں بھی پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

سیتا، لکھن، سمیت، پربھو سوہت تلی داس
ہرشت سُر، برست سمن، سگن سو منگل باس

(اے تلسی! رام چندر سیتا اور لچھمن کے ساتھ رونق افروز ہیں تو تمام دیوتا فرحت و انبساط سے وجد میں ہیں فضا معطر ہے اور پھولوں کی بارش ہو رہی ہے)

تلسی داس کا شہرۂ آفاق رام چرت مانس دوہوں اور چوپائیوں پر مشتمل ہے لیکن بہدرے رامائن میں جو "بیردے" اسلوب کا کامیاب نمونہ انھوں نے پیش کیا ہے وہ ان کے پیش روؤں کے لیے ایک امر محال ہے۔

ایک دوہا اس رنگ کا ملاحظہ ہو:

یا تو آنگ انگ ملی اُدھک اددت
ہاری بیلی پہرا دیں چمپک ہوت

(اے سیتا جی! اگر آپ کے بیلے کے ہار میں چمپا بھی ملا دیا جائے تو یہ چمپئی رنگ آپ کے پیکر میں اور بھی دلکشی بڑھا دے گا)

تلسی داس نے ہندی کی ہر صنفِ سخن میں ایک کامیاب فن کار کی طرح اپنی جولانیٔ قلم کے جوہر دکھلائے ہیں۔ وہ صرف ناٹک اور رُوپک نہیں لکھ سکے لیکن اس کے علاوہ اس دور کی مروجہ رزمیہ شاعری کے انداز و قرینہ میں بھی اپنی تخلیقات کو پیش کر کے اس صنفِ سخن کو محدود دائرہ سے نکال کر وسعت دینے کا شرف انھیں کو حاصل ہے۔ صرف پرواز تخیل، نادر اور تازہ افکار سے ہی نہیں زبان و بیان کی خوبیوں میں بھی تلسی داس اپنے ہم عصروں اور پیشروؤں سے ارفع اور اعلیٰ ہیں۔ کبیر اور دوسرے سنت شاعروں کی زبان بھدّی اور غیر فصیح ہے اسی لیے مضامین بھی غیر مربوط نظر آتے ہیں۔ جس وقت سورداس جیسا مسلم الثبوت شاعر برج بھاشا کے عام انداز اور جدت ادا سے عوام کو محظوظ کر رہے تھے، ہندی کی عشقیہ شاعری اس زبان میں پروان چڑھ رہی تھی۔ کچھ بھکتی تحریک کے سنت شعرا اودھی کا بھی استعمال کر رہے تھے لیکن تلسی داس نے برج اور اودھی دونوں کے کامیاب نمونوں سے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف رام چرت مانس کو حیات دوام بخشی۔ دونوں زبانوں کے حسین امتزاج سے ان کی زبان شستہ اور لطیف بن گئی اور اس میں ادبیت پیدا ہو گئی ہے۔ انھوں نے نزاکت جذبات سے مملو سنسکرت الفاظ کو بھی سمو لیا ہے۔ بھدّے اور عامیانہ الفاظ ان کے یہاں ناپید ہیں تلسی داس کی تخلیقات میں لفظوں کا انتخاب اور ان کا مناسب اور برمحل استعمال ہی ان کی شاعری کی روح ہے۔ انھوں نے اس دور کی مروجہ علاقائی زبانوں کے الفاظ کو استعمال کرنے میں بھی عصبیت سے کام نہیں لیا ہے۔ چنانچہ رام چرت مانس میں بھوجپوری اور بندیل کھنڈی کے ساتھ عربی اور فارسی کے الفاظ بھی بکثرت موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کو جیسا عوام و خواص نے بہ نظر استحسان نوازا کسی اور دوسرے شاعر کو یہ انوکھا اعزاز نصیب نہیں ہو سکا۔ کچھ نثریوں اور کشتیوں سے

لے کر محلوں تک اس کے دلدادہ نظر آنے لگے اور اس کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جاری ہے۔

تلسی داس کے یہاں صنائع لفظی اور معنوی کا استعمال زبردستی نہیں بلکہ فطری ہے جس مقام پر جیسا چاہتے ہیں قلم متحرک ہو جاتا ہے یہ ان کی قادر الکلامی کی روشن دلیل ہے۔ ایک مقام پر تلسی داس جسم کے رنگ کی خوبی اور پسندیدگی کو بیان کرتے ہوئے اس طرح رطب اللسان ہیں ملاحظہ فرمائیے ؎

چمپک ہروا رنگ ملی ادھک سو ہائی
جانی پری یا ہیارے جب کمھلائی

(چمپا کا خوبصورت اور دل فریب ہار سیتا جی کی گردن میں پہنچ کر خود بھی خوبصورت ہو جائے گا اور جب اس گل اندام کے گلے سے ایک لمحے کے لیے بھی جدا ہوگا تو کمھلا جائے گا)

مندرجہ بالا دوہے میں جو انداز تغزل اور جمالیاتی فکر تلسی داس نے پیش کی ہے ہندی شاعری کے حسن میں ایک اضافہ ہے اس صدی میں اس طرح کے نازک خیال، جس میں عشق کا احساس، جسم انسانی کا مشاہدہ اور اس کی کیفیات کا خوبصورت بیان ہو سوائے تلسی کے دوسرے کے بس کی بات نہیں۔

تلسی داس کی تخلیقات میں نو رسوں کے اعلیٰ نمونہ ملتے ہیں لیکن خصوصیت سے شرنگار رس کا جتنا عمدہ، حسین رومانوی کیفیت دنور شیفتگی و سرشتی ان کی نظموں میں ہے وہ جدت ادا اور خود ساختہ پن اور کہیں نہیں۔ سورداس جو ان کے تدمقابل سمجھے جاتے رہے ہیں وہ مسائل زیست کا حقیقی شعور اور احساس شعری ادراک کے ذریعہ ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس کے قطع نظر مسئلہ زیست میں جمالیاتی فکر اور رعنائی، تازگی اور طرفگی کو ملحوظ خاطر رکھنا تلسی کی شاعری کی جان ہے۔ ان کا جمالیاتی ذوق و احساس نفسیاتی اور مبنی فطری ہے مندرجہ ذیل اشعار میں شرنگار رس" کے پاک اور لازوال حسن کے مالک نمونوں کو دیکھیے ؎

کنکن کنکن نو پر دھنی سُن
کہت لکھن سُن رامُو ہر دے گن

یا

ما ہنوں مدن دُندبھی دینہیں
منا وشو جے کہہ کینہیں

ترجمہ :۔ "سیتا جی کے کنگنوں کی کھنک، چوڑیوں کی چھنک اور گھنگھروؤں کی جھنک سُن کر رام چندر نے لچھمن سے دریافت کیا یہ میرے دل کو جیتنے والی کیسی دُندبھی (فتح کا باجا) بج رہی ہے۔"

فن کے نقطۂ نظر سے تلسی داس کے کلام میں شعریت کے ساتھ ساتھ منظر کشی، جذبات نگاری، اخوت، انسانی ہمدردی، درد و تاثیر، سادگی اور مکالماتی انداز اور موزونیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ اپنے مجموعۂ کلام "کبتاولی" (कवितावली) میں ایک مقام پر یہ انسانی ہمدردی، صداقت، اور جذبۂ ایثار کا ایک موثر نمونہ پیش کرتے ہیں جس میں رومانوی انداز فکر بھی شعور و احساس کی گہرائیوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے ——— جب رام چندر کے بھائی لچھمن، جنگل میں سیتا جی کی پیاس کو بجھانے کے لیے تلاش آب میں جاتے ہیں اور سیتا جی بھی صحرا نوردی کرتے کرتے تھک جاتی ہیں تو انھیں لچھمن کی مشقت اور محنت کا احساس اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے لہٰذا اسی جذبۂ ہمدردی کا اظہار مندرجۂ ذیل اشعار میں تلسی داس نے کہا ہے ؎

جل کو گئے لکھن ہیں لرکا پری کھیو پیا گھریک ہوئے ٹھاڑھے
پونچھ پسیو بیاری کروں اَو پائیں پکھاری ہوں بھو بھری ڈاڑھے
تلسی، رگھوبیر پریا شرم جان کے بیٹھ بلمب لوں کنٹک کاڑھے
جانکی ناہ کو نیہہ لکھیو پلکو تن باری بلو چن باڑھے

ترجمہ : "سیتا کہتی ہیں اے پیا یعنی رام، لچھمن پانی لانے کے لیے گئے ہیں وہ ابھی بہت ہی لڑکے ہیں ان کا انتظار ایک درخت کے نیچے گھڑی بھر کر لیجیے اور میں آپ کے جسم کا پسینہ پونچھ کر آنچل سے ہوا دوں گی اور پاؤں سے لپٹی ہوئی دھول کو صاف کروں گی۔ رام چندر نے سیتا کی اس گفتگو کا اندازہ لگالیا کہ وہ بہت تھک گئی ہیں اور گھڑی بھر کے لیے آرام چاہتی ہیں لہٰذا وہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر پاؤں سے کانٹا نکالنے لگے اور محبت بھری نظروں سے جانکی (سیتا) کی طرف سرشاری اور کیف و سرور کے بحر بیکراں میں کچھ لمحوں کے لیے بہہ گئے"

تلسی داس کے کلام میں اس طرح کی بہت سی خوشگوار اور جیتی جاگتی مثالیں موجود ہیں ان کے ہم عصر اور ہمسر سور داس نے بھی جن موضوع کو نظم کیا ہے اس کو انتہائی نقطۂ عروج تک پہنچا دیا ہے مگر جذبہ کو موزونیت اور دل کشی سے متشکل کر دینا ہر شاعر کو نصیب نہیں۔ ایسے تلسی جیسا وسیع المطالعہ اور وسیع المشاہدہ' شاعر ہی کر سکتا ہے۔ انھوں نے جن کرداروں کو زبان و بیان عطا کیا ہے وہ کسی نہ کسی طرح سے ہر شعبۂ حیات پر عکس ڈالتے ہیں۔

فنی، ادبی اور شعری صلاحیتوں اور پختگی کے علاوہ ہندستانی تہذیب اور معاشرت کے مطمح نظر سے بھی تلسی داس کا ہندی شاعری میں سب سے اہم مقام ہے۔ تلسی داس کے عہد تک ہندی شاعری کی تاریخ میں صرف ایک پہلو یعنی چند بردائی کے اسلوب اور طرز فکر کو ہی اہمیت دی جاتی رہی رزمیہ شاعری کے نقیب صرف شجاعت اور جواں مردی کی تبلیغ فلک شگاف نعروں سے کرتے رہے۔ صوفی اور سنتوں کی شاعری صرف "بھگتی" کے تصور کو مختلف انداز سے الٹ پلٹ کے پیش کرتے تھے۔ حدیث دلبری اور حسن و عشق کے رسیا ریتی کال کے اثرات سے مبرا ہو کر شعر کہنا لائق جرم سمجھتے تھے حسن و عشق، ہجر و وصال کے موضوع ہی میں شاعری کو محدود کر رکھا تھا لیکن یہ صرف تلسی داس ہی ہیں جنھوں نے ہندی شاعری کی تاریخ میں ایک انقلابی قدم اٹھا کر شاعری میں حیات انسانی کے ہر پہلوؤں کو جگہ بخشی اور اپنی فکر و نظر کی گہرائیوں سے کام لے کر انفرادیت اور اجتماعیت کو ایک مرکزیت عطا کی۔ کبیر داس نے زندگی کو جو تلخی اور شدت سے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی تھی اُسے تلسی داس نے وارفتگی اور شگفتگی میں تبدیل کر کے سدا بہار بنا دیا۔ اپنے گرد و پیش کے مذہب اور سماج میں بے ربطی دیکھی تو آریہ عظمتوں کو مجروح ہونے سے بچانے کے لیے رام چرت مانس کے ذریعہ دھرم، طبقاتی کشمکش، حکمراں طبقہ، عوامی اور معاشرتی زندگی میں قومیت اور وطنیت کے پاکیزہ جذبہ کی روح پھونک کر بیدار کیا، سنتوں کے ادب سے پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کر کے آدمی کو عمل کی طرف مائل کر کے زندگی کا روشن اور واضح تصور تلسی داس نے بخشا ہے تاکہ کثرت میں وحدت کا جلوہ نظر آئے۔

شیسوؤں اور وشنوؤں میں پیدا شدہ اختلافات کو دور کر کے متحد کرنے کا سہرہ تلسی داس کے سر ہے اس اتحاد کی زندہ اور کامیاب سعی رام چرت مانس ہے عوامی جذبہ کا احترام تلسی داس کے یہاں زیادہ ملتا ہے اپنی تخلیقات میں انھوں نے مذہبی اور سماجی تصورات کے ساتھ ساتھ حکمراں طبقہ کے لیے بھی واضح نظریات رکھے ہیں جس کے ذریعہ عوام اور خواص، علماء اور جہلاء غرباء اور امراء سب کو نصیحتیں اور ہدایتیں دی گئی ہیں۔

ہندی شاعری میں تلسی داس کے نغمات، فلسفیانہ اور روحانی نظریات پر مبنی ہیں۔ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے تلسی داس، وجود باری تعالیٰ کے مسئلے میں "دوئی" کا تصور رکھتے ہوئے بھی وحدت میں یقین رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ رام اور خالق کائنات (برہما)' اور سیتا کو مادر کائنات تسلیم کرتے ہوئے بھی "صداقت" کو خلقت کائنات کی غرض و غایت مانتے ہیں اور اس "صداقت" کو "رام" بتلاتے ہیں بقیہ سب غلط ہے یہ ان کا ادراک یقین ہے اور اسی لیے انھوں نے "رام اور" آدمی" کا امتیاز صرف "مادیت" سے کیا ہے۔

تلسی داس نے اپنی آفاقی شاعری کے ذریعہ ہندستانی تہذیب اور معاشرت کے نادر نمونے پیش کرتے ہوئے رام چندر کے کردار و عمل کے مثالی گوشوں کو اجاگر کر کے ہندی ادب کی تاریخ میں ایک زندگی کی لہر دوڑا دی ہے اور اپنی نوک قلم سے ادب کی زمین پر جو نقوش کھینچے ہیں وہ آج تک صرف ہندی ادب ہی نہیں دنیائے ادب کی ایک گراں قدر متاع ہیں۔ ان کے مجموعوں میں ہندستان کا ماضی، حال اور مستقبل اپنی مخصوص ادا کے ساتھ جلوہ طرازیاں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی لیے چار سو سال بعد بھی ان کی عظمت کے اعتراف میں ہر طرف ان کی یادگاریں قائم کی جا رہی ہیں اور مستقبل میں بھی کی جائیں گی کیونکہ ہندی شاعری میں ان کی رفعتوں تک کوئی اور نہیں پہنچ سکا ہے۔

★

نیا دور

احتشام نمبر کی رسمِ اجرا تصویروں کے آئینے میں

ملک کے مایۂ ناز اور مقبول ترین ادیب، نقاد اور شاعر پروفیسر احتشام حسین کی یاد میں محکمۂ اطلاعات اتر پردیش سے شائع ہونے والے ماہنامہ نیا دور کے ضخیم اور منفرد احتشام نمبر کی رسم اجرا پر دیش کے علم دوست اور ادب نواز گورنر جناب اکبر علی خاں صاحب نے ۲۰ جولائی ۱۹۷۳ء کو راج بھون لکھنؤ کے دربار ہال میں ادا فرمائی۔ محکمۂ اطلاعات کے سکریٹری شری اے۔ پی۔ دکشت نے رسم اجرا کی ادائیگی کے لیے گورنر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے موصوف سے تقریب کا آغاز کرنے کی درخواست کی۔ گورنر نے (اوپر) مرحوم احتشام حسین کی قلمی تصویر کو جو، لکھنؤ کے مشہور آرٹسٹ عظمت اللہ خاں صاحب نے بنائی تھی، ہار پہنا کر تقریب اجرا کا آغاز کیا۔ اس کے بعد احتشام صاحب کے صاحبزادے جناب جعفر عسکری نے اپنی نظم "تصویر دیکھ کر" سنائی۔ (نیچے) تصویر میں جعفر عسکری صاحب نظم سنا رہے ہیں اور ڈائس پر (بائیں سے دائیں) خورشید احمد ایڈیٹر نیا دور، سکریٹری محکمۂ اطلاعات شری اے۔ پی۔ دکشت، عزت مآب جناب گورنر صاحب اور محکمۂ اطلاعات کے ڈائرکٹر شری نرد من شرما بیٹھے ہوئے ہیں۔ جعفر عسکری صاحب کے بعد لکھنؤ کے کہنہ مشق اور ممتاز شاعر جناب سالک لکھنوی نے منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ پھر ایڈیٹر نیا دور نے اپنی رپورٹ پڑھی جس میں نیا دور کے ۱۸ سالہ ادبی خدمات پر روشنی

احتشام

تصویر

راج بھون لکھنؤ میں رسم اجرا کی تقریب میں
اور احتشام صاحب کے دوستوں
مجمع
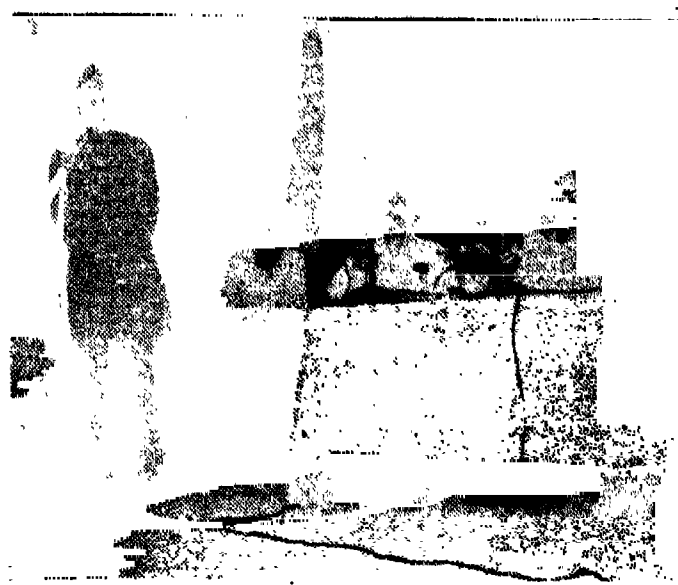
ڈالی گئی تھی اور بنیاد دوں کے ساتھ خصوصی نمبروں کی مقبولیت کا ذکر کیا گیا تھا۔ منظوم نذرانۂ عقیدت کے بعد تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب نے (تصویر میں اوپر) احتشام صاحب کی پرکشش شخصیت، ان کی ادبی عظمت، انسان دوستی اور اخلاق و مروت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ایسے عظیم انسان اور اتنے بڑے ادیب و نقاد کے اچانک اٹھ جانے سے جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کا پُر ہونا آسان نہیں۔ اس کے بعد شعبۂ اردو کے ایک اور استاد جناب شبیہ الحسن صاحب نونہروی نے (تصویر میں نیچے) ان کی دانشوری، ان کے ہمہ گیر اور آفاقی انسانی نقطۂ نظر اور تنقیدی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ "حالی نے اردو تنقید کو آرٹ اور احتشام صاحب نے سائنس بنا دیا۔" ان دو حضرات کے بعد ہندی کے ممتاز ناول نگار اور

ں رسمِ اجرا

بہ ٔینے میں

مصنف شری بھگوتی چرن ورما اور شری یشپال نے احتشام صاحب کی شخصیت، کردار، ان کے انداز فکر اور ادب و تنقید میں ان کے ترقی پسند نظریات پر روشنی ڈالی۔ شری ورما (اوپر تصویر میں) کہا کہ بات چیت اور گفتگو کی طرح ان کے لکھنے کا انداز بھی دل کش اور موثر تھا۔ انھوں نے زبان کے معاملے میں کبھی تنگ نظری کو راہ نہیں دی۔ چنانچہ وہ اردو ہی کی طرح ہندی اور انگریزی پر بھی پوری قدرت رکھتے تھے۔ شری یشپال (تصویر میں نیچے) نے احتشام صاحب سے اپنے دیرینہ تعلقات اور رسم و راہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کیا بحیثیت انسان اور کیا بحیثیت ادیب و نقاد وہ عظیم تھے۔ انھوں نے اردو میں ترقی پسندی کی بنیاد رکھی اور اس عمارت کی تکمیل عمر بھر کرتے رہے۔

ردو اور ہندی کے عالموں، ادیبوں، شاعروں اور عقیدت مندوں کے بڑے

احتشام صاحب علم و ادب کی دنیا میں یاد رکھے جائیں گے۔ اس وقت بھی اور آئندہ بھی۔

اس کے بعد سکریٹری محکمۂ اطلاعات شری اے۔ پی دکشت نے (بائیں) احتشام نمبر کی ایک خوبصورت مجلد کاپی گورنر کی خدمت میں پیش کی اور موصوف نے فرمایا کہ "اب میں اسے جاری کرتا ہوں۔" پھر اپنی مختصر مگر جامع تقریر میں عزت مآب جناب اکبر علی خاں صاحب نے (نیچے تصویر میں) احتشام صاحب کی شخصیت، ان کے اخلاق، ان کی علمی اور ادبی خدمات اور ان کے اعلیٰ اور ترقی پسندانہ خیالات کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ ایک مفکر، دانشور اور اردو کے جلیل القدر ادیب، شاعر اور نقاد تھے اور اپنی ساری زندگی زبان و ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ انھوں نے اردو کو نئے رجحانات اور تنقید کو سائنسی طرز فکر سے آشنا کیا اور اسے انتہائی بلندی پر پہنچا دیا۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے اردو ہندی کے مسئلے کو کبھی اختلافی اور سیاسی مسئلہ نہیں بنایا۔ موصوف نے فرمایا کہ آزاد انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد ان کی رہنمائی اور رہبری میں ایک اردو انسائیکلو پیڈیا شائع کرنا چاہتی تھی۔ ہم لوگوں نے انھیں اس کام کے لیے تیار اور آمادہ بھی کر لیا تھا۔ مگر موت نے اس کا موقع نہیں دیا اور ان کی فاضلانہ رہنمائی سے ہم محروم ہو گئے۔ قضا و قدر کو یہی منظور تھا کہ وہ جلد ہمارے درمیان سے چلے جائیں۔ لیکن ان کی بہترین یاد اور ان کی خدمات کا بہترین اعتراف یہی ہے کہ ہم ان کی جلائی ہوئی شمع کو روشن رکھیں اور ادب کو ان کی جو دین ہے اس کی ترویج و اشاعت کی سعی کریں۔

گورنر نے محکمۂ اطلاعات کی جانب سے نیا دور کے احتشام نمبر شائع کرنے اور اس کے اجرا کے سلسلے میں ایک خصوصی تقریب کا انعقاد کرنے پر اپنی انتہائی خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔

آخر میں ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات شری منی شرما نے گورنر، سکریٹری محکمۂ اطلاعات اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

★

غزل

تسنیم فاروقی

زندگی اک کتاب ہو جیسے
ہر ورق اُس کا خواب ہو جیسے

سایۂ شب میں آپ کا احساس
چاندنی میں گلاب ہو جیسے

فرشِ گل سے بساطِ انجم تک
تو مرا انتخاب ہو جیسے

اب بھی بیگانگی نہیں جاتی
اب بھی اُن کو حجاب ہو جیسے

اس کے عارض پہ شرم کی لہریں
شام کا آفتاب ہو جیسے

دل مرا اک سوالِ آوارہ
آنکھ تیری جواب ہو جیسے

مہکی مہکی سی اُن کی سانسوں میں
نوکشیدہ شراب ہو جیسے

آئینے میں کسی کی انگڑائی
سازشِ انقلاب ہو جیسے

زندگی اس کی یاد میں تسنیم
نشۂ بے حساب ہو جیسے

غزل

قطب سرشار

جس وقت اہلِ شہر سے کوئی خطا ہوئی
اشرار کے علاوہ سبھی کو سزا ہوئی

محرومیوں کی آنچ جو حد سے سوا ہوئی
خواہش پگھل پگھل کے فقط التجا ہوئی

شیشے کو تم نے توڑ دیا، مسکرا دیے
افسوس اب نہ کیجیے قیمت ادا ہوئی

میں ابرِ آرزو ہوں برس جاؤں گا مگر
ساری زمیں پہاڑوں کا اک سلسلہ ہوئی

یہ کون آیا قحط کے کڑوے سکوت میں
سناٹا جھنجھنایا کہ آوازِ پا ہوئی

فاقوں کی فصل، دھوپ چٹختی زمیں کی چیخ
اب کے برس بہار کی یوں ابتدا ہوئی

سب ابرِ باراں جل گئے دریا سکڑ گئے
روٹھا ہے آسمان کہ دھرتی خفا ہوئی

(افسانہ)

زندہ لاش

محمد خالد عابدی

وہ جب اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر شیو بنانے کی تیاری کرتا
کچھ دیر بعد وہ بھی اپنے برآمدے میں آ بیٹھتی۔ وہ شیو بنانے کے
دَوران کبھی کبھی نگاہیں اس پر مرکوز کر دیتا۔ وہ بے حد شوخ و شنگ
تھی اور کچھ عمر کا بھی تقاضا تھا۔ کبھی وہ اپنے چھوٹے بھائی کو گود میں
لے کر بھینچتی کبھی اس کے پھولوں جیسے رخسار پر اپنے جلتے ہوئے ہونٹ
رکھ کر اپنے جذبات کا اظہار کرتی۔ وہ بھی پہلو بدل بدل کر اپنی نگاہوں
کے تیر اس پر پھینکتا اور شاید وہ ان تیروں کی کسک محسوس کرتی۔
یہ سلسلہ ایک عرصے تک چلتا رہا۔ وہ بھی حسبِ معمول اُسے دیکھتا اور وہ
بھی اپنی دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ کر برآمدے کے پردہ میں چھپ جاتی۔۔
روز بہ روز وہ اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا اور وہ بھی برابر اسے اپنے
نینوں کی ڈور سے اپنی طرف کھینچے جا رہی تھی۔ لیکن باہمی ملاقات کا اتفاق
نہیں ہو رہا تھا۔

ایک دن شدید بارش ہو رہی تھی۔ غالباً سارے شہر کی بجلی چلی
گئی تھی۔ وہ بہت دیر سے اپنے کمرے میں آیا تھا۔ اندھیرے میں ٹٹول
کر اس نے تالا کھولا اور کمرہ میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے
ہی اس نے محسوس کیا کہ ٹخنوں سے اوپر تک سارے کمرے میں پانی
بھرا ہے۔ اس نے اندھیرے میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ سامنے
کی کھڑکی کھلی رہ گئی تھی اس لیے سارے کمرے میں پانی بھر گیا تھا۔
اس نے اپنے بستر پر ہاتھ پھیر کر دیکھا کہ بستر تو تر بتر نہیں ہے۔ اس نے
دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو رات تو آرام سے کٹے گی۔ اور اطمینان
سے بستر پر دراز ہو گیا۔

آج وہ بے حد تھکا ماندہ تھا اس لیے بستر پر پڑتے ہی گہری
نیند میں ڈوب گیا۔ اچانک ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ایک دم دروازہ
کھل گیا اور کھڑکی میں کھڑی ہونے والی وہ حسین نوخیز لڑکی اس کے
کمرے میں داخل ہوئی۔ نہ جانے اسے کونسی ہمدردی کا جذبہ یہاں کھینچ لایا
تھا۔ اس نے کمرہ میں داخل ہوتے ہی اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں،
بجلی تو جا ہی چکی تھی۔ اُس نے سوچا شاید چراغ ہو لیکن چراغ بھی نہ تھا۔
اس نے کسی طرح کمرہ کا پانی باہر نکالا اور ہوا کے تیز جھونکوں سے جو
چیزیں اِدھر اُدھر ہو گئی تھیں وہ ترتیب سے رکھ دیں۔ شاید اس کے
مزاج میں گرہستی ضرورت سے زیادہ رچی تھی۔

وہ گہری نیند میں سویا تھا۔ لمبے لمبے خرّاٹے خاموش کمرے میں
عجیب آواز پیدا کر رہے تھے۔ اس نے جیسے ہی کروٹ بدلی تو اچانک
اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سامنے سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کے ذہن میں
مختلف خیالات گردش کر رہے تھے۔ ایسا نہ ہو یہ مجھے چور سمجھ لیں وہ
یہ بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ تم کون ہوتی ہو اتنی رات گئے میرے کمرے میں
آنے والی؟ لیکن وہ نیند کے خمار میں اتنا تھا کہ اس نے پھر کروٹ کے
ساتھ آنکھوں پر نیند کی چادر کھینچ لی۔

چڑیاں چہچہا رہی تھیں، سورج کی کرنیں کھڑکی کو عبور کر کے اس
کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ جیسے ہی اس کی آنکھیں کھلیں وہ حسرت
کی تصویر بن کر رہ گیا۔ کمرے میں اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس نے جماہی
لیتے ہوئے کہا "کتنا حسین خواب تھا"
کھڑکی کے قریب آ کر اس نے ایک انگڑائی لی اور بے اختیار

س کی نظر سامنے والی کھڑکی پر جا پہنچی۔ وہ سامنے چائے کی یالی لیے کھڑی تھی۔

وہ کھڑکی کے سامنے شیو کا سامان رکھ کر شیو بنانے بیٹھ گیا۔ بھی حسب معمول برآمدے میں آکر کھڑی ہو گئی۔ وہ اسے دیکھتا ہا، اُس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔

وہ غسل سے فارغ ہو کر آئینہ کے سامنے آیا اور بال سنوارنے ا۔ شرٹ کے بٹن لگاتے ہوئے نیچے اترنے کے لیے مڑا ہی تھا کہ ،سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ پھر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ہاتھ کے ِارے سے اس نے اسے رکنے کو کہا۔ اس نے سوچا یہ حسن مجھ سے طب ہے یا اور کسی سے؟ اس لیے اس نے بھی اشارتاً وضاحت چاہی۔ خوش نصیب وہی تھا؛ لیکن اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا سا نہ ہو کہ اس کا باپ یا بھائی آجائے اور کہے "کیوں صاحب یہ کیا رافت ہے؟ آپ ہر روز کھڑکی کھول کر شیو کرنے بیٹھ جاتے ہیں" ہی ت سات آٹھ سال کا ایک بچہ اس کے کمرے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ ا کے دل نے کہا یہ اسی کا چھوٹا بھائی ہے! لیکن یہ اس بچے سے بڑا ہے الثر اس کی گود میں ہوتا ہے۔

وہ کمرے سے نیچے صدر دروازے پر آیا اور بچے سے پوچھا۔

"کہیے! میاں کیسے زحمت کی ــــــ؟"

"ہم آپ سے پڑھنا چاہتے ہیں" ــــــ بچے نے معصومیت جواب میں کہا۔

"اچھا ــــــ؟"

"تو آپ پڑھائیں گے نا ــــــ؟" بچے نے وعدہ ـا ہا۔

"کیوں نہیں ضرور پڑھائیں گے ــــــ" اس نے بت کی راہ نکالی۔

"ننھے میاں آپ نے اپنا نام ــــــ؟"

"عقیل ــــــ" بچے نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو آپ کس درجے میں پڑھتے ہیں ــــــ؟"

"تیسرے درجے میں ــــــ" بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔

"تو عقیل میاں، ہم کل سے آپ کو پڑھائیں گے ــــــ" اس نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

"مگر آپ کس وقت آئیں گے ــــــ؟" بچے نے پوچھا۔

"میں دفتر سے ساڑھے پانچ بجے تک آجاتا ہوں، چھ بجے آپ کو پڑھانے آؤں گا ــــــ"

"آپ نے ہمارا نام تو پوچھ لیا، لیکن آپ نے ــــــ اپنا نام نہیں بتایا ــــــ" بچے نے معصومیت سے کہا۔

"اچھا پہلے وعدہ کرو کہ تم بھی ہمیں اپنی باجی کا نام بتاؤ گے ــــــ؟" ں کے دل میں اس لڑکی کا نام جاننے کی خواہش ہوئی۔

"ہوں ــــــ" بچے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"عقیل میاں ہمارا نام ہے، افتخار ــــــ" اس نے اپنا نام بتا دیا۔

"عقیل میاں اب آپ اپنی باجی کا نام بتائیے ــــــ؟" افتخار نے وعدہ پورا کرنے کو کہا۔

"ہماری باجی کا نام نکہت ہے ــــــ" بچے نے افتخار کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"عقیل میاں اب آپ جائیے ورنہ آپ کی باجی ناراض ہوں گی۔ آپ کل کاپیاں کتابیں لے کر بیٹھیے گا ــــــ!" افتخار نے بچے کو رخصت کرتے ہوئے کہا۔

افتخار سیڑھیاں چڑھتا ہوا کمرہ میں داخل ہوا اور الماری سے گھڑی نکال کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو کر گھڑی باندھ رہا تھا کہ اس نے دیکھا وہ پھر برآمدے میں طلوع ہوئی۔ اس نے آنکھیں چار ہوتے ہی نہایت مؤدبانہ انداز سے سلام محبت کیا۔ افتخار نے بھی اس کے سلام کا جواب اپنے سر کو ہلکا خم دے کر دیا۔ افتخار اپنے دل میں ہزاروں خوشیاں لیے سیڑھیاں اترتا ہوا باہر نکل گیا۔ نکہت کی نگاہیں اسے رخصت کر رہی تھیں۔

رات کو جب وہ کمرے میں داخل ہو کر کھڑکی پر آیا تو نکہت نے بھی جواب میں آنگن کا بلب جلا کر اپنے آپ کو نمایاں کیا۔ وہ اس کے انتظار میں بھی

تھی۔ افتخار نے اشارے سے پوچھا ــــــــ"

"ابھی تک سوئی نہیں ــــــــ؟"

جواب میں نکہت مسکرا دی۔

وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اس کی محبت پروان چڑھ رہی تھی۔ لباس بدل کر وہ اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ لیٹے لیٹے اس نے بستر سے اپنی گردن اٹھائی کہ وہ ابھی کھڑی ہے یا چلی گئی؟ وہ آہستہ آہستہ برآمدے سے اندرونی کمروں میں داخل ہو رہی تھی۔ افتخار، نکہت کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کیا اس کی محبت، شادی میں بدل سکتی ہے ــــــــ؟ اس کے والدین اس رشتے کو پسند کریں گے ــــــــ؟ افتخار کو تو اپنے والدین پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ اس کی آرزوؤں کو پامال نہ کریں گے۔ یہی سوچتے سوچتے وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

صبح ہوئی تو حسبِ معمول تیار ہو کر وہ دفتر چلا گیا۔ نکہت کے چہرے پر خوشی کا تاثر تھا۔ اس نے آج بہت ہی باریک ہلکا آسمانی کرتا زیبِ تن کر رکھا تھا اور اس پر بہت صاف، شفاف سفید چست پاجامہ پہن رکھا تھا۔ کھلے ہوئے ریشمیں بال آج اس کی دوشیزگی کو نکھار رہے تھے۔ وہ بخوبی جانتی تھی کہ وہ کس کے لیے اپنے آپ کو سنوار رہی ہے۔ آج اس کا شگفتہ چہرہ کھلا ہوا گلاب معلوم ہو رہا تھا! جب وہ سنگار دان کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے بال سنوار رہی تھی تو یکایک اس کی آنکھیں آئینہ پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ تصور کر رہی تھی کہ افتخار اس کے قریب کھڑا ہے اور نکہت کے شگفتہ گلاب سے چہرے کو ہلکے ہلکے چھو رہا ہے۔ ہاتھ سے کنگھا چھوٹا تب کہیں اس کی محویت ٹوٹی۔ اور وہ آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے شرما گئی۔

افتخار شام کو اس کے مکان پر آ رہا تھا جہاں اس کی روح رہتی ہے، اس کا سکون، اس کا سب کچھ! آج افتخار پہلی بار حریمِ محبوب میں باریاب ہو رہا تھا۔ وہ عجیب روحانی مسرت محسوس کر رہا تھا۔ دل کی دھڑکنیں سنبھالے خراماں خراماں اپنی محبوبہ کے مکان کے زینوں پر چڑھ رہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر دروازہ پر دستک دی۔

"کون صاحب ہیں ــــــــ؟" ایک میٹھی نسوانی جوان آواز آئی۔

"میں . . . میں ــــــــ" اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"میں ہوں ــــــــ افتخار ــــــــ!" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے ہمت کر کے کہا۔

قدرے توقف کے بعد دروازہ کھلا۔ وہ کمرے میں داخل ہو گیا "تشریف رکھیے!" ایک دوسرے کمرے کے قریب سے آواز برآمد ہوئی۔ نہ جانے اس کے دل کی دھڑکنیں کیوں تیز تھیں۔ وہ قریب ہی بچھے صوفے پر بیٹھ گیا اور پینٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگا ہی رہا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر خاتون اس کی طرف آتی ہوئی نظر آئیں۔ اس نے ازراہِ احترام سگریٹ چھپا لیا اور کھڑے ہو کر آداب کرنے لگا۔

"سلامت رہو بیٹا ــــــــ!" خاتون نے دعا دی۔

وہ صوفے پر بیٹھا ہی تھا کہ اس خاتون نے اپنے بیٹے عقیل کو آواز دی اور کچھ دیر بعد وہ معصوم مسکراہٹ بکھیرتا ہوا اسلام کر کے اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"آپ کہاں ملازمت کرتے ہیں ــــــــ؟" خاتون نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

"میں قریب ایک سرکاری دفتر میں ملازم ہوں ــــــــ!" اس نے کہا۔

"آپ یہاں اکیلے ہی ہیں ــــــــ یا ــــــــ؟" خاتون سوال پر سوال کیے جا رہی تھی۔

"جی ہاں، فی الحال میں یہاں اکیلا ہوں ــــــــ!" اس نے اپنی حالت ان کے گوش گزار کی۔

"لیکن پہلے آپ اپنی فیس بتا دیجیے، پھر انھیں پڑھائیے ــــــــ!" خاتون کے سوال میں صاف گوئی کا عنصر تھا۔

"آپ بھی کمال کرتی ہیں، میں کچھ نہ لوں گا ــــــــ!" اس نے کچھ تکلف توڑا۔

"نہیں بھئی آپ بھی تو . . . . . آخر ــــــــ؟" خاتون نے ہمدردی ظاہر کی۔

"کوئی بات نہیں ــــــــ!"

"اب آپ جائیے ــــــــ!" وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تب خاتون کے جانے کے بعد اس نے دزدیدہ نگاہوں سے نکہت

کو تلاش کیا۔ وہ قریب ہی والے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی باتیں سن رہی تھی۔ اس سے آنکھیں ملتے ہی افتخار کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی اور وہ بھی ہلکا تبسم بکھیر کر دلکش ادا کے ساتھ اس کمرے میں آ گئی۔

افتخار نے عقیل کو ریاضی کے سوالات دے دیے تھے۔ وہ انھیں حل کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور اطمینان سے منہ میں سگریٹ لگا کر اپنی جیب میں ماچس تلاش کرنے لگا۔ لیکن ڈبیہ میں سلائی نہ تھی۔ اس نے چاہا بچے سے ماچس منگالے لیکن اچانک اس نے دیکھا نکہت قریب والے کمرے سے اپنا ایک ہاتھ نکالے بہت ہی ہلکی آواز میں عقیل کو آواز دے رہی ہے۔ اور اس کے نازک ہاتھ میں چائے کا کپ ہے۔ وہ خود ہی اٹھا اور اس کے پاس جا پہنچا۔ اس نے اپنی آنکھیں افتخار کی آنکھوں میں ڈالتے ہوئے چائے کی پیالی آگے بڑھا دی اور دوسرے ہاتھ سے ماچس۔ اس کی آنکھیں افتخار کی آنکھوں میں کچھ دیکھ رہی تھیں۔ شاید اسے وفا کی تلاش ہو گی۔

وہ حیران رہ گیا کہ نکہت کو کیسے علم ہوا کہ اس کی ماچس ختم ہو چکی ہے۔ شاید وہ سب کچھ دیکھ رہی ہو گی۔ افتخار نے چائے کی پیالی اس انداز سے لی کہ نکہت کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھو گیا۔ اور وہ جواب میں ہونٹ دبا کر شرما کر رہ گئی۔

دو تین مہینے تک وہ عقیل کو پڑھاتا رہا۔ ایک دن وہ خاتون پھر آئیں اور افتخار سے مخاطب ہوئیں۔

"افتخار میاں، میں ایک اور زحمت دینا چاہتی ہوں ــــــ" ان کے سوال میں التجا تھی۔

"زہے نصیب ــــــ" افتخار نے جواب میں انکساری ظاہر کی۔

"بات یہ ہے کہ میری بڑی لڑکی نکہت کو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ وہ اس سال میٹرک کے امتحان میں بیٹھ رہی ہے۔ آپ کے پاس وقت ہو تو اسے بھی ایک آدھ گھنٹہ دے دیجیے ــــــ" خاتون نے اس پر ایک اور ذمہ داری ڈالی۔

"آپ کل سے انھیں بھی عقیل کے ساتھ بھیج دیجیے ــــــ" افتخار

کو قربت کی راہیں ہموار ہوتی نظر آئیں، اس کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔

افتخار کمرے میں بیٹھا کمرے کی آرائش کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی نگاہیں ایک تصویر پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ تصویر کسی دوشیزہ کی تھی اس پر ہلکا سرخ پردہ پڑا تھا۔ اس لیے تصویر کے خد و خال اور نقوش واضح نظر نہیں آ رہے تھے۔ اچانک عقیل کمرے میں داخل ہوا اور سلام عرض کر کے افتخار کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ لیکن وہ جواب سے محروم تھا۔ عقیل بچہ تھا اس گہرائی کو سمجھ نہ سکا۔ لیکن یہ ضرور تاڑ گیا کہ ماسٹر صاحب کی نظر کسی تصویر پر مرکوز ہے۔ اور جب افتخار کی محویت ٹوٹی تو اس نے پوچھا۔

"ارے عقیل میاں آپ کب آئے ــــــ؟"

"جب آپ وہ تصویر دیکھ رہے تھے ــــــ" عقیل نے 'وہ' کو مزید کھینچتے ہوئے کہا۔

افتخار بچے کو پڑھا رہا تھا۔ پڑھا کر اٹھنے والا ہی تھا کہ اس کی نگاہیں پھر اس کھڑکی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ جہاں نکہت اکثر آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ نکہت نے اشارہ سے اسے رکنے کو کہا اور وہ پھر سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بناتا رہا۔ نکہت اس عرصے میں چائے لے کر آ گئی تھی۔ اور اس نے عقیل کو اپنی طرف متوجہ کر کے چائے کی پیالی اس کے ہاتھ بھیج دی۔

افتخار کو ایک شرارت سوجھی اور اس نے عقیل سے چائے واپس لے جانے کو کہا۔ یہ حرکات و سکنات نکہت بخوبی دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی عقیل چائے کی پیالی لے کر واپس مڑا۔ نکہت کے چہرے پر مایوسی کے تاثر نمایاں ہو گئے۔ شاید اسی طرح جیسے کسی دلہن کے گھر سے برات واپس ہو جائے۔

"ماسٹر صاحب چائے کیوں نہیں پی رہے ہیں ــــــ؟" نکہت نے مایوسی کے لہجے میں کہا۔

"وہ کہہ رہے ہیں آج گرمی بہت ہے ــــــ" بچے نے اپنے ماسٹر کی سفارش میں کہا۔

"ان سے کہنا آپ سگریٹ بھی تو پی رہے ہیں ــــــ؟ اور ہاں سنو ان سے کہنا چائے اتنی نقصان دہ نہیں ہے جتنی سگریٹ ــــــ" نکہت نے عقیل کو پھر بھیجتے ہوئے کہا۔

افتخار نے جیسے ہی چاے کا ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتارا، نکہت کو تسکین ہوئی۔ چاے پی کر اس نے سامنے ہی رکھے ٹیبل پر گلدستے کے قریب پیالی رکھ دی اور کھڑا ہو گیا۔ اور جیب سے ایک نہایت معمولی رومال نکال کر اس نے اپنے ہونٹوں سے لگایا اور ایک بار پھر نکہت کو دیکھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور اپنے مکان کی طرف چل دیا۔

صبح جب وہ دفتر جانے کے لیے کمرے کے زینوں سے اتر رہا تھا، پوسٹ مین کی آواز نے اُس کے قدموں کو روک دیا۔ اس نے پوسٹ مین سے خط لیا اور پڑھتا ہوا آہستہ آہستہ قدم آگے بڑھاتا رہا۔ یہ خط دعوت نامہ تھا۔ اس کے بچپن کے دوست جاوید کی شادی ہو رہی تھی اور وہ بھی محبت کی شادی"!

شام کو چھے بجے وہ تازہ دم ہو کر حسب معمول ٹیوشن پر گیا۔ کچھ دیر بعد عقیل کے ساتھ نکہت بھی اپنے سینے سے کتابیں لگائے ہوے خراماں خراماں آ رہی تھی۔ نکہت نے عقیل کو اپنے قریب بٹھا لیا اور وہ نیچی نگاہیں کیے کتاب پر چڑھے کور (C O V E R) کو کرید رہی تھی۔ آج بہت قربت تھی۔ افتخار کے دل کی دھڑکن اور دنوں کی نسبت تیز تھی۔ وہ پرشوق نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے گھنگھرالے بال اس کے گالوں کو چوم رہے تھے۔ آخر افتخار ہی نے طویل خاموشی توڑی۔

"کیا خاموش رہنے کی قسم کھائی ہے ـــــــ"؟ افتخار نے گفتگو کا سلسلہ چھیڑا۔

"جی ــــ"! نکہت نے نہایت تکلف سے کہا۔

"ہوں ــــ"! افتخار نے شوخی سے کہا۔

نکہت نے نہایت تکلف سے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور اپنی خوبصورت انگلیوں سے بالوں کو چہرے پر سے ہٹاتے ہوے عقیل کو ٹھوکا دیا۔

"پڑھنا کیا بیٹھے رہو گے ــــ"؟ نکہت کے منہ سے ایک میٹھا تیر چھوٹا۔

عقیل نے ویسے ہی کتابیں الٹتے پلٹتے پہلو بدلا۔

"ہاں تو عقیل میاں آپ نے کل کے سوالات حل کر لیے ــــ"؟

"لائیے دیکھیں ـــــــ" افتخار عقیل سے مخاطب ہوا۔

"جی نہیں کیے ـــــ"! عقیل نے معصومیت سے کہا۔

"اچھا تو گویا آپ کام چور ہیں، کوئی دل کا چور ہوتا ہے۔ آپ کام چور ہیں ــــ"! افتخار نے نکہت پر طنز کا تیر پھینکتے ہوے شوخی سے کہا

"اب آپ کی سزا یہی ہے کہ یہیں بیٹھ کر سوالات حل کیجیے ــــ"! افتخار سے ہلکی سی سختی ظاہر کی۔

پھر وہ نکہت سے مخاطب ہوا اور مسکراتے ہوے کہا۔

"ہاں تو آپ کیا پڑھیں گی ـــــ"؟

"یہ ــــ"؟ نکہت بظاہر بے تکلف ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے افتخار کے سامنے کتاب سرکاتے ہوے کہا۔

"یہ ــ یہ ــ کیا۔"؟ واللہ زبان کھولیے، لڑکیاں تو بہت باتونی ہوتی ہیں۔"! افتخار نے شوخی سے کہا۔

"جی ہاں! لیکن مردوں سے کم ــــ"! اب شاید موم پگھلنے لگا تھا۔

"بس، صرف اردو ہی پڑھنا ہے ــــ"! شاید وہ عام طالب علم کی طرح اردو میں کمزور تھی۔

"صرف اردو؟ لیکن اور دوسرے مضامین ـــــ"؟ افتخار نے بات کو طول دیا۔

"وہ سب میں تیار کر چکی ہوں ــــ"!

"خیر لائیے! اردو ہی پڑھیے ـــــ"! افتخار نے بھی اردو میں دلچسپی لیتے ہوے کہا۔

افتخار کے پڑھانے کا انداز اور اشعار کی تشریح نکہت کو بے حد پسند آئی ــــ وہ اس سے بے تکلف ہو گی ــــ قریب سے قریب تر ہوتی گئی۔ روزانہ کی قربت اور تنہائی نے ساری پابندیاں دور کر دیں۔ اتوار کی تعطیل نکہت کو مضطرب کر دیتی ہے اور یہی کیفیت افتخار کی ہے۔ نکہت حسین شگوفہ اور افتخار لطیف ہوا کا جھونکا جس کے لمس سے وہ پھول کی طرح کھل جاتی ہے۔

نکہت اور افتخار کا یہ حسین ملاپ زیادہ عرصے تک قائم نہ رہا۔ ان کی خوشگوار زندگی کا شیش محل ایک دن چکنا چور ہو گیا۔ افتخار

بہادر ۵۹۵ء اشک

کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاگیا، وہ مضطرب ہو اٹھا۔ نکہت بھی پیار کی جمنا سے جلتی، تپتی ہوئی ریت پر پھینک دی گئی، زندگی سے اُس کا پھول سا نازک بدن جھلس گیا۔

نکہت کی شادی سرحد پار کے پڑوسی ملک میں ہو رہی ہے۔ افتخار اب حسرت و یاس کی تصویر بنا اپنی محبت کا ماتم کرتا رہا۔ آج کی رات افتخار پر بھاری تھی، اُسے ایک پل چین نہیں مل رہا تھا، اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اور نکہت بے کس، مجبور، اپنی محبت کے شیش محل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنے کی ناکام کوشش میں لگی تھی۔ اس کے لیے زندگی میں اب کوئی کشش نہ تھی۔ ایک ہی ہفتہ میں اس کا شگفتہ چہرہ زرد پڑگیا۔

آج صبح ہی سے نکہت کی ماں سفر کی تیاریوں میں مصروف تھیں، اور بار بار تصویرِ غم نکہت کو دلاسا دے رہی تھیں۔

"بیٹی! تجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ آج تیرے والد مرحوم کی دیرینہ آرزو پوری ہو رہی ہے ——" نکہت کی ماں رندھے ہوئے گلے سے کہہ رہی تھیں۔

نکہت شمع کی طرح جل رہی تھی اور پگھلتے ہوئے موم کی طرح اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ دوسرے دن جب افتخار دفتر پہنچا تو اس کے چہرے پر تفکرات اور غم و یاس کے اثرات تھے

"افتخار صاحب! آج آپ کچھ پریشان ہیں ——" بڑے صاحب نے افتخار کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں! کچھ دنوں سے ذہنی پریشانیاں ہیں ——" وہ ایک جملہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔

"لیکن میں آج تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا ——" بڑے صاحب نے اس کا غم دور کرنا چاہا۔

"کیا ——" افتخار کے خشک گلے سے نکلا۔

"تمہارا دہلی ٹرانسفر ہوگیا ہے، دو چار دنوں میں چلے جانا ——"

بڑے صاحب ایک اور تیر چھوڑ کر اپنے کمرے کی جانب مڑ گئے۔

افتخار نے دو چار دن بھی رہنا مناسب نہ سمجھا اور وہ آج ہی دہلی جانے کو تیار ہوگیا۔ پریشان حالت میں بوجھل قدموں کے سہارے وہ اپنے مکان پر آیا۔

ایک گھنٹہ کے قلیل وقت میں، اس نے اپنا بے ترتیب سامان سوٹ کیس میں ردی کاغذ کی طرح بھرا اور ہولڈال تیار کر کے ایک بار پھر اس کھڑکی پر نظر ڈالی جہاں اس کی محبت پروان چڑھی تھی۔ آج اس کا شیوز یادہ بڑھا تھا۔ اس نے حسرت سے اس برآمدے کو دیکھا جہاں اس کا چاند طلوع ہوا کرتا تھا اور ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح بوجھل قدموں سے نیچے اُترا۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور تانگہ والے کو آواز دی۔

"کہاں چلیں گے صاحب ——" تانگہ والے نے مڑ کر پوچھا۔

"میاں اسٹیشن چلو ——" وہ بے حد مغموم تھا۔

ٹرین آچکی ہے۔ لوگ جوق در جوق اس کی طرف دوڑ رہے ہیں اور افتخار بھی ایک زندہ لاش کی طرح قبر کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

———

اُسے کھڑکی کے پاس ہی جگہ مل گئی ہے۔ اب انجن نے تیز سیٹی دی بالکل اسی طرح جیسے نکہت سے بچھڑنے پر اس کے دل سے روح فرسا چیخ نکلی تھی۔

ٹرین اب ایک جھٹکے کے ساتھ چلنے لگی۔ اس نے پینٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور جیسے ہی اس نے سگریٹ منہ سے لگایا ہے اس کے کانوں میں نکہت کا یہ جملہ گونج گیا "سگریٹ زیادہ نقصان دہ ہے ——" اس نے سگریٹ کا پیکٹ کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور اس طرح کھڑکی سے سر ٹیک دیا جیسے وہ زندہ لاش ہو ——

★

(بنذرِ مومن)

غزل

حفیظ بنارسی

ان کے گیسو جو یونہی سلسلہ جنباں ہوں گے
لوگ دیوانہ صفت داخلِ زنداں ہوں گے

فصلِ گل آئی ہے، پھر جشن کے ساماں ہوں گے
کچھ لہو روئیں گے، کچھ لوگ غزل خواں ہوں گے

اہلِ ساحل سے کہو خیر منائیں اپنی
ہم تو آغوشِ تلاطم میں بھی خنداں ہوں گے

سچ بتا تجھ کو ترے وعدہ و پیماں کی قسم
کبھی ایفا بھی ترے وعدہ و پیماں ہوں گے

تم پریشان نہ ہو، باندھ لو گیسو اپنے
ہم پریشاں تھے، پریشاں ہیں، پریشاں ہوں گے

لاکھ دیوار اٹھائیں یہ زمانے والے
جن کو ہونا ہے نمایاں وہ نمایاں ہوں گے

اب وہ دن دور نہیں دیکھ اے جانِ جفا
میرے آنسو تری پلکوں پہ فروزاں ہوں گے

کب تلک روئے گی انسانیت انسانوں کو
کب تلک خون سے مقتل میں چراغاں ہوں گے

ہم تناہی اُنکے دامن کا تعاقب ہوگا
آپ دیوانوں سے جس درجہ گریزاں ہوں گے

ہم نے جس خاک سے نشو و نما پائی ہے
خاک ہو کر ہم اسی خاک میں پنہاں ہوں گے

چومیں گے پائے صنم جوشِ عقیدت میں حفیظ
اے خوشا وقت کہ ہم لوگ مسلماں ہوں گے

(بنذرِ غالب)

غزل

افتخار احمد فخرؔ دھلیاوی

راز داں کوئی ہر اک دشمنِ جانی مانگے
عشق سی زندہ حقیقت بھی کہانی مانگے

خواب رنگیں بھی ہر رات سہانی مانگے
اسی کافر کے خد و خالِ جوانی مانگے

ہے عجب طرفہ تماشا یہ جراحت طلبی
روز اک زخم نیا، سوزِ نہانی مانگے

وا ہوئے وہ لبِ تقریر، وہ غنچے چٹکے
حیرتِ آئینہ ـــ اعجاز بیانی مانگے

جوشِ گریہ ہے، شبِ ہجر ہے، دل افسردہ
کس کا دامن یہ مری اشک فشانی مانگے!

باغباں! سنبل و سوسن کی خبر لے، ورنہ
نظمِ گلشن نہ کہیں ریشہ دوانی مانگے

سخت جاں ایسا زمانے میں نہ ہوگا ظالم
کشتۂ غم، کہ تری تیغ کا پانی مانگے

چشمِ خونناب فشاں سے وہ کشیدہ دامن
دلِ پُرخوں کہ محبت کی نشانی مانگے

تیزیِ تیغِ جفا فرض ادا کر اپنا
خون کی موج جو خنجر کی روانی مانگے

سخنِ گرم بجز آتشِ غم ناممکن
فخرؔ! افسانۂ دل شعلہ بیانی مانگے

(مزاحیہ)

پبلک ریڈنگ روم

علی عباس امید

جی ہاں! پبلک ریڈنگ روم۔

سڑک کے کنارے یا گلی کے موڑ پر جہاں کہیں بھی آپ کو کسی کمرے نما عمارت میں سستے غلے کی دکان یا سینما کی ٹکنگ جیسی بھیڑ نظر آئے تو سمجھ لیجیے کہ وہی پبلک ریڈنگ روم ہے۔ اسے "عوامی دارالمطالعہ" بھی کہتے ہیں۔ لیکن اس ترقی پسند دور میں "پبلک ریڈنگ روم" ہی مستعمل ہے۔ اور اگر کوئی عوامی دارالمطالعہ کہتا ہے تو سمجھ لیجیے اس کا تعلق قطعی پچھلی صدی سے ہے۔ خاکسار کو چونکہ "رجعت پرست" کے لقب سے ازلی بَیر ہے، اس لیے پبلک ریڈنگ روم کہنا ہی مناسب سمجھتا ہے۔ ایک وجہ اور بھی ہے۔ کچھ دن ہوئے میرے ایک دوست نما ملنے والے نے "دارالمطالعہ" کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "وہ جگہ جہاں مطالعہ کو دار سے دوچار ہونا پڑے"۔ ایک بار میرا مطالعہ بھی دار سے ہم کنار ہو چکا ہے، اس لیے اس تعریف پر ایمان رکھتا ہوں اور دارالمطالعہ کی بجائے ریڈنگ روم کہنا ہی موزوں اور سودمند سمجھتا ہوں۔

ویسے تو آپ میں سے بیشتر حضرات نے آتے جاتے ان کی زیارت کی ہوگی لیکن میں یقین کی بلندی پر استادہ ہو کر کہہ سکتا ہوں کہ ان کے متعلق پوری واقفیت بہت ہی کم لوگوں کو ہوگی۔ جس طرح ادب، سیاست، مذہب حتیٰ کہ محلہ سدھار کمیٹی تک کے کچھ ٹھیکیدار ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح ان ریڈنگ روموں پر بھی کچھ لوگوں کی "اجارہ داری" ہوتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہاں لوگ آسانی سے کسی کو مردِ میدان نہیں مانتے۔ اپنا لوہا منوانے کے لیے سچ مچ کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔

یہاں آنے والوں کو تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اوّل وہ لوگ جنھیں غیر فطری طور پر مطالعہ کا شوق ہوتا ہے۔ دوم وہ حضرات جو بھولے بھٹکے اس وادی میں آ نکلتے ہیں اور تیسری اور عظیم ترین قسم ہے پیشہ ور پڑھنے والوں کی۔ چونکہ اس تقسیم میں حضرت استعارہ کا عمل دخل ہے، اس لیے تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔

قسم اوّل میں عام طور پر پنشن یافتہ بزرگ آتے ہیں۔ چونکہ اپنی زندگی کا مشن پورا کر چکے ہوتے ہیں اس لیے ان کے پاس وقت ہی وقت ہوتا ہے۔ چنانچہ وقت گزاری کے لیے یہ مطالعہ کی عادت ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعد کو یہ کوشش چسکے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ ہر طرح کی چھپی ہوئی چیز (لٹریچر کی کوئی قید نہیں) کا مطالعہ کرتے ہیں، کھانستے ہیں اور بار بار تھوکنے کے لیے اٹھتے ہیں، بلکہ بعض تو نظریں بچا کر میز کے نیچے ہی بلغم پھینکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان خامیوں کے باوجود اُن میں سے بیشتر میں اکلوتی خوبی بھی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ایک ہی کتاب یا اخبار پر قناعت کر لیتے ہیں۔ ویسے بھی تر لگے ہوئے اخباروں اور رسالوں کے پیچھے بھاگنا ان کے بس کے باہر ہوتا ہے، اس لیے ان کے جذبۂ قناعت میں خوبی سے زیادہ مجبوری و بے بسی کو دخل ہوتا ہے۔ یہ لوگ "یہیج آمدنہ رسد گزشتہ تنہائی زا" کا ورد کرتے ہوئے بغیر موضوع اور مواد دیکھے کوئی چیز اٹھا لیتے ہیں اور اونگھ اونگھ کر اس میں مذہب و فلسفہ

تلاش کرتے ہوئے طولِ شبِ فرقت سے بھی کئی گنی بڑی مدت گذارنے کی کوشش میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اُس وقت تک مراقبے میں رہتے ہیں جب تک کہ نگراں ان کا شانہ پکڑ کر صورِ اسرافیل نہ پھونک دے۔ ویسے عام خیال ہے کہ یہ حضرات . . . . . بے ضرر ہوتے ہیں۔

دوسری قسم ہے کبھی کبھی آنے والوں کی۔ ایسے لوگ عام طور پر کسی خاص ضرورت کے تحت ہیں۔ ان کی حالت مضحکہ خیز ہونے کے ساتھ ہی قابلِ رحم بھی ہوتی ہے۔ یہ چونکہ ہر روز نہیں آتے اس لیے اجنبیت محسوس کرتے ہیں اور چھین جھپٹ سے بھی گریز کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر بیکار ہوئے تو کسی مخصوص اخبار کا "دیکھنی کالم" دیکھنے، اگر اسٹوڈنٹ ہوئے تو کسی نئی فلم کی تفصیلات یا اپنے محبوب ستارے کی ولدیت، تاریخ پیدائش اور کامیاب و ناکامیاب رومانوں کے اعداد و شمار پر مزید ریسرچ کے خیال سے مواد اکٹھا کرنے اور اگر ادیب ہوئے تو اپنی تازہ مطبوعہ تخلیق کی اکیسویں بار زیارت کرنے کے لیے اِن ریڈنگ روموں میں آجاتے ہیں۔ یہاں کی خصوصیت بلکہ طرۂ امتیازی ہے کہ کبھی کوئی چیز خالی نہیں ملتی۔ یہ حضرات کسی خاص پرچے کو دیکھنا چاہتے ہیں اِس لیے اُس کے خالی ہونے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اگر آنکھ کھلنے کے بعد کسی "آٹھ سو چالیس" کا دیدار کیے ہوئے ہوتے ہیں تو بعد از خرابیِ بسیار وہ پرچہ انھیں مل جاتا ہے، ورنہ مایوس ہو کر واپس لوٹنا تو روزِ ازل کے پیشتر ہی سے ان کا مقدر ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ خوفناک بلکہ بعض اوقات تو خطرناک بھی ہوتی ہے تیسری قسم، یعنی ہمیشہ در پڑھنے والے۔ یہ ریڈنگ روم کو اپنی خاص الخاص ملکیت سمجھتے ہیں اور اس لحاظ سے وہاں کی اچھی بُری، نئی پرانی ہر چیز پر اپنا قبلِ پیدائش کا حق مانتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انھیں کے ہنگاموں پر ریڈنگ روموں کی رونق موقوف ہوتی ہے۔ انھیں پڑھنے کا جنون ہوتا ہے۔ چنانچہ انسانیت، شرافت، تعلقات جیسی فرسودہ باتوں کو بالائے طاق رکھ کر ہر اخبار و رسالہ کو اس کے نام اور تاریخ اشاعت سے لے کر پرنٹر اور پبلشر تک پڑھنا اپنا فرضِ آخری سمجھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ریڈنگ روم کھلنے کے قبل آکر بند ہونے کے بعد واپس جاتے ہیں۔ سرِ دست جو پرچہ یہ پڑھنا چاہتے ہیں، اگر وہ کسی اور کے ہاتھ میں ہُوا تو وہ اس کی بغل کی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں اور اگر بغل کی کرسی خالی نہ ہوئی تو پشت پر کھڑے ہو کر اپنی آنکھیں پڑھنے والے کے چہرے پر یا سر پر گاڑ دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے سانسوں کے نشتروں کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہونے کے بجائے پڑھنے والا وہ پرچہ ان کے حوالہ کر دیتا ہے اور یہ بغیر شکریہ کہے ہوئے فاتحانہ شان سے کسی کرسی پر ڈٹ جاتے ہیں۔ جو لوگ اتنے خوش اخلاق نہیں ہوتے، وہ اخبار حاصل کرنے کے لیے دوسرا طریقہ اپناتے ہیں۔ وہ کوئی اخبار یا رسالہ اٹھا کر پڑھنے والے کے پاس جاتے ہیں اور اپنا پرچہ اسے دے کر اس کے ہاتھ کا پرچہ مانگتے ہیں۔ اب وہ لاکھ کہے کہ چند منٹوں میں پڑھ کر دیے دیتا ہوں، لیکن اُن کا ضد نما اصرار کم نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بگڑنے دل ان کی تحریکش کے بعد بھی پڑھنا جاری رکھے تو تضیعِ اوقات کے سوا کچھ نہ ہوگا، کیونکہ ان کے اصرار اور اخبار کے جملوں سے مل کر جو معجون مرکب تیار ہوتا ہے، اُسے کھانے والے کو نہ تو سکون ہی ملتا ہے نہ وہ صالِ خبر کی راہیں ہموار ہو پاتیں۔ ایک مثال اس کیفیت کو بخوبی واضح کر دے گی۔

نئی دہلی . . . . : ذرا یہ اخبار مجھے دیجیے گا . . . . . .
گاندھی جی کے قتل کی چھان بین کرنے کے لیے نئے کمیشن . . . . . . :
آپ یہ اخبار پڑھیے۔ اس کی خبریں زیادہ مستند ہوتی ہیں . . . . . کے قیام کی تجویز کو ناکام بنانے کی غرض سے طاقتور . . . . ذرا عجلت میں ہوں . . . . . . سیاسی لوگ اور مالی مفاد رکھنے والے عناصر راج دھانی میں اپنے تمام . . . : . . . آپ بعد میں پڑھ لیجیے گا . . .
. . . : . . . اثر و رسوخ کو بروئے کار لا رہے ہیں . . . . : . . . . . آپ کچھ بہرے ہیں کیا؟ اتنی دیر سے کہہ رہا ہوں کہ یہ اخبار مجھے دیدیجیے . . .
. . . . . . پاٹھک کمیشن اپنی تحقیقات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے ہی والا تھا اور . . . . . اور . . . . یا منظہر العجائب۔ اخبار ہے یا خبر دل کے غائب۔

اخبار حاصل کرنے کا ایک طریقہ اور بھی ہے۔ اسے کسی قدر مہذب

میجر دھیان چند یو پی کے گورنر
شری اکبر علی خاں کو اپنے دستخط
کر کے ایک ہاکی اسٹک پیش کر رہے ہیں

میجر دھیان چند کو سنٹرل
اسٹیڈیم میں
۲۴ جولائی کو گارڈ آف آنر
پیش کیا جا رہا ہے

گورنر اتر پردیش شری اکبر علی خاں، ۲؍جولائی کو گاندھی بھون میں منعقد قدرتی طریقۂ علاج نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے۔

شری اکبر علی خاں، گورنر اتر پردیش ۲۱ جولائی ۱۹۷۳ء کو دھان بھون لکھنؤ میں نہری باندھ کنٹرول بورڈ کے جلسے
خطاب کرتے ہوئے
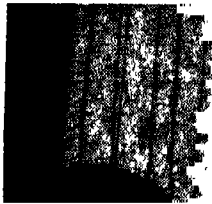
کا لقب دیا جاسکتا ہے۔ کچھ لوگ جو اتنے ڈھیٹ نہیں ہوتے بہت ہی شرافت سے پڑھنے والے کے پاس آتے ہیں۔ چند منٹ مع اخبار کے اس کے سراپا کا جائزہ لیتے ہیں۔ پھر اپنے اوپر سوگ نما معصومیت طاری کرکے آہستہ سے کہتے ہیں "ذرا بیچ کے صفحات مجھے دے دیجئے گا۔" اگر اس نے کہا کہ "ابھی میں خود ہی نہیں پڑھ سکا ہوں" تو یہ کنارے کے صفحات مانگ لیتے ہیں۔ بہر حال بغیر لیے ٹلتے نہیں۔

کچھ لوگوں کو دوسروں کو سُنانے اور پڑھنے کے ساتھ ہی فوری تبصرہ کا خبط ہوتا ہے۔ یہ بہت ہی خطرناک مرض ہے اگر خوش قسمتی سے آپ کو کوئی اخبار مل جائے اور اس کے لیے کوئی جان کی بازی لگا کر بیٹھا ابھی نہ ہو تب بھی ایسے مریض پڑھنا ناممکن کر دیتے ہیں، کیونکہ یہ ہر لمحہ اپنی طرف متوجہ کرکے سب کچھ اُچک اُچک کر آپ کے دماغ میں انڈیل دینا چاہتے ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہے کہ سُنانے کا مرض زیادہ خطرناک ہوتا ہے یا تبصرہ کرنے کا۔ کسی کو فوقیت نہیں دی جا سکتی ہے۔

پہلی قسم کے یعنی تبصرہ کرنے والے مریض خود ہی پڑھتے ہیں اور خود ہی تبصرہ شروع کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی نکتہ الجھ گیا (جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے) تو یہ بغل والے سے اُسے سُلجھانے کی استدعا کرتے ہیں۔ اگر اُن کے قوی اصرار سے مجبور ہو کر اپنی شامت کو دعوت دیتے ہوئے اس نے جواب دے دیا تو سمجھ لیجیے کہ قیامت کب کی پورے ریڈنگ روم کے علاوہ اس کے جسم پر بھی آگئی، کیونکہ اس کے خیال سے اُن کے متفق ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا یہ زبان کے ساتھ ساتھ جسم کے دوسرے حصّوں کو بھی حرکت میں لا کر اس کی تردید اور اپنی تائید میں بے سر و پا دلائل پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اب وہ بے چارہ لاکھ سمجھائے، معافی مانگے، اپنی عزّت کے علاوہ ان کی بے عزّتی کا بھی واسطہ دے لیکن یہ کسی طرح، کسی بھی شرط پر خاموش ہونے کے نہیں۔ اپنی علمیت کا مظاہرہ کرنے کے لیے ہندستان و پاکستان کے علاوہ ایران و توران کی بھی ہانکتے رہیں گے۔ اگر ان کے خلاف باجماع احتجاج ہو گیا تو ممکن ہے کہ آپ زبان کو لگام دے دیں ورنہ آخر تک حلق کو گردش ہی میں رکھتے ہیں۔ ایسے مواقع پر کبھی کبھی تو باقاعدہ دو گروپ بن جاتے ہیں اور وہ مسئلہ بجائے اصل کے ریڈنگ روم کی وسعت سے آنکھیں چار کرنے لگتا ہے۔

دوسرا مرض یعنی سُنانے والا بھی اسی پائے کا ہے۔ آپ کچھ بھی پڑھ رہے ہوں، سامنے، بغل یا پُشت سے کوئی صاحب بار بار آپ کو مخاطب کرکے خبریں سنانا شروع کر دیں گے۔ آپ کتنا ہی کہیں کہ اخبار آپ کا دیکھا ہوا ہے لیکن ان کی شفقت قطعی کم ہونے کی نہیں۔ اکثر پرانے اخبار دیکھنے والے تو دو ہزار مرتبہ کی دیکھی ہوئی گھسی پٹی خبریں سنانے لگتے ہیں۔ مخاطب کتنا ہی سمجھائے جو اطلاع ان کے لیے نئی ہے وہ کئی ماہ قبل دس پیسے سے لے کر پچیس پیسے تک کے سبھی اخبارات دے چکے ہیں۔ مگر وہ اپنے خنجر بکف خلوص کو کسی طرح مجروح نہیں ہونے دیتے اور "حالات حاضرہ" سے ہر خاص و عام کو باخبر رکھنے کا جو بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں اس پر عمل کرتے ہوئے کہتے ہیں "لیجیے سنیئے! ایک عورت نے ایک ساتھ پانچ بچوں کو جنم دیا۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ آپریشن شدہ تھی۔" اب آپ اپنے بچاؤ کے خیال سے ان سے کہیں گے: "حضرت وہ تو تین ماہ قبل کا واقعہ ہے۔ مزید اطلاع کے لیے عرض ہے کہ پانچوں بچے یکے بعد دیگرے ہفتہ بھر کے اندر ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے تھے۔" لیکن وہ اپنی بات جاری رکھیں گے "واللہ صاحب کمال ہے سبحان اللہ خالق سے کہیں مخلوق ٹکر لے سکی ہے۔"

آپ شاید سمجھیں کہ یہ ذہنی اختراع ہے لیکن بقول حضرت جوش "کیا اس کو علم جس پہ یہ بپتا پڑی نہیں"۔ لیجیے آپ بیتی سُناتا ہوں۔ درسِ عبرت لینا دینا آپ کا کام ہے۔

ہوا یوں کہ آل انڈیا ریڈیو کی جانب سے سکّے کی قیمت گھٹنے پر مقالہ پڑھنے کی دعوت ملی۔ وقت تنگ ترین تھا اور موضوع اہم۔ میں نے سوچا کہ انفارمیشن سینٹر سے کچھ مواد مل جائے گا۔ چنانچہ آنے والے وقت ناہنجار سے بے خبر وہاں پہنچ گیا۔ انچارج نے اس موضوع پر مجھے ایک کتاب دی اور میں نے ایک کرسی سنبھال لی۔ بغل کی کرسی پر ایک بزرگ کوئی اخبار دیکھ رہے تھے۔ اخبار کی رنگت بتا رہی تھی کہ وہ کافی عرصہ پہلے وجود میں آیا تھا۔ ابھی میں کتاب کھولنے کا قصد ہی کر رہا تھا کہ وہ بولے۔

"برخوردار! کیا یہ اطلاع صحیح ہے کہ ا ونتھا نٹ کو ایک لاکھ روپوں کا نہرو انعام ملا ہے؟"

میں نے خوردی کی انتہا کو پہنچ کر جواب دیا "جی ہاں"

میں نے سوچا ہی بہتر سمجھا چنانچہ آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بھی سانس برابر کرنے لگے۔ لاحول پڑھ کر میں نے ورق گردانی شروع کی کتاب موضوع کے مطابق تھی اس لیے توجہ سے پڑھنے لگا۔ ایک پیراگراف بھی نہ پڑھ پایا تھا کہ انھوں نے خاموشی پر تلا ہوا وار کیا۔ "میں تو کہتا ہوں کہ یہ آج کل کے اخبارات بھی بالکل ناکارہ ہو گئے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ یہ بھی کوئی خبر میں خبر ہے کہ اندرا گاندھی نے قحط زدہ علاقوں کا دورہ کیا۔ بلا وجہ اتنی جگہ برباد کر دی۔ کچھ نہیں تھا تو طوطا مینا یا آرائش محفل ہی سے کچھ نقل کر دیتے، اس قسم کی کوئی قاعدے کی چیز چھاپ سکتے تھے۔ میاں، میں تو کہتا ہوں کہ یہ سب ذہنی کھوکھلے پن کا نتیجہ ہے۔ ایک ہمارے زمانے کے اخبارات ہوا کرتے تھے۔ اگر ایک پرچہ پڑھ لو تو روح شاد و آباد ہو جائے۔ سبحان اللہ کیا ترتیب ہوتی تھی! ابھی مدیر کا سفرنامہ پڑھ رہے ہیں، ابھی کسی شاعر کا ذوق پرور کلام، اس سے ذرا نگاہیں ہٹیں کہ بڑے دوا خانے کا دلچسپ اور باتصویر اشتہار، صفحہ پلٹا اور دنگل کی منظوم رپورٹ۔ کیا کیا بتاؤں؟ کوزے میں دریا نہیں، سمندر بند کر دیتے تھے۔ مدیر کے دونوں ہاتھ چوم لینے کو دل چاہتا تھا۔" جب میں نے دیکھا کہ بغیر اسٹیم کا انجن کوئلہ پانی لینے کے موڈ میں بھی نہیں ہے، تو مجبوراً جسارت کی انگلی پکڑ کر گزارش کی: "قبلہ! ایک اہم مضمون کے سلسلے میں مجھے کچھ معلومات فراہم کرنی ہیں۔ لہذا کچھ دیر خاموشی سے پڑھنا چاہتا ہوں۔" اور اس لمحے واقعی میں ان کی شرافت کا قائل ہو گیا، کیونکہ میرا جملہ مکمل ہونے کے قبل ہی اُن کی نگاہیں اخبار کی کسی خبر کو جذب کرنے میں مشغول ہو چکی تھیں۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ آئی اگر اتنی آسانی سے ٹل جائے تو وہ گئی کہلانے لگے۔ چند ہی منٹوں بعد وہ بولے: "ارے یہ سردار عکم سنگھ گورنر ہو گئے!" میں خاموش رہا۔ تھوڑے توقف کے بعد پھر گویا ہوئے: "اچھا اب راجستھان کی اسمبلی کا اجلاس اپریل میں ہو رہا ہے۔"

میں اب بھی خاموش رہا۔ ذرا لمبے وقفے کے بعد انھوں نے پھر کہا: "واقعی جے پرکاش نرائن سیدھا اور سچا آدمی ہے ہمیشہ حق بات کہتا ہے۔" میں نے دہرایا تو عمل سابق ہی، لیکن اب کی آفت گویا کمربستہ کھڑی تھی۔ میری طویل خاموشی سے اکتا کر انھوں نے میرا شانہ ہلایا اور آہستہ سے دریافت کیا: "قیامت کو کتنے دن باقی ہیں"؟

میں نے نسبتاً بلند آواز میں کہا: "اس کا علم تو آپ ہی کو بہتر ہو سکتا ہے۔"

وہ تلخی کو پس پشت ڈال کر بولے۔ "اب یہ دیکھو خبر ہے کہ ایک نو بچوں والی عورت اپنے شوہر کو قتل کر کے محبوب کے ساتھ فرار ہو گئی، یہ زوال کی حد نہیں تو اور کیا ہے"؟

سخت غصے کے باوجود میں نے حضرتِ ضبط کا دامن پکڑ کر کہا: "میں نے عرض کیا نا کہ مصروف ہوں" پانی اُن کے سر کے برابر پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ وہ نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر اور سر کو جنبش دے کر بولے: "یہی تو ادبار کا خاص سبب ہے۔ صاحب زادے، ایک ہمارا زمانہ تھا۔ بزرگوں سے گفتگو کرنا تو کجا ان کے پاس بیٹھنا بھی باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ آج تو تہذیب سرے سے دفن ہو چکی ہے۔ نہ حفظِ مراتب کا خیال نہ بزرگی کا پاس۔ جانور سے بدتر انسان ہونے لگے ہیں۔ تم مہذب ہو؟ انسان ہو؟ پڑھے لکھے، تہذیب یافتہ ہو؟ میاں، اپنا نہیں تو شیروانی کا خیال رکھا کرو۔ تم سے بدرجہا بہتر تو وہ جاہل ہوتے ہیں جو بڑے چھوٹے کے فرق کو سمجھتے ہیں۔...!"

ان اعزازات کے ساتھ ہی میں نے وہ کرسی چھوڑ کر بالکل کونے کی کرسی سنبھال لی۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ میں بدمزگی کے باوجود خوش تھا کہ کم از کم اب پڑھنے کو مل جائے گا۔ ابھی دو ہی چار لائنیں پڑھ پایا تھا کہ ایک صاحب زادی نما صاحب زادے کوئی فلمی پرچہ ہاتھ میں لیے میرے برابر والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے سوچا کہ یہ تکلیف دِہ نہیں ہوں گے کیونکہ میری شیروانی اور دبیز عینک میرے غیر فلمی مذاق کا مکمل اشتہار تھی، اور واقعی ہوا بھی ایسا ہی! میں پورا ایک صفحہ پڑھ گیا لیکن خاموشی رہی۔ دوسرا صفحہ پلٹنے کا قصد ہی کر رہا تھا کہ انھوں نے غصہ میں بھر کر مجھے مخاطب کیا: "دیکھتے ہیں آپ بدمعاشی۔ اس کمبخت نے لکھا ہے کہ سائرہ سے شادی کرنے کے بعد دلیپ فلموں

میں کام نہیں کرے گا۔" آگے لکھتا ہے کہ "ربع شر کے خیال سے میں نے کہا: جانے دیجیے وہ ان کا اپنا خیال ہے۔ اس کا مقصد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

لیکن میرا جملہ مکمل ہونے کے قبل ہی انھوں نے مجھے سمجھایا: "یہ خیال نہیں صاحب، یہ کھلم کھلا دشمنی ہے۔ میں آپ کو بتاؤں، چونکہ اور کوئی اس کے مقابلہ میں آتا نہیں، اس لیے اُسے ڈاؤن کرنے کی باجماعت کوشش ہو رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اور وہ نہ جانے کیا کیا بکتے رہے۔ میں اپنی کتاب میں گم ہو گیا۔ مجھے غافل پاکر انھوں نے خاموشی کا دامن پکڑا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں میرا ہاتھ دبا کر دبے دبے جوش سے بولے "اب آگیا۔" میں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا، لیکن کوئی نیا چہرہ نظر نہ آیا۔ جب ان سے استفسار کیا تو وہ اُسی مسرت سے پھوٹتے ہوئے بولے "اب آگیا!" بات چونکہ معمے کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی، اس لیے میں نے وضاحت چاہی۔ میرا "کیوں" کہنا تھا کہ انھوں نے میری ناواقفیت پر زبردست قسم کا زبانی ماتم شروع کر دیا۔ پھر بڑی فاتحانہ بلکہ عالمانہ شان سے مطلع کیا۔ "ایک فلم آ رہی ہے "پتی پتنی" اس میں محمود جانی واکر اور ادوم پرکاش ایک ساتھ آئے ہیں لاجواب فلم ہوگی۔ قہقہوں کا سیلاب ہوگا۔ لوگ کئی پشتوں کے غم بھول جائیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

چونکہ وہ پشتوں کی تفصیل بتانے کے موڈ میں آچکے تھے۔ لہٰذا میں نے فدویانہ انداز میں گذارش کی "معاف کیجیے گا میں فلمیں نہیں دیکھتا۔ چونکہ مجھے اُن سے کوئی دل چسپی نہیں ہے، اس لیے واقفیت بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔" میرے اس جملے پر انھوں نے مجھے سر سے پیر تک کچھ اس انداز سے گھور کر دیکھا جیسے شہر کے بعض رنگر وٹ کسی سیدھے سادے دیہاتی کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ آیا وہ بھی انسانوں ہی کی کوئی قسم ہے۔

اُن کی نظروں سے بے پروا میں کتاب پڑھنے میں منہمک ہو گیا۔ مشکل سے دس منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک بھرپور ہاتھ میرے شانے پر پڑا۔ کتاب میرے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین بوس ہو گئی اور میں "یا غیر یا وحشت" کہہ کے اُچھل پڑا۔ اب جو دیکھا تو ان کا چہرہ رشکِ آتش کدہ ہو رہا تھا۔ ہونٹ تازہ ذبیحے کی طرح پھڑک رہے تھے۔ اور آنکھیں شعلے اور دھوئے تباہ کن مادے اگلنے میں مصروف تھیں۔ میں نے سہم کر دریافت کیا "حضرت کیا خطا سرزد ہو گئی مجھ سے؟"

انھوں نے نہایت ہی ترش روئی سے جواب دیا: "آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ میں تو اس نامعقول رسالے اور اس کے چھاپنے والوں کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ ساری کی ساری باتیں غلط اور بے بنیاد چھاپی ہیں۔ اب یہی دیکھیے لکھتے ہیں کہ "دیوآنند ۲۶ جنوری ۱۹۲۳ء کو ریداس پور میں پیدا ہوا تھا، حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ اس کی پیدائش ۲۶ ستمبر ۱۹۲۳ء کو گورداس پور میں ہوئی تھی۔

میں نے مجسم عاجزی بن کر دست بستہ عرض کیا: "آپ بجا فرماتے ہیں۔ خاکسار تو اس میدان میں دُلکی چلنے کے قابل بھی نہیں ہے۔" چونکہ وہ بڑھ کر کافی متنفر ہو چکے تھے اور اس سلسلے میں شاید کچھ غیر مناسب اقدامات بھی کرنے والے تھے، اس لیے فوراً ہی اُٹھ کر چلے گئے۔

میں نے معبودِ حقیقی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا (اس لیے نہیں کہ وہ حضرت دفع ہو گئے تھے۔ بلکہ اس لیے کہ اُس نے میرے درجنوں گناہوں کا عذاب عاقبت کے بجائے دنیا ہی میں مجھ پر نازل کر دیا تھا) مطمئن ہو کر میں نے کتاب کھول لی۔

کوئی دس منٹ گزرے ہوں گے کہ اُسی کرسی پر ایک خاصے شریف آدمی (صورت سے) کئی رسالے بغل میں دبائے ہوئے آکر بیٹھ گئے۔ میں بدستور پڑھنے میں مشغول رہا۔ چند منٹوں بعد انھوں نے پہلو بدل کر کنکھیوں سے مجھے دیکھا، لیکن میری محویت کی تاب نہ لاکر اپنے رسالے کی طرف پلٹ گئے۔ کچھ سکنڈ بعد انھوں نے کھنکھارا، لیکن میں حسبِ سابق محو رہا۔ آخر کچھ سمجھ کر بولے: "ذرا ایک بات بتائیے گا۔"

اخلاق کو بے نقط سُناکر مجھے کہنا پڑا: "فرمائیے!"

انھوں نے کہا: "یہ نقش کا تازہ شمارہ ہے۔ اِس میں ڈاکٹر حسین عباس عابدی صاحب رقم طراز ہیں کہ جدید شاعری ۱۹۳۶ء کے بعد شروع ہوئی لیکن میرا خیال ہے کہ مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے "تاروں بھری رات" لکھ کر اس کی ابتدا کی تھی۔ بتائیے آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے بات ختم کرنے کے خیال سے کہا: "ہر نسل اپنے دور میں جدید ہوتی ہے، لہٰذا کسی ایک کو افضلیت دینا مناسب نہیں۔"

وہ بولے: "ویسے تو کسی حد تک میں بھی آپ سے متفق ہوں لیکن

بہادر ۱۹۹۵ء

یہاں . . . . . یہ میری نظریں چونکہ کتاب پر واپس پہنچ چکی تھیں اس لیے مجبوراً انھیں بھی ہونٹ بند کرنے پڑے۔

دفعتاً ایک ٹھوکے نے مجھے کئی انچ اوپر اچھال دیا۔ وہ فرما رہے تھے۔ "یہ بھی کوئی شاعری ہے، فن نام کی کوئی چیز نہیں۔ تخیل سرے سے ندارد، جاذبیت خواب و خیال سے بھی پرے۔ اب دیکھیے یہ کیا نظم ہوئی۔ دو بے تکے مصرعے لکھ کر "عنقا" کا عنوان دے دیا ہے۔

سائنس کے کھمبے پہ چڑھ کر زندگی ڈھونڈتی ہے آسمانوں پر خوشی
یہ سب بھٹکے ہوئے ذہنوں کی پیداوار ہے۔

میں نے پھر تائید کرنے ہی میں اپنی بہتری دیکھی۔ نہ جانے کیوں وہ پڑھنے میں مشغول ہو گئے (اور مجھے خوش فہمی ہو گئی کہ بات ختم ہوئی)

یکایک انھوں نے بغیر کسی تمہید کے نیم دیوانگی کے عالم میں مجھے جھنجھوڑ ڈالا "دیکھیے اسے کہتے ہیں شاعری۔ یہ ہے فن۔ واہ، واہ، سبحان اللہ! کیا نظم لکھ دی ہے۔ آپ شاید نہ جانتے ہوں علی عباس اُمید کو۔ بڑے بڑے لوگ اُس سے ملنا فخر سمجھتے ہیں لیکن میرا تو اُس سے یارانہ ہے۔ بہت ہی آزاد اور مخلص آدمی ہے۔ غازی پور کا رہنے والا ہے۔ آہاہاہا ظالم کیا شاعری کرتا ہے۔ ہاں تو اس نے کبھی برابر ہی نہیں کیے۔ لیکن شعر ایسے کہتا ہے کہ دل میں اتر جائیں۔ داد کے ساتھ ہی دُعا نکلے۔ یہ اس کی نظم ہے، دیکھیے یہ بھی جدید ہے لیکن کیا فن ہے۔ عنوان ہے "پاسِ وفا"۔ لکھتا ہے "منزلِ دل سے بہت دور امیدوں سے پرے"۔

میں نے مؤدبانہ عرض کیا "میں پڑھ چکا ہوں" وہ کچھ مایوس سے ہو گئے۔ پھر بھی ہمت نہ ہارے۔ بغل سے دوسرا رسالہ نکال کر بولے۔ "خیر، لیکن میرا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی یہ غزل آپ نے قطعی نہ دیکھی ہوگی" اور شروع ہو گئے۔

اب برداشت کی حد کے آگے بھی انقلاب آ چکا تھا۔ چنانچہ میں آہستہ سے اُٹھ گیا۔ دروازہ کے قریب پہنچ چکا تھا کہ انھوں نے شعر مکمل کر کے داد طلب نظروں سے کرسی کی طرف دیکھا لیکن اسے خالی پایا تو جھنجھلا کر بولے "نامعقول جاہل"۔

★

غزل

جوالا پرشاد نگم روشؔ لکھنوی

فریبِ رنگ و بو سمجھیں مزاجِ باغباں دیکھیں
بہاروں میں سلیقے سے بہارِ گلستاں دیکھیں

سلیقہ دیکھنے کا ہو تو جلووں کو عیاں دیکھیں
مکاں سے لامکاں تک ہم نشانِ بے نشاں دیکھیں

شبِ تاریکیِ ہجراں کہ نیرنگِ جہاں دیکھیں
حدِ مقدور میں جو کچھ دکھائے آسماں دیکھیں

ابھی کچھ اور سجدوں کو درخشاں ہم کو کرنا ہے
جبیں کا جائزہ لے لیں تو ان کا آستاں دیکھیں

کششِ اتنی تو پیدا ہو مرے ذوقِ عقیدت میں
ترے جلووں کو ہم دیکھیں جدھر دیکھیں جہاں دیکھیں

محبت پیشِ خیمہ بدگمانی کا نہ بن جائے
ذرا ماحول کو دیکھیں فضائے آسماں دیکھیں

مرے سجدوں میں جذب و کیف آ جائے تو کیا کہنا
جبیں سے اپنی وابستہ تمھارا آستاں دیکھیں

تعین کے بہت بھاری ہیں پردے کاش اٹھ جائیں
تو جلووں کو ترے قلب و نظر کے درمیاں دیکھیں

بہت دشوار منزل ہے بڑی پُر پیچ راہیں ہیں
کہاں تک ساتھ دیتی ہے روشؔ عمرِ رواں دیکھیں

حسنِ نظر

(قارئین کے تاثرات بابتہ احتشام نمبر)

مسیح الزماں (الہ آباد)

نیا دور کا احتشام نمبر ملا۔ آپ نے بڑی محنت اور سلیقے سے یہ شاندار نمبر نکالا ہے۔ مرحوم کی شخصیت اور ادبی مرتبے پر اتنے مضامین اکٹھا کرنا آپ کے اثر و رسوخ کے ساتھ مستقل مزاجی اور پامردی کی بھی دلیل ہے۔ مختلف تصویروں کے ذریعہ آپ نے مرحوم کی زندگی کے متنوع پہلو پیش کیے ہیں اور اسے ان کی زندگی کا مرقع بنا کر سامنے رکھا ہے تاکہ قلمی اور کیمرے کی تصویروں سے ان کا نقش صورت پذیر ہو جائے۔ اگرچہ ان کی ہمہ جہت شخصیت کے بہت سے پہلو اب بھی چھوٹے ہوئے ہیں پھر بھی آپ کی سعی مشکور ہے اور آپ کو مطمئن ہونا چاہیے کہ آپ کی ان تھک کوششیں ایک حسین و جمیل مرقع کی صورت میں ظاہر ہوئی ہیں جو یادگار رہے گا۔

وارث کرمانی (علی گڑھ)

نیا دور کا احتشام نمبر موصول ہوا۔ ملتے ہی تقریباً سب پڑھ ڈالا۔ اتنا اچھا جامع اور متوازن نمبر نکالنے پر آپ واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ مرحوم کی زندگی، شخصیت اور ان کی علمی و ادبی خدمات کی مکمل تصویر سامنے آگئی۔ یہ نمبر عرصۂ دراز تک تاریخ ادبیات اردو میں اپنی اہمیت قائم رکھے گا اور آنے والی نسلوں کو اس عہد کے ایک عظیم دانشور کے متعلق تفصیل سے معلومات حاصل ہوتی رہیں گی۔

نجم الدین نقوی (رامپور)

آج جب نیا دور کا احتشام نمبر ملا تو بے ساختہ زبان سے نکلا ع

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

جیسی شخصیت تھی ویسا ہی نمبر نکلا۔ مضمون نگاروں نے تو اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے مگر آپ نے اسے ایڈٹ کرکے اپنے کمال کا معجزہ ہی دکھا دیا ہے۔ کتابت، طباعت، ترتیب، ہر لحاظ سے یہ پرچہ قابلِ قدر ہے اور محفوظ رکھنے کے قابل۔ مرحوم کی شخصیت اور فن پر بیش بہا معلومات کا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو رسائل کی تاریخ میں نیا دور کا احتشام نمبر نہایت خصوصی مقام حاصل کرے گا۔

شوکت پردیسی (جونپور)

مئی۔ جون ۱۹۷۳ء کا مشترکہ نیا دور جو "احتشام نمبر" پر مشتمل ہے، موصول ہوا۔ پروفیسر سید احتشام حسین کی شخصیت ہر لحاظ سے عظیم تھی۔ بلاشبہ ایسی عظیم اور لامحدود شخصیت کو ایک خصوصی نمبر کے دائرے میں اس طرح لانا کہ اس کی سیرت کے خد و خال بھی نمایاں رہیں اور اس کی ہمہ گیر شخصیت کے تمام خصوصی پہلو بھی سامنے آجائیں بہت ہی مشکل کام ہے۔ آپ نے اس مشکل کام کو جس محنت و عقیدت، جس خلوص و محبت اور جس عظمت و عزت کے ساتھ انجام دیا ہے اور اس کے لیے سید صاحب کے عقیدت مندوں، پرستاروں، ملک کے عظیم لکھنے والوں اور رفیق کاروں کا تعاون حاصل کیا ہے، وہ یقیناً اردو ادب و صحافت میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اس قابلِ قدر اور لائقِ فخر کارنامے کو اہلِ علم و فن ہمیشہ تاریخی اہمیت دیں گے۔

عبدالقوی دسنوی (بھوپال)

ابھی نیا دور کا احتشام نمبر دیکھا۔ رنج ہوا کہ احتشام صاحب کی یاد بے طرح آئی اور تڑپا گئی اور خوشی ہوئی کہ ان کی یاد میں ایک اچھا نمبر شائع ہوا۔

علی عباس امید (بھوپال)

چند دن ہوئے احتشام نمبر دیکھا۔ اب تک جو نمبر آئے ہیں ان میں منفرد ہے۔ یوں تو سبھی مضامین، نظم و نثر خوب ہیں لیکن شمیم کرہانی صاحب کی نظم نے خصوصی نقش چھوڑا ہے۔ آپ کی ترتیب بھی لائقِ تحسین ہے۔

شارب لکھنوی (لکھنؤ)

احتشام نمبر نظر سے گزرا۔ اول تا آخر پڑھا۔ خوب بلکہ بہت خوب ہے۔ میری طرف سے اتنا شاندار نمبر نکالنے پر مبارک باد قبول فرمایئے۔ حصہ نظم اور نثر دونوں بہت ہی بہتر ہیں۔ شمیم کرہانی، جمیل مظہری، نہال رضوی، کمال لکھنوی وغیرہ کی نظمیں بہت پسند آئیں۔

ساغر مہدی (بہرائچ)

نیا دور کے احتشام نمبر کے تمام مضامین، نثر و نظم کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نیا دور نے اتنی کم مدت اور اپنے محدود ذرائع کے باوجود

بے حد اہم، شان دار اور غیر معمولی افادیت کا نمبر نکال کر نہ صرف مرحوم احتشام حسین صاحب کی محبوب شخصیت کو معقول خراجِ عقیدت پیش کیا ہے بلکہ اردو ادب میں اپنے لیے ایک ایسی مخصوص جگہ بنالی ہے جو اردو صحافت میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

ایس۔ ایم۔ عباس رضوی (جونپور)

احتشام نمبر نظر نواز ہوا۔ دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ واقعی آپ نے اپنی جد و جہد انہماک، کاوش و کوشش سے "دیر آید درست آید" والی کہاوت بالکل صحیح ثابت کر دی ہے۔ گوناگوں رنگینیوں، دلچسپیوں، تصاویر اور بلند پایہ مضامین نثر و نظم کو یکجا کر کے آپ نے اسے محفل رنگ و بو بنا دیا۔ اس عظیم و ضخیم نمبر کی تزئین و ترتیب کے لیے میری جانب سے مبارک باد قبول فرمائیں۔

کامران کاظمی (پٹنہ)

احتشام نمبر نکالنے پر دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔ آپ نے احتشام صاحب سے متعلق اتنا شان دار نمبر نکال کر ان کو زندہ جاوید کر دیا۔

لیلیٰ لکھنوی (لکھنؤ)

نیا دور کا احتشام نمبر بے حد عظیم، اور ایک قابل یادگار نمبر ہے جو مرحوم کے اعلیٰ کردار، علمی اور ادبی خدمات کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ آپ کی کاوشیں قابل تحسین و مبارک ہیں۔

آوارہ (مارہرہ)

مئی۔ جون کا نیا دور (احتشام نمبر) آج ملا۔ مدت کے بعد اتنا حسین پرچہ نظر سے گزرا۔ پڑھ لوں تو اس کے محاسن عرض کروں گا۔

ایم۔ کیو۔ خان (گیا)

نیا دور کے احتشام نمبر کے لیے مبارک باد قبول فرمایے۔ سچ سچ بغیر کسی دعویٰ کے آپ نے بہت شان دار نمبر نکالا ہے۔ بعید از قیاس ، میں تصور بھی نہیں کر پاتا تھا کہ اتنا ضخیم اور اتنا متنوع احتشام نمبر ہو گا۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ بس ایک فرض منصبی سمجھ کر آپ کسی طرح کندھے سے جوا اتار پھینکیں گے۔ لیکن یہ نمبر دیکھ کر میں متحیر ہو گیا۔ کون سا ایسا پہلو زندگی کا یا ادبی باقی رہ گیا ہے؟ آپ کو لکھنے والے بھی ویسے ہی بلند پایہ مل گئے۔ ایک ایک مضمون بار بار پڑھنے کے قابل ہے۔ اس شمارے کی حیثیت دستاویزی ہے۔

شکیل احمد (سونا تھ بھنجن)

احتشام نمبر کی کہاں تک تعریف کی جائے۔ یہ سب آپ کی محنت اور کاوش کا ثمرہ ہے۔ میں بھی اس نمبر کی تعریف کرنے والے قارئین میں شامل ہوں۔

جے۔ رحمان جوہر رحمانی

آپ نے جس خلوص و محنت سے احتشام نمبر شائع کیا اور آپ نے جس جانفشانی سے گل ہائے عقیدت مرحوم کو پیش کیے وہ واقعی ہم لوگوں کے لیے ایک مثال ہے اور آپ اس کے مستحق ہیں کہ آپ کی جتنی تحسین و تعریف کی جائے وہ کم ہے۔

ہفتہ وار نظارہ۔ لکھنؤ۔ ۲ اگست ۱۹۸۳ء

مئی جون کا یکجائی شمارہ نیا دور کا احتشام نمبر ہے۔ جو ایک علمی ادبی اور معلوماتی ذخیرہ ہے۔ نمبر کی ترتیب و تدوین جناب سید خورشید احمد صاحب مدیر نیا دور کی قابلیت اور وسعت نگاہ کی آئینہ دار و ترجمان ہے۔ جب سے موصوف نے نیا دور کی ادارت کے فرائض انجام دینا شروع کیے ہیں نیا دور کے معیار میں انتہائی بلندی پیدا ہو گئی ہے اور اس کا شمار ملک کے اعلیٰ رسائل میں بھی امتیازی حیثیت سے ہونے لگا ہے۔

احتشام نمبر میں جناب سید احتشام حسین صاحب کی متعدد تصاویر ملک کی معتبر شخصیتوں کے پیغامات تحقیقی تنقیدی علمی و ادبی مقالے بلند ترین نظمیں شامل ہیں۔ اس نمبر کی ضخامت (علاوہ ٹائیٹل) ۱۶۸ صفحا مشتمل ہے جس میں ملک کے مشہور اہل قلم شعرا کے تصنیفات و تالیفات کو حسن ترتیب کے ساتھ یکجا کیا گیا ہے۔ یہ تمام مضامین ایک ادبی گلدستے کی شکل میں حاصل کر کے شائع کیے گئے ہیں۔ نیا دور محکمہ اطلاعات کی جانب سے جناب شرد منی شرما ڈائریکٹر انفارمیشن کے زیر نگرانی شائع ہوتا ہے۔ اگرچہ ملک کی دیگر ریاستوں سے اردو زبان میں اکثر رسالے اور ماہوار ادبی رسالے نکلتے ہیں مگر نیا دور جیسی بلندی اور خصوصی امتیاز کسی دوسرے جریدے کو حاصل نہیں ہے۔

قابل مبارک باد ہیں سید خورشید احمد صاحب جنھوں نے علم و ادب و زبان کے خدمات کی انجام دہی کے ساتھ نیا دور کو تھوڑے ہی عرصے میں ادبی جرائد کی صف اول میں پہنچا دیا ہے۔ احتشام نمبر پر تفصیلی تبصرے کے لیے متعدد صفحات کی ضرورت ہے۔ طباعت و کتابت و کاغذ کی خصوصیت کے ساتھ قیمت صرف ایک روپیہ رکھی گئی ہے (علاوہ محصول) جو مینجر رسالہ نیا دور محکمہ اطلاعات اتر پردیش (بنارسی باغ) لکھنؤ سے منگایا جا سکتا ہے۔

★

آزادی کا چھبیسواں سال

اتر پردیش میں ترقیاتی سرگرمیوں اور کامیابیوں کا ایک جائزہ

آزادی کے چھبیسویں سال کے دوران ریاست میں سوشلزم کے حصول کے سلسلے میں کچھ اہم اور دور رس اقدامات کیے گئے۔ حکومت نے تھوک بیوپاریوں اور بڑے کاشتکاروں کے تقریباً مکمل عدم تعاون کے باوجود گیہوں کی تجارت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ چھوٹے کسانوں نے مجموعی طور پر حکومت اور عوام سے تعاون کیا اور حکومت نے ان سے اب تک ۶.۶ لاکھ ٹن سے زیادہ گیہوں خریدا ہے۔ اس طرح اس سلسلے میں اتر پردیش نے ملک میں دوسرا مقام حاصل کیا ہے۔ اگرچہ اس کا مقررہ نشانہ اب بھی پورا نہیں ہوا ہے۔

اہم اقدامات

- ریاست کی معیشت کو مستحکم کرنے کے لیے ۲۵۰۰ کروڑ روپے کا پانچواں منصوبہ۔
- بے زمین افراد کے پیش نظر جوتوں کی انتہائی حد میں کمی۔
- ہریجنوں اور غریب دیہی باشندوں کے ساتھ انصاف۔
- دس لاکھ ملازمین کی تنخواہ میں اضافہ۔
- صنعت کاروں کے لیے نئے محرکات۔
- خشک سالی کا مقابلہ کرنے کے لیے موثر اقدامات۔
- ضرورت سے زیادہ غلہ رکھنے پر قانون دفاع ہند کے تحت کارروائی
- خریف کے حوصلہ مندانہ منصوبہ پر عملدرآمد۔
- علاج وصحت سے متعلق خدمات مربوط۔

ریاستی مجالس قانون ساز نے اتر پردیش کے جوتوں سے متعلق انتہائی حد (ترمیمی) ایکٹ کو منظور کیا جس کے تحت جوتوں کی انتہائی حد کم کردی گئی۔ یہ ایک تاریخی فیصلہ تھا جو زیر نظر سال کے دوران ریاست میں کیا گیا۔ اس سلسلے میں صدر جمہوریہ کی ۸ جون کو منظوری حاصل ہونے کے بعد یہ بل قانون بن گیا اور امید کی جاتی ہے کہ اس کے تحت دو لاکھ ایکڑ فاضل زمین حاصل ہوگی جو بے زمین مزدوروں، ہریجنوں اور دیہی عوام کے کمزور طبقوں میں تقسیم کی جائے گی۔

حکومت کے متعدد فیصلوں کے تحت ہریجنوں کے مفادات کا تحفظ کیا گیا اور ان کی فلاح کے لیے اقدامات کیے گئے۔ چنانچہ ان کے لیے سرکاری ملازمتوں میں ۱۸ فی صد نشستیں محفوظ کرنے سے متعلق حکم پر زیادہ سختی سے عمل درآمد کیا جارہا ہے۔ انھیں جو دیگر سہولتیں منظور کی گئی ہیں ان میں ہائی اسکول کے قبل کے درجات میں اقوام دقبائل مندرجہ فہرست کے تقریباً ۲.۵ لاکھ طلبا

کے لیے مفت تعلیم، اور وظائف کی فیاضانہ منظوری، مکانات اور کنوؤں کی تعمیر اور گھریلو صنعتوں کی ترقی کے لیے اقدامات شامل ہیں۔ ایک ہریجن جانچ کمیٹی ہریجنوں کی شکایات اور مشکلات کا جائزہ لے گی۔

ریاستی حکومت کے تنخواہ کمیشن کی سفارشات منظور کرنے کے نتیجے میں جو زیر نظر سال کے دوران پیش کی گئیں، ریاستی حکومت، لوکل باڈیز اور سرکاری امداد یافتہ تعلیمی اور تکنیکی اداروں کے دس لاکھ ملازمین مستفید ہوں گے۔

ریاستی حکومت کو اس سلسلے میں مزید ۳۸، ۰۷ کروڑ روپیہ کا بار برداشت کرنا ہوگا۔ اگر آمدنی ٹیکس کے طور پر وضع کی جانے والی رقم کو ملحوظ رکھا جائے تو اب سب سے زیادہ سب سے کم شرح تنخواہ کے درمیانی فرق کا تناسب ۲۶، ۱:اسے گھٹ کر ۸:۱ رہ جاوے گا۔

ثانوی تعلیم کو قومیانے کا مسئلہ حکومت کے زیر غور ہے۔ اس سلسلے میں متعلقہ امور پر غور وخوض کا کام ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا ہے۔

ریاست کی خوشحالی کے لیے پانچویں ریاستی پنج سالہ منصوبے کے تحت ۳۵۰۰ کروڑ روپے کے اخراجات کی تجویز رکھی گئی ہے۔ یہ منصوبہ مرکزی منصوبہ بندی کمیشن کو پیش کر دیا گیا ہے اور اس معاملے میں اتر پردیش ملک کی دیگر ریاستوں پر سبقت لے گیا ہے۔ اس کے علاوہ ریاست کے مرکزی زمرے کے منصوبہ کے واسطے ۱۵۰۰ کروڑ روپے اور نجی زمرے کے منصوبہ کے لیے اتنی ہی رقم کے مجوزہ مصارف نیز مالیاتی اداروں سے ۱۰۰۰ کروڑ روپے کی رقم کے حصول کے لیے مرکزی حکومت کی منظوری کا انتظار ہے جس کے نتیجے میں منصوبہ کے مجوزہ مصارف مجموعی طور پر ۷۵۰۰ کروڑ روپے کے ہو جائیں گے۔ منصوبہ کے خاص مقاصد ریاست کی غریبی اور پسماندگی کو دور کرنا اور عوام کی کم سے کم ضروریات کو پورا کرنا ہیں۔

ریاست کو زیر نظر سال کے دوران ایک بار پھر طویل خشک سالی کا سامنا کرنا پڑا جو جولائی کے آخر تک جاری رہی۔ اسکے نتیجے میں شروع میں بوئی جانے والی فصلوں، خاص طور پر گنواری دھان اور مکئی کو ۴۳ اضلاع میں شدید نقصان پہنچا۔ حکومت اور عوام عزم مصمم اور یکساں مستعدی کے ساتھ اس صورت حال کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ خشک سالی سے متاثر عوام کو راحت پہنچانے کے سلسلے میں ۵۸، ۷۵ کروڑ روپے کی لاگت کا ایک منصوبہ مرکزی حکومت کو منظوری کے لیے پیش کر دیا گیا ہے۔ ایک مرکزی ٹیم نے اس ماہ کے شروع میں خشک سالی سے متاثرہ علاقوں کے نقصانات کا جائزہ لینے کے لیے دورہ کیا تھا۔ اور اس کے نتیجے میں اس ٹیم نے خشک سالی سے متعلق مذکورہ منصوبہ کے بڑے حصہ کے لیے اپنی منظوری دیدی ہے۔

متاثرہ علاقوں میں تمام سرکاری واجبات کی وصولی ملتوی کر دی گئی ہے اور جہاں کہیں ضرورت محسوس کی گئی وہاں امدادی کام شروع کیے گئے۔ دھان کے لیے آبپاشی کی شرحوں میں کافی کمی کر دی گئی ہے۔ خوش قسمتی سے اگست کے دوران بکثرت بارش ہوئی ہے اور خریف کی ایک حوصلہ مندانہ مہم شروع کر دی گئی ہے جو منجملہ دیگر امور کے خشک سالی کے نقصانات کی حتی الامکان زیادہ سے زیادہ تلافی کرے گی۔ ریاست بھر میں سستے غلہ کی سترہ ہزار دوکانیں کھولی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ جن مقامات پر امدادی کام جاری ہیں وہاں بھی اس قسم کی دوکانوں کا بندوبست کیا گیا ہے۔ ضلع مجسٹریٹوں کو یہ اختیار دیدیا گیا ہے کہ وہ حسب ضرورت جتنی دوکانیں چاہیں کھول سکتے ہیں۔ اسکے علاوہ قانون دفاع ہند کے تحت انھیں یہ اختیار بھی دیدیا گیا ہے کہ وہ کسی بھی شخص کے قبضے سے اس کی جائز ضرورت سے زیادہ گیہوں کا اسٹاک برآمد کر کے اپنے قبضے میں لے سکتے ہیں۔

ریاست میں طویل عرصے کے بعد پہلی بار علاج اور صحت سے متعلق خدمات کو مربوط و منظم کیا گیا اور ضلع نیز اس سے نچلی سطح پر ان خدمات کو زیادہ موثر اور کارگر بنانے کے لیے اقدامات کیے گئے۔

ریاستی محکمہ تعمیرات عامہ نے زیر نظر سال کے ۱۴۳۵۰۰۰لا

کلومیٹر لمبی پختہ سڑکوں اور ۲۸۰۰ کلومیٹر لمبی کچی سڑکوں کی تعمیر کا کام مکمل کیا۔ جو اپنی جگہ ایک نیا ریکارڈ ہے اور یہ کارگزاری گزشتہ تین سالوں کی مجموعی کارگزاری سے زیادہ ہے۔ متعدد نئے پلوں کی تعمیر کے نتیجے میں دیہی علاقوں کے بڑے حصوں میں آمد و رفت کی سہولتیں حاصل ہو گئی ہیں۔ ریاست میں ایک پل کارپوریشن بھی قائم کیا گیا ہے جو ۲، زیر تعمیر پلوں کے مختلف مرحلوں کی نگرانی کا کام انجام دے رہا ہے۔

حکومت نے زیر نظر سال کے دوران ایک ریاستی سڑک نقل و حمل کارپوریشن قائم کیا ہے۔ تاکہ سرکاری روڈویز کے ذریعے نقل و حمل کی خدمت کو بہتر بنایا جا سکے۔ اور خوش اسلوب کارگزاری میں اضافہ کیا جا سکے۔ ریاست کے پانچ کاداں شہروں بنیز میرٹھ اور بریلی میں ٹرانسپورٹ نگر قائم کیے جا رہے ہیں۔

حکومت اور مختلف کارپوریشنوں کی مربوط کوششوں کے نتیجے میں بہت سی نئی صنعتیں قائم کی گئیں۔ مرکزی زمرے میں دو بڑے کارخانوں کے قیام کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک متھرا میں قائم کیا جانے والا تیل صاف کرنے کا کارخانہ ہے اور دوسرا رائے بریلی میں ٹیلی فون کا سازوسامان تیار کرنے کا کارخانہ ہے۔ اس کے علاوہ نائنی میں مرکزی زمرے میں ایک اسکوٹر کارخانہ قائم کیا جا رہا ہے۔

ریاست میں بجلی کی شدید قلت جاری رہی جس کا معیشت پر خراب اثر پڑا۔ ریاست بھر میں بجلی کی فراہمی میں زبردست کمی کر دی گئی۔ اگرچہ اب اس سلسلہ میں بجلی پر عائد پابندیاں کچھ نرم کر دی گئی ہیں۔ تاہم یہ اب بھی جاری ہیں۔ ان نازک حالات میں بجلی بورڈ کے انجینئروں کی ہڑتال شروع ہو گئی جس کی وجہ سے بجلی کی فراہمی شدید طور پر متاثر ہوئی۔ ہردوا گنج میں ۵۵ میگاواٹ اور اوبرا میں ۱۰۰ میگاواٹ کے تھرمل یونٹ کے چالو ہو جانے سے یہ صورت حال بہتر ہوئی۔ ریاستی حکومت نے ایک ایٹمی بجلی گھر کے لیے مرکز کی منظوری حاصل کر لی ہے جو نرورا میں قائم کیا جائے گا۔

ریاست میں امن و قانون کی صورت حال۔ پی، اے۔ سی کے ایک گمراہ طبقے کی تحریک کے علاوہ مجموعی طور پر تسلی بخش رہی۔ پی، اے، سی کے اس طبقے کی تحریک کی بنا پر شری کملا پتی ترپاٹھی کی وزارت کو مستعفی ہونا پڑا اور اس کے نتیجے میں ریاست میں صدر راج کا قیام عمل میں آیا۔ پولیس کے ملازمین کو مزید سہولتیں بہم پہنچانے کی متعدد اسکیمیں جن میں مکانات کی تعمیر اور سرمائی وردیوں کی فراہمی بھی شامل ہے۔ شروع کی گئی ہیں۔

اردو کو ترقی دینے کے لیے متعدد فیصلے کیے گئے ہیں۔ ایسے سکنڈری اسکولوں میں جہاں ۱۰ سے زیادہ طلبا اردو بحیثیت ایک مضمون کے لینا چاہتے ہیں، کئی ہزار اردو ٹیچروں کی تقرری کی جا رہی ہے۔

لکھنؤ کے کتھک طرز کے مشہور رقص کی تربیت ایک نئے اسکول میں دی جا رہی ہے۔ جو فن رقص کے نامور اور ممتاز ماہر لچھو مہاراج کی نگرانی اور رہنمائی میں قائم کیا گیا ہے۔

ذیل میں ریاست کے مختلف اہم محکموں کی جانب سے کئے گئے اقدامات اور کارگزاریوں کا ایک مختصر جائزہ دیا جا رہا ہے:

پیداوار کے سلسلہ میں منظم منصوبہ بندی

ریاست کی ترقی اور پیداوار کی منظم منصوبہ بندی کے لیے ایک اعلیٰ اختیاری ریاستی منصوبہ بندی کمیشن قائم کیا گیا۔

ریاستی منصوبہ بندی کمیشن کی مدد کے لیے ریاستی منصوبہ بندی اداروں میں موجود چھ ڈویژنوں کے علاوہ تین نئے ڈویژن قائم کیے گئے۔

ریاست کے زمرہ میں تقریباً ۳۵۳۹،۲۵ کروڑ روپیہ کا پانچواں پنج سالہ منصوبہ تیار کیا گیا۔ جس کے دو خاص مقصد ہیں اول غریبی دور کرنا، دوسرے معاشی اعتبار سے ریاست کو خودکفیل بنانا۔

ریاستی حکومت کو توقع ہے کہ ۳۵۰ کروڑ روپیہ کے منصوبہ کے علاوہ مالیاتی اداروں سے تقریباً ۱۰۰ کروڑ روپیہ دستیاب ہوگا۔

ان کے علاوہ اتر پردیش میں مرکزی زمرے کے پروگراموں میں ۱۵۰۰ کروڑ روپیہ اور نجی زمرہ میں ۱۵۰۰ کروڑ روپیہ کی سرمایہ کاری متوقع ہے۔ اس طرح ریاستی منصوبہ مجموعی طور پر تقریباً ۷۵۰۰ کروڑ روپے کے اخراجات پر مشتمل ہوگا۔ جبکہ ملک کا پورا منصوبہ کل ۵۱۰۰۰ کروڑ روپیہ کا ہے۔

بے روزگاری کے زبردست مسئلہ سے نپٹنے کے زیر نظر سال کے دوران ہنرمند وغیر ہنرمند تکنیکی اور دیگر تعلیم یافتہ افراد کو روزگار مہیا کرنے کے لیے ۸۰۶۴ کروڑ روپیہ کی ایک اسکیم شروع کی گئی۔ اس اسکیم کے تحت ۱۶۷۰۰ تعلیم یافتہ افراد کو روزگار کے مواقع حاصل ہوں گے۔

ملک میں پانچ لاکھ افراد کو روزگار مہیا کرنے کے لیے ایک اسکیم شروع کی گئی ہے اور مرکزی حکومت نے اس مقصد کے لیے ۱۰۰ کروڑ روپیہ کی رقم فراہم کی ہے۔ اس سلسلہ میں اتر پردیش کو ۱۱ کروڑ روپیہ الاٹ کیا گیا ہے اور موجودہ مالیاتی سال کے دوران ۱۱۵۰۰۰ افراد کو روزگار مہیا کرنے کے لیے ایک اسکیم تیار کی جا رہی ہے۔

ملازمین کے ساتھ منصفانہ سلوک

اتر پردیش کی تنخواہ کمیشن کی سفارشات پر عملدرآمد کے نتیجہ میں ریاستی حکومت۔ لوکل باڈیز اور امداد یافتہ تعلیمی اور تکنیکی اداروں کے تقریباً دس لاکھ ملازمین کے ساتھ منصفانہ سلوک کیا گیا ہے۔ ان سفارشات پر عملدرآمد کے سلسلے میں تقریباً ۱۳۸٫۰۷ کروڑ روپیہ کے فاضل اخراجات درکار ہوں گے۔

ریاستی حکومت کے ملازمین کی تنخواہ کی شرحیں ۱۰۸ سے گھٹا کر ۳۸ کردی گئی ہیں۔ اس طرح لوکل باڈیز اور تعلیمی اداروں کے ملازمین کی تنخواہ کی شرحوں کی تعداد بھی کم کردی گئی ہے۔

گیہوں کی سرکاری تجارت

ریاستی حکومت نے گزشتہ یکم اپریل کو گیہوں کی تھوک تجارت اپنے ہاتھوں میں لے لی ہے۔ تاکہ گیہوں کے بازار سے تھوک بیوپاریوں کا غلبہ ختم کیا جاسکے۔ اور کاشتکاروں کو استحصال سے بچایا جاسکے۔ اگرچہ مفاد پرست عناصر اور دیگر وجوہ کی بنا پر یہ اسکیم پوری طرح کامیاب نہ ہوسکی۔ تاہم حکومت نے ۱۷۶ لاکھ ٹن سے زیادہ گیہوں خریدنے میں کامیابی حاصل کی۔ گیہوں کی خریداری کے سلسلہ میں پنجاب کے بعد اس ریاست کا دوسرا نمبر ہے۔

گیہوں کی خریداری پورے سال جاری رہے گی اور خاص طور پر ان اعلاقوں میں جہاں گیہوں کی زیادہ پیداوار ہوتی ہے اس اسکیم کے تحت گیہوں کی خریداری کا کام زور شور سے جاری رہے گا۔ امید کی جاتی ہے کہ ریاست میں آئندہ چند ماہ کے دوران بڑی مقدار میں گیہوں کی خریداری کی جائے گی۔

حکومت نے قانون دفاع ہند کے تحت ضلع مجسٹریٹوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ کسی بھی ایسے شخص کے قبضہ سے گیہوں کا اسٹاک برآمد کرسکتے ہیں۔ جس کے پاس اس کی جائز ضرورت سے زیادہ گیہوں موجود ہو۔ اس حکم کا اطلاق کاشتکاروں، صارفین اور بیوپاریوں پر ہوگا۔ یہ آڈر ۱۵ نومبر تک نافذ رہے گا۔

ریاست کے ۳۷ قلت زدہ اضلاع میں گیہوں کی آزادانہ نقل و حمل کے لیے حکم جاری کیا گیا تاکہ کھلے بازار میں گیہوں بھی دستیاب ہوسکے۔ یہ اقدام اس لیے کیا گیا ہے کہ لکھنؤ، کانپور، الہ آباد اور وارانسی وغیرہ جیسے کھپت کے بڑے مرکزوں میں وہاں کی آبادی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے غلہ کھلے بازار میں پہنچ سکے۔ اس کے علاوہ اس اقدام کا مقصد خشک سالی سے متاثرہ اضلاع میں گیہوں کی نقل و حمل کے سلسلہ میں سہولت بہم پہنچانا بھی ہے۔

ریاستی حکومت نے گزشتہ خریف کے دوران گیہوں کے علاوہ ۱۳ ۱/۲ لاکھ ٹن چاول اور ۷۰۰۰۰۰ ٹن موٹا اناج بھی خریدا۔

صنعت کاری

ریاست میں ریکارڈ تعداد میں صنعتیں قائم کی گئیں جس

کا سبب صنعت کاروں کو فراہم کی جانے والی مختلف قسم کی مراعات ہیں۔

صنعت کاروں کو فراہم کردہ مراعات اور محرکات میں ریاست میں نئے صنعتی واحدوں کو تیار شدہ مال فروخت کرنے پر سیلز ٹیکس کے برابر قرضوں کی فراہمی۔ نئی صنعتوں کی مصنوعات پر چنگی کی چھوٹ وغیرہ شامل ہیں۔

حکومت نے قائم شدہ صنعتوں کی کارگزاری کا مطالعہ کرنے کی غرض سے مختلف مقامات کا دورہ کرنے والے صنعت کاروں کو سفر کے ۲۵ فیصد اخراجات ادا کرنے اور ۲۶ پسماندہ اضلاع میں صنعتیں قائم کرنے سے قبل چھوٹے صنعت کاروں کو صنعتی رہنمائی حاصل کرنے کے سلسلہ میں جو رقم صرف کرنا پڑے اس کا ۷۵ فیصد بار خود برداشت کرنے کا فیصلہ بھی کیا۔ بلیا، جھانسی، رائے بریلی، بستی، فیض آباد اور الموڑہ کے چھ اضلاع میں نئے واحدوں کے لیے سرمایہ کی فراہمی کے سلسلہ میں مالی امداد دینے کا فیصد ۱۰ سے بڑھ کر ۱۵ کر دیا گیا۔

تعلیم کو بہتر بنانے کے اقدامات

ملک کی سب سے زیادہ آبادی والی ریاست اتر پردیش میں تقریباً ۱۶۱،۵ فیصد بچوں کو تعلیمی سہولتیں مہیا کرنے کے پیش نظر ایک عظیم ذمہ داری سپرد کی گئی ہے۔ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کو کافی فروغ حاصل ہوا۔

ریاست میں ۷۳-۱۹۷۲ء میں تعلیم پر ۱۱۱۵۰۷۶۰ روپیہ کی رقم خرچ کی گئی تھی جو امسال بڑھ کر ۱۵۴۷۱۲۳۱ ہو گئی ہے۔

حکومت نے ثانوی تعلیم کو قومی ملکیت میں لینے سے متعلق مسئلہ پر غور وخوض کرنے کے لیے ایک اعلیٰ اختیاری کمیٹی کی تشکیل کی ہے۔

حکومت نے یونیورسٹیوں اور ڈگری کالجوں کے انتظامی تعلیمی اور مالیاتی امور کو بہتر بنانے کے لیے یونیورسٹیوں سے متعلق آرڈیننس ۱۹۷۳ء جاری کیا۔ جس کی دفعات، لکھنؤ، الہ آباد، میرٹھ، آگرہ، کانپور اور گورکھپور یونیورسٹی میں گزشتہ ۸ ارجون سے نافذ ہو گئی ہیں۔

پولیس کو زیادہ سرگرم بنانے کیلئے اقدامات

پی۔اے۔سی۔ میں ایک گمراہ طبقہ کی تحریک کے علاوہ۔ جو پولیس فورس میں بے اطمینانی پھیلانے کا ذمہ دار تھا ریاست میں مجموعی طور پر امن وامان کی صورت حال تسلی بخش رہی۔ پولیس اور عوام کے روابط بہتر بنانے کے لیے مربوط کوششیں کی گئی ہیں۔

پولیس کو اور زیادہ سرگرم اور ضبط و نظم کے پابند بنانے کے لیے متعدد موثر اقدامات کرنے کے علاوہ ریاستی حکومت نے پولیس فورس کی جدید کاری کے لیے ۷۵ لاکھ روپیہ کا ایک منصوبہ مرکزی حکومت کو پیش کیا ہے۔

مالیاتی سال رواں کے دوران پولیس اور پی۔اے۔سی کے ملازمین کو سہولتیں آسائشیں فراہم کرنے پر ۲۰،۱ کروڑ روپیہ کی رقم خرچ کی گئی۔ اس کے علاوہ ان کو مزید سہولتیں فراہم کرنے کے لیے مزید اقدامات کیے جانے کی تجویز ہے۔

ریاست میں فرقہ وارانہ واقعات کی روک تھام کے پیش نظر ڈویژنل کمشنروں کو یہ ہدایات جاری کی گئی ہیں کہ وہ اقلیتی فرقہ کی شکایات اور مشکلات دور کرنے اور ان کے مسائل حل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔ ضلع مجسٹریٹوں اور پولیس کے سپرنٹنڈنٹوں کو یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ امن و قانون برقرار رکھنے کے لیے ذاتی طور پر ذمہ دار ہوں گے۔

ہریجنوں اور سماج کے کمزور طبقوں پر مظالم کی روک تھام کے پیش نظر موثر اقدامات کیے گئے۔

مسلح افواج کی فلاح

حکومت نے زیر نظر سال کے دوران فوجیوں کی بیواؤں، سابق فوجیوں اور پولیس فورس کے ملازمین کی فلاح وبہبود، اور

بحالی کے لیے ۲۰ء۱۳ لاکھ روپیہ سے زیادہ کی رقم منظور کی ہے۔

اترپردیش کے ان فوجی جوانوں کو جنہوں نے گزشتہ ہند پاک جنگ کے دوران شاندار جرأت اور بہادری کے کارنامے انجام دیے تھے، ۱۵۸،۰۰ روپیہ کے نقد انعامات دیئے گئے۔ اس کے علاوہ ریاستی حکومت نے جنگ میں ہلاک ہونے والے فوجیوں کی بیویوں اور معذور فوجیوں کے لیے ۸۰ لاکھ روپیہ کی لاگت کا ایک ہاؤسنگ پراجیکٹ شروع کیا ہے۔

★

اُمراؤ جان اَدا — کردار کا تجزیاتی مطالعہ — (صفحہ ۱۲ کا بقیہ)

ساحل پر اسی لباس میں گھومتی رہی اور جیسا کہ تصویر میں دیکھا جاسکتا ہے اس نے اپنے سینے کو چھپانے کی مطلق کوشش نہیں کی۔"

ناول، شعر اور زندگی کی ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض شخصیتیں ایک زندگی میں کئی کئی لوگوں سے روحانی اور جسمانی محبت کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ امراؤ جان ادا بھی ایسی ہی شخصیت ہے۔ اگر ہم قدیم روایتی مفروضوں کو دائمی قدر اور زندگی جیسی حقیقت مان کر تنقید کریں گے تو INTIMACY کی لولو، لیڈی چیٹرلی، بہت سے اشعار کے پیکر اور جیکولین کینیڈی سب ہوس کار اور بدکردار نظر آئیں گے۔

لیکن اگر ہم عصری مفروضوں سے بے نیاز ہو کر امراؤ جان ادا کو پرکھتے ہیں تو وہ ایک قابل احترام خوب صورت عورت اور فنکارہ ہے جس کی شخصیت میں محبت ہے وہ اپنے آئیڈیل مرد میں فیضو کی گرم جوشی اور صلابت، نواب سلطان کی دلکش نفاست، نواب جعفر کی فنکارانہ مہارت اور مرزا رسوا کی رچی ہوئی ادبی لطافت تلاش کرتی ہے۔ یہ اس کے معاشرے کا جبر ہے جس میں ایسا شدید احساس کمتری پیدا کر دیا ہے کہ وہ سمجھتی ہے کہ معمولی سے معمولی آدمی کی بھی وہ بیوی ہونے کے لائق نہیں۔ وہ اعلیٰ نسوانی خوبیوں کی مالک عورت ہے جس نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو اپنی ذہانت اور ریاضت سے چمکا کر بے مثال کر دیا ہے۔ اس کی شخصیت بحیثیت ایک فنکار عورت کے غیر معمولی ہے اس دور کا معمولی سا مرد اگر خلوص اور سچی محبت کے ساتھ اسے بیوی کی حیثیت سے قبول بھی کر لیتا تو اسے اور بھی شدید ناآسودگی کا احساس ہوتا۔ وہ اپنی تکمیل کے لیے مختلف لوگوں سے محبت کرتی ہے اور وقت گزرنے کے بعد یا آسودہ ہونے کے بعد انہیں بھلا نہیں دیتی بلکہ ان کی رفاقتوں کی یادوں سے اپنی ذہنی شخصیت کی تعمیر کرتی ہے وہ عزت اور احترام کے مستحق ہے۔ اس کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ ایسے مصنوعی اور تضادات سے بھرے معاشرے میں پیدا ہوئی جہاں اس کی فطری اور فنی خوبیوں کو وہ حقیقی عزت نہیں مل سکی جس کی وہ مستحق تھی۔

★

نیا دور بابتہ جولائی ۱۹۷۳ء میں جناب بسنت کمار بسنت اور جناب منوہر لال ہادی کی غزلیں صفحہ ۴۳ پر شائع ہوئی ہیں۔ لیکن غلطی سے جناب منوہر لال ہادی کی غزل پر بسنت صاحب کا اور ہادی صاحب کی غزل پر جناب بسنت کا نام شائع ہو گیا ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔ "ادارہ"

بجادر ۸۹۵ اشک

Regd. No. L. 319

ریاستی لاٹری کی ۲۱ ویں اور ۲۲ ویں قرعہ اندازی میں اوّل انعام پانے والوں کو لکھنؤ میں ۴ راگست ۱۹۷۳ء کو کاریں پیش کی جارہی ہیں

3C NOV 1973

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی آزادی کی ۲۶ ویں سالگرہ کے موقع پر ۱۵ اگست ۱۹۷۳ء کو لال قلعہ
دہلی سے قوم کو خطاب کر رہی ہیں

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے متفق ہو

نیا دور

جلد ۲۹ نمبر ۷

آشون ۱۸۹۵ شک

اکتوبر ۱۹۷۳ء

چندہ سالانہ: پانچ روپے

فی پرچہ: پچاس پیسے

سرورق
علی عطا صدیقی

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
شرومنی شرما
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

پرنٹر
اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری، یو۔پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ، لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

اپنی باتیں

ہندستان کی سرزمین کو یہ فخر حاصل رہا ہے کہ وقتاً فوقتاً مصلحانِ قوم، روحانی پیشوا، مفکر، فلسفی اور دانشور یہاں جنم لیتے رہے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخری نصف میں بھی ایسی ہی ایک جلیل القدر ہستی پوربندر کاٹھیاواڑ کے ایک معزز خاندان میں ۲ر اکتوبر ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوئی جس کا نام نامی اور اسمِ گرامی موہن چند کرم چند گاندھی تھا اور جو آگے چل کر مہاتما کے لقب سے مشہور ہوئے۔ گاندھی جی کی ذات ہندستان کے لیے تو مایۂ ناز و باعثِ صد افتخار ہے ہی، اس لیے کہ انھوں نے اس ملک کو صدیوں کی غلامی سے نجات دلائی اور آزاد قوموں کی صف میں پہنچا دیا، ان کی ذات دنیائے انسانیت کے لیے بھی باعث فخر ہے کیونکہ انھوں نے عالمی اخوت و محبت، امن و آشتی، مساوات، آزادی اور خودداری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا پیام دیا، نسلی امتیازات کے خلاف آواز بلند کی اور ذات پات کے اختلافات کو جہاں کہیں بھی وہ پائے جاتے ہوں، مٹانے کی تلقین کی۔ گاندھی جی کا طریقہ کار ستیہ اور اہنسا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جو سچ ہے، جو حق ہے اس کے اظہار میں ذرا تامل اور جھجک نہ ہونا چاہیے بلکہ نہایت بے خوفی کے ساتھ اس کو کہنا چاہیے۔ اسی طرح اہنسا۔ عدم تشدد پر بھی ان کا کامل اعتماد و یقین تھا۔ یہی وہ حربہ تھا جو گاندھی جی نے نہتے ہندستان کو دیا اور اسی کی مدد سے برطانیہ جیسی طاقت ور سلطنت سے جنگ لڑی اور اپنے ملک کو آزاد کرایا۔ گاندھی جی کی اہنسا بزدلی یا خوف نہیں سکھاتی۔ ان کی اہنسا بہت ہی وسیع مفہوم رکھتی ہے۔ بے خوفی کے ساتھ حق بات کہنا، نڈر ہو کر حق بات پر عمل کرنا، اپنی بات منوانے کے لیے زبردستی نہ کرنا، مخالف سے لطف و کرم کے ساتھ پیش آنا، تشدد کا جواب تشدد سے نہ دینا۔ یہ ساری باتیں اہنسا کے دائرے میں آتی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ گاندھی جی کا طریقہ کار یا نظریہ حیات کیا دورِ حاضر میں بھی افادیت رکھتا ہے؟ اگر ہم غور سے دیکھیں تو ستیہ یا سچائی اور بلندیٔ اخلاق، کردار جو اہنسا کی روح ہے، ہر دور، ہر زمانے اور ہر ملک میں موثر اور کارگر ہو سکتی ہے۔ اہنسا کے بارے میں اس صدی کے عظیم ترین سائنس داں البرٹ آئن سٹائن نے کہا ہے کہ گاندھی جی نے یہ واضح کر دیا ہے کہ کسی انسان کو فتح یاب اور کامیاب ہونے کے لیے سیاسی شعبدہ گری اور چال بازی کی ضرورت نہیں بلکہ یہ کام اس کے بغیر بھی بلندیٔ اخلاق کی اعلیٰ ترین مثال پیش کر کے انجام دیا جا سکتا ہے نیز یہ کہ گاندھی جی نے جس طریقے سے بھارت کو آزادی دلائی وہ تشدد کے بغیر انقلاب کا طریقہ تھا۔

کاش آج کی جارح قومیں اور وہ قومیں جو مہلک ہتھیاروں کی دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتی ہیں، گاندھیائی فلسفے کی [illegible] ترین اور مسائل کو حل کرنے میں اس سے کام لیں تو دنیا سے خونریزی، جنگ و جدل اور جارحیت کا خاتمہ اور ایک پائدار امن قائم ہو جائے۔

آہ سید سجاد ظہیر

اردو کا دامن ایک اور ممتاز ادیب، مصنف اور ایک انسان سے خالی ہو گیا۔ اس سے پہلے بھی پے در پے سانحات سے دنیائے اردو دوچار ہو چکی ہے۔ ابھی ایک زخم ہرا ہی رہتا ہے کہ دوسری صفِ ماتم بچھ جاتی ہے۔ احتشام صاحب کے غم میں آنسو خشک نہیں ہوئے تھے کہ فراق گورکھپوری نے داغِ مفارقت دیا۔ اس کے بعد ضیا بدایونی ادبی محفل سونی کر گئے۔ اور اب سید سجاد ظہیر ہمارے درمیان سے اٹھ گئے۔

سید سجاد ظہیر ۵ نومبر ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم لکھنؤ اور آکسفورڈ میں ہوئی۔ لندن میں اپنی طالب علمی کے زمانے ہی میں وہ ترقی پسند خیالات سے متاثر ہوئے اور ہندستان واپس آکر انھوں نے ترقی پسند تحریک کے لیے کام شروع کر دیا اور ۱۹۳۶ء میں رفاہ عام کلب (لکھنؤ) کے ہال میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس منعقد کی۔ کانفرنس کی صدارت ملک کے ممتاز افسانہ نگار منشی پریم چند نے کی۔ اس طرح سید سجاد ظہیر ہندستان میں ترقی پسند تحریک کے نہ صرف بانی تھے بلکہ اس تحریک کے شیرازہ کو یکجا کیے ہوئے تھے۔ ابتدا میں یہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی میں شامل رہے۔ دو برس تک الہ آباد ضلع کمیٹی کے سکریٹری اور کئی برس تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بھی سکریٹری رہے۔ پھر ۱۹۴۲ء میں کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے اور آخر تک ان کی پارٹی سے وابستگی باقی رہی۔ ہندستان کی جنگ آزادی میں مرحوم سجاد ظہیر نے قید و بند کی بھی سختیاں جھیلیں۔ ادھر کچھ عرصے سے انھوں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور ان کا زیادہ تر وقت ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں صرف ہوتا تھا۔ روس اور ہندستان کے عوام کے درمیان تعلقات بڑھانے میں ان کا رول خاصا اہم رہا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی افرشیائی ادیبوں کی وہ کانفرنس تھی جو روس کی جمہوریہ قزاقستان کی راجدھانی الما آتا میں منعقد ہوئی تھی اور جس میں شرکت کے لیے وہ وہاں گئے ہوئے تھے۔ وہیں ۱۳ستمبر ۱۹۷۳ء کو قلبی دورہ پڑنے کے نتیجے میں ۶۷ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح ان کی موت ایک ممتاز ادیب، بلند پایہ نقاد، ایک عظیم محبِ وطن ہی کی موت نہیں ہے بلکہ ایک بڑے انسان کی بھی موت ہے جو اپنے سنجیدہ و متین انکار، اپنی دل نواز مسکراہٹ، اپنے نرم و نازک لہجے اور سب سے بڑھ کر خلوص و محبت بھرے اندازِ تکلم سے اپنے مخاطب کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ ان کی موت سے ادبی اور ثقافتی دنیا کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی بے انتہا مشکل نظر آتی ہے۔

• • •

لکھنؤ میں اردو سے متعلق نومبر کے مہینے میں دو کانفرنسیں منعقد ہو رہی ہیں۔ ان میں سے ایک آل انڈیا غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس ہے اور دوسری آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کا اجلاس دوم۔ اول الذکر کا مقصد اردو کو اس کا سابقہ وقار دلوانا اور اس کی توسیع و ترقی کے تمام ذرائع بہم پہنچانا ہے۔ آخر الذکر کا مقصد اردو اخبار نویسوں اور اردو اخبارات سے متعلقہ مسائل اور مشکلات کا حل تلاش کرنا ہے۔

اردو نے ہندستان ہی میں جنم لیا اور شروع سے وہ ایک سیکولر زبان رہی ہے۔ اس کی نشو و نما اور پرورش و پرداخت ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کوششوں کی رہین منت ہے۔ اسے پروان چڑھانے اور اس کو ادبی زبان کا درجہ دینے میں اور اسے رفعت و سربلندی عطا کرنے میں دونوں برابر کے شریک رہے ہیں۔ اس طرح اس زبان پر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا برابر حق ہے۔ جس کا ثبوت آل انڈیا غیر مسلم مصنفین کانفرنس ہے۔ اسی کے ساتھ یہ کانفرنس اردو کو ایک فرقے سے منسوب کرنے کی بعض سیاسی جماعتوں اور فتنہ پرور ذہنوں کی ناپاک سازشوں کا پردہ بھی چاک کرتی ہے اور ثابت کرتی ہے کہ اردو زبان کسی ایک فرقے یا طبقے کی نہیں بلکہ ہر ہندستانی کی خواہ وہ کسی خیال و عقیدے کا کیوں نہ ہو، زبان ہے۔ خدا کرے یہ کانفرنس اپنے نیک مقاصد میں کامیاب ہو۔

——— اسسٹنٹ ایڈیٹر

پیامِ گاندھی

لائق حسرتِ جاوید ہے نامِ گاندھی
ثبت ہے لوحِ زمانہ پہ دوامِ گاندھی
ناز کس منہ سے کرے اپنی بلندی پہ فلک
کہ فلک سے بہت اوپر ہے مقامِ گاندھی
احترام اور عقیدت سے لیا جاتا ہے
آج ہر ملک میں ہر شہر میں نامِ گاندھی
نام بھارت کا ہے گاندھی کی بدولت روشن
کیوں نہ ہر بھارتی لے فخر سے نامِ گاندھی
دل ابنائے وطن کا ہے صحیح آئینہ
دلِ گاندھی کی ہے آواز کلامِ گاندھی
دل دشمن پہ بھی اس واسطے کرتا ہے اثر
پاک ہے لہجے کی تلخی سے کلامِ گاندھی
سنو اے اہلِ جہاں گوشِ توجہ سے سنو
مژدۂ امن و سلامت ہے پیامِ گاندھی
آؤ آؤ چلو اے ملک کے گاندھی بھگتو
ہر گلی کوچے میں پہنچائیں پیامِ گاندھی
ساری دنیا کو ملے جنگ کے خطرے سے نجات
ساری دنیا اگر اپنائے نظامِ گاندھی

پنڈت میلا رام وفا

غزل

خونِ دل زینتِ مژگاں ہی سہی
آنکھ میں موجۂ طوفاں ہی سہی

خوں فشاں دیدۂ گریاں ہی سہی
میرے دامن پہ گلستاں ہی سہی

مجھ کو معلوم ہے انجامِ فغاں
اس سے کچھ رونقِ زنداں ہی سہی

درد و غم، نالۂ دل، ضبطِ فغاں
تیری فرقت میں یہ ساماں ہی سہی

میری آغوش میں جیسے تو ہے
یہ خیالِ دلِ ناداں ہی سہی

اُن کا دامن جو نہیں ہے تو نہ ہو
ہاتھ میں اپنا گریباں ہی سہی

ان کی محفل میں تو جانا ہے مجھے
چاکِ داماں و گریباں ہی سہی

کچھ نہ کچھ نذر تو کرنا ہے انھیں
وہ دلِ سوختہ ساماں ہی سہی

مجھ کو ثاقب کبھی حاصل تھا سکوں
آج یہ خوابِ پریشاں ہی سہی

ہندستانی عورت

صالحہ عابد حسین

گاندھی جی کے دل میں عورت کا بڑا احترام تھا۔ عورت کی عزت اور محبت کا یہ بیج بچپن ہی سے ان کے دل میں بویا گیا تھا، اس لیے کہ زندگی میں جن دو عورتوں سے انھیں سب سے زیادہ سابقہ رہا وہ نیکی، شرافت، محبت اور خدمت کی جیتی جاگتی مورتیاں تھیں۔ ان دونوں کی سیرت اور اخلاق کا گاندھی جی نے گہرا اثر قبول کیا۔

یہ دو عظیم عورتیں تھیں ان کی ماں پتلی بائی اور ان کی بیوی کستوربا۔ شریمتی پتلی بائی قدیم ہندستانی عورت کی نیکی اور پاک بازی کی تصویر تھیں۔ ایشور سے گہری عقیدت، زہد و عبادت کی لگن، اور ایشور کے بندوں کی سیوا اور ان سے پریم ان کی زندگی کے اصول تھے۔ اپنے بچوں کے دلوں میں بھی وہ ان نیکیوں کے بیج بونا چاہتی تھیں۔ ان کی تعلیم اور مثال کا سب سے گہرا اثر جس نے قبول کیا وہ ان کا سب سے چھوٹا بچہ موہن داس کرم چند تھا۔ اس بچہ نے دنیا کو دکھا دیا کہ اچھی ماں کی تربیت اولاد کو کس بلندی تک پہنچا سکتی ہے۔ حالی نے لکھا ہے۔ ؎

سرکار سے مالک کے جتنے پاک بندے ہیں بڑے
وہ ماؤں کی گودوں کے زینوں ہی سے ہیں آگے چڑھے

گاندھی جی ایسے پاک بندوں کا سچا نمونہ ہیں۔ خدا پرستی اور انسان دوستی کا دیا جو پتلی بائی نے اپنے بچے کے دل میں جلایا تھا وہ زندگی بھر ان کے سینے میں روشن رہا اور اس کی جوت سے دنیا منور ہوتی رہی۔

دوسری عورت جس کا ان پر بہت گہرا اثر پڑا کستوربا ہیں۔ ابھی گاندھی جی اور کستوربا تیرہ تیرہ برس کے الھڑ بچے ہی تھے کہ اس زمانے کے رواج کے مطابق انھیں بیاہ کے بندھن میں جکڑ دیا گیا۔ گاندھی جی ابھی شادی نہ کرنا چاہتے تھے مگر تیرہ برس کا لڑکا وہ بھی اب سے لگ بھگ ایک صدی پہلے ——— بھلا بزرگوں کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت کر سکتا تھا؟ اپنی شادی کا ذکر گاندھی جی نے اپنی آپ بیتی تلاشِ حق میں بڑے دکھ اور شرم کے ساتھ کیا ہے اور اپنے تجربے بڑی صفائی اور سچائی سے بیان کیے ہیں۔ انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ بیوی کو بہت چاہتے تھے اور یہ چاہت کستوربا کے لیے مصیبت بن گئی تھی۔ اس لیے کہ نوعمر موہن داس کے ذہن میں وفاداری اور محبت کے عجیب عجیب تصور رہتے تھے۔ مگر کستوربا عام بے وقوف دبّو گھسو لڑکیوں کی طرح نہ تھیں۔ ویسے بھی تیرہ برس کی لڑکی، اسی عمر کے لڑکے کے مقابلہ میں زیادہ سمجھدار ہوتی اور کچھ پختہ ذہن رکھتی ہے۔ وہ موہن داس کی دھونس میں نہ آتی تھیں۔ دونوں میں خوب جھگڑے ہوتے مگر پھر میل ہو جاتا اس لیے کہ دونوں ہی ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ بچپن سے بڑھاپے تک کستوربا کوئی بے جا بات ماننے یا زبردستی سہنے پر تیار نہیں ہوئیں۔ یوں وہ مثالی ہندستانی بیوی تھیں۔ سچی، کھری، وفادار، خدمت گزار، شوہر کو چاہنے والی، بچوں پر جان چھڑکنے والی۔ مگر ان کی اپنی ایک رائے تھی۔ اصول تھے۔ ان میں خود اعتمادی تھی اور تھوڑی ضد بھی۔ کم سنی میں موہن داس کو یہ باتیں بہت ناگوار گزرتی تھیں۔ مگر ان سے انھیں عورت کی سیرت کی پختگی، اور مضبوطی کا اندازہ ہوا ہوگا۔ بہرحال جوں جوں گاندھی جی کی عمر بڑھتی گئی ان کے علم اور تجربے میں اضافہ ہوتا گیا۔ کستوربا کی دوستی اور محبت اور ان کی سیرت اور شخصیت کا نقش ان کے دل پر گہرا ہوتا گیا۔ وہ ان کی سچی رفیق بن گئیں ——— ایسی رفیق جو بیاہی زندگی

کو جنت بنائی ہے۔ انھوں نے اپنے شوہر کے ساتھ کتنے دکھ جھیلے، کتنی کٹھنائیاں سہیں، ساری زندگی جفاکشی، تنگی اور مصیبت میں کاٹی مگر دل و جان سے ان کا ساتھ دیا۔ ہاں جس بات کو وہ غلط سمجھتیں اس میں اختلاف بھی کرتی۔ گاندھی جی نے کئی جگہ اپنے اور ان کے جھگڑوں کو بڑے مزے سے بیان کیا ہے۔ مگر یہ سچ مچ کے جھگڑے نہیں، بے تکلفی، اپنائیت اور گہری محبت کی جھڑپیں تھیں جو میاں بیوی کو ایک دوسرے سے دور نہیں کرتیں اور زیادہ قریب لاتی ہیں۔

انھیں دو دیویوں کے روپ میں گاندھی جی نے ہندوستانی عورت کا جلوہ دیکھا۔ انھیں کی محبت اور ہمدردی کا جذبہ تھا جس نے بڑھ کر سارے دیس کی عورتوں کا درد سمیٹ لیا۔

عورت اور جنگ آزادی

گاندھی جی کو عورت کے اندر انسانیت کا زیادہ مکمل اور سچا روپ نظر آیا۔ خاص کر ہندوستانی عورت کو وہ بہت اونچا مقام دیتے ہیں۔ اُسے اہنسا کا اوتار، ایثار اور جفاکشی کی مورت، سیوا اور پریم کی دیوی، نیکی کی تصویر اور مذہب کی سچی امین سمجھتے ہیں!

گاندھی جی سے بہت پہلے اردو کے مشہور مصلح شاعر مولانا حالی نے عورت کے بارے میں اسی قسم کے خیالات ظاہر کیے تھے شاید یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی کو حالی کی دو مشہور نظمیں چپ کی داد اور بیوہ کی مناجات (جس میں انھوں نے ہندوستانی عورت کی بپتا بیان کی اور اس کی خوبیوں کو سراہا ہے) بہت پسند تھیں۔ چپ کی داد میں حالی نے بھی عورت کو ایمان، عفت، نیکی اور ستیہ کی مورتی کہا ہے۔ چند شعر سنیے:

نیکی کی تم تصویر ہو عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں ایماں سلامت تم سے ہے
فطرت تمھاری ہے حیا، طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا انساں عبارت تم سے ہے
مردوں میں ست والے تھے جو ست بیٹھے اپنا گنوا
دنیا میں اے ستونتیوں لے دے کے ست اب تم سے ہے
تم آس ہو بیمار کی، ڈھارس ہو تم بیکار کی
دولت ہو تم نادار کی، عسرت میں عشرت تم سے ہے

اور گاندھی جی نے فرمایا تھا:

"میں نے کہا ہے کہ عورت اہنسا کا اوتار ہے۔ اہنسا کے معنی ہیں انتہائی محبت اور اس سے مراد ہے دکھ اٹھانے کی انتہائی صلاحیت ...... سوا عورت کے جو مرد کی ماں ہے اور کس میں یہ صلاحیت پورے طور پر نظر آتی ہے؟ وہ اس کا ثبوت اسی طرح دیتی ہے کہ بچے کو نو مہینے پیٹ میں رکھ کر اپنا خونِ جگر پلاتی اور دکھ کو سکھ جانتی ہے ..... بچے کی پیدائش کی تکلیف سے بڑھ کر دنیا میں کون سی تکلیف ہے؟ مگر وہ تخلیق کی خوشی میں اُسے بھول جاتی ہے ...... پھر وہ روز دکھ بھرتی ہے کہ بچہ روز بروز بڑھتا رہے ....."

اسی احساس نے ان کے دل میں یہ لگن پیدا کی کہ عورت کو پوری آزادی اور حقوق ملنے چاہییں تاکہ یہ صفات ابھر کر اور نکھر کر سامنے آئیں اور وہ جو کام گھر کی چار دیواری میں انجام دیتی ہے اس کے دائرے کو وسیع کر کے ساری دنیا کو امن، شانتی اور پریم کا سندیسہ دے سکے۔

لیکن یہ کس طرح ہو؟ آزادی اور حقوق کوئی بازار میں بکنے والے تحفے تو نہیں کہ خرید کر کسی کو دے دیے جائیں۔ مادی املاک تو نہیں کہ ایک سے چھین کر دوسرے کو بخش دی جائے! یہاں تو دلوں میں کایا پلٹ کرنا تھا خیالات کا رخ موڑنا تھا۔ ذہنوں کے صدیوں پرانے زنگ کو کھرچنا تھا۔ گاندھی جی جانتے تھے کہ یہ کام کتنا کٹھن ہے اور یہ بات بھی ان سے چھپی نہ تھی کہ سینکڑوں برسوں کی دہری دہری غلامی نے خود عورت کو بہت تنگ نظر، پست ہمت اور قدامت پسند بنا دیا ہے۔ اس کی بہت سی صلاحیتیں کچل گئی ہیں۔ بہت سی دب گئی ہیں۔ اس لیے اگر ایک طرف اسے مرد کی غلامی اور سماج کے ظلم و ستم سے چھٹکارا دلانا ہے تو دوسری طرف خود اس کے حوصلے کو بڑھانا اس کے دل میں خود اعتمادی اور عزتِ نفس کے احساس کو بیدار کرنا ہے۔ اس کو بتانا ہے کہ کیا کیا طاقتیں اس کے اندر چھپی ہیں اور وہ ان سے کیا کچھ کام لے سکتی ہے۔ اگر ایک بار وہ یہ بات سمجھ گئی تو پھر ان کا کام آسان ہو جائے گا۔

اسی یقین و اعتماد کے ساتھ گاندھی جی نے ہندوستانی عورت کے حقوق اور فرائض کا ایک واضح نقشہ اپنے ذہن میں مرتب کیا۔ اور پھر سب سے پہلا اور سب سے اہم عملی قدم یہ اٹھایا کہ آزادی کی جد و جہد

میں عورتوں کو مردوں کے پہلو بہ پہلو میدان میں کھڑا کر دیا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے جس سے ہر شخص واقف ہے کہ آزادی کی تیس پینتیس سال کی لڑائی میں کس طرح گاندھی جی کی رہنمائی میں ہندستانی عورتوں نے دل و جان سے حصہ لیا۔ ان میں وہ عورتیں بھی تھیں جنھوں نے برسوں گاندھی جی کے ساتھ رہ کر ان کی تعلیم و تربیت سے فیض اٹھایا تھا۔ آزادی کے معنی جانتی تھیں اور اہنسا کا مفہوم سمجھتی تھیں۔ مگر ان کے علاوہ لاکھوں کروڑوں عورتیں، صرف ایک گاندھی جی کی زبان سے آزادی کی پکار سن کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ آخر شہروں، قصبوں، دیہاتوں کی ان پڑھ، قدامت پسند، پردہ دار عورتوں تک کیسے گاندھی جی کا یہ پیام پہنچا؟ کیسے وہ گھروں کی چار دیواری سے نکل کر، گرہستی سے دامن چھڑا کر، کھیتوں کی مینڈھیں پھلانگ کر آزادی کی لڑائی میں کود پڑیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب دینے کے لیے بہت کچھ تحقیق کی ضرورت ہے۔ مگر اتنا کہا جا سکتا ہے کہ گاندھی جی کے پیام میں کوئی ایسی پر اثر بات تھی جو سیدھی سادی عورتوں کے دلوں میں اترتی چلی گئی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ستیہ گرہ کی تحریک کو عورتوں نے اس خوبی اور خوش دلی سے اپنایا کہ مردوں سے بازی لے گئیں۔ تبھی تو گاندھی جی بار بار کہتے تھے کہ عورت ستیہ کی امین اور اہنسا کی دیوی ہے۔ ان عورتوں نے بدیسی کپڑوں اور شراب اور دوسری بدیسی اشیا کی دکانوں پر دھرنا دیا، نمک کا قانون توڑنے میں گاندھی جی کا ہاتھ بٹایا، جلسوں جلوسوں میں شرکت کی۔ عدم تشدد کی اس لڑائی میں لاٹھیاں کھائیں، گولیوں کا سامنا کیا، جیلوں میں چکی پیسی، اپنے گھر کو لٹتے اور جلتے دیکھا، اپنے بچوں، شوہروں، اپنے باپ اور بھائیوں کو آزادی کی دیوی کی بھینٹ چڑھایا مگر منہ سے اف نہ کی۔ خدا جانے گاندھی جی نے کیا جادو پھونکا تھا کہ دیش بھر کی بہت سی عورتیں یوں ایک دل ایک جان ہو کر اس کام میں لگ گئیں جیسے یہی ان کا اصلی کام ہے۔ اگرچہ بدیسی حکومت کی چال بازی اور ہندو مسلمانوں کی سادہ لوحی کی وجہ سے ان میں ایک دوسرے سے تعصب، نفرت اور دشمنی بھی پیدا ہوئی ـــــ اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے اثر سے عورتیں بالکل ہی آزاد رہی ہوں گی۔ مگر پھر بھی تاریخ آزادی شاہد ہے کہ عورتوں نے کبھی ہنسا (تشدد) سے کام نہیں لیا۔

ہندستانی عورت نے ـــــ ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی، کسی بھی مذہب، نسل، رنگ فرقے کی عورت نے ظلم اور تشدد کی گھناؤنی اور شیطانی حرکتوں میں ہاتھ نہیں ڈالا۔ یہ گاندھی جی کے اس قول کا کہ عورت ستیہ اور اہنسا کی دیوی ہے، امین ہے، اتنا بڑا ثبوت ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔

بہر حال جنگ آزادی میں عورت کو ساتھ لے کر گاندھی جی نے اس کے حقوق کے لیے راہ ہموار کی اور خود اسے اپنی طاقت کا احساس دلایا۔ جنگ آزادی میں عورت کے شریک ہونے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی بندشیں خود بخود ٹوٹ گئیں اور کچھ حقوق بن مانگے مل گئے۔

پھر گاندھی جی نے، اور ان کی رہنمائی میں سینکڑوں خواتین نے اس کے لیے منظم کوشش اور جد و جہد شروع کر دی کہ ہندستانی عورت کو مرد کے برابر حقوق ملیں۔ صرف آئین ہی میں نہیں بلکہ عملی زندگی میں بھی۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں آزاد ہندستان کے آئین میں عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں سمجھا گیا۔ دونوں کو یکساں حق ملے ہوئے ہیں۔ ووٹ کا حق جو اکثر مغربی ملکوں میں عورتوں کو بڑی جد و جہد اور مردوں سے باقاعدہ لڑائی لڑ کر ملا ہے، اور دنیا کے کتنے ہی ملکوں میں ابھی تک نہیں ملا، ہندستانی عورت کو آپ ہی آپ، اس کی قربانیوں کے بل پر مل گیا۔ یعنی یہ بات کسی کے خیال ہی میں نہیں آئی کہ اُسے اس بنیادی حق سے محروم بھی کیا جا سکتا ہے۔

آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ آزاد ہند کی عورت کو ہر عہدہ ہر درجہ ہر منصب حاصل ہو سکتا ہے۔ سروجنی نائیڈو، آزادی کی جد و جہد کی ایک ان تھک سپاہی، آزاد ہندستان کی سب سے بڑی ریاست یو۔ پی کی پہلی گورنر تھیں جنھوں نے اپنا کام بڑی شان، آن بان اور قابلیت سے انجام دیا۔ وجے لکشمی پنڈت روس جیسے بڑے ملک میں ہندستان کی سفیر رہیں اور دنیا میں پہلی خاتون تھیں جو اقوام متحدہ کی صدارت کے منصب پر فائز ہوئیں۔ اور آج تو شریمتی اندرا گاندھی ہندستان کی وزیر اعظم اور رہنما بھی ہیں۔

عورت کا درجہ اور کام

گاندھی جی کی کوشش کی بدولت عورتوں نے جنگ آزادی میں

حصہ لیا۔ ان کو جو سیاسی حقوق ملے وہ اپنی جگہ بہت اہم ہیں۔ لیکن ان سماجی حقوق کے مقابلے میں وہ کچھ بھی نہیں جو گاندھی جی نے ہندستانی عورت کو دلوائے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ سیاسی دنیا میں عورت کا ایک مقام بنانا بہت بڑا کام تھا مگر اس سے کہیں کٹھن اور اہم کام گاندھی جی نے ہندستانی سماج کے ان ناانصافیوں کے پہاڑ کو گرا کر انجام دیا جس کے نیچے ہندستانی عورتیں پڑی سسک رہی تھیں۔

عورت اور مرد کا درجہ برابری کا ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو اس برابری کے معنی اصل میں کیا ہیں؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر سیکڑوں برس سے بحث ہو رہی ہے لیکن آج تک پوری طرح حل نہ ہو سکا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے چودہ سو سال پہلے عورت کو حقوق عطا کیے تھے جو انسان ہونے کے ناطے اس کا حق تھا، اور جن کے بارے میں دنیا کو صدیوں تک سوچنا پڑا تھا کہ عورت ان کو پانے کے قابل ہے یا نہیں۔ کتنے ہی آزاد ملک، جو اپنے آپ کو ترقی پذیر کہتے ہیں، آج تک بھی عورتوں کو پوری طرح مردوں کے برابر حق دینے کے خلاف ہیں لیکن ادھر کئی صدیوں سے، خود مسلمان عورت، کم سے کم ہندستان میں اپنے بہت سے حقوق سے محروم ہو گئی تھی جو اس کو مذہب کی رو سے ملے ہیں۔ جہاں تک رسم و رواج اور سماجی بندشوں کا تعلق ہے، مسلمان مرد نے بھی اسلام کے حکم کے خلاف اس پر کتنی ہی پابندیاں لگا دیں اور اس کے کتنے ہی حقوق غصب کر لیے تھے۔ مثلاً بیوہ کی شادی نہ کرنا، بیوی سے خلع کا حق چھین لینا، بیٹی کو باپ کی جائیداد میں حصہ پانے سے محروم کر دینا۔ زبانی جمع خرچ کی اور بات ہے مگر عملی طور پر جانے کتنے عرصے سے ہندستان کی مسلمان عورت کا بھی قریب قریب وہی حال تھا جو اس کی اور بہنوں کا تھا۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ گاندھی جی نے جو کچھ کیا وہ صرف ہندو عورت کی بھلائی کے لیے کیا تھا، غلط ہے۔ اس سے جو فائدہ ہندستانی عورت کو ہوا، اس میں سبھی مذہبوں کی عورتیں شامل ہیں۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، گاندھی جی عورت اور مرد کی برابری کے قائل تھے اور انھیں یہ بات سخت ناگوار تھی کہ عورت کو مرد کا محکوم یا غلام سمجھا جائے۔ ان کا کہنا تھا:

"اس میں شک نہیں کہ مرد عورتوں کو نظر انداز کرنے کے، بلکہ ان کے ساتھ بدسلوکی کرنے کے ملزم ہیں اور انھیں اس کا مناسب کفارہ ادا کرنا چاہیے ..."

لیکن اس خرابی کی اصلاح کے لیے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی کوشش کرنی ہے۔ فرماتے ہیں:

"ان عورتوں کو جنھوں نے وہموں کی زنجیریں توڑ دی ہیں اور اپنے حقوق کا احساس رکھتی ہیں خود بھی اصلاح کا کام کرنا چاہیے"

عورت اور مرد میں کسی طرح کا قانونی فرق گاندھی جی کو گوارا نہ تھا۔

"میں عورتوں کے حقوق کے معاملے میں کسی قسم کا سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ میرے خیال میں اس پر کوئی ایسی قانونی پابندی نہیں لگنی چاہیے جو مرد پر نہ لگی ہو۔ میرے نزدیک لڑکے اور لڑکیوں سے پوری برابری کا سلوک ہونا چاہیے......"

ایک جگہ انھوں نے لکھا:

"عورت مرد کی رفیق ہے جسے وہی سب ذہنی صلاحیتیں خدا کی طرف سے ملی ہیں (جو مرد کو ملی ہیں) اُسے سب چھوٹے بڑے کاموں میں مرد کے برابر حصہ لینے کا حق ہے اور اُسے آزادی اور خود مختاری کے وہی سب حقوق حاصل ہیں جو مرد کو ہیں..... اُسے اپنے دائرے میں وہی برتری حاصل ہے جو مرد کو اپنے دائرہ عمل میں ہے......"

مرد نے کبھی تعریف کے پردے میں کبھی ذلت اور حقارت کے انداز میں عورت کو صنف لطیف یا کمزور جنس کہا اور ساتھ ہی عورت کے دل میں یہ یقین بٹھا دیا کہ وہ فطری طور پر ذہنی اور جسمانی لحاظ سے کمزور پیدا ہوئی ہے اس لیے وہ مرد کی، جو طاقت ور اور عقل مند ہے کسی طرح برابری نہیں کر سکتی۔ لیکن گاندھی جی عورت کو کمزور نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس قدیم مفروضے کو یہ کہہ کر یکسر مسترد کر دیا کہ طاقت کیا صرف حیوانی طاقت کا نام ہے؟ انھوں نے مرد کو سختی سے تنبیہہ کی:

"عورت کو صنف نازک کہنا اس کی توہین اور مرد کی زیادتی ہے۔ اگر طاقت سے مراد حیوانی طاقت ہے تو اس میں شک نہیں کہ عورت حیوانیت میں مرد سے کم ہوتی ہے۔ لیکن اگر طاقت سے مراد روحانی طاقت لی جائے تو عورت مرد سے کہیں زیادہ بلند ہے ——"

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ گاندھی جی کے نزدیک عورتیں مردوں کے سب کام کرسکتی تھیں اور ان کو کرنا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ قدرت نے کچھ صلاحیتیں مرد کو زیادہ دی ہیں اور اُسے ان سے کام لینا چاہیے۔ کچھ صلاحیتیں خاص طور پر عورت ہی کو ملی ہیں۔ (اور ان صلاحیتوں کو وہ زیادہ قدر اور احترام کی نظر سے دیکھتے تھے) اس کو فطرت نے کچھ ایسے کام سپرد کیے ہیں جن کو مرد کر ہی نہیں سکتا۔ اس کے باوجود اُسے کمزور جنس سمجھنا یا گھٹیا ثابت کرنا مرد کی خود غرضی اور خود پرستی ہے۔ مگر جہاں گاندھی جی نے مرد اور عورت کے مساوی حقوق پر زور دیا وہاں عورتوں کو بھی بتایا کہ مساوات کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے فطری کام اور گھریلو فرض انجام نہ دیں یا ان کاموں کو کم تر سمجھیں — وہ ان کو بھی اتنا ہی عظیم سمجھتے تھے جتنا قوم اور ملک کی خدمت کے دھوم دھام کے کاموں کو۔ ان کا کہنا تھا کہ بچوں کی پرورش اور تربیت اور گھرداری کے فرائض جو قدرت نے عورت کے ذمے کیے ہیں وہ خود بہت اہم ہیں۔

"میں زندگی کا جو نظام چاہتا ہوں اس میں ہر شخص کو اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرنا ہوگا اور اُسے اس کا معاوضہ ملے گا۔ عورتیں ملک کے دوسرے کاموں میں بھی شرکت کریں گی مگر ان کا اصلی کام گھر کا کام ہے......"

گاندھی جی اس کے قائل نہیں کہ مرد اور عورت الگ الگ مخلوق ہیں اور ان کے مسائل الگ الگ ہیں:

"میرے خیال میں جس طرح مرد عورت اصل میں ایک ہیں ان کا مسئلہ بھی بنیادی طور پر ایک ہی ہونا چاہیے۔ رُوح دونوں میں ایک ہی ہے۔ دونوں ایک سی زندگی بسر کرتے ہیں.... ایک سا احساس رکھتے ہیں،..... ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرتے ہیں.... ایک کا دوسرے کی عملی مدد کے بغیر زندہ رہنا مشکل ہے......"

جب یہ اٹل سچائی مان لی جائے پھر دونوں میں حاکم اور محکوم کا فرق باقی نہیں رہ سکتا۔ اس لیے مرد کا حاکم بن جانا اور عورت کو محکوم بنا لینا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟

مگر کچھ ایسا ہوا کہ مرد عورت پر حکومت کرنے لگا اور صدیوں سے کر رہا ہے۔ اس سے عورت میں کمتری کا احساس پیدا ہو گیا ہے اور وہ مرد کی اس خود غرضانہ بات کو سچ سمجھنے لگی ہے کہ وہ مرد سے گھٹیا ہے۔ مگر جو عاقل مردوں میں گزرے ہیں انھوں نے عورت کے برابری کے درجے کو مانا ہے...

عورت کو اس کا مقام اور فرائض سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ماں کے فرائض جو بہت زیادہ عورتوں کو انجام دینے پڑتے ہیں ان کے لیے وہ صفات چاہئیں جن کا مردوں میں ہونا ضروری نہیں۔ عورت در اصل گھر کی مالک ہے۔ مرد روزی کماتا ہے، عورت اسے رکھتی اور بانٹتی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے خبرگیری کرنے والی ہے۔ بچوں کا پالنا اس کا خاص حق ہے جس میں کوئی اور اس کا شریک نہیں۔ اگر وہ خبرگیری نہ کرے تو انسان کی نسل ہی مٹ جائے۔"

یہاں مجھے پھر حالی کی چپ کی داد کے شعر یاد آرہے ہیں۔ ان کے اور گاندھی جی کے خیالات میں کتنی ہم آہنگی تھی۔ دیکھیے:

لیتیں خبر اولاد کی مائیں نہ گر بچپن میں یاں
خالی کبھی کا نسل سے آدم کی ہو جاتا جہاں

وہ دین اور دنیا کے مصلح جن کے وعظ و پند سے
ظلمت میں باطل کی ہوا، دنیا پہ نورِ حق عیاں

وہ علم اور حکمت کے بانی جن کی تحقیقات سے
ظاہر ہوئے عالم میں اسرارِ زمین و آسماں

کیا پھول پھل یہ سب انھیں کمزور پودوں کے نہ تھے
سینچا تھا ماؤں نے جنھیں خونِ جگر سے اپنے یاں

کیا صوفیانِ باصفا کیا عارفانِ باخدا
کیا انبیا کیا اولیا کیا غوث کیا قطبِ زماں

سرکار سے مالک کے جتنے پاک بندے ہیں بڑھے
وہ ماؤں کی گودوں کے زینے سے ہیں سب اوپر چڑھے

عورت ماں ہے، محافظ ہے، پالن ہار ہے، اس لیے اہنسا کی سچی امین اور سچائی اور امن کی دیوی ہے۔ اُسے ان عظیم خدمات سے ہٹا کر ایسے کاموں میں لگانا جو بنانے کی جگہ بگاڑ پیدا کریں جن میں اہنسا نہیں ہنسا سے کام لیا جاتا ہو، گاندھی جی کے نزدیک انتہائی افسوس ناک بات ہے:

میرے خیال میں اس میں مرد عورت دونوں کی ذلت ہے کہ عورت کو گھر چھوڑ کر، گھر کی حفاظت کے لیے 'بندوق اٹھانے پر مجبور یا آمادہ کیا جائے۔ یہ وحشیانہ زندگی کی طرف لوٹنا ہے اور تباہی کی تمہید ...... عورت مرد کی جگہ گھوڑے پر سوار ہو (یعنی میدانِ جنگ میں جائے) تو اس کی اور اپنی دونوں کی ذلت کرتی ہے۔ اس کا گناہ مرد کے سر ہوگا کہ وہ عورت کو اس کا خاص کام چھوڑنے پر مجبور کرتا یا اس کو ترغیب دیتا ہے .... گھر کو اچھی حالت میں رکھنا بھی اتنا ہی بہادری کا کام ہے جتنا اُسے باہر کے کسی حملے سے بچانا ......"

عورت گھر کا کام انجام دیتی ہے اور کھیتی باڑی میں مرد کا ہاتھ بٹاتی ہے تو اس طرح گھر بار، بال بچوں کا خرچ اٹھانے میں وہ مرد کے ساتھ شریک ہے۔ اس بات کی وجہ سے کہ مرد پیسہ کما کر لاتا ہے اس کی اہمیت نہیں بڑھ جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"عورتیں لوہار اور بڑھئی نہیں ہوتیں لیکن کھیتوں میں مرد عورت دونوں مل کر کام کرتے ہیں جس میں بھاری کام مرد کے ہاتھوں بنتا ہے۔ عورتیں گھر کی دیکھ ریکھ بھی کرتی ہیں۔ وہ بھی خاندان کی تھوڑی سی آمدنی میں کچھ اضافہ کرتی ہیں لیکن اصل کمانے والا مرد ہے ......"

یعنی خاندان کے اخراجات کے لیے پیسہ پیدا کرنے کی اصل ذمہ داری مرد کے سر ہے اور بچوں کی پرورش اور خدمت کی ذمہ دار عورت ہے۔ اس سے نہ ایک کا درجہ بڑھتا ہے نہ دوسرے کا گھٹتا ہے۔

یہ تو عمل کی تقسیم ہے جو کچھ تو قدرت نے کی ہے اور کچھ سماج نے۔

بچوں کی پرورش اور گھر داری کے کام (چند بہت پرانی تہذیبوں کو چھوڑ کر) ہمیشہ ہی سے عورت کرتی آئی ہے۔ لیکن اس کٹھن کام میں اُسے کس طرح دن اور رات کا چین آرام قربان کرنا اور اپنا خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے، اس کو مرد نے نہ کبھی پوری طرح سمجھا نہ اقرار کیا، اور نہ اہمیت دی۔ وہ اپنے کو یہی دھوکا دیتا رہا کہ اصل کام پیسہ کمانا ہے اور چونکہ یہ فرض وہ ادا کرتا ہے اسی لیے وہ سردار ہے، حاکم ہے، اہم ہے، افضل ہے۔ گاندھی جی نے بار بار کہا، ڈنکے کی چوٹ پر کہا کہ گھر گرہستی کا کام کوئی آسان یا معمولی کام نہیں، بڑا کٹھن کام ہے اور اتنا ہی اہم ہے جتنا مردوں کا بڑے سے بڑا کام۔ سچ تو یہ ہے کہ جتنے بھی نیک اور خدا رسیدہ بندے دنیا میں آئے انھوں نے اس سچائی کو مانا اور عورت کی عظمت کا اعتراف کیا۔ مگر بدقسمتی سے ان پیمبروں، عارفوں اور مصلحوں کی بات پر مردوں نے عام طور پر دھیان نہیں دیا، ورنہ یوں تو ہر زمانے میں ایسے مرد ہوئے ہیں اور اب بھی ہیں جو عورت کی عزت کرتے، اُسے برابری کا درجہ دیتے اور اس کا ہر طرح خیال کرتے ہیں۔ گاندھی جی نے بھی یہ بات بار بار دہرائی، یاد دلائی اور عورت کی اہمیت اور عظمت مرد کو سمجھائی اور تنبیہہ کی کہ اگر تم نے اپنے رویے میں اصلاح نہ کی تو دنیا میں بھی برے نتائج بھگتنے پڑیں گے اور خدا کے سامنے بھی جواب دینا ہوگا۔

"میں ہندو ہوں، تم مسلمان ہو، یا میں گجراتی ہوں اور تم مدراسی ہو، ہمیں اس تنگ نظری کو یکسر فراموش کر دینا چاہیے۔ ہمیں مشترک بھارتی قومیت میں "میں" اور "میرا" کے احساس کو بالکل مٹا دینا چاہیے۔"

——— مہاتما گاندھی

عوام سے تخاطب

عالم ارواح سے باپو کی تین آوازیں

عمر انصاری

پہلی آواز

جس صبح کی خاطر برسوں ہم بیزار غمِ جاناں سے رہے
جس صبح کی خاطر برسوں ہم مانوس درِ زنداں سے رہے
جس صبح کی خاطر برسوں ہم بے دل سے رہے بے جاں سے رہے
اُٹھی ہے جو مل کر آنکھ اُبھی
یہ صبح وہی ہے کیا لوگو؟

(وقفہ)

دوسری آواز

خوابوں میں کبھی دیکھا تھا جسے ذہنوں میں کھلا رکھا تھا جسے
صد جانِ چمن جانا تھا جسے، درمانِ محن سمجھا تھا جسے
ہر گوشۂ صحنِ گلشن میں دے دے کے لہو سینچا تھا جسے
یہ پھول جسے تم کہتے ہو
یہ پھول وہی ہے کیا لوگو؟

(پھر وقفہ اور)

تیسری آواز

چھپ چھپ کے سجائی جاتی ہے جو بزمِ طرب صیادوں کی
بکھرے ابھی تک رستے کا جو راہ میں شبنم زادوں کی
گزری ہے جو ہو کر دل سے ابھی پہنے ہوئے پائل یادوں کی
دلدار ہو جو سے خواروں کی
یہ شام وہی ہے کیا لوگو؟

ندیم الواجدی

مغرب کے قدیم افسانوی رجحانات

اردو افسانے کی صحیح معنی میں بہت تھوڑی عمر ہے۔ پروفیسر احتشام حسین کی تحقیق کے مطابق اردو کا پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" پریم چند نے ۱۹۰۵ء میں لکھا تھا لیکن ہمارے افسانے کے ابتدائی تیس سالوں میں داستانی رنگ اور مقصدیت کی چھاپ غالب رہی۔ دوسرے لفظوں میں اردو افسانہ داستانوں سے بہت زیادہ قریب رہا۔ درحقیقت اردو کے نئے افسانے کی ابتدا نئے ادب کی تحریک کے ساتھ ساتھ ہوئی اور اسی دور میں اسے ایک مقبول صنف ادب کا درجہ حاصل ہوا۔ ہمارے افسانے کی تشکیل و ارتقا میں مغربی افسانے نے اہم اور موثر رول ادا کیا ہے۔ مغربی افسانے کے جو اثرات ہم نے قبول کیے وہ ہمارے متعدد افسانہ نگاروں کے ہاں نہ صرف نمایاں ہیں بلکہ انھوں نے مغرب کے افسانہ نگاروں کے طرز و اسلوب کو اپنانے کی بھی کوشش کی۔ منٹو کے افسانوں میں موپاساں کا اثر ملتا ہے، اور چیخوف کے اثرات بیدی، حیات اللہ انصاری، حسن عسکری وغیرہ کے یہاں ملتے ہیں۔ احمد علی کا نکا سے متاثر ہیں، اور قرۃ العین حیدر کے یہاں ورجینا وولف کے افسانوں کا انداز ملتا ہے۔ قبول و جذب کا یہ سلسلہ بہت طویل ہے۔ اس موقع پر مغرب کے ان افسانوی رجحانات کا جائزہ لینا مقصود ہے جو ہمارے افسانے کی تشکیل میں معاون بنے ہیں۔ ایک مشہور افسانہ نگار یوڈورا ولٹی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اچھے افسانہ نگار وہی ہوتے ہیں جن میں تلاش اور جستجو ہوتی ہے اور جو دوسروں کے افسانوی ادب میں جھانکنے کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ اردو افسانے کو بھی کچھ ایسے ہی افسانہ نگار ملے جنھوں نے اردو کے افسانے کو مغرب کے افسانوں کے برابر لا کر کھڑا کر دیا۔ آج ہمارا افسانہ اتنا معیاری ہے کہ مغرب کے افسانوی ادب کے مقابلے میں بلا تکلف پیش کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے افسانے نے مغربی افسانے سے اثر ضرور لیا ہے لیکن مغربی افسانے کو اپنے اندر اس طرح جذب کیا ہے کہ اس کی اپنی انفرادیت اور اپنا مزاج بھی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ باقی رہا۔ نئے ادب کی تحریک کا آغاز ۳۷-۱۹۳۶ء میں ہوا اور تقریباً اسی دور میں اردو افسانے کی پہلی ضبط شدہ کتاب "انگارے" شائع ہوئی۔ "انگارے" کے تمام افسانے گویا روایت سے بغاوت تھے۔ ان کے ذریعہ ایسے خیالات و نظریات سامنے لائے گئے جنھیں اس سے پہلے پیش نہیں کیا گیا تھا۔ مثال کے طور پر رشید جہاں نے اپنے افسانے میں عورت کی آزادی اور اس کے حقوق کی حفاظت کے اہم مسئلے پر قلم اٹھایا۔ اردو میں سوشل ریلزم، سرریلزم اور اسی قسم کے دوسرے رجحانات بھی "انگارے" کے افسانہ نگاروں کے رہین منت ہیں۔

اس دور میں جو افسانوی تحریک سب سے زیادہ نمایاں طور پر سامنے آئی وہ سوشل ریلزم (سماجی حقیقت نگاری) کے نام سے مشہور ہے۔ اس تحریک کے ذریعہ یہ بات سامنے لائی گئی کہ افسانے میں صرف معاشرتی مسائل ہی پیش نہیں کیے جا سکتے بلکہ سیاسی، سماجی اور جنسی مسائل کو بھی نمایاں دخل ملنا چاہیے۔ تقریباً "انگارے" کے ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری جیسے نقاد کی آواز بھی ابھری۔ انھوں نے ادب کو زندگی اور انقلاب کے ساتھ ہم آہنگ

کرنے کا عزم کیا۔ ان سب کاوشوں نے مل کر بہت سے افسانہ نگاروں کے یہاں یہ رجحان پیدا کر دیا کہ وہ زندگی کو اس کی تمام حقیقتوں کے ساتھ پیش کریں اور یہ رجحان اردو افسانے میں اس طرح رچ بس گیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں اس رجحان کے حامل افسانہ نگاروں کی ایک کھیپ تیار ہو گئی۔ اس قسم کے افسانہ نگاروں کی فہرست بہت طویل ہے تاہم نمایندہ حضرات یہ ہیں۔ منٹو، بیدی، عصمت، حیات اللہ انصاری، رشید جہاں، اشک، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، اختر اورینوی، بلونت سنگھ، رام لعل اور دوسرے افسانہ نگار۔ ان لوگوں نے سیاسی اور سماجی حقیقت نگاری کے مسائل اردو کے افسانوی ادب میں کامیابی کے ساتھ پیش کیے اور اس طرح اس دور کے اہم رجحان کے تئیں اپنی ہم آہنگی کا ثبوت فراہم کیا۔ سیاست زندگی کے بہت بڑے مقصد کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ اسپین کی خانہ جنگیوں میں ادیب حصہ لے رہے تھے۔ سیاست اور ادب میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اردو افسانہ نگاروں نے بھی ان کوششوں کو سراہا بلکہ عملی جد و جہد بھی کی۔ اس سلسلے میں ہمارے افسانہ نگار مغرب کے جن افسانہ نگاروں سے متاثر ہوئے ان میں ٹالسٹائی، ترگنیف، چیخوف، گورکی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

سیاسی، معاشرتی اور معاشی مسائل کے علاوہ سماجی حقیقت نگاری کے جس مخصوص جز کو اپنایا گیا وہ جنسی حقیقت نگاری (SEX REALISM) تھا۔ اس سلسلے میں ہمارے بہت سے ادیبوں نے خاصے تجربے کیے اور بعض تو جنس نگاری کے ساتھ کچھ اس طرح چپکے کہ پھر علاحدہ نہ ہو سکے۔ ان لوگوں میں منٹو، عصمت، عزیز احمد اور ممتاز مفتی وغیرہ شامل ہیں۔ منٹو نے براہ راست موپاساں سے اثر لیا۔ ان کے افسانوں میں موپاساں کے اثرات کی وجہ سے لوگ انھیں اردو کا موپاساں سمجھنے لگے۔ چیخوف نے اپنے ایک افسانے کے کردار سے موپاساں کی حقیقت نگاری کو پسند کرتے ہوئے یہ الفاظ کہلائے تھے:

"زندگی زندگی زندگی، موپاساں کے ہاں زندگی ہے، زندگی موپاساں کے ہاتھوں ڈھل کر افسانے بن جاتی ہے"

اور جب اردو کی مشہور ادیبہ ممتاز شیریں نے اپنے ایک مضمون میں منٹو اور موپاساں کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا تو وہ یہ بھی لکھ گئیں۔ زندگی، زندگی، زندگی منٹو کے ہاں زندگی ہے۔ زندگی منٹو کے ہاتھوں ڈھل کر افسانہ بن جاتی ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ منٹو موپاساں کے بہت زیادہ قریب ہیں۔ منٹو کے افسانے جن موضوعات پر ہوتے ہیں وہ موپاساں کے موضوعات کی طرح جنس، شہوت، ہیجانی جذبے، ظلم، ایذا وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ موپاساں کے افسانے پڑھ کر انسان ایک گندے روپ میں سامنے آتا ہے۔ موپاساں کا انسان خواہشات نفسانی کا اسیر ہے، بدصورت، بدسیرت اور ظالم ہے۔ منٹو کے یہاں بھی انسان کا یہی تصور ملتا ہے۔ دونوں افسانہ نگاروں کے نزدیک جو انسانیت، انسانیت کہلائے جانے کی مستحق ہے، وہ بہت خوبصورت اور قابل قدر ہے۔ عصمت چغتائی نے مجموعی حیثیت سے جنس نگاری کی تحریک کو اپنایا اور اس میں نت نئے تجربے کیے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ عصمت کسی مغربی افسانہ نگار سے متاثر ہوئی ہیں یا نہیں؟ لیکن یہ صحیح ہے کہ انھوں نے ڈرامہ نگاری کے سلسلے میں برنارڈ شا سے کافی اثر لیا ہے۔

منٹو اور عصمت کی طرح عزیز احمد کے یہاں بھی ایسے افسانوں کی خاصی تعداد ہے جن میں انھوں نے جنسی حقیقت نگاری پر بڑی کامیابی کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں عزیز احمد نے جن فرانسیسی جنس نگاروں کے اثرات قبول کیے ان میں ہکسلی کا نام بہت اہم ہے۔ خود عزیز احمد کا کہنا یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں اور ناولوں میں ہکسلی سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ ممتاز مفتی کے افسانے جنسی نفسیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے اس قسم کے افسانے لکھ کر اردو میں ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی۔ ممتاز مفتی کے بعض ایسے افسانوں کو اردو افسانے کی تاریخ میں شاہکار کا درجہ دیا گیا ہے چنانچہ ان کے دو افسانے "آپا" اور "ماتھے کا تل" بے حد مقبول ہوئے۔ ان کے بہترین افسانے وہ ہیں جن میں نفسیات ایک زیریں حقیقت

کے طور پر اپنائی گئی۔

جنسی نفسیات پر ممتاز مفتی کے علاوہ منٹو اور عصمت نے بھی بڑی کامیابی کے ساتھ لکھا۔ چنانچہ عصمت کا 'لحاف' اور منٹو کا 'بلاؤز' اس قبیل کے بہترین افسانے ہیں۔ بعد میں انسانی نفسیات کے سلسلے میں تو متعدد افسانہ نگاروں نے خاصے تجربے کیے لیکن جنسی نفسیات کو عصمت سے متاثر ہونے والی دو بہنوں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے علاوہ بہت کم افسانہ نگاروں کے یہاں جگہ ملی۔۔۔۔

سوشل ریلیزم' یا سماجی حقیقت نگاری کے بعد جس مغربی تحریک نے ہمارے یہاں بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی وہ ایکسپریشنزم ہے۔ ایکسپریشنزم یا اظہاریت یا باطن نگاری ایک ایسی غیر معمولی ذہنی کیفیت کے انعکاس کا نام ہے جس میں ذہن ایسے عجیب خیالات سے متصادم ہوتا ہے جو حقیقت میں موجود نہ ہوں۔ اس کیفیت کے انعکاس کا نام ہی اندرونی اظہار ہے۔

ہمارے یہاں اس رجحان کو پیش کرنے والوں میں حیات اللہ انصاری، عزیز احمد، منٹو اور جاوید اقبال جیسے فن کار کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ عزیز احمد کا 'جھوٹا خواب'، حیات اللہ انصاری کا 'شکر گزار آنکھیں'، منٹو کا 'فرشتہ' اور جاوید اقبال کا 'پیغمبر' اس ذیل میں قابل ذکر ہیں۔ منٹو کا "فرشتہ" جب بیماریوں اور پریشانیوں میں گھر کر موت سے ہمکنار ہوتا ہے تو یہ بھی اظہاریت کی ایک کامیاب تصویر ہے۔ حیات اللہ انصاری نے 'شکر گزار آنکھیں' میں ایسی دو شکر گزار آنکھوں کی کہانی پیش کی ہے جو ایک قاتل کی طرف اٹھتی ہیں اور قاتل ان آنکھوں سے اپنے جسم میں سوزش اور جلن سی محسوس کرتا ہے۔ قاتل کو احساس ہوتا ہے کہ وہ شکر گزار آنکھیں اس کے بدن میں گھس رہی ہیں، نشتر سے چبھو رہی ہیں اور اس کا پورا جسم زخموں سے چور چور ہوا جا رہا ہے۔ قاتل سمجھتا ہے کہ ان زخموں کی وجہ سے وہ اپنے زخموں کا کفارہ ادا کر چکا ہے۔ عزیز احمد کے افسانوں میں ایسے واقعات ہوتے ہیں جو بیداری میں وقوع پذیر نہیں ہو سکتے۔ ان کا تعلق خواب سے ہوتا ہے۔ جھوٹا خواب میں بھی اسی قسم کی باطن نگاری پائی جاتی ہے۔

ایک اور تحریک جو بہت اہم ہے "خود وجودیت" ہے۔ یہ تحریک کیرکے گارد کے فلسفے سے ماخوذ ہے۔ ہمارے یہاں یہ تحریک فرانسیسی ادیبوں کے ذریعے آئی اور فرانسیسی میں بھی اس تحریک کو متعارف کرانے کا سہرا سارتر کے سر ہے۔ سارتر ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفے کی پیچیدگیوں سے بھی واقفیت رکھتا تھا۔ اس لیے اس نے بڑی آسانی سے کیرکے گارد کے فلسفے کو ادب میں پیش کر دیا۔ اردو افسانے میں خود وجودیت کو ظاہر کرنے والی تخلیقات خال خال ہی ہیں۔ انتظار حسین کا افسانہ 'چاند گہن' اس سلسلے کی کامیاب کوشش ہے۔

رمزیت کا رجحان ہمارے افسانہ نگاروں میں احمد علی اور حیات اللہ انصاری کے یہاں ملتا ہے۔ حیات اللہ انصاری سوشل ریلیزم کے افسانہ نگار ہیں۔ رمزی تحریریں ان کے یہاں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ لیکن جو ہیں وہ معیاری ہیں۔ اپنے افسانے 'ماں بیٹا' میں انھوں نے رمزیت کو ہی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ احمد علی کے یہاں رمزیت پوری طرح موجود ہے۔ احمد علی کی تحریریں رمزی کیفیت کے علاوہ دوسرے رجحانات بھی پیش کرتی ہیں لیکن ان کا خاص رنگ رمزی اور فلسفیانہ ہے۔ احمد علی کافکا کی رمزیت سے متاثر ہیں۔ کافکا کے یہاں مشاہدے کی گہرائی اور باریک بینی پائی جاتی ہے۔ بالکل یہی حال احمد علی کا ہے۔ احمد علی کی رمزیت کو ظاہر کرنے والی بعض خاص خاص تحریریں 'قید خانہ'، 'بند کمرہ'، اور 'موت سے پہلے' ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ رمزیت کے واحد نمائندہ احمد علی ہیں لیکن یہ بات غلط ہے بلکہ بعض دوسرے افسانہ نگاروں مثلاً بیدی، قرۃ العین حیدر وغیرہ کے یہاں بھی شعوری یا لاشعوری طور پر رمزیت پائی جاتی ہے۔ البتہ سرریلزم وہ واحد رجحان ہے جس کا نمائندہ احمد علی کو کہہ سکتے ہیں۔ سرریلزم وہ خیال ہے جو اپنی اصلی شکل میں انسانی دماغ میں اپنا سلسلہ جاری رکھتا ہے اور اس کے درمیان کسی قسم کی اخلاقی، عقلی یا جمالیاتی رکاوٹ نہ پائی جائے۔

اسی طرح شعوری تسلسل (FLOW OF CONCIOUSNESS)

کا رجحان بھی صرف حسن عسکری کے افسانوں ہی میں پایا جاتا ہے اور ان کے بعد شاذ ہی کسی نے اُسے اپنانے کی کوشش کی ہے۔ مجموعی حیثیت سے حسن عسکری جیمز جوائس سے متاثر ہیں اِس کا اظہار انھوں نے خود اپنے افسانوی مجموعے 'جزیرے' کے دیباچے میں کیا ہے۔ لیکن شعوری رو کے سلسلے میں جوائس اور پروست سے اثر لیا ہے اور مغرب میں یہی دو فن کار اس تحریک کے بانی ہیں۔

ایک اور افسانوی رجحان جو مغرب سے ہمارے ادب میں آیا 'سہ بعد' (THREE DIMENSIONAL) کے نام سے مشہور ہے۔ 'سہ بعد' کا مطلب ہے طول' عرض' عمق' یعنی ایک موضوع پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالنا۔ لیکن اس رجحان کے تحت ہمارے یہاں بہت کم افسانے لکھے گئے ہیں۔ کرشن چندر' عزیز احمد وغیرہ کے افسانے اس سلسلے میں پیش کیے جا سکتے ہیں' 'تینوں بعد' کے تحت لکھے گئے افسانوں میں ایک موضوع پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔ جیسے کرشن چندر کے افسانے 'ان داتا' میں بنگال کے قحط کو مختلف انداز سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'ان داتا' میں ان لوگوں کا المیہ بھی ہے جو اس مشکل میں پھنسے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کی جھوٹی اور لفظی ہمدردیوں کا افسانہ بھی ہے جو دور کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ایک ایسے غیر ملکی سفیر کے رویے کو بھی پیش کیا گیا ہے جس نے اس حادثے سے بے اعتنائی کا ثبوت دیا تھا۔ اس طرح ایک موضوع پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عزیز احمد نے اپنے افسانے "مدن سینا اور صدیاں" میں مختلف ملکوں کی پرانی اور مشہور داستانوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے علاوہ انفرادیت میں ڈوبے ہوئے خیالات و احساسات کے حامل افسانے اور اجتماعی شعور کو ظاہر کرنے والے افسانے بھی موجود ہیں۔ ایسے افسانے بھی لکھے گئے ہیں جن میں صرف ایک موڈ کی گرفت ہے اور یہ سب مغربی رجحانات سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں۔ چنانچہ منٹو کا افسانہ "بابو گوپی ناتھ" اور حسن عسکری کا افسانہ 'حرامجادی' انفرادی افسانے ہیں غلام عباس کا افسانہ 'آفندی' اجتماعی شعور ظاہر کرتا ہے۔ قدرت اللہ شہاب کے افسانے 'تلاش' میں صرف ایک موڈ کی گرفت ہے۔

یہ چند تحریکات و رجحانات ہیں جنھوں نے اردو افسانے کی تشکیل و ارتقا میں موثر رول ادا کیا ہے۔ حقیقت نگاری' آزاد تلازمِ خیال' اظہاریت' رمزیت' سہ بعد' شعوری تسلسل کے علاوہ چند اور بھی تحریکیں ہیں جنھیں اردو افسانے میں جگہ دی جاتی رہی ہے۔ چنانچہ تحلیل نفسی' مارکسیت' تہذیبی شعور' لاشعور کی دنیا ایسے ہی مختلف رجحانات ہیں جو قابلِ ذکر ہیں۔

★

" عدم تشدد بزدلی کی نقاب نہیں ہے، بلکہ ایک بہادر انسان کا اعلیٰ ترین وصف ہے۔ شمشیر زنی کی مہارت کے مقابلے میں عدم تشدد کے اصول کی پیروی کرنے میں زیادہ بہادری کی ضرورت ہوتی ہے "

——— مہاتما گاندھی

میکش غازیپوری

چراغ روز ہی یوں تو جلائے جاتے ہیں
حیات بخش ہے لیکن یہ "شامِ دیوالی"
شکست دی تھی اندھیروں کو آج اجالے نے
یہ جشنِ فتح و ظفر ہے بنامِ دیوالی

اندھیرے ظلم و ستم کے ہوں یا جہالت کے
جبینِ نوعِ بشر داغدار کرتے ہیں
اندھیرا تنگ دلی ہو اندھیرا کم نگہی
جو کور دل ہیں اندھیروں سے پیار کرتے ہیں

اندھیرا امن کا قاتل ہر پیار کا دشمن
اندھیرا ظلم و تشدد ہے فتنۂ شر ہے
اندھیرا روپ بدلتا ہو گو تڑے کا کہیں
کہیں یہ صادق و جے چند و میر جعفر ہے

اندھیرا پستی کردار کی نشانی ہے
غلط روی یہ سکھاتا ہے نونہالوں کو
اندھیرا نور سے الجھا ہے ہر زمانے میں
مگر یہ جیت نہ پایا کبھی اجالوں کو

اجالا نورِ سحر ہے اجالا حسنِ قمر
اجالا پھولوں کی خوشبو اجالا رنگِ بہار
اجالا آئینۂ اتحاد و یک جہتی
اجالا صلح کی تنویر آشتی کا نکھار

اجالا محنتِ مزدور کا پسینہ ہے
اجالا کھیتوں کے دہقاں کی لستانِ عظیم
اجالا رام کی سچائی درس گوتم کا
اجالا گاندھی کے ایثار و عزم کی تعلیم

ہم اہلِ ہوش جو وارث ہیں ان اجالوں کے
دوام بخشیں جو انکو وہ گیت گائیں گے
حیاتِ امن و محبت کی جو ضمانت ہو
ہمیشہ ایسے چراغِ وفا جلائیں گے

آشون ۱۸۹۵ شک

شباب للت

گیت وطن کے

اب کہاں رات کب کا سویرا ہوا، سوئے ہو کس لیے بے خبر ساتھیو!
کوچ کا وقت ہے بج رہا ہے گجر، باندھ لو تم بھی اپنی کمر ساتھیو!

سُستی و کاہلی کا نہیں دور یہ، آج کا دور رفتار کا دور ہے
آج کا یُگ ہے ایٹم کا بجلی کا یُگ، آج کے دور کی بات ہی اور ہے
دور ہے اپنی منزل، سفر ہے کٹھن، اور کانٹوں بھری ہے ڈگر ساتھیو
اب کہاں رات..................

ہاتھ پر ہاتھ دھر کر جو بیٹھے رہیں، ان کا ہرگز مقدّر بدلتا نہیں
بے عمل کچھ کبھی دنیا میں پاتے نہیں، [illegible] دلیلوں سے چلتا نہیں
جوش، ہمت، لگن اور تدبیر سے [illegible] منزل امنگوں کی سر ساتھیو!
اب کہاں رات..................

کیوں نہ محنت سے چمکائیں تقدیر ہم، کس لیے اپنی قسمت کو کوسا کریں
کیوں نہ اپنی مدد آج ہم خود کریں، کیوں کسی کی مدد پر بھروسا کریں
آؤ آگے بڑھیں اک نئے جوش سے، ہم قدم ساتھیو، ہمسفر ساتھیو!
اب کہاں رات کب کا سویرا ہوا، سوئے ہو کس لیے بے خبر ساتھیو!

اھنسا

عبدالمغیث سکھالوی

گاندھی جی نے دنیا کو اہنسا یعنی عدم تشدد کا وہ راستہ دکھایا جسے اختیار کرکے عورت، مرد، بوڑھا، بچہ اور جوان سبھی مساوی طور پر اپنے جائز حق کو بڑی سی بڑی طاقت سے منوا سکتے ہیں اور اپنی عزت اور ناموس کی حفاظت کرسکتے ہیں۔ یہ راستہ ذرا کٹھن راستہ ہے۔ گاندھی جی کا کہنا ہے کہ اس پر عقیدہ رکھنے والے کو عہد کرنا ہوتا ہے کہ وہ کسی چیز کی حفاظت کے لیے نہ تو تشدد کا سہارا لے گا اور نہ قوت کا استعمال کرے گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ان آدمیوں یا اداروں کی مدد کرنے سے باز رہے گا جن کی بنیاد عدم تشدد پر نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو میں سوراج کے حصول میں ہندستان کی مدد نہ کرسکتا، کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ آزادی کے بعد ہندستان کی پارلیمنٹ کے پاس کوئی نہ کوئی فوج یا پولیس ضرور ہوگی۔ اسے جانے دیجیے۔ گھریلو مثال لے لیجیے۔ اگر اہنسا کا مطلب یہ ہوتا تو میں پھر انصاف کے حصول کے لیے اپنے لڑکے کی مدد نہ کرسکتا۔ کیونکہ وہ اہنسا پر عقیدہ نہیں رکھتا ہے۔

اہنسا کے متعلق میرا نظریہ اس قسم کا نہیں ہے۔ میرے نزدیک اہنسا کا مطلب یہ ہے کہ میں خود کوئی ہنسا والا کام نہ کروں اور خدا کی مخلوق میں سے جتنے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اہنسا پر عقیدہ رکھنے کے لیے آمادہ کرسکوں کروں اور یہ صحیح نہ ہوگا کہ میں کسی اچھے مقصد کے حصول کے لیے کام کرنے والے لوگوں کی امداد سے صرف اس لیے انکار کردوں کہ وہ پوری طرح اہنسا کے اصولوں کو نہیں مانتے ہیں۔

اسی اصول کی بنا پر گاندھی جی نے حصول آزادی کے لیے کانگریس کی امداد کی حالانکہ کانگریس نے اہنسا کو عقیدے کے طور پر نہیں بلکہ پالیسی کے طور پر مانا تھا۔ اسی طرح گاندھی جی نے تحریک خلافت کی حمایت بھی اسی اصول کے پیش نظر کی تھی کہ اہنسا پر عقیدہ رکھنے والا ایک ستیہ گرہی اچھے مقصد کے لیے لڑنے والوں کی امداد سے صرف اس لیے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ اہنسا پر عقیدہ نہیں رکھتے۔ چنانچہ گاندھی جی نے کہا کہ "یہ جانتے ہوئے کہ مسلمان حق پر ہیں اس کے باوجود اگر میں ان کی مدد ان لوگوں کے خلاف اہنسا کے ذریعہ نہ کروں جنھوں نے اسلام کے وقار کو تباہ و برباد کرنے کی سازش کی ہے تو میں ایک طرح سے تشدد کو بڑھاوا دوں گا۔

ایسا اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ دونوں فریق میں سے ایک حق و انصاف پر ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص جسے لوٹ لیا گیا ہے انصاف اس کی جانب ہے، اگرچہ وہ خود اپنا چرایا ہوا مال واپس لینے کے لیے تشدد استعمال کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ یہ بڑی بھاری کامیابی ہوگی اگر ایسے شخص کو اس پر آمادہ کیا جاسکے کہ وہ اپنا چرایا ہوا مال اہنسا اور عدم تشدد کے ذریعہ واپس لینے کی کوشش کرے۔ یعنی ستیہ گرہ کے ذریعے جسے محبت یا روحانی طاقت بھی کہہ سکتے ہیں۔

میں اپنے انقلابی دوستوں اور ساتھیوں سے کہتا ہوں

[illegible] ہوں کہ یہ راستہ جو میں نے اختیار کیا ہے، دکھ اور [illegible] سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن اس راہ میں تکلیف میرے لیے بڑی راحت ہے۔ ہر قدم جو میں اس طرف اٹھاتا ہوں اس کے بعد میں اپنے کو اگلا قدم اٹھانے کے لیے زیادہ طاقتور محسوس کرتا ہوں۔ انقلابی دوستوں کو اختیار ہے کہ وہ میرے فلسفے کو مسترد کر دیں۔ ایک مقصد کے لیے کام کرنے والوں کی حیثیت سے میں ان کے سامنے اپنے تجربات رکھتا ہوں۔ ماننا نہ ماننا ان کا کام ہے۔ جیسا کہ میں نے علی برادران اور دوسرے ساتھیوں کے سامنے اپنے خیالات کامیابی کے ساتھ رکھے۔ مصطفےٰ کمال پاشا، ڈی ویلرا اور لینن کے اقدامات کے معترف ہیں۔ لیکن وہ اس بات پر مجھ سے متفق ہیں کہ ہندستان، ترکی، آئرلینڈ اور روس کی طرح نہیں۔ یہاں کے حالات وہاں سے مختلف اور الگ ہیں۔ ہمارا ملک اس وقت جس منزل پر ہے اس میں انقلابی سرگرمیاں خودکشی کے برابر ہیں۔ اتنا وسیع ملک جو چھوٹ کا شکار بھی ہے اور اس کے عوام انتہائی غربت اور بے حد خوفزدہ بھی ہیں ان حالات میں تشدد آمیز انقلابی سرگرمیاں مناسب نہیں۔

میں اپنے نکتہ چینیوں سے کہوں گا کہ وہ ہندستان ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے عوام کی مصیبت کو دیکھیں۔ میں اس مار کاٹ کو جو دنیا بھر میں بڑی بے پروائی سے جاری ہے دیکھ نہیں سکتا۔ میرا پکا عقیدہ ہے کہ انسانیت کی شان کے خلاف ہے کہ انسان ایک دوسرے کی گردن کاٹیں۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس مار کاٹ اور خون خرابے سے نکلنے کی صرف ایک راہ ہے اور وہ راہ اہنسا اور عدم تشدد ہے۔ گاندھی جی نے یہ بات صرف نظریہ کے طور پر نہیں کہی تھی اس کے پیچھے ان کا تیس سالہ تجربہ تھا۔ اس میں سے پہلے آٹھ سال انھوں نے جنوبی افریقہ میں بسر کیے تھے اور وہاں انتہائی ناسامد حالات میں حکومت کی نسلی امتیاز کی پالیسی کا مقابلہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے کہا کہ جنوبی افریقہ میں مجھے جو تجربہ ہوا ہے اس سے مجھے امید ہو گئی ہے کہ ہندستان اور پوری دنیا کے مستقبل کا دار ومدار اہنسا کا راستہ اختیار کرنے پر ہے۔ دبے ہوئے انسانوں کے سیاسی اور معاشی مسائل کے حل کے لیے یہ ایک موثر اور بے ضرر طریقہ ہے۔ میرا پختہ خیال ہے کہ اہنسا صرف کسی فرد واحد کے نروان ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ زندگی کا ایک نظام ہے۔ اگر انسان، انسانی وقار کے ساتھ آگے بڑھنا اور وہ سکون اور امن حاصل کرنا چاہتا ہے جس کا وہ صدیوں سے خواہشمند ہے تو اس کے لیے صرف یہی راستہ ہے اور کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

گاندھی جی کے اس خیال کی سچائی روز بروز روشن ہوتی جاتی ہے۔ ایٹمی اسلحہ کی ایجاد نے یہ بات بالکل واضح کر دی کہ طاقت کے ذریعے مسائل حل کرنے کا یہ طریقہ انسانی نسل کی مکمل تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ یہ احساس اگر پوری طرح نہیں تو تھوڑا بہت اب دنیا کے چھوٹے بڑے سب ممالک میں پیدا ہو رہا ہے اور وہاں کے عوام یہ سوچنے لگے ہیں کہ ایسے تباہ کن اسلحہ کی تیاری پر دنیا کی دولت برباد کرنے سے کیا فائدہ جن کا بڑے پیمانے پر استعمال کسی فریق کی کامیابی کا باعث نہیں بلکہ خود نسلِ انسانی کے خاتمہ کا باعث ہوگا۔ عوام کی عرق ریزی اور محنت سے پیدا کی ہوئی یہ دولت انسانیت کے خاتمہ کے بجائے اگر انسانوں کی بہتری اور فلاح کے لیے استعمال کی جائے تو دنیا کے دکھ درد آسانی سے دور ہو سکتے ہیں۔ اتنی تباہی اور بربادی کے بعد بھی اگر بڑی طاقتوں کے حکمراں اس راستہ کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں جو انسان کو تباہی اور بربادی کے غار میں گرانے کے سوا اور کسی طرف نہیں لے جاتا تو دنیا کے دبے ہوئے انسانوں کو وہی راستہ اختیار کرنا چاہیے جو گاندھی جی نے جنوبی افریقہ میں دبے ہوئے لوگوں کے لیے انصاف کے حصول کے واسطے اختیار کیا تھا۔ انھوں نے وہاں کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے

کہا کہ جنوبی افریقہ میں ایک مرتبہ میرے لیے ایک ایسا موقع آیا جب وہاں کے دبے ہوئے لوگ بھی بدلہ لینے اور مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن میں نے ہنسا کا یہ راستہ اختیار نہیں کیا کیونکہ یہ راستہ مسئلے کا کوئی مستقبل حل نہ تھا۔ اس کے بجائے میں نے اس قانون کی خلاف ورزی کر کے جیل بھر دینے کا فیصلہ کیا جو ہمارے لیے توہین آمیز تھا۔ اس طرح جنگ کا ایک اخلاقی نعم البدل سامنے آگیا۔

اگر آپ کسی چیز کو اتنا اہم سمجھتے ہیں کہ اس پر عمل درآمد کرائیں تو آپ کو صرف دلیلوں سے کام نہیں لینا چاہیے کیونکہ دلیل کا اثر صرف دماغ پر ہوتا ہے دل پر نہیں ہوتا۔ آپ کو اس کے لیے خود تکلیف اٹھانے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ غصہ اور نفرت کا اظہار کیے بغیر تکلیف اٹھا لینے سے دکھ پہنچانے والے کے دل پر اثر پڑتا ہے جس سے انسان کے اندر دبا ہوا نیکی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ انسان کا طرۂ امتیاز تلوار نہیں خوشی سے تکلیف برداشت کر لینا ہے۔

گاندھی جی کے نزدیک اہنسا انسانیت کا قانون ہے اور بلاشبہ حیوانی طاقت سے اعلا اور افضل ہے۔ اہنسا کی طاقت انسان کی عزت نفس اور اس کے وقار کی حفاظت کی پوری اہلیت رکھتی ہے۔ اگر اس کا پوری طرح عادی بن جایا جائے تو مسلح آدمی کی بہ نسبت یہ زیادہ حفاظت کرنے والی ثابت ہو سکتی ہے۔ اہنسا ناجائز طور پر حاصل کیے ہوئے مال یا غیر اخلاقی کاموں میں کسی طرح مددگار ثابت نہیں ہوتی۔

وہ افراد یا قومیں جو اہنسا کا استعمال کرنا چاہتی ہیں انھیں اپنی عزت اور ناموس کے سوا ہر چیز کو قربان کر دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے اور قوموں کو اپنے آخری آدمی تک قربانی کرنے کے لیے آمادہ رہنا چاہیے۔ اسی لیے اہنسا کے ذریعے دوسروں کے ملک کو ہتھیانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

گاندھی جی کا خیال ہے کہ اہنسا ایک ایسی طاقت ہے جس کا استعمال مساوی طور پر بچے، بوڑھے، جوان عورت اور مرد بھی کر سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ محبت کے دیوتا پر عقیدہ رکھتے ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں ہر انسان سے مساوی محبت ہو۔ یہ سمجھنا بڑی بھاری غلطی ہے کہ جو قانون افراد کے لیے اچھا ہے وہ عوام کے لیے مجموعی طور پر اتنا ہی مفید نہ ہوگا۔

گاندھی جی نے ہندستان کی جنگ آزادی عدم تشدد اور اہنسا کا راستہ اختیار کر کے کامیاب بنائی اور دنیا کو نہ صرف حیرت میں ڈال دیا بلکہ چھوٹے اور غریب اور غیر ترقی یافتہ ملکوں کے ہاتھوں میں ایک ایسا ہتھیار دے دیا جس کے ذریعے وہ اپنی آزادی کو غصب کرنے والوں کے خلاف کامیابی سے جنگ کر سکتے ہیں!

اہنسا کیا ہے؟ لیکن اہنسا کو کامیاب ہتھیار بنانے کے لیے شرط ہے کہ ان شرائط اور لوازمات کو نہ صرف درمیان میں رکھا جائے بلکہ ان پر پوری طرح عمل بھی کیا جائے۔ گاندھی کے نزدیک اہنسا مکمل بے غرضی اور بے نفسی ہے۔ بے نفسی کا مطلب ہے اپنے جسم کے خیال سے مکمل آزادی۔ اگر انسان اپنے کو پہچاننا چاہتا ہے یعنی سچائی کی کھوج کرنا چاہتا ہے تو وہ اس وقت کر سکتا ہے جب وہ اپنے جسم بالکل بھول جائے۔ بھولنے کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے اس سے اپنے کو بالکل محفوظ سمجھنے لگیں اہنسا کی یہی راہ ہے۔

اس دنیا میں اہنسا کی تلوار جیسی تیز اور باریک دھار پر چلنا آسان نہیں۔ جو ہنسا یعنی تشدد سے بھری ہوئی دولت اس میں کوئی مدد نہیں کرتی۔ غصہ اہنسا کا دشمن ہے اور غرور وہ دیو ہے جو اسے نگل جاتا ہے۔

مکمل اہنسا اس دنیا میں تقریباً ناممکن ہے کیونکہ اپنے جسم کو باقی رکھنا کسی حد تک دوسرے جسموں کو ہلاک کیے بغیر ممکن نہیں۔ سائنس کی نئی تحقیقات نے بہت سی ایسی جانوں کی نشان دہی کی ہے جن کا بظاہر انسان کو احساس بھی نہیں ہوتا ہے اور وہ بغیر جانے ہوئے ان کا خون کیا کرتا ہے۔ اسی لیے گاندھی جی نے کہا ہے کہ اس نوعیت کی ہنسا تین مقاصد کے لیے ہو سکتی ہے: (۱) اپنے جسم کی بقا کے لیے

(۲) اپنے متعلقین کی بقا کے لیے (۳) یا ان کی خاطر جن کی جان خطرے میں ہو۔ پہلی اور دوسری شکل میں کسی نہ کسی حد تک ہنسا یا تشدد کا ارتکاب ہوتا ہے، لیکن تیسری شکل میں کوئی ہنسا یا تشدد نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ ہنسا نہیں اہنسا ہے۔ پہلی اور دوسری شکل میں ہنسا سے بچنا تو تقریباً ناممکن ہے۔ تیسری شکل میں ہنسا کا فعل کسی کی زندگی لینے کے لیے نہیں، اس کی زندگی بچانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ جیسے کہ ڈاکٹر مریض کو مرض سے نجات دلانے کے لیے مریض کا آپریشن کرتا ہے

بعض وقت تو ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ بہت سے انسانوں کی جان بچانے کے لیے ایک انسان کی جان بھی لینا پڑتی ہے۔ فرض کیجیے اگر کوئی پاگل مسلح ہو کر بے سوچے سمجھے لوگوں کو مارنے اور قتل کرنے لگتا ہے اور اسے مارے بغیر اس پر قابو پانا ناممکن نظر آتا ہے تو ایسی شکل میں اگر کوئی شخص ایسے پاگل کو گولی مار کر ختم کر دیتا ہے تو اس کی اس ہنسا یعنی تشدد سے انسانی برادری اس کی احسان مند ہوتی ہے اور اسے گناہ گار سمجھنے کے بجائے نجات دہندہ خیال کرتی ہے۔

بدکار سے نہیں بدی سے نفرت گاندھی جی ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ نفرت کے لائق برائی ہے، برائی کرنے والا نہیں۔ وہ تو ہمدردی کا مستحق اور اصلاح کے لائق ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک ستیہ گرہی کو برائی اور برائی کرنے والے میں فرق کرنا نہ بھولنا چاہیے۔ اسے بدی سے تو نفرت کرنا چاہیے لیکن بدکار سے نہیں، کیونکہ کوئی شخص اتنا برا نہیں جس کی اصلاح نہ ہو سکے۔ ایک ستیہ گرہی کا عقیدہ ہونا چاہیے کہ اسے محبت اور ہمدردی کے ذریعے بدلا جا سکتا ہے۔ ستیہ گرہی کا عقیدہ ہونا چاہیے کہ برائی پر نیکی سے، غصے پر محبت سے جھوٹ پر سچ سے اور ہنسا پر اہنسا سے قابو پایا جا سکتا ہے۔ اسکے علاوہ دنیا کو برائیوں سے پوری طرح پاک کرنے کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں۔

گاندھی جی نے کہا کہ میں چالیس برس کی کوشش کے بعد اب یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے دل میں کسی کے خلاف نفرت کا جذبہ بیدار نہیں ہوتا۔ میں برائی چاہے جہاں بھی ہو اس سے نفرت کرتا ہوں لیکن برائی کرنے والے سے نفرت نہیں کرتا۔

میں اس برطانی نظام حکومت سے جو ہندستان میں قائم کیا گیا ہے ضرور نفرت کرتا ہوں۔ میں برطانیہ کی جانب سے ہندستانیوں کی بے رحمانہ لوٹ کھسوٹ سے نفرت کرتا ہوں۔ لیکن میں انگریزوں سے نفرت نہیں کرتا بلکہ میں محبت کے ذریعے ان کی اصلاح کرنا چاہتا ہوں۔ اگر میں واقعی ستیہ گرہی ہوں تو مجھے اپنے دشمن سے بھی محبت کرنا سیکھنا چاہیے۔

بے خوفی لازمی۔ گاندھی جی کی اہنسا کمزور کی اہنسا نہیں۔ اس کے اندر بزدلی کی کسی طرح اور کسی حال میں گنجائش نہیں، گاندھی جی کے نزدیک اگر خواتین کی عزت پر حملہ ہو تو بزدلی سے بیٹھے رہنے اور اس کی حفاظت میں جان نہ دینے سے بہتر ہے کہ آدمی تشدد اور اہنسا کا راستہ اختیار کرے اور عزت ناموس کی حفاظت کرے۔

ایک مرتبہ جنگ آزادی کے دوران کچھ گاؤں والوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ برطانی مظالم سے ڈر کر گاؤں سے بھاگ آئے ہیں۔ اس سے گاندھی جی کو بہت افسوس ہوا اور انھوں نے غلط فہمی رفع کرنے کے لیے کہا کہ یہ اہنسا نہیں یہ بدترین بزدلی ہے۔ اہنسا اس وقت ہوتی جب گاؤں کا ایک ایک فرد اپنی اور اپنے متعلقین کی عزت کی حفاظت کے لیے خاموشی اور خوشی کے ساتھ جان دے دیتا اور حملہ آور انسانوں کی لاشوں پر سے گزر کر گھر کے اندر جا سکتے۔

گاندھی جی سے دریافت کیا گیا کہ کیا عورت اپنی عصمت کی حفاظت میں خودکشی کر سکتی ہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اگر وہ اپنی عزت و عصمت کی حفاظت کرتے کرتے جان نہیں دے سکتی تو وہ خودکشی کرلے جو بزدلی کے ساتھ خود کو سپرد

کردینے سے کہیں بہتر ہے۔

ان کے خیال کے مطابق جو بات افراد کے لیے صحیح ہے وہی قوموں اور ملکوں کے معاملے میں بھی ٹھیک ہے۔ جس طرح افراد اہنسا کے ذریعے اپنی عزت کی حفاظت کر سکتے ہیں اسی طرح قوم اور ملک اپنی آزادی اور اپنے قومی وقار کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب ملک کا ایک ایک فرد یہ طے کر لے کہ اس کے وطن کی مقدس سرزمین پر حملہ آور فوج، زندہ انسانوں کو شکست دے کر نہیں بلکہ لاشوں کو روندتی ہوئی قدم رکھ سکتی ہے۔ دوسری اور کوئی صورت نہیں۔ ایسی صورت میں حملہ آور کے لیے فتح بے معنی اور بے سود ہو جائے گی۔

گاندھی جی کے نزدیک اہنسا کا مطلب برائی کے مقابلے میں خاموشی نہیں بلکہ اس کے بالکل برخلاف برائی کے خلاف اہنسا زیادہ موثر اور زیادہ حقیقی جنگ ہے جو تصادم سے بہتر ہے۔ تصادم ہمیشہ برائی بڑھانے کا باعث ہوتا ہے ختم نہیں کرتا۔ وہ برائیوں اور بداخلاقیوں کی اخلاقی مخالفت پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ روحانی اور اخلاقی مزاحمت مخالف کے لیے خلاف توقع ہوتی ہے کیونکہ وہ جسمانی مقابلے کی توقع رکھتا ہے۔ اس لیے وہ پہلے حیرت میں پڑ جاتا ہے پھر رفتہ رفتہ وہ اس روحانی طاقت کو تسلیم کرنے لگتا ہے جو اس کے اعلا جذبات کو ابھارتی ہے لیکن وہ اس شکست پر ہیٹی یا توہین محسوس نہیں کرتا بلکہ اس کا اخلاق بلند ہو جاتا ہے۔

گاندھی کا کہنا ہے کہ آپ کی روحانیت، مجہول روحانیت نہیں ہونی چاہیے جس میں صرف بیٹھے بیٹھے مراقبہ کیا جاتا ہے بلکہ اسے ایک سرگرم طاقت ہونا چاہیے جو دشمن کی صفوں میں گھس کر جنگ کر سکے اسی لیے میں ستیہ گرہ کو مقاومت مجہول کہنا برا سمجھتا ہوں۔

اہنسا اپنے جذبۂ انتقام کو شکست دینے کی کوشش ہے لیکن یہ بھولنا چاہیے کہ بزدلی کے مقابلے میں انتقام بہتر ہے۔ انتقام کا جذبہ دراصل نتیجہ ہوتا ہے خوف کا، چاہے وہ خوف اصلی ہو یا خیالی۔ موت کا خوف سب سے بڑا خوف ہے اگر یہ نہ رہے تو کمزور سے کمزور آدمی مقابلے سے جھجک نہیں سکتا۔ طاقت کے سامنے لوگ موت کے خوف ہی سے سر جھکا دیتے ہیں۔ اگر موت کا خوف دل سے نکل جائے تو پھر بڑی سی بڑی طاقت کے سامنے بھی سر جھکانے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔

گاندھی جی کے نزدیک اہنسا پر عقیدہ رکھنے والے ستیہ گرہی کے لیے سچائی اور بے خوفی ضروری ہے۔ اسے سچائی کے لیے زندگی جیسی قیمتی چیز کی قربانی دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔ بزدل آدمی اہنسا پر عمل درآمد نہیں کر سکتا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب ہم نے اپنے ہاتھ سے تلوار پھینک دی تو پھر ہم اپنے مخالف کو سوائے جام محبت کے اور کیا پیش کر سکتے ہیں اور اس جام محبت ہی کے ذریعے ہم توقع کر سکتے ہیں کہ ہم اس کو اپنے قریب لا سکیں گے۔

انھوں نے کہا کہ میں انسان، انسان کے درمیان دائمی دشمنی کا تصور نہیں کر سکتا ایک نہ ایک دن ہم ضرور اس لائق ہوں گے کہ ایک دوسرے کو محبت سے گلے لگا لیں۔ انسان کے پاس محبت ہی ایسی قوت ہے جو سب سے زیادہ طاقتور ہے۔

★

"ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ کچھ لوگ تو ہیرے جواہرات سے مرصع محلوں میں رہیں اور کروڑوں لوگ ایسی جھونپڑیوں میں رہیں جہاں سورج کی روشنی اور ہوا بھی ٹھیک طور سے نہ آتی ہو۔"

——— مہاتما گاندھی

بہت دنوں میں ہم اُن سے جو ہم کلام ہوئے
دل و نظر ہمہ تن سجدہ و سلام ہوئے

ہنوز جیسے مسیحا کی آمد آمد ہے
اگرچہ عمر ہوئی زندگی تمام ہوئے

شفق سی خیمۂ جاناں کی سمت باقی ہے
تمام وادی و کہسار غرقِ شام ہوئے

کئی گلے تھے جو شورِ جہاں میں ڈوب گئے
کئی ستم تھے جو احسان بن کے عام ہوئے

کسی طرف جنھیں راہِ گناہ مل نہ سکی
کچھ ایسے لوگ بھی دنیا میں نیک نام ہوئے

اُفق کے پار کہیں سے لہو اُچھلتا ہے
زمیں سے دور بھی کیا کیا نہ قتلِ عام ہوئے

چلے تھے اُن کی شکایت کو حضرتِ وارثؔ
کچھ اور موردِ تضحیکِ خاص و عام ہوئے

افسانہ

یکسانیت کی موت

جب مطلع صاف ہوتا ہے تو ایسا دن، لندن میں عید کی خوشیاں اپنے دامن میں لیے ہوئے آتا ہے۔ میں ایسے موقع پر لاج میں ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ٹھہرتا اور سارا دن آؤٹنگ کرنے میں گزار دیتا ہوں۔ ایسا ہی تھا وہ دلکش SUNNY DAY کہ جب میں احمد کے ساتھ کار ترکیفے پہنچا تھا۔ وہاں مجھے ایک گل اندام انگریز لڑکی دکھائی دی۔ میں اسے دیکھے جا رہا تھا اور وہ اپنے ساتھی کے ساتھ بیٹھی ہوئی کافی کے گھونٹ دھیرے دھیرے سِپ کر رہی تھی۔

احمد باتیں کر رہا تھا لیکن اس کی گفتگو اتنی پھیکی پھیکی لگ رہی تھی کہ میں اس کی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ بس میرا جی یہی چاہتا تھا کہ خاموش بیٹھا ہوا حسن و جمال کے شاہکار کو دیکھتا رہوں جو چند ساعت کے بعد میری نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گا۔ میں اتنا کھو سا گیا تھا کہ مجھے اپنے گرد و پیش کی بھی خبر نہ تھی اور جو خواہش میرے دل میں ابھری تھی وہ اب میرے چہرے پر پھیلی ہوئی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

احمد نے مجھے اس عالم میں جیسے ہی دیکھا تو کہنے لگا:

"یہاں بغیر تعارف کوئی کسی سے مخاطب نہیں ہوتا۔ لیکن فلورینس سے میں بخوبی واقف ہوں اور وہ مجھے بھی جانتی ہے۔"

"تو پھر فلورینس سے ملوانے میں دیر نہ کرو احمد!" میں نے جواب دیا۔

فلورینس جب اپنے ساتھی کے ساتھ کیفے سے باہر جانے لگی تو احمد اس سے کافی تپاک سے ملا اور مجھے وہیں انٹروڈیوس کرا دیا۔

فلورینس اپنا نرم و نازک ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے مسکرائی اور میرے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دے کر بولی:

"آپ سے مل کر مجھے کافی خوشی ہوئی۔"

"اور آپ سے ملنے کے بعد میں اس روشن دن کو شاید کبھی نہ بھول سکوں گا۔"

"شکریہ، کسی دن آیئے ہمارے یہاں۔"

یہ کہتی ہوئی وہ اپنے ساتھی کے بازو میں بازو ڈالے آگے بڑھ گئی۔

تھوڑے دنوں پہلے کی بات ہے کہ رنگینیوں اور رعنائیوں سے معمور یہ شہر مجھے قبرستان کی طرح دہشت خیز لگتا تھا اور میں اپنے کمرے میں تنہا لیٹا ہوا پہروں روتا تھا۔ بات یہ ہے کہ اپنے وطن کا ماحول، موسم، رہن سہن، اخلاص و محبت سبھی کچھ یاد آتا تھا اور میرا جی چاہتا کہ میں پر لگا کر اڑ جاؤں۔ میں ٹرین میں سفر کرتا، سڑکوں پر چلتا، پارکوں میں چہل قدمی کرتا، ہر جگہ انسان مجھے دکھائی دیتے لیکن کسی کے ہونٹ ہلتے نہ تھے۔ میں ایسے سنگین چہروں (STONY FACES) کو دیکھ کر عجب سا کرب محسوس کرتا تھا۔ یہ حالت کافی دنوں تک رہی لیکن جب سے میں فلورینس سے ملا ہوں میری اس شہر سے دلچسپی بڑھ گئی ہے۔

ایک دن میں بے اختیار ہو کر فلورینس کے یہاں

اس نے مسکراتے ہوئے میرا استقبال کیا اور کہنے لگی:

"میرا ایک ساتھی آنے والا ہے، اچھا ہوا آپ آگئے۔ میں بہت خوش ہوں گی ہم لوگ بال روم جائیں گے، آپ بھی چلیں تو مجھے کافی خوشی ہوگی۔"

"ضرور چلوں گا۔"

اس اثنا میں اس کا دوست آگیا۔ فلورنیس نے چائے سے ہماری تواضع کی۔ اس نے چائے کا ایک گھونٹ سپ کرتے ہوئے اپنے دوست سے کہا:

"تم نے مجھے کافی پامالِ انتظار کیا، مسٹر سلیم اچانک آگئے ورنہ میں تنہا بیٹھی رہتی۔"

"ویری ساری۔" دوست نے جواب دیا۔

فلورنیس کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی اور اس کے دوست نے میز پر رکھے ہوئے مصور رسالے کے دیکھنے کو ترجیح دی۔ لیکن اس کے قریب جو ایک جیتا جاگتا انسان بیٹھا ہوا تھا اس سے گفتگو کرنے کو مناسب نہیں سمجھا۔ میری خودداری بھی جاگ پڑی تھی۔ میں مخاطب نہیں ہوا اور کمرے کے ڈیکوریشن کو دیکھنے لگا۔ خوبصورت تصویریں آویزاں تھیں۔ ایک طرف بیش قیمت مسہری رکھی ہوئی تھی۔ اس پر موٹا اسپرنگ دار گدا تھا جو خوشنما بیڈ کور (BED COVER) سے ڈھکا ہوا تھا۔ دوسری سمت ایک صوفہ سیٹ اور اس کے سامنے چھوٹی گول میز رکھی ہوئی تھی درمیان میں راستہ تھا۔ صوفہ کے قریب کپڑے ٹانگنے کے لیے آئینے والی بڑی الماری اور ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ مسہری کے قریب میز پر ٹرانزسٹر اور ٹیلی ویژن سیٹ۔ غرضکہ ہر ضرورت کی چیز مہیا تھی۔ کمرے کے ڈیکوریشن سے فلورنیس کی سلیقہ مندی کا پتہ چلتا تھا اور بیش قیمت اشیاء کو دیکھ کر اس کی فراغت کا اندازہ ہوتا تھا۔ فلورنیس خوبصورت تتلی بن کر نمودار ہوئی اور اس نے ایک عجیب سا تاثر دیا۔ اب وہ مجھ سے باتیں کر رہی تھی، ہنس رہی تھی، قہقہے لگا رہی تھی۔ وہ باتیں کرتے کرتے کافی پیارے انداز میں بولی:

"آپ میرے ساتھ ڈانس کرنا پسند کریں گے؟"

"بسر و چشم"

اب ہم لوگ فلورنیس کے دوست کی کار پر آبیٹھے۔ وہ اپنے دوست کے پاس جو کار چلا رہا تھا بیٹھ گئی اور میں پیچھے بیٹھ گیا تھا۔ فلورنیس وہیں سے مجھے مخاطب کر کے باتیں کرتی رہی۔ بال روم جانے کا یہ پہلا میرا اتفاق تھا۔ فلورنیس نیم تاریک لیکن دلکش ہال میں اپنے دوست کے ساتھ دیر تک ناچتی رہی۔ دلکش موسیقی کے ساتھ خوبصورت اور نازک جسموں کی جنبشِ مسلسل نے ایک سماں باندھ دیا تھا۔ حسین جوڑے رقص میں مصروف تھے۔ لیکن میری نگاہوں کا مرکز صرف فلورنیس تھی۔ اور جب اس نے میری مشتاق نگاہیں دیکھیں تو مجھے بھی دعوتِ رقص دی۔ مغربی دنیا میں رقص کا منکر کچھ اچھی نگاہوں سے دیکھا نہیں جاتا۔ پھر میں فلورنیس سے وعدہ کر چکا تھا اور میرے دل کا تقاضا بھی تھا کہ اس گل اندام کے ساتھ رقص کروں، نازک ہاتھوں کا لمس، نیلی نیلی آنکھوں کا حسن، لبہائے لعلیں کا تبسم، پتلی کمر کی جنبشِ مسلسل نے مجھے ایسا محو کر دیا کہ میں دیر تک رقص کرتا رہا۔

رات آدھی منزل طے کر چکی تھی۔ لیکن رات کو دن بنانے والے اب بھی رنگ رلیوں میں مصروف تھے۔ آخر کب تک؟ ہارے تھکے ہوئے جسم، سکون اور تخلیے کو ڈھونڈنے لگے — ہم بھی قیام گاہوں کی طرف روانہ ہوئے۔ کار میں اگلی نشست میں فلورنیس کا دوست تنہا بیٹھا ہوا کار چلا رہا تھا اور فلورنیس میرے برابر آکر بیٹھ گئی تھی۔ مخمور فلورنیس بلا کی جاذب نظر ہوگئی تھی اور وہ اس قدر بے خود تھی کہ بار بار پھلوں سے لدی ہوئی شاخ کی طرح میرے اوپر جھک آتی تھی آخر وہ سنبھل کر نہ بیٹھ سکی اور میں نے اس کے سر کو اپنے زانو پر رکھ لیا اور دھیرے دھیرے اس کے سنہری بالوں کو سلجھاتا رہا۔ آخر کار اس کا لاج آگیا۔ میں نے اسے کار سے اتارا اور اس کے کمرے تک پہنچا دیا۔ اس کا دوست آگے چلا گیا۔ میں قیام گاہ پہنچا تو دیر تک سو نہ سکا۔ تخیل میں بسی ہوئی فلورنیس مجھے دیر تک یاد آتی رہی۔ پھر تھکن نے مجھے تھپکیاں دے کر سلا دیا۔

فلورنیس سے میں قریب ہوتا چلا گیا۔ میں نے اسے جان سے بھی

زیادہ پیار کرنے لگا اور یہاں تک کہ میں اُس مقصد کو بھی فراموش
کر چلا کہ جس کی وجہ سے میں نے اپنے پیارے وطن کو خیر باد کہا تھا۔
ماں کی بے لوث شفقتیں، باپ کی قیمتی رہنمائی مجھے بے معنی نظر آنے
لگیں۔ میں دیوانہ وار صنم مغرب کو پوجنے لگا جو بتدریج میرے
دل و دماغ پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ فیشن کی اس حسین و دلکش تصویر
نے میری وارفتگی کو خوب سمجھ لیا تھا اور اب نئے نئے انداز سے وہ
مجھے لبھانے لگی اور میں دیوانہ وار پروانے کی طرح اس شمع کے گرد گھومنے
لگا۔ پکچر ہاؤس، بار، بال روم، سی کوسٹ (SEA COAST)
ہر جگہ وہ اپنے ساتھ لیجاتی اور میں دنیا ومافیہا سے بے نیاز صرف اس
کے اشاروں پر چلتا اور اسی کی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔

احمد کے لیے لندن اور اس کی یہ حسین و جمیل محفلوں کی
سحر کاریاں نئی نہ تھیں۔ لندن کے علاوہ یورپ کے دوسرے
ملکوں سے یہاں آنے والی لڑکیوں سے بھی اس کی رسم و راہ
تھی۔ اس نے میری دیوانگی دیکھی تو اس نے میری آنکھوں پر
پڑے ہوئے پردے اُٹھانا چاہے لیکن میری آنکھیں تو وہ
دیکھ رہی تھیں کہ جو میرے دل کا تقاضا تھا۔ احمد نے مجھے خوب
ہی جھنجھوڑا اور گہری نیند سے اٹھانا چاہا لیکن میں مدہوش ہی
رہا۔ وہ مجھے برابر آواز دیتا رہا لیکن اس کی ہر صدا میرے لیے صدا
بصحرا بن گئی۔

اُن دنوں میں فلورینس کو پیکر خلوص سمجھتا تھا۔ احمد میری
رائے سے قطعی متفق نہیں تھا۔ اس لیے میں اس کی باتوں پر کان دھرتا
ہی نہیں تھا۔

آخر وہ موڑ آگیا جس پر مجھے ایک دن آنا ہی تھا۔ میں احمد
سے کئی سو پونڈ قرض لے چکا تھا اور ابھی اس کی ادائیگی کی صورت
دکھائی نہیں دے رہی تھی کہ فلورینس نے پھر ہاتھ پھیلا دیے۔ میں
نے احمد سے منت سماجت کی تو اس نے صاف کہہ دیا:

"میں وطن کو خیر باد کہہ کر یہاں اس لیے نہیں آیا ہوں کہ میہ
گاڑھی کمائی کے روپے کو تمھیں آوارہ گردی کے لیے تیار رہوں۔
میں جس قدر برداشت کر سکتا تھا اتنی رقم تمھیں دے چکا۔ اب
تم کوئی دوسرا دروازہ دیکھو۔ اگر تم فلورینس سے نباہ کرنا چاہتے ہو
تو تمھیں ہمیشہ دوسروں کے آگے ہاتھ پھارتے رہنا پڑے گا۔"

میں کئی دنوں شرمندگی کی وجہ سے فلورینس کے یہاں نہیں
گیا۔ لیکن ایک دن میں بے اختیار اس کے یہاں پہنچ گیا۔ وہ اپنے
ایک نئے دوست کے ساتھ پکنک جانے کی تیاری میں مصروف
تھی۔ وہ مجھ سے رسمی طور پر مخاطب ہوئی اور پھر خاموش ہو گئی۔ پھر
ٹیکسی آئی اور وہ دونوں خوش و خرم ٹیکسی پر بیٹھ گئے۔ وقت رخصت
فلورینس نے کہا:

"خدا حافظ، آج میں مصروف ہوں، کسی دن آجائیے گا۔
لیکن یہ دھیان رکھیے کہ اب میرے کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔"

میں نے چاہا کہ اس واقعہ کو اپنے ذہن و دل سے حرف غلط
کی طرح مٹادوں۔ لیکن میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ فلورینس اپنے
اصلی روپ میں اُبھر کے جیسے ہی میری نگاہوں کے سامنے آئی، مجھے
بے حد اذیت ہوتی۔ اس لیے کہ میں اس کا دامن رنگین کسی طرح چھوڑنا
پسند نہیں کرتا تھا۔ بیتے ہوئے دل کش دنوں کی یاد نے فلورینس
کی مشتاق نگاہوں اور اس کے پرخلوص انداز تخاطب کا واسطہ
دے کر میرے صفحۂ دل سے وہ سیاہی مٹادی جو وقتی طور پر پھیل
گئی تھی۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے یہاں کئی بار گیا
لیکن ہر بار وہ اس طرح ملی جیسے وہ کسی بھولی بسری یاد کو تازہ کر رہی
ہو۔ آخر مجھے یقین آگیا کہ وہ مجھے دائمی خوشی نہیں دے سکتی۔ اس لیے
میں ہار تھک کر بیٹھ گیا۔ لیکن اس کی یاد مجھے رہ رہ کے ستاتی تھی۔
جب کبھی میں تنہا ہوتا تو تنہائی کانٹے کی طرح چبھنے لگتی اور فلورینس
کی من موہنی صورت میری نگاہوں کے سامنے آجاتی تھی۔

غرض میں نے جبراً فلورینس کے دامن دلکش کو چھوڑ دیا۔ اس
لیے کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا اور اب میں نے لندن اسکول
آف کامرس میں داخلہ لے لیا اور یکسوئی کے ساتھ پڑھنے لگا۔ وقت
گزرتا رہا اور پرانی یادیں دھندلی ہوتی چلی گئیں۔ کافی وقت ضائع
ہو چکا تھا۔ اس لیے اب صرف ایک لگن تھی کہ کسی طرح کورس مکمل
کر لیا جائے اور آخر شب و روز کی محنت شاقہ نے مجھے چار [illegible]

بتایا اور مجھے بینک میں اچھا جاب بھی مل گیا۔ اب میں نے لندن میں اچھی زندگی گزارنے کا منصوبہ بنا لیا تھا اور اس منصوبے کو اسی ملازمت کے ذریعے کامیاب بنانے کا ارادہ تھا۔ چنانچہ میں اپنی ڈیوٹی انجام دینے میں کافی مستعد ہوگیا۔ تھوڑے دنوں میں میرا باس مجھے اچھی نگاہوں سے دیکھنے لگا اور اس نے مجھے انتھک محنت کا صلہ بھی دیا۔ عالم شباب سعی مسلسل کے لیے موزوں ہے اور زندگی کو پُرمسرت بنانے کے لیے اسی زمانے میں جد و جہد کی جاتی ہے۔

ایک دن احمد کا جہاز پھر ساحل سے آلگا۔ وہ فوراً ہی مختصر وقفے کی رخصت لے کر مجھ سے ملنے آیا اور کہنے لگا: "چلو! جہاز تک گھوم آؤ۔"

ہم لوگ ساحل کے قریب پہنچنے والے تھے کہ ایک سفید فام شخص کو کھلے آسمان کے نیچے برفیلے موسم میں بیہوش پایا۔ احمد نے کہا:

"آؤ، پولیس کو مطلع کردیں، کہیں یہ شخص سردی سے ٹھٹھر کر مر نہ جائے۔"

میں نے پولیس سارجنٹ سے جیسے ہی یہ اطلاع دی تو وہ کہنے لگا:

"از ہی کلرڈ؟" (کیا وہ سیاہ فام ہے؟)

"نو، ہی از وہائٹ" (نہیں وہ سفید فام ہے)

وہ بے حد شرمندہ ہوا اور ہمارے ساتھ اُس شخص کے پاس گیا اور اُس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولا:

"یہ زندہ ہے۔ زیادہ پی گیا ہے۔"

اُس نے فوراً ہی ایمبولنس سے اس بے ہوش شخص کو اسپتال بھجوا دیا۔ ہم لوگ جیسے ہی ساحل پر پہنچے تو اچانک فلورینس مل گئی۔ پرانی محبت جاگ پڑی۔ میں نے صبر کیا اور خاموش رہا۔ لیکن وہ مجھے دیکھتے ہی مسکرائی اور ذرا ٹھہر کے آگے بڑھ گئی۔ آج وہ کسی دوسرے دوست کے ساتھ چہل قدمی کر رہی تھی۔ میں احمد کے ساتھ بنچ پر بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا۔ وہ کہنے لگا:

"فلورینس تو شمع محفل ہے، ہر صبح وہ ایک نئے دوست کے ساتھ محو گفتگو نظر آتی ہے۔ ہر نئے فیشن کا پرتپاک خیر مقدم کرتی ہے۔ دوسرے دن نہ اُسے رفیق دیرینہ یاد آتا ہے اور نہ متروک فیشن۔"

میں نے فوراً ہی موضوع بدل دیا۔ اس لیے کہ میں احمد سے زیادہ فلورینس کو سمجھتا تھا اور اب اُس کا تذکرہ گزری دل کش ساعتوں کو یاد دلا کر مجھے بے چین کر دیتا۔ اس لیے میں نے احمد سے کہا:

"چلو، جہاز میں چلیں، ناشتہ کریں، چائے پئیں۔"

وہاں احمد نے میری خوب ہی تواضع کی اور اپنے ساتھیوں سے بھی ملوایا۔

تھوڑے دنوں کے بعد دفعتاً فلورینس کی موت کی خبر سننے میں آئی اور پھر معلوم ہوا کہ اس نے نیند کی متعدد گولیاں کھا کر خودکشی کرلی۔ یہ تعجب خیز بات تھی کہ ایک کھلا مہکتا گلاب اچانک مرجھا گیا۔ میں نے کبھی اس کو رنجیدہ نہیں دیکھا، کبھی یاسیت کی کوئی بات اس کی زبانی نہیں سنی۔ آج اُس نے اپنی دل کش زندگی کا گلا گھونٹ دیا تعجب ہے۔

اس کا دلکش چہرہ، مترنم آواز، کافر ادائیں، مستانہ چال اور جادو برساتی نگاہیں، یہ سبھی کچھ ابھی تک میرے دل و دماغ سے محو نہیں ہوئے تھے۔ میں اُسے کلی طور پر بھول جانے کی کوشش کرتے ہوئے بھی بار ہا بے اختیار اُس کی طرف کھنچتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور آج تو اس کا سراپا میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ فلورینس کی پُرمسرت زندگی کے پیچھے کوئی مخفی غم ضرور تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ بے مقصد جیتے جیتے اکتا گئی تھی اور آخر تھک کر اُس نے اپنے وجود کو موت کی پرسکون آغوش میں گرا دیا۔

★

اے کہ ترا نام ہے توقیر وطن کی

ڈاکٹر طلحہ رضوی برق

اے وہ کہ ترا نام ہے توقیر وطن کی
پنہاں تھی ترے خوابوں میں تعبیر وطن کی
چمکی تری تدبیر سے تقدیر وطن کی
دلکش تری نسبت سے ہے تصویر وطن کی

تھے وقفِ ستم کوشیٔ ظالم تڑپ اٹھے
غیرت کو جو اک ٹھیس لگی ہم تڑپ اٹھے
پل بھر کو نیستاں میں ضیغم تڑپ اٹھے
تخریب کے پردے میں تھی تعمیر وطن کی

سولی پہ جیالوں کو فرنگی نے چڑھایا
کیا خوب سبق تو نے اہنسا کا پڑھایا
ہم نے بھی قدم ہنس کے سوئے دار بڑھایا
آئینۂ صد رنگ ہے تفسیر وطن کی

شیرینیِ گفتار فسوں کار نہ ہوتی
شخصیت اگر حاملِ کردار نہ ہوتی
کافور غلامی کی شبِ تار نہ ہوتی
اکسیر کی ہے خاک میں تاثیر وطن کی

مقبولِ جہاں امن کا پیغام رہے گا
روشن سرِ آفاق یہی کام رہے گا
رخشندۂ ایام ترا نام رہے گا
ہے ظلمتِ شب روکشِ تنویر وطن کی

باپو

سیف بجنوری

تشدد کا تھا دور ہندوستاں میں ۔۔۔ دبے تھے غلامی کے بارِ گراں میں
مسرت کا عنواں نہ تھا داستاں میں ۔۔۔ نہ تھی کوئی توقیر اپنی جہاں میں
اندھیروں کی تہ میں چھپا تھا اجالا
ہر سو فرنگی کا تھا بول بالا

نہ تھا اپنی محنت پہ کچھ حق ہمارا ۔۔۔ فرنگی کا ہر چیز پہ تھا اجارا
کہیں بھی نہ تھا بحرِ غم کا کنارا ۔۔۔ رواں بربریت کا تھا تیز دھارا
سفینے کے ساحل پہ آثار کم تھے
بلاخیز کا سیلاب تھا اور ہم تھے

ہر اک موج پیکِ اجل بن گئی تھی ۔۔۔ بہت تیز بادِ جفا چل رہی تھی
ہر اہلِ سفینہ کے دم پر بنی تھی ۔۔۔ یہ کشتی غرض ڈوبنے کو چلی تھی
بصد جوش اک مردِ لاغر پکارا
نہ ڈوبے گا ہرگز سفینہ ہمارا

اس آواز پر چونک اٹھے اہلِ کشتی ۔۔۔ یہ آواز بھارت میں ہر سمت گونجی
بشارت یہ آواز تھی زندگی کی ۔۔۔ اس آواز نے عزم کو روشنی دی
فضائے زمانہ بدلنے لگی تھی
ہوا دوسرے رخ پہ چلنے لگی تھی

شقاوت تھی مصروف مکر و ریا میں ۔۔۔ تغیر نہ تھا کچھ مزاجِ جفا میں
رسن تھی ابھی دستِ عقدہ کشا میں ۔۔۔ گرہ دوست بھی باندھتے تھے ہوا میں
شقاوت شرافت کی قدروں سے گزری
ہوئی سرخ جلیان والا کی دھرتی

بھڑک اٹھی دلوں میں حرارت ۔۔۔ ہوا ترک اندازِ حرف و حکایت
دیا سب کو باپو نے درسِ محبت ۔۔۔ بتائی ہر اک کو اہنسا کی عظمت
تشدد نہ کرنے کا اقرار لے کر
اٹھا وہ اہنسا کی تلوار لے کر

صداقت کی منزل کا وہ راہبر تھا ۔۔۔ الگ سب سے اندازِ فکر و نظر تھا
وہ مخدوش راہوں میں بھی بے خطر تھا ۔۔۔ کہ ہر سانس اس کا محبت اثر تھا
مذاہب سے اس کو نہ تھا بیر کوئی
زمانے میں اس کا نہ تھا غیر کوئی

اسے دیش کا ذرہ ذرہ تھا پیارا ۔۔۔ نہ تھی کوئی تفریق اس کو گوارا
سبق اس کے مکتب کا تھا بھائی چارا ۔۔۔ تھے یکساں اسے مسجد و گوردوارا
خلوص و مروت کی تفسیر تھا وہ
سراپا محبت کی تصویر تھا وہ

وہ مسدود ہر راہِ بیداد کر کے ۔۔۔ وہ بھارت کا جن تنتر آباد کر کے
وہ ہر غم گرفتہ کا دل شاد کر کے ۔۔۔ چلا ہم سے وہ ہم کو آزاد کر کے
مسیحِ امنِ عالم کو جس نے نکھارا
غضب ایسے باپو کو بیٹے نے مارا

مگر اس کی ہستی امر ہو گئی ہے ۔۔۔ ہر اک آنکھ اب دیدہ ور ہو گئی ہے
مراتب کی اپنے خبر ہو گئی ہے ۔۔۔ وہ [illegible] راہبر ہو گئی ہے
چلیں سیف اس کی بتائی ڈگر پر
[illegible] دوسری اور ڈگر پر

اُردو شاعری میں ہندو دیومالائی عناصر

ابوالفیض سحر

(سلسلے کے لیے دیکھئے نیا دور بابت جنوری ۱۹۷۳ء)

اردو مثنویوں میں میر حسن کی سحر البیان اور آتش کے شاگرد پنڈت دیا شنکر نسیم کی گلزارِ نسیم کا اردو شاعری میں جو علمی اور ادبی مقام ہے اس سے کون واقف نہیں ہے۔ ان میں ہندستانی معاشرت اور ثقافتی زندگی کے آثار نمایاں ہیں۔ سحر البیان سے کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

کیا پنڈتوں نے جو اپنا بچار — تو پھر انگلیوں پر کیا کچھ شمار
جنم تیرا شاہ کا دیکھ کر — تولا اور برچھیک پر کر نظر
کہا رام جی کی ہے تجھ پر دیا — چندماں سا بالک ترے ہوئے گا
کہ یہ بالک ایسا مُنی ہو گا — تھوڑے ہی کال میں گُنی ہو گا

اردو شعر و ادب کا ذوق رکھنے والے شامِ اودھ، اور صبحِ بنارس کی خوبصورت ترکیب و تشبیہ کے حسن اور حسنِ استعمال سے بخوبی واقف ہیں۔ یہاں منیر کی مثنوی "معراج المضامین" میں صبحِ بنارس کی جلوہ سامانیوں کا ایک ہمہ رنگ منظر ملاحظہ ہو:

کنارِ آب انبوہِ حسیناں — ہر اک جانب ہجومِ مہ جبیناں
سنہری تھالیاں چمکے روشن — بتاشے، دودھ تلسی دھوپ چندن
مٹھائی ناریل پھول اور چاول — گلوری کالے تل سیندور گوکل
چڑھاتی ہیں نہانے میں لبِ آب — جہاں دیکھو وہاں پوجا کا اسباب
فلک بھی شعلوں کے گرنے سے گرداب — تجلی سے چراغاں تھا تہِ آب
مہنت ایک سمت کو دھونی رمائے — کہیں جوگی جٹا سر پر بڑھائے
ملے تن پر بھبوت آنکھیں لال — بچھائے ہیں ہرن کی شیر کی کھال
کوئی بیٹھا ہوا آتش کے اندر — کسی کا دست خشکیدہ ہوا پر
کوئی تانبا اٹھائے کوئی مالا — بچھائے کوئی اپنا مرگ چھالا
منجم جوتشی ہر سمت پو یا — لگن ساعت کوئی پوچھے یہ جویا
بھجن گاتے ہوئے پنڈت کسی جا — کہیں جگ ہے کہیں ہے ہون پوجا

جنگ آزادی کی تحریک تک پہنچتے پہنچتے اردو شاعری میں تصوف اور ویدانت کے مسائل وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت، دیکھنے کا قابلِ تعظیم جذبہ اور لائقِ تحسین اندازِ فکر عام ہوتا گیا۔ پھر عوامی زندگی کے ہر شعبے میں دل و دماغ کی پاکیزہ چاندنی میں اردو شاعری کے آسمانِ سخن پر ہندو، مسلم اور سکھ شعرا کی ایک برگزیدہ کہکشاں بھی ملتی ہے۔ اردو صوفیانہ شاعری میں تصوف کے ساتھ ساتھ ویدانت کے مسائل بھی ملتے ہیں خصوصاً ہندو شعراء کے کلام میں ویدانت کے مسائل اور اس کی تبلیغ و اشاعت کی پرخلوص لو اور لگن بھی نظر آتی ہے۔ ان شعرا میں منشی سورج نرائن مہر، پنڈت امرناتھ مدن اور ساحر دہلوی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ تصوف اور ویدانت کی اس چاندنی اور کہکشاں کے بعد، ہندستان کے طول و عرض میں ایک قومیت اور قوم پرستی کے روشن خیال احساسات و جذبات ایک آفتابِ تازہ کی طرح طلوع ہوئے۔ پھر اس حیاتِ نو کے لیے سفر کے آغاز کے وقت علمبرداران شعر و حکمت کے قافلے میں سرور جہان آبادی، چکبست، حسرت موہانی، یگانہ، حیدر آبادی، تلوک چند محروم جیسی ہستیاں نظر آتی ہیں۔ اردو شاعری پر بھی اس کا پرتو پڑنا لازمی تھا۔ اسی دوران ہندو مذہب کے متعلق سنسکرت اور ہندی کتابوں کے تراجم اور مستقل عنوانات کی نظمیں بھی تصنیف ہوتی رہیں۔

پاکستانی وفد کے لیڈر شری عزیز احمد ۱۲ اگست ۷۳ء کو وزیر اعظم سے ملنے ان کی قیام گاہ پر گئے۔ تصویر میں
[illegible]

۱۹۷۱ء کی ہند پاک جنگ سے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کرنے کے لیے ۱۸ اگست سے دونوں ملکوں کے درمیان نئی دہلی میں مذاکرات شروع ہوئے جن کا سلسلہ ۲۸ اگست تک چلتا رہا اور ۲۸ اگست کو دونوں ملکوں کے درمیان ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ تصویر میں پاکستانی وفد کے لیڈر شری عزیز احمد (بائیں سے نمبر ۲ پر) اور ہندستانی وفد کے لیڈر شری پی۔ این ہکسر (دائیں) مصروف گفتگو ہیں

پاکستانی وفد کے لیڈر شری عزیز احمد (بائیں) اور ہندستانی وفد کے لیڈر شری پی۔ این ہکسر (دائیں) ۲۸ اگست ۱۹۷۳ء کو معاہدے پر دستخط کرتے ہوئے

گورنر اترپردیش شری اکبر علی خاں
راج بھون میں ۱۵ اگست ۱۹۷۳ء
کو پرچم کشائی کرتے ہوئے۔

مرکزی وزیر ریاست ڈاک و تار شری ایچ۔ این۔ بہوگنا
عالم باغ، لکھنؤ کے نئے ٹیلی فون ایکسچینج کا افتتاح کر رہے ہیں

راج بھون لکھنؤ میں ۲۵ اگست ۱۹۷۳ء کو گورنر شری اکبر علی خان نے اردو، ہندی اور سنسکرت کے مصنفوں کو انعامات تقسیم کیے۔ اوپر (دائیں) گورنر ہندی کے ایک مصنف کو انعام دیتے ہوئے اور (بائیں) انعام پانے والے کچھ مصنفین

ملک کے مشہور شاعر اور صحافی جناب میلا رام وفا کو جن کا قلمی تعاون نیا دور کو حاصل ہے جد وجہد آزادی کی خدمات کے سلسلے میں حکومت پنجاب نے ۲۲ جولائی ۱۹۷۳ء کو ایک تقریب منعقدہ نہرو اسٹیڈیم جلندھر میں تامرپتر پیش کیا۔ وزیر اعلیٰ پنجاب گیانی ذیل سنگھ وفا صاحب کے ساتھ کھڑے ہیں۔ تصویر میں وفا صاحب کی پوتی کماری ساوتری بھردواج بھی کھڑی ہوئی ہیں۔

شہید فوجیوں کی بیواؤں کو میرٹھ میں مکانوں کا الاٹمنٹ

پنڈت کالکا پرشاد، سورج پرشاد نے رامائن کے ترجمے کیے۔ منشی طوطارام وغیرہ نے مہابھارت کا ترجمہ کیا۔ لالہ جگناتھ سہارے نے ست نرائن کتھا لکھی۔ منشی لال آزرپی نے مقدس کاشی پر ایک مثنوی "کاشی استیت" لکھی۔ پنڈت یوگی راج صاحب نظر سدھاتوی نے "غذائے روح" اور "کلام ربانی" کے نام سے گیتا کے منظوم ترجمے کیے۔ اقبال ورما سحر، نوبت رائے نظر، جگت موہن لال رواں، تربھون ناتھ ہجر، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، مہاراجہ کشن پرشاد شاد وغیرہ نے بھی اردو شاعری میں ہندو دیومالائی روایات کو فروغ دیا جس سے اردو شاعری کی ہندستانی روح کو مزید تقویت و تازگی ملی۔ اس خصوص میں جناب منور لکھنوی صاحب کی گراں قدر خدمات اور بالخصوص گیتا اور شکنتلا جیسی کتابوں کے ترجموں کے ذکر کے بغیر یہ جائزہ نامکمل رہے گا۔ ادھر اختر انصاری اور ساغر نظامی صاحب نے بھی شکنتلا کے ترجمے کیے ہیں۔ مسلم شعرا میں خوشتر نے رامائن لکھی ہے۔ اور خواجہ دل محمد صاحب سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور نے مقدس گیتا کا بڑی روانی اور سلاست کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ یہاں اس کے صرف تین بند پیش کروں گا۔ ان میں ارجن کے سامنے بھگوان کرشن، مسئلہ تناسخ اور اوتار دھارن کو دیکھیے کس طرح پیش کر رہے ہیں۔

یہاں آتا مجھ سے پاکر وصال — رہیں پرسکوں لے کے اوج کمال
حلول و تناسخ نہ دورِ حیات — فنا و مصیبت سے پائیں نجات

بدلتا ہے انساں لباس کہن — نیا جامہ کرتا ہے پھر زیب تن
اسی طرح قالب بدلتی ہے روح — نئے بھیس میں پھر نکلتی ہے روح

مری ذات ہے مالک کائنات — نہ اس کو ولادت نہ اس کو ممات
جو کام اپنی قدرت کو لاتا ہوں میں — ظہور اپنی مایا سے پاتا ہوں میں

تصوف و ویدانت کے مسائل ہوں کہ رزمیہ یا بزمیہ شاعری یا مزاحیہ، رومانی، باغیانہ یا انقلابی شاعری، ہر ایک کا خمیر اپنے ماحول کے آب و رنگ اور اپنی مادرِ وطن کی خاک و خون سے ہی اٹھا ہے۔

حتیٰ کہ غنائیہ اسطوریہ شاعری میں بھی ہندستانی قومی عناصر و چند اساطیر کا بھی فطری صداقت اور فطری روانی کے ساتھ بے تکلف استعمال ملتا ہے جو اردو شاعری کے گوناگوں مزاج کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ اس کی خوبصورت مثالیں صوتی و معنوی حسن کے ساتھ بیسویں صدی کے نصف اول کے اہم شاعر جناب فراق گورکھپوری کے ہاں بکثرت ملتی ہیں۔ جیسے:

جمنا میں کھلا کنول نہائے جیسے
دوشیزۂ صبح گنگنائے جیسے

ساوتری و سیتا کی قسم کھائے ہوئے
ہے اب بھی زن ہند میں اک دیویت
وہ اندر دھنش وہ سات رنگوں کی پھوار
بہروپ دکھاتے موسموں کی رفتار

فراق کی غزلوں کے علاوہ ان کی نظموں، رباعیات و قطعات وغیرہ میں بھی یہ رنگ کچھ اور گہرا نظر آتا ہے۔

کنہائیں، ازل کی ہے صباحت جن میں
رادھا کی اداؤں کی نزاکت جن میں
تو آج بھی جگ رہی ہے ایسے بچے
ہے کرشن کی شوخی و شرارت جن میں

آساں آس لیے ہے کہ یہ جادو ٹوٹے
چپ کی زنجیر کٹے وقت کا دامن چھوٹے
دے کوئی سنکھ دہائی کوئی پائل بولے
کوئی بت جاگے کوئی سانولی گھونگھٹ کھولے

ہماری ترقی پسند شاعری کا بیشتر حصہ ایک وسیع سیاسی اور سماجی پس منظر میں بڑی حد تک انقلابی شاعری پر مشتمل ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ترقی پسند تحریک بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر کمیونزم کے زیر اثر رہی جس میں مذہبی تصورات و دیومالائی عناصر کی کوئی گنجائش نہیں تھی مگر اس کے باوجود

اسا رود تہذیب [illegible] اسا رود ادب کے ایک خاص مزاج کی وجہ سے ترقی پسند شعرا کے ہاں بھی اگرچہ خال خال ہی سہی مگر بعض ایسی تشبیہات اور تلمیحات ملتی ہیں جن کا تعلق ہندو اساطیر سے ہو۔ مخدوم محی الدین جیسے ترقی پسند شاعری کے نمائندہ شاعر اور ممتاز کمیونسٹ رہنما کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وہ روپ رنگ راگ کا پیام لے کے آگیا
وہ کام دیو کی کمان جسام لے کے آگیا

مندر میں پجاری لگے ناقوس بجانے   وہ ان کے کٹھن پیارے وہ گیت انکے سہانے

لاجوردی فرش پہ ہے مشتری زہرہ کا رقص
نیل تن کرشن کے پہلو میں مچلتی گوپیاں

سردار جعفری نے بھی ہندو علم الاصنام اور ہندو نظریہ وقت سے بہت زیادہ اثر قبول کیا ہے۔ ان کی طویل نظم "نئی دنیا کو سلام" اس اثر پذیری کی غمازی کرتی ہے۔ ساتھ ہی یہ چند شعر بھی ملاحظہ ہوں ؎

نغمہ مصر کہن ہے زندگی کے ساز میں
آج ہے اک درد سا پھر رام کی آواز میں

بانسری کے زمزموں پر رقص کرتی ہر فضا
آرہی ہے آسمانوں سے کرشنا کی صدا

ہر طرف بکھرا ہوا ہے چاند سے ماتھے کا نور
موج جمنا میں ہے رادھا کی نگاہوں کا سرور
آج پھر کاشی کی پیشانی پہ رقصاں نور ہے
آج پھر تلسی کے نغموں سے فضا معمور ہے

اختر الایمان اور کیفی اعظمی کے ہاں بھی اس طرح کی متعدد مثالیں مل جاتی ہیں حتی کہ فیض کے ہاں بھی ہندوانی عقائد، رسم و رواج کی جھلکیوں کی کچھ مثالیں ملتی ہیں۔ اگرچہ یہ براست طور پہ ہندو اساطیری عناصر سے متعلق نہیں ہیں تاہم یہ پوری طرح سے ان سے غیر متعلق بھی نہیں ہیں ؎

اس طرح ہے کہ ہر اک پیڑ کوئی مندر ہے
کوئی اجڑا ہوا بے نور پرانا مندر
ڈھونڈتا ہے جو خرابی کے بہانے کب سے
چاک ہر بام، ہر اک در کا دم آخر ہے
آسماں کوئی پروہت ہے جو ہر بام تلے
جسم پر راکھ ملے، ماتھے پہ سیندور ملے
سرنگوں بیٹھا ہے چپ چاپ نہ جانے کب سے

سلام مچھلی شہری، جگن ناتھ آزاد، جاں نثار اختر اور عزیز قیسی بھی اس قبیل کے ان شعرا میں سے ہیں جن کے ہاں اس قسم کے اساطیری عناصر کے نقوش ملتے ہیں۔ جاں نثار اختر کی ایک تازہ نظم "نیا رگ وید" کے چند شعر پیش ہیں ؎

قدرت کا ہر منظر اس کو اپنے سے بلوان لگا
سب کچھ ان کو ان کی شکتی ان کا ہی وردان لگا
پیاس بجھاتی ہر اک ندی کو دیوی کا استھان دیا
سرسوتی کے ہاتھ میں اس نے جگ کا سارا گیان دیا

آؤ جس نے سب کچھ جیتا اس کا جیون بھید لکھیں
آؤ نئے ہم گیت سنائیں آؤ نیا رگ وید لکھیں

آج فلم اور فلمی صنعت نے ہمارے سماج میں ایک خاص اہمیت حاصل کرلی ہے۔ اس خصوص میں متعلقہ دیگر فنون کے فروغ کے ساتھ ساتھ فلمی شاعری بھی، عوامی طبقات میں کافی مقبول رہی ہے۔ اردو کی فلمی شاعری میں بھی بیشتر بھجن اور اکثر گیتوں میں شکیل بدایونی، مجروح سلطان پوری، حسرت جے پوری اور ساحر لدھیانوی جیسے شعرا نے ہندو دیومالا کو بھی بڑی خوبصورتی سے برتا ہے۔ ناانصافی ہوگی اس سلسلے میں اگر میں بکل اتساہی اور نارش پرتاپ گرمٹھی کی حب الوطنی اور قومی احساسات و جذبات سے سرشار گیتوں اور نظموں کا ذکر نہ کروں، جن میں انھوں نے ہندو اسطور اور ان کے علائم و خصوصیات کو فنکارانہ انداز میں ان کے

تمام تر جمال اور جلال کے ساتھ اور بڑی خوبی سے برتا ہے۔

اردو کے بعض پاکستانی شعراء کے ہاں بھی ہندستانی رنگ و بو کا احساس پایا جاتا ہے۔ جدید دور کے شاعروں میں ناصر کاظمی اور ناصر شہزاد وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس گروہ کے علاوہ پاکستان کے دیگر جدید طرز فکر کے حامل شعراء میں بھی ہندستانیت کی بو باس اور ہندو دیومالائی مظاہر کے بھی نقش و نگار ملتے ہیں جیسے:

پانی ۔ بے ہیئت ۔ بے صورت
پانی
دیوتاؤں کا ایک مقدس رس ہے
زیست کا بہتا دھارا
چاندی کی کشتی کا جھولا
میں بھی پانی
ندی بن کر بہتا جاؤں
سخت چٹانوں کا دل چیروں
دھرتی کے ہاتھوں پر ریکھا کھینچوں (اعجاز فاروقی)

سب رشی، سب منی، انبیاء، اولیاء
خیر کے دیوتا، حسن، نیکی، خدا
آج سب پہ مجھے
اعتبار آگیا، اعتبار آگیا (فہمیدہ ریاض)

اب تو کالی دیوی بن کر
اپنے خالق سے کہتی ہے
میرے آگے سیس جھکاؤ
میرے قدموں میں تم اپنے لہو کی بھینٹ چڑھاؤ (ریحان فراز)

آزادی کے بعد ہندستانی زندگی کے اندرونی و بیرونی انفرادی و اجتماعی امور عمل میں تبدیلیوں اور تغیرات کا ایک تواتر ملتا ہے۔ اردو ادب ایک نئی کروٹ بدل رہا تھا۔ ترقی پسند تحریک کا کام تمام ہو چکا تھا۔ اس طرح اردو بزم سخن میں نئے مزاج اور نئے آہنگ و اسلوب سے روشناس ہوئی وہ جدید طرز فکر، عصری حسیت اور فطری اظہار ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جدید شاعری میں ہمہ گیر اور ہمہ جہت زندگی، قومی، مذہبی اور ملی احساس و شعور اور سماجی و سیاسی بصیرت کا فقدان ہے۔ یہاں اس مسئلہ پر بحث بے محل ہوگی مگر اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ جدید شاعری میں اگر چند بری مثالیں ملتی ہیں تو بہت ساری اچھی مثالیں بھی ہیں۔ ہمارے جدید شعراء نے ایک آزاد اور غیر جانب دارانہ رویئے سے ہمارے عصر اور ہمارے معاشرے اور ہمارے ماحول کی روح کو سمجھنے اور اس کی حقیقی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے خواہ یہ کتنی تلخ و ترش کیوں نہ ہو۔ ان میں جہاں دیگر کئی عوامل و عناصر کی کارفرمائی اور عکس کشی ملتی ہے تو ان مذہبی اعتقادات و رسوم اور دیومالائی عناصر کی طرف اشارے بھی ملتے ہیں۔ جدید اردو شاعری میں ہندو دیومالائی عناصر کے استعمال کے ضمن میں کرشن موہن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کمار پاشی کے ہاں بھی ہندو اساطیر کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ ان کی حالیہ تصنیف 'دلاس یاترا' اس سلسلے کا ایک تازہ نقش ہے۔ راج نرائن راز کے پاس بھی اصنامی روایات کے کچھ نقوش ملتے ہیں۔ شہلب جعفری، ندا فاضلی، زبیر رضوی، عیاث متین، رؤف خلش اور حسن فرخ کے ہاں بھی بعض ایسی مثالیں مل جاتی ہیں جنھیں اس زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ عمیق حنفی نے ہندو دیومالا کو بڑی گہرائی اور پورے وقوف و ادراک کے ساتھ برتا ہے۔ ان کی ایک طویل نظم "سیارگاں" کا ایک بند یوں ہے ۔

ہندیوں کی داستانوں میں لکھا تھا
چاند بوڑھے مشتری کی بیاہتا کو لے اڑا تھا
اور ان دونوں سے بدھ پیدا ہوا تھا
جس کے تابع ذہن اور اعصاب
منطق و علم الکلام و عقل محض

"پتھروں کے آتما ہے
آؤ بولو شرنت تے

بدھم شرنم گچھامی
دھرمم شرنم گچھامی
سارا جنگل گونج اٹھا
پتا پتا محو دعا
دھرم کا بیڑہ پھر گھوما
سوز کا شعلہ ناچ اٹھا
پتھر کا دل موم ہوا

ایک اور نظم کا ایک اور حصہ بھی ملاحظہ ہو:-

پانڈو کچھا کسی نے ان کا نام بتایا
پاگمو کی گچھائیں کہہ کر کام چلایا
یہ تھا کسی تکدیو بودھ وہار ہمارا
یہ تھا کٹھن تپسیا کا سنسار ہمارا
ہم نے یہاں تتھاگت کے اپدیش سنائے
شانتی اور پریم سکھ کے سندیش سنائے

(بھکشو)

اگا رسا اناگا ریام بیجا
اگا رسا اناگا ریام بیجا
اگا رسا اناگا ریام بیجا

جدید شاعری سے، ہندو اصنامی روایات اور اساطیری حکایات سے تعلق رکھنے والی چند مثالیں مزید پیش کی جاتی ہیں:

اور جو پاس تھا
(کچھ تمنا میں مسرت کے دو اک لمحے دو اک خواب حسیں)
وہ سبھی عمر کے صحرا کے حوالے کر کے
مطمئن ہو گئے، یوں جیسے ابھی
زندگی
رادھا کی بھیگی ہوئی چنری کی طرح
رنگ اور نور میں ڈوبی ہوئی لہرائے گی (بشر نواز)

عقیدت سند دل سے دیر دو ترک کے ہیں ہم لیکن
روایت بیم وا رہن کو بھی کیونکر توڑ سکتے ہیں (محمود سعیدی)

عاشق ہیں اہل ہند رہ مستقیم کے
دسرت کے نام لیوا ہیں بیٹے ہیں تعلیم کے

(فضل جعفری)

وہ کون سا اجودھیا تھا منتظر کہ ہم
بن باس لے کے جسم کے جنگل میں آ سے تھے

(تاج مہجور)

اردو شاعری کے تاریخی سفر اور اس کی قومی اتحاد و اشتراک کی متاع عزیز کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے، اس کے ہندوستانی مزاج اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی گنگا جمنی روح کو سمجھنے، عوامی یگانگت و یک جہتی، سیکولر اور جمہوری روایات و اقدار کے احساس و ادراک کو پرکھنے کے سلسلے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا بھی جا سکتا ہے۔ اس خصوص میں اردو والوں نے اپنے ساتھی اہل ملک کے دوش بدوش، قدم بہ قدم جو یادگار اور مثالی خدمات انجام دی ہیں اور آج بھی جو تاریخ ساز رول ادا کر رہے ہیں اس کی ایک دل آویز جھلک ساجدہ زیدی کے ذیل کے اشعار میں بھی ملتی ہے۔

ہمیں نے جمنا کے ساحلوں کو حسیں عمارات سے سجایا
ہمیں نے پتھر کے سخت سینے کو نرم الورائی دھڑکنیں دیں
ہمیں نے رنگینیاں نچوڑیں تو نقش اجنتا کے بن گئے تھے
جو حسن و جوشش سمویا تو لال قلعے سنور گئے تھے

سمویا شیراز اور ایران کا لہجہ جذب و کیف و مستی
ہمیں نے اس سرزمین گوتم کو شعر کا بانکپن دیا تھا
ہمیں نے تہذیب ہند کو یہ مزاج گنگ و جمن دیا تھا
یہاں کے افکار و علم و آئین ہماری عظمت کے رازداں ہیں

غرض اس طویل بحث کے بعد اردو شاعری کے تعلق سے پیدا کردہ بے معنی شک و شبہات کا کہ اس میں مقامی ہندوستانی رنگ اور مزاج نہیں ملتا، نہ صرف ازالہ ہو جاتا ہے بلکہ اس میں سب سے زیادہ سیکولر کردار اور قومی مظہر ہونے کی حتمی تصدیق ہو جاتی ہے۔ ★

غمِ جہاں سے وہی لوگ پائمال رہے
تمام عمر جو آسودۂ خیال رہے
مرادِ دل کی لطافت بھی پُر ملال رہے
اگر عروج میں اندیشۂ زوال رہے
نہیں ہے حُسن کا جب مرکزِ خیال و نظر
مزاجِ عشق میں پھر کیسے اعتدال رہے
یہ اک کرشمہ تھا بس ان کی جنبشِ لب کا
جواب سُن کے بھی ہم صورتِ سوال رہے
زباں پہ کیسے ہو ذکرِ تغافلِ احباب
ہم اپنے آپ کے خود کب شریکِ حال رہے
ترا جواب نہیں ہے ادائے حُسنِ حجاب
نگاہِ عشق بھی شرمندۂ جمال رہے
اسی لیے تو ہے مجھ پر تمام مشقِ ستم
جہاں میں دار و رسن کی کوئی مثال رہے
بیانِ لطف و کرم ان کا مختصر یہ ہے
ہم اک نگاہِ محبت ہی سے نہال رہے
حیاتؔ خوب تقاضائے عہدِ حاضر ہے
دلوں میں بغض و کدورت ہو، بول چال رہے

محمود میاں رونق

ڈاکٹر عطیہ نشاط

رونق کو بعض لوگ بنارسی لکھتے ہیں، لیکن جن لوگوں کو ان کے ڈرامے پڑھنے کا موقع ملا ہے وہ ڈراموں کی زبان کی خصوصیات کو دیکھتے ہوئے رونق کو بنارسی نہیں کہہ سکتے۔ رونق کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں دکنی محاورے اتنے زیادہ استعمال ہوئے ہیں جو کسی ایسے اہلِ قلم کی تحریر میں نظر آنا مشکل ہیں جو شمالی ہند میں پرورش پاکر دکن گیا ہو۔ اشعار تک میں دکنی محاوروں کا بے ساختگی سے آجانا اس کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ دکن میں پیدا ہوئے تھے اور بچپن سے ان کے کان دکنی زبان سے مانوس تھے۔ حفیظ جہنگی احسن لکھنوی نے ناٹک اسٹیج میں لکھا ہے: "مصنفین ناٹک ساگر نے ان کو بنارسی لکھا ہے مگر میری معلومات میں دکنی تھے۔ ان کا لب ولہجہ بمبئی کے ساکنوں سے بہت ملتا جلتا ہے۔" ڈاکٹر نامی کا خیال ہے ان کے آبا و اجداد بنارس کے تھے لیکن ان کی تربیت دکن میں ہوئی جہاں وہ اپنی نانی کے ساتھ رہتے تھے۔

عمر کے بیشتر حصے میں رونق کا تعلق وکٹوریہ ناٹک منڈلی سے رہا۔ انھوں نے اس منڈلی کے لیے کئی طبع زاد اور بہت سے پرانے کھیل از سرِ نو لکھے تھے۔ ان کی زندگی میں ۱۸۸۵ء کی نمائش کے موقع پر پارسی والا اپنی کمپنی انگلستان لے کر گئے تھے۔ اس زمانے میں وہاں جس طرح کے کھیل پسند کیے جارہے تھے انھیں دیکھ کر اور وہاں کے ناشروں کے ہاں سے چھپے ہوئے ڈرامے لے کر کمپنی نے اپنے ملک کے تماشائیوں کے ذوق کی مناسبت سے چند ڈرامے منتخب کیے اور انھیں اپنے ساتھ لے آئی۔ وطن واپس آکر یہ ڈرامے اردو میں منتقل کرنے کے لیے رونق کے سپرد کیے گئے۔ رونق نے ان میں سے چند ڈرامے اخذ و ترمیم کے بعد اردو کے مروجہ انداز کے مطابق نظم میں تحریر کیے۔ یہ ڈرامے انگریزی اور اردو میں کوئی خاص مقام نہیں رکھتے۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ ایک ایسے ملک کے ڈراما نویسوں کے طریقۂ فکر کا نتیجہ تھے، جو ڈرامے کی تکنیک سے واقف تھے، اور یہ بھی جانتے تھے کہ ڈرامے کی کیا خصوصیات اسٹیج پر جاکر کھلتی اور تماشائیوں کے لیے لطف اندوزی کا باعث ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کے اسٹیج پر آنے سے ڈراما لکھنے اور تماشا دیکھنے والوں کا ذوق سست رفتار داستانی تماشوں سے ہٹ کر ڈرامائی انداز کی لذتوں سے واقف ہوگیا۔

رونق کے حالاتِ زندگی کے سلسلے میں ڈاکٹر نامی لکھتے ہیں:

"رونق نے صرف پارسی وکٹوریہ ناٹک منڈلی میں ملازمت کی۔ اس میں وہ اداکار کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور اسی کے اسٹیج پر وہ خودکشی کے مرتکب ہوئے۔"[1]

رونق کی وفات کے متعلق ڈاکٹر نامی نے زیادہ تفصیلات اپنے ایک مضمون میں بیان کی ہیں جو رسالہ ادبِ لطیف میں شائع ہوا تھا:

---

[1] ناٹک ساگر جلد دوم ص۳۰

"بائی مٹھن بائی (خورشید جی بالیوالا کے بھانجے دوراب جی دھن جی شاہ کھراس کی بیوی) نے بیان کیا ہے کہ رونق کی بیوی بہت آوارہ اور بد چلن تھی اور بار بار تنبیہہ کے باوجود اپنی شرم ناک حرکتوں سے باز نہیں آتی تھی۔ رونق اس کو مارتے پیٹتے اور زدوکوب کرتے تھے لیکن وہ ذرہ برابر بھی پروا نہ کرتی تھی۔ رونق نے اتوار کی سہ پہر کو جب "عاشق کا خون عرف دامن پر دھبا" اسٹیج ہو رہا تھا اپنے ہاتھ سے اپنی گردن اُسترے سے کاٹ لی۔ تماش بینوں نے پہلے اسے ایکٹنگ سمجھا لیکن جب ونگس سے اداکار دوڑ پڑے اور ہر طرف سے شور و غل بلند ہوا تو تماشائی گھبرا گئے اور بھاگنے لگے۔ فوراً ڈراپ ڈال دیا گیا۔ دوراب جی کو اطلاع بھیجی گئی۔ وہ پریشان حال آئے۔ کمپنی کی طرف سے کفن دفن کا انتظام کیا گیا۔"[1]

رونق کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

(۱) بے نظیر بدر منیر (۲) لیلیٰ مجنوں (۳) انجام الفت عرف ہمایوں ناصر (۴) پورن بھگت (۵) سیف السلیمان عرف معصوم معصومہ (۶) ستم ہامان عرف فریب اسرائیل (۷) عاشق صادق عرف ہیر رانجھا۔ (۸) حاتم بن طے عرف افسر سخاوت (۹) طلسم زہرہ عرف رنج کا بدلہ گنج (۱۰) فسانۂ عجائب عرف جان عالم انجمن آرا (۱۱) افعال محمود شاہ۔ عرف ظلم عمران رو سیاہ (۱۲) عجائبات پرستان عرف جیسا بونا، ویسا پانا۔ (۱۳) خواب گاہ عشق عرف بے داد و دہش (۱۴) خواب محبت عرف نادان کی دوستی اور جی کا جنجال (۱۵) غرور رعد شاہ عرف چندہ حور و خورشید نور (۱۶) سنگین بکاؤلی (۱۷) نقش سلیمانی عرف شدادی بہشت (۱۸) فریب و فتنہ عرف چاہت زر (۱۹) جفائے ستمگر عرف گھڑی کی گھڑیاں (۲۰) کالی کا بھوگ (۲۱) نور الدین و حسن افروز (۲۲) چنبیلی گلاب (۲۳) میاں پستو بیوی کھٹمل۔

کہا جاتا ہے کہ رونق نے صرف وکٹوریہ ناٹک منڈلی میں ملازمت کی۔ اس میں وہ اداکار کی حیثیت سے ملازم ہوئے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد ڈرامے بھی لکھنے لگے۔ پارٹ بھی کرتے تھے۔ ان کے ڈراموں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پلاٹ اچھے ہیں اور خیالات عام لکھنے والوں سے بالاتر ہیں۔ مثال کے لیے ان کے ڈرامے "نسخۂ دلگیر عرف رانجھا ہیر" کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہ کہانی پنجاب کی دلکش فضا میں پروان چڑھتی ہے۔ انشا کا ایک شعر ہے۔

سنائی رات کہانی جو ہیر رانجھا کی
تو اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

اس سے ہیر رانجھا کی کہانی کی مقبولیت اور تاثیر کا اندازہ ہوتا ہے۔ رونق نے اصل کہانی میں کچھ ردّ و بدل کر کے پیش کیا ہے۔ بمبئی کا عام تماشائی پنجاب کی اس حکایت کی جملہ تفصیلات سے واقف نہیں تھا۔ اس لیے مختلف قسم کی تبدیلیاں اس کی مقبولیت کی راہ میں حائل نہیں ہوئیں۔ وارث شاہ کی کہانی سے رونق نے اسے اس طرح بدلا ہے کہ:

ڈرامے کے دوسرے ایکٹ میں رانجھا ملازمت سے برطرف کر دیا جاتا ہے اور ہیر کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ رانجھا درویش کا بھیس بدل کر آتا ہے اور ہیر پر اپنی اصلیت ظاہر کر کے چچک اور شیدا کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ ہیر کو علاج کے لیے ناگ مندر پہنچا دیں۔ اس طرح وہاں سے ہیر کو لے کر رات کے وقت فرار ہو جاتا ہے اور ایک سرائے میں پڑاؤ ڈالتا ہے۔ پیچھا کرتے ہوئے شیدا بھی بھیس بدل کر اسی سرائے میں پہنچ جاتا ہے۔ رانجھا کے پانی مانگنے پر پانی میں زہر ملا کر دیتا ہے۔ رانجھا تڑپتے ہوئے جان دیتا ہے۔ شیدا رانجھا کی لاش کو ٹھوکر مارتا ہے۔ برافروختہ ہیر خنجر سے اسے ہلاک کر دیتی ہے اور آخر میں خود بھی خودکشی کر لیتی ہے۔

پنجاب کی اس دیہاتی حکایت کے اصل واقعات سے قطع نظر کر لی جائے اور اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اردو ڈرامے

---

[1] ادب لطیف فروری ۱۹۵۹ء

پہلی بار ڈرامے پیش ہونے کے چند ہی سال بعد رونق نے یہ ڈراما پیش کیا تو اس کی منطق، مناظر کی سیدھی سادی بندش کرداروں کی کفایت قابلِ قدر ہے۔ یہ منظر ملاحظہ کیجیے:

پردہ چڑھتا: باغ (رانجھا کا احوالِ فرقت گاتے ہوئے آنا)

رانجھا: (لاونی)

تجھے کیا کروں اے بادِ بہار، گُل گلشن کو آگ لگے، جب پاس نہ ہوے یار
آئی بسنت اور پھولے ٹیسو، کھلے کنول کے پھول
بھونرے تو سب شاد ہوئے، پر ہے دل میرا ملول
گُل سے ہے بلبل کو پیار
تجھے کیا کروں اے بادِ بہار
سبزہ لہراتا ہے، چشمے سارے ہیں پُر آب
فضا دیکھو ہر ایک شجر کی دل ہے مرا بیتاب، میرے پہلو میں نہیں دلدار
دیکھ کے نرگسِ شہلا، آنکھیں آتی ہیں اس کی یاد
ان آنکھوں نے جادو کر کے کیا مجھے برباد
انہیں کا ہوا ہوں میں بیمار ـــــ
میری طرح سے سنبل! ترا کیوں ہے پریشاں حال
دیکھے تو نے گُل کے ہمارے زلف کے کالے بال
مجھ سی کیوں تجھ پر ہے غم کی مار؟

(رانجھا کا ہیر کی صورت دیکھ کر بے ہوش ہونا)

کون ہے، کیا یہ فلک پر سے اتر آیا قمر
دن کو نکلا ہے قمر یا کہ ہے مہرِ انور
لے گیا دل جو مرا یہ تو وہی ہے دلبر
للہ الحمد شبِ غم نے اٹھایا بستر
مرحبا طالعِ بیدار مبارک ہو سحر

(ہیر رانجھا کا سر اپنے زانو پر رکھ کر)

ہیر: کیوں نہ لوں زانو پہ سر رکھ کے بلائیں ہر بار
کس کو ایسا نہ پسند آئے گا کہیو دلدار
زلفیں سنبل سی ہیں آنکھوں میں ہے نرگس کی بہار
سرو قد، غنچہ دہن، سیب ذقن، گل رخسار
اس کے نقشے پہ تصدق کروں سارا گلزار

رانجھا: (مخمس) (ہوش میں آکر)

تو نے بے ہوش پہ یک جلوہ مجھے یار کیا
رکھ کے پھر سر مرا زانو پہ بہت پیار کیا

(رانجھا کے ہوش میں آنے کے بعد ہیر اٹھ کے محجوبانہ الگ جا کھڑی ہوتی ہے)

ہوش آیا مجھے تو ملنے سے کیوں عار کیا
بے خودی پہ جو کرم اتنا تھا دلدار کیا
بدحواسی میں مجھے اور گرفتار کیا
غش تو آیا مجھے کیوں لیتے نہیں میری خبر
غش تو آیا مجھے لے پھر بھی مرا زانو پہ سر
غش تو آیا مجھے کیوں دور کھڑے ہو دلبر
غش تو آیا مجھے کر مہر کی پھر مجھ پہ نظر
لوں بلائیں تیری آ پاس تو اے رشکِ قمر!

ہیر: ذرا مہرباں ہوش میں آئیے
نہ اتنے بھی اب جوش میں آئیے

- - - - - - - - - -

- - - - - - - - - -

سمجھ کر تمھیں ایک بےکس غریب
تمھارے ہوے دادکو ہم طبیب
تو ہے آپ نے پاؤں پھیلا دیا
ہمیں اپنا عاشق تصور کیا
نہ آنکھیں لڑاؤ چلو دور ہو
میں سمجھی کہ تم غیرتِ حور ہو

رانجھا: تھی بیہوشی اچھی ہمیں ہوش سے
فقیروں کو کیا کام ہے جوش سے
سمجھتی ہیں آپ اپنے کو رشکِ حور
بھلا میرے عاشق ہوں پھر کیوں حضور؟
بنے ہیں طبیب آپ میرے اگر
تو کیجیے دوا میری اب جلد تر

تمھاری محبت کا بیمار ہوں   تم ہی سے دوا کا طلبگار ہوں

رونق کا ایک اور ڈراما "عجائبات پرستان" ہے۔ یہ ڈراما گجراتی رسم الخط میں تھا جسے پروفیسر سید حسن نے اردو رسم الخط میں منتقل کیا ہے۔ وہ عجائباتِ پرستان" کے متعلق لکھتے ہیں:

"رونق کے ڈراموں میں مزاحیہ عنصر بھی ہے۔ لیکن یہ عنصر اصل پلاٹ سے جدا نہیں۔ جیسا کہ بعد کے اکثر خصوصاً آغا حشر کے بعض ڈراموں میں ملتا ہے۔ رونق کے ناٹکوں کا یہ مزاحیہ عنصر قصے کے کرداروں کی گفتگو سے پیدا ہوتا ہے۔ اس میں وہ فحاشی اور عریانی نہیں ہے جو بعد کے ڈراموں میں داخل ہو گئی تھی۔ کم از کم ان ڈراموں میں جو میرے پاس موجود ہیں، یہی وصف دیکھنے میں آتا ہے۔ ان ناٹکوں میں سب سے زیادہ مذاقیہ حصہ عجائباتِ پرستان میں ملتا ہے، بلکہ اس ناٹک کے اصلی پلاٹ کی بنیاد ہی بڑی حد تک مزاح پر ہے۔" [1]

اس ڈرامے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ رونق نے شاید اپنے کسی حریف کی ہجو کی ہے۔ شاعر کی زبانی الفاظ جس بخود غلط انداز میں کہلوائے گئے اور ان پر ڈرامے کے دوسرے کرداروں کے ذریعے جلے دل کے پھپھولے جس طرح پھوڑے گئے ہیں ان سے اچھا خاصا یقین ہوتا ہے کہ کسی ہم عصر شاعر نے رونق کے ڈراموں یا اُن کی شاعری پر نکتہ چینی کی ہوگی، جس کا جواب دل کھول کر دینے کے لیے رونق نے اس ڈرامے کا ذریعہ اختیار کیا۔ اپنے حریف سے یوں انتقام لینے کی مثال اردو کے کسی دوسرے ڈرامے میں شاید نہ ملے۔

دوسرے باب کے پہلے منظر میں شاعری کے کردار کی زبانی کہلایا گیا ہے:

کسی کے شعر پر رونق جو پاتے ہیں
بڑھانے کے عوض اس کو گھٹاتے ہیں

یہ آپ اپنے کو جب ناحق بڑھاتے ہیں
تو عاجز ہو کے یہ ہم بھی سناتے ہیں

حریفاں بادہا خوردند و رفتند
تہی خم خانہ ہا کردند و رفتند

کچھ آگے بڑھ کر شاعرِ شاعراں کو شاعری یوں مخاطب کرتی ہے:

تو آپ اپنی ہی مارے ہے لاف ہم سے
ہے پھر چاہتا کیا انصاف ہم سے
نہیں اشرفِ حال ہو قائل کمال
اے سفلے تو کیا ہوگا اشراف ہم سے
تو مجرم جہاں میں، میں دنیا میں رونق
غلیظ ہوگا، تو ہوگا کیا صاف ہم سے

آخر میں شاعری یہ کہہ کر رخصت ہو جاتی ہے:

جو ہم ایسے خراباتی نہ ہوتے
صفائی تم میں پھر جاتی، نہ ہوتے
اے جنگلی تم ہی گر آ کر نہ لیتے
تو پھر شہروں میں دیہاتی نہ ہوتے

غرض شاعرِ شاعراں جہاں کہیں بھی آتا ہے، مکالموں میں خود اس کی زبانی معقول اور دوسروں کی زبانی چبھتی ہوئی ایسی باتیں لکھی گئی ہیں جن سے یہ بات چھپی نہیں رہتی کہ رونق اپنے اس ڈرامے میں شاعرِ شاعراں سے انتقام لینے پر تلے ہوئے تھے۔

"عجائبات پرستان" کمزور کھیل ہے۔ اس کی کہانی بہت معمولی ہے۔ تسلسل میں بھی کوئی حسن نظر نہیں آتا بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کھیل فی الحقیقت پہلے ہی باب کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا باب غالباً کھیل کی مدت بڑھانے کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جو مرکزی خیال سے خاص تعلق رکھتی ہو۔

کرداروں کے اغراض و مقاصد صاف نہیں۔ کردار [illegible]

---

[1] اردو ادب، علی گڑھ: جولائی ۱۹۵۴ء

انکشاف میں بھی بے ساختگی نہیں ہے۔ صنوبر پری باغ ارم کے شہزادے شمشاد پر عاشق ہو کر اسے اٹھا لاتی ہے اور اس کی بے التفاتی سے بگڑ کر اسے قلعے میں قید کر دیتی ہے۔ پرستان میں اس کے عشق کا چرچا ہوتا ہے تو پریاں اسے ایک آدم زاد کی محبت میں گرفتار ہونے پر لعن طعن اور دوسرے اس بات پر ملامت کرتی ہیں کہ تو بڑا الہوسی اور موذی ہے کہ اپنے محبوب کو قید کر کے خوار کر رہی ہے جس پر صنوبر پری یہ جواب دیتی ہے۔

اگر اس کو اپنا پسند ہے رقیب
اسے کو بنا دیں گے اس کا حبیب
ملا دیں گے ہم اس کے دلدار سے
نہ ہرگز کریں رشک اغیار سے

صنوبر پری سے شہزادے کے ملتفت نہ ہونے سے یہ نتیجہ اگر خود ہی نکال لیا جائے کہ اسے کوئی "رقیب" پسند ہے تو اس بات کا سراغ کہیں نہیں ملتا کہ یہ کون ہے۔ بہر حال شمشاد سے اپنی رقیب گلبدن کا نام معلوم ہوتے ہی صنوبر پری شمشاد کو گلبدن سے ملانے لے جاتی ہے۔ اس کے بعد گلبدن اپنے محل میں "نخرے کرتے ہوئے آتی ہے"۔ پروفیسر سید حسن کی رائے میں کھیل میں مزاح کا عنصر بہت زیادہ ہے۔

"ظلم عمران رو سیاہ عرف انصاف محمود شاہ" رونق کا مشہور کارنامہ ہے۔ نامیہ احسنہ میں احسن نے "انصاف محمود شاہ" کے متعلق لکھا ہے:

"ان کی تصنیفات میں محمود شاہ کا تماشا گلِ سرسبد ہے۔ اس اعتبار سے کہ یہ قصہ ایک ہی رات میں ختم ہو جاتا ہے یعنی تمام افسانہ ایک ہی رات کا واقعہ ہے۔ یہ نہایت عمدہ صفت ہے۔"

رونق کا ایک اور ڈراما "ظلم اظلم" نہ صرف وکٹوریہ ناٹک منڈلی کے بلکہ اپنے زمانے کے بہت مشہور ڈراموں میں سے ایک ہے۔ اس کھیل کو بمبئی میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ وکٹوریہ ناٹک کمپنی بیسویں صدی کے آغاز میں جب لاہور آئی تو "ظلم اظلم" اس کے تماشوں کی فہرست میں شامل تھا۔ اسٹیج پر اس ڈرامے کی غیر معمولی کامیابی کی ایک خاص وجہ اس کے پلاٹ کی خوبی ہے جو مخلوط ضرور ہے۔ لیکن اَن گڑھ سا ہے۔ چار شخص نور النساء پر عاشق ہیں اور وہ ان چاروں سے مختلف موقعوں پر خلاف توقع یوں دو چار ہوتی ہے کہ ڈرامے کے واقعات کا رخ بدلتا چلا جاتا ہے۔ اظلم کا ظلم و جور اسے اپنے بھائی کے ساتھ ترک وطن پر مجبور کرتا ہے۔ سمندری سفر میں طوفان آ جانے سے جہاز ٹوٹتا ہے اور بھائی سے بچھڑ کر نور النساء ایک نمازی امیر کے ہاتھ آتی ہے جو اس کے ساتھ شفقت سے پیش آتا ہے اور پناہ دیتا ہے۔ امیر کا ملازم اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ نور النساء کا پیچھا کرتا ہوا اظلم بھی یہاں آ جاتا ہے اور ملازم کی معرفت نور النساء تک رسائی کر لیتا ہے۔ ادھر نمازی پرہیزگار امیر کی نیت میں فتور آ جاتا ہے ــــ ان عشاق کی ناکامیوں کے نتیجے میں آمنا سامنا شہزادے سے ہو جاتا ہے۔ غرض کہ کھیل میں ہموار واقعات کی دلچسپ اور اہم تفصیلات سے لطف پیدا نہیں ہوتا بلکہ جگہ جگہ پلاٹ کے ایسے موڑ اور اچنبھے رکھے گئے ہیں جو تماشائی کی توجہ کھیل پر مرکوز رکھتے ہیں اور چونکہ کھیل کا مرکزی کردار ایک بے یار و مددگار لڑکی ہے اور سارے ظلم و ستم اس پر ٹوٹتے ہیں اس لیے تماشائی کھیل سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتے ہیں۔

"خونِ عاشق" ڈاکٹر نامی کے خیال کے مطابق رونق کا آخری ڈراما ہے۔ "خونِ عاشق" سے پہلے کے ڈراموں میں کرداروں کی انفرادیت نظر نہیں آتی۔ ان کے کردار عام انسانوں سے نہیں، داستانوں کے مثالی کرداروں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ "خونِ عاشق" کے کرداروں میں سے "مست ناز" "جان باز" اسفل اور دوسرے کردار خود سیرت نگاری کے استادانہ کمال سے پیش نہ کیے گئے ہوں تاہم کردار نویسی کی موٹی موٹی خصوصیات کے حامل نظر آتے ہیں اور

بہ مقابلہ داستانی کرداروں کے زیادہ جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔

"خون عاشق" کی زبان تو اس زمانے کے بیشتر ڈراموں کی طرح نظم ہی ہے۔ لیکن رونق کی نظم اور دوسرے ڈراما نویسوں کی نظم میں فرق نمایاں ہے۔ دوسروں کی نظم عموماً صرف مطلب کے بیان سے سروکار رکھتی ہے۔ رونق کے یہاں اس میں مناسب بحر اور قافیہ و ردیف کے ساتھ جذبے اور ادائگی کے امکانات بھی ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

جو گھر میرے آئے وہ میرا حبیب
کہاں ہیں بھلا ایسے میرے نصیب

مہماں کو اٹھاتے ہیں بھلا یوں کہیں گھر سے
سائل کو سخی کوئی اٹھاتا نہیں در سے

آئینہ لے کر دیکھو ہوا چہرہ کیسا زرد
روتا تھا صبح و شام کو بھر بھر کے آہ سرد

"خون عاشق" کی خصوصیات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ "خون عاشق" رونق کا طبع زاد ڈراما نہیں ہے، بلکہ اس میں وکٹورین زمانے کے کسی چلتے ہوئے کاروباری ڈرامے سے بہت زیادہ استفادہ کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ اعزاز رونق ہی کو نصیب ہو سکا کہ اردو کے پیشہ ور اسٹیج کے سستے اور ڈھیلے ڈھالے ڈراموں میں انھوں نے "خون عاشق" جیسا ڈراما لکھا جو اس زمانے کو دیکھتے ہوئے زیادہ ترقی یافتہ ڈراما قرار دیا جا سکتا ہے۔

٭ رونق کی ڈراما نگاری کے متعلق جناب "احسن" ناشہ احسن میں لکھتے ہیں:

"منشی رونق صاحب کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت ذکی، نہایت طبیعت دار اور بڑے جدید الذہن تھے۔ فی الجملہ جوہر علم سے بھی آراستہ نظر آتے ہیں۔ تخیلات شاعری اور مذاق عالی تھے۔ ان کی نظم بہ حیثیت تخیل پاکیزہ گراں بہا ہے۔ مگر بحیثیت زبان و فن کے کمزور ہے۔ زبان اردو کی خامی جا بجا محسوس ہوتی ہے لیکن جذبات انسانی کے مصور ہیں۔ ان کی کلیات کو شیخ عبداللہ صاحب نے اصلاح دے کر اپنی ملک بنا لیا ہے۔ اتفاقات کہیے کہ ان کو پلاٹ بہت اچھے اچھے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کے شاعرانہ خیالات ہندوستانی توقع سے بالاتر ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو خود فی الجملہ علم انگریزی کے ماہر تھے یا کسی ذریعے سے ان کو مغربی اہل قلم کے ترجمے مل جاتے تھے۔"

رونق کے ڈراموں میں منظوم مکالموں کے سوال و جواب کا لطف ضرور ہے اور اس سے پارسی تھیٹر کی فضا اور سامعین کے ذوق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ڈرامے کے عناصر کا ان کے یہاں فقدان ہے۔ مشہور قصوں میں بھی انھوں نے تحریک اور تصادم کے عناصر کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی اور ساری توجہ سوال و جواب پر رکھی ہے۔ اس میں بھی فطری انداز بیان سے دور رکھا ہے اور مثنوی "طلسم الفت" یا "فریب عشق" و "لذت عشق" و "بہار عشق" وغیرہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ معلوم نہیں احسن لکھنوی کو مغربی ڈرامے کے کون سے عناصر ان کے یہاں نظر آئے کہ انھیں خیال ہوا کہ رونق انگریزی کے ماہر یا مغربی ڈراموں سے واقف تھے۔

★

خدا حافظ صدیقی

ہوا کرتا ہے ہر دم انقلاب اس دارِ فانی میں
مگر خارج نہیں وہ کارِ قدرت کی روانی میں
کبھی آتی ہیں ایسی ہستیاں اس دارِ فانی میں
کہ جن کا نام رہتا ہے سدا دنیائے فانی میں
نظر سے جس کے ہوتا ہے زمانے میں اثر پیدا
ہزاروں سال میں ہوتا ہے وہ صاحب نظر پیدا

مہینہ تھا وہ اکتوبر کا دو تاریخ اس کی تھی
ولادت باسعادت جب ہوئی بھارت میں گاندھی کی
صدا دی ہاتفِ غیبی نے تب اس کامرانی کی
کہ زنجیریں کٹیں گی اس سے بھارت کی غلامی کی
کنارہ ہاتھ اسی کے آئے گا دامانِ ساحل کا
یہی پھیرے گا رخ اک روز ہر طوفانِ باطل کا

وہ رہبر تھے وہ مصلح تھے وہ تھے معمارِ آزادی
کہاں وہ دیکھ سکتے تھے بھلا قوموں کی بربادی
وہ خواہاں عافیت کے تھے وہ تھے جویائے آزادی
یہی خواہش رہی ان کی یہی منشائے آزادی
کہ یاں قومیں جو ہیں آباد وہ بگڑیں نہ آب بن کر
یہاں کا ہر بشر اک جان دو قالب رہے بن کر

عمل پیرا نصیحت پر اگر باپو کے ہم ہوتے
دکھی پھر یہ ملک ہی ہوتی نہ یہ رنج و الم ہوتے
وہ ہم ہوتے کہ ہم ایسے جہاں میں آج کم ہوتے
زمانے کی نظر جس جا پہ پڑتی واں پہ ہم ہوتے
بتاتے راز ہم قوموں کو ان کی سرفرازی کا
یہی دنیا سبق پھر ہم سے لیتی راستبازی کا

مگر افسوس ہم ان کی نصیحت کو بھلا بیٹھے
جو کچھ اخلاق باقی تھا اسے بھی ہم گنوا بیٹھے
محبت اور ہمدردی کا سرمایہ لٹا بیٹھے
بساطِ ہند پر کھیلی سی بازی ہار جا بیٹھے
ہماری بات سے پوشیدہ کب سے روحِ گاندھی ہے
مگر آج نہیں ہم کو عقیدت روحِ گاندھی سے

سخاوت شمیم

ڈاکٹر تو نے نیا روپ عطا کر کے مجھے
میری خاموش امنگوں کو زباں بخشی ہے

میرے افکار کی دنیا میں نہ تھی خودداری
ذہن اپنے ہی تصور سے ہوا تھا عاری
اپنی ہستی کا تصور جو کبھی آتا تھا
ایک نشتر سا رگِ جاں میں اتر جاتا تھا
بار بار اپنے ہی چہرے پہ نظر جاتی تھی
اور بگڑی ہوئی ہیئت پہ ٹھہر جاتی تھی
نقش کچھ زیر و زبر میرے تھے ایسے
خالقِ کل نے بنایا ہو نمونہ جیسے
دیکھتا جب کوئی عبرت کی نظر سے مجھ کو
کوفت ہوتی مرے احساسِ بشر سے مجھ کو
تیری تجویز پہ مٹنے کا ارادہ لے کر
آخرش آئی ترے پاس تمنا لے کر
اک تمنا کہ جو موہوم سی لگتی تھی مجھے
ایک نعمت کہ جو محروم سی لگتی تھی مجھے
تو نے پھر سحر کیا عالمِ بیہوشی میں
کیا سے کیا مجھ کو کیا عالمِ بیہوشی میں
قابلِ قدر جراحت کا نتیجہ ہی کہوں
مجھ پہ اللہ کی رحمت کا نتیجہ ہی کہوں
سب سمجھنے لگے کچھ اپنی نظر میں مجھ کو
اہمیت ملنے لگی اپنے ہی گھر میں مجھ کو
کبھی خوش فہمی بے حد مجھے ہو جاتی ہے
کبھی بدلی ہوئی حالت پہ ہنسی آتی ہے
دل میں اٹھتے ہیں کبھی چاہ کے ارماں بہت
الغرض ہو گئے اب جینے کے ساماں بہت

میری خاموش امنگوں کو زباں بخشی ہے
ڈاکٹر تو نے نیا روپ عطا کر کے مجھے

غزل

صلاح الدین نیّر

جب تک مجھے جینا ہے خموشی سے جیوں گا
اے رسمِ وفا! تجھ کو نہ بدنام کروں گا

گھبراؤ نہیں پیار کو رسوا نہ کروں گا
تم پاس سے گزرو بھی تو آواز نہ دوں گا

میں اپنی طرح آپ کو جلنے نہیں دوں گا
جلنا ہی جو ٹھہرا تو اکیلا ہی جلوں گا

پلکوں میں چھپا لوں گا اُمڈتے ہوئے آنسو
لیکن ترے دامن کو میں آواز نہ دوں گا

رسوائی کا احساس ہے تم کو اگر اتنا
میں عرضِ تمنا میں بھی محتاط رہوں گا

ناکام تمناؤں کو سینے میں چھپا کر
کب تک میں ترے شہر میں آوارہ پھروں گا

امید گئی شب کا اترنے لگا چہرہ
سوچا تھا ستاروں سے تری مانگ بھروں گا

جب گوشۂ دل میں ہوا اندھیرا کبھی نیّر
میں آپ کی آنکھوں سے بھی کچھ روشنی لوں گا

غزل

بشیر فاروقی

بادل جو آئے گھر کے وہ بن میں برس گئے
تپتے ہوئے نگر کے نِواسی ترس گئے

اُس کی نظر کی دھوپ کو احساس بھی نہیں
میری وفا کے پھول کہاں کیوں جھلس گئے

یہ حُسنِ اہتمام ہے شاید مرے لیے
میں جس طرف گیا ہوں اجالے برس گئے

غم اُن کا میرے غم سے سوا ہوگا اے ندیم
جو لوگ میرے حالِ پریشاں پہ ہنس گئے

یہ زندگی تمام سمندر ہے پیاس کا
یوں اُن کو دیکھنے کے لیے ہم ترس گئے

خلوت پسند ہو گئے کچھ تم بھی ان دنوں
کچھ ہم بھی زندگی کے جھمیلوں میں پھنس گئے

اوجھل نہ ہو سکے مری نظروں سے ایک پل
اِس دھوپ میں جو پھول سے چہرے جھلس گئے

اے زندگی سنبھال کہ تیرا بھرم ہوں میں
دلدل میں حادثوں کی مرے پاؤں دھنس گئے

گاؤں میں کس کو ڈھونڈ رہے ہو تم اے بشیر
مدت ہوئی کہ شہر میں وہ لوگ بس گئے

مزاحیہ

نجم الدین نقوی

ہم ٹھہرے خالص دیہاتی اور بیگم عجیب الطرفین لکھنوی۔ ایک کا مولد راے بریلی کی ایک چھوٹی سی بستی اور دوسرے کی جاے ولادت "لکھنؤ"۔ دونوں اپنے وطن سے دور پیٹ کا دوزخ پاٹنے کی فکر میں "تو ہاے گل پکار میں چلاؤں ہاے دل" کے ورد میں مصروف لکھنؤ کے ایک روزنامے کی مقامی خبروں میں وہاں کی ادبی مجلسوں، ماتمی جلوسوں اور نعت و منقبت کی محفلوں کی اطلاعیں پڑھ پڑھ کر دوری و مجبوری کے تحت کڑھتے اور دل مسوس کر رہتے۔ کتنی برسوں سے شہرِ نگاراں نہ جا سکے تھے۔

اپریل، مئی، جون کی گرمیوں کی مذمت میں اکبرالٰہ آبادی نے جو بھی گہر افشانی کی ہو وہ اُن کا اپنا تجربہ رہا ہوگا لیکن جانِ عالم کے شہر میں بغیر بجلی والے مکان کے دن عید اور رات شب برات کی طرح کٹتے تھے۔ بُرا ہو کثیر العیالی کا جس نے ایک مدت سے "بالائیوں" بوزوں اور پٹی کھوے سے "نامحروم" کر رکھا تھا۔
کہا ہوگا رجب علی بیگ سرور نے ؎

آسماں کی کیا ہے طاقت جو چھڑائے لکھنؤ
لکھنؤ ہم پہ فدا اور ہم فدائے لکھنؤ

آسماں کی طاقت تو روز بروز بڑھتی گئی مگر لکھنؤ کے شیدائیوں کی تاب مقاومت جواب دیتی گئی۔ عروجِ آدمِ خاکی کے اس دور میں چاہے انجم سہمے جاتے ہوں اور ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل پر کمند ڈال رہا ہو مگر یہ آدمِ خاکی نہ آسماں کو اپنے قابو میں لا سکا نہ بیگم کو۔ اکبر بیگم کی توجہ سے شہید ہو گئے تھے مگر اس دور کا نوجوان ہی نہیں ہم سا

ادھیڑ عمر والا بھی بیگم کی چینِ جبیں کی تاب نہ لا کر میر کا قائل ہو گیا ؎

واں چینِ جبیں پہ آئی کہ یاں رنگ زرد تھا

تو سامعینِ کرام ؎

سناؤں تمھیں بات اک رات کی
کہ وہ رات اندھیری تھی برسات کی

لاحول ولاقوۃ۔ بات کیا بتانا چاہتا تھا اور شعر کون سامنے سے نکل گیا۔ ہمارے بعض فلسفی قسم کے ادیب کبھی کبھی شاید پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔ یعنی کچھ ذہنی پس منظر، کچھ لاشعور اور کچھ تحت الشعور وغیرہ کی بات۔ قصہ یہ ہے کہ ادھر تو میرا قلم چل رہا تھا اور ادھر جولائی۔ اگست ۴۳ء کی برسات کی راتیں خدا جانے کہاں سے دل کے ایک گوشے میں جھانکنے لگیں۔ بس میرا جو حال ہوا وہ میں جانوں یا بیگم۔ غضب ہو گیا ہوتا اگر حافظ شیراز نے تحت اللفظ میں ڈانٹ کر نہ کہا ہوتا ؎

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو
رندی و ہوسناکی در عہدِ شباب اولیٰ

ہاں تو بات تھی آسمان کی طاقت کی جس نے بیگم سے گزشتہ کئی برسوں سے لکھنؤ چھڑا رکھا تھا۔ لیجیے صاحب! ربیع الاول کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ کالج بھی بند ہو گیا تھا۔ بچے بھی یوں فارغ التحصیل ہوے کہ ایک فیل ہوا، دوسرے کو پروموشن ملا، تیسرے کو زبردستی آگے دھکیل دیا گیا، چوتھے نے کسی قدر اچھے نمبروں سے پاس ہو کر گویا گزشتہ اور آئندہ نسلوں پر احسانِ عظیم کر کے ہم کی جزا کا قطعی جواز

تلاشں کرلیا، پانچویں صاحب کا فیل ہونا برحق تھا، موت کی طرح چھٹے اور ماشاءاللہ ساتویں کی بابت ابھی سے کچھ کہنا اس لیے خطرناک تھا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات منھ سے نکل جاتی تو نوج دور پار رحمیں جم۔ قرآن درمیان۔ شیطان کے کان بہرے اور سات سمندر پار کی مشین گن چلنے لگتی اور مسلسل فائر کے باعث چاہے شیطان بہرا ہوتا یا نہ ہوتا مگر خاکسار تو یقیناً بہرا ہو ہی جاتا۔ بیگم سے نہیں خود اپنے سے۔

قصہ کوتاہ۔ میں ایک طرف اور سارا قبیلہ ایک طرف! اقبال کیا شاعر تھا۔ کیسے کیسے شعر کہہ گیا ہے، جس کا دل چاہے کوئی نہ کوئی شعر اپنے حسبِ حال نکال لے۔ چنانچہ ؎

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لیے،
کہ یک زباں ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف

پڑھ کر میں نے جیب خالی کر دی۔ یوں تو مہینے کی ہر پہلی تاریخ کو ایک شریف آدمی کی طرح میں بھی جیب خالی کر دیا کرتا تھا مگر اس بار جب پہلی سے صرف ۹ دن قبل جیب خالی کرنے کا سوال پیدا ہوا تو میں سخت قسم کے اسہال میں مبتلا ہو گیا۔ سوال یہ تھا کہ جیب خالی کی جائے تو کیسے۔ بھری ہو تو خالی ہو۔ خالی جیب والا کیا خالی کرے۔ بہت سوچا۔ بات سمجھ میں آگئی۔ کسی ایسے کی جیب کاٹی جائے جو کٹنے کے بعد بھی بھری رہے۔ مگر کون سی ترکیب ہو کہ جیب بھی کٹ جائے اور پکڑ دھکڑ سے بھی بچے رہیں۔ مہینے کی ۲۲ تاریخ کو اس گرانی اور گرانی الاؤنس کی ارزانی کے ساتھ ساتھ ہم ایسے "صاحبانِ مقدرت" کے لیے کوئی راہ چارہ نہ تھی بجز اس کے کہ بینک سے ۹ دن قبل بطور ادوڈرافٹ پوری تنخواہ وصول کر لی جائے چنانچہ جتنی دعائیں یاد تھیں صرف دریاں کر کے صاحب کے کمرہ میں داخل ہوا تو میری دعاؤں کا اثر دربان پر پڑا ہو یا نہیں مگر صاحب پر پڑ چکا تھا۔ میرے قد کی درازی جسم کی فربہی، چہرہ کی شرافت اور عہدے کی دباعنت ـــ ان سب نے مل کر کام بنا دیا اور جب جیب بھر کر گھر پہنچا تو ہر نظر ہمہ تن تجسس بنی ہوئی تھی۔ جیسے ہی میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا سب کی باچھیں کھل گئیں اور بیگم تو مجھے اس طرح دیکھنے لگیں جیسے ۱۹۴۳ء میں "آرسی مصحف" کے وقت دیکھا تھا۔ میرے گھر کا سارا ماحول کچھ اس طرح کا تھا جیسے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو پورے وطن عزیز کا۔ ایک آواز آئی ع

ضربِ موسم تو بڑی بندِ بہاراں تو کھلا

ایک مدت سے میں چونکہ گھاٹے کا بجٹ چلاتا آیا تھا اس لیے پورے کنبے کو یقین تھا کہ میں بہر حال شہر نگاراں چلنے کے لیے زاد راہ وغیرہ کا انتظام کر ہی لوں گا۔ اس لیے ناشتہ دان پا بہ رکاب بستر آمادۂ سفر بکس تیار تھے۔ اور ہولڈال کے تسمے بچوں کے لیے لگامِ فرس کا کام دے رہے تھے۔ غرض میں بھی اس دھماچوکڑی میں شامل ہو گیا۔ جب دوپہر کے کھانے سے فراغت ملی تو بیگم نے ایک خاص ادا کے ساتھ مسکراتے ہوئے گلوریاں پیش کیں۔ ان کی مسکراہٹ کی تاب لانا کس کے بس کی بات تھی چنانچہ میں نے گلوریاں منھ میں رکھ کر جامِ شہادت پی لیا۔

جب سارا کنبہ آمادۂ سفر ہو چکا تو ایک سخت مسئلہ درپیش ہوا۔ سنتا ہی نہیں بلکہ دیکھتا بھی آیا تھا کہ جب لوگ صاحب اولاد ہونے کی تمام کوششوں کے باوجود ناکام ہو جاتے ہیں تو پھر اولاد معنوی پیدا کرنے لگتے ہیں۔ شاعر ہوئے تو بے تحاشہ شاگرد بنا ڈالے مدرس ہوئے تو ہر محلہ میں ایک غول بیابانی دکھائی دینے لگا۔ یہ بھی نہ ہوا تو بے چاروں نے اپنے جذبۂ تخلیق کی سیری کے لیے کچھ مرغیاں، بلّیاں، خرگوش، کچھوے اور مینڈک پال لیے۔ مگر آپ نے کم سنا ہوگا کہ کسی گھرانے میں اللہ کا فضل ہو۔ ایک مانگنے پر سات سات اولادیں عطا ہوں اور پھر بھی تخلیق کا جذبہ نہ صرف بیدار رہے بلکہ طرح طرح کی اولادوں سے گھر اچھا خاصہ پاگل خانہ بن جائے۔ چنانچہ میرے یہاں کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ کئی عدد بکس، ہولڈال، ٹین دے، ناشتہ دان پاندان، صراحی گلیں اور آموں کے جھابوں کے ساتھ بیگم کی اولاد معنوی کا کیا انتظام کیا جائے۔ بالآخر طے ہوا کہ صلبی اولاد کے ساتھ ساتھ سببی اولادیں بھی لکھنؤ چلیں۔ ایک درجن مرغیاں ان کے کئی عدد شوہر اور پھر کثرتِ ازدواج کے عملی نتائج یعنی دو

نصف درجن جوڑے کبوتر، اُن کے بچے، بلّے بلّیاں، خاک دھول بلا جو کچھ گھر میں تھا آمادۂ سفر ہوگیا۔ اس سارے سیلاب بلا کو ریلوے اسٹیشن تک لے جانے کا کام بھی ایک علاحدہ مسئلہ تھا۔ کتنے رکشے بلائے جائیں ان کا کرایہ کتنا اور کس طرح طے کیا جائے؟ جب رکشوں کی تعداد کا صحیح تعین نہ ہوسکا تو "آتے جاؤ بھرتے جاؤ" پر عمل درآمد کیا گیا۔ چنانچہ جب ہم لوگ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے تو جگہ جگہ پر ٹریفک جام ہونے لگی۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ جواب کیا اگر دس برس قبل کر لیا ہوتا تو اس طوفان بلا سے بھی بچے رہتے، شرافت سے بھی ہاتھ دھونا نہ پڑتا اور میر جی کی طرح سفر نہ کرتے۔ مگر صاحب! تہہ درویش برجان درویش کسی نہ کسی طرح اسٹیشن پر وارد ہوئے اور تقریباً ایک درجن ٹکٹ خرید کر اور اولاد معنوی کو ساتھ لے کر ایک بھرے ہوئے ڈبے پر دھاوا بول دیا۔ مسافروں نے اس یلغار کے پیش نظر عافیت اسی میں دیکھی کہ ہم سب کے لیے جگہ خالی کر دیں۔ میرا ڈبہ ہی نہیں ساری ٹرین جنسی بے اعتدالیوں کے ثبوت سے پٹی تھی اور ہم سب اس کے مجرم۔ مگر اب تو تیر کمان سے نکل چکے تھے۔ آج کل گاڑیوں کا جو عالم ہوتا ہے اس سے سب ہی واقف ہیں۔ غرض پورا سفر شب بیداری میں گزرا اور بیگم کی معنوی نسل مصروف خواب شیریں رہی۔ کاش اس پر یہی عالم اس وقت بھی طاری رہتا جب گاڑی علی الصباح لکھنؤ اسٹیشن پر وارد ہوئی۔ مگر آپ کو علم ہے کہ شب بیداری کرنے والے کبھی کبھی فریضۂ سحر سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے نوم سے بیدار کرنے کے فرائض ایک خاص مخلوق کے سپرد کی گئی ہے۔ گھر میں سہ کران کے ذہن کی یہ ادائی کیا کم تکلیف دہ تھی کہ اسٹیشن پہنچ کر تو انھوں نے احساس فرض کی شدت کا اور بھی زور شور سے اعلان کرنا شروع کر دیا اور چار باغ پر فی البدیہہ مشاعرہ شروع ہوگیا۔ ایک نے مصرع دیا، دوسرے نے گرہ لگائی۔ تیسرے نے مطلع عرض کیا تو چوتھے نے حسن مطلع پیش کیا۔ میں نے اور بیگم نے بار بار مقطع کی فرمائش کی مگر طبع کی روانی میں رکاؤ کا کوئی امکان نہ دیکھا مجبوراً تمام شعرا و سامعین کو قلیوں کے سر پر رکھ کر گویا ٹرانسسٹر ساتھ لیے ہوئے آنکھوں میں دھول ڈالنے کی کوشش کے ساتھ بھاری قدموں سے (بھاری پاؤں سے نہیں) باہر نکلنے کے لیے زینے چڑھنے شروع کر دیے۔ مگر ؎

تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

بس جیسے ہی چلتے پھرتے مشاعرہ کا منظر پاسبان کے سامنے آیا میں نے سوچا غالب والی ترکیب کر دوں۔ مگر فوراً خیال آیا کہ مرزا صاحب کا حشر کیا ہوا تھا۔ اس لیے میں اپنی شامت کیوں بلاؤں۔ لہٰذا نہ گدا بن کر پاسبان کے قدم لیے اور نہ فقیروں کا بھیس بنا کر تماشائے اہل کرم دیکھنے کی جرأت کی بلکہ نہایت چابکدستی سے "زر بر سر فولاد نہی نرم شود" پر ایمان لاتے ہوئے ایک درجن ٹکٹوں کے درمیان ایک "سرخ پوش" کو خندۂ دنداں نما کے ساتھ حاضر خدمت کرتے ہوئے اس رواں مشاعرے کو صاف نکال لے جانے میں کامیاب ہوگیا اور اس کے بعد سے ماچس لکھنوی مرحوم کے اس شعر پر ایمان لے آیا ؎

دیکھا جو ہری مُہر کا بولے یہ فرشتے   لا ہاتھ ملا نامۂ اعمال ندارد

آخر میں باری تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اس افسانہ کو میرے لیے کبھی حقیقت میں تبدیل نہ فرمائے اور میرے دوستوں، کرم فرماؤں بلکہ دشمنوں کے اس سچے واقعہ کو افسانہ بنا دے تاکہ ہمارے تمام گزشتہ اور آئندہ عصیان بخش دیے جائیں۔

★

"مجھے جو خدا بھگوت گیتا میں نظر آتا ہے، وہی انجیل مقدس اور قرآن مجید میں بھی نظر آتا ہے۔"

—— مہاتما گاندھی

احتشام نمبر کے بارے میں قارئین کے
تاثرات و محسوسات

(گزشتہ سے پیوستہ)

پروفیسر آل احمد سرور (علی گڑھ)

نیا دور کا احتشام نمبر چند روز ہوئے مل گیا تھا۔ آپنے اس نمبر پر بہت محنت کی اور واقعی یہ احتشام مرحوم کے متعلق معلومات، تاثرات، تنقید اور تحقیق سب کا گنجینہ ہے۔ مجھے ظ۔ انصاری کا مضمون اور شمیم کرہانی کی نظم خاص طور پر پسند آئی۔ دوسرے اندراجات بھی اچھے ہیں۔

صالحہ عابد حسین (نئی دہلی)

احتشام نمبر پڑھا۔ بہت پسند آیا۔ یوں تو بہت سے رسالوں نے احتشام صاحب مرحوم پر نمبر نکالے ہیں مگر نیا دور کا احتشام نمبر ان کے اور نیا دور دونوں کے شایان شان ہے۔ یوں تو بہت سی چیزیں پسند آئیں مگر ڈاکٹر محمد حسن کا مضمون اور احتشام صاحب کے بھائی کا مضمون "بھیا" دونوں لاجواب مضمون ہیں۔ ایک میں سچے جذبات کی درد بھری عکاسی ہے تو دوسرا بڑی دیانت اور عقیدت کے ساتھ لکھا گیا ہے جس سے احتشام صاحب مرحوم کی سیرت بھرپور سامنے آجاتی ہے۔

بیگم حامدہ حبیب اللہ (لکھنؤ)

مکرمی ایڈیٹر صاحب،

نیا دور کا "احتشام نمبر" دیکھا۔ اس دیدہ زیب اور ہر معنی میں جامع نکالنے کے لیے میں آپ کو "مبارک باد" پیش کرتی ہوں۔ احتشام حسین صاحب جس بلند پایہ کے دانشور اور انسان تھے، ان کی یاد میں آپ نے اسی پایہ کا نمبر نکال کر انھیں صحیح معنو میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس نمبر کے نکالنے کے لیے ایسے گراں قدر مضامین، نظمیں اور تصویریں فراہم کرنے اور ان کی ایڈیٹنگ کرنے میں آپ نے جو کد و کاوش کی ہوگی وہ یقیناً قابل ستائش ہے۔

ضیاء الدین اصلاحی (دار المصنفین۔ اعظم گڑھ)

احتشام نمبر آیا تو بے اختیار جی چاہا کہ آپ کو ہدیۂ تبریک و تحسین پیش کروں۔ واقعی آپ نے بہت عمدہ اور اچھا نمبر شائع کیا ہے، ترتیب، مواد، تنوع اور تصاویر وغیرہ ہر لحاظ سے دلکش اور دلاویز ہے۔ معارف میں اس پر ریویو لکھوں گا۔ ... مرحوم احتشام صاحب کے بھائی کا مضمون خاص طور پر بہت پسند آیا۔ احتشام صاحب جیسے فاضل ادیب، نقاد و عالم پر نیا دور کا یہ نمبر واقعی ان کے شایان شان ہے اور یہ سب دراصل آپ کے ذوق علم و ادب اور کوشش سلیقگی کا نتیجہ ہے۔ آپ کی یہ ادب نوازی یقیناً ارباب ذوق سے خراج تحسین حاصل کرے گی۔ میری رائے ہی کیا؟ کاش احتشام صاحب پر کچھ لکھ کر میں بھی اس نمبر میں شریک ہوا ہوتا۔

خلیق انجم (دہلی)

نیا دور کا احتشام حسین نمبر واقعی احتشام صاحب مرحوم کے شایان شان ہے۔ ان کی شخصیت اور فن کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو تشنہ رہ گیا ہو۔ ایک ایک صفحے اور ایک ایک سطر سے آپ کی لگن اور آپ کا خلوص جھلکتا ہے۔ آپنے جس محنت سے اتنے اچھے اور معیاری مضامین لکھوائے ہیں اور جس سلیقے اور خوبصورتی سے انھیں مرتب کیا ہے۔ اس کے لیے میں دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ حقیقت میں یہ ایک تاریخی نمبر بن گیا ہے۔

اگر آپ ان مضامین کو کتابی صورت میں شائع کر دیں تو یہ ایک مفید اور مستقل کام ہو جائے گا۔

سیف بجنوری (بجنور)

احتشام نمبر دیکھا اور ایک ایک لفظ پڑھا گیا بلکہ چاٹا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ موصوف پر بہت کچھ لکھا گیا ہے جو پڑھنے والوں کی توقعات کے عین مطابق ہے اور میرے خیال میں موصوف کی حیات کا کوئی رُخ تشنہ نہیں چھوڑا گیا ہے اور یہ سب کچھ آپ کی بہترین کارکردگی کا اعجاز ہی ہو سکتا ہے۔ آپ نے احتشام صاحب مرحوم پر تمام مضامین اور مواد کی فراہمی اور اس کی ترتیب پر جس قدر جانفشانی کی ہے وہ آپ کے حسن لیاقت کی دلیل ہے اور یہ کوشش و کاوش آپکے علمی و ادبی اور نیا دور سے خاص لگاؤ کی ایک سند ہے۔ جو لائق تحسین ہے اور پڑھنے والوں کی جانب سے آپ کی ذات حقیقی شکریہ کی مستحق ہے۔ ... مجھے برادر مکرم شمیم کرہانی کی المیہ نظم نے خاص طور سے متاثر کیا ہے اور ان کے احساسات کی درد انگیزی سے آنسو بہانے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ المیہ ناقابل فراموش المیہ ہے۔

اظہر علی فاروقی (الہ آباد)

احتشام نمبر ملا۔ اس قلیل وقفے کے اندر آپنے جس شان اور خوبصورتی سے یہ نمبر شائع کیا ہے یقیناً آپ کی ذہانت اور مخلصانہ جد و جہد کا نتیجہ ہے۔ دراصل یہ نمبر میرے لیے ایک غم آگیں مسرت بن کر آیا۔ اردو کا نہ صرف ایک عظیم ادیب بلکہ ایک انسانیت پرست عظیم انسان ناگہانی طور پر ہم سے جدا ہو گیا اور ہم کچھ نہ کر سکے۔

حیات وارثی (لکھنؤ)

احتشام نمبر مانگ کر دیکھا۔ اتنے جامع، وقیع اور مکمل نمبر کے لیے ہدیۂ

تہنیت اور گلہائے مبارکباد قبول فرمائیں۔

اشتیاق احمد لاری (لار۔ ضلع دیوریا)

صوری اور معنوی حسن سے مزین نیا دور کا احتشام نمبر نظر نواز ہوا۔ ایسا ضخیم اور ایسا وقیع نمبر نکالنے پر مبارکباد قبول فرمایئے۔ احتشام نمبر کے مطالعے سے احتشام صاحب مرحوم کی پروقار اور پرکشش شخصیت سے تو واقفیت ہوتی ہی ہے اُن کے فن سے متعلق بھی بہت سے گوشے سامنے آجاتے ہیں۔

وفا ملک پوری (پٹنہ)

آپ نے احتشام حسین نمبر اتنا شاندار نکالا ہے کہ بس دیکھا کرے کوئی۔ دراصل کوئی کام اس وقت تک "کارنامہ" نہیں ہو سکتا جب تک اس کام سے کسی نہ کسی طرح کا جذباتی لگاؤ نہ ہو۔ مرحوم احتشام صاحب کی پیاری شخصیت کے لیے ایسا پیارا نمبر ہی نکلنا چاہیے تھا۔ سو آپنے کر دکھایا۔

واحد پریمی (بھوپال)

۔۔ یہ نمبر ہر لحاظ سے شاندار اور جاندار ہے اور درحقیقت احتشام صاحب کے شایانِ شان ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین میں آپ نے جو محنت کی ہے وہ لائق ستائش ہے۔ یقین کامل ہے کہ آپ کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی اور یہ نمبر تمام ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

ڈاکٹر یوسف شریف الدین (وارنگل۔ آندھرا پردیش)

آپ نے نیا دور کا احتشام نمبر جس اہتمام سے نکالا ہے اور جتنے پُرمغز مضامین اس میں اکٹھا کیے ہیں اس کے لیے میری دلی مبارکباد قبول کیجیے۔

درویندر پرشاد سکسینہ (بدایوں)

آپ نے احتشام نمبر شائع کرکے اردو ادب کی جو خدمت کی ہے وہ سب پر روشن ہے۔ ادب کا کوئی مورخ جب احتشام مرحوم پر قلم اٹھائے گا تو اس کے لیے نیا دور کا احتشام نمبر کا مطالعہ ضرور کرنا ہوگا۔ یہ نمبر ہمارے تنقیدی ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ثابت ہوگا۔

اخلاق حسین عارف: ماہنامہ ترنم۔ لکھنؤ (اگست ۸۳ء)

میرا ذاتی مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ پچھلے چند برسوں میں ماہنامہ نیا دور نے عام اشاعتوں کے علاوہ جتنے خاص نمبر بھی جاری کیے ہیں وہ ہر حیثیت سے ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہیں۔۔۔۔۔ احتشام نمبر کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ یقیناً اچھی رائے قائم کریں گے۔ احتشام نمبر کے لیے بلند پایہ مضامین، عکسی تصاویر اور دیگر مواد کی اتنی قلیل عرصے میں فراہمی، ان کی ترتیب و تدوین اور پھر کتابت و طباعت کے تمام مراحل سے گزر کر اسے اتنی جلد آپ کے ہاتھوں میں پہنچا دینا یہ جملہ چیزیں ایسی ہیں جو بغیر لگن اور لگن نیا دور کے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتیں۔

ان تمام کاوشوں کے پیچھے جناب خورشید احمد صاحب کی دلچسپیوں اور کاوشوں کا ہاتھ تھا اور وہ اُس کے لیے یقیناً لائق صد تحسین ہیں کہ انھوں نے اتنا ضخیم اور خوبصورت ادبی جریدہ اتنے قلیل عرصے میں مکمل کرکے پیش کر دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ نیا دور کے پبلشر جناب تسرومنی شرما جو محکمۂ اطلاعات کے ڈائرکٹر بھی ہیں، لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے مدیرِ نیا دور کے ساتھ ہر موقع پر تعاون فرما کر ان کی کاوش کو کامیابی کی منزل تک پہنچایا۔

مرزا رضا حسین: ہفتہ وار سرفراز لکھنؤ (۲ ستمبر ۸۳ء)

محکمۂ اطلاعات اترپردیش کے شائع کردہ ماہنامہ "نیا دور" نے مئی جون ۸۳ء کے شمارہ میں جو ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے مرحوم پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کی یادگار میں جو "احتشام نمبر" نکالا ہے وہ کئی خیال میں ہر اعتبار سے جامع، وقیع اور عظیم کہلانے کا مستحق ہے۔۔۔۔۔ مجموعی طور پر "نیا دور" کا یہ خصوصی نمبر نہایت ہی شاندار اور کامیاب ہے۔ کاغذ کافی اچھا استعمال کیا گیا ہے۔ کتابت اور طباعت دل نشین ہے۔ تصاویر مرحوم کی یاد تازہ کرتی ہیں، شعرا اور مقالہ نگاروں کا انتخاب بھی نہایت ہی سلیقہ کے ساتھ کیا گیا ہے۔

بعض نظموں اور بعض مقالات نے اس خصوصی نمبر کے معیار کو کافی بلند کر دیا ہے اور اس میں جان ڈال دی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ یہ حقیقت بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ایڈیٹر صاحب "نیا دور" اپنی پرخلوص محنت اور کاوشوں کے لیے مستحق مبارکباد ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس شدید گرانی میں اس خصوصی نمبر کے بلند پایہ اور اس کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے اس کی ایک روپیہ قیمت بہت ہی کم ہے، قدر شناسانِ مرحوم کا فرض ہے کہ وہ اس نمبر کو خرید کر ان کی ایک مستقل یادگار اپنے پاس رکھیں۔

روزنامہ سیاست: کانپور (۱۲ ستمبر ۸۳ء)

اردو کے نقاد، ماہر لسانیات اور استاد سید احتشام حسین کی یادگار میں یوپی کے سرکاری محکمۂ اطلاعات نے یہ خاص نمبر بڑے اہتمام سے نکالا ہے، جو نفیس طباعت اور اعلیٰ کاغذ کے ظاہری حسن کے ساتھ، اچھے اور قابل مطالعہ مضامین کی معنوی لطافتوں کا بھی آئینہ دار ہے اور اس کے ایڈیٹر خورشید احمد صاحب اس مجموعہ کی اشاعت کے لیے مستحق تہنیت و مبارکباد ہیں۔

حصہ نثر میں پروفیسر آل احمد سرور، سید شبیہہ الحسن نونہروی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، ظ۔ انصاری، شارب ردولوی، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد وغیرہ کے مضامین اور حصہ نظم میں جمیل مظہری، علامہ فرقت کاکوری (جو افسوس ہے کہ خود بھی یکایک ایک سفر کے دوران سفر آخرت پر روانہ ہو گئے، قبل اس کے کہ اس رسالہ میں ان کا لکھا ہوا مرثیہ شائع ہو سکے) عمر انصاری، ثمر بدایونی وغیرہ کی نظمیں خاص طور سے لائق مطالعہ ہیں۔

★

قطعات

اختر بستوی

دُور ہے منزلِ تطہیرِ محبت اب تک
ذہن میں اب بھی چھپا بیٹھا ہے احساسِ گناہ
یوں بھی جاتا ہے تری سمت ابھی میرا خیال
جیسے اک حور کی جانب ہوس آلود نگاہ

مرہمِ زخمِ جگر ہیں تری یادوں کے نقوش
ان کو احساس کے پردے سے مٹانا ہی محال
یہ تو ممکن ہے کہ کردوں میں تجھے دل سے معاف
تجھ کو اے دوست مگر دل سے بھلانا ہے محال

حُسنِ فطرت سے نکھر جاتا ہے حسنِ اجسام
رنگِ رخسار کو کرتا ہے فزوں رنگِ چمن
چاندنی سحر طرازی کا سبب بنتی ہے
تیری آنکھوں میں ہوا کرتی ہے جب عکس فگن

تیرے جلوے تو بہت عام ہیں اے دوست مگر
تیرا دیدار کچھ اس طور سے ہم پاتے ہیں
جیسے دیکھے کوئی اُن ابر کے ٹکڑوں کی طرف
خشک کھیتوں سے جو بے فیض گزر جاتے ہیں

ہم نشینو! مری تخریب بھی بن جائے گی
حسنِ اغیار کی آرائش و زینت کی بنا
آج تم جس کو سمجھتے ہو مرا قطرۂ خون
کل بنے گا کفِ قاتل پہ وہی نقشِ حنا

اکتوبر ۱۹۷۳ء

ڈاکٹر ماتا پرشاد استھانا زیبؔ بریلوی

محفلِ عام میں چھیڑا تھا فسانہ تو نے
بربطِ قوم پہ گایا تھا ترانہ تو نے
درس سے تو نے اہنسا کے زمانے بھر میں
ذہنِ جمہور کیا آئینہ خانہ تو نے
انجمن تیری سزاوار رہے گی برسوں

ترا احساس نیا تھا ترا ہر ڈھنگ نیا
تیری ہر فکر کی تصویر میں تھا رنگ نیا
تو نے پایو کیا ہر سازِ کہن کو بیکار
تیری آواز نئی تھی ترا آہنگ نیا
انجمن قوم کی بیدار رہے گی برسوں

دین و ایماں کے کیے تو نے نمایاں اسرار
عرشِ جلوہ ہے تری فکر کا رنگیں شہکار
شانتی، امن کا پیغام وطن کو دے کر
تو نے برسائے تھے افکار کے اتنے انوار
زندگی مطلعِ انوار رہے گی برسوں

راہِ آزادیِ انساں کو نیا موڑ دیا
داغِ احساسِ غلامی کا فسوں توڑ دیا
انجمن کو تری باپو ہے ضرورت اب بھی
تو نے کیوں رشتۂ اربابِ وطن چھوڑ دیا
یہ شکایت مرے غمخوار رہے گی برسوں

پرچمِ قوم کو لہرا کے وہ انداز دیا
تم نے ایثار کے جذبات کو وہ ناز دیا
شمعِ آزادی کا پروانہ بنا کر باپو
تم نے جمہور کی آواز کو وہ ساز دیا
ٹوٹے تاروں میں یہ جھنکار رہے گی برسوں

آشون ۵۹۵۰ ڈنگ

پرانے زمانے میں اجنبی اور غیر معروف علاقوں میں سفر کرنے والوں کو جنگلی جانوروں، انجان قبائلیوں اور قدرت کی ستم ظریفیوں کے سبب بہت سے خطرات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن منظم سماج کے فروغ اور سفر کے ذرائع میں ہونے والی تکنیکی ترقیوں نے ان خطرات کو قریب قریب ختم کر دیا ہے۔ تاہم کسی بھی قسم کے سفر میں اور کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں حادثات اب بھی پیش آتے

رہتے ہیں۔ مگر احتیاطی اور حفاظتی اقدامات کے ذریعے ہم حادثات کی تعداد کو بہت کم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہندستانی ریلوے کے حکام کی بھی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے۔

حادثات میں کمی

گاڑیوں کے تصادموں، ان کے پٹری سے اتر جانے یا گاڑی میں آگ لگ جانے کے سبب ۱۹۷۲ء کے دوران ہونے والے واقعات اور لیول کراسنگ پر ہونے والے حادثات کی کل تعداد ۸۰۷ تھی جب کہ ۱۹۷۱ء کے دوران یہ تعداد ۷۵۶ تھی۔

گزشتہ ۲۰ برسوں کے دوران حادثات کی کل تعداد میں ۶۱ فی صد کمی ہوئی ہے حالانکہ ریلوے سفر کے ذریعے طے ہونے والی مسافت میں ۵۶ فی صد اضافہ ہوا ہے۔

اس مدت کے دوران ایسے حادثات کی تعداد میں بھی کمی ہوئی جن میں اتلاف جان ہو سکتا تھا یا جسمانی نقصان پہنچ سکتا تھا اس قسم کے حادثات کی تعداد ۵۳-۱۹۵۲ میں ۶۸۶ تھی جو ۷۲-۱۹۷۱ء کے دوران تقریباً نصف یعنی ۳۶۴ ہو گئی۔

حادثات کی روک تھام

ہندستانی ریلوں پر حادثوں کی تعداد کیسے کم کی جا سکی ہے۔ مختلف مطالعوں سے پتہ لگایا گیا ہے کہ انسانی نے عملی

یا ناقص کارگزاری، اور ساز و سامان کا ٹھیک سے کام نہ کرنا حادثات
کے دو اہم وجوہ ہیں۔ ٹریفک میں روز افزوں اضافے کے
ساتھ ساتھ تیز رفتاری سے ٹرینوں کو چلانے میں خطرات زیادہ ہو جاتے
ہیں۔ ہندستانی ریلوں کے حادثات کی روک تھام کی پالیسی
کی بنیاد عملے کی مناسب تربیت اور رجحان نیز بہتر تکنیکی سامان
کے استعمال کو فروغ دینا ہے تاکہ نظام کار میں اندرونی تحفظات
فراہم کیے جائیں۔

ریلوے کے محکمے کی جانب سے جو حفاظتی تنظیمیں قائم
کی گئی ہیں وہ ریلیں چلانے والے عملے کے اندر احتیاط اور تحفظ
کا جذبہ پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ تنظیمیں اس بات کی
بھی کوشش کرتی ہیں کہ عملے کے ارکان تحفظ سے متعلق مقررہ قوانین
کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور انھیں برت سکیں۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ عملے کے ارکان تحفظ کے قوانین کی خلاف ورزی
تو نہیں کرتے، اچانک معائنے کیے جاتے ہیں۔ تمام حادثات
کی تحقیقات کی جاتی ہیں اور ذمے دار افراد کے خلاف مناسب
کارروائی کی جاتی ہے۔ اگر تحقیقات سے دیگر کسی غلطی کا پتہ
چلتا ہے تو ایسی غلطی کے دوبارہ سرزد نہ ہونے کے لیے بھی کارروائی
کی جاتی ہے۔

مختلف نفسیاتی مطالعوں سے پتہ چلا ہے کہ اگر کسی کام
کے کرنے کے لیے موزوں آدمی کو تعینات کیا جائے تو حادثات
میں کمی ہو سکتی ہے۔ اس مقصد کے لیے ریلوے کے تحقیق، ڈیزائن
اور معیار کے ادارے سے منسلک نفسیاتی تکنیکی شعبے سے کام
لیا جا رہا ہے۔ یہ شعبہ ریل چلانے والے عملے میں اپنا کام اچھی
طرح اور محفوظ طور پر انجام دینے کے لیے ضروری قابلیت کی موجودگی
یا عدم موجودگی معلوم کرنے کی غرض سے مختلف نفسیاتی اور جسمانی
امتحانوں کے طریقے کی ترتیب دے رہا ہے۔ ریلوے حکام تحفظ
سے قریبی تعلق رکھنے والے عملے کی بھرتی کے موقع پر
جانچ کے ان طریقوں کا استعمال کرنے لگے ہیں۔ یہ بھی تجویز ہے
کہ ریل چلانے والے عملے کے منتخب زمروں کی ترقی کے موقع پر بھی
امیدواروں کو اس نفسیاتی اور جسمانی جانچ سے گزارا جائے تاکہ
انسانی معیار کارکردگی کو بہتر بنایا جا سکے۔

انسانی کارکردگی کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ ساز و سامان
کی خامیوں کو دور کرنے کی طرف بھی کافی توجہ دی جا رہی ہے جو
حادثات کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ اسپیڈو میٹرس یعنی رفتار کا ریکارڈ
رکھنے والے آلے کی کارکردگی کی مدت دس تا پندرہ سال مقرر
کی گئی ہے اور ریلوے عملے کو ہدایت کی گئی ہے کہ ان آلات میں
چھوٹی سی چھوٹی خامی یا غلطی کو معلوم کریں۔ اسی طرح الیکٹرک
ملٹی پل یونٹوں سے پینٹوگراف کے پاس چنگاریوں کے نکلنے کو
روکنے کے لیے ضروری کارروائی کی گئی ہے۔ اس بات کی بھی
پیش بندی کی گئی ہے کہ گاڑی کے اندر روشنی کرنے والے ڈائنمو
اچانک پٹری پر گر کر چلتی گاڑیوں کے لیے حادثہ کا سبب نہ بننے
پائے۔

ریل کی پٹریاں سطح زمین سے مل جانے کے واقعات کو
کم کرنے کے لیے کئی اور حفاظتی اقدامات کیے جا رہے ہیں جہاں
کہیں ریل کی پٹریاں اور سڑک ایک دوسرے سے بہت قریب
ہیں اور ٹرینوں اور سڑک پر چلنے والی گاڑیوں وغیرہ میں تصادم
کے امکانات زیادہ ہیں، وہاں مناسب باڑ اور روک فراہم
کی جا رہی ہیں۔ پٹریوں کے اوپر حادثات سے بچنے کے لیے پٹریوں
کے اوپر کئی پل تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ اب تک ایسے ۱۶ پل تیار
کیے جا چکے ہیں اور مزید ۲۰ پل زیر تعمیر ہیں۔

بہت سی ایسی گمٹیوں (لیول کراسنگوں) پر جہاں پہلے کوئی
آدمی تعینات نہیں ہوتا تھا وہاں اب ریلوے کی جانب سے
ملازم مقرر کیے جا رہے ہیں اور اٹھائے اور گرائے جانے
والے پھاٹک مہیا کیے جا رہے ہیں۔ سیلابوں سے ہونے والے
نقصانات کی وجہ سے لاحق خطرات کو دور کرنے کی طرف بھی
متواتر توجہ دی جا رہی ہے۔

سگنل کے بہتر طریقہ کار اور روٹ ریلے انٹرلاکنگ نظامات
کو بھی حفاظتی اقدامات کے طور پر رائج کیا گیا ہے اور ان سب اقدامات

کے نتیجے میں ریلوے سفر مقابلتاً زیادہ محفوظ ہو گیا ہے۔

کھانے کے بہتر انتظامات

ریل کے سفر کو محفوظ بنانے کے ساتھ ساتھ اسے خوشگوار اور آرام دہ بنانے کی جانب بھی خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں منجملہ دیگر آسائشوں کے دوران سفر کھانے کے معقول انتظامات پر خاص زور دیا جا رہا ہے تاکہ مسافروں کو ان کی ضرورت کے مطابق مناسب نرخ پر صاف ستھرا لذیذ اور غذائیات سے بھرپور کھانا مہیا کیا جا سکے۔ ہندستانی ریلوے ہمیشہ یہ کوشش کرتی رہی ہے کہ اس انتظام کو بہتر بنایا جائے۔

ریلوے اسٹیشنوں پر کھانا مہیا کرنے کے انتظامات ریلوے کے لائسنس یافتہ کنٹریکٹر کرتے ہیں یا پھر محکمہ جاتی طور پر خود ریلوے کی طرف سے کیے جاتے ہیں۔ مسافروں کے لیے ۔۔ ۲۹ اسٹیشنوں اور ایک سو ٹرینوں پر کھانے کے انتظامات کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ۱۰۸ اسٹیشنوں اور ۵۲ ٹرینوں پر محکمہ جاتی انتظامات ہیں، باقی اسٹیشنوں اور ٹرینوں پر کنٹریکٹروں کے انتظام میں مسافروں کو یہ سہولت مہیا کی جاتی ہے۔
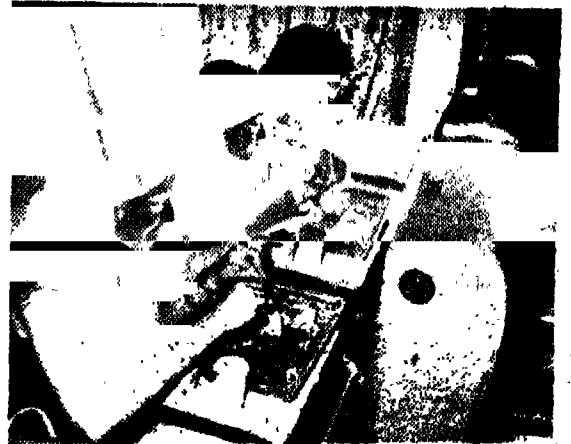
تیار کھانے

مسافروں کو بروقت کھانا فراہم کرنے کے عالی رجحان کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ڈائننگ کار میں کھانے کی فراہمی کے روایتی نظام کو بہتر بنانے کے لیے ریلوے نے ایک نیا تجربہ شروع کیا ہے۔ نئے انتظام کے تحت کسی ایک مقام پر کھانا تیار کر کے گرم ناشتہ دانوں میں بھر لیا جاتا ہے اور سفر کے دوران مناسب وقت پر مسافروں کو پیش کیا جاتا ہے۔

اس طرح کا انتظام پہلی بار راجدھانی ایکسپریس پر کیا گیا تھا، گزشتہ اپریل میں نئی دلی اور بمبئی سنٹرل کے درمیان چلنے والی فرنٹیئر میل پر بھی رائج کیا گیا۔

اس انتظام کے فوائد یہ ہیں کہ ڈائننگ کاروں میں کھانے پکانے اور چلتی ٹرینوں میں برتن دھونے کی ضرورت نہیں پڑتی اور کھانے کا سامان رکھنے کے کمرے (پینٹری کار) کو صاف ستھرا رکھا جا سکتا ہے اور بیرے اور باورچی صاف ستھری وردیوں میں رہ سکتے ہیں۔ ڈائننگ کار کو پینٹری کار (یعنی کھانے کے سامان کے کمرے) میں تبدیل کر دینے سے مسافروں کے بیٹھنے کے لیے زیادہ جگہ نکل آتی ہے۔

مسافروں کی جانب سے کھانے کی سروس کے اس نئے انداز کو عام طور پر پسند کیا گیا ہے جس سے حوصلہ پا کر ریلوے نے شروع سال سے نئی دلی اور مدراس کے درمیان گرانڈ ٹرنک ایکسپریس پر تیار کھانوں کی اسکیم کا آغاز کیا ہے۔ اس اسکیم کو نئی دلی اور بمبئی سنٹرل کے درمیان چلنے والی "ویسٹرن ایکسپریس" پر بھی شروع کیے جانے کی توقع ہے۔ اس اسکیم کو دوسری اہم ٹرینوں پر رائج کرنے کے لیے ایک مرحلہ وار پروگرام ترتیب دیا گیا ہے۔

محدود مالی وسائل رکھنے والے مسافروں کے لیے جن کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے ریلوے چند چیزوں پر مشتمل کھانے کے پیکٹ فراہم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ کھانے کے ایک پیکٹ کی قیمت ۷۵ پیسے ہوگی اور اس میں پوریاں، آلو اور ایک میٹھی چیز ہوگی۔

جدید کاری

محکمہ ریلوے، باورچی خانے سے متعلق جدید طریقوں اور سازوسامان سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے مقصد سے انھیں کیٹرنگ کے منتخب یونٹوں میں رائج کر رہا ہے تاکہ مسافروں کو بہم

پہنچائی جانے والی سہولتوں کو بہتر بنایا جاسکے۔ محکمۂ ریلوے بتدریج "ہاٹ کیس" "آئسولیٹڈ ٹرالیز" وغیرہ جیسے سازوسامان حاصل کر رہا ہے محکمۂ ریلوے میں کیٹرنگ کے عملے کو مرحلہ وار اسکیم کے مطابق دزارت خوراک اور زراعت کے تحت بمبئی میں انسٹی ٹیوٹ آف کیٹرنگ ٹکنالوجی اینڈ اپلائڈ نیوٹریشن" میں تربیت کے لیے باقاعدہ بھیجا جاتا ہے تاکہ انھیں کیٹرنگ کے کام میں پیشہ ورانہ مہارت حاصل ہوسکے۔

کنٹریکٹروں پر قابو رکھنے اور کیٹرنگ سروس کا معیار برقرار رکھنے کے لیے ریلوے نے چند اصول مرتب کیے ہیں مثلاً صرف انھیں کنٹریکٹروں کو افسروں کی ایک کمیٹی منتخب کرتی ہے جو کیٹرنگ کے میدان میں تجربہ رکھتے ہیں۔ ایک کنٹریکٹر کے تحت زیادہ سے زیادہ کیٹرنگ کے چھ یونٹ ہوسکتے ہیں۔ یہ شرط اس لیے ہے تاکہ کنٹریکٹر اپنے ہاں کے نظام پر ذاتی توجہ دے سکے اور ساتھ ہی کنٹریکٹ بھی معقول ہو۔ ریلوے کے کنٹریکٹروں کی جانب سے فراہم کیے جانے والے کھانوں اور سروس کے معیار پر ہمیشہ نظر رکھی جاتی ہے۔ تمام شکایات کی پوری پوری تحقیق کی جاتی ہے جس میں ضرورت پڑنے پر کنٹریکٹ بھی ختم کر دیا جاتا ہے۔

کیٹرنگ کی محکمہ جاتی یونٹوں میں بھی ریلوے کے کمرشیل اور طبی افسر کھانا تیار ہونے سے پہلے خام سامان اور پکانے کے بعد کھانوں کا اسٹوریج، تیاری اور کیٹرنگ کے تمام مرحلوں پر بار بار معائنہ کرتے ہیں۔ غذا کھانے اور خدمات کے معیار سے متعلق اپنی شکایات کو ایک رجسٹر میں درج کرنے کے لیے مسافروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے جو رسٹوران، ڈائننگ کار اور ہر کھانے پینے کی جگہ پر فراہم کیا جاتا ہے۔ تمام شکایات کی بروقت تحقیقات کی جاتی ہے اور کھانے اور سروس کے معیار میں کسی قسم کی کوتاہی کے لیے محکمہ جاتی انتظام کے تحت متعلقہ عملے یا ٹھیکیدار کے خلاف منا سب کارروائی کی جاتی ہے۔

ملاوٹ کی روک تھام

غذا میں ملاوٹ کی روک تھام کے قانون کے تحت ریلوے میڈیکل افسر اور سینیٹری انسپکٹر کھانوں کا معائنہ کرنے والوں کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ وہ ریلوے اسٹیشن وغیرہ پر ملنے والے کھانوں کے نمونوں کی ریلوے لیبارٹریوں اور ریاستی حکومتوں کی جانب سے قائم کردہ لیبارٹریوں میں جانچ کرواتے ہیں پھیری والے اور ٹھیکہ دار (کنٹریکٹر) جن کے نمونوں میں ملاوٹ کا خاطر خواہ ثبوت دستیاب ہو جاتا ہے ان پر عدالت میں مقدمہ چلایا جاتا ہے۔

ریلوے کی کیٹرنگ سروس کے انتظام میں عوام کا مشورہ بھی شامل ہے، اس مقصد سے اور اس نظام کو بنانے کے لیے ہر ریلوے پر علاقائی سطح کی نگراں کیٹرنگ کمیٹیاں کام کر رہی ہیں۔ ان کمیٹیوں میں ممتاز سماجی خدمات انجام دینے والے اداروں کے نمائندے اور پارلیمنٹ کے مبرشامل ہوتے ہیں۔

ریلوے کی جانب سے محکمہ جاتی کیٹرنگ کی خدمات کو اقتصادی طور پر معقول اور زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کی جارہی ہے کیٹرنگ ڈپارٹمنٹ نے جو ۶۶-۱۹۶۵ میں ۶۶۰۰۰ روپے کا نقصان اٹھایا تھا، بتدریج اپنی کارکردگی کو بہتر بنا کر ۷۲-۱۹۷۱ کے دوران ۱۸۳۰۰۰ روپے کی مالیت کے سامان کی فروخت کے ذریعے ۲۰۷۰۰۰ روپوں کا نفع کمایا۔

★

اتر پردیش شاہراہِ ترقی پر

تنخواہ میں پانچ فیصدی کٹوتی کے لیے گورنر کی اپیل ●●● "غریبی ہٹاؤ فنڈ" کے لیے تنخواہ سے کٹوتی ●●● سستے غلے کی دکانوں کی نگرانی کے لیے سپلائی افسروں کو ہدایت ●●● گیہوں کی قیمت خرید میں اضافہ۔ ایک وضاحت ●●● ریاستی ملازمین کے لیے مزید مہنگائی بھتہ ●●● روڈویز ملازمین کے لیے مفت سفر کی سہولتیں ●●● سول سروس ضوابط میں ترمیم ●●● اردو ٹیچروں کی نئی اسامیاں ●●● ملاوٹ کی روک تھام کے لیے مہم ●●● فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کے لیے ضلع کمیٹیوں کی تشکیل ●●● ریاستی یک جہتی کونسل کی ۲۰ رکنی کمیٹی ●●● لاٹری ٹکٹ فروخت کرنے میں شاہجہاں پور سرفہرست ●●● اتر پردیش کے لیے اسپتال کارپوریشن

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

گورنر شری اکبر علی خاں نے امسال یوم آزادی سے دو سال تک اپنی تنخواہ سے رضاکارانہ طور پر پانچ فی صد کی کٹوتی کا اعلان کرتے ہوئے ریاست میں ایسے تمام تنخواہ داروں تاجروں اور مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے جن کی ماہانہ آمدنی ۱۰۰۰ روپیہ یا اس سے زیادہ ہے اپیل کی ہے کہ وہ اپنی ماہانہ آمدنی یا منافع میں سے پانچ فی صد رضاکارانہ کٹوتی کے لیے رضامند ہو جائیں۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح جو رقم جمع ہوگی وہ غلہ کی قیمتیں کم کرنے کے لیے ایک غریبی ہٹاؤ فنڈ قائم کرنے کے لیے استعمال کی جائے گی۔

گورنر نے جو راج بھون میں یوم آزادی کے سلسلہ میں منعقدہ ایک تقریب میں تقریر کر رہے تھے کہا کہ انھوں نے یہ قدم موجودہ معاشی حالات اور عوام کی دشواریوں کے پیش نظر کمال عاجزی کے ساتھ اٹھایا ہے۔ یہ کٹوتی یوم آزادی سے دو سال تک کی مدت کے لیے ہوگی۔

گورنر نے ۱۰۰۰ روپیہ یا اس سے زیادہ ماہانہ تنخواہ پانے والوں سے اس قسم کی پانچ فی صد کی رضاکارانہ کٹوتی کے لیے اپیل کرتے ہوئے ڈاکٹروں۔ کارخانہ داروں اور تاجروں وغیرہ سے پرزور الفاظ میں کہا ہے کہ وہ بھی دو سال تک کے لیے اپنے منافع میں سے اس کٹوتی کے لیے رضامند ہو جائیں۔

گورنر نے اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ اشیائے صرف کی قیمتوں میں اضافہ اور بعض مقامات پر اُن کی قلت نے عوام کے لیے بڑی دشواریاں پیدا کر دی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حکومت عوام کی دشواریاں دُور کرنے کے لیے پرخلوص کوششیں کر رہی ہے۔ ضلع مجسٹریٹوں کو پہلے ہی یہ ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ چور بازاری کرنے والوں، منافع خوروں اور ذخیرہ بازوں کے خلاف سخت کارروائی کریں۔

گورنر شری اکبر علی خاں نے یوم آزادی کے موقع پر اپنی تنخواہ سے پانچ فی صد کٹوتی سے جو "غریبی ہٹاؤ فنڈ" قائم کیا تھا اس کا اثر فوری طور پر ظاہر ہو رہا ہے اور اتر پردیش اسمبلی کے اسپیکر اور گورنر کے تینوں مشیروں اور متعدد دیگر سرکاری افسروں نے اپنی تنخواہوں سے اسی قسم کی فوری کٹوتی کا اعلان کیا۔

× × ×

غلہ کمشنر شری بی۔ بی ٹنڈن نے رسد تنظیم کے افسروں کو تاکید کی ہے کہ وہ سستے غلہ کی دکانوں کے مقررہ اوقات کے مطابق کام کرنے اور جعلی راشن کارڈوں کا خاتمہ کرنے کے لیے یقینی طور پر بندوبست کریں۔

شری ٹنڈن نے جو عوام کی مشکلات کا جائزہ لینے کے لیے لکھنؤ سپلائی دفتر کا معائنہ کر رہے تھے، افسروں کو ہدایت کی کہ وہ ایسے وارڈوں کا انتخاب کریں جہاں ۱۹۷۱ء کی مردم شماری

کے مقابلہ میں راشن کارڈوں کی تعداد ۲۵ فی صد سے زیادہ ہے وہاں بھرپور جانچ کریں۔ اس کارروائی سے نہ صرف جعلی کارڈوں کا خاتمہ ہو جائے گا بلکہ سستے غلے کی ان دکانوں کا بھی پتہ چل جائے گا جو بدعنوانی کی مرتکب ہیں۔ انھوں نے ٹاؤن راشننگ افسر کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ ایسے معاملات کی خاص طور پر جانچ کریں جن میں مجرموں کو عدالت سے بری کر دیا جاتا ہے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اس کے لیے سپلائی کا عملہ کس حد تک ذمہ دار ہے۔

× × ×

بعض اخبارات میں یہ گمراہ کن اور غلط خبر شائع ہوئی ہے کہ گورنر کے مشیر شری ایم۔ کے قریشی نے یہ یقین دہانی کرائی ہے کہ وہ کسانوں اور ممبران مجالس قانون ساز کے مطالبے پر گیہوں کی قیمت خرید ۷۶ روپیہ فی کوئنٹل سے بڑھا کر ۱۰۰ روپیہ فی کوئنٹل کر دینے کے سلسلے میں مرکزی حکومت سے گفت و شنید کریں گے۔ اس سلسلے میں حقائق حسب ذیل ہیں:۔

وارانسی میں ۳۰ جولائی ۱۹۷۳ء کو منعقدہ خریف سیمینار میں ممبران مجالس قانون ساز، بلاک پرمکھوں اور ترقی یافتہ کسانوں نے پیداوار کی لاگت میں اضافہ کے پیش نظر اس بات پر زور دیا تھا کہ گیہوں کی ۷۶ روپیہ فی کوئنٹل قیمت خرید بہت کم ہے اور گیہوں کے کاشتکاروں کے لیے گیہوں پیدا کرنے اور اس پیداوار کو حکومت کے ہاتھ فروخت کرنے کے سلسلے میں یہ قیمت حوصلہ شکن ہے۔ انھوں نے یہ بات زور دے کر کہی کہ یہ قیمت خرید کم سے کم ۱۱۵ روپیہ فی کوئنٹل ہونا چاہیے ورنہ آئندہ ربیع میں بہت سے کاشتکار گیہوں کی کاشت کے رقبے پر دوسری فصلیں اگائیں گے۔ شری قریشی نے اس سلسلے میں یہ وضاحت کی کہ حکومت ہند اور زرعی اجناس کی قیمتوں کے تعین سے متعلق کمیشن کسانوں کے خیالات سے پوری طرح باخبر ہیں اور آئندہ ربیع فصل یعنی ۷۴-۱۹۷۳ء کے دوران گیہوں کی قیمت کے تعین کا معاملہ حکومت ہند کے زیر غور ہے۔

× × ×

اتر پردیش تنخواہ کمیشن کی سفارشات کے مطابق حکومت اتر پردیش۔ لوکل باڈیز اور امداد یافتہ تعلیمی و تکنیکی اداروں کے ۷۴۰ روپیہ ماہانہ تک نظر ثانی شدہ تنخواہ پانے والے ملازمین کے لیے ۷ روپیہ سے ۱۰ روپیہ ماہانہ تک مزید مہنگائی بھتہ یکم مئی ۱۹۷۳ء سے منظور کیا گیا ہے۔ یہ فیصلہ گورنر نے اپنی مشاورتی کونسل میں کیا جس کے مطابق ۱۸۰ روپیہ یا اس سے کم تنخواہ پانے والوں کو ۷ روپیہ ماہانہ۔ ۱۸۱ روپیہ سے ۳۶۴ روپیہ تک پانے والوں کو ۸ روپیہ ماہانہ۔ اور ۳۶۵ روپیہ سے ۷۴۰ روپیہ تک پانے والوں کو ۱۰ روپیہ ماہانہ کی شرح سے مزید مہنگائی بھتہ اس طرح منظور کیا جائے گا کہ تنخواہ اور مہنگائی دونوں کو ملا کر ماہانہ تنخواہ ۷۵۰ روپیہ سے زیادہ نہ ہونے پائے۔

مہنگائی بھتہ میں یہ اضافہ اتنا ہی ہے جو حکومت ہند نے اپنے ملازمین کے لیے منظور کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اضافہ قیمتوں میں اضافہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اتر پردیش تنخواہ کمیشن کی سفارشات کے مطابق بھی ہے۔ حکومت نے بہرحال یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ اضافہ عارضی ہے اور جب حکومت ہند مہنگائی بھتہ کے سلسلے میں کوئی قطعی فیصلہ کرے گی تو ریاستی حکومت بھی صورت حال کا جائزہ لے گی اور قطعی طور پر تنخواہ کے زمروں اور مہنگائی بھتہ کی شرحوں کا تعین کرے گی۔ مہنگائی بھتہ میں مزید اضافہ کے نتیجہ میں ریاستی حکومت کو مالیاتی سال رواں کے دوران ۷،۸۸ کروڑ روپیہ اور پورے سال میں ۱۴،۶ کروڑ روپیہ کے اخراجات برداشت کرنا ہوں گے۔

× × ×

اتر پردیش اسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن نے اپنے ملازمین اور ان کے خاندانوں کو ہر سال ایک مفت پاس اور دو رعایتی پاس حاصل کرنے کی سہولت فراہم کی ہے۔ رعایتی پاس ایک تہائی کرایہ کی ادائیگی پر دیے جائیں گے۔ یہ فیصلہ کارپوریشن بورڈ کے ایک حالیہ جلسے میں کیا گیا۔ اس سہولت کی فراہمی سے روڈویز ملازمین کا ایک دیرینہ مطالبہ پورا

ہو جائے گا۔

x x x

ریاستی حکومت نے کسی بھی سرکاری ملازم کو ۵۰ سال کی عمر کے بعد اس حقیقت سے قطع نظر کہ اس کی ملازمت کی مدت کتنی ہے بغیر کوئی وجہ بتائے ہوئے تین ماہ کے نوٹس یا اس کے عوض پوری یا جزوی تنخواہ دے کر جبری طور پر ریٹائر کرنے کا اختیار حاصل کر لیا ہے۔

بہرحال اس قسم کا فیصلہ حکومت کا محکمۂ نظم و نسق ایسی صورت میں کیا کرے گا جب یہ کارروائی مفاد عامہ میں ہوگی۔

اس وقت حکومت کو کسی بھی سرکاری ملازم کو جس نے اپنی ملازمت کے ۲۵ سال پورے کر لیے ہیں جبری طور پر ریٹائر کرنے کا محدود اختیار حاصل ہے۔ سرکاری ملازم کو ۲۵ سال کی ملازمت پوری کرنے کے بعد یا ۵۰ سال کی عمر پوری کرنے کے بعد رضاکارانہ طور پر ریٹائرمنٹ کا حق حاصل ہے۔ گورنر نے یہ فیصلہ اپنی مشاورتی کونسل کے ایک جلسہ میں جو سول سروس ضوابط کے آرٹکل ۴۶۵ اور ۴۶۵۔ اے میں ترمیم کر کے کیا ہے۔

x x x

حکومت اتر پردیش نے سرکاری ہائر سکنڈری اسکولوں میں اردو پڑھانے کے لیے سہ لسانی فارمولے کے تحت اسسٹنٹ ٹیچروں (اردو) کی ۱۸۰ نئی عارضی اسامیاں قائم کی ہیں۔ ان ٹیچروں کا تقرر ۲۵۰-۴۲۵ روپیہ کی شرح تنخواہ میں کیا جائے گا۔ اس اسکیم کے تحت جن اسکولوں میں اردو پڑھانے والے کم سے کم دس طالب علم ہوں گے وہاں ایک ٹیچر کی تقرری کی جائے گی۔

موجودہ تعلیمی سال کے دوران اردو پڑھنے کے لیے انٹرمیڈیٹ درجات کے لیے ۸۹ ٹیچروں (جن میں ۸ خواتین ٹیچر بھی شامل ہیں) اسنائی اسکول درجات کے لیے ۸۲ ٹیچروں (جن میں ۲۵ مرد ٹیچر بھی شامل ہیں) کا تقرر کیا جائے گا۔

پرائمری اسکولوں میں اردو پڑھانے کے لیے ۳۸۲۳ ٹیچروں کا تقرر پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ اردو پڑھانے کے لیے درجات کھولنے کے خواہش مند ڈگری کالجوں کو بھی موجودہ تعلیمی سال سے مالی مدد دی جائے گی۔

x x x

اتر پردیش کے ایسے ۲۲ شہروں میں جن کی آبادی ایک لاکھ یا اس سے زائد ہے گذشتہ ۲۰ اگست سے ملاوٹ کی روک تھام کے لیے ایک مہم شروع کی گئی ہے۔

ریاست کے صدر مقام پر موصولہ اطلاعات کے بموجب ۱۱ شہروں کی بڑی دوکانوں کارخانوں و تھوک بیوپاریوں کی دوکانوں پر پہلے ہی دن چھاپوں کے دوران غذائی اشیاء کے ۳۶۹ نمونے قبضہ میں لیے گئے جن میں ملاوٹ کا شبہ تھا۔ ان شہروں میں آگرہ (۱۳) علی گڑھ (۲۲) بریلی (۳۱) دہرہ دون (۶۵) فیض آباد (۲۹) گورکھپور (۲۷) جھانسی (۲۴) مظفر نگر (۱۷) متھرا (۶۲) رامپور (۴۶) اور لکھنؤ (۴۳) شامل ہیں۔

x x x

گورنر اتر پردیش شری اکبر علی خاں نے ریاستی یک جہتی کونسل کی مجلس عاملہ کے جلسے میں کہا کہ فرقہ وارانہ نوعیت کے واقعات کی روک تھام کے سلسلے میں مدد دینے کے واسطے اضلاع میں کمیٹیاں قائم کرنے کے لیے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ کمیٹیاں تمام فرقوں کے ممبران پر مشتمل ہوں گی اور ہریجنوں پر ہونے والے مظالم کے معاملات پر بھی غور کریں گی۔

گورنر نے کہا کہ یک جہتی کا مقصد صرف حکومت کی کوششوں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کام میں غیر سرکاری افراد کو بھی حصہ لینا چاہیے۔

انھوں نے کہا کہ عوام میں دلوں کا اتحاد اور باہمی محبت جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اور ریاستی حکومت کے جو افسران فرقہ وارانہ واقعات کی روک تھام کرنے کے لیے بروقت کارروائی کرتے ہیں۔ وہ خصوصی تعریف کے مستحق ہیں۔

x x x

ریاستی حکومت نے ریاستی یک جہتی کونسل کی ۲۰ رکنی مجلس

عاملہ کی تشکیل کی ہے تاکہ کونسل کے فیصلوں کو تیز رفتاری سے عملی جامہ پہنانے میں مدد مل سکے۔

یہ کمیٹی جس کے سربراہ گورنر شری اکبر علی خاں ہوں گے۔ ان ممبروں پر مشتمل ہوگی۔ سروشری کملا پتی ترپاٹھی۔ جے رام ورما گردھاری لال۔ مادھو پرشاد ترپاٹھی۔ اننت رام جیسوال۔ گووند سنگھ نیگی۔ ترلوکی سنگھ۔ شریمتی راجیندر کماری باجپئی۔ بیگم حامدہ حبیب اللہ۔ سروشری ماتا پرشاد۔ کنھیا لال بالمیکی۔ ایستھی گرائش۔ حبیب الرحمٰن نعمانی۔ (ڈاکٹر) رام چند شکلا۔ رجنی کانت ورما۔ (ڈاکٹر) اے۔ جے۔ فریدی۔ گورنر کے مشیر شری ستیش چندر حکومت اترپردیش کے چیف سکریٹری۔ حکومت اترپردیش کے داخلہ سکریٹری۔ محکمہ قومی یک جہتی کے کمشنر نیز سکریٹری اس کمیٹی کے ممبر۔ سکریٹری ہوں گے۔

× × ×

اترپردیش کی ستائیسویں قرعہ اندازی کے لیے ریاستی لاٹری ٹکٹ فروخت کرنے کے سلسلے میں ضلع شاہ جہاں پور دوسرے اضلاع پر سبقت لے گیا ہے۔ اس ضلع نے اپنے نشانہ کا ۱۰۶ فی صد پورا کرلیا ہے۔ اس سلسلے میں پرتاپ گڑھ۔ ہردوئی اور سہارن پور اضلاع نے بالترتیب دوسرا۔ تیسرا اور چوتھا مقام حاصل کیا ہے۔ لکھنو۔ نینی تال۔ بستی اور علی گڑھ اضلاع نے اپنے مقررہ نشانے سو فی صد پورے کر لیے ہیں۔

ریاستی حکومت نے ان اضلاع کے خزانہ افسروں کو خصوصی اعزازی رقمیں منظور کی ہیں جہاں مقررہ نشانے صد فی صد پورے کر لیے گئے ہیں۔

× × ×

ریاست کے اہم مرکزوں اور بڑے شہروں میں اسپتالوں کو چلانے کے لیے اترپردیش میں اسپتال کارپوریشن قائم کرنے کے لیے ایک اسکیم وضع کی گئی ہے۔ مذکورہ اسکیم کے بموجب ایسے لوگ کارپوریشن کے زیر انتظام اسپتال کی رکنیت حاصل کر سکتے ہیں جو رکنیت کی سالانہ فیس ادا کریں گے۔ کارپوریشن کے ممبروں کو تمام معاملات میں مفت طبی مشورہ حاصل کرنے کا حق حاصل ہوگا لیکن انھیں دوا تشخیص امراض کے سلسلہ میں ضروری جانچ نیز جنرل کارپوریشن اور اسپتال میں داخلہ سے متعلق اخراجات ادا کرنا ہوں گے۔ اس کے علاوہ اسپتالوں میں داخلے کے سلسلے میں ممبر مریضوں کو غیر ممبر مریضوں پر ترجیح دی جائے گی۔ اسپتال ممبران کے لیے ۴۰۰ سے ۵۰۰ تک بستروں کا بندوبست کرنے کے علاوہ ان کے لیے ہر قسم کی علاج کی سہولتیں مہیا کرے گا۔ امید کی جاتی ہے کہ ایسے اسپتالوں کی تعمیر اور ساز و سامان کی خریداری ادارہ جاتی سرمایہ سے کی جائے گی۔ ممبران کی رکنیت کی فیس اور اخراجات خدمت کی شکل میں جو آمدنی حاصل ہوگی وہ اسپتال کی ضروریات کی تکمیل کے علاوہ بنکوں اور دیگر اداروں کے قرضوں کی ادائیگی کے سلسلہ میں خرچ کی جائے گی۔

× × ×

★

"خدا کا ایک پرستار بھارت کی سرزمین پر آیا اور اپنی ریاضت سے اسے پاک و صاف کیا۔ نہ صرف سرزمین کو پاک و صاف بنایا بلکہ عوام کے قلوب اور اذہان میں تبدیلی پیدا کی۔"

—— پنڈت جواہر لال نہرو

گورنر اتر پردیش شری اکبر علی خاں ۲۸ اگست ۱۹۷۳ء کو ودھان بھون میں ریاستی قومی یک جہتی کونسل کے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے

شری کملاپتی ترپاٹھی، چیرمین پلاننگ کمیشن اتر پردیش، موہن لال گنج (لکھنؤ) میں مشترکہ زمرے کی پہلی فیکٹری "اتر پردیش ایس بیٹس لمیٹڈ" کا ۳۰ اگست ۷۳ء کو سنگ بنیاد رکھتے ہوئے

REGD. No. L.
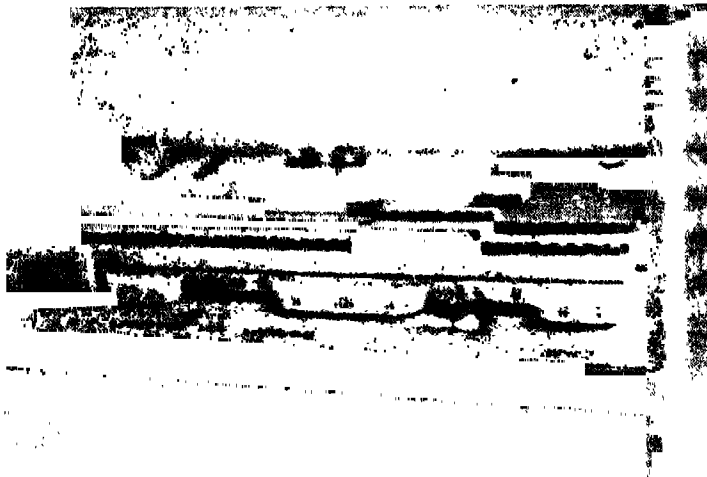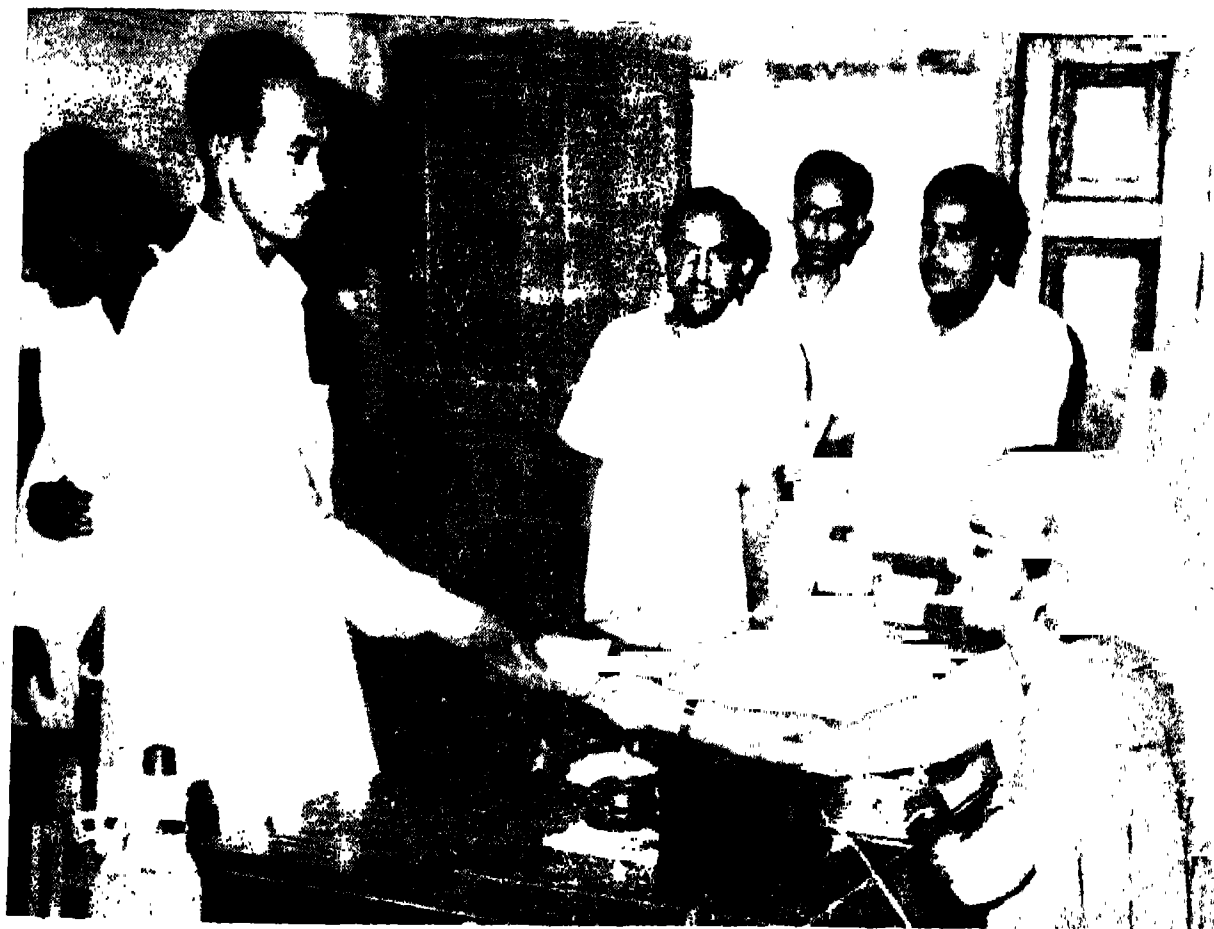
ڈائرکٹر لاٹری اتر پردیش، شریمتی روہنی نیر، ۲۰ ویں ڈرا میں اول انعام پانے والے شری کلوجت رنگھ کو ایک لاکھ روپیہ کا چیک دے رہی ہیں۔

29 (8)

نومبر ۱۹۷۳ء

گورنر اتر پردیش شری اکبر علی خاں بلرام پور اسپتال لکھنؤ میں ایک نئے وارڈ کا افتتاح کر رہے ہیں
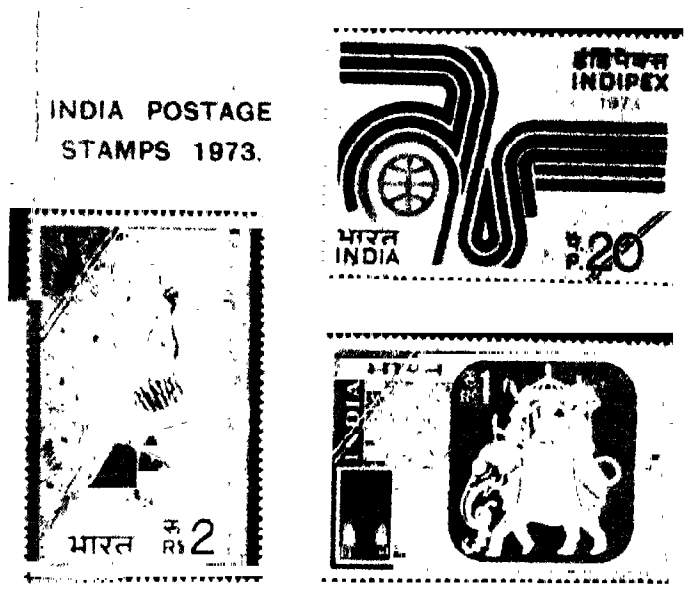
۱۴ نومبر ۱۹۷۳ء کو ڈاک ٹکٹ نمائش کے موقع پر جاری کیے جانے والے
تین یادگاری ٹکٹوں کی تصویر

گورنر اکبر علی خاں لکھنؤ میں پلاننگ اور ایڈمنسٹریشن سے متعلق ٹریننگ اور سیمینار کو خطاب کر رہے ہیں۔ اس پروگرام میں ڈائرکٹر اطلاعات یوپی
شری شرد متی شرما آئی اے ایس نے بھی حصہ لیا تھا

نیا دور

جلد ۲۹	شمارہ ۸	چندہ سالانہ پانچ روپے	فی پرچہ پچاس پیسے

کارتک ۱۸۹۵ شک

نومبر ۱۹۷۳ء

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں ظاہر کئے گئے خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ محکمہ اطلاعات [illegible]

پنڈت جواہر لال نہرو

۸۴ ویں سالگرہ یوم پیدائش ۱۴ نومبر کو

ایڈیٹر: نور شید احمد

پبلشر: [illegible] ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر: [illegible] سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو۔ پی

مطبوعہ: [illegible] پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ: محکمہ اطلاعات اتر پردیش

شریمتی اندرا گاندھی
۵۷ واں یوم پیدائش ۱۹ر نومبر کو

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

شریمتی اندرا گاندھی
۵۷ واں یوم پیدائش ۱۹ نومبر کو

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

شری ہیم وتی نندن بہوگنا

وزیراعلیٰ اترپردیش

قافلے والوں کے نام

نازش پرتاپ گڑھی

سنو! میں تم سے مخاطب ہوں میرے ہم وطنو! نظر بلند، جواں اپنا حوصلہ رکھو
ممات نہرو تو برحق مگر نہ یہ بھولو کہ موت آتی ہے اس کو جو محض انساں ہو
وہ اک یقیں تھا جو یوں نہیں گزر نہیں سکتا
وہ ایک عزم تھا اور عزم مر نہیں سکتا
وہ اک شعورِ مسلسل، جنونِ پیہم تھا وہ اک حرارتِ تر، ایک شعلۂ نم تھا
وہ جدّ و جہدِ مجسّم بنامِ آدم تھا وہ کوئی فرد نہ تھا، پورا ایک عالم تھا
نظر ڈرے تو ڈرے روشنی نہیں ڈرتی
بشر مرے تو مرے زندگی نہیں مرتی
وہ اک سلیقۂ ہستی، شعورِ اُلفت تھا وہ درسِ امن تھا، پیغامِ آدمیت تھا
ہماری "فکر و نظر" تھا، ہماری "عظمت" تھا وہ اک بشر تو نہیں تھا "وقارِ بھارت" تھا
ہر اک زمانے میں وہ انجمن سجائے گا
وہ مسکراتا رہا ہے، وہ مسکرائے گا
یہ کس کے جلووں سے ہر سمت جگمگاہٹ ہے یہ کس کے خونِ جگر سے یہاں سجاوٹ ہے
لبِ حیات پہ یہ کس کی مسکراہٹ ہے سنو، قریبِ رگِ جاں یہ کس کی آہٹ ہے
قدم قدم پہ یہ نہرو نہیں تو پھر کیا ہے
اُسی گلاب کی خوشبو نہیں تو پھر کیا ہے
یہ لہلہاتا چمن پیار کا، محبت کا یہ تحفہ قوم کو جمہوریت کی دولت کا
قیام ہند میں نا مذہبی حکومت کا یہ بزمِ دہر میں اپنا مقام عزت کا
یہ کچھ نہیں ہے اسی کے نفس کا جادو ہے
یہ ہم نہیں ہیں ثبوتِ حیاتِ نہرو ہے
مئے خلوص و محبت کا جام ہے نہرو بقائے امن و اماں کا پیام ہے نہرو
ہمارے عزم و عمل کا سلام ہے نہرو ہماری عظمتِ حاضر کا نام ہے نہرو
حیات زندہ ہے، حسنِ حیات زندہ ہے
جو ہم ہیں زندہ تو نہرو کی ذات زندہ ہے

پنڈت نہرو کی فکر کے چند پہلو

انیس نصرت

مفکر، سیاست داں، ہندستانی عوام اور خاص طور پر بچوں سے بے پناہ محبت کرنے والے، مصنف، مطالعہ کے رسیا، سنجیدہ، ہنسوڑ، دوستوں کے دوست، مخالفین کے بھی خواہ، وزیر اعظم اور ایک مخالف پارٹی کے لیڈر کے مطابق پارلیمنٹ میں حکمراں اور حزب مخالف دونوں کے لیڈر، یہ تھے پنڈت نہرو کی زندگی کے چند پہلو۔ ان میں سے کسی ایک چیز پر ضرورت سے زیادہ زور دیجیے تو شخصیت کا وہ مرقع بکھر جائے گا جس کا نام پنڈت جواہر لال نہرو تھا اور جسے سارا ہندستان پیار سے پنڈت نہرو کہتا تھا۔

پنڈت نہرو بیک وقت دو دنیاؤں کے انسان تھے۔ عملی اور تصوراتی۔ تخیل انسان کے عمل کی راہ متعین کرتا ہے اور عملی تصورات کی صداقت یا عدم صداقت کی کسوٹی۔ یہ عمل ہی ہے جس پر تخیل یا تصور کے کھوٹے کھرے ہونے کی پرکھ ممکن ہے تخیل کے بغیر عمل ممکن نہیں اور عمل سے گریز پا ہو کر تخیل محض خیالی دنیا کا ہیولا بن جاتی ہے۔ پنڈت نہرو کے ہاں ان دونوں کے درمیان ایسی حسن ترتیب اور مطابقت ملتی ہے کہ دونوں الگ الگ اجزا نہ رہ کر ایک بڑے کُل کا حصّہ بن جاتے ہیں۔

ایک قسم کا فلسفیانہ موڈ، فکری انداز اور یک گونہ بے تعلقی پنڈت نہرو کی شخصیت کا خاصّہ رہا۔ بچپن سے زندگی کے آخری لمحے تک۔ بچپن انھوں نے ساتھیوں کے بغیر گزارا، تعلیم گھر اور وطن سے دور غیر ممالک میں حاصل کی، جوانی کا زیادہ تر حصّہ ملک کے مختلف جیلوں میں گزارا اور پھر آزادی کے بعد ان کو ایک ایسا عہدہ ملا جس نے ان کو سب سے بلند و بالا قرار دیا۔ ان سارے حالات نے اس DETATCHMENT کے لیے مواقع بھی فراہم کیے اور انھیں ناگزیر بھی بنا دیا۔ وزیر اعظم، ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کا بے تاج کا بادشاہ، جدوجہد آزادی کے ایسے ہیرو کے لیے جو نعروں، جلسوں، جلوسوں، ہنگاموں سے دور نہیں بلکہ ان کے درمیان میں گھرا ہو، یہ رویہ اختیار کرنا ذرا مشکل بات تھی۔ تاہم اس میں ان کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ "تلاش ہند" میں لکھتے ہیں:

"جدوجہد اور سرگرمی کے دوران میں خود کو اس سے علاحدہ کر لیتا اور اس پر اس طرح غور کرتا جیسے وہ کوئی بالکل مختلف چیز ہو۔ کبھی کبھی میں اپنی معمول کی مصروفیات سے ایک دو گھنٹے چھین کر اور ان مصروفیات کو بالکل فراموش کر کے اپنے ذہن کے تنہا کمرہ میں لوٹ جاتا اور تھوڑی دیر کے لیے ایک بالکل دوسری زندگی گزارتا۔"

ہر شخص کا ایک فلسفۂ حیات ہوتا ہے۔ فلسفہ زیادہ دقیق لفظ محسوس ہو تو طرز حیات کہہ لیجیے۔ خواہشیں، محرومیاں، ہم جو ہونا چاہتے تھے، ہم دوسروں کا اپنی جانب اور دوسروں کی جانب جس قسم کا رویہ پسند کریں گے، ہماری نفرتیں، ہمارے تعصبات، ہمارے ردعمل، دوسروں کے ردعمل کی جانب ہمارا رویہ، یہ سب اسی طرز حیات کے مختلف مظاہرے ہوتے ہیں۔ آپ اس فلسفہ سے واقف ہوں

یا نا واقف۔ یہ فلسفہ اکتسابی ہو یا نسلی، آپ نے اسے سوچ سمجھ کے اختیار کیا ہو یا لاشعوری طور پر، بہر حال فلسفۂ حیات سے مفر ممکن نہیں۔ پنڈت نہرو بنیادی طور پر شاعرانہ مزاج رکھتے تھے۔ عملی سیاست بھی ان کے اس مزاج کو تبدیل نہ کر سکی۔ ان کی تحریروں، تقریروں، خطوط، انداز گفتگو سب کے پیچھے ایک شاعرانہ دل دھڑکتا ہوا ملتا ہے۔ سیاست اُن کا اوڑھنا بچھونا تھی لیکن اس کے باوجود ایک طرح کی شاعرانہ کیفیت ہمیشہ ان کے مزاج کا حصہ بنی رہی۔ اور سیاست کی مصروفیات بھی اسے ان سے نہ چھین سکی۔

پنڈت نہرو ایک پیچیدہ ذہن کے مالک تھے۔ جس میں بہت سے نظریات، تصورات، مسائل ایک دوسرے سے متصادم تھے ان سے وہ پریشان بھی ہوتے تھے۔ دنیا کے حالات، وہ عہد جس میں وہ زندگی گذار رہے تھے، اور وہ روحانی بحران جو پرانی قدروں کی شکست اور نئی قدروں کے تشکیل نہ پا سکنے سے پیدا شدہ صورت حال کی پیداوار تھا یہ سب انھیں بےچین رکھتے۔ فکر کے بادل ان کے ذہن پہ چھاتے، غائب ہو جاتے، پھر چھا جاتے اور فکر کی اس دھوپ چھاؤں میں ان کی زندگی کا بڑا، بلکہ بیشتر حصہ گذر گیا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میری اول CONFLICT ذہن کے اندر ہے جو تصورات کے تصادم، خواہشوں اور وفاداریوں، خارجی حالات سے برسرپیکار تحت الشعور کی گہرائیوں اور ایک کبھی نہ بجھنے والی اندرونی بھوک سے تشکیل پاتی ہے۔"

اس جد و جہد، اس تصادم، اس شکست و فتح کا میدان کارزار ذہنی ہے، اس سے مفر نہیں اور اگر مفر ممکن ہے تو بس عمل میں کیونکہ عمل — خارجی دنیا کا تصادم، اندر کی دنیا کے تصادم کو، تھوڑے ہی وقفہ کے لیے سہی، بہر حال دبا دیتا ہے۔ روح عصر کے مسائل بھی نہرو کو پریشان کرتے تھے۔ وقت جو ماضی کی قبر میں دفن ہے اب لوٹ کر نہ آئے گا، کتنا اچھا تھا وہ ماضی لیکن ماضی کبھی لوٹ کر آیا ہے! وہ اعتقادات، جو غیر مشروط تھے، لیکن اب ان کے دن گذر گئے۔ اب ایک طرح کی تشکیک کا دور ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے سے پردے ایک ایک کر کے اُٹھ رہے ہیں اور یہ شبہات، تشکیک اور پرانی اقدار کو قدم قدم پر پرکھنے اور ان پر سوالیہ نشان لگانے کے دن ہیں۔

"ہم اب پرانے اعتقادات اور رسم و رواج کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ ہمیں اب ان میں اعتماد نہیں رہ گیا ہے۔ ایشیا، افریقہ، امریکہ ساری دنیا میں یہی ہو رہا ہے۔ اس لیے اب ہم نئے راستوں کی تلاش میں ہیں۔ سچائی کے نئے پہلوؤں کی تلاش میں ہمارے نئے حالات اور ماحول سے زیادہ ہم آہنگ ہوں۔"

پنڈت نہرو کو یہ احساس ہے کہ وہ انسانیت کے ایک عظیم عہد میں جی رہے ہیں۔ وہ عہد جو نئی قدروں کی تشکیل کر رہا ہے لیکن ہمیں اس عہد میں رہنے کی قیمت بھی ادا کرنی ہے۔ عظیم عہد ہمیشہ تصادموں اور غیر یقینی حالات سے بھرے ہوتے ہیں۔ عالمی بساط سیاست کے مہروں میں کس سے امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں اور کس سے نہیں۔ ایک عہد ختم ہو گیا ہے، اقدار کا ایک نظام ٹوٹ گیا ہے۔ انسان نئی اقدار، نئی روحانیت، نئے حالات، نئے تصورات کو جنم دینے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی فکر میں ہے۔ اس میں کامیابی ممکن بھی ہے اور ناممکن بھی۔ کچھ لوگ جد و جہد کر کے اس سرے پر پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ کامیابی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ راستے میں ہی تھک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کچھ ایسے بزدل ہوتے ہیں کہ بپھری ہوئی موجوں کو دیکھ کر ان میں کود پڑنے کی ہمت ہی نہیں کر پاتے اور اپنے گوشۂ عافیت میں لوٹ جاتے ہیں یہ سوچ کر کہ "ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را"، لیکن اب یہ گوشۂ تنہائی ہے کہاں؟ گوشۂ عافیت اور گوشۂ تنہائی دونوں وقت کے سمندر میں جانے کب کے ڈوب گئے اور بزدلی گوشۂ عافیت کی جانب ہماری رہنمائی نہیں کرتی۔ لیکن گوشۂ عافیت کی تلاش جاری رہتی ہے اس کے لیے جد و جہد جاری رہتی ہے۔ ذاتی سطح پر بھی، قومی سطح پر بھی اور اس سے بڑی سطح پر بھی۔

شر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا مقابلہ کرنا اخلاقی

سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے کے مرادف ہے۔ اس سے جابر اور غاصب کی ہمت افزائی ہوتی ہے، اسے زیادہ ظلم کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ یہ انفرادی تصادم جب قومی سطح پر ظاہر ہوتا ہے تو جنگ و جدال کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اگرچہ اس میں نقصان انسان کا ہی ہوتا ہے لیکن برائی کی طاقتوں سے لڑنے کے لیے اگر جنگ و جدال کی صورت آجائے تو بہرحال اس سے گریز بھی نہیں کرنا چاہیے۔ تو کیا وقت کی یہ تبدیلی انسان اور دنیا کی بہتری کے لیے نہیں۔ کیا جو دن بیت گئے وہ آج سے اچھے تھے۔ اندھے وشواش کے دن۔ سوال نہ پوچھنے کے دن۔ جواب ڈھونڈھنے کے دن نہیں ایسا تو کبھی نہ تھا اور اگر تھا بھی تو ان کی بازیافت انسان کے قبضۂ اختیار سے باہر ہے۔

۱۹۴۰ کی انفرادی ستیہ گرہ کے دوران جب پنڈت نہرو کی گرفتاری تقریباً یقینی تھی، اور سب لوگ اسی سبب سے بہت ملول تھے، جیسے ہی انھوں نے با (کستوربا گاندھی) سے رخصت لی تو انھوں نے کہا۔ "خدا تمھاری حفاظت کرے گا۔" پنڈت نہرو نے فوراً ہی پلٹ کر پوچھا "با! خدا کہاں ہے؟ اگر وہ موجود ہے تو کافی گہری نیند لے رہا ہو گا۔" نہرو کے اس جواب پر گاندھی جی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ گاندھی جی پنڈت نہرو کے ذہنی تحفظات سے واقف تھے اور اکثر کہا کرتے تھے "اگرچہ نہرو ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ وہ خدا میں یقین نہیں رکھتے لیکن وہ بہت سے ایسے لوگوں کے مقابلہ میں خدا سے قریب تر ہیں جو خود کو خدا کا اطاعت گذار کہتے ہیں۔" گاندھی جی کے نزدیک نیکی اور سچائی پر عمل پیرا ہونا خدا کی پرستش کے ہم معنی تھا اور جب اول الذکر چیز انھیں پنڈت نہرو میں مل گئی تو پھر انھیں اس بات کی فکر نہ رہی کہ آخر الذکر چیز ان میں ہے کہ نہیں۔

پنڈت نہرو کو شاید والتیئر کے اس قول سے زیادہ اختلاف نہ رہا ہو کہ "اگر خدا موجود نہیں ہے، تو بھی اسے ایجاد کرنا ضروری ہے۔" لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کا یہ بھی خیال ہے "اگر خدا کا وجود ہے تو بھی بہتر یہی ہے کہ ہر مسئلہ میں نہ اس کی طرف دیکھا جائے اور نہ اس پر انحصار کیا جائے۔ مافوق الفطرت طاقتوں پر بہت زیادہ انحصار انسان کی خود اعتمادی ختم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تخلیقی صلاحیت کو بھی کند کر دیتی ہے۔" اصل میں پنڈت نہرو ان روحانی عناصر کے قائل ضرور ہیں جو طبعیاتی دنیا سے بلند اور ارفع ہوتے ہیں۔ روحانی اور اخلاقی اقدار بھی ان کے نزدیک لازمی ہیں کیونکہ ان کے بغیر زندگی میں کوئی مقصد نہ رہ جائے گا۔ "ہم خدا کو مانیں یا نہ مانیں لیکن ایک بلند اور برتر چیز کو تسلیم کرنے سے انکار ممکن نہیں چاہے ہم اسے زندگی بخش تخلیقی قوت کا نام دیں، یا وہ طاقت قرار دیں جو اسے متحرک، از خود نمو پانے اور خود کو تبدیل کرنے کی صلاحیت بخشتی ہے، یا کسی اور نام سے پکاریں۔" فلسفیانہ افکار، زندگی اور سماجی مسائل کی آمیزش سے ایک ایسے SYNTHESIS کی تشکیل جس میں فکر و عمل، روحانیت اور مادیت، خواب و حقیقت، ماضی، مستقبل اور حال برابر کے حصہ دار ہوں نہرو کے ذہن رسا کا ایک معمولی کارنامہ تھا۔

پنڈت نہرو کی فکر کی ایک اور بنیادی خصوصیت زندگی کے مسائل کی طرف ان کا سائنسی رویہ تھا۔ سائنس کی معذوریاں معلوم، تسلیم۔ یہ بھی تسلیم کہ مادی دنیا سے ماورا کے تجربات اس کے حیطۂ اختیار سے باہر ہیں۔ یہ بھی تسلیم کہ سائنس کے اصولوں کے بھی مستثنیات ہوتے ہیں لیکن توہمات، جذباتیت، غیر عقلیت کے پیش کردہ حلوں کے مقابلہ میں سائنسی طریقوں سے حاصل ہونے والے جوابات بہرحال زیادہ منطقی اور زیادہ قابل قبول ضرور ہوتے ہیں۔ وہ زندگی مظاہر کی دنیا (PHENOMENAL WORLD) پر عقل، علم اور تجربہ (سائنس) کی حکمرانی چاہتے تھے۔ سچائی اگر آخری اور کلی حقیقت ہے تو اسے دائمی تغیر اور تبدل سے بلند ہونا چاہیے لیکن ہمارا ذہن سچائی کو شاید اپنی مکمل ہمہ گیری میں گرفت میں نہ لے سکے اس لیے انسانی ذہن کو ہمیشہ سچائی کی تلاش، اسے نئے سرے سے پرکھنے اور جانچنے کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔ اگر سچائی کا کوئی پہلو ادعا (DOGMA) بن گیا ہے تو وہ نہ تو نئے حالات کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے اور نہ آج کے مستقبل کے سوالات کا جواب فراہم کر سکتا ہے۔ اس لیے سچائی کو متحرک ہونا چاہیے منجمد نہیں، سچائی ایک حیات بخش قوت ہے

(باقی صـ۵۲ پر)

عہدِ نہرو تھا اک پیامِ حیات

نشور واحدی

عہدِ نہرو تھا یا پیامِ حیات — اک ہوائے سُبک خرامِ حیات
فکرِ نہرو سے پا گیا ترتیب — تازہ تر ہند کا نظامِ حیات
رونما تھی ہوئی دھندلکے میں — وہ سنہری کرن بہ نامِ حیات
صدرِ ایوان صلح کوشی تھے — کس کو ملتا ہے یہ مقامِ حیات
فیضِ نہرو سے مے کشوں کو ملے — گاندھی جی بھر گئے تھے جامِ حیات
ان کی "سالم روی" سے جا پہنچی — بین الاقوامیت بہ بامِ حیات
ان کی جمہوریت نوازی سے — نکہت آگیں ہوا مشامِ حیات
کانٹوں پر پاؤں رکھ کے چلتا تھا — ملکے پھلکے اٹھائے گامِ حیات
دشمنوں پر تھا رعب چھایا ہوا — سادگی میں تھے احتشامِ حیات
ان کی ہستی تھی ابتدائے فروغ — اندرا جی اب ہیں اہتمامِ حیات

جو بھی محفل سے جام لے کے اٹھا
وہ جواہر کا نام لے کے اٹھا

ہند میں جانِ انقلاب تھے وہ — قوم میں روحِ اضطراب تھے وہ
نو بہاروں کا رنگ اڑ سا گیا — چمنِ ہند کے گلاب تھے وہ
دھوپ نکلی تو ان کی ذات تھی چھاؤں — رات پھیلی تو آفتاب تھے وہ
بین الاقوامیت کی آنکھوں میں — امنِ عالم کا ایک خواب تھے وہ
اسلحہ ساز قوتوں کے لیے — ایک انداز احتساب تھے وہ
دل نوازی ہو یا جہاں داری — محسن کوئی ہو انتخاب تھے وہ
وید سے تا مہاتما گاندھی — ہر ریاست میں باریاب تھے وہ
جو سوالات آج پیدا ہیں — سب کا اک مختصر جواب تھے وہ
صفحۂ فکر زندگانی پر — آخری درسِ انقلاب تھے وہ
چھپ گئے تھے وہ اپنی عظمت میں — جیسے اپنے لیے حجاب تھے وہ

صبحِ تاریخ تازہ تھے نہرو
روئے عالم پہ غازہ تھے نہرو

میر اکبر علی خاں

حسن الدین احمد

بیرسٹر میر اکبر علی خاں صاحب کا تعلق حیدرآباد کے سربرآوردہ اور قدیم جاگیردار گھرانے سے ہے۔ آپ کے والد ماجد میر محبوب علی خاں صاحب حیدرآباد کے ایک وضعدار جاگیردار تھے۔

آپ ۱۷ نومبر ۱۸۹۹ء کو شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مفید الانام ہائی اسکول میں حاصل کی جس کے قیام میں راجہ منسی لال اور خود آپ کے اہل خاندان نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ آپ سٹی ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے علی گڑھ یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ سنہ ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی اور علی برادران کے مشورے پر تعلیم ترک کر دی۔ اس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین قوم پرست طالب علموں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ حیدرآباد کا ایک وفد سر اکبر حیدری کی قیادت میں علی گڑھ گیا جس میں نواب راس مسعود، لطیف یار جنگ، مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی بھی تھے۔ اس وفد کا مقصد یہ تھا کہ علی گڑھ میں تعلیم پانے والے حیدرآبادی طلبہ کو ترک موالات کی تحریک میں شرکت سے باز رکھا جائے لیکن حیدرآباد کے آٹھ دس طالب علموں نے اپنے فیصلے کو بدلنے سے انکار کیا۔ ان میں میر اکبر علی خاں بھی تھے۔ اس طرح یہ وفد ناکام رہا۔

علی گڑھ سے واپس آ کر آپ نے سنہ ۱۹۲۳ء میں جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کی تکمیل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان روانہ ہوئے۔ انگلستان میں لندن یونی ورسٹی سے ایل۔ ایل۔ بی (آنرز) اور مڈل ٹمپل سے بار ایٹ لا کی تکمیل کی اور سنہ ۱۹۲۷ء میں واپس آ کر بہ حیثیت ایڈوکیٹ پیشہ وکالت سے منسلک ہوئے۔ مولوی احمد شریف، راجہ شیشور ناتھ، سر تیج بہادر سپرو اور سری نواس آئنگار کے جونیر کی حیثیت سے کام کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔

اس وقت حیدرآباد میں قوم پرست نوجوانوں نے ایک ترقی پسند گروپ قائم کیا تھا جس میں ایم نرسنگ راؤ، بی رام کشن راؤ، علی یاور جنگ، بیرسٹر سری کشن، محمد فضل الرحمٰن، راماچاری اور کاشی ناتھ راؤ ویدیہ، وغیرہ شریک تھے۔

حیدرآباد میں دستوری اصلاحات کا کمیشن قائم ہوا تو غیر سرکاری اراکین کی کمیٹی تشکیل پائی جس میں کاشی ناتھ راؤ ویدیہ، ہنمنت راؤ اور نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ آپ کو بھی شریک کیا گیا۔ باوجود باہمی اختلاف رائے کے نواب بہادر یار جنگ آپ سے بڑا خلوص رکھتے تھے اور دونوں کے باہمی تعلقات ہمیشہ بہت قریبی اور دوستانہ رہے۔

بیرسٹر سری کشن نے جب ملکی تحریک شروع کی تو آپ اس کے روح رواں بن گئے۔ اس تحریک کو نواب سر نظامت جنگ کی تائید حاصل رہی۔ ان ہی کی کوششوں کے نتیجے کے طور پر ملکی رولز نافذ ہوئے۔

آپ کو امور بلدیہ سے بھی گہری دلچسپی رہی اور جس وقت نواب مہدی یار جنگ مجلس بلدیہ حیدرآباد کے صدر تھے آپ اس کے نائب صدر تھے۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں عثمانیہ گریجوئیٹس اسوسی ایشن کا قیام عمل میں
آیا تو ابتدا ہی سے آپ اس سے وابستہ اور اس کے روح رواں

۱۰ نومبر ۱۹۷۲ء کو غالب کلب حیدرآباد میں میر اکبر علی خاں صاحب انسٹی ٹیوٹ "آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز" کی جانب سے شائع شدہ کتاب "نیشنل انٹگریشن" کی رسم اجرا انجام دے رہے ہیں۔ صدر انسٹی ٹیوٹ حسن الدین احمد کتاب حاصل کر رہے ہیں۔

رہے اور اس کی معاشی کمیٹی اور نمائش کمیٹی کے رکن اور صدر
کی حیثیت سے آپ نے نمایاں خدمات انجام دیں۔

آپ ۱۱ سال تک مجلس اتحاد و ترقی کے صدر رہے۔ یہ ایک
غیر فرقہ وارانہ ادارہ تھا جس میں قوم پرست نوجوان شریک تھے۔
جب مجلس اتحاد المسلمین نے اقتدار حاصل کیا تو اس ادارے کو
طرح طرح کی دشواریاں پیش آئیں۔

حیدرآباد کا مالی سال سنہ فصلی کی پہلی آذر کو شروع ہوتا تھا
اور اب سے کوئی ۳۵ برس پہلے مختلف فرقوں کے آپس کے اتحاد
کو بنائے رکھنے کے لیے اس دن سال نو منانے کا انتظام کیا
گیا تھا۔ حضور نظام نے اس تحریک کی ستائش کرتے ہوئے اپنے
ایک فرمان میں اس یقین کا اظہار فرمایا تھا کہ ایسے تقاریب اور
آپس کے میل جول سے "حیدرآبادیت" اور "حیدرآبادی تمدن"
کی بنیادیں مستحکم ہوں گی۔ کئی سال تک یہ جشن منایا جاتا رہا۔ اس
جشن کی کامیابی میں بھی بیرسٹر میر اکبر علی خاں صاحب کی کوششوں کا بڑا دخل رہا۔

سنہ ۱۹۳۹ء میں سری نواس آئنگار کے مشورے سے آپ نے
ہندو مسلم اختلافات کو ختم کرنے کے لیے ایک اسکیم مرتب فرمائی۔ اس
کو ایک جانب مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد
کے سامنے اور دوسری جانب نواب بہادر یار جنگ کے توسط سے
محمد علی جناح کے سامنے پیش کیا لیکن دوسری جنگ عظیم کے آغاز کی
وجہ سے اس پر تفصیلی غور نہ ہو سکا۔

بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ سنہ ۱۹۴۰ء میں
محمد علی جناح نے آپ کو سابق ریاست حیدرآباد کی ایک فرقہ وارانہ
تنظیم مجلس اتحاد المسلمین میں شرکت کا پرزور مشورہ دیا تھا لیکن یہ آپ
کے سیاسی مسلک کے خلاف تھا اس لیے آپ نے اسے قبول نہیں
کیا۔ پھر سنہ ۱۹۴۷ء میں آپ کو وزارت عظمیٰ کا عہدہ پیش کیا گیا تھا
اور شرط یہ رکھی گئی تھی کہ آپ مجلس میں شرکت کریں۔ چونکہ آپ
اصولی طور پر مجلس کے طریقہ عمل سے بنیادی اختلافات رکھتے تھے
اس لیے آپ نے اس کو قبول نہیں کیا۔ اصولوں کی خاطر
ایثار کی اس سے بہتر اور کیا مثال ہو گی۔

حیدرآباد کی سیاست میں سخت مشکلات اور شدید اختلافات
کے باوجود آپ نے ہمیشہ اعتدال پسندی اور غیر فرقہ وارانہ طریقہ کار
کا پرچار کیا اور یہ آپ کی انتہائی اصول پرستی کا اثر تھا کہ مخالفین
نے بھی ہمیشہ آپ کے نقطہ نظر کا احترام کیا لیکن جب سیاست میں
جذبات کا دخل ہو گیا اور فرقہ واریت حکومت کی سطح تک آ گئی
تو آپ کو غیر معمولی اور نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا لیکن آپ نے
نہ صرف اس کو کامل اعتماد اور خندہ پیشانی سے برداشت کیا بلکہ
ایسے اعلیٰ کردار کا ثبوت دیا جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

اس کے بعد حیدرآباد میں سیاسی انقلاب آیا اور ان اقدار
اور اصولوں کو کامیابی حاصل ہوئی جن کے آپ ہمیشہ سے حامی تھے۔
یہ ایسا وقت تھا جب کہ اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں آپ نے
اس موقع پر بھی انتہائی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا۔ نہ تو اقتدار حاصل
کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی شخصی مخالفت کرنے والوں سے
بدلہ چکانے کا خیال کیا بلکہ خاموشی اور انہماک سے اپنے کام کو جاری
رکھا۔

جب حیدرآباد میں انڈین نیشنل کانگرس کا پہلا اجلاس
سنہ ۱۹۲۶ء میں منعقد ہوا تو آپ کو مجلس استقبالیہ کا نائب صدر مقرر

کیا گیا۔ سوامی رامانند تیرتھ اس کے صدر تھے۔ ۱۹۵۲ء میں آپ کو جامعہ عثمانیہ کی سینٹ کا رکن مقرر کیا گیا۔ اس وقت آپ علی گڑھ یونی ورسٹی، جواہر لال یونی ورسٹی اور جامعہ کے رکن ہیں۔

۱۹۵۷ء میں آپ نے حیدرآباد پالی ٹکنیک کالج کی بنیاد رکھی۔ گزشتہ ۱۶ سال سے یہ ادارہ کامیابی سے چل رہا ہے۔

ریاستوں کی تنظیم جدید کے کمیشن نے یہ مشورہ دیا تھا کہ ابتدائی پانچ سال تک تلنگانہ کی ایک علاحدہ ریاست قائم کی جائے۔ چنانچہ وینکٹ رنگا ریڈی صاحب نے علاحدہ ریاست کا مطالبہ کیا اور ایک تحریک چلائی۔ آپ اس تحریک سے وابستہ رہے۔ اس سلسلے میں پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور گووند بلبھ پنت سے تلنگانہ کے قائدین، رنگا ریڈی، جے وی نرسنگ راؤ اور ڈاکٹر چنا ریڈی سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں تلنگانہ کے مطالبات کی ترجمانی کے فرائض آپ ہی نے انجام دیے۔ لیکن جب ۱۹۶۹ء میں علاحدہ تلنگانہ کی تحریک چلائی گئی تو آپ نے اس سے اصولی اختلاف کیا۔ آپ نے یہ محسوس کیا کہ تلنگانہ کے عوام کے ساتھ اگرچہ کافی ناانصافیاں ہوئی ہیں لیکن اس موقعے پر آپ نے علاحدہ ریاست کے قیام کو تلنگانہ کے لیے مضر قرار دیا اور اپنے نقطۂ نظر کو نہایت بے باکی کے ساتھ پیش کیا۔

آپ نے اقوام متحدہ میں کرشنا مینن کی رہنمائی میں ہندستان کی نمائندگی کی اور چین کو جو خیر سگالی مشن آنجہانی سائنم آئنگار کی سرکردگی میں گیا تھا اس میں شریک رہے۔ ماسکو، فن لینڈ، ایشیا، افریقہ اور یورپ کے دیگر ممالک کو جو وفد بھیجے گئے ان میں آپ شریک رہے۔

آپ ۱۸ سال تک راجیہ سبھا کے رکن رہے جس کے منجملہ ۱۲ سال تک نائب صدر رہے۔ کانگرس پارلی مانی بورڈ کے ڈپٹی لیڈر بھی رہے جب کہ مسز اندرا گاندھی اس کی لیڈر تھیں۔

سال گزشتہ ۱۱ر فروری کو جبکہ آپ حیدرآباد کی ایک ادبی تنظیم ولا اکیڈمی کی مطبوعات کی رسم اجرا کے جلسے کی صدارت فرما رہے تھے تو میں نے آپ کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا تھا: "زندگی کی اعلیٰ قدروں سے لگاؤ اور اصول پرستی کے جذبے نے میر اکبر علی خاں کو سیاست کے میدان میں لا کھڑا کیا۔ وہ حیدرآباد کی اس تہذیب کے علمبردار ہیں جو ہم کو برصغیر میں ایک ممتاز درجے سے نوازتی ہے۔"

واقعہ تو یہ ہے کہ میر اکبر علی خاں کا شمار ان مشاہیر میں کیا جا سکتا ہے جن پر ہندستانی تمدّن کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔

حکومت ہند، گورنری کے جلیل القدر عہدے کے انتخاب کے وقت خاص اوصاف عوامی خدمات اور اعلیٰ صلاحیتوں کو پیش نظر رکھتی ہے۔ اس عہدے تک پہنچنے کے لیے میر اکبر علی خاں کو خدمت و خلوص کا مجسمہ بننا پڑا جو ان کی طبیعت ثانی رہی ہے، اصولوں اور اقدار کی پابندی کرنی پڑی جو ہمیشہ ان کا شعار رہا۔ وضع داری اختیار کرنی پڑی جو ان کی فطرت رہی اور صلح کل پالیسی پر عمل پیرا ہونا پڑا جو ان کا ہمیشہ طریقہ کار رہا۔ عوامی اداروں کے چلانے میں ایسے اعلیٰ کردار کا ثبوت دینا پڑا جو ساتھ کام کرنے والوں کے لیے نمونہ رہا۔

۱۱ر فروری ۱۹۷۲ء کو
عزیز باغ حیدرآباد میں ولا اکیڈمی کی
مطبوعات کی رسم اجرائی شری گوپال ریڈی
انجام دے رہے ہیں
جلسہ کی صدارت
میر اکبر علی خاں صاحب فرما رہے ہیں

غزل

ساغر نظامی

بُت مرا آج تلک خام نہیں ہے تو ہے کیا؟ / خود یہ صناع یہ الزام نہیں ہے تو ہے کیا؟

میں نے کب آرزو کی تھی کہ ملے مجھ کو حیات / زیست اک مفت کا الزام نہیں ہے تو ہے کیا؟

کہیں زنجیر، کہیں طوق، کہیں دار و رسن / زندگی آہنی اک دام نہیں ہے تو ہے کیا؟

ایک زنجیر ہے گہوارے سے تا حدِ لحد / زندگی سلسلۂ دام نہیں ہے تو ہے کیا؟

خانہ ویرانی میں یہ حسرتِ تعمیر چہ خوب / ریت میں خوابِ در و بام نہیں ہے تو ہے کیا؟

ہم ہی شعلوں میں جلیں ہم ہی وفادار نہیں / ہم پہ یہ ظلم کا الزام نہیں ہے تو ہے کیا؟

بیٹھ جاتا ہوں جہاں آبلے دیتے ہیں لہو / یہ ہر اک گام پہ آرام نہیں ہے تو ہے کیا؟

کچھ مرے ہم سفروں کو تو ہے فرصت حاصل / راہ میں اک مجھے آرام نہیں ہے تو ہے کیا؟

کبھی سقراط کے ہونٹوں نے جسے چوما تھا / میرے ہونٹوں پہ وہی جام نہیں ہے تو ہے کیا؟

ہر "درندے" کو مۓ عشق ملے تب جانیں / بادۂ عشق ابھی عام نہیں ہے تو ہے کیا؟

نیزہ بردار اندھیروں کی ہے ہر شوخ کرن / صبح، شب خون کی اک شام نہیں ہے تو ہے کیا؟

بتِ ظاہر کا پجاری کوئی ذہنی بت کا / آدمی بندۂ اصنام نہیں ہے تو ہے کیا؟

نور تو سیکڑوں سیاروں کا افسردہ ہے / کفر بھی مشرقِ اسلام نہیں ہے تو ہے کیا؟

یہ جو سیاروں کی جانب میں اڑا جاتا ہوں / یہ نیا نالہ و پیغام نہیں ہے تو ہے کیا؟

سینۂ تاک میں خود تو نے لنڈھا دی مۓ ناب / ہم بلا نوش! یہ الزام نہیں ہے تو ہے کیا؟

"محشرِ شیشہ گراں" رمز تہی دست سمجھ / میرے ہاتھوں میں اگر جام نہیں ہے تو ہے کیا؟

پھول مرجھایا تو اک دوسرا مسکانے لگا / زندگی، موت کا انجام نہیں ہے تو ہے کیا؟

روک لیتے ہیں انھیں راہ میں آتے جاتے / قبضے میں گردشِ ایام نہیں ہے تو ہے کیا؟

عشق تو نام ہی رسوائی کا ہے میرے ندیم! / عشق میں گر کوئی بدنام نہیں ہے تو ہے کیا؟

کس کو چپ رہ کے وہ ہر سانس میں دیتے ہیں صدا / ان کے ہونٹوں پہ مرا نام نہیں ہے تو ہے کیا؟

نالۂ نیم شبی، نغمۂ آہ سحری / یہ شبِ ہجر کا الہام نہیں ہے تو ہے کیا؟

یہ مری گرسنگی، ہائے مری تشنہ لبی!! / یہ مرے فن ہی کا انعام نہیں ہے تو ہے کیا؟

نہیں ساغر کسی سلجوقی و طوسی کا غلام
عصرِ حاضر کا یہ خیام نہیں ہے تو ہے کیا؟

اردو صحافت کا پچھلا دور

محمد ازہر شاہ قیصر

اردو صحافت نے اپنی کم عمری کے باوجود اس ملک کی نمایاں خدمات انجام دی ہے اور اس کے ذریعہ دین و مذہب، ادب و سیاست، صنعت و تجارت، سائنس، برقیات، اور زندگی کے دوسرے شعبوں کو نمایاں ترقی حاصل ہوئی ہے۔ اردو صحافت کا ہر قدم ترقی کی طرف رہا ہے۔ اس نے کتابت و طباعت، کی بہتری کے ساتھ جدید و قدیم مسائل پر معیاری بحث کی ہے۔ ہماری تحریک آزادی میں بھی اردو اخبارات نے بڑا کردار ادا کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اردو کا سب سے پہلا اخبار مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر صاحب نے، دہلی سے جاری کیا تھا۔ مولوی محمد باقر صاحب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شریک تھے اور ان کو اس ہنگامے میں انگریزوں نے موت کی سزا دی تھی۔ لاہور سے مولوی محبوب عالم صاحب کا "پیسہ" اخبار، کلکتہ سے مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" اور البلاغ" مولانا ظفر علی خاں صاحب کا "زمیندار" رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کا "ہمدرد"، مولانا شوکت علی کا اخبار "خلافت"۔ بجنور کا اخبار "مدینہ"، مولانا مظہر الدین کے اخبارات "الامان" "دعوت۔ آثار" میر تقی احمد خاں میکش کے اخبارات "انصاف" "احسان" "شہباز" مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی کا "ہند جدید" مولانا محمد عثمان فارقلیط کا "زمزم" مولانا شائق احمد عثمانی کا کلکتہ سے "عصر جدید" مولانا عبدالباقی صاحب مرحوم کا لاہور سے "روزنامہ آزاد" "الجمعیۃ" "ملاپ" "پرتاپ" "تیج" نیشنل کانگریس۔ لالہ کرم چند کا اخبار "پارس" سردار دیوان سنگھ مفتوں کا شاندار اخبار "ریاست" مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر کا اخبار "انقلاب" خواجہ حسن نظامی مرحوم کے اخبارات "منادی" "نظام گزٹ" "نظام المشائخ" سیماب اکبرآبادی کا اخبار "تاج" مولانا عبدالوحید صدیقی کا اخبار "نئی دنیا" مولانا عثمان آزاد کا روزنامہ "انجام" حسن ریاض ایم۔اے کا اخبار "منشور" مفتی شوکت علی فہمی کا دہلی سے "سہ روزہ عادل" مولانا حبیب الرحمن صاحب بجنوری مرحوم کا اخبار "نجات"، مولوی خلیل الرحمن صاحب بجنوری کا "مشہور زمانہ" اخبار الخلیل" یہ اردو کے نمایاں اور کامیاب اخبار ہے ہیں۔ دیوبند کے دو اخباروں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ایک اخبار "مہاجر" کا جو ۱۹۴۶ء سے نکلا تھا۔ یہ مشہور قومی رہنما مولانا حفظ الرحمن سیوہاری، مولوی سعید احمد صاحب اکبرآبادی، مولوی عبدالوحید صدیقی۔ مولانا عبدالباقی خاں مرحوم اور مولانا حامد الانصاری غازی کی ابتدائی صحیفہ نگاری کا آئینہ دار تھا۔ دوسرا اخبار "استقلال" جس کے ادارہ تحریر میں انور صابری اور راقم الحروف "سید محمد ازہر شاہ قیصر" شامل تھے۔ استقلال اپنے وقت کا کامیاب اخبار تھا۔ تقسیم سے پہلے لکھنؤ سے دو اخبار نکلتے تھے۔ ایک چودھری خلیق الزماں کا روزنامہ "تنویر" اور دوسرا قومی آواز قومی آواز کے اڈیٹر حیات اللہ انصاری تھے جو ابھی پچھلے دنوں اخبار کی اڈیٹری سے سبکدوش ہوئے ہیں۔ "تنویر" اخبار بند ہو چکا ہے "قومی آواز" جاری ہے۔ قومی آواز ایک اچھے معیار کا اخبار ہے۔

رسالوں میں ایک زمانے میں دہلی سے مولوی نذیر احمد دہلوی کے پوتے شاہد احمد بی۔اے کا "ساقی"۔ سید وصی اشرف کا "شاہجہاں" لاہور سے کلیم یوسف حسن کا "نیرنگ خیال" حافظ محمد عالم کا "عالمگیر" محمد احمد خاں درانی کا "جہانگیر" اختر شیرانی کا "رومان" "مولانا تاجور

نجیب آبادی کے" ادبی دنیا"۔ اور" شاہکار"، مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کا رسالہ" عبرت" اظہر امرتسری مرحوم کا راولپنڈی سے" سالک"، محمد فضل صاحب کا امرتسر سے" چمنستان"۔ مولانا راشد الخیری کے رسالے" عصمت" جوہر نسواں" " نبات"۔ عزیز حسن بقائی کا" پیشوا" مولوی عبدالحمید کا" مولوی" سیماب اکبر آبادی کا" شاعر"، جگر مراد آبادی اور مسعود اختر جمال کا" اضطراب" نیاز فتحپوری کا" نگار"۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا" معارف"، ندوۃ المصنفین دہلی کا رسالہ" برہان"۔ دارالعلوم دیوبند کا رسالہ" دارالعلوم" مولانا منظور نعمانی کا" الفرقان"۔ غلام احمد پرویز کا" طلوع اسلام" مولانا محمد عثمان فارقلیط کا" فاران"۔ چودھری برکت علی کا لاہور سے" ادب لطیف"۔ جس کے اڈیٹر مرزا ادیب۔ گوپال متل۔ احمد ندیم قاسمی وغیرہ رہ چکے ہیں۔ دہلی کے سرکاری رسالہ" آج کل" کا ذکر رہ جاتا ہے۔ جو تقسیم سے پہلے سے جاری ہے۔ یہ ایک معیاری ادبی رسالہ ہے۔ کسی وقت آغا محمد یعقوب دادرشی۔ اس کے اڈیٹر تھے۔ پھر فضل حق قریشی، جوش ملیح آبادی اور عرش ملسیانی وغیرہ اس کے اڈیٹر رہے۔ اتر پردیش سرکار کے محکمۂ اطلاعات کی جانب سے بھی ایک ماہنامہ نیا دور شائع ہوتا ہے۔ جس نے ادبی اور صحافتی دنیا میں اپنا ایک مقام بنا لیا ہے لیکن یہ آزادی کے بعد سے شائع ہونا شروع ہوا اس لیے تفصیل سے اس کا ذکر ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

دہلی سے حافظ محمد یوسف کا فلمی رسالہ شمع بھی کثیر الاشاعت رسالہ ہے جس نے اردو کو آگے بڑھانے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ کلیم محمد تقی دہلوی کا رسالہ" شعور" بھی اچھا ادبی رسالہ تھا۔

یہ سب رسالے اپنے اپنے وقت میں علم و ادب کی گرانقدر خدمت انجام دے چکے ہیں۔ ان میں سے بہت سے اخبارات اور رسائل اور ان کے مدیر و اڈیٹر ختم ہو چکے ہیں۔ اردو صحافت میں ان کی زندگی ایک قصۂ پارینہ بن چکی ہے۔ کئی اخبارات و رسائل اب تک جاری ہیں اور ان کا وجود ان کی شاندار زندگی کی ایک علامت ہے۔ لاہور کے اخبار" زمیندار" اور بجنور کا" مدینہ" یہ دو اخبار اپنے وقت کے مقبول اور نما اخبارات رہے ہیں۔" مدینہ" کا اجراء کا سن ۱۹۲۰ء ہے۔ اور اپنی خوش قسمتی سے یہ اخبار اب تک جاری ہے۔ مولانا ظفر علی کا اخبار" زمیندار" بند ہو چکا ہے۔ دونوں اخبار کم و بیش پچاس سال تک عرصۂ صحافت پر چھائے رہے۔ دونوں نے ملکی اور ملی تحریکات کی اولوالعزمانہ رہنمائی کی۔ دونوں کے اڈیٹروں کو قید و بند کا سامنا اور ضمانتوں اور قرقیوں کی سزا بھگتنی پڑی۔ مولانا ظفر علی خاں کے اخبار" زمیندار" نے تو تقریباً تین لاکھ روپیہ ضمانتوں اور جرمانوں کی شکل میں حکومت کے خزانہ میں داخل کیا۔ مولانا ظفر علی خاں اپنے وقت کے بے مثال ادیب شاعر آتش افشاں صحافی اور شعلہ بار مقرر تھے۔ ان کا اخبار جرنلزم کا ایک مستقل اسکول تھا۔ اردو کے سیکڑوں ادیب، صحافی ان کے اخبار کی ٹکسال میں ڈھل کر سکۂ رائج الوقت بنے۔ مولانا انگریزی اردو عربی فارسی کے متبحر عالم و ادیب تھے۔ یہ اگرچہ پنجابی تھے۔ مگر اردو کے محاورات اور زبان کے مختلف گوشوں پر ان کی واقفیت اتنی بے پناہ تھی، کہ دہلی اور لکھنؤ کے ادیب و شعرا ان سے لوہا لیتے ہوئے گھبراتے تھے۔ مولانا کی صحبت و رفاقت ادب و انشا سے دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں کے لیے ایک نعمت عظمیٰ تھی۔ سیکڑوں صحافی ان کے یہاں سے پل کر اور ڈھل کر نکلے۔ اسی طرح مالک اخبار" مدینہ" مولوی مجید حسن صاحب مرحوم کے حسن انتخاب اور دیدہ وری سے ان کے" اخبار مدینہ" کے حلقہ ادارت میں بھی ہمیشہ وقت کے اعلیٰ درجہ کے صحافی شامل رہے۔ مدینہ کا ہر اڈیٹر اپنے وقت میں ایک کامیاب لیڈر ہوتا تھا۔ جس کی رائے سے سارے سیاسی حلقے اثر لیتے تھے مدینہ کی سنجیدہ اور طویل بحثیں مختلف موضوعات پر ان کے عالمانہ مضامین، اس کا معتدل طریقہ تحریر ہمیشہ ملک و قوم میں پسندیدہ رہے۔ شام کے وقت دن بھر کی مصروفیات سے فارغ ہو کر پڑھے لکھے لوگ اپنی اپنی بیٹھکوں میں جمع ہوتے۔ ان میں سے کوئی ایک" زمیندار" سے مولانا ظفر علی خاں کی ہنگامہ خیز نصیحتیں اور بھاری بھرکم مضامین اور مدینہ سے اس کے شاندار اداریے سناتا اور سارا مجمع داد و تحسین کے ڈونگرے برسایا کرتا۔ اس زمانے میں گھر گھر مدینہ زمیندار، الہلال اور ہمدرد کا چرچا تھا۔ ذیل میں اپنی یادداشت سے" زمیندار" اور" مدینہ" کے اڈیٹروں کے نام لکھتا ہوں۔ ان سب حضرات کے مضامین ان اخبارات میں مجھے پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس فہرست سے اندازہ ہو گا کہ دونوں اخبار کتنے

خوش قسمت تھے۔ اس زمانہ کے کہنہ مشق صحافی اور ملک و ملت کی خدمات کا والہانہ جذبہ رکھنے والے حضرات کے بعد دیگرے ان اخبارات کی کرسیِ ادارت پر متمکن رہے۔ اخبار زمیندار کے ادارہ تحریر کے افراد میں:

(۱) مولانا ظفر علی خاں (۲) مولانا غلام رسول مہر (۳) مولانا عبداللہ عجازی (۴) مولانا عبدالمجید سالک (۵) مولانا نیاز فتح پوری (۶) آغا میر تقی احمد خاں میکش (۷) چراغ حسن حسرت (۸) مولانا عبدالباقی خاں ایم۔اے (۹) سید ابن الحسن فکر ایم۔اے (۱۰) سید اسماعیل وحشی آروی (۱۱) مولانا صدیق طبیب بہاری (۱۲) قاضی احسن اللہ شوستری (۱۳) مولانا اظہر امرتسری (۱۴) سید دلیر حسن مسعود بی۔اے (۱۵) مولانا اظہر حسن زاہدی بی۔اے (۱۶) غلام احمد مضطر ہاشمی (۱۷) میم حسن لطیفی (۱۸) مولانا غلام حسن ربانی لودھی (۱۹) چودھری غلام حیدر خاں (۲۰) مولانا اختر علی خاں (۲۱) غلام حسین میر کاشمیری (۲۲) ممتاز ملک ایم اے (۲۳) مولانا عبدالوحید صدیقی (۲۴) مشہور شاعر حفیظ جالندھری (۲۵) خلیل۔ بی۔ اے (۲۶) سید ظہور احمد وحشی (۲۷) ابوالعلاء وحشی (۲۸) حاجی لق لق (۲۹) منشی وجاہت حسین جھنجھانوی (۳۰) مشہور ادیب مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی۔

اخبار مدینہ بجنور کے حلقہ ادارت میں یہ حضرات شریک رہے:۔

(۱) حافظ نورالحسن ذہین (۲) مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی (۳) مولانا مظہرالدین شیرکوٹی (۴) مولانا امین احسن اصلاحی (۵) قاضی بدرالحسن سید جلالی ایم اے (۶) مولانا نصراللہ خاں عزیز بی۔اے۔ (۷) مولانا حامد الانصاری غازی (۸) ابوسعید بزمی۔ دیوبندی۔ ایم۔ اے (۹) ابواللیث ندوی اصلاحی (۱۰) شبیر بیگ بریلوی (۱۱) مولانا محمد عثمان فارقلیط (۱۲) مولانا محمد صلح الحسینی فاضل دیوبند (۱۳) مولانا محمد وارث کامل بی۔اے (۱۴) ضیاءالحسن فاروقی ایم۔اے (۱۵) حمید حسن نکر ایم۔اے (۱۶) قدوس صہبائی بی۔اے آنرز (۱۷) ماہرالقادری (۱۸) سعید اختر ایم۔اے۔

افسوس ہے کہ ۷۲ء کے بعد مولینا ظفر علی خاں کے فرزند مولانا اختر علی خاں بھی انتقال کر گئے۔ اور مولینا اختر علی خاں کے لڑکے منصور علی خاں اور مسعود علی خاں "زمیندار" کو جاری نہ رکھ سکے اور اس طرح اردو کا یہ آتش افشاں اخبار دم توڑ گیا۔ "مدینہ" اب بھی جاری ہے۔ سعید اختر صاحب نے اس کی زمام اصلات اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے۔ ایک زمانہ میں "مدینہ" کی جو شان تھی۔ وہ اب نہیں ہے۔ نہ وہ مضامین، نہ وہ کتابت وطباعت۔ اور نہ صحافت کا وہ اعلیٰ معیار بس اتنی بات غنیمت ہے کہ ۱۹۲۰ء میں جو اخبار نکلا تھا وہ اب ۱۹۷۳ء تک جاری ہے۔ ۴۷ء کے بعد اردو صحافت نے ایک اور کروٹ لی ہے اور ایک نیا روپ اختیار کیا ہے۔ ہم نے پچھلے اخبارات اور اخبار نویسوں کی یاد زندہ رکھنے کے لیے یہاں ان کے نام گنائے ہیں۔ اردو کا موجودہ صحافت کا جائزہ لینے کے لیے ایک اور مضمون کی ضرورت ہے۔

اردو صحافت کے ذکر کے سلسلے میں اردو کے معمر اور کہنہ مشق صحافی اور اہل قلم مولانا محمد عثمان فارقلیط کا نام خاص طور پر آنا چاہئے۔ مولانا کی عمر اب ۸۰ سال کے قریب ہے۔ وہ اردو کے بزرگ ترین صحافیوں میں سے ہیں۔ عمر زیادہ ہونے کے باوجود ان کا قلم جوان ہے۔ انھوں نے تفسیر قرآن بھی لکھی ہے، ناول اور افسانے بھی لکھے ہیں۔ عمرانیات، سائنس، مذہب سیاست اور اخلاق پر ہزاروں مضامین بھی ان کے قلم سے نکلے ہیں۔

★

ایک مستحسن اِقدام

لکھنؤ میں آل انڈیا غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس کا انعقاد یہ ثابت کرتا ہے کہ اردو کسی مخصوص فرقے کی زبان نہیں۔ اس پر ہر ہندستانی کا برابر حق ہے۔ اردو کے خلاف فتنہ پرور ذہنوں کی ناپاک کوششوں کو ناکام بنانے کے لیے منتظمین کانفرنس کا یہ اقدام نہایت ہی مستحسن ہے جس کے لیے وہ اور مندوبین وغیرہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

دانائے رازِ حرّیت

نہالؔ رضوی

السلام اے علم و دانش کے گلستاں کے امیر
پیکرِ انسانیت، آئینہ دل، روشن ضمیر

اے کہ تو آیا بدلنے کو گلستاں کے لباس
ہے دوائے دردِ اہلِ گلستاں بھی تیرے پاس

عزم و ہمت کے جہاں اے خیر خواہِ خاص و عام
ہم نے رکھا ہے جواہر لال نہرو تیرا نام

صاف دل انساں، امیرِ کاروانِ انقلاب
ہو نہیں سکتا ہے باپو کی طرح تیرا جواب

تیرا مقصد ہے گلستاں سے اندھیرے چھانٹنا
تیرا منشا ہے سکونِ زیست کی ہَے باٹنا

ختم کرنے کے لیے آیا فرنگی اقتدار
تیرے قرباں کائناتِ حرّیت کے تاجدار

شانتی سے قصر ڈھا کر ظلم و استبداد کے
تو نے بدلا ہے مقدّر کو غلام آباد کے

رہنمایانِ جہاں کرتے ہیں تیرا احترام
ساقیِ مے خانۂ ہندوستاں تجھ کو سلام

ہے مسلّم تیرے قول و فعل کی یکسانیت
مانتے ہیں سب تجھے دانائے رازِ حرّیت

دھوپ سے تیرے عمل کی گلستاں در گلستاں
جاگ اُٹھے زندگی کی جرأتوں کے کارواں

زندگی کی چاندنی ہر سمت رقصاں تو نے کی
روشنی گلزار و ویرانے میں یکساں تو نے کی

تو نے مستقبل گلستاں کا بنانے کے لیے
جرأتِ اقدام کے فانوس روشن کر دیے

اے عظیم المرتبت انساں تری ہمدردیاں
بھول سکتے ہیں کبھی باشندۂ ہندوستاں

ہے چمن اندر چمن تیرے تدبّر کا جمال
مل نہیں سکتی تیرے فہمِ سیاست کی مثال

شہریاری کے لیے تو بن گیا تھا دردِ سر
حامیِ امن و اماں اے نیک طینت راہبر

عام کر کے جرأتِ اظہارِ جورِ خسروی
تو نے بدلی ذہنیت اہلِ غلام آباد کی

انقلابِ عام کا نعرہ کیا تھا یوں بلند
ہوش کھو بیٹھے تھے اپنے سب فرنگی ہوش مند

دے کے مایوسیوں کو تو نے زندگی کے حوصلے
سرد نبضوں میں حرارت کے کنول روشن کیے

ظلمتِ بے روزگاری کم سے کم تر تو نے کی
بخش دی معصوم دہقانوں کے ہونٹوں کو ہنسی

اے نئے ہندوستاں کے سب سے پہلے سربراہ
تیری چوکھٹ پر جھکے گی ہر مورخ کی نگاہ

ناخدائے کشتیِ ہندوستاں، پائندہ باد
مصلحِ رفتارِ نبضِ عصرِ حاضر، زندہ باد

پنڈت موتی لال نہرو

پروفیسر ہارون خاں شروانی

یہ واقعہ ۱۹۱۵ء کا ہے۔ میں کسی مقدمے کے سلسلے میں الٰہ آباد گیا ہوا تھا اور حیدر آباد کے سابق چیف جسٹس نواب سربلند جنگ کے یہاں مقیم تھا۔ یورپ کے قیام کے اواخر میں جواہر لال نہرو سے میرے دیرینہ روابط ہو گئے تھے، اور ہم دونوں لندن میں شانہ بشانہ اپنی بساط کے مطابق ہندستان کی خدمت میں مصروف رہے تھے۔ الٰہ آباد گیا تو قدرتی طور پر جواہر لال نہرو کے والد پنڈت موتی لال نہرو سے ملنے کی خواہش ہوئی۔ معلوم ہوا کہ پنڈت جی صرف بڑے بڑے مقدمے لیتے ہیں اور ان میں بھی ان کی پریکٹس زیادہ تر رائے دینے تک محدود ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ عام طور پر تعطیل کے دن صبح کے وقت ملاقاتیوں سے ملتے ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں یو، پی میں موٹروں کا زیادہ رواج نہیں تھا چنانچہ میں نواب سربلند جنگ کی دو اسپہ فٹن میں آنند بھون پہنچا۔ غالباً جواہر لال نے اپنے والد صاحب سے میرا ذکر کر دیا ہوگا چنانچہ میرا نام معلوم کر کے نہایت تپاک کے ساتھ میرا سواگت کیا۔ پنڈت جی آنند بھون کے وسیع برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے سفید باریک ململ کا کرتا جس کے نیچے بنیائن صاف نظر آتی تھی، پاؤ گز کی مہری کا غرارہ، سر کے تل چاولی بال نہایت سلیقے سے کڑھے ہوئے خوبصورت مونچھیں، چوڑی پیشانی، غرض پوری سج دھج ایسی تھی کہ اس سے پنڈت جی کی سوجھ بوجھ، ان کی قابلیت، ان کے مرتبے اور ان کی امارت کا پورا اندازہ ہوتا تھا۔ اتفاقاً وہ اکیلے بیٹھے تھے۔ جواہر لال غالباً ہائی کورٹ گئے ہوئے تھے۔ بہت دیر تک بٹھایا میرے اور جواہر لال کے تعلقات کے متعلق دریافت کرتے رہے۔ نواب سربلند جنگ اور ہمارے خاندان کے روابط کے متعلق پوچھا۔ پنڈت جی کو اس بات سے بہت دلچسپی ہوئی کہ سربلند جنگ کے والد مولوی سمیع اللہ خاں نے علی گڑھ کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور علی گڑھ کالج کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ سربلند جنگ کے دو نسبتی بھائی عباس بیگ اور یحییٰ بیگ انگلستان میں میرے ساتھیوں میں سے تھے۔ پنڈت جی نے میرے کام اور میرے مستقبل کے متعلق بھی سوالات کیے۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے مجھ سے کہا کہ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد ہر نوجوان کو آگے بڑھنے کے لیے بہت کچھ محنت کرنی پڑتی ہے اور ابتدا میں اسے اس محنت کا ثمرہ بظاہر حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن ہمت نہیں ہارنی چاہیے اور یہ سوچنا چاہیے کہ اسے زندگی کے کس شعبے سے زیادہ لگاؤ ہے اور اس میں داخل ہو جائے اور محنت کر کے اس میں کمال پیدا کرے۔

یہ بات حیرت ناک معلوم ہوتی ہے کہ پنڈت جی نے کسی یونیورسٹی سے کوئی ڈگری نہیں لی اور نہ ایل ایل بی کا امتحان ہی پاس کیا — انھوں نے وکالت کا معمولی امتحان پاس کر کے اپنے پیشے کا آغاز کیا اور محض اپنی فطری قابلیت، اپنی دور رس نگاہ اور محنت و دیانت سے پیشے کے اعلیٰ ترین منازل طے کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۱۵ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کی سماجی خلیج حائل نہیں تھی اور کسی بھی طبقے کے ہندو اور اسی طبقے کے مسلمان کے پہناوے، زبان، رسم و رواج اور رہن سہن میں بہت کم فرق نظر آتا تھا۔ گو اونچی ذات کے ہندوؤں میں چھوت چھات سے پرہیز حد کو پہنچ

گیا تھا، لیکن اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے معاشری تعلقات میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی اجنبی کے لیے یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ اس کا مخاطب ہندو ہے یا مسلمان۔ اس ملی جلی تہذیب کے شاید سب سے نمایاں مظہر وہ کشمیری پنڈت تھے جو یو پی میں آ کر بس گئے تھے اور جنھوں نے یہاں کی پبلک زندگی میں گویا اپنا نقش قائم کر دیا۔ ان کشمیری پنڈتوں میں شاید سب سے نمایاں سر تیج بہادر سپرو، بشن نرائن در، برج نرائن چکبست، اقبال نرائن گرٹو، اور موتی لال نہرو تھے۔ بعد کی سیاسی زندگی میں موتی لال نسبتاً "گرم" اور سر تیج بہادر سپرو نسبتاً "نرم" ہو گئے ہوں، لیکن معاشری اعتبار سے دونو ایک دوسرے کے ہم خیال تھے اور دونوں میں کسی قسم کے تعصب کا شائبہ بھی نہ تھا۔

یو پی کی صوبائی کانفرنس کا (جو کانگریس کی صوبائی شاخ تھی) جلسہ ۱۹۱۶ء میں علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ میرے والد مرحوم حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب کو کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کا صدر، اور راقم الحروف کو اس کا معتمد منتخب کیا گیا۔ اس میں شرکت کے لیے منجملہ دوسرے بڑے بڑے لیڈروں کے، موتی لال نہرو اور جواہر لال دونوں آئے۔ میرے والد ماجد نے انھیں اپنی کوٹھی 'مشرت منزل' میں (جو اُن دنوں سیاسی کارکنوں اور سیاست دانوں کی آماجگاہ تھی) کھانے پر مدعو کیا۔ باتوں باتوں میں پنڈت جی کہنے لگے کہ "حاجی صاحب! میں تو کھانے پینے کے معاملے میں — COSMOPOLITAN ہوں، میرا کھانا ایک مسلمان بورچی تیار کرتا ہے، لیکن میرے رسوئی خانے کا رنگ ڈھنگ ہندوؤں جیسا ہے اور کھانا میں انگریزوں کی طرح کھاتا ہوں۔" میرے والد صاحب کے دریافت کرنے پر پنڈت جی نے اس کی یہ توضیح کی کہ ایک اچھے مسلمان بورچی سے بہتر کسی کو کھانا بنانے کا سلیقہ نہیں ہوتا، ایک ہندو رسوئی خانے کی جو صفائی ہوتی ہے وہ آپ لوگوں کے بورچی خانے کی نہیں ہوتی اور انگریز جس نفاست سے کھانا کھاتے ہیں اس سے نہ ہندو واقف ہیں نہ مسلمان۔

صرف کھانے پینے کے مسائل ہی میں نہیں بلکہ پنڈت جی کی پوری زندگی کسی قسم کے تعصب سے پاک تھی۔ پنڈت جی کو روپے کی کمی نہ تھی۔ آمدنی فراواں تھی۔ ٹیکس برائے نام تھے۔ آنند بھون کیا تھا ایک آرام دہ محل، ایک کلب گھر، ایک سیاست خیز مسکن تھا گھر میں امیرانہ ٹھاٹھ تھے۔ کھانے کا کمرہ، ملاقاتی کمرہ، متعدد سونے کے کمرے (BED ROOMS) بلیرڈ کھیلنے کا کمرہ، تیرنے کا حوض، ایک نفیس کیا ڈنڈا اور عمدہ باغ، کون سی چیز تھی جو اس کوٹھی میں نہ پائی جاتی ہو۔ پنڈت جی کے سونے کے کمرے میں جانے کا تو اتفاق نہیں ہوا، لیکن ایک مرتبہ کسی عدالتی کام کی غرض سے الٰہ آباد گیا، تو جواہر لال نہرو مجھے اپنی شاہانہ فٹن میں (جس میں دو دیو ہیکل مشکی گھوڑے جتے ہوئے تھے) مجھے ہائی کورٹ سے آنند بھون لے گئے۔ کھانے میں ذرا دیر تھی تو انھوں نے کوٹھی کو گھوم پھر کر دکھانے کے بعد کہا کہ آؤ میرے کمرے میں چلو، وہاں بیٹھیں گے۔ یہ جواہر لال نہرو کا سونے کا کمرہ تھا۔ شاید ۲۵ فٹ طویل اور اتنا ہی عریض ہوگا۔ اس کمرے کے چاروں طرف، زمین سے تین چار فٹ بلندی پر الماریوں کا ایک لا متناہی سلسلہ تھا۔ جس کے شیشوں پر خوبصورت ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے جواہر لال نہرو سے دریافت کیا کہ کتابوں کی الماریوں پر ریشمی پردوں کا کیا مطلب ہے، کتابیں تو دکھائی ہی نہیں دیتیں۔ جواہر لال نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا کہ یہ کتابوں کی الماریاں نہیں بلکہ میرے کپڑوں کی الماریاں ہیں، اور ایک دو دروازے کھول کر مجھے دکھائے تو ایک حصے میں ٹائیاں اور دوسرے میں جرابیں ہی جرابیں نظر آئیں۔ یہ مثال یہاں اس لیے دی گئی ہے کہ اس سے باپ بیٹے کے رہن سہن کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جائے۔

پنڈت جی کا معیار زندگی اس درجہ بلند ہونے کے باوجود ان میں ذرا بھی دماغ داری نہیں تھی۔ وہ ہر ایک سے ایسے گھل مل کر ملتے تھے کہ مخاطب سمجھتا تھا کہ ان سے زیادہ میرا کوئی دوست نہیں اور حقیقت میں یہی راز ان کی پیشہ ورانہ ترقی کا تھا۔ ساتھ ہی ان کی طبیعت میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کے کئی سال بعد تک وہ اس میں اتنے منہمک رہے کہ کسی دوسری طرف دیکھنے کی انھیں فرصت ہی نہ تھی لیکن جب انھوں نے وکالت میں نام پیدا کر لیا تو وہ سوچنے لگے

کہ جس طرح انھیں ذاتی خودداری کا احساس ہے اسی طرح ان کے ملک کو بھی ہوگا کیوں کہ اُسے بے شمار مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے اور اس کے وقار کو بری طرح ٹھیس لگ رہی ہے۔ انھوں نے اب یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ یہ افسوس ناک صورت حال ملکی اور قومی خودداری کے منافی ہے اور اس کی ضرورت ہے کہ ہر شخص ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ملک کو ان بیڑیوں سے آزاد کرائے۔ چنانچہ موتی لال نہرو سیاسی اکھاڑے میں کود پڑے اور اپنے آرام و آسائش اور اپنے پیشے کو خیرباد کہہ دیا۔ شاید سب سے زیادہ اثر جو پنڈت جی پر پڑا وہ مسز اینی بیسنٹ اور ان کے رفقائے کار، ارنڈیل اور واڈیا کی نظر بندی تھی۔

اس صدی کی دوسری دہائی کا زمانہ انگریزی سامراج کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا اور اگر کسی ممتاز شخصیت کو انگریز اپنی قید و بند میں مبتلا کر دیتے تھے تو پورا ملک تھرا جاتا تھا۔ مسز بیسنٹ اور ان کے رفقائے کار کی نظر بندی اسی طرح کا ایک سانحہ تھا، اور اس سے متاثر ہو کر ہندو، مسلمان، پارسی سب ہی احتجاج پر اتر آئے اور بالآخر طاقتور سامراج کو گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور کر دیا۔ راقم الحروف کو اچھی طرح سے یاد ہے کہ جن لوگوں نے کبھی ارنڈیل اور واڈیا کا نام بھی نہیں سنا تھا انھوں نے بھی اس احتجاج میں بھرپور حصہ لیا۔ شہر شہر بلکہ گاؤں گاؤں میں جلسے ہوئے، تقریریں ہوئیں، لوگوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا، اور شاید انگریزوں کو پہلی مرتبہ یہ محسوس ہوا کہ ہندوستانی بھی بلا تفریق مذہب و ملت ہم زبان ہو سکتے ہیں۔ اگست ۱۹۱۷ء میں ایک عظیم الشان احتجاجی جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس میں برج نرائن چکبست نے ایک ولولہ انگیز نظم پڑھی جس کا ایک ایک لفظ اس جوش و خروش کی ترجمانی کرتا ہے جو ہر ہندو، ہر مسلمان اور ہر پارسی کے دل میں پایا جاتا تھا۔ اس کے دو بند ملاحظہ ہوں:

قوم غافل نہیں آیا تری غمخواری سے — زلزلہ ملک میں ہے تیری گرفتاری سے
آگ بھڑکی ہے تری آگ کی چنگاری سے — خاک حاصل نہ ہوا تیری دل آزاری سے
دل ترا قوم کے دامن میں لیے جاتے ہیں
ہڈیوں کو تری زنداں میں لیے جاتے ہیں
ہند بیدار ہوا یوں تری بیداری سے — جیسے برسوں کا مریض اٹھتا ہے بیماری سے

قوم آزاد ہوئی تیری گرفتاری سے — چاندنی پھیل گئی حسن وفاداری سے
تو نظر بند ہے جلوہ ہے ترا ہر گھر میں
شمع فانوس میں ہے نور ہے محفل بھر میں

غور سے دیکھا جائے تو یہ محسوس ہوگا کہ مسز بیسنٹ کی نظر بندی ایک اعتبار سے مہاتما گاندھی کی کامل قیادت کا پیش خیمہ تھی، اور اس نے اس عظیم تحریک کے لیے راستہ ہموار کر دیا جسے "گاندھیت" کا لقب دیا جاتا ہے۔ موتی لال نہرو پر اس کا بڑا اثر پڑا اور وہ مسز بیسنٹ کی قائم کی ہوئی ہوم رول لیگ کے ممبر ہو گئے۔

اس سے بھی زیادہ جس واقعے نے پنڈت جی کی خودداری اور وطن دوستی کے لیے مہمیز کا کام کیا وہ پنجاب کا المیہ اور جلیانوالہ باغ کا قتل عام تھا۔ نہتے مردوں، عورتوں اور بچوں پر جنرل ڈائر کی بے تحاشہ گولہ باری نے جس میں چشم زدن میں سیکڑوں افراد بھون دیے گئے اور جن کے خون نے ہر قسم کی ذہنی خلیج کو گویا پاٹ دیا، اس نے پنڈت جی کے جسم میں بھی ایک برقی لہر دوڑا دی، اور اب وہ اپنا آرام و آسائش سب کچھ بھول کر مہاتما گاندھی کی قیادت میں سیاسی میدان میں آ گئے۔ پنجاب کے مظالم کی تحقیقات کے لیے کانگرس نے ایک ذیلی کمیٹی مقرر کی، اور اس کا صدر موتی لال نہرو کو چنا گیا۔ اس کے دوسرے ارکان خود مہاتما گاندھی، چترنجن داس، عباس، طیب جی اور ایم آر جیاکر تھے۔ اس کمیٹی کی جو روداد شائع ہوئی اس پر جملہ ارکان کے دستخط ہیں۔ لیکن اس کے ایک ایک فقرے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ابتدائی مسودہ پنڈت جی ہی نے بنایا ہوگا۔

پنڈت جی کو سیاسیات میں تن من دھن سے شریک ہوئے اگرچہ کچھ زیادہ مدت نہیں گزری تھی لیکن ان کی بے لوث خدمت کے جذبے اور ان کی غایت وطن دوستی کا یہ نتیجہ تھا کہ انھیں ۱۹۱۹ء کے کانگرس اجلاس کا صدر چنا گیا۔ اس کا اجلاس جان بوجھ کر امرتسر میں ہونا قرار پایا تاکہ جلیان والا باغ کے قتل عام کی بھیانک تصویر لوگوں کے ذہن میں تازہ رہے۔ یہی وہ اجلاس تھا جس میں "ہندو مسلمان کی جے، مہاتما گاندھی کی جے، شوکت علی، محمد علی کی جے، کے نعروں سے پنڈال گونج رہا تھا۔ شوکت علی اور محمد علی کئی سال سے نظر بند تھے اور

حال ہی میں وہ تھینڈ واڑہ جیل سے رہا ہوئے تھے۔ رہائی کے بعد بجائے اس کے کہ مدت کے بعد اپنے اہل و عیال سے ملیں، انھوں نے سیدھا امرتسر کا رخ کیا تھا تاکہ وہ کانگریس کے عہد آفریں اجلاس میں شریک ہو سکیں۔ امرتسر کے اس اجلاس کے بعد پنڈت موتی لال نہرو کے خاندان اور محمد علی کے درمیان تعلقات گہرے ہو گئے، اور جب چار سال بعد محمد علی کا کانگریس کی صدارت پر انتخاب ہوا تو جواہر لال نہرو کو کانگریس کا معتمد چنا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ملک کے سیاسی حالات اس کے مقتضی تھے کہ ۱۹۱۹ کے اجلاس کی صدارت پنڈت جی کے ہی سپرد کی جائے۔ کچھ تو پنڈت جی کی خاندانی روایات اور کچھ ان کے ذاتی خیالات، دونوں انھیں ایک ہی طرف دیکھنے پر مجبور کر رہے تھے، وہ یہ کہ ہندؤں مسلمانوں کے اتحاد کے بغیر ملک کو نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔ اب کانگریس کی کرسیِ صدارت پر بیٹھنے کے بعد پنڈت جی کو اپنے ان خیالات کے پرچار کرنے کا پورا موقع مل گیا۔ اُن کا خطبۂ صدارت وطن دوستی، قوم پرستی اور ملکی اتحاد کے جذبات سے لبریز تھا۔ گو ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا کہ وہ اس ٹولی کا ساتھ دینا شروع کر دیتے جس کے سب سے نمایاں نیتا خود ان کے فرزند جواہر لال تھے لیکن انھیں اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ اگر ملک کو باہر والوں کے جوے سے مُکتی حاصل کرنا ہے تو پھر مہاتما گاندھی کی قیادت کو قبول کرنا اور ان کے اُصولوں کو اپنانا ہو گا۔ گاندھی جی کی نحیف آواز میں جو سوز اور جادو بھرا ہوا تھا اس نے سب کو چونکا دیا اور موتی لال بھی دل و جان سے ان کے ہم نوا ہو گئے۔ ستیہ گرہ تحریک ایک بالکل انوکھی تحریک تھی اور اس لفظ سے بھی لوگوں کے کان ناآشنا تھے۔ ایک نہتی قوم سے کہا جاتا تھا کہ تم مسلح، ہر قسم کے وسائل سے لیس، دنیا میں سب سے طاقت ور سامراج کا مقابلہ عدم تعاون[1] سے کرو، لاٹھیاں کھاؤ، جیل جاؤ، اپنے آرام و آسائش کو خیرباد کہو۔ یہ کتنا عجیب معلوم ہوتا ہو گا؟ موتی لال نہرو کے لیے یہ زقند لگانا کتنا دشوار ہو گا؟ جو شخص گویا سونے میں تولا جاتا تھا، جسے ہر قسم کی آسائش میسر تھی، جس کا بیٹا ہیرو اور ٹیرنٹی کا تعلیم یافتہ تھا، جس کا مسکن بڑے بڑے محلات سے بھی زیادہ آرام دہ تھا، اس کے سامنے اب طرح طرح کی مصیبتوں کا خطرہ منڈلا رہا تھا۔ ان کے سامنے اب جیل کے دروازے کھلے ہوئے تھے، لاٹھیاں اٹھی ہوئی تھیں، وکالت کو، جس کے سہارے دنیوی نعمتیں حاصل ہوئیں، اس سے ہمیشہ کے لیے منھ موڑنا تھا۔ یہ امرتسر کانگریس ہی تھی جس میں ولی عہد سلطنت برطانیہ شہزادہ ویلز (جو بعد میں ایڈورڈ ہشتم قیصر ہند بنے) ان کی آمد پر مکمل مقاطعے کی قرارداد منظور ہوئی اور ساٹھ برس کے موتی لال نہرو اور اُن کے نڈر اور دلیر فرزند جواہر لال نہرو کو جیل خانے جانا پڑا۔

جیل میں پنڈت جی کی گویا کایا پلٹ گئی۔ ایک زمانہ تھا جب انھیں انگریزوں اور انگریزیت سے دلی لگاؤ تھا، اور اب ان کے رفقائے کار میں چترنجن داس، مہاتما گاندھی اور حکیم اجمل خاں تھے۔ پنڈت جی نے اب اس ذاتی اور قومی منشور کو جسے مہاتما گاندھی نے ملک کے سامنے رکھا تھا، سو فی صد قبول کر لیا۔ ان پر پہلے تو چترنجن داس کی موت کا بڑا اثر ہوا، اور پھر حکیم اجمل خاں کی وفات سے جو رنج پہنچا اس کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ ان کے والد حکیم صاحب کو اپنا بھائی سمجھتے تھے، اور جو کچھ ہندؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کے متعلق حکیم صاحب کی زبان سے نکلتا تھا اس پر مہاتما گاندھی آمنّا وصدّقنا کہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ پنڈت جی اور حکیم صاحب دونوں ہندو مسلم مشترکہ کلچر کی پیداوار تھے، وہ کلچر جسے سیاست کاری کا تیز و تند سیلاب بہائے لیے جا رہا تھا۔ حکیم اجمل خاں کی وفات سے ملک کو جو عظیم نقصان پہنچا اس کا اندازہ کچھ موتی لال نہرو ہی کر سکتے تھے۔

---

[1] شاید یہ بات اس مضمون کے اکثر پڑھنے والوں کو معلوم نہ ہو گی کہ "عدم تعاون" کا لفظ ایک مسلمان، فانی القوم رہنما حسرت موہانی نے اختراع کیا تھا۔ اس کا ماخذ قرآن مجید کی یہ آیت ہے: لا تعاونوا علی الاثم والعدوان (تم گناہ اور ظلم کا کبھی ساتھ نہ دو)

برطانوی سامراج اور ہندستان کے وطن دوستوں کے درمیان جو کشمکش کئی دہوں سے جاری تھی وہ مہاتما گاندھی کی جادو کی چھڑی کے وار کے باعث ایک نئے حلقے میں آگئی تھی۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان جو سمجھوتہ ہوا تھا اس کے اثرات میں یکجہتی نمایاں تھا اور باوجود قوم پرور مسلمانوں کی کوششوں کے جن میں ڈاکٹر انصاری، شعیب قریشی، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، محمد علی اور شوکت علی شامل تھے، ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملے جلے آدرشوں میں گویا بال پڑ گیا تھا، اور جگہ جگہ فرقہ وارانہ فسادات ہونے لگے تھے۔ انگریزوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وطن دوست طبقے کو چیلنج دیا کہ اگر آپ لوگ یک زبان ہو کر ملک کے لیے ایک متفقہ دستور مرتب کر سکتے ہیں تو ہم بھی اسے تسلیم کر لیں گے۔ کانگریس نے اس چیلنج کو قبول کر کے ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں ایک کل جماعتی کانفرنس طلب کی۔ اس کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ اس میں ہندستان کا دستور مرتب کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی ذیلی کمیٹی کی تشکیل کی گئی اور اس اہم کمیٹی کی صدارت کے لیے موتی لال نہرو کا انتخاب کیا گیا۔ اس کمیٹی کے ارکان سیاسیات کے میدان میں نہایت وقیع اور سر برآوردہ حیثیت کے حامل تھے۔ مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے سر علی امام اور شعیب قریشی کو رکھا گیا تھا، ایم۔ ایس۔ اِنے اور ایم۔ آر جیاکر ہندو مہاسبھا کے نمائندے تھے، سر تیج بہادر سپرو لبرل فریق کے رہنما تھے اور این ایم جوشی کو مزدوروں کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ ان میں سے صرف چھ ممبروں نے ابتدا سے آخر تک کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کی، اور یہ بھی پنڈت موتی لال نہرو کی فراست اور ترغیب کا نتیجہ تھا کہ جو رپورٹ بالآخر تیار ہوئی اس پر باقی ماندہ ارکان بلا اختلاف رائے دستخط کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ یہ رپورٹ کانگریس کے صدر ڈاکٹر انصاری کو ۱۰ اگست ۱۹۲۸ء کو پیش کی گئی۔ ڈاکٹر انصاری نے اپنی تقریر میں اس کی پرزور تائید کی اور کہا کہ نہرو رپورٹ کے ساتھ ہندستان کی تیس کروڑ آبادی کی دیرینہ امیدیں وابستہ ہیں۔ ہندستان کے باشندوں کو اس کا احساس پیدا ہو گیا ہے کہ ان پر ایک اعتبار سے دوہری زد پڑ رہی ہے، ایک زد غیر کے تسلط کی اور دوسری آپس کے بغض و عناد کی، اور ہمیں ان دونوں حربوں سے اپنے آپ کو بچانا ہے۔

اس رپورٹ کی تیاری میں اگرچہ مختلف طبقوں کے نمائندوں نے حصہ لیا تھا، تاہم یہ ہندو مسلم فرقہ واریت کی دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی اور موتی لال نہرو کی امیدیں بر نہیں آئیں۔ قوم نے پنڈت جی کو ۱۹۲۸ء کی کانگریس کا صدر مقرر کیا۔ وہ دو سال بعد یعنی ۱۹۳۰ء میں مہاتما گاندھی کی نمک ستیہ گرہ میں شامل ہو گئے، اور دوسرے کانگریسی نیتاؤں کی طرح انھیں از سر نو جیل جانا پڑا۔ کچھ عمر کا تقاضہ اور کچھ زندگی کی میں عظیم انقلاب کے باعث پنڈت جی جب جیل سے نکلے تو ایک ٹوٹے ہوئے بادبان والے جہاز کی طرح ہو گئے تھے اور پہچان میں بھی نہیں آتے تھے۔ انھیں صرف پانچ مہینے اس دنیا میں اور رہنا تھا، تاہم اس آخری زمانے میں بھی انھیں چین سے بیٹھنے نہیں دیا گیا اور جلسوں، تقریروں، جلوسوں اور مسافرت نے، جو توانائی باقی تھی اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ آخر وہ وقت آگیا جب پنڈت جی کو اس دنیا سے چلا جانا تھا۔ جب ۶ فروری ۱۹۳۱ء کو ان کا انتقال ہوا تو اُن کی ارتھی کے ساتھ سوگواروں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے تھے۔ اس عظیم الشان جلوس کی رہنمائی خود مہاتما گاندھی کر رہے تھے۔ ہزاروں ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں، مردوں، عورتوں، بچوں میں مشکل سے کوئی ایسا ہوگا جو اپنے محبوب رہنما کی جدائی میں اپنی آنکھوں سے آنسو نہ پونچھ رہا ہو۔

★

پیش گوئی

سلام مچھلی شہری

چمنِ دہر سے گل بار ہوا آنے لگی
آخرش امن و محبت کی فضا چھانے لگی
زندگی میں کوئی بن بیار نہیں رہ سکتا
آدمی بر سرِ پیکار نہیں رہ سکتا
خود غرض روح کو راحت تو نہیں مل سکتی
صرف دولت سے مسرّت تو نہیں مل سکتی
چرخ ہل جاتا ہے انسان کی ہر آہ کے بعد
کامگار ابھریں گے ہر ایک شہنشاہ کے بعد
اب تو دنیا کے سنورنے کی سحر آئے گی
زندگی موت کے پنجے سے نکل جائے گی
زندگی لے کے جمالِ ابدی آئے گی
اب قیامت کے تصور پہ ہنسی آئے گی
شاعرِ خواب ہوں، خوابوں میں گھرا رہتا ہوں
میں پیمبر تو نہیں، پھر بھی یہی کہتا ہوں
زہر آگیں سر و سامانِ جہاں ہار گئے
اسلحہ خانے سرِ بزمِ اماں ہار گئے

مادرِ ارض! ترا عزمِ جواں زندہ باد،
آدمِ نو! یہ فلک بوس نشاں زندہ باد!

اترپردیش میں

اردو کی تعلیم و ترقی کے لیے اقدامات

—————— ادارہ

اردو ہمارے ملک، ہماری قوم کی ایک اہم اور شیریں زبان ہے اور ملک کے تمام لوگ بلالحاظ مذہب و ملت اس کی ترقی کے دل و جان سے خواہاں ہیں۔ دستورِ ہند میں اس کو بھی ملک کی ۱۴ قومی زبانوں میں ایک قومی زبان کی حیثیت دی گئی ہے۔ اس کے گیسوؤں کو ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سبھی نے سنوارا اور نکھارا ہے۔ جدوجہد آزادی میں اس زبان کی خدمات انتہائی قابلِ قدر اور ناقابلِ فراموش ہیں۔ اس کے انقلابی نعروں، ترانوں اور گیتوں نے مجاہدین آزادی کے دلوں میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ ہمارے اردو شعراء نے بھی ہمیشہ وطن کی عظمت اور محبت کے نغمے گائے ہیں۔ اکثر شعراء کے ایک ایک شعر نے اہلِ وطن کے دلوں کو جوش و امنگ سے بھر دیا تھا۔ کون ایسا شخص ہے جس نے رام پرشاد بسمل کے اس شعر کو نہ سنا ہوگا جس نے برٹش سامراج سے ٹکر لینے کے لیے ہر محب وطن کے دل و دماغ میں آگ بھڑکا دی تھی ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

ہماری ریاست اترپردیش، جو اردو زبان کا گہوارہ رہی ہے اور جہاں یہ زبان پلی، بڑھی اور بڑھ کر جوان ہوئی ہے، اس پر اس زبان کو ترقی دینے اور اردو کی تعلیم کے لیے ضروری سہولتیں بہم پہنچانے کی زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو حکومت اترپردیش اپنی اس ذمہ داری کا پورا پورا احساس رکھتی ہے۔ چنانچہ اردو کی تعلیم کو فروغ دینے اور اردو زبان و ادب کی ترقی و توسیع کے زیادہ سے مواقع بہم پہنچانے اور اس سلسلے میں تمام ضروری سہولتیں مہیا کرنے کے لیے اس نے بہت سے کام کئے ہیں اور اس سلسلے میں اور بھی متعدد اسکیمیں اس کے زیرِ غور ہیں۔

پرائمری سطح پر

ریاستی حکومت نے حال ہی میں ابتدائی سطح پر اردو کی تعلیم کے لیے ایک انتہائی اہم فیصلہ کیا ہے جس کے مطابق ریاست کے شہری علاقوں میں واقع ہر پرائمری اسکول میں نئے تعلیمی سال سے اردو کی تعلیم کی سہولت مہیا کرنے کے لیے کم از کم ایک اردو ٹیچر مقرر کئے جانے کے احکامات صادر کئے گئے، خواہ کسی اسکول میں اردو جاننے والے ٹیچر پہلے سے ہی کیوں نہ موجود رہے ہوں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر حال ہی میں تقریباً... ۱۴ اردو ٹیچر مقرر کئے جا چکے ہیں۔ اگر کسی پرائمری اسکول میں فی الحال اردو پڑھنے والے طالب علم نہ بھی ہوں گے تب بھی وہاں کم سے کم ایک اردو ٹیچر کا بندوبست لازمی طور سے کر دیا جائے گا۔ جب تک اردو پڑھنے والے طالب علم نہ ہوں گے اس وقت تک ان ٹیچروں سے دوسرے مضامین پڑھانے کا کام لیا جائے گا اور اگر ایک شخص بھی اردو پڑھنا چاہے گا تو اسے پڑھنے کی ضروری سہولت فراہم کی جائے گی۔ اس سلسلے میں ڈائرکٹر تعلیمات (بیسک) اترپردیش کی جانب سے ریاست کے تمام ضلع بیسک تعلیم افسران کو ۱۲ر جولائی ۱۹۷۳ء کو اس امر کی سخت ہدایات جاری کی گئی ہیں کہ وہ اپنے

اپنے ضلع اور حلقے میں محکمہ کی جانب سے اردو کی تعلیم کے بارے میں وقتاً فوقتاً جاری کیے جانے والے احکامات پر سختی سے عملدرآمد کریں اور اگر ان کے عملدرآمد میں کسی قسم کی غفلت برتی جاتی ہے تو اس کے ذمے دار وہ خود ہوں گے۔

نارمل اسکولوں میں اردو جاننے والے کچھ امیدواروں کو بھی داخل کرنے کی تجویز ہے تاکہ پرائمری اسکولوں کے لیے اردو ٹیچروں کی جو کمی ہے اسے جلد دور کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تجویز ہے کہ برسرِ ملازمت ٹیچروں کے لیے اہلیتی سرٹیفکیٹ امتحان اور ترغیبی بھتے (INCENTIVE ALLOWANCE) کو بھی باقی رکھا جائے۔ تاکہ ٹیچر اردو پڑھنے کی جانب زیادہ متوجہ ہوں اور اردو جاننے والے ٹیچروں میں بھی اردو میڈیم سے پڑھانے کی اہلیت پیدا ہو جائے۔ ریاست کے جن مکتبوں، مدرسوں اور اردو میڈیم اسکولوں کو تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن انھیں مالی امداد دینے والوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا ہے، انھیں بھی مالی امداد دینے کے مسئلے پر غور کیا جا رہا ہے۔ حکومت اسلامیہ اسکولوں، اور اردو میڈیم اسکولوں کو ملنے والی مالی امداد میں اضافے کے سوال پر بھی غور کرنے کا وعدہ کر چکی ہے۔

اتر پردیش میں اردو زبان و ادب کی تیز رفتار ترقی و توسیع کی غرض سے ریاستی سطح پر جب بااختیار اردو اکاڈمی کا قیام سابق وزیر اعلیٰ شری کملا پتی ترپاٹھی کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا، اس کے ایک وفد کو کچھ عرصہ قبل موصوف نے یہ یقین دلایا تھا کہ حکومت اردو اکاڈمی کے تجویز کردہ مقامات پر نئے اردو میڈیم اسکول قائم کرنے کی کوشش کرے گی۔ بشرطیکہ وہاں کافی تعداد میں ایسے طلباء موجود ہوں جو اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ اسکے علاوہ ادھر کچھ عرصے سے اردو کی نصاب کی کتابوں پر نظرِ ثانی کے جانے کا مطالبہ بھی کیا جا رہا تھا۔ اس سلسلے میں سابق وزیر اعلیٰ نے یہ تجویز رکھی تھی کہ اردو اکاڈمی خود ہی اس مقصد کے لیے ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کرے اور اس کی سفارشات پر غور و خوض کرنے کے لیے حکومت کو پیش کرے۔ چنانچہ اکاڈمی نے درسی کتابوں پر نظرِ ثانی کے لیے ایک سب کمیٹی مقرر کر دی ہے اور اس نے اپنا کام شروع بھی کر دیا ہے۔ شری ترپاٹھی سے وفد کی اس ملاقات کے موقع پر وفد کے لیڈر، قاضی عدیل عباسی نے تمام حالات سے واقف ہونے کے بعد ان خیالات کا اظہار کیا تھا:

"میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اردو کی ترقی اور اس کی تعلیم کو بڑھاوا دینے کے لیے جو کوششیں اتر پردیش کی حکومت نے کی ہیں وہ ہندستان بھر کے کسی بھی صوبے نے نہیں کی ہیں۔"

ڈائرکٹر تعلیمات کے صدر دفتر پر ایک ڈپٹی ڈائرکٹر (اردو) کی تقرری اس بات کی دیکھ بھال کے لیے کی جا چکی ہے کہ لسانی اقلیتوں کی تعلیمی سہولتوں کے لیے حکومت جو اسکیمیں تیار کرتی ہے ان پر مناسب ڈھنگ سے عملدرآمد ہو اور اردو کی توسیع و ترقی کی رفتار کو تیز کیا جا سکے۔ ریاستی سطح پر اردو کی ترقی کی دیکھ بھال کی خاص ذمہ داری اس افسر پر رکھی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ریاست میں ہر منطقے کے لیے ایک ڈپٹی انسپکٹر اردو میڈیم اسکول اور ریاست بھر کے عربی مدارس کے لیے ایک انسپکٹر تعینات کیے جا چکے ہیں تاکہ وہ اردو، فارسی اور عربی کی رفتارِ ترقی کی دیکھ بھال کرتے رہیں اور اس سلسلے میں تمام ممکن سہولتیں بہم پہنچائیں۔

ریاستی محکمہ تعلیم نے یہ احکامات بھی جاری کیے ہیں کہ اردو کے غیر تربیت یافتہ ٹیچر جو اس وقت اسکولوں میں کام کر رہے ہیں ان کی ملازمتیں جاری رہیں گی اور انھیں اوپر کے احکامات کے بغیر علاحدہ نہیں کیا جائے گا تاوقتیکہ ان کی جگہ پر زیادہ اہل اور ٹرینڈ اردو ٹیچر دستیاب نہ ہو جائیں۔

تعلیمی سال ۷۲-۱۹۷۲ء میں ریاست میں ایسے پرائمری اسکولوں کی تعداد تقریباً ۲۲۰۰ تھی جن میں طالب علموں کو اردو میڈیم سے تعلیم دی جاتی تھی۔

اردو کے ایسے تعلیمی اداروں کے بارے میں جو تسلیم شدہ اداروں کی فہرست میں شامل نہیں ہیں، اعداد و شمار فراہم کیے جا رہے ہیں اور یہ معلومات بھی حاصل کی جا رہی ہیں کہ ان کے پاس عمارت، ساز و سامان اور ٹیچروں کا کیا بندوبست ہے۔

ابھی تک پہلے درجے سے لے کر پانچویں درجے تک کی ہی اردو کی درسی کتابیں مہیا تھیں۔ ریاستی حکومت نے یہ حکم دیا کہ جولائی ۱۹۷۲ء سے چھٹے، ساتویں اور آٹھویں درجوں کے لیے بھی اردو کی نصاب کی کتابوں کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، حساب، الجبرا وغیرہ پندرہ مضامین میں اردو کی درسی کتابیں مہیا ہو جائیں۔ چنانچہ یہ کتابیں گزشتہ سال ہی بازار میں آگئی تھیں۔ آئندہ کے لیے بھی انتظام کیا جا چکا ہے کہ جو درسی کتابیں تیار ہوتی جائیں وہ بھی اردو میں بازار میں دستیاب ہوں۔

ڈگری سطح پر

ریاستی حکومت نے ڈگری سطح پر بھی اردو کی تعلیم کی زیادہ سے زیادہ سہولت بہم پہنچانے کے لیے حال ہی میں ایک اہم فیصلہ کیا ہے جس کے مطابق ۱۲ر جون ۱۹۷۳ء کو حکومت کی جانب سے ڈائرکٹر تعلیمات (اعلیٰ تعلیم) اتر پردیش کے نام ایک گشتی چٹھی میں کہا گیا ہے کہ "...... ریاست میں اردو کو ترقی دینے کے مقصد سے حکومت کی طرف سے یہ پالیسی اپنائی گئی ہے کہ ڈگری کالجوں میں اردو کے درجے کھولنے کے لیے خاص طور پر کوشش کی جائے تاکہ جو طلبا اردو پڑھنا چاہیں انھیں پوری پوری سہولت حاصل ہو سکے۔ اس پالیسی کے مطابق گزشتہ سال حکومت کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ریاست کے پانچ اضلاع یعنی بریلی، مراد آباد، بجنور، سہارنپور اور مظفر نگر کے ایک ایک ڈگری کالج کو ڈگری سطح پر اردو مضمون کی تعلیم شروع کرنے پر حسب ضابطہ ملنے والی گرانٹ پہلے سال سے ہی منظوری کر دی جائے۔ ریاست میں اردو کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کے مقصد سے حکومت نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ مندرجہ بالا سہولت ان پانچ اضلاع کے ڈگری کالجوں تک ہی محدود نہ رہے گی بلکہ دیگر تمام اضلاع میں واقع ان سبھی ڈگری کالجوں پر بھی اس کا اطلاق ہوگا جو اردو مضمون کے درجے کھولنا چاہتے ہیں....." اس چٹھی کی نقلیں تمام یونیورسٹیوں کے رجسٹرار کو بھی ضروری کارروائی کی غرض سے بھیج دی گئی ہیں۔

اردو میں درخواستیں

ریاستی حکومت نے ضلع حکام کو اس امر کے بھی احکامات جاری کر دیے ہیں کہ اردو میں لکھی ہوئی درخواستوں کو قبول کرنے میں کوئی حیلہ حوالہ نہ کیا جائے اور اگر ایسی شکایت کسی افسر یا اہلکار کے خلاف موصول ہوگی تو اُسے ڈسپلن کی خلاف ورزی سمجھا جائے گا۔

اردو اکاڈمی

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، اردو زبان کے تحفظ اور اردو ادب کی ترقی و توسیع کے لیے اتر پردیش اردو اکاڈمی کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اکاڈمی کا افتتاح سابق وزیر اعلیٰ شری کملا پتی ترپاٹھی نے ۱۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کو کیا تھا۔ ریاست اتر پردیش جس طرح اردو زبان کو فروغ دینے کے معاملے میں پیش پیش رہی ہے اُسی طرح اکاڈمی کے قیام میں بھی اس ریاست نے پہل کی ہے۔

اکاڈمی کے اغراض و مقاصد میں ادبی اور علمی اہمیت کی طبع زاد یا مقبول عام تصانیف شائع کرنا، بچوں کے متعلق کتابیں شائع کرنا، مختلف موضوعات پر دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے کروانا، اردو کے مصنفین کو ان کے مسودوں کی اشاعت میں مدد دینا، بیمار، معذور اور ضرورتمند ادیبوں کو مالی امداد دینا، اردو کے اسکالروں کو اعلیٰ تحقیقی کام کے لیے سہولتیں فراہم کرنا، اردو کی ترقی سے متعلق سیمینار وغیرہ منعقد کرنے کے انتظامات کرنا، اردو کی طبع زاد کتابوں کے مصنفوں کو انعامات دینا، لائبریریوں اور مطالعہ گھروں کو اردو کتابیں، رسالے اور اخبار خریدنے کے لیے مالی امداد دینا وغیرہ شامل ہیں۔

اکاڈمی اس وقت تک تقریباً ایک لاکھ، ۵ ہزار روپے سارے ہندستان کے اردو مصنفوں کو ان کی تصانیف پر انعام منظور کر چکی ہے۔ اس کے علاوہ ۱۴۲ لائبریریوں اور مطالعہ گھروں کو ایک لاکھ ۳۰ ہزار سے زائد روپیہ تقسیم کیا جا چکا ہے اور ۲۷۰ لائبریریوں اور مطالعہ گھروں کو تقریباً ایک لاکھ روپیہ منظور ہو چکا ہے۔

اکاڈمی نے مختلف مصنفوں کو اب تک ان کے مسودات کی طباعت کے لیے تقریباً ۱۲ ہزار روپیہ منظور کیا ہے۔ بوڑھے، بیمار

اور ضرورت مند ادیبوں اور شاعروں کو علاج و معالجے کے لیے بھی اس وقت تک ۹ ہزار ۴ سو روپے اکاڈمی کی جانب سے منظور کیے جا چکے ہیں۔

اس کے علاوہ اکاڈمی نے ایک اشاعتی پروگرام بھی تیار کر لیا ہے۔ اس پروگرام کے تحت ۳ کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں کام بھی شروع ہو چکا ہے۔

اکاڈمی اردو تعلیم کے سلسلے میں حکومت کو برابر اپنی تجویزیں پیش کرتی رہتی ہے۔ حکومت ان میں سے بعض تجویزیں منظور بھی کر چکی ہے۔

یہ ہے اُن اقدامات کا ایک خاکہ جو اردو تعلیم کی ترقی اور اردو زبان و ادب کو فروغ دینے کے لیے موجودہ حکومت اترپردیش نے حال میں کیے ہیں۔ ذیل میں ان سہولتوں کا اختصار کے ساتھ ذکر کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا جو اس سے پہلے ریاستی حکومت اردو کے سلسلے میں دے چکی ہے۔

پرائمری اسکولوں میں ایڈوانس داخلہ رجسٹر

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ پرائمری اسکولوں میں کتنے طالب علم اردو پڑھنے کے خواہش مند ہیں، ہر پرائمری اسکول میں ایڈوانس داخلہ رجسٹر کھولے جا چکے ہیں جن میں ایسے بچوں کے نام نیا تعلیمی سال شروع ہوتے ہی درج کر لیے جاتے ہیں جو اردو میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ اس بات کی شکایت موصول ہوئی تھی کہ تعلیمی افسران ان ایڈوانس رجسٹروں کی جانچ مناسب ڈھنگ سے نہیں کرتے، اس لیے اس شکایت کو دور کرنے کے واسطے اسکولوں کے ڈپٹی انسپکٹروں اور سب ڈپٹی انسپکٹروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ لازمی طور سے ان رجسٹروں کا معائنہ کریں اور معائنے کی رپورٹوں میں اس بارے میں اپنی رائے دیں۔

اس کے علاوہ اردو پڑھنے والے بچوں کی مزید سہولت کے لیے داخلہ کے فارم میں مادری زبان کا بھی ایک کالم بڑھا دیا گیا ہے۔ اس سے اُس بچے کو جو اردو پڑھنا چاہے گا اردو پڑھنے کی سہولت دینے میں آسانی ہو جائے گی۔

ثانوی تعلیم میں اردو کی تعلیم کا بندوبست

پرائمری تعلیم کی طرح ثانوی تعلیم کی سطح پر بھی اردو کی تعلیم کے لیے سہولتیں موجود ہیں۔ سہ لسانی فارمولہ ریاست میں ۶۴-۱۹۶۳ء سے شروع کیا گیا۔ اس فارمولے کے تحت اگر ثانوی درجوں میں ۵ طالب علم بھی اختیاری زبان کے طور پر اردو پڑھنا چاہتے ہیں تو اس کا معقول بندوبست کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سہولت ہے کہ اگر شروع میں یہ تعداد پانچ سے کم ہے مگر یہ امید ہو کہ وہ تعداد بڑھ کر پانچ ہو جائے گی تب بھی اختیاری زبان کے طور پر اردو کی تعلیم کے لیے بدستور سہولتیں فراہم رہیں گی۔ علاوہ ازیں حکومت کی جانب سے یہ بھی احکامات جاری کیے گئے ہیں کہ پرائمری درجوں کی طرح ثانوی درجوں کے لیے بھی ایڈوانس داخلہ رجسٹر رکھے جائیں تاکہ کسی طالب علم کو اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے میں دقت نہ ہو۔

اس امر کے بھی احکامات موجود ہیں کہ اگر کسی اسکول کے ایک تہائی طالب علم اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا بندوبست کیا جانا چاہیے۔ اس وقت علی گڑھ میں ایسے اسکول ہیں جہاں ثانوی سطح پر اردو میڈیم سے تعلیم دی جاتی ہے۔

سرکاری اسکولوں میں تو یہ سہولتیں حاصل ہی ہیں حکومت نے تمام تسلیم شدہ غیر سرکاری سینیر بیسک اسکولوں اور ہائر سکنڈری اسکولوں میں بھی سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو کی تعلیم کی غرض سے اپنے خرچ پر مزید ٹیچروں کی تقرری کی ہے۔

اس اسکیم سے متعدد تعلیمی اداروں نے فائدہ اٹھا کر اپنے یہاں اردو پڑھانے کا مناسب انتظام کیا ہے۔

ہائی اسکول۔ انٹر اور یونیورسٹی کی سطح پر اردو کی تعلیم کا بندوبست

ریاست کے بہت سے گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکولوں اور انٹرمیڈیٹ کالجوں کے ساتھ ساتھ متعدد تسلیم شدہ غیر سرکاری ہائر سکنڈری اسکولوں اور کالجوں میں اردو کی تعلیم کی سہولت بطور ایک اختیاری مضمون کے مہیا ہے۔

اس کے علاوہ ایک سہولت یہ بھی حاصل ہے کہ جو طالب علم ہندوستان کے کسی دوسرے علاقے سے آکر اترپردیش میں آباد ہو گئے ہیں یا جن طالب علموں نے گھر پر تعلیم حاصل کی ہے وہ بورڈ آف

ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن اترپردیش کے امتحانات میں اپنے پرچوں کے جوابات اردو یا انگریزی میں دے سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں ریاست کی تمام یونیورسٹیوں میں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ درجوں میں بھی اردو کی تعلیم کا بندوبست ہے۔ گورنمنٹ کالج، رام پور میں بھی ایم۔ اے کے درجے تک اردو کی تعلیم کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔

عدالتوں اور سرکاری کاموں میں اردو کے لیے سہولتیں

فوجداری، دیوانی اور مال کی عدالتوں میں لوگ اپنی درخواستیں یا شکایتیں فارسی رسم خط میں پیش کر سکتے ہیں۔ ہندی کی طرح اردو میں بھی لکھی ہوئی ان درخواستوں پر کارروائی کی جاتی ہے۔

عدالتوں کی طرح رجسٹری کے دفتروں میں بھی اردو زبان میں دستاویزیں داخل کی جا سکتی ہیں۔

اس کے علاوہ حکومت اترپردیش نے دیوانی ملازمتوں میں اردو کا امتحان بھی پاس کرنا ضروری قرار دیا ہے۔ اس فیصلے کے تحت اب متعلقہ ایکٹ میں ترمیم کر دی گئی ہے اور اُسے یو پی کے سرکاری گزٹ میں بھی شائع کر دیا گیا ہے۔

اہم قوانین کی اردو میں اشاعت

ان سہولتوں کے ساتھ ساتھ اہم قوانین، قواعد اور سرکاری اعلانات وغیرہ کے خلاصے بھی اردو میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

سرکاری گزٹ کے خلاصے بھی اردو میں شائع کیے جاتے ہیں۔ گزٹ کی کاپیاں ریاست کے ان ضلعوں اور ۲۲ تحصیلوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی آبادی ۱۵ فی صد یا اُس سے زائد ہے، مطالعے کے لیے بآسانی دستیاب ہوتی ہیں۔

فہرست رائے دہندگان کی اردو میں اشاعت

اترپردیش کے ان ضلعوں اور تحصیلوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی آبادی ۱۵ فیصد یا اس سے زائد ہے، فہرست رائے دہندگان اردو میں بھی شائع کی جاتی ہے۔

اردو اخبارات کو سہولتیں

اردو اخبارات اور رسائل کو وہ تمام سہولتیں فراہم ہیں جو ہندی اخبارات اور رسالوں کو حاصل ہیں۔ اردو روزناموں کے علاوہ ہفتہ وار اخباروں کو بھی سرکاری اشتہارات دیے جاتے ہیں۔

محکمۂ اطلاعات اترپردیش کی طرف سے خبریں مضامین اور سرکاری اعلانات وغیرہ اردو اخباروں کو اردو میں بھیجے جاتے ہیں۔

شاعروں اور ادیبوں کو امداد

حکومت اردو کے ان مصنفوں کو بھی مالی امداد دیتی ہے جنھوں نے بحیثیت ادیب، شاعر اور نقاد اردو زبان کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں لیکن اب ان کے حالات علالت یا ضعیف العمری یا کسی اور وجہ سے سازگار نہیں رہے ہیں۔

اس کے علاوہ ایسے اردو ادیبوں اور شاعروں کو جو اپنی تخلیقات شائع نہیں کرا پاتے، حکومت کی جانب سے ان کی اشاعت کے لیے مالی امداد دی جاتی ہے۔

حکومت اترپردیش کے محکمۂ اطلاعات کی جانب سے شائع ہونے والے اردو ماہنامہ نیا دور میں جو مضامین، نظمیں، غزلیں اور افسانے شائع ہوتے ہیں ان کے لکھنے والوں کو معقول نذرانہ دیا جاتا ہے۔

اردو مصنفین کو انعامات

اترپردیش کا محکمۂ تعلیم ہر سال اردو مصنفین کو ان کی معیاری کتابوں پر انعامات دیتا ہے۔ پہلا انعام "غالب انعام" کے نام سے موسوم ہے۔ دوسرے اور تیسرے انعامات بالترتیب "اکبر الہ آبادی" "شبلی" انعامات کہلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ متفرق انعامات بھی دیے جاتے ہیں۔ محکمہ قومی یک جہتی کی جانب سے اردو کی ایسی معیاری کتابوں پر بھی انعامات دیے جاتے ہیں جن میں قومی یک جہتی اور حب الوطنی کے جذبات پر زور دیا گیا ہو۔

لائبریریوں اور ریڈنگ روموں کو بھی اردو کی مفید کتابوں، رسالوں اور اخباروں کی خریداری کے لیے مالی امداد دی جاتی ہے۔

مذکورۂ بالا حقائق سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ اردو زبان کی ترقی اور نشو و نما کے لیے حکومت اترپردیش تمام ضروری اقدامات کر رہی ہے اور اس کے پھلنے پھولنے کے [illegible] تمام سہولتیں فراہم کر رہی ہے۔

★

وزیراعظم شریمتی اندراگاندھی، شاہ وملکۂ نیپال کا دہلی ہوائی اڈے پر استقبال کر رہی ہیں

پروفیسر نورالحسن، مرکزی وزیرِ تعلیم، غالب اکاڈمی کی ایک تقریب میں
اردو ٹائپنگ ٹریننگ سنٹر کا افتتاح کرتے ہوئے

گورنر اترپردیش شری اکبر علی خاں اموسی ہوائی اڈے پر

گورنر اترپردیش شری اکبر علی خاں اقبال لائبریری کانپور میں
ڈاکٹر اقبال
کے صد سالہ یوم پیدائش کی تقریبات کا افتتاح کر رہے ہیں

اسٹیڈیم میں دوسرے عالمی ہاکی کپ کے سیمی فائنل میچ میں ہندستان پاکستان کے درمیان

ندھیہ دیولوی کا استقبال کرتے ہوئے

لکھنؤ میں بوڑھوں کو اعزاز دینے کی کمیٹی کے زیر اہتمام گذشتہ ۸ ستمبر کو ایک جلسے میں ۱۱۹ سالہ شریمتی جے دیوی کو گورنر شری اکبر علی خاں ایک شال پیش کر رہے ہیں۔ قریب ہی دوسرے معمر شری محمد سلیمان (۱۱۶ برس) بھی بیٹھے ہیں۔

ہندوستان نے صفر کے مقابلے میں ایک گول سے پاکستان کو ہرا دیا

اوپر: پاکستانی فوجی افسر پاکستان میں داخل ہونے سے قبل ہندستانی افسرانِ فوج کو الوداع کہتے ہوئے۔
نیچے: پاکستانی جنگی قیدیوں کی تیسری کھیپ کے کچھ قیدی جو واگھا چیک پوسٹ پر پاکستان کے حوالے کیے گئے۔

گلاب اور جواہر

شاداں بارہ بنکوی

گلِ سرخ میں رنگ پاسِ حیا ہے
گلِ سرخ سے اس کا اک واسطا ہے
گلِ سرخ کا وہ فدائی رہا ہے
گلِ سرخ میں اس کا جذبہ چھپا ہے
گلاب اس کے جذبات کا ترجماں ہے
گلاب اس کی عظمت کا زندہ نشاں ہے
گلاب اس سے ہٹ کر تو برگِ خزاں ہے
گلاب اس کے سینے سے لگ کر جواں ہے
گلاب اس کے ہر فعل ہر فن سے واقف
گلاب اس کے گھر اس کے آنگن سے واقف
گلاب اس کے تیور سے چتون سے واقف
گلاب اس کے سینے کی دھڑکن سے واقف
گلِ سرخ کوئی ملے تو یہ پوچھوں
تجھے چوم لیتا تھا تنہائی میں کیوں
وہ تھا کون سا کرب جس کے لیے یوں
وہ رہتا تھا ہر وقت بیتاب و محزوں
گلِ سرخ تو امن کا اک نشاں تھا
کہ نہرو کے جذبات کا ترجماں تھا
شہیدوں کا خوں اس کے دل میں جواں تھا
جواہر اسی واسطے مہرباں تھا
گلاب اس زمیں کا گلِ اولیں ہے
جو کانٹوں میں رہ کر بھی اتنا حسیں ہے
گلاب اس کی انسانیت کا امیں ہے
گلاب آج بھی دور اس سے نہیں ہے
شباب چمن ہے شبابِ جواہر
کہ موسم ہوا فیضیابِ جواہر
خزاں اب نہ آئے گی صحنِ چمن میں
مہکتا رہے گا گلابِ جواہر

تازہ گلاب ابھرے گا

مہند کشن پرتاب گڑھی

غنچہ اک چودہ نومبر کی سنہری ساعت
مادرِ ہند کی دامن کا بنا تھا زینت
ہو گئی نقش ہر اک ذہن پہ جس کی عظمت
انقلابات کی حامل بنی جس کی سیرت
پھول جب بن کے ہوا صحنِ چمن میں رقصاں
ارضِ ہستی کا ہر گوشہ ہوا عطر فشاں
اس کی کاوش پہ تھے اربابِ سیاست حیراں
اس کی فطرت سے تھی افرنگ کی قوت لرزاں
پھول وہ جس میں نمایاں رہا اخلاص کا رنگ
جس کی خوشبو سے ابلتا رہا یک جہتی کا ڈھنگ
جس کی فطرت میں نہ تھا بغض نہ نفرت تھی نہ جنگ
جس کے سینے میں مچلتی تھی محبت کی امنگ
اس کی بو امن کا پیغام سناتی گزری
خوابِ خرگوش سے انساں کو جگاتی گزری
دل میں آزادی کی قندیل جلاتی گزری
نفرت و بغض کی لعنت کو مٹاتی گزری
جیتے جی اسی سے معطر رہا دامانِ چمن
اس کی خوشبو سے شگفتہ رہے اربابِ وطن
مر کے بھی اس نے نہیں چھوڑا دفاؤں کا چلن
خاک اس کی ملی کشمیر سے تا ارضِ دکن
پھر اسی خاک سے اک تازہ گلاب ابھرے گا
ایک دن پھر اسی دھرتی کا شباب ابھرے گا

چار گرہ کپڑا

(غالبؔ کے ایک شعر پر گفتگو)

ڈاکٹر نیر مسعود

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

بیخود موہانی نے اس شعر کا مطلب یہ بیان کیا ہے:

اس چار گرہ کپڑے کی قسمت پر افسوس آتا ہے جسے عاشق کا گریبان بننا پڑے۔ وصال میں بیتابیِ شوقِ عاشق و شوخیِ معشوق اور فراق میں شوریدگیِ عاشق اس کے پرزے اڑا دے گی۔"

اور یہ مفہوم دراصل نظم طباطبائی کی اس شرح کی بازنوشت ہے:

"یعنی اگر ہجر ہے تو وہ [عاشق] آپ چاک کرے گا اور اگر وصل ہے تو شوخیِ معشوق کے ہاتھوں پر پرزے اڑ جائیں گے۔"

دوسرے شارحین بھی اسی مفہوم کی تکرار کرتے ہیں کہ ہجر کے علاوہ وصل میں بھی عاشق کے گریبان کو (معشوق یا خود عاشق کے ہاتھوں)، چاک ہونا پڑے گا۔ ہجر میں تو عاشق کی گریبان دریدگی سمجھ میں آتی ہے لیکن وصل میں، اور وہ بھی معشوق کے ہاتھوں، عاشق کے گریبان کی دھجیاں اڑنا عجیب سی بات ہے۔ شارحین نے اس پر غور نہیں کیا کہ اس طرح معشوق شوخی سے کہیں آگے بڑھ کر جنسی دیوانگی کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ غالباً لفظ "قسمت" کی تکرار کے جواز کی فکر نے شارحین کو اس پر مائل کیا ہے کہ وہ ہجر کے علاوہ وصل میں بھی عاشق کے گریبان کو تار تار ہوتے دکھائیں۔

حقیقتاً شعر کی اس تاویل اور وصل کے ذکر کو بیچ میں لانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جب شاعر نے "عاشق کا گریباں" کہہ دیا تو چاک ہونے کا تصور از خود اس کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس شعر میں لفظ "قسمت" کی تکرار بہت نمایاں طور پر غیر ضروری معلوم ہو رہی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس میں بھی شک نہیں کہ کسی نہ کسی وجہ سے لفظ "قسمت" کا استعمال اس شعر کے دونوں مصرعوں میں ضروری ہے، ورنہ غالبؔ کا کیا ذکر، دوسرے تیسرے درجے کا شاعر بھی کسی ایک مصرعے میں سے یہ لفظ بہ آسانی نکال سکتا تھا۔ آیئے دیکھیں کہ غالبؔ نے کس مصلحت سے اس لفظ کو دوبارہ استعمال کیا ہے۔

پہلے یہ دیکھا جائے کہ شعر کے مفہوم کو نثر میں کیونکر ادا کیا جا سکتا ہے۔ نثر میں یہ مفہوم دو طرح سے ادا ہوتا ہے:

(الف) اے غالب! حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت جسے عاشق کا گریبان ہونا پڑے۔

(ب) اے غالب! حیف وہ چار گرہ کپڑا جس کی قسمت میں عاشق کا گریبان ہونا لکھا ہو۔

آپ نے دیکھا کہ دونوں نثری صورتوں میں لفظ "قسمت" کا

صرف ایک ہی بار استعمال کافی ثابت ہو رہا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنے میں جلدی نہ کیجیے کہ شعر میں کسی ایک جگہ "قسمت" کا لفظ حشو ہے۔ دونوں نثری صورتوں پر غور کیجیے۔ پہلی صورت میں یہ لفظ وہاں پر ہے جہاں پر شعر کے پہلے مصرعے میں ہے۔ دوسری صورت میں یہ لفظ وہاں پر ہے جہاں پر شعر کے دوسرے مصرعے میں ہے۔ اور مفہوم کے اعتبار سے دونوں صورتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہیں سے اس لفظ کے حشو میں شک پڑنا شروع ہو گیا۔ حشو وہ لفظ ہوتا ہے جس کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکے کہ یہاں پر یہ لفظ بلا ضرورت ہے۔ اس شعر کے لفظ "قسمت" میں یہ یقین حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن یہ دلیل قائل کر سکتی ہے، مطمئن نہیں کرتی، اس لیے کہ اب بھی اس لفظ کی تکرار غیر ضروری معلوم ہوتی ہے، اگرچہ یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ یہ لفظ کس مصرعے میں غیر ضروری ہے۔

اب آئیے یہ بھی دیکھ لیں کہ کیا دونوں مصرعوں میں لفظ "قسمت" کا مفہوم بالکل یکساں ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ لفظ یقیناً حشو ہے اور اس کی تکرار غیر ضروری اور عیب ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو حشو و تکرار کا الزام درکنار، شاعر اس قند مکرر پر خصوصی داد کا مستحق ٹھہرے گا۔

دونوں مصرعوں اور ان کی متبادل نثری صورتوں کو ایک بار پھر پڑھیے:

(الف) حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
(اے غالب! حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت)
(ب) جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا
(جس کی قسمت میں عاشق کا گریبان ہونا لکھا ہو)

اب دونوں جگہ لفظ "قسمت" پر غور کیجیے:

(الف) دوسرے مصرعے میں اس کپڑے کی قسمت کا تعین کر دیا گیا ہے، وہ یہ کہ اس کی قسمت میں عاشق کا گریبان ہونا لکھا ہے

(ب) پہلے مصرعے میں قسمت کا تعین نہیں ہے، بس "حیف" کے لفظ کی وجہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آئندہ اس کی قسمت اچھی نہیں ہے یعنی دوسرے مصرعے میں اس کپڑے کی قسمت (عاشق کا گریبان ہونا) صراحتاً معلوم ہے، اس لیے کہ "قسمت" کا یہ لکھا سامنے آ چکا ہے اور وہ کپڑا عاشق کا گریبان بن چکا ہے۔

پہلے مصرعے میں اس کپڑے کی قسمت یقین کے ساتھ نہیں معلوم اس لیے کہ اس مصرعے میں "قسمت" کا تعلق مستقبل سے ہے جو تاریکی میں رہتا ہے۔

کیا خود قسمت کی صورت حال بعینہٖ یہی نہیں ہے؟ یقیناً مفہوم کے اعتبار سے قسمت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ قسمت جو سامنے آ چکی ہو، جس کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے اور اسی لیے اس قسمت کا حال چھپا نہیں ہوتا۔ ایک وہ قسمت جو ابھی سامنے نہیں آئی ہے، جس کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے، اس لیے اس کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، صرف اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً کسی نابینا پیدا ہونے والے بچے کے بارے میں یہ تو بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ اس بچے کی قسمت میں نابینا پیدا ہونا تھا لیکن ابھی اس نابینا بچے کی قسمت میں اور کیا کیا ہے، اس کے بارے میں صرف قیاس آرائی ہی کی جا سکتی ہے۔

(۱)

غالب کے اس شعر میں لفظ "قسمت" کی تکرار کا راز یہی ہے۔ ایک قسمت ماضی سے متعلق ہے، ایک مستقبل سے۔ یہ تو معلوم ہے کہ اس چار گرہ کپڑے کی قسمت میں عاشق کا گریباں ہونا تھا، لیکن اب اس عاشق کے گریبان کی قسمت میں کیا ہے، اس کے بارے میں صرف قیاس کیا جا سکتا ہے (مثلاً جنون کی ہر لہر کے ساتھ عاشق کے ہاتھوں چاک ہونا، چارہ سازوں کے ہاتھوں رفو ہونا، پھر چاک ہونا، پھر رفو ہونا . . .) اور ہر قیاس کا محور یہی ہوگا کہ عاشق کا گریبان بننے کے بعد، بلکہ عاشق کا گریبان بننے کی وجہ سے، اس کپڑے پر کیا کیا گزر سکتی ہے۔

(۲)

لیکن اس بالکل سیدھے سے شعر میں بھی صرف "قسمت" کا پھیر نہیں ہے۔ اس میں بھی ایک سے زیادہ مفہوم نکلتے ہیں۔ شعر کا دوسرا مفہوم دیکھیے:

اوپر بیان ہونے والے مفہوم میں ہم نے دیکھا کہ پہلے مصرعے میں "قسمت" کے لفظ سے مستقبل مراد ہے اور دوسرے مصرعے میں ماضی۔ ذکر ماضی یہ ہے کہ اس چارگرہ کپڑے کی قسمت میں عاشق کا گریبان ہونا تھا۔ مستقبل کا حال نہیں معلوم کہ اب عاشق کا گریبان بننے کے بعد اس کی قسمت کیا ہے۔ مگر شعر کا دوسرا مفہوم نہ صرف یہ کہ اس مفہوم کو ایک لحاظ سے برعکس کر دیتا ہے بلکہ بڑے عجیب انداز میں مستقبل کا حال بھی بتا دیتا ہے، اور عجیب تر یہ کہ مستقبل کا حال بتاتا بھی ہے اور نہیں بھی بتاتا۔

اور یہ نہ سمجھیے کہ اس دوسرے مفہوم تک پہنچنے کے لیے ہمیں کوئی پُرپیچ راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ حقیقت میں یہ راستہ پہلے مفہوم تک پہنچنے کے راستے سے زیادہ آسان ہے اور وہ راستہ یہ ہے:

پہلا مفہوم مختصراً ایک بار پھر دہرا لیا جائے:

(الف) دوسرے مصرعے میں "قسمت" سے مراد ماضی کا حال ہے۔

(ب) پہلے مصرعے میں "قسمت" سے مراد مستقبل کے واقعات ہیں۔

لیکن آپ خود ہی دیکھ رہے ہیں کہ

(الف) دوسرے مصرعے میں "عاشق کا گریبان" کہا گیا ہے۔

(ب) پہلے مصرعے میں جس کا تعلق مستقبل سے ہے "چارگرہ کپڑے" کا ذکر ہے۔

نتیجہ بھی آپ خود ہی نکال سکتے ہیں:

(الف) یہ معلوم ہی ہے کہ اس کپڑے کی قسمت میں عاشق کا گریبان ہونا تھا۔

(ب) یہ بھی معلوم ہے کہ مستقبل میں عاشق کا گریباں، گریبان نہ رہے گا، چارگرہ کپڑا رہ جائے گا (عاشق اپنے گریبان کو سلامت نہ رہنے دے گا)۔

(ج) مگر یہ نہیں معلوم کہ اس کے بعد اس چارگرہ کپڑے پر اور کیا کیا گزرے گی۔

(۳)

ظاہر ہے کہ "چارگرہ" کوئی مقررہ ناپ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد کپڑے کا ایک معمولی سا ٹکڑا ہے۔ شعر کے پہلے اور دوسرے مفہوم کی مدد سے تیسرے مفہوم کی طرف ذہن جاتا ہے:

کپڑے کا ایک معمولی سا ٹکڑا عدم سے وجود میں آتا ہے، قطع و برید اور خیاطی کے مراحل سے گزرتا ہوا تکمیل اور اپنی شناخت (گریبان ہونا) کی منزل تک پہنچتا ہے، اور دوبارہ انھیں اپنے مراحل سے ملتے جلتے چاک و رفو کے مراحل سے گزرتا ہوا وہ پھر اپنی شناخت کھو دیتا ہے اور کپڑے کا ایک معمولی سا ٹکڑا رہ جاتا ہے۔ کیا وہ عدم کی طرف واپس جا رہا ہے؟ یہ حقیقتاً چارگرہ کپڑا ہے یا کوئی علامت جو عدم، وجود، کمال، زوال، عدم کی منزلوں کا سراغ دیتی ہے؟

کیا اس کی تکمیل اور شناخت ہی اس کے انجام کا آئینہ بھی ہے؟

اور اس ابتدا و انتہا کی توجیہہ کیا ہو سکتی ہے؟

قسمت، قسمت!

(۴)

اور ان سب مفاہیم کی طرف رہنمائی اسی سے ہوتی ہے کہ اس شعر میں "قسمت" کا لفظ دو بار آیا ہے۔ کیا اب بھی آپ غالب کو اس قند مکرر کی داد نہ دیں گے؟

لیکن اس داد دینے میں خود اس کو فراموش نہ کریں جس کے گریبان کی قسمت کا یہ حال ہے، کیونکہ یہ شعر چارگرہ کپڑے کے پردے میں خود اس کی قسمت پر بھی غور کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔

★

ایشیا کے رہبرِ اعظم تجھے میرا سلام

ثمر بسوانی

اپنی ماتا کا دُلارا باپ کا نورِ نظر دیش کی جانِ تمنا قوم کا قلب و جگر
پیار تیری عرفیت ہے عشق تیرا اصل نام
ایشیا کے رہبرِ اعظم تجھے میرا سلام

تُو نے آنے دی کسی پر بھی نہیں گردِ ملال ہائے تجھکو تھا مفادِ قوم کا کتنا خیال
دیش میں رائج کیا ہے تو نے جمہوری نظام
ایشیا کے رہبرِ اعظم تجھے میرا سلام

ذات تیری عقل و دانش علم و حکمت کی کتاب بات تیری خوبصورت بے نظیر و لاجواب
تُو مقنن تُو مدبّر تو سیاست کا امام
ایشیا کے رہبرِ اعظم تجھے میرا سلام

انبساطِ رُوح بھی ہے اور لُطفِ جانِ جسم کامیاب کامران ہے آج تیرا سوشلزم
ارتقا کی منزلوں پر گامزن ہیں خاص و عام
ایشیا کے رہبرِ اعظم تجھے میرا سلام

تُو محبت کا مُفسّر، آشتی کا راہبر امنِ عالم کا مُبلّغ صُلح کا پیغامبر
خدمتِ انسانیت تھا تیرا شیوہ تیرا کام
ایشیا کے رہبرِ اعظم تجھے میرا سلام

خضر بن کر راہ بتلاتا ہے تیرا سنگِ میل رہنمائے عالمِ انسانیت ہے پنچ شیل
تو نے دنیا کو دیا ہے زندگانی کا پیام
ایشیا کے رہبرِ اعظم تجھے میرا سلام

غمگسارِ نسلِ آدم، حامیِ نوعِ بشر چارۂ قلبِ مریضاں مرہمِ زخمِ جگر
نیک خصلت نیک طینت نیک نیت نیک نام
ایشیا کے رہبرِ اعظم تجھے میرا سلام

شیخ ہو یا برہمن ہو ہر کسی سے پیار تھا اتحادِ باہمی کا تو علمبردار تھا
ذات سے تیری اخوت کی ہوئی ہے رسم عام
ایشیا کے رہبرِ اعظم تجھے میرا سلام

ظلم و استبداد سے تو برسرِ پیکار تھا جنگِ آزادیِ بھارت کا سپہ سالار تھا
نازِ تاریخِ وطن ہے تیری تیغِ بے نیام
ایشیا کے رہبرِ اعظم تجھے میرا سلام

عالمی اقوام کا تو یار تھا غمخوار تھا یہ بنامِ جنگ جوئی غیر جانبدار تھا
یہ اُصولِ خاص تیرا آج ہے مقبولِ عام
ایشیا کے رہبرِ اعظم تجھے میرا سلام

تیرے ایثار و عمل سے ہم کو آزادی ملی غم نصیبانِ وطن کو دولت و شادی ملی
مالکانِ تاجِ زرّیں ہیں فرنگی کے غلام
ایشیا کے رہبرِ اعظم تجھے میرا سلام

ساری دنیا جانتی ہے تجھکو معمارِ وطن ذکر تیرا ہو رہا ہے انجمن در انجمن
تجھ کو حاصل ہو چکی ہے دولتِ حسنِ دوام
ایشیا کے رہبرِ اعظم تجھے میرا سلام

جواہر لال نہرو

کرنل ایم۔ ایس۔ راؤ

کرنل ایم۔ ایس۔ راؤ پنڈت جواہر لال نہرو کے ذاتی معالج تھے۔ اس مضمون میں انھوں نے پنڈت جی کی زندگی سے متعلق اپنے کچھ ذاتی تاثرات بیان کیے ہیں

پنڈت جواہر لال نہرو کے سکریٹریٹ نے ۱۹۵۲ء میں مجھے تین مورتی ہاؤس میں پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے گھر کے تمام افراد کا ذاتی ڈاکٹر بننے کی دعوت دی۔ اس بات نے میرے اندر ذمہ داری کا گہرا احساس پیدا کیا۔ یہ تقرر جہاں میرے لیے باعث فخر تھا وہاں آرمڈ فورسز میڈیکل سروس کے لیے بھی باعث افتخار تھا۔

پھر یہ بات جلد ہی واضح ہو گئی کہ ان کے ساتھ میرا نباہ بآسانی ہو سکے گا کیونکہ ہم دونوں کے کردار و اطوار میں متعدد مغربی اوصاف موجود تھے۔ ہم دونوں نے ہی ایک دوسرے کو پسند کیا اور ہمارا وقت مزے میں گزرنے لگا۔

تقریباً دس سال تک مجھے پنڈت جی کے خاندان کے افراد کے لیے بہت کم طبی فرائض انجام دینے پڑے۔ اس عرصے میں میں نے زیادہ تر معمولی بیماریوں کا علاج کیا۔ جب وہ لوگ غیر ممالک کے دورے پر روانہ ہوتے تھے تو میری نگرانی میں انھیں ہیضے اور چیچک وغیرہ کے ٹیکے لگائے جاتے تھے۔

میں نے اپنی تقرری کے بعد جلد ہی یہ محسوس کیا کہ پنڈت جی دواؤں حتیٰ کہ ٹانکوں اور وٹامن کی گولیوں کو بھی ناپسند کرتے ہیں۔ انھیں اپنی شاندار صحت پر بجا طور پر بہت فخر تھا۔ لیکن اس کے باوجود جب کبھی میں نے انھیں بتایا کہ دوا استعمال کرنا ان کے لیے بے حد ضروری ہے تو انھوں نے میرے مشورہ پر عمل کیا۔

پنڈت جی کی گوناگوں شخصیت کا بیان بہت مشکل کام ہے البتہ میں اپنے صرف چند ذاتی تجربے تحریر کر رہا ہوں جن سے یہ اندازہ ہوگا کہ ایک قومی اور بین الاقوامی شخصیت ہونے کے باوجود وہ اپنے اسٹاف کے ممبران کی ذاتی بہبود اور آرام کا کتنا خیال رکھتے تھے۔

پنڈت جی وقت کی پابندی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ان کی زندگی کے آخری برسوں میں یا میرے کسی ساتھی کو ہر اتوار کو صبح سات بجے ان کا طبی معائنہ کرنا ہوتا تھا۔ ہم لوگ ان کی خوابگاہ میں مقررہ وقت سے پانچ منٹ قبل پہنچ جاتے تھے اور پنڈت جی گرمی ہو یا جاڑہ ٹھیک سات بجے آجاتے تھے۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ وہ کبھی ایک منٹ بھی دیر سے آئے ہوں۔

اگر کسی سبب سے انھیں وقت پر پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو وہ بے حد ناخوش نظر آتے تھے۔ ایک بار جب کہ وہ کسی غیر ممالک کے دورے پر جا رہے تھے تو انھوں نے ٹیکے وغیرہ لگوانے کے لیے سات بجے شام کا وقت

دیا۔ لیکن ایک شادی کی تقریب میں ان کے بے شمار مداحوں نے انھیں
گھیر لیا اور وہاں انھیں کچھ زیادہ دیر تک ٹھہرنا پڑا۔ لیکن انھوں نے
وہیں سے ہمیں دو بار فون کیا اور تاخیر کے لیے معذرت مانگی۔ آخرش
جب وہ ساڑھے سات بجے ہمارے پاس پہنچے تو انھوں نے ایک بار
پھر معذرت کا اظہار کیا۔

جب میں ہندی بولتا تھا تو وہ مجھے چھیڑا کرتے تھے اور اکثر کہا
کرتے تھے کہ "کبھی کرنل راؤ کی شستہ ہندی ضرور سنیں گے"۔ اس کے
بدلے میں میں بھی زیادہ سے زیادہ سنسکرت کے الفاظ سے بوجھل ہندی
استعمال کرتا تھا۔ پنڈت جی اس بات سے بڑے محظوظ ہوتے تھے۔

ایک بار اپنے خاندان کے افراد کی موجودگی میں انھوں نے مجھے
چند ایسی ورزشوں کے مظاہرے کر کے دکھائے جن پر عمل کرنے سے چہرہ
موٹا نہیں ہوتا تھا۔ ان ورزشوں میں زیادہ تر زبان کا باہر نکالنا اور طرح
طرح کے چہرے بنانا شامل تھا۔ ہم لوگ ان کے اس مظاہرے سے
کافی لطف اندوز ہوئے۔

لگاتار کام کرنے کی ان کی صلاحیت حیرت انگیز تھی۔ ایک
بار میں ان کے ساتھ ہوائی جہاز سے شانتی نکیتن جا رہا تھا۔ شروع
میں انھوں نے چند بحث طلب جملے کہے۔ لیکن اس کے بعد وہ بیرونی ملک
کے اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے اور لگاتار چار گھنٹے تک ان کا
مطالعہ کرتے رہے۔ یہ وہ وقت تھا جب ہماری مسلح فوجیں گوا کی
کارروائی میں مصروف تھیں۔

پنڈت جی کو جنگ آزادی کے اپنے دیرینہ ساتھیوں سے گہرا
لگاؤ اور ربط تھا۔ کم از کم دو موقعوں پر مجھے اس بات کا احساس ہوا
تھا۔ جب مولانا آزاد موت و حیات کی کشمکش سے گزر رہے تھے۔
اور ہم نے اعلان کیا کہ مولانا صاحب کے بقید حیات رہنے کی
کوئی امید نہیں تو ہم نے دیکھا کہ پنڈت جی لوگوں سے دور ایک
کونے میں چلے گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ رومال سے
انھیں پونچھ رہے تھے۔ اس واقعہ سے اس بات کا اندازہ آسانی سے
لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا مرحوم کی بیماری کے دوران انھیں کن پریشانیوں
اور فکر و تردد سے گزرنا پڑا تھا۔ پنڈت پنت کی موت کے وقت
بھی ان پر اسی کیفیت کا غلبہ تھا۔

ہم جب بھی کبھی کسی اعلیٰ شخصیت کے علاج میں مصروف
ہوتے تھے تو پنڈت جی ہمارے آرام و سہولت کا بڑا خیال رکھتے
تھے۔ انھیں ہمارے کھانے پینے کی بھی بڑی فکر رہتی تھی اور حقیقتاً ایک
دو بار انھوں نے اپنے گھر سے ہمیں گرم دودھ اور سینڈوچ بھی بھجوائے تھے۔

آپ بڑے ہی روادار اور بامروت واقع ہوئے تھے۔ دوسروں
کی کمزوریوں کو ہمیشہ نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ ان کے ایک پرسنل
اسسٹنٹ نے مجھے ایک بڑا ہی پر اثر واقعہ سنایا۔ جاڑے کی
ایک رات کو کافی دیر تک وہ اپنے پی۔ اے کو ڈکٹیشن دیتے رہے۔
اس کے بعد وہ اپنی خوابگاہ میں سونے کے لیے چلے گئے لیکن وہ آفس
میں کچھ ضروری چیز بھول گئے تھے۔ چنانچہ جب ان کو یاد آیا تب فوراً
ہی وہ اسے لینے آفس واپس آئے۔ یہاں انھوں نے دیکھا کہ پی۔ اے
گہری نیند سو رہا ہے۔ ظاہر تھا کہ وہ کام کرتے کرتے بہت تھک گیا تھا
اس لیے اسے فوراً نیند آ گئی تھی۔ وہ اپنی خوابگاہ میں واپس گئے اور وہاں
سے ایک کمبل لا کر اس پر ڈال دیا تاکہ اسے سردی نہ لگے۔ جب بعد میں
ان کے پی۔ اے کی آنکھ کھلی تو وہ سخت پریشان ہوا۔ اس نے سوچا کہ
پنڈت جی بے حد خفا ہوں گے۔ مگر انھوں نے اپنے پی۔ اے سے کبھی بھی
اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی۔

لوگوں نے زیادہ تر ان کی تند مزاجی کے واقعات ہی سنے ہیں لیکن
جب پنڈت جی کو اس بات کا احساس ہو جاتا تھا کہ دوسرا شخص صحیح
کہہ رہا ہے تو وہ فوراً اپنی تیز مزاجی کی تلافی کر دیا کرتے تھے۔ ۱۹۶۲ء میں جب
وہ الیکشن کے سلسلے میں بھارت کے دور دراز علاقوں کے دورے
پر جا رہے تھے تو میں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ ایک ڈاکٹر اپنے ساتھ
لے جائیں۔ اس بات پر ان کا ردعمل شدید تھا۔ لیکن جب میں نے
انھیں یہ بتایا کہ جس طرح حفاظتی اشخاص کا کام ان کی زندگی کی حفاظت
کرنا ہے اسی طرح ہمارا فرض ان کی صحت کا خیال رکھنا ہے۔ یہ بات
ان کی سمجھ میں آ گئی اور انھوں نے مجھے کافی پر مدعو کیا۔ اپنے دورے
پر وہ اپنے ہمراہ کسی ڈاکٹر کو نہیں لے گئے۔ جس کے نتیجے میں بدقسمتی

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

میرے ہندوستاں میرے پیارے وطن

حضورؔ سہوانی

میرے ہندوستاں، میرے پیارے وطن
تیری کانوں سے دھاتیں نکلتی رہیں
تیری مٹی اگلتی رہے سیم و زر
تیرا ہر کھیت کیسر اگاتا رہے
ہوں فضا میں تری خوشبوئیں سربسر

سر ابھارے رہیں تیرے پربت یوں ہی
تیرے دریا یونہی گنگناتے رہیں
موتیوں سے رہیں پُر سمندر ترے
تیرے دامن میں گل مسکراتے رہیں

تیری چھاتی سے چشمے اُبلتے رہیں
تیرے جھرنوں کی لے اور بھی تیز ہو
تیرے تن میں مہکتی رہیں خوشبوئیں
چپّہ چپّہ ترا اور گل ریز ہو

مسکراتے رہیں تیرے دشت و جبل
پھول کھلتے رہیں برف گرتی رہے
تیرے آنگن میں چھٹکی رہے چاندنی
ساری دنیا تجھے نور کا گھر کہے

وادیاں تیری سرسبز و شاداب ہوں
تیرے گلشن ہمیشہ مہکتے رہیں
آئے ہر سمت سبزہ ہی سبزہ نظر
کھیت تیرے یونہی بس لہکتے رہیں

حُسن تیرا نکھرتا رہے روز و شب
کھنچتا ہی رہے دل، ترا بانکپن
تیری رعنائیاں اور بھی ہوں سوا
دلربا اور بن جائیں تیرے چلن

تیری مٹی میں چاندی کی بہتات ہے
تیرے ذرّوں کی ضو روز بڑھتی رہے
دُور ہو جائیں نفرت کی تاریکیاں
شمعِ الفت کی لو روز بڑھتی رہے

دم زمانہ تری دوستی کا بھرے
گُن وفا کے تری گائیں اہلِ جہاں
نیک نامی میں آئے نہ کوئی کمی
تو ہمیشہ رہے بے نیازِ خزاں

تو ابد تک پیامی رہے امن کا
تا قیامت نہ بدلے ترا یہ چلن
لوگ کہتے رہیں تجھ کو دارالاماں
تو ہمیشہ رہے دوستی پر مگن

تجھ سے دشمن یونہی سہمے سہمے رہیں
جنگ سے تیرا دامن رہے پاک تر
بال بیکا نہ تیرا کوئی کر سکے
تجھ پہ پڑنے نہ پائے کوئی بد نظر

تیرے متوالے پی کر مئے حرّیت
گیت جمہوریت کے سُناتے رہیں
رہ کے غرقابِ بحرِ مسرّت میں خود
سارے اہلِ وطن کو ہنساتے رہیں

ہونے پائے نہ ہرگز بھی غم کا گزر
تیرے باسی یونہی مسکراتے رہیں
شیر، بکری رہیں ایک ہی گھاٹ پر
گیت اخوّت کے سب گنگناتے رہیں

جدید ہندستان کا

معمار اعظم نہرو

احمد ابراہیم علوی

کسی محکوم ملک کو آزادی حاصل کرنے کے بعد کتنے سنگین مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا احساس ہندستان کے ہر با شعور اور ذی علم انسان کو تھوڑا بہت تو ضرور ہی ہے کیونکہ ہندستان جو کسی زمانے میں اپنی خوشحالی اور دولت کے سبب "سونے کی چڑیا" کہلاتا تھا۔ جب برسہا برس کی جدوجہد کے بعد ہی ہندستان انگریزوں کے چنگل سے آزاد ہوا تو جیسے یہاں کچھ بھی نہ تھا بس ہر طرف بھوک، افلاس، پس ماندگی اور جہالت کا بول بالا تھا جس طرح بھی غیر ملکی حکمراں یہاں کے مال و متاع کو لوٹ سکتے تھے، انھوں نے لوٹا تھا ان کا مقصد ہی یہ تھا کہ جب وہ یہاں سے بدرجہ مجبوری جائیں تو اس جنت کو جہنم بنا جائیں تاکہ یہاں کے رہنے بسنے والے برسوں اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ قوموں کی ہمسری نہ کر سکیں۔ اگر ہندستان کو پنڈت جواہر لعل نہرو جیسا با تدبیر اور ہوشمند حکمراں، وزیر اعظم کی صورت میں نہ ملا ہوتا تو یقیناً آج ہندستان کی وہی کیفیت ہوتی جس کا منصوبہ غیر ملکی حکمرانوں نے بنایا تھا۔

پنڈت جواہر لعل نہرو ہندستان کی جدوجہد آزادی میں ہمیشہ پیش پیش رہے تھے اس لیے انھوں نے بہت پہلے ہی آزادی کے بعد رونما ہونے والے مسائل کا اندازہ کر لیا تھا بلکہ اس کے حل کے لیے ایک بہت ہی واضح لائحہ عمل بھی ذہن میں محفوظ کر لیا تھا آزادی کے بعد جب ان کو وزیر اعظم بننے کا فخر حاصل ہوا تو ان کو اپنے سوچے سمجھے منصوبے پر عمل کرنے کا زیادہ بہتر موقع مل سکا۔

پنڈت نہرو کی مدبرانہ قیادت ہندستان کی تعمیر نو میں جتنی ممد و معاون ثابت ہوئی اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ملک تقریباً ایک صدی کی غلامی کے بعد آزادی حاصل کرتے ہی دنیا کی نظروں میں چڑھ گیا۔ نہرو نے کامن ویلتھ کا تصور پیش کیا جس کو بہ نظر تحسین دیکھا گیا اور نہ صرف برطانیہ اس کے لیے بخوشی رضامند ہوا بلکہ دنیا کے بیشتر نو آزاد ممالک نے اس کی ممبری قبول کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھا ــــ نہرو نے کامن ویلتھ کے لیے اس لیے کوشش کی کہ اس طرح ایک دم سے ہندستان جو برطانیہ کا غلام تھا آزادی حاصل کرتے ہی اس کی صف میں اسی طرح آ گیا کہ اس کو وقار اور احترام بخشا گیا۔ اگر یہ کیفیت نہ ہوتی تو معلوم نہیں کب تک ہندستان اور ہندستانی برطانیہ سے احساس کمتری کے شکار رہتے اور ایسی صورت میں ملک کی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹیں پیدا ہوتیں۔ کامن ویلتھ کا بانی میانی اور باوقار ممبر ہونے کے سبب برطانیہ میں ہندستانیوں کی آمد و رفت کے دروازے کھلے رہے۔ ہندستان کو اپنے عوام کی خوشحالی اور فلاح و بہبود کے لیے ماہرین کی سخت ضرورت تھی چونکہ ملک میں صحیح تعلیم و تربیت کے ذرائع قریب قریب مفقود تھے اس لیے بڑی تعداد میں ہندستانی برطانیہ گئے اور اکثر کو حکومت نے اپنے وسائل سے بھیجا جو وہاں سے ماہرانہ تربیت حاصل کر کے اپنے ملک واپس ہوئے اور یہاں لگ لپٹ کر ملک کی ترقی کے کاموں میں پوری تندہی سے منہمک ہو گئے۔

کامن ویلتھ کے علاوہ پنڈت نہرو نے ایسی بین الاقوامی پالیسی اختیار کی جس سے ہر ملک کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم ہوئے۔ اس پالیسی کے نتیجے میں ہندستان کی عزت دوسرے ملکوں میں بڑھ گئی اور ان ملکوں کے عوام نے یہاں کے عوام کے ساتھ خیر سگالی کے

جذبات وابستہ کیے۔ اس طرح ترقی کی چند اور راہیں کھل گئیں۔

غیر ملکی حکمرانوں نے ملک میں ایک ایسا تناؤ کا ماحول پیدا کر دیا تھا اور ملک کا بٹوارہ کر کے یہاں کی اکثریت کو اقلیت سے اتنا مشکوک کر دیا کہ ہر وقت کشیدگی اور تصادم کا اندیشہ رہنا یقینی ہو گیا تھا۔ اس صورت حال سے بھی نہرو جی اچھی طرح واقف تھے۔ چونکہ ان کی نگاہ بھی دوررس تھی اس لیے انھوں نے اس کا بھی حل ڈھونڈھ نکالا۔ ہندوستان ہندو اکثریت کا ملک ہوتے ہوئے بھی سیکولر ملک قرار پایا جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی غرضکہ تمام مذاہب کے ماننے والوں کو مساوی حقوق دیے گئے۔ اس میں بھی نہرو کی ذہانت کو بڑی حد تک دخل رہا۔

ہندوستان کو سیکولر ملک قرار دیتے وقت پنڈت نہرو کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ بہت ممکن ہے یہاں بعض مفاد پرست سیکولرازم کا یہ مطلب عوام کو سمجھانے کی کوشش کریں کہ یہاں بھی روس کی طرح مذہب کو نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ ہندوستان ہمیشہ سے مختلف مذہب اور اعتقادوں کے لوگوں کا ملک رہا ہے۔ اس لیے نہرو نے سیکولرازم کی صاف اور واضح تعریف کرتے ہوئے کہا کہ سیکولرازم کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ حکومت مذاہب کو نیست و نابود کر دے گی یا ان کی اہمیت کو یکسر نظر انداز کرے گی بلکہ یہاں اس کا مقصد یہ ہے کہ ملک میں جتنے بھی مذاہب پائے جاتے ہیں حکومت ان کا احترام کرے گی مگر سرکاری کام کاج میں کسی مذہب کا کچھ بھی دخل نہ ہو گا۔ لیکن یہاں ہر مذہب کے پیروؤں کو اپنے اپنے طور سے اپنے مذہب کے اصولوں پر عمل کرنے کی پوری پوری آزادی ہو گی۔ حکومت کا نہ کوئی مذہب ہو گا اور نہ وہ کسی مخصوص مذہب کی سرپرستی کرے گی۔

پنڈت نہرو کی یہ تدبیر پوری طرح اثر انداز ہوئی اور کشیدگی وقتی کے ماحول میں بڑی حد تک تغیر پیدا ہوا۔ ملک کے مخصوص ماحول اور حالات کو دیکھتے ہوئے سیکولرازم کو اختیار کرنا ملک کی بہتری کے لیے از حد ضروری تھا۔ نہرو نے نہ صرف سیکولرازم کی پالیسی کو حکومت کے ذریعے اختیار کروایا بلکہ وہ تمام عمر اس کی سختی سے پابندی کے لیے کوشاں رہے۔

ہندوستان کو عالمی برادری میں معزز مقام دلانے اور ملک میں امن و امان کے مسائل سے بخیر و خوبی عہدہ برآ ہونے کے بعد سب سے اہم مسئلہ ملکی معیشت کا تھا۔ ظاہر ہے معیشت تباہ حال تھی جو غریب تھے ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا، بیکاری، بیروزگاری اور مفلسی کے مہیب سائے ہماری معیشت پر چھائے ہوئے تھے اس کے برعکس ملک کا ایک مخصوص طبقہ بڑی شاہانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایک ہی ملک کے عوام میں زمین و آسمان کا فرق تھا اور ایک نو آزاد ملک میں خصوصاً جس نے جمہوری طرز حکومت اختیار کیا ہو، یہ کیفیت بڑی سنگین صورت حال پیدا کر سکتی تھی۔ بالکل بدیہی امر تھا کہ ملک کی بڑی اکثریت ایک معمولی سی اقلیت کو اپنے ہی خون پسینے کی کمائی سے عیش و طرب کی محافل سجاتے دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ لوٹ مار اور قتل و غارت زنی سے لے کر خونی انقلاب تک آ سکتا تھا۔ نہرو ان حقائق سے بخوبی واقف تھے انھوں نے نئے آزاد ہونے والے ملکوں کی قوموں کے مزاج کو بڑی اچھی طرح سمجھا تھا اس لیے انھوں نے سوشلزم کا راستہ اختیار کیا اور عوام کو جمہوری سوشلزم سے روشناس کراتے ہوئے کہا کہ ملک کی معیشت اس طرح کی ہو گی کہ زیادہ سے زیادہ غریب عوام کی فلاح و بہبود پر نظر رکھی جائے گی۔ دولت کی منصفانہ تقسیم ہو گی اور ہر فرد و بشر کو اپنی محنت کا حق ملے گا۔ نہرو کی اس پالیسی سے جاگیردارانہ مزاج و ذہنیت کے لوگوں میں ذرا کھلبلی مچی مگر ان کے سامنے ملک کے کروڑہا عوام تھے اور ان کی فلاح و بہبود کا خیال وہ مقدم تصور کرتے تھے اس لیے ان کے پائے استقامت کو ذرا بھی جنبش نہ ہوئی بلکہ انھوں نے سوشلزم کی پالیسی کو بڑی سختی سے اختیار کیا اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ ملک کے کروڑہا عوام نے ان کو اپنا حقیقی رہنما تسلیم کر کے ان کے نقش قدم پر چلنا باعث مسرت سمجھا۔

سیکولرازم، سوشلزم اور ناوابستگی کی پالیسیاں جو نہرو کی لائق قیادت میں ہندوستان نے اختیار کیں آج ہندوستان انھیں پر عمل پیرا ہو کر اس قابل ہو سکا ہے کہ اب ایشیا میں وہ ایک بڑی طاقت بن کر ابھر رہا ہے اور دنیا کی تمام ترقی یافتہ قوموں کی نظریں ہمیشہ اسی کی طرف لگی رہتی ہیں۔ پنڈت نہرو کی اختیار کردہ یہی پالیسیاں ہی ہیں جو ہندوستان کی ترقی کی بنیادیں ہیں اور یہ بنیادیں بہت ہی مستحکم

ہیں۔ انھیں مضبوط بنیادوں پر جدید ہندستان کی تعمیر ہوئی ہے۔

پنڈت نہرو کی وسیع النظری اور مدبرانہ قیادت لائق صد ستائش و تحسین ہے کہ اس کی بدولت آج ہندستان ہر شعبۂ حیات میں آزادی حاصل کرنے کے بعد ایک بہت ہی قلیل مدت میں خود کفالتی کی منزل سے ہمکنار ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا اور ہندستان شاہراہ ترقی پر آگے بڑھتا جائے گا، پنڈت نہرو کی عظمت اور ان کی اختیار کردہ پالیسیوں کی افادیت ہر کس و ناکس پر منکشف ہوتی جائے گی۔

پنڈت نہرو نے ملک کی فلاح و بہبود کے لیے بہت کچھ کیا مگر ان کو اس سے بھی بہت زیادہ کرنا تھا۔۔ افسوس موت کے بے رحم ہاتھوں نے ان کو ہم سے چھین لیا بلکہ اس عمل میں کسی حد تک عجلت کی ورنہ دیو ہیکل ڈیم لہلہاتے ہوئے سرسبز و شاداب کھیت و باغات، کل کل کرتی ہوئی ندیاں، ہمالیہ کی برف پوش چوٹیاں ۔۔ جن سے ان کو بے پناہ محبت تھی سب کے سب ہندستان کی خوشحالی کے ذرائع بن چکی ہیں ۔۔۔۔ لیکن نہرو نے جو بھی کام ادھورے چھوڑے ہیں ہندستان کے عوام ان کی پالیسیوں پر عمل پیرا ہو کر ان کاموں کو پورا کر کے دم لیں گے کیونکہ بالآخر یہ سب انھیں کی بھلائی کے لیے تو ہیں۔

پنڈت نہرو کو اس ارض مقدس کے ذرے ذرے سے پیار او محبت تھی یہاں کے عوام کی خوشحالی ان کو سب سے زیادہ عزیز تھی اس لیے انھوں نے ایسی ہی پالیسیوں کو اختیار کیا جن پر عمل کر کے جلد از جلد ترقی کی جا سکے۔

مہاتما گاندھی نے کہا تھا ہندستان دیہاتوں میں بستا ہے اس لیے جب بھی کوئی منصوبہ بنایا جائے دیہاتوں کی ترقی کو مقدم سمجھا جائے۔ نہرو نے اس حقیقت کو تسلیم کیا اور ان کی نگاہ ہمیشہ گاؤں میں بسنے والے کروڑہا غریب اور بھولے بھالے کسانوں پر رہی۔ اسی لیے زمینداری نظام کا خاتمہ ہوا اور کسانوں کو اپنے کھیتوں کا خود مالک تصور کیا گیا۔ اس طرح کسانوں کو راحت ملی اور انھوں نے اپنی تمام تر توجہ اپنے کھیتوں اور کھلیانوں کی طرف لگا دی۔ ان اقدامات سے کسانوں میں ایسی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کو انقلابی تبدیلیاں بآسانی کہا جا سکتا ہے' ان کے رہن سہن میں بڑا فرق آ گیا۔ ان کی عادات و اطوار بدلیں اور وہ آزاد فضا میں سانس لے کر اپنے کو آزاد ملک کا آزاد شہری تصور کر کے کچھ اور ہی تندہی سے اپنے کھیتوں کی طرف متوجہ ہو گیے ۔۔ اسکے نتیجہ میں ملک میں سبز انقلاب آیا اور غذا کے مسئلے کو بڑی حد تک حل کر لیا گیا ۔۔۔ وہ دن دور نہیں جب ملک اس قابل ہو سکے گا کہ موسم کی بداعتدالیاں اس کی معیشت پر اثر انداز نہ ہو سکیں گی اور یہاں کا کسان، محنت کش اور عام انسان سکون کی زندگی بسر کر سکے گا ۔۔۔ مگر وہ نہرو کی عظیم قیادت کا ممنون کرم ہو گا ۔۔۔۔ کیونکہ جدید ہندستان کا حقیقی معمار اعظم تو نہرو ہی تھا۔

★

جواہر لال نہرو۔ (صفحہ ۲۵ کا بقیہ)

سے وہ دلی واپس آنے پر ایک دن کے اندر ہی بیمار پڑ گئے۔

وہ حیرت انگیز جسمانی قوت اور کام کرنے کی صلاحیت کے مالک تھے جب وہ نیشنل ڈیفنس اکاڈمی کا سنگ بنیاد رکھنے پونا تشریف لائے تو میں نے انھیں تین بجے دوپہر سے لے کر آدھی رات تک لگاتار کام کرتے دیکھا اور کام کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ انھیں زیادہ تر کھڑے ہی رہنا پڑا۔

یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ پنڈت جی فطرتاً رئیس الطبع واقع ہوئے تھے۔ یہ بالکل صحیح ہے لیکن وہ رئیس تھے روح کے، فکر کے، اپنے ملک اور اپنے ہم وطنوں کی خدمت کے گہرے احساس کے۔

★

(منظوم افسانہ)

حج اکبر

جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی

رخ پر ہے عکس کاکل شام　　جلوے ہیں ہراساں لب بام
بھیگا بھیگا ہوا کا دامن　　کھرا کھرا تمام گلشن
سارا عالم بجھا بجھا ہے　　جیسے کچھ آج کھو گیا ہے
آئیں گے رات میں ستارے　　سہمے سمٹے حیا کے مارے
آیا ہی نہیں مُوا ابھی تک　　دیتی ہے در پہ رات دستک
ساتھی ہے اب نہ ہے سہیلی　　جاؤں بھی تو کہاں اکیلی
ممکن ہے ہو کسی کے بس کی　　چڑیا اُڑتی نہیں قفس کی
یارب یہ ہے تو ہے بلا کیا　　کوئی بھی ہو نہ ہو ہوا کیا
رہتا ہے یہی گمانِ غالب　　یک جاں ہیں، دو مگر ہیں قالب
مت پوچھ ہے کون آنے والا　　جا تو ہی صبا اُسے بلا لا
شاید ہے جواب یہ اسی کی　　آہٹ ہے صاف آدمی کی
ٹنکے کی چوٹ کہہ رہی ہے　　وہ کیا ہے، سامنے وہی ہے
دل کی دھڑکن سوا ہوئی ہے　　ہلکا ہلکا غم دوئی ہے
وہ کیا ہے آڑ میں کھڑا ہے　　موذی یہ کہاں سر چڑھا ہے
بدلی کی اوٹ ماہِ کامل　　چھپ چھپ کے جھانکنے سے حاصل
کمبخت بتا کہاں تھا عزو　　مر کیوں نہ گیا کہاں تھا بدخو

× × ×

معلوم بھی ہے کہاں تھا عزو　　تو بھی تو تھی جہاں تھا عزو
وحشت میں انتظار اچھا　　دیوانہ غرض بکار اچھا
شادی کی بات چل پڑی تھی　　تقدیر ظفر سے جا لڑی تھی
پکی ہے بات خیر تیری　　خالی ہے صرف جیب میری
لاؤں گا تجھے دلہن بنا کر　　حورا ہے بس یہ حج اکبر

× × ×

کہتے تو سب یہی ہیں اکثر　　بہتر ہے وہم کی دوا کر
مانا ہے تجھ سے قرب رغبت　　ہوتی ہے دل کو دل سے راحت
ایسا آیا بڑا وہ بن کر　　منہ پھٹ ہے بدنہاد بدگہر

ملنا تو نہیں گناہ ہرگز　　بدلے نہ مگر نگاہ ہرگز
شیشے میں اُتار تا پری کا　　بے سود گدانے دلبری کا
ہٹ رے غرض نہ ہتکڑی سے　　زنگت ہی کیا جو لاگ جائے
سونا سونا نہ چاندی چاندی　　بندی تو کیا بنے گی باندی
میری گڑیا تجھے خبر ہے　　دنیا کی بہت بری نظر ہے
باتیں ہیں عجیب بہکی بہکی　　سانسیں ہیں غریب ہکی ہکی
چھپتا ہے کب غم محبت　　وحشت ہے چاہ کی علامت
منہ پر ہیں خاص و عام گویا　　چرچا ہے یہ تمام گویا
ہے تو کہنے کو نام شب تاب　　خود ہے ماہِ تمام بے آب

× × ×

کہتا ہے بات اپنے دل کی　　بھولی ننھی نہیں میں اتنی
چل ہٹ منہ بند کر خدارا　　سمجھی سمجھی ترا اشارا
چھپتی ہے کب ہوا ہوس کی　　یکسر ہے آگ تو نفس کی
باتیں نہ بنا نے حد سے بڑھ کر　　کھاتا ہے منہ کی سر پہ چڑھ کر
کس کی جوتی کی گرد دبی ہے　　کس کی بیزار کو پڑی ہے
جلیں بھر بھر کے مار کھائے　　رو رو کے روٹیاں پکائے
سُن پائیں جو کہیں یہ ابا　　کھا جائیں وہ تجھے نہ کچّا

× × ×

راضی ہے وہ لے جو دولت　　قاروں نہ بنے تری بدولت؟
ہوگا تو وہی قمر کو پیارا　　جو اس کو دے سکے سہارا
دے سیم و زر نہال کر دے　　منہ پہلے موتیوں سے بھر دے
جانا تو کہے مجھی کو باہر　　رہنا ہے صرف تجھ کو گھر پر
زخم تیغ فراق کھا کر　　لاؤں گا خوب سا کما کر

× × ×

دولت تو بے گماں ملے گی　　حورا بھی کیا وہاں ملے گی
رہتے گو دور دور تاہم　　ملتے جلتے ضرور باہم

کر جائے مجھ سے تو کنارا　　یہ بات بھی تو نہیں گوارا
کھائے گا کیا کہاں رہے گا　　آتے آتے جواں رہے گا
آئے گی یاد بھی وطن کی　　اپنی چھوٹی سی انجمن کی
ڈل سی ملنی محال ہے جھیل　　جھرنا جھرنا نگار تمثیل
رقصندہ آب و رنگ ایسے　　بجتے ہیں جلترنگ جیسے
پتہ پتہ چنار کا آگ　　طرفہ باگ بہار کا راگ
مینوش حسیں جواں نظارے　　اپنا سا منہ لیے ستارے
یخ بستہ پہاڑ کیسے کیسے　　وارفتہ بار لگے
ان سے کیوں کر کرے کنارا　　کس کو ہوگا کبھی گوارا

(۲)

لایا ہے آسماں نیا رنگ　　جورا اب ناگزیر ہے جنگ
سرحد ہے مرجع قیامت　　چھائے گی خاکِ دشتِ غربت
اچھے گو ہوئے ہیں بند تلکے　　کھلتے ہیں پر وہاں ہوا کے
داغی ہیں موت کے طیارے　　ممکن ہے اب مرے نہ مارے
اڑ اڑ کے دھجیاں بموں سے　　اجڑیں گی بستیاں بموں سے
تکیہ دائم امید پر ہے　　دنیا قائم امید پر ہے
اڑ کر لے لے گی کیا قمر سے　　چوری اچھی نہیں پدر سے
عزو معلوم ہے کہاں ہے　　چشم بد دور کیا جواں ہے
پانی نکلے جو لات مارے　　دن آئے زرگری کے بارے
بہتے دریا کے ساتھ بہہ کر　　موتی رو لے یہ دور رہ کر
باتوں باتوں میں جال لگا لا　　جورا ہے تو اسے منا لا

× × ×

دیکھوں گی اس سے بات کر کے　　دامن میں گل مراد بھر کے

(۳)

یوں ہی سوتا رہے گا عزوؔ　　اے ہے اٹھا نہیں ابھی تو
آغوشِ مہ لقا کے طالب　　شاید ہے بجھ پہ نقش غالب
اتنا تو ہو مگر نہ غافل　　ہو جائے بھاگنا بھی مشکل
بستر تو ہے بندھا بندھایا　　تیرا ہے سب کرم خدایا

× × ×

جویا ہے گوشۂ اماں کی　　سنتی بھی ہے پکار ماں کی
ناحق ہے فکر جان و تن کی　　جو کچھ ہے خاک ہے وطن کی
چہ خوب ترا کہا کروں گا　　ماروں گا یا میں خود مروں گا
جاتا ہوں اب تو پھر ملوں گا　　لوٹا تو خوش تجھے کروں گا

× × ×

تو جائے گا نہ اب اکیلا　　دو دن ہے زندگی کا میلا
مرنا ہے اب تو ساتھ تیرے　　دیکھے گا رن میں ہاتھ میرے
توپوں کے کھل گئے دہانے　　ملنا ہے کچھ اسی بہانے
آگے کرنی کا پھل ملے گا　　ہار آج نہیں تو کل ملے گا

(۴)

وہ دیکھ گرے نہ دو لڑا کے　　پھرتی سے آ قدم بڑھا کے
کرنا ہے پُر اب اس خلا کو　　روکے گا کیا کوئی ہوا کو
سج دھج کے چل نہیں سپاہی　　توپیں ہیں کلید سربراہی
آتا تو ہے نہ وار کرنا؟　　زد سے بچ بچ کے مار کرنا
ٹکڑی کے آ اڑا ائیں ٹکڑے　　اکھڑے دشمن تھے پاؤں اکھڑے
بھاگے دشمن وہ دیکھو بھاگے　　لیکن ہے موت آگے آگے
کاری ہے ضرب ضرب کاری　　پل پل ہے رہزنوں کو بھاری
اے جانِ من کمال کر دی　　کر دی قائم مثال کر دی
چستی پھرتی بہ حسن کاری　　بجھ پر ہے ختم گولہ باری
دشمن کے چھڑا اے خوب چھکے　　منہ آئے اور مزا نہ چکھے
انبار لگے ہیں کنکروں تغے　　باقی ہیں نام سنگروں کے
کاندھوں پہ چڑھ کے گھر چلیں گے　　گھر گھر میں جب دیے جلیں گے
دُرّے ہیں مفسدوں کو دُرّے　　جورا جورا کہ ہرّے ہرّے

× × ×

صد شکر ہوا حساب پورا　　عزو کوئی نہ اور جورا

★

ادبی ترجمے اور قومی یک جہتی

آفاق حسین صدیقی

ہندستان ایک وسیع وعریض ملک ہے اور اس کی عظمت مسلّم ہے۔ ہندستان کی وسعت اور عظمت کے دائرہ میں مختلف تہذیبیں، مذاہب، ملتیں، نسلیں، فرقے اور طبقے بکھرے ہوئے ہیں۔ یہاں اگر ایک طرف مختلف مذہبوں سے عقیدت رکھنے والے اور مختلف مسلک کے ماننے والے لوگ آباد ہیں تو اسی کے ساتھ دوسری طرف یہ ملک مختلف رسم ورواج وعقائد پر کاربند رہنے والے، مختلف النوع نظریات رکھنے والے اور مختلف قسم کی زبانیں وبولیاں بولنے والے افراد کا مادیٰ ومسکن ہے۔ قوس وقزح کی سی رعنائی اور عظمت رکھنے والی ہندستانی تہذیب کی تشکیل میں یہاں کے ہر علاقہ کے رہنے بسنے والے لوگوں اور متفرق رنگ ونسل وتنوع لسانی گروہوں سے تعلق رکھنے والے افراد کا برابر کا حصّہ ہے اور انھیں کا باہمی اشتراک وتعاون اس ملک کے بہتر وخوشگوار مستقبل کا ضامن ہے۔ ہندستان کے سیاسی استحکام، قومی سالمیت، ملک کی تعمیر وتشکیل قوت وطاقت نیز متحدہ قومیت کے جذبہ کی توانائی کے لیے ہفت رنگ تہذیب گوناگوں رسم ورواج، مختلف النوع عقائد ونظریات، مختلف مذاہب، ملتوں اور لسانی گروہوں کے درمیان ایک قسم کا باہمی ربط اور اتحاد نہایت ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ یہاں کے مختلف صوبوں اور مختلف لسانی علاقوں کے افراد کے درمیان جذباتی وذہنی ہم آہنگی، ہمدردی خلوص اور یگانگت کے جذبات وہ خصوصیات ہیں جن کے فروغ میں ایک بہتر اور صحت مند سماج کے خواب کی تعبیر پوشیدہ ہے۔

ملک کے تہذیبی، جذباتی اور ذہنی اتحاد کے لیے یہاں کے مختلف علاقوں میں رہنے والے لوگوں کا ایک دوسرے کے طرز معاشرت تہذیب وتمدن، رسم ورواج اور اقدار وعقائد سے روشناس ہونا، ایک دوسرے کے نظریات نیز ذہنی وفکری رجحانات سے واقف ہونا ضروری ہے اس کے علاوہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ وہ ایک دوسرے کے افکار وخیالات سے ہمہ وقت آگاہی حاصل کرتے رہیں۔ غالباً اس کے لیے موزوں ترین ذریعہ ادب ہے۔ ادب اپنے تخلیق کرنے والے اور بولنے والے افراد کی زندگی اور معاشرت کا آئینہ دار، تہذیب وتمدن، رسم ورواج، عقائد واقدار کا عکاس اور ذہنی وفکری نیز حسیاتی کیفیات کا ترجمان ہوتا ہے اسی کے ساتھ خیال وافکار کے اظہار اور ابلاغ کا موثر ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے ذریعہ سے اس کے خالق کے اطراف کی زندگی، سارے ثقافتی سرمایے اور تمام ذہنی وجذباتی کیفیات نیز میلانات کا ادراک حاصل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہر آدمی کے لیے ہر زبان سے واقف ہونا یا ملک میں بولی جانے والی تمام زبانوں کے ادب کا براہ راست مطالعہ کرنا ممکن نہیں ہے اس کے لیے مختلف زبانوں کی کتابوں نیز ادب پاروں کے ترجمے نہایت کارآمد اور مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔

ترجموں کے ذریعہ ادب کے آئینہ کے وسیلہ سے ایک علاقہ کے افراد یا ایک علاحدہ زبان بولنے والے لوگ دوسرے علاقہ یا دوسری زبان کے افراد کی تہذیب ومعاشرت، رسم ورواج، ذہن ومزاج اور افکار وخیالات سے واقفیت حاصل کرسکتے ہیں، ان کے مسائل سے باخبر رہ سکتے ہیں۔ ان کے دکھ درد کا احساس کرسکتے اور ان کی ذہنی

کیفیات دو دوسرے عوامل سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ اور ان کے نہاں خانوں میں جھانک کر انھیں سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ ادبی تراجم سے ایک لسانی گروہ کے افراد کو دوسری زبان سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے خیالات اور افکار سے استفادہ کرنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ خیالات و افکار کی واقفیت اور باہمی تبادلہ سے نظر کشادہ نقطۂ نظر فراخ اور ذہن وسیع ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے حالات سے دلچسپی اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، ذہنی اجنبیت کم ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے سے قریب آنے میں مدد ملتی ہے اس کا لازمی نتیجہ ذہنی ربط، جذباتی ہم آہنگی باہمی اعتماد اور مفاہمت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

ادبی ترجموں کا عمل ایک اچھے سماج کی تشکیل میں اس طرح بھی معاون ہوتا ہے کہ ایک علاقہ کے افراد دوسرے علاقہ کے لوگوں کے رہن سہن، طور طریق، رسم و رواج، اقدار اور اخلاقیات سے واقف ہو کر ان کی خصوصیات اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اخلاقی، تہذیبی اور معاشرتی قدروں کا یہ لین دین درمیانی فاصلوں کو کم کرتا ہے فرقہ وارانہ تعصب اور علاقائی و لسانی عصبیت کی جگہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور علاقائی اتحاد ظہور پذیر ہونے لگتا ہے۔ یگانگت کے جذبات بیدار ہو کر بہتر سماج کی تشکیل کے لیے نئے امکانات اور نئی راہیں روشن کرتے ہیں۔

گذشتہ زمانے میں ہمارے یہاں علاقائی زبانوں کے ادبیات کے ترجموں پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی یا اس عمل کو غیر اہم تصوّر کر کے عموماً نظر انداز کیا جاتا رہا۔ غالباً اسی لیے علاقائی زبانوں کے ادبی ترجمے نہ ہونے کے برابر ہیں اور ہم ان زبانوں کے بارے میں اور اپنے ملک کے مختلف علاقوں کے سلسلے میں اتنا بھی نہیں جانتے جتنا مغربی زبانوں اور مغربی تہذیب و تمدن و معاشرت کے سلسلے میں جانتے ہیں۔ ادھر چند سالوں سے ہمیں غالباً اپنی اس کوتاہی کا احساس ہوا ہے اور علاقائی زبانوں مثلاً تامل، تیلگو، مراٹھی، گجراتی بنگالی اور پنجابی وغیرہ کے ادب پاروں کے تراجم کا رجحان پیدا ہوا ہے چنانچہ ادبی رسائل میں علاقائی زبانوں کے ادب پاروں کے ترجمے شائع ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں منظم کوشش نیشنل بک ٹرسٹ انجام دے رہا ہے۔ ٹرسٹ نے گزشتہ چند سالوں میں پنجابی، ہندی، گجراتی اور دوسری زبانوں کے ناولوں، افسانوں اور چند دوسری معیاری کتابوں کے معیاری ترجمے شائع کیے ہیں، ٹرسٹ کے علاوہ دوسرے اداروں نے بھی اس جانب توجہ دی ہے اور بعض اچھے ترجمے منظر عام پر آئے ہیں، سونیتی کمار چٹرجی کے مضامین کا مجموعہ "بکھرے ورق" اس کی اچھی مثال ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود ابھی تک علاقائی زبانوں کے ادب کے ترجموں کا کام محدود ہے۔ اردو اور ہندی میں اسے فروغ دینے کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ اردو ہندی کسی مخصوص علاقہ کی زبانیں نہیں ہیں اور یہ کم و بیش سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں اسی لیے ان میں علاقائی زبانوں کے ترجمے ہمہ گیر اثرات مرتب کر سکتے ہیں۔ اردو اور ہندی کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی ترجموں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ ان زبانوں سے تعلق رکھنے والے لوگ اردو، ہندی اور دوسری مختلف علاقائی زبانوں کی تخلیقات سے استفادہ حاصل کر سکیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ابھی تک ترجموں کا میلان افسانوں اور ناولوں کی طرف زیادہ رہا ہے، اسے بھی وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ افسانوں اور ناولوں کے علاوہ تہذیبی اور سماجی موضوعات پر لکھی جانے والی کتابوں نیز فلسفیانہ و مفکرانہ خیالات پر مبنی تخلیقات کے تراجم بھی مفید ثابت ہو سکتے ہیں، جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے ایسی تخلیقات کے ترجموں سے افکار و خیال کے باہمی تبادلے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے ذہن و مزاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور ذہنی یک جہتی کی فضا تیار ہوتی ہے۔ مثلاً ٹیگور کی کتاب "سنسکرتی کے چار ادھیائے" کا اردو کے علاوہ دوسری علاقائی زبانوں میں ترجمہ یا اردو کی تخلیقات "قومی تہذیب کا مسئلہ" "آندھی میں چراغ" "اردو شاعری کا سماجی پس منظر" وغیرہ کے ہندی کے ساتھ دوسری زبانوں میں تراجم ایک دوسرے کی معلومات میں اضافہ کا باعث اور سودمند نتائج برآمد کرنے کا سبب ہو سکتے ہیں۔

ادبی ترجموں کی افادیت میں ترجمے کی نوعیت اور اس کے

معیار کو بڑا دخل حاصل ہوتا ہے اور اس کا انحصار مترجم کی ذہنی و فکری صلاحیت نیز علمی و ادبی استعداد پر ہوتا ہے بالفاظ دیگر ترجمے کی افادیت کا بہت کچھ دارومدار مترجم پر ہوتا ہے۔ چنانچہ ترجمہ کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ دونوں زبانوں پر کامل عبور رکھتا ہو، الفاظ پر اس کی گرفت مضبوط ہو اور اُس کو اسالیب بیان پر دسترس اظہار بیان پر قدرت حاصل ہو، اسی کے ساتھ دونوں زبانوں کے ادبی سرمایے نیز زبانوں کے مخصوص مزاج سے کماحقہٗ واقف ہو۔ اس کے علاوہ مترجم کے لیے اس کی بھی ضرورت ہے کہ وہ ادبی قدروں کا ادراک رکھتا ہو اور اُسے ادب کے بنیادی مسائل و بنیادی خصائص نیز ادب کے سماجی، ثقافتی اور عمرانی رشتوں کا شعور حاصل ہو۔ اگر کوئی مترجم ادب کی قدروں اور ادب و زندگی کے گہرے رشتہ سے نابلد ہوگا یا اُسے ادب کی سماجی و عمرانی حیثیت کا صحیح احساس نہ ہوگا یا ادب پر اس کی نگاہیں سطحی انداز سے پڑیں گی تو وہ اس ادب کی زیریں سطح کو دیکھنے میں کامیاب نہ ہوسکے گا، جس کا وہ ترجمہ کر رہا ہے، نہ ہی وہ اس کی روح تک پہنچ سکے گا۔ ایسی صورت میں ترجمہ صحیح نمائندگی نہ کرسکے گا اور اس کی افادیت کے مجروح ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا۔ ان باتوں سے قطع نظر ایک اچھے ترجمہ کے لیے مترجم کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ جس زبان کے ادب کا ترجمہ کر رہا ہو اس زبان کے الفاظ، روزمرہ، محاوروں اور تراکیب کا بھرپور شعور حاصل کرے تاکہ ان کے مفہوم کو صحیح طور پر ادا کرسکے، کسی بھی زبان کے الفاظ روزمرہ، محاورے اور تراکیب اس کے مخصوص مزاج کے مظہر اور زبان کے برسہا برس کے طویل سفر کا ثمرہ ہوتے ہیں۔ ان کے اجمال میں تفصیل اور اختصار میں بڑی وسعت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اگر مترجم ان سے سرسری طور پر گزر گیا تو وہ ترجمہ کا حق ادا کرنے سے قاصر رہے گا۔ ایک باصلاحیت مترجم کو ترجمے کے عمل کے دوران کبھی کبھی تخلیقی مراحل بھی طے کرنے پڑتے ہیں ــــ ترجمے میں وہ ادب کے خالق کے مطمح نظر کو واضح کرنے کے لیے جو الفاظ استعمال کرتا ہے جو تراکیب وضع کرتا ہے اور جو پیرایہ بیان اختیار کرتا ہے وہ خالق کے مطابق ہوتے ہوئے بھی انفرادی حیثیت کا حامل ہوتا ہے اور مترجم کی خلاقانہ کاوش

پر دلالت کرتا ہے۔ مترجم ادب کے خالق کی بات یا خیال کو ایک نئے انداز اور نئے طرز بیان میں پیش کرکے گویا نئے روپ میں جلوہ گر کرتا ہے۔ اس طرح اُسے دوہری ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ یہ دوہری ذمہ داری اس سے ادب کی زبان پر قادر ہونے کے ساتھ ساتھ ترجمہ کی زبان پر وسیع مہارت حاصل کرنے کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔

ترجموں کی افادیت کے ذیل میں ترجمہ کی زبان کی سادگی و سلاست کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور ترجمہ کی مقبولیت میں اس کا بڑا حصہ ہوتا ہے، چنانچہ مترجم کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ ترجمہ میں سادہ، سلیس اور عام فہم زبان کا استعمال کرے تاکہ لوگوں کو اس کے مطالعہ میں کسی قسم کی دشواری محسوس نہ ہو اور اسے خاص و عام میں یکساں مقبولیت حاصل ہوسکے۔

ترجموں کی افادیت کے لیے مذکورہ لوازمات اور شرائط کے ساتھ ان کتابوں کی نوعیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جن کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ کتابوں کے سلسلہ میں یہ لازمی ہے کہ وہ معیاری حیثیت کی حامل اور مقبول عام ہوں، اسی کے ساتھ اپنے علاقے کی طرز زندگی، طرز معاشرت و رسم و رواج کی آئینہ دار، جذبات، احساسات اور صحت مند خیالات و بلند افکار کی ترجمان ہوں اور اپنے ماحول، حالات و اپنے عہد کی صحیح و سچی عکاسی کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ یہ تخلیق کرنے والوں کے ذہنی و فکری میلانات کو نمایاں طور پر پیش کرتی ہوں نیز زبان و ادب کی انفرادی خصوصیات کی نمائندہ ہوں۔ ان تمام چیزوں سے ایک جانب تو قومی تہذیب و تمدن کی خصوصیات اور مختلف زبانوں کے ادبی و ثقافتی سرمایے سے متعلق معلومات میں اضافہ ہوگا تو دوسری طرف ان کے بالواسطہ مطالعہ سے جذباتی و ذہنی اتحاد اور باہمی ربط پیدا ہوگا۔ باہمی مفاہمت و تعاون کی نئی راہیں کھلیں گی۔ یگانگت کے جذبات بیدار ہوں گے۔ اور متحدہ قومیت کے جذبہ کو استحکام و قومی یکجہتی کے احساس کو قوت حاصل ہوگی۔

آج جب کہ دُور دراز کے علاقوں اور مختلف ممالک کے درمیان تعلق اور رابطہ قائم ہو رہا ہے، ایک ملک کے ادبی و ثقافتی میلانات

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

افسانہ

واپسی

ولی تنویر

اس دن گرمی اپنے پورے شباب پر تھی۔ ہر طرف ایک ہُو کا عالم تھا۔ ہوا بھی انتہائی گرم چل رہی تھی: ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کائنات ایک گرم بھٹی میں تبدیل ہو گئی ہے۔ کہتے ہیں شدید گرمی کسی طوفانی بارش کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ یہ بات اس دن سچ ہی ثابت ہوئی۔

شام سے کچھ دیر پہلے ہی آسمان پر کالے کالے بادل ابھرنے لگے، اور دیکھتے ہی دیکھتے نیلے آسمان کی بلند وسعتوں پر چھا گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں تیز ہواؤں کے ساتھ طوفانی بارش شروع ہو گئی۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک سے ماحول پُر ہول اور خطرناک ہو گیا۔ کل تک کسی نے یہ سوچا بھی نہ تھا کہ موسم اچانک اس قدر تبدیل ہو جائے گا۔ یوں تو یہ اس موسم کی پہلی بارش تھی لیکن پچھلے دو سال سے خشک سالی کی وجہ سے جو غیر یقینی صورتِ حال تھی اس کا خیال کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ بارش پچھلے دو سال میں ہونے والی ساری بارش سے کچھ زیادہ ہی اطمینان بخش ہے۔

پچھلے دو سال تو انتہائی خشک گذر گئے تھے۔ ان دو برسوں میں برسات کا موسم کب آیا اور کب ختم ہوا کچھ پتہ ہی نہ چل سکا تھا۔ بڑے بڑے تالاب، ندی، نالے اور دریا سوکھ چکے تھے۔ جنگلوں میں درختوں کے پتے تو جیسے جل ہی گئے تھے۔ کھیت لہلہاتی فصلوں، جھومتی بالیوں کے لیے اور کھلیان اناج کے اونچے اونچے ڈھیروں کے لیے ترس کر رہ گئے تھے۔ ان کھیتوں میں تو اب ہرے تنکے بھی مشکل سے نظر آتے تھے۔ زندگیوں کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ زمین میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ سارے جانور قحط کی نذر ہو چکے تھے ۔۔۔ پریشان حال دہقان اپنے دیہاتوں، پیارے کھیتوں، جلتے ہوئے کھلیانوں، پانی کے ایک ایک قطرے کو ترستی اور جلتی سلگتی ہوئی زمینوں کو چھوڑ کر اپنی زندگی بچانے اور پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کی خاطر شہروں کی طرف نکل آئے تھے۔

اپنے گاؤں کی گلیوں سے دور ہوتے ہوئے ان کے دلوں کی جو حالت ہوئی ہوگی اس کا بیان آسان نہیں۔ زمین کھیت باڑی، گاؤں کے گلی کوچے، یہ سب کس قدر عزیز تھے انھیں ۔۔۔ ان کھیتوں میں سرسبز و شاداب فصلیں لہلہاتیں تو انھیں ایسا محسوس ہوتا جیسے دھرتی کی ممتا انگڑائیاں لے رہی ہے۔ انھیں ان کھیتوں میں ماں کی گود کا سا سکون اور پیار نصیب ہوتا۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ اب۔۔۔۔۔!! وہ سکون کہاں ۔۔۔ اب تو ان کھیتوں میں دھول اڑ رہی تھی، کھیتوں کے بندھاروں، مینڈھوں پر ان کے اپنے جانوروں کی نعشیں پڑی تھیں جن پر کتوں، گدھوں اور چیلوں کے غول منڈلا رہے تھے۔ سارے گاؤں ویران ہو گئے تھے ۔۔۔ پرماتما جیسے روٹھ گیا تھا۔!!

علی میاں اور بسنگیا بھی اپنے بیوی بچوں سمیت میکو بابا کے ساتھ گاؤں چھوڑ کر روزگار کی تلاش میں شہر آ چکے تھے میرے گھر کے پچھلے حصے میں بنے ہوئے دو چھوٹے چھوٹے کمروں میں ان کے رہنے کا میں نے بندوبست کروا دیا تھا۔

علی میاں اور بسنگیا گاؤں میں ہمارے کھیتوں پر بٹائی پر کام کیا کرتے۔ زمین ہماری تھی اور محنت وہ کرتے۔ آمدنی برابر

برابر تقسیم کرلی جاتی۔

غریب، نادار اور ان پڑھ مگر مخلص۔ علی میاں اور سنگیا۔
رات دن کھیتوں میں کام کرنے کے باوجود ان کی زندگی غیر اطمینان بخش رہی۔ بس، دو وقت پیٹ کی روٹی مل جاتی۔ عید، بقرعید اور دیپاولی و دسہرے کے موقع پر مشکل سے کپڑے بن جاتے۔ سال، دو سال میں جب بچوں کی شادی بیاہ کا مسئلہ آکھڑا ہوتا تو وہ بھی جوں توں کرکے نپٹ ہی جاتا۔ ان کا اور ان کے بچوں کا نہ کوئی روشن مستقبل تھا اور نہ ان کے سامنے خوشحال اور بہتر زندگی کا کوئی واضح تصور یا منصوبہ تھا۔ وہ اکثر سیٹھوں ساہوکاروں کے مضبوط شکنجے میں جکڑے رہتے۔

شہر آنے کے بعد چند ہفتوں تک انھیں کوئی کام نہ مل سکا۔ اس عرصے میں وہ میرے مہمان رہے۔ پھر انھیں کام مل گیا۔ دن بھر وہ محنت و مشقت کا کام کیا کرتے اور رات کو نصف پیٹ روٹی اپنے بال بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے اور سو جاتے ــــ اس طرح چھ سات ماہ گزر گئے۔

اب شہر کے حالات بھی روز بروز سنگین صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ شہر کی آبادی میں کافی اضافہ ہو چکا تھا، اشیائے خورد و نوش کی گرانی نے جیسے انسانوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ سیمنٹ اور لوہے کی قلت و گرانی سے تعمیری کام پر بھی غیر معمولی اثر پڑا جس کے باعث علی میاں اور سنگیا کے روزگار کو پھر ایک بار خطرہ پیدا ہو گیا۔ انھیں ایک دن کام ملتا اور دو دن وہ روزگار کی تلاش میں شہر کی سڑکیں ناپتے پھرتے۔۔۔ اب تو علی میاں اور سنگیا کی گھر والیوں نے بھی پاس پڑوس کے مکانوں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ بھی دن بھر برتن مانجھتیں، کپڑے دھوتیں، اور بچوں کو سنبھالتیں پھر رہا سہا، باسی کوسی جو کچھ بھی رات کے کھانے کے بعد مل جاتا اپنے ساتھ لے آتیں اور اپنے اور بچوں کے پیٹ کی دوزخ بھرتیں۔!

میرے والد نے بھی ایک چھوٹا سا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اس سے کوئی خاطر خواہ آمدنی نہ ہوتی تھی تاہم ان کا وقت کٹ جاتا اور گاؤں کی جان لیوا یادیں قدرے کم ہو جاتیں ــــ!

کبھی کبھار میں علی میاں اور سنگیا کی مدد کر دیا کرتا۔ لیکن میرا ضمیر اس سے مطمئن نہ ہوتا، وہ لوگ اور بھی زیادہ امداد کے مستحق تھے، ان کے مجھ پر اتنے احسانات تھے کہ میں شاید انھیں کبھی ادا نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اپنے بچپن کے دن جب بھی یاد آتے ہیں تو علی میاں اور سنگیا کے معصوم اور بجھے بجھے سے چہرے میری نظروں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ میں بہت چھوٹا تھا۔ وہ لوگ مجھے اپنے کاندھوں پر بٹھائے کھیتوں پر لے جایا کرتے، دن بھر مجھے اپنے پاس رکھتے اپنی گائے کا گرم گرم اور میٹھا میٹھا دودھ پلاتے، جوار کا گرم گرم ہڑلا، چنے کے اولے اور گیہوں کی اُمیاں کھیت کے بندھارے پر بھون بھون کر کھلاتے، کتنا پیار بھرا تھا ان کا دل۔! محبت، خلوص اور ہمدردی کے پاک اور مقدس جذبات سے سرشار ــــ۔۔۔ بے لوث اور بے غرض خدمت کرنا بس انھیں کا حصہ تھا ــــ!

مجھے اچھی طرح یاد ہے علی میاں اور سنگیا۔۔۔ سرسبز شاداب کھیتوں میں ہوا کے نرم و نازک جھونکوں سے جھومتی ہوئی گیہوں کی بالیوں کو دیکھتے تو خوشی سے ان کے دل بھی جھوم اٹھتے اور وہ والہانہ انداز میں ان تیار فصلوں کو اس طرح اپنے مضبوط اور محبت بھرے بازوؤں میں بھینچ لیتے جیسے وہ فصل نہیں ان کی اپنی اولاد ہے۔ کھیتوں میں ہل جوتنا بونا، کیاریاں بنانا، ان میں پانی دینا، کھیتوں کی نگرانی کرنا ــــ یہ سب کام وہ اتنے جتن اور لگن سے کیا کرتے جیسے وہ اپنی ماں کی خدمت کر رہے ہوں، ماں سے انھیں آشیرواد لینا ہو۔ دھرتی یقیناً ان کی ماں ہی تو تھی،۔۔۔۔!!۔۔۔ میں اکثر ان کے اس عجیب و غریب رشتے کے بارے میں سوچتا کہ کسان اور زمین کا یہ رشتہ بھی واقعی کتنا مقدس رشتہ ہوتا ہے۔ پھر فصل تیار ہو جاتی تو وہ خوشی سے پاگل ہی ہو جاتے مسرت و شادمانی میں سرشار۔۔۔۔۔۔ ہنستے ہوئے گیت گاتے ہوئے فصل کاٹتے۔ کھلیان میں اس کو اکٹھا کرتے اور اناج سے بھرے بھرے بورے لیے گھر آتے۔

ان دنوں میں بہت کم عمر تھا اس لیے ان کی خوشیوں میں

برابر کا شریک ہو جاتا۔ لیکن اب جبکہ میں بچہ نہیں رہا اور بہتر طریقے سے سوچنے سمجھنے اور اپنی رائے قائم کرنے کے قابل ہو گیا ہوں تو مجھے اس بات کا احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے کہ علی میاں اور سنگپا رات دن جتنی محنت کرتے انھیں اپنی محنت کا اتنا صلہ نہیں ملتا ــــ وہ زمین پر دن رات اپنی پوری طاقت و توانائی صرف کر دیتے تھے لیکن ان کی محنت کوئی اصولی اور صحیح انداز میں نہیں ہوا کرتی۔ وہی پرانے اور دقیانوسی قسم کے زرعی آلات استعمال کیا کرتے، جس سے ان کا وقت، قوت اور توانائی بہت زیادہ صرف ہو جاتی اور اس کا نتیجہ کچھ زیادہ بہتر نہیں برآمد ہوتا۔ میں نے والد صاحب کے علاوہ علی میاں اور سنگپا سے بار بار جدید سائنسی آلات اور حکومت کی جانب سے دی جانے والی تمام سہولتوں سے بھرپور استفادہ حاصل کرنے کو کہتا لیکن وہ لوگ اپنے پرانے طور طریقوں کو بدلنا جیسے گناہ سمجھتے تھے۔ اس لیے میری باتوں کا انھوں نے کوئی اثر قبول نہ کیا تھا اور اسی ڈگر پر اپنی توانائیاں صرف کیے جا رہے تھے۔ اتنی محنت مشقت کے باوجود ان کی زندگیاں قابل رحم تھیں، ان کا اور ان کے بچوں کا مستقبل انتہائی تاریک تھا۔ برسہا برس سے وہ کھیتی باڑی کے کام میں لگے ہوئے تھے لیکن حالت یہ تھی کہ پچھلے ایک دو سال سے قحط کے حالات پیدا ہو جانے پر وہ ان حالات کا پوری جرأت مندی سے مقابلہ کرنے کے قابل نہ تھے۔ یہی ان کی محنت کا صلہ تھا۔ یہی ان کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔!!

وہ لوگ اب شہر آ گئے تھے اور اپنی مجبور، بے کس اور بے سہارا زندگی کے دن جوں توں گزار رہے تھے!

لیکن اب......! آج کی اس طوفانی اور اطمینان بخش بارش سے تو اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا کہ سارے ندی نالے کنویں تالاب اور دریا ایک بار پھر پانی سے بھر گئے ہوں گے۔ ہر طرف جل تھل ہو گا۔ پھر سے وہی دن لوٹ آئیں گے......!

اس بارش سے یوں تو سب ہی کو سکون نصیب ہوا ہو گا لیکن علی میاں اور سنگپا کی حالت تو دیدنی تھی۔ ابا حضور بھی خوشی سے جیسے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ انھوں نے سنگپا اور علی میاں کو رات کے کھانے کے لیے اپنے کمرے میں ہی بلا لیا تھا اور کھانے کے دوران دسترخوان پر بیٹھے اگلے پروگراموں سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی: "علی میاں.... اب ہمیں آج کل میں گاؤں چلا جانا چاہیے، بارش تو خوب ہو گئی ہے بس ایک دو دن میں کھیتوں پر کام شروع ہو جائیں گے۔" ابا حضور نے کہا۔

"ہو جت! ہنگی اپنے کنے تو کچ بی نئیں ہے، پورے بیلاں مر گو گئیں، ہل بکھر بی نئیں ہے۔ پانی تو پڑا ئے ہنگی.... زمین میں پیرنے کو بیج بی تو ہونا.... وہ بی نئیں اجریا اپنے کنے....!" علی میاں نے کہا۔

"علی میاں نجے چینتا رو دورا۔! ماتانا اُور لا ام اُندی الوڑو! ایڈ لولے دو بندی لے دو،؟ وٹی جینو تیسو کوئی ننتی میدا کو ٹکو دالے؟ تینا نیکی کٹر لوکی رتو ٹے لے دو بھومی لو پٹا نیکی گنجل یاڑ لیکی دیا والے؟" (علی میاں سچ کہتے ہیں سرکار۔ ہمارے پاس گاؤں میں کیا ہے ان دنوں۔ بیل ہے نہ بنڈی، خالی کھیت لے کر سر پہ ماریں گے کیا۔ پیٹ کو کھانے کے لیے روٹی نہیں ہے زمین میں بونے کے لیے دانہ کہاں سے لائیں۔؟) سنگپا نے کہا:

"تم لوگ جو کہہ رہے ہو ٹھیک ہے، لیکن..... اگر ... ایسا ہی رہا تو پھر کام کیسے چلے گا۔؟" ابا حضور نے ان کی ہاں بھرتے ہوئے تشویش بھرے انداز میں کہا: "کسی سیٹھ ساہوکار سے قرض لے کر کام چلائیں گے، اب کی فصل پر قرض ادا کر دیں گے!"

میں بھی وہیں بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا: "ابا حضور.... یہ سب منصوبے بے کار ہیں... آج تک آپ لوگ سیٹھوں ساہوکاروں کے شکنجے میں بری طرح پھنسے رہے۔ یہ سیٹھ اور ساہوکار کسانوں کا خون چوس لیتے ہیں۔ اور جب قحط پڑتا ہے تو ان کے لیے وہ مزید خوشیاں لے آتا ہے۔! آپ لوگ حکومت کی دی ہوئی بے شمار سہولتوں کا صحیح انداز میں فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔ قومی ملکیت میں لیے ہوئے بینک ہمارے کسانوں کو بڑے سے بڑا قرض کم شرح سود پر دے رہے ہیں۔ حکومت قحط زدہ علاقوں کے کسانوں کی امداد کے لیے

مختلف قسم کے ہمہ مقصدی منصوبے بنا چکی ہے۔ جدید سائنسی اور تکنیکی آلات کے ساتھ ان آلات کو چلانے اور ان کا استعمال سکھانے کے لیے ماہرین بھی فراہم کیے جا رہے ہیں۔ بہترین قسم کا بیج بھی مہیا کیا جائے گا ـــــ ہمیں ان سہولتوں سے مکمل استفادہ حاصل کرنا چاہیے۔" ـــــ قدرے توقف کے بعد میں نے مزید کہا: "اب تو ان دقیانوسی طریقوں کو چھوڑ دینا چاہیے۔ اپنی محنت و توانائی کا صحیح استعمال کیجیے۔ اور دوسری بات میں آپ سے یہ عرض کروں گا۔ ہم نے اپنی آبائی زمینوں کو چھوٹے چھوٹے حصوں بخروں میں تقسیم کر رکھا ہے، ان سارے کھیتوں کے بندھاروں اور باندھ کپتوں کو صاف کر کے ایک وسیع و عریض خطہ بنا ڈالیں۔ ان بندھاروں اور باندھ کپتوں سے ہماری کئی ایکڑ قابلِ کاشت زمین برباد ہو رہی ہے! اگر ہم زمین کا ایک وسیع خطہ بنا کر جدید طرز سے اپنی کھیتی کریں تو میں یہ بات یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ گزشتہ دو سالوں میں قحط کی وجہ سے جتنے اناج کی کمی واقع ہوئی ہے اس سے کہیں زیادہ اناج ہم اُگا سکیں گے۔"!

"لیکن بیٹے یہ سب کام ہم کس طرح کر سکیں گے ـــــ؟"

ابا حضور نے کہا:

"کوئی مشکل کام نہیں ہے ابا حضور یہ"! میں نے کہا: "آپ ہمت کر کے یہ کام شروع تو کر دیجیے پھر دیکھیں گے سارے گاؤں والے آپ کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ہم اپنی غذائی ضرورتیں پوری کرنے لگیں گے۔"! ـــــ "ابا حضور..."!

میں نے کہا: "اب اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ بھی تو نظر نہیں آتا۔ کیونکہ اب ہمارے ہاں نہ تو زراعت کے وہ قدیم آلات باقی رہے اور نہ ہی جانور ہی زندہ ہیں ـ! کیوں نہ ہم اپنے اس نئے سال کا آغاز ایک نئے عزم و ارادہ سے کریں۔ اور نئے ساز و سامان کا پورا پورا استعمال کریں۔"! میں نے یہ سب جیسے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ میری اس بات پر ابا حضور خاموش رہے۔ ان پر میری باتوں کا جیسے اثر ہو رہا تھا۔ علی میاں اور سنگیا بھی اپنے آپ کو اس نئے طرز کے زرعی کام کاج کے لیے خود کو تیار کرتے ہوئے محسوس کر رہے تھے ـــــ!!

دوسری صبح بہت روشن، دل کش اور حسین تھی، رات کی بارش سے ساری چیزیں دُھل کر جیسے صاف شفاف ہو گئی تھیں، اور ابھرتے ہوئے سورج کی پیلی پیلی نیم گرم دھوپ میں چمک رہی تھیں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے نرم و نازک جھونکوں میں جاتی ہوئی پریشانیوں اور آنے والی خوشیوں کے نغمے صاف سنائی دے رہے تھے، ریلوے پلیٹ فارم پر لوگوں کا بہت کم ہجوم تھا۔ والد صاحب، علی میاں اور سنگیا اور ان کے بیوی بچے گاؤں جانے کے لیے ریل میں سوار ہو چکے تھے، ان کے چہروں پر ایک انجانی مسرت اور خوشی کے دل فریب احساسات کی پرچھائیاں رقصاں تھیں اور آنکھوں میں ایک نئے عزم و ارادہ کے نہ بجھنے والے چراغ روشن تھے۔ کچھ دیر بعد ریل آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی پلیٹ فارم چھوڑ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔

★

ادبی ترجمے اور قومی یک جہتی

(صفحہ ۴۴ کا بقیہ)

دوسرے ممالک پر اپنے اثرات مرتب کر رہے ہیں اور نیا زمانہ مطالبہ کر رہا ہے کہ ہم اپنے سے دور کے ممالک کے بارے میں معلومات حاصل کریں اور وہاں کے تمام حالات نیز تہذیب و معاشرت سے واقف ہوں۔ ایسی صورت میں ہمیں اپنے ہی ملک کے مختلف علاقوں سے غیر متعلق یا وہاں کی طرزِ زندگی سے لاعلم اور مختلف زبانوں کے ادبی سرمایہ سے ناواقف نہ رہنا چاہیے۔ اس کے لیے مفید اور کارآمد ذریعہ ترجمے ہیں جنھیں فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ ابتدا میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان مختلف التوع لسانی گروہوں کا ملک ہے۔ ترجموں کے ذریعہ ان مختلف لسانی گروہوں اور مختلف لسانی علاقوں کے درمیان تعلق قائم کر کے کثرت میں وحدت پیدا کی جا سکتی اور انکے وسیلے سے ملک میں رہنے والے افراد کو ذہنی طور پر ایک دوسرے سے نزدیک لا کر ملک کے مختلف حصّوں کے درمیان ہر قسم کے اختلافات لسانی تعصبات و تنازعوں کو بھی دور کیا جا سکتا ہے۔ ترجموں سے پورے ملک میں ایک خوشگوار اور خوش آئند فضا پیدا کرنے میں اور قومی یکجہتی کے خوابوں کی تکمیل میں مدد مل سکتی ہے۔

★

اترپردیش میں حصول آزادی کے بعد کی ترقیاں

امیر احمد صدیقی

ہمارے ملک کی آزادی کے ۲۶ سال پورے ہو چکے ہیں۔ اس قلیل عرصے میں ہندستان اپنے عظیم رہنماؤں کی سوجھ بوجھ اور عوام کی انتھک کوششوں کے سبب ترقی کے راستے پر برابر گامزن رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اقوام عالم میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔ ہندستانی عوام نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو مہاتما گاندھی کی قیادت میں ایسے ذرائع سے جن کا استعمال اس سے پہلے تاریخ میں کبھی نہیں کیا گیا تھا، عہد حاضر کی عظیم ترین سامراجی طاقت سے اپنے تقدیر کے خدوخال مرتب کرنے کا حق چھین لیا تھا۔ لیکن آزادی کے فوراً ہی بعد ہم کو ایک کرم خوردہ اور انحطاط پذیر سماجی اور معاشی نظام ملا تھا اور ہمیں اس فرسودہ نظام کی نوتعمیر کرنے کے لیے کوئی راستہ بتلانے والا بھی نہ تھا۔ چنانچہ ہمیں ابتدا میں خود ٹٹول کر اپنا راستہ تلاش کرنا پڑا لیکن بتدریج ہماری رفتار ترقی تیز تر ہو گئی اور اب ہم نے ایک طویل فاصلہ طے کر لیا ہے۔ ایک ملک جو صرف ۲۶ سال قبل نیم غنودگی کی حالت میں تھا اور قسمت کا تابع تھا آج بامقصد اور تعمیری سرگرمیوں کا گہوارہ ہے اور ایک خوش حال اور مستحکم سوشلسٹ سماج کی تشکیل کرنے کا عزم مصمم کر چکا ہے۔

ہماری ریاست اترپردیش بھی ملک کے ساتھ ساتھ شاہراہ ترقی پر گامزن ہے اور یہاں بھی آزادی کی مستحکم بنیاد پڑ چکی ہے اور ایک ایسا نظام تیزی سے عمل میں آ رہا ہے جو صرف چند مخصوص طبقوں کے لیے نہیں بلکہ غریب اور مراعات سے محروم طبقوں کی ضرورتوں امنگوں اور تمناؤں کو پورا کر سکے۔ عام آدمی کی زندگی میں انقلاب لانے اور اس کے رہن سہن کے معیار کو بلند کرنے کے سلسلے میں متعدد دوررس اقدامات کیے گئے جن کے اثرات اظہر من الشمس ہیں۔

ہریجنوں اور پسماندہ طبقوں کی ترقی

حصول آزادی کے بعد ہریجنوں اور پسماندہ طبقوں کے لیے جن کا سماج میں کوئی مقام نہ تھا، امید کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ریاستی حکومت نے مہاتما گاندھی کی مہم کو آگے بڑھاتے ہوئے ان کی ترقی اور سماج میں ان کو جائز مقام دلانے کے لیے ایک پروگرام شروع کیا۔ چھوت چھات برتنے والے اشخاص کے خلاف پولیس کو قانونی کارروائی کا اختیار دینے کے لیے قانون وضع کیا گیا۔ اب تک ان کی تعلیم اور دیگر فلاحی پروگراموں پر کئی کروڑ روپیہ کی رقم خرچ کی جا چکی ہے۔ ہریجن بستیوں کو پینے کے پانی اور بجلی کی سہولتیں فراہم کرنے پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ اقوام مندرج فہرست کے افراد کو ان کی بستیوں اور مکانات کی تعمیر کے لیے خاتمہ زمینداری ایکٹ میں ترمیم کی گئی ہے۔ ان کو مکانات بنانے نیز اپنی بستیوں کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے ضروری سہولتیں فراہم کی گئیں۔ ضلع مجسٹریٹوں اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ہریجنوں اور سماج کے دیگر کمزور طبقوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے ذاتی طور پر ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ریاست میں ان طبقوں کی معاشی اور سماجی حالت کو بہتر بنانے کے لیے مربوط کوششیں جاری ہیں۔

اصلاحات اراضی

اصلاحات آراضی کے سلسلے میں اترپردیش نے جو پہلا قدم اٹھایا وہ برسہا برس کے زمینداری نظام کو ختم کرنا اور زمین پر

کسانوں کی ملکیت کو قائم کرنا تھا جس کے نتیجے میں کاشتکار اور حکومت کے درمیان براہ راست رابطہ قائم ہوگیا۔ زمین جوتنے بونے والے شخص کو زمین پر حق ملکیت دے کر خواہ وہ اصل کاشتکار ہو یا شکمی کاشتکار، حکومت نے زراعتی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے تحریک بہم پہنچائی۔ اس ایکٹ کے تحت تقریباً سوا لاکھ ایکڑ مزروعہ اراضی حاصل ہوئی جو مختلف اداروں میں تقسیم کر دی گئی جن میں بے زمین افراد بھی شامل ہیں۔ چونکہ اس کے بعد بھی بڑی بڑی جوتیں سابق درمیانی اشخاص کے قبضے میں رہ گئی تھیں اس لیے ۴۰ ایکڑ کی انتہائی حد مقرر کر دی گئی اور فاضل زمین بے زمین افراد خاص طور سے ہریجنوں میں تقسیم کر دی گئی۔ بدلے ہوئے سماجی اور سیاسی حالات کے پیش نظر ۴۰ ایکڑ اراضی کی انتہائی حد کو بھی زیادہ تصور کیا گیا اور اس کو گھٹا کر آبپاشی شدہ رقبے کی صورت میں ۱۸ ایکڑ اور غیر آبپاشی رقبہ کی صورت میں ۲۷ ایکڑ کر دی گئی ہے۔ یہ ترمیم شدہ قانون بابت میں گزشتہ ۸ جولائی سے نافذ ہوگیا ہے۔ یہ اصلاحات اراضی کے میدان میں ایک بڑا قدم ہے جس سے دیہی علاقوں کے کسانوں میں عدم مساوات کو کم کرنے اور فاضل زمین کی مناسب تقسیم میں بڑی مدد ملے گی اور اس کے ذریعے تقریباً دو لاکھ زمین دستیاب ہو جائے گی۔ اصلاحات اراضی کے سلسلے میں دوسرا بڑا قدم جوتوں کی چک بندی ہے۔ منتشر جوتوں کو ایک مقام پر یکجا کر دینے سے کسان اپنے وسائل اور محنت کا بہترین استعمال کر سکتے ہیں۔

آبپاشی

کاشتکاروں کو ناسازگار قدرتی حالات سے محفوظ رکھنے اور پہاڑی علاقوں، بندیل کھنڈ اور مشرقی اضلاع جیسے پسماندہ اور نیم ترقی یافتہ علاقوں میں آبپاشی کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے جہاں ان کی بے حد کمی تھی، آبپاشی کی بڑی درمیانی اور چھوٹی تحریکوں پر تقریباً ساڑھے تین سو کروڑ روپیہ کی رقم صرف کی جا چکی ہے۔ ان اقدامات سے نہروں کی لمبائی اور ریاستی ٹیوب ویلوں کی تعداد میں بہت کافی اضافہ ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ ریاست میں ایک آبپاشی کمیشن بھی قائم کیا جا چکا ہے جو علاوہ دیگر امور کے کسانوں کو آبپاشی کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنے کے سلسلے میں اقدامات کرنے کا مشورہ دے گا۔

زراعتی پیداوار

مختلف اقدامات کے نتیجے میں گزشتہ ۲۶ سال کے دوران ریاست کی زراعتی پیداوار دوگنی ہوگئی۔ ان اقدامات میں خاتمہ زمینداری اور دیگر اصلاحات اراضی، آبپاشی کی سہولتوں میں توسیع، زراعتی ضروریات کی بر وقت اور یقینی طور پر فراہمی زیادہ پیداوار کی اقسام کی کاشت، زراعتی آلات کی فراہمی اور ان کی مرمت کے لیے خدمتی مراکز کا قیام اور زمین کے تحفظ سے متعلق اسکیمیں شامل ہیں۔ اب ہماری ریاست میں زراعتی صلاحیتوں کے سلسلے میں خود اعتمادی کی فضا پیدا ہوگئی ہے اور اتر پردیش اس مرحلے سے گزرنے کے بعد زراعتی پیداوار کو ایک انقلاب میں تبدیل کر رہا ہے۔

بجلی

بجلی کو جو زرعی اور صنعتی پیداوار کے لیے لازمی ضروری ہے سب سے زیادہ اولیت دی گئی۔ اس مدت میں ریاست میں متعدد بجلی گھر قائم کیے گئے جن کے نتیجے میں بجلی کی پیداواری صلاحیت دس گنی ہوگئی ہے۔ متعدد پراجیکٹوں کی تکمیل کے بعد جن کے لیے یا تو مرکزی حکومت نے منظوری دے دی ہے یا جو منظوری کے مرحلے میں ہیں، امید کی جاتی ہے کہ ریاست میں بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت ڈھائی ہزار میگاواٹ سے کہیں زائد ہو جائے گی۔

صنعتی ترقی

آزادی سے قبل اتر پردیش کا شمار صنعتی اعتبار سے ملک کی زیادہ ترقی یافتہ ریاستوں میں نہیں تھا۔ بڑے پیمانے کی صنعتوں کی تعداد بہت کم تھی اور ان کی حالت بھی بہت اچھی نہ تھی۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کا تو قریب قریب فقدان تھا لیکن آزادی کے بعد تیزی سے صنعتی ترقی شروع ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۵۰-۵۱ء سے اب تک تقریباً ۵۰۰ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری سے بڑے اور اوسط درجے کے تقریباً ۵۰۰ صنعتی وحدے قائم کیے جا چکے تھے

نئے صنعتی واحدوں کے قیام اور موجودہ واحدوں کی توسیع سے متعلق لائسنسوں کے دائرۂ عمل میں متعدد نئی صنعتیں آگئی ہیں۔ اس وقت میں چھوٹے پیمانے کے صنعتی واحدوں میں بھی معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ریاستی حکومت نے سرکاری زمرے میں چار کارخانے قائم کیے ہیں ان میں سے دو واحدے سیمنٹ سے متعلق ہیں اور ایک پری سیزن انسٹرومنٹ واحدہ اور ایک میگنائٹ پلانٹ ہے۔ اب ریاست کی برآمدات بھی کافی بڑھ گئی ہے۔ ریاستی حکومت نے ہینڈلوم اور پاورلوم صنعت کی معاشی حالت بہتر بنانے کے لیے بھی خصوصی اقدامات کیے ہیں۔

منصوبہ بندی

ریاست میں منظم معاشی ترقی کا دور اپریل ۱۹۵۱ء سے شروع ہوا جبکہ پہلا پنج سالہ منصوبہ شروع کیا گیا۔ اس کے بعد دوسرے تیسرے اور چوتھے پنج سالہ منصوبے اور تین سالہ منصوبے شروع کیے گئے۔ منصوبہ بندی کے فوائد کا اندازہ فی کس آمدنی، ریاستی آمدنی، فی کس پیداوار میں اضافہ تعلیم، تکنیکی ٹریننگ، صحت اور دیگر شعبوں میں بچت، سرمایہ کاری اور ترقی سے لگایا جاسکتا ہے۔ منصوبہ بندی کو اور زیادہ موثر اور مفید بنانے کے لیے مسلسل کوششیں جاری ہیں۔

تعلیم

ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ، تینوں مرحلوں پر تعلیم کی کافی توسیع ہوئی ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ گذشتہ ۲۶ برسوں کے دوران تعلیم کی مد پر اخراجات ۸۰ گنا ہو گئے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے شعبہ میں اسکولوں اور ان میں پڑھنے والے طلبار کی تعداد میں بہت ہی اضافہ ہوا ہے۔ اسی طرح اب ڈگری کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد بڑھ کر بالترتیب ۱۴۱ اور ۱۱ ہوگئی ہے۔ ریاستی حکومت نے ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کا کام دیکھنے کے لیے دو الگ الگ نظامتیں قائم کی ہیں۔ حکومت کا اہم ترین اور انقلابی اقدام پہلے سے آٹھویں درجہ تک پرائمری اور جونیر تعلیم کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا ہے۔ اس کام کو دیکھنے کے لیے ابتدائی تعلیم کا ایک بورڈ قائم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ تعلیمی بورڈ کے کام کو بھی لامرکزی بنایا جارہا ہے۔ تعلیمی نصابوں اور درسی کتابوں کی اصلاح کے لیے بھی اقدامات کیے گئے۔ ٹیچروں کو اپنے فرائض کی بہتر انجام دہی کے قابل بنانے کے لیے ان کے مشاہرات اور شرائط ملازمت کو بہتر بنا دیا گیا ہے۔ تکنیکی تعلیم کی کل ہند کونسل کی سفارشات کے مطابق تکنیکی تعلیم کو بھی ترقی دی جاری ہے۔

اردو کی ترقی

اردو کی ترقی کے لیے ایک خصوصی افسر، ڈپٹی ڈائرکٹر (اردو) کی تقرری اور ریاستی سطح پر اردو اکاڈمی کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ریاست کے شہری علاقوں کے ہر پرائمری اسکول میں اردو کی تعلیم کی سہولت فراہم کرنے کے لیے تقریباً چار ہزار اردو ٹیچروں کی تقرری کی گئی ہے۔ جونیر اسکول کی سطح تک تمام کتابیں اردو میں شائع کی جاچکی ہیں۔ تمام تعلیم شدہ اردو میڈیم اسکولوں اور مکتبوں کو مالی امداد دیے جانے کے اقدامات کیے جارہے ہیں۔ اس کے علاوہ نارمل اسکولوں میں اردو جاننے والے امیدواروں کو بھی داخلہ دینے کی تجویز ہے تاکہ پرائمری اسکولوں کے لیے اردو ٹیچروں کی کمی کو دور کیا جاسکے۔ نئے اردو میڈیم اسکولوں کے قیام کی کوشش کی جارہی ہے۔

علاج صحت وخاندانی منصوبہ بندی

عوام کو علاج اور صحت عامہ سے متعلق سہولتوں کی فراہمی کے سلسلے میں اہم اقدامات کیے گئے۔ حصول آزادی سے قبل اس سلسلے میں فی کس اخراجات ۴۴ پیسے سے بڑھ کر تقریباً ۵ روپیہ ہوگیا ہے میڈیکل تعلیم وتربیت کے شعبے میں میڈیکل کالجوں کی تعداد دو سے نو ہوگئی ہے جہاں سے ہر سال ۵۰۰ ڈاکٹر فارغ التحصیل ہوکر نکلتے ہیں۔ ڈسپنسریوں اسپتالوں اور ان میں داخل ہونے والے مریضوں کے لیے پلنگوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوگیا ہے۔ وبائی امراض اور چھوت کے امراض پر کافی حد تک قابو پالیا گیا ہے۔ ملیریا انا ملیریا کی بیخ کنی کے پروگرام کو کامیابی کے ساتھ عملی جامہ پہنایا گیا ہے۔ حال ہی میں حکومت نے ریاستی میڈیکل کالجوں اور سرکاری اسپتالوں کے ڈاکٹروں کی نجی پریکٹس ممنوع قرار دی ہے۔ خاندانی

منصوبہ بندی پروگرام ریاست بھر میں زور شور سے بروئے کار لایا گیا ہے اور اس سلسلے میں ایک ہزار سے زائد خاندانی فلاحی مرکز کھولے گئے ہیں۔ آیورویدک، یونانی اور ہومیو پیتھک طریقہ ہائے علاج کو بحال کرنے کے لیے بھی کافی کام کیا گیا ہے۔

سماجی فلاح

بے سہارا معذور کمزور افراد کی امداد اور خبر گیری کے لیے محکمہ سماجی فلاح و بہبود قائم کیا گیا۔ سماجی فلاح پروگراموں میں خواتین کی فلاح و بہبود کے کام کو سب سے زیادہ اولیت دی گئی ہے۔ دو نگہداشت گھر، ایک پناہ گھر، ایک مہیلا آشرم، ملازمت کرنے والی خواتین کے لیے دو ہوسٹل اور دو پناہ گھر نیز تربیتی درکشاپ لکھنؤ، میرٹھ، فتح پور، سہارن پور، کانپور اور وارانسی میں قائم کیے گئے۔ بہت سے بے سہارا عورتوں کی شادی کا انتظام ریاستی حکومت نے کیا تاکہ ان کی بحالی کی جا سکے۔ آگرہ میں جنگ سے متاثرہ خاندانوں کے بے سہارا بچوں کے تحفظ کے لیے ایک اطفال گھر کھولا گیا اور مہیلا سدنوں میں رہنے والی عورتوں کے بچوں کے لیے دیوریا، کانپور اور میرٹھ میں بال سدن کھولے گئے ہیں۔ فلاح اطفال کے سلسلے میں سب سے اہم اقدام اتر پردیش اطفال ایکٹ ۱۹۵۱ء کی تشکیل ہے جس کا نفاذ ریاست کے ۲۶ اضلاع میں کیا گیا ہے۔ بوڑھے اور معذور افراد کے لیے ایک رہائش گاہ بھی قائم کی گئی ہے۔

یہ ہے ایک مختصر جائزہ ان ترقیاتی کاموں کا جو پچھلے ۲۶ سال کے عرصے میں ریاست کے مختلف اہم محکموں میں انجام دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ امداد باہمی، نقل و حمل، اجتماعی ترقی، محنت، لوکل سیلف گورنمنٹ، روزگار و تربیت وغیرہ محکموں میں بھی زبردست ترقیاتی پروگرام بروئے کار لائے گئے ہیں۔

★

پنڈت نہرو کی فکر کے چند پہلو (صفحہ ۸ کا بقیہ)

مردہ تصور نہیں۔ سائنس اور سائنسی مبادیات اور زندگی کے مختلف مسائل سے متعلق کتابیں آخری وقتوں تک پنڈت نہرو کی رفیق سفر رہیں۔ مائیکل بریچر کے مطابق جب انھوں نے ۱۹۵۸ میں پنڈت نہرو کے ساتھ اندھرا کا دورہ کیا تھا ڈاکٹر او پنہائمر کی مشہور و معروف کتاب (SCIENCE AND THE COMMON UNDERSTANDING) پنڈت نہرو کے زیر مطالعہ تھی۔ یہ بات تسلیم کرنے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو کہ سائنس سچائی کا محض ایک حصّہ، اگرچہ یہ حصہ خاصا بڑا ہے، پیش کرتی ہے لیکن اس ایک حصّہ کو بخوبی جاننا کچھ نہ جاننے اور خلا میں تیر چلانے سے کہیں بہتر ہے۔

انسان پنڈت نہرو کی فکر کا نقطۂ آغاز ہے۔ انسانی فطرت، انسانی مسائل اور انسانی دلچسپیاں ان کے نزدیک بہت اہم ہیں۔ خدا سے تو ایک بار انکار بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اگر ہم انسان ہی سے انکار کر کے ہر چیز کو فضول قرار دیدیں تو پھر رہ ہی کیا جاتا ہے۔

پنڈت نہرو انسان کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو سوکھی ہڈیاں گوشت پوست کی بن جاتی ہیں اور زندہ مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا جلوس، ہم سے کتنا مختلف لیکن ہم سے کتنا ملتا جلتا ہوا، نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

انسان کی فطرت، عناصر فطرت کے خلاف اس کی جد و جہد اس کی جرات، مصائب برداشت کرنے کی اس کی بے پناہ سکت، دوستوں سے وفاداری اور خود فراموشی — انسانی تاریخ کے یہ عناصر پنڈت نہرو کو مسحور کر دیتے ہیں۔ وہ دنیا کو زیادہ حسین، انسان کو زیادہ خوش و خرم، دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی خیالی اور عملی دنیا کا ایک ہی مقصد تھا۔ اور وہ تھا بنی نوع انسان کی بہبود۔ لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے عمل ہی واحد طریق کار ہے۔ عمل کی دنیا ہی میں ماضی، حال سے ہوتا ہوا مستقبل سے جڑ جاتا ہے۔ ماضی ہمیں عمل کے لیے اکساتا ہے، حال ہمارا عمل کا لمحہ ہے اور مستقبل اسی عمل سے وجود میں آتا ہے۔

★

بچوں کی بہبود

——— شری بی۔ این۔ لوتھرا

اب روز بروز یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ بچوں کی بہبود ہمارے اقتصادی ترقیاتی پروگراموں کا ایک اہم اور لازمی جز ہے چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر ہندستان کے پہلے وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو نے ۵ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو بمبئی میں بچوں کی بہبود سے متعلق عالمی بین الاقوامی کانفرنس کے افتتاحی خطبہ میں فرمایا تھا کہ "ہم قومی ترقی کے لیے فیکٹریوں اور مشینری کے قیام کی صورت میں نیز دیگر عام اسکیموں کو بروئے کار لانے کی صورت میں منصوبہ بندی پر غور و خوض کیا کرتے ہیں اور اس خیال میں اس قدر بہہ جاتے ہیں کہ اکثر و بیشتر اس حقیقت پر دھیان نہیں رہ پاتا کہ بالآخر ہر بات کا مدار انسانی وسائل پر ہے۔ دراصل یہ انسان ہے جس پر دھیان دینا ضروری ہے اور جب یہ بات طے ہے کہ انسان پر دھیان دیا جاتا ہے تو اس ضمن میں ایک بالغ انسان کی حیثیت سے کہیں زیادہ ایک بچے کی بہبود پر دھیان دینا ضروری ہے۔

بچوں کی فلاح کے پروگرام میں سرکاری سطح پر کام کے ساتھ ساتھ رضاکارانہ اداروں اور خاندان کی ذمہ داریوں پر بھی توجہ دی جانی چاہیے۔ بچوں کی دیکھ بھال سے متعلق پروگرام میں سرکاری سطح کی کوششوں کے تحت بچوں کی نشوونما کے لیے قومی منصوبہ ہماری توجہ کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔ سرکار کو اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری رقم فراہم کرنا چاہیے، نیز اس کام کی اہمیت سے سب کو باخبر کرنا چاہیے اور اس کام میں پیش قدمی کرنا چاہیے۔ جہاں تک رضاکارانہ اداروں کا تعلق ہے انھیں سرکار کے ساتھ مل کر بچوں کی نشوونما سے متعلق پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کام کرنا چاہیے۔ تاہم اس سلسلے میں خاندان کے بھی کچھ فرائض ہیں۔ لہٰذا ہر کنبے کو اس کی اہمیت سے باخبر کرانا ضروری ہے۔

حکومت نے بچوں کی فلاح و بہبود سے متعلق پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے متعدد اقدامات کیے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک قومی بورڈ کے قیام پر غور و خوض کیا جا رہا ہے۔ اس کے ذریعے بچوں کی بہبود سے متعلق کاموں کی ضرورت پر توجہ مرکوز کرائی جا سکے گی اور یہ بورڈ اس کام کے لیے ضروری قیادت بھی فراہم کر سکے گا۔

بچوں کی بہبود سے متعلق پروگرام کا دائرۂ کار وسیع ہے لہٰذا اس سلسلے میں صحت، تعلیم، اجتماعی ترقی اور زراعت کی وزارتوں نیز منصوبہ بندی کمیشن کا تعاون درکار ہوگا۔ سماجی بہبود کا محکمہ ان وزارتوں کی توجہ اس سلسلے میں بنیادی کاموں کی طرف مبذول کرائے گا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے بین وزارتی سطح پر ایک تال میل کمیٹی کا قیام زیر غور ہے۔

بچوں کی بہبود کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مرکز اور دیہی علاقوں کے درمیان ایک ربط قائم کیا جائے گا کیونکہ ہمارے دیہات ہی دراصل وہ مقامات ہیں جہاں کہ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ اس مقصد کے لیے ریاستی سطح پر ایک بین وزارتی کمیٹی قائم کی جائے گی اور پھر افسروں پر مشتمل اسی طرح کی کمیٹیاں ضلع کے صدر مقامات پر قائم کی جائیں گی اور پھر بلاک کی سطح پر بھی اسی طرح کی کمیٹیاں بنائی جائیں گی۔

بلاک ضلع اور ریاستی سطح پر سماجی بہبود کے محکمے سے نئے کارکن رکھے جائیں گے تاکہ اس طرح کی کمیٹیوں کے درمیان مطلوبہ تال میل قائم کر سکیں۔ اس طرح بچوں کی بہبود سے متعلق قومی پالیسی کو اعلیٰ ترین سرکاری سطح سے لے کر دیہی علاقوں تک بروئے کار لایا جائے گا۔

بچوں کی بہبود سے متعلق کام کرنے والی بہت سی رضاکارانہ تنظیمیں سرکار سے رابطہ قائم کریں گی تاکہ انھیں اس سلسلے میں ضروری کام تفویض کیا جا سکے۔ اس طرح کی رضاکارانہ تنظیموں

کو نہ صرف مالی امداد دی جائے گی بلکہ ضروری سامان بہم پہنچایا جائے گا اور ان کو تربیتی سہولتیں فراہم کی جائیں گی تاکہ وہ بچوں کی بہبود سے متعلق کام کو آگے بڑھانے میں سرکار کا ہاتھ بٹا سکیں۔

خاندان کو بچوں کی بہبود سے متعلق ذمہ داریوں سے آگاہ کرانے کے لیے حالات بہت سازگار ہیں۔ ہندستان کے عوام اپنے بچوں سے پیار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے زندگی میں ترقی کریں اور خوش حالی سے ہم کنار ہوں۔ البتہ خامی یہ ہے کہ دیہات میں رہنے والا خاندان بچوں کی بہبود کی ضروریات سے ناآشنا ہے لہٰذا انھیں ایسی تعلیم بہم پہنچانا ہے تاکہ وہ لوگ یہ بات جان

مربوط انداز پر فراہم کرنا ضروری ہے۔ اسے بچوں کی نشو و نما سے متعلق مربوط نظریہ کا نام دیا گیا ہے۔ بین الاقوامی بچوں سے متعلق اقوام متحدہ کے ہنگامی فنڈ (یونیسف) نے بچوں کی بہبود سے متعلق ان سرویسوں کی فراہمی کو "بچوں کی غور و پرداخت سے متعلق مربوط سروس" کا نام دیا ہے۔

اسکول جانے سے قبل کی عمر کے بچوں کی بہبود کا پروگرام پہلے چھ سال تک کی عمر کے بچوں کے لیے ہے۔ اس کا مقصد بچوں کی صحت کو بہتر بنانا اور انھیں تغذیہ بخش غذائیں فراہم کرنا ہے۔ اس پروگرام کا مقصد یہ ہے کہ بچوں کی ابتدائی عمر میں ان کے جسم میں اتنی قوتِ مدافعت پیدا ہو جائے کہ وہ بیماریوں کو پاس نہ آنے دے۔ اس کے

لکھنؤ میں آل انڈیا غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس کا انعقاد ۱۰ و ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء کو ہو رہا ہے۔ اس کا مقصد جیسا کہ ہم اپنے اکتوبر کے شمارے میں بھی بتا چکے ہیں اردو کو اس کا جائز مقام دلوانا اور اس کی ترقی کے لیے جملہ سہولتیں بہم پہنچانا ہے۔ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ اس پر ہر ہندستانی کا، خواہ وہ کسی مذہب اور کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو برابر حق ہے۔ کانفرنس کے منتظمین قابل شکریہ ہیں کہ انھوں نے اردو کو ایک فرقے سے منسوب کرنے کی ناپاک اور سیکولرزم کے منافی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے کانفرنس کا انعقاد ضروری سمجھا۔ اردو کے غیر مسلم مصنفین بھی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے کانفرنس کے داعیوں کی آواز پر آواز دی اور اس اہم موقع اردو کے تحفظ و بقا اور توسیع و ترقی کے لیے آگے بڑھے۔

——— اڈیٹر

سکیں کہ بہ حیثیت والدین ان کے کیا فرائض ہیں۔ اس کی اہمیت ماں کو خاص طور پر ذہن نشین کرانا ہے۔ اسے زمانہ حمل سے ہی اس سلسلے میں ضروری مدد دی جاتی ہے۔

پیدائش کے بعد چھ سال تک کا عرصہ بچے کے لیے بہت اہم ہے تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ اس عرصے میں بچوں پر جو مضر اثرات پڑتے ہیں ان کی وجہ سے بچے کی نشو و نما پر برا اثر پڑتا ہے اور کچھ اثرات تو ایسے ہیں کہ ان کا ازالہ ہی ممکن نہیں۔

اس عرصے کے دوران بچے گرد و پیش کے بہت سے غیر محفوظ حالات سے گزرتے ہیں صحت، غذا، تعلیم، تفریح اور سماجی بہبود کے ضمن میں ان کی ضرورتیں ایک دوسرے سے متعلق ہوتی ہیں۔ انھیں

علاوہ بچے کی شخصیت کے ارتقا سے متعلق اقدامات بھی اسی پروگرام کا جز ہیں۔ اس پروگرام کے تحت گھر اور سماج میں بچے کو مناسب ماحول کا ملنا ضروری ہے تاکہ اسے اپنے تحفظ کا احساس ہو سکے اور اسے ضروری پیار مل سکے۔

اسکول جانے سے قبل بچے کی تعلیم میں کیا کیا شامل کیا جانا چاہیے اس بارے میں کافی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ پرائمری اسکول جانے کی تیاری ہے۔ کچھ لوگ اس مرحلے پر بچوں کو اس طرح کی پابندی سے بری رکھنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں مقاصد کی صحیح صحیح نشان دہی بہت ضروری ہے۔

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

سید نصیر حسن حسینی پاروی

ماہنامہ نیا دور۔ احتشام نمبر: شائع کردہ محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش۔ لکھنؤ۔ ضخامت ۱۶۸ صفحے، قیمت صرف ایک روپیہ

ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ ایک عرصے سے زیر نگرانی محکمۂ اطلاعات اترپردیش ملک اور عوام کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے مضامین تحقیقی اور ادبی حیثیت سے مرصع اور قابل قدر ہوتے ہیں۔ اسی ماہنامہ نیا دور کا احتشام نمبر یعنی جلد ۲۹ شمارہ ۲ و ۳ ماہ مئی و جون ۱۹۷۳ء ہمارے سامنے ہے۔ یہ نمبر جناب پروفیسر سید احتشام حسین صاحب مرحوم کی عظیم یادگار میں شائع کیا گیا ہے۔ اس ضخیم نمبر کے مطالعہ کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ یہ نمبر نہ صرف احتشام صاحب کے حالات و دیگر واقعات کے اعتبار سے ایک کامیاب نمبر ہے بلکہ ادب اردو میں ایک نیا اضافہ ہے۔ اس قابل قدر نمبر میں احتشام صاحب مرحوم کے حالات زندگی اور ان کے کارناموں اور خصوصیات کے تذکرے کے ساتھ ساتھ بہت سے نئے معلومات کا خزانہ ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ ادارۂ نیا دور قابل صد شکریہ ہے کہ پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کی عظیم شخصیت کے اعتبار سے یہ نمبر کمال درجہ محنت اور جد و جہد کے ذریعے منظر عام پر لایا گیا ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ نمبر پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم کے شایان شان مرتب کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے میں محترم مدیر کی اس صلاحیت، محنت اور سلیقہ کا تذکرہ کرنا تقاضائے حق سمجھتا ہوں کہ اس عظیم نسخے کے مضامین کی ترتیب میں بڑی دیدہ ریزی سے کام لیتے ہوئے لطیف انداز اختیار کیا گیا ہے۔ یہ اسپیشل نمبر ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے جس میں نثر و نظم دونوں حصے ہیں۔ علاوہ قلمی معاونین کے ملک کے مشاہیر کے پیغامات اور تاثرات کو بھی نمایاں طور پر جگہ دی گئی ہے۔

پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کی عظیم شخصیت کے بارے میں اس نمبر کے حسب ذیل قلمی معاونین کے خیالات قابل ملاحظہ ہیں:

(۱) ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، صفحہ ۲۶ — "بہر حال تنقید پر ان کے مضامین ہی اتنے زیادہ ہیں کہ اگر انھیں ایک ترتیب سے یکجا کر دیا جائے تو اصول تنقید و عمل تنقید پر ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے"

(۲) علی جواد زیدی، صفحہ ۲۸ — "روسی، فرانسیسی اور انگریزی ادب کے علاوہ اردو اور ہندی پر خاصی گہری نظر تھی۔ لسانیات، تاریخ، سوشیالوجی، علم النفس، فلسفہ، مذاہب کا تقابل، کلام، منطق، سیاست، جدید سیاسی اور سماجی تحریکوں کے بارے میں بھی ان کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا"

(۳) ملک زادہ منظور احمد، صفحہ ۵۳ — "جب فلیش لائٹ الہ آباد کا مشاعرہ تھا صدارت کے فرائض ان کے ذمے اور شعرا کے تعارف و ترتیب کا کام میرے ذمہ تھا۔ دوران مشاعرہ میں ایک بار میں نے ان کو بے چین اور مضطرب پایا۔ وجہ میں سمجھ نہ سکا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھے ڈائس سے نیچے اترے جہاں مرزاپور کے ایک سن رسیدہ اور معمر شاعر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کو وہاں سے اٹھا کر اپنے پاس لا کر بٹھلایا اور پھر مطمئن ہو کر شاعری سننے لگے۔ بزرگوں کے ساتھ اتنی عقیدت اور ان کا اتنا احترام، ترقی پسند دور کو احتشام صاحب کا تحفہ ہے۔ انھوں نے مارکس کے جدلیاتی فلسفے کو اپنایا ضرور تھا مگر ہندستانی تہذیب اور اس کی روایات کا دامن کبھی نہیں چھوٹا"

(۴) ڈاکٹر وحید اختر، صفحہ ۷۰ — "اپنے عہد کے قحط الرجال میں عہد آشوب تو بہت لکھے جا سکتے ہیں مگر قصیدہ لکھنے کے لیے ممدوح کو تلاش کرنا بہت دشوار ہے۔ مجھے بارہا خیال ہوا کہ اگر آج کے انسان کی شرافت اور بڑائی کا قصیدہ لکھنا ہو تو احتشام صاحب ایسے کسی سادہ انسان ہی کو نمونہ بنایا جا سکتا ہے۔ ان کی اچانک موت نے اس خیال پر مہر توثیق ثبت کی۔ وہ نظروں سے دور ہو کر دل سے قریب محسوس ہونے لگے۔ اتنی ہی ان کی بڑائی اور بلندی بھی منکشف ہوتی گئی"

اس اسپیشل نمبر کی بعض نظموں کے بھی حوالے دے دینا بے محل نہ ہوگا:

(۱) شمیم کرہانی، صفحہ ۱۸:

ہیئت کی وضع، فکر کی تشکیل دیکھیے
تہذیب حرف و لفظ کی تکمیل دیکھیے
جذبات کی صداقت ترسیل دیکھیے
ذہن رسا پہ سایۂ جبریل دیکھیے

ہم پر کھلا، فراق مبارک نفس کے بعد
آتے ہیں ایسے لوگ ہزاروں برس کے بعد

شغل مطالعہ میں گزاری تمام عمر
نبض حیات ذہن [illegible] تمام عمر
زلف نگار فکر سنواری تمام عمر
تصویر زندگی کی اتاری تمام عمر

کیا سر بسر شعور تھا حکمت شعار تھا
رکھتا تھا وہ قلم جو حقیقت نگار تھا

(۲) جمیل مظہری، صفحہ ۷۷: آہ وہ شاعر و دانشور و نقاد و خطیب

زیب کرسی ادب زینت ہر بیت علوم
عارف نبض سخن مالک فن سالک فن
خادم دانش و دیں اہل ادب کا مخدوم
تھا مضطرب الحال اجزائے آسماں
آسماں ہی نہ رہا جب تو کہاں جائیں نجوم

(۳) عمر انصاری صفحہ ۸۲: اندھیری رات میں اب بھی چراغ طور تھے وہ
نئے زمانے، نئی نسل کا شعور تھے وہ

(۴) تاج ادرنگ آبادی صفحہ ۱۱۹: شعور و فکر کو بخشی ہے تازگی جس نے
وہ قصرِ اردو کا مینار احتشام حسین
امامِ نقد و نظر رہبرِ قدیم و جدید
نئے ادب کا تھا معمار احتشام حسین

(۵) علی خبیر کرانی صفحہ ۱۲۰: علم و تنقید و زباں کا رازداں جاتا رہا
احتشام مادرِ ہندوستاں جاتا رہا

غرض اس نمبر کے حصۂ نثر و نظم دونوں اس قابل ہیں کہ انھیں شوق سے پڑھا جائے اور ان سے استفادہ کیا جائے۔

پروفیسر سید احتشام حسین اردو کے نقاد تھے اور ان کے ادبی و تنقیدی بصیرت سے زبان اردو کو بڑی ترقی ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی دائمی مفارقت کا غم بلا اختلاف مذہب و ملت ہر حلقہ میں منایا گیا اور مرنے والے کے خدمات جلیلہ کو بنظرِ احترام دیکھا گیا۔

پروفیسر سید احتشام حسین یقیناً ایک بڑے انسان تھے اور ان کی ذات محض ہندوستان ہی کے لیے نہیں بلکہ بین الاقوامی دائرہ میں بھی کارآمد، موثر، معزز، مقتدر اور باکمال سمجھی جاتی تھی۔ اس کا نیز ان کی پاکیزگیِ نفس، سماجی خدمات اور مجلسی خصوصیات کا یہ اثر ہے کہ بلا کسی اختلاف کے ہر خیال اور ہر عقیدہ کے اہلِ قلم نے نیا دور کے اعلیٰ مقاصد میں ہر امکانی تعاون کیا۔

یہ احتشام نمبر جس شان و شوکت، بلند خیالی و اولوالعزمی اور اعلیٰ نمونۂ کارگزاری، مختلف فوٹو خوشنما تائیٹل اور نایاب مواد کے ساتھ منظرِ عام پر لایا گیا ہے وہ اس قابل ہے کہ علمی و ادبی و ثقافتی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

اس اسپیشل نمبر کے ذریعہ پروفیسر سید احتشام حسین کے ہر شعبۂ زندگی پر پوری طرح روشنی پڑتی ہے۔ اتنا ضخیم اور باوقار اسپیشل نمبر جو کتابت و طباعت میں لاجواب ہے اس کی قیمت صرف ایک روپیہ رکھی گئی ہے اس کے لیے بھی محکمۂ اطلاعات قابلِ مبارکباد ہے کہ اس نے قیمت غالباً اس مقصد سے اتنی کم رکھی ہے کہ یہ خاص کی چیز ہر ہاتھ میں پہنچ سکے خصوصاً طلبا جو احتشام حسین صاحب پر کام کرنا چاہیں وہ آسانی کے ساتھ اسے خرید سکیں۔

★

بچّوں کی بہبود — اقتصادی ترقی کے پروگرام کا لازمی جز

(صفحہ ۵۳ کا بقیہ)

ظاہر ہے کہ بچوں کی پرورش و پرداخت سے متعلق مراکز پر محض کھیل کود کے انتظامات ہی نہیں ہونے چاہئیں بلکہ ان کے لیے ایسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا موقع ملنا چاہیے جن سے ان کی شخصیت ابھر کر سامنے آسکے۔ انھیں آزادانہ طور پر تخلیقی کاموں کا موقع ملنا چاہیے۔ زیادہ زور اس بات پر ہونا چاہیے کہ وہ بغیر ارادہ خود بخود اور بغیر کسی جبر کے تعلیم حاصل کر سکیں جبکہ اکثر انھیں روایتی قسم کی پہلے سے ڈھلی ڈھلائی باتوں کو سکھانے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ بچے کو یہ سکھانا ضروری ہے کہ وہ سماج کے لیے خود کو کس طرح کارآمد بنائے۔ یہی نہیں کہ وہ اپنے ہم عمر بچوں میں کھیل کود سکے بلکہ اسے اپنے سے چھوٹے بچوں کے ساتھ بھی کھیلنا چاہیے۔ اس لیے پرائمری اسکول کے قریب بچوں کی بہبود کے مراکز کھولنا مناسب ہوں گے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچے کو آج کے دور کے سماج میں یا آج سے بیس برس بعد کے زمانے کے سماج میں رہنے کے لیے کس طرح مفید اور کارآمد بنانا چاہیے۔ آج دنیا کے نوجوانوں میں بغاوت کا جو جذبہ پایا جاتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ ہمارا موجودہ سماج اور اس کے نظریات مستقبل کی نسلوں کو قابلِ قبول نہیں ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ وہ نوجوان یا ہم جو کہ آئندہ نسل کے باپ ہیں اس کے بجائے کیا چاہتے ہیں۔ اس بارے میں اتنی بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ آج جو نوجوان پرورش پا رہے ہیں انھیں کل بڑے ہو کر ایسی قوتوں کا سامنا کرنا ہو گا جو آپس میں ایک دوسرے سے متصادم ہوں گی اور گھٹتے ہوئے وسائل اور بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے آنے والے دور میں جبکہ فاصلے بہت کم رہ گئے ہوں گے خود غرضانہ خیالات سے گریز کرنا ہو گا لہٰذا اس وقت اپنے بچوں کے لیے منصوبہ بندی کرتے وقت ان باتوں کو سامنے رکھنا بہت ہی ضروری ہے۔

★

نیا دور بابت اکتوبر ۱۹۷۲ء میں سرورق کے آرٹسٹ کا نام (شری) ڈی ڈی ہونا چاہیے۔ سہواً غلط نام درج ہو گیا ہے۔ دراصل شری ڈی ڈی ہی سرورق کے آرٹسٹ ہیں۔
— ادارہ

Regd. No. L 319

وزرائے اعلیٰ کانفرنس کے موقع پر گورنر اتر پردیش، شری اکبر علی خاں، وزیر اعلیٰ پنجاب شری ذیل سنگھ سے معانقہ کرتے ہوئے

29(9)

اپنی بات

اترپردیش میں صدر راج کے خاتمہ پر ۹ر نومبر ۱۹۷۳ء کو شری ہیم وتی نندن بہوگنا کی قیادت میں ۴۵ رکنی نئی کانگریس حکومت نے حلف لیا۔ شری بہوگنا اب تک دیش میں جتنے وزیر اعلیٰ ہوئے ہیں ان میں سب سے کم عمر وزیر اعلیٰ ہیں۔ یہ اس امر کی خوشگوار علامت ہے کہ کانگریس کی قیادت اب نئی نسل کے ہاتھوں میں آرہی ہے۔

شری بہوگنا ضلع گڑھوال کے موضع بگھانی میں ۲۵ر اپریل ۱۹۲۱ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کی اعلا تعلیم الٰہ آباد میں ہوئی اور وہیں سے سیاسی زندگی کا آغاز بھی ہوا۔ آپ کی عمر ۲۰ سال سے بھی کم تھی جب آپ آزادی کی جدوجہد میں شریک ہوئے اور اس وقت سے اب تک ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے پارٹی کی سرگرمیوں کے روح رواں اور ملک و قوم کی خدمت کے لیے وقف رہے ہیں۔ ۱۹۴۲ء کے 'ہندستان چھوڑو' اندولن کے سلسلے میں یو، پی اور دہلی کی حکومتوں نے ان کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر پانچ ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا تھا۔ اس سے بہوگنا جی کی سیاسی میدان میں اہمیت و برتری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اترپردیش کی سیاست سے شری بہوگنا کا تعلق دیرینہ ہے۔ آپ ۱۹۵۲ء سے نومبر ۱۹۶۹ء تک یو پی اسمبلی کے ممبر رہے۔ ڈاکٹر سمپورنا نند کی وزارت میں ۱۹۵۷ء میں پارلیمنٹری سکریٹری مقرر ہوئے۔ ایک سال بعد ۱۹۵۸ء میں نائب وزیر محنت وصنعت ہوئے اور ۱۹۶۷ء میں وزیر مالیات و نقل و حمل بنائے گئے۔ نومبر ۱۹۶۳ء سے نومبر ۱۹۶۹ء تک بہوگنا جی اترپردیش کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔ پھر نومبر ۱۹۶۹ء ہی میں کل ہند کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری ہوئے اور ۱۹۷۱ء کے پارلیمانی انتخابات کے بعد وزیر مواصلات کی حیثیت سے مرکزی وزارت میں شامل کیے گئے۔ وزیر اعلا کی حیثیت سے شری بہوگنا کی اترپردیش واپسی پر جس عام خوشی کا اظہار کیا گیا اور جو پرجوش استقبال ہوا وہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ عوام کے اس اعتماد کو ظاہر کرتا ہے کہ بہوگنا جی جس طرح پہلے بھی متعدد بار رجعت پسند اور فرقہ پرست عناصر کے چیلنجوں کا مقابلہ کرچکے ہیں اسی طرح اب بھی ان عناصر کی جانب سے جمہوری اور سیکولر نظام کو درپیش سنگین خطرات کا مقابلہ کریں گے اور انھیں ایک بار پھر نیچا دکھائیں گے۔ حلف برداری کے بعد ایک زبردست جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے بہوگنا جی نے کہا کہ ہم غذائی صورت حال اور اس کی تقسیم کے نظام کو بہتر بنانے، قیمتوں میں ٹھہراؤ پیدا کرنے، ضروری اشیاے زندگی کی فراہمی، رشوت خوری اور بدعنوانی کے مرتکب سرکاری افسران اور منافع خوری کرنے والے تاجروں کو سزا دینے کی کوشش کریں گے اور اقلیتوں کا تحفظ کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ ہم عہد کرچکے ہیں کہ با وقار کے لیے کام کریں گے یا مرینگے۔ لیکن یہ سب اسی وقت ہوسکتا ہے جب عوام کا تعاون حاصل ہو۔ اب یہ اترپردیش کے عوام کا کام ہے کہ وہ سماج دشمن عناصر اور فرقہ پرستوں سے نپٹنے اور حالات کو بہتر بنانے میں بہوگنا جی اور ان کی حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔

● عظیم سویت رہنما مسٹر لیونڈ بریژنیف کے پانچ روزہ خیرسگالی دورے پر ۲۶ر نومبر کو نئی دہلی پہنچنے پر ان کا جو زبردست خیر مقدم ہوا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ اس دورہ کا مقصد دونوں ملکوں کے درمیان معاشی، سائنسی، تکنیکی اور ثقافتی تعاون کے رشتوں کو مزید تقویت پہنچانا اور امن کے استحکام کے لیے اقدامات کرنا تھا۔ دونوں ملک چونکہ دنیا میں امن اور بین اقوامی معاملات میں سدھار لانے کی کوششوں میں مصروف ہیں اور دونوں ملکوں کے درمیان دوستی نہ صرف ایشیا بلکہ پوری دنیا کے امن کے لیے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے اس لیے روس اور ہندستان کی دوستی کو اور زیادہ مستحکم بنانا ازبس ضروری ہے۔ اسی خیال کا اظہار ہندستان اور سویت یونین کے عظیم رہنماؤں شریمتی اندرا گاندھی اور مسٹر بریژنیف نے اس موقع پر اپنی تقریروں میں بھی کیا۔ دونوں رہنماؤں کے درمیان چار روزہ مفصل گفتگو کے بعد صنعت، برقیات، زراعت، معدنیات اور تربیت کے میدانوں میں تعاون کے ایک پندرہ سالہ معاہدے پر دستخط ہوئے۔ سویت رہنما کے اس دورے اور دونوں ملکوں کے درمیان معاشی معاہدے کی یقیناً ایک تاریخی اہمیت ہے۔ اس سے دونوں ملکوں میں معاشی اور ثقافتی تعاون بڑھانے میں مدد ملے گی۔

اسلام مچھلی شہری

دسمبر کے شمارے کی آخری کاپی پریس جارہی تھی کہ یہ اندوہناک خبر آئی کہ ۱۹ر نومبر کو سلام مچھلی شہری بھی ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئے۔ یہ بھی ان دلدوز سانحوں میں سے ایک ہے جن سے اردو ادب ادھر دو سال سے دوچار ہے۔ گزشتہ ایک سال کے اندر پروفیسر احتشام حسین، غلام احمد فرقت کاکوروی، ضیا بدایونی، سید سجاد ظہیر، ڈاکٹر تارا چند، ابراحسنی گنوری وغیرہ جیسے ممتاز نقاد، ادیب، دانشور اور شاعر اردو دنیا کو سوگوار بنا چکے ہیں اور اب وہ سلام مچھلی شہری کے ماتم میں سوگوار ہے۔ سلام ابتدا ہی سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ انھوں نے ہیئت کے جتنے حسین تجربے کیے اور ان تجربوں کو اپنی شاعری میں سمونے کی جو جرأت مندانہ کوشش کی وہ نئی نسل کو ہمیشہ حوصلہ دیتی رہے گی۔ سلام ایک لاابالی، معصوم اور سادہ دل انسان تھے۔ ان کا دل محبت سے لبریز تھا۔ ان کی اس معصومیت، لاابالی پن اور انسان دوستی نے احباب کا ایک وسیع حلقہ ضرور بنا لیا تھا لیکن پیٹ کی جانب سے وہ زندگی بھر غیر مطمئن رہے۔ اسی لیے اپنے بعد انھوں نے صرف بے سہارا بیوی اور بچے چھوڑے ہیں۔

راقم الحروف سے بھی مرحوم بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کے ہر خط کے ایک ایک لفظ سے محبت، اپنائیت اور خلوص ٹپکتا تھا۔ آخری خط مرحوم نے ۹ر نومبر کو ولنگڈن نرسنگ ہوم سے تحریر کیا تھا اور لکھا تھا

"ڈیر خورشید! میں اچھا ہو کر پھر بیمار ہوگیا۔ دہی پیلیا (J A U N D I C E)۔ پرسوں (9/11/73) صبح اس جگر کا آپریشن ہوتا ہے جگر کے عمل میں رکاوٹ ڈال رہا ہے۔ آپریشن بڑا ہے، دعا کرنا، ویسے میرا خدا پر یقین ہے۔ جو ہوگا اچھا ہوگا۔ کیسے ہو۔ گھر پر سب کو سلام دعا کہو۔

تمھارا اسلام مچھلی شہری

کیا خبر تھی کہ یہ آخری خط ہے اور اس کے بعد موت انھیں خط لکھنے کی مہلت نہ دے گی۔ اب ان کے ایسا عقیدہ اور لگن کا پختہ ادب اور شفقت کرنے والا انسان پیدا ہونا آسان نہیں۔ ادارہ نیا دور اس سانحہ پر مرحوم کے پسماندگان سے اظہار تعزیت کرتا ہے۔

——— ایڈیٹر

کوئی مشعل بھی نہیں کوئی ستارا بھی نہیں
دور سے راہ بتا دے کوئی اتنا بھی نہیں

پہلے بھی راہِ محبت میں کوئی بھیڑ نہ تھی
اور اب تو کوئی برسوں ادھر آتا بھی نہیں

بے تعلق ہو تو دیتے نہیں کانٹے بھی گزند
میں تو گزرا مرا دامن کہیں اُلجھا بھی نہیں

جہدِ ہستی کی وہ بے کیف کشاکش ہے کہ اب
سُن کے دیوانہ کی باتیں کوئی ہنستا بھی نہیں

نظر آتے نہیں سلمائے سحر کے خط و خال
اور جو کہیے کہ اندھیرا ہے اندھیرا بھی نہیں

ان کی اس سادہ نگاہی سے کوئی کیا سمجھے
جس میں اقرار کا مبہم سا اشارہ بھی نہیں

چند دھوکے ہیں جہاں ذہن کو ملتی ہے پناہ
ورنہ کوسوں سفرِ زیست میں سایہ بھی نہیں

ـــــــ سری نواس لاہوٹی

۹ مارچ ۱۹۷۳ء کے اخبارات میں جب میں نے یہ خبر پڑھی کہ دنیا کے سب سے بڑے اور نامور مصوّر "پکاسو" کا انتقال ہوگیا تو دل کو ایک دھکا سا لگا اور ماضی کی یادوں نے دل کے جھروکوں سے جھانک کر میری دبی ہوئی نا امید تمناؤں کو تازہ کر دیا اور میں اگست ۱۹۶۲ء کی دو شاموں میں کھو گیا جو پکاسو سے ملاقات کرنے کی غرض سے میں نے صرف کی تھیں۔

میرا پیرس کا سفر بھی زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ ہم ڈاکٹر برنال (مرحوم) کی سالگرہ کے جشن میں، جو ماسکو کے ایک شاندار ہوٹل میں منایا جا رہا تھا، جمع ہوئے تھے۔ اس موقع پر "سارتر" بھی موجود تھے اور انھوں نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا تھا "کیا تم نے پیرس دیکھا ہے؟" میں نے نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ "اگر آپ چاہیں تو میں پیرس دیکھ سکتا ہوں۔" انھوں نے فوراً نہ صرف پیرس آنے کی دعوت دی بلکہ اخراجات بھی برداشت کرنے پر آمادہ ہوگئے ـــــ اس دعوت کا بھی ایک پس منظر ہے اور وہ یہ کہ ماسکو میں "ترک اسلحہ کی کانفرنس" کے موقع پر کلچرل کمیشن کے اجلاس میں ایک سب کمیٹی کی رپورٹ پیش کرنے کا موقع مجھے ڈاکٹر انیس احمد (افغانستان) کی رخصت کی وجہ سے مل گیا تھا۔ اس وقت مجلس صدارت ناظم حکمت، ایلیا اہرن برگ اور سارتر پر مشتمل تھی اور جب میں نے رپورٹ ختم کی تو تالیوں کی گونج میں اسے منظور کیا گیا اور اجلاس برخاست ہونے پر جن لوگوں نے مجھے گلے لگایا ان میں سارتر اور مرزا ترسون زادے بھی شامل تھے۔ جس کی بنا پر مجھے سارتر نے پیرس آنے کی دعوت دی تھی اور جب میں نے یہ بات بنّے بھائی (سجاد ظہیر) کو بتلائی اور کہا کہ مجھے ہنگری کی امن کمیٹی نے دورے کی دعوت دی ہے اور سارتر نے پیرس کے لیے مدعو کیا ہے تو انھوں نے فوراً کہا کہ "تم سارتر کی دعوت قبول کر لو اور ہنگری کے بجائے ویانا ہوتے ہوئے پیرس چلے جاؤ۔"

میں تین تمنائیں لے کر پیرس گیا تھا کہ "لوور" (میوزیم) دیکھوں گا۔ نائٹ کلب جاؤں گا اور پکاسو سے ملاقات کروں گا۔ مگر ان تین تمناؤں میں سے "لوور" دیکھنے کی تمنا تو پوری ہوئی جہاں پکاسو کی دوسری تخلیقات کے علاوہ (ROSE PERIOD) کی تخلیقات کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے جس طرح سے لینن گراڈ کے "ہرمیتج" (HERMITAGE) میوزیم میں پکاسو کے (BLUE PERIOD) کو یکجا جمع کر دیا گیا ہے ـــــ لیکن دوسری دو تمناؤں کے سلسلے میں مجھے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ نائٹ کلب میں داخلے کے بعد ہی چند منٹ میں باہر آگیا اور مجھے جو ذہنی کوفت ہوئی اس کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے مگر باوجود کوشش کے میں پکاسو کا شرف نیاز

حاصل نہیں کرسکا حالانکہ وہ دن تک جنوبی فرانس میں ان کے
محل کے چکر کاٹتا رہا لیکن بے نیل و مرام واپس ہونا پڑا۔

آج اور آج سے دس سال قبل بھی اگر پیرس کے ذہنی اور
فکری ذخیروں کو ٹٹولا جائے اور عبقری ہستیوں کو چنا جائے تو پکاسو
ہی کی شخصیت سب سے زیادہ نمایاں اور ہم سے قریب دکھائی دے گی۔
اس کی گہری انفرادیت اور آرٹ کا شخصی عنصر ایسی خصوصیات ہیں
جو اس کو دنیا کی سطح ذہن سے بلند کر دیتی ہے اور اس کا آرٹ عوام کی فہم و
بصیرت کے لیے اجنبی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی مسلم الثبوت
فنکاری اور عظمت کے آگے بڑی سے بڑی نکتہ سنج نگاہ بھی وقف
تحیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ فرانس پر جرمن قبضہ کے دوران اور اس
کے بعد سے اسلوب و فنکاری میں پکاسو نے جو عروج مدارج
اور برتری حاصل کر لی تھی اس کی شہادت ان کی اس دور کی
لاتعداد تصاویر فراہم کرتی ہیں۔ پکاسو کے قدردانوں میں ایک بڑی
تعداد ایسے افراد کی ملے گی جو استعجاب کا شکار ہو کر ایک طرف تو اس
کی تعریف کر رہے ہوں گے تو دوسری طرف کسی قدر کبیدہ خاطری سے
دبی زبان میں یہ اقرار کرتے ہوئے ملیں گے کہ وہ ان کی فہم و ادراک سے
بہت بلند ہے۔ پکاسو کی مغلق لیکن زندگی و تازگی سے مملو تصاویر
کی تحسین و تنقیص کسی کے بس کی بات نہیں ہے اور اگر نقاد خام ہو
تو یہ منزل اور بھی کٹھن ہو جاتی ہے کیوں کہ نزاکت خیالی، لطافت
احساس اور خلوص کے اعتبار سے وہ اپنے میدان کا واحد شہسوار
تھا جہاں کسی کم سواد کی رسائی ناممکن تھی۔

آرٹ کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں پکاسو نے اپنے آرٹ کے
عظیم الشان ارتقاء کے دوران طبع آزمائی نہ کی ہو ــــــ رومانی،
حقیقت پسندانہ، اثر پرستانہ کلاسیکل، اظہاری، تعمیری اور
سرریلسٹ وغیرہ ــــــ اور کوئی ذریعہ اظہار ایسا نہ تھا جس
میں اس نے مہارت حاصل نہ کی ہو مثلاً مصوری، سنگ تراشی، کوزہ
گری وغیرہ ــــــ وہ ہمیشہ حیرت انگیز حد تک اختراعات
اور تخلیقات میں مصروف رہا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے بارے میں
ایک جگہ کہتا ہے کہ "جب میں کوئی تصویر بناتا ہوں تو مجھے اس میں
دو دو افراد دکھانے کی فکر نہیں ہوتی۔ ان افراد کا کہیں وجود رہا ہوگا لیکن
میرے لیے اب ان کے وجود کی کوئی اہمیت نہیں۔ ان کے تعلق سے میرے
تصور نے مجھ میں ایک بنیادی تحریک پیدا کی پھر رفتہ رفتہ ان کا وجود
دھندلا ہوتا گیا اور وہ میرے لیے ہر قسم کے مسائل میں تبدیل ہو گئے
اور اس طرح میرے لیے وہ دو افراد نہیں بلکہ خطوط اور رنگ ہیں ــــ
ایسے خطوط اور رنگ جو ان دو افراد کے تجربوں کے آئینہ دار ہوتے ہیں
اور ان کی زندگی کے ارتعاش کو برقرار رکھتے ہیں"

پکاسو کی تصویریں ہمارے زمانے کی پوری طرح سے نمائندگی
کرتی ہیں ــــــ وہی زمانہ جس میں آپ اور ہم بستے ہیں۔ جس کی جڑیں
ہمارے احساسات میں پیوست ہیں۔ وہی کرب، وہی درد، وہی خوف
و ہراس اور وہی تڑپ اور بے چینی، یہی وہ تمام مسالا ہے جو اس نے
اپنی تخلیقات میں صرف کیا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس بات کو بھی
نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ عوام کی اقدامی تحریکات پر اس کا کوئی راست
اور حیات بخش اثر نہیں پڑا یعنی پکاسو کی تند و پر ہول شخصیت، محنت کش
طبقے کی تحریک کے لیے آج بھی وجودی اور امکانی ہے، حقیقی نہیں اور
اس کے انتقال کے بعد تو اس کیفیت کے ختم ہونے کے امکانات مبہم
ہو چکے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ گزشتہ پچاس سال میں
پیدا ہونے والے تمام فنکاروں میں پکاسو ہی سب سے بلند و برتر ہے
مگر ساتھ ہی ساتھ وہ اس سے بھی واقف تھا کہ اس کی عظیم شخصیت کے
کے لیے عظیم اختلافات بھی موجود ہیں اس کے باوجود بھی اس کی تخلیقات
کا غالب حصہ دنیا کی بربریت اور تشدد پر ایک کاری ضرب ہے کیوں کہ
عمومی تحریک کے تیز و تند دھارے اور فنی نزاکت خیال کی بے پایاں
کامیابیوں کے ساتھ ساتھ فن کار کسی تحریک کی عظمت ہی سے متاثر ہو کر اپنے شاہکاروں
کے لیے محرکات حاصل کیا کرتے ہیں اور یہ محرکات فنون لطیفہ کے
مختلف مظاہر موسیقی، مصوری یا شاعری کی صورت میں وجود پذیر ہوتے
ہیں نیز وقت آنے پر یہی شاہکار اپنے خالق کو پروان چڑھانے
میں کام بھی آجاتے ہیں۔ لیکن باہمی تبادلے کا اصول پکاسو اور اس
کے ہم عصر فنکاروں کے مقابل ٹوٹ کر رہ جاتا ہے اس لیے کہ پکاسو
اپنے شاہکاروں کے لیے عوام کی تڑپ اور کشمکش سے بلا شبہ

اشارے پاتا ہے جس کی زندہ و جاوید مثال اس کا شاہکار (GUERNICA) "گورنیکا" ہے جو تین سو مربع فٹ کے وسیع و عریض کینوس (CANVAS) پر مشتمل کلاسیکل مصوری کا شاہکار ہے جس میں اسپین کی خانہ جنگی کے دوران ایک چھوٹے سے شہر "باسک" پر بمباری اور فاشسٹوں کے مظالم کو اجاگر کیا گیا ہے جو وقت کی قید سے ماورا ہے اور انسانیت پر جو مصیبتیں نازل کی گئی تھیں ان کو اس پینٹنگ (PAINTING) میں سمویا گیا ہے۔

اس تصویر میں پکاسو نے کھڑے ہوئے بیل کو بربریت کی علامت اور گھوڑے کو تہذیب کی نشانی کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس نے اس شاہکار پر انتھونی بلنٹ (ANTHONY BLUNT) کی ایک ضخیم کتاب شائع کی ہے جس میں اس تصویر کو ایک عظیم الشان شاہکار سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس وقت یہ تصویر "ماڈرن گیلری" نیویارک کی ملکیت ہے۔ اس کے علاوہ اس وقت پیرس میں کئی ایسی تصویریں موجود ہیں جو مقبوضہ فرانس کے کرب اور بے چینی کی مظہر ہیں جس میں مقاومت کے طوفان دستوج کو دکھایا گیا ہے۔ یہ تصویریں پوری دنیا کو نہیں تو دنیا کے ایک رُخ کو تو ضرور اور یقینی طور پر بے نقاب کرتی ہیں اور یہی ان کی قدر و قیمت اور زندگی کی بڑی ضمانت ہے اور اس گروہ کے لیے گوشمالی ہے جو صرف رنگوں کی آمیزش ہی سے کینوس (CANVAS) کو رنگین کر ڈالتا ہے اس پر مزید یہ کہ یہ شہ پارے چالیس سال کے ایک مہیب دور سے گزرنے کے باوجود اپنی قدر و قیمت رکھتے ہیں اور اپنے خالق کی تقدیر کا ساتھ دے رہے ہیں۔

آج کل تو فرانس کے اہل فن اور دیگر صاحبان کمال کی اکثریت معاشی اور نظریاتی حیثیت سے بورژوا دائرۂ فن کی بے حس و مردہ روایات کی حامل اور ایک گھناؤنے ماحول کا شکار ہو کر رہ گئی ہے اور خود بورژوا طبقے کے گنے چنے فن کاروں میں تو اتنی بھی صلاحیت نہیں ہے کہ اپنی ہی جماعت کے انفرادی ذوق کی تشفی کر سکے۔ اس لیے کہ فن کار جب تک سماج کے رجعت پسند طبقے کی آئینہ داری کرتا رہے گا اس وقت تک وہ طبقہ فن کار کو اپنے مقصد کے لیے تیار اور اپنے گندے مذاق کی گندی اختراع کے مطالبوں سے اس کو دماغی افلاس میں مبتلا کرتا رہے گا اور اس طرح اس کے فن سے بیزاری، مجبوری، حرمان و نفرت ہی کا اظہار ہوتا رہے گا جس کی مثال آج ہمیں اردو شاعری میں جدیدیت کے نام سے چلنے والی تحریک میں نمایاں طور پر ملتی ہے۔

آج کا فرانسیسی فن کار مخصوص حالات سے دوچار ہے اور ان حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد مشکل ہی سے اس بات کی امید بندھتی ہے کہ یہ فن کار اپنے اختلافات کی بھول بھلیوں سے آسانی کے ساتھ نکل سکیں گے جن میں وہ جکڑ دیے گئے ہیں۔ ایسے افراد تو خال خال ہی ملیں گے جو پکاسو کی طرح محرکات کی تلاش میں سماج کی ذی رتبہ طبقہ واریت سے گزر کر "ذہنی تکمیلیت" (INTELLECTUAL FINALITY) تک پہنچ گئے ہوں۔

یہاں اس نکتہ پر بھی دھیان دینا ضروری ہے کہ فن کار کو کسی ایسے مرکزی خیال کی ضرورت کا احساس دلانا جس میں کوئی نہ کوئی سماجی پہلو نمایاں ہو صالح تنقید کا کام ہوا کرتا ہے اور ایسی صالح اور منظم تنقید کی ضرورت اس وقت لاحق ہوتی ہے جب کہ فن کار کی کج روی کو درست کرنا مقصود ہو تاکہ اس کے وجدان و تخیل میں انقلاب پیدا کیا جا سکے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ عوام میں اس بصیرت کو بھی عام کرنے کی ضرورت ہے جو فن لطیف کے سمجھنے اور پرکھنے کے لیے ناگزیر ہے۔ ایسی بصیرت پیدا ہو جانے پر ہی عوام اپنی برادری کے اس فن کار کی حوصلہ افزائی کر سکیں گے جو ان کی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کو ان پر واضح اور نمایاں کرتا ہے یہ کوشش اپنے مقاصد کی معنویت کو لیے ہوئے دنیا میں شروع ہو چکی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اہل فن بھی اس کی ضرورت و اہمیت پر توجہ کرنے لگے ہیں اور اپنے موجودہ انتشار و تشکیل کے مطالبوں کو سمجھنے لگے ہیں۔ اس لیے سوال اس وقت صرف پکاسو اور اس کے فن کا ہے نہ اظہاریت و اشاریت کا، حقیقت و ماورایت سے بحث ہے نہ کامل تجاہت د

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

غزل

محویؔ صدیقی لکھنوی

نثارِ دوست کردی ہر خوشی ہر ناخوشی اپنی
محبّت ہی محبت رہ گئی ہے زندگی اپنی

جنونِ عشق سے پہلے تو یہ حالت نہ تھی اپنی
حسینوں کا تماشا بن گئی ہے زندگی اپنی

نگاہِ چارہ گر سے ہے نمایاں بے کسی اپنی
کچھ اب محسوس ہوتی ہے مجھے بیچارگی اپنی

کبھی ہنسنے کبھی رونے لگے زنداں میں دیوانے
خدا جانے انھیں کیا آرزو یاد آگئی اپنی

مرے نقشِ قدم پر چلنے والے شوق سے آئیں
وفا کی راہ میں بھی جانچ لیں دیوانگی اپنی

تری صورت، تری تصویر یا تیرا تصوّر ہو
سہارے پر انھیں دو ایک کے ہے زندگی اپنی

گرے آنکھوں سے آنسو اور اٹھی ٹیس سی دل میں
کبھی ہم نے جو آئینے میں صورت دیکھ لی اپنی

مبارک ہو تمھیں یہ ناز اپنی بے نیازی پر
مبارک بیکسوں کو بیکسی اور بے بسی اپنی

یہ اک اجڑی ہوئی دنیا وہ اک ٹوٹا ہوا تارہ
محبّت دیکھ لی ان کی تمنّا دیکھ لی اپنی

نگاہِ شوق کی گستاخیوں پر برہمی کیوں ہو
کسی دن کیوں نہ تیغِ ناز تم نے کھینچ لی اپنی

کبھی ایسے بھی کچھ لمحے گزر جاتے ہیں دنیا میں
کہ رو دیتا ہے حالت دیکھ کر خود آدمی اپنی

وہاں آہستہ آہستہ اٹھائی جاتی ہے چلمن
یہاں رگ رگ میں واپس آ رہی ہے زندگی اپنی

کمالِ خود شناسی تو نگاہِ دل میں پیدا ہو
نظر آنے لگے گی آپ کی تصویر بھی اپنی

یہ دن بھی ہائے کیا دن ہیں محبت اور مسرت کے
شباب اپنا، رباب اپنا، شراب و سرخوشی اپنی

فضا میں بجلیاں ہی بجلیاں منڈلائی جاتی ہیں
چمن والو! خدا کے واسطے روکو ہنسی اپنی

نگاہِ شرمگیں کو آج اس انداز میں دیکھا
حریمِ ناز میں یاد آگئی بیچارگی اپنی

اِحتشام صاحب

معنیِ لفظِ شرافت

— عادل جعفری —

یہ مضمون احتشام نمبر کے لیے موصول ہوا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ تاخیر سے موصول ہونے کے باعث یہ اس میں شامل نہ کیا جا سکا۔ اب مرحوم احتشام صاحب کی برسی کے موقع پر اسے شائع کیا جا رہا ہے۔ (ایڈیٹر)

موت کے ظالم ہاتھوں نے اردو ادب کی دنیائے تنقید پہ پچھلے ۳۰۔۳۵ برسوں سے چھائے ہوئے سنجیدہ، متوازن اور سلجھے ہوئے نقاد پروفیسر احتشام حسین کو یکایک بڑی سنگ دلی اور بے دردی سے چھین کر آزادی کے بعد اردو ادب کو سب سے بڑا نقصان پہنچا دیا۔ پہلی دسمبر سنہ ۱۹۷۲ء کی صبح ان پر یکایک دل کا دورہ پڑا۔ وہ مشکل سے دو منٹ بھی اس کی تاب نہ لا سکے اور سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر چل بسے۔ جس نے جس وقت اور جہاں سنا یقین نہ کر سکا لیکن یہ ایک تلخ سنگین حقیقت تھی اور ایسی حقیقت خواہ کتنی ہی ناقابلِ یقین کیوں نہ ہو اپنے کو منوا کر چھوڑتی ہے۔ کاش انھوں نے آخری وقت میں تھوڑی سی خدمت کا موقع دیا ہوتا! کچھ دوا کچھ دعا کا وقت ملا ہوتا۔ اتنی جلدی بھی کیا تھی؟ کہتے ہیں اتنی جلدی آنا فاناً اور اور فوری موت بہت اچھے انسان ہی کی ہوا کرتی ہے اور اس میں شک کا ذرا بھی شائبہ نہیں کہ وہ واقعی بہت اچھے انسان تھے۔ اردو ادب میں حالی کے بعد شریف ترین نقاد۔ بہت سیدھے سادے بے حد بامروت اور انتہائی وضع دار۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خدا کے نیک بندوں کو اپنے مرنے سے قبل اپنی زندگی کے اختتام کا ادراک اور اپنی موت کی آمد کا احساس ہو جاتا ہے۔ وہ بے شک و شبہ خدا کے نیک بندے تھے۔ زندگی بھر آبگینوں کو ٹھیس نہ پہنچانے والے — انھیں بھی خود یہ خود علم ہو گیا تھا کہ ان کا وقت آخر آ پہنچا۔ زندگی میں ان کے گھر پہ کتنے ہی مہمان آئے ہوں گے جن کا ممکن ہے، انھوں نے تنہا استقبال کبھی کیا ہو اور اکیلے خاطر و تواضع بھی۔ کبھی فرد خانہ کو آواز نہ دی، کسی کو خبر نہ کی کسی کو اس کے آرام و آسائش سے متعلق کوئی ہدایت نہ دی۔ زندگی میں آنے والے مہمانوں میں کوئی بلایا ہوا مہمان ہوتا تو کوئی بن بلائے ہی آ جاتا۔ ان میں کسی کو اپنی کتاب پر رائے لکھانی ہوتی تو کسی کو اپنے مجموعۂ کلام پر پیش لفظ کوئی ان کی مروت کا فائدہ اٹھاتا تو کوئی ان کی شرافت کا۔ زندگی کے لمحۂ آخر میں ایک ایسا مہمان آیا جس نے خود ان کی زندگی کی کتاب پر ایسا جچا تلا پیش لفظ لکھ دیا کہ تکمیل کتاب کے بعد کسی غلط نامہ کی شمولیت کی بھی گنجائش نہ رہی۔ زندگی میں آنے والے مہمان ان کا تھوڑا سا وقت لیا کرتے تھے لیکن اس مہمانِ لمحۂ آخر نے ان کی پوری زندگی ہی لے لی۔ زندگی میں آنے والے مہمان جاتے وقت معذرت ضرور کرتے "معاف کیجیے، ہم نے آپ کا بیش قیمت وقت خراب کیا" اور اس کے بعد شکریہ ادا کرنا نہ بھولتے۔ یہ مہمان جتنے راز دارانہ طور سے آیا اس سے زیادہ پُراسرار خاموشی کے ساتھ چلا گیا۔ نہ معذرت کی نہ شکریہ ادا کیا۔ زندگی کے دوران آنے والے مہمان اپنے اپنے طور پر انھیں قسطوں میں مارتے رہے۔ اس مہمان نے انھیں پوری طرح ختم کر کے ہی دم لیا۔

وہ جب سترہ سال کے تھے تو قد و قامت میں اپنے والد سید ابوجعفر صاحب مرحوم سے اونچے ہو گئے تھے اور ایک دن انھیں مخاطب کر کے فخریہ لہجے میں کہا تھا:

"ابّا! اب میں آپ سے بڑا ہو گیا ہوں"

اور اب جب کہ اپنی عمر کی ساٹھویں منزل میں چلتے چلتے وہ یکایک دل تھام کر اس طرح بیٹھے کہ پھر نہ اٹھ سکے تو کیا تعجب کہ انھوں نے اپنے والد سے بڑی دل خراش سنجیدگی سے کہا ہو:

"ابّا! اب میں آپ کے پاس آ گیا ہوں"

معلوم نہیں اس طرح اچانک انھیں اپنے پاس پا کر ان

اگر ہانٹر ۱۹۹۵ اٹک

کے والد کی روح خوش ہوئی ہوگی یا غمزدہ لیکن ادبی دنیا کو ان کے اس طرح چلے جانے پر دلی صدمہ پہنچا ہے جس کا اثر نہ جانے کب تک رہے گا، ختم بھی ہوگا یا نہیں، کون بتا سکتا ہے؟

احتشام صاحب سے جب بھی ملاقات ہوتی اس طرح ملتے کہ محسوس ہوتا جیسے ان سے براہِ راست خون کا رشتہ ہو۔ وہ میرے بڑے بھائی سید کامل حسین جعفری صاحب کے سسرالی اعزا میں تھے۔ اتنا سا ربط سارے خاندان کی خیریت دریافت کرنے کے لیے کافی تھا۔ کون کہاں ہے، کس حالت میں ہے، ایک ایک کرکے ہر ایک کے بارے میں پوچھتے۔ اپریل ۷۲ء میں میری بڑی بہن کے چالیسویں کے موقع پر الٰہ آباد میں اُن سے دیر تک گفتگو رہی۔ زیادہ تر ہمشیرہ مرحومہ سے متعلق باتیں ہوئیں پھر ہم عصر ادب کے بعض مسائل، نئی شاعری اور عمیق حنفی صاحب کا ذکر چھڑ گیا۔ چلتے وقت دھیمے مگر اثر پذیر لہجہ میں انھوں نے کہا تھا:

"خوشی ہوئی کہ آپ خاصا پڑھتے ہیں اور غور و فکر سے بھی کام لیتے ہیں مگر لکھتے بہت کم ہیں۔ لکھا کیجیے"

افسوس! کیا معلوم تھا کہ اتنی جلدی — سال کے اندر ہی — وہ وقت آجائے گا کہ مجھ جیسا کم نگار خود ان کے بارے میں قلم اٹھائے بغیر نہ رہ سکے گا!

احتشام صاحب خودساز (SELF MADE) تھے۔ بچپن میں ان کے گھر کی معاشی حالت اچھی نہ تھی۔ ان کے والد گھر کی روایتی عزت کی دیواریں کسی طرح سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کے مرنے کے بعد یہ دیوار بھی ڈھ گئی اور انھیں اپنی تعلیم کے لیے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا پڑا۔ چچا نے بروقت حوصلہ افزائی کی۔ وہ چاہے اعظم گڑھ کے ویزلی ہائی اسکول کے نویں دسویں درجہ میں پڑھ رہے ہوں، خواہ گورنمنٹ انٹر کالج الٰہ آباد میں ایف۔ اے میں تعلیم پا رہے ہوں یا الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کر رہے ہوں ہر جگہ چچا پر کم سے کم بار ڈالنے کے خیال سے خود کنواں کھود کر اپنے اخراجات کی آگ اور اپنے علم کی پیاس بجھاتے رہے۔ اُن کا سماجی مرتبہ کسی کا مرہونِ منت نہ تھا۔ انھوں نے اسے اپنی قوتِ بازو سے حاصل کیا تھا۔ اسی لیے وہ دوسروں پہ احسان تو کر سکتے تھے لیکن کسی کا احسان لینا انھیں گوارہ نہ تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور وہ اربابِ اقتدار و اختیار کے کاسہ لیس ہو سکتے تو لکچرر، ریڈر اور پروفیسر کی تثلیث سے مطمئن نہ ہو جاتے اور ان پرسکون جہانوں سے آگے کے پرشور اور ہنگامہ خیز جہانوں کی جانب نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ ہاں، ایک زمانہ میں شاید اپنے مرحوم والد کی خواہش کے احترام کے پیش نظر وہ آئی سی۔ ایس کے امتحان میں قسمت آزما ہوئے تھے لیکن امید ہی نہیں ایک حد تک یقین کی کمند وہاں پہونچ کر ٹوٹ گئی جہاں سے بامِ کامیابی دو چار گام سے زیادہ فاصلہ پر نہ تھا۔ قدرت کو اُن سے کام کچھ اور ہی لینا تھا تو بھلا یہ کامیابی ان کا مقدر کیسے ہوتی؟ یہ اُن کے علم و ادب اور پیشۂ معلمی سے والہانہ عشق سے پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد ان کی کتابِ حیات کے کسی صفحہ پر کسی اور عشق کے امتحان کا ذکر نہیں ملتا۔

وہ اُن لوگوں میں تھے جو کسی باعزت شعبۂ حیات سے منسلک ہو کر اپنے لیے عزت و وقار کا سامان فراہم نہیں کرتے بلکہ خود اُس صیغۂ حیات کے لیے باعثِ افتخار ہوا کرتے ہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچرر اور ریڈر یا الٰہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر ہونا ان کے لیے نہیں بلکہ خود ان یونیورسٹیوں کے لیے فخر کی بات تھی کہ ان کے جیسا صاحبِ بصیرت عالم اور دیدہ ور ادیب وہاں ایک طویل عرصہ تک شمعِ علم و ادب فروزاں کیے ہوئے تھا۔

وہ الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے تیسرے صدر تھے۔ مرحوم سید ضامن علی صاحب اور ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب کے بعد انھوں نے اس منصبِ جلیل کی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ انتظامی معاملات سے قطع نظر، جن سے انھیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی (ممکن ہے یہ آئی سی ایس میں خلافِ توقع ناکامیابی کا نفسیاتی ردِ عمل رہا ہو) وہ لسانی ادبی، علمی اور تحقیقی کارناموں کے پیش نظر اپنے شفیق و لئیق پیشروؤں کی صالح اور صحتمندانہ روایات کی تابندہ جبیں کو اور زیادہ درخشندہ کر گئے ہیں۔

احتشام صاحب نے اپنی طالب علمی کا زمانہ بڑی آب و تاب کے ساتھ ختم کیا۔ وہ مالی مشکلات کے باوجود ہر امتحان کی طرح ایم۔ اے میں بھی اوّل آئے۔ حصول تعلیم کے شوقِ بے پایاں نے انھیں دل ہی دل میں نہ جانے کتنی آرزوؤں کا گلا گھونٹنے پر مجبور کیا تھا۔ علمی

طور سے انھیں ہنگامی دنیا سے بے تعلق رہنا پڑا تھا۔ ان کا شمار اُن نمایاں ترین ذہین و فطین طالب علموں میں تھا جو کھیل کے میدانوں کی جانب زیرِ لب تبسم کے ساتھ بڑی شان بے نیازی سے دیکھ کر تیز قدموں سے لائبریری کی طرف بڑھ جانا اپنا معمول بنا لیتے ہیں۔ اس سے انھیں فائدہ ہوا، بہت بڑا فائدہ۔ ایم۔اے کرتے کرتے ان کا مطالعہ اس قدر وسیع ہو گیا کہ اس کے بعد تحقیق کی ڈگری حاصل کیے بغیر اس کے امیدواروں کی رہنمائی کی۔ ان میں ایسی ہمہ جہت قابلیت اور پر اعتماد صلاحیت آگئی کہ وہ جیتے جی نہ جانے کتنوں کے نام کے آگے اس سند کا اضافہ کرا گئے۔ ایم۔اے کر لینے کے بعد انھیں ایک طرف اپنی کچھ بننے کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کی صورت نظر آئی تو دوسری جانب بہت کچھ کرنے کی دبی دبائی اور تھپک تھپک کر سلائی ہوئی آرزو نے انگڑائی لی۔ پہلے اُن کے دامن دل کو وکالت نے اپنی جانب کھینچا اور وہ اپنے چند بزرگوں کے مشورہ سے ال۔ال۔بی میں داخلہ لے بیٹھے لیکن مشیّتِ ایزدی کو یہ منظور نہ تھا کہ ان کے جیسے شریف النفس آدمی کا دامن بے داغ پیشۂ وکالت کے ماحول کی غلاظت سے آلودہ ہو چنانچہ لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرر مقرر ہو جانے پر انھوں نے ال۔ال۔بی کرنے کا ارادہ اس طرح ترک کر دیا کہ پھر فراغت و فرصت کے کسی لمحۂ بے فکر میں بھی مڑ کر اس طرف نہ دیکھا۔ اسی زمانہ میں وہ پی سی۔ایس (یو۔پی) میں منتخب ہوئے مگر انھوں نے ڈپٹی کلکٹر بننے کے بجائے اردو کا لیکچرر رہنا اس طرح پسند کیا جیسے کوئی خوش ذوق شاعر لوحِ فکر پر ایک قافیہ کو حرفِ غلط کی طرح کاٹ کر دوسرے قافیہ میں طبع آزمائی کرنا پسند کرے۔ ممکن ہے ان کا یہ فیصلہ حاکمانہ نمود و نمائش اور فرائض شان و شوکت کے لحاظ سے ان کے حق میں نقصان دِہ رہا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اردو ادب کے لیے فیض رساں ثابت ہوا۔ لکھنے پڑھنے کو تو بعض نمایاں سرکاری عہدوں پر فائز حضرات بھی حسبِ توفیق لکھتے پڑھتے ہیں لیکن وہ جس طرح سرکاری قواعد و ضوابط کی گرفت سے بچ کر اپنے فرائض منصبی کی قرار واقعی ادائگی سے کم و بیش چشم پوشی کر کے اپنے تسکینِ ذوق کی خاطر اخلاقی جرم کے مرتکب ہونا گوارہ کر لیتے ہیں اس طرح احتشام صاحب سے ممکن نہ تھا۔ وہ تو یک درگیر و محکم گیر کے قائل تھے اگر اُدھر جاتے تو قدم قدم پر شرافت کا پاس کرتے اور فرض کا احساس انھیں اِدھر نہ آنے دیتا۔ ممکن ہے ان کا تخلیقی کرب عید بقر عید اُن سے ادب کی نماز با جماعت پڑھوا لیا کرتا لیکن اس میں مستقل اور مسلسل ریاضتِ نیم شبی اور عبادتِ صبح گاہی کی کیفیت کہاں سے آتی؟

لکھنؤ جانے سے قبل وہ الٰہ آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم رکن بن چکے تھے۔ یہ ان کی ادبی زندگی کی باقاعدہ ابتدا کا زمانہ ہے اس سے پہلے ان کے افکار و احساسات لبِ اظہار تک ضرور آتے تھے۔ لیکن ان کی دنیا وسیع نہ تھی کبھی کچھ واقعاتِ کربلا سے متعلق لکھتے تو کبھی کسی قومی یا سماجی موضوع پر طبع آزمائی کرتے۔ جس سے اُن کی خداداد ذہانت کے چہرہ سے پردہ تو اٹھتا لیکن انکے روشن مستقبل کی ضمانت کا پتہ نہ چلتا۔ باقاعدہ ادبی حدود میں داخل ہو کر انھوں نے پہلے کچھ افسانے لکھے جو "ویرانے" کے نام سے شائع ہو کر ادبی دنیا میں مقبول ہوئے۔ ان کا افسانہ "دوسرا نکاح" شدید مخالفت اور ہنگامہ آرائی کا شکار ہوا جس کا ذکر کرتے ہوئے خود انھوں نے لکھا ہے:

"۔۔۔۔۔ ہوا یہ کہ اس سے (دوسرا نکاح سے) ہماری مومن برادری کے کچھ کم پڑھے لکھے پرجوش نوجوان اس قدر برانگیختہ ہوئے کہ مجھے مارنے اور قتل کرنے کی دھمکیاں دینے لگے۔ مہینوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ رسالہ انیس کے دفتر میں آگ لگا دی گئی اور محمود فاروقی صاحب (مدیر) کے ساتھ بہت ناروا برتاؤ کیا گیا۔"

(اعتبارِ نظر ـــــ ص ۲۸۴)

ممکن ہے اسی واقعہ کا اثر ہو کہ ان کی احتیاط پسند طبیعت نے ان سے افسانہ لکھنا بند کرا دیا ہو البتہ شاعری کا سلسلہ جو کم و بیش اسی زمانہ میں شروع ہوا تھا جاری رہا مگر اس میں بھی ایک نمایاں تبدیلی راہ پا گئی۔ ابتک وہ صرف نظمیں کہا کرتے تھے۔ اب غزل کی طرف بھی مائل ہوئے۔ ان کے پاس ذہن رسا بھی تھا اور دل گداختہ بھی۔ ان کی زندگی بڑی دشوار گزار راہوں سے ہو کر گزر رہی تھی۔ ان کے پاس مشاہدات کی کمی تھی۔ نہ احساسات کی اور نہ تجربات کی۔ وہ ہزاروں منزلِ وہم و گمان سے ہو کر یقین کی خطرناک

تک پہونچے تھے۔ چنانچہ بڑے رچے بسے اور دل کی نادیدہ گہرائی میں جگہ کر لینے والے شعر کہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو فارسی کے ایک جلسہ میں تقریباً دس سال قبل میں نے انھیں یہ اشعار اپنے مخصوص خاطر نشین ترنم میں پڑھتے ہوئے سنا تھا جو آج بھی میرے ذہن میں اپنی پوری اثر انگیزی اور دلآویزی کے ساتھ محفوظ ہیں۔

کیوں یورشِ طرب میں بھی غم یاد آگئے
سوچا ترے کرم کو ستم یاد آگئے

اے دوست میکدے میں یہ کیسی ہوا چلی
سب فتنہ ہائے دیر و حرم یاد آگئے

اب کیا دکھا رہا ہے رہِ ماہ و کہکشاں
نامِ کسی کے نقشِ قدم یاد آگئے

روشن ابھی ہوا تھا سرِ جادۂ حیات
اک کاکلِ سیاہ کے خم یاد آگئے

جب بھی کسی نے راستہ پوچھا ہے احتشام
جن راستوں سے گزرے ہیں ہم یاد آگئے

مگر انھوں نے شاعری کو بھی اپنی ذات کے اظہار کا مستقل وسیلہ نہ بنایا۔ وہ اس کے لیے کچھ ہی نہیں بہت کچھ وسیع فضا کے خواہاں تھے۔ اصل میں وہ بڑے منظم اور مہذب ذہن کے حامل تھے۔ ان کے مزاج میں انتشار کا کم، ترتیب و تہذیب کا دخل زیادہ تھا۔ چنانچہ جیسے ہی ان کی زندگی میں ٹھہراؤ، اطمینان اور سکون آیا انھوں نے سب کچھ چھوڑ کر اپنے مزاج کے عین مطابق راہ اپنالی۔ اس راہ کے انتخاب میں ان کی طبع شرافت شعار کو بڑا دخل تھا۔ بقول شریف آدمی کسی کو بے راہ ہوتا دیکھ کر بڑے خلوص سے ٹوک دیتا ہے۔ اُسے سیدھے راستہ پر لگانا چاہتا ہے۔ وہ خوبیوں کے ساتھ خامیوں پر بھی نظر رکھتا ہے۔ اسی کھرے کھوٹے کی پرکھ کا نام ادب میں تنقید ہے۔ احتشام صاحب نے یہی راہ اپنائی۔ نقد ادب کی راہ — علمی، سائنسی اور مارکسی تنقید کی راہ — جس پر چل کر انھوں نے بڑے فکر افروز اور خیال انگیز مضامین لکھے۔ ترقی پسند تحریک کے نقطۂ نظر کی بڑے سلجھے ہوئے انداز اور سنجیدہ و متین لہجہ میں وضاحت کی۔ اور تنقید کے اغراض و مقاصد کی تعبیر اور اس کے تاریخی اور سماجی رشتوں کی تشریح کی۔ وہ ہم عصر ادب میں نئے افق کی تلاش و جستجو کے حامی تھے۔ مگر بے راہ روی اور انتہا پسندی کا رجحان مضر رساں انھیں پسند نہ تھا۔ وہ ان لوگوں میں نہیں تھے جو سنگین قطع کرا کے بھیڑوں میں شامل ہونا باعثِ فخر سمجھتے ہیں اور ہر نئی تبدیلی کے ساتھ اپنے کو آسانی سے تبدیل کر لیا کرتے ہیں۔ اپنے طرزِ فکر و اظہار کو مصلحت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانا انھیں نہیں آتا تھا۔ نئے کی جستجو میں پرانے کو فراموش کر بیٹھنے کے قائل وہ نہیں تھے۔ وہ حقیقتوں کی روشنی میں سابقہ صداقتوں کے رنگ کی موجودگی سے انکار کرنا نہیں جانتے تھے۔ انھیں مغرب کے صحت مند اثرات کے دوش بہ دوش مشرق کی صالح روایات بھی عزیز تھیں۔ اپنے امریکہ کے سفر میں دانشورانِ دیارِ غرب سے جتنے متاثر ہوئے اس سے کہیں زیادہ اپنے حسنِ طبیعت، سوزِ دروں اور علمی تجرد تعمق سے انھیں اپنا گرویدہ بنا کر واپس آئے۔ لکھنؤ سے الہ آباد جا کر دس گیارہ سال کے عرصہ میں وہاں علمی اور ادبی حلقہ میں اتنے مقبول و محبوب ہوئے کہ اکثر لوگ کسی ایک جگہ اپنی پوری زندگی گزارنے کے بعد بھی نہیں ہو پاتے۔ ابھی وہ خدا معلوم کیا کچھ نہ کرتے مگر افسوس موت کے سفاک ہاتھوں نے اُن کی شمع حیات گل کر کے مستقبل کے روشن تر امکانات پر دوامی تیرگی اور دائمی تاریکی کا ایسا دبیز پردہ ڈال دیا جسے چاک کرنا ممکن نہیں۔

ان کی موت کی خبر سن کر مجھے انھیں کے جیسے کسی بڑے ذہن کی سوچی اور کہی ہوئی یہ بات یاد آئے بغیر نہ رہی:

"میں نے ساحل پر کھڑے ہو کر ایک جہاز کو دیکھا جو اپنے سفید بادبانوں کو کھولے ہوئے سمندر کی وسعتوں کی جانب بہا جا رہا تھا۔ وہ جب اُس خطِ افق پر پہونچا جہاں سمندر سے آسمان مِل جاتا ہے تو میرے منھ سے یکایک نکلا، ارے! جہاز تو غائب ہو گیا۔"

★

محمد اشرف ۵۵ ...

غزل

غلام مرتضیٰ راہی

ٹھہر، دو چار نفس، اب کیا ہے
راہ ہموار ہے بس، اب کیا ہے

رہا جب تک رہا سمتوں کا زوال
آئی آوازِ جرس، اب کیا ہے

میں ترے سامنے آئینہ تھا
اپنی صورت کو ترس، اب کیا ہے

آ گئے موج میں ندی، نالے
اے گھٹا، کھل کے برس، اب کیا ہے

دلنے دانے پہ نظر تھی تیری
آ تھہرِ دامِ ہوس، اب کیا ہے

ختم ہو جائے گا جھگڑا سارا
چل گیا ہے مرا بس، اب کیا ہے

غزل

ظہیر غازی پوری

تو آگ ہے پانی ہے کہ جنگل کی ہوا ہے
ہر سطح پہ میں نے تجھے محسوس کیا ہے

وہ خطہ جو تہذیب کی آندھی سے بچا ہے
ابتک وہاں انسان ہی خود اپنا خدا ہے

انگلی نہ کوئی اپنی تراشے مری خاطر
ملبوس مرا خون سے رنگین ملا ہے

فردا کا یقیں لے کے گزرنے کا ہے ہنگام
آئینۂ امروز بہت ٹوٹ چکا ہے

آوازوں کے صحرا میں یہاں گنگ ہے میری
لفظوں کا ہر اک ذائقہ کانوں سے چکھا ہے

دیکھو کہیں تعمیر کی عظمت پہ نہ حرف آئے
دیوار ہے قائم ابھی لیوا ہی گرا ہے

احساس اذیت کا کہاں کر سکیں الفاظ
پیشانیِ افکار پہ بل اب بھی پڑا ہے

خود لوگ ظہیر اب اسے محسوس کریں گے
آہنگ مرا دانشِ حاضر کی صدا ہے

اگرہانڈر ۱۸۹۵ اشک

حالی کی تحریک کے اثرات اردو غزل پر

———— عزیز اندوری

ناسخ، آتش، ذوق، غالب اور مومن کی "اصلاحی تحریکات" کے بعد اردو غزل نے جو ارتقائی شکل اختیار کرلی تھی وہ ان کے بعد دلی کے انتشار اور ابتری سے ایک بار پھر متاثر ہوئی ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے ذہنوں کو مفلوج کر دیا تھا اور اس کے رد عمل کے طور پر دلی کا دامن پھر سے علم و کمال کے پرستاروں سے خالی ہونے لگا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذکورہ شعرا، نے دلی کے ادبی مزاج کو غزل کی جس خوشبو سے مہکایا تھا وہ بغاوت کے لہولہان ماحول کی "پراگندگی" میں ایک بار پھر سے ڈوب گیا۔ اگر کہیں کہیں بے اس خوشبو کا جھونکا آتا بھی تھا تو اس میں "زبان دانی" کی مہک شامل ہوتی تھی جسے داغ دہلوی کی شوخیِ طبع نے اور بھی معطر بنا دیا۔ جس کے باعث غزل میں "چھلبلے پن" کا رجحان داخل ہوا۔ غزل جب داغ کے ہاتھوں میں پہنچی تو اس کا مزاج دلی کے بدلتے ہوئے حالات میں ڈھل چکا تھا۔ داغ نے چونکہ قلعۂ معلیٰ میں آنکھیں کھولی تھیں اور وہاں کے ماحول کا اثر ان کے دل و دماغ پر مرتسم تھا اس لیے انھوں نے بھی وہی زبان اختیار کی جس کا تعلق اس ماحول سے تھا۔ اس لیے ان کی غزل میں روزمرہ کی زبان کا رجحان شامل ہوگیا۔ ان کی غزل سلاست اور سادگی کی وجہ سے مقبول تو ہوئی لیکن وہ رعایت لفظی کا پیکر بھی بن گئی اور اس میں رفتہ رفتہ گل و بلبل کی داستان، شمع و پروانہ کے قصے، لیلیٰ و مجنوں کے افسانے شوق و تمنا زلفِ پریشاں، نرگسِ بیمار، رشکِ اغیار اور زہد و تقویٰ پر طعن و تعریض سے متعلق انتہائی سطحی اور آسان مضامین شامل ہونے لگے اور غزل بعض صورتوں میں رکاکت اور ابتذال کا نمونہ بن گئی۔ زبان دانی سلاست اور سادگی کے شوق نے غزل کو اس درجے پر پہنچا دیا جہاں اس میں اس قسم کے اشعار ملنے لگے۔

تم کو ہے وصلِ غیر سے انکار — اور جو ہم نے آکے دیکھ لیا
اس نہیں کا کوئی علاج نہیں — روز کہتے ہیں آپ آج نہیں
ہم بوسہ لے کے ان سے عجب چال چل گئے — یوں بخشوا لیا کہ یہ پہلا قصور تھا
کسی کی شامت آئے گی کسی کی جان جائے گی — کسی کی تاک میں وہ بام پر بن ٹھن کے بیٹھے ہیں

یا پھر

ع مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

گویا غزل کو ایک بار پھر میر کے لفظوں میں "چوباجانٹی" کے آغوش میں پہنچا دیا گیا ہے اور اسے زبان دانی کے چٹخارے نے ایسے مقام پر لا کر چھوڑا جہاں ہر کس و ناکس نے اپنی مرضی کے مطابق اسے استعمال کرنا شروع کر دیا اور بعض صورتوں میں وہ بازار ادب کی ایسی جنسِ ارزاں بن گئی جسے بوالہوس نے خریدنا شروع کر دیا۔ ولی، میر، غالب، مومن، آتش اور ناسخ نے اُسے جس طرح بیش بہا دولت بنا کر پیش کیا تھا، ان حریص ہاتھوں نے اُسے اتنی ہی بے دردی کے ساتھ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزل ایک ایسی بدنما تصویر بن گئی، جسے بڑے ہی عامیانہ رنگوں کی آمیزش سے تیار کیا گیا ہو۔

ایسے عالم میں اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ کسی خاص تحریک اور تنظیم کے تحت اس میں کوئی ایسی تبدیلی کی جائے جو اس کی کھوئی ہوئی عظمت، طہارت، منزلت اور رعنائی سے اسے ایک بار پھر "حسین"

اگر ہائٹر ۱۸۹۵ تک

بنا سکے۔

ادھر ہندستان میں انگریزوں کا مکمل اقتدار ہو چکا تھا، اور چونکہ انگریز اپنے ساتھ نئی طرزِ فکر اور معاشرتی تربیت کا نیا انداز لے کر آئے تھے اس لیے اُن سے ہندستانی بھی پوری طرح متاثر ہو رہے تھے۔ اور قدیم بے جان روایات سے رفتہ رفتہ منہ موڑتے جا رہے تھے۔ ذہن و نظر ہر اس آواز کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے جس کی لے نئی ہو۔ غزل بھی اس نئی لے کی طرف متوجہ ہوئی اور اس کی باشعور پرستاروں نے اس کی عظمت، منزلت اور رعنائی کو دوبارہ حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن یہ کوشش زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اور غزل روایت کے غارِ گمنامی میں جوں کی توں پڑی رہی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ اس طرف غزل گو شعراء نے بھرپور توجہ نہیں کی اور اس کی طرف سے تجاہلِ عارفانہ برتتے رہے۔ دوسرے انگریزوں کے طرزِ فکر اور معاشرتی تربیت کے نظامِ نو نے بھی غزل کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچایا۔ لوگ اس فکر او تربیت کے نئے پن سے متاثر تو ضرور ہوئے لیکن بیشتر نے انھیں پسند بھی نہیں کیا۔ وہ لوگ جو انگریزی تحریک سے متاثر ہو رہے تھے، انھوں نے غزل گو شعراء سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے غزل کی اہمیت سے انکار کر دیا۔ اور انگریزی فکر اور تربیت کے زیرِ نگرانی ہندستانیوں کی نجات کے لیے نظم گوئی کو مقدم سمجھا۔ ان کے اس رویے نے غزل کو بنیادی طور پر نقصان پہنچایا اور لوگ ولی، میر، غالب، مومن وغیرہ کے رجحاناتِ شعری کو بھی فراموش کرنے لگے۔ انھیں مسائلِ حیات اور واقعاتِ زمانہ کو حل کرنے کے لیے غزل کا دامن انتہائی تنگ نظر آنے لگا۔

اسی کے ساتھ غزل کے انحطاط میں اس دور کے ملکی انتشار کو بھی بڑا دخل رہا۔ یہ انتشار جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد پیدا ہوا تھا، اس وقت ختم ہوا جب غزل کی وہ قدیم فضا جسے قدیم شعراء کی روایتوں نے تازہ رکھا تھا، ختم ہو چکی تھی۔ مغربی طرزِ فکر اور تربیت نے نئے نئے اثرات مرتب کر دیے تھے۔ نئی تہذیب اور روایات نے غزل کے دامن کو انتہائی تنگ پاکر اُسے پھلنے اور پھولنے سے محروم کر دیا تھا۔

مغربی طرزِ فکر اور تربیت سے متاثر ہونے والوں میں حالی کا نام نمایاں رہا ہے۔ انھوں نے غزل کی تنگ دامانی کی شکایت کرتے ہوئے اُسے مسائلِ حیات و واقعاتِ زمانہ کے حل کرنے کے لیے ناکافی سمجھا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے غزل میں محض محاورہ بندی اور لفظی صناعی کی خاطر مضمون اور خیال کو پسِ پشت ڈال دینے کی بھی سخت مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ موجودہ حالات کا حل تلاش کرنے میں غزل کامیاب نہیں ہو سکتی اور دوسرے غزل کی روایت کو توڑنا بھی آسان نہیں ہے۔ اُسی کے ساتھ آزادی کی تحریک نے قومیت اور وطنیت کا جو رجحان پیدا کیا تھا، غزل کا مزاج اُسے قبول کرنے کے لائق نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اس کا دامن تنگ ہے۔ حالانکہ اوّل اوّل انھوں نے غزل کی اصلاح کی کوشش بھی کی اور اس کی روایت کو توڑنا بھی چاہا۔ لیکن جب انھیں کامیابی نہیں ملی تو انھوں نے اس سے منہ موڑ کر نظم گوئی سے اپنا رشتہ مضبوط کر لیا۔ اس کے باوجود انھوں نے غزل کی خوبیوں کا اعتراف کیا۔ اور اسے تمام اصنافِ سخن میں سب سے زیادہ موثر صنف تسلیم کرتے رہے۔ اگر انھیں کوئی اختلاف تھا تو وہ اس کے تقلیدی اور میکانکی انداز سے۔ وہ چاہتے تھے کہ غزل سے ابتذال اور تتبع کے رجحان کو ختم کر کے اس میں حالات و واقعاتِ زمانہ سے متعلق تمام مسائل کو کھل کر داخل کیا جائے۔ اسی لیے انھوں نے "ہدایت نامۂ غزل" لکھ کر غزل کے مخصوص رنگ کو تبدیل کرنے کی طرف پہلی بار توجہ دلائی۔ جس کے تحت انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ غزل کو محض داخلی اظہار ہی کا ذریعہ نہ سمجھا جائے بلکہ اُسے شعوری اعتبار سے بھی پرکھ کر اُس میں نئے نئے موضوعات کو داخل کیا جائے تاکہ اس کا دامن وسیع ہو سکے۔ ان کا یہ اقدام اس بات کی علامت تھا کہ وہ غزل کی بتدریج تبدیلیوں سے واقف تھے اور چاہتے تھے کہ غزل میں ایسی تبدیلی لائی جائے جس سے اس میں اپنے جذبات و خیالات کو "تفصیل" سے پیش کیا جا سکے۔ اسی لیے انھوں نے مسلسل غزل کہنی شروع کی لیکن انھیں اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ مل سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غزل نے بتدریج

تبدیلیوں کے باوجود کبھی بھی اپنے مخصوص رمزیہ انداز کو فراموش نہیں کیا تھا اس لیے اس میں تسلسل کے بعد وہ تاثرات پیدا نہ ہوسکے جو غزل کے رمزیہ انداز کے تحت اس کے لیے مخصوص تھے۔ اسی لیے ان کی مسلسل غزل کی تحریک بھی نظم کی شکل اختیار کر گئی۔ اسی کے ساتھ یوں کہ انھوں نے مقدمہ شعر و شاعری میں کسی مضمون کو غزل کے دو مصرعوں ہی میں بیان کرنے پر زور دیا اس لیے بھی مسلسل غزل کے اشعار کو غزل کے اشعار کی صورت میں تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

اس سلسلے میں ان کا کہنا تھا:

"بعض خیالات جو دو مصرعوں میں بالکل یا زیادہ خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہوسکتے ان کو قطعہ یا رباعی کے لباس میں ظاہر کیا جاسکتا ہے"[1]

حالی کی اس طرح اصلاحی تحریک سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ غزل ایک نئے آہنگ سے آشنا ہوگئی اور اس میں وقتی مسائل کو شامل کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ انھوں نے غزل کی اصلاح کے سلسلے میں جو مشورے پیش کیے اُن کا لب لباب یہ ہے۔

(۱) غزل کے عشقیہ مضامین تجربات کے تحت لائے جائیں جو غیر فطری نہ ہوں اس سلسلے میں ان کا کہنا تھا۔

"غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ ایسے جامع الفاظ میں ادا کیے جائیں جو دوستی اور محبت کے تمام انواع و اقسام اور تمام روحانی تعلقات پر حاوی ہوں"[2]

(۲) غزل میں ایسے خمریات کے لوازمات کا ذکر کرتے ہوئے فقہا، زہاد اور اہلِ ظاہر پر طعن و تعریض کرتے وقت غلو سے کام نہ لیا جائے بلکہ دنیا دار قسم کے صوفیوں اور زاہدوں کی مخالفت کرنے میں کوئی معقول وجہ اور دلیل پیش کی جائے۔

انھوں نے اس بات کو یوں کہا ہے:

"نکتہ چینی ایسے طریقے سے کی جانے جس سے معلوم ہو کہ محض ریا و مکر و سالوس کی برائی بیان کرنی مقصود ہے نہ کہ زہاد اور واعظین کی ذات پر حملے کرنا"[3]

(۳) انھوں نے قدما کے ذریعہ بیان کیے گئے مضامین کو دہرانے کی مخالفت کی اور غزل میں مختلف پیرایوں اور اچھوتے مضامین لانے پر زور دیا لیکن وہ اس صداقت کے معترف رہے۔

"ایک ایک مضمون کو مختلف پیرایوں اور متعدد اسلوبوں میں بیان کرنا بھی کمالِ شاعری ہوسکتا ہے"[4]

(۴) غزل میں صرف ایسے مضامین لائے جائیں جن کا تعلق جذباتِ انسانی سے ہو لیکن انھوں نے تقلید کی سخت مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا:

"ہر قسم کے خیالات جو شاعر کے دل میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوں، وہ غزل، رباعی یا قطعہ میں بیان ہوسکتے ہیں لیکن جو خیالات اگلوں نے زمانے کے اقتضا سے یا اپنے جذبات کے جوش میں ظاہر کیے ہیں ہم بھی وہی راگ گاتے رہیں اور انھیں کے خیالات کا اعادہ کرتے رہیں۔ نہیں۔ ہم کو چاہیے کہ اپنی غزل کو خود اپنے خیالات اور جذبات کا آرگن بنائیں"[5]

انھوں نے ایک خیال کو بار بار دہرانے کو پسند نہیں کیا۔ وہ اس فعل کو "بہروپیے کا روپ" کہتے رہے۔

غزل کی زبان میں بھی حالی نمایاں تبدیلیاں کرنا چاہتے تھے ان کے اس اقدام کا یہ نتیجہ نکلا کہ لوگ نئی علامتیں وضع کرنے اور پرانی علامتوں کو نئے مفاہیم میں استعمال کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے خود بھی اس نئی علامت کو وضع کرنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا کہ پرانی علامتوں کو نئے مفاہیم کے تحت استعمال کرنے پر توجہ دی۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار نئے دور کی غزل کی عمدہ مثال ہیں:

رہے گی کس طرح راہ امین کہ رہنما بن گئے ہیں رہزن
خدا نگہباں ہے قافلوں کا اگر یہی رہزنی رہے گی

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۱۳۲
[2] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۱۴۴
[3] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۱۳۷
[4] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۱۵۱
[5] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۱۴۶

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

اب جاگتے ہیں سایۂ زلفِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

حالی کے ان اشعار کا پس منظر پرانی علامتوں کے نئے استعمال سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کا لہجہ جہاں جدید ہے، وہیں اس میں تازگی بھی موجود ہے۔

حالی کا دور اردو غزل کے لیے عجیب کشمکش اور امتحان کا دور تھا۔ اکثر لوگوں کو اس بات کا احساس تھا کہ اگر غزل نے اپنی پرانی ڈگر کو نہیں چھوڑا تو وہ ایک دن دم توڑ دے گی۔ دوسری طرف حالی نے سیاسی، سماجی اور معاشی تحریک کے تحت غزل کو نظم سے اتنا قریب کر دیا تھا کہ لوگ اس خدشے میں مبتلا ہو گئے کہ کہیں غزل نظم میں ضم نہ ہو جائے۔ پھر بھی حالی نے غزل کو جن ارضی تبدیلیوں کے احساس سے قریب کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ غزل کو ایک ایسا نیا اور وسیع لب ولہجہ دینا چاہتے تھے جو فارسی اور عربی لب ولہجہ سے ہٹ کر اہلِ یورپ کے لب ولہجہ سے نزدیک ہو۔ اسی لیے انھوں نے غزل کے فرسودہ اور بوسیدہ رجحانات پر جو اس میں صدیوں سے موجود تھے قناعت کرنے سے انکار کر دیا۔

انگریزی طرزِ فکر اور تربیت نے اردو غزل سے فارسی اور عربی اثرات کو کم کیا۔ جس کے تحت اس میں ایسے جذبات و رجحانات کو داخل کیا گیا جس سے غزل اندر کی طرف سے باہر آئی اور جہاں اُسے ملکی اور قومی مسائل سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ اُسے نئی نئی علامتیں، استعارے اور سلیس و پُر اثر زبان بخشی گئی۔ لیکن چونکہ اس کے نازک مزاج کو تبدیل کرنا کچھ آسان نہ تھا اس لیے اس دور میں "نئی غزل" خاطر خواہ ترقی نہ کر سکی۔ اُس کے مقبول نہ ہونے کا سبب بھی بہت سے لوگوں کے نزدیک حالی ہی تھے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ حالی انگریزی طرزِ تفکر کے مُقلد اور مداح تھے اس لیے اس طرزِ فکر کو مقبول بنانے میں انھوں نے مصلحت پسندی سے بھی کام لیا۔ اور اس طرح غزل میں انگریزی طرزِ فکر کو داخل کرنا بھی حالی کی مصلحت پسندی ہی تھا۔ اس سلسلے میں سردار جعفری کا کہنا ہے۔

"حالی جدید ادبی تحریک کے بانی ہونے کے باوجود
سیاسی رجعت پرستی کا شکار تھے اور انھوں نے انگریز آقاؤں
سے سمجھوتا کیا اور اُن کے راگ گائے"[1]

اس مصلحت پسندی کے باوجود حالی نے اردو غزل میں بیداری کا جو جذبہ پیدا کرنا چاہا۔ اُسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ غزل میں فطری تقاضوں کی تکمیل کی طرف لوگوں کی توجہ بھی حالی کے اسی جذبے کی مرہونِ منت ہے۔ جس کی وجہ سے غزل خارجی احساسات کا آئینہ بنی اور اس میں دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ دماغی کاوشوں کو بھی داخل کیا گیا۔ اور اس طرح اس میں پہلی بار ان عصری میلانات و رجحانات کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی جو روحِ عصر تھے۔ اس سلسلے میں اختر انصاری نے کہا ہے۔

"حالی کا سماجی اور اجتماعی احساس بیدار تھا۔ وہ اپنے
زمانے کی تاریخی قوتوں اور بنیادی حقیقتوں سے واقف تھے"[2]

حالی کو اپنی اس کاوش میں حسب منشا کامیابی نہ مل سکی جس کی وجہ یہ تھی کہ اردو داں طبقہ غزل کی روایت پرستی میں بری طرح جکڑا ہوا تھا اور اسے عصری میلانات و رجحانات کو سمجھنے کی پہلے سے تربیت بھی نہیں دی گئی تھی۔ اسی لیے حالی کی تحریکات کو مغربی طرزِ فکر کی تقلید سمجھ کر قبول نہیں کیا گیا حالانکہ یہ رجحانات اور یہ طرزِ فکر

---

[1] ترقی پسند ادب صفحہ ۱۹۴
[2] حالی۔ مطبوعہ اردو تنقید کے معمار مرتبہ ایم حبیب خاں صفحہ ۸۰

اتنی زود اثر تھی کہ اس سے ہر باشعور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ دوسرے مغربی طرز فکر اور ادبی نظریات میں حالات و واقعات کی دھڑکنوں کو شعر و ادب میں پھیلانے کی زیادہ صلاحیت تھی۔ اور اردو غزل چونکہ صرف عربی اور فارسی کی طرف سے بنائے ہوئے رسمی اور روایتی راستوں پر گامزن تھی اسی لیے اُسے اپنی جگہ سے ذرا سا بھی نہیں ہلنے دیا گیا۔ اور اُسے انتہائی محدود دائروں میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ اس کی تمام تر ترقیاں محدود ہوگئیں۔ اور وہ جمود و سکوت ہوکر بے حسی کا شکار ہوگئی۔ حالی نے غزل کی اس محدودیت اور کھلے ہوئے دماغ سے غور کیا۔ اور انھوں نے محسوس کیا کہ اس میں لیلیٰ و مجنوں اور گل و بلبل کی فرسودہ داستان بیان کرنے کا وقت نکل گیا ہے۔ وہ بار بار اس احساس سے تڑپتے رہے کہ اردو غزل میں حالات کو سمجھنے کی ذہانت کیوں پیدا نہیں ہو رہی ہے۔؟ نیز وہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے شدید ردعمل کے باوجود قدیم بے جان روایتوں کی تقلید کرنے میں کیوں منہمک ہے۔؟ اس احساس ہی نے انھیں غزل کی نازک مزاجی اور روایتی انداز کا مخالف بنا دیا۔ حالانکہ انھیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ وہ اس اختلاف کے باوجود غزل میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں لا سکتے اسی لیے انھوں نے غزل کے لیے یہ رائے قائم کی وہ حسن و عشق کے مسائل کو پیش کرنے کا ذریعہ تو ہوسکتی ہے لیکن اس میں بدلتے ہوئے حالات اور جدید طرز فکر کے ارتقائی پہلوؤں کو بیان نہیں کیا جاسکتا اور اگر ایسا کیا بھی گیا تو اس کا اثر غزل کی نازک مزاجی پر نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے ان کی اصلاحی تحریک تذبذب اور کشمکش کا شکار ہوگئی۔ اور انھیں خود بھی غزل کے روایتی انداز کے قریب سے ہوکر گزرنا پڑا۔ جہاں بعض جگہ وہ اُلجھ کر رہ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے غزل کے اس مزاج سے ایسا "معاہدہ" کرلینا چاہا جس سے اس میں داخلی مسائل کو بھی پیش کیا جاسکے اور اس میں "روح عصر" بھی شامل ہوسکے۔ ان کے اس تذبذب ہی نے انھیں کبھی اطمینان سے نہیں بیٹھنے دیا۔ جس سے وہ ایک "محتاط نظریے" کے شاعر بن گئے اور اس طرح ان کی اصلاحی تحریک میں وعظ و نصیحت سے پُر ایسا لہجہ پیدا ہوگیا جس کے ذریعہ وہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہے۔ اسی لیے ان کا لہجہ نیا ہونے کے باوجود لوگوں کے لیے بیزاری کا سبب ہوگیا۔ جس کا اثر ان کی غزلوں پر بھی پڑا اور وہ خشک و غیر موثر ہوگئیں۔ وہ غزل سے بھی وہی کام لینا چاہتے تھے جو انھوں نے مسدس سے لیا۔ لیکن مجموعی طور پر انھوں نے غزل کو اس کے روایتی انداز سے نجات دلائی۔ اور ان کی تحریک کی وجہ سے بقول عبدالاحد خاں خلیل

"ہماری غزل کے فن میں تو خیر لیکن فکر میں نئے باب کا اضافہ ہوا۔ اب غزل محض سر دھننے اور دل خوش کرنے کی چیز نہیں رہی۔ بلکہ کچھ کام کی طرف متوجہ کرنے کا وسیلہ بن گئی۔ افادیت کی جگہ لے لی" [1]

حالی کے اس کارنامے کو سراہتے ہوئے آل احمد سرور نے کہا تھا:

"ہماری شاعری دل والوں کی دنیا تھی۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ اُسے ایک ذہن دیا۔" [2]

حالی کی اصلاح پسندی یا تبلیغی مصلحت پسندی سے چاہے اختلاف کرکے انھیں وقتی اور عارضی سمجھا جائے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی اصلاحی تحریک نے انتہائی اہم کارنامہ انجام دیا جس کا اثر ان کے بعد کے شعراء کی غزلوں میں صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔

★

[1] اردو غزل پچاس سال صفحہ ۶۴

[2] حالی مطبوعہ ماہ ادبی دنیا مارچ ۱۹۳۶ء بحوالہ اردو تنقید کا مطالعہ از عبادت بریلوی صفحہ ۱۷۰

جاڑا

سید ابراہیم خلیل

کہر کی نقاب اوڑھ لی آسماں نے کہ آیا ہے جاڑوں کا رنگین موسم
چمکتی ہے اشجارِ گلشن کے سبز اور شاداب پتّوں پہ شفّاف شبنم

دھندلکے کی چادر میں ہے رہ گزر، فضاؤں پہ چھایا ہوا ہے اندھیرا
افق تا افق دھندلی ہے فلک پر، یہ ہے سرمئی شام یا اک سویرا

امیدوں کے طوفان مچلے دلوں میں، سہانی نظر آ رہی ہیں فضائیں
بدن میں کڑی سوئیاں چبھ رہی ہیں جو چلنے لگیں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں

خدا نے دیا ہے زر و مال جن کو وہ ہیں مطمئن گرم پوشاک پہنے
جو بد بخت غربت کے مارے ہوئے ہیں وہ آسودہ ہیں جامۂ چاک پہنے

غریب ہو کہ یا صاحبِ استطاعت، میسر ہے سب کو مسرت کی دولت
کہ رہتی ہے ادنیٰ و اعلیٰ پہ یکساں ہمیشہ خدائی کی چشمِ عنایت

خلیل عقلِ انساں ہے محوِ حیرت بیاں کیا ہو نیرنگیٔ حسنِ فطرت
کہ ہے کلکِ شاعر یہاں سربسجدہ، نظر میں ہے قدرت کی تقدیسِ عظمت

اگرہا نشرہ ۸۹۵ انک

رباعیات — ڈاکٹر اسعد انصاری

پینے کا ارادہ کیا، مخمور ہوا
کی سعیٔ عیاں ہونے کی، مستور ہوا
حاصل ہوا ایقان، تو اوہام بڑھے
میں اپنے کو پاتے ہی بہت دور ہوا

نذرِ دورِ شراب ہو جانے دو
ذرّہ ہوں میں آفتاب ہو جانے دو
محشر میں خدا جانے ہو کیا حشر مرا
دنیا میں تو کامیاب ہو جانے دو

ہے خیرہ نگاہی اثرِ کثرتِ نور
ہر جلوہ ہوا ہو کے نمایاں مستور
پانا یہ بہ الفاظِ دگر کھونا ہے
وہ آیا مرے پاس تو میں ہو گیا دور

آسان کٹھن راہگذر ہو جائے
شبِ زیست کی کٹ جائے سحر ہو جائے
منزل نہ سہی حسرتِ منزل ہی سہی
جس طرح بھی ہو، ختم سفر ہو جائے

افسانہ

ماضی کے شعلے

ایس، ایم، وسیم

وہ ایک پرکیف شام تھی۔

زندگی بھر کی تھکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آج ابھی اسی شام اتر گئی ہے۔

میں نے اپنی کھوئی ہوئی منزل پالی تھی ——— یقیناً دو راہوں چلنے والے مسافر کسی نہ کسی اگلے دوراہے پر پھر ایک دوسرے ...ا ہی لیتے ہیں۔ میں بے حد خوش تھا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ دور تک لمبی شاہ راہ پر، خوشی کے گیت ...تا، ناچتا چلا جاؤں ——— دُور بہت دور تک

مجھے یاد تو نہ تھا لیکن اس آخری خط کے فقرے ذہن میں ابھر ...مر کر آرہے تھے"۔ ..... تم کو، خوب یاد ہے، کالج کے اس آخری ...داعی جلسے میں جی بھر کے دیکھا تھا ——— تصویر میں......

...نکہ تم اس دن بیماری کا بہانہ کر کے نہیں آئی تھیں ...... یا پھر ...ید تم واقعی بیمار ہو گئی تھیں ..... ممکن ہے تمہارے ذہن میں ...ید ...... شاید کوئی سوال الجھن بن کر آگیا ہو .....؟"

یکایک ایک موٹر جو تیزی سے بھاگ رہی تھی مجھ سے ٹکراتے ...تے بچی۔ ڈرائیور یقیناً بچا کر نکال لے گیا ورنہ میری چال تو ٹکرانے کے قابل تھی۔ شاہراہ پر تیز رفتاری سے ادھر ادھر قدم رکھنا ...شبہ خطرناک ہوتا ہے۔

پھر خیال ابھرا "ردفی ——— تم آخر کس طویل خاموشی کا شکار ہو؟ ... ممکن ہے تم نے میری زندگی کے سائے سے .... اف .. .. ممکن ہے تم نے میری زندگی کے سائے سے بھی دُور ..... دُور

جانا مناسب سمجھا ہو اور کوئی .... کوئی .... کوئی اجنبی خوش قسمت شا ——— آہ ...... زاد ...... دا ..... روفی ..... ایک منتظر نگاہ دیدار کی طلبگار ......"

"ارے بابو ......" رکشے والا چلّا کر ہینڈل تیزی سے گھماتا ہوا گزر گیا۔

میں دور تک لمبی شاہراہ پر چلتا گیا۔ قدم آگے تھے اور خیالات کا لامتناہی سلسلہ ماضی کی ڈوری پکڑے ہوئے واپس لوٹ رہا تھا ان حسین شاموں کی یاد میں، جب ہم اور وہ کبھی دریا کے نیلگوں پانی میں اپنا منتشر وجود دیکھ کر مسکراتے تھے۔ میں کتنی مسافت طے کر گیا مجھے کچھ پتہ نہیں تھا۔

یکایک کسی نے کاندھا پکڑ کر ہلایا۔

"جی"

"جی ہاں ——— میں آپ کا پڑوسی ہوں ——— بالکل آپ کے گھر کے پاس رہتا ہوں"

"خوب ملاقات ہوئی"

"جی ہاں"

"خیر ——— خوشی ہوئی۔ مجھے دیر ہو گئی تھی۔ بات در اصل یہ ہے ——— کہ جس مکان میں آپ رہتے ہیں، اس میں ایک صاحب پہلے رہا کرتے تھے"

"تو!" ...

"جی۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ مجھ سے کہہ گئے تھے کہ اگر

ان کا کوئی خط آئے تو فوراً ان کے پتے پر بھیج دیا جائے۔ ڈاکیہ نے بتایا ہے کہ وہ آج ایک خط دے آیا ہے...... "

"ڈاکیہ سچ کہتا تھا۔ مگر وہ خط میرا ہے۔" میں نے اطمینان و اعتماد سے کہا۔

"ہو سکتا ہے...... مگر ذرا دیکھ لیجئے گا اگر آپ کا نہ ہو تو واپس کر دیجئے گا...... بھئی آپ تو جانتے ہیں نئی بیوی کے خطوط کا کتنا انتظار ہوتا ہے؟ بیچارے انور صاحب۔ بس آتے ہی تھے کہ تبادلہ ہو گیا...... "

"تبادلہ...... جی ہاں۔ تبادلہ بھی دربدری ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ میں نے لکھنؤ سے ایم۔ اے کیا تھا۔ پھر نوکری ملی اور اب یہی تبادلہ مجھے بھی آپ کے شہر لے آیا۔ قسمت سے آپ مل گئے۔ الہ آباد واقعی حسین شہر ہے۔" میں نے بات ٹالنے کے لیے سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔

میں اس اجنبی کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور رونی کے خط کے جملے آہستہ آہستہ ابھرنے لگے:

"...... تم...... اتنے دنوں سے خاموش کیوں ہو؟...... نہ کوئی خط اور نہ کوئی پیغام۔ آخر کیا ہوئی تمھاری لامتناہی محبت؟ مجھے شروع کے دن یاد آتے ہیں —— نہ کوئی کام نہ کوئی فرض۔ بس یہی کہ تمھیں دیکھے جاؤں؟ آخر تم اتنی طویل چپ کا شکار کیوں ہو؟...... دل کہتا ہے کل کی صبح آئے گی۔ گھڑی سات۔ آٹھ، نو اور دس بجا چکے گی تو گیارہ، بارہ کے بیچ گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ دل دھڑکنے لگا۔ تیز تیز، تمھاری یاد میں۔ پھر یکایک کوئی کہے گا رونی یہ خط؟ اور میں اس خط کے پیچھے دوڑوں گی۔ بے تحاشہ۔ بچوں کی طرح...... لیکن تم ہو کہ خاموش خاموش کبھی نہ ٹوٹنے والی خاموشی...... کاش تمھیں بھی میری طرح...... انتظار ہوتا؟ بولو —— کسی سائے کی آڑ میں تمھارا وجود چھپ گیا ہے...... "

ہم ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ میں نے سکوت توڑنے کے لیے کچھ کہنا چاہا تو زبان پر آیا:

"جی وہ خط میرا ہے۔"

"انور صاحب۔ بڑا آیا انور صاحب کا ہمدرد" میں زیر لب بڑبڑایا۔

"جی...... کیا کہا؟" اس نے پوچھا۔

"جی۔ کچھ نہیں۔ جی چاہ رہا تھا کہ کچھ گنگنانے لگوں مگر بہت تھک گیا ہوں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ دفتر...... "

"جی ہاں...... " اس نے بات کاٹ دی۔

خط کی عبارت بار بار ابھرتی ڈوبتی رہی اور میرا اعتماد بڑھتا گیا۔ یقیناً رونی کو میرا خط نہیں ملا تھا۔ پھر بھی اس نے مجھے ڈھونڈ ہی لیا۔

ہم ساتھ ساتھ واپس لوٹ رہے تھے۔ وہ بولتا رہا اور میں بس سنتا رہا۔ راستہ کٹ گیا لیکن وقت کی زنجیریں میرے بوجھل قدموں سے پھر لپٹ گئیں۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے اپنے اس آخری خط میں جو لکھنؤ سے عرصہ ہوا، میں نے اس کو لکھا تھا، تحریر کیا تھا:

"دیکھو! جواب ضرور دینا —— آخر تم کس دنیا میں ہو؟ کہہ تو نہیں سکتا کیا کیا سوچتا رہتا ہوں مگر اتنا ضرور کہ تم جہاں بھی ہو خوش ہو —— کاش! تم محبت کرنے والا درد مند دل رکھتی ہوتیں؟ رونی —— جواب ضرور دینا...... "

اور میرے ذہن نے کہا "دیکھا! جواب آیا۔"

"دیکھئے —— یہ رہا آپ کا دروازہ اور میں باہر انتظار کر رہا ہوں" اس نے کہا اور میں دروازہ کھلتے ہی کمرہ میں داخل ہو گیا۔

...... احتیاط سے خط دیکھا۔ اسی کی تحریر تھی۔ فوراً نگاہ نے پوچھا:

تمہاری اور صرف تمہاری

رونی

پتہ دیکھتے ہی میں مبہوت سا عجیب کیفیت سے دوچار ہوا۔ نوکر نے آکر بار ہا مجھ سے کچھ کہا اور پتھر کی مورت سا خاموش کھڑا رہا۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ میرا پڑوسی باہر میرے جواب کا انتظار کر رہا ہے۔

"دیکھو الطاف...... باہر جو صاحب ہیں ان سے کہہ دو خط صاحب کا ہے۔ جلدی آنا...... "

(بقیہ صفحہ ۲۶ پر)

رنگِ عالم

اعجاز فاطمہ

وہ رہے میری ہر خوشی کے خلاف
میں رہی ان کی برہمی کے خلاف
جو ملا ہے مجھے محبت سے
وہ جنوں بھی ہے آگہی کے خلاف
لمحۂ فکریہ ہے عالمِ مرگ
کیسے سوچوں میں زندگی کے خلاف
سوچتی ہوں جنوں کے عالم میں
چاند بھی ہوگا چاندنی کے خلاف
ہر طرف شورِ میگساراں ہے
کوئی کیا ہوگا تشنگی کے خلاف
کیا اسے انقلابِ عصر کہوں
تیرگی بھی ہے روشنی کے خلاف
آپ کے ماسوا زمانے میں
کون ہے میری بیخودی کے خلاف
اس لیے کہ خزاں نصیبوں میں
ہوں بہاروں سے دوستی کے خلاف
غم نہ کیجے یہ رنگِ عالم ہے
تم کسی کے تو ہم کسی کے خلاف
کوئی اعجاز ہو نہ ہو لیکن
میں نہیں کیف دائمی کے خلاف

ڈاکٹر مایا کھنہ راجے بریلوی

صبح بنارس زندہ باد، شام اودھ پائندہ باد
شیخ و برہمن ساز اٹھاؤ
سچے من سے تار ملاؤ
دیر و حرم میں مل کر گاؤ
صبح بنارس زندہ باد، شام اودھ پائندہ باد
کوہ ہمالیہ کی دیوارو
گنگ و جمن کے ہنستے دھارو
بولو! اے دلکش نظارو
صبح بنارس زندہ باد، شام اودھ پائندہ باد
محنت کش مزدور جوانو
شمع ترقی کے پروانو
نعرہ اب ہو یہ دیوانو
صبح بنارس زندہ باد، شام اودھ پائندہ باد
گوتم و گاندھی کی تصویر
لفظ محبت کی تاثیر
تم بھی لکھو غالب و میر
صبح بنارس زندہ باد، شام اودھ پائندہ باد
چرخ بریں اور تاج طلائی
سات سمندر کی گہرائی
قرباں تم پر ہر رعنائی
صبح بنارس زندہ باد، شام اودھ پائندہ باد

اگرا شرہ ۱۸۹۵ بلک

ابو ریحان البیرونی

سلمان شمسی ندوی

البیرونی جن گوناگوں خصوصیات کا حامل ہے وہ تاریخ کی چند ہی شخصیتوں کے حصے میں آئی ہیں۔ ہماری تاریخ نے بہت سے مختلف الاسباب مختلف النوع اور مختلف الفنون ہزار شیوہ اہل علم عباقرہ (GENIOUS) کے حالات کو محفوظ کیا ہے انھیں تاریخ ساز شخصیتوں میں البیرونی کی ذات بھی ہے جو مختلف پہلوؤں سے غیر معمولی ندرت اور جدت میں ممتاز ہے۔ حال کے مبصرین کی اس رائے سے کہ "ماضی میں علوم و فنون اس قدر متنوع نہیں تھے جتنے آج ہیں" انکار نہیں لیکن البیرونی جیسی شخصیتوں کا مطالعہ کرنے سے ایسا وہم ہونے لگتا ہے کہ ماضی کے علوم اپنے محدود وسائل کے پس منظر میں اس دور سے کہیں زیادہ متنوع تھے۔

ان ہستیوں کی عظمت کا راز، انکا وہ غیر معمولی کمال علم ہے جسکی بدولت انھوں نے مختلف علوم و فنون سے ایک جامع الصفات شخصیت کی تعمیر کی تھی از دش اور مثل نہیں صدیاں گذر جانے کے بعد بھی وہ "یکتائے زمانہ، نادر روزگار" اور زندہ جاوید جیسے خطابات کا مصداق بنے ہوئی ہیں چنانچہ آج سے ایک ہزار سال پہلے پیدا ہونے والے اس عبقری کا جشن کسی خاص ملک اور زبان میں نہیں بین الاقوامی سطح پر منایا جا رہا ہے۔

ماضی کے غیر معمولی فضلاء میں جن کی خصوصیت گوناگوں، جامع اور ہمہ گیر تھی۔ البیرونی بہت زیادہ ممتاز ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مذاق علمی کی رنگارنگی اس کی جامعیت اور جدت ہمیشہ اور ہر زمانہ میں انسانی فطرت، ذہنی تربیت اور علمی تشنگی کی مخصوص مثال سمجھی جائے گی۔ بیک وقت علم و حکمت، مشاہدہ، حساب و ہندسہ فلسفہ، طب، علم السنہ، فنون لطیفہ، نجوم، علم آثار قدیمہ، تاریخ تمدن، مابعد الطبعیات، کیمیا، جغرافیہ، علم حیوانات و نباتات، طبقات الارض علم السنین اور علم مذاہب وغیرہ میں مہارت نامہ پر ماضی اور حال کے ماہرین کا اتفاق اس کی ناقابل انکار جدت طبع اور تبحر علمی کا ثبوت ہے۔

ان تمام علوم و فنون کے ماہرین نے اس کی شخصیت کا مطالعہ اپنے مخصوص اور محدود نقطہ نظر سے کیا اور اسی حیثیت سے اس کے علمی کارناموں کا بھی جائزہ لیا لیکن اس کی جامع شخصیت پر کوئی جامع تحقیق اس لیے سامنے نہ آسکی کہ اس کے بعد ابھی تک ان علوم میں کوئی ایسا جامع الصفات شخص پیدا نہیں ہوا۔ البیرونی پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت ہونے کے باوجود اس کی علمی خدمات کے مقابلے میں بہت کم ہے اور اس سے زیادہ افسوسناک واقعہ یہ ہے کہ دو سو سے زائد کتابوں کے مصنف کی صرف دو ہی کتابیں منظر عام پر آسکی ہیں اور خدا جانے کتنی کتابیں ایسی ہونگی جن کا سراغ بھی نہیں لگ سکا ہے۔

مشہور جرمن مستشرق پروفیسر سخاؤ نے البیرونی کے جو حالات مختلف مصادر و مراجع سے مقدمہ "آثار باقیہ" میں جمع کیے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ "وہ ۳ ذی الحجہ ۳۶۲ھ میں خوارزم میں پیدا ہوا اور ۲ رجب ۴۴۰ھ میں غزنہ میں ۷۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔ بیرونی، بیرون خوارزم کی طرف منسوب ہے۔ چونکہ وہ نواحی شہر خوارزم یا صوبہ خوارزم کا رہنے والا تھا۔ خوارزم کا باشندہ نہ تھا اس لیے اس کو بیرونی کہا گیا۔

بظاہر ابو ریحان البیرونی نے اپنی عمر کے ابتدائی حصہ کو خوارزم میں ماماتیوں کے ظل عاطفت میں جو خوارزم شاہیہ کے نام سے مشہور ہیں بسر کیا ماماتیوں کا خاندان ابتدا میں شاہان سامانیہ کا باج گذار تھا۔

اگر ہائنٹر ۸۹۵ انک

پھر سامانیوں کی سلطنت کے خاتمہ اور غزنویوں کے استقلال حکومت کے مابین یعنی ۳۸۴ھ سے ۳۹۰ھ کے درمیان یہ خاندان مستقلاً فرماں روا ہو گیا لیکن اس استقلال کے چند ہی سال بعد ۴۰۷ھ میں سلطان محمود غزنوی نے خوارزم کو فتح کر کے اپنی وسیع سلطنت میں شامل کر لیا۔

ابوریحان نے چند سال جرجان میں شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کے دربار میں بھی جس نے دو مختلف زمانوں یعنی ۳۶۶ھ تا ۳۷۱ھ اور ۳۸۸ھ تا ۴۰۳ھ میں جرجان اور مضافات جرجان میں حکومت کی بسر کیے اور ۳۹۰ھ میں اس کے نام پر کتاب "آثار باقیہ" تصنیف کی۔ ابوریحان کی کتابوں کی فہرست میں ایک کتاب کا نام "تاریخ خوارزم" ہے اور ابوریحان نے اس کتاب میں حسب عادت اپنے وطن کے تمام اخبار، آثار اور قصص و حکایات بالخصوص اپنے زمانے کے مخصوص واقعات جن میں اکثر واقعات کو اس نے بچشم خود دیکھا تھا، درج کیے ہیں۔

بہرحال سلطان محمود جب خوارزم سے غزنہ کو واپس ہوا تو ۴۰۸ھ میں ابوریحان اور دربار خوارزم شاہی کے تمام فضلا کو اپنے ساتھ غزنہ لے گیا۔ چنانچہ محمود نے ہندوستان پر جو حملے کیے ان میں ابوریحان بھی اس کے ساتھ رہا۔

اس نے ہندوستان کے علما و حکما سے میل جول پیدا کر کے سنسکرت زبان سیکھی اور تاریخ، ہیئت، ریاضی، جغرافیہ اور علوم طبیعات میں ان کے میل جول سے اپنی معلومات کو وسیع کیا۔ انھیں سفروں میں اس نے اپنی مشہور کتاب "کتاب الہند" کا مواد ہندوؤں کے علوم، مذاہب اور اخلاق و عادات کے متعلق جمع کیا۔

ابوریحان نے اپنی معلومات ان عمدہ کتابوں کے علاوہ جو اب ناپید ہیں زیادہ تر لوگوں کی زبانی باتوں سے حاصل کی ہیں اور ہمیشہ دوسرے مذاہب کے پیشواؤں اور دوسری قوموں کے علماء و حکما سے میل جول پیدا کر کے کوشش بلیغ کے ساتھ معلومات حاصل کرتا رہا ہے۔

ابوریحان انتہائی حقیقت پسند تھا اور اس حقیقت پسندی پر وہ کسی دوسری شے کو ترجیح نہیں دیتا تھا۔ اس نے اس حقیقت کو کسی دوسری غرض سے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ مسلمان تھا اور شیعیت کی طرف مائل تھا۔ خشک مزاجی اور تعصب سے بہت دور تھا۔ ایرانی قوم اور انکی خصوصیات کا شیدائی تھا۔

تذکروں میں البیرونی کی تعلیم و تربیت، اخلاق و عادات اور خاندان کو نظر انداز کیا گیا ہے اس لیے اس سلسلے میں کچھ زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں البتہ خود البیرونی نے اپنی کتاب "الآثار الباقیہ" میں اپنے دو استادوں کا ذکر کیا ہے ایک ابو نصر منصور علی اور دوسرے محمد بن الحق۔ ان دو ناموں کے سوا کوئی اور سراغ نہیں ملتا اور ان میں بھی آخر الذکر نام بعض محققین کے نزدیک محل نظر ہے۔

محققین نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ صرف اس کے علم و ہنر سے متعلق ہے اس کی شخصی زندگی اور کردار کے سلسلے میں وہ عام طور پر خاموش ہیں۔ یاقوت نے معجم الادباء میں اس کی معاشرت کی تعریف کی ہے اور اس کے بعض اخلاقی مقولے بھی نقل کیے ہیں، حلیہ کے سلسلے میں بھی لکھا ہے کہ پستہ قد اور گندم گوں تھا۔

البیرونی کی عام شہرت اس کے علوم حکمت و فلسفہ اور ریاضی نیز ہیئت و نجوم میں ہوئی لیکن وہ اپنے ان خشک مضامین میں مہارت کے ساتھ ذوق شعر و سخن اور ادبیت کے لطیف شوق سے بھی بیگانہ تھا۔

معجم الادباء کے مصنف نے اس کا تذکرہ بحیثیت ادیب کے کیا ہے اور اس کے بعض عربی اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ یاقوت کی روایت کے مطابق البیرونی نے دواوین کی شرحیں بھی لکھی ہیں جن میں شرح الکلم کے دستخطی نسخہ مصنف مذکور کی نظر سے گزرا تھا۔ فن طب پر البیرونی کی خاص نظر تھی، ان علوم و فنون کے سلسلے میں شیخ بوعلی سینا سے اس کی مراسلت و مناظرات کا بھی پتہ چلتا ہے لیکن معقولات میں وہ شیخ کا ہم نہ تھا۔ البیرونی نے ریاضی کی تکمیل میں محض یونانی خزینہ معلومات پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ وہ ہندوستان کے علمی سرچشموں سے بھی پوری طرح فیضیاب ہوا تھا۔ صرف اس شخص کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ مشرق و مغرب کی معلومات پر دسترس رکھتا تھا اور دنیا کے ہر ابتدائی عمر سے لے کر آخیر تک البیرونی کو ہیئت و نجوم سے جو غیر معمولی دلچسپی رہی وہ اس کی تصانیف سے ظاہر ہے۔ چنانچہ اس کی کتاب "قانون مسعودی" علم ہیئت میں ام الکتب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں اس کی مہارت صرف علمی عمق کے نقطہ نظر سے قابل توجہ نہیں بلکہ اس علم میں اس نے

متقدمین پر تنقید بھی کی ہے اور ان کی تحقیقی لغزشوں کو پیش کیا ہے۔

آلات ہیئت پر اس کی متعدد تصانیف ہیں اور خاص طور پر جغرافیائی تحقیقات میں اس کی بیش بہا خدمات اس کے فضل و کمال کی دلیل ہے جسے اس نے مشاہدہ اور نظریہ دونوں حیثیتوں سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ مشہور ماہر جغرافیہ ریمنڈ بیزلے "(REMONDBEEZLAY)" نے لکھا ہے کہ "البیرونی اپنے زمانہ کا سب سے بڑا جغرافیہ داں تھا" اور بہت سے اہل فن کی رائے ہے کہ "البیرونی شاید تاریخ اسلام کے ہر عہد اور ہر قوم میں سب سے بڑا نام ہے"۔

البیرونی کی کچھ ایسی تصنیفات بھی ملتی ہیں جن میں دم دار، گیسودار اور ٹوٹنے والے ستاروں سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ تاریخ تمدن، علم الآثار اور علم مذاہب میں البیرونی کے علمی کارنامے آج بھی کسی نئی تحقیق سے کم نہیں ہیں چنانچہ کتاب الہند اس سلسلے کی سب سے روشن مثال ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا ہمہ گیر مذاق حکمت ہے جس کے سرسری مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ یہ کسی فرد واحد کی بساط سے کہیں زیادہ ہے لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید لغت میں عبقری کا لفظ ایجاد نہ ہوتا۔

شہرزوری نے اس کی محنت اور شوق کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "وہ تحصیل علوم میں اور شوق تصنیف میں اس قدر مصروف اور محو تھا کہ کبھی نہ ہاتھ سے قلم جدا ہوتا تھا نہ کتاب سے آنکھ اور نہ دل سے فکر۔ اس کا موقع صرف سال میں دو بار آتا تھا یعنی نوروز اور مہرجان کے دنوں میں، ان دو دن میں وہ اپنے خور و نوش کا سامان مہیا کرتا تھا"۔ چنانچہ بعض کتابوں کے حصول میں البیرونی نے ۴۰ سال تک جستجو اور محنت کی ہے۔ زکریا رازی کی کتاب "سفر الاسرار" سے متعلق اس کی اس طویل المدت کوشش کا تذکرہ خود اس کے اپنے مکتوبات میں موجود ہے۔

حسن برنی کے بقول "البیرونی نے اپنی زندگی محض کنج عزلت میں نہیں گذاری تھی بلکہ بہت کچھ سفر کیا تھا اور خوب دنیا دیکھی بھالی تھی۔ میدان مشاہدہ اور میدان معلومات وسیع ہونے کی وجہ سے اس میں اجتہاد اور جدت بہت زیادہ پائے جاتے ہیں مشاہدہ کی قوت نہایت دوربین اور نکتہ رس ہے ہر شے کی علمی تحقیقات اس زمانہ میں البیرونی کا حصہ ہے جو دماغی فضل اور حریت ذہن پر دلالت کرتی ہے۔ اس کا مدار صرف حکما کی تصنیف کی تقلید اور خیالات کی غلامی پر نہ تھا بلکہ وہ ہمیشہ نئی بات پیدا کرنے اور نئے علوم اختراع یا موجودہ دائرہ معلومات کو وسیع کرنے پر مائل رہتا تھا نیز تحقیقات علمی میں جن کا مدار مشاہدہ یا تجربہ پر ہوتا تھا وہ کبھی مطمئن نہ ہوتا تھا تاوقتیکہ خود بھی اس کا تجربہ نہ کرے یہی وجہ ہے کہ اس کی معلومات اس قدر صحیح اور قابل قدر ہیں"۔

چنانچہ جرمن محقق ڈی بور البیرونی کی ان خصوصیات کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ البیرونی کے وقت وفات کا ایک واقعہ اس کی علم دوستی اور معرفت شناسی کے شوق و دارفتگی کا شاہکار ہے۔ اس واقعہ کو یاقوت نے محمود نیشاپوری سے نقل کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ۔

"میں حالت نزع میں ابوریحان کے پاس گیا۔ اسی شدت تکلیف میں اس نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے جدات فاسدہ کا حساب ایک دن کس طرح بتایا تھا میں نے کہا اس حالت میں پوچھنا کیا ضروری ہے، اس نے کہا میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلے سے ناواقف رہ کر دنیا سے رخصت نہ ہوں۔ میں نے اس کو یہ مسئلہ بتایا اس نے اسے بمشکل یاد کیا۔ اس کے بعد میں رخصت ہو گیا لیکن چند لمحوں بعد اطلاع ملی البیرونی کا انتقال ہو گیا"۔

ان تمام تصریحات سے اس کے علمی ذوق، علمی انہماک اور کثرت تصنیفات کا حال معلوم ہوتا ہے۔ البیرونی نے اپنی ان تصنیفات کی فہرست جو ۴۲۷ھ تک یعنی وفات سے ۱۳ سال پیشتر لکھی جا چکی تھیں اپنے دوست کے نام ایک خط میں ایک سو چودہ بتائی ہے لیکن یہ فہرست نامکمل معلوم ہوتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ بات قابل غور ہے کہ وہ اس خط کے بعد ۱۳ سال تک زندہ رہا اس لیے ناممکن ہے کہ اس عرصہ میں اس کا سیال قلم رک گیا۔ اس کے علاوہ بھی اس کی کچھ کتابیں زیر تصنیف تھیں اس کی بعض تصنیفات کی تصریحات کچھ دوسری کتابوں میں ملتی ہیں جو اس کی بتائی ہوئی فہرست سے مختلف ہیں "کشف الظنون" میں ایسی ایک بڑی فہرست موجود ہے۔

معتدبہ تصانیف دوسروں کی فرمائش اور خواہش پر لکھی گئی تھیں چنانچہ جرجان، بلخ خوارزم کے علماء نے متعدد بار استفسار رسائل کی شکل میں اس سے تصنیفات لکھائی تھیں نیز بہت سی کتابیں تصحیح ترتیب، تہذیب، تفسیر اور رد جواب کی حیثیت سے لکھی گئی تھیں۔

محمد حسن برنی نے البیرونی کی کچھ کتابوں اور رسائل کی فہرست اپنی معلومات کی بنیاد پر جمع کی ہے لیکن یہ نا ممکن ہے، بہر حال ذیل میں صرف ان کتابوں کا تذکرہ کر دینا مناسب ہے جو صرف ہندستان سے متعلق ہیں:

۱۔ جوامع الموجود لخواطر الهنود فی حساب التنجیم۔ اس کتاب میں البیرونی نے اہل ہند کے علوم و نجوم کی بابت مکمل تحقیقات درج کی تھیں۔ (۲) زیچ ارکند کا ترجمہ = یہ ایک مشہور ہندستانی کتاب تھی جس کا ترجمہ البیرونی نے جدید معلومات کی بنیاد پر کیا تھا۔ (۳) خیال الکسوفین عند الهند آفتاب اور ماہتاب کے دو متحد اور مساوی مداروں کے متعلق۔ اہل ہند میں یہ مبحث شہرت عام رکھتا تھا اور ان کے یہاں کوئی زیچ اس سے خالی نہ تھی۔ (۴) سند (حساب میں) ہندستانی قوموں سے حساب و شمار (۵) رسوم الهند (حساب سکھلانے میں نقوش کی کیفیت) (۶) رسالہ = جس کا موضوع ہے کہ اہل ہند کے یہاں عدد کے مراتب عربوں سے بہتر ہیں (۷) براهم سدرهانت (ہندی) کا ترجمہ (حساب کے اعداد کے سلسلہ میں) (۸) فی سکلب الاعداد (حساب میں) (۹) رسالہ جس کا موضوع ہے کہ اہل ہند کے یہاں اجزا علوم کرنے کے کیا قاعدے ہیں۔ (۱۰) علم نجوم سے متعلق اہل ہند کے سوالات کے جوابات۔ (۱۱) کشمیر کے علماء کے سوالات کے جوابات (۱۲) عمر نکالنے کے متعلق ہندوؤں کا کیا قاعدہ ہے۔ (۱۳) براہمیر کی کتاب سوالید الصغیر کا ترجمہ (۱۴) حکایت بیتی و بومعما کر مرزبان نیلوفر (۱۵) کتاب فی تحقیق ما للهند من مقالة مقبولة او مرذولة (۱۶) مقالة فی تاشیا الهند عند بجیبة الادفی (عقائد سے متعلق) (۱۷) کتاب فی الموجودات المحسوسة والمعقولة (عقائد) (۱۸) کتاب باتنجل فی الخلاص من الارتباک (عقائد) (۱۹) کتاب فی تنصیف التعدیل عند اصحاب الهند (متفرقات) (۲۰) برهم گپت کے پانی ساسی هانت کا ترجمہ عربی۔ (۲۱) تحریر اقلیدس (۲۲) کتاب المجسطی (۲۳) مفتاح الغیث۔

ان تمام کتابوں کا سراغ اس کی تصنیفات سے ملتا ہے، اگرچہ ان تصنیفات کے تذکرہ سے اس کے تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے لیکن متداول نہ ہونے کی وجہ سے ان کا تذکرہ محض داستان گوئی کے کچھ اور نہیں لیکن اس کی معرکۃ الآراء کتاب کتاب الهند نے اس کی شخصیت کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیا ہے۔ اس کتاب میں اس نے ہندوؤں کے متعلق ہر قسم کی معلومات جو ان کے عقائد یا اعمال سے متعلق اسے حاصل ہوئیں جمع کر دیا ہے۔ ان معلومات کو حاصل کرنے کے لیے ہی اسے سنسکرت زبان سیکھنے اور اس میں مہارت پیدا کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ جس زمانہ میں اس نے یہ مراحل طے کیے اس وقت اس کی عمر ۴۵ سال سے متجاوز تھی "کتاب الهند" کا سال تالیف ۴۲۳ھ ہے یعنی اس کتاب کی تکمیل کے وقت اس کی عمر ۶۰ سال تھی۔ اسے سنسکرت کے پیچیدہ نکات، صرف و نحو اور لغات پر عبور حاصل تھا ظاہر ہے کہ اس کے بغیر وہ اہل ہند کے معتقدات، فلسفہ اور ہیئت سے متعلق معلومات حاصل نہیں کر سکتا تھا جبکہ یہ سارا مواد صرف سنسکرت کے دفینوں میں موجود تھا۔ چنانچہ "کتاب الهند" کی فہرست دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنے مقصد کے حصول میں پوری کامیابی حاصل کی اور کوئی ممکن عنوان نظر انداز نہیں کیا۔

البیرونی کا اس تصنیف سے مقصد یہ ہے کہ وہ ہندو تہذیب و تمدن کے حالات خود ہندستان کے رہنے والوں کی زبان سے بیان کرے چنانچہ اس نے تمدن ہند کی پوری تصویر خود انھیں کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر پیش کی ہے۔ اس کتاب میں اس نے یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ اس سے اس کا مقصد ہندو خیالات کی تردید نہیں بلکہ ان کی اشاعت و توسیع ہے۔

البیرونی کی رائے ہے کہ ہندو اپنے فلسفہ، ریاضی اور ہیئت میں بلند پایہ رکھتے ہیں اس نے اس کتاب میں ہندستان اور یونانی فلسفہ کا باہمی تقابل بھی کیا ہے وہ ہندستان کی صنعت و تعمیر کا بھی مداح ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے

اگر ناظرہ ۱۸۹۵ انگلی

مسلمانوں کو ہندوؤں کے علوم سے واقف کرایا" سخاؤ نے "کتاب الہند" کے مقدمہ میں کتاب پر یوں تبصرہ کیا ہے :

"اگر مسلمانوں کو یہ حق ہے کہ وہ اس کتاب پر فخر کریں اور اسے عربی زبان و ادب کا شاہکار سمجھیں تو ہندوؤں کے لیے بھی یہ کتاب قابل فخر ہے کیونکہ ایک بہت بڑے فلسفی اور صاحب علم نے ان کی تمدنی میراث کو محفوظ کر دیا ہے۔ جہاں جہاں البیرنی کی تصنیف میں کچھ قابل اعتراض باتیں جو اہل ہنود کے لیے ہو سکتی ہیں اس کا سبب اس کا ذوق تاریخ نویسی ہے جس کی وجہ سے وہ حقائق کو مروت پر ترجیح دیتا ہے۔"

البیرونی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے علوم سے اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے فلسفے سے باہم متعارف کرایا۔ اتنی عظیم شخصیت جس کے متعلق کچھ لکھنے کے لیے ایک طویل المدت تحقیق کی ضرورت ہے تاریخ کا افسوسناک المیہ ہے کہ اس نے اسکی جائے وفات کے بارے میں خاموشی برتی اور مورخین اسکی داستان صرف یہ کہہ کر ختم کرتے چلے آئے کہ

"ایک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے"

"کتابیات"

۱۔ معجم الادبار — جلد ششم — یاقوت حموی
۲۔ اخبار الحکمار — شہرزوری
۳۔ طبقات الاطبار — ابن ابی اصیبعہ
۴۔ انسائیکلو آف اسلام (انگریزی)
۵۔ رسالہ عنایت اللہ (بی۔ اے علیگ)
۶۔ مشاہیر عالم — حصہ اول — عبداللہ خاں
۷۔ البیرونی — عبدالسلام ندوی
۸۔ " — سید حسن برنی
۹۔ آثار باقیہ — ابوریحان البیرنی
۱۰۔ کتاب الہند — "
۱۱۔ تاریخ الصلات بین الہند والعرب — ڈاکٹر محمد اسماعیل
۱۲۔ عرب و ہند کے تعلقات — سید سلیمان ندوی
۱۳۔ نزہۃ الخواطر بہجۃ المسامع والنواظر — حکیم عبدالحئی حسنی
۱۴۔ تذکرہ مشاہیر — یحییٰ محمد نوشہروی

(نوٹ) مضمون میں البیرونی کے حالات میں "سخاؤ" کی عبارت کی تلخیص البیرونی از عبدالسلام ندوی سے ماخوذ ہیں۔

دوسرے اقتباسات کے تراجم و تلخیص میں حسن برنی کے انتخابات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

★

ماضی کے شعلے — (صفحہ ۲۰ کا بقیہ)

رات کی تیرگی بڑھتی رہی اور میرے ذہن کی پراگندگی۔ دفعتاً میں آتش دان کی طرف بڑھا اور یکایک میرے ہاتھوں کو حرکت ہوئی اور میں نے وہ خط دونوں ہاتھوں سے آتش دان میں ڈال دیا۔ لیکن حروف جو جلے تو داستان پکار اٹھی۔ میں نے سرعت سے شعلہ فشاں کاغذ کو نکالنے کی کوشش کی اور میرے ہاتھ جل گئے۔ خادم نے دوڑ کر مجھے سنبھالا۔

صبح جب آنکھ کھلی تو میرے ہاتھوں میں پٹی بندھی تھی۔ دفتر دیر سے پہنچا تو بے تکلف دوستوں نے فقرے بازی کی۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ایک بے ہنگم سے قہقہے کے ساتھ یہ کہہ کر دوستوں کو مطمئن کر دیا:

"ماضی کے بھڑکتے شعلوں سے رات کھیل بیٹھا تھا۔ ہاتھ جل گئے۔"

★

غزلیں

اخلاق فتح پوری

نہ آرزو نہ اُمنگیں نہ ولولے نہ خروش
چراغِ صبح کے مانند دل بھی ہے خاموش

بُجھی بُجھی سی ہے کُل کائناتِ قلب و نگاہ
یہ کون بزمِ تمنا سے ہوگیا روپوش

یہ زندگی کی تگ و دو کہاں پہ لائی ہے
بہ ہر قدم ہیں یہاں کرب و کیف دوش بدوش

اس ایک آس پہ کب سے بھٹک رہا ہے کوئی
کہیں تو لطف و مروت کی وا ملے آغوش

تجھے خبر ہے تری اک نگاہ میں گم ہیں
تمام عالمِ ہستی تمام عالمِ ہوش

چلو کہ وقت کی پہنائیوں میں گم ہو جائیں
ملے گا پھر نہ یہ ماحول یوں طلسم بدوش

زباں پہ آنے لگی ہے حدیثِ دل اخلاق
زمانہ گوش بر آواز ہے خموش خموش

تکمیل رضوی

جس طرف دیکھو بدحواسی ہے
ساری دنیا سکوں کی پیاسی ہے

جو نظر اجنبی رہی برسوں
آج جیسے کچھ آشناسی ہے

دوست دشمن میں امتیاز نہیں
بیخودی ہے کہ بدحواسی ہے

مدعائے نظر سمجھتے ہیں
یہ ہماری سخن شناسی ہے

مٹ چکا فصلِ گل میں جب گلشن
نکہتِ گل تو اب قیاسی ہے

اپنا ساقی ہے اپنا میخانہ
روحِ میخوار پھر بھی پیاسی ہے

عاشقی کیا ہے ضبط و خودداری
بیقراری تو اک خطا سی ہے

موسم خوش گوار ہے اب تو
چہرۂ گل پہ کیوں اداسی ہے

طنز کے ساتھ شکریہ تکمیل
ایک اندازِ ناسپاسی ہے

افسانہ

فضل حسنین

میں اس کی سیٹ کے قریب پہنچ کر کھڑا ہو گیا کیونکہ بس میں بہت بھیڑ تھی اور آگے بڑھنے کی گنجائش بالکل بھی نہ تھی۔ ایک سیٹ خالی ضرور تھی مگر اس پر لکھا ہوا "لیڈیز" کا لفظ جیسے مجھے چڑھا رہا ہو۔ کبھی میں خالی سیٹ کی طرف دیکھتا اور کبھی اس لکھے ہوئے "لیڈیز" کو۔ اس سیٹ پر بیٹھی ہوئی لڑکی میری اس کش مکش سے کافی محظوظ ہو رہی تھی۔

اچانک بس ایک جھٹکے کے ساتھ رکی اور میں اس کی سیٹ پر گرتے گرتے بچا۔

"معاف کیجیے گا"! میں نے احتیاطاً معذرت کی۔

"اس میں آپ کی کیا غلطی ؟ قصور تو ڈرائیور کا ہے۔ خیر! آپ بیٹھ جائیے۔ مجھے کوئی اوبجکشن (OBJECTION) نہیں ہے"! اس نے بے تکلفی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ!" کہتے ہوئے ہچکچاہٹ کے ساتھ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"کہاں تک چلیں گے۔ ؟" لڑکی باتونی معلوم ہوتی تھی۔

"بس تھوڑی دور!" میں نے ٹالتے ہوئے کہا۔

"اور آپ...... ؟" میں نے رسماً پوچھ لیا۔

"یونیورسٹی تک!" اس نے جلدی سے کہا۔ جیسے وہ یہ بتلانے کے لیے بے چین رہی ہو۔

"اچھا تو آپ اسٹوڈنٹ ہیں ؟"

"کافی انٹیلیجنٹ معلوم ہوتے ہیں آپ" اس نے اس انداز میں کہا جیسے میں اس سے بہت چھوٹا ہوں۔ انداز مضحکہ اڑانے کا تھا۔

"کس ایر (YEAR) میں ہیں ؟" میں نے اس کے اس انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"اس سال میں نے انگلش میں ایم۔اے جوائن کیا ہے"۔ اس نے لفظ "انگلش" پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"آپ کو انگلش سے دلچسپی ہے۔ بڑی اچھی بات ہے۔ رِچ زبان ہے"۔ میں نے تعریفی انداز میں کہا۔

"کیا آپ بھی انٹرسٹڈ (INTE ESTED) ہیں انگلش سے میرا مطلب ہے کہ آپ کو بھی یہ پسند ہے ؟" اس نے اس انداز میں پوچھا جیسے کسی بچے سے مخاطب ہو۔

"تھوڑا بہت!!" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

اتنے میں ایک لڑکا بس میں سوار ہوا اور آ کر ہم لوگوں کے پاس ہی کھڑا ہو گیا۔

"ہلو! مینا!!" اس نے لڑکی کو مخاطب کیا۔

"ہائے!! دنیش!!" اس نے خالص انگریزوں کے سے انداز میں کہا۔

"آج تو بڑا مزہ آئے گا"

"کیوں ؟"

"آج کوئی نئے لکچرر آنے والے ہیں مسٹر آر۔ کے تیواری کا گروال صاحب تو آکسفورڈ چلے گئے"۔ میں اس کے اس انکشاف پر بری طرح چونکا۔ میری دلچسپی بڑھ گئی۔

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ مزہ آنے کی کیا بات ہے؟" دنیش نے پوچھا۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا حالیہ دورہ لکھنؤ

۱۷ نومبر ۱۹۷۳ء کو امّوسی ہوائی اڈے پر وزیر اعلیٰ اترپردیش شری ہیم وتی نندن بہوگنا (بائیں) کی کابینہ کے اراکین سے تعارف

وزیر اعظم قیصر باغ بارہ دری میں آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے اجلاس عام کو ۱۸ نومبر ۷۳ء کو خطاب کرتے ہوئے

وزیر اعلیٰ اترپردیش شری ہیم وتی نندن بہوگنا کانفرنس کے اجلاس میں شریک مندوبین اور شرکاء کو خطاب کر رہے ہیں

وزیر اعظم شریمتی گاندھی لکھنؤ یونیورسٹی کے بیریل ساہنی ہاسٹل کا افتتاح کرتے ہوئے
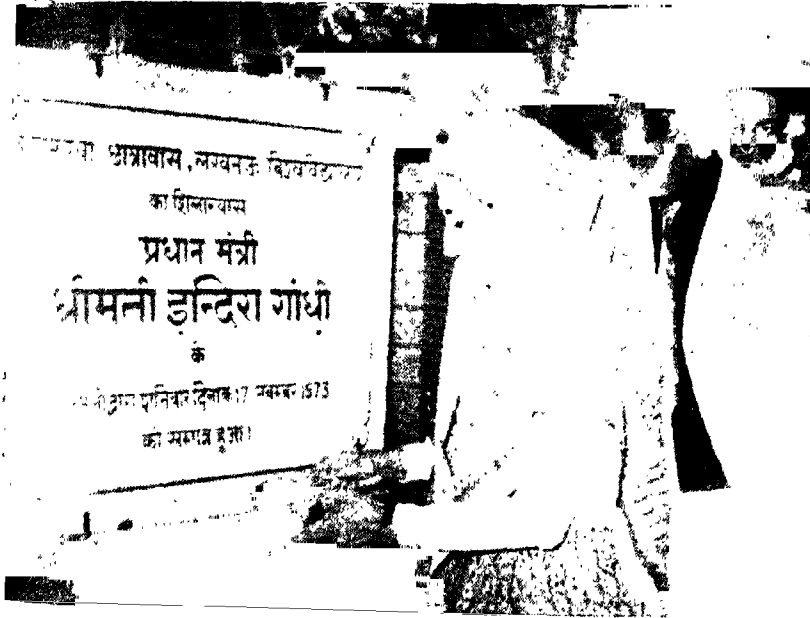
(بائیں) وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی لکھنؤ
یونیورسٹی کے کستوربا ہاسٹل کا ۱۷ نومبر ۱۹۷۳ء
کو سنگ بنیاد رکھ رہی ہیں
(دائیں) گورنر اتر پردیش شری اکبر علی خاں
۱۳ اکتوبر کو کمائوں ڈویژن کے سیاسی
متاثرین کو تامر پتر دیتے ہوئے

وزیراعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا رویندرالیہ لکھنؤ میں ۱۰ نومبر کو آل انڈیا غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس منعقدہ لکھنؤ کے مشاعرہ کا افتتاح کرتے ہوئے۔ اسٹیج پر چیف کنوینر شری رام لعل، شری کرشن چندر، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، رانی رام کمار بھارگوا، بیگم حامدہ حبیب اللہ اور ڈاکٹر نریش وغیرہ بیٹھے ہوئے ہیں

(دائیں) آل انڈیا غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس کے آخری اجلاس کے بعد ۱۱ نومبر کو جناب رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری اور رام لعل صاحب وزیراعلیٰ شری بہوگنا کو کانفرنس کی قراردادوں کا متن پیش کرتے ہوئے

(نیچے) وزیراعلیٰ شری بہوگنا روسی انقلاب کی ۵۶ ویں تقریبات کے سلسلے میں ہند سوویت ثقافتی ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام منعقدہ جلسے کو خطاب کر رہے ہیں

"اچھا! آپ تو اس یونیورسٹی میں اسی سال آئے ہیں۔ ایسا ہے کہ جب کوئی نیا لیکچرر آتا ہے تو ہم لوگ انٹروڈکشن لیتے ہیں اسے خوب بیوقوف بناتے ہیں۔ ہفتوں اسے پڑھانے نہیں دیتے بیچارہ بالکل نروس ہو جاتا ہے۔ ہم لوگ خوب مزہ لیتے ہیں۔"

"اوہ! وہ کیسے؟"

"ارے بھئی! خوب الٹی سیدھی بحث کرتے ہیں۔"

"تو وہ سوالوں کا جواب دیتا ہوگا۔"

"ارے تو بے سر پیر کی باتوں کا کیا جواب دے گا کوئی؟"

"دیکھوں گا۔ میری یونیورسٹی میں تو یہ TRADITION نہیں ہے۔"

دنیش کو بھی کچھ خوشی سی ہوئی۔

اور پھر دونوں مستقل طور سے گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ لڑکی شاید بھول گئی تھی کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

"اچھا بتلائیے مسٹر دنیش! آپکا FAVOURITE کون ہے؟ میرا مطلب POETS میں آپ کا پسندیدہ شاعر کون ہے؟"

"رابرٹ براؤننگ۔"

"آپ کو وہ کیوں پسند ہے؟"

"OPTIMIST ہے نا! مجھے رجائی شاعر اچھے لگتے ہیں۔ انھیں ہر چیز میں اچھائی ہی نظر آتی ہے۔ اور پھر براؤننگ WHAT A GREAT POET HE IS واقعی وہ عظیم شاعر ہے۔"

"مجھے تو وہ بالکل پسند نہیں ہے۔"

"آپ کسے پسند کرتی ہیں؟"

"شیلے کو۔"

"آپ اسے کیوں پسند کرتی ہیں؟"

"BECAUSE HE IS KNOWN AS A POETS OF YOUTH" جی ہاں! نوجوانوں کا شاعر ہونے کی وجہ سے وہ مجھے بے حد پسند ہے۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی! چونکہ وہ 'جوانوں کا شاعر' ہے اس لیے ہر نوجوان اسے پسند ہی کرے، یہ تو کوئی ضروری نہیں ہے!"

"اس نے مناظر فطرت کی بڑی ہی اچھی تعریف کی ہے" لڑکی نے اپنی غیر معمولی معلومات کا اظہار کیا۔

"اچھا! یہ کوئی نئی بات بتا رہی ہیں آپ؟" لڑکے کو کچھ حیرت ہوئی۔ اور واقعی اس بات پر میں بھی مسکرا دیا۔ لڑکی کی معلومات پر مجھے بھی حیرت تھی۔

"آپ شاید ورڈسورتھ کے بارے میں کہہ رہی ہیں!" لڑکے نے تصحیح کرنا چاہی۔

"جی نہیں! وہ تو مجھے ذرا بھی پسند نہیں ہے! اس کی کچھ باتیں تو میرے بالکل سمجھ میں نہیں آتیں۔"

"FOR EXAMPLE! مثال کے طور پر کوئی بات بتلائیے۔"

"اب دیکھیے نا! اپنی ایک POEM میں بھلا سا نام ہے اس نظم کا وہ کہتا ہے کہ "میں اپنی لڑکی کے لیے ایک ہی زبان کافی سمجھتا ہوں۔"

میں چونک سا گیا۔ بڑی عجیب عجیب باتیں بتا رہی تھی۔

"مس مینا! EXCUSE ME معاف کیجیے گا! کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو انگلش مل کیسے گئی؟" اس یونیورسٹی کا اسٹینڈرڈ تو بہت اونچا ہے۔"

"SOURCE! مسٹر دنیش! ذریعہ بڑی چیز ہے۔"

"تب ہی تو آپ ایسی باتیں کر رہی ہیں۔"

"کیوں؟" وہ کچھ چونکی۔

"آپ نے ابھی جو بات کہی ہے وہ ملٹن کے بارے میں ہے!"

"اچھا چلیے ملٹن ہی سہی۔ لیکن اس کا مطلب سمجھائیے۔"

"اصل میں اس کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیوں کے لیے ایک ہی زبان کافی ہے۔ اور وہ ہے یہ!" میں نے اپنی زبان دکھلاتے ہوئے کہا۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا۔

"جی! وہ پھر چونکی! اوہ! ہاں آپ کو بھی تو انگلش سے دلچسپی ہے۔"

اب اس نے اپنی انگلش کی قابلیت ختم کر دی اور ریاست پر لوڈ کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ آن کی آن میں بڑے بڑے ریاستدانوں کے نام گنوا ڈالے۔ وہ شاید لوگوں کے نام اور ان کے اقوال رٹ لینے کو ہی سب سے بڑی قابلیت سمجھتی تھی۔ اب وہ ابراہم لنکن کے اس قول کو دہرانے کے لیے موقع نکال رہی تھی، جو انھوں نے جمہوریت (DEMOCRACY) کے بارے میں کہا تھا۔

"DEMOCRACY IS......"

"جی ہاں! جی ہاں۔ ٹھیک ہے"! میں نے بات کاٹی۔ میں اب اس کی باتوں سے اکتا گیا تھا۔ ذشیں صاحب کافی سکون محسوس کر رہے تھے کیونکہ میں نے خود یہ بلا اپنے سر لے لی تھی۔ پہلے تو یقیناً میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی لی تھی۔ لیکن اب یہ سوچ رہا تھا کہ یہ مشین بند کیسے ہو! میں نے محسوس کیا کہ بس کے دوسرے لوگ بھی اس عجوبہ کو سمجھنے میں مصروف تھے۔ شاید وہ لوگ بھی بور ہو گئے تھے۔ لیکن لڑکی تھی کہ مشین کی طرح اس کی زبان چل رہی تھی۔ پہلے تو یقیناً میں نے اسکی باتوں میں دلچسپی لی تھی لیکن اب بہت بور ہو رہا تھا۔ مجھے اس کے صحیح الدماغ ہونے میں شک ہو چلا تھا۔ اگر اس آفت ناگہانی سے ذرا بھی واقف ہوتا تو بس میں بیٹھتا ہی نہیں۔ یوں بھی مجھے سٹی بس سے آنا نہیں چاہیے تھا۔ لیکن چونکہ آج ملازمت کا پہلا دن تھا۔ میں وقت سے کچھ قبل ہی پہنچنا چاہتا تھا۔ کافی دیر رکشے کا انتظار کرتا رہا۔ جب کوئی رکشا خالی نہ مل سکا اور دس بج گئے تو مجبوراً اس بس میں ہی سوار ہو گیا۔

"اچھا اب میں چلوں گا"۔ اگرچہ مجھے وہاں نہیں اترنا تھا لیکن میں نے مزید بیٹھے رہنا ہرگز مناسب نہ سمجھا اور اب سننے کو رہ بھی کیا گیا تھا؟ لیکن میں نے سوچا اچھا ہی ہوا میں اس بس سے آیا۔

"دیکھیے! میں تو راستے بھر بکواس کرتی آئی ہوں۔ لیکن اپنے بارے میں آپ نے کچھ نہیں بتایا"۔ شاید وہ مجھے بھی اسٹوڈنٹ سمجھ رہی تھی۔

"کوئی ضروری تو نہیں"! میں نے "ملنے کی غرض سے کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس وقت اسے بور کر دوں ساری اسمارٹنس (SMART - NESS) ہوا ہو جائے گی۔

"اچھا BRIEF INTRODUCTION! مختصر تعارف ہی سہی۔ صرف نام تو بتا دیجیے"۔ لڑکی غیر معمولی اور غضب کی بے جھجک تھی۔ وہ خود کو حد سے زیادہ اسمارٹ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور میری کش مکش سے خوب محظوظ ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس سے چھٹکارا پانا مشکل ہے۔ اس لیے مجبوراً میں نے اپنا بریف کیس پلٹ دیا جس پر میرا نام وغیرہ لکھا ہوا تھا۔

اسے دیکھتے ہی جیسے اس کو کرنٹ سی لگی۔ وہ سٹپٹا کر کھڑی ہو گئی۔ پسینے سے شرابور ندامت سے جھکا ہوا اس کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا!!!

★

پکاسو

(صفحہ ۶ کا بقیہ)

حرفت سے بلکہ اصل مسئلہ تو ازن تمام فن کاروں اور دیگر لطیف صلاحیت رکھنے والوں کو معاشرے کے اس حقیقی ارتقار کی طرف رجوع کرانا ہے جہاں سے وہ اپنی تخلیق کے لیے الہام حاصل کرتے ہیں۔

پکاسو نواح اسپین کا باشندہ تھا۔ اس آرٹسٹ کی پیدائش ۲۵ اکتوبر سنہ ۱۸۸۱ء میں ایک ڈرائینگ ماسٹر کے گھر ہوئی۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں فرانکو کے فاشسٹی جبر و تعدی نے اس کے ہم وطنوں کو جس عذاب میں مبتلا کر دیا تھا اس سے یہ ناواقف نہیں تھا۔ بلکہ گہری جراحتیں جو اس کے احساسات پر پڑی تھیں، اس نے ان کو دنیا پر عیاں کر دیا تھا۔ اس وقت اس کی ہستی عوامی ارتقائی اقدام اور ذہنی شعور و جوش کے لیے درمیانی واسطے کا کام دیتی تھی۔ یہاں یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ جب سنہ ۱۹۴۴ء میں پکاسو نے خود کو فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی سے منسلک کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اب میں اپنے اصلی مقام پر ہوں"۔ پکاسو کی زندگی کامیابیوں کی ایک عظیم الشان داستان ہے۔ اس نے ایک سنجیدہ اور ذمہ دار آرٹسٹ کی حیثیت سے زندگی گزاری جو اپنے فن کے لیے وقف ہو چکا تھا اور ایسے گہرے تخلیقی طریقہ کو اپنایا تھا جس کی اس سے قبل نہ تو کسی دوسرے آرٹسٹ کو ہوا لگی تھی اور نہ کسی نے اس کے تعلق سے سوچا ہی تھا۔ وہ ایک ایسا جدید شائستہ اور منفرد دانشور تھا جسے سطحیات سے نفرت تھی۔ اس کے باوجود جہاں تک خود اس کے اپنے آرٹ کا تعلق ہے اس کا رویہ بالکل ایک بچے کی مانند تھا جو ہر روز ایک نیا تجربہ کرتا ہے۔

★

اگرہائنٹر ۱۸۹۵ تک

گوشۂ اقبال

علامہ اقبال

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا
اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

اگرا نشر ۱۸۹۵ء

حبّ الوطنی اور اتحاد

اقبال کی شاعری میں

صالحہ عابد حسین

ڈاکٹر محمد اقبال ان گنتی کے بڑے شاعروں میں سے ہیں جو کسی ایک قوم یا ملک یا کسی خاص عہد کے نہیں ہوتے، بلکہ ان کا پیام عالمگیر اور شہرت ہمہ گیر ہوا کرتی ہے۔ لیکن کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ اول تو انھیں صرف مسلمانوں کا شاعر سمجھا گیا اور پھر پاکستان بننے کے بعد کچھ تو اس تصوّر کی وجہ سے جو ایک الگ اسلامی ریاست کا ان کے ذہن میں تھا، اور زیادہ تر پاکستان کے پروپیگنڈے کی وجہ سے انھیں "پاکستانی شاعر" سمجھا جانے لگا۔ حالانکہ جب انھوں نے صرف مسلمانوں کو خطاب کیا (واضح رہے کہ ان کا خطاب ساری دنیائے اسلام سے ہوتا) اس وقت بھی ان کا ایک وسیع نقطۂ نظر تھا۔ وہ اسلام کی صحیح تعلیم کو دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔ اور انسانیت کی صحیح خدمت انجام دینے کا فرض ادا کرنا ان کا مقصد تھا۔ اس بارے میں مختلف رائیں ہو سکتی ہیں اور ہیں کہ ان کی شاعری اس عظیم مقصد کو کہاں تک پورا کر سکتی ہے لیکن اقبال کے خلوص پر اور اس انسان دوستی اور محبت پر جس سے ان کا وسیع قلب بھرپور تھا، کوئی شک و شبہ کرنا ان پر ظلم اور بڑی ناانصافی ہے۔

اقبال کی شاعری کی ابتدا وطن کی محبت اور قومی اتحاد و اتفاق کے ترانوں سے ہوئی۔ انھوں نے دیش کی عظمت اور سندرتا کے گیت گائے ہیں اور ہندستان کی عظیم ہستیوں کی بڑائی کا اعتراف کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں انھیں اپنے وطن کے ہر ہر پھول، پتے، پرند، انسان، دریا، پہاڑ، زمین، آسمان ہر شے کے حسن اور خوبی کا احساس ہے۔ اس کا بیان وہ بڑے جذبے اور جوش کے ساتھ کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وطن کی زبوں حالی، غلامی اور پستی کا احساس اور درد بھی ان کے دل میں بہت شدید ہے۔ پھر آگے چل کر جیسے جیسے ان کا شعور پختہ، علم وسیع اور مشاہدہ گہرا ہوتا گیا، ان کے کلام میں زیادہ وسعت و ہمہ گیری آتی گئی اور ان کا پیام عالمگیر ہونے لگا۔

یہاں ان کے صرف اس کلام پر ایک سرسری نظر ڈالنا مقصود ہے جس میں انھوں نے وطن کی محبت کے گیت گائے اور اپنے ہم وطنوں کو محبت، اتحاد و اتفاق اور رواداری کا سبق دیا ہے۔

پاکستان کے لوگ لاکھ کہیں کہ اقبال صرف ان کا ہے، ان کا قومی شاعر، مگر آج بھی ہمارے دیش کے ہزاروں لوگ اس کے "ترانۂ ہندی" کو جھوم جھوم کر گاتے اور وجد کی حالت میں سنتے اور پڑھتے ہیں:

> سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
> ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

اور کیا اس شعر میں ہر اس ہندوستانی کے دل کی آواز نہیں سنائی دیتی جو کسی وجہ سے اپنے وطن سے دور ہے؟

> غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
> سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

سچی سیکولرزم کی مثال اسی شعر میں دیکھیے اور ایمان سے کہیے کہ اس شعر میں شاعر نے دریا کو کوزے میں نہیں بند کر دیا ہے؟

> مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
> ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

ذرا فرق کے ان جذبے اور احساس پر بھی غور کیجیے ؎

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

اس کو یہ احساس ہے کہ اس دیس میں کوئی ایسی بات ایسی خوبی ہے کہ اس کا نام امر اور اس کی تہذیب لافانی ہے۔ دنیا کی کتنی تہذیبیں ابھریں، انتہائی عروج پر پہنچیں اور غروب ہو گئیں۔ مگر ہندوستانی تہذیب ہزاروں سال سے اپنی جگہ قائم و دائم ہے ؎

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

ہندوستان کا بے مثال قدرتی حسن اسی کے شاعرانہ ذوق کو وجد کے عالم میں لاتا ہے اور وہ ان کو شاعرانہ کمال کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ اسی ترانہ میں کہتا ہے ؎

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں جس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

ہمالہ میں کس جوش سے کہتا ہے۔ سنیے:

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں — چومتا ہے جھک کے پیشانی کو تیری آسماں
ایک جلوہ تھا کلیم طورِ سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے
آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی — کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی — سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
کانپتا پھرتا ہے کیا، رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

وطن کی بدحالی پر اس کا احساس دل تڑپتا ہے۔ ہندوستان سے خطاب کر کے بڑے درد سے کہتا سنائی دیتا ہے ؎

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

غلامی کی لعنت اور بدیسی سامراج کی حرکتوں اور خود دیس والوں کے آپس کے نفاق کو استعارے کے پردے میں بیان کرتا ہے ؎

نشاں برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

پھر ان کو سمجھاتا ہے جس میں درد بھی ہے تنبیہ بھی ہے، دلسوزی بھی ہے عمل کا پیغام بھی ہے اور راہ آزادی و ترقی پر گامزن ہونے کا پیام بھی ؎

وطن کی فکر کر ناداں، مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے، بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
یہی آئین قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن، محبوبِ فطرت ہے

"ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" ایک اور ایسی ہی نظم ہے جس کے ذریعے وہ بچوں کے دل میں ہندوستان کی عظمت بٹھانا اور اپنے دیس کی محبت پیدا کرانا چاہتا ہے۔

چشتی نے جس زمیں کو پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

دیکھا آپ نے — وہ ایک ہی سانس میں گرو نانک جی اور حضرت معین الدین چشتی کی عظمت کا اعتراف کرتا ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ ہندوستان کی کشش ایسی تھی جس نے عربوں کو اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان کو اپنا لینے پر مجبور کر دیا۔

اس کا وطن دنیا کے سب ملکوں اور قوموں پر فوقیت رکھتا ہے۔ یہ ہر انسان کے دل کی آواز ہوتی ہے — اس وقت اقبال بھی سچے دل سے یہی سمجھتا تھا ؎

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا

سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا
ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

دلیلوں میں کتنا وزن اور سچائی ہے یہ بات بھی قابل غور ہے۔ یہ فرضی اور تخیلی مدح سرائی نہیں بلکہ اس کی بنیاد ٹھوس حقیقت پر ہے۔ یہی نہیں وہ یہ بھی بتاتا ہے ؎

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میر عرب[1] کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ہندوستان کے مذہبی رہنماؤں کی بزرگی اور بڑائی کا وہ کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ رام چندر جی، گرو نانک جی، سوامی رام تیرتھ وغیرہ پر انھوں نے چھوٹی چھوٹی مگر بڑی پر اثر نظمیں کہی ہیں۔ رام چندر جی کی شان میں جو نظم کہی ہے اس کے دو تین شعر سنیے:۔

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رام ہند
اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شام ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوش محبت میں فرد تھا

سکھ فرقے کے رہنما، ہندوستان کے مرد عارف گرو نانک کی پیدائش کا تذکرہ اقبال کس عقیدت سے کرتے ہیں ؎

آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا
بت کدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نور ابراہیم سے آزر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

اقبال اتحاد اور یک جہتی کا حامی تھا اور ہندو مسلمانوں میں اتفاق و محبت دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا ایک اٹل ثبوت ان کی مشہور نظم نیا شوالہ ہے جس میں وہ مذہب کے ظاہر پرست خود ساختہ ٹھیکہ داروں سے خطاب کر کے ان کو یک جہتی اور محبت کا ایک نیا مندر قائم کرنے کا مشورہ دیتا ہے جس میں مورتی جو ہو وہ ہندوستان کی ہو۔ یہ باتیں اصطلاح میں شاعرانہ انداز سے کہی گئی ہیں مگر اتنی پر اثر اور دلکش ہیں کہ دل میں اترتی چلی جاتی ہیں۔ وہ بتاتا ہے کوئی بھی سچا مذہب کبھی نفرت، نفاق اور لڑائی جھگڑے کی تعلیم نہیں دیتا ؎

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

یہ دشمنی اور جنگ و جدل شاعر کے نازک و حساس دل پر بڑی چوٹ لگاتی ہے۔

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے

پھر بڑے درد بھرے انداز میں اس سے کہتا ہے:۔

کچھ فکر پھوٹ کی کر، مالی ہے تو چمن کا
غنچوں کو پھونک ڈالا اس بس بھری ہوا نے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

[1] جناب رسالت مآب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم

اوپر کا یہ شعر اقبال کی ہندوستان سے محبت اور عقیدت کا ایک اٹل ثبوت ہے جس سے انکار کرنا اپنی جہالت کا یا پھر تعصب کا اظہار کرنا ہے۔

یہ دوستی اور محبت اہل وطن میں کیسے پیدا ہو سکتی ہے وہ اسے شاعرانہ انداز میں بیان کرتا ہے۔ سیدھے سادے لفظوں میں کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر سب ہندوستان اس دیس کو اپنا وطن سمجھ کر اس سے گہری اور دلی محبت کریں اور ایک دوسرے کو بھائی سمجھیں تو یہ سب جھگڑے مٹ جائیں! ان چند شعروں میں شاعر نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ اگرچہ اس نظم کے دو تین شعر کہا جاتا ہے کہ بعد میں اقبال نے اسی ترانے سے نکال دیے تھے سنیے:

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامان آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
پھر اک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو
اس ہردوار دل میں لا کر جسے بٹھا دیں
ماتھے پہ اس صنم کے ہندوستان لکھ دیں
اس دیوتا سے مانگیں جو دل کی ہوں مرادیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پریت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

بے شک یہ نظمیں اقبال کے ابتدائی دور کی ہیں۔ اس میں بھی کلام نہیں کہ بعد میں ان کا نقطۂ نظر بدلا اور صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کو وہ اپنا وطن سمجھنے اور ساری انسانیت کو اپنی برادری ماننے لگے۔ لیکن یہ اقبال کی شاعری کا تنزل نہیں عروج ہے۔ جس دل کی وسعت اور ہمہ گیری کا یہ عالم ہو کہ ساری دنیا اس میں سمٹ آئے اس کے فن میں تنزل کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ تبھی تو وہ یہ کہتا سنائی دیتا ہے:

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

اقبال شاعر کے اس مقام سے بخوبی واقف ہے جو قدرت اسے ودیعت کرتی ہے — یہ مقام کبھی ملک و قوم کے اونچے سنگھاسن تک پہنچتا ہے اور کبھی کبھی شاذ و نادر — انسانیت کی سب سے بلند چوٹی تک جا پہنچتا ہے فرماتے ہیں:-

قوم گویا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم
منزل صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفل نظم حکومت، چہرۂ زیبائے قوم
شاعر رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اور اس عظیم شاعر کا دل عمر بھر قوم، ملک اور دنیا کی بدحالی پر روتا ہے۔ بے شک اقبال کا پیام ساری دنیائے اسلام اور دنیائے انسانیت کے لیے ہے۔ لیکن سب سے پہلے وہ ہمارے لیے ہے — ہم ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے لیے جن کا وہ سب سے پہلے ہے۔ سب سے پیارا ہے — اس نے اتحاد، اتفاق کا جو درس دیا تھا، وطن اور اہل وطن کی محبت کی جو ہدایت اور تعلیم دی تھی — اس کے سمجھنے کی آج اور زیادہ ضرورت ہے۔ اس کا پیام آج بھی اتنا ہی اہم، تر و تازہ اور وقت کی سب سے بڑی پکار ہے۔ یاد رکھیے بڑے فن کار کا فن کبھی مرتا نہیں کبھی "آؤٹ آف ڈیٹ" OUT OF DATE نہیں ہوتا۔ کیا اس حقیقت سے کوئی انکار کر سکتا ہے کہ:-

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

سیدھے سادے مدھر بولوں میں ہمارا اقبال کتنی بڑی بات کہہ گیا ہے!! قومی یک جہتی محبت اور پریم کا کتنا بڑا درس دے گیا ہے۔ کاش ہم صرف اس کے اس ایک ہی۔ اس لافانی شعر کو سمجھ کر اپنا لیں تو کیا ہمارا دیس جنت نہ بن جائے؟

★

اگر انٹر ۱۸۹۵ء تک۔

اقبال اور انسانیت

اقبال کو شاعر مشرق کہنا حقیقت کو دو نیم کرنا ہے ۔ اقبال انسانیت کا شاعر ہے، اس کا کلام اردو اور فارسی میں مقید ہونے کے باوجود آفاقی اور کائنات گیر ہے ۔ اس کی فکر نے جغرافیائی توہماتی اور روایتی بندھن توڑ ڈالے ۔ وہ لامحدود انسانیت کا کلاگو ہے لیکن محدود وفاداریوں کی گرمی بھی اس کے آہنگ میں ملتی ہے ۔ اقبال کو اپنے وطن سے والہانہ محبت تھی ۔ اس کے شواہد اس کے اشعار میں بکھرے ہوئے ہیں ۔ شری رام چندر جی کو وہ "چراغ ہدایت" اور "امام ہند" کہتا ہے ۔ "نیا شوالہ" میں وطن کی محبت سے مخمور ہو کر وہ پکار اٹھتا ہے :

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

اسی نظم میں آگے چل کر شاعر کہتا ہے :

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

غور کیجیے اس نظم میں بھی جہاں وطن سے محبت کا اظہار نصف النہار پہ ہے، شاعر کی نظر وطن سے آگے بڑھ جاتی ہے اور ساری دھرتی کے باسیوں سے پریت کا مطالبہ کرتی ہے ۔ اقبال کا سفر محدود سے لامحدود، وطن اور مذہب سے انسانیت کی جانب ہے ۔ ہندستان کے متعلق ایک دوسری جگہ کہتا ہے :

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز ۔۔۔ اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشم مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن ۔۔۔ یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی ۔۔۔ جن کے لیے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب

"ترانہ ہندی" کو بھی چھوڑیے جو کبھی بچے بچے کی زبان پر تھا، اس نظم کو لیجیے جس کا عنوان ہے "ہندستانی بچوں کا قومی گیت" :

چشتی نے جس زمیں پہ پیغام حق سنایا ۔۔۔ نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

اسی نظم میں آگے چل کر شاعر کہتا ہے :

وحدت کی لَے سُنی تھی دنیا نے جس مکاں سے

دیکھیے روئے سخن یہاں ہے ویدک عہد کی طرف، بالخصوص رگ وید کے نغمات توحید کی جانب۔ اس عہد کی سادگی اور پاکیزگی کی طرف (اپنی نظم "ہمالہ" میں) وہ کیسی ارمان کے ساتھ نگاہ دوڑاتا ہے :

اے ہمالہ! داستاں اس وقت کی کوئی سُنا ۔۔۔ مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا ۔۔۔ داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

یہاں اس بنا پر کہ اقبال گردشِ ایام سے تقاضا کرتا ہے کہ ہزاروں سال پیچھے کی طرف لوٹ جائے، کیا آپ اسے رجعت پرست قرار دیں گے ۔ اسے جس دور اور جس اقلیم میں انسانیت ناروا اور مکروہ بندشوں، واہموں اور کذب و جمود سے آزاد نظر آتی ہے، وہی دور اور وہی اقلیم اس کے لیے لائق احترام اور شایان ستائش بن جاتی ہے ۔ ادبیاتِ عالم شاید کوئی دوسری مثال ایسے شاعر کی پیش نہ کر سکے جس کا ذہن رسوم و قیود سے اس حد تک آزاد، ظلم و جہل سے اس قدر بیزار اور کاہلی، آرام طلبی اور کم ہمتی سے اس طرح نفور اور سچائی، پاکیزگی

عزتِ نفس، جستجو، پرواز، ریاضت، قوتِ عمل اور عظمتِ انسانی کا اس قدر گرویدہ ہو۔ اقبال کی نظر التفات وطن پر پڑتی ہے لیکن ماورائے وطن بھی جاتی ہے۔ اسلام سے اسے عقیدت ہے لیکن مذہب بھی اس کی اُفق بندی نہیں کرتا۔ وہ انسانی وحدت اور عظمت کا نقیب ہے۔ خدائے واحد کی طرح انسانیت کو بھی اقبال واحد اور ناقابلِ تقسیم سمجھتا ہے۔ سرگزشتِ آدم اسی نام کی ایک نظم کے الفاظ میں:

ملا مزاج تغیر پسند کچھ ایسا — کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے
نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی — کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے
کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا — چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے
کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا — کیا فلک کو سفر، چھوڑ کر زمیں میں نے
کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں — دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے
سنایا ہند میں آ کر سرودِ ربانی — پسند کی کبھی یوناں کی سرزمیں میں نے
دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی — بسایا خطۂ جاپان و ملکِ چیں میں نے

آخری شعر میں اشارہ صاف بدھ مذہب کی طرف ہے

یہاں تک ذکر تھا مختلف ادوار و ادیان کا، لیکن انسانیت کا شاعر جو ارتقائے انسانی کا نغمہ سرا ہے نہ وطن کا قیدی ہو سکتا ہے نہ ظواہرِ مذہب کا زندانی، چنانچہ اس شعر میں کوپرنکس کے انقلاب آفریں اجتہاد کا ذکر ہے:

ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں — سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے

اور اس شعر پہ آئزک نیوٹن کی چھاپ ہے:

کشش کا راز ہویدا کیا زمانہ پہ — لگا کے آئینۂ عقل دوربیں میں نے

ہمارے دور میں سائنس کا تخمِ آسائش کے جو برگ و بار لایا اس کی جھلک اس شعر میں دیکھیے:

کیا اسیر شعاعوں کو برقِ مضطر کو — بنا دی غیرتِ جنت یہ سرزمیں میں نے

مختصر یہ کہ انسانیت کے کمالات پر خواہ وہ مذاہب کی دنیا میں ہوں، خواہ علم اور سائنس کی اقالیم میں، شاعر افتخار کرتا ہے بلا لحاظِ زمان و مکان، بدونِ امتیازِ رنگ و نسل و جغرافیائی اور مادی فتوحات، علمی اور روحانی تسخیرات اس کے لیے شایانِ احترام ہیں، لیکن وہی تسخیرات جو انصاف اور سچائی اور نیک و بد کے امتیاز پر مبنی ہوں۔ انصاف اور پاکیزگی کو الگ کر دیجیے تو یہ فتوحات نری بربریت ہو جاتی ہیں ع جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔

اقبال کو انسان کے ہمہ جہت ارتقا سے سروکار ہے۔ انسانیت کے فروغ، عروج اور عظمت کی مثالیں ہی اس کی روح کے تاروں کو مرتعش کرتی ہیں۔ انسان کی قوتِ تخلیق، اس کے جنونِ تسخیر، اس کی جستجو، اس کی پرواز، اس کی نگاہِ پردہ سوز پر وہ سر دھنتا ہے۔

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو ؛ فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو

انسان کی عظمت اور اس کی لامحدود صلاحیتوں کا احساس اسے مخمور کر دیتا ہے اور یہی راز ہے گاہ بہ گاہ خدا کی شان میں اس کی بے باکی کا۔ خدا سے بے محابا نوک جھونک کی مثالیں اقبال کے اوراق میں جا بجا ملیں گی:

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا — مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن — زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

●

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن — ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

●

فیضِ ساقی شبنم آسا، ظرفِ دل دریا طلب — تشنۂ دائم ہوں آتش زیر پا رکھتا ہوں میں
مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا — نقش ہوں اپنے مصور سے گلہ رکھتا ہوں میں

ایسے موقعوں پر اقبال کی بے باکیاں "باخدا دیوانہ باش" کے حدود میں داخل ہو جاتی ہیں ع

یا مرا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

آفاق اقبال کی جولانگاہ ہے:

نہ چینی و عربی وہ نہ رومی و شامی ؛ سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی

اس سے بھی واضح تردید شاعرِ مشرق کے تصور کی خود اقبال کی زبانی سنیے:

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی ؛ گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

اس کی ساری کائنات جس خواہش سے عبارت ہے وہ ہے آدمِ خاکی کا عروج:

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام ؛ یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر ؛ فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اقبال کی نظر مشرق و مغرب کے علوم و اکتسابات پر بہت گہری ہے۔ جس چمن میں کوئی خوشنما پھول نظر آیا، شاعر نے اسے اپنی دستار میں سجا لیا۔ ہمارے ادب میں مغرب کے بارے میں دو طرح کے ردِ عمل ہوئے۔ ایک مرعوبیت دوسرا بیزاری۔ اقبال کی فکر اور اس کی نظر آفاق گیر ہے۔ اس میں نہ خیرہ کُن مرعوبیت کی گنجائش تھی نہ کورانہ بیزاری کی۔ سائنس کے انکشافات و اختراعات اور عقل کے اکتسابات اور فکرِ انسانی کے اجتہادات لائقِ ستائش اور موجبِ تحیّر ہیں۔ یہ سب انسان کی قوتِ تسخیر کے شواہد ہیں۔

مغربی اربابِ علم و فن اور قدیم و جدید خدایانِ شعر و ادب کے افکار و رشحات کو اقبال کے ذہنِ رسا نے انتہائی سلیقے اور وسعتِ نظر کے ساتھ اپنے کلام میں جذب کیا ہے۔ اخذِ افکار و علوم و مضامین و حِکَم کا انداز ہر جگہ فاتحانہ ہے، تقریباً اسی طرح جیسے شکسپیئر اپنی تاریخی اور نیم تاریخی داستانوں کو اپنے ڈراموں کے لیے صرف میں لاتا ہے۔ دونوں شاعروں کے تخیل کی بھٹی میں مستعار مواد پگھل کر آتش سیال بن جاتا ہے جسے ان کی فکرِ خلاق کے نوزائیدہ سانچے حشر انگیز حد تک دلفریب شکلیں عطا کرتے ہیں۔ اقبال کو امتدادِ زمانہ اور توسیعِ وسائل کی بدولت یہ موقع ملا کہ اس نے مشرق اور مغرب دونوں کے علوم پر مسخرانہ نظر ڈالی۔ کتاب کے کیڑوں کی طرح نہیں، بلکہ آفتابِ عالمتاب کی طرح جو نہفتہ گوشوں کو روشن اور روپوش خوبصورتیوں کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ یا بادِ صبا کی مانند جو ہر گلستاں سے گلوں کی نکہت کو چنتی ہوئی نکل جاتی ہے۔ اردو ادب اس تصرف اور اس آفاق گیری اس تسخیر اور اس روشن ضمیری کی دوسری مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اردو اور فارسی شاعروں اور حکیموں سے اس کشمیری برہمن زادہ نے بہت کچھ سیکھا اور خود اپنے وطن کی قدیم تہذیب اور ادب سے خوشہ چینی کی۔ ان حوالوں سے قطعِ نظر جو قدیم ہندستانی حکما و اولیا و شعرا کے متعلق دواوینِ اقبال میں پائے جاتے ہیں، یہاں کے فلسفہ اور یہاں کی تہذیب کو اقبال نے اپنے فکر و فلسفے میں سمویا۔ اقبال کی نگاہ عقابی تھی۔ بہنگامِ مطالعۂ فکر و فن، علم و حکمت، زبان و ادب کے جواہر پاروں کو اس کی نظر اسی انداز سے نکال لاتی تھی جیسے غواص سمندر سے موتی کو۔ اور پھر ان گہر ہائے شاہوار سے وہ اپنے افسرِ فکر اور اورنگِ حکمت کو اس طرح سجاتا تھا کہ باید و شاید۔

اقبال نے اردو شاعری کے فکری اُفق کو بیکراں بنا دیا۔ دور رس تھے وہ اثرات جو اس نے مغربی علوم و ادبیات کے مطالعے، یورپ کی سیاحت اور اس میں سکونت سے اخذ کیے۔ علاوہ بریں اس نے بہت سے مغربی شعرا کی نظموں کے مرکزی خیالات و تاثرات کو اردو نظم کے شیشے میں اس اسلوب سے اتارا کہ اجنبیت کی جھلک تک نہ آنے پائی۔ بانگِ درا میں پہلے دور کی نظموں پر نظر ڈالیے۔ ان میں بچوں کے لیے جو نظمیں ہیں وہ جیسا کہ زیرِ عنوان صراحت کی گئی ہے، بیشتر انگریزی شعرا سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً "بچے کی دعا" کے متعلق اگر شاعر خود اعلان نہ کرتا تو کس کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ یہ سراسر آمد اور سادہ و پرکار نظم طبعزاد نہیں ہے:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری　　زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

فارسی شعرا سے جو قرب اقبال کو تھا اس کے لیے تضمین نے ایک دل کش وسیلۂ اظہار کا کام کیا۔ مخمس یا مسدس کے ڈھنگ کی تضمینوں کی ہمارے یہاں کثرت ہے۔ اقبال نے تضمین کے چشمے کو سمندر بنا دیا۔ یہ موضوع ایک مبسوط مضمون کا طالب ہے۔ یہاں اجمالاً یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ اقبال کی تضمین معنی و صورت کے لحاظ سے اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہے۔ اس نے بالعموم کسی شاعر کے چونکا دینے والے شعر کو گنبد مان کر اس کے نیچے اس نظم کا ایوان تعمیر کیا ہے اور خود اس مستعار شعر کو اس ڈھنگ سے گنبد کی طرح بالائے ایوان سجایا ہے گویا ساری نظم کے افکار و مفاہیم، احساسات و تاثرات کا نقطۂ عروج وہی شعر ہے۔ پھر ایسا کرتے ہوئے شاعر نے اس مستعار شعر کے معنوی تمول کو دوچند کر دیا ہے اور اس کو نئے نئے حسین رُخ دے دیے ہیں۔ مثلاً بالِ جبریل کی وہ طویل نظم جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا　　غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا

حکیم سنائی کے مصرع کی تضمین ہے۔

صدا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے
"گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا"

آگے چل کر صائب کے ایک مصرع کو با ادنیٰ تصرف تضمین کیا ہے:

عجب کیا گر مہ و پروین مرے نخچیر ہو جائیں
"کہ بر فتراکِ صاحب دولتی بستم سرِ خود را"

وہ نظم جس کا عنوان ہے "نپولین کے مزار پر" سکندر، تیمور اور عہد آفریں مردانِ خدا کا ذکر کرنے کے بعد اس شعر پر ختم ہوتی ہے:

عاقبت منزلِ ما وادیِ خاموشاں است ؛ حالیہ غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

"تاتاری کا خواب" میں تضمین ہے اس شعر کی

بگو داگر و خود چنداں کہ بینم ؛ بلا انگشتری و من نگینم

اقبال کی ساری تضمینیں اسی طرح ایک جہان معانی اور ایک وضع نو لیے ہوئے ہیں۔ وہی تضمین جو دوسرے شعرا کے یہاں ایک قسم کی مشاقی تھی، اقبال کے یہاں سحر و اعجاز کے مراتب کو پہنچ گئی۔ یہاں مراد یہ نہ تھی کہ تضمین سے فی نفسہٖ بحث کی جائے بلکہ مقصود یہ ظاہر کرنا تھا کہ اقبال کا شعری فن اساتذۂ سلف کے اجرام خیالی سے جگمگا رہا ہے، نیز یہ کہ بڑی شاعری کی جڑیں کس طرح باستان سے غذا حاصل کرتی ہیں اور کس طرح ادبی روایت سے بظاہر انحراف کرنے کے باوجود ادبی روایت سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔

ہر دور اور ہر اقلیم سے اقبال نے کچھ نہ کچھ اخذ کیا۔ اخذ و تحصیل کا انداز سارقانہ نہیں فاتحانہ، دزدانہ نہیں ترکانہ تھا۔ فکر انسانی میں جہاں بھی حسن نظر آیا اقبال نے اپنی جھولی اس سے بھر لی، نہ زماں کی قید قبول کی نہ مکان کی۔

جہاں اقبال کی توسیع و تزئین میں تضمین سے بڑھ کر حصہ ہے تلمیح کا۔ یہاں بھی وہی صناعی وہی فنکاری جلوہ گر ہے جو دیرینہ روایات سے نئی نئی راہیں نکالتی ہے، نئے نئے صنم تراشتی ہے۔ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں۔ "خضر راہ" میں "کشتیٔ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم" پر نظر ڈالیے۔ ایک دوسری نظم میں سرمایہ کے ہاتھوں محنت کے استحصال کا ذکر کرتے ہوئے حسن بن صباح کی بہشت کو اپنی پُر فریب کشش کے ساتھ شاعر ہمارے روبرو لایا ہے۔

ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش ؛ اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات

ایک تیسرا وسیلہ جس نے اقبال کے کلام کی معنویت کو بڑھایا ترکیب ہے لیکن اس وقت وہ ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہے۔ یہاں ہم صرف اتنا کہنے پر اکتفا کریں گے کہ بحیثیت فن کار اقبال کا جائزہ لیتے وقت اس حسین تثلیث پر بھی نظر رکھنا ہوگی جس کی تشکیل ہوئی ہے تضمین، تلمیح اور ترکیب سے۔

اردو کے شعری افق میں بیکراں وسعتیں بھرنے میں شاعر کو بڑی مدد ملی ہے قدرت کے پس منظر سے۔ آسمانوں، ستاروں، کہساروں، ندیوں صحرائوں، لالہ زاروں، مرغزاروں، سمندروں، امواج و سحاب، شجر و حجر نور و ظلمت کا سلسلہ یا تو براہ راست یا بطور پس منظر کے اقبال کی شاعری پر محیط ہے۔ فطرت کے مظاہر سے اس کی بے محابا گفتگو اس بات کی غماز ہے کہ وہ فطرت کا ہمراز ہے۔ حسنِ فطرت کی دلپذیر جھلک مثالاً ان دو شعروں میں دیکھیے جو سحر و شام کے آئینہ دار ہیں:

برگ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح ؛ اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

●

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو ؛ طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے

یا تصویر کشی کے ایک اور پہلو کو دیکھیے:

بسیر کرتا ہوں جس دم لب جو آتا ہوں ؛ بالیاں لہر کی گرداب کو پہناتا ہوں

صبح کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے آفتاب ؛ لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

●

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن ؛ مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار ؛ اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن

اقبال سارے عالم کا غیر منقسم انسانیت کا شاعر ہے ــــ یہ بات تو واضح ہوگئی۔ دوسری بات جو ہم کہنا چاہتے ہیں پہلی بات کو الٹ کر کہیں گے۔ یعنی اقبال کا ایک بڑا وصف خود اس کی انسانیت ہے جس سے عبارت ہے انسان کا درد، شرافتِ نفس، حلم، رواداری، مرنجان مرنجی، وسعت نظر اور عالی ظرفی۔

اس انسانیت کا سرچشمہ آپ چاہے دردمندی میں ڈھونڈیں چاہے درویشی میں چاہے بے نیازی میں تلاش کریں چاہے قلندری میں ــــ زندگی اور شاعری میں اقبال نے وہ سطح اپنائی جو سخت کلامی

درشت گوئی، بحث و مباحثہ، سب و شتم، طعن و تشنیع، سوال و جواب سے بالاتر تھی۔ قیل و قال بحث و جدال، مناظرہ اور مباحثے سے اقبال نے اپنے دل اور زبان کو ہمیشہ محفوظ رکھا۔ اس کی نگاہ اصل الاصول پر تھی، فروعات میں وہ کبھی نہیں اُلجھی۔ اقبال کے اس انداز میں درویشی کی شان ہے۔ اس کا مقابلہ اس سلسلے میں دو اور بڑے شاعروں سے کیجیے۔ غالب کی ان تند لہجہ بحثوں کو دیکھیے جو برہانِ قاطع پر اعتراضات سے شروع ہوئیں۔ ملٹن کی نظم و نثر میں ان سیاسی اور مذہبی مباحثوں پر نظر ڈالیے جہاں "فردوس گم شدہ" کا خلاق سخت کلامی اور لعنت ملامت پر اتر آتا ہے۔ اور پھر اقبال کی رواداری اور کریم النفسی اور تہذیبِ افکار و گفتار کا اندازہ کیجیے۔ خانقاہ اور مدرسہ کی روایات سے ملت کو جو نقصان پہنچے اقبال کی شاعری میں ان کا ذکر بار بار آیا ہے لیکن اس درویش صفت شاعر کا حسنِ خلق دیکھیے کہ اس نے اہلِ مدرسہ اور اہلِ خانقاہ کا فرداً فرداً ہمیشہ احترام کیا۔

اقبال کی شخصیت کا یہ ایک ایسا پہلو ہے جس کی طرف نگاہ کم گئی ہے۔ اس پہلو کی قدر اور بڑھ جاتی ہے جب ہم غور کرتے ہیں کہ اقبال اسرارِ خودی کا عقدہ کشا اور زورِ خودی کا نغمہ سرا ہے۔ لیکن یہ خودی استحکام اور عروج کے لیے ہے، ایذا اور افتخار کے لیے نہیں، ورنہ خودی کا انانیت کی حدوں میں داخل ہو جانا کتنا سہل اور کتنا عام ہے۔ عزتِ نفس کے گن گانے والے شاعر کی فروتنی اور انکساری ہوش ربا ہے۔ "یادوں کی برات" میں جوش نے اعتراف کیا ہے کہ جب وہ امداد اور تعارف کے محتاج تھے، اقبال نے ان کی دستگیری اور ہمت افزائی اور رہبری کی۔

اقبال کی انسانیت کا ایک پہلو اس کی شخصیت کے وہ تضادات ہیں جن کی طرف خود شاعر نے پر لطف انداز میں اشارہ کیا ہے:

گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت　　اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی
مجموعۂ اضداد ہے اقبال نہیں ہے　　دل دفترِ حکمت ہے طبیعت خفقانی

عینِ شغلِ مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز
کچھ ترے مسلک میں رنگِ عشرتِ مینا بھی ہے

اقبال نے خود کو تختۂ مشق بنانے سے کبھی گریز نہیں کیا:

ہم نے اقبال سے ازراہِ نصیحت یہ کہا
عاملِ روزہ ہے تو اور نہ پابندِ نماز
تو بھی ہے شیوۂ اربابِ ریا میں کامل
دل میں لندن کی ہوس لب پہ ترے ذکرِ حجاز
اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے
پردۂ خدمتِ دیں میں ہوسِ جاہ کا راز

اقبال کی انسانیت کا ذکر کرتے وقت ہمارا روئے سخن اسی تعلق کی طرف نہیں ہے جو شاعر اور انسان کے درمیان تھا۔ شاعر کی شخصیت اس کے کلام پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے، ناقدین میں اس پر اختلاف ہے۔ بیسویں صدی کے مشہور نقاد شاعر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے نظریے نے شاعر اور انسان کے مابین فاصلے کو بڑھا دیا ہے۔ اس کی نگاہ میں جہاں تک کسی نظم کی تشکیل کا تعلق ہے ادبی روایت کو شریکِ غالب کا مرتبہ حاصل ہے اور شاعر کی انفرادیت کا رول صرف اتنا ہے کہ وہ احساسات و تاثرات و مشاہدات و نقوش کو دماغ کی تہوں میں چھپا کر رکھتا ہے تا وقتیکہ عملِ تخلیق کی حدت انھیں پگھلا کر شعری قالب میں ڈھال دے۔ اور کسی شاعر کی پختگی، رسیدگی اور بڑائی کا پیمانہ یہ ہے کہ اس نے اپنی انفرادیت، اپنی شخصیت کو ادبی روایت پر کس حد تک نثار، اس میں کس حد تک ضم کر دیا ہے۔ ایلیٹ نے اسی بنا پر ورڈسورتھ کے اس مقولے سے اختلاف کیا ہے کہ شاعری اسی جذبے کا نام ہے جسے شاعر سکون کے لمحات میں یاد کرے۔ ایلیٹ کہتا ہے کہ شاعری کا خام مواد جذبہ نہیں ہوتا بلکہ احساسات کا وہ سارا تانا بانا جسے ایک تہذیب یافتہ دماغ جذبے کے ارد گرد جال کی طرح بُن دیتا ہے، اور شعر کی تخلیق کے وقت دماغ کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ سکون کی بہ نسبت ہیجان سے قریب تر ہے۔ علاوہ بریں اس عمل میں شعور اور قصد کو اس حد تک دخل نہیں ہوتا کہ اس کو جذبے کے یاد کرنے سے تعبیر کیا جائے۔ ایلیٹ سے سو فیصد اتفاق کیے بغیر اقبال نے اس دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے، شاعر اور انسان کے مابین اجنبیت کا اعلان کر کے:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے　　کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

★

اقبال کی اردو غزلیں

نجم الدین نقوی

اقبال کا ایک شعر ہے۔

نغمہ کجا و من کجا، سازِ سخن بہانۂ ایست
سوے قطار می کشم ناقۂ بے مہار را

اس کا مطلب یہ نکل سکتا ہے کہ اقبال اپنی شاعری کو ایک ذریعہ سمجھتے تھے سماج کے بکھرے ہوئے شیرازے کو منظم کرنے کا اور نفس شاعری کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور شاید ان کی شاعری کے اس مقصدی پہلو نے اردو کے ادیبوں اور نقادوں سے اقبال کی شاعرانہ صناعیون اور فنی کمالات پر بہت کم لکھوایا۔ اقبال کے پرستار اور ان پر تبصرہ کرنے والے ادیب اور نقاد زیادہ تر ان کے مذہبی اور فلسفیانہ خیالات کی ترجمانی اور تاویل و تعبیر میں مصروف رہے۔ انیس کو تو ایک شبلی میسر بھی آ گئے لیکن اقبال کو کوئی شبلی نہ ملا۔ اسے ادبی تاریخ کا ایک زبردست المیہ سمجھنا چاہیے۔ کاش اس عہد کے ادیب اور نقاد اقبال کی شاعری کے ادبی پہلوؤں پر پوری توجہ سے لکھیں تاکہ ان کا فن پوری طرح ابھر کر سامنے آ سکے۔ اقبال شاعر پہلے ہیں اور فلسفی وغیرہ بعد میں۔ نظیر اکبر آبادی کے خیالات اور نظریات ترقی پسند ہونے کے باوجود اس عہد میں اس لیے فروغ نہ پا سکے کہ اول تو وہ دور ہی ان خیالات کے لیے ناسازگار تھا۔ دوسرے یہ کہ ان کا اندازِ بیان شاعرانہ صناعیون سے کوسوں دور تھا۔ رومی اگر اپنے فلسفہ کو نثر میں بیان کرتے تو شاید زبان پہلوی میں "قرآن" پیش کرنے سے قاصر رہتے۔ مثنوی معنوی نے صدیوں انسانی ذہن کی تربیت اس لیے کی کہ ان کے معجزۂ فن کی نمود شاعری سے ہوئی تھی جس میں ان کے خونِ جگر کی آمیزش بھی تھی۔

شاعری میں معجزۂ فن کیا ہے۔ شاید ایک مثال سے واضح ہو سکے۔ شعراء کے نام تو یاد نہیں البتہ سنا ہے کہ کسی شاگرد نے اپنے استاد کو یہ شعر سنایا ؎

سیہ چوری بدست آں نگارے مہ جبیں بینم
بہ شاخ صندلیں پیچیدہ مارِ آستیں بینم

استاد نے شعر یوں کر دیا ؎

سیہ چوری بدست آں نگارے
بہ شاخِ صندلیں پیچیدہ مارے

اصلاح کے بعد شعر معجزۂ خفی بن گیا۔

وہ لوگ جو شاعرانہ صناعیوں اور فنی رعنائیوں کو برتنے پر قادر نہیں، ہیئت و مواد کی بحث چھیڑ کر خلط مبحث کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ خیالات کی اثر انگیزی اور جاگزینی بغیر اسلوب کی دل پذیری کے ناممکن ہے اور اس سے انکار ایک ایسی بات کی تردید کرنا ہے جس کی گواہی پوری ادبی تاریخ دے رہی ہے۔ جب ہی تو شاعری کو جادو کہا گیا ہے اور جادو جگانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ ولی سے لے کر آج تک صرف انگلی پر گنے جانے والے شاعر پیدا ہو سکے جن کا کلام اور کمال اس وقت تک ہمارے شعر و ادب کو باقی رکھے گا جب تک اردو زبان اور اس کے پرستار باقی ہیں اور یقین ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ باقی رہیں گے۔ یہی نہیں بلکہ اردو شاعری کی حشر سامانیاں آئے دن نت نئے پرستار

اگر ہاٹر ۱۸۹۵ اشک

پیدا کرتی رہیں گی۔

غالبؔ کا انتقال سنہ ۱۸۶۹ء میں ہوا۔ جدید اردو شاعری کا سنگ بنیاد لاہور میں سنہ ۱۸۷۴ء میں رکھا گیا۔ اقبالؔ کی ولادت ۱۸۷۵ء میں ہوئی۔ ان باتوں کا تذکرہ بظاہر خسرو کی اَن ملیوں جیسا ہے لیکن اقبال پر کچھ لکھتے وقت ان کا ذکر یقیناً اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے کہ اقبال اپنے علوے فکر میں غالبؔ کے مقلّد کہے جا سکتے ہیں انھوں نے غالبؔ پر جو نظم لکھی ہے اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ ثابت ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

اقبالؔ غالبؔ اور گوئٹے کو ہم نوا کہتے ہیں اور ان دونوں سے بے حد متاثر ہیں۔ اقبالؔ نے اظہار خیال کے لیے نظم کو اپنایا۔ نظم ۱۸۷۴ء سے ایک اصلاح بن چکی تھی اور جدید شاعری کی تحریک کے تحت نظم کا مفہوم عمومی نہ رہ کر خصوصی ہو گیا تھا۔ چنانچہ حالؔی اور آزادؔ کے وقت سے آج تک جب بھی نظم کی بات آتی ہے تو اس سے مُراد موضوعاتی شاعری ہوتی ہے۔ اقبال کی شاعری جدید شاعری کا منطقی نتیجہ ہے لیکن اس مضمون میں نہ جدید شاعری سے بحث کرنا مقصود ہے نہ اس کے موضوعات سے بلکہ چند سطروں میں اقبال کی شاعرانہ صناعیوں پر روشنی ڈالنا ہے۔

اقبالؔ کو آنکھ کھولنے کے بعد جو ادبی ماحول ملا اس میں غزل کا بول بالا تھا۔ ارشد گورگانی اور داغؔ جیسے اساتذہ موجود تھے جو بعد میں اقبالؔ کے استاد بھی ہوئے۔ اقبالؔ نے اپنی غزلوں پر ان اساتذہ سے اصلاح لی۔ داغؔ کی وفات پر اقبالؔ نے ان کا مرثیہ لکھا اور حسب ذیل اشعار میں اُن کے رنگ تغزل پر مختصر مگر جامع تبصرہ کر دیا :

اب کہاں وہ بانکپن وہ شوخیٔ طرزِ بیاں
آگ تھی کافورِ پیری میں جوانی کی نہاں
تھی زبانِ داغؔ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیٔ معنی وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت
ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ غزل اردو شاعری کی ابجد بھی ہے اور منتہٰی بھی۔ بظاہر بہت آسان مگر برتنے میں بہت مشکل۔ اس کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ اگر غزل گو کامل ہے تو اس کا ایک شعر پوری پوری نظموں پر حاوی ہوتا ہے۔ یہی نہیں غزل گوئی کا ملکہ دوسرے اصنافِ سخن کی تخلیق میں بھی مددگار ہوتا ہے۔ چاہے وہ قصیدہ ہو یا غزل، مرثیہ ہو یا مثنوی ہر جگہ غزل اپنا رنگ دکھاتی ہے جس نے غزل گوئی پر عبور حاصل کر لیا ہر صنفِ سخن پر قادر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اقبال کی بہترین نظموں کا لطف ان کے رنگِ تغزل کا مرہونِ منت ہے۔ اگرچہ اقبالؔ کی شاعری میں نظموں کی اکثریت ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ برابر غزلیں کہتے رہے اور یہ غزلیں بانگ درا، ضربِ کلیم اور بالِ جبریل میں نہ صرف موجود ہیں بلکہ غزل کے پورے رچاؤ کے ساتھ ہیں۔ بانگ درا کی ابتدائی غزلوں میں داغؔ کی زبان، اندازِ بیان اور محدود انداز میں سہی ان کی معاملہ بندی پائی جاتی ہے۔ داغؔ کی ناوک فگنی اور عشق کی ہو بہو تصویر کھینچنے کا انداز بھی ملتا ہے۔ ابتدائی غزلیں بھی غزل گوئی کی صلاحیت اور ارتقا کے امکانات کی نشاندہی کرتی ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں :

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی — مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولے — خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا — نگہ تیری مستی میں ہشیار کیا تھی
تأمل تو تھا اُن کو آنے میں قاصد — مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

عجب واعظ کی دینداری ہے یارب — عداوت ہے اُسے سارے جہاں سے
بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں — لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے

مگر چونکہ اقبالؔ کے دل و دماغ بلند تر مضامین اور اسلوب کے لیے خلق ہوئے تھے اس لیے ان کے ابتدائی دور کی غزلوں میں بھی بہت

جدید رنگ جھلکنے لگا۔ اس طرح کے اشعار بھی غزلوں میں آنے لگے جن میں قدیم و جدید غزل کے موضوعات اور اسلوب کا حسین امتزاج ملتا ہے مثلاً :

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں
علاج درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں
پھلا پھولا رہے یارب چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں
نہیں بیگانگی اچھی رفیقِ راہِ منزل سے
ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

کہوں کیا آرزوے بے دلی مجھ کو کہاں تک ہے
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے
وہ میکش ہوں فروغِ مے سے خود گلزار بن جاؤں
ہوائے گل فراقِ ساقیِ نامہرباں تک ہے

اور اب ایک شعر اسی غزل میں ایسا بھی ملاحظہ ہو جو حقیقت اور اسلوب ادا کا کمال پیش کرتا ہے۔ ؎

جوانی ہے تو ذوقِ دید بھی لطفِ تمنا بھی
ہمارے گھر کی آبادی قیامِ میہماں تک ہے

جیسے جیسے شعور پختہ اور مطالعہ وسیع ہوتا گیا ان کی قوتِ متخیلہ شاعرانہ بصیرت و کمالِ فن کے جوہر دکھانے لگی۔

جدید اردو غزل کے اساتذہ میں اقبال کا نام نہیں لیا جاتا اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ انھیں حکیم امت، مجدد اسلام اور دوسرے القاب سے تو نوازا گیا لیکن ان کی غزلیہ شاعری پر توجہ نہیں کی گئی جو کلاسیکی انداز کے ساتھ جدید غزل کے عناصر سے بھی بھرپور ہیں۔ ان کی غزلوں میں خیال کی رعنائی، جذبے کی شدت، صداقت کا خلوص اور موضوعات کی ندرت کے ساتھ بقول میر بات بنانے کا فن پوری طرح جلوہ گر ہے۔ یوں تو ہر موزوں طبع شعر کہہ سکتا ہے لیکن غزل ہو کہ قصیدہ، مثنوی ہو کہ مرثیہ تمام اصناف سخن میں شاعر کا علمی تبحر جان ڈال دیتا ہے۔ حالی نے قوت متخیلہ کی بحث میں کہا ہے کہ تخیل بغیر مادی آبجکٹ کے شاعری میں سرکس کا گھوڑا بن کر رہ جاتی ہے۔ میں عرض کروں گا کہ اگر تخیل کی وسعت کے ساتھ علم کی گہرائی اور گیرائی بھی کسی شاعر کے یہاں پیدا ہو جائے تو پھر اس کے اشعار "چیزے دیگر" بن جاتے ہیں۔ ولی سے لے کر آج تک اردو شعرا میں اقبال سے بڑا عالم نہیں پیدا ہوا۔ میر، انشا، درد، غالب سب کے سب محدود علمی لیاقت کے لوگ تھے۔ ان کی لیاقت علوم متداول سے آگے نہ بڑھی تھی۔ اردو، فارسی اور عربی پر یقیناً بڑی حد تک وقوف رکھتے تھے لیکن مغربی علوم اور خیالات تک دسترس نہ تھی۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں اس لیے اس عہد کے ذرائع علم محدود تھے اور وہ خود قانع اور اپنے ماحول سے مطمئن تھے۔ اقبال نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ اس ماحول سے بہت مختلف تھا۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد ملک میں جگہ جگہ مغربی علوم کی درس گاہیں کھل گئی تھیں۔ مغرب کے علما اور فلسفی براہ راست اور بالواسطہ اس عہد کے نوجوانوں کے دامنِ دل و نظر کو کھینچ رہے تھے۔ علی گڑھ تحریک نے ملک کے نوجوانوں کا نقطۂ نظر بدل دیا تھا۔ حالی کہہ چکے تھے ؎

حالی اب آؤ پیرویِ مغربی کریں   بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

اقبال مولوی سید میر حسن سے علوم مشرقیہ کی تکمیل اور لاہور میں مغربی علوم پر وقوف حاصل کرنے کے بعد وہاں پروفیسر ہو چکے تھے پھر آرنلڈ جیسے عالم کی نگاہ نکتہ رس سے بھی مستفیض ہو چکے تھے مغربی علوم کا براہ راست مطالعہ اور یورپ کے سفر و قیام سے ان کی نگاہ دور رس اور طبیعت بے چین اور سخت کوش بن چکی تھی۔ رومی سے

اگست ۱۸۹۵ء تک

درس لینے کے بعد ان کی نگاہ دلِ وجود کو چیر چکی تھی اور توہمات سے الجھنے کے بعد حقائق تک پہنچ چکی تھی۔ اس لیے غزلوں میں بھی انھوں نے بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں۔ کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

الٰہی عقلِ شکستہ پا کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری مجھے سرِ پیرہن نہیں ہے

جو موجِ دریا لگی یہ کہنے سفر سے قائم ہے شان میری
گہر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھ کو سامانِ آبرو کا

کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

تہہِ دام بھی غزل آشنا رہے طائرانِ حرم تو کیا
جو فغاں دلوں میں تڑپ رہی تھی نوائے زیرِ لبی رہی

ترا جلوہ کچھ بھی تسلیِ دلِ ناصبور نہ کر سکا
وہی گریۂ سحری رہا وہی آہِ نیم شبی رہی

کیا عشق ایک زندگیِ مستعار کا
کیا عشق پائدار سے ناپائدار کا

وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک
اس میں مزہ نہیں تپش و انتظار کا

میری بساط کیا ہے تب و تابِ یک نفس
شعلہ سے بے محل ہے الجھنا شرار کا

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

نہیں اس عالمِ بے رنگ و بو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ بن جائے

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

گدائے میکدہ کی شان بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

میں تو نیاز ہوں مجھ سے حجاب ہی اولیٰ
کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نگاہ بے قابو

اگر ان اشعار کی معنویت، ان کے ابلاغ، ان کے اسلوب اور ان میں مضمر خلوص پر غور کیا جائے تو انھیں جانِ غزل کہنا پڑے گا۔ متقدمین سے لے کر دورِ حاضر کے معیاری غزل گویوں کی فکر اور اسلوب دونوں کا کتنا دل پذیر امتزاج ان اشعار میں ملتا ہے۔ مرصع سازی بھی ہے سادگی و پرکاری بھی۔ خلوص بھی ہے اور صداقت بھی۔ "حرف با یار گفتن" بھی اور شکایتِ غمِ روزگار بھی۔ ہستیِ ناپائدار کا شکوہ بھی اور اس بے ثباتی کے باوجود کچھ کر گزرنے کی تعلیم و تلقین بھی۔ مجاز کی ترجمانی بھی اور حقیقت کی پردہ کشائی بھی۔ انسان کی دور بینی بھی، اس کی کوتاہ نظری بھی، عقل کی کج روی بھی اور عشق کی استواری بھی۔ رہبانیت سے نفرت بھی اور ماسوا سے بے نیازی بھی۔ عقل و عشق کی پیکار بھی اور رند و زاہد سے چھیڑ چھاڑ بھی۔ پھر یہ سب ایک خاص سنجیدگی کے ساتھ علمی وقار کے ساتھ۔ سطحیت مفقود، ابتذال معدوم، بات حکیمانہ، لہجہ دلبرانہ، اثر و نفوذ سے لبریز، "از دل ریزد" کا مصداق۔

البتہ آخری غزلوں میں "حرف با یار گفتن" کے عناصر بہت کم ہو گئے ہیں۔ یہی نہیں زہد کی خشکی، تبلیغ کی شدت اور ناصحانہ پیرایۂ بیان کی ناگواری کے ساتھ ساتھ تغزل سے دوری بھی محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی

اس طرح کے اشعار پر تعجب نہ ہونا چاہیے اس لیے کہ اقبال ایک خاص رنگ میں ڈوب چکے تھے اور اس کے زیرِ اثر ایسے اشعار کا وارد ہونا تعجب خیز نہیں ہو سکتا۔

★

شمس تبریز خان ندوی

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال تقسیم ہند سے پہلے کے شاعر ہیں۔ اس لیے وہ اصلاً برصغیر ہند کے ترجمان اور نمائندہ ہیں اور ان کی شاعری کے پس منظر میں غیر منقسم ہندستان کا وسیع کینوس، اس کے کوہ دامن، باغ و راغ، اور اس کی روایات و تاریخ کا بھی ایک بڑا حصہ رہا ہے لیکن اقبال کا پیغام اگر آفاقی اور کائناتی ہے تو یہ ممکن نہیں کہ وہ صرف مسلمانوں کے شاعر یا تقسیم کے بعد کے شاعر سمجھے جائیں۔ ان کے پیام کی آفاقیت اور ہمہ گیری تو ازل صید و ابد شکار ہے۔ وہاں زمان و مکان کی طنابیں کھنچ گئی ہیں اور ایک کائناتی حقیقت اور عالمگیر صداقت نے چہرہ کشائی کی ہے۔ اقبال اصلاً شاعر و فن کار ہے اور اب یہ احساس عالمگیر ہوتا اور ایک مسلّمہ بنتا جا رہا ہے کہ دنیا کے بڑے فن کار کسی قوم و ملک ہی کے نمائندہ نہیں بلکہ مجموعی طور پر فکر انسانی کی میراث کا حصّہ ہیں اور کائنات کے تاریخی تسلسل اور ارتقاء کی ایک کڑی۔ اقبال کی آفاقیت اور اسلامیت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ پھر بھی اتنا کہا جا سکتا ہے کہ کسی نظریہ حیات اور فلسفۂ زندگی کو اگر آفاقی احساس (UNIVERSAL SENSE) اور روح کائنات کو سامنے رکھ کر پیش کیا جائے تو اسے آفاقی اور کائناتی سمجھنا چاہیے۔ خواہ اس نظریہ کا تعلق عملاً کسی قوم کیا کسی فرد ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو۔ اقبال نے اسلام کی یقیناً ترجمانی کی ہے۔ لیکن ایک حد کی تصوّر اور ارتقا پذیر تفکر کے انداز میں اس کے آفاقی پیغام پر روشنی ڈالی ہے۔ اقبال کے خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی فکر کو محدود و مقید اور انھیں تنگ نظر و تنگ ظرف نہیں کہا جا سکتا۔

اپنے فلسفے کے متعلق وہ ڈاکٹر مانکلسن کو لکھتے ہیں[1]۔

"مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفے کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے لیکن باعتبار اطلاق و انطباق، مخصوص و محدود۔ ایک حیثیت سے ان کا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعر و فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے لیکن اگر اسے موثر نصب العین بنانا، اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطب اولین نہیں ٹھہرائیں گے اور ایک ایسی مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرۂ مخاطب محدود کر دیں گے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہ عمل رکھتی ہو لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے..... میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ میری قوت طلب و جستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ

[1] اقبال نامہ ص ۴۶۱ و ۴۶۲

اگر انٹر ۱۸۹۵ تک

ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشرتی نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصد وحید ذات پات، رتبہ و درجہ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔"

یہ خیال کہ ہندو اور مسلمان مل کر رہ ہی نہیں سکتے، نہ ان میں کوئی رشتۂ محبت و انسانیت استوار ہو سکتا ہے، نہ وہ باہمی ہمدردی و رواداری کا برتاؤ کر سکتے ہیں، اقبال اس کے اپنی عمر کے کسی دور میں قائل نہ تھے۔ ان کے تعلقات مشہور ہندو لیڈروں اور اور مختلف طبقات کے لوگوں سے تھے جن میں موتی لال، جواہر لال نہرو، ٹیگور، مسز سروجنی نائیڈو، مہاراجہ کشن پرشاد وغیرہ کے نام ممتاز ہیں۔ موخرالذکر سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ لیکن پاسِ ادب، اور حفظِ مراتب کے خیال سے انھیں اپنے خطوط میں 'سرکار والا تبار' اور 'سرکار والا مرتبت' لکھتے ہیں۔ مہاراجہ سے اقبال کے تعلقات اتنے گہرے تھے کہ دونوں اپنے اہم گھریلو معاملات اور رشتہ ناطہ تک میں مشورے لیتے تھے۔

مہاراجہ کے نام ایک خط میں اقبال نے راماین کو اردو جامہ پہنانے کا خیال ظاہر کیا تھا[1]:

"میرا ارادہ راماین کو اردو میں لکھنے کا ہے۔ سرکار کو معلوم ہوگا مسیح جہانگیری نے راماین کے قصے کو فارسی میں نظم کیا ہے۔ افسوس ہے وہ مثنوی کہیں سے دستیاب نہ ہوئی۔ اگر سرکار کے کتب خانہ میں ہو تو کیا چند روز کے لیے عاریۃً مل سکتی ہے۔ میرے خیال میں اس کا تتبع کرنا بہتر ہوگا۔ اس کے متعلق اور مشورہ سے بھی سرکار دریغ نہ رکھیں۔"

جہاں تک اقبال کی حب الوطنی اور نظریۂ وطنیت کا سوال ہے عجیب بات ہے کہ اسے اقبال کا منسوخ نظریہ سمجھا جاتا ہے جسے اقبال نے اپنے خیالات کے ارتقا کے بعد گویا رد، (REJECT) کر دیا تھا۔ حالانکہ جس طرح اقبال کے بظاہر متضاد نظریات کا حل نہ پانے سے جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اقبال ذاتی طور پر ہمیشہ محب وطن رہے اور ہندستان کے سلسلے میں ان کی جتنی نظمیں ہیں ان میں ان کا جذبہ واخلاص نمایاں ہے۔ انھوں نے جہاں وطنیت اور قومیت کی تردید کی ہے وہاں ان کی مراد اس جارحیت پسند وطنیت اور اندھی قوم پرستی سے ہے جہاں حق و باطل اور ظلم و انصاف میں کوئی تمیز نہیں رہ جاتی اور آدمی غلط صحیح ہر طرح آنکھ بند کر کے اپنے ہی قوم و وطن کا ساتھ دینے لگتا ہے اور اس کے ناجائز اقدام کو بھی حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ ورنہ وہ سچی قلبی محبت اور لگاؤ جو ارضِ وطن سے ہوتا ہے اور جسے سرورِ کائنات نے حب الوطن من الایمان کہا ہے! اس کا اقبال کیسے انکار کر سکتے ہیں؟ اس کے علاوہ حب وطن کی جو اسلامی تعلیمات ہیں اقبال انھیں کس طرح نظر انداز کر سکتے تھے؟ نظیری نے خوب کہا ہے:

گر کنم یاد زبت خانہ مرا عیب مکن
ہر کرا مہر وطن نیست مسلمانی نیست!

اس تمہید کے آخر میں ایک بات اور کہہ دینا ضروری ہے کہ یہ اقبال ہی ہیں جنھوں نے مسلم معاشرے، اور اردو کی ادبی روایت میں شکوہ ترکمانی، اور نطق اعرابی کے ساتھ "ذہن ہندی" کا تعارف کراتے اور اس کو مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا ایک گمشدہ عنصر سمجھتے ہیں جو ان کی نشأۃ ثانیہ کے لیے ضروری ہے:

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی!

اقبال "ذہن ہندی"، اور ہندستانی فلسفہ و روحانیت کے ہمیشہ قائل رہے اور اس کے تابناک پہلوؤں سے مستفید بھی ہوئے۔ وہ خاص طور پر شنکر اچاریہ کے فلسفۂ کائنات اور ذات باری کے تصور کو رومی کے خیالات کے مطابق سمجھتے تھے اور اس سے خود بھی بعض اثباتی صفات کے علاوہ اختلاف نہیں رکھتے تھے۔

---

[1] اقبال نامہ ص۱۴۷۔ مہاراجہ اور اقبال کے خطوط شاد اقبال کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

وہ مہاتما گوتم بدھ کو نبیوں کی صف میں دکھا کر ان کے فلسفۂ حیات پر روشنی ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مقصد زندگی انسان دوستی نیک نیتی اور حسن خیال و حسنِ عمل ہے :

راحت جاں طلبی ، راحت جاں چیزے نیست
در غمِ ہم نفساں اشک رواں چیزے نیست
حسن رخسار دمے ہست و دمے دیگر نیست
حسن کردار خیالاتِ خوشاں چیزے ہست[1]

ہندستانی شخصیات میں انھوں نے جعفر و صادق کا عبرتناک انجام دکھایا ہے اور انھیں فلکِ زحل پر اس دریائے خوں میں تبایا ہے جو خبیث روحوں کے لیے بنایا گیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے مجرمانہ کردار کی وجہ سے دوزخ بھی ان سے نفرت کرتی اور انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے :

منزلِ ارواح بے یوم النشور　　دوزخ از احراق شاں آمد نفور
اندرونِ او دو طاغوتِ کہن　　روح قومے کشتہ از بہر دو تن

وہ جعفر و صادق کی روحوں کو فریاد کرتے ہوئے دکھاتے ہیں کہ موت بھی انھیں پوچھتی اور دوزخ بھی نہیں جلاتی کہ یہ دونوں اس لائق بھی نہیں :

نے عدم ما را پذیرد نے وجود
وائے از بے مہریِ بود و نبود!
تا گذشتیم از جہانِ شرق و غرب
بر در دوزخ شدیم از درد و کرب

یک شرر بر جعفر و صادق نہ زد
بر سر مشتِ خاکستر نہ زد
گفت دوزخ را خس و خاشاک بہ
شعلۂ من زیں دو کافر پاک بہ

پھر انھوں نے 'روحِ ہندستان' کو ایک اپسرا کے روپ میں دکھایا ہے جس کے ماتھے پر "نورِ نارِ لم یزل" کی چمک ہے اور آنکھوں میں ابدی سرور رقصاں ۔ وہ بادلوں سے بھی ہلکا لباس پہنے ہوئے ہے جس کے تانے بانے رگِ گل سے تیار ہوئے ہیں لیکن وہ فریادی ہے ۔ رومی انھیں متوجہ کرتے ہیں !

گفت رومی روح ہند است این نگر
از فغانش سوزہا اندر جگر

ہندستان کی دیوی فریاد کر رہی ہے کہ ہندستانیوں نے ناموس ہند کا خیال نہیں رکھا اور غلامی پر رضامند ہو گئے وہ کہتی ہے کہ جب تک اخلاقی سدھار نہ ہوگا وطن کی خیر نہیں ، زمین کی عزت اس کے معزز اور بلند کردار باشندوں سے ہوتی ہے کہ اس کے طبیعاتی وجود سے اقبال اپنے آسمانی سفر میں آخری آسمان پر پہنچتے اور نطشے ، شرف النسا ، سید علی ہمدانی ، غنی کشمیری وغیرہ سے ملتے ہوئے ہندستان کے مشہور فلسفی راجہ بھرتری ہری[2] سے ملاقات کرتے ہیں ۔ رومی اقبال کو بھرتری ہری کی طرف ان الفاظ میں متوجہ کرتے ہیں :

آں نوا پرداز ہندی را نگر　　شبنم از فیضِ نگاہِ او گہر

---

[1] جاوید نامہ صفحہ　[2] جاوید نامہ صفحہ ۱۶۵ ، ۱۷۲ ۔

[3] راجہ بھرتری ہری ۔ (भर्तृहरि) عظیم شاعر کالیداس کے مربی راجہ بکرماجیت کے بڑے بھائی تھے ۔ یہ شروع میں تعیش پسند تھے مگر اپنی رانی کی خیانت کے سبب بادشاہی سے بیزار ہو کر فقیری کی راہ لی ۔ وہ ایک عالم ، فلسفی اور شاعر تھے ۔ انھوں نے تقریباً ۔ ۔ ۳ ا اشعار لکھے ہیں جن میں سے ۔ ۔ اشعروں کا مجموعہ "نیتی شتک" کے نام سے موسوم ہے جس میں عملی زندگی کے لیے بہت سے زرّین اصول بیان ہوئے ہیں ۔ دوسرے شعری مجموعے کا نام शृंगार-शतक ہے جس میں حسن و عشق سے متعلق اظہار خیال ہوا ہے تیسرے مجموعے کا نام वैराग्य शतक ہے جس میں رہبانیت کی تلقین ہے ۔ ان کی دوسری کتاب کا نام वाक्यपदीय ہے جس میں فلسفۂ لفظ و معنی سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ کائنات کی اصل کلمہ (لفظ) ہے اور خود ذات باری کی تعبیر بھی کلمہ ہی سے ہو سکتی ہے ۔ چنانچہ انھوں نے حقیقتِ کبریٰ کا نام शब्द ब्रह्म دیا ہے (یعنی کلمہ ہی خدا ہے ۔ ان کی تیسری کتاب کا نامکمل نسخہ ابھی حال ہی میں دریافت ہوا ہے جو پانینی کی अष्टाध्यायी کی مشہور و معروف تفسیر महा भाष्य کی شرح ہے

نکتہ آرائے کہ نامش برتری است
فطرتِ او چوں سحاب آذری است[1]

اقبال کہتے ہیں کہ یہ راجہ، بادشاہی میں فقیری کا لذت شناس تھا اور اس کا فلسفیانہ مقام بہت بلند ہے۔ وہ کارگاہ زندگی کا محرم ہے اور اس کے اشعار اپنے کائناتی احساس کی وجہ سے جام جم۔ اقبال کہتے ہیں کہ ہم اس فنکار کی تعظیم کے لیے اٹھے اور پھر مجلس آرائی ہوئی جس میں اقبال نے ان سے پوچھا کہ شعر میں سوز و اثر خودی سے آتا ہے یا خدا سے؟ بھرتری کہتے ہیں کہ نغمۂ شعر کا زیر و بم اس کے لیے حجاب بن جاتا ہے۔ لیکن شعر کا اثر جستجو اور مقام آرزو سے متعلق ہے۔ وہ آگے چل کر کہتے ہیں کہ میں دیر و کنشت دونوں سے برتر ہوں اور رسومات کا قائل نہیں۔ ذوق عمل اصل چیز اور کردار، راز زندگی ہے۔ یہ دنیا میدان عمل ہے جو بوؤگے وہ کاٹو گے:

پیش آئینِ مکافاتِ عمل سجدہ گزار
زانکہ خیزد ز عمل دوزخ و اعراف و بہشت
سجدۂ بے ذوقِ عمل خشک و بجائے نرسد
زندگانی ہمہ کردار چہ زیبا و چہ زشت
این جہانے کہ تو بینی اثر یزداں نیست
چرخہ از تست و ہم آں رشتہ کہ بر دوک تو رشت[2]

اقبال نے اسرار خودی میں شیخ و برہمن اور گنگا اور ہمالہ کے مکالمہ میں بتایا ہے کہ حیات ملی کے لیے ملی روایات کا تحفظ ضروری ہے، افراد کو اپنے لیے کوئی نصب العین بصیرت اور یقین کے ساتھ اپنانا چاہیے۔ وہ مرزا غالبؔ کی طرح اس کفر کی بھی قدر کرتے ہیں جسے انسان نے غور و فکر اور خلوص کے ساتھ اپنایا ہو، وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی، کافر ہے تو اسے 'شائستہ زنار' اور اپنی تہذیب کا امانت دار بھی ہونا چاہیے:

من نگویم از بتاں بیزار شو
کافری! شائستہ زنار شو!
اے امانت دارِ تہذیب کہن
پشت پا بر مسلکِ آبا مزن
گر ز جمعیت حیات ملت است
کفر ہم سرمایۂ جمعیت است
تو کہ ہم در کافری کامل نۂ
در خورِ طوفِ حریمِ دل نۂ!
ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور
تو ز آذر، من ز ابراہیمؑ دور
قیس ما سودائیِ محمل نہ شد
در جنونِ عاشقی کامل نہ شد!

اقبال نے لکھا ہے کہ گنگا نے ہمالہ سے کہا، تم صدیوں سے اپنی جگہ کھڑے ہو لیکن مجھے دیکھو کہ میں زندگی کی طرح مسلسل رواں دواں ہوں، ہمالہ نے جواب دیا کہ تمہارا یہی خرام ناز تو سامان فنا ہے جس نے اپنی جگہ چھوڑی پھر وہ کہیں کا نہ رہا۔ تم سے تو افتادہ ساحل اچھا ہے جو اپنا وجود محفوظ رکھتا ہے۔ تم تو آخر سمندر میں جا کر فنا ہو جاؤ گی۔ میں نے اپنی جگہ رہ کر ستاروں سے رسم و راہ پیدا کی اور ہمدوش ثریا ہو گیا:

ہستیم بالید تا گردوں رسید
زیرِ داماں ثریا آرمید
ہستیِ تو بے نشاں در قلزم است
ذرۂ من سجدہ گاہِ انجم است
زندگی بر جائے خود بالیدن است
از خیابانِ خودی گل چیدن است[3]

---

[1] جاوید نامہ۔ صفحہ ۱۲۸-۱۲۷۔ یہ خیالات بھرتری کی نیتی شتک (नीति शतक) طبع بنارس ۱۹۵۵ء مرتبہ شری لال ایادھیائے کے صفحات ۴۹، ۵۲ میں بیان ہوئے ہیں جن میں ایک خیال یہ بھی ہے کہ جب سب کچھ عمل (कर्म) ہی سے ہوتا ہے تو عمل ہی کی تعظیم کیوں نہ کریں کیونکہ خدا بھی عمل کے مطابق ہی اجر دیتا ہے۔ (افادہ ڈاکٹر ہرش نارائن، لکھنؤ) [3] اسرار خودی۔ صفحہ ۶۵، ۶۸

وشوامتر[1] (विश्वामित्र) ہندستان کی مذہبی تاریخ کے ایک اہم رکن ہیں۔ اقبال نے "جاوید نامہ" کے آسمانی سفر میں جہاں مشاہیر عالم سے ملاقاتیں کیں وہیں اس 'جہاں دوست' اور 'عارف ہندی' سے بھی ملے اور ان کے گرانقدر خیالات کو نظم کیا ہے۔ رومی انھیں فلک قمر کے ایک غار پر لے جاتے ہیں جہاں کی فضا میں ہندستانی فضا کا اثر ہے اور عقیدت و عبادت کا تفکر آشکار ہے۔ ہندی سے وہ گہرے تفکر کے عالم میں ملتے ہیں اور ان کی شان میں کہتے ہیں :

آدمے از آب و گل بالاترے — عالم از دیر خیالش پیکرے
وقت او را گردشِ ایام نے — کار او با چرخ نیلی فام نے

پھر وشوامتر عارف رومی سے سوال کرتے ہیں کہ عالم کی اساس تو رنگ و بو پر ہے حالانکہ بے رنگی اور تجرد (ABSOLUTENESS) ہی وجود حق کی صفتِ خاص ہے ؟ رومی کہتے ہیں کہ رنگا رنگی بھی اسی بے رنگی کا فیضان ہے اور دونوں میں قدر مشترک موجود ہے۔ پھر اقبال اور وشوامتر میں بہت سے فلسفیانہ اور صوفیانہ مسائل پر گفتگو ہوتی رہی اور آخر میں وشوامتر نے وہ باتیں خاص طور سے بتائیں ۔۔۔۔ 'ہمالہ' شاید ان کی پہلی نظم یا چند ابتدائی نظموں میں سے ایک ہے جسے اقبال نے ۱۹۲۴ء میں اپنے پہلے مجموعہ کلام میں پہلے نمبر پر رکھا۔ یہ نظم شاعر کے قومی و وطنی جذبہ و احساس کی ایک علامت کہی جا سکتی ہے جس میں شاعر نے اپنے وطن کی عظمت سے پردہ اٹھایا ہے اور اس کے فطری حسن کی ایک جھلک دکھائی ہے۔ وہ 'ہمالہ' کو ابدیت کی تصویر اور 'جلوۂ حسن' کی تنویر قرار دیتے ہیں :

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طورِ سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لیے

وہ اسلامی روایات کے مطابق ہندستان کو وہ پہلی سرزمین مانتے ہیں جہاں حضرت آدمؑ جنت سے اتارے گئے اور جس کے چمن زاروں میں روح انسانی نے پہلی بار آنکھیں کھولیں، جو ہندستانی تہذیب کی قدامت کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے:

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکن آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

ہندستان مختلف قوموں اور مذہبوں کا ملک رہا ہے اس لیے یہاں ایک مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کی جو خاص طور سے ہندو مسلم کلچر کی ہم آہنگی سے بنی ہے، ضرورت رہی ہے قومی یکجہتی (NATIONAL INTEGRATION) تاریخ کے ہر دور میں ہندستان کے لیے ضروری سمجھی گئی ہے۔ اقبال بھی اس سے غافل نہ تھے بلکہ انھوں نے جگہ جگہ ہندو مسلم نزاع کو نفرت اور ناپسندیدگی کی نگاہ سے

---

[1] وشوامتر ایک زاہد مرتاض اور رشی تھے جن کی ریاضت سے دیوتاؤں کا راجہ اندر بھی خائف تھا۔ یہ اصلاً چھتری تھے مگر ریاضت کے زور سے برہمن بن گئے۔ मेनका کے بطن سے ان کی لڑکی شکنتلا پیدا ہوئی۔ تاعمر ایک دوسرے رشی وششٹ سے مقابل رہے۔ ایک قحط کے موقع پر انھیں ایک شودر (چنڈال) کے گھر سے مردار کتے کا گوشت چرا کر کھانا پڑا تو اس نے انھیں ٹوکا لیکن اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ یہ حالت اضطرار ہے یہاں مذہب کے احکام بھی میں سمجھتا ہوں (فہرست اسمائے مہا بھارت : گیتا پریس گورکھپور ۱۲۲) برہمنوں کے سات مورثوں میں سے ایک یہ بھی ہیں جنھیں زندہ اٹھا کر آسمان میں تاروں کے درمیان جگہ دی گئی۔ ان کی سوانح میں ایک اپسرا رمبھا کا نام ملتا ہے جسے اندر نے انھیں دھوکہ دینے کے لیے بھیجا تھا۔ کوشک قوم کے راجہ گادھی، وشوامتر کے باپ تھے یہ کوسامب کے لڑکے تھے۔ وشنو پران انھیں اندر کہتا ہے۔ (ہندو مذہب کی جھلکیاں: ڈاکٹر محمد یسین)

دیکھا ہے۔ ان کی ایک نظم 'صدائے درد'، خاص طور سے اسی موضوع سے متعلق ہے۔ اس کا ایک بند ملاحظہ ہو:

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق انگیز ہے
بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں
کب زباں کھولی ہماری لذتِ گفتار نے
پھونک ڈالا جب چمن کو آتشِ پیکار نے

وہ دیر و حرم کے اس امتیاز کے قائل نہیں کہ انسانی محبت، اخوت اور بہی خواہی و ہمدردی کا رشتہ بھی آپس میں باقی نہ رہے اور انسان، انسان کو اختلافِ مذہب و ملت کی بنا پر غیر سمجھے اور اس کے ساتھ ناروا سلوک کرے۔ وہ اپنی نظم 'شمع' میں کہتے ہیں کہ فطرت سب کو اپنے فیض سے نوازتی ہے اور شمع دیر و حرم، دونوں کو روشن کرتی ہے۔ لیکن انسان آپس میں بھید بھاؤ کرتا ہے۔

یک بیں تری نظر صفتِ عاشقانِ راز
میری نگاہ مایۂ آشوبِ امتیاز
کعبے میں بتکدے میں ہے یکساں تری ضیا
میں امتیازِ دیر و حرم میں پھنسا ہوا
(بانگِ درا)

اپنی نظم 'تصویرِ درد' میں اقبال نے وطن کی محبت اور اس کے لیے دلسوزی کا حق ادا کر دیا ہے۔ وہ آپس کے اختلافات اور مذہبی تعصبات کو غلامی کی بنیاد قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس صورتِ حال سے ملک کی سالمیت اور آزادی ہی کو خطرہ ہے:

جلانا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے
تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا
اجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو
میرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے؟

مگر مایوس نہیں بلکہ وطن کے لیے اپنی خدمات پیش کرتے اور ایک نیا عزم لے کر اٹھتے ہیں:

اقبال نے حبِ وطن اور قومی جذبہ کے زیرِ اثر ہندستانیت سے سرشار ہو کر ترانۂ ہندی (INDIAN ANTHEM) لکھا ہے۔ اس میں جذبہ کی سرشاری اور سچائی جس طرح نمایاں ہے وہ اسے اونچا مقام دیتی ہے۔ وطنیت کا جوش و خروش، عوامی جذبات کی ترجمانی اور ملکی باشندوں کے عزائم و افکار کی نمائندگی اس میں پوری طرح موجود ہے:

سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

اپنی نظم "ہندستانی بچوں کا قومی گیت" بھی انھوں نے قومی ترانے ہی کی حیثیت سے لکھی ہے۔ اس میں انھوں نے وہ تمام تاریخی روایات یکجا کر دی ہیں جو ہندستان کی عظمت کی گواہ ہیں۔ وہ اس کی رواداری کا ذکر کرتے ہیں کہ یہاں چشتی اور نانک نے توحید اور وحدت کا پیامِ حق سنایا، اور حجاز و تاتار کی قوموں نے اسے اپنا وطن بنا لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں کے علوم و فنون نے یونان اور ساری دنیا سے خراجِ عقیدت لیا تھا۔ وہ آریوں کے وسطِ ایشیا سے سفر کو نئے علوم اور نئی تہذیب کا سفر قرار دیتے اور وحدۃ الوجود کے فلسفہ کو ہندستان کی دین سمجھتے ہیں۔

وہ عرب و ہند کے تعلقات اور قدیم دوستانہ روابط کو یاد کر کے اسی روایت کی تائید کرتے ہیں جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ 'مجھے ہندستان کی جانب سے ٹھنڈی ہوا آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے'، وہ اسلامی تاریخ کے اس واقعہ کے بھی قائل ہیں کہ حضرت نوحؑ کی کشتی ہندستان ہی کے کسی پہاڑ پر آکر ٹھہری

تھی ـــــ ان کی نظم "نیا شوالہ" ہندو مسلم اتحاد کی بہت پر زور اور موثر دعوت ہے :

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے، مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی، بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اقبال نے برادرانِ وطن کی ممتاز شخصیات کو جگہ جگہ خراجِ عقیدت دیا ہے اور ان کے پیام محبت کو سراہا ہے۔ ایک مشہور ہندو رشی سوامی رام تیرتھ نے دنیا سے دل برداشتہ ہو کر دریائے گنگا میں خودکشی کر لی تھی۔ اقبال اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے اور انھیں بہت اچھے الفاظ میں یاد کیا :

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بے تاب تو
پہلے گوہر تھا، بنا اب گوہر نایاب تو
آہ کھولا کس ادا سے تو نے رازِ رنگ و بو
میں ابھی تک ہوں اسیر امتیاز رنگ و بو
مٹ کے غوغا زندگی کا فتنۂ محشر بنا
یہ شرارے بجھ کے آتش خانۂ آذر بنا
نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا
توڑ دیتا ہے بتِ ہستی کو ابراہیم عشق
ہوش کا دارو ہے گویا مستیٔ تسنیم عشق

وہ ہندستانی فلسفہ کو مغربی فلسفہ پر ترجیح دیتے ہوئے شری رام چندر جی کو 'امام ہند' کہتے اور ان کے بلند کردار کا ذکر کرتے ہیں :

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رام ہند
یہ ہندیوں کے فکرِ فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے اونچا ہے بام ہند
اس ملک میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شام ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوشِ محبت میں فرد تھا

مہاتما گوتم بدھ کے بارے میں انکے تاثرات یہ ہیں کہ انھوں نے زندگی کیلئے ایک مفید فلسفہ اور شودروں، اچھوتوں کے لیے ایک پیام نجات دیا تھا۔ لیکن اس پیغام کی قدر نہیں ہوئی۔ اسی ضمن میں وہ بابا نانک کے پیام توحید کا ذکر بھی کرتے ہیں :

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یکدانہ کی
پھر اٹھی توحید کی آخر صدا پنجاب سے
ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

اقبال اپنے وطن کی محبت اور عظمت سے ہمیشہ سرشار رہے اور اپنے کو احساس فخر کے ساتھ دنیا میں شاعر ہند کی حیثیت سے پیش کرتے رہے وہ یہاں کی شخصیات، سیاسیات، شہروں، اور یادگاروں کو بہ نظر تحسین دیکھتے تھے۔ ان کا قومی شعور جارحانہ نہ تھا۔ لیکن فخر کا احساس اس میں موجود تھا۔ وہ روضۃ الکبریٰ میں دلی کی عظمت رفتہ کو یاد کرتے ہیں :

سوادِ روضۃ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے
وہی عبرت، وہی عظمت، وہی شانِ دلآویزی

اپنے لختِ جگر جاوید کو نصیحت کرتے ہیں کہ ہندستان کا نام روشن کرو اور فرنگ کا ممنونِ کرم مت بنو :

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

اقبال

علامہ سر محمد اقبال دورِ حاضر کے ایک زبردست مصلح، مفکر، فلسفی اور شاعر تھے۔ اقبال نے دراصل ایک دور کا مزاج بنایا ہے۔ ان کے تصورات نے زندگی کو ایک نئی طاقت بخشی ہے۔ زندگی پر ان کا مطالعہ نہایت وسیع اور نظر نہایت گہری ہے۔ انھوں نے مختلف آبدار موتیوں کو ایک نئے انداز سے پرو دیا ہے۔ اقبال خاص طور پر صاحبِ مثنوی مولانا جلال الدین رومیؒ، امام غزالیؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ دہلوی، مولانا جمال الدین افغانی نیز نیطشے، برگسان وغیرہ سے متاثر ہوئے ہیں۔ دوسرے مفکرین اور فلاسفہ کے افکار سے فیض یاب ہونے کے باعث اقبال کی عظیم مفکرانہ حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ چراغ سے چراغ جلا کرتا ہے۔

اقبال نے ہوش سنبھالا تو دیکھا کہ ہر طرف زندگی کی نفی ہو رہی ہے۔ صوفیوں کی تلقین اور مسیحیت کی تعلیم بتلا رہی تھی کہ انسان کی کوئی ہستی نہیں بلکہ وہ ماحول اور فطرت کے ہاتھوں صرف ایک کھلونا ہے اور اس کی کوئی انفرادی حیثیت نہیں۔ اقبال ان تصورات سے بیزار ہو گئے۔ انھوں نے افلاطون کی تعلیمات کو وجہ فساد قرار دیا۔ حافظ شیرازیؒ وغیرہ کے فرمودات بھی خودی کی نفی کر رہے تھے۔ انھیں صوفیوں کی عزلت گزینی اور ترکِ دنیا کا مسلک ناپسند آیا۔ لہٰذا اقبال نے زندگی کے متعلق ایک باقاعدہ اور تاریخی نظام ترتیب دیا۔

کائنات میں جو بے شمار چیزیں موجود ہیں ان میں انسان ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ کائناتی نظام کی تمام توجہات کا مرکز انسان ہے۔ گویا وہ کائنات کا حاصل ہے۔ اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ زندگی کوئی بے مقصد چیز نہیں بلکہ اس کی اہم غرض غایت ہے۔ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ قدرت نے تمام اشیا کو ایک جوہر عطا کیا ہے، ایک صلاحیت بخشی ہے۔ کارخانۂ عالم میں اشیا کا یہی پوشیدہ جوہر نشوونما پا کر نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔ اسی جوہر اور صلاحیت کا نام اقبال کی اصطلاح میں "خودی" ہے۔ اقبال کا نظریۂ زندگی دراصل اسی "خودی" پر مرکوز ہے جو حیاتِ انسانی کا مرکزی نقطہ ہے۔ ؎

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

موالید ثلاثہ یعنی جمادات، نباتات، حیوانات بشمول عالم انسان سب ہی میں خودی کی جلوہ فرمائی ہے۔ اس کی نگہداشت اور پرورش میں وجود کی ترقی ہے اور اس کی نفی میں زوال ہے۔ مشرقی فلسفہ اور تصوف پر وجودی مسلک کا بڑا اثر پڑا ہے اور اسی کی ترجمانی زیادہ تر مشرقی شعر و ادب میں جلوہ گر رہی ہے۔ جب ذیل قسم کے اشعار بڑے معرکے کے سمجھے جاتے رہے ہیں۔ ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا

ہاں مت کھائیو فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے — وغیرہ وغیرہ

اقبال نے اس نظریۂ زندگی پر بڑی سخت تنقید کی ہے کیونکہ

یہ نظریہ عقل انسانی کو خود اعتمادی کے بجائے توہمات دیتا ہے نیز کارکردگی کی حوصلہ مندانہ صلاحیتوں کو پامال کرتا ہے۔ اقبال کے نقطۂ نظر سے بشر کی خودی اس کی زندگی کی سب سے عظیم حقیقت ہے۔ لہٰذا اقبال کی تعلیم ہے کہ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبال کے یہاں "خودی" زندگی کی مظہر اور عرفان کی دلیل ہے۔ ان کے فلسفۂ زندگی کا نچوڑ یہ ہے کہ انسان کا کمال یہ نہیں ہے کہ وہ خود ذاتِ خداوندی میں کھو جائے بلکہ کمال اس میں ہے کہ وہ بقیہ بندگی خدا کی صفات اپنے اندر پیدا کرے۔

اقبال تمام انسانوں کو دعوتِ عمل دیتے ہیں۔ وہ فرد کی خودی کی تکمیل اس لیے چاہتے ہیں کہ جماعت کا فائدہ ہو۔ انسانیت کی تکمیل کے لیے تکمیل خودی سب سے ضروری چیز ہے۔ مشرق نے اسے بھلا دیا اور منفی اثرات طاری ہو گئے۔ مغرب نے خودی کی تکمیل کی مگر یہ قوانین الٰہی کی پابند نہیں تھی اور اس میں رُوحانی جذبہ نہیں تھا جو اقبال کے نزدیک ضروری ہے۔

اقبال کے فلسفۂ حیات میں آزادی کو بنیادی درجہ حاصل ہے۔ وہ غلامی پر کسی حالت میں راضی نہیں۔ دنیا میں صرف مردانِ حُر کی آنکھیں ہی بینا بھی ہو سکتی ہیں! اقبال کے نزدیک زندگی ایک بلند و برتر مفہوم رکھتی ہے۔ وہ ایک پیکرِ خاکی میں رہتے ہوئے بھی اپنی ادبیت سے ناآشنا نہیں۔ زندگی اپنے سفرِ دوام کے لیے نفس کی آمد و شد کی محتاج نہیں۔ خضرِ راہ میں اقبال فرماتے ہیں ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

اقبال کا نظریۂ زندگی اور فلسفۂ خودی فرد کی تربیت اور ہمہ گیر ترقی کا ایک باضابطہ نظام ہی نہیں بلکہ ایک صحت مند سوسائٹی کی تعمیر بھی ہے۔ اسی کا نام انھوں نے "بے خودی" رکھا ہے۔ زندگی کا کوئی نظام جو تنہا فرد کے مسائل پر توجہ کرے اور معاشرہ کے سوال کو نظر انداز کر دے کبھی مکمل اور جامع نظام نہیں کہلا سکتا ؎

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اقبال کے یہاں زندگی مسلسل حرکت ہے۔ جد و جہد اس کی غذا ہے۔ انسان فی نفسہٖ نہ اچھا ہے نہ بُرا ہے۔ کارکردگی اور عمل سے اس کا مرتبہ اور حیثیت مقرر ہوتی ہے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اقبال نے ترکِ دنیا، نفس کشی، عزلت گزینی اور تن بہ تقدیر قسم کے مجہول اور جامد نظریوں کی شدید مخالفت کی ہے۔ انھوں نے زندگی کے جمود پسند، تقدیر پرست تصور پر شدید ضربیں لگائی ہیں۔ انھوں نے افرادِ ملت کو ایک مثبت اور متحرک زندگی گزارنے کے لیے للکارا ہے۔ اقبال نے بڑے ولولے اور جوش کے ساتھ سعیِ کامل، عملِ پیہم اور سخت کوشی کی تعلیم دی ہے ؎

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
نہیں یہ شانِ خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کر لے
تنک بخشی سے استغنا کو پیغامِ خجالت دے
نہ رہ منت کشِ شبنم نگوں جام و سبو کر لے
اگر منظور ہے تجھ کو خزاں ناآشنا رہنا
جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطعِ آرزو کر لے

★

گم انٹر ۱۸۹۵ اٹک

بہترین اردو کتابوں کے مصنّفین کو ایک لاکھ روپیہ کی پیش کش

اتر پردیش

اتر پردیش اردو اکاڈمی نے طے کیا ہے کہ ہر سال پانچ پانچ ہزار کی رقوم اردو کے دو ممتاز ترین مصنفین کو ان کی مجموعی علمی و ادبی خدمات کے صلہ میں بطور انعام پیش کرے۔ ایسے ممتاز ادیبوں کی بیواؤں کو بھی یہ انعامات دیے جا سکتے ہیں جن کا انتقال گذشتہ تین سال کے اندر ہوا ہے۔

علاوہ ازیں اتر پردیش اردو اکاڈمی نے طے کیا ہے کہ ہر سال تین تین ہزار روپیے کے خصوصی انعامات ان مصنفین کو دیے جائیں گے جن کی کتابیں یکم جنوری ۱۹۷۳ء کے بعد موضوعات ذیل میں سے کسی ایک موضوع پر بہترین سمجھی جائیں گی اور دوران سال اردو میں شائع ہوئی ہوں گی۔

۱۔ طبیعاتی علوم (جس میں انجینیرنگ بھی شامل ہے)
۲۔ حیاتیاتی علوم (جس میں "طب یونانی" بھی شامل ہے)
۳۔ سماجی علوم
۴۔ ہندستان کی تاریخ، ہندستان کی مشترکہ تہذیب اور قومی یک جہتی۔
۵۔ ادبی تنقید
۶۔ افسانوی ادب (جس میں ناول، افسانہ، ڈرامہ شامل ہے)
۷۔ شعر و سخن
۸۔ فنون لطیفہ
۹۔ انشائیہ، سوانح نگاری و دیگر اصناف ادب۔
۱۰۔ کلاسیکی اردو ادب کے کسی شاہکار کی بہترین ایڈیٹنگ یا تحقیقی کام پر۔
۱۱۔ ہندستان کی کسی زبان کی مطبوعہ تصنیف کا بہترین اردو ترجمہ۔
۱۲۔ دیگر زبانوں میں شائع شدہ کسی کتاب کا بہترین اردو ترجمہ۔

ان کے علاوہ دو ہزار اور ایک ہزار روپیہ کا ایک ایک انعام اردو کے ان ناشروں کو دیا جائے گا جن کی مطبوعات کتابت، طباعت اور دیدہ زیبی وغیرہ کے لحاظ سے بہترین ہوں گی۔

مندرجہ بالا انعامات کے علاوہ دو ہزار، ڈیڑھ ہزار، ایک ہزار اور پانچ سو روپیے کے مختلف انعامات بھی، جن کی مجموعی رقم اکیاون ہزار ہوگی اردو کی دوسری کتابوں کے ان مصنفین کو دیے جائیں گے جن کی کتابیں دوران سال شائع ہوئی ہوں گی۔

یکم جنوری ۱۹۷۳ء اور ۳۱ دسمبر ۱۹۷۳ء کے درمیان شائع ہونے والی کتابیں اتر پردیش اردو اکاڈمی کو انعامات دینے کے لیے مطلوب ہیں۔ ان کتابوں کی آٹھ آٹھ جلدیں، سکریٹری اتر پردیش اردو اکاڈمی (۱۳۔ آر کے۔ ٹنڈن روڈ۔ قیصر باغ۔ لکھنؤ) کو اس طرح بھیجی جائیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ ۱۵ جنوری ۱۹۷۴ء تک ان کے پاس پہنچ جائیں۔ جو کتابیں بھیجی جائیں ان کے سرورق کے دوسرے صفحہ پر مندرجہ ذیل تفصیلات کا ہونا ضروری ہے۔

مصنف کا نام اور پتہ۔
ناشر کا نام اور پتہ۔
کتاب کی قیمت۔
سال اشاعت (اگر ممکن ہو تو ماہ اشاعت)

اور مصنف کی یہ تصدیق کہ اس کتاب پر کسی سرکاری یا نیم سرکاری ادارے سے کوئی انعام اسکو نہیں ملا ہے۔ انعام کے لیے ان کتابوں پر بھی غور کیا جا سکتا ہے جن کا اس مدت میں کوئی نیا ایڈیشن نکلا ہو۔

★

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے
دو نسخے آنا لازمی ہیں)

مصنف — غلام مرتضیٰ راہی قیمت — چار روپے
ناشر — دلنواز پبلیکیشنز ۱۱ - مرزا علی اسٹریٹ، بمبئی نمبر ۹۔

جدید شاعری کے معترضین کی گروہ بندی کی جائے تو اس میں ایک جماعت وہ ہے جو اس کی قائل ہے کہ ادب میں جو کچھ ہو رہا تھا اچھا تھا اور اب جو کچھ ہو رہا ہے بیکار ہے۔ دوسری جماعت وہ ہے جو مختلف اداروں سے وابستہ ہو کر وقتی اور ہنگامی نعروں کی شکار ہو گئی ہے، اور ادب کو مالی اور سیاسی منفعت کے حصول کا آلۂ کار سمجھنے لگی ہے۔ ان دونوں جماعتوں سے ادب کو سمجھنے میں سخت غلطی ہوئی ہے۔ ادب نہ سیاسی اشتہار ہے نہ بندصالح کا نظریہ۔ اچھا اور عالمی ادب وہی ہے جو اپنے عہد سے متاثر بھی ہوتا ہے اور عہد ساز بھی۔ اپنے ہمعصر فلسفوں سے تعلق بھی رکھتا ہے اور جدا بھی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ادب بھی فلسفہ، مذہب اور سائنس کی طرح ایک مستقل بالذات حقیقت ہے۔

ادب کا سب سے بڑا مقصد تسکین ذوق (ASTHETICAL SATISFACTION) ہے۔ کوئی بھی فن پارہ چاہے وہ جدید ہو یا قدیم اس وقت تک قابل قبول نہیں ہو سکتا جب تک اس کے اندر اتنی لچک نہ پیدا ہو جائے کہ اسے ہر دور میں فنی اور زندہ تقاضوں کے ساتھ احترام کی نظر سے نہ دیکھا جائے۔

وہ اسالیب جو بانجھ قسم کی تقلید سے جامد بن چکے تھے اور بنتے جا رہے تھے، جدید شاعری نے انھیں ایک بار پھر زندہ اور سیال بنا دیا ہے۔ جدید شاعری کی عمر ابھی زیادہ نہیں ہے۔ اتنی کم عمری میں اس نے جن معدودے چند شعراء کو پیدا کیا ہے ان میں غلام مرتضیٰ راہی کا نام بڑے اعتماد سے لیا جا سکتا ہے۔ راہی کے یہاں فکر بھی ہے اور فکر کا (ARDENT) ابلاغ بھی۔ اس عہد میں انسان کے لیے اس سے بڑا اور کوئی مسئلہ نہیں ہے کہ وہ اپنی ذات کا عرفان حاصل کرے۔ راہی کی شاعری اس باب میں اوّل تا آخر روشن ہے۔ ؏

لاریب، لامکاں کے بعد کی منزل ہے۔ اس میں بھی وہی درّاک قوتِ تخلیق اور انانیت سے بھرپور راہی نظر آتا ہے، جو شمس الرحمٰن فاروقی کو لامکاں میں ملا تھا۔ راہی کے لہجے کی دبازت اور تازگی، اس کی خلاقانہ قوت پر دلالت کرتی ہے۔ راہی نے شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ لاریب میں شاعری کے جملہ محاسن کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے اور ادب کی افادیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا گیا بقول ڈاکٹر وحید اختر "جدید شاعری نئے معنیٰ کی تلاش ہی نہیں، تخلیق بھی ہے۔ لاریب اس تلاش و تخلیق کی ایک روشن مثال ہے"۔

اگر میں حرف غلط ہوں تو کس کے سر جاؤں کوئی ورق بھی تو سادا نہیں کہ بھر جاؤں
اچھالنے میں تجھے، کتنے ہاتھ شامل تھے کنارے بیٹھ کے لہروں کا کچھ شمار لگا
دیکھ تجھ کا کلیجہ میرا یہ چمک تھی کہاں خنجر پہ ترے
کٹ مرا اک شخص اپنی آن پر اور اپنا سر اٹھا کر لے گیا

اقبال اور ہندستان (صفحہ ۵۲ کا بقیہ)

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

وطن سے اسی محبت کا نتیجہ تھا کہ ٹیگور سے ان کی ہلکی معاصرانہ چشمک تھی اور وہ اپنے کو ہندستان کا نمائندہ شاعر سمجھتے تھے۔ باہر کے ملکوں میں ان کی خواہش رہتی تھی کہ انھیں اسی حیثیت سے دیکھا جائے۔ ایک ایرانی صحافی نے ان کے مقابلہ پر ٹیگور کو عالمی شاعر لکھا۔ اس پر ٹیگور اور اقبال کے مشترک دوست عباس علی خاں لمعہ نے ٹیگور کو لکھا تو ٹیگور نے اقبال کو اپنا ہمسر قرار دیتے ہوئے دنیا کے صفِ اوّل کے شعرا میں شمار کیا۔ دونوں شاعر ایک دوسرے کی عظمت تسلیم کرتے تھے۔ دونوں کے باہمی تعلقات خوشگوار تھے۔ ٹیگور جب لاہور جاتے اقبال سے ملتے۔ آزادی کی جنگ کے ادبی محاذ پر نذرالاسلام، ٹیگور اور اقبال دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ اقبال نے غیر معمولی طور پر ہندستان کی غلامی اور پسماندگی کو محسوس کیا تھا۔ تقریباً ان کا آدھا کلام حریت اور استقلال کے احساسات بیدار کرنے کے لیے وقف تھا۔ وہ ہندو مسلم کشمکش کو ہندستان کے لیے ہمیشہ خطرناک سمجھتے رہے۔ مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق" میں انھوں نے ہندستان کے لیے ایک عنوان قائم کیا ہے:

"اشکے چند بر افتراقِ ہندیاں"

اس میں ہندستانی قوموں کو دعوتِ اتحاد دی ہے۔ اس کے آغاز میں کہتے ہیں کہ پھوٹ کی وجہ سے ہندستان اپنا بین الاقوامی رول نہیں ادا کر سکا:

اے ہمالہ اے اٹک اے رود گنگ! زیستن تا کے چناں بے آب رنگ؟

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش ان سے بہرحال متفق ہو

اپنی بات

عیسوی کلینڈر کے حساب سے بیسویں صدی کا ۱۹۷۳ء والا سال ختم ہوا اور ہم ۱۹۷۴ء میں اس امید کے ساتھ قدم رکھ رہے ہیں کہ یہ دشواریوں اور پریشانیوں کا نہیں بلکہ خوشیوں اور کامرانیوں کا سال ہوگا۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے قوم کے نام اپنے نئے سال کے پیغام میں کہا ہے کہ ہمیں امید، اتحاد اور اشتراک و تعاون کی نئی سمت میں کام کرنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ "میں یہ نہیں کہتی کہ ۱۹۷۴ء میں دشواریاں نہیں ہوں گی۔ لیکن جو بھی دشواریاں سامنے آئیں ان کا مقابلہ ہمیں ہمت اور خوش دلی کے ساتھ کرنا چاہیے ہندستان متعدد بار سخت دشواریوں کے دور سے کامیابی کے ساتھ گزرا ہے۔ امید ہے کہ نیا سال ایک اچھا سال ثابت ہوگا اور اتحاد و تعاون کی نئی فضا میں ہم آگے بڑھیں گے"۔

اس میں شک نہیں کہ ۱۹۷۳ء ہمارے ملک کے لیے ایک کٹھن سال تھا۔ اس میں عوام کو زبردست خشک سالی، سیلاب، زبردست گرانی، عام چیزوں کی شدید قلت، بجلی کے بحران اور کوئلے، کاغذ نیز کیمیادی کھادوں کی کمیابی کا سامنا رہا۔ اس کے علاوہ یہ ہڑتالوں کا بھی سال رہا۔ اس کی تفصیل میں جانا مقصود نہیں لیکن اس سلسلے میں انجنیروں، ڈاکٹروں، ہوابازوں، ریلوے کے لوکو عملے، ایر لائنس کے ملازمین، بجلی کے ٹکنیکل عملے وغیرہ کی جانب سے کی جانے والی ہڑتالیں قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح زیر نظر سال میں سیاسی صورت حال کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں رہی۔ آندھرا پردیش منی پور اور اڑیسہ کے علاوہ اتر پردیش میں بھی جہاں پی اے سی کے ایک طبقے نے بغاوت کردی، صدر راج کا نفاذ ناگزیر ہوگیا۔ طلبا کی ہڑبونگ کے اعتبار سے بھی یہ سال نمایاں رہا۔ اتر پردیش میں ان کی توڑ پھوڑ اور آتش زنی کا نشانہ لکھنؤ یونیورسٹی بنی۔ لیکن ان تمام مسائل، دشواریوں اور مشکلوں پر مرکزی حکومت اور حکومت اتر پردیش نے جس استقلال اور دور اندیشی سے کام لے کر قابو حاصل کیا وہ یقیناً تسلی بخش ہے۔ یہی نہیں مشکل حالات کے باوجود ملک کو سوشلزم کی جانب تیزی سے بڑھانے کا سلسلہ جاری رہا۔ خشک سالی سے متاثر افراد کی راحت رسانی کے اقدامات (جن میں خشک سالی کے عروج کے دوران تقریباً ۱۸ کروڑ انسانوں کو مفت راشن کی فراہمی شامل تھی) ہندستان اور روس کے درمیان معاشی اور تجارتی تعاون کے لیے پندرہ سالہ معاہدہ، چکوسلاواکیہ، پولینڈ اور ہنگری کے ساتھ معاشی اور تجارتی تعلقات میں زیادہ قربت پیدا کرنا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سے تعلقات میں بہتری، عرب اسرائیلی جنگ میں عرب موقف کی حمایت کے باعث عرب ملکوں اور ہندستان کے درمیان بہتر مفاہمت اور ایک دوسرے سے قریب تر ہونا، کوئلے کی صنعت اور گیہوں و چاول کی تھوک تجارت کو قومیانا، ہندستان کے چیف جسٹس کی سینیارٹی کی جگہ نظریات کی بنیاد پر تقرری اور انسانی مسائل کو حل کرنے کے لیے ہندستان اور بنگلا دیش کی مشترکہ پیش کش کی بنیاد پر پاکستان اور ہندستان کے مابین دہلی سمجھوتہ اور اس سمجھوتے کے تحت ہندستان سے پاکستانی جنگی قیدیوں اور دوسرے شہریوں، بنگلا دیش سے پاکستانیوں اور پاکستان سے بنگالیوں کی واپسی کے پروگرام پر عمل درآمد وہ کارنامے ہیں جو ۱۹۷۳ء کے دوران انجام پائے۔

تہنیت

ادارہ نیا دور قارئینِ نیا دور کو نئے سال کی مبارکباد پیش کرتا ہے اور توقع کرتا ہے کہ یہ مسرت و کامرانی کا سال ہوگا

اتر پردیش میں صدر راج کے نفاذ کے تھوڑے ہی عرصے بعد حالات کے اعتدال پر آتے ہی صدر راج ہٹا لیا گیا اور شری ہیم وتی نندن بہوگنا کی قیادت میں عوامی حکومت قائم کی گئی۔ پردیش میں فروری کے آخر میں عام انتخابات ہونے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ پردیش کے عوام اتنی سیاسی بیداری اور سوجھ بوجھ کا یقیناً ثبوت دیں گے کہ انتخابات پرامن طریقے پر اور پردیش کے صالح روایات کے شایان شان ہو سکیں جس کے نتیجے میں یہاں پائدار حکومت قائم ہو تاکہ ہمارا پردیش ملک کو درپیش مسائل کے حل کرنے، اس کی جمہوری اور سیکولر بنیادوں کو مستحکم سے مستحکم تر بنانے اور قوم کو سوشلزم کے راستے پر آگے بڑھانے میں دوسرے پردیشوں کے نہ صرف شانہ بشانہ چلے بلکہ پیش پیش رہے۔

——— ایڈیٹر

چندہ سالانہ
پانچ روپے
فی کاپی پچاس پیسے

ملنے کا پتہ
انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

ترسیل زر کا پتہ
سپرنٹنڈنٹ انفارمیشن (سی) ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور
انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

	جنوری					فروری				
اتوار		۶	۱۳	۲۰	[illegible]		۳	۱۰	۱۷	۲۴
دوشنبہ		۷		۲۱			۴	۱۱	۱۸	۲۵
منگل		۸	۱۵	۲۲	۲۹		۵	۱۲	۱۹	۲۶
بدھ	۲	۹	۱۶	۲۳	۳۰			۱۳	۲۰	۲۷
جمعرات	۳	۱۰	۱۷	۲۴	۳۱		۷	۱۴	۲۱	۲۸
جمعہ	۴	۱۱	۱۸	۲۵		۱	۸	۱۵	۲۲	
سنیچر	۵	۱۲	۱۹	۲۶			۹	۱۶	۲۳	

	مارچ					اپریل				
اتوار	۳۱	۳	۱۰	۱۷	۲۴		۷	۱۴	۲۱	۲۸
دوشنبہ		۴	۱۱	۱۸	۲۵	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹
منگل		۵	۱۲	۱۹	۲۶	۲	۹	۱۶	۲۳	۳۰
بدھ		۶	۱۳	۳۰	۲۷	۳	۱۰	۱۷	۲۴	
جمعرات		۷		۲۱	۲۸	۴	۱۱	۱۸	۲۵	
جمعہ	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹	۵	۱۲	۱۹	۲۶	
سنیچر	۲	۹	۱۶	۲۳	۳۰	۶		۲۰	۲۷	

	مئی					جون				
اتوار		۵	۱۲	۱۹	۲۶	۳۰	۲	۹	۱۶	۲۳
دوشنبہ			۱۳	۲۰	۲۷		۳	۱۰	۱۷	۲۴
منگل		۷	۱۴	۲۱	۲۸		۴	۱۱	۱۸	۲۵
بدھ	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹		۵	۱۲	۱۹	۲۶
جمعرات	۲	۹	۱۶	۲۳	۳۰		۶	۱۳	۲۰	۲۷
جمعہ	۳	۱۰	۱۷	۲۴	۳۱		۷	۱۴	۲۱	۲۸
سنیچر	۴	۱۱	۱۸	۲۵		۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹

	جولائی					اگست				
اتوار		۷	۱۴	۲۱	۲۸		۴	۱۱	۱۸	۵
دوشنبہ	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹		۵	۱۲	۱۹	۶
منگل	۲	۹	۱۶		۳۰		۶	۱۳	۲۰	۷
بدھ	۳	۱۰	۱۷	۲۴	۳۱		۷	۱۴	۲۱	۸
جمعرات	۴	۱۱	۱۸	۲۵		۱	۸	۱۵	۲۲	
جمعہ	۵	۱۲	۱۹	۲۶		۲	۹	۱۶	۲۳	
سنیچر	۶	۱۳	۲۰	۲۷				۱۷	۲۴	

	ستمبر					اکتوبر				
اتوار	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹		۶	۱۳	۲۰	
دوشنبہ	۲	۹	۱۶	۲۳	۳۰		۷	۱۴	۲۱	
منگل		۱۰	۱۷	۲۴		۱	۸		۲۲	
بدھ	۴	۱۱	۱۸	۲۵		۲	۹	۱۶		
جمعرات	۵	۱۲	۱۹	۲۶		۳	۱۰	۱۷	۲۴	
جمعہ	۶	۱۳	۲۰	۲۷		۴		۱۸	۲۵	
سنیچر	۷	۱۴	۲۱	۲۸		۵	۱۲		۲۶	

	نومبر					دسمبر				
اتوار		۳	۱۰	۱۷	۲۴	۱	۸	۱۵	۲۲	
دوشنبہ		۴	۱۱	۱۸	۲۵	۲	۹	۱۶	۲۳	
منگل		۵	۱۲	۱۹	۲۶	۳	۱۰	۱۷		
بدھ		۶	۱۳	۲۰	۲۷	۴	۱۱	۱۸	۲۵	
جمعرات		۷	۱۴	۲۱	۲۸	۵	۱۲	۱۹	۲۶	
جمعہ	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹	۶	۱۳	۲۰	۲۷	
سنیچر	۲	۹	۱۶	۲۳	۳۰	۷	۱۴	۲۱	۲۸	

آنسو بھی ہوے خشک وفورِ تپ غم سے
کیا آگ بجھے گی یہ بھلا دیدۂ نم سے

اللہ رے وہ تیرگیٔ شامِ غریباں
کل رات تو سایہ بھی گریزاں رہا ہم سے

آلامِ جہاں، جورِ فلک، گردشِ دوراں
سب بھول گئے ہم، غمِ جاناں کے کرم سے

ہے ان کے لیے مرحلۂ دار و رسن کیا
جو کھیل چکے سلسلۂ زلفِ صنم سے

اے دشتِ جنوں میرے سوا کون یہاں ہے
آباد یہ صحرا ہے مرے نقشِ قدم سے

ان سے بھی ہے رسوائیِ ناموسِ محبت
ٹکراتے ہیں سر اپنا جو دیوارِ حرم سے

رکھتے نہیں ہم صبحِ طرب سے بھی کچھ امید
ہر چند پریشاں ہیں بہت شامِ الم سے

ہر گام پہ اک سلسلۂ نقشِ جبیں ہے
اس طرح بھی گزرا ہے کوئی کوے صنم سے

ڈر ہے کہ پھر اس دل کو غمِ دہر نہ گھیرے
مشغول رکھیں آپ اسے اپنے ستم سے

کہنے کو تو اے دوست وفا نام ہے میرا
دنیا میں مگر ذکرِ وفا ہے ترے دم سے

چنداین اور مینا ستونتی

ڈاکٹر پرکاش مونس

ملّا داؤد کی چندائن اب تک کی تحقیق کے مطابق ہندی کی کسی بھی بولی کی قدیم ترین دستیاب شدہ کتاب ہے۔ نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ بھی اس سے کم از کم ساٹھ سال بعد کی تصنیف ہے۔ غوّاصی کی مینا ستونتی ہر چند چندائن سے قریب سوا دو سو سال بعد معرض وجود میں آئی لیکن ان دونوں میں ایسا قریبی تعلق ہے کہ ایک کے تحقیقی مطالعے کے لیئے دوسرے سے کما حقہٗ واقفیت ضروری ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندی والوں کی یا تو مینا ستونتی پر نظر ہی نہ گئی یا انھوں نے اسے لائقِ اعتنا نہ گردانا اور اردو والوں نے بھی چندائن پر توجہ نہ کی اور اسے بھلا ہی بیٹھے۔

مینا ستونتی سات سو سے زیادہ اشعار کی دکنی اردو بولی کی مثنوی ہے۔ اس میں ایک ایسی رقت زدہ عصمت شعار بیوی کی المیہ داستان نظم کی گئی ہے جو شوہر کی بے وفائی اور ہزارہا مصیبتوں کے باوجود متاع و آسائش کی ہر ترغیب و تحریص کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر اپنی عصمت و عفت کو محفوظ رکھتی ہے۔ قدیم ہندی پریم کتھاؤں کی قصہ در قصہ والی روایت کی تقلید میں اس مثنوی میں چھ ضمنی کہانیاں بھی آتی ہیں۔ اس کے ماخذ کا غوّاصی نے خود مینا ستونتی میں ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

رسالہ اتھا فارسی یو اوّل کیا نظم دکنی ستے بے بدل

(قدیم اردو جلد اول ۱۹۶۵ء ص ۱۲۲)

لیکن اس فارسی رسالے کا کیا نام تھا اور یہ کس کی تصنیف ہے اس کے بارے میں مثنوی میں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

مینا ستونتی کی دریافت کا سہرا جناب نصیر الدین ہاشمی کے سر ہے۔ بعد میں ڈاکٹر غلام عمر خاں نے اسے ایک مبسوط اور پر مغز مقدمے کے ساتھ رسالہ قدیم اردو حیدرآباد۔ جلد اول ۱۹۶۵ء میں تمام و کمال شائع کر دیا۔ اس کا سال تصنیف قطعیت کے ساتھ معلوم نہیں ہوتا لیکن جو پختگی غوّاصی کی دوسری مثنویوں یعنی سیف الملوک (۱۶۱۶ء) اور طوطی نامہ (۱۶۴۰ء) میں پائی جاتی ہے وہ مینا ستونتی میں مفقود ہے اس سے اور بعض دوسرے قرائن و شواہد کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ مینا ستونتی ان دونوں مثنویوں سے پہلے کی تصنیف ہے اور اس کا زمانۂ تصنیف سترھویں صدی عیسوی کے ربع اول کے آس پاس ہے۔ مینا ستونتی کے قصّے کا خلاصہ یہ ہے:

کسی شہر میں بالا کنور نامی ایک راجہ تھا اور چندا اس کی عیش دختر تھی۔ چندا نے ایک دن لورک نامی چرواہے کو محل کے نیچے سے گزرتا ہوا دیکھا اور اس کے مردانہ حسن پر عاشق ہو گئی۔ چندا نے کسی طرح لورک کو محل میں بلا کر اس کے سامنے اظہار عشق کیا اور اس کے ساتھ چلنے پر اصرار کیا، لورک پہلے تو کچھ عذر کرتا رہا لیکن بالآخر رضامند ہو گیا۔ چندا بہت کچھ زر و جواہر لے کر اس کے ساتھ فرار ہو گئی۔ چندا کے باپ بالا کنور کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے کہا جو ہونا تھا ہو گیا۔ وہ لورک کی زہرہ جمال بیوی مینا پر پہلے سے ہی فریفتہ تھا۔ لورک کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اس نے ایک دلّالہ کو مینا کے پاس بھیجا لیکن دلّالہ کی تمام عیّاریاں اور کوششیں عصمت مآب مینا کے پائے استقلال کو متزلزل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ ایک روز بالا کنور خود مینا کے گھر جا کر

چھپ گیا اور دلّالہ اور مینا کی گفتگو سننے لگا۔ میناؔ کی شوہر پرستی اور عصمت آبی کی باتیں سن کر وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے ظاہر ہو کر دہیں میناؔ سے معافی مانگی اور اسے ماں کہہ کر خطاب کیا۔ اس کے بعد راجہ نے لورک کی تلاش شروع کر دی اور آخر اسے ڈھونڈھ نکالا۔ چندا کو سنگسار کر دیا گیا اور لورک اور میناؔ آرام سے رہنے لگے۔

ملّا داؤد کی چندائن کا ماخذ بھی یہی پریم کتھا ہے۔ لیکن اس کے اور میناستونتی کے قصے میں بہت زیادہ فرق ہے۔ چندائن میں شہزادی کا نام چاؔند ہے جو چندا سے زیادہ مختلف نہیں ہے لیکن اس کے باپ کا نام بالاکنور کی بجائے سہدیو۔ اے مہر ہے جسے گودر نگر کا راجہ بتایا گیا ہے۔ چاؔند کی شادی چار برس کی عمر میں راجہ جیت کے بیٹے باؔون سے ہو گئی تھی۔ لیکن چونکہ اس کا شوہر کبھی اس کی طرف ملتفت نہ ہوا تھا اس لیے بارہ برس بعد چاؔند کو اس کے شوہر کے یہاں سے گودر نگر واپس بلا لیا گیا۔ وہاں ایک باجر سادھو چاؔند کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گیا اور اس کے حسن و جمال کے گیت گاتا شہر شہر پھرنے لگا۔ روپ چند نامی ایک راجہ سادھو کی زبانی چاند کی تعریف سن کر اسے حاصل کرنے کے لیے بے قرار ہو اٹھا اور اس نے گودر نگر پر چڑھائی کر دی۔ لڑائی میں چاؔند کے باپ کو شکست ہونے ہی والی تھی کہ لورک نامی ایک گوالا اپنے ساتھیوں کو لے کر میدان جنگ میں کود پڑا اور اس جواں مردی اور جانبازی سے لڑا کہ روپ چند کو بھاگتے ہی بنی۔ فتح کے بعد لورک کا ایک ہاتھی پر جلوس نکالا گیا۔ چاؔند نے لورک کو دیکھا تو اس پر فریفتہ ہو گئی۔ ایک سہیلی کے توسط سے چاند اور لورک کی ایک مندر میں پہلی ملاقات ہوئی اور کچھ دنوں کے بعد دونوں شہر سے فرار ہو گئے۔ سفر میں دو مرتبہ چاند کو سانپ نے کاٹا لیکن ایک جوگی اور مداری کی وجہ سے دوبارہ اُسے زندگی ملی۔ آگے چل کر سارنگ پور کے راجہ کے ساتھ قمار بازی میں اپنے سارے مال و اسباب کے ساتھ لورک نے چاند کو بھی ہار دیا۔ اس کے بعد ایک جوگی نے چاند کے حافظے کو معطل کر دیا (مقابلہ کیجیے نل دمینتی کی کتھا اور کالی داس کے شکنتلا ناٹک سے)۔ لیکن مداری کے سکھلائے ہوئے منتر کی بدولت دوبارہ چاند اسے مل گئی اور حافظہ بھی واپس آ گیا۔ بعض اور مصیبتیں جھیلنے کے بعد دونوں ہری پاٹن پہنچے اور وہاں کے راجہ کی سرپرستی میں رہنے لگے۔ لورک کے فرار ہونے کے بعد اس کی بیوی میناؔ پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ لورک کی ماں کھولن اور میناؔ نے ایک قافلے کے سردار کے ذریعہ لورک کے پاس اپنے حال زار کی خبر بھجوائی جسے سن کر لورک اور چاند ہری پاٹن کے راجہ سے اجازت لیکر گودر نگر سے اپنے شہر واپس آئے۔ پہلے چاند اور مینا میں کچھ جھگڑا ہوا لیکن لورک نے دونوں کو سمجھا لیا اور تینوں مل کر آرام کی زندگی بسر کرنے لگے۔

چندائن کے قصے میں لورک کی غیر حاضری میں مینا کو حاصل کرنے کے لیے بالاکنور کے اقدام اور میناؔ کے امتحان و آزمائش کا کوئی ذکر نہیں جبکہ میناستونتی کے قصے کی بنیاد ہی اس تصور پر قائم ہے۔

چندائن اور میناستونتی کی بنیاد ایک ہی لوک کتھا پر ہے جس کا ایک رُخ میناستونتی میں اور دوسرا چندائن میں اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ لوک کتھا بہار کے شمالی حصے سے حیدر آباد دکن تک مروج ہے۔ گیا، سارن، رام نگر، شاہ آباد، مرزا پور، چھتیس گڑھ کے ضلع رائے پور، بندیل کھنڈ اور راجستھان میں بھی یہ کتھا کسی نہ کسی شکل میں سننے کو ملتی ہے۔ مرزا پور میں مروج کتھا میں لورک کی ہیروئن چندا نہیں بلکہ منجری ہے۔ اس لوک کتھا میں جب لورک چندا کو لے کر فرار ہو جاتا ہے تو اس حصے کو "چانواں کا اُڈھار" کہتے ہیں[1]۔ چتربھج داس کی تصنیف مدھو مالتی میں بھی ایک ضمنی کہانی مینا اور لورک کے نام سے آتی ہے۔ خیال یہ ہے کہ مدھو مالتی میں یہ کتھا کھیم داس داودیہی کی مینا کا ستونامی کتاب سے جو سترھویں صدی ہجری میں لکھی گئی ہے آئی ہے۔ میاں سادھن کی میناست[2] بھی اسی لوک کتھا کو لے کر لکھی گئی ہے۔ بنگال میں بھی یہ کتھا مروج ہے جسے دولت قاضی نے ستی مینا کے نام سے سنسکرت آمیز بنگلہ میں وزیر اشرف خاں کے ایما سے ۱۶۵۷ء میں منظوم کیا۔ اس کے بقیہ حصے کو لور چندرانی کے نام سے علاال نے مکمل کیا[3]۔ فارسی میں حمیدی

---

[1] چندائن مرتبہ ڈاکٹر وشوناتھ پرشاد۔ ۱۹۶۲ء ص ۲۶ [2] میناست مرتبہ اگر چند ناہٹا۔ ۱۹۵۶ء۔ ہندی ودیا پیٹھ پرکاش، آگرہ [3] ستی مینا او رچندرانی مرتبہ شستیندر ناتھ گھوشال۔ وشو بھارتی نمبر ۲۰۱۲ [4] نوائے ادب۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء

سا عصمت نامہ اور غواصی کی زیر نظر مینا ستونتی بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کسی مہدوی نامی شاعر کی مثنوی لودک چندا کا بھی ذکر کیا ہے[۱] لیکن اس کا قصّہ غواصی کی مثنوی سے کافی مختلف ہے۔

چنداین کا ذکر سب سے پہلے ۱۸۲۹ء میں مسر بندھوؤں نے اپنی کتاب مسر بندھو ونود میں کیا تھا۔ اس کے بعد ہری اودھ نے اور پھر ڈاکٹر پیتامبر دت بڑتھوال نے اپنے مقالے "دی نرگن اسکول آف ہندی پوئٹری" میں اس کا ذکر کیا۔ لیکن ان میں سے کسی نے چنداین کے ماخذ یا اس کے زمانۂ تصنیف کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ ۱۹۴۰ء میں سری برج رتن داس کی کتاب کھڑی بولی ہندی ساہتیہ کا اتہاس چھپی تو اس میں انھوں نے پہلی مرتبہ چنداین کے مصنف ملا داود کے بارے میں دعوی یا دلیل پیش کیا اور عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ کے حوالے سے بتایا کہ چنداین کی تصنیف فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت (۱۳۵۱ تا ۱۳۸۸ عیسوی) میں ہوئی تھی[۱]۔

بہر حال عرصے تک چنداین کا صرف نام ہی سنا جاتا تھا۔ ۵۲-۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر واشودیو شرن اگروال کو کتب خانہ رام پور میں پدماوت کے ایک نسخے پر چار لائن چنداین کے نام کے ساتھ لکھی ہوئی ملیں۔ بھارت کلا بھون کاشی میں چھ مصوّر اوراق پہلے سے موجود تھے وہ بھی چنداین کے ثابت ہوئے۔ اس کے بعد چنداین کے چوبیس مصوّر اوراق پنجاب آرکائیوز میں ملے۔ سید حسن عسکری صاحب کو منیر شریف کی خانقاہ سے چنداین کے جو ستّر صفحات دستیاب ہو چکے تھے۔ لیکن اس وقت انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کس کتاب کا جز ہیں۔ عسکری صاحب نے انھیں شری واشو دیو شرن اگروال کو دکھایا تو معلوم ہوا کہ وہ چنداین کے اوراق ہیں۔ اس کے بعد چونسٹھ صفحوں کا ایک نامکمل مخطوطہ بھوپال میں ملا جسے بمبئی پرنس آف ویلز میوزیم کے لیے خرید لیا گیا۔ ۵۳-۱۹۵۴ء میں چنداین کے ایک اور نسخے کی بابت معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ اس طرح چنداین کے چار نسخے فارسی رسم الخط میں دستیاب ہوگئے[۲]۔

ہندی میں چنداین کا تفصیلی تعارف سب سے پہلے ڈاکٹر پرمیشوری لال گپت نے کرایا۔ بعد میں اسے ڈاکٹر وشوناتھ پرشاد نے ایک جامع مانع مقدمے کے ساتھ آگرہ یونیورسٹی کے ہندی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے چنداین کے نام سے اور اس کے بعض حصّوں کو ڈاکٹر ماتا پرشاد گپت نے لور کسہا (لورکتھا) کے نام سے شائع کر دیا۔

چنداین کے مختلف اوراق مختلف جگہوں سے دستیاب ہوے ہیں۔ ان پر نمبر پڑے ہوے نہیں ہیں اور اکثر میں ترک بھی غائب ہے۔ ان اوراق کو محققوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ترتیب دے لیا ہے۔ اس طرح چنداین نامی جو کتاب مرتب کی گئی ہے، اس پر ایک نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ زنجیر کی بعض کڑیاں غلط جگہ جڑی ہوئی ہیں اور بعض سرے سے غائب ہیں۔ قصّے میں بعض جگہ تسلسل بھی باقی نہیں ہے۔

چنداین کے مصنّف ملّا داؤد ڈلمؤ ضلع رائے بریلی (اتر پردیش) کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے یہ کتاب فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت میں جبکہ جونا شاہ ان کے وزیر تھے، تصنیف کی۔ اس کا ذکر خود چنداین میں اس طرح آتا ہے:

برس سات سئے ہتے اناسی — تہیا یہ کوی سرس ابھاسی
ساہ پھروج دلی سلطانو — جونا ساہ اُجیر بھاکھانو
دلمؤ نگر بسے نور نگا — اوپر کوٹ تلے بہے گنگا

(چنداین۔ مرتبہ ڈاکٹر وشوناتھ پرشاد ۱۹۲۲ء ص ۷)

ان اردھالیوں سے صراحتاً معلوم ہو جاتا ہے کہ چنداین ۷۷۹ھ مطابق ۷۸-۱۳۷۷ء میں تصنیف ہوئی۔ رسالہ قدیم اردو جلد اوّل ۱۹۶۵ء کے ص ۶۵ پر ڈاکٹر غلام عمر خاں کے مینا ستونتی کے مقدمے میں ۷۷۹ھ کا متوازی سن عیسوی ۱۳۸۷ دیا ہوا ہے جو کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۵ پر)

---

[۱] کھڑی بولی ہندی ساہتیہ کا اتہاس۔ کاشی سمت ۱۹۹۸ ص ۱۲-۱۵ [۲] مضمون از ڈاکٹر پرمیشوری لال گپت۔ مطبوعہ سمیلن پترکا جلد ۴۷ شمارہ ایک شک ۱۸۸۲۔

معیارِ فن

اخگر مشتاق

ہاں او نظرِ ہوش رُبا تیرا ستم بھی ۔۔۔ ہر رنگ میں ہے حاصلِ ہستی و عدم بھی

یہ تو نہیں، ہم بھول گئے شیوۂ غم بھی ۔۔۔ ہاں، آپ ہی سے بن نہ پڑی مشقِ ستم بھی

اے شکوہ طرازانِ ستم ہائے تغافل ۔۔۔ کچھ غیرتِ رسوائیِ پندارِ صنم بھی

یا دل کو بڑی آرزوئے ہم سخنی تھی ۔۔۔ یا بارِ لبِ شوق ہے اب شکوۂ غم بھی

اللہ رے یہ خفگیِ صد مرحمت انداز ۔۔۔ دل ہے کہ ہوا جاتا ہے مفتونِ ستم بھی

یا چشمِ کرم حسبِ تقاضائے تمنا ۔۔۔ یا ساتھ لیے جاؤ مرے دیدۂ نم بھی

کس وادیِ ویراں میں ہے آوارۂ غربت ۔۔۔ پامالِ حوادث ہے جہاں سایۂ غم بھی

یہ حرف بھی اب پردہ درِ رازِ جنوں ہے ۔۔۔ تھے حاملِ سرمایۂ معنی کبھی ہم بھی

وہ جبرِ زمانہ ہے کہ ہم کہہ نہیں سکتے ۔۔۔ افسانۂ بے رحمیِ صیّاد و صنم بھی

وہ لوگ جو شاکی ہیں ترے نازِ ستم کے ۔۔۔ ایسا تو نہیں، بھول گئے رازِ ستم بھی

کھل جائے نہ اس کشمکشِ بیم و رجا میں ۔۔۔ اک حوصلۂ عرضِ تمنا کا بھرم بھی

یارائے خموشی ہے نہ یارائے تکلّم ۔۔۔ اُف! صورتِ دلجوئیِ اربابِ کرم بھی

اک وعدۂ فردا ہی رہا حاصلِ ایماں ۔۔۔ کیا چیز تھی اک کفرِ سراپا کی قسم بھی

اٹھ آئے تو ہو صحنِ صنم خانہ سے اخگر

راس آیا نہ گر سایۂ دیوارِ حرم بھی

ذوق کا ایک نایاب مرثیہ

نور السعید اختر

اُردُو شاعری میں شیخ ابراہیم ذوق کی حیثیت مسلم ہے اور یہ ہم سب کو معلوم ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں ذوق کا بیشتر کلام تلف ہوگیا اور جب محمد حسین آزاد دہلی سے بھاگے تو ان کے اثاثے میں استاد کی چند غزلیں، یادداشتیں اور چند تمام اور ناتمام قصائد بھی شامل تھے۔ لیکن اس اثاثے میں ذوق کے چند معرکے کے قصیدے بھی نہیں تھے۔ اس طرح یہ قصائد بھی ضائع ہوگئے اور ان کا پورا کلام ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ذوق کا پورا کلام نہیں چھپا۔ ذوق سے منسوب صرف دو اصناف سخن باقی رہ گئے۔ ایک غزل اور دوسرا قصیدہ۔ لیکن اتنا بڑا استادِ فن جو استادِ شاہ بھی کہلاتا تھا، غزل اور قصیدہ کے علاوہ یقیناً دوسرا اصنافِ سخن میں بھی اپنی جولانیٔ طبع دکھاتا رہا ہوگا۔

مجھے حال ہی میں ذوق کا ایک مرثیہ ملا ہے جس کا ایک مخطوطہ مہاراشٹر کالج، بمبئی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ یہ مخطوطہ مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی[1] نے بطور عطیہ کالج کو دیا ہے۔

اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ یہ مخطوطہ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کو کہاں سے ملا؟ اس مخطوطے کی دستیابی کے سلسلے میں مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے مجھے یہ بتایا تھا کہ انھیں یہ مخطوطہ شاہ اودھ غازی الدین حیدر کے نواسے نواب محسن الدولہ بہادر کے کتب خانے سے حاصل ہوا تھا۔ نواب محسن الدولہ شاہ اودھ محمد علی شاہ کے داماد، شاہ اودھ امجد علی شاہ کے بہنوئی اور آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کے حقیقی پھوپا تھے۔ یہ شعر و سخن اور خاص طور پر فن مرثیہ گوئی کے بڑے سرپرست تھے۔ نواب محسن الدولہ مرزا دبیر کے شاگرد بھی تھے اور کئی مرثیہ گو شعرا ان کی سرکار سے مستقل طور پر وابستہ تھے۔"

چنانچہ فاروقی صاحب نے جو مخطوطات مہاراشٹر کالج کو عطا فرمائے ہیں ان میں سے اکثر مراثی ان شعراء کے ہیں جو محسن الدولہ کے ملازم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں نواب محسن الدولہ کا ذکر بتصریح کے ساتھ موجود ہے۔

فاروقی صاحب نے بتایا کہ "نواب محسن الدولہ کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ مرزا دبیر کو ایک ایک مرثیہ پر کئی کئی ہزار روپیہ دیتے تھے۔ اس طرح ہر مرثیہ گو شاعر ان کے بزل و کرم کا مورد بنتا تھا۔ وہ شعراء سے فرمائش کرتے تھے کہ وہ مراثی کہیں اور مرثیہ کہنے پر وہ ان کو مالا مال کر دیا کرتے تھے۔"

ذوق کے جس مرثیہ کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ فاروقی صاحب کو نواب محسن الدولہ کے مکان واقعہ محلہ "گھڑیالی" لکھنؤ سے ملا تھا، جہاں نواب محسن الدولہ کی پوتی مقیم ہیں۔ اور یہ مرثیہ موصوفہ نے ہی اپنے دادا کے جمع کردہ مراثی میں سے نکال کر فاروقی صاحب کو دیا تھا اور یہ بتایا تھا کہ یہ مرثیہ محسن الدولہ بہادر کی فرمائش پر استاد ذوق نے ان کے لیے لکھ کر بھیجا تھا۔ علاوہ ازیں ذوق کا یہ مرثیہ اس لحاظ سے نایاب ہے کہ محمد حسین آزاد نے بھی آب حیات میں لکھا ہے کہ "افسوس یہ ہے کہ عالم جوانی کی طبع آزمائی سب برباد ہوئی۔ جو کچھ ہیں وہ چند قصیدے ہیں کہ بڑھاپے کی ہمت کی برکت ہیں[2]۔" ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں کہ انھیں ذوق کا ہر قسم کا کلام دیکھنے کا موقع ملا۔ لیکن وہ خصوصاً اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ "مرثیہ سلام کہنے کا (ذوق کو) موقع نہیں ملا[3]۔" ذوق کے کسی بھی مطبوعہ کلام میں یہ مرثیہ نہیں پایا جاتا۔ حتیٰ کہ رام بابو سکسینہ[4] اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی[5] نے بھی اس جانب کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔

ذوق کا یہ مرثیہ انیس، دبیر، ضمیر، عشق وغیرہ کے مراثی سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں نہ چہرہ ہے نہ رجز، نہ رزم ہے نہ سراپا بلکہ صرف ایک بینہ روایت نظم کی گئی ہے۔ اس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں:-

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی مصنف دبستان دہلی

(۱) مرثیہ کی طرزِ ضمیر ابھی لکھنؤ کے حدود سے باہر نہیں نکلی تھی۔

(۲) جدید طرز کا پہلا مرثیہ میر ضمیر نے ۱۲۴۹ء میں کہا تھا جس کا اعلان انھوں نے خود اپنے ایک مرثیہ میں کیا ہے:

جس سال لکھے وصف یہ ہم شکل نبی کے — سنہ بارہ سو انچاس تھے ہجری نبوی کے
آگے تو یہ انداز سنے تھے نہ کسی کے — اب سب یہ مقلد ہوے اس طرزِ نوی کے
دس میں کہوں سو میں کہوں یہ زد ہے میرا
جو جو کہے اس طرز میں شاگرد ہے میرا[۵]

اس کے بعد اس طرز مرثیہ گوئی کو مقبول بنانے میں برسوں صرف میر ضمیر اور مرزا دبیر کوشاں رہے اور جب یہ طرز مقبول ہوگئی تو میر انیس مطلع پر ابھرے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ لکھنؤ میں مرثیہ کی اس نئی طرز کو مقبول بنانے میں دس گیارہ سال لگے ہوں گے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرثیہ کی طرزِ ضمیر کم از کم ۱۲۶۰ھ میں لکھنؤ میں مرثیہ کا دستورِ عام قرار پائی ہوگی۔ ذوق کا انتقال اس کے محض دس گیارہ[۱۱] سال بعد سن ۱۲۷۱ھ میں ہوگیا۔ ایسی حالت میں یہ بات قرین قیاس ہے کہ ذوق کو مرثیہ گوئی کی نئی لکھنوی طرز کا پورا پورا اندازہ نہ ہوا ہو، اور انھوں نے دلی کے پرانے مروجہ طرز میں ہی مرثیہ کہا۔

مخطوطے کا اجمالی تعارف

سائز "۱۲ × ۷½"، نمبر ۴۳۴۵، کتب خانہ مہاراشٹر کالج، بمبئی[۶]

اس مخطوطے میں کل بارہ مرثیے نقل ہیں۔ گیارہ مرثیے کتابت شدہ ہیں جن کے کاتب علیحدہ علیحدہ ہیں۔ صرف ذوق کا مرثیہ ایسا ہے جس پر کاتب کا نام درج ہے۔ ذوق کا مرثیہ نہایت صاف شستہ اور نستعلیق خط میں کتابت ہوا ہے۔ مراثی کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ مرثیہ: از: سلیس ۱۴۲ بند ۷۔ مرثیہ: از: ذوق ۴۵ بند۔ کاتب میر محمد جان
۲ " " تعشق ۱۵۲ " ۸ " میاں نظیر اکبرآبادی ۴۴ " مطبوعہ مطبع مرتضائی آگرہ ۱۸۸۴ء / ۱۳۰۱ھ
۳ " " عشق ۲۹ " ۹ " سعد ۱۱۳ "
۴ " " عشق ۵۷ " ۱۰ " شہرت ۳۴ "
۵ " " عشق ۳۰ " ۱۱ " ولایت ۳۳ "
۶ " " برق ۳۰ " ۱۲ " بحر ۴۹ "

اس طرح مخطوطے میں شامل مراثی کے بندوں کی مجموعی تعداد ۵۷۷ اور اشعار کی مجموعی تعداد ۱۲۲۷ ہوتی ہے۔ مرثیہ ذوق کے چند منتخب بند ملاحظہ ہوں:

ابتدا: (۱)

جب اربعینِ سبط پیمبر قریں ہوا
اور طول قید عزتِ سلطانِ دیں ہوا
افزوں ملالِ زینب اندوہگیں ہوا
بولی کہ آہ طورِ رہائی نہیں ہوا
اس سے زیادہ اب مجھے صدمہ بڑا نہیں
ابتک ہے میرے بھائی کا لاشہ گڑا نہیں

(۲)

وہ میرا بھائی دامن زہرا میں جو پلا
تن اس کا اوس میں رہا اور دھوپ میں جلا
گردونِ دوں نے ڈالی ہے مجھ پر عجب بلا
دیکھوں بندھا ہے رہتا ہے کبتک مرا گلا
تیجا نہ ہونے پایا تھا کہ اس سمت آ گئیں
اور فاتحہ بھی بھائی کا کرنے نہ پائی میں

(۳)

سجاد بولے اے جگرِ بنتِ مصطفےٰ
مدت ہوئی کہ گڑ چکا لاشہ حسین کا
مقتل پہ معجزے سے میں زنداں سے تھا گیا
تم سے بیاں کروں میں مفصل وہ ماجرا
تم بی بیوں سے کہدو نہ آہ و فغاں کریں
وہ حالِ دفنِ شہ سنیں اور ہم بیاں کریں

---

۱ آبِ حیات: محمد حسین آزاد، لاہور ص ۴۸۰ ۲ آبِ حیات: محمد حسین آزاد، لاہور ص ۴۷۱ ۳ تاریخ ادبِ اردو: رام بابو سکسینہ دہلی ۴ ذوق؛ سوانح و انتقاد از ڈاکٹر تنویر احمد علوی، مجلس ترقی ادب لاہور ۵ اردو مرثیے کا ارتقاء: ڈاکٹر مسیح الزماں لکھنو: ص ۲۵۴ تا ۲۵۶ ۶ مرثیہ نظیر اکبرآبادی بھی نہایت نایاب ہے۔ اس کا تعارف بھی کسی موقع سے پیش کیا جائے گا۔ (نور السعید)

اس کے بعد سید سجاد کی زبانی امام حسینؑ کے دفن کا حال بیان کیا گیا ہے۔ دوران بیان امیر شام کا ایلچی آیا اور اس نے سید سجادؑ سے کہا کہ امیر نے آپ کو اور آپ کی پھوپھی کو دربار میں بلایا ہے اس کے جواب میں امام نے کہا:

(۱۵)

سجاد نے سنا جو یہ اوس شخص کا کلام
فرمایا میرے سمت سے حاکم کو دے پیام
مجھ کو اگر بلائے تو آؤں میں تشنہ کام
زینب پھوپی کے آنے کا کیا اوس جگہ ہے کام
اون کے وہاں بلانے سے کچھ فائدہ نہیں
کس طور سے وہ آئیں کہ سر پر ردا نہیں

اس کے جواب میں امیر شام نے کہلوایا کہ تنہا زین العابدین ہی آئیں۔ چنانچہ جب آپ دربار میں پہنچے تو امیر نے اپنے برابر انھیں بٹھایا اور قیدیوں کو رہا کرنے اور لوٹ کا مال واسباب واپس کرنے کی بات کہی۔ یہ سن کر زین العابدین کی جو کیفیت ہوئی اسے یوں بیان کیا گیا ہے:

(۳۱)

یہ سن کر روئے خوب سا سجاد خستہ جان
رو کر کہا پھوپی میں کروں تم سے کیا بیان
دیتا ہے سارا لوٹ کا اسباب بدگمان
کہتا ہے میں نہ دونگا سرِ شاہ تشنہ کان
شدت سے حال غیر ہے مجھ ناتوان کا
جس طرح ہوگا لونگا میں سر بابا جان کا

(۳۲)

زینب یہ سن کے بولی کہ بیٹا یہہ کیا کیا
دیتا اگر نہیں وہ سر شاہِ کربلا
پھر کیا حصول قید سے گر کر دیا رہا
حاشا مجھے رہائی کی خواہش نہیں ذرا
بھائی کے سر کو چھوڑ کے خواہر نجائیگی
زینب نجائیگی میری دلبر نجائیگی

(۴۲)

روے پھوپی کی باتوں سے سجاد نامور
کہنے لگے یہہ بنت علی سے بچشم تر
دربار میں چلو تو خدا پر رکھو نظر
ممکن نہیں ملے نہ تمھیں شاہ دین کا سر
ایسا نہیں کہ میں رشتۂ الفت کو توڑ دوں
جاؤں وطن کو اور سرِ شبیر چھوڑ دوں

(۴۳)

یہہ کہکے آیا گود میں سجاد کے وہ سر
منہ منہ پہ رکھہ کے خوب سا رویا وہ نوحہ گر
زینب کو پھر دیا سر سلطانِ بحر و بر
کہنے لگا کہ لو پھوپی اماں ملے پدر
غصے جو مجھ کو دیکھا تو تشریف لائے ہیں
بابا حسین آپ محبت سے آئے ہیں

(۴۴)

زینب نے پایا جبکہ سر سید زماں
دربار سے چلی سوی زنداں وہ خستہ جاں
آئی جو قیدخانہ میں کرتی ہوئی فغاں
دکھلا کے سر حسین کا سب سے کیا بیاں
دیکھو دوا ے درد جگر لے کے آئی ہوں
لو بی بیو میں بھائی کا سر لیکے آئی ہوں

(۴۵)

دیکھا سر حسین تو سب روئیں بی بیاں
اتنے میں آیا لوٹ کا اسباب بھی وہاں
ہمراہ لے کے اہل مصیبت کا کارواں
راہی ہوئی وطن ہوئے سجاد نیم جاں
اے ذوق اب وہ حال نکہہ شور و شین کا
جس طرح سے کہ دفن ہوا سر حسین کا

کاتب میر محمد جان عفی عنہ

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

شوکت پردیسی

ہاں! یاد ہے اب تک مجھے گزرا ہوا کل
خوابوں کا وہ گلزار، امیدوں کا محل
اک ہاتھ میں تھا عشرتِ ماضی کا ایاغ
اک ہاتھ میں تھا میرے تمہارا آنچل

پھولوں کو تبسم کی لطافت دے دو!
شاخوں کو لچکنے کی نزاکت دے دو!
ہر چیز عطا کر دو گلستاں کو مگر
تم مجھ کو فقط اپنی محبت دے دو!

کب چاند ستاروں پہ نظر جاتی ہے
کب ہوش کو دیوانگی بہکاتی ہے
کیا جانے وہ مفلس کہ جسے فاقوں میں
پھولوں سے بھی روٹی کی مہک آتی ہے

ناکامی کا سوگ بن گئی ہے امید
کیا سنجوگ بن گئی ہے امید
پھر دل کی چتا میں جل رہا ہے وشواس
اک جان کا روگ بن گئی ہے امید

کھل اٹھتے ہیں سینے میں محبت کے کنول
مخمور بنا دیتا ہے اس کا آنچل
جب صبح کو چولھے میں جلاتی ہے وہ آگ
بیدار سا ہو جاتا ہے احساسِ عمل

جرأت ہو، تو دنیا سے بغاوت کرلو!
احساس کو بیگانۂ نفرت کرلو!
کیوں حرص کے مرگھٹ پہ سسکتے ہو تم!
انسان ہو اپنے سے محبت کرلو!

پھولوں کی تمنا کا صلہ کچھ بھی نہیں
کانٹوں سے بھی دامن کو ملا کچھ بھی نہیں
یوں میرے گلے میں تھیں کسی کی بانہیں
جب آنکھ کھلی، سامنے تھا کچھ بھی نہیں

کاکا کالیکر

گاندھی جی کی زندگی صفات کا اس قدر عظیم مجموعہ تھی کہ ان کے بارے میں کچھ لکھتے وقت کسی بھی شخص کا احساسِ کمتری کا شکار ہو جانا ایک قدرتی امر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ گاندھی جی کے میرے اوپر گہرے اثرات پڑے ہیں اور ان کی بدولت مجھے ثقافتی انقلاب میں حصہ لینے کے جو مواقع میسر آئے انھیں مدنظر رکھتے ہوئے ان کی عظمت کو تسلیم کرنا میری سعادت ہے۔

مہاتما گاندھی ــــ حالانکہ اس وقت ان کے لیے یہ الفاظ مروج نہیں ہوئے تھے، ۱۹۱۵ء کے اوائل میں بھارت میں قیام کرنے کے لیے آئے۔ وہ وقت ایک غیر معمولی اور عجیب وقت تھا۔

میری رائے میں طاقت کے بل پر آزادی حاصل کرنے کی ۱۸۵۷ء کی جدوجہد کی ناکامی کے بعد نئے بھارت کی داغ بیل ڈالنے کا کام شروع ہو چکا تھا۔ جامد اور بوسیدہ سماجی اور معاشرتی ماحول کے خلاف متشددانہ بغاوت کی یہ آخری منظم کوشش تھی۔ اس واقع کو مشکل سے ۲۵ یا تیس برس گزرے ہوں گے کہ انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی۔ اس کی پالیسی یہ تھی کہ راجاؤں پر تکیہ نہ کیا جائے اور نہ ان کی فوجوں کا سہارا لیا جائے بلکہ عوام کو بیدار کیا جائے اور ہندو مسلمان، پارسی عیسائی اور دیگر فرقوں کے لوگوں کو قوم پرستی کی بنا پر منظم کیا جائے، کیونکہ قومی بیداری کا یہی واحد راستہ تھا۔ اس طرح ایک نئے بھارت کا جنم ہوا اور یہی اس کا عہدِ طفلی تھا۔

قومی ایکتا

اس قومی تنظیم کے جنم داتاؤں نے قومی یک جہتی اور اس کے لیے تمام مذاہب کے ماننے والے لوگوں کی منظم کوششوں کی ضرورت کو محسوس کرایا تھا لیکن ان مذاہب میں سے کسی بھی مذہب کے پیروکاروں کو اس بات کا احساس نہیں ہوا تھا کہ اس ضرورت اور آدرش کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے ملک گیر سطح پر عظیم کوشش کی جانی چاہیے۔

گاندھی جی اس ماحول میں اس یقین کامل کے ساتھ داخل ہوئے کہ قومی اتحاد کی ضرورت کو محسوس کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان جماعتوں کے خلاف جدوجہد بھی کرنی چاہیے جو اس ایکتا اور اتحاد کی راہ میں رکاوٹ بن رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی تعمیری کاموں کے ذریعے قومی ایکتا کے موقف کو پوری شدومد کے ساتھ آگے بڑھانا چاہیے۔

ادھر ایک طرف ہم ہندستانی عوام ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں قوم پرستی کی روح پھونکنے کی کوششوں میں مصروف تھے تو دوسری طرف برطانوی حکمراں ایک ایسی برطانوی سلطنت قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے جس کا آفتاب کبھی غروب نہ ہو۔ دراصل اس خواب کو حقیقت میں ڈھالنے کی آرزو میں انھوں نے ۱۸۹۷ء میں نہ صرف انگلینڈ میں بلکہ بھارت میں بھی ملکہ وکٹوریہ کے عہد کی ڈائمنڈ جوبلی منائی۔

ان دنوں میں ۱۲ برس کا تھا اور سوراج کا ایک ہلکا سا تصور میرے ذہن میں تھا۔ میں نے سنا تھا کہ سوراج حاصل کرنے کے لیے ہم ہندستانیوں کو پوشیدہ سوسائٹیاں بنانی ہوں گی اور برطانوی سرکار کی بھارتی فوجوں میں بے اطمینانی پھیلانی ہوگی اور ملک میں طاقت کے ہر سلسلے کو اپنے قبضے میں کرنا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی تھا کہ ملک کی صنعتی ترقی کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں، اس لیے میں نے سودیشی تحریک میں حصّہ

ینا بھی شروع کر دیا تھا۔

لارڈ کرزن نے ۱۹۰۳ء میں دلی میں دربار کیا۔ برطانوی حکومت کی ایجادات اور اغراض و مقاصد کی خوب تشہیر کی گئی اور اس طرح اپنی حکومت کی طاقت کی دھاک بٹھائی گئی۔ تقریباً انہی دنوں گاندھی جی جنوبی افریقہ چلے گئے تاکہ بیرونی ملک میں بھارتی ثقافت کو ایک نئی زندگی در شکل و ہیئت دی جا سکے اور وہاں آباد بھارتی لوگوں کے اندر ایک نیا ولولہ پیدا کیا جائے۔

اب میں آپ کو بتاؤں کہ اس وقت میں نے گاندھی جی کے بارے میں کیا محسوس کیا۔ مجھے ان کے نقطۂ نظر سے ہمدردی ہونے کے ساتھ ساتھ اختلاف بھی تھا۔ اس وقت میں بھی بھارت کے دوسرے نوجوانوں کی طرح سوچتا تھا۔

ایک بار میں نے تلک سے ملاقات کی اور دوران گفتگو یہ خیال ظاہر کیا کہ "بھارتی معاشرے سے چھوت چھات کی بدعت کو ختم کرنے کے لیے ہمیں عوام میں پروپیگنڈا کرنا چاہیے۔ تلک نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو لیکن جب ہریجن منظم ہو کر میرے پاس آئیں گے تو میں ان سے تحریک آزادی کی حمایت کرنے کو کہوں گا اور ہم بھی چھوت چھات کی بدعت کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر ہم ان کو کچھ دیں گے تو ہمیں کچھ ملے گا بھی"۔ ہو سکتا ہے کہ الفاظ دوسرے ہوں مگر مفہوم کچھ ایسا ہی تھا۔ لیکن میرا جواب کچھ اور ہی تھا۔ میں نے کہا کہ اگر ہم نے اس سلسلے میں تاخیر سے کام لیا تو انگریز ہریجنوں کو فوراً اپنا آلۂ کار بنا لیں گے اور پھر اس سیاسی لین دین کا موقع کبھی نہیں آئے گا۔

میں تلک کے یہاں سے مایوس و نامراد لوٹ آیا اور خفیہ طور پر بندوق چلانا سیکھنے لگا۔ کچھ ہی دنوں میں میں اس فن کا ماہر ہو گیا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ حصولِ مقصد کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں بلکہ جنگ کے جدید طریقوں کی معلومات رکھنا بھی از حد ضروری ہے۔ بہرکیف اس تمام مدت کے دوران مجھے ایسی کوئی سیاسی جماعت یا قوت نظر نہیں آئی جس کا عوام پر بھرپور اثر نہ ہو۔ ہر پارٹی لوگوں میں اتحاد پیدا کرنے کی بجائے ان میں پھوٹ ڈالنے میں مشغول تھی۔

انقلابیوں میں ایسے جاں نثار اور بہادر افراد تو ضرور موجود تھے جو مادر وطن کی خاطر سر کٹانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے، لیکن وہ عوام میں بیداری پیدا کرنے سے قاصر تھے۔ جب مجھے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آئی تو میں نے ہمالیہ کی گود میں پناہ لی اور وہاں روحانی ریاضت میں مصروف ہو گیا۔ اس وقت میں سوامی وویکانند اور سری ا دند سے بہت متاثر تھا۔ بہر حال تمام سنتوں نے یکساں طور پر لوگوں کو دنیاوی امور سے بے نیاز ہو کر دوسری دنیا کی طرف دیکھنے کا ہی سبق دیا۔ سنتوں کے اپدیش، سوراج کے حصول کے لیے بھلا کیا کام آ سکتے تھے

میں ہمالیہ سے یہ احساس لیے لوٹ آیا اور قومی تعلیم کے فروغ کے لیے راہ بنانے کی غرض سے شانتی نکیتن چلا گیا۔ جب گاندھی جی بھارت آئے تو میں شانتی نکیتن میں تھا۔ میں نے ان سے ملاقات کی۔ انھوں نے میری بابت میرے دوست' بھائی کو توال سے دریافت کیا۔ گاندھی جی سے بات چیت کے دوران میں نے کہا:

"میں مانتا ہوں کہ روحانیت اور سادھوؤں کے مشرب میں عدم تشدد کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ بہ ظاہر ہے کہ عدم تشدد کے بغیر فرد کی نجات نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں عدم تشدد کو پسند کرتا ہوں۔ لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ عدم تشدد سے بھارت کو سوراج کیونکر مل سکتا ہے۔ گوروں کے لیے عدم تشدد پر مبنی تحریک کا سامنا کرنے کے بجائے جنوبی افریقہ میں بھارتیوں پر سے تین پونڈ کا ٹیکس ختم کر دینا فطری تھا لیکن بھارتی سلطنت برطانوی تاج کا سب سے روشن نگینہ تھا' اس لیے میں یقین نہیں کر سکتا کہ وہ اس نگینہ کو عدم تشدد پر مبنی احتجاج کے ہاتھوں جانے دیں گے۔ ملک کو ذہنی ثقافتی اور سیاسی غلامی سے چھٹکارہ دلانے کے لیے ہر طریقے کو استعمال کرنا ہو گا اور آخر میں ایک مسلح جدوجہد ناگزیر ہو جائے گی۔ میں آپ کی طاقت اور صلاحیت سے متاثر ہوں لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا آپ کا راستہ سوراج کی منزل کی طرف رہنمائی کرتا ہے"۔

دراصل میں نے گاندھی جی کو بتایا کہ:

"میں سوراج پہلے چاہتا ہوں چاہے اس کے لیے مجھے جہنم میں بھی جانا پڑے تو مجھے پرواہ نہ ہو گی۔ سوراج ملنے کے بعد جانکیہ کی طرح کوئی بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکتا ہے۔ لیکن

انگریزوں کو دیش سے نکالنے کے لیے مسلح جدوجہد کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

گاندھی جی جانتے تھے کہ میں نے ان کی تحریر پڑھی ہے میں جنوبی افریقہ کے واقعات کی تفصیل سے واقف تھا۔ انھوں نے صرف اتنا کہا:

"آپ میرے ساتھ آئیے۔ میں ایک آشرم کھولنے والا ہوں، آپ اس میں رہیے۔ میرے طریقۂ کار کو قریب سے دیکھیے۔ اگر آپ اسے درست سمجھیں تو قیام کریں نہیں تو آپ جا سکتے ہیں۔"

میں نے اپنی دلیل پر اصرار کیا:

"میں عدم تشدد کی قدر کرتا ہوں مگر اس کو میں نے اپنا مسلک نہیں مانا ہے۔ کیا آپ ایک ایسے آدمی کو اپنے آشرم میں رکھ لیں گے؟"

ان کے جواب نے مجھے جیت لیا۔ انھوں نے مسکرا کے کہا:

"میں آپ کے طرزِ فکر کو سمجھتا ہوں۔ آج آپ جیسے لوگوں کی دنیا میں اکثریت ہے۔ میں اقلیت میں ہوں۔ اگر میں بھی آپ کی طرح لوگوں کو ناپسند کرنے لگوں تو مجھے آدمی کہاں سے ملیں گے۔ یہ میرا کام ہے کہ اس عدم تشدد کی طاقت کے لیے آپ کے اندر یقین پیدا کر دوں۔"

اجتماعی رہائش

اس گفتگو کے بعد میں نے اپنے ایک قریبی دوست اور انقلابی جے۔ بی۔ کرپلانی کو تار دیا کہ وہ آ کر گاندھی جی سے ملیں۔ انھوں نے بھی گاندھی جی سے کافی طویل گفتگو کی۔ بات چیت کے دوران ایک مرتبہ کرپلانی جی نے کہا:

"میں تاریخ کا معلم ہوں۔ دنیا کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ جب کسی ملک نے عدم تشدد کے ذریعے آزادی حاصل کی ہو۔ جو کچھ آپ کہتے ہیں میں اپنے طلبا کو کیونکر پڑھا سکتا ہوں۔"

گاندھی جی نے حسب معمول جواب دیا:

"آپ تاریخ پڑھاتے ہیں اور میں تاریخ بناتا ہوں۔ جب ہم عدم تشدد کے ذریعے آزادی حاصل کر لیں گے تو تاریخ کے معلم اس پر لیکچر دیا کریں گے۔"

میری طرح کرپلانی جی بھی تبدیل ہو گئے۔ ہم دونوں اپنے اپنے انداز میں گاندھی جی کا کام کرنے میں مشغول ہو گئے۔

گاندھی جی کے آشرم میں نوکر نہیں تھے۔ وہاں نہ مذہب اور ذات کی کوئی تفریق تھی اور نہ جنس کی تفریق تھی۔ سب مل کر کھانے پکاتے، خود بانٹتے اور ساتھ بیٹھ کر کھاتے تھے۔ اسی طرح بیت الخلا کی صفائی بھی سب کو کرنا ہوتی تھی۔

ہم سب ساتھ مل کر تمام مذاہب کی پرارتھنائیں کرتے تھے۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں ہر مذہب، ذات اور فرقے کے لوگ جمع تھے اور جہاں ایک خاندان کے میل جول سے بھی زیادہ قربت تھی۔

دھیرے دھیرے عدم تشدد اور ستیہ گرہ کے ہتھیار کے موثر ہونے میں میرا عقیدہ پختہ ہوتا گیا۔ میں قائل ہو گیا کہ سوراج کے لیے سیاسی تیاریوں اور آزادی کے لیے قومی جذبے کو بیدار کر کے گاندھی جی ملک میں جذباتی ہم آہنگی کو فروغ دینے کا عظیم کام کر رہے ہیں۔

گاندھی جی نے سماج میں الجھنوں کو دور کرنے، مختلف گروہوں میں علیحدگی اور طرح طرح کے ادنیٰ مفادات کا خاتمہ کرنے اور آپس کے شک و شبہ کے تدارک کے لیے مہمیں شروع کیں۔

انھوں نے بڑی خاموشی سے کانگریس میں جو کہ ۳۰ برس سے قوم پروری کی خوبیوں کا چرچا کرتی آ رہی تھی، شمولیت اختیار کی اور اس کی شکل و صورت ہی بدل کر رکھ دی۔ اس تنظیم کو جس کا اجتماع ہر سال کرسمس کی چھٹیوں میں ہوتا تھا اور جس نے عوام کی مختلف دشواریوں سے حکومت کو آگاہ کیا تھا، انھوں نے ایک ملک گیر تنظیم میں تبدیل کر دیا۔

انھوں نے کانگریس کو ایسی تنظیم بنا دیا جو سال بھر سرگرم عمل رہنے لگی۔ انھوں نے اس تنظیم کی ایک ورکنگ کمیٹی بنائی جو سال بھر اس کے کام کی نگرانی کرنے لگی اور سوراج حاصل کرنے کے لیے تین شرطیں رکھیں:

(۱) سچے دل سے ہندو مسلم اتحاد پیدا کرنا (۲) چھوت چھات کا خاتمہ کرنا اور قبائلیوں کی فلاح و بہبود کا کام (۳) کھادی کی ایک مہم تاکہ کسانوں کو ایک گھریلو صنعت مل سکے اور وہ اپنی جزوی بے روزگاری کا خاتمہ کرنے کے ساتھ ساتھ خود مکتفی ہو سکیں۔

ان تین شرطوں کی بنیاد پر گاندھی جی نے قوم میں ایک نئی روح پھونک دی۔ بھارتی عوام میں ایک نئی زندگی کا احساس جاگا۔ انھوں نے ملک کے ہر دل عزیز رہنماؤں کی پیروی کرنے کا منظم انداز سیکھا اور اس طرح تھوڑے دنوں میں سارا ملک سوراج کے لیے تیار ہو گیا۔

مل جل کر کام کرنا

ہر شخص اس کام سے واقف ہے جو گاندھی جی نے کانگریس کے ذریعے عوام کو بیدار کرنے کے لیے کیا۔ لیکن اپنے آشرموں میں بھارتی سماج کی صدیوں پرانی خامیوں کو جنھیں بھارتی تہذیب کا امتیازی نشان سمجھا جاتا تھا، ختم کرنے کا انتہائی اہم اور قابلِ قدر کام انجام دیا۔

جب آشرم کھلے گئے تو دن بھر کی روٹی کے لیے گاندھی جی صبح صبح خود بیٹھ کر گیہوں پیستے، میں بھی گاندھی جی کے ساتھ بیٹھنے لگا۔ باغیانہ خیالات رکھنے والے مہاراشٹر کے کچھ دوستوں نے میری طرف اشارہ کرکے کہا: "کاکا صاحب کو دیکھیے، کیسے بوڑھی عورت کی طرح گاندھی جی کے ساتھ بیٹھے ہیں اور گیہوں پیس پیس کر سوراج حاصل کر رہے ہیں۔"

ایسے لوگوں کو سمجھانے کے لیے ہم جو کچھ بھی کرتے، یعنی مل جل کر کام کرتے اور آشرم میں سماجی مساوات کا ماحول پیدا کرتے، اُسے وہ سمجھنے میں ناکام رہتے۔ مگر سوراج حاصل کرنے کے مقصد کے پیشِ نظر گاندھی جی کے لیے یہ کام بہت ضروری تھا۔ اس کے ساتھ ہی حالات نے بھی مدد کی۔

آج بھارت میں جمہوریت قائم ہے لیکن لوگ اس نئے نظام کی بنیادی روح سے نابلد ہیں۔ ہم مغربی ملکوں کے تجربے کی بنیاد پر کام نہیں چلا سکتے۔

جب لوگ یہ جان جائیں کہ ہمیں اپنی غلطیوں سے سبق لینا چاہیے تبھی ہم صحیح راستہ پا سکتے ہیں۔ اس راہ کی تلاش میں ہمیں یقین ہے کہ ہم گاندھی جی سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ہم نے انھیں اپنا ہادی اور رہنما مانا ہے۔

★

چندائن اور میناستونتی ـــ (صفحہ ۶ کا بقیہ)

چندائن اودھی بولی کی تصنیف ہے۔ اس میں چوپائی کی پانچ اردھالیوں کے بعد ایک دوہے کی ترتیب ہے۔ لیکن دوہوں میں کہیں پہلے یا دوسرے اور کہیں کہیں دونوں مصرعوں میں چوبیس کی جگہ اٹھائیس ماترائیں بھی آگئی ہیں۔ کتاب کے تمام مخطوطے اردو رسم الخط میں ہیں اور ہر بند کا عنوان فارسی میں دیا ہوا ہے۔ مثلاً چندائن کے پہلے بند کا عنوان ہے "آمدن لورک بر در اُو جہیتم و سلام کردن" اور آخری یعنی ۴۶ویں بند کا عنوان ہے "طالع سعد نمودن سرجن از رفتن لورک وطنِ قدیم خود۔" اسی طرح ڈاکٹر ماتا پرشاد گپت کی نو رہ کتھا میں پہلے اور آخری یعنی ۸۰ ویں بندوں کے عنوانات بالترتیب "جواب دادن راؤ روپ چند رپھولاں را" اور "کیفیت مینا گفتن سرجن بفراق حال..... نمودن" ہیں۔

چندائن کو اردو دنیا سے سب سے پہلے سید حسن عسکری نے اپنے مختلف مضامین کے ذریعے روشناس کرایا لیکن اردو میں چندائن ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔ اسی طرح غواصی کی میناستونتی بھی ہندی میں طبع نہ ہو سکی۔ اگر چندائن کو اردو میں اور میناستونتی کو ہندی میں صحیح متن اور ضروری حواشی کے ساتھ شائع کر دیا جائے تو یہ اردو اور ہندی کلاسیکی ادب کے تقابلی مطالعے کی جانب ایک قابلِ قدر اور کارآمد اقدام ہوگا۔

★

کبھی کا لکھنؤ

تسنیم فاروقی

آصف الدولہ کا یہ جنت نما شہرِ جواں
وادیٔ گلگوں میں دریائے مسرت ہے رواں

اپنی تاریخیں لیے مینار یہ تہذیب کے
آسماں جیسی یہ گلیاں یہ چمکتے راستے

یہ کھنڈر یہ کنگرے صدیوں کے یہ بوڑھے مکاں
اپنے سائے میں چھپائے ہیں وفا کی داستاں

یہ منقش طاق و درمحراب و خم، دیوار و بام
مسکرا کر اپنے سیاحوں کو کرتے ہیں سلام

اور ہوتی ہے فزوں تر لکھنؤ کی دلکشی
کیوں نہ پھر آنکھیں بچھائے راہ میں مہمان کی

موتیوں کے خوش نما سائے میں یہ شہرِ عروس
فرشِ مخمل پر اتر آیا ستاروں کا جلوس

قصرِ عالم میں مثالِ گلستاں پائندہ باد
یہ بہارِ زندگی کا کارواں پائندہ باد

ذکر کیا کیا کیجیے اس ارضِ پُرتاثیر کا
ہے یہ مہمان خانۂ غالب چمن ہے میر کا

ہر قدم بکھرا ہوا تازہ گلوں کا رنگ ہے
خود صبا اس بزم کی رعنائیوں پر دنگ ہے

ہر نفس شیشہ بہ شیشہ روشنی کا رقص ہے
شمعدانوں میں نگارِ زندگی کا رقص ہے

گو نئی دنیا میں دورِ زہرہ و مریخ ہے
پھر بھی یہ دلکش کرہ گہوارۂ تاریخ ہے

کیمیا کے غم میں تپتی ہے بظاہر خاک ہے
یہ وہ بستی ہے جہاں مٹی کو بھی ادراک ہے

اس کے ساکن علم و فن کی جھولیاں بھرتے رہے
آخری دم تک ہنر کی پرورش کرتے رہے

ناز ہے تاریخ کے اوراق کی ترتیب کا
ہر زمانے میں اسے دعویٰ رہا تہذیب کا

یہ شررؔ، چکبستؔ اور سرشارؔ کا اُجلا وطن
یہ انیسؔ و آتشؔ و ناسخؔ کا شائستہ چمن

غنچہ غنچہ پتہ پتہ پیار کا بکھرا ہے
گوشہ گوشہ سبزہ سبزہ عطر کا چھڑکاؤ ہے

اس کے فن کی انگلیوں میں حسن کا اعجاز ہے
صنعتیں ایسی ہیں جن پر صنعتوں کو ناز ہے

ذرّے ذرّے میں یہاں تنویر کا ابلاغ ہے
یہ کبھی کا لکھنؤ اب بھی شگفتہ باغ ہے

آوازیں جو الفاظ بن گئیں

محمد اسحاق صدیقی

آدمی اور جانور میں بڑا فرق ہے۔ جانوروں کی خاص خاص آوازیں ضرور ہوتی ہیں جن سے وہ جذبات کا اظہار کرتے ہیں لیکن وہ ہماری طرح باتیں نہیں کر سکتے۔ ایک جانور دوسرے جانور کی آواز کی نقل بھی نہیں اتار سکتا، سوائے چند مخصوص پرندوں کے جیسے طوطا اور مینا وغیرہ، جو کسی حد تک اس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن انسان میں یہ خوبی ہے کہ وہ نہ صرف ہر جاندار کی آواز بلکہ بے جان چیز سے پیدا ہونے والی آواز کی بھی نقل کسی نہ کسی حد تک ضرور اتار سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جو مختلف جاندار اور بے جان چیزوں سے پیدا ہونے والی آوازوں کی نقل ہیں، مثلاً ہماری زبان میں جانے پہچانے جانوروں کی آوازوں کے لیے یہ الفاظ ہیں: بھونکنا (کتے کی آواز) ہنہنانا (گھوڑے کی آواز) بلبلانا (اونٹ کی آواز) چنگھاڑنا (ہاتھی کی آواز) دہاڑنا (شیر کی آواز) چہچہانا (چڑیوں کی آواز) ٹرّانا (مینڈک کی آواز) بھنبھنانا (مکھیوں کی آواز)۔

بعض جانداروں کے نام ہی ان کی آوازوں پر رکھ لیے گئے ہیں جیسے: چیل، بلبل، پپیہا، بھونرا، بھنبھیری، جھینگر اور چھچھوندر وغیرہ۔

مور کو سنسکرت میں میور کہتے ہیں کیونکہ جب مور بولتا ہے تو اس کے گلے سے صاف 'میور' 'میور' کی آواز نکلتی ہے۔ کوّے کا نام اس کی آواز "کاؤں کاؤں" پر رکھا گیا ہے۔ اس آواز کو جس نے جیسا سنا ویسا ہی نام کوّے کا رکھ دیا مثلاً:

ہندی/اردو	سنسکرت	انگریزی	فارسی
کوّا	کاکا	کرو	کلاغ/زاغ

انگریزی میں پپیہے کو برین فیور برڈ (BRAIN FEVER BIRD) کہتے ہیں، کیونکہ جب پپیہا بولتا ہے تو انگریزوں کی سمجھ میں آتا ہے "برین فیور"... "برین فیور" (دماغی بخار) جبکہ ہمیں "پی کہاں"... "پی کہاں" کی آواز سنائی دیتی ہے۔

بعض الفاظ اُن آوازوں کی نقل ہیں جو ہمارے جسم سے خاص حالتوں میں پیدا ہوتی ہیں جیسے چھینکنا، تھوکنا، پھونکنا، کھانسنا، چومنا، چمکارنا، پچکارنا، ڈکارنا، بدبدانا، بڑبڑانا، سُڑکنا، بھنبھنانا، چچڑانا، تھپ تھپانا، چھینک، تھوک، پھونک، کھانسی، چمّا، ڈکار، ہچکی، خرّاٹا، غرارہ (غرغرہ) تھپڑ، طمانچہ وغیرہ۔

انسان نے بے جان چیزوں سے پیدا ہونے والی آوازوں کی جو نقل اتاری ہے اس میں پانی کا رِم جھم برسنا، ہوا کا سرسرانا، پتوں کا کھڑکھڑانا، ٹہنیوں کا چرچرانا، بادلوں کا گرجنا، بجلی کا کڑکنا، دل کا دھڑکنا، برتنوں کا کھنکنا، پروں کا پھڑپھڑانا، دروازے کا کھٹکھٹانا، دانتوں کا کٹکٹنا، کھانے کا کرکرانا وغیرہ شامل ہیں۔

اسی طرح کے بعض دوسرے الفاظ یہ ہیں:

جھنکار (زنجیر کی آواز) ٹن ٹن (گھنٹے کی آواز) ٹھن ٹھن (روپے کی آواز) بھک بھک (انجن کی آواز)، دھک دھک (دل کی آواز) گھڑگھڑاہٹ (چکی کی آواز) ڈھم دھم (باجے کی آواز) دھم دھم (گرنے کی آواز) چرمر (جوتے کی آواز) چرّ (کاغذ یا کپڑے کے پھٹنے کی آواز)۔

بعض بے جان چیزوں کے نام ان کی آوازوں پر رکھ لیے گئے ہیں جیسے: ڈھول، ڈھپلی، ڈگڈگی (ڈمرو)، بھونپو، پیپہری، جھانجھ

جُھنجُھنا، گھنگرو، ٹَرٹَر، پھٹ پھٹی، پٹاخہ، پچکاری، چِپل چِٹّی، کھٹ پٹی، کھڑاؤں، دَھونکنی، چھنی، مُرمُرے، گُدگُدے، کھٹیا، ببلبہ، چیٹی (آتش بازی اور ایک طرح کے بٹن) وغیرہ۔

اسی سلسلے کا ایک دلچسپ لفظ ہے خشخاس۔ پستے کو اگر ہلایے تو جھنجھنے کی سی آواز آتی ہے جو خش خش سے مشابہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کے بیجوں کا نام خش خش (ہندی کھس کھس) یا خشخاش پڑگیا۔ فارسی میں خشخشہ کاغذ اور نئے کپڑے کی کھرکھراہٹ یا اس کے پھٹنے کی آواز کو کہتے ہیں۔

اگر کسی چیز کو کاٹیے تو "کٹ" کی آواز آتی ہے۔ دنیا کی بہت سی زبانوں میں کاٹنے کے معنی رکھنے والے الفاظ اسی آواز سے نکلے ہیں۔ آیئے پہلے ہم اپنی زبان میں اس آواز کی مختلف صورتیں دیکھیں:

(۱) کُٹ ترُ۔ سامنے کے دانتوں سے کسی چیز کو کاٹنے کی آواز (۲) کَٹا مچھلی پکڑنے کا کانٹا، سیفٹی پن (۳) کٹیلا۔ کانٹے دار (۴) کُٹّی۔ گنڈاسے سے کٹا ہوا باریک چارا (۵) کٹوتی۔ ایک سکّے کو دوسرے سکّے سے بدلنے میں جو کمی ہو (۶) کَرَدا۔ آٹا پیوانے میں جو حصّہ کم ہو اور اُسے کاٹ لیا جائے (۷) کترانا۔ گھوم کر جانا، ٹیڑھا چلنا (۸) کترنا۔ قینچی سے کاٹنا، چھانٹنا، تراشنا (۹) کترن۔ کاغذ، کپڑا یا پان کا ٹکڑا جو کاٹنے کے بعد بچ جائے اور بیکار ہو (۱۰) کترنی۔ قینچی (۱۱) کتّل۔ اینٹوں کے کٹے ہوئے ٹکڑے۔

"کٹ" سے یہ الفاظ بھی نکلتے ہیں:

(۱۲) کُوٹ۔ کوٹنے سے چیز کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں گویا وہ کٹ جاتی ہے (۱۳) کوچی۔ دیوار پوتنے کے لیے کوٹ کر بنائی جاتی ہے (۱۴) کانٹا۔ جہاں چبھ جاتا ہے، وہاں کی کھال کاٹ دیتا ہے (۱۵) کانچ۔ اس کے چُبھنے سے کھال کٹ جاتی ہے (۱۶-۱۷) قینچی، چاقو۔ کاٹنے کے آلے اور (۱۸) چاک۔ کاٹنا۔

انگریزی میں کٹ (CUT) کے معنی ہیں "کاٹنا" اور کٹر (CUTTER) کے معنی ہیں "کاٹنے والا"۔ آخری لفظ ہندی میں کٹار (خنجر) ہے اور فارسی میں کتارہ۔ اسی سے فارسی لفظ کارد بنایا گیا جس کے معنی چھری ہیں

بعض آوازیں آپس میں بدل جاتی ہیں جیسے چ ٹ سے بدل جاتا ہے اور ٹ ت یا ش سے۔ فارسی کا ایک لفظ ہے کُش۔ یہ کُٹ یا کَٹ کی بدلی ہوئی صورت ہے جیسے خودکُشی "خود کو مار ڈالنا"۔ اس کی اصل کُشتن[1] ہے (کُشت وخون کے معنی ہیں "مار کاٹ")۔ اس کی دوسری شکل کِشتن ہے جس کے معنی کھیتی کے ہیں۔ (کِشت کے معنی ہیں "کھیت") غالباً اِس کے معنی پہلے ہل چلانے کے تھے اور ہل جس طرح زمین کو کاٹتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اسی طرح کُشادن کے معنی کھولنے کے ہیں مثلاً نقاب کشائی یعنی "نقاب کھولنا" اور کھولنے اور کاٹنے کا تعلق بھی ظاہر ہے۔

سنسکرت میں کرِشی (कृषि) کے معنی "پھاڑنے" اور "ہل چلانے" کے ہیں۔ یہ لفظ فارسی خراشیدن (چھیلنا)، کشادن، کُشتن اور کِشتن سے تعلق رکھتا ہے۔ انگریزی الفاظ کلیش (CLASH) اور کریش (CRASH) بھی اس سے رشتہ رکھتے ہیں۔ ان کے معنی ہیں "ٹکر"۔ کرَش (CRUSH) بھی اسی طرح کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "کچلنا"۔ کراس (CROSS) + کا تعلق کاٹنے سے ظاہر ہے۔ کرِس کراس (CRISS CROSS) "کٹا کُٹا" کو کہتے ہیں۔ کرسٹ (CRUST) بہ معنی "چھلکا" بھی انھیں الفاظ سے رشتہ رکھتا ہے۔

عربی میں قطع، قَصّ اور قَصب کے معنی "کاٹنے" کے ہیں۔ قُطّاع "کاٹنے والے" کو کہتے ہیں۔ قص ہی سے لفظ قصائی (گوشت کاٹنے والا) نکلا ہے۔ قِصاص "خون کے بدلے" کو کہتے ہیں۔ غالباً قصُوی (انتہا، آخر) قَضا (تمام کرنا، موت) قضیہ (جھگڑا) بھی اسی طرح کے الفاظ ہیں۔ قصب سے لفظ قَصّاب (بہ معنی قصائی) نکلا ہے۔ کاٹنے سے چونکہ کسی چیز کے حصے یا ٹکڑے ہو جاتے ہیں لہٰذا کاٹنے کی آواز سے یہ الفاظ بھی بنائے گئے: قسم (حصہ، نوع) کسر (توڑنا، حصہ، ٹکڑا) اس آخری لفظ سے قَسر (بزور کسی سے کام لینا)، اور قِشر (چھال،

---

[1] جیسے اردو ہندی الفاظ کے آخر میں نا لگایا جاتا ہے مثلاً کھیلنا، کودنا، ہنسنا، رونا۔ اسی طرح فارسی میں دن یا تن لگاتے ہیں۔ دن یا تن فعل کی علامت ہے، جن الفاظ کے آخر میں تن یا تن آتا ہے انھیں مصدر کہتے ہیں۔

کھال) وغیرہ اخذ کیے گئے۔

اب ذرا ان الفاظ پر غور کیجیے:

(قط) سخت چیز کا کاٹنا جیسے قلم کا قط	(قتل) ہتھیار سے مارنا یا کاٹنا
(قطر) سیدھی لکیر جو دائرے کے دو برابر حصے کرے	(قیط) کسی چیز کا ٹکڑا
(قطرہ) بوند یا سیال شے کا ذرا سا حصہ	(قسط) ظلم کرنا، بے انصافی
(قطار) صف جس میں چیزیں ٹکڑوں کی حیثیت رکھتی ہیں	(قساوت) بے رحمی، سخت دل ہونا۔

ان کے علاوہ خط، ختنہ اور ختم کا تعلق بھی کاٹنے سے ظاہر ہے۔
خار (کانٹا) خارق (پھاڑنے والا) خراط یا خراد (چرخ پر چڑھا کر لکڑی کو صاف کرنا) خراش (چھلنا) خارش (کھجلی) اور خلش (چبھنا) وغیرہ الفاظ بھی اسی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔
ترکی میں کاٹنے کو کسمک کہتے ہیں۔ اس سے مک (علامتِ مصدر) کو علاحدہ کر لیجیے تو کس بچے کا جو کٹ کی بدلی ہوئی صورت ہے۔
دنیا کی مشہور زبانوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوا کہ ان میں کاٹنے کے معنی میں جو الفاظ پائے جاتے ہیں، وہ کٹنے سے پیدا ہونے والی آواز سے ماخوذ ہیں۔ اگر آپ دنیا کی ناپید اور اجنبی زبانوں کے لغات کا جائزہ لیں تو وہاں بھی آپ یہی صورت پائیں گے۔ چنانچہ قدیم مصری زبان میں خت کے معنی تھے "کاٹنا"۔ عراق کی قدیم زبان سمیری میں کُڈ کے معنی تھے "علاحدہ کرنا"۔ چینی میں کت کے معنی ہیں "کاٹنا" اور نیوزی لینڈ کی مادری لوگوں کی زبان میں کوٹی کے معنی ہیں "کاٹنا"۔ پیرو کی زبان میں کوٹو کے معنی تھے "تاگے کو دانت سے توڑنا" اور میکسکو کی زبان میں کوکوتا کے معنی تھے "کاٹنے والا"۔

★

ذوق کا ایک نایاب مرثیہ (صفحہ ۱۰ کا بقیہ)

اس مخطوطے کی فراہمی کے سلسلے میں راقم الحروف کتب خانہ بہار اشتر کالج کی لائبریرین مس خدیجہ وکیل کا ممنون ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مخطوطہ قدیم طرزِ تحریر میں ہے مثلاً بھوبھی کی جگہ "بھوبی"، اُس کی جگہ "اوس"۔ ان کی جگہ "اون"، رکھو کی جگہ "رکہو"، غصے کی جگہ "غصی"، بہر کی جگہ "بہیر"، دِکھلا کی جگہ "دکہلا"، سُوے کی جگہ "سوئی"، نہ کہہ کی جگہ "نہہ" وغیرہ۔

غزل

نسیم اجمل

طلوعِ صبحِ نظر، شامِ فکرِ ذات ہوں میں
ازل سے تا بہ ابد پیکرِ حیات ہوں میں

فروغِ ذوقِ نظر رونقِ حیات ہوں میں
نمودِ عکس میں حسنِ تجلیات ہوں میں

پیامِ فکر و عمل رمزِ کائنات ہوں میں
مٹا سکا نہ جسے وقت ایسی بات ہوں میں

قبائے ذات ہوں تعمیرِ صفات ہوں میں
دیارِ فکر میں تفسیرِ کائنات ہوں میں

گزرتا جاتا ہوں لحہ بہ لحہ ہستی سے
مرا ثبات یہ کہتا ہے بے ثبات ہوں میں

پگھل گئے مرے اندر ہزارہا سورج
کہ ظلمتِ شبِ ہستی کی واردات ہوں میں

ہجومِ خندۂ طوفاں نہ کہہ سکا جس کو
کھلی ہوئی لبِ ساحل پہ ایسی بات ہوں میں

مہک رہا ہوں ہواؤں کی زد میں آ آ کر
کہ صحنِ زیست میں یک غنچہ صفات ہوں میں

میں فرشِ سبز پہ لیٹا ہوں اوس کی صورت
نگاہِ درد کا محرومِ التفات ہوں میں

واہ فرقت صاحب!

جنوری ۱۹۷۴ء میں
غلام احمد فرقت کاکوروی
کی پہلی برسی کے موقع پر

ساغر مہدی

آل انڈیا ریڈیو نے ۱۴ر جنوری ۱۹۷۳ء کی صبح کو اپنے اردو بلیٹن میں یہ خبر نشر کی کہ "پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی آج صبح مغل سرائے اسٹیشن پر ٹرین کے ایک ڈبہ میں مردہ پائے گئے۔ اور چلتے چلاتے اس سماج اور نظام کیسا بھرپور طنز کر گئے۔ پانچ بچوں، بیگم، دوسرے عزیزوں اور ہزاروں دوستوں، جاں نثاروں کے ہوتے، لاوارث قرار پائے اور چندہ سے بنارس کے قبرستان میں دفن کر دیئے گئے۔ فرقت صاحب جھریا (بہار) کے ایک مشاعرہ میں گئے تھے۔ دھن باد سے سیالدہ ایکسپریس کے ذریعہ لکھنؤ آتے ہوئے (پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق) مغل سرائے ریلوے اسٹیشن پر حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔

فرقت صاحب اگرچہ بزرگوں میں تھے مگر ہمیشہ دوستوں کی طرح ملتے۔ یوں تو فرقت صاحب سے بارہا ملاقاتیں رہیں۔ مختلف مشاعروں ادبی اجتماعات، کانفرنسوں اور نجی محفلوں میں ہمیشہ چاق و چوبند مسکراتے اور قہقہے لگاتے ہوئے۔ وہ جتنے اچھے طنزاً نگار تھے عام زندگی میں بھی اتنے ہی شگفتہ اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔

امین آباد کی ایک شام ہے۔ چوراہے پر ایک مشہور ہوٹل کے سامنے شمیم کرہانی صاحب کے ساتھ کھڑے ہیں، جو بھی شناسا نظر پڑتا بہت تپاک اور بے تکلفی سے گردن میں بانہیں ڈال دیتے، سینے سے لگاتے، خیر و عافیت دریافت کرتے اور اس کے اصرار پر ہوٹل میں جاتے جلدی جلدی پرچ میں چائے انڈیل کر پیتے اور پھر چوراہے پر آکر کھڑے ہو جاتے شمیم صاحب کھڑے کھڑے بور ہو رہے ہیں۔ آخر فرقت صاحب پر برس پڑے۔ فرقت صاحب نے ایک قہقہہ لگایا "اماں! آدابِ فقیری سے بھی ناواقف ہو۔"

ایک شعری نشست میں ایک شاعر نے مطلع عرض کرنے سے پہلے فرقت صاحب سے پوچھا: "فرقت صاحب کیا سناؤں۔" فرقت صاحب کی رگ ظرافت پھڑکی فرمایا: "اماں! وہ غزل سناؤ جو بلند شہر کے تحصیلدار نے بہت پسند کی تھی۔"

لکھنؤ سیتا پور روڈ پر ان کو ۲ بیگھے زمین مل گئی تھی۔ ایک روز لکھنؤ میں ملے تو زمین کا ذکر کیا اور کہنے لگے "بھیا لکھنؤ سیتا پور روڈ پر تقریباً ۲ بیگھے زمین مل گئی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کاشتکاری کا ارادہ ہے۔ مگر یہ بتایئے، ۲ بیگھے کتنی زمین ہوتی ہے؟" میں نے کہا: "۲ بگہ ہوتی ہے۔" "آخر ہوتی کتنی ہے؟" "امین آباد کے برابر ہوگی"۔ بولے "خیر کافی زمین ہوئی۔"

یہ تو یاد نہیں کہ فرقت صاحب سے پہلی بار کب ملاقات ہوئی۔ مگر اس موقع پر ان کا جملہ ابتک یاد ہے۔ کسی صاحب نے میرا تعارف کرایا تو ایک خاص انداز سے مسکراتے ہوئے آگے بڑھے، گلے سے لگایا اور کہنے لگے: "جناب! آپ کی لوگوں نے اس قدر تعریف کی ہے کہ آپ کی صورت سے نفرت ہوگئی۔"

سال گزشتہ گرمیوں کی تعطیلات کا زمانہ تھا۔ میں میڈیکل کالج سے بہت سخت لو اور دھوپ میں اپنے کسی عزیز کی عیادت کے بعد واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک جگہ اچانک آواز آئی "اماں!

لکھنؤ ہی میں رہتے ہو۔؟ یہ فرقت صاحب تھے۔ نہایت بے تکلفی اور تپاک سے ملے۔ کہنے لگے "رکشہ چھوڑ دو راماں! اس دوپہر میں کہاں مارے مارے پھر رہے ہو۔" اپنے مکان پر لے گئے اور اپنی ایک عزیزہ کو آواز دی۔ یہ غالباً ان کی بہن تھیں۔ کہنے لگے۔ ایک جگ میں پانی لاؤ۔ پانی آیا تو تابڑ توڑ تین چار گلاس اصرار کرکے مجھے پلوایا۔ بولے "میاں! لو لگ گئی تو ٹیں ہو جاؤ گے۔ ایک گلاس اور پی لو۔" میں نے تعمیل حکم میں ایک آخری گلاس بھی جگ سے انڈیل لیا اور فرقت صاحب قہقہے لگاتے ہوئے شربت کا انتظام کرنے چلے گئے۔ اتفاق سے رشید صاحب آ گئے (سید رشید احمد جن کا حال ہی میں انتقال ہو گیا۔ ان کے کئی مضامین آجکل، نیا دور، اور معارف میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں) فرقت صاحب کی قیام گاہ پر ان سے پہلی اور آخری ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت وہ محکمۂ پولیس سے تعلق رکھنے والے اردو ادیبوں اور شاعروں پر کوئی کتاب لکھنے کی دھن میں تھے۔ ان کو بھی فرقت صاحب کی طرح عمر رسیدہ ہونے کے باوجود بے حد مصروف اور نوجوانوں کی طرح چاق و چوبند پایا۔ لو، دھوپ اور سخت ترین موسم کے باوجود وہ گلستان کالونی سے سائیکل پر آئے تھے۔ دبلے پتلے، نحیف و نزار جسم پر سفید سوٹ اور فیلٹ کیپ، ایک لمبا سا رجسٹر سائیکل کے کیریر میں لگا ہوا اور ہاتھ میں پنسل۔ آتے ہی فرقت صاحب سے کسی پولیس آفیسر شاعر پر گفتگو شروع کی۔ فرقت صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں بولنا شروع کیا۔ "اماں قسم قرآن کی دورانِ ملازمت محکمۂ پولیس میں اس شان سے تفتیش بھی نہ کی ہوگی جس طرح ریٹائر ہونے کے بعد آپ ادب میں تحقیق کر رہے ہیں۔"

پندرہ اگست ۱۹۶۷ء کو آزادی کے جشن سیمین کے موقع پر لال قلعہ دہلی کے مشاعرہ میں گیا تو اردو بازار میں اچانک فرقت صاحب مل گئے۔ اس طرح ملے جیسے کوئی عزیز ترین بزرگ خاندان ملتا ہے۔ میں شرمندہ ہوتا رہا کہ ان کے گھر پر حاضری کیوں نہ دی۔ وہ شکوہ و شکایت کا دفتر باز کیے رہے۔ حالی پبلشنگ ہاؤس کے قریب ایک چائے خانے میں کچھ دیر نشست رہی اور شام کو مشاعرہ میں ملاقات کا وعدہ کرکے رخصت ہو گئے۔ لال قلعہ میں عجیب اتفاق رہا کہ ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ دوسرے روز میں صبح آسام میل سے واپس چلا آیا۔ دو تین روز کے بعد ان کا خط ملا جس میں ملاقات نہ ہونے کی شکایت اور افسوس کا اظہار تھا۔ دلی جیسے مشینی شہر میں بھی یہ اخلاق و وضعداری فرقت صاحب کا حصہ تھی۔ ان کے اندر ایک قصباتی خلوص اور وضعداری رچی بسی تھی۔

کئی سال گذرے آموں کا موسم تھا۔ اخگر مشتاق صاحب نے اپنی قیام گاہ مینگو ولاج رحیم آباد میں آم اور غالب کے سلسلے کا کا ایک جلسہ منعقد کیا۔ حسن اتفاق سے میں بھی لکھنؤ میں تھا۔ پروگرام بن گیا۔ پروگرام کے مطابق صبح کو ہم لوگ ایک جگہ جمع ہوئے۔ پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم، پروفیسر نسیم قریشی، امین سلونوی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، عبدالاحد خاں خلیل، احمد جمال پاشا، مولانا شمس اور فرقت صاحب ایک بے حد خستہ حال اسٹوڈی بیکر کے ذریعے رحیم آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ فرقت صاحب میرے قریب کی سیٹ پر بیٹھے اس موٹر کے متعلق سوچ رہے تھے۔ میں نے پوچھا فرقت صاحب کیا سوچ رہے ہیں۔ بولے میں غور کر رہا ہوں کہ یہ گاڑی زیادہ قدیم ہے یا آم اور غالب۔ مختصر یہ کہ راستے بھر اپنی شگفتہ گفتگو اور لطیفوں سے ماحول کو قہقہہ زار بنائے رکھا۔ کبھی کبھی دو تین منٹ کے لیے سنجیدہ ہو جاتے اور ڈائری نکال کر کچھ نوٹ کرتے جاتے۔ راستے میں کاکوری بس اڈہ آیا فرقت صاحب نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے مکان وغیرہ کے بارے میں بتایا اور ڈائری نکال کر جلدی جلدی پھر کچھ نوٹ کرنے لگے۔ رحیم آباد پہنچنے پر فرقت صاحب کے بار بار ڈائری میں کچھ نوٹ کرنے کا راز کھلا۔ معلوم ہوا کہ راستے میں وہ آم اور غالب کے موضوع پر مضمون کی تیاری میں مصروف تھے۔ رحیم آباد پہنچتے ہی وہ ایک گوشہ میں بیٹھ کر مضمون مکمل کرنے لگے جس کا خاکہ راستہ میں تیار کر لیا تھا اور جسے آم اور غالب کی محفل میں انھیں سنانا تھا۔ مختصر یہ کہ فرقت صاحب ذہنی طور پر ہمیشہ تخلیقی عمل سے گذرتے رہتے تھے اور شور و غل نیز ہنگاموں

کے باوجود ان کی توجہ تخلیقی عمل سے بے سمت نہ ہوتی تھی۔

غلام احمد فرقت کاکوروی ۱۹۱۴ء میں اپنی فطری ولادت سے دو ماہ قبل کاکوری کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ حضرت محسن کاکوروی ان کے جدامجد تھے۔ پانچ چھ سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ کو دربار رام پور سے پندرہ روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ اس قلیل رقم میں بھائی بہنوں کی گزر بسر نہ کوئی اثاثہ نہ جائیداد۔ ابتدا میں اردو فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ میں گورنمنٹ حسین آباد ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ سویرے سے ۹ بجے تک اسکول جانے سے قبل لکھنؤ کے گلی کوچوں میں آواز لگا کر "حقیقت" اخبار فروخت کرتے۔ اس طرح چار آنہ یومیہ کمیشن مل جاتا تھا۔ اسکول میں لڑکے آوازے کستے اور مذاق اڑاتے۔ یکم محرم سے عشرہ تک راجہ بازار میں تعزیے ہدیہ کرتے اور اس طرح آٹھ دس آنے یومیہ مل جایا کرتے۔ اس عرصے میں شعرو شاعری کا ذوق بھی پیدا ہوا اور حضرت آرزو لکھنوی کے فیضِ صحبت نے ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ ان کی پہلی غزل ۱۹۲۷ء میں "آفتاب اخبار" سنبھل میں شائع ہوئی جس کا مطلع تھا:

ہچکیاں آئیں تو ہے حکم کہ فریاد نہ کر
آپ تو یاد کریں ہم سے کہیں یاد نہ کر

اسی دوران معین الادب کے نام سے ایک ادبی انجمن کی بنا ڈالی۔ جس کے صدر حضرت آرزو لکھنوی تھے۔ ۱۹۳۱ء میں ایف اے پاس کیا اور حقیقت اخبار کے مدیر معاون ہو گئے۔ اس طرح جو اخبار کبھی گلی کوچوں میں پھیری لگا کر فروخت کرتے تھے اسی اخبار میں جوائنٹ ایڈیٹر کی جگہ ان کا نام آنے لگا۔ اب اس اخبار میں خبروں کے علاوہ مزاحیہ کالم بھی ان کے سپرد کر دیا گیا۔ لکھنؤ سے اسی زمانے میں "گلابی ہیرا" کے نام سے ایک طویل افسانہ شائع ہوا جو مشترکہ طور پر خواجہ عبدالروف عشرت، فدا علی خنجر، بہزاد لکھنوی، فضل لکھنوی، ہدف اجتہادی، اکبر علی ایم۔ اے اور فرقت کاکوروی کے زورِ قلم کا نتیجہ تھا۔ اس عرصے میں ان کے کئی افسانے بھی ریاست دہلی اور اودھ اخبار لکھنؤ میں شائع ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں فرقت صاحب راجہ صاحب کرٹ کے پرائیوٹ سکریٹری مقرر ہو گئے۔ مگر جلد ہی اس جی حضوری سے نجات حاصل کر لی اور استعفیٰ دیدیا۔ اب تعلیمی سلسلہ پھر شروع کیا اور لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ اس عرصے میں انگریزی اخبار کریسنٹ میں بھی کام کیا۔ ۱۹۳۷ء میں صداقت ہفتہ وار کے نام سے خود اپنا اخبار جاری کیا۔ مگر دو سال کی مدت پوری کر کے وہ اخبار بھی بند ہو گیا۔ کچھ دن بیکار رہے۔ آخر ایک جرمن انشورنس کمپنی میں ایجنٹ ہو گئے۔ ۱۹۳۸ء میں کریسنٹ بھی بند ہو گیا۔ اردو اخبارات کی حالت پہلے ہی خراب تھی۔ آخر فرقت صاحب اردو اخبارات کے مستقبل سے مایوس ہو کر کسی اور مشغلے کی تلاش میں نکل پڑے۔ پرائیوٹ طور پر ایک ٹیلرنگ شاپ سے رجوع کیا۔ کٹنگ کا کام سیکھ لیا۔ شاہجہان پور کی کلودنگ فیکٹری میں سپروائزر کی جگہ خالی ہوئی اور فرقت صاحب ملازم ہو گئے۔ مگر یہ کام بھی ان کے مزاج پر بار رہا۔ ہاتھ پیر مارتے رہے۔ میونسپل بورڈ شاہجہاں پور میں کلرکی کی ایک جگہ خالی تھی۔ فرقت صاحب نے درخواست دی اور نوکری مل گئی۔ ۱۹۴۰ء میں شادی ہوئی اور اس کے فوراً بعد لکھنؤ سکریٹریٹ میں ملازم ہو گئے۔ بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی سے پرائیوٹ ایم۔ اے کیا۔ کچھ دنوں کانپور کے ایک کالج میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ پھر دلّی چلے گئے اور وہاں دلّی کالج سے وابستہ ہو گئے اور اسی کے ہو رہے۔

اپنی زندگی اور حالات کے بارے میں فرقت صاحب نے کہیں لکھا تھا "میری زندگی کیا ہے ایک آزاد نظم ہے، جس میں نہ قافیہ ہے نہ ردیف، نہ پابندیاں ہیں نہ بندشیں، نہ کیف ہے نہ سرور ہے۔ ایک لنگڑی کسر کا سا سوال ہے جو منفی سے شروع ہوتا ہے۔ پھر بریکٹ آتے ہیں۔ پھر مثبت اور منفی کے نشانات ہیں اور آخر میں بڑے بڑے اعداد ہیں جو دور تک ایک دوسرے سے ضرب ہوتے چلے گئے ہیں۔ اس کٹھن کسر کے سوال کے شروع

(بقیہ صفحہ ۲۶ پر)

کلیمہ تسنیم

سالِ نو

ہر گئی شام کے بعد اک فاصلہ
صبح بن کر قریں اور قریں آرہے ہے
از افق تا افق رنگ پھیلائے ہے

اور نیا سال پھر
مطلع فکر پر اب کے روشن ہوا
جھلملاتی ہوئی سی لکیروں میں پھر
عکس، روپ اور رنگ
ٹوٹتے، ڈوبتے اور ابھرتے ہوئے
ذہن کی سطح پر رقص کرنے لگے
صفحۂ قرطاس پر رنگ بھرنے لگے

دوستو! جشنِ خورشید کا اہتمام
سالِ نو، زندگانی سے لبریز جام

صلیب، آئینہ اور میں

سلمان رضوی

وہ ایک نقطہ، وہ ایک لمحہ، وہ اک ہیولا
جو آئینہ تھا حسین و رنگیں
جو زندگی کے سیاہ پتھر پہ اجالی صبحوں کا ہمسفر تھا
نہ جانے کیوں،
جانے کس جگہ پر
اک اجنبی موت مر گیا ہے۔
وہ آئینہ جس میں عکس ہے حسین قصاں رہے تھے برسوں
وہ آئینہ جس میں سرسراتے تھے سرخ آنچل
وہ آئینہ جس میں زندگی کی ہر اک تمنا جواں تھی۔
وہ آئینہ جس کے سبزہ زاروں میں مسکراتے تھے شوخ چہرے
وہ آئینہ جو کہ رازداں تھا مری محبت کے ہر نفس کا
وہ آئینہ جس میں مسکراتی تھیں زندگی کی حسین قدریں
وہ آئینہ جس میں ماں کی شفقت کا عکس روشن چمک رہا تھا
وہ آئینہ جو کہ بھائی بہنوں کا پیار بن کر مہک رہا تھا
وہ آئینہ جس کے آنگنوں میں تیں گھٹنیوں چل کے زندگی کی
عظیم راہوں پہ عصرِ نو کا نقیب بن کر،
سحر کی خاطر بھٹک رہا تھا۔
وہ آئینہ آج زندگی کے سیاہ پتھر پر
اک اجنبی کی شبیہہ بن کر
عدم شناسی کی خونیں کرنوں کا بوجھ اوڑھے
حیاتِ نو کا مسیح بن کر
سیہ صلیبوں پہ جھولتا ہے
وہ ایک نقطہ وہ ایک لمحہ، وہ اک ہیولا جو آئینہ تھا
وہ آئینہ آج مر چکا ہے
مگر سجائے ہوئے ہیں اب تک

بدن پہ اپنے سیہ صلیبیں
سیاہ نقطوں پہ چل رہا ہوں
خود آگ میں اپنی جل رہا ہوں

افسانہ

دلوں کے فاصلے

لیلیٰ لکھنوی

شبانہ اور احمر کے درمیان جو فاصلے آ گئے تھے وہ معمولی فاصلے نہ تھے بلکہ دلوں کے فاصلے تھے۔ ایسے فاصلے جو مرنے کے بعد ہی مٹتے ہیں، زندگی میں نہیں مٹتے

زندگی کی ہر سانس ان فاصلوں کو اور وسیع کرتی چلی گئی۔ وہ اپنے دل کے زخموں اور ناسوروں کو چھپائے زندگی کی تلخیوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ کا پردہ ڈالے حقیقت سے آنکھیں چراتا رہا، اندھیرے میں روشنی کی کرن ڈھونڈتا رہا، زندگی سے فرار کی کوشش کرتا رہا ــــ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی کوششوں میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوا۔ اس نے شراب کی تلخی میں اپنی زندگی کی محرومیوں اور تلخیوں کو ڈبونا چاہا۔ کچھ لمحوں کے لیے اس کو ان قطروں نے بے پایاں جرأت بھی دی، غموں کو برداشت کرنے کی قوت بھی بخشی، ہمت اور خود اعتمادی بھی عطا کی، بس ان "چند لمحوں" میں اس کو دنیا کی ہر شے پر قدرت حاصل ہو جاتی۔ زندگی کی تلخیاں، دنیا والوں کی بے مہری، ان کے طنز، چبھتے ہوئے فقرے، ناکامیاں، خستگی و ماندگی سب کچھ اس کی ٹھوکر پر ہوتے ــــ مگر نشہ اترنے کے بعد غموں کے سائے اور گہرے ہو جاتے۔ وہ اندر ہی اندر سلگتا رہتا ــــ شمع کی طرح خاموش پگھلتا رہتا۔

لوگ اس کو اس کی حسین و جمیل بیوی شبانہ کے نام سے زیادہ جانتے تھے، جو ہر بزم، ہر محفل کی رونق تھی جس کے حسن و جمال نے سیکڑوں کے خرمنِ عقل و ہوش پر بجلی گرائی تھی، جس کی ایک نگاہ غلط انداز کا نشانہ بننے کے لیے دل و جگر پیش کرنے والے ہزاروں ہی بیتاب نظر آتے، جس کے تہر ساماں تبسم اور کافر اداؤں نے کتنوں کو بسمل بنایا تھا۔ وہ چلتی تو فضائیں جھوم اٹھتیں۔ وہ ہنستی تو پھول مسکرانے لگتے۔ اس کے ترکش کا تیر کبھی رائیگاں نہیں گیا ــــ اس کو جو بھایا اس پر چھا گئی، جس سے نفرت کی اس کو فنا کر دیا!! اور وہ احمر! ــــ وہ ہمیشہ کا کم سخن، مہر بہ لب، گوشہ نشین، کتابوں کا کیڑا، دبلا پتلا، ویران سا!!

وہ اس کی شرعی بیوی ضرور تھی، اور بس۔ وہ اس کے گھر میں رہتی بھی تھی۔ اپنے نام کے ساتھ اس کا نام بھی لکھتی تھی۔ دن میں کسی نہ کسی وقت ان کا ایک دوسرے سے سامنا بھی ہو جاتا تھا۔ کبھی رسمی گفتگو بھی ہوتی تھی۔ وہ اگر کبھی موڈ میں ہوتی تو اسے دوستانہ مشورہ بھی دیتی تھی کہ "اس کی صحت گرتی جا رہی ہے، اسے اپنے سینے کا اکسرے کرا لینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے اس کے پھیپھڑے خراب ہو رہے ہوں۔ اُسے سگریٹ قطعی چھوڑ دینا چاہیے۔" اس کے ماسوا وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ احمر سے زیادہ اس کی بیوی کے بارے میں اس کے دوست جانتے تھے کہ آج کل اس کو کن چیزوں کا شوق ہے۔ اسپتال میں کون کون سے کیس زیادہ سنگین ہیں، اس کے نئے اور پرانے پرستاروں میں آج کل کس کا نام سرِ فہرست ہے جس کے قدموں کی آہٹ ہی سے شبانہ کے چہرے پر فروغ مے کی درخشانی کا دھوکا ہونے لگتا ہے اور اس کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں۔

کبھی اگر دبی زبان سے کوئی کہتا کہ "شبانہ کو لوگ ڈاکٹر نہیں مسیحا کے لقب سے پکارتے ہیں کیونکہ اپنے ڈاکٹری کے پیشے کی پرخلوص لگن سے مریضوں کو شفایاب کرنے کے علاوہ اپنے پیار و محبت سے اس نے نہ جانے کتنے ٹوٹے دلوں کو جوڑا ہے اور کتنوں ہی کو قربت کی بھیک

لیونڈ بریژنیف
سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سکریٹری جنرل

سوویت یونین کے رہنما کا دورۂ ہند

مسٹر بریژنیف ہندستان کے پانچ روزہ دورے پر ۲۶ نومبر کو دہلی پہنچے۔ ہوائی اڈے پر اور دہلی میں ان کا تاریخی استقبال ہوا۔ وزیر اعظم ہندستان کے چار روز کے مفصل مذاکرات کے بعد ایک پندرہ سالہ معاشی اور ثقافتی تعاون کے معاہدے پر دستخط ہوئے۔ روسی رہنما کو وزیر اعظم ہند، مرکزی وزرا، سفارت خانوں کے اراکین اور دیگر معززین نے ہوائی اڈے پر گرم جوشی کے ساتھ الوداع کہی
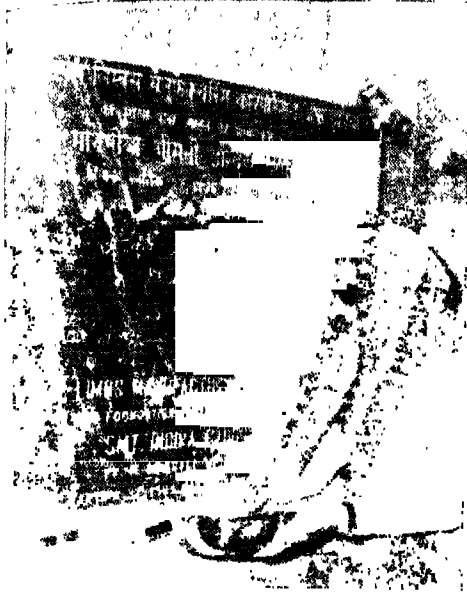
شریمتی اندراگاندھی آئی۔آئی۔ٹی کانپور کے احاطے میں مصنوعی اعضا کے کارپوریشن کی عمارت کا ۱۸رنومبر ۱۹۷۳ء کو سنگ بنیاد رکھتے ہوے۔

وزیر اعظم شریمتی اندراگاندھی دریاے گومتی پر جنہیٹ (ضلع لکھنؤ) کے قریب تعمیر ہونے والے "اندراگاندھی سیتو" کا ۱۷رنومبر ۱۹۷۳ء کو سنگ بنیاد رکھتے ہوے
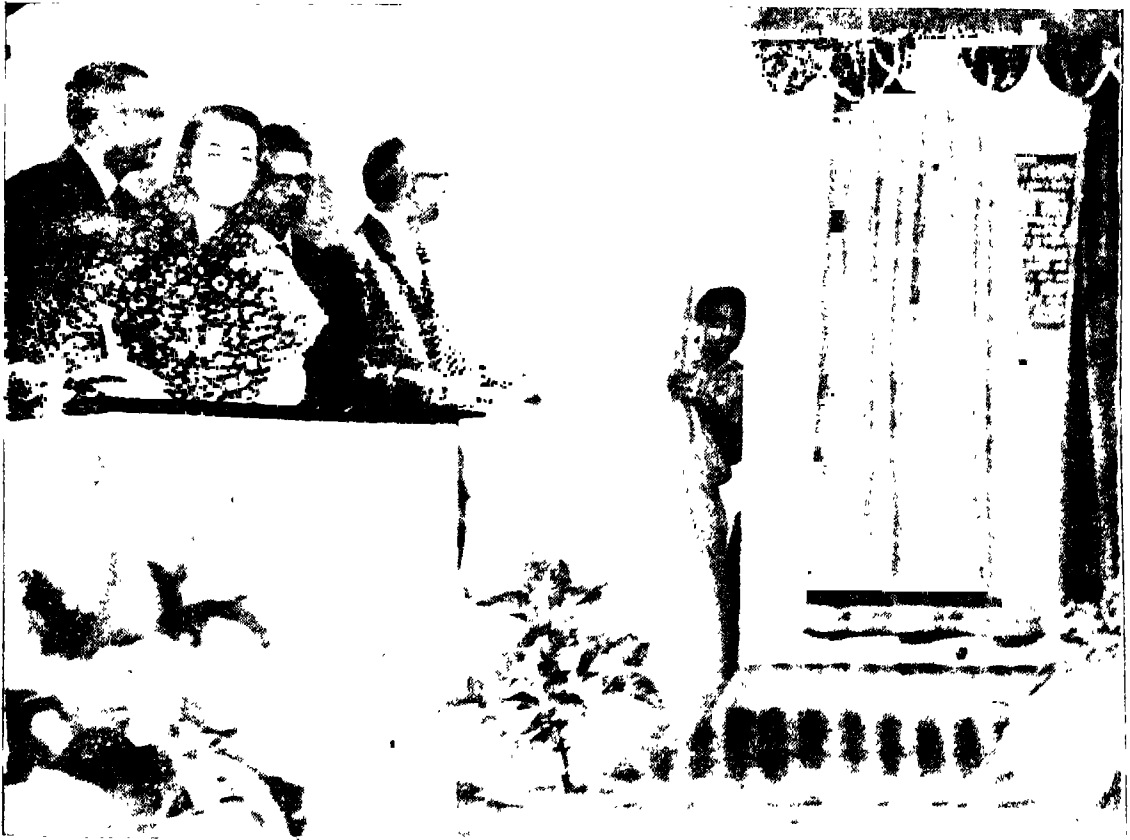
شریمتی اندراگاندھی ۱۷رنومبر ۱۹۷۳ء کو لکھنؤ بارہ بنکی روڈ پر ہندستان ایروناٹکس لمٹیڈ کا افتتاح کرتے ہوے

لکھنؤ کے سنٹرل اسپورٹس اسٹیڈیم پر
۲۶ نومبر ۱۹۷۳ء کو ہونے والے خواتین
کرکٹ میچ کے آغاز سے پہلے سکریٹری و ڈائریکٹر
محکمہ اطلاعات شری شرد منی شرما کا کھلاڑیوں
سے تعارف

کرکٹ میچ کا ایک منظر

مس، دلی اور سمستی پور کے درمیان ۳۱ اکتوبر ۱۹۷۳ء
سے چلائی جانے والی نئی جینتی جنتا ایکسپریس ٹرین
کے ایک کمپارٹمنٹ کا اندرونی منظر
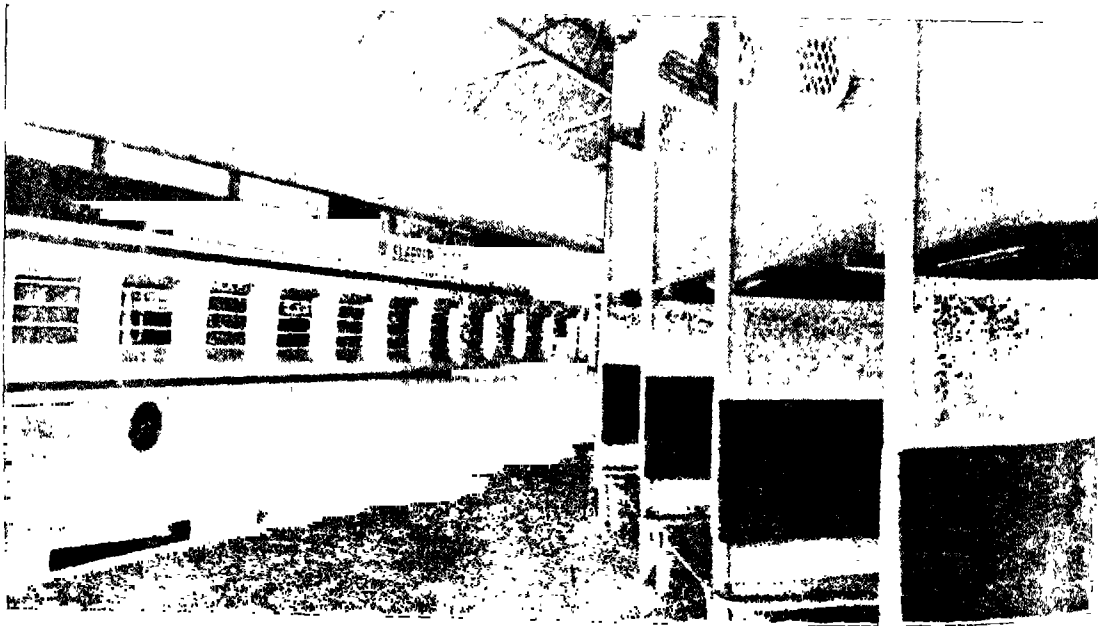
ہر ہائی نس پرنس کریم آغا خاں اور ہر ہائی نس بیگم آغا خاں ۲۱ نومبر ۱۹۷۳ء کو نئی دہلی میں
وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ساتھ
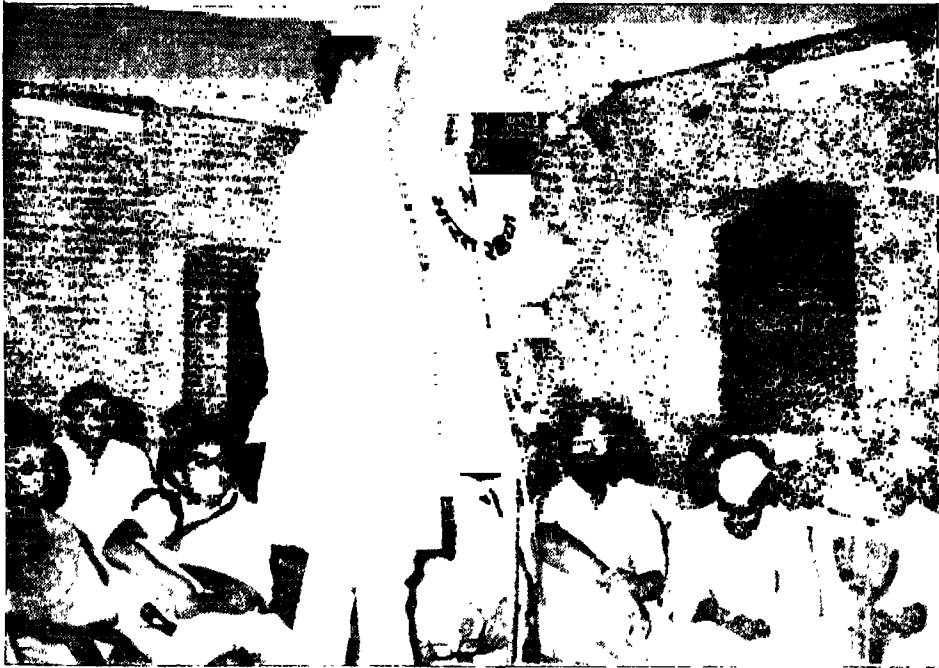
وزیر اعلیٰ بہار شری عبد الغفور ۳۱ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو کانپور میں اقلیتی
کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے

دی ہے" تو احمر کے ہونٹوں پر تلخی کا زہر پھیل جاتا۔ جیسے اس نے سچ مچ زہر کا کوئی گھونٹ پی لیا ہو۔

وہ سب کی نگاہوں سے بچنے کے لیے اور خلوت نشین ہوگیا۔ شراب سے اس نے اپنا ناطہ جوڑ لیا۔ بے خودی کے وہ لمحات جن میں وہ دنیا کی ہر شے کو ٹھکرا دیتا تھا، جیسے اسے موت پر بھی اختیار حاصل ہوجاتا تھا اس کی زندگی کا عزیز ترین سرمایہ بن گئے ـــ وہ دنیا سے دور تنہائیوں میں گم ہوتا چلا گیا۔

اور شبانہ اسی قدر جلوت آرا ہوگئی۔ اس کے عشق و محبت کے قصے دور دور تک پھیلتے چلے گئے ـــ اور احمر تنہائیوں میں انگاروں پر جلتا رہا ـــ

اس شہر میں جیسے صرف شبانہ بستی تھی، صرف شبانہ ـ اور احمر کا وجود، اس کی اہمیت اس شہر میں، اس گھر میں صرف اتنی تھی کہ وہ شبانہ کا شوہر تھا۔ یہی ایک لیبل جیسے اس کی پیشانی پر لگا تھا اور باہر مکان کے گیٹ پر ایک بیحد قیمتی نیم پلیٹ لگی تھی جس پر بڑے بڑے پیتل کے چمکتے ہوئے حرفوں میں لکھا تھا:

ڈاکٹر شبانہ احمر ایم بی بی ایس۔

جب وہ کسی چھوٹے سے بچے کو اپنے باپ کی گود میں دیکھتا تو کوئی شے ایک دھماکے کے ساتھ اس کے دل کے اندر ٹوٹ کر بکھر جاتی اور اس کے ریزے اس کے جسم میں پیوست ہوجاتے ـــ

اُسے بار بار یہ خیال ستاتا کہ اس کا وجود مٹ چکا ہے اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں۔ یہ خیال انگارے کی طرح اس کو جلا ڈالتا۔

آج سے چند سال پہلے جب اس کی شادی ہوئی تھی تو شبانہ ایسی نہ تھی۔

سہاگ رات کو جب اس نے اس کا چہرہ دیکھا تھا تو اس پر بیحد معصومیت و پاکیزگی تھی اور وہ سہمی ہوئی اس کے سینے سے لگی رو رہی تھی۔ اس کے حُسن نے اس پر بجلی گرا دی تھی۔ اس کی قربت کی آنچ سے پگھلنے لگا تھا۔

شادی کے کچھ عرصے بعد شبانہ کو میڈیکل کالج میں نوکری مل گئی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کے طریقے بدلنے لگے۔ وہ چراغ خانہ کی بجائے شمع محفل بن گئی...... اس کے اور احمر کے درمیان ایک لکیر سی پڑ گئی۔ پھر یہ لکیر بڑھتے بڑھتے خلیج بن گئی۔ کبھی کبھی وہ رات گئے اسپتال سے واپس آتی کبھی کسی سنگین کیس یا فوری آپریشن کے بہانے رک بھی جاتی تھی۔ اس کا گھر جس میں وہ رہتا تھا اس کے رقیبوں سے آباد رہنے لگا اور وہ پردہ نشین ہوگیا۔ اس کو اپنے وجود سے نفرت سی ہونے لگی۔ جب کبھی وہ اپنے نئے ساتھی سے اس کو ملواتی "MEET MY HUSBAND — یہ میرے شوہر مسٹر احمر ہیں" اور وہ اپنا دُبلا پتلا ہاتھ آگے بڑھاتا اور وہ گرم جوشیلا مضبوط ہاتھ اس کے ہاتھ کو اس طرح تھام لیتا جیسے وہ ہاتھ کسی بچے کا ہو تو احمر احساس کمتری کے بوجھ کے نیچے دبتا چلا جاتا ـــ اور کئی بار اس نے اسی مضبوط ہاتھ کو شبانہ کے مرمریں ہاتھ کو تھامے دیکھا تھا۔ ذرا ذرا سے عذر اور بہانے پر اس کا ہاتھ شبانہ کے جسم کو چھو جاتا۔ کبھی کبھی وہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں اس طرح لے لیتا جیسے اس نے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا عہد کر لیا ہو۔ احمر کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی۔ خون کھول جاتا۔ اگر اس کی غیرت نے احتجاج کرنے کی جرأت بھی کی تو شبانہ بگڑ کر کہتی:

"تم میری پوزیشن، اہمیت، مقبولیت اور میرے ساتھیوں سے جلتے ہو، حسد کرتے ہو کیونکہ تم ایک ناکام انسان ہو۔ نہ تم اپنی نوکری میں ترقی کرسکے نہ زندگی میں کسی کو متاثر کرسکے۔ تم پہلے بھی پروفیسر تھے اور آج بھی وہی ہو۔ شاید تمھاری صلاحیت پر کائی جم گئی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمھاری طرح میں بھی گمنامی کے غار میں دفن ہوجاؤں۔ اگر تمھیں میرے دوست ناپسند ہیں تو تم ان سے نہ ملو، ان کے سامنے نہ آؤ۔ لیکن تمھاری وجہ سے میں اپنی نوکری یا اپنے ساتھیوں کو تو نہیں چھوڑ سکتی۔ ہاں! اگر کہو تو میں یہ گھر چھوڑ دوں"

اس دن کے بعد سے اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس گھر میں اس کا اپنا کچھ بھی نہ تھا۔ نہ شبانہ اس کی تھی، نہ گھر اس کا تھا، نہ وہاں کی کوئی شے اس کی تھی۔ جیسے وہ زبردستی اس کے راستے میں حائل ہوگیا تھا ـــ جیسے وہ ایک آؤٹ سائیڈر، ایک اجنبی یا کوئی غیر تھا جو بغیر بلائے اس کی محفل میں آدھمکا تھا جسے کوئی جانتا بھی نہ تھا۔

اس رات اس نے بے حد پی ـــ اتنی پی کر اس کا جسم بوجھل اور سُن ہوگیا۔ مگر وہ بیتا رہا جیسے اس نے عہد کر لیا تھا کہ آج کی رات

وہ اس قدر پیے گا کہ پھر کبھی اُسے ہوش نہ آئے، پھر کبھی شبانہ کے جلے تیر و نشتر بن کر نہ چبھیں۔ کبھی اس کی نگاہیں شبانہ کی نفرت و حقارت سے لبریز نگاہوں سے چار نہ ہوں جو پکار پکار کر اس سے کہہ رہی تھیں:

"تم ایک بوجھ ہو۔ ایک مصیبت ہو۔ ایک ناکام انسان! تمھیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ دنیا میرے لیے ہے۔ اس میں میں بستی ہوں، صرف میرا نام پکارا جاتا ہے۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے تمھاری ضرورت نہیں ہے۔"

اور وہ تڑپ اٹھا۔ وہ حسب معمول مکان کی چھت پر چلا گیا تھا.......................... اور وہیں اکیلے بیٹھا پیتا رہا تھا..... رات گئے گیٹ کے پاس ایک بڑی سیاہ چمکتی ہوئی کار آکے رکی ـــــ اس نے گردن اٹھا کر دیکھا کوئی خوبصورت مرد سیاہ پتلون، سفید قمیص، سیاہ بو لگائے باہر نکلا۔ اس نے نہایت پھرتی سے آگے کی سیٹ کا دوسرا دروازہ کھولا ـــــ اس میں سے سیاہ شفون کی ساڑی پہنے شبانہ نکلی...... کس قدر حسین لگ رہی تھی وہ۔ اس کی نگاہوں میں یکبارگی کئی بجلیاں کوند گئیں۔ جیسے زندگی میں پہلی بار اس نے اس کے حسن، اس کی رعنائیوں کو دیکھا ہو ـــــ پہلی بار۔

اس کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں ہو رہا تھا۔ شبانہ اس مرد کے شانے پر سر رکھے اُسے "شب بخیر" کہہ رہی تھی اور اس کا "محبوب" اس کی جدائی کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ اس کو اپنی بانہوں کی گرفت میں جکڑے کھڑا تھا، جیسے اس سے التجا کر رہا ہو کہ "کچھ لمحے اور میری بانہوں میں یونہی مچلتی رہو۔ کچھ دیر اور اس خواب کو حقیقت بنا رہنے دو۔ کچھ دیر اور میری جان!"

اور وہ چھت پر کھڑا اس منظر کو دیکھتا رہا۔ پھر یکبارگی اس کی غیرت جاگ اٹھی۔ ایک بار پھر اس کا خون کھولنے لگا۔ ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ وہ زور سے چیخا "بدمعاش۔ غنڈے! آج تجھے زندہ نہ چھوڑوں گا۔ تو نے میرا گھر برباد کر دیا۔ میری عزّت لوٹ لی.....

اس کے ہاتھ سے بوتل اور گلاس چھوٹ کر نیچے ایک چھناکے کے ساتھ چکنا چور ہو گیا اور اسی کے ساتھ وہ خود نیچے آ رہا۔ ایک لمحے کے لیے گہرا سناٹا چھا گیا۔ نہ کہیں کوئی نغمہ تھا، نہ دھن..... نہ صدا...

شبانہ نے گھبرا کر دیکھا کہ فرش پر شیشے کے ٹکڑوں پر اختر کا جسم تڑپ رہا تھا... خون سے موزیک کا فرش گلنار ہو رہا تھا اور اس کی سرخی ان فاصلوں کو مٹاتی چلی گئی۔

★

واہ فرقت صاحب (صفحہ ۲۲ کا بقیہ)

میں منفی کا نشان"۔ یہ تھی فرقت صاحب کی زندگی۔ زندگی کو فرقت صاحب نے جس قدر قریب سے دیکھا، جھیلا اور برتا، ان کے معاصرین میں کم لوگوں کو یہ سعادت نصیب ہوئی ہوگی۔ زندگی ہو یا ادب انھوں نے یہ منزل اپنی ذاتی جد و جہد، عمل پیہم، خلوص سچائی اور دیانتداری سے سر کی۔ سماجی، معاشرتی اور ادبی دنیا میں وہ جو کچھ بھی تھے۔ بلا شرکت غیرے، تن تنہا۔ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر وہ بلا تکلف SELF MADE کہے جا سکتے ہیں۔ آنسوؤں کے اس بازار میں قہقہوں کا بیوپار کرنے والے فنکار نے مدادا سے قد جھے تک اپنی طنزیہ تحریروں کے ذریعے جس چابکدستی اور ہمدردی کے ساتھ ادب میں بے راہ روی اور ہیّجی رجحانات یا ٹیڈی ازم کے خلاف اصلاحی رخ اختیار کیا، وہ بہر حال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ نہ کبھی جدیدیت کے خلاف رہے نہ ترقی پسندی کے دشمن۔ ہاں انتہا پسندی اور بے مقصد تحریروں کے مخالف ضرور تھے۔ انھوں نے خود کئی جدید نظمیں لکھیں جو ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی گئیں۔

★

فسانۂ عجائب

سرور کا ناکام کارنامہ

اشتیاق احمد لاری

فسانہ عجائب سرور کی اولین ادبی کوشش ہے، یہ کتاب اپنی بعض گوناگوں خصوصیات، متضاد کیفیات، بیشمار خوبیوں اور ان سے زیادہ ہزاروں خامیوں کے باوجود آج بھی ادبی دُنیا میں ایک مستقل اور قابلِ تعریف مقام رکھتی ہے۔ اس کتاب نے سرور کو دُنیائے ادب سے روشناس کرایا اور اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے سامنے سرور کی دوسری تصنیفات کا چراغ نہ جل سکا۔

ادبی ماحول ۔ دبستان لکھنؤ کا قدیم نثری سرمایہ فسانہ عجائب کی تالیف کے وقت کسی قابلِ ذکر نثری تالیف سے خالی تھا۔ سرور نے جس وقت فسانہ عجائب لکھنے کا قصد کیا اس وقت لکھنؤ میں شعر و شاعری کا عام چرچا تھا، اُمرار اور شاہان اودھ بھی نثر کی طرف سے آنکھیں بند کیے شعرگوئی اور شعرار کی قدر افزائی کی طرف متوجہ رہے۔ فسانہ عجائب کی تالیف کے وقت سرور کے سامنے اس عہد کی اُردو نثر کی سب سے زیادہ دلپذیر اور مقبول عام کتاب قصہ چہار درویش یا باغ و بہار تھی جس کے مصنف نے اپنی زبان اور اسلوب کے ذریعے لافانی شہرت حاصل کر لی تھی۔ سرور نے فسانہ عجائب لکھتے وقت اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا کہ فسانہ کا اسلوب بھی ایسا ہو جو شہرت و مقبولیت حاصل کر سکے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ فسانہ عجائب اسلوب، طرزِ تحریر اور فنِ داستان گوئی کے لحاظ سے رجب علی بیگ کا ناکام کارنامہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرور نے فارسی ادب کے مُردہ اسلوب کو ایک مرتبہ پھر زندہ کرنے کی کوشش کی اور اس میں ایسی رنگ آمیزی کی کہ اس کی چمک تقریباً تیس سال تک محسوس کی جاتی رہی لیکن اسلوب اور طرزِ تحریر میں سرور سے جو کوتاہیاں اور غلطیاں ہوئیں اس کی وجہ سے انشا پردازی اور داستان گوئی کے میدان میں انھیں کوئی بلند مرتبہ نہیں دیا جا سکتا۔

باعث تحریر اجزائے پریشاں ۔ سرور نے یہ فسانہ بڑی زوارروی اور محض دوستوں کی دلبستگی کے لیے شروع کیا تھا۔ ایک جگہ فسانہ عجائب کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"ایک روز چند دوست صادق جمع تھے اور زمانے کی نیرنگی اور فلک کی کج روی اور دوں نوازی کا تذکرہ تھا۔ سب دل گرفتہ سینہ ریش اور اُداس تھے کہ کسی دوست نے فرمایا کہ اس وقت کوئی قصہ یا کہانی بہ شیریں دہانی ایسا بیان کرکہ رفع کدورت اور جمعیت پریشانی طبیعت ہو اور غنچہ سربستہ دل باہر از نسیم تکلم کھل جائے۔"

سرور نے دوستوں کی خواہش اور اصرار سے کہانی کہنا شروع کیا۔ یہ قصہ بے حد پسند کیا گیا اور ہر طرف سے اس کے لکھے جانے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ مگر سرور عدیم الفرصتی اور ناسازگاری زمانہ سے اس مقصد کو ضبط تحریر میں نہ لا سکے۔ کچھ دنوں بعد سرور ایک قتل کے معاملے میں ملوث ہوئے جس کے نتیجے میں انھیں لکھنؤ چھوڑنا اور کانپور جانا پڑا۔ سرور کے لیے کانپور کی فضا اور ماحول بڑا ناسازگار اور ناپسندیدہ ثابت ہوا۔ مگر وہ کانپور میں رہنے پر مجبور تھے۔ کانپور کے دوران قیام میں برابر ان کو یہ خیال آتا رہا کہ اس قصے کو مربوط کر کے

کتابی شکل دے دیں۔ اس کا اظہار انھوں نے اپنے دوست حکیم اسد علی سے بھی کیا جس کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ "بیکار مباش کچھ کیا کر" اور بقول سرور یہ کلمہ توسن طبع کو تازیانہ ہوا۔

فسانہ عجائب اور سرور کے حالات زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے فسانہ کسی معاوضے کی خاطر یا کسی راجہ نواب کو خوش کرنے کی غرض سے نہیں لکھا تھا بلکہ انھوں نے چند احباب کی دلبستگی اور دلجمعی کے لیے فسانہ لکھا۔ اس کا خاکہ لکھنؤ میں تیار ہوا اور ابتدا درتکمیل کے مراحل کانپور کے دوران قیام میں طے ہوئے۔

ایشیائی روایات۔ فسانہ عجائب ادبی اور فنی نقطۂ نگاہ سے ایشیا کی ادبی روایات، مشرقی تہذیب و تمدن اور افسانوی ذہنیت کا مکمل نمونہ ہے۔ ایشیائی خیالات اور زندگی کے طور طریقے جگہ جگہ نمایاں ہیں۔ ایشیائی افسانہ نویسوں نے فسانہ نویسی کے جو اصول مرتب کر دیے تھے، جو راستہ دکھلا دیا تھا سرور اسی راستے پر آنکھ بند کر کے چل پڑے۔ اس لحاظ سے سرور قدامت پرست بھی ہیں۔ ان کے اندر جدت پسندی، قوت تخلیق یا ایجاد و اختراع کی صلاحیت بالکل نہیں ہے۔ مشرقی روایات اور ہندستانی ماحول کی عکاسی سرور نے ابتدائے قصہ ہی میں کامیابی سے کی ہے۔ کتاب حمد و نعت سے شروع ہوتی ہے۔ بادشاہ وقت کی مدح و ستائش اس کے لیے فلاح و بقا کی دعا، تاریخی و جغرافیائی اور مقامی رنگ، تہذیبی اور سماجی کیفیات، دوست اور احباب کے حالات و واقعات، سبب آغاز داستان سے قبل بیان کر دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد کتاب کی وجہ تالیف بیان کی گئی ہے۔ یہی ایشیائی فسانہ نویسی کا اصول تھا اور اس پر سرور بھی گامزن ہوئے۔ اس طرح فسانہ عجائب کے مخفی دیباچہ کے حسب ذیل اجزا ہو جاتے ہیں

(۱) حمد خدا، نعت رسول، منقبت حضرت علی و اہل بیت (۲) مدح غازی الدین حیدر (۳) بیان لکھنؤ (۴) تعریف نصیرالدین (۵) استاد نوازش کی تعریف (۶) وجہ تالیف کتاب (۷) میر امن پر حملہ اور (۸) کتاب کی کیفیت اور نام۔

ایشیائی طرز فسانہ نویسی سوسائٹی کے اعلیٰ اور باوقار طبقے کو اپنے قصے کا موضوع بناتا ہے۔ چنانچہ بادشاہ، شاہزادوں، وزیروں، امیرزادوں اور شہزادیوں کا انتخاب اشخاص قصہ کے طور پر کیا جاتا ہے۔ سماج کے ادنیٰ اور کمتر درجے کے لوگوں کی اہمیت اس وقت نہ تھی یہی وجہ ہے کہ یہ طبقہ کسی بھی قدیم قصے میں جگہ نہ پاسکا۔ سرور نے شاہی اور شخصی حکومت کا عہد دیکھا تھا بلکہ واجد علی شاہ کے ظل عاطفت میں پرورش بھی پا چکے تھے۔ ہر چند ان کی آنکھوں کے سامنے شخصی حکومت کے تار و پود بکھر چکے تھے مگر سرور کا ذہن ایشیائی روایات کی گرفت میں تھا، اسی لیے انھوں نے بھی فسانہ عجائب کے لیے انھیں کرداروں کو منتخب کیا جو قدیم سے چلے آرہے تھے۔ سرور چاہتے تو بڑی آسانی سے اس طبقہ اعلیٰ کو نظر انداز کر سکتے تھے، مگر وہ تو اپنے کو "مقلد گذشتگاں" کہتے تھے اور اس پر فخر بھی کرتے تھے۔ سرور جیسا قابل، وسیع النظر اور ہمہ گیر انسان جو بیک وقت مختلف فنون میں دستگاہ بلکہ مہارت رکھتا تھا اگر روایات پرستی اور تقلید گذشتگاں کے جال میں نہ پڑ گیا ہوتا تو وہ اردو کے افسانوی ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے والا ہوتا۔ بہر حال عام فسانوں کی طرح فسانہ عجائب کی ابتدا بھی ایک بادشاہ فیروز بخت سے ہوتی ہے جو لاولد ہے۔ بڑی تمناؤں اور آرزوؤں کے بعد بڑھاپے میں جان عالم عالم فانی میں تشریف لاتے ہیں۔ جوان ہو کر ان دیکھے محبوب پر عاشق ہوتے ہیں۔ اس کی تلاش و جستجو میں ہفت خواں طے کرتے ہیں۔ درمیان میں دیووں، پریوں اور جادوگرنیوں سے مقابلہ ہوتا ہے۔ مختلف سحر و طلسمات میں اسیر ہوتے ہیں، ہر جگہ کوئی نہ کوئی پیر فقیر رہنمائی اور مشکل کشائی کے لیے آموجود ہوتا ہے اور اس کے تعاون اور دعاؤں سے گوہر مقصود تک پہنچتے ہیں اور ہیروئن کو لے کر شاد و بامراد واپس لوٹتے ہیں۔

ایشیائی قصوں کی ایک اور خصوصیت جو فسانۂ عجائب میں پائی جاتی ہے وہ مافوق العادت، غیر فطری اور ناقابل یقین واقعات کا قدم قدم پر ظہور میں آنا ہے جو داستان کے ارتقا

میں بہت ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ ایک روح کا دوسرے کے جسم میں حلول کر جانا، شکلوں کا بدل جانا، انسان کا جانور بن جانا اور مہینوں بنے رہنا، مکمل آبادی کا پتھر بن جانا، کسی وجہ سے بستی یا شہر کا فنا ہو جانا اور ایک نفس یا شخص کا باقی رہ جانا، یہ اور اسی طرح کی بہت سی ایسی باتیں جو مشرقی قصوں اور داستانوں کا لازمی جُز تھیں، فسانۂ عجائب میں پائی جاتی ہیں۔

ادبی سرقہ – اُویس احمد ادیب نے فسانۂ عجائب کے فنی تجزیے کے بعد اسے طبع زاد قصہ تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے اور اسے ادبی سرقہ قرار دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرور کا مطالعہ بہت وسیع تھا، داستانی ادب کا قدیم سرمایہ ان کی نظروں سے گذر چکا تھا، اسی کو بنیاد بنا کر سرور نے فسانۂ عجائب کی تالیف کی۔ اس کے کردار، پلاٹ، تمہید اور منظر نگاری سب کی سب دوسری تصنیفات کا عکس ہیں۔ سرور نے اپنی طرف سے کسی اضافہ کی ایجاد یا اختراع کی ضرورت نہیں سمجھی۔ انھوں نے مختلف داستانوں کے مختلف اجزا کو بڑی چابک دستی سے ترتیب دے کر ایک مربوط اور مسلسل قصہ کی شکل دیدی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند کے خیال میں۔

> "فسانۂ عجائب کا قصہ طبع زاد ہے لیکن اس کی سب جزئیات مشہور داستانوں کے ڈھنگ پر ہیں اور دوسرے قصوں میں ملتی ہیں ....ہم ان مماثلت کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فسانۂ عجائب تصنیف کرتے وقت سرور کی نظر میں تمام رائج الوقت قصے تھے۔

اسی طرح فخر الحسن دہلوی فسانۂ عجائب کے اجزائے ترکیبی سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

> "یوں تو کہنے کو بہت سے داستان گو دہلی اور لکھنؤ میں مارے مارے پھرتے ہیں، اگر وہ بھی چاہیں تو فسانہ لکھ ڈالیں، تھوڑا کام کرکے بڑا نام کرلیں۔"[1]

اسی طرح یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ فسانۂ عجائب ان کا اپنا کارنامہ نہیں انھوں نے غیروں کے چراغ سے روشنی حاصل کی ہے اور ان تمام واقعات و حکایات کو جو انھوں نے دوسری داستانوں سے اخذ کیے ہیں، اپنا بنا کر پیش کیا ہے۔ شاید ان کے اندر اجتہاد اور اختراع کی صلاحیت بھی نہیں تھی۔ وہ طبعی اور ذہنی اعتبار سے کچھ تھکے تھکے سے تھے ورنہ اگر ان کے اندر اختراعی صلاحیت ہوتی تو انھیں ماخذ سے یقیناً کوئی نئی کہانی جنم دے سکتے تھے ڈاکٹر اعجاز حسین اپنے مضمون "کچھ فسانۂ عجائب کے بارے میں" سرور کی اس کوتاہی پر اظہار ملال کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛-

> "...... ..لیکن اس کا بھی ملال ہے کہ انھوں نے ان تمام مضامین کو پڑھ کر کوئی ایسا قصہ مرتب کیا جو نہ صرف قصہ بھی اُردو میں ایک اضافہ ہوتا، فسانۂ عجائب کی اہمیت طرز بیان اور زبان کے لحاظ سے جو کچھ بھی ہو لیکن بحیثیت افسانہ کے اس کا کوئی خاص مرتبہ نہیں، نہ سرور نے کوئی لافانی کردار اُردو ادب کو دیا نہ پلاٹ میں کوئی خاص دلکشی پیدا کی، نہ منظر نگاری میں کوئی خصوصیت عطا کی ....کاش وہ اپنے وسیع مطالعہ سے فائدہ اٹھا کر کوئی ایسا قصہ قلم بند کرتے جو افسانوی لحاظ سے بھی اُردو کے دوسرے قصوں سے الگ ہوتا۔"[3]

فسانۂ عجائب کے مطالعہ کے وقت جب ہم اس کے پلاٹ کے تانے بانے اور کرداروں کی حرکت و عمل پر غور کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم بیک وقت سحر البیان، طوطا کہانی، پدماوت، بہار دانش، امیر حمزہ، گل و صنوبر، اور باغ و بہار سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

ڈاکٹر نیر مسعود، سرور کے محقق ہیں انھوں نے اپنی تحقیق میں ایک جگہ لکھا ہے؛

> "........فسانۂ عجائب میں پیش کیے جانے والے واقعات کا اس وقت کی مروجہ داستانوں اور دوسری جگہوں سے ماخوذ ہونا اس کتاب کی اہمیت کو کم نہیں کرتا۔ قصہ نگاری کا

---

[1] اُردو کی نثری داستانیں [2] سروش سخن [3] ادب اور ادیب؛ مضمون "کچھ فسانۂ عجائب کے بارے میں"

قدیم فن چراغ سے چراغ جلانے کو معیوب نہیں سمجھتا۔[1]
اس سے کتاب کی اہمیت کم ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو مگر سرور کی داستان گوئی کی اہمیت ضرور کم ہو جاتی ہے۔ انھیں ایک کامیاب داستان سرا کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ وہ دوسروں کے نقش قدم پر چلنے والے تھے۔ بعد کے آنے والوں کے لیے نشان منزل نہ بن سکے۔

پلاٹ۔ فسانۂ عجائب کے پلاٹ کی ترتیب میں سرور شدید طور پر ناکام ہوئے ہیں۔ قصے کو خواہ مخواہ طول دینے کے لیے انھوں نے مختلف داستانوں سے ۔۔ دلینے کی کوشش کی ہے، مگر ان داستانوں کو ایک ہی لڑی میں پرو دینے میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ واقعات کی نامناسب ترتیب نے داستان کو غیر مربوط بنا دیا ہے۔ قصے کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے سرور نے جن داستانوں کا اضافہ کیا ہے وہ اصل داستان میں ٹھیک سے کھپ نہیں سکی ہیں، واقعات کی بے ترتیبی بار بار قاری کو الجھن میں مبتلا کر دیتی ہے۔

کردار۔ پلاٹ کی طرح سرور کردار نگاری میں بھی ناکام نظر آتے ہیں۔ ان کے کردار بے جان اور بے حرکت ہیں۔ ان کی حرکت اور ان کے عمل کبھی جادوگرنی کا سحر یا کسی دیو، فقیر یا درویش کے ارادے اور اشارے کے تابع نظر آتے ہیں۔ جان عالم داستان کا ہیرو ہے۔ ناز و نعم میں پلا ہوا شہزادہ تمام علوم و فنون سے مکمل واقفیت کے باوجود ایسا نادان اور غیر دانشمند ہے کہ جگہ جگہ اپنی حماقتوں اور ناعاقبت اندیشیوں سے مصائب و آلام میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر نیر مسعود۔

"جان عالم جن مصیبتوں میں پھنستا اپنی نادانی سے ہے ان سے چھوٹتا اپنی عقلمندی سے نہیں ہے۔ کہیں ساحرہ کا نقش سلیمانی، کہیں ملکہ کے باپ کی لوح طلسم، کہیں مہرنگار کی ہوشیاری، اور کہیں سفید دیو اس کی مشکل کشائی کرتا ہے۔"

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہزادگی کی وہ امتیازی خصوصیات اور اعلیٰ صفات جو کسی شہزادے کے کردار میں ہونے چاہیے، جان عالم میں اُجاگر کرنے میں سرور ناکام ہوئے ہیں۔ جان عالم عیاش اور نفس پرست ہے اور فنون سپہ گری میں کامل مہارت کے باوجود حد درجہ کا بزدل بھی ہے۔ سرور اس کو آئیڈیل نہیں بنا سکے۔ اس کے کردار میں اگر سفلی کمزوریاں نہ ہوتیں تو یقیناً وہ ایک آئیڈیل کردار بن سکتا تھا

سرور نے ہر کردار کو شروع ہی میں اس طرح متعارف کرا دیا ہے کہ اس کے بارے میں ہمیں کچھ اور جاننے کی خواہش یا تجسس نہیں پیدا ہوتا۔ سرور کی مثالیت پسندی نے کرداروں کو ارتقائی منازل طے کرنے سے باز رکھا۔ ہر کردار شروع سے شجاع، عالی ہمت، خوبصورت، سخی اور عاشق مزاج ہے مثلاً ملکہ مہرنگار کا کردار کہ وہ حد درجہ پاکباز، عقلمند، باتدبیر، وفادار، باہمت اور مستقل مزاج ہے۔ سرور کی یہ مثالیت پسندی بھی دوسری داستانوں اور افسانوں کے ڈھنگ پر ہے۔ ہر قدیم داستان کا کردار شروع میں یا تو اعلیٰ صفات کا مالک ہوتا تھا یا حد درجہ بدکردار ہوتا تھا۔

مغلق اور نامانوس الفاظ۔ سرور کے دوستوں میں سے کسی نے کہا تھا کہ یہ افسانہ

"لغت سے صاف ہو، جو روز مرہ اور گفتگو ہماری تمہاری ہے یہی ہو ایسا نہ ہو کہ آپ رنگین عبارت کے واسطے دقت طلبی اور نکتہ چینی کریں، ہم فقرے کے معنی فرنگی محل کی گلیوں میں پوچھتے پھریں۔"

دوستوں کی یہ فرمائش پوری کرنے میں بھی سرور بُری طرح ناکام ہوئے ہیں۔ فسانۂ عجائب میں متعدد جگہوں پر ایسے الفاظ جملے اور تراکیب آجاتی ہیں جن کو سمجھنے کے لیے کافی ذہنی اور دماغی جد و جہد کرنا پڑتی ہے۔ جابجا عربی عبارتوں اور قرآنی آیات نے عبارت کو اور بھی زیادہ بوجھل بنا دیا ہے۔ حالانکہ سرور کا دعویٰ اس کے برعکس ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

[1] رجب علی بیگ سرور۔ آب حیات اور کارنامے

"اس تحریر سے نمود نظم و نثر و جودت طبع کا خیال نہ تھا

.........بلکہ نظر ثانی میں جو لفظ دقت طلب، غیر مستعمل، عربی فارسی کا مشکل تھا اپنے نزدیک، اسے دور کیا اور کلمہ سہل ممتنع محاورے کا تھا اسے رہنے دیا۔ دوست کی خوشی سے کام رکھا۔"

سرور کی اس عبارت پر تبصرہ کرتے ہوئے وقار عظیم اپنے مضمون "کچھ فسانہ عجائب کے بارے میں" میں لکھتے ہیں:

"یہ سہل ممتنع والا ٹکڑا تو محض سرور کے احساس کمتری کی غمازی کرتا ہے۔"[1]

اور حقیقت بھی یہی ہے۔ سرور نے دیدہ و دانستہ اور شعوری طور پر فسانہ عجائب کو مغلق اور نامانوس الفاظ سے مشکل اور پرشکوہ بنانا چاہا ہے۔ سرور کی کوشش از اول یہی رہی ہے کہ کسی طرح فسانہ عجائب کو داستانی ادب میں ایسی انفرادیت اور امتیاز حاصل ہو جائے جو ان کے لیے حیات دوام کی ضامن بن جائے۔ اس کے لیے سرور نے قطعی شعوری طور پر ایسا اسلوب اختیار کیا ہے جسے فسانہ، عجائب کا امتیازی اور انفرادی اسلوب کہا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایسے الفاظ، محاورے اور ترکیبیں استعمال کرتے چلے گئے جو ایسی ذہنیت اور مزاج کے لوگ کرجاتے ہیں۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے ایک جگہ سرور پر کیے گئے اس اعتراض کے بارے میں یہ لکھا ہے:

"........ اس میں کہیں دقت محسوس ہو تو اس کا سبب عربی و فارسی سے بڑھتی ہوئی ناواقفیت اور قدیم طرز تعلم کے انحطاط کو سمجھنا چاہیے"[2]

یہ بات دور حاضر کے بارے میں تو ایک حد تک درست ہو سکتی ہے لیکن ہم اوپر سرور کے دوستوں کی یہ فرمائش نقل کر چکے ہیں کہ "لغت سے صاف ہو، جو روزمرہ اور گفتگو ہماری تمہاری ہے، یہی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ...... ہم فقرے کے معنی فرنگی محل کی گلیوں میں پوچھتے پھریں۔" اس سے ظاہر ہوتا کہ اس زمانے میں بھی لوگ یہ اسلوب اور لغت سے پرعبارت کی جگہ روزمرہ اور عام فہم زبان ہی کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ پھر یہ بھی یقین ہے کہ سرور کے عہد کا ہر فرد عربی اور فارسی کا عالم نہیں تھا۔ اسی سے سرور کے احباب کو "رنگین عبارت کے واسطے" دقت طلبی اور نکتہ چینی" سے باز رہنے کی باقاعدہ فرمائش کرنا پڑی۔ یہ بات اور ہے کہ سرور نے اعتنا نہ کی۔

اشعار کی کثرت۔ سرور کی ایک اور بڑی ناکامیابی یہ ہے کہ انھوں نے داستان میں زور اور عبارت میں حسن پیدا کرنے کے لیے کثرت سے اشعار استعمال کیے ہیں۔ مگر یہ اشعار با موقع اور سلیقے سے استعمال نہیں ہوئے ہیں۔ ان سے نہ عبارت میں حسن و رعنائی پیدا ہوتی ہے اور نہ عبارت میں زور ہی۔ پوری کتاب میں تقریباً ساڑھے پانچ سو اردو و فارسی کے اشعار استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اتنی ہی تعداد میں اردو و فارسی کے مصرعے بھی ہیں۔ اس طرح داستان بعض جگہوں پر نثری تالیف کے بجائے شعری مجموعہ معلوم ہونے لگتی ہے۔

سرور کی ادبی زندگی کا آغاز شعر و شاعری سے ہوتا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرور شعر گوئی کے میدان میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے اور بہت جلد ان کو یہ احساس ہو گیا کہ شعر و شاعری کا سہارا لے کر شہرت و مقبولیت کے ایوان میں داخل ہونا ممکن نہیں۔ اس احساس نے بڑی شدت کے ساتھ ان کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا اور ان کے وہ اشعار جو مشاعروں اور محفلوں میں نہ پڑھے جا سکے غیر شعوری طور پر فسانہ عجائب کے صفحات پر منتقل ہو گئے۔

سرور نے بہ کثرت اپنے اور استاذ نوازش کے اشعار استعمال کیے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی دوسرے معروف و غیر معروف شعرا کے اشعار درج کیے ہیں۔ اگر یہ اشعار محنت و کاوش سے منتخب کیے جاتے یا موقع و محل کے مطابق پیش کیے گئے ہوتے تو عبارت میں حسن و دل کشی پیدا ہو جاتی مگر اشعار کی غیر ضروری کثرت اور بعض جگہ ان کے بے جا صرف نے داستان کو بوجھل بنا دیا ہے۔

---

[1] ہماری داستانیں۔ [2] رجب علی بیگ سرور حیات اور کارنامے۔

اسلوب میں ناہمواری ۔ فسانۂ عجائب کسی ایک اسلوب کی نمائندگی بڑی مشکل سے کرتا ہے۔ اسلوب کی ناہمواری اور خامی کئی جگہوں پر نمایاں ہے۔ کہیں وہ نہایت سادہ، سلیس اور عام فہم اسلوب اختیار کرتے ہیں اور کہیں ان کا اسلوب مشکل تشبیہات اور استعارات سے مغلق اور دقیق ہو جاتا ہے۔ سرور جب کوئی منظر پیش کرتے ہیں تو کہیں زبان کی سادگی و شیرینی اور بیان کی سلاست و روانی عجب لطف دے جاتی ہے اور کہیں عجیب و غریب تشبیہات و استعارات اور عربی و فارسی کے مشکل و نامانوس الفاظ و تراکیب کے استعمال سے عبارت بوجھل اور پیچیدہ بن جاتی ہے۔ دونوں کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

"چلے کے جاڑے سے کڑاکے کی سردی تھی، گویا زمین سے آسمان تک یخ بھر دی تھی۔ سردی سے سب کا جی جلتا تھا دم تقریر ہر شخص کے منہ سے دھواں دار دھواں نکلتا تھا۔ زمانے کے کاروبار میں خلل تھا، ہر ایک دست در بغل تھا۔ ہر سنگ کے سینے میں آگ تھی......"

ایک دوسرا موقع،

"جس وقت زاغ شب نے بیضہ ہائے انجم آشیانۂ مغرب میں چھپائے اور صیادان سحر خیز دام بر دوش آئے اور سیمرغ زریں جناح مطلا بال غیرت لال قفس مشرق سے جلوہ افروز ہوا یعنی شب گذری سحر ہوئی۔"

نثر سادہ اور نثر رنگین کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو:

"شاہ کیوال بارگاہ بلند مرتبہ عالی جاہ سر حلقۂ شاہان والا تبار، جم شوکت، فریدوں فر، سلیمان اقتدار، کشور گیر، ملک ستان، خدیو کیہاں......"

"اس نے کہا آپ سا عقلمند ایسا کلمہ فرمائے تو نہایت بعید ہے۔ دُنیا میں تین معرکہ ہیں زر، زمین، زن۔ یہ سامان جمع ہیں اگر آپ نہ جائیں گے فدوی تنہا جائے گا...... نے کہا افسوس ہے ہم تمھیں دانا جانتے تھے الا ہماری نادانی تھی....."

مذکورہ اقتباسات سے سرور کے اسلوب کا تضاد صاف نظر آتا ہے۔ ایک طرف سادگی، سلاست اور روانی ہے تو دوسری طرف تصنع، تکلف، آورد اور اغلاق ہے۔

ہر چند کہ بیشتر نقادان ادب نے فسانۂ عجائب کو سرور کی انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا ہے اور ان کے خیال میں سرور کی انشا پردازی اور عبارت آرائی کی وجہ سے ہی فسانۂ عجائب زندہ اور مقبول ہے مگر فسانۂ عجائب میں دو متضاد قسم کے اسلوب دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ سرور کا مخصوص اسلوب اور ان کے فن کا اعلیٰ نمونہ کس کو قرار دیا جائے۔ حامد حسن قادری نے سرور کے متضاد اسالیب بیان کو محسوس کرتے ہوئے بالکل صحیح رائے ظاہر کی ہے وہ لکھتے ہیں:

"سرور کی تحریر میں مناسب اور نامناسب دونوں انداز موجود ہیں۔"

سید وقار عظیم فسانۂ عجائب کے اسلوب، زبان اور اس کی مقبولیت کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"......بے محل اور غیر دلکش اشعار کی بھرمار، جا بجا مراعاۃ النظیر اور تلازمہ کا بھونڈا پن لفظی و معنوی تعقید، ایہام کا تصنع اور خیال اور بیان میں آہنگ اور توازن کی شدید کمی۔ یہ سب چیزیں مل کر فسانۂ عجائب میں انشا پردازی کے مثبت اور منفی پہلوؤں کی ایسی آمیزش کر دیتی ہیں کہ ساری کاوش صفر کے برابر معلوم ہونے لگتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ سرور نے اپنے آپ کو ممتاز بنانے کی کوشش میں انشا پردازی کو ایسے دام میں گرفتار کر دیا ہے جس سے اس کی رہائی محال سی ہے۔"

غرض فسانۂ عجائب کی تالیف میں سرور نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ پلاٹ، کردار، مکالمے، منظر کشی، طرز تحریر اور اسلوب بیان میں سے کسی میدان میں وہ کامیاب نظر نہیں آتے۔ میرامن سے مقابلہ کی شدید خواہش اور جذبے نے سرور کو بے حد نقصان پہنچایا، اور وہ کیا ایک کامیاب داستان گو اور کیا ایک کامیاب انشا پرداز کسی بھی حیثیت سے اُبھر کر ہمارے سامنے نہ آ سکے۔

نیا سال

مفتون کوٹوی

اے دوست! ہم سبھی کو مبارک یہ سالِ نو

دل پاکباز ہو تو نظر پاکباز ہو — دل پاکباز جب ہو کر خوے نیاز ہو
ہرگز برائیوں سے نہ کچھ ساز باز ہو — ہر شخص ملک و دوست ہو ملت نواز ہو

اے دوست! ہم سبھی کو مبارک یہ سالِ نو

تبدیلیاں ہوں کاش ہویدا دماغ میں — ہو روشنی کچھ اور ہی اپنے چراغ میں
بھر دے یہ سال بادۂ الفت ایاغ میں — لائے بہارِ صدق و وفا باغ و راغ میں

اے دوست! ہم سبھی کو مبارک یہ سالِ نو

چاہے مدد جو بڑھنے میں اسکی مدد کریں — کرنے نہ دیں کسی کو نہ خود کارِ بد کریں
رکھیں نہ دشمنی نہ کسی سے حسد کریں — شائستگی سے رد کریں جو بات رد کریں

اے دوست! ہم سبھی کو مبارک یہ سالِ نو

ہم کاش کامیاب ہوں ہر امتحان میں — راہیں ترقیوں کی رہیں اپنے دھیان میں
ہر سمت شہرت اپنی ہو دنیا جہان میں — ہم سے اضافہ اور ہو بھارت کی شان میں

اے دوست! ہم سبھی کو مبارک یہ سالِ نو

چشتی، کبیر، نانک و تلسی و سورداس — تلقین و درس دیکھیے کیسے تھے انکے پاس
مخلوق جمع رہتی تھی بے خوف بے ہراس — یہ ربط و اتحاد ہمیں پھر سے آئے راس

اے دوست! ہم سبھی کو مبارک یہ سالِ نو

جمہوریت میں کوئی کسی سے بڑا نہیں — باہم کسی سے بغض و عداوت روا نہیں
دل جوئی ہو تو ملک میں پھر اپنے کیا نہیں — مفتون کا اور اس کے سوا مدعا نہیں

اے دوست! ہم سبھی کو مبارک یہ سالِ نو

رحمٰن مین پوری

کہوں کیسے یہ دنیا اجنبی ہے
مجھے ہر شے یہاں کی جانتی ہے

کمی خود مجھ میں ذوقِ دید کی ہے
نظاروں کی جہاں میں کیا کمی ہے

خودی رحمٰن شرطِ بے خودی ہے
یہی رازِ عروجِ آدمی ہے

وہی انساں مقدر کا دھنی ہے
جسے حاصل کمالِ زندگی ہے

مسرت سے وہ غم ہے لاکھ بہتر
شریکِ غم اگر ان کی خوشی ہے

اٹھو! پھر جادۂ منزل نے یارو!
ہمارے عزم کو آواز دی ہے

اجل سے لوگ کیوں ڈرتے ہیں آخر
سکونِ دل کی جب منزل یہی ہے

مجھے ہو جہل کی ظلمت کا ڈر کیا؟
نگاہوں میں خرد کی روشنی ہے

یہ فصلِ گل ہے یا موسم خزاں کا
چمن کی ہر کلی سہمی ہوئی ہے

غرورِ اہلِ دانش سے یقیناً
بہت اچھی مری دیوانگی ہے

اہم تھا عرضِ غم پر ان کا ہنسنا
مرے احساس پر بجلی گری ہے

وہیں تو تھا ہمارا بھی نشیمن
گلستاں میں جہاں بجلی گری ہے

بتاؤ، ناقدو! رحمٰن ہے کیا؟
تمھیں بھی تو خدا نے عقل دی ہے

نجات دہندہ

(تمثیل)

قمر احسن

فضا میں ہلکی ہلکی سسکیوں کے ساتھ ایک دھیمی دھیمی سی آواز اُبھری۔

نہیں ملا۔ آج بھی نہیں ملا۔ کل بھی نہیں ملا تھا۔ ۱۲ سال سے نہیں ملا ہے۔ نہ معلوم وہ کہاں ہوگا۔ ساری کتابوں میں لکھا تھا کہ وہ ہر جگہ ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی بھیس میں۔

قدموں کی آواز اُبھرتی ہے، اور روشنی میں ایک شخص سامنے آتا ہے۔ اس وقت ہوائیں بڑی شدت اختیار کر چکی ہوتی ہیں۔ ہواؤں کی تیز چیخ میں بوڑھے کی آواز دب دب کر اُبھرتی ہے۔

"غلطی میری ہی تھی کہ میں سارے جہان میں چکر لگاتا رہا۔ ہو سکتا ہے کہ جب میں یہاں تھا تب وہ وہاں ہو۔ اور جب میں وہاں پہنچا تو وہ وہاں سے اِدھر آ گئے۔ اور پھر وہاں سے۔ پھر وہاں سے پھر — اور میں بیکار دوڑتا رہا — آہ — ہ۔ کیا کچھ نہ چھوڑنا پڑا اس کی تلاش میں —"

اُسی وقت دور سے ایک سایہ اُبھرتا ہے۔ بوڑھا بے چینی سے اس کی طرف لپکتا ہے۔ مگر پھر رُک جاتا ہے۔ اگر کہیں کوئی نجات دہندہ تیرے سٹتے ہی یہاں آ گیا تو —

اتنی دیر میں وہ سایہ سامنے آ جاتا ہے، اور ایک شخص جس کی جھکی ہوئی کمر اور سفید سے سر پر لاتعداد کتابیں رکھی ہیں، بڑبڑاتا ہوا گزرتا ہے۔ (سامنے آتا ہے۔)

"ہونہہ۔ یعنی لاحول ولاقوۃ۔ آخر کب تک ایک مفروضہ کے لیے یہ بوجھ ڈھوتا رہوں۔ میں نے اسی چیز کا کیوں نہ انتظار کیا جو یقینی ہے۔ آخر یہ کتابیں اور ان کی جلدوں میں گھسی ہوئی دیمکیں کب میرا ساتھ چھوڑیں گی۔ کیا جب وہ ملے گا۔ آخر کب ملے گا وہ — نہ معلوم" —؟

پہلا شخص۔ شخص پکارتا ہے "اے بھائی۔ اے صاحب۔ اے جناب ذرا سنیئے" —

دوسرا۔ "ارے یہ آواز۔ ایسی آواز۔ یہ جگہ۔ کہیں۔ کہیں۔ یہ وہی تو نہیں۔ ارے اس نے مجھے خود بلایا۔" ہائے وہ ساعت کہ جب دم سامنا ہو جائے گا۔ کدھر ہے؟ ارے حضور سامنے آئیے۔ ذرا جلدی"

پہلا۔ یہ ضرور وہی ہے۔ دیکھو کیسا اس نے اپنے تلاش کرنے والے کی آواز کو پہچان لیا۔ اِدھر اُدھر مجھے تلاش کر رہا ہے۔ آیا۔ آیا حضور —"

پہلا سامنے آتا ہے

دوسرا۔ یہ تو بالکل ویسا ہے جیسا کتابوں میں لکھا ہے۔ ضرور ضرور" اور حیرت سے کھڑا رہ جاتا ہے۔

پہلا۔ میں آپ کو ۱۲ برس سے تلاش کر رہا ہوں۔ ساری دنیا کا چکر لگا کر اب مایوس ہوتا جا رہا تھا — اب آپ مل گئے۔ ارے واقعی آپ مل گئے۔"

دوسرا۔ آنکھیں بند کیے بڑبڑاتا ہے۔" یہ خود میرا انتظار کر رہا تھا۔ یہ خود مجھے تلاش کر رہا تھا۔ ارے میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ کتنا خوش" —

پہلا۔ آیئے۔ آیئے۔ لایئے لایئے۔ یہ بوجھ مجھے دے دیجیے۔"

دوسرا۔ نہیں۔ نہیں۔ حضور ٹھیک ہے۔ نہیں تو — میں تو خوشی سے پاگل ہوا جا رہا ہوں۔ کہ آپ مل گئے۔

پہلا۔ ہاں۔ ہاں۔ سرکار میں بھی خوش ہوں۔ ساری کتابوں میں سچ لکھا ہے کہ آپ عجیب عجیب بھیس میں رہتے ہیں۔ آئیے۔ آئیے۔ جلدی آئیے..... اب برداشت نہیں ہے۔ بہت تھک گیا ہوں۔

دوسرا۔ یہ بھی خوشی ہے۔ یعنی یہ کہ میں بھی کافی اہم ہو چکا ہوں۔

پہلا۔ جلدی کیجیے حضور۔ مجھے نجات ...... نجات دلائیے..... مجھے نجات دلائیے۔ سسکیاں بھرنے لگتا ہے۔

دوسرا۔ ارے۔ ارے آپ رونے لگے۔ رونا تو مجھے چاہیے۔ خوشی کے آنسو۔ آج آپ اتنی مدت کے بعد آخر مل ہی گئے۔ میرا نجات دہندہ! اب آپ کو نہ جانے دوں گا۔ میرا امتحان نہ لیجیے۔ آپ ہی نجات دہندہ ہیں۔ میں آپ کو پہچان گیا ہوں۔ آخر اتنی ساری کتابوں میں آپ کی پہچان لکھی ہے۔ کتابیں پٹک دیتا ہے۔ اب کیا ہوگا۔ ان سب کتابوں کو ڈھوکر۔ اب تو آپ خود مل گئے۔

پہلا۔ امتحان —؟ نجات دہندہ —؟ میں —؟ پھر خوب زوروں سے قہقہہ لگاتا ہے اور ہنستے ہنستے سانس پھول جاتا ہے۔

دوسرا۔ ارے۔ ارے۔ آپ کافی کمزور ہیں۔ حضور اتنا نہ ہنسیے۔ ارے آپ تو ہنستے ہی چلے جا رہے ہیں۔ مگر اب میں دھوکا نہیں کھاؤں گا۔

پہلا۔ پھر ہنسنے لگتا ہے۔ دھوکہ نہ کھاؤں گا۔ قہقہہ۔ آپ میرا امتحان لے رہے ہیں۔ نجات دہندہ آپ ہی ہیں۔ میں بھی پہچان گیا ہوں —

دوسرا۔ میں نجات دہندہ۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ حضور؟ تو کیا آپ نجات دہندہ نہیں ہیں —؟

پہلا۔ نہیں۔ مگر آپ ضرور وہی ہیں۔

دوسرا۔ نہیں۔ مگر آپ ضرور وہی ہیں۔ میں کئی برس سے آپ کی تلاش میں ہوں۔

پہلا۔ میں بھی کئی برس سے آپ کی تلاش میں ہوں۔

پہلا۔ آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ مذاق کر رہے ہیں۔

دوسرا۔ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ مذاق کر رہے ہیں۔

پہلا۔ آپ جھوٹے ہیں۔

دوسرا۔ آپ خود جھوٹے ہیں۔

پہلا۔ کیا واقعی — وہ نہیں ہو —؟

دوسرا۔ نہیں! — اور کیا تم وہ نہیں ہو —؟

پہلا۔ لاحول ولا۔ تم۔ بے ہودہ ہو۔ بدتمیز۔ تم نے اتنا وقت برباد کر دیا۔

دوسرا۔ تم نے خود میرا وقت برباد کیا۔ میں وہاں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اگر اتنی دیر میں وہ وہاں آ گیا ہو تو۔ جاؤ۔ جاؤ۔ بس جاؤ۔

پہلا واپس پلٹنے لگتا ہے۔

دوسرا۔ اے جناب۔ ارے۔ ارے سنو۔ یہ کتابیں مجھ سے اکیلے نہیں اُٹھیں گی ذرا میری پیٹھ پر لاد دو۔

پہلا۔ بس۔ بس جاؤ۔ کمینہ کہیں کا۔ دھوکہ باز۔

دوسرا۔ رکھ دو بھائی۔ ورنہ میں ساری عمر یہیں بیٹھا رہ جاؤں گا۔ استدعا کرتا ہوں۔

پہلا۔ رکتا ہے اور پھر بڑبڑاتا ہوا کتابیں اٹھانے لگتا ہے۔ ہونہہ۔ نجات دہندہ۔ یہ صورت ہے ان کی۔ اور بنیں گے نجات دہندہ۔

دوسرا۔ یک بیک چیختا ہے "ارے وہ دیکھو کون آ رہا ہے —؟"

پہلا۔ گھبرا کر "کہاں۔ ؟ ارے کہاں؟" ضعیفی نے آنکھیں بھی کمزور کر دی ہیں۔ چاروں طرف دیکھتا ہے۔ ارے مجھے کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ بڑبڑاتا ہے۔ میں اتنی دیر سے انتظار کر رہا ہوں۔ اور اس نے سب سے پہلے نجات دہندہ کو دیکھ لیا۔ ارے سور۔ کمینے۔ اگر تم نہ آئے ہوتے تو سب سے پہلے میں ہی اس کو دیکھتا۔ جاؤ۔ تم جاؤ۔ یہاں سے۔ وہ میرے پاس آیا ہے۔ دوسرے کو کتابیں مارنے لگتا ہے۔

دوسرا۔ کتابوں سے بچ بچ کر قہقہہ لگاتا ہے۔ ہا۔ ہا۔ میں واقعی خوش نصیب ہوں کہ اس کو پہلے دیکھا۔ ہائے وہ ساعت کہ جس دم سامنا ہو جائے گا۔

پہلا۔ اسے دوڑاتا ہے۔

دوسرا۔ ارے ارے او بوڑھے تم گر جاؤ گے۔ ہائے وہ ساعت

.....ارے وہ دیکھو وہ اور نزدیک آگیا۔

پہلا۔ رک کر۔ کہاں۔؟ ارے ہاں ہے تو۔ ارے اس کے کاندھے پر کیا ہے۔ شاید گٹھری۔؟

دوسرا۔ ارے بے وقوف۔ گٹھری نہیں۔ وہ ضرور مشکیزہ ہے جس میں آب حیات لیے ہوگا۔ ہا۔ ہا۔ ہائے وہ ساعت کہ جب......"

پہلا۔ اس کو بڑبڑاتا چھوڑ کر دوڑ پڑتا ہے۔ پہلے میں ملوں گا۔ پہلے میں...."

دوسرا۔ بھی دوڑتا ہے" ارے پہلے میں ملوں گا۔ میں نے پہلے دیکھا تھا۔

آنے والا روشنی میں آجاتا ہے۔

پہلے کو دیکھتا ہے۔ ارے او۔ وہ خود ہی بھاگا آرہا ہے مجھ سے ملنے۔ یعنی میں کافی اہم ہوں۔ مگر میرے کپڑے۔؟ سونگھتا ہے۔ اف کتنی خراب بدبو آرہی ہے ان میں سے۔ کہیں وہ ناراض نہ ہوجائے۔ اور جلدی جلدی کپڑے اتارنے لگتا ہے۔ اتار دوں جلدی جلدی سے۔ تب تک دوسرا بھی نظر آتا ہے۔ ارے یہ کون ہے؟ ایں اس کے کاندھے پر کیا ہے۔؟ شاید مشکیزہ جس میں وہ آب حیات لیے ہوگا۔ پھر یہ پہلا کون ہے؟

پہلا۔ نزدیک آکر۔ آپ؟

تیسرا۔ بات کاٹ کر۔ آپ؟

تب تک دوسرا بھی آجاتا ہے اور ادھر ادھر کچھ تلاش کرتا ہے:

دوسرا۔ ارے وہ مشکیزہ کہاں ہے؟

تیسرا۔ دوسرے کی طرف دیکھ کر۔ ہاں وہ مشکیزہ کیا ہوا؟

دوسرا۔ جلدی سے گندے کپڑوں کے ڈھیر کی طرف لپکتا ہے۔ شاید ان کپڑوں کے نیچے آپ نے چھپا دیا ہو۔

تیسرا۔ دوڑ کر پکڑ لیتا ہے۔ نہیں۔ نہیں۔ وہاں کچھ نہیں ہے۔ وہاں کچھ نہیں ہے۔

دوسرا۔ زور کرکے۔ ارے مجھے وہاں جانے دیجیے۔

پہلا۔ دھیرے دھیرے ان کپڑوں کی طرف بڑھتا ہے۔ اتنے میں تیسرا لپک کر اس کی لمبی ٹانگ پکڑ لیتا ہے۔ ارے آپ وہاں نہ جائیے وہ آپ کے لائق نہیں ہیں۔

دونوں اپنے کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔

پہلا۔ دیدیجیے۔ دیدیجیے۔ میں آپ کا بہت دنوں سے انتظار کر رہا ہوں۔

دوسرا۔ جانے دیجیے۔ جانے دیجیے۔ میں آپ کا دوست ہوں۔

پہلا۔ ارے یہ دھوکہ باز ہے۔ اس کو نہ دیجیے گا۔ صرف مجھے چھوڑ دیجیے۔

دوسرا۔ نہیں۔ جناب۔ وہ خود پکا چارسو بیس ہے۔ ابھی مجھ سے اپنے کو نجات دہندہ کہہ رہا تھا۔

پہلا۔ نہیں نہیں حضور۔ وہ خود ہی اپنے کو نجات دہندہ کہہ رہا تھا۔

تیسرا۔ بڑبڑاتا ہے۔ ایں۔ تو کیا یہ دونوں نجات دہندہ نہیں ہیں۔ ارے! اور گرفت ڈھیلی کر دیتا ہے چلو بھاگو تم دونوں یہاں سے۔

پہلا۔ چھوٹ کر سیدھا کپڑوں کے ڈھیر کی طرف دوڑتا ہے اور جلدی سے سارے کپڑے سمیٹ کر بھاگتا ہے۔

دوسرا۔ بھی اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ ارے بھائی ہم تم دوست ہیں۔ ذرا سا مجھے بھی دینا۔

پہلا۔ ارے ان کپڑوں سے کتنی بدبو آرہی ہے۔ شاید آب حیات کی ہے۔

تیسرا۔ ارے کمینو۔ کمبختو۔ میرے کپڑے۔ ارے میرے کپڑے وہ بھی ان کے پیچھے دوڑتا ہے۔

پہلا۔ ان کپڑوں کا میں کیا کروں گا۔ اس کو دوسرے کے لیے چھوڑ دوں اور مشکیزہ لے لوں۔ وہ کپڑوں کو جلدی جلدی پلٹتا ہے۔ ارے اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔

تب تک دوسرا بھی آجاتا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے کپڑے کی گٹھری چھیننے لگتے ہیں۔

تیسرا۔ دوڑتا ہوا نزدیک آتا ہے۔ پھر کپڑوں کے پھٹنے کی آواز آتی ہے اور وہ سر پکڑ کر وہیں بیٹھ جاتا ہے۔ ارے سوّرو تم نے میرے کپڑے پھاڑ دیے۔ اب اگر وہ مل گیا تو میں ننگا اس کے سامنے جاؤں گا؟

پہلا اور دوسرا ایک دوسرے سے لڑتے ہی رہتے ہیں۔ تیسرا ایک طرف اپنا بدن چھپائے بیٹھا ہے کہ دور سے ایک آدمی کا سا ابھرتا ہے۔ اور تیسرا اپنا بدن چرائے ہوئے دوڑ پڑتا ہے۔

تیسرا۔ وہ آرہا ہے وہی ہے۔ میں نے پہچان لیا۔

دوسرا اور پہلا بھی رُک کر اُدھر دیکھتے ہیں۔

پہلا۔ ہاں وہی ہے۔ بالکل وہی۔ کتابوں والا۔

دوسرا۔ ہاں۔ ہاں۔ بالکل وہی ہے۔

اور دونوں دوڑ پڑتے ہیں۔ ہائے وہ ساعت ......

چوتھا سایہ ان لوگوں کو دیکھ کر ان کی طرف دوڑتا ہے۔

تیسرا۔ ارے آؤ۔ آؤ۔ یہ تو اسی طرف دوڑا آرہا ہے۔ ضرور یہ وہی ہے۔

پہلا۔ ہاں۔ ہاں۔

دوسرا۔ ہاں۔ ہاں۔

چوتھا روشنی میں آتا ہے اور تینوں کو غور سے دیکھتا ہے۔ پھر پہلے کی طرف آتا ہے۔ ارے آپ وہی ہیں۔ بالکل وہی۔ اب مجھ سے نہ چھپیے۔ اور لپٹ جاتا ہے۔

پہلا۔ ارے ارے حضور یہ کیا کر رہے ہیں؟

دوسرا۔ ارے حضور میں اس سے بھی زیادہ دنوں سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔

چوتھا۔ چونک کر۔ یہ آواز ــ یہ تو بالکل وہی ہے۔ وہی ــ پہلے کو چھوڑ کر دوسرے کی طرف لپکتا ہے۔ معاف کیجیے مجھے دھوکہ ہو گیا میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔

پہلا۔ سسکیاں بھرتا ہے۔

تیسرا۔ ارے میں کیسے ان کے سامنے جاؤں۔ میرے کپڑے .....

دوسرا۔ شکریہ۔ شکریہ۔

تب تک تیسرا زور زور سے رونے لگتا ہے۔

چوتھا چونک کر اس کی طرف بڑھتا ہے۔

چوتھا۔ آپ .... آپ شاید ــ نہیں۔ یقیناً آپ ہی وہ ہیں۔ کتابوں میں لکھا ہے۔ کہ آپ عجیب عجیب طرح کے بھیس بدلتے ہیں۔

تیسرا۔ اپنے بدن کو چھپاتا ہوا۔ اور زور زور سے روتا ہوا کہتا ہے۔ نہیں ..... ان لوگوں نے مجھے وہ سمجھ کر میرے کپڑے چھین لیے ہیں۔ میں وہ نہیں ہوں۔

چوتھا۔ آپ نہیں ہیں تو پھر ــ تو پھر۔ پہلے کی طرف پلٹ کر۔ آپ وہ ہیں؟

پہلا۔ نہیں میں تو آپ کا ۱۲ برس سے انتظار کر رہا ہوں ــ!

دوسرا۔ ہائے وہ ساعت کہ جس دم سامنا ہو جائے گا۔

چوتھا۔ دوسرے کی طرف پلٹتا ہے۔ آپ وہ ہیں۔ دیکھیے آخر میں نے آپ کو پہچان لیا۔

دوسرا۔ رک کر۔ ایں۔ تو کیا آپ بھی وہ نہیں ہیں؟

چوتھا۔ نہیں۔ تو کیا آپ بھی وہ نہیں ہیں؟

پہلا۔ گالیاں بکتا ہے۔ سور۔ کمینہ۔ بدمعاش۔ دھوکہ باز ــ!

دوسرا۔ ہاں۔ ہاں۔ دھوکہ باز۔ سور۔ کمینہ۔

تیسرا۔ روتا ہے۔ ارے یہ بھی وہ نہیں ہے۔ بدمعاش۔ بدمعاش

چوتھا۔ تم سب سور ہو۔ کمینے۔ بدمعاش۔ دھوکہ باز۔

یک بہ یک دوسرا اپنی کتابوں کی طرف دوڑتا ہے۔ سب کچھ صحیح صحیح کتابوں میں لکھا ہوگا۔ میں نے اب تک پڑھا ہی نہیں۔

پہلا۔ تیسرا اور چوتھا بھی دوڑتا ہے۔ ارے رکو۔ رکو۔ کہاں بھاگ رہے ہو؟

دوسرا۔ جا کر جلدی جلدی کتابوں کو الٹتا ہے۔ ہاں۔ نجات دہندہ! اسی میں لکھا ہوگا ــ

تینوں بھاگ جاتے ہیں۔ دوسرا پڑھتا ہے۔

" اے نجات دہندہ کو تلاش کرنے والو۔ جب تم لوگ اس کی تلاش سے تھک جاؤ۔ تو یہ جان لینا کہ تم ہی سب نجات دہندہ ہو۔ ــ جاؤ اپنا فرض ادا کرو۔

تینوں۔ ایں ــ ؟؟؟

چوتھا۔ روتا ہوا۔ ایں ــ ایں ــ

دوسرا۔ ہائے وہ ساعت کہ ....

پہلا۔ رک کر۔ سنو۔ سنو۔ ہم سب نجات دہندہ ہیں ــ!

تینوں۔ ہاں۔ ہاں۔ ہاں ہیں۔ اور اُچھلنے لگتے ہیں۔

پہلا۔ رک کر۔ سنو تو۔

تینوں رک جاتے ہیں۔

(باقی صفحہ ۳۹ پر)

یوشن ۱۸۹۵ افتک

شاہدرہ ریلوے لائن

ادارہ

شاہدرہ سے سہارنپور (اترپردیش) تک ۱۶۱ کلو میٹر لمبی بڑی لائن کی تعمیر کا منصوبہ تیار کیا گیا ہے جس پر ۱۷ کروڑ ۴۴ لاکھ روپے صرف ہوں گے توقع ہے کہ یہ لائن ۷۹-۱۹۷۸ء تک مکمل ہو جائے گی۔

امید ہے کہ اس منصوبے کی تکمیل کے بعد اس لائن پر روزانہ

شاہدرہ سہارنپور لائٹ ریلوے جو ۱۹۰۵ء سے شاہدرہ سے سہارنپور تک کے علاقے کے لوگوں کی خدمت کر رہی تھی، ۱۳ اگست ۱۹۷۰ء کو بند کر دی گئی تھی۔ اس ریلوے کے مالکان کو یہ سروس اس لیے بند کرنی پڑی کہ بسوں کے شدید مقابلے کے سبب انھیں مسلسل

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۴ دسمبر ۱۹۷۳ء کو شاہدرہ سے سہارنپور تک ریلوے لائن بچھانے کے کام کا افتتاح کیا

پندرہ مسافر اور مال گاڑیاں چلا کریں گی۔ ویسے اس لائن کی صلاحیت اتنی ہوگی کہ اس پر دونوں طرف سے بیس بیس گاڑیاں چل سکیں۔

شاہدرہ اور سہارنپور دونوں مقامات پر جنکشن کے انتظامات موجودہ ریلوے نظام کے تحت ہی کیے جائیں گے۔ اس لائن پر پڑنے والے دوسرے اسٹیشنوں کی تعداد ۲۸ ہوگی۔

نقصان برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن اس ریلوے کے بند ہو جانے کی وجہ سے اس علاقے کے عوام کو کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

نئی بڑی لائن کی تعمیر

روڈ ٹرانسپورٹ کی موجودہ سہولیات اس علاقے میں ٹریفک کو پوری طرح نہیں سنبھال رہی ہیں اور مستقبل میں ٹریفک کے اور بھی بڑھنے

کا امکان ہے اس لیے شاہدرہ سے سہارنپور تک بڑی لائن کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔

ایک تفصیلی جائزے سے معلوم ہوا ہے کہ پرانی چھوٹی لائن کو بحال کرنا نہ صرف غیر منفعت ہوگا بلکہ وہ اس علاقے میں ٹریفک کی مستقبل کی ضروریات کو بھی پورا نہیں کر سکے گا۔

نئی لائن کی تعمیر سے ان سب لوگوں کو فائدہ پہنچے گا جنھیں پہلے شاہدرہ۔ سہارنپور لائٹ ریلوے کی خدمات میسر تھیں۔ اس کے علاوہ لمبے سفر کے مسافروں کو، جو غازی آباد۔ سہارنپور لائن پر سفر کرتے ہیں ایک براہ راست اور متبادل روٹ مل جائے گا۔

نئی لائن پر لمبی مسافت طے کرنے والی کچھ سیدھی پسنجر ٹرینیں چلائی جا سکیں گی۔ یہ لائن مشرق سے مغرب کی سمت مال کے نقل و حمل کے لیے بھی ایک متبادل روٹ کا کام دے گی۔

نئی لائن قریب قریب اسی راستے پر تعمیر کی جائے گی جس پر کہ پرانی چھوٹی لائن چلا کرتی تھی اس پر جو اسٹیشن پڑیں گے وہ بھی آبادی کے قریب ہوں گے۔

ترقی کے وسیع امکانات

نئی ریلوے لائن جس علاقے میں بنائی جارہی ہے وہ دریائے جمنا اور دریائے گنگا کے درمیان واقع دوآب کے علاقے ہی کا ایک حصہ ہے۔ یہ ملک کے سب سے زرخیز علاقوں میں سے ہے اور زرعی و صنعتی دونوں شعبوں میں اس کو ترقی دینے کے امکانات کافی وسیع ہیں۔

اس لائن کے بن جانے پر اس علاقے میں جو ریل کی خاطر خواہ سہولیات موجود نہ ہونے کی وجہ سے ترقی کے میدان میں پیچھے رہ گیا ہے زرعی و صنعتی ترقی اور اقتصادی خوشحالی کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

نئی بڑی لائن کی تعمیر کا یہ پراجیکٹ ریلوے اور روڈ ٹرانسپورٹ کے درمیان تعاون اور مرکزی حکومت اور ریاستی سرکار کے درمیان اشتراک عمل کا بھی مظہر ہے۔ ریلوے اور روڈ ٹرانسپورٹ کے درمیان غیر صحت مندانہ مقابلے سے بچنے کی غرض سے نئی لائن کی تعمیر کے لیے ایک کارپوریشن بنائے جانے کی تجویز ہے جس کے اخراجات اتر پردیش سرکار اور وزارت ریلوے مل کر برداشت کریں گی۔ اس روٹ پر روڈ ٹرانسپورٹ کی سروسیں چلانے کی ذمہ داری بھی مشترکہ کارپوریشن پر ہی ہوگی۔

نئی بڑی لائن کی تعمیر اور اس پر ریل گاڑیاں چلانے کے اخراجات بھی مرکزی اور ریاستی حکومتیں مل کر نصف نصف کے تناسب سے برداشت کریں گی۔

★

نجات دھندہ (صفحہ ۳۴ کا بقیہ)

پہلا۔ سوال یہ ہے کہ ہم کس کو نجات دلائیں؟ کس کی نجات کرائیں۔

تینوں۔ ہاں۔ یہ تو ہے۔

اور دور سے ایک سایہ ابھرتا ہے۔

سایہ۔ اں۔ وہ یہاں بھی نہیں۔ کتنے برس ہو گئے تلاش کرتے مگر آج تک وہ نہیں ملا۔

اچانک چاروں اسے دیکھ لیتے ہیں۔ اور چاروں دوڑتے ہیں۔

چاروں۔ اے بھائی رکو۔ اے بھئی ذرا ٹھہرو۔ د۔ د۔

سایہ رک کر چونکتا ہے۔

سایہ۔ اں۔ وہ تو اکیلا ہوگا۔ یہ چار ہیں ــ اور بھاگتا ہے۔ بچاؤ۔ بچاؤ۔ دوڑو ــ دوڑو ــ

وہ چاروں چیختے ہیں۔ اے بھائی ہم نجات دہندہ ہیں۔ رکو ــ رکو ــ!

سایہ چیختا ہے۔ دوڑو .... دوڑو۔ بچاؤ ــ

★

فہرست تعطیلات اُتر پردیش بابتہ سنہ ۱۹۷۴ء

نام تعطیل	تعداد	تاریخ	دن
عید الضحیٰ	۱	۵ جنوری	سنیچر
یوم جمہوریہ	۱	۲۶ جنوری	سنیچر
شیوراتری	۱	۲۰ فروری	بدھ
ہولی	۲	۷ و ۸ مارچ	جمعرات و جمعہ
رام نومی	۱	یکم اپریل	دوشنبہ
بارہ وفات	۱	۶ اپریل	سنیچر
گڈ فرائی ڈے	۱	۱۲ اپریل	جمعہ
بینکوں کی ششماہی حساب بندی	۱	۲۹ جون	سنیچر
یوم آزادی	۱	۱۵ اگست	جمعہ
مہاتما گاندھی کا جنم دن	۱	۲ اکتوبر	بدھ
عید الفطر	۱	۱۸ اکتوبر	جمعہ
دسہرہ	۲	۲۴ و ۲۵ اکتوبر	جمعرات و جمعہ
دیوالی	۳	۱۳، ۱۴ و ۱۵ نومبر	بدھ، جمعرات، جمعہ
کارتک پورنیما اور گرونانک کا جنم دن	۱	۲۹ نومبر	جمعہ
کرسمس ڈے	۱	۲۵ دسمبر	بدھ
بینکوں کی سالانہ حساب بندی	۱	۳۱ دسمبر	منگل

نوٹ

۱۔ عید الضحیٰ، بارہ وفات اور عید الفطر کی تعطیل مقامی رویت ہلال کے مطابق ہوگی اور بوقت ضرورت ضلع مجسٹریٹ ان تعطیلات کا تعین از سر نو کر سکتے ہیں۔

۲۔ بینکوں کی ششماہی اور سالانہ حساب بندی کی چھٹی صرف خزانوں اور ذیلی خزانوں میں ہوگی۔

۳۔ مذکورہ بالا عام تعطیلات کی فہرست میں محرم اور جنم اشٹمی کی چھٹیاں اتوار کو پڑنے کی وجہ سے شامل نہیں کی گئی ہیں۔

محدود تعطیلات کی فہرست جن میں سے ہر سرکاری ملازم اپنے لیے حسب خواہش دو تعطیلات کا انتخاب کر سکتا ہے

نام تعطیل	تعداد	تاریخ	دن
یوم سال نو اور گرو گوبند سنگھ کا یوم پیدائش	۱	یکم جنوری	منگل
مکر سنکرانتی	۱	۱۴ جنوری	دوشنبہ
بسنت پنچمی	۱	۲۸ جنوری	دوشنبہ
* محرم	۱	۲ فروری	سنیچر
گرو روی داس کا یوم پیدائش	۱	۶ فروری	بدھ
* چہلم	۱	۱۴ مارچ	جمعرات
بیساکھی	۱	۱۳ اپریل	سنیچر
بدھ پورنیما	۱	۶ مئی	دوشنبہ
ناگ پنچمی	۱	۲۳ جولائی	بدھ
رکشا بندھن	۱	۳ اگست	سنیچر
جنم اشٹمی	۱	۱۰ اگست	سنیچر
* شب برات	۱	۳ ستمبر	منگل
رمضان کا آخری جمعہ	۱	۱۱ اکتوبر	جمعہ
مہالیہ اماوسیہ	۱	۱۵ اکتوبر	منگل
* عید الفطر	۱	۱۹ اکتوبر	سنیچر
دسہرہ	۱	۲۳ اکتوبر	بدھ
کرسمس ڈے	۱	۲۴ دسمبر	منگل

جن چھٹیوں پر * نشان بنا ہے وہ مقامی رویت ہلال کے مطابق ہوں گی۔

مذکورہ بالا عام اور محدود تعطیلات کے علاوہ حسب ذیل چھٹیاں بھی بجز خزانوں اور ذیلی خزانوں کے تمام سرکاری دفتروں اور اداروں میں ہوں گی

نام تعطیل	تعداد	تاریخ	دن
مہاویر جینتی	۱	۵ اپریل	جمعہ
دیوالی	۱	۱۶ نومبر	سنیچر

کیا آپ جانتے ہیں؟

—— ٭ ادارہ

- اتر پردیش میں اس برس (۸۴-۱۹۸۳ء) میں پھلوں کی پیداوار ایک لاکھ ٹن تک پہنچ جانیکی توقع ہے جبکہ پچھلے سال ۷۰ ہزار ٹن پھل پیدا ہوئے تھے۔
- مختلف مقامات پر چھوٹے چھوٹے باغات لگانے اور پود گھر قائم کرنے کے علاوہ ضلع پوڑی میں بھرسار اور الموڑہ ضلع میں چوبتیا اور دوناگری میں بڑے بڑے باغات لگائے گئے ہیں۔
- ضلع نینی تال میں رودرپور میں ۵۰ ایکڑ پر مشتمل ایک فارم قائم کیا گیا ہے۔
- پہاڑی ضلعوں میں ۲۰ جگہ اور سرحدی ضلعوں کے ہر بلاک میں قلمی باغات لگائے گئے ہیں۔ یہ قلمی باغات پھلوں کی کاشت کرنے والوں کے لیے نمونے کے طور پر کام آتے ہیں۔
- الموڑہ ضلع کے سیونی اور چوبتیا باغات میں دواؤں میں کام آنیوالے پودے بھی لگائے گئے ہیں۔
- طبی تحقیق کی بھارتی کونسل نے سرطان کے اسباب کا پتہ لگانے کے لیے ماحولاتی جراثیم وغیرہ کا تجزیہ کرنے کے لیے بمبئی، حیدرآباد، اور احمدآباد تین یونٹ قائم کئے ہیں۔ یہ یونٹ خوردنی تیلوں، مشروبات، تمباکو، مانع حمل اشیاء، جراثیم کش اور کیڑے مارنے والی دواؤں میں سرطان سے متعلق جراثیم وغیرہ کا تعین کرنے کے لیے تحقیق کر رہے ہیں۔
- بمبئی میں واقع انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ ان ری پروڈکشن میں مانع حمل اشیاء میں سرطان کے جراثیم اور سمیت خوردنی تیلوں میں سرطان کے جراثیم کی موجودگی اور حلق کے سرطان اور تمباکو کے تعلق کے بارے میں تحقیق کی جا رہی ہے۔
- حیدرآباد میں واقع قوت بخش غذاؤں سے متعلق قومی انسٹی ٹیوٹ میں خوردنی تیلوں اور مشروبات میں سرطان کے جراثیم کی موجودگی کا پتہ لگانے کے بارے میں مطالعات کئے جا رہے ہیں۔
- احمدآباد میں واقع نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اکوپیشنل ہیلتھ میں جراثیم کش ادویہ میں سرطان کے جراثیم کی موجودگی اور سمیت کے بارے میں تحقیق کی جا رہی ہے۔
- یہ تینوں یونٹ حال ہی میں قائم کئے گئے ہیں۔ یہاں جو مطالعات کئے جاتے ہیں وہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہیں۔

- پسماندہ علاقوں کی ترقی اور مختلف ریاستوں کی نابرابری کو کم کرنے کے لیے چوتھے پنجسالہ منصوبے کے لیے دستیاب رقم میں سے دس فیصد رقم مختلف ریاستوں کو مرکزی امداد کے طور پر فراہم کی گئی ہے۔ یہ رقم، بہار، اڑیسہ، کیرالا، مدھیہ پردیش اور اتر پردیش کی ریاستوں کو دی گئی ہے۔ یہاں فی کس آمدنی قومی اوسط سے کم ہے۔
- تلنگانہ علاقہ کے خصوصی علاقائی ترقی کے پروگرام کو چلانے کے لیے اندھرا پردیش سرکار کو ۵۴ کروڑ روپے کی خصوصی امداد فراہم کی جا رہی ہے۔ یہ رقم مذکورہ علاقے کے لیے منصوبے کے مصارف کے علاوہ ہے۔
- مرکزی کفالت سے چلنے والی اسکیموں کے تحت چوتھے پنجسالہ منصوبے کے دوران ۴۸۹ قبائلی ترقیاتی بلاکوں کے لیے ۲۲۱.۵۰ کروڑ روپے مختص کئے گئے ہیں۔
- پہاڑی اور سرحدی علاقوں کی ترقی کے پروگراموں کے تمام اخراجات مرکزی سرکار برداشت کر رہی ہے۔
- میگھالیہ، آسام، ناگالینڈ، جموں اور کشمیر (لداخ) اور ہماچل پردیش (لاہول، اور اسپیتی اور کنور اضلاع) کے ترقیاتی پروگراموں کے کل اخراجات کی ۹۰ فیصد رقم عطیہ کے طور پر ملتی ہے۔
- ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے صنعتی اعتبار سے پسماندہ ۲۴۱ اضلاع کو نئی صنعتیں قائم کرنے کے لیے سرکاری مالیاتی اور قرضہ جاتی اداروں سے بہ رعایت مالی امداد فراہم کرنے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔
- دیہی بے روزگاری کو دور کرنے کے لیے ۵۰ کروڑ روپے سالانہ کے اخراجات سے ایک زبردست پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ بیروزگاری کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے کچھ خاص پروگرام بھی چلائے جائیں گے۔
- دیہی علاقوں میں بجلی فراہم کرنے کے لیے ایک کارپوریشن قائم کیا گیا ہے جو پسماندہ دیہی علاقوں میں بجلی پہونچانے کے لیے ریاستی بجلی بورڈ کو رعایتی شرطوں پر رقم فراہم کر رہا ہے۔

★

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

شکر صنعت کی تنظیم نو کے لیے وزیر اعلیٰ اتر پردیش کی اپیل ● ● ● عوام کو موثر اور کارگزار نظم و نسق فراہم کرنے کے لیے وزیر اعلیٰ کا افسروں کو مشورہ ● ● ● سماج وادی نظام کے خواب کو حقیقت بنانے کے لیے سرگرم اور با مقصد تعاون ضروری ـــــ شری بھوگنا ● ● ● کھارا نہر کی تعمیر کا افتتاح ● ● ● تعمیر مکانات کے لیے ۸۳ لاکھ روپے کی منظوری ● ● ● کسانوں کے لیے آبپاشی کی پاس بکیں ● ● ● قومی بچت میں ۱۱ لاکھ روپے سے زیادہ رقم جمع ہوئی ● ● ● بیسک تعلیم سے متعلق عملے کو مہنگائی بھتہ ● ● ● بیسک اسکول لائبریریوں کے لیے محکمہ تعلیم کتابوں کا انتخاب کرے گا ● ● ● کنٹرول قیمت پر مٹی کے تیل کی آزادانہ فروخت ● ● ● جوانوں کی بیواؤں کو نقد انعامات ● ● ● متفرقات

وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری ہیم وتی نندن بھوگنا نے حال ہی میں شکر ملوں گنے مالکان اور مزدوروں سے اپیل کی کہ وہ شکر کی صنعت کی تنظیم کے طریقے دریافت کریں جو اس وقت قریب قریب نیم مردہ حالت میں ہے۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ صورت حال کو اسی وقت سدھارا جا سکتا ہے جب اس کی تو تنظیم کے لیے موثر اقدامات کیے جائیں۔

وزیر اعلیٰ نے ودھان بھون لکھنؤ کے تلک ہال میں شکر صنعت کی ۲۵ ویں سہ جماعتی سالانہ کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ریاست مالی دشواریوں سے گذر رہی ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ شکر صنعت کو ۱۰ ـــ ۲۰ سال پہلے کی حالت میں لانے کے لیے فوری طور پر ٹھوس اقدامات کیے جائیں۔ اس سے ریاستی معیشت میں یقیناً سدھار ہوگا۔

شری بھوگنا نے شکر صنعت کی موجودہ سنگین صورت حال پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ شکر ملوں کے مالکان، مزدور اور حکومت سبھی اس کے لیے ذمہ دار ہیں۔ شری بھوگنا نے ریاست میں صنعتوں کو درپیش سنگین مسائل کے مختلف اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ بعض افسران نے نہ تو گنے کی اقسام کو سدھارنے کے لیے مطلوبہ کارروائی کی اور نہ فی ہیکٹر پیداوار میں اضافہ کے لیے کوئی کوشش کی۔ اگر موثر اقدامات کیے جاتے تو ریاستی صنعتوں کو فروغ حاصل ہوتا اور تمام متعلقہ افراد مستفید ہوتے۔

شری بھوگنا نے کہا کہ ریاستی حکومت نے پانچویں منصوبے میں تحقیقاتی کام کی رفتار تیز تر کرنے اور گنا کاشتکاروں کو ضروری زراعتی ساز و سامان مہیا کرنے کے لیے ایک جامع اسکیم تیار کی ہے۔

شری بھوگنا نے کہا کہ کوئی بھی صنعت اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس کے ملازمین مطمئن نہ ہوں۔ انھوں نے کہا کہ شکر صنعت اور دیگر صنعتوں کے مزدوروں کے درمیان موجود زبردست عدم مساوات سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ مزدوروں کے متعدد مسائل ہیں مثلاً رہائش کے لیے مکان، بونس، بچوں کی تعلیم اور ان کے کام کے شرائط۔ ان مسئلوں کو فوری طور پر حل کیا جانا چاہیے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب شکر ملوں کے مالکان اور مزدوروں میں باہمی میل جول اور محبت کا جذبہ بیدار ہو۔

اس دو روزہ سہ جماعتی کانفرنس میں دیگر امور کے علاوہ

شرح اجرت میں اضافے ۷۳-۱۹۷۲ء کے لیے بونس کی ادائیگی اور پیرائی سیزن کے بعد غیر ہنر مند مزدوروں کے پابندی خدمت بھتہ میں اضافے کے بارے میں غور و خوض کیا جائے گا۔ وزیر محنت شری راج منگل پانڈے نے کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ حکومت اپنی پالیسی کے تحت مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتی رہے گی۔ لیکن حکومت یہ توقع رکھے گی کہ وہ پیداوار میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ نظم و ضبط کی پابندی کریں گے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ہماری پالیسی یقینی طور پر مالکوں کے خلاف نہیں ہے، اور حکومت صنعت کاروں کے مفاد کا بھی تحفظ کرے گی۔ لیکن ایسا نظم و ضبط کے پابند محنت کش مزدوروں کے مفاد کو پس پشت ڈال کر نہیں کیا جا سکتا۔ شری پانڈے نے کہا کہ مزدوروں کو وہ سب کچھ یقیناً دیا جائے گا جو واجب الادا ہے تاکہ ان میں یہ تاثر پیدا ہو سکے کہ وہ بھی شکر صنعت کی ترقی میں حصہ دار ہیں جس پر ریاست کے لاکھوں افراد کے مفاد اور خوش حالی کا انحصار ہے۔

شکر صنعت کے نمائندوں اور مزدوروں نے حکومت کو یقین دلایا کہ وہ اس صنعت کی ہمہ گیر ترقی میں پورا پورا تعاون کریں گے۔

× × ×

وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا نے ریاست کے افسروں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کریں اور حکومت کی اعلان شدہ بنیادی پالیسیوں کو کامیاب بنانے میں پورا پورا تعاون کریں۔ انھوں نے کہا کہ ملک کے عوام ان سے چاک و چوبند دیانت دار اور مستعد نظم و نسق کی توقع کرتے ہیں۔

وزیر اعلیٰ نے مزید کہا کہ افسروں کو چھوٹے بڑے کا امتیاز ختم کرنا ہوگا اور اپنا طرز عمل بھی بہتر بنانا ہوگا۔ انھوں نے آگاہ کیا کہ مفاد عامہ کے کسی بھی کام کے سلسلے میں حکومت اب ان کی کسی بھی قسم کی تساہلی یا بدعنوانی کو برداشت نہیں کرے گی۔

شری بہوگنا نے کہا کہ آج ہم سب کو بہت تیزی سے کام کرنا ہے اور اب کسی بھی طرح کی لاپروائی یا کاہلی کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ افسران کو تیز رفتار پروگرام کے نشانوں اور دیگر فلاحی پروگراموں کو جلد سے جلد پورا کرنا چاہیے۔ انھیں اپنے فرائض سے بخوبی آگاہ ہونا چاہیے۔ اگر کوئی غلط کام کرتا ہے یا کوئی بیوپاری بدعنوانی اور ذخیرہ اندوزی کا مرتکب پایا جاتا ہے تو انھیں اس کے خلاف سخت کارروائی کرنا چاہیے۔ حکومت چاہتی ہے کہ بددیانت بیوپاریوں کو کمر میں رسّا باندھ کر سیدھے جیل لے جایا جائے تاکہ دوسروں کو سبق حاصل ہو سکے اور بددیانتی کی لعنت ہمارے ملک سے جلد سے جلد ختم ہو جائے۔ فرقہ وارانہ کی آگ بھڑکانے والوں کے ساتھ بھی انھیں اسی قسم کا سلوک کرنا چاہیے جو ملک کے دشمنوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

وزیر اعلیٰ نے افسروں کو یقین دلایا کہ ان کے روزمرہ کے کاموں میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی لیکن انھیں بھی عوام اور عوامی نمائندوں کے ساتھ مسلسل رابطہ برقرار رکھنا چاہیے۔ انھیں عوام کے نمائندوں کا مناسب احترام کرنا چاہیے اور یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ افسران اور عوامی نمائندے گاڑی کے دو پہیوں کے مانند ہیں جن میں تال میل پیدا کیے بغیر ملک کا ترقی کی جانب گامزن ہونا مشکل ہے۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ افسران کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ہریجنوں کو سرکاری ملازمتوں میں مقرر، نمائندگی ملے اسی طرح ملازمین کے اعمال نامے کے اندراجات اور ترقی و تغیر کے معاملات میں بھی انھیں تساہلی نہ برتنا چاہیے اور صحیح فیصلہ کرنا چاہیے۔

شری بہوگنا نے کہا کہ ٹیکنوکریٹ اور بیوروکریٹ جیسے تنازعات پیدا کر کے ایک طبقہ کو دوسرے پر کیچڑ نہیں اچھالنا چاہیے۔ ٹیکنوکریٹ کا کام بھی اتنا اہم ہے جتنا کہ بیوروکریٹ کا۔ دونوں کو ایک دوسرے کی کارگزاری اور صلاحیت کا احترام کرتے ہوئے مربوط طور سے کام کرنا چاہیے۔

× × ×

وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا نے نوجوانوں سے اپیل کی کہ ملک کو آج جن چیلنجوں کا سامنا ہے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے

وہ سینہ سپر ہو کر آگے آئیں کیونکہ ان کے سرگرم اور بامقصد تعاون کے بغیر سماج وادی نظام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

شری بہوگنا نے نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ملک میں مختلف عقائد کے ماننے والے تمام شہریوں کو زندگی گزارنے کے مساوی حقوق حاصل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں غریب اور پسماندہ طبقوں کا خاص خیال رکھنا ہے جو استحصال کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ شری بہوگنا نے کہا کہ ملک کی خوش حالی سماج کے کمزور طبقوں کی خوش حالی میں مضمر ہے۔

ریاست کی ترقی کے سلسلے میں وزیر اعلیٰ نے کہا کہ بجلی تمام ترقیاتی اسکیموں کی بنیاد ہے۔ اسی لیے حکومت بجلی کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہی ہے تاکہ زراعت اور صنعت کی ترقی میں بجلی کی قلت کی وجہ سے کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ پڑنے پائے۔

× × ×

ضلع سہارن پور میں ۱۴ نومبر کو یوم اطفال کے موقع پر ۳۵ء۲۳ لاکھ روپے کی لاگت کی کھارا نہر کی تعمیر کا افتتاح کیا گیا۔ جمنا ندی کے بائیں کنارے پر تاجیوالا ہیڈ ورکس سے بہاؤ کی مخالف سمت میں تقریباً ۹ کیلومیٹر کے فاصلے پر جب ۲۰۱ کیلومیٹر لمبی اس نہر کی تعمیر مکمل ہو جائے گی جو ضلع سہارن پور میں ہر سال ۱۸۵۰۰ ایکڑ قابل کاشت آراضی کی آب پاشی ہو سکے گی۔ اس نہر سے پانی کے نکاس کی صلاحیت ۳۵۰ کیوسکس ہوگی۔

اس نہر کی تعمیر کا منصوبہ ریاستی حکومت کی غذائی پیداوار میں اضافے اور خود کفالت کے حصول کے لیے آب پاشی کی سہولتوں میں زیادہ سے زیادہ توسیع کی بھرپور کوششوں کی ایک کڑی ہے۔

× × ×

مکانات کی تعمیر اور شہری ترقی سے متعلق کارپوریشن (حکومت ہند) نے لکھنؤ اور وارانسی کی نگر مہا پالیکاؤں اور غازی آباد امپروومنٹ ٹرسٹ کو مکانات کی تعمیر کے لیے ۱۸۳ لاکھ روپے کا قرضہ منظور کیا ہے۔

قرضے کی رقم لکھنؤ میں ۳۴۳ مکانات، غازی آباد میں ۱۵۵۰ مکانات اور وارانسی میں ۳۶۴ مکانات کی تعمیر اور ۱۹۹ پلاٹوں کو ترقی دینے پر خرچ کی جائے گی۔

مذکورہ رقم میں سے ۵۴ لاکھ روپیہ لکھنؤ، ۵۰ لاکھ روپیہ وارانسی، اور ۷۹ لاکھ روپیہ غازی آباد کو دیا جائے گا۔ ریاستی حکومت نے قرضے کی کل رقم کی ضمانت دی ہے۔

× × ×

حکومت نے یہ احکام جاری کیے ہیں کہ ایسے کسانوں کو جن کی جوت ٹیوب ویل سے آب پاشی کے علاقوں میں ہے انھیں آب پاشی کی پاس بکیں دی جائیں۔ اسی ذیل میں یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ اُن پاس بکوں میں کسی خاص ٹیوب ویل سے آب پاشی شدہ رقبہ، بجلی کی یونٹوں اور پانی کی مقدار سے متعلق تفصیلات درج کی جائیں۔ ان پاس بکوں کو کسان اپنے پاس رکھیں گے اور اُن پر وہ اور متعلقہ آپریٹر دونوں دستخط کریں گے۔

یہ انتظام کسانوں کی دشواریوں کو دور کرنے کے لیے کیے گئے ہیں کیونکہ ٹیوب ویلوں سے پانی کی فراہمی کے طریقے میں کچھ نقص پیدا ہو گیا تھا اور آپریٹر پانی کی تقسیم میں بے ضابطگیاں کرنے لگے تھے۔

انھوں نے کسانوں کو مشورہ دیا کہ وہ پاس بکوں کو اپنے پاس رکھیں اور اس بات کو دیکھیں کہ متعلقہ ملازمین ان میں صحیح اندراجات کرتے ہیں یا نہیں۔ ملازمین کو یہ آگاہی دی گئی کہ وہ کسانوں کے ساتھ مناسب برتاؤ کریں۔

وزیر موصوف نے مزید کہا کہ اگر یہ تجربہ کامیاب ہوتا ہے اور اس طرح کسانوں کی دشواریاں دور ہو جاتی ہیں تو نہروں سے آبپاشی کے علاقوں میں بھی اس پر عمل درآمد کیا جائے گا۔

× × ×

قومی بچت نظامت اتر پردیش میں تمام اضلاع سے موصولہ اعداد و شمار کے مطابق اپریل سے ستمبر ۱۹۷۳ء تک قومی بچت میں ۲۲ء۷ کروڑ روپیہ جمع ہوئے جبکہ گزشتہ سال اسی مدت میں ۲۹ء۷ کروڑ روپیے جمع ہوئے تھے۔ ریاست میں قومی بچت

کے سلسلے میں ۷۴-۱۹۷۳ء کے لیے ۵۵ کروڑ روپیہ کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

ضلع الہ آباد نے اپنے مقررہ نشانے کے مقابلے میں ۷۵ء۷۰ فی صد رقم جمع کرکے اول مقام حاصل کیا۔ اسی طرح لکھنؤ اور رائے بریلی نے بالترتیب دوسرا اور تیسرا مقام حاصل کیا۔ ڈویژنوں میں لکھنؤ ڈویژن سرفہرست رہا جہاں ۹ء۳۴ فی صد رقم جمع کی گئی۔ الہ آباد ڈویژن نے ۷ء۳۴ فی صد اور فیض آباد ڈویژن نے ۳ء۲۴ فی صد رقم جمع کرکے بالترتیب دوسرا اور تیسرا مقام حاصل کیا۔

ریاستی حکومت نے حکم دیا ہے کہ سرکاری ملازمین کے مہنگائی بھتہ میں وقتاً فوقتاً جو اضافہ کیا گیا ہے وہ سرکاری ملازمین کی طرح بیسک تعلیم سے متعلق بورڈ کے تدریسی اور غیر تدریسی عملے کو بھی دیا جائے۔ اس حکم کے جاری کرنے کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ بعض مقامات پر مہنگائی بھتہ میں بڑھی ہوئی رقم صرف غیر تدریسی عملے کو ہی دی گئی ہے۔

حکومت نے اس سلسلے میں یہ وضاحت کی ہے کہ اتر پردیش بیسک تعلیمی بورڈ کے ملازمین سے مطلب تدریسی اور غیر تدریسی دونوں عملے سے ہے۔ اس لیے اضافہ شدہ مہنگائی بھتہ بورڈ کے دونوں زمروں کے ملازمین کو دیا جانا چاہیے۔

× × ×

اتر پردیش کا محکمۂ تعلیم مالیاتی سال رواں کے دوران جونیئر بیسک اسکولوں کی لائبریریوں کے لیے خریداری کے واسطے ہندی اور اردو کی ایسی کتابوں کا انتخاب کرے گا جو جونیئر بیسک اسکولوں کے بچوں کے لیے مفید ہوں گی۔

اس فیصلے کے پیش نظر مصنفین اور ناشرین کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ ہر کتاب کے چار مطبوعہ نسخے مفت پیش کریں اور اس کے ساتھ ہی فی کتاب دس روپے ریویو فیس اتر پردیش کے کسی بھی سرکاری خزانہ میں جمع کریں اور ٹریزری چالان پاٹھیہ پستک ادھیکاری اتر پردیش، ۶ مال ایونیو، لکھنؤ کو ۲۵ جنوری ۷۴-۱۹۷۳ء تک بھیج دیں۔ مقررہ تاریخ کے بعد موصول ہونے والی کتابوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ یہ کتابیں ۱۹۶۸ء سے قبل شائع نہ ہوئی ہوں اور ان کی قیمت فی کتاب تین روپے سے زیادہ نہ ہو۔ اس سلسلے میں تفصیلات اتر پردیش سرکاری گزٹ کے حصۂ چہارم میں شائع کی گئی ہیں۔

× × ×

ریاستی حکومت نے شہری اور دیہی علاقوں میں صارفین کو فراہم کیے جانے والے مٹی کے تیل کی مقدار پر عائد تمام پابندیاں ختم کردی ہیں اور اب صارفین کسی بھی بیوپاری سے کسی بھی مقدار میں حکومت کی مقرر کردہ قیمت پر مٹی کا تیل خرید سکیں گے۔

اتر پردیش کا مٹی کے تیل کا ماہانہ کوٹہ ۲۹ ہزار ٹن سے دوگنا کرکے ۵۸ ہزار ٹن کردیا گیا ہے اور سیمنٹ کے الاٹ شدہ کوٹے میں ۱۰ لاکھ ٹن کا خصوصی اضافہ کردیا گیا ہے جس کے نتیجے میں سیمنٹ کا سالانہ کوٹہ ۱۷ء۶۰ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۲۷ء۶۰ لاکھ ٹن ہوگیا ہے۔

مرکز نے ڈیزل آئل کی وافر مقدار میں فراہمی کی یقین دہانی کرائی گئی ہے اس لیے ڈیزل سے چلنے والی موٹر گاڑیوں کو زیادہ شرح پر بھاڑا اور کرایہ وصول کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

کاوال شہروں کو سیمنٹ کا فاضل کوٹہ الاٹ کرنے کے ساتھ ساتھ ان اضلاع کے لیے بھی اس کا بندوبست کیا گیا ہے جہاں اس وقت سیمنٹ کی قلت ہے۔

× × ×

ریاستی حکومت نے ہندوستانی بحریہ کے لفٹیننٹ ایچ۔ ایس۔ سروہی کی بیوہ شریمتی پی۔ جے سروہی کو جو ضلع بلند شہر کی رہنے والی ہیں، ایک ہزار روپیہ کا نقد انعام منظور کیا ہے۔ لفٹیننٹ سروہی کو ۱۹۷۱ء کی ہند پاک جنگ کے دوران غیر معمولی جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کرنے پر بعد از مرگ "مینشنڈ ان ڈسپیچ" سے سرفراز کیا گیا تھا۔

حکومت نے شریمتی ایم خاتون کو دو ہزار روپے کا نقد انعام دینے کا حکم بھی دیا ہے جو بعد از مرگ میڈل حاصل کرنے والے مرحوم لانس نائک حوالدار افضل علی وارثی کی بیوہ ہیں۔ اس سے

قبل یہ انعام متوفی جوان کے والد شری علیم الدین خاں وارثی لکھنؤ کو منظور کیا گیا تھا۔

متفرقات

پانی کی فراہمی کا تیز رفتار پروگرام۔ مرکزی حکومت نے ریاست میں مالیاتی سال رواں کے دوران پانی کی فراہمی سے متعلق تیز رفتار پروگرام پر عمل درآمد کے لیے منظور شدہ رقم میں جو ۲۵ء۲ کروڑ روپے کی تخفیف کی تھی، اس کی پھر منظوری دے دی ہے۔

اس پروگرام کے لیے مجموعی طور پر چار کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی تھی جو مالی دشواریوں کے پیش نظر تخفیف کے نتیجے میں صرف ۷۵ء۱ کروڑ روپے رہ گئی تھی لیکن اب اس سلسلے میں ریاست کو چار کروڑ روپے ملیں گے۔

ہریجنوں کے لیے مکانات۔ ریاستی حکومت اتر پردیش کے جیجھتی مواضعات میں ہریجنوں کے لیے مرکزی حکومت کی چلائی ہوئی ایک اسکیم کے تحت مکانات تعمیر کرے گی۔ اس مقصد کے لیے مرکزی حکومت نے ایک کروڑ ۱۵ لاکھ روپے کی رقم منظور کی ہے۔

اس اسکیم سے قبائل مندرجہ فہرست کے افراد جن میں صفائی مزدور، چمڑہ کمانے والے اور بے زمین مزدور شامل ہیں مستفید ہوں گے۔

شکر ملوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو مہنگائی بھتہ۔ حکومت اتر پردیش نے احکامات جاری کر دیے ہیں کہ شکر کی صنعت میں لگے ہوئے مزدوروں کو ۱۹۷۲-۷۳ء کے سیزن کے لیے قیمتوں کے کل ہند اشاریہ میں ہونے والے اضافہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے مہنگائی بھتہ دیا جائے۔

اس سیزن میں یعنی یکم جولائی ۱۹۷۲ء سے ۳۰ جون ۱۹۷۳ء تک کی مدت میں قیمتوں کے کل ہند اشاریہ میں ۱۹ پوائنٹ کا اضافہ ہوا ہے۔

مسوری کو مرکز سیاحت بنانے کا پروگرام۔ مسوری کو پانچویں پنج سالہ منصوبے کے دوران ۸۰ء۳۱ لاکھ روپے کی تخمینی لاگت سے سیاحت کے ایک مرکز کی حیثیت سے ترقی دینے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔

اس مرکز سیاحت میں ایک ریسٹوران، ایک بڑی جھیل اور سیاحوں کے لیے دھنولتی اور چکراتا میں دو آرام دہ بنگلوں کا بندوبست کیا جائے گا۔ اول الذکر میں ۲۴ اور آخر الذکر میں ۵۰ افراد کے ٹھہرنے کا انتظام ہوگا۔ اس مرکز سیاحت میں دھنولتی، چکراتا، ناگ پا تھر اور وہ مقام شامل ہیں جہاں ٹہری باندھ تعمیر کیا گیا ہے۔

یہ فیصلہ منصوبہ بندی کمیشن کے اس ورکنگ گروپ نے کیا ہے جو اتر پردیش کے پہاڑی علاقوں میں سیاحت کی ترقی کے لیے تشکیل دیا گیا ہے۔

اتر پردیش میں جنگلات کارپوریشن۔ ریاستی حکومت کی ایک تجویز کے تحت پانچویں پنج سالہ منصوبے کے دوران ایک ریاستی جنگلات کارپوریشن قائم کیا جائے گا۔

محکمۂ جنگلات کی پیداواری اسکیموں پر عمل درآمد کے لیے اگر ممکن ہوا تو کارپوریشن کے توسط سے مختلف بنکوں اور دیگر مالیاتی اداروں سے مالی امداد حاصل کی جائے گی۔

★

نقد و تبصرہ
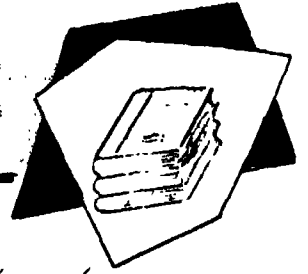
(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

فردوسِ نظر

مجموعۂ کلام حکیم شارب لکھنوی۔ صفحات : ۲۰۰
قیمت : چار روپے۔ ملنے کا پتہ : حکیم شارب ۳۲۹/۱۸ ترسی گنج، کاظمین روڈ۔ لکھنو نمبر ۳

حکیم شارب لکھنوی کی ذات محتاج تعارف نہیں ہے۔ قصائد، غزلیات اور مختلف نظموں میں ان کے کلام کے مجموعے چھپ کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعۂ غزلیات فردوسِ نظر ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں صفحہ ۴ پر جناب شارب کے مختصر سوانح حیات اور صفحہ ۱۹۳ پر فہرست غزلیات درج کی گئی ہے۔ اس فہرست میں رباعیات و قطعات کے علاوہ ۱۲۴ غزلیں درج ہیں۔ صفحہ ۱۵۲ پر حصۂ نظم کی فہرست ہے جس میں ۲۴ مختلف نظموں کا اندراج ہے۔

شارب لکھنوی کے کلام میں سادگی، معنویت، سلاست، روانی، جاذبیت، شوکتِ الفاظ، تشبیہات و استعارات کی بلندی، سہل و آسان انداز میں ہر قاری کے دل پر اپنا سکہ جما لیتی ہے۔ علامۂ اثر لکھنوی نے شارب کی شاعری کے بارے میں جو اظہار خیال کیا تھا اور جو زیر نظر مجموعے کے صفحہ ۵ پر نقل کیا گیا ہے وہ بالکل درست اور حقیقت پر مبنی ہے۔ فرماتے ہیں :

"ان کا (شارب) اسلوب خیال و انداز بیان اس بیمار ذہنیت اور سطحی تخیل سے کوسوں دور ہے جسے مجہولیت نے معیار غزل سمجھ لیا ہے۔ وہ جدید رجحانات سے باخبر ہیں اور نظموں کے علاوہ غزل میں بھی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور مسائل پر تنقید کرتے ہیں اور روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ شعر میں صحیح اثر اندازی کا راز کیا ہے۔"

مہر و وفا، صدق و صفا، عزم محکم، رضائے معبود، ہمت مردانہ، عظمت و جبروت خداوندی، فلسفۂ خلقت کائنات، حکمت و راز زندگی، حیات جاودانی، عظمت شہادت و قربانی، وجود باری تعالیٰ، خوف خدا، صبر و قناعت، تصور روز محشر اور اسی طرح کے دیگر اہم مسائل جناب شارب نے اپنے زیر نظر مجموعۂ کلام میں بڑی خوبصورتی اور سلاست کے ساتھ نظم کیے ہیں۔

اب حصۂ غزل سے کچھ اشعار منتخب کر کے درج کیے جاتے ہیں جن سے شارب لکھنوی کی غزل میں مہارت کا اندازہ لگایا جا سکے گا :

فریب خود کو دیا ہے یہ واقعی میں نے
کہ ایک خواب کو سمجھا ہے زندگی میں نے

اس شعر میں کتنے حسن و خوبی سے بے ثباتی عالم کو سمجھایا گیا ہے۔ اگر انسان آغاز زندگی اور مآل زندگی کو سمجھ لے تو یقیناً وہ فریب سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

کس طرح کشتی ہے طوفانوں میں رہ کر زندگی
اُن کو کیا معلوم جو ساحل پہ جا کے رہ گئے

جہد البقا کے لیے طوفان کا مقابلہ کرنا عمل پیہم اور عزم محکم کا وہ اعلیٰ و حکیمانہ ہدایت نامہ ہے جس کی تصویر اس شعر میں کھینچی گئی ہے۔

زندۂ جاوید ہیں وہ جو وفا کی راہ میں
موت کی آغوش کو منزل بنا کے رہ گئے

یہ شعر حق و صداقت کی ترجمانی میں قربانی پیش کرنے والوں کی حیات جاودانی کا واضح اور بدیہی ثبوت ہے۔ اس شعر میں شہدائے راہِ حق کا ایک لافانی کردار پیش کیا گیا ہے۔

پرورش پائی ہے آغوش میں طوفانوں کی
ہمیں آتا نہیں طوفاں میں ہراساں ہونا

جس جواں ہمتی، عزم محکم اور زمانے کے گرم و سرد کے مقابلے کے بعد ایک انسان بجا طور پر جو فخر کر سکتا ہے اس کا حقیقی دعویٰ اس شعر میں کیا گیا ہے۔

خدا کے ڈھونڈنے والے خدا مل جائے گا تجھ کو
مگر یہ شرط ہے پہلے خود اپنی جستجو کر لے

اس شعر میں حضرت علی کے مشہور قول کی ترجمانی کی گئی ہے کہ اگر انسان خود اپنے کو سنوار لے تو وہ یقیناً معرفت الٰہی کے بلند زینے تک پہنچ سکتا ہے۔

بہت گل چنے گلستانِ جہاں میں
مگر جب چلے ہم تو دامن تھا خالی

حیات مستعار کا جائزہ لینے کے بعد ایک خوش عقیدہ انسان اسی نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے جو اس شعر کا ماحصل ہے۔

شارب یہ جانتا ہوں کہ دنیا ہے بے وفا
چلنا پڑے گا پھر بھی اسی کارواں کے ساتھ

اہل دنیا سے تلخ تجربہ حاصل ہونے کے باوجود انسان جب تک زندہ ہے اہل دنیا سے بے تعلقی اختیار نہیں کر سکتا۔ اس شعر میں اہل دنیا کی بے وفائی اور اتحاد و تعلقات باہمی کی ضرورت کو بتایا گیا ہے۔

مجھ سے کہتے ہیں یہ طوفاں کے تھپیڑے بار بار
بھول کر بھی رُخ نہ کرنا جانب ساحل ابھی

یہ شعر عزم و استقلال کا محرک ہے۔

بنانا ہیں نئے جادے ادب کے واسطے شارب
اُڑانی ہیں خیالات کہن کی دھجیاں مجھ کو

جناب شارب نے شاعری میں جدید رجحانات کو جگہ دینے کی وکالت بڑے واضح انداز میں کی ہے۔

خود مشکلوں کو جس نے گلے سے لگا لیا
پھر اُس کے واسطے کوئی مشکل نہیں رہی

عزم محکم و عمل پیہم پر اگر کوئی شخص قائم ہے تو یقیناً اس کے لیے ہر مشکل آسان ہے۔

لکھنؤ مٹ گیا پھر بھی شارب
امتحاں گاہ اہل نظر ہے

اس شعر میں لکھنؤ کے عروج و زوال کو تسلیم کرتے ہوئے بحالت موجود بھی لکھنؤ کی عظمت کا دعویٰ کیا گیا ہے جو صحیح ہے۔

یہی مشکل ہے کہ اپنے کو بدل لے انساں
پھر زمانے کو بدلنا کوئی دشوار نہیں

بے شک انسان اپنی اصلاح کرلے تو وہ زمانہ کی بھی اصلاح کر سکتا ہے۔

خود اپنی منزل بنا رہا ہوں خود اپنا رہبر بنا ہوا ہوں
میں ایسی راہوں پہ جا رہا ہوں جہاں کوئی نقش پا نہیں ہے

اس شعر میں جدت پسندی کا دعویٰ کیا گیا ہے اور بڑے اچھے عنوان سے۔

ستم سے ظلم سے ٹکرا کے مرجانا تو آتا ہے
ہمیں جینا نہیں آتا ہے ظالم کی اماں لے کر

اس شعر کے پہلے مصرعے میں ہمت مردانہ اور دوسرے مصرعے میں غیرت حمیت انسانی اور جذبۂ خودداری کا بڑا ولولہ انگیز نقشہ کھینچا گیا ہے۔

فسانہ آکے سن لیجے کہ تھوڑی رات باقی ہے
سحر تک آپ آئیں گے سحر تک ہم نہیں ہونگے

تغزل کے ساتھ ساتھ یہ شعر بے ثباتی کے افسانہ اور گراں باری انتظار کا حقیقی ترجمان ہے۔

دولت والوں کے سائے میں پاؤگے کیا آرام
دھوپ پڑی تو اور تپے گی سونے کی دیوار

غریبی اور سرمایہ داری کے مسئلے پر یہ شعر نہایت لطیف پیرایہ میں حقیقت کا ترجمان ہے۔ شعر مشاہدہ اور عمل دونوں کے مطابق ہے۔

شدت تشنہ دہانی کا گلہ کس سے کریں
وہ بھی پیاسا نظر آیا جسے میخانہ ملا

موجودہ زمانہ میں عدم اطمینان اور غیر قانع زندگی کی واضح مثال یہ شعر ہے۔ تخیل قابل تعریف ہے۔

کس کو فرصت ہے کہ جو گریۂ شبنم دیکھے
سب کی ہنستے ہوئے پھولوں پہ نظر جاتی ہے

ایک اخلاقی پیام اور مساوات و مواسات کا ایک سبق ہے جس کی ترجمانی یہ شعر کر رہا ہے۔

—— ہٹا دو چند لمحوں کے لیے پردے تبسم کے
ذرا ہم بھی تو دیکھیں کون سا دل غم سے خالی ہے

مشہور ہے کہ دنیا جائے رنج و محن ہے۔ انتہائی خوبصورت طریقے پر اس تصور کی ترجمانی کی گئی ہے۔

حصۂ نظم سے بھی چند اقتباسات درج کیے جارہے ہیں جن سے نظم گوئی پر شارب جو قدرت رکھتے ہیں اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

جشنِ آزادی

وطن کو جنت دنیا بنانے کی قسم کھا لو   وطن کے واسطے ہر غم اٹھانے کی قسم کھا لو
قسم کھا لو کہ اب ہر غم میں ہم کو مسکرانا ہے   منا لو اس طرح گر جشنِ آزادی منانا ہے

جرم و سزا

جزا کیا ہے خود اپنے فرض کا احساس ہو جانا   سزا کیا شے ہے اپنے فرض سے غفلت شعاری ہے
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی   یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

یادِ صفی (لکھنوی)

السلام اے شاعر نباض فطرت السلام   السلام اے حامل رنگ حقیقت السلام
السلام اے محفل اردو کی زینت السلام   السلام اے ترجمان درد ملت السلام
ترجمانی درد کی کچھ اس طرح کی جوش میں   دیدیے ٹکڑے جگر کے ملک کی آغوش میں
اے صفی اے ترجمان زندگی تجھ پر سلام   اے نقیب کاروان زندگی تجھ پر سلام
اے ہلال آسمان زندگی تجھ پر سلام   کامیاب امتحان زندگی تجھ پر سلام
تیرے اک اک شعر پر اہل وطن کو ناز ہے   شاعری میں تیری ملک و قوم کی آواز ہے

عزم محکم

موجیں کیا چیز ہیں گرداب کی ہستی کیا ہے   ہم جو طوفان کو بھی ٹالیں گے تو ٹلنا ہوگا
سینۂ کوہ میں بھی راہ ملے گی ہم کو   موم کی طرح سے پتھر کو پگھلنا ہوگا
عزم محکم کے سہارے پہ بڑھایا ہے قدم   پھول سمجھیں گے جو کانٹوں پہ بھی چلنا ہوگا

وطن کے سپاہی

سر اپنا تو نے کیا باندھ کر کفن اونچا   ترے سبب سے ہوا ہے سر وطن اونچا
نہ چھو سکا جسے کوئی وہ آسمان ہے تو   مرے وطن کے سپاہی وطن کی آن ہے تو

زیر نظر مجموعے کی ترتیب میں سلسلہ بہ سلسلہ سال عیسوی کا لحاظ رکھا گیا ہے یعنی اس میں ۱۹۴۵ء سے ۱۹۷۲ء تک کا کلام جمع کر دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ قارئین اسے دل چسپی کے ساتھ پڑھیں گے اور تحریک حاصل کریں گے۔

یہ مجموعہ اتر پردیش اردو اکادمی کی مالی اعانت سے شائع کیا گیا ہے۔ اکادمی مستحق مبارکباد ہے کہ اس نے ایسے شعرا اور ادیبوں کی تخلیقات کی اشاعت میں مالی اعانت کا پروگرام بنایا ہے جو خود طباعت و اشاعت کا بار برداشت نہیں کر سکتے۔ کاغذ اور لکھائی چھپائی عمدہ اور ٹائیٹل پیج بھی دیدہ زیب ہے۔

★

پوش ۱۸۹۵۵ اشک

REGD. NO. LW/NP-17

سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری جنرل مسٹر لیونڈ بریژنیف ہندستان کے ۵ روزہ
دورے کے بعد واپسی سے قبل ہوائی اڈے پر وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ساتھ

نیا دور
جلد ۲۹ نمبر ۱۱
ماگھ ۱۸۹۵ شک
۲۶ جنوری ۱۹۷۴ء
چندہ سالانہ: پانچ روپے
فی پرچہ: پچاس پیسے
ایڈیٹر
خورشید احمد
پبلشر
شرومنی شرما
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش
پرنٹر
اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یو۔پی
مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہرحال متفق ہو

اپنی بات

غیر ملکی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے بعد ہم نے اپنے لیے ناز ہسی جمہوری نظام یعنی ایک ایسا نظام اپنانے کا فیصلہ کیا تھا جس میں بلا لحاظ مذہب وعقیدہ ہر شخص کو ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہوں گے اور اسے آزادی کی نعمتوں اور آسائشوں سے مستفید ہونے کا موقع ملے گا۔ چنانچہ اس فیصلے کے مطابق آج سے ۲۴ سال قبل ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو آزاد جمہوریہ ہند کا دستور نافذ ہوا جس میں مذکورہ بالا باتوں کی ضمانت دینے کے علاوہ ہر شہری کو تحریر، تقریر اور اظہار رائے کی آزادی بھی دی گئی جو جمہوریت کا ایک مسلمہ حق ہے۔ استقلال جمہوریہ کی سالگرہ ہر سال ہمارے ملک میں ایک قومی تہوار کے طور پر منائی جاتی ہے۔ یوم جمہوریہ جہاں ہم کو ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو کیے گئے مکمل آزادی کے عہد کی اور اس عہد کو عملی جامہ پہنانے اور آزادی کامل کے حصول کے لیے کی گئی بے شمار ہندستانیوں کی قربانیوں کی یاد تازہ کرنے اور انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کا موقع دیتا ہے وہاں یہ دن ہمیں اپنا محاسبہ کرنے اور سال بھر کی اپنی کارگزاریوں اور کوتاہیوں کا جائزہ لینے کا بھی موقع فراہم کرتا ہے۔ اسی لیے ہر سال ۲۶ جنوری کو ہم ایک عہد دہراتے ہیں جس میں ہم اپنے اس عزم مصمم کا اعادہ کرتے ہیں کہ ہم ہندستان کی آزاد جمہوریہ کے ایک وفادار شہری کی حیثیت سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ برتیں گے اور فرقہ وارانہ اتحاد کو فروغ دینے، ملک میں سوشلسٹ سماج کی تعمیر کے عمل کو تیزی کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچانے، امن وامان کو برقرار رکھنے میں خود بھی کوشاں ہوں گے اور اس ضمن میں حکومت کی جو بھی کوششیں ہوں گی ان میں بھرپور تعاون کریں گے۔ اسی کے ساتھ ہم تحریکوں اور نظریات سے علاحدہ رہنے اور ان کی ہمت شکنی کرنے کا بھی عہد کرتے ہیں جو قومی یکجہتی کے احساس کو کمزور کرتے ہیں اور امتیازات کے رجحان کو خواہ وہ کسی سطح اور نہج کے ہوں، ہوا دیتے ہیں۔ ایک بار پھر جشن جمہوریہ کی تقریبات قریب آ گئی ہیں۔ بدقسمتی سے اس وقت ہم کو ایسے مسائل اور مشکلات کا سامنا ہے جن سے ملک کبھی بھی دوچار نہیں ہوا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بعض مشکلات عالمی اسباب کے باعث پیدا ہوئی ہیں لیکن ایسے حالات جو مفاد پرست طبقے کی چالوں، سماج واد کے مخالفین کی ریشہ دوانیوں نیز سماج اور ملک دشمن عناصر کی سرگرمیوں کا نتیجہ ہیں، ان کا ہمیں ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہوگا۔ البتہ یہ مقابلہ ہڑتالوں، متشددانہ تحریکوں اور احتجاجوں، نظم وضبط کی خلاف ورزیوں، لاقانونیت، فرقہ وارانہ کشیدگیوں کے ذریعہ اور قومی املاک کو تباہ وبرباد اور ذرائع آمد ورفت میں رخنہ اندازی کر کے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تشدد، توڑ پھوڑ، ہڑتال بند اور اس طرح کی دوسری کارروائیوں سے جہاں پیداوار متاثر ہوتی ہے اور قلت پیدا ہوتی ہے وہاں ذخیرہ اندوزوں، چور بازاری کرنے والوں اور نفع خوروں کو اپنی سرگرمیاں بڑھانے کا موقع ملتا ہے اور وہ مصنوعی قلت پیدا کر کے گرانی میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس لیے جشن جمہوریہ کے موقع پر ہمیں ایک بار پھر سچے دل سے عہد کرنا ہوگا کہ ہم ہر اس صورت حال کا مقابلہ پوری طاقت سے کریں گے جس سے شہری زندگی مفلوج ہوتی ہو، پیداوار میں خلل پڑتا ہو، سماج واد کی طرف ملک کو لے جانے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو، گرانی میں اضافہ ہوتا ہو اور ضبط ونظم، امن وامان اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی مجروح ہوتی ہو۔ حکومت ملک میں سماج واد لانے، غریب اور کمزور طبقوں، خستہ حال افراد اور دبے کچلے لوگوں کو اوپر اٹھانے، ان کے لیے ضروریات زندگی فراہم کرنے اور دوسرے شہریوں کی طرح ان کے واسطے بھی ترقی کی راہیں کھولنے کے سلسلے میں جو کوششیں کر رہی ہے، ان میں پورا پورا تعاون کرنے کے لیے ایک نئے عزم وارادے کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔ یہی وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اگر آج ہم اس میں تساہلی برتتے ہیں تو صرف یہی نہیں کہ کل ہمیں اس نسل کے سامنے جو ابھر رہی ہے اور پروان چڑھ رہی ہے، جوابدہ ہونا پڑے گا بلکہ تاریخ بھی ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔

انتخابات

ملک کی کئی ریاستوں کی طرح اتر پردیش میں بھی عام انتخابات فروری میں ہونے والے ہیں۔ رائے دہندگی کا جمہوری حق ہمارے دستور نے ہمیں دیا ہے۔ اس حق کو جس طرح استعمال کیا جاتا ہے اس سے ہماری قومی اور سیاسی بیداری کا پتہ چلتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس مرتبہ بھی ہم ترغیب وتحریص سے بالاتر ہو کر اور اشتعال انگیزیوں اور خوف وہراس کا شکار ہوئے بغیر اپنے حق رائے دہندگی کا استعمال کریں تاکہ عام انتخابات آزادانہ اور پرامن فضا میں ہو سکیں۔ عوام کی صحیح نمائندہ حکومت منتخب کرنے کا یہی واحد طریقہ ہے۔ توقع ہے کہ اتر پردیش کے عوام اپنے تہذیبی روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے عام انتخابات کے پرامن فضا میں مکمل کیے جانے میں نظم ونسق کا ہاتھ بٹائیں گے۔

—— ایڈیٹر

جشنِ جمہوریت

نازش پرتاب گڑھی

زہے یہ ارضِ ہمالہ یہ رشکِ وادیٔ طور — خوشا یہ جشنِ مسرّت بہ نصرتِ جمہور
افق سے تا بہ افق صرف آدمی زادے — رہے نہ اب کے وہ دارا، نہ قیصر و فغفور
کبھی تھمی نہیں عرصے تک اک مقام پہ زیست — کہیں رہا نہیں تادیر ظلمتوں کا غرور
نہ زندگی ہمہ گریہ، نہ تیرگی کو دوام — نہ آسمان ہے جابر، نہ آدمی مجبور
بہ نامِ آدمِ دور آفریں، یہ جشن تمام — یہ عصرِ نو کہ ہے منسوبِ عظمتِ جمہور
ہمارا خون بہا تھا جو کل بیاباں میں — ہوا ہے آج وہ دھرتی کی مانگ کا سیندور
نفس نفس میں شعورِ حیات ملتا ہے — قدم قدم پہ ہے تعمیرِ زندگی کا ظہور

نگاہ عرش نشیں ہے، دماغ روشن ہے
ہوائیں تیز ہیں لیکن، چراغ روشن ہے

سفر کٹھن ہے مگر تم نہ ہمتیں ہارو — بڑھے چلو سوئے منزل بڑھے چلو یارو
پگھلتی جائیں گی رستے کی ظلمتیں خود ہی — قدم بڑھائے چلو تیز گام سیّارو!
سنورتا جائے گا ہر خار زار کا دامن — کھلو کچھ اور گل و نسترن کے نظّارو!
کہیں کہیں ابھی ظلمت ہے بزمِ ہستی میں — ابھی کچھ اور بھی چمکو زمیں کے مہ پارو!
تھرک رہی ہے ابھی موت کی سی پرچھائیں — کچھ اور تیز روی اے حیات کے دھارو!
ہزار ناز سے کرتے ہوئے کلاہ کو کج — ہزار فخر سے تم بھی یہ کہہ سکو یارو!

کھلا رہے ترے عارض پہ رنگتوں کا چمن
سلام تجھ پہ ہو صبحِ دیارِ گنگ و جمن!

—— پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب

غالب کا خط اُن کے شاگرد سید احمد حسین میکش کے نام ہے اور غالب کے نام دونوں خط منشی یحییٰ علی خاں کے ہیں۔ یہ تینوں خط غیر مطبوعہ ہیں۔ غالب کے مجموعۂ خطوط پنج آہنگ میں میکش کے نام صرف ایک خط ہے۔ احسان اللہ خاں ممتاز کی فارسی مثنوی بحر امواج انبیا و مرسلین کے حالات میں ہے۔ اس کو شیخ عبداللہ نے اپنے مقدمے کے ساتھ ۱۳۴۲ھ (۱۹۲۳ء) میں شایع کیا۔

منشی یحییٰ علی خاں نے ایک کشکول میں اپنی اور اپنے چھوٹے بھائی منشی باقر علی خاں کی متعدد تحریریں اور نظمیں درج کرکے اپنے ہاتھ سے خط شفیعا میں لکھا۔ کشکول کے سرورق کی عبارت یہ ہے "نقل بعضے از نگارشات منشی محمد یحییٰ علی خاں ولد میر منشی ثابت علی خاں بہادر ابن امین الانشاء رونق علی خاں مرحوم ابن منشی فیض محمد پالکی یاب و جاگیردار عہد نواب آصف جاہ بہادر۔" یہ کشکول اور مثنوی بحر امواج کا مقدمہ زیر قلم مضمون کے دو معتبر ماخذ ہیں۔

ملک الشعراء میر قمر الدین منت کے شاگرد ممتاز الشعراء مولوی شیخ احسان اللہ خاں ممتاز اناؤ کے رہنے والے اپنے زمانے میں فارسی کے بڑے نامی نثار اور شاعر تھے۔ ۱۱۷۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۵ھ (۱۸۵۷ء) میں ستانوے[۹۷] برس کی طویل عمر میں انتقال کیا۔ وہ اودھ کے فرماں روا نواب سعادت علی خاں کے عہد میں لکھنؤ میں مقیم اور معزز عہدوں پر فائز رہے۔ پہلے مفتی اور پھر عمدۃ الاقتدار اور داروغہ عدالت فوجداری مقرر ہوئے۔ ان کے شاگردوں میں ملاّنواں ضلع اناؤ کے رہنے والے دو بھائی منشی یحییٰ علی خاں یحییٰ اور منشی باقر علی خاں باقر بھی تھے۔[۱] فارسی انشا پردازی ان کا آبائی امتیاز تھا۔ منشی یحییٰ علی خاں لکھنؤ میں داروغہ اخبار گشتی تھے۔ ان کے بیٹے منشی ولایت علی ولایت درویشی اختیار کرکے صفی پور ضلع اناؤ میں مقیم ہو گئے۔ اُن کے مرشد نے اُن کو محمد عزیز اللہ شاہ' کا لقب عطا کیا۔ اس کے بعد وہ عزیز بھی تخلص کرنے لگے۔ فارسی کے زبردست شاعر اور نثار تھے۔ اُردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ نثر و نظم میں پینتیس[۳۵] کتابیں ان سے یادگار ہیں۔ ان سے اور مرزا غالب سے خط کتابت ہوتی تھی اور غالب ان کی فارسی دانی پر فخر کرتے تھے۔ راقم حروف نے اپنے لڑکپن میں ایک بزرگ سے سنا تھا کہ غالب نے ایک خط میں منشی ولایت علی کو لکھا تھا کہ یہاں میں غالب اور وہاں تم غالب۔

منشی یحییٰ علی خاں کے چھوٹے بھائی منشی محمد باقر علی خاں باقر فارسی نثر و نظم میں بڑے بھائی سے بھی زیادہ مہارت رکھتے تھے۔

---

[۱] منشی یحییٰ علی خاں، اُن کے بھائی منشی باقر علی خاں اور بیٹے منشی ولایت علی ولایت عرف عزیز اللہ عزیز کے حالات کے لیے دیکھیے عیارِ غالب مرتبہ مالک رام میں راقم کا مقالہ خطوط مشاہیر بنام ولایت و عزیز صفی پوری شاگرد غالب۔

نثر نگاری میں بالخصوص ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔

"اعیان شہر اتفاق داشتند کہ مثل باقر علی خاں نثارے دیگر در لکھنؤ نیست۔" انھوں نے چوبیس[۲۴] کتابیں نثر میں لکھیں، جن میں صرف دو یعنی شعلۂ جانسوز اور مرآۃ الجمال چھپ کر شائع ہوئیں۔ شاعر ایرانی مرزا ناطق مکرانی ان کی مدح میں لکھتا ہے:

در نظم توی فیضی ثانی باقر   در نثر ابوالفضل زمانی باقر
کس نیست چو تو بہ نکتہ دانی باقر   در ہند کہ جاوید بمانی باقر

منشی یحییٰ علی خاں کے کشکول میں مرزا غالب کے ایک خط کا اقتباس بھی درج ہے۔ یہ خط احمد حسین خاں میکش کے نام اور اس کا یہ اقتباس منشی یحییٰ علی خاں سے متعلق ہے اس اقتباس کے عنوان کی عبارت یہ ہے:

"فقراتے کہ جناب مرزا محمد اسد اللہ خاں غالب شاہجہاں آبادی در ضمن خط اسمی شاگرد رشید خود احمد حسین خاں میکش تحریر نمودہ اند۔

اور اقتباس حسب ذیل ہے:

"انچہ از مہرورکوی (کذا) و مہربانی منشی محمد یحییٰ علی خاں صاحب نسبت خویشتن رقم کردہ اند۔ محبت آں فرخندہ گہر در دلم جا کرد آں کہ شما را چوں من عزیز دارد من چوں عزیزش ندارم۔ شفقتے کہ بر شما می کنند منتے است کہ بر من می نہند۔ و چوں نوشتہ اند کہ یحییٰ تخلص می کنند و سخن می گویند۔ سلام من بہ ایشان و کلام ایشان بمن باید رسانید۔"

جواب از محمد یحییٰ علی عفی اللہ عنہ

(آپ نے جو اپنی نسبت منشی محمد یحییٰ علی خاں کی مہرورزی اور مہربانی کا حال لکھا ہے اس سے اُس فرخندہ گہر کی محبت میرے دل میں جاگزیں ہوگئی۔ جو آپ کو میری طرح عزیز رکھے بھلا میں کیونکر نہ عزیز رکھوں۔ جو شفقت وہ آپ پر فرماتے ہیں دراصل احسان ہے جو وہ مجھ پر کرتے ہیں۔ اور چونکہ آپ نے لکھا ہے کہ وہ یحییٰ تخلص کرتے ہیں اس لیے میرا سلام اُن کو اور اُن کا کلام مجھ کو پہنچے)

نواب عالی جناب فیض رسانا۔ از روزے کہ بہ ملاقات جناب میر احمد حسین خاں میکش مسرور شدہ ام و کیفیت بر می دارم قلم کم و کیف آں نمی تواند نگاشت و از بلند رتبگی جناب وا نہ بہتے داشتیم اگر از اشتیاق آستانۂ فیض کاشانہ حرفے زنم حد خود نمی بینم کہ بہ کدام امر این آرزو ہا تواں نمود کہ خلق خلقی والا دست الطاف و کرم بر سرم نہاد و سر مارا از منت باخم کردہ نا اید مشتاق لقائے مبارک ساخت۔ اگر عاری نویسم از نادانستن عار بر دارم و اگر بہ رنگین رنگین طرازی سازم رنگ ارژنگ نہ دارد آخر رنگ بر وشکنم۔ و اگر بہ نظم سخنے منتظم کنم این کلام ست ناموزون و دال بر زبونی این زبون۔ پس کدام لفظ و معانی پیدا کنم کہ شائستہ مدح و ثنائے والامی آید و شکرگذاری و اشتیاق غائبانہ عرض نماید

ایں طرفہ گلے نگر کہ ما را بشگفت
نے رنگ تواں نمود نے بوئے بہفت

این قدر گستاخی می نماید کہ کار دل از دست اشتیاق خراب است و دیدۂ دیدار طلب پر آب۔ الّا بہرکیف چوں از آں سو دلداریہا شدہ است ختم کلام بر این معنی است۔

اسداللہ اسد گر بہ مددگاری دل
زہرۂ شیر بود آب ز پاداری دل

و چوں از کلام موزوں طبعان شب را بہ روز آوردہ ام از تاثیرش گاہ گاہے نعرہ موزوں کردہ ام والّا۔

شاعری فن شریف است ولا کار تو نیست

و خان ممدوح انچہ نوشتہ خوبی خود کردہ و بندہ را شرمندہ۔ نیک چوں خود نیک داند جملہ را۔

(نواب عالی جناب فیض رسانا
جس دن سے مجھے جناب میر احمد حسین خاں میکش سے ملاقات کی مسرت حاصل ہوئی ہے، اس دن سے میری جو کیفیت ہے قلم اس کے کیف و کم کو لکھ نہیں سکتا۔ جناب کی بلند رتبگی کے سامنے اپنے اشتیاق ملاقات کا اظہار کرتے نہیں بنتا تھا کہ کس بساط پر ایسی آرزو میں زبان پر لائی جائیں، ایسے میں آپ نے اپنے خلق و مروت سے کام لے کر میرے سر پر دست کرم رکھا اور اس احسان سے میرا سر خم اور مجھے پہلے سے زیادہ مشتاق ملاقات کر دیا۔ اگر نثر عاری لکھے بیٹھوں تو اپنی ناواقفیت سے عار ہے، اگر نثر رنگین میں رنگین طرازی کروں تو اس میں بھی کوئی رنگ ارژنگ نہیں، اور اگر نظم میں سخن کو منظم کروں تو یہ بھی ناموزوں بات اور مجھ زبوں کی زبونی پر دال ہے۔ پھر کون سے لفظ و معنی پیدا کروں کہ جو آپ کی مدح و ثنا کے شایان ہوں اور شکرگزاری اور اشتیاق غائبانہ کا اظہار کر سکیں۔

ایں طرفہ گلے نگر کہ ما را بشگفت   نے رنگ تواں نمود نے بوئے نہفت

البتہ اتنا گستاخانہ عرض کرتا ہوں کہ اشتیاق کے ہاتھوں دل کا حال خراب اور دیدۂ دیدار طلب پُر آب ہے۔ بہرکیف چونکہ آپ کی جانب سے دلداری ہوئی ہے لہٰذا ختم کلام اس طور پر ہے،

اسداللہ اسد گر بہ مددگاری دل   زہرۂ شیر بود آب ز پاداری دل

اور چونکہ موزوں طبعوں کا کلام پڑھ پڑھ کر رات کو دن کیا کرتا ہوں اس لیے اُسی کی تاثیر سے کبھی کبھی کوئی نعرہ موزوں کر لیتا ہے ورنہ

ناگہ ۸۹۵ اشک

(شاعری فنِ شریف است ولا کار تو نیست
اور خانِ ممدوح نے جو کچھ لکھا اس سے ان کی خوبی ظاہر اور بندے کو شرمندگی حاصل
ہوئی : نیک چون خود نیک داند جملہ را)

یہ خط لکھنے کے کچھ مدت بعد منشی یحییٰ علی خاں نے غالب کو دوسرا
خط لکھا۔

رقعۂ ثانیہ بنام اسداللہ خاں غالب

نوابِ عالی جناب فیض رسانا۔ سر بہ تسلیم خم است چنانکہ دل
ہمچو قبلہ نما بہ رجوعِ قبلہ ہمدم۔ دگر مدّت دو سال سر آمد
کہ نامۂ موعودِ میر احمد حسین بہ سرم نہ رسید و سرم از ہوائش
تہی است و از خود خالی۔ از اخلاقش بعید آمدم و از سراسیمگی
نزدیک بندہ نیز در غیبتش بیمار گردیدم و بہ مقام تا بہ بستر
رسیدم۔ ہر کہ دید نشناخت و ہر کہ شنید دل باخت و توقع
برداشت۔ حالا کہ قدر از دستِ قضا باز ستانید و عمرِ دوبارہ
یافتیم و توان در جان و روان آمد نعرۂ اوّل کہ زدم بادِ دوست
بود کہ در دیدہ و دل ہمہ اوست بود۔ لراقمہ

دردل و دیدہ کردہ ای منزل   از تو جاناست دردِ جاں حاصل
ذکرِ احمد حسین بر لبِ ماست   فکرِ تو نیز با دلم واصل

معہذا ذرّہ را پرتوِ آفتاب ذریعہ و قطرہ را تموجِ دریا وسیلہ
و آن پرتو و موج نیز از جانب جناب میر احمد حسین بودہ است
کہ رُخ بہ ما گردیدہ و بہ ساحتِ دلم تابیدہ و الّا بہ کدام سرمایہ
ہمدستان توان شد و یاد خود را بجائے خود بہ آن آستان
توان جا داد۔ الغرض چنانکہ حضرتِ شان باعثِ پرسشِ و
افتخارِ ما از جانبِ غالبِ کلّ غالب شدہ بود حالا ہم پرسش
او سببِ اعتبارِ من و تحریکِ خامۂ مشکین شمامہ شود عجیبے نیست
بل بزرگانِ اعتبارِ خرداں افزودہ اند۔ اگر در زمرۂ ممتاز
دانستہ اعتبار بخشند و از آن خود نگرند نیز گنجائش ہا دارد
و الّا یارائے این آرزومندیم ظاہر است کہ بہ کدام لیاقتِ و
قابلیتِ خود را زیبائے این معنی توان دید۔

ہاں مگر لطفِ شما پیش نہد گامے چند

باقرِ باقر اگر زندہ می بود سزاوارِ بندہ می بود۔ کلامِ مایاں را میر
احمد حسین رسانیدہ باشد و مشمولِ رائے گردانیدہ۔ و گر از
مولانا فخرالدین خوشنویسِ خطِ شکستہ کہ شکستہ بہ دلم غائبانہ
رسانیدہ و در میانش رابطِ خط و اسطہ نیز استفسارے است
اگرچہ پیشِ پرسشِ میر احمد حسین گنجائش دگر در نظر نیست لیکن از
جلوہ گاہِ دوست است ہمہ اوست است۔ اے یحییٰ
زینہار زینہار خبردار و شرطِ ادب نگہ دار۔ زیادہ از حدِ خود
و راہ بیہودہ مرو و بدیں اکتفا است۔

کردم از عقل سوالے کہ بگو ایماں چیست
عقل در گوشِ دلم خواند کہ ایماں ادب است

و از آں سو ہمیں زیبا است

لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

والسلام مع الاکرام

(نوابِ عالی جنابِ فیض رسانا
سرِ تسلیم کے واسطے خم ہے جیسے دل قبلہ نما کی طرح آپ کی طرف رجوع کیے ہوئے ہے۔ دو سال
کی مدت ہوگئی کہ میر احمد حسین کا موعودہ خط مجھے نہیں ملا اور مجھے اس کی خواہش کے سوا اپنی خبر نہ
یہ بات ان کے اخلاق سے بعید ہے اور اسی وجہ سے میں سراسیمگی کے نزدیک آپہنچا ہوں۔ میں
ان کی غیر موجودگی میں بیمار پڑا اور بستر سے لگ کر رہ گیا۔ جس نے دیکھا وہ پہچان نہ سکا جس نے سنا
گھبرا گیا اور امید چھوڑ بیٹھا۔ اب جبکہ قسمت مجھے قضا کے ہاتھوں سے نکال لائی ہے اور میں نے دوبارہ زندگی
پائی اور جان میں جان آئی تو پہلا نعرہ جو میں نے مارا وہ دوست کے لیے تھا کہ دیدہ و دل میں وہی وہ تھا

دردل و دیدہ کردہ ای منزل   از تو جاناست دردِ جان حاصل
ذکرِ احمد حسین برلبِ ماست   فکرِ تو نیز با دلم واصل

معہذا ذرّے کے لیے پرتوِ آفتاب ذریعہ اور قطرے کے لیے تموجِ دریا وسیلہ ہے اور یہ پرتو و موج کا وسیلہ
مجھے جناب میر احمد حسین کی بدولت حاصل ہوا ورنہ میرا کیا مقدور تھا کہ آپ سے ہم کلام ہوتا اور آپ کو اپنی
یاد دلاتا۔ الغرض جس طرح ان کی ذات غالبِ کل غالب کی جانب سے میری پرسش کا باعث ہوئی
اسی طرح ان کی پرسش اگر مجھے شرفِ اعتبار بخشے اور آپ کے خامۂ مشکیں شمامہ کو تحریک دے تو کوئی
بات نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ بزرگوں نے خردوں کا اعتبار بڑھا دیا ہے۔ اگر آپ از خود مجھے اپنی توجہ سے نوازیں
اور اپنا جانیں تو خیر ورنہ ظاہر ہے کہ میں ایسی آرزو کی ہمت کہاں کر سکتا ہوں اور کس لیاقت و
قابلیت کے بھروسے پر خود کو اس عنایت کا مستحق سمجھ سکتا ہوں :

ہاں مگر لطفِ شما پیش نہد گامے چند

باقرِ باقر اگر زندہ ہوتا تو سزاوارِ بندہ ہوتا۔ میرا کلام میر احمد حسین نے آپ کے ملاحظے سے گزارا ہو
دوسرے یہ کہ مولانا فخرالدین جو خطِ شکستہ کے خوشنویس ہیں اور جنھوں نے غائبانہ میرے دل
سے یکجائی ہے۔ ان کے متعلق بھی پوچھنا ہے۔ اگرچہ میر احمد حسین کی پرسش کے سامنے کسی دوسرے
کی گنجائش نہیں لیکن چونکہ دوست کی درگاہ ہے اس لیے ہمہ اوست کا عالم ہے۔ اے یحییٰ زینہار
زینہار، خبردار، شرطِ ادب ملحوظ رکھ، اپنی حد سے بڑھ کر نہ بول اور بے راہ مت ہو۔ بلکہ اسی پر اکتفا کر

کردم از عقل سوالے کہ بگو ایماں چیست   عقل در گوشِ دلم گفت کہ ایمان ادب است

اور ادھر سے یہی مناسب ہے :

لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش   والسلام مع الاکرام)

ان خطوں کی تاریخِ تحریر معلوم نہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ منشی یحییٰ علی
نے ان کو اپنے کشکول میں ۲۲ محرم سنہ ۱۲۶۹ھ کو نقل کیا تھا۔

★

میرے وطن میرے وطن

افتخار اعظمی

میرے وطن میرے وطن
گل پوش تیری وادیاں
سرسبز تیری کھیتیاں
تو پرتوِ حسنِ جہاں
تو رشکِ ماہ و کہکشاں
تو نازشِ دُرِّ عدن
میرے وطن میرے وطن

تو نور ہے خورشید کا
تو چاند کی دلکش کرن
تیرے چراغوں کی لویں
چاروں طرف ہیں ضو فگن
اک انجمن ہے یہ جہاں
اور تو ہے شمعِ انجمن
میرے وطن میرے وطن

یہ تاج کا حسنِ جواں
یہ نور و نکہت کا سماں
یہ دل کی رنگیں داستاں
انگشتریٔ دہر میں
جیسے کوئی لعلِ یمن
میرے وطن میرے وطن

یہ ناز اور یہ دلکشی
یہ روپ اور یہ زندگی
یہ حسن اور یہ بانکپن
جیسے کہ برگِ یاسمن
جیسے کہ چوتھی کی دلہن
میرے وطن میرے وطن

اک جنتِ ارضی ہے تو
اک پیار کی نگری ہے تو
لالہ رخوں کا دیس ہے
عشاق کی بستی ہے تو
اے وادیٔ سرو سمن
میرے وطن میرے وطن

تو انجمِ علم و ادب
تو مہرِ عقل و آگہی
تو نیّرِ شعر و سخن
تو فلسفے کی چاندنی
تو ماہتابِ فکر و فن
میرے وطن میرے وطن
میرے وطن میرے وطن

ہندستانی جمہوریت کا ارتقاء

انیسہ نصرت

کم و بیش ساٹھ سال قبل جیمس برائس نے اپنی مشہور و معروف تصنیف (MODERN DEMOCRACIES) کے پیش لفظ میں لکھا تھا: ”ایک ایسا موضوع، جس کے متعلق تصنیفات کی ابتدا افلاطون اور ارسطو کے عہد سے شروع ہوتی ہو اور جسے اب تک ہزاروں مصنف اور زیادہ دقیع بنا چکے ہوں اس پر اضافہ کرنا اور اس میں نئی بات پیدا کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔“ برائس کی یہ رائے بڑی حد تک درست ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ وسیع معنوں میں اور بنیادی طور پر ہم رنگ، ہم مزاج ہونے کے باوجود جمہوریہ یا جمہوریت کا تجربہ، وہ کسی چھوٹے ملک میں ہو یا ہندستان ایسے عظیم ملک میں، اپنی تفصیلات میں یقیناً دوسرے سارے تجربات سے مختلف ہوتا ہے۔

نظریاتی مباحث سے قطع نظر اگر بالکل عملی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ایک ایسے ملک میں جمہوریت کا تجربہ، جہاں اس کی جڑیں گہری اور زندگی میں پیوست ہیں، اس ملک کے تجربہ سے یقیناً مختلف ہوگا جہاں اس پودے کو کسی دوسری جگہ سے اکھاڑ کر لگایا گیا ہو۔ ایک جگہ احتیاط کے باوجود مزید آزادیوں کے تقاضے ہوں گے تو دوسری جگہ محتاط آزادیاں بھی کم از کم فکر و نظر کی بیڑیوں میں اسیر ہوں گی۔

ہندستان کی تاریخ ہم تک جس طرح پہنچی ہے یا پہنچائی گئی ہے اس سے عام شخص تو یہی نتیجہ نکالے گا کہ ہمارا سارا سیاسی ورثہ بادشاہوں، راجاؤں کے جنگ و جدال اور لڑائیاں جیتنے اور لڑائیاں ہارنے کی داستان ہے۔ عوام اس تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتے۔ عوام کے مطالبات، ان کی خواہشات اور آرزوئیں، ذرائع پیداوار، معاشیات اور معاشرت سب ایک خوبصورت پردے پر ناچتی ہوئی کٹھ پتلیاں معلوم ہوتی ہیں جن کو حرکت دینے والی بادشاہ کی خواہش کی انگلیاں ہیں جو پیچھے سے انھیں نچا رہی ہیں۔ لیکن یہ ہماری تاریخ کا نہ صرف غلط بلکہ نہایت گمراہ کن تصور ہے۔

جمہوریت کے تقریباً اولین تجربے ہندستان میں ہوئے۔ ایسی سلطنتیں اس سرزمین پر ایک عرصہ تک قائم رہیں جن میں بڑے سیاسی فیصلوں سے لے کر چھوٹے چھوٹے مسائل تک پارلیمنٹ میں طے پاتے تھے۔ اور اس پارلیمنٹ کے ممبران کے انتخاب، کا طریقہ، کورم کے اصول، ووٹ ڈالنے کے طریقے، حد یہ ہے کہ خفیہ ووٹنگ کے سارے اصول طے تھے اور ان پر عمل بھی ضرور ہوتا تھا۔ پارلیمنٹ، اسمبلی — یہ نام ضرور نیا ہے لیکن ہندستان کے لیے ان کا تصور نیا نہیں۔

سن عیسوی سے چھ سو سال قبل ہندستان میں ایسی بہت سی ریاستیں موجود تھیں، بڑی اور چھوٹی، جن پر شخصی حکمرانی نہیں تھی بلکہ ان کی حیثیت جمہوریتوں اور چند سری (OLIGARCHIES) کی تھی۔ اس وقت کے ہندستان کی حالت ایک طرح سے یونان کی طرح تھی اگرچہ ایسی ریاستوں کی تعداد اور رقبہ کے اعتبار سے ہندستان اور یونان کا کوئی مقابلہ ممکن نہیں۔

اس بات کے کافی ثبوت موجود ہیں کہ سکندر اعظم کو ہندستان میں جن ریاستوں سے واسطہ پڑا ان میں اکثریت غیر شخصی حکومتوں کی تھی۔ اس کے علاوہ مہابھارت اور کوٹلیہ (KAUTALYA) کے ارتھ شاستر میں بھی غیر شخصی (NON-MONARCHICAL) حکومتوں کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ایسی ریاستوں کا سب سے تفصیلی اور دلچسپ بیان بودھ ادب ہی میں پایا جاتا ہے۔

بودھ کتابوں میں بہت سے جمہوریت پسند قبائل (REPUBLICAN CLAUS) کا ذکر ملتا ہے لیکن ان کے دستور کے بارے میں تفصیلات صرف کپل دستو کی ساکیہ اور (NAMAJJAVA) کا نفیڈریشن کے بارے میں ہی ملتی ہیں۔ اس کانفیڈریشن کی سیاسی اہم جمہوریتیں ویشالی کی لچھاوی ریاستیں

تھیں۔ ان دونوں جمہوریتوں پر کل طاقتی اسمبلیاں حکمراں تھیں۔ ان اسمبلیوں کے اراکین میں سن رسیدہ اور نوجوان شامل ہوتے تھے حکومت کے سربراہ کا انتخاب ووٹوں کے ذریعہ ہوتا تھا۔ یہ سربراہ ان طے شدہ مدت کے لیے منتخب کیا جاتا تھا۔ ان جمہوریتوں میں ۹ ممبرا پر مشتمل ایک مجلس عاملہ ہوتی تھی جس کے رکن اور سربراہ مملکت راجہ کہلاتے تھے۔ اس مجلس عاملہ کو آج کی اصطلاح میں کابینہ اور سربراہ کو وزیر اعظم کہا جا سکتا ہے۔ لچھاوی ریاست کو متعدد انتظامی اکائیوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یہ طرز حکومت گوتم بدھ کو اس قدر پسند آیا تھا کہ انھوں نے اپنے سنگھ کے لیے بھی ایک جمہوری دستور قبول کر لیا تھا۔

اس وقت کی اسمبلی میں تجویز پیش کرتے وقت محرک کے لیے اسے تین بار پڑھنا ضروری ہوتا تھا۔ اگر کوئی اس تجویز کی مخالفت نہ کرتا تو وہ تجویز منظور ہو جاتی اور اگر ایک شخص بھی اس کی مخالفت کرتا تو فیصلہ اکثریت سے کیا جاتا۔ ووٹ شماری کے طریقے تک تھے اور اس کے لیے ایک افسر مقرر ہوتا تھا۔ الجھے ہوئے مسائل کمیٹیوں کے سپرد کر دیے جاتے تھے اور کورم اور غیر حاضر ممبروں کے ووٹ تک کے بارے میں قانون بالکل طے تھے۔

اس جمہوریہ کے بارے میں گوتم بدھ نے "مہاپری نبّیا سوت" (MAHAPARI NIBBANA SUTTA) میں کہا ہے: "اے آنند اس وقت تک جب تک VAJJIANS اسمبلیوں کے اجلاس طلب کرتے رہیں گے، اتفاق رائے سے فیصلے اور ان پر اتفاق و اتحاد کے ساتھ عمل کرتے رہیں گے، جب تک اس قدیم ادارہ کی روایتوں کی روشنی میں اپنا لائحہ عمل طے کرتے رہیں گے VAJJIAN کے بزرگ اراکین کی عزت اور ان کی حمایت کرتے رہیں گے، اور ان کی باتوں پر غور اور ان پر عمل اپنے لیے فرض تصور کرتے رہیں گے اس وقت تک VAJJIAN کو زوال نہ ہوگا اور وہ برابر بڑھتے اور پھیلتے رہیں گے۔"

مہابھارت میں بھیشم نے ریاست کے بارے میں ہندستان کا قدیم تصور پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ ریاست کا وجود انسان کی اس خواہش کی پیداوار ہے کہ ایک ایسا سماج وجود میں لایا جائے جس میں انسان کو تحفظ نصیب ہو، وہ امن و چین سے رہ سکے اور اپنی محنت کا پھل کھا سکے۔ برخلاف اس کے ارسطو نے انسان کو سیاسی جانور کے نام سے یاد کیا ہے۔ ایک جانب ریاست کا وہ تصور ہے جس میں وہ انسان پر لادی ہوئی ایک چیز بن جاتی ہے اور جس کے قیام میں انسان کی مرضی کو کوئی دخل نہیں ہوتا اور دوسری جانب ریاست کا وہ تصور ہے جو ایک ضابطۂ اخلاق کی پیداوار بھی ہے اور اس کو جنم دینے والا بھی۔ ریاست کی جانب ہمارے اس رویہ کا فرق آج تک موجود ہے۔

گاندھی جی کی رہنمائی میں ہندستان کی سیاسی جدوجہد اور سرگرمیوں نے خود کو ایک اخلاقی مقصد کا پابند بنا لیا تھا۔ سیاست اور ریاست کی جانب ہمارا یہ اخلاقی نقطۂ نظر آج کے سارے مادّی لوازمات میں بھی موجود ہے۔ لیکن ریاست، چاہے وہ کتنی ہی جمہوری کیوں نہ ہو طاقت کا مظہر ہوتی ہے اور یہ طاقت بیشتر حالات میں اخلاقی نہیں ہوتی۔ طاقت کو طاقت بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے عوام میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ وہ ہیبت ناک شکل اختیار نہ کر سکے۔ طاقت کا ایک پہلو قانون بھی ہوتا ہے لیکن قانون اور طے کردہ فرائض کسی حکومت یا ریاست کی ترقی کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔ اسی لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ عوام نظم و نسق سے تعاون کرنے کو بنیادی اہمیت دیں۔

جمہوریت کے بارے میں سوچنا بالکل غلط ہے کہ ایک بار قائم ہونے کے بعد اس کے تحفظ کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور یہ ہمیشہ اسی طرح دائم و قائم رہے گی جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا معیار بگڑ بھی سکتا ہے اور اس کا استعمال خود اس کے زوال کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے۔

جمہوریت کی کامیابی کا بڑا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم اسے چلانے کے لیے کیسے نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں کیونکہ یہ بات تو بہرحال طے ہے کہ اصول و ارادے چاہے کتنے ہی نیک کیوں نہ ہوں ان پر عمل تو بہرحال انسان ہی کرتے ہیں اور خراب انسان اچھے اصولوں کو بھی تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ اس لیے بھی ضرورت

ایسے لوگوں کو ہی منتخب کرنا چاہیے جو جمہوریت پر واقعی ایمان رکھتے ہوں اور اسے چلانے کے اہل بھی ہوں لیکن افراد پر اصرار ہمیں ایسی وفاداریوں کی گرفت میں بھی لے سکتا ہے جن میں اصول اور پالیسیاں پس پشت جا پڑیں۔ لیکن اگر ہم نے یہ سمجھ لیا کہ سیاسی سچائی کی علامت اور پہچان صرف اکثریت پر ہے اور تعداد افراد کے مقابلہ میں حتمی سچائی کی حیثیت رکھتی ہے تو ہم خود کو ایک بڑے خطرہ کے مقابل لا کھڑا کریں گے — اور وہ خطرہ اس بات کا ہے کہ اکثریت کہیں اس بات کی دعوے دار نہ بن جائے کہ پالیسیوں کے تعین، ان کو عملی جامہ پہنانے والوں کے انتخاب اور ریاست کی ساری طاقت پر اُن کا اور صرف اُن کا حق ہے۔ سیاست میں آج کی اکثریت کل کی اقلیت بھی بن سکتی ہے۔

قوم پرستی اور وطن پرستی کبھی بھی ریاست اور جمہوریہ کی طاقت کا سرچشمہ بھی بنتے ہیں اور کبھی یہی دونوں چیزیں اس کی سب سے بڑی کمزوری بھی بن سکتی ہیں۔ قوم پرستی کو اگر نسل، کلچر اور مذہب کا ہم معنی بنا دیا جائے تو بڑے بڑے خطرات سر اٹھالیں گے۔ اسی طرح وطن پرستی بھی یہ غلط تصور پیدا کر سکتی ہے کہ ہماری ریاست کا ہر اقدام اخلاقی طور پر بھی اعلیٰ اور ارفع ہے اور ان کی مخالفت کرنے والے بنیادی طور پر غیر اخلاقی ہیں۔ لیکن اگر ہم اپنے سفر کی ابتدا قوم پرستی اور وطن پرستی کے اصولوں سے کرنے کے بجائے ایسے حالات پیدا کریں جن میں یہ جذبہ ساری آبادی میں از خود نمو پا جائے تو ہم خود کو ایک بڑے خطرہ سے بچالیں گے۔

اب جمہوریت کے ایک اور پہلو پر غور کیجیے۔ کیا جمہوریت صرف سیاسی فیصلے کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ یعنی یہ کہ ہم کیا فیصلے کرتے ہیں یہ اہم نہیں بلکہ اہم یہ ہے کہ ہم فیصلے کن طریقوں سے کرتے ہیں۔ مثلاً کیا کسی جمہوری حکومت کو یہ فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ دولت کی غیر مساوی تقسیم، انسان اور انسان کے درمیان رنگ، نسل، مذہب، کلچر اور زبان کی بنیاد پر فرق فطری اور جائز ہے؟ فرض کیجیے کہ ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے جس میں منتخب نمائندوں کی اکثریت یا عوام کی اکثریت اس طرح کے کسی نقطۂ نظر کی حامی ہو جاتی ہے اور مثلاً ریاست یہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ فلاں مذہب یا فلاں کلچر یا فلاں زبان سے متعلق لوگوں کو باقی لوگوں کے برابر حقوق حاصل نہیں ہوں گے تو کیا ایسے فیصلے کو جمہوری فیصلہ کہا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہوگا۔

تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جمہوریت محض ہیئت کا نہیں بلکہ مواد کا بھی نام ہے اور صرف سیاسی جمہوریت کا وجود ممکن نہیں۔ صرف سیاسی طور پر مساوات قائم کرنے کی کوشش دولت، حیثیت اور تعلیم میں نابرابری کی میزان پر سر ٹیک ٹیک کر جان دے دیگی۔ در اصل سیاسی جمہوریت ناگزیر طور پر سماجی اور معاشی جمہوریت کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہے۔

ہندستان میں جمہوریت کے اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کی پہلی کوشش ظاہر ہے، پنڈت نہرو نے کی تھی۔ جمہوریت کے رسمی (FORSUAL) تصور کو بامعنی بنانے اور اسے معنویت (CONTENT) یعنی معاشی اور سماجی نظام سے وابستہ اور ہم آہنگ کرنے کے ٹھوس اقدامات بھی انھوں نے ہی کیے۔ ان کے بقول "جمہوریت ایک مردہ نہیں بلکہ زندہ اور متحرک چیز ہے اور جیسے جیسے اس تصور میں تبدیلیاں ظہور میں آتی ہیں ویسے ویسے اس کا حلقۂ اثر وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے اور بالآخر یہ ایک ذہنی رویہ کا نام بن جاتا ہے جس سے ہم سیاسی اور معاشی مسائل حل کرنے میں مدد لیتے ہیں۔" لیکن پنڈت نہرو کے ذہن میں جمہوریت کے اس بنیادی رویہ کے خد و خال کیا تھے؟ عوام، عوام کے مسائل، انسان کی زندگی، ارض وطن اور وطن کی روایات سے ان خد و خال کا کیا رشتہ تھا اور ان کی نمو داخلی طور پر ہوتی تھی یا خارجی طور پر؟ یہ ہیں وہ اہم سوال جن کے جواب میں ہی ہندستان میں جمہوریت، جمہوری حکومت، جمہوری اداروں اور جمہوری اقدار کے سارے اسرار و رموز اور امکانات پوشیدہ ہیں۔

جمہوریت عوام کے مکمل اقتدار کا نام ہے لیکن کبھی کبھی چالاک سیاست دانوں نے قوم اور وطن کو عوام سے کہیں زیادہ اہمیت دے کر ان کو فاشزم اور نازیت کے راستہ پر لگا دیا

ہے۔ لیکن پنڈت نہرو کے تصورِ جمہوریت میں عوام اور ملک تقریباً برابر اہمیت کے مالک ہیں۔ ایک بار ملک کے طوفانی دورے کے دوران عظیم الشان جلسوں میں انھوں نے یہ بات کئی بار دہرائی کہ عوام ہی ہندستان ہیں۔ جلسہ کو خطاب کرنے کیلئے جونہی پنڈت نہرو کسی گاؤں پہنچتے ہزاروں، لاکھوں عوام "بھارت ماتا کی جے" کے فلک شگاف نعروں سے ان کا خیر مقدم کرتے۔ پنڈت نہرو وہاں کے سیدھے سادھے کسانوں سے یہ پوچھ کر ان کو حیرت میں ڈال دیتے کہ "بھارت ماتا" سے ان کی کیا مراد ہے؟ چاروں طرف خاموشی چھا جاتی۔ کسی کونے سے ایک آواز ابھرتی۔ "ارض وطن"۔ تو وہ پوچھتے: وطن کی زمین کا کون سا حصہ؟ آپ کا گاؤں، ضلع، صوبہ یا سارا ہندستان؟ — اور پھر خود ہی جواب بھی دیتے کہ بھارت ماتا سارا ہندستان ہے جس کا دوسرا نام ہندستان کے عوام بھی ہے۔ اس طرح ان کے تصورِ جمہوریت میں ارض وطن اور عوام اس طرح شیر و شکر ہو کر رہ گئے ہیں کہ ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔

جنگ آزادی کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے پنڈت نہرو تلاش ہند میں لکھتے ہیں "ہماری جد و جہد کا مقصد یہ نہیں کہ سفید کے بجائے سیاہ لوگ ہم پر حکمرانی کرنے لگیں۔ بلکہ ہم عوام کے ذریعہ عوام پر کی جانے والی ایک حقیقی عوامی جمہوریت کے خواہاں ہیں۔ ایک ایسی جمہوریت کہ جس میں سارے مصائب اور ہماری غربت کا خاتمہ ہو سکے۔" لیکن عوام سے ان کی مراد عوام بحیثیت گروہ نہیں بلکہ عوام کا ایک ایک فرد ہے — ایک بار انھوں نے ایک جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے سوال کیا تھا "ہمارا اصل مسئلہ کیا ہے اور ہم کتنے مسائل سے دو چار ہیں؟" اور پھر ملک کی ساری آبادی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا "ہندستان میں ۳۶ کروڑ مسائل ہیں۔" ان کے اس جواب پر قہقہوں کا ایک طوفان بہت بڑا اٹھا لیکن جب انھوں نے اس کی وضاحت ان لفظوں میں کی تو سارے مجمع پر خاموشی چھا گئی: "یہ ایک بنیادی سچائی ہے ہمیں اپنے سارے مسائل کو ۳۶ کروڑ لوگوں میں سے ہر ایک کے بنیادی اصول پر اور ہندستان اور ہر پہلو طرح کا دیکھنا ہے۔"

سیاسی آزادی، مساوات اور پُرامن طریقوں سے ترقی پنڈت نہرو کے جمہوریت کے تصور میں کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔ پنڈت نہرو مکمل جمہوریت کے حامی تھے کیونکہ وہ دن گذر گئے جب پابند یا محدود جمہوریت ممکن تھی۔ انیسویں صدی کا یہ تصور کہ ہر شخص کو محض ووٹ دینے کا حق حاصل ہونا چاہیے اسی وقت درست تھا لیکن آج ایک مفلس اور ایک کروڑپتی کے ووٹ میں فرق ہے دونوں برابر ہرگز نہیں۔ اپنے اثرات کے استعمال کے لیے دولتمند کے پاس ہزاروں طریقے ہیں جب کہ مفلس ان سے محروم ہے اسی طرح کسی تعلیم یافتہ شخص وا یسے شخص سے کوئی مقابلہ ممکن نہیں جسے اس نعمت سے محروم رکھا گیا ہے۔ اگرچہ دونوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے لیکن ظاہر ہے دونوں کے ووٹوں میں فرق ہے — وہ انفرادی صلاحیتوں کے فرق کو ضرور مانتے تھے لیکن ان کے نزدیک اصل بات یہ تھی کہ ہر شخص کو ترقی کرنے کے برابر مواقع حاصل ہونے چاہئیں۔ اس کے بعد اب یہ اس کی قوتِ پرواز پر منحصر ہے کہ وہ کن بلندیوں کو چھوتا ہے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جب تک عوام کی غربت، مفلسی اور جہالت دور نہ ہو جائے اس وقت تک انھیں ووٹ دینے کے حق سے محروم کر دیا جائے۔ وہ مغربی مفکرین کے اس خیال سے قطعاً متفق نہ تھے کہ غیر تعلیم یافتہ عوام کو ووٹ دینے کے حق کے باعث غلط نتائج پیدا ہونے لگے۔ برخلاف اس کے ان کا خیال یہ تھا کہ عوام کو ووٹ دینے کا حق تو فوراً ہی دے دینا چاہیے اور پھر ان کے ہاتھوں چنی جانے والی حکومت کو ان کی غربت اور جہالت دور کرنے کے لیے فوری اقدام کرنے چاہئیں۔ چنانچہ آزادی کے فوراً ہی بعد ہندستان میں پہلی بار ہر بالغ کو حق رائے دہی حاصل ہو گیا۔

پنڈت نہرو کے تصورِ جمہوریت کے اجزائے ترکیبی میں ہر بالغ کو ووٹ دینے کا حق، ووٹ کی طاقت کو عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے، انھیں تعلیم یافتہ بنانے، اس فرد کی انفرادیت قائم رکھنے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے — جمہوریت کے یہی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے — ان کی خواہشات انسان کے نقطۂ نظر سے۔

★

۲۶ جنوری

ثمر ہلوری

تقدیرِ انقلاب ہے چھبیس جنوری
جمہور کا شباب ہے چھبیس جنوری

صد مرحبا کہ تیرے عزائم کے سامنے
ہر ظلم آب آب ہے چھبیس جنوری

تھا ملک میں جو باہمی فرقوں کا اختلاف
ان سب کا سدباب ہے چھبیس جنوری

رندانِ اتحاد و مساوات کے لیے
جامِ شرابِ ناب ہے چھبیس جنوری

تاریخِ حریت کا زبانِ عوام میں
اک یادگار باب ہے چھبیس جنوری

عہدِ عمل کے عزمِ فراواں کا روز ہے
چھبیس جنوری نئے ارماں کا روز ہے

یہ کیا کہ مقصد ایک مگر اختلاف ہے
یہ کیا کہ بھائی بھائی میں باہم مصاف ہے

یہ کیا کہ ناز کرتے ہیں اجداد پر فقط
یہ کیا کہ جھوٹ موٹ کی لاف گزاف ہے

یہ کیا کہ اعتراض کے فیشن کا ہے رواج
یہ کیا کہ فردِ جذبِ تعاون ہی صاف ہے

یہ کیا کہ اپنے ملک کا کرتے ہیں راز فاش
یہ کیا کہ ہم کو حوصلۂ انکشاف ہے

یہ کیا کہ مے پرست مکیف نہیں ہنوز
یہ کیا کہ بادۂ عمل آب مضاف ہے

یہ کیا کہ ہیں سکوت میں اربابِ حل و عقد
یہ کیا کہ کم نگاہ وطن نکتہ باف ہے

یکجہتی۔ اتحاد و محبت کے واسطے
کوشش ہے شرط وحدتِ ملت کے واسطے

لفظوں کا رنگ حسنِ معانی نکھار دے
گلزارِ اعتبارِ تمنا بہار دے

اے نوجوان۔ مادرِ ہندوستاں کے لال
انقصائے ہند میں یہی اٹھ کر پکار دے

مزدور اور کسان ہر اک اپنے طور پر
تقدیرِ ملک اپنے عمل سے سنوار دے

اے صاحبِ ارادہ و عزمِ شبابِ ہند
جمہوریت کو سلسلۂ استوار دے

باغِ ترقیات کو اے صاحبِ قلم
تحسینِ بہارِ کلکِ زمرد نگار دے

بھارت میں بھکری کے غریبی کے دیو کو
پیکانِ قدرِ عظمت و محنت سے مار دے

ہاں اے امینِ دولتِ ہمتِ وطن کی آن
اب تک ادھار لیتا رہا اب ادھار دے

غیرت پسند فرض یہ ہے خود کفیل بن
راہِ ترقیات میں تو سنگِ میل بن

چھبیس جنوری

ودود قیصر

دامن میں صد ہزار گلستاں لیے ہوئے
آنکھوں میں لطفِ زیست کا ساماں لیے ہوئے
چھبیس جنوری کہ بہاراں لیے ہوئے
آئی ہے صبحِ جشن کا عنواں لیے ہوئے
لعلِ یمن سے بڑھ کے ہر اک سنگ و خشت ہے
خاکِ وطن پر آج نچھاور بہشت ہے

اس سمت گلستاں تو ادھر سبزہ زار ہے
جھیلیں کہیں پہ ہیں تو کہیں آبشار ہے
اس خطۂ زمیں پہ دل و جاں نثار ہے
ہر گوشہ جس کا آج بہت پُر بہار ہے
رقصاں ہے جس کی گت پہ ہر اک سمت زندگی
چھبیس جنوری ہے کنھیا کی بانسری

قمری ہے نغمہ زن تو کہیں عندلیب ہے
گیسوئے ارضِ ہند کی خوشبو عجیب ہے
اس سرزمیں پہ جو بھی ہے وہ خوش نصیب ہے
سرشار و شادباش امیر و غریب ہے
رقصاں کبھی ہوئے تو غزل خواں ہوئے کبھی
چھبیس جنوری کی طرح مست ہیں سبھی

ہر گوشہ عطر بیز تو ہر ذرہ ہے حسیں
منظر ہے دل فریب دل آویز دل نشیں
جنت نشاں ہے وادیِ کشمیر کی زمیں
سچ کہتا ہے زمانہ کہ فردوس ہے یہیں
فردوسِ ہند اور یہ جمہوریت کا جشن
جمہوریت کا جشن ہے انسانیت کا جشن

سب لوگ ایک ساتھ ہیں ہر فرد اک زباں
بھارت کے رہنے والے ہیں اک جسم ایک جاں
ہندو ہے سکھ ہے اور نہ مسلماں ہے یہاں
صرف ایک قوم ایک وطن ایک کارواں
اربابِ فکر و اہلِ نظر ایک ہو گئے
نامِ وطن پہ سارے بشر ایک ہو گئے

سری نواس لاہوٹی

دائیں سے بائیں :- رضیہ سجاد ظہیر، سری نیواس لاہوٹی اور سجاد ظہیر

فرانس کے مشہور مفکر وکٹر ہیوگو نے والیٹر کی صد سالہ یادگار مناتے ہوئے کہا تھا کہ "زندگی کتنی ہی شاندار اور عظیم ہو لیکن موت ہمیشہ اس کی منتظر رہتی ہے۔" اگر ہیوگو کا یہ قول صحیح ہے تو سجاد ظہیر کی موت ہماری ادبی تاریخ کا ایک فیصل شدہ واقعہ ہے۔ اور جب کہ ترقی پسند ادبی تحریک ایک نیا ابھار حاصل کر رہی ہے اس وقت ہمارے درمیان سے اس تحریک کے میر کارواں کا اٹھ جانا ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی فی الحال ممکن ہی دکھائی نہیں دیتی۔

سجاد ظہیر ۵ نومبر ۱۹۰۵ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد وزیر حسن یہیں وکالت کرتے تھے جو بعد میں سر وزیر حسن کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ اپنے سات بھائیوں بہنوں میں چھوٹے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں یعنی (۹) سال کی عمر میں انھیں پانچویں درجہ میں گولڈن جوبلی اسکول میں شریک کرایا گیا۔ اسکول کے پرنسپل ایک اینگلو انڈین تھے وہ اپنی خیرخواہی جتلانے کیلیے جائز اور ناجائز طریقوں سے جنگ کے نام پر چندہ وصول کیا کرتے تھے۔ اس معاملے میں اسکول کے پرنسپل سے ان کی جھڑپ ہو گئی۔ پرنسپل نے کہا کہ "تمھارے والد کے پاس تو لاکھوں روپیہ ہے"۔ ننھے اس سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے فوراً جواب دیا کہ "ٹیکس بھی تو ادا کرتے ہیں"۔ اس وقت ان کی عمر مشکل سے گیارہ سال کی تھی۔ ننّھے میاں اور پرنسپل کی اس جھڑپ کا یہ نتیجہ نکلا کہ طالب علموں کی اکثریت نے جنگی بانڈس نہیں خریدے۔

ان کے گھر کی فضا پر ایک طرح سے سیاست چھائی ہوئی تھی۔ ان کے والد مسلمانوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو کانگریس کے ساتھ مل کر انگریزی حکومت کے سامنے ہندستان کے لیے ذمہ دارانہ حکومت کا مطالبہ رکھنا چاہتے تھے۔ ۱۹۱۶ء کا ماہ دسمبر ہماری قومی تاریخ کا ایک یادگار مہینہ رہے گا۔ اس سال لکھنؤ میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ کئی برسوں تک جیل میں رہنے کے بعد لوک مانیہ تلک اس اجلاس میں شریک ہونے کے لیے لکھنؤ پہنچے تو عوام نے گاڑی سے گھوڑوں کو ہٹا دیا۔ اور اس گاڑی کو جس میں تلک سوار تھے اپنے ہاتھوں سے کھینچا۔ پورا لکھنؤ "تلک مہاراج کی جے" کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ کانگریس کے اس اجلاس میں "کانگریس اور مسلم لیگ کا تاریخی

معاہدہ ہوا۔ اس وقت بنّے بھائی کے والد وزیر حسن مسلم لیگ کے معتمد عمومی تھے۔ اس لیے بنّے میاں کو بارہ سال ہی کی عمر میں ملک کے مشہور قائدین کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ گاندھی جی، مسٹر جناح، مسز سروجنی نائیڈو، مولانا آزاد کئی دفعہ ان کے مکان پر آئے اور قیام کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ سجاد ظہیر کی تعمیر میں ان ان واقعات کا بہت بڑا حصہ رہا ہے تو یہ کوئی مبالغہ کی بات نہ ہوگی۔ چنانچہ اس بارے میں ایک جگہ خود تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"لکھنؤ میں قیصر باغ کی بارہ دری میں لیگ کا وہ سیشن مجھے اچھی طرح یاد ہے جس میں کانگریس کے لیڈر بھی شریک تھے۔ گاندھی جی، مسز نائیڈو، تلک اور جناح صاحب کو میں نے پہلی بار اسی زمانے میں دیکھا تھا۔ کانگریس کے اس اجلاس کے صدر بابو امبیکا چرن مجومدار تھے لیکن سب سے بڑے لیڈر تلک تھے جب تلک کا جلوس امین آباد سے گزرا تو ہم سب بھائی جو پارک کنارے اپنی گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے کہ جم غفیر نے ہمیں آلیا۔ لوگ والہانہ انداز میں نعرے لگا رہے تھے۔ "بولو تلک مہاراج کی جے" تلک جس گاڑی میں سوار تھے اس کے گھوڑے کھول دیئے گئے تھے اور لوگ اسے کھینچ رہے تھے۔ اسی زمانے میں میں نے مسز سروجنی نائیڈو کو پہلی دفعہ دیکھا، ان سے باتیں کیں اور ان کی تقریر سنی اور خفیہ طور پر ان کا دلدادہ ہو گیا۔ اس کے بعد سے وطنی آزادی اور قومی اتحاد کا احساس مجھ میں بڑی شدت کے ساتھ پیدا ہوا اور جوں جوں عمر بڑھتی گئی اس احساس میں اضافہ ہوتا گیا۔"

پہلی جنگ عظیم ختم ہو گئی تھی اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ بنّے میاں میں وسیع النظری پیدا ہونے لگی۔ اسی دوران میں انھوں نے کربلائے معلّٰی کی زیارت بھی کرلی اور وہاں سے واپسی کے بعد دوبارہ اپنی تعلیم میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۲۱ء میں انھوں نے میٹرک درجہ دوم میں کامیاب کیا۔ اردو، انگریزی اور سائنس میں انھوں نے اچھے نمبرات حاصل کئے۔ لیکن ریاضی نے ان کی لٹیا ڈبو دی۔ اس وقت ملک میں عدم تعاون اور خلافت کی تحریکیں زوروں پر چل رہی تھیں۔ ان کے دل میں بھی جوش پیدا ہوا لیکن انھوں نے تعلیم ترک نہیں کی۔

اس کی وجہ خود انھوں نے بیان کی ہے کہ "کوئی ان کو اس راہ پر لگانے والا نہیں ملا۔" ۱۹۲۲ء میں انھوں نے لکھنؤ کرسچین کالج میں داخلہ لیا۔ ان کے مضامین فارسی، انگریزی اور تاریخ تھے۔ اس وقت کالج کے احاطے کے قریب موتی برج کے پاس لکھنؤ کے مشہور کانگریسی لیڈروں، پنڈت ہرکرن ناتھ مسرا، چودھری خلیق الزماں اور رنگا ایتر کی تقریریں ہوا کرتی تھیں جس میں میاں پابندی سے شریک ہوا کرتے تھے۔ اس وقت ان کے والد اودھ کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ اور قومی ذمہ داریوں کو میاں نے سنبھال لیا تھا۔ چنانچہ وہ خود اس بارے میں کہتے ہیں کہ

"میں نے ان تمام حالات اور فضا سے متاثر ہوکر کھدر پہننا شروع کر دیا تھا۔ سر کے بال منڈوا لیے تھے، گوشت کھانا ترک کر دیا تھا پلنگ پر سونا چھوڑ دیا تھا، چٹائی بچھا کر زمین پر سوتا تھا۔ ہمارے خاندان والوں، بابا کے دوستوں اور احباب اور شہر میں عام طور پر یہ خبر پھیل گئی کہ وزیر حسن کا چھوٹا لڑکا تو کانگریسی ہو گیا ہے۔ میں نے چرخہ کاتنا شروع کر دیا تھا۔ میرے والد نے میری ان حرکتوں پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ نہ کبھی وہ اس موضوع پر مجھ سے گفتگو کرتے تھے۔"

۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء میں انھوں نے کالج کی لائبریری سے حاصل کرکے کئی انگریزی اور فرانسیسی مصنفوں کی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ان میں اناطول فرانس اور رسل کی کتابوں نے ان کے دماغ پر بڑے گہرے اثرات مترتب کئے۔ رسل کی کتابیں پڑھ کے بعد بنّے دہریت کی جانب مائل ہونے لگے۔ انٹرنس کامیاب کرنے کے بعد جامعہ لکھنؤ میں بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ تاریخ اور انگریزی ادب ان کے خاص مضامین تھے۔ اس وقت ڈی۔ پی۔ مکرجی ان کے اکنامکس کے پروفیسر تھے۔ اس زمانے میں کارل مارکس کا نام لینا بھی خطرناک سمجھا جاتا تھا لیکن جب ایک دن پروفیسر مکرجی نے کلاس میں کہا کہ "آجکل بہت سے اکانمسٹ مارکس کے نظریوں کو غلط بتاتے ہیں۔ لیکن تم لوگ ان کی باتوں نہیں آنا۔ مارکس کے نظریے ہی دنیا میں پھیل رہے تھے اور ا

اثرات سے دنیا بدل رہی ہے۔ مارکس کو غلط ثابت کرنے والوں کو دنیا جھلاتی رہی ہے"۔ اس وقت کانپور میں "میرٹھ کانسپریسی کیس" کی شنوائی ہو رہی تھی۔ اس میں مظفر احمد، ڈانگے، گھاٹے اور شوکت عثمانی وغیرہ ماخوذ تھے۔ انگریزوں کا مقصد یہ تھا کہ اس مقدمے کے ذریعہ کمیونسٹوں کو کچل دیا جائے۔ اس کے بارے میں ایک جگہ سجّے لکھتے ہیں کہ :

"یہ مقدمہ کافی دنوں تک چلا تھا۔ روز صبح کو اس کی روئیداد" (پائنیر (جو خالص اینگلو انڈین سرکاری اخبار تھا) میں چھپتی تھی۔ میں اس کا ایک ایک لفظ بڑے انہماک سے پڑھتا تھا اور پھر اس کے تراشے بناتا۔ اس طرح گویا میری، اور میری طرح کے بہت سے نوجوانوں کی کمیونسٹ تحریک کے متعلق ابتدائی تعلیم ہوئی۔ یہ بہت ناقص اور ناکافی تھی۔ لیکن اس میں ابتدائے عشق والی سرشاری کی کیفیت تھی"۔

۱۹۲۶ء میں انھوں نے بی۔اے کامیاب کیا لیکن خرابیٔ صحت کی بناء پر انھیں ایک سال ولایت جانے کے لیے رک جانا پڑا۔ اس دوران میں انھوں نے فارسی، اور ہندی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ مارچ ۱۹۲۷ء میں یہ ولایت کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس وقت ان کے بڑے بھائی حسین ظہیر ہائیڈل برگ (جرمنی) میں کیمیا کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ وہ پیرس میں آکر ان سے ملے اور اس کے کچھ دن بعد جامعہ آکسفورڈ میں داخلہ لے لیا جہاں انھوں نے اپنے لیے تاریخ جدید، معاشیات اور سیاسیات کو منتخب کیا تھا۔ اس وقت وہاں ان کے استاد پروفیسر جی۔ ڈی۔ ایچ کول تھے۔ جامعۂ آکسفورڈ میں رجعت پسندوں کا زور تھا اور تمام استاد قدامت پسند گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس وقت یہ آکسفورڈ میں زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکے۔ اس لیے کہ ان پر دق کا حملہ ہو گیا۔ اور انھیں مجبوراً جامعہ کو خیرباد کہہ کر علاج کے لیے سوئٹزرلینڈ چلا جانا پڑا۔ جہاں ایک سینی ٹوریم میں یہ بغرض علاج داخل ہو گئے۔ یہاں سال بھر کے قیام کے دوران کی صحت پر کافی اچھا اثر پڑا اور وہ یہاں فرانسیسی زبان و ادب کا مطالعہ کرنے لگے۔ روس اور کمیونزم سے متعلق بھی ان کو یہاں کافی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا اور پہلی دفعہ انھوں نے ایک روسی فلم بھی دیکھی۔ اس وقت ان کے ساتھ ڈاکٹر حسین ظہیر بھی تھے۔

۱۹۲۸ء میں انھوں نے دوبارہ آکسفورڈ میں داخلہ لیا۔ یہاں پر ان کی برٹش پارلیمنٹ کے کمیونسٹ رکن سکلت والا سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت محمود الظفر بھی یہیں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس لیے قدامت پسندوں کے اس قلعے میں انھوں نے اپنے آپ کو اکیلا محسوس نہیں کیا۔ لندن میں ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر زیڈ۔اے احمد جیسے اور بہت سے ہندستانی نوجوان ساتھی موجود تھے۔ ان ہی کی ایما سے سجاد ظہیر بھی لندن کی ہندستانی کانگریس کے رکن بن گئے۔ آکسفورڈ میں ہندستانی طالب علموں کی ایک انجمن تھی۔ یہ اس کے نمائندے کی حیثیت سے فرانکفرٹ میں ہونے والی مخالف سامراجی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں ان کو سویت نمائندوں سے بھی ملنے کا موقع ملا۔ اسی سال لندن میں سائمن کمیشن کے خلاف ایک جلوس نکالا گیا جس میں یہ بھی شریک ہوئے۔ اور ان کو پولیس کی لاٹھیاں کھانی پڑیں۔ جلوس کے بعد یہ اور ان کے بہت سے ساتھی شاہ پورجی سکلت والا کے مکان پر جمع ہوئے اور وہاں سے واپسی پر "ہائی گیٹ کے قبرستان" میں پہنچے، اور یہاں ایک نئے مرشد کے مزار پر انھوں نے وہ عہد کیا جس کو مرتے دم تک نبھاتے رہے ـــــ یہ مرشد کوئی اور نہیں کارل مارکس تھا۔

۱۹۳۲ء میں آکسفورڈ سے بی۔اے کرنے کے بعد یورپ کے کئی ممالک کا سفر کرتے ہوئے یہ ہندستان واپس ہوئے۔ سوئٹزرلینڈ کے قیام کے دوران انھوں نے بہت سی کہانیاں لکھ لی تھیں۔ جو بعد کو "انگارے" میں شائع ہوئیں۔ ہندستان میں اس کتاب کے شائع ہوتے ہی اس کو ضبط کر لیا گیا۔ یہ سجاد ظہیر کی پہلی کاوش نہیں تھی۔ بلکہ اس سے قبل ان کی کئی کہانیاں "زمانہ" میں شائع ہو چکی تھیں۔

ہندستان میں چھ ماہ قیام کرنے کے بعد یہ دوبارہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان روانہ ہو گئے۔ اب ان کا قیام

لندن میں تھا اور وہ مستقل مزاجی کے ساتھ اپنا زیادہ تر وقت سیاسی کاموں میں صرف کرنے لگے تھے۔ اس وقت تک انھوں نے کمیونسٹ پارٹی میں شرکت اختیار کر لی تھی۔ یہ مزدوروں کے جلوس میں شامل ہوتے اور ان کی تنظیموں میں کام کرتے تھے۔ گول میز کانفرنس کے وقت جب گاندھی جی لندن پہنچے تو بنّے میاں اور ان کے ساتھیوں نے گاندھی جی سے ان کے لائحہ عمل پر گفتگو کی اور اس کو عملی جامہ پہنانے کا وعدہ کیا۔ اسی زمانے میں یہ ہندستانی طالب علموں کی جانب سے شائع ہونے والے رسالہ "بھارت" کی ادارت بھی کرنے لگے اور اس سے علیحدہ ہونے کے بعد انھوں نے "نیو انڈیا" کے نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع۔ اس وقت یہ قانون کے طالب علم تھے۔ لیکن انکا پورا وقت رالف فاکس، ڈیوڈ گیسٹ اور مارکس کنفرتھ اور دوسرے مارکسی ادیبوں کی صحبت میں گزرتا تھا اور قانون جسے یہ پڑھنے کے لیے لندن میں ٹھہرے ہوئے تھے ایک غیر اہم سی چیز ہو کر رہ گیا تھا۔ بالکل معمولی، غیر ضروری اور اہمیت سے خالی۔ چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :-

"ہمارا دماغ ایک ایسے فلسفے کی جستجو میں تھا جو ہمیں سماج کی دن بدن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ان کو سلجھانے میں مدد دے سکے۔ ہمیں اس بات سے اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ انسانیت پر ہمیشہ سے مصیبتیں اور آفتیں رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ مارکس اور دوسرے اشتراکی مصنفین کی کتابیں ہم نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیں۔ جیسے جیسے ہم اپنے مطالعے کو بڑھاتے، آپس میں بحثیں کر کے تاریخی، سماجی اور فلسفیانہ مسئلوں کو حل کرتے اس نسبت سے ہمارے دماغ روشن ہوتے اور ہمارے قلب کو سکون ملتا جاتا تھا۔ جامعاتی تعلیم ختم کرنے کے بعد یہ ایک نئے لامتناہی تحصیل علم کی ابتدا تھی۔"

یہ وہ دور تھا جب کہ فاشزم اپنے عروج پر تھا۔ دوسری عالمی جنگ کا خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا اور "دنیا کی تہذیب برلن کی سڑکوں اور چوراہوں پر جل رہی تھی، اٹلی کے گلی کوچوں میں اس کا خون بہایا جا رہا تھا۔ اسپین میں اس پر بمباری کی جا رہی تھی۔ ایشیا کے ملکوں میں، ہندستان اور چین میں بیرونی سامراج قومی تہذیبوں کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ ہٹلر نے یہ کہہ کر ادیبوں اور دانشوروں کو اپنی اپنی سمت کا انتخاب کرنے پر مجبور کر رہا تھا کہ جو کوئی فاشزم کے ساتھ نہیں اسے فاشزم کا دشمن سمجھا جائے گا۔" اسی زمانے میں سجاد ظہیر نے ڈاکٹر ملک راج آنند اور اپنے دوسرے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد ہندستانی انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی اور یہ اس کے کنوینر منتخب ہوئے۔ اس انجمن کا پہلا اعلان نامہ لندن کے ایک ریسٹوران میں تیار کیا گیا جس پر ہندستان کے بڑے بڑے محترم ادیبوں نے بعد کو دستخط کئے اور پھر اسی اعلان نامے کی بنیاد پر سنہ ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس منشی پریم چند کی صدارت میں لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ اسی زمانے میں جب فرانس میں ادب اور تہذیب کی حفاظت کے لیے رومارولاں، آراگورن، طامس مان، ہنری باربس، گورکی اور دوسرے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ادیبوں نے ایک مخالف فسطائی ادیبوں کی انجمن کی بنیاد ڈالی اور اس کا پہلا اجلاس پیرس میں منعقد ہوا تو اس وقت سجاد ظہیر ہی ہندستانی ادیبوں کی نمائندگی کرتے ہوئے اس کانفرنس میں شریک ہوئے اور ہندستان کی جانب سے بین الاقوامی ادیبوں کے اس اجتماع کو بھرپور یقین دلایا کہ ہندستانی ادیب بھی ان کی اس جدوجہد میں برابر کے شریک ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اس کانفرنس کے لیے ایک سندیسہ بھجوایا تھا۔ اس کانفرنس کا حال سجاد ظہیر نے ایک مضمون میں یوں بیان کرتے ہیں :

"یہ پہلا موقع تھا جب قریب قریب دنیا کی ہر مذہب کے ادیب باہم صلاح و مشورہ کے لیے ایک مقام پر جمع ہوئے۔ انھوں نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ تہذیب و تمدّن کو رجعت پسندی اور تنزل کی اٹھتی ہوئی لہر سے بچانے کے لیے ان کو اپنی انفرادیت کو خیرباد کہہ کر خود اپنی ایک جماعت کا منظم کرنا ضروری ہے۔ صرف یہ ایک موثر طریقہ ہے جس کے ذریعہ وہ ترقی و فلاح کی قوتوں کی مدد کر سکتے ہیں۔ اپنی تخلیقی صلاحیت کو افزائش و نشوونما کا پورا موقع دے سکتے ہیں اور اس طرح سے جماعتی حیثیت سے انسانی ہستی کو ایک انقلاب انگیز عہد میں فنا ہونے سے بچا سکتے ہیں۔

۔ظاہر ہے کہ اتنی بڑی کانفرنس میں مختلف خیال اور عقیدے
کے ادیب جمع تھے لیکن ایک چیز کے بارے میں وہ سب متفق
تھے اور وہ یہ تھی کہ ادیبوں کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ
آزادیٔ خیال و رائے کے حق تحفظ کی کوشش کرنی چاہیے۔
فاشزم یا سامراجی قوتیں جہاں بھی ادیبوں پر جابرانہ پابندیاں
عائد کریں یا ان کے خیالات کی بنا پر مظالم کریں تو اس کے
خلاف احتجاج کرنا چاہیے۔ دوسری چیز جو اس کانفرنس میں
میں سب محسوس کرتے تھے یہ تھی کہ ادیب اپنے حقوق کا بہترین
تحفظ اسی حالت میں کر سکتے ہیں جب وہ عوام کی آزادی کے "متحدہ
محاذ" کا جزبن کر محنت کش طبقوں کی پشت پناہی کریں۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ کومنترن کی ساتویں کانگریس نے جو
۱۹۳۵ء میں منعقد ہوئی تھی ساری بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک
کو جس میں ہندستان کی کمیونسٹ تحریک بھی شامل ہے ایک نیا
رخ دیا اور تمام نوآبادیاتی اور نیم نوآبادیاتی ملکوں میں ایک وسیع
قومی محاذ اور ایک عالمی اتحاد کے قیام کے لیے جو آزادی اس کا اثر
ہماری قومی تحریک پر بھی پڑا اور کانگریس کے اندر بائیں بازو کی
طاقتوں نے اپنے آپ کو مجتمع کرنے کی کوشش کی اور دوسری جنگ
کے آغاز کے وقت اس لائن کے انتہائی مثبت نتائج سامنے آئے۔
ایک طرف ہمارے ملک میں کسانوں مزدوروں اور طلبا کی تنظیمیں
قائم ہوئیں تو دوسری طرف تہذیبی محاذ پر ادیبوں اور دانشوروں نے
اپنے آپ کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کیا اور یہ وہ محاذ تھا جس کی رہنمائی
سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں نے کی جنھیں ٹیگور، پریم چند، عبدالحق
اور پنڈت نہرو کی سرپرستی حاصل تھی۔

۱۹۳۵ء میں ننّے بیرسٹری کی سند حاصل کرنے کے بعد
ہندستان واپس ہوئے۔ یورپ کے دوران قیام کا انھوں نے ایک
مضمون میں جو "یادیں" کے نام سے شائع ہوا ہے بڑے ہی دلچسپ
انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ یہ مضمون کیا ہے گویا اس وقت کی پوری سیاسی
سرگرمیوں کا ایک واضح عکس ہے جس کو انھوں نے بہت ہی سلجھے
ہوئے انداز میں بیان کیا ہے اور یہی انداز بیان اور طرز تحریر مرحوم
کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ اپنی واپسی کے دوران میں یہ کچھ
دنوں کے لیے پیرس میں رک گئے اور اپنا زیادہ تر وقت انھوں نے
"لندن کی ایک رات" کے لکھنے میں صرف کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے
وہاں کے ترقی پسندوں سے بھی راہ و رسم پیدا کی جن میں رومان رولاں،
لوئی آراگان اور آندرے ژید جیسی قابل ذکر ہستیاں شامل ہیں۔
ان ادیبوں سے انھوں نے ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کے متعلق
بھی تبادلۂ خیال کیا تاکہ ان لوگوں کے تجربات کی بنیاد پر ہندستان
میں بھی ایسی انجمن کو منظم کیا جا سکے۔ جب انھوں نے آراگان سے
دریافت کیا کہ ہمارا ارادہ بھی ہندستان میں اس تحریک کو شروع کرنے کا ہے
اور اسکے لیے ہم آپکے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو آراگان نے
خاص فرانسیسی طرز سے دونوں ہاتھ اٹھا لیے اور مسکرا کر جواب دیا کہ:

"یہ نہ پوچھیے ادیبوں کی تنظیم سے بڑھ کر مشکل دنیا میں
اور کوئی جماعت کی تنظیم نہیں ہے۔ ہر ادیب اپنا راستہ الگ
نکالنے کی کوشش کرتا ہے تاہم ہمیں مسلسل کوشش کرتے رہنا
چاہیے۔ زمانے کے حالات خود ادیبوں کو اپنے آرٹ کی
حفاظت اور ترقی کے لیے تنظیم کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔"

ہندستان واپس ہونے کے بعد والدین کو ننّے میاں سے بہت
امیدیں وابستہ تھیں۔ گھر والوں کو امید تھی کہ ننّے بیرسٹری کر آئے
ہیں اور اب کچھ کر سکتے ہیں۔۔۔ ننّے میاں نے الہ آباد میں پریکٹس
شروع کر دی جہاں ان کے والد کا طوطی بول رہا تھا۔ لیکن
وکالت صرف بیرسٹری کی سند حاصل کر لینے سے تھوڑی ہی چلتی
ہے۔ اس کے لیے ایک خاص ماحول کی ضرورت ہے نسلی امتیازات
کے دلدل میں پھنسے ہوئے اس وقت کے انگلستان کے اعلیٰ طبقات
کے معاشرے کی بہ نسبت انھیں انگریز کمیونسٹوں کا معاشرہ بہت
ہی متاثر کن معلوم ہوا، اور بہت سے قابل ذکر ہندستانی طالب علموں
کی طرح یہ بھی اسی جانب راغب ہوئے ننّے میاں اس معاشرہ کا
جتنا قریب سے مطالعہ کرتے گئے اتنا ہی ان پر زیادہ اثر پڑا اور ان کی
آنکھیں کھل گئیں اور انھیں قومی آزادی اور بین الاقوامی امن کا
راستہ صاف دکھائی دینے لگا۔ ملک کی مذہبی، سیاسی اور

سماجی گتھیاں ایک ایک کرکے ان کے سامنے آنے لگیں۔ لیکن ان
گتھیوں کا سلجھانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ آکسفورڈ کا طیلسان
بیرسٹر بن جانا ایک ضمنی چیز تھی۔ انھوں نے تو اپنے آپ کو ایک
سیاسی کارکن کی حیثیت سے ڈھال لیا تھا اسی لیے وکیلانہ دل و
دماغ پیدا نہیں کرسکے۔ اب ان کا زیادہ تر وقت "آنند بھون"،
میں کانگریس کے کاموں میں صرف ہونے لگا۔ اس وقت جواہر لال
نہرو صوبائی کانگریس کمیٹی کے صدر تھے اور سجے الہ آباد سٹی کانگریس
کمیٹی کے معتمد منتخب ہوئے تھے۔ اسی زمانے میں وہ دو سال تک
صوبائی اسمبلی کے رکن رہنے کے بعد ۱۹۴۵ء میں دوسرے کمیونسٹ
ساتھیوں کے ساتھ انھوں نے بھی کانگریس سے استعفیٰ دیدیا۔ کانگریس
کارکن کے ساتھ ساتھ وہ سوشلسٹ پارٹی کے بھی سرگرم کارکن بن
گئے اور اسی زمانے میں "نیا بھارت" کے نام سے ہندی ہفتہ وار
اخبار نکالنے لگے۔ اس دوران انھوں نے "بیمار" نامی ایک ڈرامہ
بھی لکھا جس کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ الہ آباد کے قیام کے
دوران میں یہ مزدوروں اور کسانوں کی تنظیم میں بھی حصہ لینے لگے۔
اور صوبائی کمیونسٹ پارٹی کو منظم کرنے میں انھوں نے کامریڈ
بھاردواج کا ہاتھ بٹایا۔ ۱۹۳۶ء کے اواخر میں انھیں گرفتار کرلیا گیا۔
اور جولائی ۱۹۳۷ء میں کانگریسی وزارت کے برسراقتدار آنے کے
بعد انھیں رہائی ملی۔

۱۹۳۶ء میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس لکھنؤ
میں منشی پریم چند کی صدارت میں منعقد ہوئی تو یہ اس کے معتمد عمومی
چنے گئے اور جو شمع ۱۹۳۶ء میں روشن ہوئی تھی اور جو تقریباً چالیس
سال سے ہمارے ملک میں ترقی پسند اہل قلم کی شیرازہ
بندی کررہی ہے اس تحریک کا یہ کارنامہ ہے کہ "اس نے ادب
کے سامنتی ڈھانچے کے بخیے ادھیڑ دیے اور اس تصور کو ختم کردیا کہ
ادب کا مقصد صرف تفریح طبع ہے۔ اس ادب نے مزدوروں، اور
کسانوں اور مظلوم درمیانی طبقے کی زندگی اور مسائل کو اپنا موضوع
بنایا اور ادب میں حقیقت نگاری کی بنیادیں استوار کیں۔" اور ان
لوگوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جو اسے کمیونزم کا ایک شاخسانہ کہتے ہیں،
اس لیے کہ ہر وہ بغاوت جو قدیم کے خلاف کسی قوم کے جدید عناصر
کرتے ہیں، قدامت کے دیوتاؤں کو آزردہ کردیتی ہے اور وہ
تعمیری اور صحت مند ادبی روایات کو روکنے کے لیے بہانوں کی
تلاش کرتے ہیں۔ ہماری اس تحریک میں بھی کئی موڑ ایسے آئے لیکن
سجے بھائی کی قیادت نے ہر مشکل کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا اور
کشتی کو بھنور میں پھنسنے نہیں دیا۔

۱۹۳۸ء میں ان کے سر پر سہرا باندھا گیا۔ بیوی رضیہ بھی اعلیٰ
تعلیم یافتہ اور مصنفہ ملیں۔ شادی کے بعد رضیہ نے بھی جامعہ
الہ آباد سے درجہ اول میں ایم۔اے کامیاب کیا۔ رضیہ کو شادی کے
وقت بڑی خوشی ہوئی کہ ان کا شوہر ایک بڑے خاندان کا سپوت
اور آکسفورڈ کا گریجویٹ اور انر ٹمپل کا بیرسٹر ہے اور جس کی شہرت
ہر ایک کی زبان پر ہے۔ مگر جب رضیہ بیگم، سجاد ظہیر کے گھر آئیں اور
ان کا جائزہ لیا تو ان کا ماتھا ٹھنکا اور انھوں نے اپنے میاں کو
"پاگلوں" کے راستے سے ہٹا کر "صحیح راستہ" پر لگانا اپنا فرض جانا
کیونکہ ان کو اپنے آپ پر اعتقاد تھا اور میاں کو بھی ان سے کافی
محبت تھی۔ رضیہ سجے میاں کو "راہ راست" پر لانے کی کوششوں میں
مصروف ہی تھیں کہ ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء کا دن آن پہنچا اور سجے
میاں کو گرفتار کرکے لکھنؤ جیل میں بند کر دیا گیا۔ دوران نظر بندی
میں سجاد ظہیر نے رضیہ کے نام جو خطوط لکھے ہیں وہ ہر قومی کارکن کیلئے مشعل راہ
ثابت ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں رضیہ کو یوں مخاطب کرتے ہیں
"میں تو صرف اس امید پر جیتا ہوں کہ ہم اپنی جذباتی
یگانگت کی بنا پر اپنی مشترکہ زندگی کا مستقبل میں ایسا
نقشہ بنائیں جہاں ہم ذہنی اور روحانی توازن بھی جسمانی
میل کے ساتھ ساتھ قائم رکھ سکیں۔ ہماری گزشتہ ناہمواریاں
اور ناکامیاں اس کام میں، ہماری مددگار ہوں گی اور اس
وقت مجھے کوئی وجہ ایسی نظر نہیں آتی کہ کیوں ہم اپنی اس
نئی مشترکہ زندگی کو مکمل طور پر کامیاب نہ بنا سکیں ——
—کیوں نہیں —— مجھے تم سے بے انتہا محبت ہے۔ مجھے تم پسند
ہو، اچھی لگتی ہو، تم میں وہ ذہنی صلاحیت ہے۔ جس کی میں

اپنی شریک زندگی میں ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ ہمارے ارادے بلند ہیں۔ ہم دنیا میں کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ زندگی ہمارے سامنے نئے مسئلے، نئی گتھیاں اور مشکلات حل کرنے کے لیے پیش کرتی رہے گی۔ لیکن اس مستحکم اعتماد، ہمدردی، عشق اور محبت کے مضبوط بازو ہماری مدد کریں گے اور ہم دونوں مل کر مشکل مہم سر کرلیں گے۔ تم پریشان نہ ہو۔ کیا تمھیں اس کا غم ہے کہ ہم نے اپنی زندگی سے بہت سا قیمتی وقت ضائع کر دیا ہے۔ لیکن زندگی کو اس کے لمحات اور وسعت سے نہ ناپو۔"

یہ ان ہی خطوط کا نتیجہ ہے کہ رضیہ کو اپنے نقطۂ نظر میں تبدیلی کرنی پڑی اور وہ ان کی راہ میں حائل ہونے کے بجائے ایک سچے مددگار کی حیثیت سے کمر باندھ کر تیار ہوگئیں۔ پورے دو سال جیل میں نظربند رہنے کے بعد ۱۴ر مارچ ۱۹۴۲ء کو بنّے جیل سے رہا ہوئے۔ اور پھر اپنی راہ پر چلنے لگے۔ اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ رضیہ بھی پارٹی کارڈ ہولڈر بن گئیں۔

سجاد ظہیر جیل سے رہا ہونے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈ کوارٹر پر بلائے گئے اور ان کے ذمہ پارٹی کے اخبارات کی ادارت سونپ دی گئی۔ ہندستان میں شاید ہی کوئی ایسا اردو لکھا پڑھا آدمی ہوگا جس نے "قومی جنگ"، "نیا زمانہ"، اور "سات دن" کا نام نہ سنا ہو، سجاد ظہیر نے بمبئی کے قیام کے دوران میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے مرکزی دفتر کو لکھنؤ سے بمبئی منتقل کرلیا اور سارے ہندستان میں ترقی پسند ادیبوں کو منظم کرنے لگے۔ ۱۹۴۵ء میں حیدرآباد میں منعقد ہونے والی ترقی پسندوں کی کل ہند کانفرنس اس تحریک میں ایک سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

مارچ ۱۹۴۸ء میں کمیونسٹ پارٹی کی دوسری کانگریس نے انھیں پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کا معتمد منتخب کیا اور یہ پاکستان منتقل ہوگئے اور وہاں پر بائیں بازو اور خاص طور پر پارٹی کو منظم کرنے میں نمایاں حصّہ لیا۔ جس سے خائف ہوکر وہاں کے حاکموں نے ان کو اور فیض احمد فیضؔ کے علاوہ کچھ اور فوجی افسروں کو گرفتار کرلیا۔ ان لوگوں پر ایک من گھڑت سازشی مقدمہ چلایا گیا جو "راولپنڈی کانسپریسی کیس" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا واحد ٹرائل تھا جہاں نہ تو ملزمین کو اپنی پسند کے وکیل مقرر کرنے کا حق حاصل تھا اور نہ عوام ہی اس مقدمے سے واقف ہوسکتے تھے۔ اس لیے کہ یہ مقدمہ "حیدرآباد، سندھ جیل" میں چلایا جارہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ساری دنیا کے جمہوریت پسند انسانوں نے ایک ہوکر یہ آواز بلند کی کہ یا تو سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے یا انھیں غیر مشروط رہا کردیا جائے۔ آخر چار سال بعد ان کی رہائی عمل میں آئی۔ اور یہ دوبارہ ہندستان واپس آنے کے بعد۔ پارٹی کے ہمہ وقتی کارکن کی حیثیت سے تہذیبی محاذ پر کام کرنے لگے۔

۱۹۵۶ء میں انھیں کی ایما پر تیس ملکوں کے ترقی پسند مصنفینؔ نے جو افروایشیائی ملکوں کی نمائندگی کررہے تھے۔ دہلی میں اپنا اجتماع منعقد کیا جس میں تاشقند میں افروایشیائی ادیبوں کی ایک کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز اتفاق رائے سے پاس ہوئی۔ اس طرح سے افروایشیائی مصنفین کی تحریک کے تصوّر نے جنم لیا جس کا مقصد ان دو براعظموں میں آباد قومی ادب اور تہذیبوں کو فروغ دینا تھا۔ اس طرح اجتماع کے بعد پندرہ برسوں میں ادیبوں کی اس تحریک نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی۔ جو بین الاقوامی تغیرات، متعدد قومی ادیبوں کے فروغ جدوجہد آزادی اور قومی تعمیر نو کے مناصب پر اپنا اثر ڈال رہی ہے۔ الماتا میں اس تنظیم کی پانچویں کانفرنس ۴ر ستمبر سے ۸ر ستمبر ۱۹۷۳ء کو منعقد ہوئی جس میں سجاد ظہیر نے ہندستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے نہ صرف حصّہ لیا بلکہ اس کے افتتاحی اجلاس میں "ترقی پسند ادب اور ہندوستانی آزادی و سماجی ترقی کی جدوجہد" کے موضوع پر اپنا مقالہ بھی پڑھا اور اس کے بعد ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ ۱۳ر ستمبر ۱۹۷۳ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہوگئے۔

بنّے بھائی جنتا کے آدمی تھے اور اسی لیے انھیں عوام کی زبان اور اس کے گیتوں اور شاعری سے بے پناہ محبت تھی۔ انھوں نے اپنی مادری زبان یعنی جون پور میں بولی جانے والی بھاشا میں

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر)

جمہور کی بیداری

عزیز سلونوی

ضو فشاں دن ہے نئے رنگ کا دریا ہے آج
ذرۂ خاکِ وطن مطلع انوار ہے آج

اے خوشا وقت عجب رونق بازار ہے آج
جو بھی ہے جنسِ محبت کا خریدار ہے آج

ذرہ ذرہ چمنِ دہر کا گلزار ہے آج
ہر بشر شاد ہے مسرور ہے بیدار ہے آج

اور ہی رنگ ہے جمہور کی بیداری کا
یعنی ہر شاخِ چمن ابر گہر بار ہے آج

چشمِ ساقی کا سرِ بزم اشارا ہے یہی
جو مئے ناب نہ پی لے وہ گنہگار ہے آج

مل گیا ہے جو شہیدوں کے لہو کا غازہ
سرخی رنگ شفق اور بھی گلنار ہے آج

مٹ گئی ظلمتِ شب نور فشاں ہے خورشید
جو بھی ہے ذرہ چمن کا دُرِ شہوار ہے آج

اپنے گلشن میں اب آزاد ہیں گلشن والے
اب نہ زنداں ہے نہ وہ بندشِ دیوار ہے آج

دشمنوں کو بھی لگاتے ہیں گلے سے اپنے
کل جو تھا دہر میں اپنا وہی کردار ہے آج

سرفروشانِ وفا تھے جو سر دار و رسن
ان شہیدانِ محبت کا یہ دربار ہے آج

آج آزاد ہیں گلشن میں سب اربابِ چمن
کون کہتا ہے کہ تفریق گل و خار ہے آج

اب مجھے گردشِ دوراں کا کوئی خوف نہیں
جب مرا ذوقِ عمل ہر طرح بیدار ہے آج

کیوں پریشاں ہیں نہالانِ چمن سے کہہ دو
مرکزِ امن ہر اک وادی و کہسار ہے آج

در و دیوار چراغوں سے ضیا بار ہوئے
جس طرف دیکھیے اک عالمِ انوار ہے آج

دشمنِ ملک و وطن کو یہ بتانا ہے عزیز
ہر نظر قوم کی چلتی ہوئی تلوار ہے آج

ـــــــــ ڈاکٹر سیدہ جعفر

صنعتی کا شمار دکن کے اچھے مثنوی نگاروں میں ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ صنعتی کے یہاں نہ وجہی کا سا بلند تخیل موجود ہے نہ وہ دیدہ وری اور ژرف نگاہی جو سب رس اور قطب مشتری جیسے عظیم کارناموں میں نظر آتی ہے۔ صنعتی کے یہاں غواصی کا سا فنی رچاؤ یا نصرتی کی سی جادو بیانی اور شگفتگی نہیں ملتی۔ اس کے باوجود دکنی ادب میں صنعتی کا ایک خاص مقام اور طرز اظہار ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری نے صنعتی کی مثنوی قصۂ بے نظیر (۱۶۴۵ء) کو "مجلس اشاعت دکنی مخطوطات" کی جانب سے ۱۹۳۸ء میں اپنے عالمانہ مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا۔ صنعتی کی ایک اور مثنوی گلدستہ اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد میں موجود ہے۔ یہ مخطوطہ مکمل ہے اور اچھی حالت میں ہے۔ جب سالار جنگ کے انتقال کے بعد ان کے نوادرات، قیمتی کتابیں اور مخطوطات وغیرہ عوام کے استفادے کے لیے باہر لائے گئے تو انگریزی، عربی اور فارسی کی کئی نایاب کتابوں کے علاوہ بہت سے دکنی مخطوطات بھی منظر عام پر آئے۔ ان ہی بیش بہا اور نادر مخطوطات میں سے ایک قیمتی ادب پارہ صنعتی کی مثنوی گلدستہ بھی ہے۔ ادبی قدر و قیمت سے قطع نظر اس مخطوطے کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں صنعتی کے حالات زندگی کے بارے میں بعض اہم داخلی شہادتیں موجود ہیں۔ اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد اور کتب خانہ سالار جنگ کے ان دو نسخوں کی موجودگی نے اس مثنوی کے باقاعدہ مطالعے میں سہولت پیدا کر دی ہے۔

صنعتی کے حالات زندگی ابھی تک پردہ خفا میں ہیں وہ عادل شاہی خاندان کے چھٹے حکمران محمد عادل شاہ (۱۶۲۶ء تا ۱۶۵۶ء) کا ہمعصر تھا۔ خارجی ذرائع سے شاعر کے حالات زندگی پر کچھ زیادہ روشنی نہیں پڑتی۔ اس زمانے کے ادبی تذکروں میں صنعتی کا ذکر موجود نہیں ہے حالانکہ محمد عادل شاہ کے زمانہ حکومت کی ادبی سرگرمیوں اور علوم و فنون کی ترقی سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہیں۔ محمد قاسم فرشتہ کی مشہور تاریخ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں تصنیف ہوئی تھی۔ اس وقت صنعتی غالباً کم عمر تھا اور بحیثیت شاعر کوئی خاص شہرت حاصل نہیں کی تھی ورنہ فرشتہ نے جہاں فارسی شعرا کے ساتھ دکنی شاعروں کا بھی ذکر کیا ہے وہاں صنعتی کا تذکرہ بھی ضرور کرتا۔

حکیم شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم میں صنعتی کا ذکر کرتے ہوئے ان کے وطن کا نام ساگر بتایا ہے لیکن وہ شاعر کے نام کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتے حالانکہ ان کی نظر سے صنعتی کی مثنوی گلدستہ گزر چکی تھی جس میں شاعر نے اپنا نام بتایا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شمس اللہ قادری نے اس مخطوطے کا سرسری طور پر مطالعہ کیا تھا کیونکہ وہ اس مثنوی کا نام بھی ٹھیک طور پر نہیں بتاتے۔ انھوں نے صنعتی کی اس ادبی تخلیق کا نام گلدستہ عشق بتایا ہے حالانکہ خود شاعر اس کو گلدستہ سے

موسوم کرتے ہوئے کہتا ہے ع

توگلدستہ کر نام اس کا میں رک
دیا ہوں بدل یادگاری یو جگ

تلاش بسیار کے باوجود پروفیسر عبدالقادر سروری کو صنعتی کے حالات اور دیگر تفصیلات دستیاب نہ ہوسکی تھیں چنانچہ "قصہ بے نظیر کے دیباچے میں وہ رقم طراز ہیں :-

"مصنف کے متعلق خارجی ذرائع سے کچھ معلومات حاصل نہ ہوسکیں کسی تذکرے میں اس کا حال درج نہیں ہے۔"

مثنوی گلدستہ پروفیسر عبدالقادر سروری کی نظر سے نہیں گزری تھی اور صنعتی کے حالات کسی تذکرے میں موجود نہیں تھے اس لیے انھوں نے بساتین السلاطین مصنفہ ابراہیم زبیری پر اپنی معلومات کی بنیاد رکھی ۔ صاحب بساطین السلاطین نے ایک ایسے شاعر کا ذکر کیا تھا جس کا تخلص صبتی ہے پروفیسر سروری نے صبتی کو صنعتی سمجھا اور لفظ کی تبدیلی کو سہو کاتب تصور کیا ان دونوں الفاظ کی باہمی مشابہت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" صبتی اور صنعتی میں جو مشابہت ہے وہ ظاہر ہے ممکن ہے کہ اسی تجنیس خطی نے صنعتی کو صبتی بنا دیا ہو۔"

نصیرالدین ہاشمی اور ڈاکٹر زور نے صنعتی کا نام محمد ابراہیم خاں بتایا ہے ۔ دونوں محققین نے صنعتی کے نام کے ساتھ لفظ "محمد" کا بھی اضافہ کر دیا ہے ۔ راقمۃ الحروف کا خیال ہے کہ محمد ابراہیم خاں صبتی اور حسن شاہ محی الدین صنعتی دو مختلف شخصیتیں ہیں جن کے نہ صرف ناموں میں اختلاف ہے بلکہ حالات زندگی بھی جداگانہ ہیں ۔ صنعتی کا نام محمد ابراہیم خاں نہیں ہے اور نہ "صبتی"، "صنعتی" کی بگڑی ہوئی شکل یا سہو کاتب یا تجنیس خطی ہے ۔ اس سلسلے میں داخلی شہادتیں یعنی خود صنعتی کے بیانات بہتر طور پر ہماری رہنمائی کرسکتے ہیں ۔ مثنوی گلدستہ میں شاعر نے اپنا نام اس طرح بتایا ہے ع

الس فعل سوں کرمرا نیک نام ۔۔۔ سدا قدر و عزت سوں کر توں مدام
یہی اس دہر تج دھیر یا عین ہے ۔۔۔ مسمی حسن شاہ محی الدین ہے

آگے چل کر اپنے والد کے نام پر روشنی ڈالی ہے اور کہتے ہیں کہ

میں مرتضیٰ قادری کا "خلف" ہوں ع

خلف مرتضیٰ قادری نامور
ہے تس نام عرف شاہ حضرت گگر

مندرجہ بالا اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ صنعتی کا نام شاہ حسن محی الدین اور ان کے والد کا نام مرتضیٰ قادری عرف شاہ حضرت تھا ۔ اب اگر ہم بساتین السلاطین کے بیان پر غور کریں تو حسب ذیل امور ہمارے سامنے آتے ہیں ۔

(۱) بساطین السلاطین میں جس شاعر کا ذکر کیا گیا ہے اس کا نام ابراہیم خان ہے ۔

(۲) ابراہیم خاں کا تخلص صبتی ہے ۔

اگر صبتی کوئی بے معنی لفظ ہوتا تو اس کو کتابت کی غلطی سمجھ لینے میں پس و پیش نہ ہوتا "صنعتی" ایک بامعنی لفظ ہے ۔ صبع کے معنی عربی میں فخر کے ہیں ۔ لفظ صبع سے صبتی بنالیا اس لیے قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ دکن میں اس طرح کی روایت بہت قدیم اور مقبول ہے ۔ لفظ مقیم سے مقیمی، ذوق سے ذوقی، خیال سے خیالی لطف سے لطفی، راز سے رازی، طبع سے طبعی، آتش سے آتشی ایاغ سے ایاغی، شغل سے شغلی اور ضعیف سے ضعیفی بنالیا گیا ہے دکن کے اکثر بلند پایہ شاعروں کا تخلص حرف "ی" پر ختم ہوتا ہے جیسے وجہی، ابن نشاطی، غواصی، نصرتی اور جنیدی وغیرہ ۔ اس صورت میں یہ قیاس غلط نہ ہوگا کہ صبع سے صبتی بنالیا گیا ہے ۔

بساتین السلاطین کے مصنف زبیری نے ابراہیم خاں کو ایک قصیدہ گو اور غزل گو شاعر کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے ۔

" قصیدہ و غزل معنی پیچیدہ و معانی انگیں برجستہ چنداں نستر کہ از بار تحسین آں، زباں حرف گیراں چوں رنگ رخ نشاں درہم شکستہ . . . . "

اس کے برخلاف صنعتی بحیثیت مثنوی نگار شہرت رکھتا ہے ۔ صنعتی کی شہرت کا دار و مدار مثنوی پر ہے ۔ زبیری کے مذکورہ بالا بیان میں صرف غزل اور قصیدے کا ذکر ہے، مثنوی کا نہیں حالانکہ ۱۶۴۵ء

میں صنعتی کی مشہور مثنوی قصہ بے نظیر منظر عام پر آچکی تھی اور
اس کے بہت بعد بساطین السلاطین لکھی گئی ہے۔ یہ منظوم قصہ
صرف اپنے ادبی محاسن کی وجہ سے مقبول ہوا بلکہ اس کے مذہبی
رنگ نے بھی اس کو ہر دل عزیز اور پسندیدہ بنا دیا تھا۔ مذہب پرستی
کے اس دور میں ایک ایسی کتاب کو نظر انداز کر دینا جس میں ایک
صحابی تمیم انصاری کی سرگزشت بیان کی گئی ہو تعجب خیز ہی نہیں
بلکہ ناقابل یقین محسوس ہوتا ہے۔

صاحب بساطین السلاطین نے شاعر کی تعریف ایسے
مبالغہ آمیز پیرائے میں کی تھی کہ

به میدان معنی چو ناز سمند
سر اہل دعوی کشد در کمند
چو دریای طبعش شود موج زن
زند جوشش گوہر زمین و زمن

ایسی صورت میں مصنف اپنے دعوے کی دلیل میں یقیناً قصہ
بے نظیر کا ذکر ضروری سمجھتا جس میں بقول پروفیسر سروری "سادگی
و لطافت، جذبات اور توضیحات کے علاوہ وہ تمام خوبیاں کم و بیش
پائی جاتی ہیں جو اس عصر کی تصنیفات کی امتیازی خصوصیات ہیں"۔
"بساطین السلاطین میں صنعتی کا ذکر" دربیان بعضے شاعر کہ در آں قلل
بودند" کے عنوان کے تحت کیا گیا ہے جس سے صنعتی کا شاعر ہونا تو
یقیناً ظاہر ہوتا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ فارسی کا شاعر تھا
یا دکنی کا؟ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس نے فارسی میں طبع آزمائی
کی ہو۔

آگے چل کر بساطین السلاطین میں ایک تاریخی واقعے پر
روشنی ڈالی گئی ہے۔ زبیری لکھتے ہیں کہ جب وزیر سلطنت خان
محمد کو قتل کر دیا گیا تو یہ عہدۂ فضل و کمالات مرتبت" ابراہیم خاں
نے سنبھالا۔ جب محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ نے جو عبداللہ شاہ
کی بہن تھیں حج کا ارادہ کیا تو ابراہیم خاں بھی ساتھ ہو گیا اور اپنے
فرزند کو جس کا نام عبدالمحمد تھا اپنی جگہ انتظام مملکت پر مامور کیا۔
مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم خاں سلطنت میں
ایک ذمہ دار عہدے پر فائز ہو چکا تھا اور اطمینان اور فراغت کی
زندگی بسر کی تھی۔ اس کے برخلاف اب صنعتی کا یہ بیان ملاحظہ ہو
جس میں وہ خود کو ایک معمولی سپاہی کہتا اور اپنی پریشان حالی کا
ذکر کرتا ہے۔

اتھا اصل میں ایک سپاہی غریب
سپاہاں کی سب گرد میں تھا قریب

اپنی خستہ حالی، افسردگی اور گوشہ نشینی کا اس طرح ذکر کرتا ہے کہ

دلے چرخ آفات سے ہو حزیں — خموشی پکڑ کر تھا گوشہ نشین
مرے دل پہ کچھ شادمانی نہ تھی — شب و روز فکر گرانی اتھی

صنعتی کہتا ہے کہ ان حالات نے میری "طبع تیز" کو "کند" کر دیا ہے
اور میں اپنی بدقسمتی پر "تند" ہوں کہ

مکدر ہوا اور سستی طبع کند ہو
ایس بخت پر میں اتھا تند ہو

ایک ایسا شخص جو بقول زبیری "از مجلسیان حضور اعلیٰ"
ہے خواہ کتنی ہی انکساری سے کام لے خود کو گوشہ نشین نہیں کہہ سکتا
اور اس کو اپنی قسمت اور فلاکت کی شکایت کرنے کی بظاہر کوئی
وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ یہاں یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے
صنعتی کی ابتدائی زندگی عسرت و پریشانی میں گزری ہو لیکن بعد میں
رسائی حاصل کی ہو۔ زبیری نے محمد عادل شاہ کا سنہ وفات
۱۰۶۷ھ مطابق ۱۶۵۶ء بتایا ہے اور اس کے بعد اس کی ملکہ کے
سفر حج کا ذکر کرتا ہے جس مثنوی میں صنعتی نے اپنے یہ حالات بیان
کئے ہیں اس کا سنہ تصنیف ۱۰۷۶ھ مطابق ۱۶۶۶ء ہے جن میں
وہ خود کو بادشاہ کا وزیر نہیں بلکہ ایک غریب سپاہی کہتا ہے یہی نہیں
بلکہ مثنوی کے آخر میں وہ قارئین سے خواہش کرتا ہے کہ اگر انھیں مثنوی
پسند آئے تو وہ اس کے حق میں دعا کریں تاکہ اس کی کلفت دور ہو سکے

کہ جس دل میں آئے شفقت کا پیار
مرے حق میں کرنا دعا بے شمار

صنعتی کہتا ہے کہ میری زندگی مصائب و مشکلات سے معمور ہے۔ وہ
فنکار جنھیں فراغت اور خوش حالی نصیب ہوتی ہے وہ پوری دلچسپی

کے ساتھ شعر گوئی کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں مجھے یہ چیز نصیب نہیں ع

کیے باغباں جو ادل ہو کر سب میسر اتھا ان کو عیش و طرب
و ہی تے خوشی سوں دل افراز کر سنوارے اپس باغ سامان فکر

لیکن میرا دل "کدورت" کی "ہلاکت" کا نشانہ بن گیا ہے اس لیے میں اس مثنوی میں اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار کرنے سے قاصر رہا ہوں ع

کدورت میں تھا دل ہلاکت میں پڑ
یو نکلیا سخن خام کا مج تے بڑ

زبیری نے صنعتی کا نام ابراہیم خاں بتایا ہے جس سے ان کا پٹھان ہونا ظاہر ہوتا ہے حسن شاہ محی الدین صنعتی نے خود کو "مثنوی گلدستہ" میں "حسنین کی آل" بتایا ہے اور اُن کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں امام احمد حنبل کا پیرو ہوں ع

شہیدوں میں افضل حسین و حسن بدل دیں لیئں کربلا کا وطن
ان آل میں ہو کر یو نام دار کیے مذہب حنبلی اختیار

نعتیہ اشعار کہنے کے بعد صنعتی نے معراج کا واقعہ بیان کیا ہے اور کہتا ہے کہ میں آنحضرت کے سلسلے آل سے تعلق رکھتا ہوں اور شیخ ہوں ع

وسیلہ ان سلسلے کا میں کر ہوا شیخ ہوں مین لوٹے بوجہ دہر

مندرجہ بالا اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ صنعتی شیخ تھے پٹھان نہیں تھے۔
صنعتی اور اس کے حالات زندگی کے متعلق مندرجہ ذیل معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

صنعتی کا نام حسن شاہ محی الدین تھا اور ان کے والد مرتضیٰ قادری عرف شاہ حضرت تھے۔ صنعتی کے دادا کا نام شرف الدین قادری تھا۔ مرتضیٰ قادری کے متعلق "تذکرے اولیاء دکن" میں عبدالجبار ملکاپوری تحریر کرتے ہیں کہ وہ شرف الدین صوفی القادری کے صاحبزادے تھے۔ آپ کا وطن احمد آباد گجرات تھا۔ عبدالجبار ملکاپوری کا بیان ہے کہ مرتضیٰ قادری کی طبیعت ابتدا ہی سے زہد و ورع کی طرف مائل تھا۔ ایک دن اتفاقاً ایک مجذوب سے ملاقات ہوئی اور آپ پر جذب کی کیفیت طاری ہو گئی۔ شاہ وجیہ الدین کے خلف رشید شاہ عبدالعزیز الگجراتی نے آپ کی دستگیری کر کے سلوک کی رہنمائی کی۔ مرتضیٰ قادری نے بیجاپور کا سفر کیا اور رجعت گر دابراہیم عادل شاہ کے زمانہ حکومت (۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۷ء) میں بیجاپور چلے آئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ ابراہیم عادل شاہ کے مرشد شاہ ابوالحسن قادری کے ہم عصر تھے۔ شاہ ابوالحسن کی "سکھ انجن" دکنی ادب کی ایک قابل قدر تخلیق ہے۔ آپ نے ۳۰ رجمادی الثانی ۱۰۲۲ھ مطابق ۱۶۱۳ء کو وفات پائی۔ سمجھا جاتا ہے کہ آپ کا مزار ابراہیم پور کے دروازے کے باہر ہے تاریخ دکن جلد سوم میں عبدالغفور خاں رام پوری نے بھی آپ کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔

مثنوی گلدستہ میں صنعتی نے اپنے والد کے بارے میں لکھا ہے کہ میرے والد بڑے عالم اور فاضل آدمی تھے میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا یہ ان ہی کی ترتیب اور فیض کا طفیل ہے کہ میری "طبع" کا "چمن تازہ" ہوا ہے جو شخص بھی ان کی صحبت میں رہے وہ دنیا میں "عزیز" بن جاتا ہے۔

بدرج کمالات سوں ہونا مدار ایتا علم کے فن میں سب کام کار
خصوصاً جو پائیں ادب ہور تمیز رہے فیض تس کی ہو جگ میں عزیز

جیسا کہ اس سے قبل کہا جا چکا ہے، صنعتی امام احمد حنبلی کا پیرو تھا خلفاء راشدین کی مدح اور حضرت عبدالقادر جیلانی کی تعریف و توصیف سے بھی اس کا سنی المذہب ہونا ثابت ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں ع

عجب نام دار اد شہ کامگار علم دیں کا جس نے پکڑیا قرار
کھرے دیں کوں کرا ہیں تب کھرا محی الدین کریائے مراتب بڑا

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صنعتی کو حضرت عبدالقادر جیلانی سے خاص عقیدت و مودت تھی چنانچہ اس نے مثنوی گلدستہ میں آپ کی مدح میں چھتیس اشعار اور قصہ بے نظیر میں بیس مسلسل اشعار میں ہدایۂ عقیدت پیش کیا ہے۔

مثنوی گلدستہ میں سبب تالیف بتلاتے ہوئے صنعتی کہتا ہے کہ حضرت امین الدین حسینی نے مجھے یہ کتاب لا کر دی اور دکنی میں اسے نظم کرنے کا حکم دیا۔ آگے چل کر شاعر کہتا ہے کہ

چونکہ فارسی زبان سمجھنا عوام کے لیے دکنی کے مقابلے میں مشکل ہے اس لیے میں نے اس کتاب کا دکنی میں ترجمہ کیا۔ اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد میں اس مثنوی کا جو نسخہ موجود ہے اس کے صفحۂ اول پیشانی پر "تصنیف من شیخ داؤد ابن شیخ حیدر" تحریر کیا گیا ہے ممکن ہے کسی شیخ داؤد نامی شاعر نے فارسی میں یہ قصہ نظم کیا ہے لیکن مثنوی میں اس کی طرف کوئی اشارہ موجود نہیں ہے بہرحال صنعتی کہتا ہے کہ میں نے امین الدین حسینی کی فرمائش پر اس کتاب کو دکنی کا جامہ پہنایا ہے ؎

ادہی پیر کامل حقائق پناہ   معارف کا جس کو اچھے دستگاہ
او مخدوم حسینی کا نامی خلف   کر دں جگ میں شہرت مرا ہو طرف

صنعتی کہتا ہے کہ راجے خاں اور عمر خاں سوائی کو مجھ سے بڑا خلوص ہے ان دونوں نے بھی مجھے اس بات کی ترغیب دی کہ میں گلدستہ پیش کروں ؎

بھی ویسے میں نامی شجاعت مآب   عمر خاں سوائی ہوت کامیاب
لگت راجے خاں نام او نام ور   جنیں بھل منی کر کہیں جگ بھیتر
رکھے مجھ سوں دائم محبت کمال   رکھو حق سدا تس کوں سنسر بحال

صنعتی کی تاریخ پیدائش کی طرح اسکے سنہ وفات کا بھی علم نہیں ہو سکا۔

مثنوی گلدستہ میں صنعتی کی زبان قصہ بے نظیر سے زیادہ سلیس ہے۔ طرزِ ادا میں بے ساختگی اور اثر آفرینی کے علاوہ انفرادیت بھی پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں نے مثنوی کو پرلطف بنا دیا ہے۔ سلاست زبان کے اعتبار سے یہ مثنوی اس زمانے کی دوسری ادبی تخلیقات میں ایک امتیازی شان رکھتی ہے اس کا سبب بتاتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ میں نے مثنوی کو عام فہم بنانے کے لیے "سنسکرت" کے الفاظ بہت کم استعمال کیے ہیں۔ مثنوی گلدستہ میں بار بار اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ شاعر نے ایک نئے طرز کو اپنایا ہے۔ قصے کی پیشکشی کا انداز منفرد نہ سہی لیکن اس کا اختتام بہرحال ایک نئے انداز کا حامل ہے شاعر کے لب و لہجہ نے قصے کی نشو و نما کے اس نئے موڑ کو پر اثر اور خوبصورت بنا دیا۔

مثنوی گلدستہ کی تصنیف کا مقصد محض ایک عشقیہ داستان بیان کرنا نہیں بلکہ قاری کی مذہبی معلومات میں اضافہ کرنا بھی ہے لیکن شاعر کا یہ مقصد مثنوی کے آخری حصے میں ظاہر ہوتا ہے۔ صنعتی یہ نہیں چاہتا کہ اس کی مثنوی خشک بے کیف اور سپاٹ ہو کر رہ جائے اسے اس کا بھی احساس ہے کہ قاری اس قسم کی مقصدیت سے بہت جلد اکتا جاتا ہے اس لیے اس نے ابتدا میں قاری کو قصے کی دلکشیوں سے سامان تفریح فراہم کیا جب قاری کی توجہ پوری طرح قصے پر مرکوز ہو جاتی ہے تو پھر وہ مذہبی معلومات پیش کر کے اپنے دوسرے موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ دکن کے اکثر شاعروں اور ادیبوں نے تبلیغ و تلقین کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر مختلف نظمیں اور رسالے تصنیف کیے ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد ایسی کاوشوں کی ہے جن میں مقصدیت ادبیت پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے اس لیے ان کی ادبی اہمیت کم اور تاریخی اور لسانی اہمیت زیادہ ہے۔ اس کے برخلاف صنعتی کی مثنوی میں آخر تک قاری کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ اس دلچسپ قصے کی تان، اخلاق آموزی اور مذہبی اصولوں کی اشاعت پر ٹوٹے گی۔ مثنوی میں آخر تک شہزادہ بلعم کی مہمات ہماری توجہ کا مرکز بنی رہتی ہیں۔ شہزادہ مختلف مشکلات پر فتح پاتے ہوئے دختر فغفور تک پہنچتا ہے اور آخر کار اس کے سوالوں کا جواب دے کر درِ مقصود سے اپنا دامن بھر لیتا ہے۔ گلدستہ میں شہزادی کے سوالات کی نوعیت قصہ حاتم طائی کی طرح ما فوق الفطرت عناصر کی رہین منت نہیں حسن بانو کے ہر سوال کے پیچھے ایک عظیم مہم پوشیدہ ہے اس کے برخلاف دختر فغفور کے ہر سوال کا جواب مذہبی معلومات پر مبنی اس لیے شہزادہ بلعم کو صحراؤں کی خاک نہیں چھاننی پڑتی بلکہ علم کے میدان کی بادہ پیمائی کرنی پڑتی ہے۔ "قطب مشتری، سیف الملوک اور بدائع الجمال" بھرام وگل اندام، ماہ پیکر اور گلشن عشق محض عشقیہ مثنویاں ہیں ان کے برخلاف مثنوی گلدستہ عشقیہ بھی ہے اور مقصدی بھی۔ تفریح اور افادیت اور قصہ گوئی اور تعلیم و تبلیغ کا ایسا انوکھا امتزاج دکن کی بہت کم مثنویوں میں نظر آسکے گا۔

قصے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ مصر کے بادشاہ کا اکلوتا بیٹا شہزادہ بلعم بڑا حسین وجمیل تھا۔ بچپن میں اس کی خوبصورتی کا یہ عالم تھا کہ آسمان کا ہلال بھی اس کے حسن سے شرمندہ تھا ع

عجب حُسن میں خوب صاحب جمال
کہ جس حُسن تل دبیے نت ہلال

شہزادہ جب سن شعور کو پہنچا تو خوش اخلاقی اور علم وفراست میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ایک دن بادشاہ کے وزیروں نے منصوبہ بنایا کہ اس کو قتل کر کے سلطنت آپس میں تقسیم کرلیں جب بادشاہ کو وزیروں کی بدنیتی کا پتہ چلا تو اس نے شہزادے اور اپنی ملکہ کو لے کر جنگل کی راہ لی۔ آخر سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرتا ہوا ایک شہر کو پہنچا اور وہاں گمنامی میں زندگی بسر کرنے لگا۔ ایک روز اتفاقاً اس شہر کے بادشاہ کا باز اڑ گیا۔ بادشاہ بہت افسردہ خاطر ہوا اور سپاہیوں کو ہر طرف دوڑایا کہ اس کا پتہ چلائیں اور اس کو کسی طرح پکڑ کر لے آئیں۔ شہزادہ بلعم ایک درخت کے نیچے سو رہا تھا اتفاق سے بادشاہ کا باز اسکے سینے پر آکر بیٹھ گیا۔ ع

ہو ہوشیار جب کھول دیکھیا نظر
دیا باز خوش ایک چھاتی اوپر

بلعم اس باز کو پاکر بہت خوش ہوا اور سیدھا بادشاہ کے دربار میں پہنچا۔ بادشاہ نے خوش ہوکر اس خدمت کے صلے میں خلعت اور اشرفیاں عطا کیں اور ایک اعلیٰ درجے کا گھوڑا سواری کیلئے دیا ع

دیے ایک خلعت سوا اشرفی
ترنگ اک صلا اس دیا تشریفی

بادشاہ نے بلعم سے اس کا حسب نسب اور حال دریافت کیا۔ شہزادے نے جواب دیا میں ایک سوداگر ہوں۔ چوروں نے ہمارا مال واسباب لوٹ لیا ہے۔ آپ میرے ماں باپ کو اپنے محل میں جگہ دیں اور مجھے سفر پر روانہ ہونے کی اجازت دیں تو یہ احسان عمر بھر نہ بھولوں گا۔ اس گھوڑے پر سوار ہوکر اپنی قسمت آزمانے نکل جاؤں گا۔ بادشاہ نے بلعم کی درخواست قبول کرلی اور وہ اپنے ماں باپ کی دعائیں لیتا ہوا جنگل کی طرف روانہ ہوگیا۔ مسلسل کئی دن تک سفر کرتا رہا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہے کہ ایک قافلہ تیزی سے گزر رہا ہے۔ اس قافلے کی شان وشوکت دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ قریب جاکر سردار سے ملاقات کی تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے بادشاہ کا "نامہ مہر" لے کر چین جا رہا ہے۔ چین کا بادشاہ فغفور شاہ اس کا منتظر ہے۔ سردار نے بلعم سے کہا اے نوجوان تو مجھے ایک بلند حوصلہ اور باہمت شخص نظر آتا ہے میں تجھے اپنا نائب بناتا ہوں تو یہ خط لے کر میرے ساتھ چین کو چل اور وہاں اپنی قسمت آزما فغفور شاہ تجھے انعام واکرام سے سرفراز کرے گا اور تیری تقدیر جاگ اٹھے گی۔ بلعم راضی ہوگیا اور سردار کے ہمراہ چلا۔ قافلہ کئی دن تک منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہی گیا لیکن ایک روز زبردست طوفان آیا اور ایسی ہوا چلی کہ قافلے والے ادھر ادھر منتشر ہوگئے اور شہزادہ اکیلا رہ گیا۔ بلعم بہت پریشان ہوگیا اور اس نے خدا سے دعا مانگی کہ وہ اس مصیبت سے نجات دے۔ کچھ دور چلنے کے بعد بلعم کو صاف وشفاف پانی کا ایک چشمہ نظر آیا۔ یہاں وہ ٹھہر گیا اور چشمے کے پانی اور جنگل کے پھلوں سے اپنی بھوک پیاس مٹائی۔ جب حواس ٹھکانے لگے تو بلعم کو اس خط کا خیال آیا جو سردار نے اس کے حوالے کیا تھا اس نے خط کھول کر پڑھا اس میں بادشاہ سے یہ خواہش کی گئی تھی کہ خط لانے والے کا سر فوراً قلم کر دیا جائے۔ اب بلعم کو پتہ چلا کہ سردار نے اس کے ساتھ دغابازی کی تھی۔ بہرحال بلعم نے اپنا سفر جاری رکھا یہاں تک کہ وہ ایک بارونق شہر میں پہنچا جہاں ایک بوڑھی عورت نے اس کے حال پر رحم کھاکے اسے اپنے گھر میں پناہ دی۔ یہ ضعیفہ اکثر شہزادے کو کہانیاں سنایا کرتی اور اس سے شفقت ومہربانی کا برتاؤ کرتی تھی۔ ایک دن اس نے چین کے بادشاہ فغفور کا قصہ سنایا اور بتایا کہ اس کی اکلوتی لڑکی نے شادی کے لیے بڑی عجیب وغریب شرط لگا رکھی ہے۔ بادشاہ کو شہزادی کی شادی کا بڑا ارمان ہے لیکن وہ ضدی لڑکی اپنی بات پر مُصر ہے اور صرف اسی شخص سے شادی کرنا چاہتی ہے جو اس کے سوالوں کا ٹھیک طور پر جواب دے سکے۔ بلعم شہزادی کے حسن کی داستانیں سُن کر

اس کا گرویدہ ہو چکا تھا اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ دختر فغفور کے سوالوں کا جواب دے کر اس سے ضرور شادی کرے گا بوڑھی کے منع کرنے کے باوجود وہ چین پہنچا اور دربار میں رسائی حاصل کرنے کے منصوبے باندھنے لگا۔ ایک روز اتفاقاً راستے پر اسے ایک دیوانہ نظر آ گیا جس پر بچے پتھر پھینک رہے تھے بلعم کو اس پر رحم آ گیا اور وہ دیوانے کو بچوں سے چھڑا کر ایک گوشے میں لے آیا۔ دیوانے نے کہا تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے اب میرے ساتھ گھر چلو زندگی بھر اس مہربانی کو یاد رکھوں گا۔ جب بلعم دیوانے کے ساتھ اس کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ ایک عالی شان محل اور کئی ملازم ہیں۔ دیوانے نے کپڑے تبدیل کیے اور زریانہ لباس پہن لیا۔ اس نے کئی دن تک بلعم کو اپنے یہاں مہمان رکھا ایک دن بلعم نے دیوانے کو اپنے دل کا حال سنایا اور مدد طلب کی۔ دیوانے نے دو کہنہ لباس منگوائے اور دونوں نے کپڑے تبدیل کیے اور فغفور کے محل کا رخ کیا۔ محل کے باہر یہ دونوں دیوانوں کی طرح چیختے چلاتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے ہوئے پہنچے۔ لوگ ان کے گرد جمع ہونے لگے اور بھیڑ لگ گئی دختر فغفور نے ماجرا دریافت کیا اور ان کے حال پر رحم کھا کر انھیں اندر بلوایا۔ کھانا کھلوایا اور رات بسر کرنے کی جگہ دی۔ اب بلعم کو دختر فغفور کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور عشق کا تیر دل کے پار ہو گیا۔ صبح ان دونوں نے شہزادی سے رخصت لی اور واپس چلے آئے۔ دوسرے دن بلعم بڑی شان و شوکت کے ساتھ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا اور اپنا حسب نسب بتا کر شہزادی سے شادی کی تمنا ظاہر کی۔ بادشاہ نے آہ سرد بھری اور کہا۔ میری بیٹی کے سوالوں کا جواب ٹھیک طور پر آج تک کوئی نہ دے سکا کئی شہزادے قسمت آزمائی کر چکے ہیں تو اس خیال کو اپنے دل سے نکال دے۔ بلعم نے جب بہت اصرار کیا تو بادشاہ نے اجازت دے دی۔ دوسرے دن بلعم دختر فغفور کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے سوالوں کا صحیح جوابات دینے کا وعدہ کیا۔ پردہ کر دیا گیا اور خطامی نے شہزادی کے سوال یکے بعد دیگرے پیش کرنے شروع کیے دختر فغفور کا پہلا سوال جو خطامی نے پوچھا یہ تھا "وہ کون سی چیز ہے جو صرف ایک ہے دو نہیں" بلعم نے جواب دیا خدا ذات وحدہٗ لاشریک ہے۔ شہزادی کا دوسرا سوال تھا "وہ کون سی چیزیں ہیں جو دو ہیں تین نہیں" بلعم نے جواب دیا "کن" کے دو حروف، بحر و بر، لوح و قلم وغیرہ۔ شہزادی نے اس طرح کے بیس سوالات کیے اور جب وہ جوابات سے مطمئن ہوئی تو دوسرے دن دوبارہ حاضر ہونے کا حکم دیا۔ بلعم کے علم و فضل سے دختر فغفور بہت خوش ہوئی اور کہا کہ میں ایسے ہی عالم و فاضل شہزادے سے شادی کی خواہاں تھی۔ چند روز بعد بڑی دھوم دھام سے ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ بلعم شہزادی کو لے کر اپنے ماں باپ کے پاس پہنچا ایک لشکر جرار جمع کیا اور دغاباز وزیروں کو شکست دے کر کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کی قصے کے آخر میں صنعتی کہتا ہے ؏

الہی کیا فیض جوں اس پہ رحم بھی کر ہور خلقت پو اپنے کرم
محبت کی اس بیل ہو کر ہری لی پھل پھول امید منڈوے چڑی
محباں کے حق میں دعا منگ شتاب ارے صنعتی کر تو ختم کتاب

اس کے بعد شاعر دعا کرتا ہے کہ میری یہ ادبی کاوش "ہر دیس" میں "آسمان کے سوا" کی طرح چمکے مثنوی گلدستہ میں صنعتی نے دکنی زبان سے اپنے غیر معمولی شغف کا اظہار کیا ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے اس مثنوی کو فارسی سے ترجمہ کر کے سلیس دکنی میں پیش کیا ہے اور سنسکرت الفاظ بہت کم استعمال کیے ہیں اور حتی الامکان مثنوی کو عام فہم بنانے کی کوشش کی ہے جو لوگ فارسی سے ناواقف ہیں وہ بآسانی میری زبان سمجھ سکتے ہیں ؏

رکھیا کم سنسکرت کے اس میں بول ادک بولنے سے کیا ہوں امول
جسے فارسی کا نہ کچ گیان ہے سو دکنی زباں اس کو آسان ہے
سو اس میں سنسکرت کا ہے مراد کہاں اس نے آسانگی کا سواد
کیا اس نے دکن میں آسان کر جو ظاہر مرسیں اس میں کئی کئی ہنر

اس مثنوی کا ایک "ہنر" جس پر ہماری توجہ مرکوز ہوتی ہے اس کا پیرایۂ بیان ہے۔ دکنی ادب میں مقصدیت، افادیت اور افادیت اور شعریت کا اتنا حسین امتزاج بہت کم نظر آتا ہے۔

★

غزل

سیف بجنوری

وہ بے وفا تھے نہ مقصد مرا ستانا تھا
انھیں تو میری محبت کو آزمانا تھا

ملا تھا دل تو اسے کام کا بنانا تھا
کمال یہ تھا کہ دل میں انھیں بسانا تھا

غرض تو یہ تھی محبت میں زندگی بن جائے
دلِ خراب کو دل کی حدوں میں لانا تھا

دلِ خموش کو بیٹھے بٹھائے چھیڑ دیا
انھیں تو بزم میں فتنہ کوئی جگانا تھا

یقین کرنا پڑا ان کی جھوٹی قسموں کا
سکونِ دل کے لیے کچھ فریب کھانا تھا

اعادۂ اَرنی اور میں قصور معاف
مجھے تو اپنی نگاہوں کو آزمانا تھا

حرم کی، دیر کی، تقدیس تو سر آنکھوں پر
مگر مجھے ترے در پر ہی سر جھکانا تھا

یہ اہتمامِ قیامت، یہ زینتِ محشر
ہجومِ عام میں شاید مجھے بلانا تھا

ترے کرم نے تُنک بار کر دیا ورنہ
مرے گناہوں کا اللہ کچھ ٹھکانا تھا

بہار کا نہ بھروسہ، نہ کچھ خزاں کی خبر
مآلِ گل پہ نہ غنچوں کو مسکرانا تھا

وہ وفا ہے یہ ہنس کھیل کر نہیں کٹتی
جناب سیف سمجھ کر قدم اٹھانا تھا

غزل

رام پرکاش راہی

جبین یار پہ آئی ہے برہمی کی شکن
کہاں بہار کہاں شوق و آرزو کا چمن

یہ تیرے روپ میں ڈوبا ترا گداز بدن
سحر کی گود میں جیسے مہک رہا ہو چمن

ہر اک نگاہ اٹھی مجھ پہ انگلیاں بن کر
مگر کسی کو نہ سوجھے ترے خطوط بدن

بہارِ زیست ہے شاید وہی فضا کہ جہاں
گلِ نشاط کی قیمت ہے خارِ غم کی چبھن

کیا تھا جرمِ تمنا کبھی جوانی میں
تو آج سیتے ہیں حسرت کا اپنے ہاتھ کفن

سدا بہار ہے ہر زخم دل اگر راہی
ہنسی کی بات ہے آئی گئی خزاں کا چلن

اَندھیرے کا کرب

عابد سہیل

میں نے قلی کے ہاتھ میں ایک روپیہ رکھا اور آہستہ سے کہا:

"سونے کی جگہ دِلا دو تو اٹھنی اور"

قلی نے میری طرف ذرا تعجب سے دیکھا، پھر مسکرایا اور پورے پلیٹ فارم کا ایک چکر لگانے کے بعد بالکل اسی جگہ سے جہاں ہم دونوں میں ایک زبانی معاہدہ ہوا تھا ریلوے یارڈ میں داخل ہو گیا. میں پیچھے پیچھے وہ آگے آگے۔ "بابو جی تار ہے" اس نے پٹریوں کے دونوں جانب لگے ہوئے تاروں کو پھلانگتے ہوئے کہا۔ "ذرا احتیاط سے" اور آگے بڑھ گیا۔ پھر تین پٹریاں اس نے پار کیں' دو گاڑیوں میں داخل ہو کر نکلا اور ایک ڈبہ میں داخل ہو گیا۔ ڈبہ بڑا تھا، چاروں طرف بالکل اندھیرا تھا. ساری سیٹیں خالی تھیں اس نے ایک سیٹ پر میری اٹیچی رکھ دی اور سامنے والی سیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "اس پر بیٹھ جائیے۔ اوپر چادر بچھا دیجئے گاڑی چلے تو سو رہیے گا۔"

میں نے سگریٹ جلاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکالا تو اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا، اٹھنی نکالنے کے لیے۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا. ایسی ٹرین میں جس میں بیٹھنے کی جگہ تک ملنا محال ہو، اگر سونے کی صورت نکل آئے تو دو روپے کیا زیادہ ہیں۔ میں نے سوچا، اس نے سلام کیا اور رخصت ہو گیا۔

میں نے چادر اوپر والی برتھ پر بچھا دی اور بریف کیس کو تکیے کے طور پر استعمال کرنے کے لیے کونے میں رکھ دیا۔ چادر برابر کرنے کے لیے دوسرے کونے پر گیا تو ڈبہ میں دو تین بیڑیاں چمکتی نظر آئیں تھیں۔ اتنے بڑے کمپارٹمنٹ کا تھوڑی دیر کے لیے سہی بلا شرکت غیرے مالک ہونے کی جس خوشی نے مجھے سرشار کر رکھا تھا اس میں کمی ضرور ہو گئی، لیکن خوش میں اب بھی تھا. سونے کی جگہ تو پکی ہو گئی۔

تھوڑی دیر میں کچھ اور لوگ آ گئے. پھر کچھ اور۔ اور اس کے بعد تو جیسے مسافروں کا تانتا بندھ گیا۔ پہلے لوگ بالکل خالی برتھوں پر بیٹھے، پھر کم بھری برتھوں پر، پھر جس کو جہاں جگہ ملی۔

بیڑی کے دھوئیں، لوگوں کی بات چیت' بچوں اور عورتوں کی آوازیں اور گندے میلے اور صاف جسموں کی بُو نے، جس میں میرے جسم کی بو بھی شامل رہی ہو گی. مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر پلیٹ فارم پر ہی کھڑا رہتا تو کم از کم صاف ہوا تو ملتی لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ اوپر والی برتھ پر میری چادر بھی بچھی ہے اور سونے کے لیے جگہ بھی محفوظ ہے. پلیٹ فارم سے گاڑی میں داخل ہوتا تو یہ صورت نہ ہوتی۔ اس دماغی جمع تفریق کا سلسلہ ٹوٹا تو سامنے والی برتھ پر بیٹھے ہوئے ایک شخص کا جملہ میرے کانوں سے ٹکرایا۔

"صاف ستھری زمین۔ نہ لکڑی نہ کوئلہ، بس ہاتھ رکھا تو لال بھبھوکا کوئلوں کا ڈھیر لگ گیا۔"

اس نے بیڑی کا ایک لمبا کش لگایا۔

"بھگوان کی مایا ہے، بڑی شکتی ہے۔ پرانے پرانے روگی جنھیں بڑے بڑے ڈاکٹر جواب دے چکے تھے، ہاتھ لگاتے ہی بھلے چنگے کر دیے۔"

بائیں طرف کسی مسافر نے بکس کھینچا تو وہ میرے پیر سے ٹکرایا۔

میں نے جھک کر گنّے پر ہاتھ پھیرا۔ پھر کھڑے ہو کر اوپر والی برتھ پر ایک نظر ڈالی تو دوسرے کونے پر کسی نے اپنا تھیلا رکھ دیا تھا۔ میری چادر اسی طرح بچھی تھی۔ سرہانے میرا بریف کیس رکھا تھا۔

"ـــــ ہمرے گاؤں میں بھی ایک بجرگ تھے ـــ" میری میری ہی برتھ سے آواز آئی۔ "بڑی کرامت کے مالک رہن۔ دن بھر سڑک کے کنارے بیٹھے رہن۔ کبھی کبھی کبر پر اکڑاکڑا تے جاڑے میں جب رجائی، لحاف کے اندر سردی لاگت ہے، وہ درکھت کے نیچے کھلے میں بیٹھتے رہن۔ نہ گرمی سے پریسان نہ جاڑے سے، نہ کبھی کسی سے کچھ مانگتے دیکھا نہ کچھ کھاتے پیتے۔"

"کبھوں کھانا بھی نہ کھات تھے؟" کسی نے یقین اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت سے پوچھا تو اس شخص نے جواب دے دیا۔ "کسی نے تو دیکھا نہیں۔ پھر ایک دن غائب ہو گئے، اکثر غائب ہو جاتے تھے۔ مہینہ مہینہ بھر کے لیے۔ پھر ایک دم آجاتے تھے۔ پر اب دو سال ہو گئے لوٹ کے نہ آے۔ گاؤں والوں نے ان کی سمادھی بنا دی ہے۔ اب وہاں ہر سال عرس ہووت ہے، عرس"

کھوں، کھوں، کھوں" اس پر زوردار کھانسی کا دورا پڑا اور نہ شاید وہ اپنی بات جاری رکھتا۔ اتنے میں کسی نے بیڑی جلانے کے لیے دیا سلائی جلائی تو میں نے ایک ہی نظر میں سارے چہروں کا جائزہ لینے کی کوشش کی ـــــ ایک داڑھی، شاید آدھے بال سفید آدھے کالے، دو بڑی مونچھیں ایک چہرہ نہ دیکھ سکا۔ کندھے پر رومال پڑا تھا۔ دو تین بچے ایک خاصی میلی قمیص پہنے ہوئے۔ ایک بالکل ننگا۔ تین چار عورتیں، شاید معمولی کپڑوں میں، ایک سفید پوش نوجوان اور ایک میں۔ ادھر ادھر چار لوگ اور تھے لیکن اتنی دیر میں دیا سلائی بجھ چکی تھی۔

اسی وقت کسی مسافر پر کھانسی کا دورہ پڑا ـــــ پرانی کھانسی، اٹک اٹک کر، رک رک کر اس طرح کھوں کھوں کی آواز کہ عمر کا اندازہ کرنا مشکل بات نہ تھی۔ یہ آواز ٹوٹی ہی تھی کہ کسی نے ٹوٹے ہوئے سروں کو جوڑا۔

"یہ تو کلجگ ہے کلجگ لوگ سادھو سنتوں کا بھی جال کرنے لگے ہیں، جسے دیکھو سادھو بنا گھومتا ہے، بدن پر بھبھوت مل کر کسی قبر پر بیٹھ گئے دنیا کا موہ بھی، روپے بھی جمع کر رہے ہیں اور سادھو بھی لیکن اگر کبھی قسمت سے اصلی سادھو مل جائے تو جیون کا کلیان ہو جاتا ہے۔" اس نے اپنے ساتھ ہی برتھ پر بیٹھے یا شاید لیٹے ہوئے بچے کو پیار کیا۔ مجھے یہ پہچان کے چٹخارے اور اندھیرے کی روشنی دی۔ اور کہا ـــ "آپ کو کیا بتاؤں شادی کو سات سال ہو گئے تھے، کوئی اولاد نہ تھی ـــــ ل سے ایک دن تھکا ہارا لوٹا ہی تھا کہ دروازے پر کسی نے صدا لگائی ـــ "جو ایک چٹکی آٹا دے بھگوان اس کی گود ہری کرے" "عورت کو بچے کا موہ مرد سے زیادہ ہوتا ہے" میری بیوی ٹٹلوی بھر آٹا لے کر چلی تو میں نے ٹوکا، رہنے دے ایسے ایسے سادھو بہت دیکھے ہیں ـــ" میں نے یہ بات دھیرے سے کہی تھی باہر تک بھلا کیا آواز گئی ہوگی، لیکن سادھو مہاراج نے باہر ہی سے آواز لگائی ـــ "کیوں دل میلا کرتا ہے سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا ہے ـــــ اگلے بھادوں میں نہ گود ہری ہو تو کہنا۔ تو بھی کیا یاد کرے گا۔" مجھے یہ آواز جیسے اوپر سے آئی ہوئی معلوم ہوئی۔ فوراً تخت سے اٹھ کر باہر بھاگا تو وہاں کوئی نہ تھا، سامنے دور تک سڑک خالی پڑی تھی، نہ کوئی سادھو تھا نہ سنت۔ کیا بتاؤں سادھو مہاراج کا ایک ایک شبد سچ نکلا۔ اب وہ مہاتما مل جائیں تو ان کے چرنوں کی دھول اپنے ماتھے پر لگا کر معافی مانگوں ـ مجھے تو کبھی کبھی بڑا ڈر لگتا ہے۔

وہ کچھ اور بھی کہتا کہ کسی نے کہا ـــ "ڈرنے کی کوئی بات نہیں، سچے سادھو آشیرواد ہی دیتے ہیں، کسی کا برا نہیں چاہتے۔"

اب میری تخیل اپنے بازو پھیلا چکی تھی۔ میں نے کھانس کر گلا صاف کیا اور پورا پلاٹ ذہن میں تیار کیے بغیر پہلا جملہ داغ دیا۔

"اب میں آپ لوگوں کو اپنی آنکھوں دیکھا واقعہ سناتا ہوں۔" میں لوگوں کا ردِّ عمل معلوم کرنے کے لیے ایک منٹ کے لیے خاموش ہوا تو کسی نے کہا ـــ "کیا ہوا تھا، بھیّا!"

"پچھلے سال میں ایک عزیز کے یہاں جگدل پور گیا تھا وہی شہر والا جگدل پور۔ وہاں ایک بزرگ کے اُن دنوں بڑے چرچے تھے۔

ایک درخت کے نیچے دن رات بیٹھے رہتے لوگ طرح طرح کے کھانے پکوا کے لاتے اور ان کے سامنے رکھ دیتے، جی چاہا تو ایک آدھ نوالا کھا لیا نہیں تو کھانا یوں ہی رکھا رہتا جو آتا سلام کرتا کسی کا جواب دے دیا تو وہ اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھتا۔"

میں نے اپنی کہانی کا تاثر معلوم کرنے کے لیے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنا چاہا لیکن وہاں تو بالکل اندھیرا تھا پھر بھی لوگوں کی خاموشی سے یہ اندازہ ہوا کہ لوگوں کے دل میں میری بات یقین کی جگہ پا رہی ہے اسی دوران میں نے کہانی کی کچھ اور جزئیں بٹھالی تھیں۔

میں ایسی باتوں کو مانتا نہیں لیکن جب میرے عزیزوں نے بہت زور دیا تو ایک شام ان سب کے ساتھ میں بھی شاہ صاحب کے پاس چلا گیا وہاں پہونچتے ہی میں نے کہا۔

"شاہ صاحب! سلام علیکم"

اس وقت شاہ صاحب اپنے جسم کو اس طرح ہلا رہے تھے جیسے مٹکے میں کوئی چیز بھرتے وقت زیادہ جگہ بنانے کے لیے لوگ اُسے ہلاتے ہیں۔ سلام کا انھوں نے کوئی جواب نہ دیا، پھر ایک دم بولے ——" وعلیکم "، جا جا کیوں آیا ہے میں جھوٹا ہوں، میں جھوٹا ہوں، میں سچا نہیں، یہ جو آیا ہے سمجھتا ہے میں جھوٹا ہوں —— میں جھوٹا ہوں۔"

سب نے میری طرف دیکھا، میری پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے —— پھر شاہ صاحب نے کہا۔ "جا بابا۔ دیکھ لینا، میں سچا ہوں، میں سچا ہوں۔"

"شاہ صاحب نے آپ کے دل کا حال جان لیا ——؟" کسی نے سوال کیا۔

"ہاں بھائی —— میں تو سچ مچ ڈر گیا تھا ۔" میں نے کہا اور اپنی کہانی کو ایک اور موڑ دیا۔ "خیر کچھ دنوں بعد میں اس واقعہ کو بھول گیا اور واپسی کے لیے روانہ ہوتے وقت اس واقعہ کی کوئی بھی یاد میرے دل و دماغ میں نہ تھی —— لیکن جوں ہی رائے پور کے لیے میری بس چلی سامنے ایک چبوترے پر شاہ صاحب بیٹھے تھے ان کے چاروں طرف لوگوں کی بھیڑ تھی ان کی آنکھیں میری طرف نہیں تھیں، لیکن مجھے لگا کہ وہ آنکھیں جیسے مجھے اور صرف مجھے ہی دیکھ رہی ہوں۔

خیر پھر میں تھوڑی دیر میں اس واقعہ کو بھول کر پہاڑوں کے مناظر میں کھو گیا لیکن صاحب آپ یقین نہیں کریں گے جگدل پور سے رائے پور تک جہاں جہاں بس رکی میں نے شاہ صاحب کو بس کے آس پاس ہی کہیں نہ کہیں بیٹھے ضرور دیکھا اور پھر جب لکھنؤ میں رکشہ پر بیٹھ کر گھر جا رہا تھا تو رکاب گنج کے پل کے پاس کیا دیکھتا ہوں کہ وہی شاہ صاحب آگے آگے پیدل چلے جا رہے ہیں میں نے فوراً رکشہ رکوایا اور معافی مانگنے کے لیے اُن کی طرف جو بڑھا تو وہاں کوئی نہ تھا —— میں تو اب بھی سوچ لیتا ہوں تو مارے ڈر کے ——

"نہیں نہیں" کسی نے اتنا ہی کہا تھا کہ انجن گاڑی سے لگا اور ان صاحب کی آواز انجن کے گاڑی سے لگنے کی آواز میں ڈوب گئی۔

چند منٹ کے بعد گاڑی پانچ چھ بار پٹریاں بدل کر پلیٹ فارم پر آ گئی بجلی جل اٹھی، پنکھے چلنے لگے۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر ان صورتوں کو پہچاننے کی کوشش کی جو اس افسانے کے کردار تھے لیکن اپنے علاوہ کسی اور کی صورت نہ پہچان سکا۔

کیا یہ کہانی میں نے ہی سنائی تھی؟ کیا یہ کہانی میں نے ہی سنائی تھی؟ —— مسافروں کا ایک ریلا آیا تو ڈبے میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ میں خود کو بے حد بے آرام محسوس کر کے کھڑا ہو گیا اوپر والی برتھ پر منتقل ہونے کے لیے کھڑا ہوا تو وہاں کوئی صاحب لیٹے خرانٹے لے رہے تھے۔ میری چادر تہہ کر کے انھوں نے کونے میں رکھ دی تھی اور اپنا بستر بچھا دیا تھا بریف کیس چادر کے اوپر ہی رکھا تھا۔

راستے بھر میں سوچتا رہا کہ اگر اس وقت بھی جب گاڑی یارڈ میں کھڑی تھی ڈبے میں روشنی ہوتی تو کیا ان کہانیوں کا وجود ممکن ہوتا۔؟

★

نوائے جشن جمہوری

طاہر حسن رضوی برق

نصیب ہموطناں، جشنِ یوم جمہوری　　فروغ انجمناں، جشنِ یوم جمہوری
خروشِ نغمہ زناں، جشنِ یوم جمہوری　　ہے رقصِ گلبدناں، جشنِ یوم جمہوری

"ترنگا" جھوم کے یوں مسکرا کے لہرائے!
فلک پہ دیکھ لے قوس قزح تو شرمائے

خوشا وہ پرچمِ ہندوستاں، وقارِ وطن　　نشانِ شوکتِ آزادئ نگارِ وطن
ضیائے صبحِ وطن، صبحِ نو بہارِ وطن　　سوادِ شامِ وطن، شامِ لالہ زارِ وطن

نہاں ہے سرخ لہو تجھ میں جاں نثاروں کا
ترے جلو میں چلا قافلہ بہاروں کا

وہ رہروانِ رہِ خار زارِ آزادی　　بلالِ ہند، وہ آئینہ دارِ آزادی
وہ آبروئے رسن، زیب دارِ آزادی　　انھیں کے نام سے ہے اعتبارِ آزادی

انھیں کا خون ضمانت ہوا چمن کے لیے!
انھیں کی یاد ہوئی حرزِ جاں وطن کے لیے

بجائے جشن مسرت کی رسم ادا کرلیں　　خرابۂ دلِ مضطر کو گل کدہ کرلیں
دعائے دل کو فقیروں کی ہم صدا کرلیں　　عدو بھی چاہیں تو یہ لطف بیجا کرلیں

عزیز ہے دل و جاں سے متاعِ آزادی
نصیبِ غیر، الٰہی وداعِ آزادی

شبوں کو روز کرے اور دنوں کو رات کرے　　بلند پرچمِ ہند آسماں سے بات کرے
حماتِ آرزو منجملۂ حیات کرے　　بساطِ دہر کے بازیٔ گردوں کو مات کرے

ملا وطن کو وہ عالی دماغ کیا کہنا
جو آندھیوں میں جلائے چراغ کیا کہنا

دلوں میں جذبۂ انسانیت رہے باقی　　زمیں پہ خیریت و عافیت رہے باقی
شکستِ زلفِ شہنشاہیت رہے باقی　　گرفتِ شانۂ جمہوریت رہے باقی

بہار آئی ہے گلشن میں کیا پیام لیے
لگی ہیں جھومنے شاخیں گلوں کے جام لیے

یہی ہے کوششِ پیہم کسی سے جنگ نہ ہو　　نزاعِ مذہب و تمیزِ نسل و رنگ نہ ہو
کوئی کسی سے کشیدہ، ملول، تنگ نہ ہو　　شکارِ تفرقہ پردازئ فرنگ نہ ہو

یہی سبق ہے محبت کا اس پہ دھیان رہے
تمام چین کی بنسی بجے امان رہے

ہز ایکسیلنسی ڈاکٹر گستاف ہساک چیکوسلواکیہ سوشلسٹ ریپبلک کے چیرمین ۲۳ دسمبر ۱۹۷۳ء کو ایک ہفتے کے سرکاری دورے پر ہندستان تشریف لائے۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی دہلی ہوائی اڈے پر ڈاکٹر اور مسز ہساک کا استقبال کر رہی ہیں
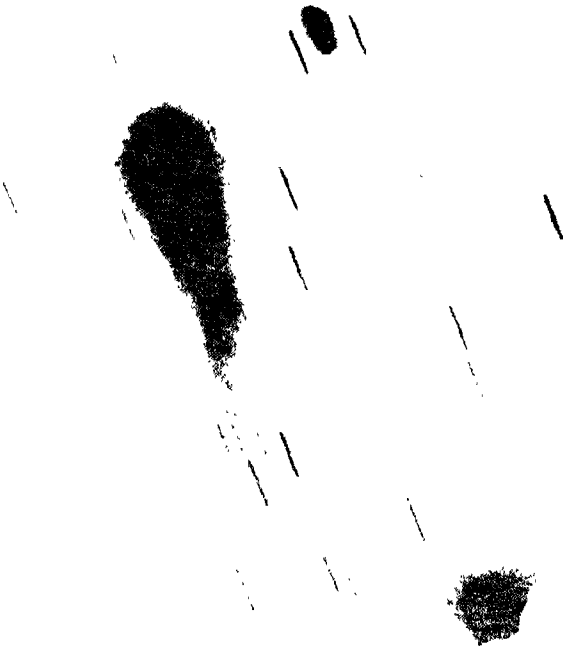
ایک غیر معمولی دمدار ستارہ۔ ٹیلیس کوپ کے ذریعہ لی گئی اس تصویر میں تارے تصویر کے وقت دمدار ستارے کی حرکت کے باعث لکیروں کی شکل میں دکھائی دے رہے ہیں

گورنر اتر پردیش شری اکبر علی خاں ۲۱ دسمبر ۳، ۱۹ء کو پولیس لائن لکھنؤ میں پولیس پریڈ کے موقع پر اعلیٰ کارکردگی کے سلسلے میں تمغے تقسیم کر رہے ہیں (دائیں سے) سورگیہ شری رام کشن رائے کی بیوہ کو شری اکبر علی خاں تمغہ پیش کر رہے ہیں (دائیں) دوسرے پولیس افسران جن کو تمغے دیئے گئے

وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری ہیم وتی نندن بہوگنا ۲۳ دسمبر ۳، ۱۹ء کو این۔سی۔سی سلور جبلی پریڈ میں اول آنے والے گروپ (الہ آباد) کو شیلڈ پیش کر رہے ہیں

دیوانِ میر کا قدیم ترین اور مستند مخطوطہ

نسخۂ محمود آباد

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

شہنشاہِ متغزلین، سرتاج الشعرا اور خدائے سخن میر تقی میر ۱۱۳۵ھ مطابق ۱۷۲۲ء میں اکبر آباد میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں ۱۲۲۵ ہجری مطابق ۱۸۱۰ء میں ۹۰ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ انتقال کے ایک سال کے بعد ۱۲۲۶ھ مطابق ۱۸۱۱ء میں کلیاتِ میر پہلی مرتبہ لارڈ منٹو گورنر جنرل کے حکم سے کیپٹن ٹیلر، ڈاکٹر ولیم ہنٹر، کیپٹن گالوی اور کیپٹن روبک نے مرزا کاظم علی جواں، مرزا جان طپش، مولوی محمد اسلم، تارنی چرن اور منشی غلام اکبر سے تصحیح کرا کے فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے شائع کرایا۔ اس کے بعد منشی نولکشور نے اسے لکھنؤ میں ۱۸۶۸ء میں چھاپا۔ اسی مطبع سے وقتاً فوقتاً اس کے کئی ایڈیشن چھپ گئے۔ یہ نسخے اب عنقا ہو گئے ہیں۔ عرصے کے بعد ۱۹۴۰ء میں آسی لکھنوی نے کلیاتِ میر کو مزید اضافوں کے ساتھ مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع کیا۔ مرتب نے اسے تمام نسخوں سے بہترین قرار دیا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ۱۹۵۸ء میں میر کے کلیات کو ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ ادبی دنیا کراچی سے شائع کیا۔ موصوف کا دعویٰ ہے کہ

"میں نے کلیاتِ میر کے اس نسخے کی ترتیب و تدوین میں ان تمام مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھا ہے اور ان کے علاوہ میر کے تقریباً تمام اہم غیر مطبوعہ نسخوں کو بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ کتب خانۂ ریاست رامپور، کتب خانۂ سالار جنگ، کتب خانۂ انجمن ترقی اردو اور کتب خانہ محمود آباد کے مخطوطے خاص طور پر میرے پیشِ نظر رہے ہیں۔۔۔۔۔ میں نے کوشش یہی کی ہے کہ میر صاحب کا تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اردو کلام نئی ترتیب اور صحت کے ساتھ اس میں یکجا ہو جائے۔"

راقم الحروف نے اپنی زیرِ نظر کتاب "دیوانِ میر نسخۂ محمود آباد" میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نسخۂ کلکتہ نایاب ہے، نیز یہ کہ "بالخصوص محمود آباد کے کتب خانہ میں موجود سارا غیر مطبوعہ کلامِ میر ان کے (ڈاکٹر عبادت بریلوی) مرتب کردہ کلیات میں درج نہیں ہے"

راجہ صاحب محمود آباد کے نادر الوجود کتب خانہ میں دیوانِ میر کے متعدد قلمی نسخے محفوظ ہیں۔ ان میں دیوان چہارم اور زیرِ نظر دیوان یعنی دیوانِ میر کا سب سے قدیم اور مستند نسخہ مکتوبہ ۱۲۰۳ ہجری جسے آسانی کے خیال سے اس مضمون میں آئندہ نسخۂ محمود آباد کہا گیا ہے، غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ دیوان چہارم کی تفصیل یہ ہے

نمبر مخطوطہ ۵۴ سائز "۶×۹" سطریں ۱۲۔ خط شکستہ

ابتدا ؎

کرتا ہوں اللہ اللہ درویش ہوں سدا کا   سرمایۂ توکل یاں نام ہے خدا کا

دیوان کے آغاز میں صفحہ ۲ سے ۱۳۹ تک غزلیں درج ہیں۔ صفحہ ۱۴۰ پر "سوانح محمد تقی میر" درج ہیں۔ پھر اس کے بعد صفحہ ۱۴۱ سے ۱۴۳ تک رباعیات ہیں۔ ان کی تعداد ۹ ہے۔ صفحہ ۱۴۴ پر "ہولی نامہ"، صفحہ ۱۴۸ پر مثنوی بزنامہ، صفحہ ۱۵۱ پر مثنوی جگر سوز، صفحہ ۱۶۵ پر ساقی نامہ اور اس کے بعد جنگ نامہ آصف الدولہ ہے۔ اس مثنوی میں نواب آصف الدولہ بہادر کے فتح رامپور کی تاریخ بھی درج ہے ؎

بسکہ اب ملک و مال سب نواب   راہ لیتے ہیں لکھنؤ کی شتاب
سال تاریخ کا تھا مجھ کو خیال   لطف کے ردے کی ملک نے مقال
کاسے سخن گسترد جہاں استاد   فتح نواب سے کراب دل شاد

۳۰ + ۱۱۷۹ = ۱۲۰۹ سنہ ہجری

مثنوی جنگ نامہ نسخۂ کلکتہ میں شامل نہیں ہے۔

دیوان کی ابتدا میں سادہ ورق پر میر تقی میر کے جائے مدفن اور تاریخ

وفات کے بارے میں میر کے بھتیجے میر محمد محسن[1] تخلص محسن المخاطب زین الدین احمد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر بھی درج ہے۔ یہ دیوان میر کے داماد میر حسن علی تجلی[2] کے ہاتھ کا ۱۲۲۵ھ سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔

میر محمد محسن کی تحریر کے اوپر امجد علی شاہ بادشاہ (عہد سلطنت ۱۲۵۸-۱۲۶۳ھ) کے کتب خانے کی مہر لگی ہوئی ہے۔ اس کے نیچے بادشاہ نصیر الدین حیدر (۱۲۴۳-۱۲۵۱ھ) اور سلطان عالم واجد علی شاہ کی یہ دو مہریں ثبت ہیں۔

سنہ ۱۲۶۳ ہجری واجد علی سلطان عالم	خوش است مہر کتب خانۂ سلیماں جاہ بہر کتاب خزینہ و نقش بسم اللہ ۱۲۴۳ ہجری

داہنی طرف یہ عبارت درج ہے۔

"بتاریخ دہم ربیع الاول سنہ ۱۲۶۳ ہجری بجائزہ رسید"

ذیل میں میر محمد محسن کی پوری عبارت جو ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے درج کی جاتی ہے۔

"بروز جمعہ بستم ماہ شعبان المکرم وقت شام سنہ ۱۲۲۵ھ یک ہزار دو صد بست و پنجم ہجری بودہ میر محمد تقی صاحب میر تخلص صاحب این دیوان چہارم در شہر لکھنؤ در محلہ سٹھی بعد طے نہ عشرۂ عمر بجوار رحمت ایزدی پیوستند و روز شنبہ بست و یکم ماہ مذکور سنہ الیہ وقت دو پہر در اکھاڑہ بھیم کہ قبرستان مشہور است نزد قبور اقربائے خویش مدفون شدند و چہار دیوان خود را کہ ایں دیوان چہارم از آنجملہ است بمحرر سطور محمد محسن المخاطب بزین الدین احمد تجاوز اللہ عن سیاتہ در حین حیات خویش بکمال رغبت بحل کردہ بخشیدہ فقط غفر اللہ لہ بیا میرزادہ۔

حررہ محمد محسن عفی عنہ روز جمعہ بست و ہفتم ماہ شعبان سنہ الیہ بوقت چہار گھڑی روز باقی ماندہ این دیوان از دستخط میر

نوادر الکملا کا ایک ورق جس میں سوانح میر محمد تقی درج ہیں

حسن علی تجلی داماد میر مغفور است محررہ محمد محسن عفی عنہ

محمد تقی میر شاعر کہ بود مسلم ور اتخت و تاج سخن
باقلیم معنی ز ارباب شعر ستانندہ او بود باج سخن

۱۲۲۵ ہجری

---

[1] محسن تخلص می کند برادر زادۂ فقیر مولف است۔ ذہنش بسیار مناسب و سلیقہ اش خیلے درست معلوم می شود۔ مصرع ریختہ مشورت من موزوں می کند۔ سنش نام خدا تا بہ بست سالگی رسیدہ باشد۔ خوب خواہد گفت۔ (نکات الشعرا ص ۱۳۹) میر تقی میر محسن نے ۱۲۴۸ھ میں وفات پائی۔ راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں دیوان منوچہری کا ایک قلمی دیوان مکتوبہ ۱۰۱۰ھ ہے اس کی ابتدا میں میر محمد محسن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر ۱۲۲۹ھ کی درج ہے۔

[2] تجلی تخلص عرف میاں حاجی۔ یکتا کہتے ہیں کہ "در فن ریختہ بے نظیر و ہمشیر زادۂ میر تقی میر دیوان ضخیم ترتیب دادہ (دستور الفصاحت ص ۴۴) ڈاکٹر مختار الدین احمد کے پاس ان کا دیوان ہے جس میں تقریباً ۲ ہزار شعر ہیں۔

دیگر

میر تقی استاد فن شعر   مرد و زد تیا سے عدم شد
گشت چو اشعارش ہمہ بے سر   میر تقی استاد رستم شد

۱۲۲۵ ہجری

اس ورق پر "یا فتاح" "بسم اللہ" "۱۰۲ ورق"
اور دو شعر میر حسن علی تجلی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں

کرتا ہوں اللہ اللہ درویش ہوں سدا کا   سرمایۂ توکل یاں ناؤں ہے خدا کا
میں نے نکل جنوں سے مشق قلندری کی   زنجیر سر ہوا ہے تھا سلسلہ جو پا کا

پورا دیوان میر حسن علی تجلی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اشعار ذیل پر ختم ہوتا ہے ؎

راہ جاناں سے ہے گزر مشکل   جاں ہی سے کوئی مگر گزرے
مارے غیروں کو یا مرے عاشق   کچھ نہ کچھ چاہیئے کہ کر گزرے
غنچہ ہو شرم سے ان آنکھوں کا   گل نرگس اگر نظر گزرے

سر کا جانا ہی ہر قدم ہے میر
کیا کوئی اس کی راہ پر گزرے

دیوان کے آخری ورق پر بھی نصیر الدین حیدر، واجد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے شاہی کتب خانوں کی مہریں ثبت ہیں۔ امجد علی شاہ کی مہر اس طرح لگی ہے۔

گول دائرے کے اندر دو مچھلیوں کے بیچ میں تاج شاہی ہے۔ اور اس کے نیچے مہر کی عبارت یہ ہے۔

۱۲۶۰
تا سخن مہر شد چوں شد مزین برکتا
خاتم امجد علی شاہ زماں عالیجنا
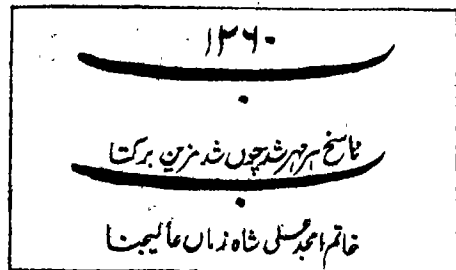
دیوان کے بیچ میں غزلیات کے بعد صفحہ ۱۴۰ میں "سوانح محمد تقی میر" عنوان کے تحت میر کے اہم واقعات زندگی مندرج ہیں۔ یہ صفحہ میر کے بارے میں اہم تاریخی دستاویز ہے اور ان کے حالات زندگی اور آخری ایام کے واقعات نوادر الکلام سے ماخوذ ہیں اس کتاب کا اب نام و نشان بھی نہیں ملتا ہے۔ پوری عبارت ذیل میں من و عن درج کی جاتی ہے۔

میر کا دیوان چہارم بخط میر حسن علی تجلی داماد میر مغفور۔ اشعار کے نیچے میر محمد محسن تخلص محسن (برادر زادۂ میر تقی میر) کے ہاتھ کی تحریر درج ہے۔ اس میں محسن نے میر کی تاریخ وفات اور ان کے قبرستان کی نشاندہی کی ہے۔

سوانح محمد تقی میر

"اصلش از اکبر آباد۔ در اواخر یک صد و یک ہزار و سی و پنج ہجری تولد واقع شدہ۔ بعد واقعۂ ہائلہ پدر بزرگوار بعمر ہفتدہ سالگی نزد دہلی رفت و نجانۂ سراج الدین علی خاں آرزو اقامت ورزیدہ تکمیل علوم عقلی و نقلی نمودہ بعد مرور دہور کہ جدائی فیما بین واقع شد، بر وسائے عظام در خورد و بخدمت ہر دو بعز طبع نام و خوبی بالا کلام باعز امرا و اقربا زندگی بسر می برد تا زمانے کہ آشوب عظیم و فتنہ نمایاں شد بر دسے کار آمدند و ہنگامۂ نادری گرم شد۔ کار و بار مردم در ہم برہم شدہ خانما نہا بتاراج او باشان رفت، بر بنیاد شرفا عرصۂ حیات تنگ شدہ مردمان شاہجہان آباد از شہر دسے کریافتند از جا بیرون رفتند و در بصوبۂ غربت نہادند۔ میر صاحب تا زمانے بے چارہ ماند، مگر حیران و پریشان، سراسیمہ سرگرداں نہ رفیقے کہ یاری کند و نہ انیسے کہ غمگساری۔ گلفتہا دیدند و کربہا کشیدند۔ آخر الامر

باگہرہ ۹۸۱ شکست

دیوان میر
نسخۂ محمود آباد
کا
آخری ورق

با پلسے نواب وزیر حضرت دہلی راکہ بجائے مالوف بود وداع کردہ بہ بلاد شرقی شتافتند ودر بلدۂ لکھنؤ طرح اقامت انداختند و مورد عواطف آصفی شدند، شہرۂ حسن کلام زمین و زمان را برگرفت، ذرّہ ذرّہ روشناس و قطرہ قطرہ محو سپاس چہ تعظیمہا کہ ندیدند و چہ آفرینہا کہ نکشیدند، چونکہ گردون بے مدار فتنہ اساس و زمانۂ غدّار ناسپاس است، کسے را نہ بیند کہ بیارامد، جگر میر را حوادث گوناگون فگار ساخت و آسودہ را افگار افگار کرد۔ درسالے ناز پروردۂ آغوش ناز دختر دسانی دیگر مرہم جگر افگار خلف کامگار و در سالے دیگر اہلیہ عفت شعار بکنج عافیت مزار آسودند قیامت آشکار و محشر بید مدار شد، در حواس و مزاج اختلال کلی راہ یافت۔ برداشتگی خاطر از دنیائے ناپائدار از حد فزوں و شوق سپردگی از اندازہ بیروں رفت دلمان عزلت مستحکم گرفتند و مجالس محافل را وداع نمودند مدتے ہمیں نوع گزشت، آخر در شہر ربیع الثانی عوارض مزمنہ روبہ ترقی آوردند، در دقولنج کہ جلیس قدیم و ہمراز ندیم بود ساعتے نگذاشت و جع مفاصل قوائے جسمانی را معطل ساختہ، پزشکان شاہی کہ شناسائے قدیم بودند ہجوم آوردند رائے ہمگنان برآں قرار یافت کہ چارۂ کار واقعی باید نمود دوا روے باید استعمال آورد، کہ قبض طبیعت برطرف شود، تلیئنے دادند، اسہال بود کہ پیام مرگ، جثہ نحیف و مضغہ ضعیف واسہال، یک روزہ یک صدو پنجاہ، واویلا واویلا آہ آہ، دو سہ روز ہمیں نوبت بود، آزار مرگ انجامید، فرشتۂ موت جام ہلاہل۔

کل من علیہا فان نے پیش نمود دبیا شامید، انا للہ وانا الیہ راجعون ثم انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم مردے بعد متوکل سپاہی پیشہ، رقیق القلب، پابند وضع، جہاں دیدہ سرد و گرم زمانہ چشیدہ، سرآمد سخنوران ماضی و حال در سخن سنجی بے مثال کم اختلاط و با دوستاں سراپا ارتباط سنجیدہ، از حرص و ہوائے دنیا آزاد، کسے را کہ نیاز ورزے ہرگز ہرگز حملہ براں نیاوردے، کسی را بدنی گفت و بدنمی شنفت، استغنائے بیش از بیش و بہ تعظیم ہر کرد مہ پیشا پیش، مراختہ و مطارحہ را ترک نمودہ بود، تاہم سخن گوئی را مدار حیات خویش افکار کردہ تادم واپسیں گرفتار دام طرۂ سخن بود، حرفہا زدو کلامہا می گفت و در آخر ہنگامش ہمیں مطلع غزل کہ گفتہ او بود بود

سازِ بسیج آمادہ ہے سب قافلے کی تیاری ہے
مجنوں ہم سے پہلے گیا ہے اب کی ہماری باری ہے

قریب چہار صد کس ہمراہ جنازہ اس بودند و بعد ازاں خنوندگاں و عقیدتمندگان جوق در جوق نماز غائبانہ گزاردند، ہر صنف کلام یادگار را وست، مثنوی و غزل و مدح و ذم گرمی بازار ادست الہی اللہم اغفرہ . . . .

از نوادر الکلام نقل گرفتہ شد و ثبت دیوانش نمودہ آورد۔"

راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں میر کے دیوان پنجم کا ایک نادر اور نایاب قلمی نسخہ ہے۔ یہ مطبوعہ دیوان پنجم سے مختلف ہے۔ اس میں میر کا غیر مطبوعہ کلام بھی درج ہے۔ دیوان میں مثنوی معورنامہ بھی ہے۔ یہ مثنوی نسخۂ کلکتہ، نسخۂ نولکشوری اور نسخۂ آسی میں شامل نہیں ہے۔ ڈاکٹر جین صاحب کو یہ مثنوی حیدرآباد میں کلیات میر کے ایک نسخہ میں دستیاب ہوئی اور انہوں نے اسے اردو ادب مطبوعہ جون ۱۹۵۷ء میں شایع کیا۔ اس کے ایک سال بعد ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اسے کلیات میر میں شامل کرکے شایع کیا۔ دونوں حضرات کے اس مثنوی میں غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ غالباً جین صاحب کے پیش نظر خط شکست میں کوئی ناقص نسخہ رہا ہوگا۔ راقم کو اس مثنوی کا بالکل صحیح اور خوشخط نسخہ دستیاب ہوا ہے چونکہ یہ مثنوی بہت عمدہ، سبق آموز اور مزاج میر

کی آئینہ دار ہے اس لیے یہ صحت کے ساتھ پہلی مرتبہ شائع کی جاتی ہے۔[1]

جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے راجہ صاحب محمود آباد کے نادر الوجود کتب خانے میں دیوان میر کے کئی نایاب اور بیش بہا قلمی نسخے محفوظ ہیں۔ ان میں سب سے قدیم اور مستند نسخہ ۱۲۰۳ھ مطابق ۸۷-۱۷۸۶ء کا مخطوطہ ہے۔ یہ میر کی حیات میں موتی لال تخلص حیف شاگرد میر سوز (متوفی ۱۲۱۳ھ) کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس زمانے میں میر لکھنؤ میں تازہ وارد ہوئے تھے اور نواب آصف الدولہ بہادر کی سرکار سے وابستہ تھے۔ حیف بھی نواب موصوف کے دیوان، بھوانی پرشاد کے ملازم تھے اس طرح دونوں بزرگوار یعنی میر اور حیف لکھنؤ میں نواب وزیر کے زیر عاطفت رہتے تھے۔ یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ دیوان میر کی نظر سے گزرا ہو۔ میر دیوان کی کتابت کے بعد ۲۲ سال تک زندہ رہے اور ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں انتقال کیا۔

نسخۂ محمود آباد وہی دیوان ہے جس پر میر کو بڑا فخر تھا اور جس کے بارے میں انہوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ ؂

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

راقم الحروف نے زیر نظر دیوان کئی قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے ترتیب دیا ہے، مطبوعہ نسخوں میں نسخۂ کلکتہ سے بھرپور استفادہ کیا گیا۔ نسخۂ کلکتہ میں میر کا سالم کلام شامل نہیں ہے۔ جب یہ نسخۂ محمود آباد سے ملایا گیا تو معلوم ہوا کہ بعض غزلوں کی تعداد اشعار میں نمایاں فرق ہے یعنی نسخۂ کلکتہ اور دیگر مطبوعہ نسخوں میں اشعار کی تعداد کم اور نسخۂ محمود آباد میں زیادہ ہے۔

میر کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کے کلام میں بہتّر نشتر ہیں۔ کلیات میر جیسی ضخیم کتاب میں صرف ۷۲ نشتر کا تعین کرنا میر کے ساتھ ناانصافی ہے۔ راقم نے نسخۂ محمود آباد میں میر کے سیکڑوں اشعار دریافت کئے ہیں جن میں سے ایک ایک شعر نشتر سے تیز تر ہے۔ اور یہ سب کے سب غیر مطبوعہ ہیں۔ اس کی مثال صرف ایک شعر سے دی جا سکتی ہے جو آج تک لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہے۔ تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی ابتدا غزل کے اس شعر سے ہوتی ہے ؂

تھا استغنا حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

نسخۂ محمود آباد کا آغاز ذیل کی غزل سے ہوتا ہے ؂

گل و بلبل بہار میں دیکھا
ایک تجھ کو ہزار میں دیکھا

یہ غزل نسخۂ کلکتہ میں صفحہ ۳۷ میں درج ہے اور یہ ۳۴ ویں غزل ہے۔ نسخۂ کلکتہ کی پہلی غزل جس کا مطلع اوپر نقل کیا گیا ہے نسخۂ محمود آباد میں صفحہ ۳۷ کی ۸۳ ویں غزل ہے۔ تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں اس غزل میں ۱۰ شعر ہیں لیکن نسخۂ محمود آباد میں ۱۱ ہیں۔ پانچواں شعر غیر مطبوعہ ہے اور یہی راقم کی نظر میں حاصل غزل ہے۔

اس فصل میں کہ گل کا گریباں بھی ہے ہوا
دیوانہ ہو گیا سو بہت ذی شعور تھا

نسخۂ محمود آباد کی پہلی غزل گل و بلبل الخ میں ۷ شعر ہیں جبکہ نسخۂ کلکتہ اور دیگر قلمی نسخوں میں یہ غزل ۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ غزل کا تیسرا اور چھٹا شعر غیر مطبوعہ ہے ؂

جی اضطر تھا زندگی میں دل — دو میں میں نے حزار میں دیکھا
ذبح کرتیں کہا تھا مرتا ہوں — دم نہیں مجھ نگار میں دیکھا

دیوان میں اس قسم کے غیر مطبوعہ اشعار بکثرت درج ہیں جو میر کے مزاج اور افتاد طبع کے آئینہ دار ہیں۔ راقم نے ہر غزل کے فٹ نوٹ میں اختلاف نسخ کے علاوہ ان تمام غیر مطبوعہ اشعار کی نشاندہی کی ہے جو پہلی مرتبہ دریافت کئے گئے ہیں۔

نسخۂ محمود آباد غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ میر کا قدیم ترین اور مستند دیوان ہے اور اسے تمام قلمی و غیر مطبوعہ نسخوں پر فوقیت حاصل ہے۔ راقم کی رائے ہے کہ میر نے دلّی میں ۱۱۶۵ ہجری مطابق ۵۲-۱۷۵۱ء سے قبل جو دیوان ترتیب دیا تھا نسخۂ محمود آباد اسی کا مخطوطہ ہے۔ روایتی لکھنؤ سے قبل میر کا یہی دیوان دلّی میں مروج تھا۔ اس کا واضح ثبوت خود میر کے تذکرۂ نکات الشعراء سے فراہم ہوتا ہے۔ میر نے یہ تذکرہ ۱۱۶۵ھ میں تالیف کیا تھا۔ انھوں نے تذکرے کے آخر میں اپنے ۲۰۰۰ اشعار اور ۷ رباعیوں کا انتخاب دیا ہے۔ انتخاب کے یہ جملہ اشعار نسخۂ محمود آباد میں درج ہیں۔ میر کے بعد گردیزی[3]، قائم[4]، شفیق[5] اور میر حسن[6] نے اپنی

---

[1] بسبب طوالت مثنوی نہ الوقت شائع نہ کی جا سکی۔ ملاحظہ کیجیے آئندہ قسط (ایڈیٹر) [2] میر ۱۱۹۱ ہجری میں وارد لکھنؤ ہوئے تھے۔ [3] تذکرۂ ریختہ گویان صفحہ ۱۳۶ [4] مخزن نکات صفحہ ۴۰، [5] چمنستان شعراء صفحہ ۲۶۲، [6] تذکرۂ شعرائے اردو صفحہ ۱۵۱

غزلیات کا انتخاب درج کیا ہے۔ جو نسخۂ محمود آباد میں ملتی ہیں۔ اس نسخے میں ذیل کی غزلیں درج نہیں ہیں ؎

(۱) الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

(۲) راہِ دورِ عشق میں روتا ہے کیا[1]

یہ دونوں غزلیں میر نے ۱۱۶۵ ہجری (۱۷۵۲ء) کے بعد کہی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی غزل نکات الشعرا، مخزن نکات یا تذکرۂ میر حسن میں درج نہیں ہے۔ پہلی غزل میر نے شوق رامپوری کو اپنے تازہ کلام کے ساتھ طبقات الشعرا کے لیے ۱۱۶۵ ہجری کے بعد اس وقت بھیجی تھی جبکہ میر ناگرمل کے پاس ملازم تھے اور یہ ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۷۵ء کا زمانہ تھا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ طبقات الشعرا کا سالِ تصنیف بھی ۱۱۸۸ھ ہے۔ شوق کے الفاظ یہ ہیں:-

کلیاتِ میر نسخۂ کلکتہ مطبوعہ ۱۸۱۱ء کا سرورق

"از مدتے بسبب افراط و تفریطِ روزگار ناہنجار ہمراہ ناگرمل کہ دیوان تن خلیل بادشاہی بود در قلعۂ ڈیگ شنیدہ می شود"[2]

دوسری غزل تذکرۂ عشق (سالِ تصنیف، ۱۱۹۰ھ یا بعد) میں درج ہے[3]

نسخۂ محمود آباد کے ترقیمہ میں کتاب کا نام "دیوان بزبان ہندی تصنیف میر تقی صاحب مرقوم ہے۔ اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۲۰۳ھ سے قبل میر کا یہی دیوان موجود تھا جو تقریباً پانچ ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ راقم کے بیان کی تائید مردان علی خاں مبتلا لکھنوی کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ وہ ۱۱۹۴ ہجری میں جبکہ میر دلی ہی میں تھے کہتے ہیں کہ دیوان میر میں چار پانچ ہزار بیت ہیں۔ اصل عبارت یہ ہے۔

"مسموع شد کہ (میر) در شاہ جہاں آباد تا حالت تحریر ایں گلشن سخن کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجری است بہ سلامت استقامت دارد..... دیوان فصاحت بیانش چہار پنج ہزار بیت"[4]

امر اللہ الہ آبادی نے بھی اسی ایک دیوان کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

"در دیوانش بہتر از یں اشعار بنظر فقیر آمدہ"[5]

تذکرہ نویسوں میں مصحفی پہلے شخص ہیں جنہوں نے تذکرۂ ہندی[6] میں میر کے چار دواوین کا ذکر کیا ہے۔ اسی زمانے میں میر حسن علی تجلی (متوفی ۱۲۱۴ ہجری) نے میر کا دیوان چہارم اپنے ہاتھ سے نقل کیا تھا۔ یہ دیوان بعد میں میر نے اپنے بھتیجے میر محمد محسن کو عنایت کیا تھا۔ میر محمد محسن کے الفاظ یہ ہیں:

"ایں دیوان چہارم محررِ سطور محمد محسن ...... در حین حیات خویش بکمال رغبت بحل کردہ بخشیدند"۔

مصحفی کے بعد مرزا علی لطف نے بھی ۱۲۱۵ ہجری میں انہی چار دیوان کا ذکر کیا ہے[7]

اس کے بعد جب ۱۲۱۸ ہجری میں شاہ کمال نے مجمع الانتخاب ترتیب دیا تو اس وقت میر کے پاس پانچ دیوان تھے۔ یہ پانچوں دیوان مع دیوان زادہ لا انتخاب دیوان پنجم میر نے شاہ کمال کو انتخاب کے لیے دیے تھے[8] احمد علی یکتا پہلے تذکرہ نویس ہیں جنہوں نے میر کے چھ دواوین اور ایک "دیوانچہ" کا ذکر کیا ہے[9]

---

[1] تمام قلمی اور پرانے نسخوں میں مصرع اسی طرح ہے۔ [2] طبقات الشعرا صفحہ ۲۰۶ مرتبہ نثار احمد فاروقی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور [3] تذکرۂ عشق صفحہ ۱۹۱ [4] گلشن سخن صفحہ ۲۰۵
[5] تذکرۂ مسرت افزا صفحہ ۱۹۹-۲۰۰ مرتبہ قاضی عبد الودود [6] تذکرۂ ہندی صفحہ ۲۰۳ سالِ تکمیل ۱۲۰۹ھ [7] گلشن ہند صفحہ ۱۵۳ [8] مجمع الانتخاب (قلمی) کتب خانہ علی گڑھ
[9] دستور الفصاحت صفحہ ۳۶

شاید دیوانچہ" سے یکتا کی مراد "دیوان زادہ" ہے۔

نسخۂ محمود آباد میر کے عمدہ اور نمائندہ کلام کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس میں وہ غزل بھی درج ہے جس کا مطلع ہے ؎

رہی نگفتہ میرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ میر نے یہ غزل لکھنؤ میں ناقدردانی کے طور پر کہی تھی اور اس شعر کی بنیاد پر اہل لکھنؤ کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے کہ وہ میر کی زبان نہیں سمجھتے تھے اور میر کو ان سے شکایت تھی۔ راقم کی دریافت ہے کہ یہ غزل بھی میر نے ۱۱۶۵ ہجری سے قبل دلی میں کہی تھی۔ ثبوت یہ ہے کہ اس کا انتخاب قدیم تذکروں جیسے تذکرۂ میر حسن سال تصنیف ۱۱۸۸ - ۱۱۹۱ ہجری میں بھی دیا گیا ہے۔

غزل کا یہ شعر جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے تیر و نشتر سے کچھ کم نہیں ہے ؎

نہیں ہے تاب تواں کی جدائی کا اندوہ　　کہ ناتوانی بہت ہے مزاج داں میری

ذیل کی غزلیں بھی ۱۱۶۵ ہجری سے قبل دلی میں کہی گئی تھیں ؎

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میر　　پہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا
ریختہ رتبہ کو پہنچایا ہوا اس کا ہے　　معتقد کون نہیں میر کی استادی کا
سر سبز ملک ہند میں ایسا ہوا کہ میر　　یہ ریختہ لکھا ہوا ترا دکھن گیا
میر شاعر بھی زور کوئی تھا　　دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب
گیا جہان سے خورشید ساں اگرچہ میر　　ولیک مجلس دنیا میں اس کی جا ہے گرم
بلا ہوئی ہے مرے جی کو طبع روشن میر　　ہوں آفتاب ولیکن زوال اپنا ہوں
ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کرو　　چاہیے اہل سخن میر کو استاد کریں
تربت میر پہ ہیں اہل سخن　　ہر طرف حرف ہے حکایت ہے
تو بھی تقریب فاتحہ سے چل　　بخدا واجب الزیارت ہے
گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر　　یہ ہماری زبان ہے پیارے

نسخۂ محمود آباد میں میر کی خاص زبان ہے۔ جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

زیر نظر دیوان میں ایک غیر مطبوعہ غزل کا یہ شعر قابل غور ہے ؎

تذکرے سب کے پھر رہیں گے دھرے
جب مرا انتخاب نکلے گا

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ میر نے گویا ۱۱۶۵ ہجری سے قبل اپنے کلام کا انتخاب بھی کیا تھا بہر حال یہ دیوان جسے راقم نے کئی قلمی و مطبوعہ نسخوں سے ترتیب دیا ہے اردو تحقیقی ادب میں میر کے بارے میں ایک اضافہ اور نئی دریافت ہے۔ راقم کو اس بات پر فخر ہے کہ تقریباً دو سو سال کے بعد میر کا مستند اور غیر مطبوعہ کلام پہلی مرتبہ شائع کیا جاتا ہے۔ یہ اشعار نسخۂ کلکتہ یا اور کسی قلمی و مطبوعہ نسخے میں نہیں ملتے ہیں

ذیل میں نسخۂ محمود آباد کے علاوہ دیوان چہارم اور دیوان پنجم کے غیر مطبوعہ اشعار ردیف وار درج کیے جاتے ہیں۔ ابتدا میں وہ غزلیں درج کی جاتی ہیں جو تین سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہیں۔

دیوان میر۔ نسخۂ محمود آباد

غیر مطبوعہ کلام

وہ جو پی کر شراب نکلے گا　　کس طرح آفتاب نکلے گا
محتسب میکدہ سے جاتا نہیں　　یاں سے ہو کر خراب نکلے گا
یہی چپ ہے تو درد دل کہتے　　مونہہ سے کیوں کر جواب نکلے گا
جب اٹھے گا جہان سے یہ نقاب　　تب ہی اس کا جواب نکلے گا
عرق اس کے بھی مونہہ کا بو کیجو　　گر کبھو یہ گلاب نکلے گا
آؤ بالیں تلک نہ ہو کے دیر　　جی ہمارا شتاب نکلے گا
دفتر داغ ہے جگر اس بن　　کسو دن یہ حساب نکلے گا
تذکرے سب کے پھر رہیں گے دھرے　　جب مرا انتخاب نکلے گا

میر دیکھو گے رنگ نرگس کا
اب جو وہ مست خواب نکلے گا

نہیں ایسا کوئی میرا جو ماتم دار ہووے گا　　مگر اک غم ترا ہے شوخ بیکس ہو کے رووے گا
اگر لگتے رہے اے ناامیدی داغ ایسے ہی　　تو کاہے کو کوئی تخم تمنا دل میں بووے گا
الٰہی وہ بھی دن ہوگا کہ جس میں ایک ساعت بھی　　میں رووں گا وہ اپنے ہاتھ میرے مونہہ کو دھووے گا

جو ایسے شور سے روتا ہے دن کو میر تو شب کو
نہ سونے دیگا ہمسایوں کو نہ یہ آپ سووے گا

ہو بلبل گلگشت کہ اک دن ہے خزاں کا　　اٹھتا ہے ابھی رنگ گل باغ جہاں کا
ہے مجھ کو یقیں تجھ میں وفا ایسی جفا پر　　گر جاک برابر ہووے اس میر گماں کا
سینے میں مرے آگ لگی میرے سخن سے　　جوں شمع جلایا ہوا ہوں اپنی زباں کا

آرام عدم میں نہ تھا ہستی میں نہیں چین
معلوم نہیں میرا ارادہ ہے کہاں کا

ہمیشہ دل میں کہتا ہوں یہاں جاؤں وہاں جاؤں   تجھے غم کو اکیلا چھوڑ کر پیارے کہاں جاؤں
لگی آتی ہے واں تک تیرے دامن کی ہوا اڑ کے   میں یہ مشت غبار اپنا چھپانے کو کہاں جاؤں
ادھر صحرائے بیتابی ادھر شہدے لے قاتل   جو فرما دے تو وہاں جاؤں جو فرما دے تو یاں جاؤں

اگر جبتا رہا لے زلف تو میں میرؔ ہوں سنیو
بلائے ناگہانی کے سرا دپر ناگہاں جاؤں

عشق کرنے کو جگر چاہیے آسان نہیں   سب کو دعویٰ ہے ولے ایک میں جان نہیں
غارت دیں میں تیری چشم کی ایماں میں ادا   تجھکو کافر نہ کہے جو وہ مسلمان نہیں
سرسری ملئے بتوں سے جو نہ ہو تاب جفا   عشق کا ذائقہ کچھ داخل ایمان نہیں
ایک بے درد تجھے پاس نہیں عاشق کا   ورنہ عالم میں کسی خاطر مہمان نہیں
کیونکے غم سرزدہ ہر لحظہ نہ آوے دل میں   گھر ہے درویش کا یہاں دربان نہیں
ہمنشیں آہ نہ تکلیف شکیبائی کر   عشق میں صبر و تحمل ہو یہ امکان نہیں

کس طرح منزل مقصود پہنچیں گے میرؔ
سفر دور ہے اور ہم کنے سامان نہیں

آنکھوں سے دل تلک ہیں چنے خوان آرزو
نومیدیاں ہیں کتنی ہی مہمان آرزو

یک چشمک اس طرف بھی تو کافر کہ تو ہی ہے
دین نگاہ حسرت و ایمان آرزو

آیا تو اور رنگ رخ یاس جل با
جانے لگا تو چلنے لگی جان آرزو

اس مجلے کو سیر کروں کب تلک کہ ہے
دست ہزار حسرت و دامان آرزو

پامال یاس آہ کہاں تک رہوں گا میرؔ
سرشتہ کیوں کیا تھا میں دیوان آرزو

نہ آ دام میں مرغ فریاد کیجو   ٹک اک خاطر خواب صیاد کیجو
یہ تہمت بڑی ہے کہ مرگئی شیریں   تحمل ٹک اے مرگ فرہاد کیجو
غم گل میں مرتا ہوں لے ہم صفیرو   چمن میں جو جاؤ مجھے یاد کیجو

ماگھ ۱۸۹۵ تک

رہائی مری مدعی ضعف سے ہے   تو صیاد مجھ کو نہ آزاد کیجو
مرے روبرو آئینہ لے کے ظالم   دم واپسیں میں تو تو شاد کیجو

جدا تن سے کرتے ہی پامال کرنا
یہ احساں مرے سر پہ جلاد کیجو

وہی مجھ پہ غصہ، وہی یاں سے جا تو   وہی دور ہو تو، وہی پھر نہ آ تو
مرے اس کے وعدہ ملاقات کا ہے   کوئی روز اے عمر، تعجیل وفا تو
بہت پوچھیو دل کو میری طرف سے   اگر جائے اس کی گلی میں صبا تو
سفینہ مرا ورطۂ غم سے نکلے   جو ٹک ناخدائی کرے اے خدا تو

سب اسباب ہجراں میں مرنے ہی کے تھے
بھلا میرؔ کیوں کر کے جیتا رہا تو

مرے درد دل کا تو یہ جوش ہے   کہ عالم جوان سیہ پوش ہے
کیا روبرو اس کے کیوں آئینہ   کہ بے ہوشی اس کا دم اور ہوش ہے
کبھو تیر سا اس کماں میں بھی آ   کہ خمیازہ کش میری آغوش ہے

بلاؤں میں اس دور بد کی تو نہیں
جہاں میں خوشا حال مے نوش ہے

سن کے صفت ہم سے خرابات کی   عقل گئی زاہد بد ذات کی
جی میں ہمارے بھی تھا پیویں شراب   پیر مغاں تو نے کرامات کی
کوئی رمق جان بھی تن میں مرے   سو بھی ترے غم کی مدارات کی

یاد میں تجھ زلف کے گریہ سے شوخ
روز مرارات ہے برسات کی

جوں جوں ساقی تو جام بھرتا ہے   مری توبہ کا جان ڈرتا ہے
سیر کر عاشقوں کی جانبازی   کوئی سکتا ہے کوئی مرتا ہے

میرؔ از بسکہ ناتواں ہوں میں
جی مرا سائیں سائیں کرتا ہے

اڑا برگ گل کو دکھاتی ہے وادی   کہو کس طرح نہیں صبا جو رہا دی
میں لبریز تجھ نام سے جو نگیں تھا   رہی لوح تربت مری کیوں کے سادی
ترے غم میں ہو زیست اور موت یکساں   نہ مرنے کا ماتم نہ جینے کی شادی

میں ہوں بے نوا میرؔ ایسا کہ شب کو
فغاں سے کہوں ٹک کھڑی رہیو ہادی

مجھکو مارا بھلا کیا تو نے ۔۔۔ پر وفا کا بُرا کیا تو نے[1]
حسرتیں اس کی سر پٹکتی ہیں ۔۔۔ مرگ فرہاد کیا کیا تو نے
میں جو کہتا تھا تو ہی کر یو قتل ۔۔۔ بارے میرا کہا کیا تو نے
اس کے جور و جفا کی کیا تقصیر ۔۔۔ جو کیا سو وفا کیا تو نے
یہ چمن ہے قفس سے برلے ضعف ۔۔۔ مجھکو بے دست و پا کیا تو نے

کل ہی پڑتی نہیں ہے تجھ بن آج
میرؔ کو کیا بلا کیا تو نے

چلی جاتی ہی نکلی جان ہے تدبیر کیا کریے
مداوا سے مرض گزرا کہو اب میرؔ کیا کریے
نہ رکھا کر کے زنجیر پریشاں دل ہمارے کو
ہوئی اب یہ تو تیری زلف سے تقصیر کیا کریے
کریں استادگی آیا تھا جی یہ قتل ہونے میں
یہ اپنا کام ہے قاتل یہ اس کو دیر کیا کریے
نہیں آتا ہے کوئی ڈھب ہمیں آسودہ ہونے میں
بھلا تو ہی بتا اے خاطر دلگیر کیا کریے

ساقی گھر چاروں اور آیا ہے ۔۔۔ دے کبھی مے ابر زور آیا ہے
ذوق تیرے وصال کا میرے ۔۔۔ ننگے سر تا بہ گور آیا ہے
بوجھ اٹھاتا ہوں ضعف کا شاید ۔۔۔ ہاتھ پاؤں میں زور آیا ہے
غارت دل کرے ہے خال سیاہ ۔۔۔ بے طرح گھر میں چور آیا ہے

آج تیری گلی سے ظالم میرؔ
لوہو میں شور بور آیا ہے

یہ کلول نہیں ملتی جی پر سے اس کے ۔۔۔ علاقہ ہوا جس کو خنجر سے اس کے[2]
سکھا دے ہے ہجراں کا غم دلوں کے ۔۔۔ اُگے پھول کانٹے ہو بستر سے اس کے
وہ بے رحم گھر سے کبھی اپنے نہ نکلا ۔۔۔ گئیں نعشیں غم کشتوں کے در سے اس کے
مجھو کہا دے گا آفتاب آفتابا ۔۔۔ سحر دیر بڑھتا ہو اب گھر سے اس کے

کہیں میرؔ کی جلتی آنکھیں ہوں ٹھنڈی
کف پا ملو دیدۂ تر سے اس کے

ذیل میں نسخۂ محمود آباد کے وہ غیر مطبوعہ شعر نقل کیے جاتے ہیں جو نسخۂ کلکتہ میں ناپید ہیں۔ راقم نے فٹ نوٹ میں یہ بھی دکھایا ہے کہ نسخۂ کلکتہ میں ان اشعار کو کن صفحات میں درج ہونا چاہیئے تھا۔

نسخہ محمود آباد

غزل ۱

جیسا مضطر تھا زندگی میں دل ۔۔۔ وہ ہیں میں نے مزار میں دیکھا[3]
ذبح کر میں کہا تھا مرتا ہوں ۔۔۔ دم نہیں مجھ شکار میں دیکھا

غزل ۴

ہم تو گئے تھے شیخ کو انسان بوجھکر ۔۔۔ پر اب سے خانقاہ میں جایا نہ جائے گا[4]

غزل ۸

لوہو پینے ہی مرا اشک سو منہ کو لاگا ۔۔۔ بوسہ جب لے ہی ترے ہونٹوں کی پپڑی کا مزا[5]

غزل ۹

بے نالہ و بیزاری بے خستگی و خواری ۔۔۔ امروز کبھی اپنا فردا نہ ہوا ہوگا[6]

غزل ۱۸

ننظر اس کے کر خت ہو گئے بیٹھے بیٹھے ۔۔۔ جس کے مردے کو اٹھایا سو لٹایا گیا[7]

غزل ۱۹

مرتا ہوں جان دیں ہیں وطن داریوں پہ لوگ
اور سنتے جانتے ہیں کہ ہر اک نے سفر کیا[8]

(۲۰)

تسلی ہوا صبر سے کچھ میں تجھ بن ۔۔۔ کبھی یہ قیامت طرح دار ہوگا[9]
صبا موئے زلف اس کا ٹوٹے تو ڈر ہے ۔۔۔ کہ اک وقت میں یہ سیہ مار ہوگا
مرا دانت ہی تیرے ہونٹھوں پہ مت پوچھ ۔۔۔ کہوں گا تو لڑنے کو تیار ہوگا
نہ مر کر بھی چھوٹے گا اتنا رکے گا ۔۔۔ ترے دام میں جو گرفتار ہوگا

---

[1] یہ غزل نسخۂ محمود آباد میں ردیف "ن" میں درج ہے۔ پہلے دو شعر نسخۂ کلکتہ میں دیوان پنجم میں درج ہیں۔ [2] یہ غزل دیوان چہارم مکتوبہ میر حسن علی تجلی میں درج ہے۔ [3] نسخۂ کلکتہ ص۲۰، [4] نسخۂ کلکتہ ص۳۹، [5] نسخۂ کلکتہ ص۴۰، [6] نسخۂ کلکتہ ص۴۱، [7] نسخۂ کلکتہ ص۴۲، [8] نسخۂ کلکتہ ص۵۰، [9] نسخۂ کلکتہ ص۵۱

(۲۱)

میرے نہ ہونے کا تو ہے اضطراب یوں ہی
آیا ہی جی لبوں پر اب کیا ہے جانے گا[1]

غزل ۲۲ شعر ۶ ص

دہ کچھ جانتا ہوگا زلفوں میں پھنسا — جو کوئی اسیر تہ دام ہو گا[2]

غزل ۲۷، شعر ۹، ۱۴۹۱ ص

خورشید رد کا پر تو آنکھوں میں روز ہے گا — یعنی کہ شرق رویہ دالان ہے ہمارا[3]
نالے میں اپنے ہر شب آتے ہیں ہم بھی پنہاں — غافل تری گلی میں مذکور ہے ہمارا
جی جا مرہ آہ ظالم تیرا ہی تو ہے سب کچھ — کس مونہہ سے پھر کہیں جی قربان ہے ہمارا

غزل ۳۱ شعر ۷، ۸ ص

اس برہمن پسر کے قشقہ پہ مرتے ہیں ہم — ٹک دے گا رو تو گویا جی ہم کو دان دے گا[4]
ہو جو نشانہ اس کا اے بوالہوس سمجھ کر — تیروں کے مارے سارے سینے کو چھان دیگا

غزل ۳۲ شعر ۵، ۶ ص

کوری چشم کیوں نہ زیارت کو اس کی آئے
یوسف سا جس کو مد نظر نور دیدہ تھا[5]

افسوس مرگ صبر ہے اس واسطے کہ وہ
گلہائے باغ عشرت دنیا نچیدہ تھا

غزل ۳۳ شعر ۴ ص

شکر زاہد کا اپنی آنکھوں میں — ہے عوض خرقہ مرتہن دیکھا[6]

غزل ۳۶ شعر ۱ ص

ہیں دشت اب یہ جیسے بستی تھی شہر سارے
ویرانۂ کہن ہے معمورہ اس جہاں کا[7]

غزل ۴۲ شعر ۴، ۵ ص

رونا ہی آتا ہے ہم کو دل ہوا جب سے جدا
جائے رونے ہی کی ہے جاوے جب ایسا آشنا[8]

ناسمجھ ہے تو جو میری قدر نہیں کرتا کہ شوخ
کم بہت ملتا ہے پھر دل خواہ اتنا آشنا

غزل ۴۴ شعر ۷ ص

خراش سینۂ عاشق کبھی جی کو لگ جاے — عجب طرح کا ہو فرقا یہ دل فگاروں کو[9]

غزل ۴۵ شعر ۹ ص

ہر لخت دل میں صید کی پیکان بھی گئی — دیکھا میں شوخ ٹھاٹھ تری صید گاہ کا[10]

غزل ۵۰ شعر ۶ ص

وہ تو ہماری خاک پہ آ نہ پھر ابھی غرض
ان نے جفا نہ ترک کی اپنی سی ہم نے کی وفا[11]

غزل ۵۲ شعر ۴ ص

شب زخم سینہ او پر چھڑکا تھا میں نمک کو
ناسور تو کہاں تھا ظالم بڑا مزا تھا[12]

غزل ۶۰ شعر ۳، ۴ ص

ہوتا رتار سیتے ہی سیتے جو اڑ گیا — اب تک عبث میں اپنا گریباں سیا کیا[13]
سن سن کے تری بات تو کیا کیا نہ کہہ سنا — کیا کیا کہوں میں تجھ سے کہ کیا کچھ کیا کیا

غزل ۶۲، شعر ۵، ۶

یوں خاک میں ملایا اس بن کہ کچھ نہ پوچھو
اس ظلم دیدہ دل کا ہم اضطراب دیکھا[14]

واعظ زبوں مت کہہ مے خانہ کو کہ اس جا
پیراہن نیکویاں رہن شراب دیکھا

غزل ۶۵، شعر ۴ ص

تو نے تلوار کبھی سر رکھا میں بندہ ہوں — اپنی تسلیم کا بھی اور تری جلادی کا[15]

غزل ۶۷ شعر ۵ ص

دختر رز سے کیا تھا میرے تئیں — شیخ کی ضد پہ میں حرام کیا[16]

غزل ۶۸ شعر ۵

---

۱ نسخۂ کلکتہ ص۵۲ ، ۲ نسخۂ کلکتہ ص۵۴ ، ۳ نسخۂ کلکتہ ص۶۲ ، ۴ نسخۂ کلکتہ ص۶۰ ، ۵ نسخۂ کلکتہ ص۶۷ ، ۶ نسخۂ کلکتہ ص۶۶ ، ۷ نسخۂ کلکتہ ص۲۹
۸ نسخۂ کلکتہ ص۳۲ ، ۹ نسخۂ کلیات ص۳۶ ، ۱۰ نسخۂ کلکتہ ص۳۴ ، ۱۱ نسخۂ کلکتہ ص۶۵ ، ۱۲ نسخۂ کلکتہ ص۶۲ ، ۱۳ نسخۂ کلکتہ دیوان دوم ، ۱۴ نسخۂ کلکتہ ص۲۳ ،
۱۵ نسخۂ کلکتہ ص۴۳ ، ۱۶ نسخۂ کلکتہ ص۵۱ ،

دیوان میر نسخۂ محمود آباد مکتوبہ ۱۲۰۳ ہجری مطابق ۱۷۸۸ء بخط موتی لال حیف شاگرد میر سوز کی یہ دو غزلیں

میں نے تلوار سے ہرن مارے
عشق کر تیری چشم و ابرو کا[1]

غزل ۱، شعر ۳ سے
کاکل میں نہیں ہے خط میں نہیں زلف میں نہیں
روز سیہ کے ساتھ مرا دل کدھر گیا[2]

غزل ۲، شعر ۴ سے
گئی ہوتی سر آبلوں کی پر ہوئی خیر
بڑا قضیہ خاروں سے برپا ہوا تھا[3]

غزل ۷، شعر ۳ سے
نگہ تمام تو اس کی خدا نہ دکھلاوے
کرے ہے قتل اثر جس کی کم نگاہی کا[4]

غزل ۸۲ شعر ۸
تجھ سے کیا کیا توقعیں تھیں ہمیں
سو ترے ظلم نے نراس کیا[5]

کیا ڈھٹا ہے جن نے خانہ بنا
زیر افلاک سست اساس کیا

غزل ۸۴ شعر ۵ سے
اس فصل میں کہ گل کا گریباں بھی ہے ہوا
دیوانہ ہو گیا سو بہت ذی شعور تھا[6]

غزل ۸۸ سے
جو اے قاصد وہ پوچھے میر بھی ادھر کو چلتا تھا
تو کہیو جب چلا ہوں میں تب اس کا جی نکلتا تھا
سماں افسوس و بے تابی سے تھا کل قتل کو میرے
تڑپتا تھا ادھر میں اور ادھر وہ ہاتھ ملتا تھا

★

۱؎ نسخۂ کلکتہ ص۳، ۲؎ نسخۂ کلکتہ ص۵، ۳؎ نسخۂ کلکتہ ص۶، ۴؎ نسخۂ کلکتہ ص۱۵ دیوان پنجم ۵؎ نسخۂ کلکتہ ص۳۲ ۶؎ نسخۂ کلکتہ ص۱۹

سخاوت شمیم

وفا کی راہ

پیا جو جامِ شہادت تو زندگی پائی
بڑھے جو دار پہ اعزاز کا پیام آیا
بہت کٹھن تھا سفر کا ہر اک قدم لیکن
وفا کی راہ سے گزرے تو یہ مقام آیا

جلے جو شمع کی مانند ملک کی خاطر
اندھیرا دور ہوا، روشنی نظر آئی
کئی برس کی غلامی کا طوق اُترا تو
فسردہ چہروں پہ کچھ زندگی نظر آئی

ہمیں نصیب ہے جو کچھ بہارِ آزادی
ہزار خونِ شہیداں کی اک فضیلت ہے
جو سرخرو ہیں زمانے میں آج بھی ہم لوگ
وطن پرست مجاہدوں کی بدولت ہے

رکھو وہ جوشِ محبت کہ آج جس کے بغیر
یہ سرفروشی کی کچھ رسم ہی نہیں ہوتی
ہزار منزلیں آئیں، بڑھے چلو آگے
وفا کی راہ کبھی ختم ہی نہیں ہوتی

مہدی پرتاپگڑھی

رباعیات

اک دورِ مسرت کا ہوا ہے آغاز
تعمیر و ترقی کا ہوا ہے در باز
پھر تاج، فن و فکر کے ہوں گے تیار
پھر حکمتِ آدم ہے یہاں سرافراز

ہر ذہن میں ہے حُسنِ فراست کا ظہور
ہیں حکمتِ تعمیر سے بیدار شعور
ہے عطر فشاں کوہ و دمن اے مہدی
مہکا ہے اس انداز سے باغِ جمہور

نکھرا ہے مرے دیش کا گوشہ گوشہ
حد درجہ شگفتہ ملا بوٹا بوٹا
عالم یہ ہے جمہور کی بیداری کا
جاگا مرے گلزار کا پتہ پتہ

کھُل گئے بابِ علم و حکمت دیکھو
انساں کا عزم، اس کی ہمت دیکھو
لائے گا رنگ جمالِ تیشہ اپنا
کیا روپ دکھائے، بشر کی محنت دیکھو

ملاوٹ کی مصیبت

سرور جمال

کوئی ایک سال پہلے کی بات ہے کہ ایک صبح ہمارے محلے کے سیٹھ لالہ چھنّی مل ملاوٹ کے جرم میں گرفتار کر لیے گئے۔ اور جب وہ ضمانت پر رہا ہو کر گھر پہنچے تو وہاں بیٹنس مچی ہوئی تھی کیونکہ ان کا اکلوتا لڑکا انھیں کی فرم کی دوا کھا کر خدا کو پیارا ہو چکا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن لالہ جی کچہری عدالت کے چکّر لگاتے لگاتے جان سے عاجز ہیں اور ماں بیٹے کے غم میں روتے روتے اندھی ہوئی جا رہی ہے۔ اس طرح لاکھ کا گھر خاک ہوتا نظر آ رہا ہے۔ لیکن صاحب یہ نہ سمجھ لیجے کہ یہ لاکھ کا گھر خاک ہی سے بنا تھا۔ یعنی کہ اصلی خاک سے۔ لالہ چھنّی مل جنھیں پہلے سب لوگ 'چھنو' اور 'چھنوا' کہہ کر پکارتے تھے پسا ہوا مصالحہ پڑیوں میں بیچا کرتے تھے۔ لیکن رنگین خاک اور کھریا کی بدولت اس درجہ کو پہنچ گئے یہ 'چھنو' سے 'چھنّی مل' کیسے بنے اس کی کہانی بڑی لمبی ہے۔ آپ کے لیے بس اتنا جاننا کافی ہے کہ ان کی ٹوٹی پھوٹی کوٹھری اب سربلند کوٹھی میں اور چھنو نہ صرف چھنّی، بلکہ سیٹھ چھنّی مل میں بدل چکے ہیں۔

دواؤں کے ساتھ زہر کے قصے بھی کچھ کم عجیب و غریب نہیں ہوتے۔ ایک بے چارا عاشق بے صادق اپنی محبوبہ کی منگنی کی خبر سن کر روایتی عاشقوں کی طرح جان دینے کو تیار ہو گیا۔ بازار سے زہر کی پڑیا لایا اور کھا کر سو رہا۔ رات بھر موت کے انتظار میں کروٹیں بدلتا رہا، لیکن موت کا فرشتہ بھی محبوب کی طرح بے وفا نکلا۔ صبح ناامیدی کے عالم میں اٹھا اور تیار ہو کر محبوبہ کے یہاں اپنی زندگی کا مژدہ سنانے جا پہنچا۔ راستہ بھر اسے یہی غم ستاتا رہا کہ محبوبہ نے رو رو کر آنکھیں پھوڑ لی ہوں گی اور ظالم سماج اسے زندہ درگور کرنے کے درپے ہو گا۔ لیکن جب اس کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ جو محبوبہ کل ہاتھ جوڑ جوڑ کر اس کو خودکشی سے باز آنے کی التجا کر رہی تھی اور خود بھی جل جانے اور مر جانے کی دھمکی دے رہی تھی آج اپنے منگیتر کے گلے میں بانہیں ڈالے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے۔ اب اس عشق کو بھی کیا کہیے کہ آج کی دنیا میں عشق میں بھی ملاوٹ ہے۔ کبھی مرزا غالبؔ کو اپنی دعاؤں کی تاثیر میں شک ہوا کرتا تھا لہذا اچھا کہہ گئے ہیں۔ ع

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
شاید کہ دشمنی ہو دعا کو اثر کے ساتھ

تو دوا کے سلسلے میں آپ بھی اس فارمولے کو آزمایئے۔ اگر دوا کا صحیح اثر دیکھنا چاہتے ہیں تو الٹی دوا کیجیے یعنی کہ اگر آپ موت کے طلبگار ہیں تو دوا پیجیے اور اگر واقعی جینا چاہتے ہیں تو زہر کھایئے۔

دوا کسی فرم کی ہو، ساری کی ساری ہمیں موت کی طرف کھینچے لیے جا رہی ہیں۔ روزانہ کا تجربہ ہے کہ مکسچر کی جگہ رنگین پانی اور انجکشن کی جگہ ڈسٹلڈ واٹر ملتا ہے۔ فرموں کی نقلی دوائیں جان لیوا ثابت ہوتی ہیں۔ زہر تو سبھی ہیں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی دوا SLOW POISON کا کام کرتی ہے تو کوئی سمِ قاتل کا۔

کسی کا قول ہے کہ ہنسو اور موٹے ہو جاؤ۔ تو جناب موٹا

نے کے لیے اب ہمارے پاس رہ ہی کیا گیا ہے۔ آج کی ملاوٹ
بھرپور غذا انہیں کہاں تک طاقت پہنچا سکتی ہے۔ اب تو
کے لیے اور موٹا ہونے کے لیے واقعی ہنسی ہی کی ضرورت
لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ آج ہم خالص ہنسی سے بھی محروم
۔ ایسی ہنسی جس میں تصنع نہ ملا ہو۔ ایسے قہقہے جو کھوکھلے نہ ہوں۔
ہنسی ہی کو کیا کہیے اب تو ہر جگہ ملاوٹ ہی ملاوٹ نظر آتی ہے
ں کو دیکھیے تو ان پر لڑکیوں کا دھوکا ہوتا ہے۔ لڑکیاں لڑکا بنی
تی پھرتی نظر آرہی ہیں۔ اگر کسی لمبے بالوں والی ایسی لڑکی پر جو
ے مٹک کر چل رہی ہو، پیچھے سے آپ کی نظر پڑ جائے تو اس
بال اور اس کی چال سے دھوکا نہ کھایئے بلکہ یقین جانیے
ہ لڑکا ہو گا۔ بات بس اتنی ہے کہ اس کی مونچھ داڑھی
ں زلفوں کی ملاوٹ ہو گئی ہے۔

اب تو ملاوٹ کا زمانہ ایسا آگیا ہے کہ اصل اور نقل میں کوئی
رہی نہیں رہ گئی بلکہ نقل اصل سے بڑھ گئی ہے۔ اب امتحانات
کو لے لیجیے۔ جو لڑکا اپنی عقل و ذہانت سے پرچے حل کرتا ہے
سے کوئی پوزیشن نہیں ملتی اور گیس پیپر اور کنجی رٹ کر امتحان
ینے والے یا امتحان میں نقل کرنے والے کو فرسٹ کلاس
ں جاتا ہے۔ لیکن طلبا بے چارے بھی کیا کریں جبکہ ماسٹر صاحبان
ں بناسپتی ہو گئے ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ لیاقت
ں اب کوئی چیز نہیں رہ گئی۔ اب تو ملازمت کے لیے بھی یہی دیکھا
اتا ہے کہ امیدوار کے پاس اصل کے ساتھ 'ملاوٹ' کتنی بگڑی
ہے۔ اس اصل کو بھی تو اصل نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن سند تو
ر بھی سند ہے۔ ہاں وہ سند بھی اس وقت تک ایک بے کار
غذ کی طرح ہے جب تک کہ اس کے ساتھ ایک بڑی سفارش
میل نہ ہو۔ اور وہ میل بھی کوئی پوّے چھٹنکی کا نہ ہو بلکہ کم سے کم
ننٹل کا تو ہو ہی۔

یہ ملاوٹ کی مصیبت تو ہمارے پیچھے اس طرح پنجے جھاڑ کر
ی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں جا کر دم لے گی۔ ابھی گذشتہ ہفتے
ذکر ہے کہ میری ایک سہیلی اپنے بڑھتے ہوئے موٹاپے سے گھبرا کر

ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچیں تاکہ اس سے ڈائٹنگ اور SLIMMING
کے بارے میں کچھ مشورے لیں۔ ڈاکٹر نے تمام طبی جانچوں کے
بعد کہا:

"محترمہ آپ کو ڈائٹنگ کی تو بے شک ضرورت ہے۔ لیکن
خوراک کم کرنے کی نہیں بلکہ طاقت بخش غذاؤں کی ہے"۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب میں تو تمام مقوی چیزیں کھاتی ہوں مثلاً
دودھ۔ انڈا۔ مکھن۔ گھی۔ پنیر وغیرہ وغیرہ"۔

ڈاکٹر صاحب نے پوچھا:

"کیا آپ کے یہاں گائے، بھینس یا کم سے کم بکری ہی
پلی ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب میں بہت بڑی عمارت کی پانچویں منزل کے
ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتی ہوں۔ اس ڈربے میں
انسان تما جانور ہی اس کثرت سے پلے ہیں کہ گائے بھینس
تو کیا مچھر تک پالنے کی گنجائش نہیں"۔

ڈاکٹر صاحب اس پر زور سے ہنس پڑے۔

"محترمہ! وہ چیز جسے آپ دودھ کے نام سے یاد کرتی ہیں
وہ محض پانی ہے جس میں سنگھاڑے کے آٹے اور ارارو ٹ
کے ساتھ دودھ کا ایسنس ملا دیا جاتا ہے۔ مکھن، گھی اور
پنیر، چربی اور بناسپتی سے بنائے جاتے ہیں۔ اور کیا
کہتے ہیں جناب یہ بالائی جو آپ کھاتی ہیں وہ بلاٹنگ پیپر
اور اسی طرح کی الا بلا سے بنی ہوئی ایک شے کثیف ہے۔
اور انڈے جنھیں آپ مرغی کے انڈے سمجھتی ہیں ان میں
کچھوے کے انڈے کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ کیا
کہتے ہیں جناب! یہ کھانا جو آپ کھاتی ہیں ان سب میں ایسی
ملاوٹ ہے کہ آپ کا ہر لقمہ موت کی طرف بڑھتا ہوا ایک
قدم ہے۔ کیا انھیں چیزوں کا نام غذا اور غذائیت ہے؟
اور سب سے دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اس کو کیا کہتے ہیں
جناب کہ! یہ آپ کا موٹاپا جو ہے نا، وہ بھی اصلی نہیں۔ آپ کے
جسم میں خون میں پانی اور بادی کی ملاوٹ زیادہ ہو گئی ہے

لہٰذا آپ کا جسم پھول گیا ہے۔"

یہ سب سن کر میری سہیلی کا چہرہ اتر گیا اور بولیں:

"تو پھر اس کا علاج؟"

"اس کو کیا کہتے ہیں جناب کہ سر دست اس کا علاج تو یہی ہے کہ اگر آپ واقعی اصلی چیزیں کھانا چاہتی ہیں تو گائے پالیے، بھینس پالیے، مرغی پالیے۔"

"تو کیا ہم تیل اور گھی کی ملیں بھی اپنے یہاں کھول لیں۔ آٹا چکی بھی لگا لیں؟" میری سہیلی جل کر بولیں۔

"ہاں! ہاں! اس کو کیا کہتے ہیں جناب! اگر ایسا ہو جائے تو کیا کہنا۔"

ڈاکٹر ان کے غصّہ کی پروا کیے بغیر بولا۔

میری سہیلی جلتی بھنتی اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ لے میرے گھر پہنچیں۔ ابھی میں اُن کے دُکھڑے سُن ہی رہی تھی کہ خالہ قیامت اُٹھائے گھر میں داخل ہوئیں:

"ارے بوی! خدا ان دودھ والوں کو غارت کرے۔ دن دہاڑے لوٹ رہے ہیں اور سر بازار آنکھوں میں دُھول جھونک رہے ہیں۔ اب بتاؤ کوئی کیسے زندہ رہے۔ ہر چیز میں ملاوٹ ہے۔ اب مصالحوں کو دیکھو لو کالی مرچ کی جگہ پرے پپیتے کے بیج، پسے ہوئے مصالحہ میں خاک ہی خاک اور چائے میں رنگا ہوا برادہ۔ غضب ہے کہ دار چینی، زیرہ اور لونگ تیز پات تک میں نمبر ایک اور دو چل گیا ہے، اور وہ موئے ایک نمبر ہی میں کون سی خوشبو رہ گئی ہے۔ ہائے ہائے یہ دار چینی، کیوڑے اور زعفران کی خوشبو کہاں اڑ گئی۔ اب تو انسان اصلی خوشبو کو بھی ترس گیا۔ بڑی بڑی دعوتیں پارٹیاں ہوتی ہیں لیکن قسم لے لو جو کہیں سے خوشبو کی ایک ہلکی سی لہر بھی پہنچی ہو۔ ایک ہمارا بھی زمانہ تھا کہیں بھی کوئی تقریب ہو لوگ باگ خوشبو پاکر چیونٹیوں کی طرح جمع ہو جاتے تھے۔ اب تو پڑوس میں شادی بیاہ ہو تب بھی کوئی خبر نہیں ہو پاتی۔ کیا کوئی کہیں جائے اور کیا کھائے۔"

ان دونوں کو سمجھا بجھا کر ان کے گھروں کو روانہ کیا۔ لیکن میں بھی سوچتی رہی کہ واقعی ہم کدھر جا رہے ہیں اور کیا کھا رہے ہیں۔

اس ملاوٹ بھری دنیا سے لوگ اس طرح عاجز آ گئے ہیں کہ سزا و جزا کی باتیں سوچنے لگے ہیں۔ ایک محفل میں ملاوٹ دور کرنے اور ملاوٹ کرنے والوں کو سخت ترین سزائیں دینے کے بارے میں بڑی بحث چل نکلی۔ کسی نے کہا ملاوٹ کرنے والوں کو اُلٹا لٹکا دیا جائے، کسی نے کہا ہاتھ پیر کاٹ کر چھوڑ دیا جائے۔ کوئی بولا منہ میں کالک پوت کر بازار میں گھمائیں۔ اس پر میری ایک سہیلی بولیں:

"واقعی حد ہو گئی ہے۔ ابھی میں بازار سے بناسپتی کا مہر بند ڈبہ لائی کھول کر جو دیکھا تو اس میں نرا تیل ہی تیل بھرا ہے۔ اور وہ موا تیل بھی ایسا گھٹیا کہ اس میں پکائی ہوئی چیز زبان پہ نہ رکھی جائے۔ واقعی ان ملاوٹ کرنے والوں کو اچھی طرح ذلیل کرنا چاہیے۔"

ایک صاحب بولے: "یہ خوب! کیا خوب آئیڈیا ہے۔ گویا آپ کے نزدیک وہ ذلیل نہیں۔ ارے جو ایسا کام کرتا ہے اور جسے کسی کے مرنے جینے تک کی پروا نہ ہو وہ ذلیل نہیں تو اور کیا ہے۔ بلکہ ذلیل ترین ہے۔ پھر اس سلسلے کی آئے دن کی گرفتاریاں، پٹائی اور لوٹ مار کی وارداتیں انھیں بڑی عزت بخشتی ہیں نا!"

"تو پھر کیا کریں انھیں کوئی سخت سزا دینی چاہیے۔"

"اب اس سے بڑھ کر سخت سزا اور کیا ہوگی کہ اپنے ہی یہاں کی دوا کھا کر کسی کی بیٹی موت کے گھاٹ اتر گئی تو کسی کا بیٹا۔ کیا آپ نے یہ نہیں سنا کہ بنیا اپنے یہاں کا آٹا، تیل اور گھی وغیرہ اپنے یہاں استعمال نہیں کرتا۔ لیکن بنیے کی عقل ہی کتنی وہ احمق یہ بھول جاتا ہے کہ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔"

اس پر ایک دوسرے صاحب بولے:

"یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم بھول جاتے ہیں کہ ہمارا ایک فائدہ ہماری پوری قوم کا ہی نقصان نہیں بلکہ ہمارے اپنے دس نقصانوں کا باعث بنتا ہے۔ ایک چیز میں ملاوٹ کر کے بنیا، دوکاندار یا سیٹھ اپنے پیسے تو کھرے کر لیتا ہے۔ لیکن دس دوسری چیزیں خریدتے وقت اپنے پیسے کھوٹے بھی

کرآتا ہے۔"

"لیکن یہ مہر بند ڈبوں میں ملاوٹ کیسے ہوتی ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"واہ! یہ ترکیب آپ کو نہیں معلوم۔ وہ ایک طرح کی سرنج ہوتی ہے جس کے ذریعہ ڈبہ سے اصل مال نکال لیتے ہیں اور نقلی مال کا انجکشن لگا دیتے ہیں۔ اکثر تو ایسا دیکھا گیا ہے کہ تیل بھی نہیں بلکہ پانی بھرا ہوا ہے۔ یعنی کہ سیٹھ نے تو نوکر سے ناسپتی کی جگہ تیل بھرنے کو کہا اور اس نے ملاوٹ میں ملاوٹ کر دی یعنی کہ تیل نہیں پانی بھر دیا۔"

"اُف! اُف! یہ ملاوٹ ہی کی نہیں بلکہ گراوٹ کی بھی انتہا ہے۔ ایسے لوگوں کے تو سر قلم کر دینا چاہیے یا کالے پانی بھیج دینا چاہیے۔"

"بھئی میرا تو خیال ہے کہ ان کا سوشل بائیکاٹ کرنا چاہیے۔"

"ارسطو نے کہا ہے 'انسان سماج میں رہنے والا جانور ہے'۔ تو بس اس جانور کو سدھارنے کے لیے ہمیں ان کا مکمل بائیکاٹ کرنا چاہیے ان سے ملنا، جلنا، شادی، غمی کی تقریبات میں شرکت کرنا وغیرہ قطعی بند ہونا چاہیے۔ یہ سزا ایک انسان کے لیے کالے پانی سے کسی طرح کم نہیں۔" میں نے کہا اس پر ایک صاحب محفل برخواست کرتے ہوئے بولے:

"ٹھیک ہے! ٹھیک ہے! لیکن اس کی شروعات کالے پانی ہی سے ہونی چاہیے۔"

★

بنّے بھائی — (صفحہ ۱۹ کا بقیہ)

لینن پر ایک الھا بھی لکھا تھا۔ اور جب وہ خود اس کو جون پور کے دھوبیوں کی زبان میں سناتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دیہاتی اپنی زبان میں عوام کو انقلاب کا پیام دے رہا ہے۔ چنانچہ ہندستانی عوام کے تعلق سے اپنے غیر متزلزل عقیدے کے بارے میں ایک جگہ رقمطراز ہیں:۔

"جب میں اپنی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ اس جہد اکبر میں سب سے زیادہ جس چیز نے میری مدد کی وہ ہندستان عوام ہیں۔ یعنی مزدوروں، کسانوں، اور دانشوروں کی وہ جدوجہد ہے جو انھوں نے اپنی زندگی کو آزاد، خوشحال اور مہذب بنانے کے لیے جاری رکھی ہے اور جس کا ایک ناچیز حصہ بننے کا مجھے شرف حاصل ہوا ہے۔ اس جدوجہد کی بہترین تنظیم اور رہنمائی میری نظر میں یہاں کی کمیونسٹ پارٹی نے کی ہے۔ اس لیے کہ میرے نزدیک موجودہ دور میں سب سے زیادہ باشعور جماعت یہی ہے۔ میرے نزدیک وہ ہماری قوم کی اعلیٰ ترین تہذیبی روایتوں کی نمائندگی کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ جس مارکسی نظریے پر اس کے عمل کی بنیاد ہے، سماج کو سمجھنے اور بدلنے اور اس کی نئی اور بہتر، زیادہ منصفانہ اور زیادہ لطیف اور بارآور ترتیب و تنظیم کرنے کے لیے اس نظریہ سے زیادہ سائنٹفک نظریہ نوع انسانی کے پاس اس عہد میں اور کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نظریے کو محض کتابوں کو پڑھ کر یا کسی الہامی ذریعہ سے سکھایا، یا سمجھایا نہیں جا سکتا۔ مارکسزم درحقیقت فطرت اور سماج میں حرکت اور تبدیلی، زوال اور ارتقاء کے قوانین کو سمجھنے اور اس علم کے ذریعے اور وسیلے سے اپنے فہم و ادراک کو جلا دیکر ایسے عمل کا نام ہے جس کا تقاضا سماجی زندگی کی ہیئت ایک خاص موقع پر کرتی ہے۔"

آخر میں چکبست کے اس شعر پر بنّے بھائی کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ شعر مرحوم پر صادق آتا ہے:۔

درد دل، پاس وفا، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

★

ہمارا دیس

(ترائیلے)

فرحت کیفی

اے بلادِ بے نظیر، اے کشورِ ہندوستاں
تیرے دامن میں بہادر بھی پلے ہیں لعل بھی

امن عالم کے محافظ، مرکزِ دانشوراں
اے بلادِ بے نظیر، اے کشورِ ہندوستاں

لب پہ گنگا کے ہے جاری "جے جوان اور جے کسان"
قومی یک جہتی علامت ہے نئی تعمیر کی

اے بلادِ بے نظیر، اے کشورِ ہندوستاں
تیرے دامن میں بہادر بھی پلے ہیں لعل بھی

غزل

جعفر عسکری

خوں چکاں راہ میں جو نقش و نگار آئے ہیں
ورقِ ذہن پہ ہم سب کو اتار آئے ہیں

اپنا سایہ بھی سرِ شام گریزاں ہو جہاں
وادیٔ شوق میں ایسے بھی دیار آئے ہیں

زخمِ ادراک سے ٹپکے ہیں لہو کے الفاظ
شاخِ احساس میں جب فکر کے خار آئے ہیں

آبلہ ہائے تمنا کو بچانے کے لیے
راہِ پر خار سے ہم کرتے فرار آئے ہیں

پا بہ زنجیر ہوئے دشتِ جنوں کے راہی!
رہ گزاروں پہ نئے شاہسوار آئے ہیں

وہ جو پیتے ہیں شب و روز مسرت کا لہو
سوئے میخانہ وہی بادہ گسار آئے ہیں

نکہت و نور کا گلزار کہاں ہے جعفرؔ!
ہم کہ ظلمات کا طے کر کے حصار آئے ہیں

ریشمی رومال سازش

کرانتی کمار

جدو جہد آزادی کے سلسلے میں دارالعلوم دیوبند (ضلع سہارن پور) مسلم حریت پسندوں کا خاص مرکز رہا ہے۔ اس حیثیت سے اس کی تاریخ بہت پرانی اور بے حد شاندار ہے۔ اس دار العلوم کے ناظم اعلیٰ مولانا محمود الحسن اور اُن کے شاگرد عبید اللہ سندھی نے ملک سے انگریزی تسلط کی بیخ کنی کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا تھا جو ''ریشمی رومال سازش'' کے نام سے مشہور ہوا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران کابل میں آزاد ہندستان کی سب سے پہلی عارضی حکومت قائم کی گئی جس کے صدر راجہ مہیندر پرتاپ تھے۔ اس کے بانی بھی مولانا محمود الحسن ہی تھے۔ اس جماعت کے آخری نمائندے مولانا حسین احمد مدنی تھے جو آگے چل کر کانگریس تحریکوں کے ایک خاص کارکن اور سرگرم ممبر رہے۔

ریشمی رومال سازش

ہندستان کی غلامی کی بنیاد ۲۲ جون ۱۷۵۷ء کی شام کو پلاسی کے میدان میں مستحکم ضرور ہوگئی لیکن انگریزوں کا تسلط قائم ہو جانے کے بعد بھی ملک میں آزادی کی جدو جہد کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں جاری رہا۔ ۱۷۷۶-۸۰ء کی سنیاسیوں کی بغاوت، ۱۸۳۰-۳۱ء کی بال کوٹ کی جنگ اور ۱۸۵۷ء کی آزادی کی پہلی باقاعدہ لڑائی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد پورے ملک میں کچھ عرصے کے لیے سناٹا ضرور چھا گیا لیکن آزادی کا جذبہ ختم نہیں ہوا۔ چنانچہ ایک طرف آئینی طریقوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے ۱۸۸۵ء میں کانگریس کا قیام عمل میں آیا اور دوسری طرف ملک میں انقلابیوں کی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء کی پہلی عالمی جنگ کے قبل ہندستان کی آزادی کے لیے جو تحریکیں چلیں ان میں ''ریشمی رومال کی سازش'' یا ''ریشمی خطوط کی سازش'' ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ سازش ناکامیاب بھی رہی اور اس کا دائرہ عمل بہت محدود بھی تھا اس لیے اسے اتنی شہرت حاصل نہ ہو سکی جتنی آزادی کی دوسری تحریکوں کو حاصل ہوئی۔ بہر حال ملک کو آزاد کرانے کا یہ منصوبہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن اور ان کے معتمد شاگرد مولانا حسین احمد مدنی اور عبید اللہ سندھی نے بنایا تھا۔

ریشمی خطوط کی سازش یہ تھی کہ ترکی کی فوجیں افغانستان کے راستے ہندستان پر حملہ کر دیں گی اس کے ساتھ ہی یہاں کے مسلمان پورے ملک میں بغاوت کر دیں۔ ترکی فوج ملک کے حریت پسندوں کی مدد سے ہندستان کو آزاد کرنے کے بعد واپس لوٹ جائے گی اور ترکی کو اس مدد کے صلہ میں آزاد ہندستان ہمیشہ مالی امداد دیتا رہے گا۔ عبید اللہ سندھی کا منصوبہ یہ تھا کہ ملک میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا پرچار کیا جائے اور اس طرح ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس سے انگریزوں کے خلاف بغاوت کامیاب ہو سکے۔

اس انقلابی منصوبے کے تیار کرنے والے مسلم علماء کو یقین تھا کہ ریشمی رومالی سازش یقیناً کامیاب ہوگی اور ترکی سے مدد بھی ضرور ملے گی۔ ترکی برطانیہ سے ہار چکا تھا اور برطانیہ کے خلاف اس میں بغض و عناد پایا جاتا تھا۔ ۱۸۲۹ء میں ترکی بغاوت میں انگریزوں

نے باغیوں کی مدد کی تھی۔ اس مدد کے عوض میں انگریزوں نے عدن پر قبضہ کر لیا اور اس مدد کا سارا خرچ جو تقریباً بیس لاکھ پونڈ تھا ہندستان کے سر ڈال دیا۔ ۱۸۷۸ء میں انگریزوں نے جزیرۂ قبرص پر قبضہ کر لیا۔ اسی سال انگریزوں نے برلن میں ایک کانفرنس کی اور یورپ کے ملکوں نے ترکی سلطنت کا کافی حصہ آپس میں تقسیم کر لیا۔ ۱۹۰۸ء میں ترکی میں فوجی انقلاب ہوا۔ یہ انقلاب فوجیوں کے ایک ادارے اتحاد المسلمین نے کیا تھا۔ اس کے قائد غازی انور پاشا تھے جو بعد میں ترکی کے صدر ہوے۔ ۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان میں ہندستان کے دہشت پسندوں اور حریت پسندوں نے ترکی کی جو اخلاقی اور مالی امداد کی تھی اُسے انور پاشا بھولے نہیں تھے۔ اس لیے ریشمی رومال کی سازش میں ترکی کے لیڈر کی جانب سے مدد ملنا یقینی تھا۔

سازش کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دس ٹھوس پروگرام تھے۔ یہ پروگرام ۱۹۰۵ء میں تیار کیے گئے تھے۔ اس سازش کا ہیڈ کوارٹر پہلے دیوبند تھا لیکن بعد میں دلی ہو گیا۔ یہ پروگرام کافی غور و فکر کے بعد تیار کیے گئے تھے اور تقریباً دس سال تک ان کو عملی جامہ پہنانے کی تیاری کی گئی تھی۔

یہ دس پروگرام حسب ذیل تھے۔

(۱) ہندو مسلم اتحاد (۲) پرانے خیالات کے عالموں اور نئی تعلیم یافتہ جماعت میں بیداری کو پیدا کرنا (۳) آزاد ملکوں سے اخلاقی مدد حاصل کرنا (۴) جنگ کے نقشے تیار کرنا (۵) انقلاب کے بعد کی عارضی حکومت کا خاکہ تیار کرنا (۶) بغاوت کے خفیہ مرکزوں کا قیام (۷) بیرونی ممالک میں امدادی مرکز قائم کرنا (۸) ترکی کی مدد کے لیے دوسرے ممالک سے رابطہ قائم کرنا (۹) بیرونی حملے کے لیے راستوں کا تعین کرنا اور (۱۰) بہ یک وقت اندرونی بغاوت اور بیرونی حملے کا تعین کرنا۔

اس پروگرام کی دو مدوں کے لیے فضا پہلے سے ہی ہموار تھی۔ ہندو مسلم حریت پسندوں میں ذہنی یک جہتی یعنی مل جل کر کام کرنے کا جذبہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورِ حکومت میں ہی پیدا ہو چکا تھا۔ اس کا مظاہرہ بار بار اور خاص طور سے ۱۸۵۷ء میں اور اس کے بعد بھی ہو چکا تھا۔ اس تحریک کے روحِ رواں مولانا محمود الحسن اور راجہ مہندر پرتاپ تھے۔

تیسرے پروگرام کے تحت فرانس، امریکہ، چین، جاپان اور برما میں کام شروع کیا گیا۔ اس کے لیے مشنری طریقۂ کار اختیار کیا گیا۔ پہلا مشن دیوبند سے مولانا مقبول الرحمٰن سرحدی اور مولانا شوکت علی کی رہنمائی میں چین بھیجا گیا۔ مشن میں چھ اور ممبر تھے جن میں دو ہندو تھے۔ اس مشن نے وہاں ایک مرکزی کمیٹی قائم کر کے اس کی شاخیں چین بھر میں قائم کیں۔ اردو اور چینی زبانوں میں ایک جریدہ الیقین جاری کیا گیا۔ ان سرگرمیوں میں مشن کو کافی کامیابی حاصل ہوئی۔ چینی مسلمانوں کی کثیر تعداد ہندستان کے حالات سے متاثر ہوئی اور انگریزی حکومت سے نجات دلانے کے لیے ہر ممکن اخلاقی مدد دینے کا وعدہ کیا۔

دوسرا مشن جاپان بھیجا گیا۔ اس مشن میں پانچ ممبر تھے اور اس کے لیڈر پروفیسر برکت اللہ تھے۔ انگریزی، ترکی اور جرمن زبانوں کے علاوہ انھیں جاپانی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ اس لیے ٹوکیو کے ایک کالج میں انھیں پروفیسری مل گئی تھی۔ اس مشن نے "اسلامک فریٹرنٹی" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور اس نام سے جاپانی اور انگریزی زبانوں میں جریدے نکالے۔ اس کے ایڈیٹر پروفیسر موصوف ہی تھے۔ ترکی کی طرح جاپان سے بھی پوری مدد ملنے کی توقع تھی کیونکہ جاپان بھی برطانیہ کے سخت خلاف تھا۔

چین میں جو مشن کام کر رہا تھا اُس نے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۹ء تک وہاں کام کیا۔ اس کے بعد اس مشن کے ممبروں کو برما جانے کا حکم ہوا۔ مشن کے تمام ممبران، چین میں جو کام ہو رہا تھا اس کی نگرانی کے لیے وہیں رہ گئے اور باقی ممبران برما چلے گئے۔ برما میں ظاہری طور پر ان لوگوں نے کپڑے کا روزگار شروع کیا جس میں کافی منافع ہوا۔ یہاں "انسانی برادری" کے نام سے ایک تنظیم کا قیام عمل میں آیا جس کی آڑ میں کام شروع کیا گیا۔

مولانا مقبول الرحمن نے عربی زبان میں ایک کتاب "الانسان" لکھی اور مولانا شوکت علی نے اس کا برمی اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ کیا۔ یہ مشن برما میں ۱۹۱۶ء تک بڑی مستعدی اور کامیابی کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اس تنظیم نے برما کے ہزاروں لوگوں میں ہندستان کے مسائل سے دلچسپی پیدا کرادی اور اس طرح برما میں ہندستانیوں کی اخلاقی مدد کے لیے ایک ماحول تیار ہوگیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ تحریک ۱۹۱۶ء میں ناکامیاب ہوگئی اور مولانا شوکت علی نیز تنظیم کے دونوں ہندو ممبر ہندستان واپس آگئے۔ مولانا مقبول الرحمن رنگون ہی میں رہ گئے۔ ہندستان کی فضا ناموافق دیکھ کر مولانا شوکت علی ہندستان سے فرار ہوکر برلن چلے گئے اور وہاں رہ کر ہندستان کی آزادی کے لیے کام کرنے لگے۔ مولانا مقبول الرحمن برما سے ۱۹۲۲ء میں وطن واپس آگئے۔

ادھر چودھری رحمت علی کی رہنمائی میں ایک مشن فرانس بھیجا گیا تھا۔ چودھری صاحب کے ہمراہ جو دو ممبر تھے ان میں ایک گرجو بیٹ رام چندر بہت ہی قابل اور بہت ہی مستعدی سے کام کرنے والے تھے۔ جاپان کے مشن کا کام چل نکلا اور اسے جب کامیابی ہونے لگی تو وہاں سے پروفیسر برکت اللہ کو چودھری رحمت علی کی مدد کے لیے ۱۹۱۰ء میں فرانس جانے کا حکم ملا۔ پروفیسر صاحب نے نوکری چھوڑ دی، اخبار بند کر دیا اور اپنے ایک ساتھی کو لے کر فرانس پہنچ گئے۔ فرانس میں پروفیسر برکت اللہ نے انگریزی میں "انقلاب" کے نام سے ایک اخبار نکالا۔ فرانس میں چھ سال تک کام ہوتا رہا۔ لیکن یہاں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ اس لیے چودھری رحمت علی اور پروفیسر برکت اللہ کو امریکہ جانے کا حکم دیا گیا۔

امریکہ میں لالہ ہردیال کی رہنمائی میں چھ افراد پر مشتمل ایک مشن کام کر رہا تھا۔ پروفیسر اور چودھری صاحبان کے شامل ہو جانے پر ان کی تعداد ۸ ہو گئی۔ یہاں سے غدر نامی نام کا رسالہ نکالا گیا جس کے ایڈیٹر پروفیسر صاحب تھے۔ چودھری صاحب نے وہاں ایک ہوٹل کھول لیا تھا۔ اس ہوٹل کے ایک کمرے میں پارٹی آفس اور دوسرے کمرے میں اخبار کا دفتر قائم کیا گیا۔ ہوٹل کی آمدنی سے وہاں کا پورا خرچ چلتا تھا۔ وہاں کا سب کاروبار لالہ ہردیال اور چودھری صاحب کی دیکھ بھال میں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ پارٹی والے رنگوں کی تجارت بھی کرتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ اس تجارت کی آڑ میں مشن کے لوگ ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھے۔ اس تجارت سے آمدنی بھی کافی ہوجاتی تھی جس سے خرچ بخوبی چلتا تھا۔ دلی کے چار مسلمان اور تین ہندو، بمبئی کے چار ہندو اور ایک مسلمان، کلکتہ کے چار ہندو اور ایک مسلمان، ڈھاکہ کے ایک ہندو اور دو مسلمان، لاہور کے دو مسلمان اور دو ہندو، پشاور کے دو مسلمان اور ایک ہندو اور کراچی کے ایک ہندو، ان لوگوں سے مال منگواتے تھے۔ اس تجارت کی آڑ میں ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ بھیجی جاتی تھی اور وہاں سے ہدایتیں حاصل کی جاتی تھیں۔ جب ہندستان سے تحریک کے ناکامیاب ہونے کی خبر ملی تو ہوٹل بیچ دیا گیا اور اخبار بھی بند کر دیا گیا۔ مشن کے ممبران امریکہ سے فرانس چلے گئے۔ وہاں سے وہ لوگ جنیوا اور برلن ہوتے ہوئے افغانستان پہنچے، پھر وطن واپس آگئے۔

اس سازش کا چوتھا پروگرام جنگ کے نقشے تیار کرنا تھا۔ اس پروگرام کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلا حصہ تھا بیرونی حملے کے لیے راستوں اور جنگ کے مقامات کی ٹھیک ٹھیک اور تفصیل کے ساتھ نشاندہی کرنا۔ حملہ آور فوجوں کے پیسے رسد پہنچانا، حریت پسند رضاکاروں سے رابطہ قائم کرنے کے لیے پیغام بھیجنے کا بندوبست کرنا اور حملہ آور فوج کے لیے سہولتیں مہیا کرنا۔ دوسرا حصہ سی آئی ڈی کے افراد کا تعاون حاصل کرنا اور اس محکمہ میں اپنے آدمیوں کو بھی داخل کرنا تاکہ حکومت کی پالیسیوں اور ارادوں کی خبر ملتی رہے۔ اس کا تیسرا جز فوج میں اپنے ہم خیال پیدا کرنا اور حریت پسند کارکنوں کو فوج میں بھرتی کرانا تھا تاکہ جب حملہ ہو تو دشمن کو نیست و نابود کیا جا سکے۔

پہلا کام مولانا عبید اللہ سندھی کو سونپا گیا اور بمبئی کے شیخ محمد ابراہیم کو ان کا مددگار بنایا گیا۔ مولانا نے شمالی مغربی سرحد

کے کئی دورے کیے۔ وہاں کے جغرافیائی حالات کا بغور مطالعہ کیا اور لگاتار سات برس تک کام کرنے کے بعد جنگ اور اس کے میدانوں اور راستوں کا ایک بڑا اہم نقشہ تیار کیا۔ اس نقشے سے بعد میں ترکی، جرمنی اور افغانستان کے فوجی افسروں نے بھی کافی فائدہ اٹھایا ہے۔ دوسرے حصّہ کے کام کو ڈاکٹر انصاری نے انجام دیا۔ انھوں نے بہت سے ہندو اور مسلمان نوجوانوں کو سی۔ آئی۔ ڈی۔ میں داخل کرادیا۔ یہ لوگ سرکار کے راز تحریک کے ممبران تک پہنچاتے رہے۔ تحریک کے ناکامیاب ہونے کے بعد متعدد نوجوان گرفتار کر لیے گئے اور ان میں سے کچھ کو پھانسی دے دی گئی۔ تیسرے حصّہ کے تحت کچھ خاص نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کرایا گیا۔ انھوں نے قوم پرست فوجیوں کو اپنا ہم خیال بنایا۔ ان میں سے کئی گرفتار کیے گئے۔ کچھ تحریک کی ناکامیابی کے بعد بھی فوج میں موجود رہے۔ یہی لوگ دوسری عالمی جنگ کے بعد آزاد ہند فوج کی شکل میں سامنے آئے۔

پانچویں پروگرام کے مطابق انقلاب کے بعد عارضی حکومت کا خاکہ تیار کرنا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ ایک ہندو اور ایک مسلمان کی ایک اعلیٰ اختیار کونسل ہوگی۔ اس کونسل کے تحت صدر اور صدر کے ماتحت کابینہ ہوگی جس میں ایک وزیر اعظم ہوگا۔ فوج میں ۱۲ جنرل ہوں گے۔ فوج کا کمانڈر انچیف (سپہ سالار علیٰ) اعلیٰ طاقتی کونسل کا ایک کوئی ممبر ہوگا۔ اس اعلیٰ اختیار کونسل کے مسلمان ممبر کے لیے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کا نام تجویز ہوا تھا اور ہندو ممبر تلاش کیا جا رہا تھا۔ صدر کے لیے راجہ مہیندر پرتاپ کا نام رکھا گیا تھا۔ وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کے لیے پروفیسر برکت اللہ اور مولانا عبید اللہ سندھی کے نام تجویز ہوئے تھے۔

چھٹا پروگرام بغاوت کے خفیہ مرکزوں کے قیام کا تھا۔ ہیڈکوارٹر دلی میں تھا۔ ہیڈکوارٹر کے ماتحت ۸ مرکز قائم کیے گئے۔ یہ مرکز لاہور، کراچی، پانی پت، راندیر (گجرات)، اختان ئی (سرحدی صوبہ)، دین پور (ریاست بہاول پور)، ترنگ زئی (آزاد قبائل) اور امروٹ (سندھ) میں قائم کیے گئے۔ ہر مرکز ایک ایک امیر کے ماتحت رکھا گیا۔ ان آٹھوں مرکزوں کے امیروں کے نام بالترتیب درج ذیل ہیں:

مولانا محمد احمد، مولانا محمد صادق، مولانا احمد اللہ، مولانا محمد ابراہیم، خان عبد الغفار خاں، مولانا غلام محمد، مولانا فضل محمد اور مولانا تاج محمد۔

ساتویں پروگرام کے مطابق بیرونی ممالک میں امدادی گروپوں کا قیام تھا۔ اس کا ہیڈکوارٹر کابل میں بنایا گیا۔ اس کے بانی راجہ مہیندر پرتاپ تھے۔ بعد میں مولانا سندھی بھی وہاں پہنچ گئے تھے اور پھر دونوں نے مل کر وہاں کام کیا۔ کابل کے ہیڈکوارٹر کے تحت مدینہ منورہ، برلن، استنبول اور انقرہ میں تنظیم کی شاخیں تھیں۔ برلن میں لالہ ہردیال نے کافی اہم کام انجام دیے۔ ان کی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ جرمنی اور ترکی میں معاہدہ ہوگیا اور جرمنی ہندستان کو آزاد کرانے کے لیے راضی ہوگیا۔ ہیڈکوارٹر کابل میں بھی کافی اہم کام ہوئے۔ یہ لوگ افغانستان کی سیاست پر اتنا چھا گئے کہ سازش کے ناکامیاب ہوجانے کے بعد بھی انقلابیوں کے دوستوں اور ہمدردوں نے افغانستان کے امیر حبیب اللہ اور ان کے تیسرے لڑکے عنایت اللہ کو قتل کروادیا اور امیر کے دوسرے لڑکے امان اللہ خاں کو گدّی پر بٹھادیا۔ حریت پسندوں کا خیال تھا کہ امیر حبیب اللہ اور ان کا سب سے چھوٹا لڑکا عنایت اللہ انگریزوں سے مل گئے تھے اور غدار ہوگئے تھے۔ امان اللہ خاں نے تخت پر بیٹھتے ہی تحریک کے نظر بند حامیوں کو رہا کر دیا اور انھیں اپنا صلاح کار بنالیا۔ اس تحریک کے لیڈروں ہی کی صلاح پر امیر امان اللہ خاں نے انگریزوں سے جنگ کی اور ۲۳ اگست ۱۹۱۹ء کو افغانستان کو مکمل طور پر آزاد کرالیا۔

آٹھویں پروگرام کے مطابق ترکی اور برطانیہ کی دشمنی کو مستحکم بنانا تھا تاکہ ترکی آسانی سے ہندستان پر حملہ کرنے کو تیار ہو جائے۔ اسی کے ساتھ روس، فرانس، امریکہ اور جرمن

کو ترکی کی حمایت کے لیے آمادہ کرنا تھا۔ غیر ممالک میں صرف جرمنی ہی میں تحریک کو کامیابی حاصل ہوئی۔ راجہ مہیندر پرتاپ وہاں تین سال تک رہے۔ انھوں نے لالہ ہردیال کی مدد سے ایسی فضا تیار کردی کہ جرمنی ترکی کی مدد کرنے اور ہندستان کو آزاد کرانے کے لیے تیار ہوگیا۔ جرمنی کے کیپٹن ہنٹس نے بھی اس کام میں بڑی مدد کی۔ وہ خود میدان جنگ کے معائنہ کے لیے کابل گئے۔

نویں پروگرام کے مطابق حملے کے لیے راستوں کا تعین کرنا تھا۔ ایران برطانیہ کی حمایت کر رہا تھا اور ترکی سے اس کی اَن بَن تھی۔ اس لیے ایران کا راستہ چھوڑنا پڑا۔ دوسرا راستہ افغانستان ہو کر ہی تھا۔ افغانستان کے امیر حبیب اللہ انگریزوں کے ہمدرد تھے لیکن اپنے بیٹے امان اللہ خاں، سول اور فوجی افسروں اور قبائل سرداروں کے ڈر سے افغانستان سے راستہ دینے کو تیار ہو گئے تھے لیکن اپنی انگریز دوستی کے پیش نظر انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ترکی کی فوج کچھ مخصوص درّوں سے ہو کر گزرے تاکہ انگریزوں سے یہ کہا جا سکے کہ وہاں کے قبائلی باغی ہو گئے تھے۔ سرکاری فوج اس لڑائی میں حصہ نہ لے گی لیکن عوام، والینٹر کی شکل میں اس جنگ میں شریک ہو سکیں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ جس کا پلہ بھاری دیکھیں گے ادھر جھک جائیں گے۔ اس پر امیر افغانستان کے دونوں بڑے لڑکے امان اللہ خاں اور نصر اللہ خاں نے جو شروع ہی سے انگریزوں کے سخت مخالف اور تحریک کے ہمدرد تھے، تحریک کے رہنماؤں کو مشورہ دیا کہ وہ اس پر راضی ہو جائیں۔ جب ترکی کی فوج ملک میں داخل ہو جائے گی تو ہم لوگ امیر کو یعنی اپنے والد کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر لیں گے ورنہ انھیں راستے سے ہٹا دیں گے۔

دسویں پروگرام کے مطابق حملے اور بغاوت کی تاریخ طے کرنا تھا۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۴ء تک ان اسکیموں پر کامیابی کے ساتھ عمل کیا گیا۔ صرف دسویں پروگرام پر عمل کرنا باقی تھا کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ یہ تحریک کارکنوں کے لیے ایک موقعہ تھا۔ فوراً دیوبند میں ان کی خفیہ نشستیں ہوئیں اور اس میں یہ طے پایا کہ ۱۹ فروری ۱۹۱۷ء کو بیرونی حملہ اور اندرونی بغاوت ساتھ ساتھ شروع کی جائے۔ اس کی اطلاع سبھی شاخوں کو دے دی گئی۔ انھیں یہ بھی ہدایت کی گئی کہ وہ بغاوت کے لیے تیار رہیں اور دوسری اطلاع ملنے کا انتظار کریں۔

اب اس تاریخ کی منظوری ترکی حکومت سے حاصل کرنی تھی اور افغانستان حکومت سے بھی اس کے بارے میں مشورہ کرنا تھا۔ شیخ الہند کو ایک اجازت نامہ لکھ کر دے دیا گیا تھا اور اس پر سازش کے سبھی ممبروں کے دستخط تھے۔ شیخ الہند کو ترکی جا کر اور وہاں سلطان غازی انور پاشا سے مل کر اس تاریخ کی منظوری لینا تھی نیز ترکی کی حکومت اور حکومت افغانستان سے تحریری طور پر اس معاہدے کی سب شرطیں طے کر لینا تھیں۔

شیخ الہند حج کے ارادے سے مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ انگریزی حکومت انھیں دلّی ہی میں گرفتار کر لینا چاہتی تھی لیکن وہاں اُن کے مریدوں کا ازدہام دیکھ کر حکومت کو تامل ہوا اور اس لیے ان کو بمبئی میں گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر انصاری نے خفیہ پولیس میں اپنے آدمیوں کے ذریعے حکومت کے اس فیصلے کا پتہ لگا لیا اور حکومت میں اپنے آدمیوں کی مدد سے بمبئی کے گورنر کے پاس بھیجے جانے والے تار میں تاخیر کرا دی۔ بمبئی کی حکومت کو تار اس وقت ملا جب شیخ الہند کا جہاز بندرگاہ سے روانہ ہو چکا تھا۔ برطانوی حکومت نے عدن میں انھیں گرفتار کرنا چاہا لیکن وہاں بھی حریت پسندوں نے وقت سے تار نہیں پہنچنے دیا۔ اس طرح شیخ الہند صحیح سلامت مکہ پہنچ گئے۔

مکہ میں شیخ الہند نے انور پاشا کے سکریٹری غالب پاشا سے ملاقات کی۔ شیخ الہند کو غالب پاشا کے ذریعے انور پاشا کی جانب سے دو پیغامات ملے۔ پہلا پیغام اس تحریک کی حمایت میں تھا جسے شائع کر کے ہندوستان اور افغانستان میں تقسیم کر دیا جانے

سے متعلق تھا۔ دوسرا پیغام افغانستان کی حکومت کے نام تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے شیخ الہند جو کچھ کہیں گے اُسے ان کی حمایت حاصل ہوگی۔ پہلا پیغام "غالب نامہ" اور دوسرا انور نامہ کے نام سے مشہور ہوا بعد میں شیخ الہند نے ترکی کے سلطان انور پاشا سے بھی ملاقات کی۔ ان کی یہ ملاقات مدینہ منورہ میں ہوئی اس ملاقات کے دوران تفصیل سے معاملات پر غور کیا گیا۔

شیخ الہند نے غالب نامہ اپنے پاس رکھ لیا اور انور نامہ کو مولانا ہادی حسن کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اسے صحیح سلامت افغانستان پہنچا دیں۔

اس دستاویز کو افغانستان بھجوانے میں شیخ الہند نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ انھوں نے لکڑی کا ایک صندوق بنوایا۔ اس کے تختوں میں اس دستاویز کو اس طرح چھپا دیا گیا کہ وہ نظر نہیں آ سکتا تھا۔ انھوں نے بمبئی کے ایک تحریک کے کارکن کو بھی خفیہ طریقہ سے اس سلسلے میں ہدایت روانہ کر دی۔

جہاز جیسے ہی بمبئی پہنچا، ڈیک پر ہی ایک شخص نے آکر صندوق لے لیا اور اسے قلی سے اٹھوا کر باہر لے کر چلا گیا۔ باہر آکر اس نے اُسی وقت صندوق کو مظفر نگر کے حاجی محمد نبی کے نام پارسل کر دیا۔ حاجی محمد نبی وہ صندوق یعنی دستاویز نہایت احتیاط سے اپنے پاس رکھے رہے۔

ادھر مولانا ہادی حسن جیسے ہی جہاز سے باہر نکلے گرفتار کر لیے گئے۔ سی۔ آئی۔ ڈی پہلے ہی سے لگی ہوئی تھی۔ ان کی تلاشی لی گئی لیکن کچھ برآمد نہ ہوا پھر بھی انھیں اسی وقت گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں نینی تال کے جیل میں رکھا گیا۔ کچھ دنوں بعد جب وہ رہا ہوئے تو بھیس بدل کر ظفر احمد کے نام سے مظفر نگر پہنچے، وہاں انھوں نے حاجی محمد نبی سے دستاویز لی اور چھپتے چھپاتے کسی طرح افغانستان میں داخل ہو گئے۔ اس طرح یہ دستاویز افغانستان پہنچ گئی۔ اسی دستاویز کو انور نامہ سے موسوم کیا گیا تھا۔

شیخ الہند نے غالب نامہ مولانا محمد میاں کے سپرد کیا کہ وہ اسے ہندوستان ہوتے ہوئے افغانستان لے جائیں لیکن جب مولانا محمد میاں ہندوستان پہنچے تو ان کے پیچھے سی۔ آئی۔ ڈی لگ گئی لیکن وہ کسی طرح بچتے بچاتے چھپتے چھپاتے افغانستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے وہاں ہندوستان کی عارضی حکومت نے اس کو شائع کیا لیکن اسی اثنا میں ریشمی رومال پکڑا گیا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اس طرح یہ غالب نامہ بیکار ہو کر رہ گیا۔

جب انور نامہ افغانستان پہنچ گیا تو وہاں مولانا عبید اللہ سندھی اور نصر اللہ خاں نے ترکی، افغانستان معاہدے کا سارا مضمون جو کہ عربی زبان میں تھا ایک ریشمی رومال پر کڑھوا لیا۔ اس پر امیر افغانستان حبیب اللہ اور ان کے تینوں فرزندوں کے دستخط بھی لے لیے۔ یہ رومال پیلے رنگ کے ریشمی کپڑے کا اور ایک گز مربع تھا۔ اس پر چاروں کے دستخط بھی پیلے رنگ ہی میں کرائے گئے تھے۔ اس کے بعد یہ ریشمی رومال پیشاور بھجوایا گیا۔ اس کام کو شیخ عبد الحق نے انجام دیا۔ یہ بنارس کے رہنے والے ایک گریجویٹ تھے۔ اور کابل، پیشاور، افغانستان اور ہندوستان کے درمیان کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تجارت محض ایک آڑ تھی اور اس کا خاص کام تحریک کے کارکنوں کے پیغامات کو افغانستان سے ہندوستان پہنچانا تھا۔

پروگرام یہ تھا کہ شیخ عبد الحق دستخطوں والے اس رومال کو سرحد پار پیشاور تک کسی طرح پہنچا دیں گے۔ اس کے بعد اسے کئی ہاتھوں سے گزر کر حیدرآباد (سندھ) کے شیخ عبد الرحیم تک پہنچنا تھا۔ شیخ عبد الرحیم کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ ریشمی رومال کو لے کر حج کرنے کے بہانے مکہ جائیں گے اور وہاں وہ اسے شیخ الہند مولانا محمود حسن کو سونپ دیں گے۔ اس ریشمی رومال کو جو افغانستان اور ترکی کے درمیان ایک اہم معاہدے کی دستاویز کی حیثیت رکھتا تھا لے کر شیخ الہند ترکی چلے جائیں گے اور اسے انور پاشا کو دے دیں گے۔ اس طرح ترکی اور افغانستان کے درمیان معاہدہ مکمل ہو جائے گا۔ ادھر پروگرام کے مطابق ترکی افغانستان کے راستے سے ہندوستان پر ۱۹ فروری ۱۹۱۷ء کو حملہ کر دے گا۔

اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ کابل میں آزاد ہندستان کی عارضی حکومت قائم کی جا چکی ہے۔ اس عارضی حکومت کے صدر راجہ مہندر پرتاپ تھے۔ اس عارضی حکومت کی جانب سے روس کے زار کے پاس جو خط بھیجا گیا وہ سونے کی طشتری پر کندہ تھا اور اس پر راجہ مہندر پرتاپ کے دستخط تھے کیونکہ وہی ہندستان کی عارضی حکومت کے صدر تھے۔ اس خط میں زار سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ وہ انگلینڈ سے اپنی دوستی ختم کر دیں اور ہندستان سے انگریزی حکومت کو ختم کرنے میں اپنی پوری قوت صرف کر دیں۔ ترکی کو بھی لکھا گیا کہ ہندستان کی عارضی حکومت ترکی حکومت سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتی ہے۔ اسی کے ساتھ ایک خط شیخ الہند کو بھی لکھا گیا جس میں کابل میں عارضی حکومت ہند کی اب تک کی کارروائیوں اور افغانستان میں غالب نامہ کے پہنچنے کا ذکر کیا گیا تھا۔ ترکی کو جو خطوط بھیجے گئے تھے وہ بھی پیلے ریشمی رومالوں ہی پر لکھے گئے تھے۔

ان سب رومالوں کو شیخ عبدالحق نے سرحد پار پشاور تک پہنچا دیا۔ انھوں نے یہ امانت پشاور میں رات نو بجے مولانا حق نواز خاں کو سونپ دی۔ حق نواز خاں نے ان رومالوں کو اگلے دن علی الصباح چار بجے ایک بہت ہی معتبر شخص کے ہاتھ ریاست بھاولپور کے دانپور میں سجادہ نشین خواجہ غلام محمد کے پاس بھجوا دیا۔ خواجہ غلام محمد کے پاس یہ رومال اگلے دن دس بجے پہنچے۔ انھوں نے اسی وقت ان رومالوں کو ایک نہایت معتبر شخص کے ہاتھ حیدرآباد روانہ کر دیا۔ ادھر پشاور میں صبح ہوتے ہی فوج اور پولیس نے حق نواز خاں کے گھر پر چھاپا مارا اور انھیں گرفتار کر لیا۔ پولیس ان کے قبضہ سے رومال برآمد نہ کر سکی کیونکہ کچھ ہی دیر پہلے چار بجے صبح کو وہ انھیں خواجہ غلام محمد کے پاس بھیج چکے تھے۔ اس کے باوجود انھیں جیل بھیج دیا گیا۔ اسی طرح سجادہ نشین صاحب کے گھر پر بھی پولیس نے چار بجے شام کو چھاپہ مارا اور انھیں گرفتار کر لیا۔ یہاں بھی رومال برآمد نہ ہو سکا۔ سجادہ نشین صاحب چار ماہ تک قید میں رہے۔

ریشمی رومال، دوسرے دن دوپہر کے وقت حیدرآباد میں شیخ عبدالرحیم کو ملا۔ وہ ان رومالوں کو فوراً ایک گدڑی میں سینے لگے۔ اپنے پرانے طرز کے مکان میں پیچھے کی جانب صحن میں بیٹھ کر وہ چپ چاپ گدڑی میں رہتے تھے کہ ایک دھماکا ہوا۔ شیخ نے سر اٹھا کر دیکھا اور حیرت زدہ رہ گئے۔ وہ کیا دیکھتے ہیں کہ کچھ گورے اور کچھ سکھ سپاہی صحن کی پچھلی دیوار سے پھاند کر ان کی جانب لپکے آ رہے ہیں۔ وہ پرانی گدڑی لے کر بھاگے وہ سپاہیوں کی گرفت میں آتے آتے بچ گئے۔ لیکن گدڑی ان کے ہاتھ سے چھن گئی۔ وہ دیوار پھاند جاتے ہیں کچھ فوجی ان کا پیچھا کرتے ہیں لیکن وہ رفوچکر ہو جاتے ہیں اور فوجی سپاہی کف افسوس ملتے ہوئے واپس آتے ہیں۔ اس طرح ریشمی رومال، پکڑ لیا گیا البتہ شیخ عبدالرحیم پکڑے نہ جا سکے۔

انگریزی حکومت کے ہاتھ یہ خفیہ دستاویز لگتے ہی چاروں طرف تیزی سے گرفتاریاں ہونے لگیں۔ اس دستاویز کے ہاتھ آ جانے سے انگریزوں کو تحریک کے شرکا اور ترکی حکومت کے خلاف مکمل ثبوت فراہم ہو گئے۔ حکومت نے فوراً اس سازش کو کچل دینے کے لیے سختی سے قدم اٹھایا اور تیزی سے کارروائی ہونے لگی۔ جہاں جہاں بغاوت کا خطرہ تھا وہاں فوراً فوجیں بھیج دی گئیں۔ سرحدی صوبہ میں فوجیں دوگنی کر دی گئیں۔ جس شخص پر ذرا سا بھی شک و شبہ ہوتا اُسے فوراً گرفتار کر لیا جاتا۔ گرفتار ہونے والوں پر طرح طرح کی سختیاں کی جاتیں۔ تین چار آدمیوں کو چھوڑ کر باقی سبھی نے کچھ بتانے سے انکار کر دیا اور حکومت ان سے کچھ بھی اگلوا لینے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

ادھر برطانیہ کی جانب سے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا۔ اور ایران میں فوج داخل کر کے ترکی اور افغانستان کے درمیان رابطہ ختم کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ مکہ معظمہ کو تیار کر کے اس سے ترکی کے خلاف بغاوت کرا دی گئی۔ عرب اور ہندستان کے ضمیر فروش مولویوں سے ترکی کے خلاف فتوے دلوائے گئے۔ شیخ الہند کو مکہ میں گرفتار کر کے ان پر مصر کی عدالت میں مقدمہ

(بقیہ صفحہ ۲ پر)

غزل

پورن سنگھ ہنر

کیا رہیں ایسی دنیا میں ہم دوستو
غم زیادہ مسرت ہے کم دوستو

منزلِ حق پہ پہنچے نہ ہم دوستو
راستے میں تھے دیر و حرم دوستو

اب مداوائے غم ہو تو ہو کس طرح
آرزوئیں بہت عمر کم دوستو

دوستوں سے نہ کچھ کام ہم کو پڑا
رہ گیا دوستی کا بھرم دوستو

شکوۂ آدمیت کریں کس سے ہم
آدمیت ہے دنیا میں کم دوستو

عشق میں ایک ایسا مقام آگیا
ہم نے سمجھا خوشی کو بھی غم دوستو

کیا وہ جور و ستم پر پشیماں ہوئے
کیوں ہوئی آنکھ ان کی بھی نم دوستو

آدمی تو ابھی تک اندھیرے میں ہے
جلتی ہے شمعِ دیر و حرم دوستو

اس میں اپنے پرائے کی تخصیص کیا
غم کسی کا ہو آخر ہے غم دوستو

جب گلستاں میں آئی بہارے ہنر
ہو گئے ہم اسیرِ الم دوستو

غزل

نجمہ سلونوی

کس کس طرح کے آئے ہیں مے خوار دیکھئے
زاہد چھپا ہے وہ بس دیوار دیکھئے

لذت بہ قدرِ تلخیٔ آزار دیکھئے
دامِ بلا میں ہو کے گرفتار دیکھئے

آئینہ لے کے ہاتھ میں سرکار دیکھئے
انگڑائی ہے کہ حسن کی تلوار دیکھئے

دنیائے آرزو کی حدیں ختم ہو چکیں
آساں ہوئی ہے منزلِ دشوار دیکھئے

ملتے جو طور پر تو یہ کہتے کلیم سے
جلوہ بہ قدرِ ہمتِ دیدار دیکھئے

وہ جانِ حسن اپنی ادا دیکھتا نہیں
میرے لیے یہ حکم لگاتار دیکھئے

ٹکرا رہے ہیں قید میں سر کو اسیرِ غم
گلزار تنگ ہو گئے در و دیوار دیکھئے

اس جلوہ گاہِ ناز میں پروانہ کہہ گیا
شمعِ غمِ حیات کا بازار دیکھئے

دل شیشہ اور وہ بھی شکستہ الٰہی خیر
ہوتا ہے کون اس کا خریدار دیکھئے

چھائی ہے میکدہ پہ وہ توبہ شکن گھٹا
زاہد بھی ہو رہے ہیں گنہگار دیکھئے

نجمہ کو غم قبول مگر ہے یہ التجا
میری طرف بھی اے مرے سرکار دیکھئے

غالب کی کامیاب تقلید

— نجم الحسن انجم ادیب

صنفِ سخن میں غزل و قصیدہ مشہور ہیں۔ غزل تو ہر شاعر کہہ کر مشہور ہو سکتا ہے مگر قصیدہ نگاری ایک ایسی صنف ہے جس میں بہت سے شعرا نے طبع آزمائی کی اور چند ہی مشہور ہوئے۔ ذوق اور غالب نے نت نئی ترکیبیں تراشیں اور اُسے ایک نیا موڑ دیا۔ جہاں تک فن کا تعلق ہے ذوق کا مرتبہ بہت بلند ہے مگر غالب کو اپنے فارسی قصائد میں جتنی مقبولیت اور شہرت نصیب ہوئی اتنی اردو قصائد سے نہ ہو سکی۔

قصیدہ میں چار چیزوں کا اچھا ہونا بے حد ضروری ہے۔ "مطلع" جسے سامع سن کر مسرور ہو جائیں اور طبیعت ایسی محظوظ ہو کہ پورا قصیدہ سننے کے لیے بے قرار ہو جائے۔ دوسرے قصیدے کا گریز اچھا ہونا چاہیے مگر یہ فنِ قصیدہ کا مشکل مقام ہے۔ تیسرے حُسنِ طلب یعنی مدّاح ممدوح سے صلہ پانے کے لیے یا کوئی چیز مانگنے میں ایسی سحر بیانی سے کام لے کہ التماس قبول ہو جائے۔ چوتھے مقطع نہایت عمدہ ہو کیونکہ اگر مقطع اچھا ہو تو سارے اشعار میں لطف مل جائے گا۔

مولانا شاہ ابوالحسن ادیب مرحوم دکن کے وہ نامور شاعر اور ادیب ہیں جنھوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ علم و ادب کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس میں مولانا ادیب نے خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ مولانا کی لامحدود شخصیت اور ان کی ہمہ گیر زندگی کے ایک ایک گوشہ میں ان گنت انجمنیں اور بے شمار محفلیں برپا تھیں۔ آپ کا وجود میسور کی ادبی تاریخ کا ایک اہم ترین دور تھا۔ آپ مرزا غالب کے بڑے مدّاح تھے۔ غالب کی مشکل ترین زمینوں میں آپ نے بہت سی غزلیں کہی ہیں۔ شاہ ابوالحسن مرحوم کے کلام پر فی الحال روشنی ڈالنا مقصود نہیں ہے۔ اس لیے یہاں غالب کے مشہور قصیدے سے

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام — جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

کی زمین میں مولانا ادیب نے جو کامیاب تقلید کی ہے وہ ہدیۂ ناظرین کی جا رہی ہے۔ یہ قصیدہ آپ نے سنہ ۱۹۳۰ء میں جشن دسہرہ کے موقع پر حضور لامع النور سری کرشنا راج وزیر بہادر والیِ ریاست میسور کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لکھا تھا۔

قصیدہ

مجھے سیرِ چمن کو کل سرِ شام — لے گئی جب طبیعت خودکام

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جو چلتی تھی — ہو رہا تھا دوبالا لطفِ خرام

اس قدر دلکشی تھی پھولوں میں — اُٹھ نہ سکتے تھے میرے ہرگز گام

مرحبا زمزمے عنادل کے — میرے دل کو تھے قدرتی پیغام

اسی حالت میں آگے بڑھ کے کہا — جذبۂ دل نے مجھ کو کرکے سلام

منظرِ جاں فزا ہے پیشِ نظر — کچھ تو طبعِ رواں سے لیجیے کام

جی میں آئی کہ ہاں میں لکھوں کچھ — نہ کروں فکرِ گردشِ ایام

پھر یہ سوچا کیا کہ کیا لکھوں — فکر بولی ہو مدحِ شہ ارقام

بندہ پرور شہ کرشن راج — تاف سے قاف تک ہے جس کا نام

عدل و انصاف جس کا شیوہ ہے — کام جس کا ہے فیض اور انعام

ہے رعایا نواز وہ ایسا! — اس کی ہے بے مثال بخششِ عام

آسماں ہے یہ گلشنِ میسور — اور یہ بادشاہ ماہ تمام

جس کے فیض و کرم سے بقعۂ نور — ہو گئے ہیں تمام منظر و بام

شاد ہو ہو کے آج پیتے ہیں — شادمانی کی سب مئے گل فام

علم و حکمت کے ہیں رواں دریا
آئین دنیا کے تشنہ کام تمام

دیکھ لے طرز عدل و داد اگر
نام کسریٰ کو بھول جائے انام

آکے سیکھیں یہاں جہاں بانی
جو ہیں دنیا میں خسروان عظام

دیکھتے شاہ کے اگر اوصاف
جم و دارا و قیصر و بہرام

دل سے ہوتے وہ مائل مدحت
جیسے مداح شیخ ہوں خدام

ہے رعایا کو عام آزادی
شاد ہیں شاد پیرو اسلام

نہیں محروم فیض سے کوئی
سب کو ملتے ہیں اپنے اپنے سہام

اہل مغرب ہیں مدح خواں جسکے
یہ وہ ہے خسرو بلند مقام

جتنا شاہ کے مقاصد ہیں
حسن آغاز و زینت فرجام

دیکھ کر شاہ کی اولوالعزمی
چشم حیراں ہے گردش ایام

اسد اللہ رسے راہِ دانش میں
اس شہ دادگر کی تیز ہی گام

رشک ملکوت ذات عالی ہے
جس کے اوصاف کو نہیں اتمام

حسن سیرت نے جود و بخشش کو
کر دیا ہے امید گاہ انام

تیری صحت کا اہل مغرب بھی
پیتے ہیں جام بر سبیل دوام

ہے ترا نہیں ملک کا منشا
نہ رہے کوئی ملک میں ناکام

فیض خالق جو خاص ہو تجھ پر
ہو ترا فیض کیوں نہ ملک پہ عام

طبع مائل نہ ہو غزل پر کیوں
عالم عاشق سے ہوئے عجب الہام

ہے وہ اک تیری بے رخی کا نام
جس کو کہتے ہیں گردش ایام!

عاشقی کو لگاؤ وصل سے کیا
ارے ناداں ترا خیال ہے خام

عاشق سینہ چاک ہوں میں بھی
تو ہے گر ماہ روئے گل اندام

جان لے گر اصول مے نوشی
پھر نہ دنیا میں ہو کوئی بدنام

ہجر اور وصل میں ہو فرق جسے
ایسے عاشق کو دور ہی سے سلام

ہے شراب طہور سے بڑھ کر
اس ستمگر کی تلخی دشنام

بوالہوس جو ہیں وہ نہیں عاشق
عاشقوں کو ہوس سے ہے کیا کام

بے خودی کے اسیر ہیں دونوں
ایک ہے حسن و عشق کا انجام

شیخ مل جائیں تو یہ عرض کروں
دختر رز ہو ہم پہ ہائے حرام

لوگ جس کو ادیب کہتے ہیں
وہ بھی ہے اس کا بندۂ بے دام

ہے شہ نیک نام ذوالاکرام
سرور دادگر بلند مقام

حکم پر گر ترے فدا ہیں خواص
دل سے قرباں ہیں بزم عام عوام

جو تری طرز حکمرانی ہے
نہیں رکھتی ہے حاجت صمصام

تیری اس طرح دھاک بیٹھی ہے
ایک خلقت ہے لرزہ براندام

اس میں کیا شک ہے اک زمانہ کو
عدل نے تیرے کر لیا ہے رام

عہد میں تیرے بامراد ہیں سب
کوئی اس جا نہیں ہے دشمن کام

میرے دل کو قرار ہے حاصل
اور سب کو نصیب ہے آرام

جس قدر ملک میں ہیں خورد و کلاں
شاد و خرم ہیں آج حسب مرام

آج دنیا میں کون ہے ایسا
اس حکومت کو دے سکے الزام

کبھی دیکھا ہے عہد ایسا بھی
سچ بتا تو اے چرخ نیلی نام

ہے رعایا کے ہاتھ میں دائم
مئے عشرت کا وہ بلوریں جام

ایک جرعہ اگر ملے اس کا
پھر نہ باقی رہے خمار دوام

نظر لطف و فیض والا سے
ہر جواں اب ہے رشک رستم و سام

اب ہے میور روکش یوناں
علم و حکمت یہاں ہیں اتنے عام

یہ اثر مدح شاہ کا پایا
آج خامہ ہے میرا تیز خرام

جودت طبع میری ہے اعجاز
نام ہے میری فکر کا الہام

نظم میری لآلیِ منظوم
نثر میری ہے روکش ارقام

میری باتیں جواہر دانش
میرے جملے ہیں زیب بخش کلام

میرے تابع ہیں سرزمین سخن
اس قلمرو میں میرا حکم ہے عام

میرا چلتا ہے اس جگہ سکہ
ہیں مضامین آج میرے غلام

اب دعا مستجاب ہے میری
پھر کہوں کیوں نہ اس کو عرش مقام

کیوں نہ دوں شاہ کو دعا دل سے
اہل دنیا پہ جس کا لطف ہے عام

تا ابد شاہ شاد ہو میرا
ہو حکومت کو اس کی استحکام

روز عشرت ہو شاہ کی ہر شب
صبح فرحت ہو شاہ کی ہر شام

ملے توفیق صحت جاوید
اور عشرت کو ہو نوید دوام

یہ ادیب عزیب مدح سرا
شاہ کی مدح میں کرے اقدام

کہئے ہر وقت شاہ زندہ باد
ہو کشن راج اس کا تکیہ کلام

★

مزاحیہ

دانت کا درد

محمد شمیم الاسلام

دانت کا درد کہنے کو تو بہت معمولی بات ہے مگر جسے ہوتا ہے اسے چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے، دماغ کی چولیں ہل جاتی ہیں، اسکے سامنے دنیا بے مزہ ہوجاتی ہے۔ چاروں طرف اسے ایسے ہی لوگ دکھائی دیتے ہیں جو اپنے دانت سے ہاتھ دھو چکے ہیں اور مصنوعی بتیسی لگائے ہوئے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ خوف خون خشک کر دیتا ہے کہ اگر دانت کا درد کم نہ ہو تو ڈنٹل کالج جانا پڑے گا جہاں کے تصور ہی سے آدمی بیہوش ہوجائے۔

اور اس دن اتفاق سے ہوا بھی ایسا ہی۔ ہمارے دانت میں گزشتہ ۵۔۶ ماہ سے درد تھا۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ ڈنٹل کالج جاکر دکھلادیں۔ مگر میں راضی نہ تھا۔ بلکہ کالج کا نام آتے ہی رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔ طرح طرح کے منجن، ٹوتھ پیسٹ استعمال کرڈالے۔ مگر بے سود۔ 'درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی' کا مصداق ہمارا دانت ہوگیا۔ اس روز درد سے آنسو نکل آئے۔ آخر میں نے طے کیا کہ آج میں ڈنٹل کالج جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا، خواہ کچھ بھی ہو۔

"تو کیا آج آپ ڈنٹل کالج جارہے ہیں؟" بیگم نے مجھ سے دریافت کیا۔"

"ہاں! آج جارہا ہوں۔ کیا تم مجھے اتنا بزدل سمجھتی ہو؟" میں نے بہت فاتحانہ انداز میں جواب دیا اور پھر رکشے پر سوار ہوگیا۔ رکشے پر بیٹھتے ہی جیسے ہمارے دماغ میں پورا ڈنٹل کالج سما گیا جہاں روز سیکڑوں دانت کے مریض آتے ہیں، ڈنٹل چیر پر بیٹھتے ہیں جس کے اوپر ایک ایک ہزار پاور کے بلب لٹکتے رہتے ہیں۔ کرسی کے بائیں جانب پانی سے بھرا ہوا گلاس، داہنے جانب دانت صاف کرنے کے مختلف اوزار ــ چمٹی، کانٹے، زمبور، چھوٹے سے لیکر بڑے تک جس سے جبڑا تک کھینچا جاسکے۔ دانت صاف کرنے کی بجلی کی گراری دار مشین۔ دانت سے بہتے ہوئے خون کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے ملائم روئی ــ اور نہ جانے کیا کیا۔

اتنے میں رکشہ رکا اور میں ڈنٹل کالج کے پھاٹک پر کھڑا تھا۔ جلدی جلدی پیسے دیکر آگے بڑھا اور ٹکٹ بنواکر اپنی باری کا انتظار کرنے لگا اور سوچنے لگا کہ یہ وہی ڈنٹل کالج ہے جس کا خیال کرکے میں گھبرا رہا تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ گھبراہٹ کی کیا بات ہے۔؟ آخر چھوٹے چھوٹے بچے بھی تو آتے ہیں! کیا میں ان سے بھی گیا گزرا ہوں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ میں نے بہت ہمت سے دل کو سمجھایا۔ اتنے میں گیٹ پر کھڑے باوردی چپراسی نے آواز لگائی:

"اسلام صاحب!" اسلام صاحب"۔

میں جیسے چونک پڑا۔ بینچ سے ایک دم کھڑا ہوگیا۔ آگے بڑھا۔ ہال کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ جہاں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میں دیکھنے لگا ــ لمبی لمبی دو قطاریں ــ قریب پچیس پچیس آدمیوں کی ایک قطار ــ سب کے منہ کھلے ہوئے اور نظریں چھت کی طرف ــ کوئی چیخ رہا ہے تو کوئی اگالدان میں خون کے تھوک تھوک رہا ہے، کوئی کلی کر رہا ہے تو کسی کے چاروں طرف ڈاکٹر گھیرے ہوئے دانتوں کا معائنہ کر رہے ہیں۔

"کہئے۔ آپ کو کیا تکلیف ہے؟" ڈاکٹر نے گھسا گھسا یا سوال کیا۔

"میرے بائیں طرف نیچے مسوڑے کے پاس دانت میں تکلیف ہے۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اور ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کھولئے منھ" ڈاکٹر نے حکم دیا۔

اور میں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے جتنا منھ کھولنا ممکن تھا کھول دیا۔ ڈاکٹر نے حسب معمول منھ میں چمٹی ڈال کر ہلکے سے ٹھونکا اور جب کچھ درد نہیں معلوم ہوا تو گراری دار مشین پیر سے کھسکا کر دانت صاف کرنا شروع کر دیا۔

زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میرے منھ میں گراری دار مشین چل رہی تھی جس کی ذرا سی لغزش سے دوسرے دانت جنبش کر سکتے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ ڈاکٹر بھی انسان ہی ہے۔ اور انسان سے غلطی ممکن ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ ڈاکٹر صاحب کسی خیال میں متاثرہ دانت کے بجائے کسی دوسرے دانت کی صفائی نہ کر دیں اور مجھے لینے کے دینے پڑ جائیں۔ میں یہ سب سوچ رہا تھا اور ہاتھ کے اشارے سے ڈاکٹر کو اپنی تکلیف بھی بتاتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میرے پسینے چھوٹنے لگے۔ دسمبر کی سردی میں لوگ گرم کپڑوں میں کانپ رہے تھے۔ مگر میں شیروانی کے بٹن کھول رہا تھا۔ پنکھا چلانے کے لیے ڈاکٹر سے اشارہ کیا۔ ایک گھونٹ پانی پیا۔ اور پھر مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا۔ جب ہوش آیا تو مجھے بہت سے ڈاکٹر گھیرے ہوئے تھے اور ایک لیڈی ڈاکٹر کا ہاتھ ہماری نبض پر تھا۔

"گھبرائیے نہیں جناب! اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔" لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔

میں پوچھنے جا رہا تھا کہ آخر یہ ہوا کیا۔ مگر لیڈی ڈاکٹر نے بڑی نرم اور شیریں آواز میں مجھے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ میں نے مجبورانہ اشارہ کیا۔ جس کا مطلب تھا۔ "مگر یہ تو بتائیے کہ مجھے کیا ہو گیا تھا اور میرا منھ کیوں نہیں کھل رہا ہے"۔؟

لیڈی ڈاکٹر نے پھر اسی شیریں لہجے میں آہستہ آہستہ بتایا کہ "دانت کی صفائی کے دوران پتہ چلا کہ متاثرہ دانت اندر سے بالکل کھوکھلا ہو چکا ہے اور مسوڑہ پک گیا ہے۔ دانت کو باہر نکالنے میں ایک حصہ مسوڑے میں ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ آپ جس طرح گھبرائے ہوئے تھے اگر آپریشن کا حال بتا دیا گیا ہوتا تو آپ اس کے لیے تیار نہ ہوتے۔ اس لئے آپ کو بتائے بغیر بیہوش کر کے آپریشن سے وہ ٹکڑا نکالا گیا ہے"۔ یہ کہتے کہتے ڈاکٹر صاحبہ لپک کر میرے ۵۰ سال کے اس ساتھی دانت کو اور اس کرچ کو جس کے باعث مجھے عالم بے خبری کی سیر کرنا پڑی اور اب آزادی گفتار پر پابندی لگی ہوئی ہے، لائیں۔ میں حسرت سے انھیں دیکھتا رہا۔ جی چاہتا تھا کہ پوچھوں میرے دوست، میرے ساتھی، کچھ دیر پہلے تک کے میرے مددگار آخر مجھ سے کون سا قصور ہوا جس کی اتنی بڑی سزا تجویز کی۔ لیکن ڈاکٹر صاحبہ دوسرے ہی لمحے واپس لے گئیں اور خدا جانے ان پر کیا گزری۔

کوئی تین بجے ہمیں گھر جانے کی اجازت ملی۔ اس عرصے میں گھر میں کہرام مچ گیا۔ منتیں مانگی گئیں۔ جب میں گھر پہنچا تو منھ میں ٹھونسی ہوئی روئی اور بائیں جانب رخسار کے ورم کو دیکھ کر بیگم ایک دم گھبرا گئیں۔ میں نے اشارے سے اطمینان دلایا۔ مگر کاغذ منگوا کر اس پر اختصار کے ساتھ کیفیت لکھی اور سجدۂ شکر ادا کرنے کی ہدایت کہ آج ہم ایک بڑی آزمائش میں نہ صرف پورے اترے بلکہ آپ کا سہاگ بھی باقی رہا۔ ورنہ سیپٹک ہو جانے اور اس کے نتیجے میں ہمارے رخت سفر باندھ لینے میں زیادہ کسر نہیں رہ گئی تھی۔

★

پردیش کے عوام اور کمزور طبقوں کی راحت رسانی کے اقدامات

ادارہ

اترپردیش میں صدر راج کے قیام کے بعد ۹ نومبر ۱۹۷۳ء کو شری ہیم وتی نندن بہوگنا کی قیادت میں تشکیل پانے والی حکومت نے اترپردیش کے عوام اور کمزور طبقوں کی راحت رسانی اور سرکاری ملازمین کو رعایتیں دینے کے لیے کچھ انقلابی فیصلے کیے ہیں جن کا مختصراً ذکر ذیل میں کیا جا رہا ہے۔

ہریجنوں کے مفادات کا تحفظ

ریاستی ملازمتوں میں تیسرے اور چوتھے زمرے کی ۵۰ فیصد اسامیاں اقوام و قبائل مندرجۂ فہرست کے لیے محفوظ کی گئیں۔

پولیس اور پی اے سی میں بھی کانسٹبلوں کی بھرتی میں ۵۰ فیصد اسامیاں ان کیلئے محفوظ کر دی گئیں۔

سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی اداروں کے ہوسٹلوں میں ۱۸ فیصد نشستیں ہریجنوں کے لیے محفوظ کی گئیں۔

اقوام مندرجہ فہرست کا کوئی بھی طالب علم وظیفہ یا حکومت کی فراہم کردہ دیگر سہولتوں سے محروم نہ رہنے پائے گا۔

ضروری اشیا کی یقینی فراہمی کے لیے بندوبست

خصوصی کوششوں کے نتیجے میں مرکزی حکومت نے غلہ، مٹی کا تیل، سیمنٹ اور کیمیاوی کھاد کے کوٹوں میں بھی اضافہ کیا۔ سستے غلہ کی دکانوں پر فی یونٹ راشن کی مقدار بڑھا کر ۸ کیلوگرام کر دی گئی۔ ریاست کا مٹی کے تیل کا کوٹہ ۲۹۰۰۰ ٹن سے بڑھ کر ۵۸۰۰۰ ٹن ہوگیا۔ ریاست کو آئندہ ماہ سے ہر مہینہ ۵ء۴ لاکھ ٹن سیمنٹ ملنے لگے گا۔ غلہ کی ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، اسمگلنگ اور ملاوٹ کی روک تھام کے لیے اندرونی سلامتی برقرار رکھنے سے متعلق قانون بروئے کار لایا گیا۔

کھیتوں اور کارخانوں کے لیے مزید بجلی

ریاست کے تھرمل بجلی گھروں میں امکانی پیداواری صلاحیت کا استعمال ۵۹ فیصد سے بڑھا کر ۸۰ فیصد کر دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں کارخانوں میں دو شفٹیں چلنا شروع ہوگئیں اور کسانوں کو آبپاشی کے لیے ۱۸ گھنٹے کے واسطے بجلی ملنے لگی۔ ریاستی حکومت نے آگرہ الیکٹریسٹی سپلائی کمپنی کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

صنعتی واحدوں کو خود اپنی بجلی پیدا کرنے کی غرض سے جنریٹروں کی خریداری کے لیے دی جانے والی مالی امداد دوگنی کر دی گئی۔

گنے کی قیمت میں اضافہ

لکھنؤ کے مغرب میں واقع ۴۰ ملوں میں گنے کی قیمت ۱۳ روپیہ ۲۵ پیسے فی کوئنٹل اور مشرقی منطقے کی ملوں کے لیے ۱۲ روپیہ ۲۵ پیسے فی کوئنٹل مقرر کی گئی جبکہ مرکزی حکومت نے کم سے کم قیمت ۸ روپیہ مقرر کی تھی۔

کسانوں کو مراعات

کسانوں کے لیے تقریباً ۷۰۰ ٹن مزید نائٹروجن ملی ہوئی کیمیاوی کھاد حاصل کی گئی۔ ٹیوب ویلوں کے علاقے میں کسانوں کو آبپاشی کی پاس بکیں جاری کی گئیں۔ ریاست کے سیلاب اور خشک سالی سے متاثرہ ۲۶ اضلاع میں ایک ایکڑ تک کی جوت کے کسانوں کو بیج مفت فراہم کیے گیے۔ اس کے علاوہ چھوٹے کسانوں کی بیج کی ۵۰ فیصد ضروریات مفت پورا کرنے کے لیے بندوبست کیا گیا۔ بڑے کسانوں کے لیے قرضوں کا انتظام کیا گیا۔

ریاست کے ۴۵ لاکھ کھیت مزدوروں کی کم سے کم اجرت میں اضافہ کیا گیا۔ شکر ملوں کے مزدوروں کے مہنگائی بھتے میں اضافہ کیا گیا جس سے ۹۰۰۰۰ مزدور مستفید ہوئے۔

کانپور کے چمڑے کی صنعت میں لگے ہوئے مزدوروں کو ۲۷ روپیہ ماہانہ تک کی عبوری امداد دی گئی۔ انجینیرنگ مزدوروں کو تغیر پذیر مہنگائی بھتے کے پیش نظر عبوری راحت دی گئی۔

ٹیچروں کی تنخواہ میں اضافہ

امداد یافتہ سکنڈری اداروں کے تدریسی اور غیر تدریسی عملے کی تنخواہوں کی شرحیں حکومت کے زیر انتظام چلنے والے تعلیمی اداروں کے عملے کی تنخواہوں کی شرحوں کے برابر کر دی گئیں۔ اس فیصلے سے ۸۰۰۰۰ ٹیچروں اور دیگر ملازمین کو فائدہ پہنچے گا اور حکومت کو پانچ کروڑ روپیہ کے مزید اخراجات برداشت کرنا ہوں گے۔ جے ٹی سی ٹیچروں کو سی ٹی گریڈ دیا جانے لگے گا۔ منتظمین سے بقایا کی وصولیابی کے سلسلے میں ٹیچروں کو حکومت کی مدد کی یقین دہانی کی گئی۔ نجی اسکولوں سے ملحق پرائمری درجات کے ٹیچروں کی تنخواہ بیسک شکشا پریشد کے پرائمری اسکولوں کے ٹیچروں کی تنخواہ کے برابر کر دینے کا فیصلہ۔

یونیورسٹی تعلیم میں سدھار

لکھنؤ یونیورسٹی کو ۸۰ء۷ لاکھ روپیہ کے خسارے کی تلافی کرنے کی یقین دہانی۔ طلباء کی فلاح سے متعلق کونسلوں کے قیام کا فیصلہ۔ کمایوں اور گڑھوال یونیورسٹی کا قیام۔ فیض آباد میں ایک زرعی یونیورسٹی کے قیام کا فیصلہ۔

سرکاری ملازمین کو مہنگائی بھتہ

حکومت کے تقریباً پانچ لاکھ ملازمین کو اسی تاریخ اور اسی شرح سے مزید مہنگائی بھتہ دینے کا فیصلہ کیا گیا جس کی مرکزی حکومت نے اپنے ملازمین کے لیے منظوری دی ہے۔ اس اقدام کے نتیجہ میں ریاستی خزانہ پر مزید ۴۶ء۹ کروڑ روپیہ کے مصارف کا بار پڑے گا۔

ریاستی حکومت کے ایسے تمام گزیٹیڈ اور غیر گزیٹیڈ ملازمین کو مستقل کر دیا جائے گا جنھوں نے یکم جنوری ۱۹۷۴ء کو تین سال کی مسلسل ملازمت پوری کر لی ہے۔

ریاست کے ۷۵۰ روپیہ ماہانہ تک تنخواہ پانے والے سرکاری ملازمین کو مکان کا کرایہ حاصل کرنے کے سلسلے میں رسیدیں پیش کرنے اور ان کی تصدیق کرانے سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔

اسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کے ملازمین کو ۹ فیصد ایکس گریشیا رقم کی ادائیگی۔

نئی صنعتوں کا قیام

ریاست میں پانچ شکر ملوں اور ۸ کتائی ملیں قائم کرنے اور ڈلا سیمنٹ فیکٹری کی توسیع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ہر شکر مل کے قیام پر ۴ء۲۵ کروڑ روپیہ کی لاگت آئے گی اور ۸ کتائی ملوں کے قیام پر ۲۰ کروڑ روپیہ کے مصارف ہوں گے۔ ڈلا سیمنٹ فیکٹری کی توسیع کے لیے چھ کروڑ روپیہ کی مرکزی امداد اور شارد امہانک پراجیکٹ کے لیے مزید چھ کروڑ روپیہ کی امداد حاصل ہوئی۔

اس کے علاوہ ریاست میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو فروغ دینے کے لیے ایک مشاورتی کمیشن کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔

بنکروں کے لیے مزید سہولت

کتائی ملوں کے تیار کردہ سوت پر ۲۰ فیصد لیوی۔ اٹاوہ امداد باہمی کتائی مل کی توسیع کا کام تیز تر کیا گیا۔ نجی زمرے میں دوسری شفٹ چلانے کے لیے کتائی ملوں کو بجلی کی فراہمی۔

آیورویدک یونیورسٹی کے قیام کی تجویز

ریاست میں ایک آیورویدک یونیورسٹی اور راجیہ آیورویدک اور یونانی دوائیں تیار کرنے کے لیے ایک کارپوریشن کا قیام زیر غور۔

ڈاکٹروں کی نجی پریکٹس پر عائد پابندی ختم

حکومت اتر پردیش نے سرکاری ڈاکٹروں کی نجی پریکٹس کے سلسلہ میں سابقہ حالت کو بحال کرنے اور ایسے تمام ڈاکٹروں کی نجی پریکٹس کے سلسلے میں عائد پابندی اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے جن کو یکم مارچ ۱۹۷۲ء سے قبل نجی پریکٹس کی اجازت تھی۔ حکومت نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ ایسے تمام معاملات میں یکساں شرح پر تنخواہ کے ۵۰ فیصد کے برابر پریکٹس نہ کرنے کے عوض بھی بھتہ دیا جائے گا جن میں ڈاکٹروں کو ایسی اسامیوں پر کام کرنا پڑے جو یکم مارچ ۱۹۷۳ء کو ایسی اسامیاں تھیں جن میں پریکٹس کرنے کی اجازت نہ تھی۔

حکومت نے ریاستی اسپتالوں اور ڈسپنسریوں کے کام کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے ایک رکنی کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔

نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لیے اقدامات

سرکاری افسروں اور ملازمین کو بدعنوانی اور فرائض کی انجام دہی میں غفلت برتنے کے خلاف انتباہ۔ آمدنی اور حیثیت سے زیادہ خرچ کرنے والے افسروں اور ملازمین پر کڑی نظر رکھنے کیلیے احکام۔ نگراں کمیشن کو زیادہ چوکنا اور مستعد رکھنے کی ہدایت۔

وزیر اعلیٰ نے مجلس وزراء کے رفقائے کار کو لوگوں کی مہمان نوازی قبول نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ وزیروں کا پٹرول کا ماہانہ کوٹہ ۲۲۵ لیٹر سے گھٹا کر ۱۵۰ لیٹر کر دیا گیا۔

نئے پراجکٹ

گذشتہ یکم دسمبر کو فتح پور میں ۱٫۸ کرور روپیہ کی لاگت کے کشن پور پمپ کینال اور ۴٫۵۰ کرور روپیہ کی لاگت کے کملا نہرو پمپ کینال پراجکٹ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ وزیر اعظم نے ہردوار میں گنگا پر ۴٫۵۰ کرور روپیہ کی لاگت کے پل کا سنگ بنیاد رکھا اور شاہدرہ سہارن پور بڑی ریلوے لائن کا افتتاح کیا۔ اس سے قبل وزیر اعظم نے ۱۷ نومبر کو لکھنؤ میں ۸ کرور روپیہ کی لاگت کی اندرا ایکویڈکٹ کا سنگ بنیاد رکھا۔ دوسرے دن انھوں نے اناؤ میں تین کرور روپیہ کی پرنٹنگ مشین فیکٹری اور کالپی میں جمنا پر ۲٫۱۰ کرور روپیہ کی لاگت کے پل کا سنگ بنیاد رکھا۔ حکومت نے گنگا ندی پر اوسطاً ہر ۱۲۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ایک پل تعمیر کرنے کی اسکیم بھی منظور کی ہے۔

ریشمی رومال سازش (صفحہ ۵۶ کا بقیہ)

چلا یا گیا اور جنگی قیدی بنا کر مالٹا میں قید کر دیا گیا۔ ان کے ساتھ مولانا حسین احمد مدنی بھی گرفتار کر لیے گئے۔ یہ لوگ مالٹا میں قید رہنے کے باعث جزیرہ مالٹا کے قیدی کے نام سے مشہور رہے۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۹۱۶ء میں حکومت کو یہ پتہ چلا کہ برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے ہندستان کے کچھ مولوی اور مسلمان حریت پسند سازش کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کیونکہ ریشمی رومال سازش ۱۹۰۵ء سے چل رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کو بہت پہلے ہی اس سازش کا علم ہو چکا تھا۔ انگریزوں نے اپنے جاسوسوں کو حریت پسندوں کی شکل میں سازش کی تنظیم میں داخل کر دیا تھا لیکن کوئی سخت کارروائی کرنے سے پیشتر حکومت اصل ریشمی رومال کو پکڑ لینا چاہتی تھی تاکہ قطعی اور ناقابل تردید ثبوت اسکے ہاتھ آجائے۔

ریشمی رومال پکڑا کیسے گیا اس کے بارے میں مولانا عبیداللہ سندھی کا خیال تھا کہ پشاور کے حق نواز خاں نے مخبری کی۔ لیکن مولانا حسین احمد مدنی کا خیال تھا کہ افغانستان کے امیر حبیب اللہ خاں اور ان کے تیسرے بیٹے امانت اللہ خاں اس سازش کی اطلاع خفیہ طور سے برابر انگریزوں کو دیتے رہتے تھے۔ غداری کرنے والوں میں مولوی عزیز گل، مولوی چاند پوری قندھا کے ایک مولوی اور چک وال کے ایک مولوی کا بھی نام لیا جاتا ہے۔

★

REGD. No. LW/NP

دہلی۔ اسبادقومی شاہراہ پر درختوں کی دو رویہ قطار۔

نیا دور

جلد ۲۹ نمبر ۱۲

پھالگن ۱۸۹۵ اشک
مارچ ۱۹۷۴ء

چندہ سالانہ: پانچ روپے
فی پرچہ: پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
شرومنی شرما
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

پرنٹر
اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یو۔پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو

اپنی بات

اترپردیش میں فروری ۱۹۷۴ء کے عام انتخابات کے نتیجے میں کانگریس کو ایک بار پھر اکثریت حاصل ہوئی اور شری ہیم وتی نندن بہوگنا کی قیادت میں ۱۱ رکنی وزارت نے ۵ مارچ ۱۹۷۴ء کو راج بھون لکھنؤ میں حلف لیا۔ شری بہوگنا اترپردیش کے دوبارہ وزیر اعلیٰ ہوئے ہیں۔ پہلی بار پنڈت کملاپتی ترپاٹھی کے مرکز میں چلے جانے کے بعد پردیش کی کانگریس لیجسلیچر پارٹی کے لیڈر منتخب ہوئے تھے اور ان کی قیادت میں کابینی وزراء، وزرائے ریاست اور نائب وزرا پر مشتمل ۳۵ رکنی وزارت کا قیام ۸ نومبر ۱۹۷۳ء کو عمل میں آیا تھا۔ شری بہوگنا نے جس وقت پردیش کی قیادت سنبھالی یہ زبردست بحرانی حالات سے دوچار تھا۔ اس پر مستزاد عام انتخابات تھے جو بالکل سر پر آگئے تھے۔ پنڈت کملاپتی ترپاٹھی کے مرکز میں جانے کے بعد پردیش کی قیادت ایسے ہاتھوں میں دینے کی ضرورت تھی جو ان حالات کا مقابلہ ہمت و پامردی اور دور اندیشی کے ساتھ کر سکے نیز جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرزم پر عوام کے اعتماد و یقین کو جس میں کمزوری سی پیدا ہو رہی تھی نہ صرف بحال کر سکے بلکہ اسے مستحکم تر بنا سکے۔ یہ شریمتی اندرا گاندھی کی جوہر شناس نظر ہی تھیں جنھوں نے اترپردیش کی قیادت کے لیے شری ہیم وتی نندن بہوگنا کا انتخاب کیا۔ بہوگنا جی کے جوہر بحران ہی میں کھلتے ہیں جس کا ثبوت اس سے قبل متعدد بار مل چکا ہے۔ چنانچہ ملک و قوم کے اس سچے خادم، آزمودہ کار جنرل اور فعال شخصیت نے آگے بڑھ کر اس ذمے داری کو اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا اور وہ پردیش کو مشکلات کے دلدل سے باہر نکالنے اور عوام کے دکھ درد کو کم کرنے میں منہمک ہو گئے۔ تین ساڑھے تین مہینے کا وقفہ ہی کیا ہوتا ہے لیکن اس مختصر مدت میں لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ بھیانک اندھیرا نہ صرف ختم ہو گیا ہے بلکہ روشنی کے آثار بھی نمودار ہو چکے ہیں اور دلوں سے بے اطمینانی کی کیفیت دور ہونے لگی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ فروری میں ہونے والے عام انتخابات کے سلسلے میں مفاد پرستوں کی توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ اس سے قبل ان سطور میں ہم نے اس توقع کا اظہار کیا تھا کہ پردیش کے عوام اپنے تہذیبی روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے عام انتخابات کے پُرامن فضا میں مکمل کیے جانے میں نظم و نسق کا ہاتھ بٹائیں گے۔ خوشی کی بات ہے کہ انھوں نے اپنی فرض شناسی، دور اندیشی اور حالات کی نزاکت کے احساس کا ثبوت دیتے ہوئے انتخابات کے نہ صرف پُرامن فضا میں انجام پذیر ہونے میں اپنا تعاون دیا بلکہ فرقہ پرور اور رجعت پسند جماعتوں کو ٹھکرا کر یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ سوشلزم، سیکولرزم اور جمہوریت پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔

وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا

نئی کانگریس لیجسلیچر کے لیڈر منتخب ہونے کے بعد اسے خطاب کرتے ہوئے بہوگنا جی نے کہا کہ "ہم نے اس وقت ایک چھوٹی لڑائی جیتی ہے، بڑی اور اصلی لڑائی ابھی جیتنا باقی ہے اور یہ ہے عوام کے استحصال کے خلاف جنگ، غریبوں کی آنکھوں سے آنسو پونچھنے کے لیے جنگ اور پردیش سے پس ماندگی اور بے روزگاری دور کرنے کی جنگ۔" رجعت پسند، فرقہ پرور اور مفاد پرست عناصر مل کر جمہوریت کو ختم کرنے اور سوشلزم کی بنیاد کو کھوکھلا بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ متحد ہو کر ان عناصر کا مقابلہ کیا جائے اور انھیں جمہوریت نیز ملک کی آزادی سے کھیلنے کا موقع نہ دیا جائے۔ آئیے ہم سب ایک آواز ہو کر اس جنگ میں وزیر اعلیٰ اور ان کی حکومت کا ساتھ دیں اور کسی قربانی سے دریغ نہ کریں تاکہ قوم کو تیزی سے ترقی اور سوشلزم کی جانب لے جانے کے عمل کو پورا کرنے میں اترپردیش نے اپنا حصہ ادا نہیں کیا، یہ کہنے والا کوئی نہ ہو۔

● حسب سابق اس سال بھی صدر جمہوریہ شری وی۔ وی۔ گری نے یوم جمہوریہ کے موقع پر دانش وروں، سائنس دانوں، شاعروں، ادیبوں، صحافیوں، ڈاکٹروں، موسیقاروں، فلمی صنعت سے تعلق رکھنے والوں اور دیگر حضرات کو قومی اعزازات سے نوازا ہے۔ اس سال کل ۸۴ اعزازات مختلف شعبہائے زندگی میں امتیازی خدمات انجام دینے کے سلسلے میں دیے گئے ہیں۔ ان میں ۴ پدم وبھوشن کے، ۲۱ پدم بھوشن کے اور ۵۹ پدم شری کے اعزازات ہیں۔ ملک کا سب سے بڑا قومی اعزاز اس سال بھی کسی کو نہیں ملا ہے۔

اترپردیش نے علم و ادب، ثقافت و فنون لطیفہ اور صحافت کے میدانوں میں ہمیشہ امتیازی خدمات انجام دیے ہیں اور اس کا اعتراف بھی قومی اعزازات میں حصہ دے کر کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ اس سال بھی ادب، شاعری، صحافت، سائنس، فنون لطیفہ، دست کاری، تعمیرات اور سماجی خدمت کے شعبوں میں نمایاں اور امتیازی حیثیت حاصل کرنے کے سلسلے میں پدم بھوشن اور پدم شری کے اعزازات سے لوگوں کو نوازا گیا ہے۔ ان قومی اعزاز حاصل کرنے والوں میں اردو کے ممتاز صحافی عشرت علی صاحب صدیقی، مشہور ادیب و افسانہ نگار قاضی عبدالستار اور نامور شاعر کیفی اعظمی شامل ہیں جنھیں پدم شری کے اعزازات ملے ہیں۔ عشرت صاحب کا شمار اردو کے ممتاز صحافیوں میں ہوتا ہے۔ آپ ایک متوازن، پرخلوص اور صاحب الرائے صحافی کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ آپ کے قلم میں زور اور تحریر میں وزن ہوتا ہے۔ یہ زور اور یہ وزن آتش نوائی اور آتش بیانی کی وجہ سے نہیں ہوتا کیونکہ یہ عشرت صاحب کی طبیعت کے منافی ہے۔ آپ کی تحریروں میں زور، کشش اور وزن آپ کی معاملہ فہمی، نکتہ رسی، خلوص و صداقت اور بات کو جچے تلے انداز میں بے لاگ طریقے سے کہہ دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ عشرت صاحب کا تعلق صحافت کی دنیا سے بہت پرانا ہے اور روزنامہ قومی آواز لکھنؤ سے تو آپ ابتدا ہی سے وابستہ ہیں۔ شروع میں آپ اس کے جوائنٹ ایڈیٹر رہے اور حیات اللہ انصاری صاحب کے سبک دوش ہو جانے کے بعد آپ نے قومی آواز کی ادارت سنبھال لی ہے۔

قاضی عبدالستار صاحب شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریڈر ہیں۔ آپ ایک ممتاز ادیب، ناقد اور افسانہ نگار ہیں۔ ادب و تنقید کی خدمت آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔ اردو شاعری میں قنوطیت پر آپ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے۔ جدید تنقیدی قدروں سے اردو کے دامن کو پُر کرنے اور اردو افسانوں کو جدید تکنیک سے روشناس کرنے اور اسے کامیابی کے ساتھ برتنے میں آپ ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔

کیفی اعظمی کا شمار ملک کے نامور شعرا میں ہوتا ہے۔ اگرچہ آپ نے خود کو فلمی صنعت سے وابستہ کر لیا ہے لیکن ان کی شاعری کا خصوصی موضوع قومی یک جہتی، اتحاد، وطنیت اور سوشلزم کا فروغ ہے۔ آپ اعظم گڑھ کے مردم خیز ضلع کے رہنے والے ہیں ویسے فلمی صنعت سے تعلق کے باعث آپ کا قیام بمبئی میں رہتا ہے۔

ہم جناب عشرت علی صاحب صدیقی، قاضی عبدالستار صاحب اور جناب کیفی اعظمی کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ہم ان تمام حضرات کی خدمت میں بھی مبارک باد پیش کرتے ہیں جنھیں قومی اعزازات سے نوازا گیا ہے۔

پروفیسر امجد نجمی مرحوم

اردو کے مشہور اور کہنہ مشق شاعر پروفیسر امجد نجمی (کٹک)، جن کی ذات گرامی نے اڑیسہ جیسے غیر اردو علاقے میں شعر و ادب کے ذوق کو نہ صرف بیدار کیا بلکہ پروان بھی چڑھایا، یکم فروری ۱۹۷۴ء کو انتقال فرما گئے۔ آپ کا سانحۂ ارتحال اردو دنیا کے لیے ایک عظیم حادثہ ہے۔ آپ کے دو شعری مجموعے طلوع سحر اور جوئے کہکشاں منظر عام پر آ کر ارباب ادب سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ادارہ نیا دور اس سانحہ میں پسماندگان اور اردو دوست اور ادب نواز حضرات سے اظہار تعزیت کرتا ہے۔

ایڈیٹر

مارچ ۱۹۷۴ء

پھاگن ۱۸۹۵ شک

غزل

فضا ابن فیضی

دیکھ یہ شوخی، طلسم دل کشا میں بند ہوں
بوئے گل ہوں اور زندانِ صبا میں بند ہوں

میری ہستی بھی ہے اِک دیباچہ اس کی ذات کا
میں وہ بیگانہ ہوں ذہنِ آشنا میں بند ہوں

باہر آؤں تو کریدوں سوختہ لمحوں کی راکھ
میں ابھی تو جلتے ساون کی گھٹا میں بند ہوں

صرصرِ آشوبِ دنیا کیا بجھائے گی مجھے
ہوں چراغ ایسا کہ فانوسِ ہوا میں بند ہوں

دیکھ اک تک چھوڑتے ہیں راستہ پیچھا مرا
منزلوں کا حوصلہ ہوں، نقشِ پا میں بند ہوں

قید سے چھوٹوں جو اس پنجرے کا دروازہ کھلے
کتنی صدیوں سے میں جینے کی سزا میں بند ہوں

لوگ پھر بھی بے جہت ہوتے نہیں میری طرح
سب ہیں بکھرے بکھرے میں کنجِ انا میں بند ہوں

مجھ سے ملنا ہے تو پھر مجھ پر کوئی تیشہ اُچھال
دیر سے میں سینۂ سنگِ نوا میں بند ہوں

میرے ہونے پر نہ ہونے کا ہے دنیا کو گماں
زندگی، یہ میں کس آغوشِ فنا میں بند ہوں

سر سے پا تک ہوں خود اپنی نارسائی کا طلسم
میں صدا ہو کر بھی حرفِ نارسا میں بند ہوں

مجھ کو پیارے اس فصیلِ کہنہ سے باہر نہ ڈھونڈھ
خواب ایسا ہوں کہ چشمِ ارتقا میں بند ہوں

اس زمیں سے ہے مرا رشتہ برائے نام سا
میں وہ سیارہ ہوں پہنائے خلا میں بند ہوں

کیا مجھے دیں گے رہائی یہ زمانے کے یزید
سیکڑوں صدیوں سے دشتِ کربلا میں بند ہوں

وقت کے نقار خانے میں مری آواز کیا
اس لیے چپ ہوں کہ تمہ کوہِ ندا میں بند ہوں

یہ قبا ہو چاک تو پائیں مرا کچھ بھید لوگ
ہوں بدن اپنا مگر تیری قبا میں بند ہوں

ہمنشیں ٹھہرے لہو کے رنگ، دکھ کی خوشبوئیں
میں یہاں جیسے گزرگاہِ حنا میں بند ہوں

گیسوؤں کی چھاؤں مجھ کو عمر بھر ڈھونڈھا کیے
میں لب و عارض کی چمکیلی فضا میں بند ہوں

بال مکند عرش ملسیانی

غالب نے حاتم علی مہر کو ایک خط میں لکھا ہے کہ "اپنی معشوقہ کے مرنے کا اتنا غم نہ کرو۔" چنانچہ اس خط کا یہ فقرہ تو ضرب المثل ہے کہ "چنا جان نہ سہی منا جان سہی۔" گویا غالب اس بات کے قائل نہ تھے کہ ایک ہی کے ہو رہو ایک نہیں تو دوسری سہی۔ اس کے برعکس خود لکھتے ہیں کہ جوانی میں وہ کسی ڈومنی کو دل دے بیٹھے تھے لیکن جب وہ عین عالم شباب میں جاں بحق ہو گئی تو پھر کسی سے عشق نہیں کیا۔ اس سلسلے میں ان کی ایک غزل "پردہ داری ہائے ہائے" کو نقادوں نے اسی ڈومنی کا مرثیہ قرار دیا ہے واللہ اعلم بالصواب۔ نقاد اور بالخصوص محقق اس پہلے تو گو رکنی تک پہنچتے ہیں۔ اس غزل کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

تیرے دل میں گو نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے

کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل تس پر یہ نا امیدواری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

صاف نظر آتا ہے کہ غالب کے دل پر چوٹ لگی ہے اور چوٹ بھی گہری۔ ردیف کا انتخاب بھی گریہ و زاری کا ترجمان ہے۔ معشوقہ کے کردار کی بلندی بات بات سے نمایاں ہے اور اس سے اپنی نگاہِ محبت شناس کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ یعنی دور جوانی کے اس ایک واقعہ کو لے کر ہم غالب کے تصورِ عشق کی حدیں متعین نہیں کر سکتے۔ ان کی ساری شاعری میں پھر اس قسم کا کوئی مرثیہ نہیں۔ کوئی واسوخت نہیں۔ ان کے خطوط میں کہیں اور ایسا اشارہ

نہیں ملتا جس سے پتہ چلے کہ عشق کی چنگاری پھر دل میں جل اٹھی ہو۔ ایسا ہوتا تو نہ جانے کیا گل کھلتے۔ صرف کلکتے جا کر نازنینانِ پری چہرہ کو دیکھ کر چیخ اٹھے تھے —

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

لیکن یہ محض تفنن کی بات ہے۔ دل لگی ہے دل کی لگی نہیں۔ جو شخص عنفوانِ شباب میں اتنا حساس تھا آگے چل کر کس طرح سنبھل گیا۔ اس راز کو کون جانے۔ لوہارو خاندان میں شادی ہوئی۔ یہ لوگ ثقہ لوگ تھے۔ خاندانی شرافت اور وضعداری مانع رہی ہوگی۔ زیادہ کھل کھیلنا معیوب نظر آنے لگا ہوگا لیکن جام دنیا کا شغل تو رہا۔ وہ سرمایۂ رسوائی کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔ اب ان کا کلام ہی ایک ایسا آئینہ ہے جو ان کے تصورِ عشق پر کچھ روشنی ڈال سکتا ہے۔

اس کلام میں ہوا و ہوس کے شعر بھی ہیں عشق کی بلندی بھی۔ محبوب سے چھیڑ چھاڑ، کبھی سوقیانہ اور کبھی والہانہ۔

پہلے ہوا و ہوس اور سوقیانہ مذاق کے اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو یہ خو کہیں
دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کیے

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کے عذرِ مستی ایک دن

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اسد خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
...

ان اشعار سے نہ عاشق کے آئینِ عشق میں بلندی نظر آتی ہے اور نہ ہی محبوب کا کردار اونچا اور اعلیٰ نظر آتا ہے لیکن ایسے اشعار غالب کے یہاں خال خال ہیں۔ اس کے آئینِ عشق میں بڑی وضعداری اور محبوب کے کردار میں بڑی بلندی ہے۔

تھی جو اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں

اس کی شاعری کی تمام رعنائیوں کا انحصار محبوب کے تصور پر ہے۔ وہ نہیں تو ساری شاعری ہیچ پوچ ہے۔ یہ شعر اس کے تصورِ عشق کی سچی تصویر اور اس کے ذوقِ تخیل کا صحیح آئینہ ہے۔ محبوب کا تصور ہو یا دیدار غالب کے لئے باعثِ انبساط و فرحت ہے۔ یہاں تک کہ اس کے چہرے پر جو خوشی محبوب کو دیکھ کر رقص کرتی ہے وہ اس کی کاہشِ جاں کو چھپا لیتی اور اس کی پردہ پوش ہو جاتی ہے۔

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ایسا نفسیاتی مطالعہ اور وہ بھی اپنی ذات سے کسی نے کم کیا ہوگا۔ اب ان اشعار میں محبوب کے مرتبے کی شان جلال دیکھیے۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

(پاسِ ادب)

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

(عتابِ خاص)

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

(احترازِ تعلق)

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

(استغنائے محبوب)

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تیری عادت ہی سہی
(تسلیم و رضا)

گو غالب کے یہاں کوئی منظم تصور یا فلسفۂ عشق پانا مشکل ہے۔ عام شعرائے فارسی و اردو کی طرح وہ بھی مختلف کیفیتوں کا اظہار مختلف صورتوں سے کرتے ہیں۔ لیکن رکاکت اور ابتذال ان کے یہاں ماسوا ان ابتدائی مثالوں کے شاید ہی کہیں اور ملے۔ ان کے یہاں تضاد خیالی ضرور پائی جاتی ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی دردِ بے دوا پایا

لیکن اسی سانس میں وہ فرماتے ہیں۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

غالب کی یہ ہمہ جہت طبیعت کی کارفرمائی ہی تو ہے کہ جس عشق سے زیست کا مزہ باقی ہے وہ اسی کو دماغ کا خلل بھی کہتے ہیں۔

خندہ ہائے گل کو خندہ ہائے بے جا بھی کہا ہے۔ خود اپنی نازک طبعی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دے
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

کتنا نفسیاتی شعر ہے۔ عاشق ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتا۔ پھولوں کی ہنسی بھی عشق میں اسے بے جا نظر آتی ہے۔ غالب کبھی کبھی عشق میں مجبور و معذور ہو کر چیخ اٹھتے ہیں۔

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

لیکن ان کے یہاں عاشق کے عزتِ نفس اس کی خودداری اور اس کا انا جگہ جگہ نمایاں ہے۔ یہ ان کا مقتضائے طبیعت ہے۔

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں   کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی   کیوں ترا راہ گذر یاد آیا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو   اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

تو اور آرائشِ خمِ کاکل   میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

واں وہ غرورِ عز و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

تم وہ نازک کہ خموشی کو بھی فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

تمھیں کہو کہ گزارہ صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

جی ڈھونڈتا ہے پھر اسی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

ان تمام اشعار میں غالب نے عشق کی مختلف کیفیتوں کی تصویر کشی کی ہے اور خوبی یہی ہے کہ کہیں نہ عاشق کی تذلیل ہے نہ محبوب کی۔ طنز طعنہ یا نوک جھونک تو ایک فطری امر ہے۔ محبت میں یہ بھی نہ ہو تو اس میں لطف کیا رہا۔ عاشق کی نازک مزاجی کا بیان ہے۔ علو نفس کا ذکر ہے اور رجائیت تو جگہ جگہ ٹپکی پڑتی ہے۔ مثلاً کچھ تو پیغام زبانی اور ہے یا اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے۔ غالب کے طنز کا تیکھا پن اس کا دھیما لہجہ اور دلی کسک کا اظہار کچھ اس انداز سے ہوتا ہے کہ کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ تقدیس عشق پر حرف آئے۔ کبھی اس کا یہ تصور فلسفیانہ گورکھ دھندا بھی بن جاتا ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز   میں ہوں اپنی شکست کی آواز

کبھی سادگی میں پرکاری دکھاتا ہے۔

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر   فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے
غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

آخری دونوں شعر بظاہر سادہ مگر معنی کے لحاظ سے گلستاں بکنار ہیں کیا مصرع کہا ہے ع لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
غالب سے ایسے صاف فصیح اور زبان کے رنگین مصرعے کی کم امید ہو سکتی ہے۔ اس کی بنیاد فارسی شاعری پر ہے اور وہ بقول خود فارسی کا ہی ذوق مبداء فیاض سے لایا تھا۔ دلی کی بولی ٹھولی اس کے اور اشعار میں بھی کم ہے اس نے اس بولی ٹھولی کو اپنی فارسیت سے ایک نیا اور پُر لطف لہجہ دیا ہے دوسرا شعر اس کی مثال ہے۔ بات سادہ اور معانی کا ایک بحر ذخار۔

غالب اپنے تصور عشق میں کوئی خاص تنظیم تو داخل نہ کر سکا گو تا گونی میں البتہ اس نے ایک حسن خاص بھر کر یک رنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ عشق کے مضامین بیان کرتے کرتے جب سطحیت سے اونچا اٹھتا یا گہرا جاتا ہے تو تصوف کی دنیا بساتا ہے۔

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر   یاں کیا دھرا ہے قطرۂ موج و حباب میں

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستی اشیاء مرے آگے

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

ہاں کھائیو مت فریب ہستی   ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

غالب کے چند ایسے شعر ملاحظہ فرمائیں جن میں اس کی ذات کی بلندی اور عشق کا والہانہ پن ظاہر ہوتا ہے۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

ایسا ہی مضمون غالب کے یہاں فارسی میں بھی موجود ہے۔

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم
گر بہ موج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

ہم چنیں بیگانہ زی با من دل و جان کسے
بد گماں کردم اگر دانم کہ می دانی مرا

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

غالبؔ کسی رنگ کا شعر کہیں رندانہ ہو، محاکاتی ہو یا زندگی کی کش مکش سے متعلق ہو اس سے عشق و محبت کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نمودار ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ غالبؔ کا کوئی منظم پیغام عشق نہیں لیکن شعر برائے شعر گفتن بھی ان کا شیوہ نہیں۔ اگر ان کی صرف ایک غزل "انتظار ہوتا"، "وصالِ یار ہوتا" دیکھی جائے تو اس ایک غزل میں ہی عشق و محبت کا فلسفہ اور زندگی کے حقائق پر ایسی نکتہ سرائی ہے جس کا جواب نہیں مناسب تو نہیں کہ اشعار پر اشعار اقتباس کے طور پر پیش کیے جائیں لیکن موضوعِ مضمون سے ناانصافی ہوگی اگر یہ چند اشعار مضمون میں درج نہ کیے جائیں۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ایسے اشعار جس نے کہے اور ایسا بلند تصورِ عشق و محبت پیش کیا کہ زندگی کے رموز بھی کھول ڈالے تو اس کی بادہ خواری اس کے ولی ہونے میں حائل نہیں ہونی چاہیے۔ غالبؔ ولایتِ شعر کا ولی تھا۔ ہمیں یہ ماننا پڑے گا۔

★

غزل

نواب فرخ حیدر فرخ

کیوں چھوڑ دی تم نے مشقِ ستم کیوں دل کا ستانا بھول گئے
بیمار تمہاری الفت کا پابندِ الم رہتا ہے سدا

کیوں چلتے نہیں اب تیرِ نظر کیا اپنا نشانا بھول گئے
وہ موت کے ہاتھوں مٹ نہ سکا تم جس کو مٹانا بھول گئے

ہو شوق کا جس دم سیلِ رواں کھلتی ہے بھلا پھر کس کی زباں
بیتابیٔ دل تیرا ہو برا کچھ کام نہ اپنا تجھ سے بنا

دنیا کے فسانے اُن سے کہے اک اپنا فسانا بھول گئے
وہ پوچھنے آئے حالتِ دل ہم اُن کو بتانا بھول گئے

گردش نے زمانے کی فرخؔ یہ رنگِ طبیعت بدلا ہے
یا آٹھ پہر کے جلسے تھے یا ہنسنا ہنسانا بھول گئے

رشید الدین

مولانا محمد حسین آزاد — ایامِ دیوانگی میں

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کی شخصیت اردو ادب میں کئی حیثیتوں سے اہمیت کی حامل ہے۔ وہ ذوق کے ایک ممتاز شاگرد تھے۔ خود بھی ایک شاعر تھے۔ روایتی انداز کی غزلیں لکھنے کے علاوہ اردو میں جدید نظم نگاری کی بنیاد ڈالنے والوں میں سے تھے۔ ایک ماہر تعلیم اور عالم تھے اور سب سے بڑھ کر وہ ایک صاحب طرز نثر نگار تھے۔ اردو نثر میں ان کی کتابیں۔ آب حیات، نیرنگ خیال اور دربار اکبری، لافانی ہیں۔ ان میں سے اوّل الذکر کتاب شاعروں کا تذکرہ ہے اور باوجود اپنی چند کوتاہیوں کے تذکرے اور تنقید کے باب میں اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔ دوسری کتاب مختلف مضامین کا مجموعہ ہے اور آخر الذکر کتاب اکبر اعظم سے متعلق ہے۔ اس کا موضوع تاریخی اور خشک ہونے کے باوجود یہ آزاد کی طرز تحریر کی وجہ سے بے حد دلچسپ بن گئی ہے۔

آزاد دلّی کے رہنے والے تھے لیکن جوانی کے بعد ان کا پورا زمانہ لاہور میں گزرا اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ وہ ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ۹ محرم ۱۳۲۸ھ کو لاہور میں انتقال کیا۔ اس طرح ان کی عمر ۸۲ سال ہوتی ہے۔ اس میں سے ان کے آخری بائیس سال دیوانگی کے عالم میں گزرے۔ ان کے والد مولوی محمد باقر دلّی کے ایک معزز آدمی تھے۔ ان کا اپنا ذاتی پریس تھا اور وہ ہفت روزہ "اردو اخبار" کے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر اور مالک تھے۔ اس اخبار کو اردو کا پہلا اخبار ہونے کا بھی حق حاصل ہے۔ دلّی کالج کے انگریز پرنسپل ٹیلر صاحب سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے اور یہی ان کی موت کا باعث ہوئے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء میں باغیوں نے ٹیلر کو باقر صاحب کے گھر سے برآمد کر کے قتل کر دیا۔ بعد میں کرنل ہڈسن نے انھیں ٹیلر کو باغیوں کے حوالے کر دینے کے جرم میں پھانسی کی سزا دی۔

جب والد کا انتقال ہوا اس وقت آزاد کی عمر صرف ۲۷ سال تھی۔ وہ پریشان حال دلّی سے نکل کھڑے ہوئے۔ اور پھرتے پھراتے لاہور پہنچ گئے۔ وہاں ماسٹر پیارے لال کی سفارش پر انھیں محکمۂ تعلیمات میں ملازم رکھ لیا گیا اور ان کے سپرد ابتدائی جماعتوں کی نصابی کتابوں کی تیاری کا کام کیا گیا۔ ان زمانے میں پنجاب میں برسوں آزاد کی مرتبہ ریڈریں پڑھائی گئیں۔ وہیں انھیں شمس العلما کا خطاب ملا اور وہیں سے سارے ملک میں ان کی انشا پردازی کی دھاک بیٹھی۔ وہیں انھوں نے جدید طرز کی نظمیں لکھیں اور ان کے گرد معتقدین اور شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ جمع ہو گیا۔

ویسے تو آزاد کی پوری زندگی ہی کلفتوں اور پریشانیوں میں بسر ہوئی لیکن جب ان کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی تو اس وقت ان کی جوان بیٹی کا انتقال ہو گیا۔ آزاد اسے بے حد چاہتے تھے۔ اس سانحہ سے ان کے دل و دماغ پر ایسا اثر ہوا کہ وہ دیوانے ہو گئے اور مرتے دم تک یہی حالت رہی۔ لیکن نے

آبِ حیات" میں بیسیوں شعرا کے تذکرے لکھے تھے، اسے کیا معلوم تھا کہ ایک دن لوگ اس کا بھی تذکرے لکھیں گے اور وہ بھی دیوانگی کا لیکن آزاد بہرحال آزاد تھے۔ چاہے وہ سیانے ہوں یا دیوانے۔ اس لیے ان کی دیوانگی کے حالات قلمبند کرنا بھی ضروری ہیں۔ آزاد نے چونکہ عالمِ دیوانگی میں اپنی زندگی کا کافی عرصہ گزارا اس لیے اس کا مطالعہ بھی کرنا ہوگا اور یہ مطالعہ دلچسپی اور افادیت سے خالی نہیں ہے۔

آزاد کی دیوانگی ایسی نہ تھی کہ لوگوں کو پتھر مارتے پھریں یا گریبان چاک کرکے گالیاں بکیں بلکہ ان کی حالت ایک مجذوب کی سی تھی جو اپنے آپ میں رہتا ہو اور خود سے باتیں کیے جاتا ہو۔ کمال تو یہ ہے کہ وہ اس زمانے میں بھی لکھنے لکھانے سے غافل نہیں رہے اور سینکڑوں صفحے سیاہ کر ڈالے مگر سب گفتگو کی طرح بے ربط اور اوٹ پٹانگ، جو بھی لکھتے اسے شطرنجی کے نیچے چھپا کر رکھ دیتے اور کسی کو بتاتے نہیں تھے۔ عالمِ دیوانگی میں وہ یہ کہا کرتے تھے کہ "میں روحوں کو بلاتا ہوں اور ان سے باتیں کرتا ہوں۔" اسی زمانے میں کچھ انسان کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ وہ راجہ اندر ہیں اور ان کے اطراف پریوں کا جمگھٹا ہے۔ آزاد عالمِ دیوانگی میں کچھ ملا تو کھا لیتے تھے ورنہ کبھی کسی سے کچھ مانگتے نہیں تھے۔ کسی کو تکلیف بھی نہیں دیتے تھے۔ آپ ہی آپ کچھ بڑبڑاتے رہتے تھے۔ کچھ پوچھا جائے تو اُلٹا سیدھا جواب دے دیتے تھے۔

ایک بار جب دیوانگی کا زور بڑھا تو کسی سے کچھ کہے سنے بغیر گھر سے غائب ہو گئے۔ ان کے لڑکے محمد ابراہیم نے بہت تلاش کیا لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ ان کے بچپن کے دوست شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ کو بھی دلی اطلاع کرائی گئی۔ وہ بھی سن کر پریشان ہوئے۔ کوئی چھ ماہ بعد ایک دن مولوی صاحب نے کیا دیکھا کہ آزاد ان کے دروازے پر موجود ہیں۔ وہ لاہور سے نکل کر پا پیادہ پتہ نہیں کہاں کہاں گھوم کر دلی پہنچے تھے اور سیدھے اپنے دوست کے گھر آ گئے تھے۔ انھوں نے فوراً منہ ہاتھ دھلوایا، کھانا کھلایا اور لاہور اطلاع کرائی کچھ دن بعد ان کے فرزند آ کر پھر لاہور لے گئے۔

دلی کے اس قیام کا ایک دلچسپ واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ ایک بار وہ باہر سے گھوم گھام کر واپس آئے تو دیکھا کہ نائی ان کے دوست منشی ذکاء اللہ کی داڑھی بنا رہا ہے۔ انھوں نے یہ کہہ کر نائی کو ایک طرف کر دیا کہ "یہ کیا خط بنائے گا۔" اور خود استرا لے کر بیٹھ گئے اور منشی صاحب کا شیو بنانا شروع کر دیا۔ اس اثنا میں منشی صاحب کے ایک شناسا ان کے گھر آ گئے اور یہ منظر دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ خدا خدا کرکے آزاد نے اپنا کام ختم کیا اور اندر کمرے میں چلے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد ان صاحب نے منشی جی سے کہا "بھئی آپ نے تو کمال کر دیا۔ استرا ایک دیوانے کے ہاتھ میں دے کر اپنا گلا اس کے سامنے کر دیا۔ اگر وہ آپ کا گلا کاٹ دیتا تو۔؟" اس پر منشی ذکاء اللہ نے مسکرا کر کہا "بھلا ایک سچا دوست کس طرح گلا کاٹ سکتا ہے۔ آزاد میرا بچپن کا دوست ہے۔ اس پر مجھے دیوانگی میں بھی بھروسہ ہے۔"

دلی میں قیام کے دوران آزاد کا ایک دلچسپ مشغلہ ذکاء اللہ کے پالتو طوطے ہیرامن سے باتیں کرنا تھا۔ منشی صاحب کے بچے آزاد کو گھیرے رہتے۔ بیچ میں طوطے کا پنجرہ ہوتا اور وہ اس سے دنیا جہان کی باتیں کرتے رہتے۔ بچے تالیاں بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے۔ پھر اس سے اکتا جاتے تو دلی میں گھومنے کے لیے نکل جاتے گھنٹوں گھومنے کے بعد پھر واپس آ جاتے اور سیدھے گھر میں کبھی نہ گھستے۔ اطلاع کراتے اور پھر آتے۔ باہر بغیر شیروانی اور شملہ کے اس زمانے میں بھی نہیں نکلتے تھے۔

لاہور آنے کے بعد ایک دن ان کے دل میں جانے کیا آئی کہ اپنی ضخیم کتاب "دربارِ اکبری" کے مسودہ کو بغل میں دبایا اور راوی کی طرف جا نکلے۔ کچھ دیر دریا کے کنارے کھڑے رہے اور مسودہ پانی کی نذر کر دیا۔ ان کی عادت تھی کہ ایک تحریر کو بار بار لکھتے تھے۔ اس طرح "دربارِ اکبری" کے بھی کچھ نسخے ناصاف (رف) حالت میں موجود تھے۔ بعد میں ان ہی کاغذوں کو ترتیب دے کر آٹھ سو صفحوں کی موجودہ دربارِ اکبری زیورِ طبع سے

آراستہ کی گئی۔ اس طرح آزاد کی بار بار لکھنے کی عادت کی وجہ سے اردو زبان ایک اچھی کتاب سے محروم نہ ہونے پائی۔

دربارِ اکبری ان کے شاگرد رشید ممتاز علی نے اپنے مطبع میں شائع کرائی تھی اور بڑی مشکل سے شائع کرائی تھی۔ کیونکہ کسی صورت میں بھی دیوانگی کی حالت میں آزاد اس کی طباعت کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ایک دن ممتاز علی صاحب نے زیادہ مجبور کیا تو انھوں نے سختی سے جواب دیا! "ممتاز! کیا تم چاہتے ہو کہ میں بادشاہ اور ان کے مصاحبین کی ہڈیاں فروخت کر دوں۔ میرے پاس اپنے اسلاف کا یہی ایک سرمایہ ہے۔ اور میں اس سے پیسہ کمانا نہیں چاہتا۔" یہ جواب سن کر وہ بھی خاموش ہو گئے۔ مگر بعد میں نہ جانے کیا دل میں آئی کہ اس کی طباعت کی اجازت دیدی۔ جب کتاب پریس میں چھپ رہی تھی تو بعض وقت وہاں پہنچ بھی جاتے۔ لیکن دماغی حالت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ یہ احساس جاتا رہا تھا کہ یہ ان کی کتاب ہے۔ اور اسے انھوں نے بڑی چاؤ سے لکھا ہے اور اب یہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو رہی ہے۔

ان کے مرنے کے بعد جب ان کی دیوانگی کے زمانے کے مسودے جمع کئے گئے تو ان کی تعداد کئی سو تک جا پہنچی۔ مگر ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہ تھا کہ اس میں کوئی تُک کی بات ہوتی۔ خدا جانے وہ کیا لکھنا چاہتے تھے۔ اور قلم سے کیا نکلتا تھا۔ تاہم ایک بات ضرور تھی کہ ان تحریروں میں بھی ان کا مخصوص اسٹائل موجود تھا۔

کہتے ہیں کہ عقل کی دیوانگی ہوتی ہے۔ یقیناً آزاد کے معاملے میں ایسا ہی ہوا۔ وہ ایک انتہائی ذہین اور عقلمند انسان تھے۔ ان کی یہی ذہانت ان کی دیوانگی کا باعث بنی۔ ورنہ وہ ایسے آدمی ہرگز نہیں تھے کہ ایک لڑکی کی موت سے پاگل ہو جاتے۔ جس شخص نے غدر کا ہنگامہ دیکھا، اپنے باپ کو پھانسی پر لٹکتے دیکھا، پردیس میں مصیبتیں جھیلیں وہ بھلا ایک لڑکی کی موت پر کیا حواس کھو بیٹھتا؟ بہر حال ان کی دیوانگی کی وجہ خواہ کچھ ہو، یہ ضرور ہے کہ اس کی وجہ سے اردو زبان و ادب کا بڑا نقصان ہوا۔ ورنہ اس بیس بائیس سال میں کیا کیا نثر پارے آزاد کے قلم سے نکلتے اور ہماری زبان و ادب (خصوصاً نثر) کا دامن مالا مال کر دیتے۔

★

قطعۂ تاریخ وفات

شاعرِ عظیم حضرت سلام مچھلی شہری اور ماہرِ فنِ عروض علامہ ابرار حسنی گنوری

★ —— ثمر کاکاروی

چل بسے حضرت سلام ثمرؔ — اٹھ گئے حیف ابرؔ ماہرِ فن
بزمِ اردو بہت اداس آج — اور افسردہ ہو زباں کی پھبن
کوئی دیکھے تو رفعتِ پرواز — ہیں بہشت آشیاں ہمارے سخن
تا دمِ واپسیں اگلتے رہے — باغِ اردو میں یاسمین و سمن
کیوں نہ تاریک ہو مری محفل
بجھ گئے وہ چراغِ بزمِ سخن
۱۹۷۳ء

حضرت علامہ ابرار حسنی گنوری مرحوم

چل بسا محفلِ سخن سے آہ
ابرؔ سا کُل عروض کا ماہر
گفت ہاتف سنِ وصالِ ثمرؔ
اٹھ گیا۔ کُل عروض کا ماہر
۱۳۹۳ھ

★

آئینۂ افکار

حیات وارثی

ہم اپنی وفاؤں کا صلہ مانگ رہے ہیں
خودکردہ گناہوں کی سزا مانگ رہے ہیں

وہ لوگ نہیں ہے جنھیں جینے کا سلیقہ
ماحول بدلنے کی دُعا مانگ رہے ہیں

تم غم کے چراغوں کی لویں اور بڑھا دو
آئینۂ افکار جِلا مانگ رہے ہیں

مرجھانے لگے ہیں تپش لطف و کرم سے
ہم پھر سے تغافل کی گھٹا مانگ رہے ہیں

تڑپیں گے وہ باہوں میں اندھیروں کی سحر تک
خود شمع بجھا کر جو ضیا مانگ رہے ہیں

حیرت ہے حیاتؔ آج مجھے موت کے تا حد
کیوں امن کی گھبرا کے دعا مانگ رہے ہیں

لباسِ گُل

عبرتؔ بہرائچی

کسی کی یاد میں جو بے قرار گزری ہے
وہی تو رات مری خوشگوار گزری ہے
نظر سے آہ مری بے قرار گزری ہے
قبائے گل کی طرح تار تار گزری ہے
کہاں سے خار بچائے گلوں کے دامن کو
چمن سے برق جو ترتیب وار گزری ہے
طلسم ہوش ربا ہے تری نظر اے دوست
کبھی جگر تو کبھی دل کے پار گزری ہے
پنہا دیا ہے ہر اک خار کو لباسِ گل
کچھ اس ادا سے نسیم بہار گزری ہے
لبوں کا سرِ تبسم وہ دیکھتے کیسے
جب ان کو آہ مری ناگوار گزری ہے
وہ یاد جس کا تعلق نہ تھا مرے دل سے
وہ یاد دل سے مرے بار بار گزری ہے
کبھی چمن کو جو دیتی تھی عزمِ نو کا پیام
وہی نسیمِ گلِ تر پہ بار گزری ہے
ضرور چھو کے ہے آئی کسی کے عارض کو
نسیم یونہی نہیں مشک بار گزری ہے
بِنا پڑی تھی محبت کی جس سے اے عبرتؔ
وہی نگاہِ کرم دل پہ بار گزری ہے

سید محمود نقوی

بعض حقیقتیں بھی اس قدر عجیب وغریب ہوتی ہیں کہ ان پر یقین کرتے ہوئے کچھ پس وپیش ہوتا ہے مگر دستاویزی ثبوت شک وشبہ کی گنجائشوں کو ختم کر دیتے ہیں اور واقعہ سخت ہونے کے باوجود عقل وفہم کو تسلیم لانا ہی پڑتی ہے۔ مختلف حوالے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اودھ کے آخری تاجدار اور انیسویں صدی کے سب سے زیادہ پُرگو شاعر جان عالم محمد واجد علی شاہ اختر نے زمانۂ ولی عہدی میں بلکہ اس سے بھی قبل کچھ مثنویاں لکھی تھیں اور وہ اسی زمانے میں شائع بھی ہو گئی تھیں مگر ان مثنویوں کا ایک بھی نسخہ کسی کتب خانے یا لائبریری میں دستیاب نہیں۔ اور اس حقیقت سے آگہی کہ واجد علی شاہ کی طبیعت میں رنگینی اور مزاج میں نفاست تھی اور وہ اپنی تصنیفات کافی اہتمام سے تیار کرواتے تھے، معاملے کو اور پیچیدہ بنا دیتی ہے کیونکہ اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ابتدائی تصنیفات کے ساتھ یہ اہتمام نہ کیا گیا ہو۔ ان ہی وجوہ سے مطبع سلطانی سے مدو علی کے زیر اہتمام مطبوعہ نسخے کو عموماً دریائے تعشق کا پہلا ایڈیشن سمجھا جاتا رہا۔ یہ نسخہ زمانۂ شاہی میں شائع ہوا کیونکہ اس کے سرورق کی پیشانی پر دو سطروں میں بادشاہ کا نام مع القاب درج ہے:

" مثنوی ہذا تصنیف مبارک حضرت ابو المنصور ناصر الدین سکندر جاہ بادشاہ عادل قیصر زماں سلطان عالم محمد واجد علی شاہ اودھ غازی خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ مسمی بہ دریائے تعشق "

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ نسخہ سال جلوس یعنی ۱۲۶۳ ہجری مطابق ۱۸۴۷ء کے بعد کا ہے۔ اس کے پہلے ایڈیشن کے وجود کی نشاندہی سب سے پہلے 'لکھنؤ کا شاہی اسٹیج' میں کی گئی تھی اور پھر اسی موضوع پر لکھے گئے مبسوط تحقیقی مقالے 'واجد علی شاہ کی ادبی وثقافتی خدمات' میں اس کا تذکرہ اسی حوالے کے ساتھ ملتا ہے۔ لیکن اس پہلے ایڈیشن کی تفصیلات ابھی تک منظر عام پر نہ آسکیں۔ یہ کب شائع ہوا، پہلے اور دوسرے نسخے میں فرق کیا ہے، کیا دوسرا ایڈیشن نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا یا پہلے ہی کی نقل ہے، اگر نظر ثانی کی گئی تو زبان وبیان کا فرق قابل لحاظ ہے یا محض پہلے نام، دونوں نسخوں کا فرق شعری صلاحیتوں کی ارتقاپذیری کا غماز ہے یا نہیں؟ یہ تمام پہلو اہم بھی ہیں اور توجہ طلب بھی، کیونکہ یہ تفصیلات ایک طرف واجد علی شاہ کے ذہنی سفر اور اس کی منزلوں کا پتہ دیں گی اور دوسری طرف اگر اسی کے ساتھ ساتھ ان کے اندر چھپے ہوئے فن کار کے قدم بھی آگے بڑھتے نظر آئیں تو پھر یہ حقیقت ناقابل تردید ہو جائے گی کہ واجد علی شاہ کا شعری سرمایہ ان کی اپنی تخلیق ہے کسی اور کی سخن گسترانہ کرم فرمائی نہیں۔ چنانچہ یہ تمام پہلو ہمیشہ کے لیے پردۂ خفا میں رہ جاتے اگر پروفیسر مسعود حسن رضوی اپنے ذاتی کتب خانے میں دوسری نایاب کتابوں کی طرح مثنوی دریائے تعشق کے پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ فراہم نہ کر لیتے۔ اس پہلے ایڈیشن کی دید ودریافت سے اس مثنوی کے صحیح سال تصنیف کا پتہ

ا تصنیف پروفیسر مسعود حسن رضوی صفحہ ۱۲۳ ۲ تصنیف ڈاکٹر کوکب قدر صفحہ ۲۰۰ ڈاکٹر سلیمان حسین کے تحقیقی مقالہ 'مثنویات دبستان لکھنؤ' کے صفحہ ۱۳۰ پر بھی اس کا تذکرہ اسی طرح موجود ہے۔

تو نہیں چلتا لیکن داخلی شہادتوں سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ۱۸۳۷ء کے بعد اور ۱۸۴۲ء کے پہلے منظوم کی گئی کیونکہ اس میں محمد علی شاہ کی بحیثیت بادشاہ اودھ اور امجد علی شاہ کی ولی عہد کے طور پر تعریف و توصیف کی گئی ہے اور یہی زمانہ اول الذکر کی بادشاہت اور آخر الذکر کی ولی عہدی کا ہے:

ہے شاہ زماں اودھ کا جو شاہ   قبضے میں ہے تا بہ ماہی و ماہ
فرزند کا اُس کے ہوں میں فرزند   اُس شہ کے جگر کا ہوں میں دلبند[1]

دریائے تعشق واجد علی شاہ کی دوسری تصنیف ہے اس کے پہلے وہ ایک اور مثنوی افسانۂ عشق کے نام سے منظوم کر چکے تھے جس کا تذکرہ اس دوسری مثنوی کے پہلے ایڈیشن کے سبب تالیف[2] میں بھی موجود ہے۔ لیکن افسانۂ عشق کا پہلا ایڈیشن نایاب ہی ہے اور دریائے تعشق کے پہلے ایڈیشن کا جو نسخہ موجود ہے اس کے ابتدائی دس صفحات غائب ہیں، سرورق بھی موجود نہیں جس سے معلوم ہوتا کہ یہ ایڈیشن کب اور کس مطبع سے شائع ہوا جس کی مدد سے سال تصنیف کا تعین بھی کیا جا سکتا تھا۔ بہر طور اتنی بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ واجد علی شاہ نے جب یہ مثنوی قلمبند کی تو ان کی عمر انیس سال سے زیادہ نہ تھی کیونکہ ان کی تاریخ پیدائش ۱۰ ذیقعدہ ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۹ جولائی ۱۸۲۲ء[3] ہے۔ اس حساب سے وہ اپنے دادا محمد علی شاہ کی تاجپوشی کے وقت صرف چودہ سال کے تھے اور ۱۸۴۲ء میں ان کے انتقال کے وقت اپنی زندگی کی انیسویں منزل میں۔ اغلب یہ ہے کہ ۱۸۴۱ء کے آخری یا ۱۸۴۲ء کے ابتدائی مہینوں میں ہی یہ مثنوی لکھی گئی ہوگی کیونکہ اپنی پہلی مثنوی کے بارے میں انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس کی تصنیف کے وقت ان کی عمر ۱۸ برس کی تھی:

غرض تھی یہ جب گفتگو درمیاں   برس عمر کا تب تھا اٹھارواں
ہوا اس قدر دل میں جوش الم   کہ اٹھارہ گنڈے بنا بحر غم[4]

ہجری کے اعتبار سے ۱۰ ذیقعدہ ۱۲۵۵ھ سے شروع ہو کر ۹ ذیقعدہ ۱۲۵۶ھ کو اور عیسوی حساب سے ۱۹ جولائی ۱۸۴۰ء سے شروع ہو کر ۱۸ جولائی ۱۸۴۱ء کو واجد علی شاہ کی عمر کا اٹھارواں سال پورا ہوتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب انھوں نے حسن یار خاں کے اصرار پر مثنوی گوئی کی طرف توجہ کی اور پندرہ دن میں افسانۂ عشق لکھ کر بحیثیت مثنوی نگار اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔

اسی دھن میں یہ قصہ کہنے لگا   جگر خون ہو ہو کے بہنے لگا
جب اس مثنوی کو کہا صبح و شام   ہوئی پندرہ دن میں آخر تمام
کہوں ایک جزو اس کا دستور تھا   کروں ختم جلدی یہ منظور تھا
بھلا نظم کرنے کا کب ہے یہ طور   کہاں رطب و یابس یہ جلدی میں غور[5]

یہ بات قرین قیاس نہیں کہ افسانۂ عشق کے مکمل ہوتے ہی دوسری مثنوی نظم کرنا شروع کر دی ہو۔ یقیناً کچھ دن اپنے اس پہلے کارنامے پر داد و ستائش حاصل کی ہوگی اور لوگوں کا ردعمل دیکھا ہوگا۔ دریائے تعشق کے سبب تالیف میں جس لب و لہجہ میں پہلے کہی گئی مثنوی کا تذکرہ کیا گیا ہے اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی مثنوی کو منظوم کیے کچھ عرصہ گزر چکا ہے:

اک مثنوی آگے بھی کہی ہے   بس درد میں عشق کے بھری ہے
افسانۂ عشق اُس کا تھا نام   آغاز بھی خوب اور انجام
سب کو ہوا وہ کلام مرغوب   کس واسطے تھی کہی بہت خوب
درپے ہوئے میرے لوگ اک روز   اک مثنوی اور کہہ دو دلسوز[6]

بہر طور دونوں مثنویوں کے درمیان اتنی مدت ضرور گزری کہ اپنی پہلی کوشش میں جس رطب و یابس کا شاعر کو خود ہی احساس تھا اور جسے زود گوئی کا نتیجہ قرار دے کر بات ختم کر دی گئی تھی وہ ہر طرف سے تعریف و توصیف کے بعد خود اعتمادی میں بدل گیا اور اسی کو شاعر 'بہت خوب' سمجھنے لگا۔ اس طرح اس مثنوی کا سال تصنیف ۵۷-۱۲۵۶ھ اور ۴۲-۱۸۴۱ء متعین کیا جا سکتا ہے، لیکن زیور طبع سے بھی اسی سال آراستہ ہوگئی ہو اس کا کوئی ثبوت سر دست موجود نہیں کیونکہ اس کے پہلے ایڈیشن کا جو ایک نسخہ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے پاس موجود ہے اس کے ابتدائی دس صفحات غائب ہیں۔ ہاں آخری صفحے کے خاتمہ پر دوسرے ایڈیشن

---

[1] دریائے تعشق پہلا ایڈیشن صفحہ ۲۴ [2] صفحہ ۱۳ [3] واجد علی شاہ کی ادبی و ثقافتی خدمات صفحہ ۳۰ [4] عشق نامہ: داستان ہشتم [5] افسانۂ عشق: در وجہ موزوں نمودن صفحہ ۴۵ [6] دریائے تعشق ص ۱۳

کی طرح اس میں بھی "تمم کلام الملک ملک الکلام" تحریر ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی اشاعت تصنیف کے کئی برس بعد یعنی واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے بعد ہوئی ہوگی اور کاتب نے اپنی طرف سے یہ جملہ حسب حال شامل کر دیا ہوگا۔

دریائے تعشق کے پہلے ایڈیشن کے موجودہ نسخے میں صفحہ ۱۱ سے لے کر صفحہ ۱۰۵ تک ۲۲۲۲ اشعار ہیں۔ پہلے دس صفحوں میں جن کا غالباً اب کہیں وجود نہیں زیادہ سے زیادہ سو شعر رہے ہوں گے کیونکہ گیارہ سطری صفحے ہیں۔ درمیان میں حمد، نعت اور منقبت پر مشتمل تین سرخیاں رہی ہوں گی اور پہلے دو صفحات یا ایک صفحہ پر پانچ چھ اشعار ہی رہے ہوں گے اس طرح موجودہ اشعار میں سو کے اضافے سے کل تعداد ۲۳۲۲ ہو جائے گی جبکہ دوسرے ایڈیشن میں اشعار کی مجموعی تعداد ۲۹۶۲ ہے یعنی ۶۴۰ اشعار زیادہ ہیں۔ پہلے ایڈیشن میں ۳۳ عنوانات قائم کیے گئے ہیں جبکہ دوسرے میں ۲۹ ہی ہیں لیکن نفس مضمون کے اعتبار سے دراصل پہلے ایڈیشن میں ایک ہی باب زیادہ ہے "مدح صاحب عالم ولی عہد بہادر" جس کی گنجائش دوسرے ایڈیشن میں نہ تھی کیونکہ اس وقت واجد علی شاہ خود بادشاہ ہو چکے تھے۔ پہلے ایڈیشن میں تین اور باب جو زیادہ ہیں انھیں دوسرے ایڈیشن میں ماقبل کے باب کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر پہلے ایڈیشن میں غزالہ کے پیدا ہونے اور پرورش پانے کے باب الگ الگ تھے لیکن دوسرے ایڈیشن میں یہ تفصیلات ایک ہی باب میں جمع کر دی گئی ہیں۔ اس طرح تقریباً ساڑھے چھ سو اشعار کے اضافے کے باوجود قصے میں کوئی خاص ترمیم یا اضافہ نہیں کیا گیا ہے لیکن زبان و بیان میں اتنی زیادہ تبدیلیاں نظر آتی ہیں جیسے قصے کو از سر نو نظم کیا گیا ہو۔ یہ کام یقیناً زیادہ دشوار رہا ہوگا کیونکہ اپنی کسی تخلیق کو ایک بار تکملہ کے بعد دوبارہ نظم کرنا پہلے عمل تخلیق سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ اس کے لیے بنیادی شرطیں تنقیدی شعور اور فنی بصیرت ہیں جن کے بغیر نقش ثانی پہلے سے بہتر نہیں ہو سکتا اور اگر فن پر گرفت پہلے سے زیادہ مضبوط نہ ہو اور زبان و بیان کو زیادہ چابکدستی سے استعمال کرنے کا سلیقہ نہ آگیا ہو تو ایسی کوشش محض اک سعی رائیگاں ہوگی۔

مثنوی دریائے تعشق کے دونوں نسخوں کے تقابلی مطالعے سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ واجد علی شاہ نظر ثانی کے فن سے بڑی کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں بحیثیت فن کار صحت مند تدریجی ارتقا موجود ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ دونوں نسخوں سے کچھ ایسے اقتباسات پیش کیے جائیں جہاں ایک ہی واقعہ کو منظوم کیا گیا ہے۔ مثنوی کی ہیروئن غزالہ چودہ برس کی ہو گئی ہے، اس کی سیر و تفریح کے لیے ایک باغ آراستہ کیا گیا ہے، جانے سے پہلے کی تیاریاں ہیں، غزالہ کے غسل کی کیفیت قابل لحاظ ہے:

پہلا نسخہ

کرنے لگی غسل وہاں دلارام　　یہاں عیش کو ہوتا تھا سرانجام
نقارچیوں کو حکم پہنچا　　شاہانہ بجا دیں اور الہیا
حمام کے در پہ لوگ تھے جمع　　پروانوں کے بیچ میں ہو جوں شمع
روشن ہوا رخ سے اس کے حمام　　کرنے لگی غسل وہ دلارام
تسلا لیے ہاتھ میں تھی کوئی　　کھیسا لیے ساتھ میں تھی کوئی
بیسن لیے اک کھڑی تھی بہرد　　روغن لیے کوئی، کوئی خوشبو
تلووں میں لگا جو ہونے جھانواں　　پیشانی پہ بل پڑا اس آن

دوسرا نسخہ

کرنے لگی غسل وہ دلارام　　نہلانے لگی ہر اک گلفام
تھا ایک کے پاس طشت زریں　　کیسہ کرتی تھی کوئی خود بیں
اک حور لیے تھی تیل بیسن　　کنگھی کرتی تھی کوئی پرفن
وہ پریوں کا پاؤں اس کے دھونا　　تلووں میں وہ اس کے جھانواں ہونا
وہ تیوری چڑھا کے سسکی بھرنا　　بیچین وہ ہو کے غمزے بھرنا
وہ پاؤں سمیٹ لینا ہر بار　　وہ گھرکیاں ہنس کے دینا ہر بار

شہزادی غسل سے فارغ ہو چکی ہے، محل میں ہر طرف چہل پہل ہے، خوشیاں منائی اور منتیں بڑھائی جا رہی ہیں۔

پہلا نسخہ

تیاری تھی رتجگے کی اک جا　　صحنک تھی ہر اک طرف مہیا
دونوں پہ نیاز دیتی کوئی　　تھی حاضری جا کے لینے کوئی
مجلس بھی تھی اک طرف کو ہوتی　　کوئی رات کی جاگی دن کو سوتی
کونڈے بھی تھے اک طرف کو تیار　　ہوتی تھی نیاز نذر ہر بار

دوسرا نسخہ

طیاری وہ حاضری کی اک جا   مجلس کی بنا کہیں تھی برپا
طیاری وہ رتجگے کی شب بھر   صحنک کی دھوم دن کو اندر
سیدانیوں کا وہ کونڈے کھانا   وہ لوگوں کا منتیں بڑھانا
اک دیتی تھی دونے پہ کھڑی نیاز   روزہ کوئی کھولتی تھی دمساز
ماں اس کی بھی منتیں بڑھاتی   افراط خوشی سے کانپتی جاتی
گر مانگتی اس سے کوئی انعام   کہتی گھبرا کے وہ گل اندام
دم لے دم لے ذرا ٹھہر جا   دوں گی دوں گی میں اچھا اچھا

شہزادی باغ میں پہنچ چکی ہے، شہزادی کے ساتھ باغ کی بہار بھی اپنے شباب پر ہے:

پہلا نسخہ

خوش خوش تھے جو لوگ ہر سو   کھولے ہوئے چہروں پر وہ گیسو
گھنگرو تھی بجاتی کوئی چھڑی سے   آواز نکالتی کڑی سے
کوئی نہر میں منھ کو دھو رہی تھی   دالان میں کوئی سو رہی تھی

دوسرا نسخہ

گلگشت میں محو تھی وہ گل رو   خوش خوش پھرتے تھے لوگ ہر سو
اٹکھیلیاں کرتی پھرتی تھی اک   آہیں کہیں بھرتی پھرتی تھی اک
بالی میں پروتی تھی کوئی پھول   تھی سیر چمن میں کوئی مشغول
اک نہر میں منھ کو دھو رہی تھی   زیر شجر اک سو رہی تھی

ان تمام اقتباسات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زبان و انداز بیان، واقعہ نگاری و منظر نگاری کبھی اعتبار سے دوسرا نسخہ کہیں بہتر ہے۔ پہلے نسخے میں مشاہدہ اور تخئیل دونوں ہی کمزور نظر آتے ہیں، تسلسل کی کمی سے فن کے ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے جبکہ دوسرے نسخے میں ان خامیوں پر بڑی حد تک قابو پایا گیا ہے اور جزئیات پر زیادہ توجہ دے کر افسانہ کو حقیقت کا رنگ دینے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے جس کے باعث واقعات اصلیت سے زیادہ قریب معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن مندرجہ بالا اقتباسات یا اشعار کی مجموعی تعداد میں اضافے سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ پہلے نسخے کے مقابلہ میں دوسرے نسخے میں ہر جگہ تفصیل سے کام لیا گیا ہے یا نہیں بلکہ کئی جگہ اختصار سے کام لے کر شاعر نے اپنے تنقیدی شعور کا ثبوت دیا ہے۔

واجد علی شاہ نے اپنی مثنویوں میں کئی موقعوں پر غزلیں بھی شامل کی ہیں جو کسی رقص و سرود کی محفل میں گائی جاتی ہیں۔ دریائے تعشق میں بھی ایسے کئی مواقع ہیں۔ دوسرے نسخے میں بیشتر جگہ غزلوں کے اشعار میں کمی کر دی گئی ہے، یہ ایک خوشگوار تبدیلی ہے کیونکہ مثنوی میں زیادہ طویل غزلیں اک بے ربطی پیدا کر دیتی ہیں۔ پہلے نسخے میں جو غزل اختر، ۱۲ شعروں کی تھی وہ دوسرے نسخے میں ۴۲ شعر کی 'غزل' رہ گئی:

پہلا نسخہ

وہ یار مرا کدھر گیا ہے   کیا ہے جو وہ مجھ سے بدمزا ہے
افسوس جو اپنا دلربا ہے   وہ غیر کے نام پر فدا ہے
ہم جس کے ہیں غم میں جان دیتے   لگا اسے اور سے ہوا ہے
عاشق کے ہے خون سے رنگین   یا ہاتھ میں اسکے یہ حنا ہے
روٹھے ہو جو مجھ سے تم تو روٹھو   پروا نہیں میرا بھی خدا ہے

دوسرا نسخہ

دل جس کو ہمارا ڈھونڈھتا ہے   اے چرخ کدھر وہ مہ لقا ہے
افسوس جو اپنا دلربا ہے   وہ غیر کے نام پر فدا ہے
ہم غم میں ہیں جس کے جان دیتے   پروا نہیں اسکو اک ذرا ہے
عشاق کے خون سے ہیں رنگین   ہاتھوں میں کب ان کے یہ حنا ہے
روٹھیں ہیں جو آپ مجھ سے روٹھیں   بندے کا بھی اے صنم خدا ہے

اسی طرح واجد علی شاہ نے طلسمی باغ کا جو منظر کھینچا ہے وہ پہلے نسخے میں کافی تفصیل سے نظم کیا گیا ہے جس کے باعث طلسماتی تاثر کچھ ہلکا ہو جاتا ہے جبکہ دوسرے نسخے میں یہ مرقع اشعار میں پیش کیے جانے سے زیادہ موثر ہو گیا ہے:

پہلا نسخہ

قدرت کا ہے باغ وہ بنایا   ہے لعل کا ہر شجر لگایا
پتے ہیں زمردیں بنائے   ہر قسم کے ہیں شجر لگائے
گیندے بھی عقیق زرد کے ہیں   عاشق کے لیے وہ درد کے ہیں
یاقوت کا ہے تراشا لالہ   ہے سبز ہر ایک الماس کا پتہ
تھی در نجف کی موگری جو   نرگس بھی تھی جان دیتی مردود
پکھراج کا چنپا تھا تراشا   دیکھا نہیں آنکھوں نے یہ تماشا

سیوتی وہ صدف کی تھی تراشی　　اور ابر تھا کرتا آبپاشی

دوسرا نسخہ

اک باغ ہے گلشن طلسمات　　گو فصل نہیں مگر ہے برسات
یاقوت کے ہیں تمام اشجار　　پتّے ہیں زمردی طلاکار
موتی کا شگفتہ موتیا ہے　　اور دُرِّ نجف کا موگرا ہے
چنیا پکھراج کی ہے یکسو　　بلّور کی اک طرف ہے شبّو
اک کیاری میں سیوتی کھلی ہے　　وہ گوہر شب چراغ کی ہے

پہلے اور دوسرے نسخوں میں زبان و بیان کے ان واضح اختلافات کے علاوہ ایک اور اہم فرق تقریباً تمام ابواب کی سرخیوں کی عبارت میں مناسب تبدیلی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اردو نظم کے ساتھ فارسی نثر میں بھی پختہ کاری حاصل ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر پہلے جس باب کا عنوان 'آراستہ شدن باغ و رفتن عزالہ دراں گلزار و استقامت نمودن دراں' تھا وہ بعد کو 'حمام نمودن عزالہ و آراستہ شدہ در باغ و تعمیر رفتن' کر دیا گیا۔ بلاشبہ دوسری عبارت نسبتاً زیادہ فصیح و بلیغ ہے۔

چنانچہ اگر ایک فن کار کی نومشقی کوششوں اور پختہ کارانہ کاوشوں کا تقابلی جائزہ مقصود ہو تو دریائے تعشق کے دونوں نسخوں کا مطالعہ بہت دلچسپ ثابت ہوگا۔ پہلے نسخے میں فن پر گرفت ڈھیلی ہے، گل چینی کا شوق ضرور ہے مگر گل آرائی کا سلیقہ نہیں، تجربے کی کمی بار بار کھٹکتی ہے۔ ترتیب و تزئین کے لیے تراش خراش بھی ضروری ہے فنکار اس پہلو سے ابھی ناواقف معلوم ہوتا ہے۔ لگاوٹ اور گھلاوٹ کے سبھی انداز اور ناؤ نوش کی سبھی کیفیات سے ہنوز اس کا دل ناآشنا ہے، ابھی عنفوان شباب کا جوش اور شعر گوئی کا شوق اس سب پر غالب ہے مگر دوسرے نسخے میں رات کی گہری تاریکی اور دن کے ہمہ گیر اجالے کے ساتھ زندگی کے طوفان سے آشنا ہو جانے کا احساس ہے، زندگی کو دیکھنے اور برتنے کا شعور ہے، اب دل میں وقت کی مناسبت سے نرمی اور کرختگی، بات کہنے اور باتیں کرنے کا سلیقہ ہے۔ شعر گوئی کے شوق نے اب فنکارانہ قادر الکلامی کی صورت اختیار کر لی ہے اور عنفوان شباب کے جوش نے بول چال میں ایک توازن اور وقار پیدا کر دیا ہے۔ اب ہر بات اک تمہید کے ساتھ اور ہر واقعہ ایک پس منظر لیے ہوئے ہے۔ اب تشبیب کی رنگارنگی بھی ہے اور تسلسل بیان بھی۔ اب نگاہ سرسری جائزے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ باریک بینی اور جزئیات نگاری زیادہ لطف دے جاتی ہے کیونکہ اب دریائے تعشق کا مصنف سلطنت اودھ کے شاہ زماں کے فرزند کا فرزند نہیں بلکہ قیصر زماں سلطان عالم محمد واجد علی شاہ اودھ ہے۔

آخر میں بطور اثبات دونوں نسخوں کے آخری کچھ اشعار جو اپنے دامن میں ان تفصیلات کو سمیٹے ہوئے ہیں، ملاحظہ ہوں:

پہلا نسخہ

مقبول سخن ہے تیرا اختر　　موقع ہے یہی دعا کا اختر
یارب ہے یہ کائنات جب تک　　یہ روز ہے اور یہ رات جب تک
جب تک مہ و مہر کی ضیا ہے　　جب تک کہ یہ ارض اور سما ہے
جب تک کہ ہے بہار باغ دنیا　　روشن رہے تا چراغ دنیا (کذا)
ہے یہ جو ثریا جاہ میرا　　بے شبہ و شک ہے شاہ میرا
یہ ہی ہے ولی عہد دوراں　　اس کا ہو جہاں مطیع فرماں
یہ ہو وے اور اس کی مملکت ہو　　دنیا ہو اور اس کی سلطنت ہو
قبضے میں ہو ماہ تا بہ ماہی　　تا حشر رہے ثریا جاہی

تم کلام الملک ملک الکلام[1]

دوسرا نسخہ

اختر یہی وقت ہے دعا کا　　ہنگام ہے عرض مدعا کا
اب ہاتھ اٹھائیے مناجات　　کر عرض خدا سے اپنی حاجات
یارب بے حرمت محمد　　یارب از بہر آل امجد
اس درد کی میری کچھ دوا کر　　صحت مجھے اب جلد عطا کر
عاصی ہوں خطا شعار ہوں میں　　خود کردہ سے شرمسار ہوں میں
غفار ہے تو رحیم ہے تو　　ستار ہے تو کریم ہے تو
عصیاں و خطا سے در گزرنا　　عاصی پہ نگاہ لطف کرنا

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

---

[1] پہلا ایڈیشن صفحہ ۳۲۰

ساحر بھوپالی

غزل

جب دل سے دور خوفِ خدا کر دیا گیا
ہر ظلم بے کسوں پہ روا کر دیا گیا

دنیا ہی میں اک حشر بپا کر دیا گیا
اب کون اُن سے پوچھے یہ کیا کر دیا گیا

دیکھا حریصِ لذتِ آزار جب مجھے
سارے جہاں کا درد عطا کر دیا گیا

اب چاہتے ہیں وہ کہ بہ ہر حال خوش رہوں
جب دل ہر اک خوشی سے بُرا کر دیا گیا

پہلے تو چھین لی گئی جینے کی آرزو
پھر موت کو بھی مجھ سے خفا کر دیا گیا

مژدہ سُنا کے کنجِ قفس میں بہار کا
ہر ایک زخمِ دل کا ہرا کر دیا گیا

اُس دل کی بے کسی بھی کوئی دیکھتا، جسے
محرومِ التفاتِ جفا کر دیا گیا

اس نے نگاہِ گرم سے دیکھا، ستم کیا
سب کرکرا جنوں کا مزا کر دیا گیا

جب کچھ نہ ہو سکا ہوسِ دید کا علاج
امیدوارِ روزِ جزا کر دیا گیا

پھر وہ اسیرِ عشق کہیں کا نہیں رہا
اپنا بنا کے جس کو رہا کر دیا گیا

کس طرح پھر جیے گا کوئی ہجرِ یار میں
جب جان ہی کو تن سے جدا کر دیا گیا

ساقی کی چشمِ مست کا اعجاز دیکھنا
بس اک نظر سے سب کا بھلا کر دیا گیا

ساحر خود اپنی ذات سے بھی کر کے دشمنی
حق اُن کی دوستی کا ادا کر دیا گیا

محبوب راہی

غزل

لاکھ رکھتا ہو کوئی بختِ سکندر جیسا
دل بھی تو چاہیے اے راہی، تونگر جیسا

عیش سے گھر کے طبیعت کبھی اُوب اٹھتی ہے
دشت میں بھی کبھی ملتا ہے سکوں گھر جیسا

سوچ بھی سکتا ہے محسوس بھی کر سکتا ہے
وہ بظاہر جو نظر آتا ہے، پتھر جیسا

فطرتاً یوں تو وہ مخلص بھی ہے مہربان بھی ہے
ہم سے جب ملتا ہے، ملتا ہے ستمگر جیسا

کہنے والے اسے احساس کہا کرتے ہیں
دل میں پیہم جو چبھا کرتا ہے نشتر جیسا

شکلِ فطرت میں ہر اک چیز بھلی لگتی ہے
صحرا صحرا ہی کی مانند ہو گھر، گھر جیسا

سب نے اوپر سے کئی خول چڑھا رکھے ہیں
نہیں اندر سے کوئی شخص بھی باہر جیسا

آج اس حسنِ مجسم کا سراپا دیکھا
ہو بہو ہے مرے تخئیل کے پیکر جیسا

چھید کر دل کو کلیجے میں اتر جاتی ہیں
اس کی باتوں میں مزہ آتا ہے خنجر جیسا

اٹھتی رہتی ہیں تمناؤں کی موجیں جس میں
راہی اس دل کا بھی عالم ہے سمندر جیسا

کوثر چاندپوری

افسانہ

جوار بھاٹا

جس روز رام پرشاد دھوبی نے گاڑی کھینچنے کے لیے بچھڑا خریدا اسی دن برادری کا ایک غریب لڑکا صرف روٹی کپڑے پر رل گیا۔ رام پرشاد نے بہت غنیمت سمجھا۔ اس نے نو برس کے گھاسی کو اپنے یہاں رکھ لیا۔ اس کے پاس ایک بیل سے چلنے والی گاڑی تھی۔ اسی میں میلے کپڑوں کی گٹھریاں لاد کر جمنا گھاٹ پر جایا کرتا تھا۔ وہیں بھٹی میں لگا کر انھیں دھوتا اور سکھا کر شام کو گھر لے آتا۔ پرانا بیل بوڑھا ہو گیا تھا، چڑھائی پر کھڑا ہو کر ہانپنے لگتا، کبھی چلتے چلتے بیٹھ جاتا، دھوبی مہینوں تک رکشاؤں پر گٹھریاں لے جاتا رہا ان کے کرائے میں پیسے بہت خرچ ہو جایا کرتے تھے۔ اس نے پرانے دستور کے مطابق ایک ایسے بچھڑے کا سودا کر لیا جو بہت موٹا تازہ تھا۔ وہ ہمیشہ ایسے ہی بچھڑے لیا کرتا تھا اور انھیں گاڑی میں جوتنے لگتا تھا۔ شروع میں بڑی محنت کرنی پڑتی، دونوں طرف سے دو آدمی سنبھالتے اور سیدھا چلنے کی مشق کراتے پہلے بوجھ کم بھرا جاتا آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا رہتا بچھڑا ٹھیک طرح گاڑی کھینچنے لگتا تو رام پرشاد گٹھریاں لاد کر ان کے اوپر بیٹھ جاتا، اور رسّے کے اشارے سے ہانکتا رہتا گھاسی جس کو رام پرشاد نے بظاہر شانتی کو ممنون کرنے کے لیے رکھ لیا تھا گھر کا کام کاج بھی کرتا اور صبح کو سر پر گٹھری رکھ کر گھاٹ پر جاتا دھوبی اسے بھی بچھڑے کی طرح سدھانے لگا تھا۔ گٹھری کا وزن روز بروز بڑھتا رہا گھاسی گاڑی کے پیچھے پیچھے چل کر گھاٹ پر پہنچتا تو پاؤں دکھنے لگتے تلووں میں آگ سی جل اٹھتی، بدن بوجھل ہو جاتا۔ وہ گٹھری بھٹی کے قریب رکھ دیتا۔ ادھر رام پرشاد بچھڑے کی گردن سے جوا اتار کر اس کے کندھے کو ملنے لگتا۔ اس طرح خون جمنے کا اندیشہ نہیں رہتا تھا یہ اس کا پرانا تجربہ تھا۔ گھاسی کے دل میں بھی امنگ پیدا ہوتی کوئی میری گردن کو بھی اسی طرح سہلا دیتا یہ آرزو سوکھے گملے میں لگے پودے کی طرح مرجھا جاتی۔ بچھڑا آہستہ آہستہ بڑا ہوتا گیا ذرا ذرا سے سینگ نظر آنے لگے، رام پرشاد تیل لگا کر انھیں خوب چمکا دیتا۔ گھاسی بھی دس سال کا ہو گیا، بوجھ میں لگ گیا تھا بیل کو مقررہ وقت پر دانہ کھلایا جاتا ہری گھاس ہر وقت اس کے آگے پڑی رہتی، گھاسی رات کی باسی روٹیاں پانی کے سہارے گلے سے اتارتا اسی طرح بڑھنے میں بیل کا ساتھ دینے کی ناکام کوشش کرتا۔ بیل کا راتب برابر بڑھ رہا تھا گھاسی کو گنی چنی روٹیاں ہی ملا کرتی تھیں گھاسی کو اپنے اور بیل کے فرق کا خوب احساس تھا، اس کو برابری کا خیال تک نہ آتا، وہ دیکھ رہا تھا کہ بیل کا راتب بڑھتا جا رہا ہے مگر اس کی روٹیوں میں اضافہ نہیں ہوتا، آخر کیوں، بیل اور وہ ساتھ ساتھ بڑھ رہے تھے، دانے کے ساتھ اس کی روٹیاں بھی نہیں بڑھائی جاتیں، یہ سوالات پانی کے بلبلے کی طرح ابھرتے اور پھوٹ جاتے، جواب کسی کا نہ ملتا اکثر وہ شانتی سے پوچھتا۔

ماں بیل اور آدمی میں کیا فرق ہے۔

یہی کہ اس کے سینگ ہوتے ہیں آدمی کے نہیں ہوتے جیسے سینگ نہیں تو کوئی اور چیز ضرور ہوگی۔

ابھی تیری عمر ہی کیا ہے، جب بڑا ہوگا داڑھی بھی نکلے
گی اور مونچھ بھی۔
اس قسم کی باتیں آپ ہی آپ گھاسی کے شعور میں سر ابھارتی
رہتیں جیسے کان میں کوئی پھونک دیتا ہو کہ تم آدمی ہو جو بیل سے بڑا
ہوتا ہے اندر جاکر یہ باتیں کیڑوں کی طرح کسی ان دیکھی بھٹی میں
پکتیں پھر زبان پر آجاتیں وہ کہتا:
ماں کوئی اور فرق بھی ہونا چاہیے میرے اور بیل کے درمیان
ضرور ہوگا بیٹا میں نہیں جانتی شانتی اس کی بھولی بھالی
صورت دیکھ کر کہتی۔
گاڑی گھر اور گھاٹ کا فاصلہ طے کرتی رہی اس میں گٹھریاں
بھر دی جاتیں رام پرشاد ان کے اوپر بیٹھ کر بیل کو ہانکتا رہتا
جھٹکوں سے کوئی گٹھری گر پڑتی تو گھاسی چیخ کر کہتا روکو گاڑی روکو۔
رام پرشاد نیچے کود کر گٹھری اٹھا لیتا۔
گھاسی کی گٹھری بھاری ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن پاؤں اب
دکھتے نہیں تھے۔ تلوؤں میں آگ بھی نہیں جلتی تھی۔ باہر سے کانوں
میں زبردستی گھس جانے والی باتیں اندر جاکر اسی طرح کھولتی رہیں۔
وہ سوچنے لگا بیل کے سینگ دو انگل کے قریب باہر آگئے میری
مونچھیں کیوں نہیں نکلتیں، ایک دن فضا ساکن تھی، پانی میں موجیں
نہیں اٹھ رہی تھیں۔ گھاسی نے جمنا کے کنارے بیٹھ کر آنکھیں
پھاڑ کر دیکھا اسے اپنی مسیں بھیگتی ہوئی معلوم ہوئیں ناک اور اوپر
کے ہونٹ کے درمیان کالا ریشم سے زیادہ ملائم رواں دیکھ کر وہ بہت
خوش ہوا یہ پہلا تغیر تھا جس کو اس نے سینگوں سے زیادہ اہمیت
دی۔ وہ اپنے اوپر فخر کرنے لگا، مسرت کا احساس اس وقت بے
پایاں ہو گیا جب اس نے سوچا کہ اب میں بیل سے بڑا ہو کر رام پرشاد
کے برابر ہو جاؤں گا۔ اسی کی طرح بڑی بڑی مونچھیں رکھوں گا،
ان میں سینگوں سے زیادہ چمک ہوگی، گھاسی اپنے ماحول کا
جائزہ لے کر اس کی تبدیلیوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا ایک مرتبہ
ماں سے پوچھا۔
عقل کیسی ہوتی ہے ماں؟

کبھی دیکھی نہیں، یہ ضرور جانتی ہوں کہ عقل کوئی بہت بڑی
چیز ہے۔
بیل کی بڑی ہوتی ہے یا آدمی کی
ایسی باتیں مجھ سے مت پوچھا کر گھاسی، بھلا میں کیا جانوں۔
دیوالی پر رام پرشاد نے بیل کے سفید بالوں پر ہرے
پیلے پھول بنائے گلے میں نیلے اور سفید موتیوں کی مالا ڈالی، گھاسی
نے شانتی سے شکایت کی کہ رام پرشاد نے میرے گلے میں مالا کیوں
نہیں ڈالی کیا میں بیل سے چھوٹا ہوں۔
اس نے بیل کی قیمت ادا کی ہے وہ کپڑوں سے بھری
گاڑی کھینچتا ہے۔
شاید عقل بھی بیل کی بڑی موٹی ہوگی۔
شانتی پھر ہنسنے لگی اسے بیٹے کی باتیں اچھی بھی لگتیں
اور بری بھی۔ اچھی اس لیے کہ وہ اس کا اکلوتا لڑکا تھا اور بری اس
وجہ سے کہ اس کے دل میں رام پرشاد کی عزت کم ہوتی معلوم
ہو رہی تھی۔ شانتی اسے مالک اور ان داتا سمجھتی تھی گھاسی کا۔
اپنی مونچھیں دیکھ کر گھاسی نے ماں سے کہا:
"میں بڑا ہو گیا ماں"
"ہاں ضرور ہو گیا تجھے بڑا ہی ہونا چاہیے"
"میرے رام پرشاد کی سی مونچھیں نکل آئیں۔ اب ہم دونوں
بالکل برابر ہو گئے"
"گھاسی ایسا مت سوچ اس کے پاس رہنے کو مکان ہے
تیرے پاس نہیں"
"تو غریب ہے، گھر بنانے کو پیسہ نہیں تیرے پاس"
"گھاسی کے احساس پر چوٹ لگی۔ وہ خاموش ہو گیا، وقت
آگے بڑھتا رہا۔ جمنا کے بہتے پانی کی طرح وہ کبھی ٹھہرتا ہی نہ تھا۔
ایک روز جمنا میں بہت بڑی لہر آئی کئی کپڑے بہا لے گئی۔ گھاسی
دیر تک ڈھونڈتا رہا کچھ پتہ نہ چلا۔ رام پرشاد اتنا نقصان برداشت
نہ کرسکتا تھا خفا ہو کر بولا:
معلوم ہوتا ہے روٹیاں لگ گئی ہیں تمھیں جو دھیان سے

کام نہیں کرتے۔ گھاسی شرمندہ ہوگیا۔ اسے گمان ہوا کہ وہ بیل سے بہت چھوٹا ہے۔ رام پرشاد کبھی اس کے لکڑی نہیں مارتا، مجھے بے دردی سے ڈانٹتا ہے۔ پھر وہ افسوس کرتا رہا کہ اس کی وجہ سے اتنا بڑا نقصان ہوگیا۔ رام پرشاد نے اس کی غفلت کی سخت سزا دی۔ اسے الگ کر دیا جس وقت گھاسی کو ہٹایا گیا ہے اسے چار روپے مہینہ تنخواہ ملنے لگی تھی۔ شانتی کو بڑا رنج ہوا۔ گھاسی میں نہ جانے کہاں سے اتنی ہمت آگئی تھی کہ اس کے ماتھے پر بل تک نہ آیا۔ اس نے کہا:

"غم مت کرو ماں جلد ہی دوسری نوکری مل جائے گی"

اور ایسا ہی ہوا ٹھاکر پرشاد نے اسے بیس روپے مہینہ پر ملازم رکھ لیا۔ شانتی خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔ پہلی تنخواہ لے کر گھاسی گھر آیا تو دن بھر یہی سوچتی رہی کہ اتنے روپے خرچ کہاں کرے۔ ٹھاکر پرشاد بہت مالدار تھا۔ اس کے قبضہ میں رام پرشاد سے بڑا مکان تھا کپڑے لانے لے جانے کے لیے جیپ رکھ چھوڑی تھی۔ اپنے نوکروں کے آرام اور عزت کا بہت خیال رکھتا تھا سب سے عزیزوں کا سا سلوک کرتا تھا۔ وہ گھاسی کے کام اور ایمانداری کو بہت زیادہ پسند کرنے لگا۔ اکثر کاموں میں اس سے مشورہ کرتا۔

گھاسی نے محنت اور دیانت سے اس کا دل جیت لیا۔ وہ اس پر پورا اعتبار کرنے لگا۔ گھاسی جیپ میں ہی جمنا گھاٹ پر جاتا۔ کسی دن ٹھاکر پرشاد نہ آتا تو وہی نگرانی کرتا۔ اچانک ٹھاکر پرشاد بیمار ہوگیا۔ اسے آرام کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ وہ دن رات گھر پر ہی پڑا رہتا کاروبار کی ساری ذمہ داری گھاسی پر آپڑی۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے اس کو پورا کیا۔ ٹھاکر پرشاد کے اچھا ہونے پر پوری برادری نے خوشی منائی۔ بہت بڑا جشن ہوا۔ دھوبیوں نے گیت گائے اور ٹھاکر پرشاد کے گلے میں ہار ڈالے گئے۔ گھاسی یہ منظر دیکھ کر نہ جانے کیا سوچنے لگا۔ اسی وقت ٹھاکر پرشاد کی بڑی لڑکی سوہنی نے مسکراتے ہوئے گھاسی کو بھی پھولوں کی مہکتی ہوئی مالا پہنا دی۔ جوشِ مسرت سے اس کے گال سرخ ہوکر تمتمانے لگے۔ اس نے بلند آواز میں ماں سے کہا:

"ماں دیکھو میں رام پرشاد اور اس کے بیل سے بھی بڑا ہوگیا"

شانتی اس مرتبہ بالکل نئے انداز سے ہنسی۔ اس کی چھاتی میں جوار بھاٹا سا آگیا اس میں بڑی گھن گرج تھی جیسے کوئی انقلاب آرہا ہو، آسمان جھک کر زمین کو چھونے لگا ہو۔

مثنوی دریائے عشق: (صفحہ ۱۷ کا بقیہ)

تیری ہی صفت ہے بے نیازی — تو ہی کرتا ہے چارہ سازی
تو نے ہی کیا ہے مجکو سلطاں — عالم ہے میرا مطیع فرماں
تو نے ہی دیا ہے مجکو یہ اوج — طبل و علم و حکومت و اوج
کیا شکر تیرا ادا ہو ہم سے — امید ہے یہ ترے کرم سے

رکھنا مجکو سدا بہ اقبال — دشمن رہے میرا خوار و پامال
ہر دم مجھے بامراد رکھنا — دل کو میرے شاد شاد رکھنا
تابندہ رہے یہ نجم شاہی — قبضہ میں ہو مہ سے تا بماہی

تم کلام الملک ملک الکلام[له]

له دوسرا ایڈیشن صفحہ ۲۳۳و ۲۳۴

ڈاکٹر عثمان صدیقی بسوانی

ہندستان کے تمام مروجہ تہواروں میں ہولی موسم بہار کا ایک عظیم الشان تہوار ہے اور اس کو ایک منفرد اور خاص اہمیت حاصل ہے جس کا مطالعہ اردو شعر و سخن کے آئینے میں بڑی خوبی سے کیا جا سکتا ہے ۔ اردو شاعری میں سماجی، ثقافتی اور تہذیبی تصورات جس طرح نمایاں ہوتے ہیں اسی طرح اس کی آئینہ سامانی بھی بے حد بصیرت افروز ہے۔

جب موسم بہار میں پھاگن کی خوش گوار ہواؤں سے درختوں کی آرائش ہوتی ہے اور آم کے بور کی کیف آور فضاؤں سے مستی ٹپکتی ہے، ڈالی ڈالی پر سرسبزی و شادابی آتی ہے، سے کلے نکلتے ہیں، شگوفے پھوٹتے ہیں، کلیاں مسکراتی ہیں اور پھول کھلکھلا کر ہنستے ہیں، کھیتوں کھیتوں سُن برستا ہے اور ہر کشت زار اپنی محنت کا ثمرہ لیے ہوئے اناج کی بالیوں کی شکل میں جھوم جھوم کر نغمۂ خلوص و محبت گاتا ہے تو ہر دیدۂ نرگس سے شراب ارغوانی چھلکنے لگتی ہے اور مئے گلرنگ فضاؤں میں اچھلنے لگتی ہے اسی مسرت و شادمانی کی رنگا رنگی کو "ہولی" کہا جاتا ہے۔ شاعر کی نگاہیں بھی اس جمال ہوش ربا کی تجلیاں دیکھتی ہیں اور جذبات و احساسات میں ہولی کے تصورات کی کرنیں بکھر جاتی ہیں۔

اس رنگ و بو کا ذکر نظیر اکبر آبادی یوں فرماتے ہیں :۔

آ جھمکے عیش و طرب کیا کیا جب رنگ دکھایا ہولی نے
ہر آن خوشی کی دھوم ہوئی یوں لطف جتایا ہولی نے
ہر خاطر کو خورسند کیا ہر دل کو لُبھایا ہولی نے
دَف رنگیں نقش سنہری کا جس وقت بجایا ہولی نے
بازار گلی اور کوچوں میں غل شور مچایا ہولی نے

نظیر اکبر آبادی عوامی شاعر تھے ۔ ان کے کلام میں ہندستان کے مزاج و ماحول کا ایک گہرا نقش اور حسین عکس ملتا ہے ۔ چنانچہ ہولی کی مختلف کیفیات پر ان کی بہت سی نظمیں ملتی ہیں ۔ مگر بخوف طوالت یہاں صرف دو ایک اقتباسات درج کیے جا رہے ہیں۔ کہیں راگ رنگ کی محفل ہے، کہیں بزم میکدہ ہے اور کہیں مسرت و شادمانی کے جلسے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی نے طرح طرح سے ہولی منانے کی کیفیات کو یوں بیان کیا ہے :۔

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دَف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور ساغر کے چھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
کپڑوں پر رنگ چھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

نظیر اکبر آبادی کے تصور میں ہولی کی بہاریں چاروں طرف چھائی ہوئی ہیں ۔ زمین تو زمین آسمان پر بھی انھیں ہولی کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں :۔

جو گھر کے ابر کبھی اس مزے میں آتا ہے
تو بادلوں میں وہ کیا کیا ہی رنگ لاتا ہے
خوشی سے رعد بھی ڈھولک پہ گیت گاتا ہے
ہوا کو ہولیاں گا گا کے کیا سناتا ہے

تمام رنگ سے پُر ہے بہار ہولی میں!

اسی مسرت و شادمانی اور کیف و نشاط کے بکھرے ہوئے روپ نے بہتوں کو موہ لیا اور شاعر تو فطرتاً حساس ہوتا ہی ہے اس کا متاثر ہونا بالکل قدرتی ہے۔ چنانچہ میر تقی میر جن کے کلام میں انتہائی سوز و گداز ہے اور درد ہی درد ہے، وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ میر صاحب کو خدائے سخن اور شہنشاہ غزل تسلیم کیا جاتا ہے اور ان کی مثنویوں کو بھی خاص شہرت حاصل ہے انھوں نے ہولی کی مثنوی میں عوامی ہولی کا نہیں بلکہ اونچے طبقے کی ہولی کا ذکر کیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ ہولی کی رنگا رنگی صرف عوامی گوشہ تک محدود نہیں بلکہ حاکم اور بادشاہ وقت سب ہی ہولی کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہیں۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر — رنگ صحبت سے عجب ہیں خرد و پیر

زعفرانی رنگ سے رنگیں لباس — عطر مالی سے سبھوں ہیں گل کی باس

رنگ افشانی سے پڑتی ہے پھوار — رنگ باراں تھا مگر ابر بہار

قمقمے جو مارتے بھر کر گلال

جس کے لگتا آن کر پھر منہ پہ لال

ہولی کی رنگا رنگی اور مختلف کیفیات کے نقشے اور آئینے میں بادشاہ سے لے کر گدائے گوشہ نشیں تک سراپا بہار دیوانہ وار دیکھے جا سکتے ہیں جس کو جوشش عظیم آبادی اس طرح بیان فرماتے ہیں

پچکاری ہاتھ میں ہے ناکاری باتیں منہ پہ

آپس میں کھیلتے ہیں بے اختیار ہولی

ہولی کا موسم آیا عشرت نے منہ دکھایا

لے شاہ تا گدا سب کھیلے ہیں یار ہولی

اور ہولی کی سرمستیوں کا ذکر فائز دہلوی کی زبان سے بھی سنیئے: ؎

لے عبیر اور رنگیا بھر کر رومال — چھڑکتے ہیں اور اڑاتے ہیں گلال

ہر چھبیلی از لباس کیسری — تازہ کرتی ہے بہار جعفری

جوش عشرت گھر بہ گھر ہے ہر طرف

ناچتی ہیں سب تکلف بر طرف

اب سعادت یار خاں رنگین سے ہولی کی داستان سماعت فرمائیے جو ایک قادر الکلام شاعر اور متعدد زبانوں کے ماہر تھے اور جن کو ہندستان کے ماحول سے خاص دلچسپی تھی۔ وہ ہولی کھیلنے کی یوں تصویر کشی کرتے ہیں:

چلتی ہے دو طرف سے پچکاری — مینہ برستا ہے رنگ کا بھاری

یعنی دور اس کی دھار جاتی ہے — جس کو چاہے گی یہ بھگا دے گی

بھر کے پچکاری وہ جو ہے چالاک

مارتی ہے کسی کو دور سے تاک

ہولی کی مختلف نزاکتوں کا احساس بہادر شاہ ظفر کو بھی ہوا جو ایک باکمال شاعر ہونے کے علاوہ خاندان مغلیہ کی آخری شمع بھی تھے۔ وہ بادشاہ ضرور تھے مگر ساری عمر مایوسی و پریشانی میں کٹی۔ لیکن ہولی کی رنگینیوں نے انھیں بھی مسرور کیا۔ فرماتے ہیں:

کیوں مو پہ رنگ کی ماری پچکاری — دیکھو کنور جی دوں گی گاری

ہر کہ دست از جاں بشوید

ہر چہ در دل دارد بگوید!

شاہ تراب کاکوروی جو ایک صوفی شاعر تھے فرماتے ہیں:

لال گلال لگائے مکھ پہ — رنگ سے بھیگی چونریا ساری

آپ بچو یہ ہے سب کو رنگ دے — کو ہے تراب اس چتر کھلاری

ہولی کی عشرت و سرمستی جہاں کیف و سرور کا پیام دیتی ہے وہاں چند دھڑکتے ہوئے دلوں کے لیے اشک غم کا تحفہ بھی لاتی ہے موسم کی شگفتگی احساس فرقت کے شعلوں کو بھڑکا دیتی ہے جیسے بالترتیب افضل، وہاب اور مقصود سے ملاحظہ فرمائیں جن میں عورتوں کی زبان سے باتیں کہی گئی ہیں ؎

لیے ہاتھوں میں پچکاری پھرت ہیں

عبیر اپنے پیا کے مکھ ملت ہیں

اجی یہ دیکھ کر ہنگام ہولی

مرے جی پر قیامت شام ہولی

(افضل)

سبھوں کو گیت رنگ اب لاگ بھاوے

مرے تن کو تو ہوری سی جلا دے (وہاب)

سکھی سب ڈھاک پھولے انوا بورے پیا اب تک نہ موئے آ ہ بورے!
پیا کے غم میں، میں ساری گئی سوکھ مرے جوبن کی پھلواری گئی سوکھ
(مقصود)

اسی طرح ہولی کے موقعہ پر اُن احساساتِ فرقت اور جذباتِ محبّت کی ترجمانی بھی اُردو شعراء نے کی ہے جو فطرتاً ہولی کی رنگ رلیوں میں اُبھر آتے ہیں۔ ہولی کی مسرت خیزیوں اور سحر انگیزیوں کی شوخ وارداتوں کو اُردو زبان کے قدیم و جدید مستند اہلِ زبان شعراء نے اپنے اپنے انداز میں ایک حسین مرقع بنا کر پیش کیا ہے۔ ذرا شاعر کی فن کاری کا نمونہ مولانا حسرت موہانی کی تخیل میں دیکھیے:

منھ پر رنگ نہ ڈال مُراری بنتی کرت ہوں تہاری
پنیا بھرن کا ہ جائے نہ دیہیں شیام بھرے پچکاری
تھر تھر کانپت لاجن حسرت
دیکھت ہیں ”نر“ ناری

اور تقریباً اسی اندازِ فکر کے ایک گیت کے دو شعر مشہور ہیں جو انتہائی شوخ ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

جانے نہ دے موہے پنیا بھرن کو روکے ڈگر پچکاری مارے
رنگ میں بھیجوئے موری بہیاں پکڑکے کیسے بتاؤں کوئی ساری سنبھالے

اُردو کی قدیم و جدید شاعری میں ہولی کا ذکر غزلوں میں بھی نمایاں ہے۔ ہولی کی صہبائے کیف آور اور مخمور حسینوں کی وارفتگیِ شوق کی تصویر جوشؔ ملیح آبادی نے بھی کھینچی ہے:

آرائشوں کی فکر نہ زیبائشوں کا ہوش
وارفتگیِ لالہ رُخاں دیدنی ہے آج

اسی طرح مولانا ہدایت نسوانی کے اِن اشعار میں ایک خاص کیفیت ہے اور اس سے ہولی کی پُر بہار عکاسی ہوتی ہے:

چھپا ہوا ہے کوئی گلعذار ہولی میں بہار میں ہے یہ طرفہ بہار ہولی میں
بلا ہے جام مئے خوشگوار ہولی میں پیے ہوئے ہے ہر اک میگسار ہولی میں
چمن میں چاروں طرف رنگ نور برسا ہے
عیاں ہے رحمتِ پروردگار ہولی میں

اب ذرا بیدم شاہ وارثی کا حسینِ کلام ملاحظہ کیجیے جن کا مخصوص رنگ عارفانہ ہے اور جن کو وارثی شعراء میں خاص اہمیت حاصل ہے:

پھاگن کھیلن گئے ہیں بنواری گروا لگائیں، ماریں پچکاری
سکھی برج میں گھمسان پڑا ہے!

اسی طرح ماسٹر باسط بسوانی نے اپنے ایک قطعہ میں ہولی کی جذباتی کیفیات کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

ہولی تن من پھونک رہی ہے دور سکھی گردھاری ہے
دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہے اور زخمِ جگر بھی کاری ہے
ہائے اکیلی کھیل رہی ہوں، ساری ڈوبی ساری ہے
خونِ تمنا رنگ بنا ہے آنکھوں کی پچکاری ہے

اب ذرا شمیم کرہانی کا اندازِ فکر ملاحظہ فرمائیے جو موجودہ دور کے ایک ممتاز شاعر ہیں ؎

دل جلوں کی پاک ہولی آ گئی زندگی پر پرچم نیا لہرا گئی!

یہی نہیں ہولی کی رنگینیوں اور رعنائیوں کے بیان کے ساتھ ساتھ ہولی کی مبارک باد بھی شاعر نے اپنی شاعرانہ تخیل کی مدد سے ہو بہو تصویر کھینچ کر پیش کر دی ہے جو ثمر بسوانی کی زبان سے سنیے:

یہ رنگ و نور میں گنگ و جمن ہولی مبارک ہو
بہارِ نکہتِ حسنِ چمن ہولی مبارک ہو
یہ شمعِ انجمن دُرِ انجمن ہولی مبارک ہو
مبارک ہو تمھیں اہلِ وطن ہولی مبارک ہو

اور موجودہ دور کے مشہور شاعر نذیر بنارسی ہولی ملن کا ڈھنگ کس خلوص و محبّت سے بتاتے ہیں:

کہیں پڑے نہ محبت کی مار ہولی میں پریم دل سے کرو دل سے پیار ہولی میں
آنا تو ایک برس کا خمار ہولی میں گلے میں ڈال دو باہوں کا ہار ہولی میں
ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں

اسی طرح ڈاکٹر سلام سندیلوی نے ہولی کا پورا نقشہ ترتیب دیا ہے:

برس رہا ہے گلال سب پر چاروں اور چلی پچکاری

(باقی ص ۳۱ پر)

عبدالمجیب سہالوی

بیماری زحمت بھی اور رحمت بھی

بیماری خیر بری چیز تو ہی ہے مگر اللہ نے نہ تو کسی چیز کو اچھائیوں سے بالکل محروم رکھا ہے اور نہ برائیوں سے بالکل پاک۔ بیماری میں جہاں بہت سی برائیاں ہیں وہاں کچھ اچھائیاں بھی ہیں۔ مثلاً جوں ہی آدمی بیمار پڑتا ہے اس میں رقت قلب، خوف خدا اور دنیا کی بے ثباتی کے نیک جذبات یکدم ابھر آتے ہیں اور اسے اس قسم کے اشعار سے خاصی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے ؎

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا
جب لاد چلے گا بنجارہ

اور بعض وقت بخار کی تیزی کے عالم میں واقعی بنجارے کے بیل کی گھنٹی دور سے کانوں میں سنائی بھی دینے لگتی ہے ورنہ آپ کے کیا چوری اس زمانے میں جبکہ ضرورت کی ہر چیز اڑن چھو ہو گئی ہے آدمی کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم کرنے ہی سے فرصت نہیں ملتی تو وہ بے چارہ دنیا کی بے ثباتی پر کیا غور کرے گا اور مارے پیٹے اگر کہیں دم مارنے کی فرصت مل بھی گئی تو بی سیاست کے آج کل وہ چرچے ہیں کہ کوئی جب اور جہاں بھی منھ کھولے گا تو گھوم پھر کر سیاست ہی پر تان ٹوٹے گی یعنی ؎

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک

چاہے دوستوں کی بے تکلف محفل ہو یا سنجیدہ حضرات کا اجتماع جب کوئی ذکر چھڑے گا تو بات کا سیاست تک پہنچ جانا یقینی ہے۔ شادی بیاہ حتیٰ کہ غمی کے موقعوں پر بھی جب بات چلے گی تو بی سیاست اپنی ٹانگ ضرور اڑا دیں گی۔ اور پھر پوری محفل پر اس طرح چھا جائیں گی کہ کسی کو اور کسی بات کا ہوش ہی نہ رہے گا۔ غالب صاحب کے زمانے میں بادہ وساغر کا اتنا زور تھا کہ انھیں کہنا پڑا تھا ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

آج کل سیاست کا اتنا زور ہے کہ اگر کوئی سیاسی مسائل پر اظہار خیال نہ کرے اور موقع محل کا لحاظ کر کے خاموش رہے تو اسے سمجھدار نہیں بدھو خیال کیا جائے گا۔

آپ سوچتے ہونگے کہ بیماری کی اچھائیاں بیان کرتے کرتے سیاست کا دورہ کیسے پڑ گیا۔ وجہ ظاہر ہے بیماری کا ذکر ہو یا صحت کا بیچ میں کود پڑنا یقینی ہوتا ہے بہر حال سیاست کی دخل اندازی پر معافی کے بعد یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ منھ کا مزا بدلنے کے لیے کبھی کبھی بیمار پڑ جانا کوئی بری بات نہیں، بھاگم بھاگ اور مسلسل دوڑ دھوپ والی اس زندگی میں چور چور اور ہلکان ہو جانیوالے جسم کو اگر دم مارنے کی فرصت مل سکتی ہے تو بیماری ہی کے دامن میں مل سکتی ہے ورنہ زندگی کا کھٹ راگ آدمی کو چوبیس گھنٹے گھن چکر بنائے رکھتا ہے اور کسی وقت بھی پیٹھ سے چار جامہ اتار کر دم لینے کی اجازت نہیں دیتا بس بیماری ہی ایک ایسا بہانہ ہے جس کا سہارا لے کر آپ اپنے تھکے ہارے جسم کو آرام کا موقعہ فراہم کر سکتے ہیں۔

مگر ایک تجربہ کی بات یاد رکھیے کہ اگر آپ واقعی بیماری میں آرام کے خواہشمند ہیں تو جہاں تک ہو سکے آپ اپنی بیماری کی شہرت نہ ہونے دیں۔ میں نے یہ بات کہنے کو تو کہہ دی لیکن یہ کام آسان نہیں میرے علم میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ بیماری میں فرصت کے اوقات اس فہرست کے بنانے میں صرف کرتے ہیں کہ محلے پڑوس، عزیز و اقارب، دوست احباب میں کون کون انھیں دیکھنے آیا اور کون دیکھنے نہیں آیا تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔ وقت ضرورت کی تشریح

کی ضرورت نہیں آپ خود ہی سمجھ گئے ہونگے۔

بہر حال آپ کو اگر عیادت نہیں آرام عزیز ہے تو آپ عام رواج کے مطابق اپنی بیماری کو کچھ مبالغہ کے ساتھ شہرت دینے کے بجائے اس کی خبر کم سے کم لوگوں تک پہنچنے دیجیے ورنہ عیادت کرنے والے نیک دل کرم فرما عیادت کرتے کرتے آپ کا کچومر نکال دیں گے مگر یہ بھی تو مشکل ہے کہ اگر کوئی عیادت کرنے نہ آئے تو آپ لیٹے لیٹے یہ سوچ کر کڑھتے رہیں گے کہ اس بھری دنیا میں کوئی آپ کی خیریت پوچھنے والا بھی نہیں شاید یہی وجہ ہے کہ بیمار اپنی بیماری کے دن خاموشی سے کاٹنے کے بجائے اس کا ڈھنڈورا پیٹنا مناسب خیال کرتا ہے اور عیادت کرنے والے بے دریغ عیادت کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جب بیماری کا اعلان اور عیادت لازمی ہی قرار پاگئی تو بیماری کا بہانہ بھی بے کار ہو گیا اور آرام بدستور حرام رہا۔ اس لیے بیماری عیادت کرنے والوں سے درخواست ہے کہ عیادت کرنے آئیں اور ضرور آئیں لیکن زیادہ فراخدلی کا ثبوت دیں اور عیادت بے طوالت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی، پر عمل کرنے کے بجائے اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف عیادت کا فرض ادا کرکے مریض کو زیادہ سے زیادہ آرام کا موقعہ دیں اور طویل قیام اور طویل تر کلام کے ذریعہ سنت اور نوافل کا ثواب حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں۔

میں عیادت کرنے والے کرم فرماؤں کے تفصیلی جائزے سے آپ کا آرام حرام کرنے کی قطعی کوشش نہ کروں گا لیکن اس مرتبہ بیماری کے موقعہ پر ایک خاص بات معلوم ہوئی ہے اس کا اپنے ہی سینے میں چھپائے رکھنا بخالت معلوم ہوتا ہے اس لیے سمع خراشی کی معافی کے ساتھ ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر بیمار کو تسکین، ہمت اور حوصلہ بخشنا ہے تو جہاں تک ہو سکے وہی لوگ عیادت کے لیے آئیں جو بیمار سے زیادہ نحیف ولاغر اور اس سے زیادہ سن رسیدہ ہوں۔

ہماری حالیہ بیماری میں عیادت کے لیے بہت سے کرم فرما آئے لیکن اللہ جانتا ہے جو تسکین، جو ہمت اور جو حوصلہ اپنے ایک پرانے ساتھی کی عیادت اور زیارت سے حاصل ہوا وہ کسی سے نہ ہوا ہمارے یہ ساتھی چاہے اقرار نہ کریں لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ عمر میں ہم سے بہت نہیں تو اچھے خاصے بڑے ہیں اور ریٹائرڈ ہو چکے ہیں اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں ان کے جسم لاغر میں ہڈی اور چمڑے کے علاوہ گوشت کے نام کی کوئی چیز ڈھونڈھنے کے باوجود ملنا مشکل ہے، ہاڈی اور چمڑا تو کپڑے اتار کر اگر سمیٹ لایا جائے تو بلا مبالغہ آپ کے دستی رومال میں آسانی سے آسکتا ہے۔ جب وہ ریٹائرڈ ہوئے تھے تو کچھ پاس پڑوس والوں نے ان کی پیٹھ پیچھے اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ دیکھو بچارے کو پراویڈنٹ فنڈ کی رقم سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ بھی ملتا ہے۔ یا خالی بیوی بچے مزے اڑائیں گے لیکن دشمنوں کے منہ میں خاک اللہ نظر بد سے بچائے ان کا بال تک بیکا نہ ہوا اور وہ رتی بھر گھٹے یا بڑھے بغیر زندہ و سلامت ہیں اور بڑی مستعدی سے برابر تعزیت اور عیادت کے فرائض انجام دے رہے ہیں اللہ ان کی عمر دراز کرے ہمیں قوی امید ہے کہ وہ ابھی عرصہ تک یہ نیک کام انجام دیتے رہیں گے۔

دوسرے لوگ عیادت کے لیے آئے اور انھوں نے تسکین کے لیے وہی گھسے پٹے رسمی الفاظ کہے کوئی خاص بات نہیں میعادی بخار ہے چند دن میں اتر ہی جائے گا رہی کمزوری سو وہ تو کچھ دن ضرور رہے گی اس کے بعد انھوں نے قوت بڑھانے والے انٹ سنٹ دو چار ٹانکوں کے نام بتائے اور چلے گئے لیکن اپنے ان دبلے پتلے لیکن چمڑے دوست کو دیکھ کر معاً یہ صحت افزا خیال آیا کہ اللہ جیتا رکھے اگر وہ اس لاغر اور نحیف جسم و جان کے ساتھ میری اور میرے جیسے سیکڑوں دوست و احباب کی عیادت کے لیے زندہ و سلامت رہ سکتے ہیں تو مجھے اپنی زندگی کی طرف سے مایوس ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں کیونکہ اس بیماری کے عالم میں بھی خدا جھوٹ نہ بلائے تو ان سے دس گنا نہیں تو چھ گنا ضرور ہوں۔ یقین کیجیے اس حوصلا افزا خیال کے آنے کے بعد جب ٹمپریچر دیکھا گیا تو بالکل نارمل تھا اور وہ اپنے جسم لاغر کے ساتھ زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ گھبراؤ نہیں، تمہارے مرنے کا کیا سوال ہے ابھی میں برسوں اسی طرح عیادت کے لیے آتا اور زندگی کے لیے حوصلہ دیتا رہوں گا۔ میں نے شکر و نیاز کے جذبہ سے سر جھکا لیا اور دل سے بے ساختہ ان کی درازی عمر کے لیے دعا نکل پڑی جو وہ سنے بغیر چلے گئے کیونکہ وہ عیادت کے بعد ہم سے اپنی درازی عمر کی دعا لینے نہیں آئے تھے بلکہ محض خلوص و محبت میں آئے تھے جس کا بدلہ نہیں ہو سکتا۔ بیماری رقت قلب کے ساتھ تلافی مافات کا جذبہ بھی بے طرح پیدا کر دیتی ہے دل بے اختیار یہ کہتا سنائی دیتا ہے۔ قسم لے لو اچھے ہو گئے تو انشاء اللہ ایک وقت کی نماز بھی قضا نہ ہونے دیں گے نماز سے فائدہ ہی فائدہ ہے کوئی نقصان تو ہے نہیں اگر پابندی سے پانچوں وقت نماز پڑھی جائے، تو پاکی کے ساتھ

ساتھ صحت پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے۔

چنانچہ یہ صحت مند خیال آتے ہی صحت پر اچھا اثر پڑنے لگا اور صحتیاب ہو کر ہم نے پانچوں وقت کی نماز خشوع و خضوع کے ساتھ شروع کر دی مگر جوں جوں کمزوری دور ہوتی گئی اور ظالم زندگی کی سرگرمیاں بڑھنے لگیں نماز بلا ارادہ پنج وقتہ کے بجائے گنڈے دار ہو گئی پھر رفتہ رفتہ بیماری کے مکمل خاتمہ کے ساتھ ساتھ رقت قلب بھی ختم ہو گئی اور روز آخرت کی فکر کرنے کے بجائے دال نون لکڑی کے چکر میں ایسا پھنسا کہ اے بیماری کے دوران کیے گئے عہد کی طرف مڑ کر دیکھنے کی بھی فرصت نہ ملی اور کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر، کا ورد کرنے لگا۔

بیماری کے زمانے میں یہ انکشاف بھی ہوا کہ بچے جن کو ہم صحت کے عالم میں کوئی لفٹ نہیں دیتے اور ان کی بھولی بھالی باتوں کو بے اعتنائی سے ہوں ہاں کہہ کر ٹال دیتے ہیں، بیماری میں بڑے رفیق ثابت ہوتے ہیں بڑوں کو تو گھر کے دھندے اور علاج اور دوا کی فراہمی کی فکر سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ زیادہ دیر تک آپ کے پاس بیٹھ کر آپ کا دل بہلا سکیں لیکن گھر کے ننھے منے گڈو، گڈّی آپ کی تنہائی دور کرنے کا تنہا سہارا ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ غم عشق اور غم روزگار دونوں سے بے نیاز ہوتے ہیں اس لیے وہ یار کی گلیوں اور روزگار کے دفتروں کے چکر لگانے کی فکر میں گھلنے کے بجائے چڑا چڑیا کی کہانی سنتے اور سنانے سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں اور کہانی سننے اور سنانے کی فرصت گھر میں سوائے بیمار کے کسے ہو سکتی ہے چنانچہ بیماری کے دوران ہماری رفاقت بچوں نے بہت کی انھیں ہمارے قریب لانے میں کہانی سننے اور سنانے کا شوق تو تھا ہی اس کے علاوہ کچھ کشش ان سنتروں اور سیبوں کی بھی تھی جو ہمارے قریب میز پر رکھے رہتے تھے۔ ہم بھی اس خیال سے کہ خالی باتوں سے تو پیٹ بھرتا نہیں کھاتے وقت انھیں بھی شریک کر لیتے تھے۔

کہانی سنتے سنتے ایک دن ان میں سب سے چھوٹے صاحبزادے منّو میاں کو معلوم نہیں ہمارے پاس بیٹھے بیٹھے کیا سوجھی کہ فرمانے لگے آپ کو گانا بجانا بھی آتا ہے کہ نہیں۔ میں نے کہا کہانی میں نے سنائی ہے اب گانا تم سناؤ میرا خیال تھا کہ وہ کچھ تکلف کریں گے کیوں کہ ابھی ان کا تتلاپن گیا نہیں ہے مگر توبہ کیجیے وہ تو بڑی پھرتی سے اٹھ بیٹھے اور مزا لے لے کر یہ فلمی گیت گانے لگے 'تم نے پوڈر لگایا صبح ہو گئی، کاجل لگایا رات ہو گئی' ابھی وہ آنکھیں بند کیے جھوم جھوم کر گیت گا ہی رہے تھے کہ ان کی امّی نے ان کے سر پر ٹیپ مارتے ہوئے کہا اور جو انجانا لگایا آنکھ کھل گئی، امّی نے تو ایک ہی ٹیپ ماری تھی۔ بچوں کو اچھا موقع مل گیا اور انھوں نے اتنی ٹیپیں رسید کیں کہ منّو میاں کی آنکھیں ہی نہیں کھل گئیں بلکہ دن میں تارے بھی نظر آنے لگے اور وہ گانے کے بجائے گدّی سہلاتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے اور ان کے ساتھ ہی دوسرے بچے بھی چل دیے۔

بیماری کے شروع میں خاص طور پر بخار کی حالت میں کھانا دیکھ کر بیمار کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن بخار اترتے ہی کھانے کا ہوکا ہو جاتا ہے۔ بس چلے تو جو سامنے آ جائے سب کھا جائے لیکن میعادی بخار میں مبتلا مریض کے تیمار دار اچھی طرح جانتے ہیں کہ شادی کے پیچھے کی طرح میعادی بخار کا پچھا بھی بڑا کٹھن ہوتا ہے اور ذرا سی بے احتیاطی مریض کو موت کے گھاٹ اتار سکتی ہے۔ چنانچہ اب ہمارے تیمار دار ہماری دوا کی فکر کم اور ہمارے کھانے کی نگرانی بڑی چوکسی سے کر رہے تھے۔

اللہ جانتا ہے کہ ہم کوئی بد پرہیز آدمی نہیں لیکن میعادی بخار اترنے کے بعد مریض اتنا ہی ندیدہ ہو جاتا ہے جتنا شادی سے پہلے نوجوان۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے ہر اچھی صورت دیکھ کر نوجوان کے منہ میں پانی آ جاتا ہے اور مریض چٹ پٹا کھانا دیکھ ہی بے تاب ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ پرہیز کی ماری آنتوں پر بخار کے پھندے سے چھٹنے کے بعد بھوک کا ایسا سخت دورہ پڑتا ہے کہ اچھا بھلا آدمی دیوانہ ہو جاتا ہے۔ آپ کیا پوچھ رہے ہیں ابھی بارہ بھی نہ بجے ہوں گے اچھی طرح ناشتہ کر لینے کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم برسوں کے بھوکے ہیں ہماری آنتیں قل ھو اللہ کی نہیں معلوم کتنی بار تلاوت کر چکی ہیں۔ اب آپ ان بھوکی آنتوں کی تلاوت کب تک سنیے گا کھانے میں دیر نہ ہوتی تو روکتا اچھا خدا حافظ۔

★

موجودہ نسل سے خطاب

ڈاکٹر کسیری کشور

تم نے کیا بند مکانوں کو کبھی دیکھا ہے ؟
کسی اجڑی ہوئی بستی سے کبھی گزرے ہو ؟
سڑکیں ویران، مکاں بند، دکانیں خاموش
اور ہر سمت دریچوں میں لٹکتے جالے
مردنی چھائی ہر اک بام پہ ہر در بیہوش
زنگ آلود وہ سانکل وہ پرانے تالے
شام آتے ہی وہ بڑھتے ہوئے لمبے سائے
جیسے ہر کونے سے آسیب نکل آئے ہوں
دھجیاں ٹوٹی ہوئی گھونسلے یوں لٹکے ہوئے
زیست کے پیڑ میں جوں موت کے پھل آئے ہوئے
دل ترستا ہے کوئی بولے کوئی آہٹ ہو
اس قدر غم ہے کہ دنیا کے بٹائے نہ مٹے
کون دے ساتھ یہاں کون کرے دل جوئی
اپنے ہی پاؤں کی آہٹ سے کلیجہ دھڑکے
اور پگ پگ پہ یہ محسوس ہو جیسے کوئی
خون پینے کو چلا آتا ہو چپکے چپکے
آمد مرگ سنو زیست کی پرواز سنو
ارے دل تھام کے پُر ہول یہ آواز سنو
چرمراہٹ کسی ٹوٹے ہوئے دروازے کی
پھڑپھڑاہٹ کسی طائر کے گزر جانے کی
تم نے دیکھا ہی نہیں دورِ غلامی وطن
تم تو پیدا ہی ہوئے چھاؤں میں آزادی کی
تم نے محسوس نہیں کی وہ دل وجاں کی دکھن
تم پہ کب مشق ہوئی ہے فن صیادی کی
بند تھیں ہم پہ کئی شاہراہیں کتنے چمن
کس میں دم تھا کہ کہے "اپنا وطن اپنا وطن"

پہلے ہر جملے کو ہر لفظ کو ہم تولتے تھے
بولتے تھے تو بہت سوچ کے لب کھولتے تھے
نظم گوئی کے لیے صرف قصائد کے رسوم
جنبش پا کے لیے صرف قواعد کے رسوم
گھر میں بیٹھو تو زباں بند ہم چمٹے ہوئے
گھر سے نکلو تو بہت سہمے ہوئے سمٹے ہوئے
وہ گراں باری آزار کہ اللہ اللہ
ہائے وہ سطوت اغیار کہ اللہ اللہ
بے دھڑک تم تو زباں اپنی ہلا لیتے ہو
تم تو آقاؤں سے بھی آنکھ ملا لیتے ہو
یاد ہے تم کو کہ اک پیر یہاں آیا تھا
ساتھ میں اپنے وہ جادو کی چھڑی لایا تھا
پیرِ اکسیر گری اپنا ہی تن من پھونکا
ادھ مری قوم تھی اس قوم میں جیون پھونکا
اس کے جینے کا بھی مرنے کا سبب یاد نہیں
نام بھی اس کا بہت لوگوں کو اب یاد نہیں
ذکر ماضی کو سمجھتے ہو جو زحمت سمجھو
اتنا کافی ہے کہ آزادی کی قیمت سمجھو
ہم ادھیڑوں کی یہ اک عمر کا سرمایہ ہے
ہم اسے لائے ہیں اور تم نے اسے پایا ہے
اپنا ذمہ نہ کسی غیر پہ جا کر رکھو"
تم کو رکھنا ہے اسے اس کو سجا کر رکھو
چند روز اور مرے دوست فقط چند ہی روز
ہم سے سن لو کوئی نغمہ، کوئی نوحہ، کوئی سوز
سب تمہارا ہی ہے ہم کچھ بھی نہ لے جائیں گے
قول دہراتے شہیدوں کا چلے جائیں گے

"در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں"

خسرو متین خسرو

جانور ہمارے استاد ہیں

اگر کوئی آپ سے کہے کہ جانور ہمارے اُستاد ہیں تو آپ شاید اس کی دماغی صحت پر شبہہ کرنے لگیں یا پھر اسے ایک مذاق سے زیادہ اہمیت نہ دیں، مگر یہ ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا اور جو کہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ موجودہ دور میں آج ہم نے جو کچھ ترقی کی ہے سب جانوروں کی مرہونِ منت ہے۔ یہاں تک کہ چاند کی تسخیر کا کارنامہ بھی ایک چھوٹے سے جانور کی دین ہے۔ بظاہر تو یہ بات بڑی ہی عجیب سی لگتی ہے کہ جانور ہماری موجودہ ترقی میں کس طرح معاون ہوسکتے ہیں۔ آئیے آج ہم آپ کو کچھ ایسے جانوروں کے بارے میں بتاتے ہیں جو کہ کسی نہ کسی طریقہ سے ہماری موجودہ ترقی میں معاون ومددگار ہیں۔

میدانِ جنگ کا بہترین ہتھیار ٹینک کچھوے کی ساخت کو دیکھ کر بنایا گیا ہے۔ خطرے کے وقت کچھوا اپنی گردن اور ہاتھ پیروں کو اپنی مضبوط کھوپڑی کے اندر چھپا لیتا ہے اور اس طرح وہ دشمن سے اپنا بچاؤ کرتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی دورانِ جنگ ٹینک میں چھپ کر بیٹھتا ہے اور دشمن کا مقابلہ کرتا ہے۔

راڈر آج کے دور کی ایک اہم ایجاد ہے۔ اس کے ذریعہ دشمن ملک کے جہاز کا دور ہی سے علم ہو جاتا ہے اور آنے والے خطرہ کا بچاؤ کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح راڈر ہمارے لیے ایک نعمت سے کم نہیں، لیکن آپ سن کر حیرت کریں گے کہ اسے

بنانے کا خیال انسان کو چمگادڑ کو دیکھ کر ہوا۔ چمگادڑ اس کا استعمال آج سے لاکھوں بلکہ کروڑوں سال قبل سے کر رہی ہے۔ اس کے جسم سے ہر وقت ایک قسم کی شعاعیں خارج ہوتی رہتی ہیں، جن کی مدد سے یہ بغیر دیکھے ہوئے اپنی پرواز جاری رکھتی ہے۔ جب اس کے سامنے کوئی چیز آتی ہے تو یہ شعاعیں اس چیز سے ٹکرا کر واپس ہو جاتی ہیں اور اس طرح چمگادڑ کو اس کا علم ہو جاتا ہے اور یہ اپنی پرواز کا رخ بدل دیتی ہے۔

ہوائی جہاز جس نے برسوں کے سفر کو مہینوں، مہینوں کے سفر کو دنوں اور دنوں کے سفر کو گھنٹوں اور منٹوں میں تبدیل کر دیا ہے اور جو کہ نقل وحمل کا بہترین ذریعہ ہے۔ اُس کو بنانے کا خیال انسان کو اڑنے والے جانوروں کو دیکھ کر ہوا جس کا ٹھوس ثبوت یہ ہے کہ شروع میں جب انسان نے ہوا میں اڑنے کی کوشش کی تھی اس نے اپنے پہلوؤں میں مصنوعی پر لگائے تھے۔

چند برس قبل امریکہ نے انسان کو چاند پر اتار کر ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ چاند کی تسخیر کا یہ کارنامہ کوئی معمولی کارنامہ تھا۔ یہ ایک خواب تھا ــــــ جسے انسان نہ جانے کتنی صدیوں سے دیکھتا آرہا تھا۔ سائنس نے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کر دیا ہے۔ راکٹ کے متعلق یہ بات تو سبھی لوگ جانتے ہیں کہ یہ نیوٹن کے اس اصول پر بنایا گیا ہے کہ ہر عمل کے ساتھ، اس کے

برابر، اگر مخالف سمت میں ردِ عمل ہوتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت کچھ ہی لوگوں کو معلوم ہوگی کہ اس اصول پر بعض جانور ہزاروں سال سے کاربند ہیں۔ سمندر میں جھینگے سے مشابہہ ایک جانور پایا جاتا ہے جسے سی ایرو (SEA ARROW) کہتے ہیں۔ یہ جانور اپنے جسم کے پچھلے حصے میں بہت سا پانی بھر لیتا ہے اور جس وقت یہ شکار کرتا ہے یا دشمن سے بچاؤ مقصود ہوتا ہے تو یہ اپنے جسم کو زور سے دباتا ہے۔ اس دباؤ سے جسم میں جمع شدہ پانی ایک باریک سوراخ سے تیز دھار کی شکل میں نکلتا ہے اور یہ جانور نہایت تیزی سے مخالف سمت میں حرکت کرتا ہے۔

برقی قوت ہماری زندگی کا ایک اہم حصہ بن گئی ہے۔ موجودہ ترقی میں اس نے اہم رول ادا کیا ہے۔ ذرا سوچیے اگر یہ نہ ہوتی تو کیا ہم رات کی تاریکی میں دن کی مانند دیکھ سکتے تھے؟ مئی اور جون کی جھلسا دینے والی گرمی اور نومبر دسمبر کی سرد راتوں میں کیا ہم ان سے مقابلہ کر سکتے تھے؟ آج ہمیں گرمی کے موسم میں کسی ہل اسٹیشن جانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ، کولر، پنکھوں اور ایر کنڈیشن کے ذریعہ ہم اس پر کافی حد تک قابو پا چکے ہیں۔ اسی طرح جاڑوں کی سرد راتوں میں آتشدان کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی، کیونکہ یہ کام ہیٹر بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتا ہے۔ اسی طرح بہت سی چیزیں مثلاً سینما، کارخانے فیکٹریاں اور ریل گاڑی وغیرہ سب اسی کی محتاج ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ برقی قوت ہمارے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ بظاہر تو اس کی ایجاد کا سہرا انسان ہی کی سر بندھتا ہے، لیکن جب ہم کارخانۂ قدرت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی، کیوں کہ یہی برقی قوت جس کو ہم اپنی ایجاد و اختراع تصور کرتے ہیں، کارخانۂ قدرت میں انتہائی سادہ لیکن حیرت انگیز طور پر موجود ہے۔ شمالی امریکہ کی ندیوں میں 'ایل' نام کی ایک مچھلی پائی جاتی ہے۔ یہ مچھلی سانپ کی سی ساخت کی ہوتی ہے۔ خطرے کے وقت یہ ایک منٹ میں کئی بار پانچ سو وولٹ سے زیادہ بجلی چھوڑتی ہے۔ جس سے اس کے حریف کو سخت جھٹکے لگتے ہیں اور وہ فوراً اس سے دور بھاگ جاتا ہے۔

اشک آور گیس کا رواج جانوروں میں بھی رائج ہے۔ سکنک (SKAUNK) چوہے کی شکل کا ایک جانور ہے۔ اس کا رنگ سیاہ اور چہرہ چمگادڑ سے مشابہہ ہوتا ہے۔ جسامت میں یہ عام چوہے سے کچھ بڑا ہوتا ہے۔ اس کے جسم میں آنسو گیس تیار کرنے والے غدود ہوتے ہیں۔ جب کوئی جانور اس پر حملہ کرتا ہے تو یہ اشک آور گیس چھوڑتا ہے۔ جس سے حملہ آور عارضی طور پر اندھا ہو جاتا ہے۔ یہ گیس دس منٹ تک اپنا اثر دکھاتی ہے۔

آج کے دور میں اشتہار بازی کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے عجیب و غریب طریقے اپنائے جاتے ہیں۔ خوشنما رنگوں اور خوشبوؤں سے صرف انسان ہی متاثر نہیں ہوتا بلکہ جانور، پرندے اور کیڑے مکوڑے بھی ان چیزوں پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ پیڑ، پودوں کو اپنی افزائش کے لیے جانوروں، پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کی مدد درکار ہوتی ہے۔ انھیں اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے پیڑ، پودے بھی خوشنما رنگوں اور خوشبوؤں کا سہارا لیتے ہیں۔

بڑھیا مائی کو تو سبھی نے دیکھا ہوگا اور سینکڑوں مرتبہ اس کے ذریعہ بچپن میں اللہ میاں کو سلام بھی بھجوایا ہوگا۔ یہ دراصل آگ کا بیج ہوتا ہے جس کے چاروں طرف روپہلی ریشے ہوتے ہیں جو کہ اس کے وزن سنبھالے رہتے ہیں اور یہ ہوا میں دور دور تک اڑتا چلا جاتا ہے۔ ہوائی جہاز سے پیراشوٹ کے ذریعے، نیچے اترنے کا خیال انسان کو اسے دیکھ کر ہوا۔

آپریشن کرنے سے قبل ڈاکٹر اس مقام کو سن کر دیتا ہے جہاں آپریشن کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس طرح مریض کو کسی قسم کی تکلیف کا احساس نہیں ہو پاتا۔ خون آشام چمگادڑ (VAM-PIRE BAT) انسان کا خون چوسنے سے قبل ایک قسم کا مادہ چھڑکتی ہے جو اس حصے کو وقتی طور پر سن کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات یہ چمگادڑ سوتے ہوئے انسان کا خون چوس لیتی ہے اور اسے محسوس تک نہیں ہوتا۔

پیراکی کا شوق آج کے انسان میں کسی قدر تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں اس کے بڑے بڑے مقابلے ہوتے ہیں اور بین الاقوامی سطح پر بھی یہ ہر سال منایا جاتا ہے۔ لیکن حیرت کا مقام ہے کہ انسان نے یہ فن بطخ، مچھلی، مینڈک اور دوسرے آبی پرندوں سے سیکھا ہے۔ جس کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ آج کل جو پیراکی کا لباس استعمال کیا جاتا ہے اس میں پیروں کی ساخت مینڈک اور بطخ کے پیروں سے مشابہ ہوتی ہے۔

اسی طرح تیرتے وقت تیراک اپنی آنکھوں پر ایک خاص قسم کا چشمہ چڑھا لیتا ہے جس کی مدد سے وہ پانی میں بھی دیکھ سکتا ہے۔ مینڈک کی آنکھ پر تین پلکیں ہوتی ہیں۔ تیسری پلک سے وہ وہی کام لیتا ہے جو ایک تیراک اپنی عینک سے۔

کاغذ کی نلکیوں سے ٹھنڈے مشروب پینا ایک فیشن بن گیا ہے چھوٹی بڑی، ہر تقریب میں ان نلکیوں کا خاص طور سے انتظام کیا جاتا ہے۔ کارخانۂ قدرت میں بے شمار ایسے جانور موجود ہیں جو ہزاروں، لاکھوں سال سے قدرتی نلکیوں کا استعمال کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر پھولوں کے گرد منڈلانے والے بھونرے اور تتلیاں۔ ان چھوٹے چھوٹے پتنگوں کے منہ کے دائیں بائیں دو باریک سی نلیاں ہوتی ہیں۔ جب یہ پتنگے چاہتے ہیں تو نلیاں پھیل جاتی ہیں اور ان کی مدد سے یہ رس چوس لیتے ہیں۔ استعمال کے بعد یہ نلیاں خود بخود سکڑ جاتی ہیں اور دوبارہ اسی وقت کھلتی ہیں جب ان کی ضرورت پیش آتی ہے۔

ٹیلی فون، ریڈیو اور وائرلیس پیغام رسانی کے بہترین ذرائع مانے گئے ہیں۔ ان کے ذریعے ہم ہزاروں میل دور پر اپنے دوست یا عزیز سے بآسانی گفتگو کر لیتے ہیں۔ ٹیلی فون کے موجد گراہم بیل، کو شاید ہی اس بات کا علم ہوا ہو کہ بعض جانور ہزاروں سال قبل سے ہی پیغام رسانی کے طریقوں سے واقف ہیں خرگوش کی ایک خاص قسم ہوتی ہے جسے (CON TON- TAIL) کہتے ہیں۔ یہ خرگوش دشمن کو دیکھتے ہی اپنی پچھلی ٹانگوں کو ایک مخصوص انداز میں زمین پر مارتا ہے۔ یہ آواز زمین کے اندر سفر کرتی ہوئی چاروں طرف پھیل جاتی ہے اور دوسرے خرگوش فوراً خبردار ہو جاتے ہیں۔ لطف کی بات یہ کہ اس قدرتی ٹیلی فون سے خرگوش ہی نہیں، دوسرے جانور بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔

لیجئے اب آخر میں ایک تاریخی واقعہ سپردِ قلم کرتا ہوں۔ دنیا کے سب سے پہلے قاتل ہابیل نے جب اپنے ہی بھائی قابیل کو قتل کر دیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ایک حقیر سے جانور ہی کے ذریعہ لاش کو زمین میں دفن کرنے کا خیال اس کے ذہن میں ڈالا تھا۔

ہولی شعر و سخن کے آئینہ میں:

(صفحہ ۲۴ کا بقیہ)

کھیل رہے ہیں رنگ آپس میں پیار سے دونوں نر اور ناری
لالوں لال ہیں کرتے، دھوتی، جوتے، ٹوپی، جمپر ساری
ڈھول بجاتے، ہولی گاتے لوگ پھر رہے ہیں گاؤں میں
لے کر اپنی اپنی ٹولی، آئی ہولی، آئی ہولی!

بہرحال ہولی کی رنگا رنگ شادمانی میں زمانہ کی گرانی کا احساس بھی شاعر کو جھنجھوڑتا ہے جو عوام کے اس پُر مسرت تہوار کے رنگ میں بھنگ کر دیتا ہے۔ ان شدید جذبات اور گرانی کی قیامت خیزی کو احمد علی شوق قدوائی نے واضح الفاظ میں ظاہر کیا ہے:

گرانی میں اب کی جو آئی ہے ہولی — نیا سوانگ میں سوانگ لائی ہے ہولی
نہ پوری کچوری، نہ آلو نہ اردی — دُہائی ہے ہولی دُہائی ہے ہولی
جلایا ہے جس طرح سوکھے نے ہم کو — اسی طرح ہم نے جلائی ہے ہولی
گرانی نے پہلے سے پھیری تھی جھاڑو — مگر پھانکنے خاک آئی ہے ہولی
یہ افلاس دیکھے یہ ٹیکس اور مہنگی — یہ کیوں آئی کیا بوکھلائی ہے ہولی
للائن کی ٹھنٹھنی، بٹیوا کی تڑیا — گرد گانٹھ کر کے منائی ہے ہولی

اُردو شعر و سخن کے اس آئینہ میں ہولی کی مکمل تصویر اور اس کی مختلف کیفیات جلوہ گر ہیں جو ہر صاحبِ ذوق کے لیے دعوتِ نظارہ ہیں۔

نظیر اکبر آبادی ـــــ قومی یک جہتی کا علمبردار

خدیجہ رحمان

نظیر اکبر آبادی کو اردو نظم کا اگر باوا آدم کہا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ ہمارے ناقد حضرات نے اردو نظم نگاری کا سہرا عموماً حالی کے سر باندھا ہے۔ لیکن حالی سے پہلے نظیر نہ صرف اس کی بنیاد رکھ چکے تھے بلکہ اس کو منزل عروج تک پہنچا چکے تھے۔

نظیر اکبر آبادی نے نہ صرف تعداد کے اعتبار سے کافی نظمیں لکھی ہیں بلکہ تنوع اور مختلف عنوانات کے اعتبار سے بھی ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور خوبی یہ ہے کہ ہر نظم میں موضوع کے لحاظ سے زبان استعمال کی ہے۔ مثلاً منظر کشی کی زبان دوسری ہے۔ میلوں کا ذکر دوسری زبان میں کیا ہے۔ پتنگ بازی اور تیراکی کا بیان دوسری زبان میں ہے۔ منقبت، نعت اور حمد کی زبان عربی آمیز ہے۔ اس طرح سری کرشن سے متعلق نظموں کی زبان سنسکرت آمیز ہے۔ غرض جتنی مختلف النوع زبان نظیر نے لکھی ہے۔ اردو کے کسی دوسرے شاعر کے کلام میں ملنا محال ہے۔

اس طرح انھوں نے بے شمار الفاظ استعمال کیے ہیں الفاظ کا یہ بیکراں خزانہ کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہ تھا۔

میر انیس نے الفاظ بہت زیادہ تعداد میں استعمال کیے ہیں مگر انھوں نے ایک مخصوص طبقے کی ترجمانی کی اسی لیے ایک مخصوص طبقے کی زبان بھی اختیار کی ہے اور مخصوص قسم کے الفاظ استعمال کیے ہیں کیونکہ ان کا موضوع صرف واقعہ کربلا ہے۔

نظیر نے عوام اور خواص دونوں کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے موضوعات بھی مختلف ہیں اور بے شمار ہیں اور ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے موضوع کے اعتبار سے زبان اختیار کی ہے اور اس میں عربی، فارسی، سنسکرت اور عام بول چال کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ان الفاظ میں بہت سے الفاظ متبذل اور سوقیانہ بتائے جاتے ہیں چونکہ نظیر نے عوام کی ترجمانی کی ہے اور ان کے جذبات و کردار کو پیش کیا ہے اس لیے ان کے حسب مراتب الفاظ نے اپنے مافی الضمیر کو کمال خوبی سے ادا کیا ہے اور نشست کے اعتبار سے اپنے اشعار میں نہایت مناسب اور موزوں ہیں۔ لہذا ان کو مبتذل اور سوقیانہ کہنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ جس لفظ کے استعمال سے انھوں نے اپنا مفہوم ادا کر دیا ہے، دوسرا لفظ اس خوبی سے اس کو ادا نہیں کر سکتا ہے۔ اگر ایک مداری کے الفاظ پیش کرنا ہوں تو اس کے لیے ایک فلاسفر کی زبان کا استعمال درست نہ ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ الفاظ کا ذخیرہ جو نظیر کے پاس تھا وہ نہایت حیرت انگیز تھا۔

انھوں نے اپنی غزلوں میں اپنے عہد کی زبان استعمال کی ہے۔ لیکن نظموں میں انھوں نے عموماً اپنے مستقبل کی زبان استعمال کی ہے۔ یعنی تقریباً عہد حاضر کی اردو اور ہندی چند الفاظ جو متروک ہو چکے ہیں ان کو نکال دیجیے اور قواعد میں جو کچھ تبدیلیاں ہو چکی ہیں ان کو نظر انداز کر دیجیے تو نظیر کی زبان آج کی زبان سے بالکل قریب آجاتی ہے۔

نظیر کے کلام کی دوسری اہم اور عظیم خصوصیت ہے ان کی مذہبی رواداری اور قومی یک جہتی۔ وہ ایک مسلمان شاعر نہیں بلکہ ایک قومی شاعر تھے۔ وہ سب سے پہلے ہندوستانی تھے۔ اس کے بعد

وہ انسان تھے اور آخر میں وہ ہندستان تھے۔

ان کی نظر میں نہ کوئی ہندو ہے نہ کوئی مسلمان، ان کو سب انسان معلوم ہوتے ہیں۔ بھائی معلوم ہوتے ہیں اور دوست معلوم ہوتے ہیں ان کے حلقۂ احباب اور حلقۂ ارادت میں جس طرح مسلمان تھے اسی طرح ہندو بھی۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہندو زیادہ تھے اور مسلمان کم اور یہ ان کی قومی یک جہتی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

ان کو ہندوستان سے والہانہ محبت تھی۔ ہندستانیوں سے محبت تھی اور ہندستانی چیزوں سے محبت تھی اور اس کا ثبوت ان کا کلام ہے۔ انھوں نے دجلہ اور فرات کا ذکر نہیں کیا ہے۔ انھیں گنگ و جمن سے پیار ہے۔ انھوں نے شیریں فرہاد کا ذکر نہیں کیا ہے۔ انھیں اپنے دیش کی گوری اور سانولی سے پیار ہے۔ غرض ان کا پورا کلام ہندستان، ہندستانی سماج اور ہندستانی پس منظر سے معمور ہے۔

اور یہ بات صرف شاعری تک محدود نہ تھی۔ بلکہ وہ اس پر پوری طرح عمل پیرا تھے جس طرح وہ عید اور شب برات مناتے تھے اس طرح وہ ہولی اور دیوالی بھی مناتے تھے۔ جس طرح انھوں نے عید اور شب برات وغیرہ پر نظمیں لکھی ہیں اسی طرح ہولی اور دیوالی وغیرہ پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ اور یہ رسماً نہیں لکھی گئی ہیں بلکہ ان میں جوش مسرت، امنگ اور خلوص کی زرح پوری طور پر جلوہ فگن ہے۔

ان نظموں میں محض خیال آرائی نہیں ہے، لفاظی اور مبالغہ نہیں ہے بلکہ اپنے عہد اپنے سماج اور اپنے مزاج کی بہترین ترجمان ہیں اور اس لیے اگر ان کو اس عہد کی سماجی تاریخ کہا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ انھوں نے نہ صرف ان تیوہاروں پر روشنی ڈالی ہے بلکہ اس عہد کے مذاق، اخلاق، کردار اور اس کے علاوہ اس زمانے کی اقتصادی حالت اور سیاسی زندگی بھی پیش کردی ہے۔ سیاسی جمود اور قومی بے حسی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

ہولی پر ان کی متعدد نظمیں ہیں ان کی منظر کشی اور مصوری قابل ستائش ہے ان کے چند بند ملاحظہ فرمائیں :

خوشی کی دھوم سے ہر گھر میں رنگ بنوائے
گلال عبیر کے بھر بھر کے تھال رکھوائے
نشوں کے جوش ہوئے راگ رنگ ٹھہرائے
جھمکتے روپ کے بن بن کے سوانگ دکھلائے
ہوا ہجوم عجب ہر کنار ہولی کا

گلی میں کوچے میں غل شور ہو رہے اکثر
چھڑکنے رنگ لگے یار ہر گھڑی بھر بھر
بدن میں بھیگے ہیں کپڑے گلال چہروں پر
مچی یہ دھوم تو اپنے گھروں سے خوش ہوکر
تماشا دیکھنے نکلے نگار ہولی کا

گلال اور عبیر تو ہولی میں اب بھی استعمال ہوتا ہے لیکن وہ ارزانی کا عہد تھا اور یہ گرانی کا دور ہے۔ لہذا آج کل تھال بھر بھر کے نہیں منگائے جاتے ہیں۔ بس بھرے تھال تو دکانوں ہی پر نظر آتے ہیں۔ نظیر کا عہد بھی اقتصادی بحران کا شکار تھا حکومت تو ختم ہو چکی تھی صرف نام باقی تھا اور اس نام ہی پر لوگ مرتے تھے۔ جھوٹا فخر و ناز بھی سروں پر سوار تھا۔ لوگ پرانی رسموں اور روایتوں کو گلے لگائے ہوئے تھے۔ اور اب یہی ان کا سرمایۂ حیات تھا۔ اور اسی پر ان کو فخر و ناز تھا۔ لہذا ؎

خالص کہیں سے تازی اک زعفراں منگا کر
مشک و گلاب میں بھی مل کر اسے بسا کر
شیشے میں بھر کے نکلا چپکے لگا چھپا کر
مدت سے آرزو تھی اک دم اکیلا پا کر
اک دن صنم پہ جا کر میں رنگ ڈال آیا

صرف عبیر و گلال ہی استعمال نہیں ہوتا تھا بلکہ محبوب ترین ہستیوں کے لیے مشک و زعفران بھی مہیا کیا جاتا تھا۔ یعنی خصوصیت کے لیے مشک و گلاب سے بھی ہولی کھیلی جاتی تھی۔ یہ گویا عزت افزائی، پرستش اور اظہارِ محبت کا ذریعہ تھا۔

ہولی کے لوازمات تو اس وقت بھی وہی تھے جو آج ہیں یعنی رنگ رلیاں منانا، رنگ کھیلنا، عبیر و گلال لگانا، ٹولیوں کی صورت میں یار دوستوں کے وہاں ہولی کھیلنے جانا لیکن اس عہد میں ان تیوہاروں کی ادائیگی میں رسم و رواج کا دخل کم تھا

اور اخلاص کا زیادہ اور اس خوشی میں صرف لب ہی نہیں ہنستے تھے۔ بلکہ دل بھی ہنستے تھے:

ارباب بزم پھر تو، وہ شاہ اپنے لے کر
سب ہم نشین حسب دل خواہ اپنے لے کر
چالاک چست کافر گم راہ اپنے لے کر
دس بیس گل رخوں کو ہم راہ اپنے لے کر
یوں ہی بھگو نے مجھ کو وہ خوش جمال آیا

اور یہ رسم آج تک قائم ہے۔ ہولی کے دن سڑکوں پر بہار آجاتی ہے۔ خوشی اُمنڈ آتی ہے اور لوگ جوش مسرت سے سرشار اپنے دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ رنگ پھینکنے کے لئے نکل جاتے ہیں۔ پھر جب یہ ٹولی چلتی ہے تو ہر شخص کی اپنی ایک دھج ہوتی ہے اور یہ گویا اس ٹولی کی ایک قسم کی آرائش ہوتی ہے کہ ہر شخص ایک نرالی دھج بناتا ہے اور اسی میں مست ہوتا ہے اور اس طرح ٹولی کا ہر شخص قابل توجہ بن جاتا ہے۔

ہاتھوں میں دل بروں کے ساغر کسی کے شیشا
کمروں میں جھولیوں میں کیسروں گلال باندھے
اور رنگ کی بھی بھر کر مشک و پکھال آیا

اتنا ہی نہیں جب یہ ٹولیاں رنگ کھیلتی چلتی تھیں تو ان میں بعض من چلے گالیاں بکتے چلتے تھے اور ان گالیوں پر کوئی لڑتا نہیں تھا اور نہ برا ہی مانتا تھا۔ یہ گویا محبت کی گل کاریاں ہوتی تھیں۔

نگہ نے دی، مے گل رنگ کی بھری پیالی
جو ہنس کے دو ہمیں پیارے تم اس گھڑی گالی
تو ہم بھی جانیں کہ ایسا ہے پیار ہولی میں

محبوب کی زباں سے ادا ہو تو گالی بھی پیار معلوم ہوتا ہے۔ اور اس روز تو گویا ہر گالی پیاری ہوتی تھی۔ اور پیار کا ایک جام ہوتی ہے۔

ہولی کے دوسرے لوازمات بھی تھے۔ جن میں خاص تھا رقص وسرود جس کے بغیر آج بھی ہولی نامکمل رہ جاتی ہے۔ لہٰذا یہ اس وقت بھی ضروری تھا اور آج بھی۔

گھنگرو کی پڑی آن پھر کان میں جھنکار
سارنگی بھی ہوتی ہے طنبوروں کی مدد گار
طبلوں کے ٹھیکے، طبلق پہ سازوں کے بجے تار
راگوں کے کہیں غل، کہیں ناچوں کے بندھے تار
ڈھولک کہیں جھنکار رہے مردنگ زمین پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمین پر

جگہ جگہ جشن منائے جاتے تھے عیش وطرب کی محفلیں جمتی تھیں۔ لوگ اپنے اپنے کمال دکھاتے تھے اور حوصلے نکالتے تھے۔ اور ان محفلوں میں صرف رقص وسرود ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ ناؤ نوش بھی جاری وساری رہتا تھا۔ اور اس سے محفل کا رنگ دوبالا ہو جاتا تھا اور اس میں چار چاند لگ جاتے تھے۔

مے خانے میں دیکھو تو عجب سیر ہے یارو
واں مست پڑے لوٹے ہیں اور کرتے ہیں ہوہو
مستی کے سوا عیش نہیں ہوش کسی کو
شیشوں میں پیالوں میں صراحی میں خوشی ہو
اچھلے ہے پڑی بادۂ گل رنگ زمین پر

غرض ہولی عیش ونشاط کا تیوہار ہوتا ہے اس میں لوگ جی بھر کے عیش کرتے ہیں اور خوشی مناتے ہیں۔

ہیں ناچ کہیں، راگ کہیں، رنگ کہیں نوش
پیتے ہیں نشے عیش میں سب لوٹیں ہیں مدہوش
معجوں کہیں پیتے ہیں کہیں بھنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

یعنی محفل میں ایک ہی قسم کا نشہ نہیں ہوتا بلکہ ہر شخص اپنے اپنے مذاق کے مطابق اپنی تسکین کرتا ہے۔

غریب اور رئیس سب ہی ہولی مناتے ہیں لیکن غربت اور امارت کی طرح ان کے تیوہار منانے میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ان کے عیش ونشاط میں بھی فرق ہوتا ہے۔ عوام تو سڑکوں پر باغوں میں اور مے خانوں میں جشن منا لیتے ہیں۔ مگر راجوں مہاراجوں کے یہ شایان شان نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کے جشن بھی ان کی طرح مخصو

ہوتے ہیں اور مخصوص جگہوں پر ہوتے ہیں یعنی

مزے کی ہوتی ہے ہولی بھی راؤ راجوں کی
کئی مہینوں سے ہوتا ہے بھاگ کا ساماں
مٹکتی ہولیاں گاتی ہیں گائنیں گھڑیاں
گلال عبیر بھی چھایا ہے در زمین و زماں
چہار طرف ہے رنگوں کی مار ہولی میں

نظیر کے عہد میں دلی کی طرف جمع فاعل کے ساتھ اس کا فعل بھی جمع ہی لایا جاتا تھا۔ جیسے گائنیں گھڑیاں حالانکہ آج گائنیں گھڑیاں بولا نہیں جائے گا۔ کیونکہ اب یہ متروک ہو چکا ہے۔ اور یہ کوئی غلطی نہیں ہے بلکہ زندہ زبانوں میں وقت کے ساتھ تغیر آیا ہی کرتے ہیں اور یہ بہت ضروری ہیں اور زندگی کی علامت ہیں۔

ہر عہد کے ساتھ اس کے کچھ الفاظ کا متروک ہو جانا لازمی ہے۔ کیونکہ زبان کی ترقی اور بقا کے لیے اس کی ضرورت ہے لہذا اگر کوئی لفظ ہمارے عہد میں نہیں بولا جاتا اور عہد گزشتہ کے کسی شاعر نے اس کو استعمال نہیں کیا ہے تو یہ کوئی عیب نہیں ہے۔

غرض ہولی کے لوازمات تو راجوں کے وہاں بھی وہی ہوتے ہیں۔ رقص و سرود، مے خواری، بادہ نوشی، رنگ کاری، عبیر و گلال کی بیا کاری۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عوام خود ناچتے گاتے ہیں اور راجوں مہاراجوں کے وہاں ارباب نشاط، پھر ان کے وہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ نہایت اعلیٰ پیمانے پر۔

امیر راجہ تو نہیں ہوتے مگر امیر ضرور ہوتے ہیں۔ لہذا ان کے جشن راجوں سے کم پایے کے ہوتے ہیں لیکن عوام سے اعلیٰ۔

چونکہ یہ بھی اپنی آن بان پر جان دیتے ہیں اس لیے سڑکوں پر عوام کے ساتھ شریک ہونا باعث توہین سمجھتے ہیں اور گھروں ہی میں جشن منا لیتے ہیں۔ یعنی

امیر جتنے ہیں، سب اپنے گھر میں ہیں خوش حال
قبائیں پہنے ہوئے تنگ تنگ گل کی مثال
بنائے گہری طرح حوض، ٹل کے سب فی الحال
مچاتے ہولیاں آپس میں لے عبیر و گلال
یہی ہیں رنگ سے رنگیں نگار ہولی میں

نظیر نے برج کی ہولی کی بڑی تعریف کی ہے۔ کہتے ہیں ایسی ہولی ہم نے اور کہیں نہیں دیکھی۔

یہ سیر ہولی کی ہم نے تو برج میں دیکھی
کہیں نہ ہووے گی اس لطف کی میاں ہولی

برج کی ہولی نظیر کو بہت پسند تھی۔ اور اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ کہ

گھروں سے سانوری اور گوریاں نکل چلیاں
کسنبھی اوڑھنی اور مست کرتی اچپلیاں
جدھر کو دیکھیں اُدھر مچ رہی ہیں رنگ رلیاں
تمام برج کی پریوں سے بھر رہیں گلیاں
مزا ہے، سیر ہے، در ہر کنار ہولی میں

یعنی برج میں عورتیں بھی گھروں سے باہر نکل کر ہولی کھیلتی تھیں۔ اور ظاہر ہے اس طرح لطف دوبالا ہو جاتا تھا۔ اور ہولی میں چار چاند لگ جاتے تھے۔ اور

کوئی تو شرم سے گھونگھٹ میں سین کرتی ہے
اور اپنے یار کے نینوں میں نین کرتی ہے

یعنی ہولی میں حسن و عشق بھی جاگ جایا کرتے تھے اور اس کشش سے لوگ سڑکوں پر اس کثرت سے جمع ہو جاتے تھے کہ راستے بند ہو جایا کرتے تھے۔

لگا کے چوک سے اور چارسو تلک دیکھا
کہ جا گہ ایک بھی تل دھرنے کی نہیں ہے فدا
تمام بھیڑ سے ہر طرف بند ہے رستا
تس اوپر رنگ کا بادل ہے اس قدر برسا

چونکہ یہاں عورتیں بھی مردوں کے ساتھ ہولی کھیلتی تھیں اس کشش سے تمام عورت مرد سڑکوں پر نکل کر ہولی کھیلا کرتے تھے رنگ کے سیلاب امڈنے لگتے تھے اور راستے بند ہو جایا کرتے تھے ایسی زبردست بھیڑ ہوتی تھی کہ کاندھے سے کاندھا چھلتا تھا۔

بوڑھے بچے، جوان سب ہی اس میں شریک ہوا کرتے تھے۔

جو ہولی مناتے تھے وہ ہولی کھیلنے جاتے تھے جو نہیں مناتے تھے وہ محض تماشا دیکھنے جایا کرتے تھے۔ غرض اس جشن میں شریک سب ہوتے تھے اور لطف سب اٹھاتے تھے۔ اور اس سے دلچسپی سب کو تھی۔ ہولی کی آمد سب ہی کے لیے تفریح اور مسرت کا باعث ہوتی تھی۔ فرماتے ہیں۔

نظیر ہولی کا موسم جو جگ میں آتا ہے
وہ ایسا کون ہے، ہولی نہیں مناتا ہے
کوئی تو رنگ چھڑکتا ہے، کوئی گاتا ہے
جو خالی ہاتھ ہے، وہ دیکھنے کو جاتا ہے
جو عیش چاہو سو ملتا ہے یار ہولی میں

رنڈیاں اس عہد میں گویا ایک بنیادی ضرورت بن چکی تھیں۔ رنڈی رکھنا کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ بلکہ یہ بھی جاہ و حشم کی ایک علامت تھی اور اس لیے لوگ علانیہ رنڈیاں رکھا کرتے تھے۔ اور ان کا مردوں کے ساتھ آزادانہ میل جول رہا کرتا تھا اور اس پر کوئی انگلی نہیں اٹھاتا تھا۔ کیونکہ سب ہی اس رنگ میں رنگے ہوئے تھے حالانکہ اس عہد کے بحران اور تباہی کا ایک بڑا سبب یہ رنڈیاں بھی تھیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ رنڈی کی اہمیت کے مقابلہ میں بیوی کی عظمت دم توڑ چکی تھی۔ وہ تو صرف جائز اولاد پیدا کرنے کی ایک مشین تھی اور بس۔ اسی رنڈی کے بارے میں بتاتے ہیں۔

محبوب پری رو پیاروں کی ہر جانب نوک جھونکی ہے
کچھ آن رنگیلی چلتی ہے، کچھ یاں ادھر سے رکی ہے
کچھ نینیں ترچھی سحر بھری، کچھ گھات لگاوٹ جو کی ہے
کچھ شور آہا ہا ہا کا، کچھ دھوم اہو ہو ہو کی ہے
یہ عیش، یہ حظ، یہ کام، یہ ڈھب ہر آن جتایا ہولی نے

ان نظموں کی زبان عام فہم ہے۔ چند الفاظ نکال دینے کے بعد یہ ہمارے عہد کی "روزمرہ" بن سکتی ہے اور یہ نظیر کا کمال ہے۔ اور ان کی دور اندیشی کا روشن ثبوت ہے۔ کہ انھوں نے اپنے عہد کے مذاق کے برخلاف صاف اور سادہ زبان اختیار کی۔ تخیل کے قلعہ بنانے کے بجائے حقیقت نگاری کی بنیاد ڈالی۔

محاکات کا استعمال نظیر کے یہاں لاجواب ہے۔ وہ جس واقعہ کا ذکر کرتے ہیں اس کا ایک جیتا جاگتا منظر کھینچ دیتے ہیں۔

ان کے بعض شعر مرقع نگاری کا لاجواب نمونہ ہیں۔ تیوہاروں پر ان کی جو نظمیں ہیں وہ بھی حقیقت سے معمور ہیں۔ ویسے تو نظیر کا پورا ہی کلام نشاط انگیز ہے۔ مگر ان نظموں میں یہ چیز بدرجۂ اتم موجود ہے۔ کیونکہ نظیر خود ان تیوہاروں کو مناتے تھے، ان کے کھیل تماشوں میں شریک ہوتے تھے، ان سے مسرور ہوتے تھے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی دلی مسرت اور جوش سے یہ نظمیں معمور ہیں۔

نظیر کے عہد میں ہندو اور مسلمانوں میں وہ تفرقہ نہ تھا جو بعد میں "انگریزوں نے لڑاؤ اور حکومت کرو" کے تحت پیدا کر دیا تھا۔ مسلمان ہندوؤں کے تیوہاروں میں شریک ہوتے تھے اور آج بھی دیہاتوں میں ہندو مسلمان مل کے ہولی دیوالی مناتے ہیں اور اسی طرح آج بھی بہت سے ہندو گھرانوں میں تعزیے رکھے جاتے ہیں۔

غرض ہولی کے بیان پر مشتمل نظموں میں ایک نظم بہترین ہے۔ اس میں ہولی کی روح مکمل طور پر جلوہ گر ہے یہ پوری نظم بذات خود رقصاں ہے اور صوتی آہنگ اس میں اپنے کمال پر ہے۔ اس نظم کے ذریعہ گویا انھوں نے ہولی کو ہمارے سامنے مجسم جلوہ گر کر دیا ہے۔ اس کے لفظ لفظ سے خوشی جوش اور مسرت پھوٹی پڑتی ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں۔

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
ساغر مے کے چھلکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں جھکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی
ہو ناچ رنگیلی پریوں کا، بیٹھے ہوں گل رو رنگ بھرے
کچھ بھیگے تانیں ہولی کے، کچھ ناز و ادا کے ڈھنگ بھرے
دل پھولے دیکھ بہاروں کو اور کانوں میں آہنگ بھرے
کچھ طبلے کھڑکیں رنگ بھرے کچھ عیش کے دم منہ چنگ بھرے
کچھ گھنگرو تال چھلکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی۔

گل زار کھلے ہوں پریوں کے، اور محفل کی تیاری ہو
کپڑوں پر رنگ کے چھینٹوں سے خوش رنگ عجب گلکاری ہو
منہ لال، گلابی آنکھیں ہوں، اور ہاتھوں میں پچکاری ہو
اس رنگ بھری پچکاری کو، انگیا پر تک کر ماری ہو
سینوں سے رنگ ڈھلکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اس رنگ رنگیلی مجلس میں، وہ رنڈی ناچنے والی ہو
منہ جس کا چاند کا ٹکڑا ہو، اور آنکھ بھی مے کی پیالی ہو
بدمست بڑی متوالی ہو، ہر آن بجاتی تالی ہو
مے نوشی ہو، بے ہوشی ہو، بھڑوے کی منہ میں گالی ہو
بھڑوے بھی بھڑوا بکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی

یہاں رنڈی اور اس کے ساتھیوں کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے ان سے کسی شائستہ انداز کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا نظیر نے جو کچھ دیکھا اس کی ترجمانی کر دی۔ انھوں نے اپنے عہد کی خیال آرائیوں سے دامن بچا کے واقعیت اور حقیقت کی طرف ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا ہے اور یہاں سے ایک نئے اور اہم باب کا اضافہ ہوتا ہے اور اس اعتبار سے نظیر کا کلام ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہولی ہی کی طرح انھوں نے دیوالی کی بھی عکاسی کی ہے۔ اس نظم سے بھی اس عہد کے سماج پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے خوبیاں اور خامیاں سب ہی کھل کر بیان کر دی ہیں۔ کوئی بات لطف دے جاتی ہے اور کوئی کھٹکتی ہے۔ اس نظم میں وہ رنگینی اور سرخوشی نہیں ہے جو ہولی کی نظموں میں ہے۔ دراصل ہولی کے لوازمات دوسرے ہیں اور دیوالی کے دوسرے۔ لہٰذا ان کے انداز بیان میں بھی فرق نمایاں ہے۔ کچھ بند ملاحظہ فرمائیں:

جہاں میں یارو عجب طرح کا ہے یہ تیوہار
کہ لیپ رہے ہیں در و بام کوچہ و بازار
کھلونے کھیلوں بتاشوں کا گرم ہے بازار
کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے ادھار
سبھوں کو فکر ہے اب جا بجا دوالی کا

دیوالی کی ابتدا صفائی ستھرائی سے ہوتی ہے۔ پھر دیوالی کے دن میلا لگتا ہے۔ جس میں کھیلوں، چوڑوں، بتاشوں اور مٹی کے کھلونوں کی دکانیں کثرت سے لگتی ہیں۔ اور بچے سب سے زیادہ انھیں پر ٹوٹتے ہیں۔ بھاؤ تاؤ ہوتا ہے۔ دکاندار گاہک پر طنز کے تیر برساتا ہے۔ اور گاہک کو شرمندہ کرتا ہے اور متعدد گاہک محض شرمندگی مٹانے کو سودا خرید لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

کوئی کہے ہے "اس ہاتھی کا بولو کیا لوگے"
یہ دو جو گھوڑے ہیں۔ ان کا بھی بولو کیا لوگے
کوئی کہے ہے کہ "اس بیل کا ٹکا لوگے"
وہ کہتا ہے کہ "میاں جاؤ بیٹھو کیا لوگے
ٹکے کو لے لو کوئی چوگھڑا دوالی کا"

کوئی گھڑا فقط اک چوگھڑا اٹھانے کو
کوئی جو گجری کا پیسا لگا بتانے کو
وہ کہتا ہے کہ "میں بیچوں گا پانچ آنے کو
یہ پیسا رکھو تم اپنے افیم کھانے کو
کہ جس کی لہر میں دیکھو مزا دوالی کا"

غرض دکاندار طنزیہ انداز میں گاہک کو خوب شرمندہ کرتا ہے۔ یہ طنز نہایت لطیف اور گہرا ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی موثر بھی۔ یعنی گاہک بگڑ بھی نہیں سکتا یہاں تک کہ شرم سے اس کا سر جھک جاتا ہے اور قیمت کو نامناسب سمجھنے کے باوجود بھی اس کو خریدنا پڑتا ہے۔

دیوالی کی خاص چیز ہے قمار بازی۔ اس میں کوئی رونق اور رنگینی تو ہوتی نہیں۔ بلکہ اس سے بہت سی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مالی نقصان بھی پہنچتا ہے اور گھر میں لڑائی جھگڑے بھی ہوتے ہیں۔ یعنی

کسی نے گھر کی حویلی گرو رکھا ہاری
جو کچھ تھی جنس میسر، بتا بتا ہاری

کس نے چیز کسی کی بڑا چھپا ہاری
کس نے گٹھری پڑوسن کی اپنی لا ہاری
یہ ہار جیت کا چرچا بڑا دوالی کا

پانچ مصرعوں میں ایک مکمل کہانی بیان کردی ہے ایک جیتا جاگتا نقشہ پیش کردیا ہے اور ایک زخم دکھا کے اس کے علاج کی طرف بھی رجوع کیا ہے۔

نظیر نے کبھی ناصحانہ انداز نہیں اختیار کیا ہے۔ نصیحتیں بہت کی ہیں مگر ہنسی مذاق کے انداز میں کہ پہلی نظر میں یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اس بات کے کہنے سے ان کا منشا کیا ہے لیکن انسان غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

وہ اس کے جھونٹے پکڑ کر کہے ہے ماروں گا
ترا جو گہنا ہے سب تار تار اتاروں گا
حویلی اپنی تو اک داؤں ہی میں ہاروں گا
یہ سب تو ہارا ہوں، خندی تجھے بھی ہاروں گا
چڑھا ہے مجھ کو بھی اب تو نشا دوالی کا

غرض اس جوے سے دوالی میں جو بدمزگی پیدا ہوا کرتی تھی اس کو انھوں نے محسوس کیا اور اس کے بعد اس کا اظہار بھی کر دیا۔

اب اس حد تک جوا نہیں کھیلا جاتا کہ مکان اور بیوی داؤں پر لگادی جائے وہ چونکہ سیاسی اور اخلاقی بحران کا عہد تھا لہٰذا جیسے سب باتوں میں لوگ حد سے گزر گئے تھے ویسے ہی اس میں بھی ضرورت سے زیادہ تجاوز کر گئے تھے۔ اب علم اور تجربہ نے اس برائی کو ختم کر دیا ہے۔

یہ نظم کافی طویل ہے۔ یہاں صرف چند بند پیش کیے گئے ہیں۔ بہرحال انھوں نے اپنے دور کی دیوالی کا اچھا نقشہ کھینچا ہے اور صاف وسادہ زبان میں بہت اچھے مرقعے پیش کر دیے ہیں اور کئی کہانیاں سُنادی ہیں کئی واقعات دکھا دیے ہیں جو عبرت خیز ہیں اور سبق آموز ہیں اور پھر انھوں نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ

نصیحتیں ہیں انھیں دل سے مانیو یارو
جہاں کو جا دیہ قصہ لکھا ئیو یارو
جو جواری ہو، نہ برا اس کا مانیو یارو
نظیرؔ آپ بھی ہے، جواریا دوالی کا

نظیر کو جو بات ناپسند تھی اس کا انھوں نے ذکر کر دیا ہے۔ اور نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہے اور بطور معذرت یہ بھی کہہ دیا ہے کہ خود بھی نظیر جواری ہے اس سے تم بُرا نہ ماننا کیونکہ یہ ہم سب کی خامی ہے لہٰذا اس لت کو چھوڑ دینا مناسب ہے۔

انھوں نے کرشن جی سے متعلق بھی بہت سی نظمیں لکھی ہیں اور ان میں جوش عقیدت اپنے کمال پر ہے اور انداز نہایت والہانہ ہے۔ دراصل نظیرؔ اکبرآبادی قومی یک جہتی کے پیامبر تھے۔

★

ستم ظریفی تو کوئی دیکھے ۔۔۔

قیصر سرمست

چند سال پہلے لکھنؤ میں ایک صاحب ہوا کرتے تھے جن کا قد ایسا اونچا کہ بہتیروں سے نکلتا ہوا۔ رنگ قدرے سانولایا ہوا، بدن چھریرہ، فرنچ کٹ سے لگا کھاتی ہوئی خشخشی ڈاڑھی، ڈاڑھی کی اس کمی کو گھنی اور لانبی مونچھوں نے پورا کر دیا تھا۔ آنکھوں میں ایک خاص چمک لیے ہوئے، بظاہر سنجیدہ لیکن پیشانی خندہ ۔۔ یہ خاکہ ہے سید مقبول حسین صاحب مرحوم کا، جو ظریف لکھنوی کے تخلص سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ حضرت ظریف کے انتقال پر ان کے بڑے بھائی مولانا علی نقی صاحب صفی لکھنوی نے یہی مصرعہ کہا تھا جسے میں نے اپنے مضمون کے عنوان کے لیے منتخب کیا ہے۔

بیشتر تذکرہ نویسوں نے حضرت ظریف کے حالات لکھنے سے پہلوتہی کی ہے۔ کیوں؟ شاید اس وجہ سے کہ وہ مزاح نگار تھے۔ مگر ایسا بھی نہیں ہو سکتا اس لیے کہ ان کے پیشرو حضرت اکبر الٰہ آبادی کے تذکروں سے کتابیں پٹی پڑی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہوگی سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ بھی ایک طرح کی ستم ظریفی ہے کہ ہنسانے والا روتا چھوڑ کر چلا گیا۔ مگر اس سے زیادہ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ شوکت تھانوی جیسا ذمہ دار شخص "نقوش" کے شخصیات نمبر میں "لکھنؤ کی چند شخصیتیں" کے زیرِ عنوان ظریف لکھنؤی کے متعلق سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے یہ لکھنے لگے کہ "بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ظریف کے کلام کا بیشتر حصہ مولانا صفی کا ہے۔ ایسا سمجھنے کی وجہ بھی انہی سے سنئے اور غور کیجئے کہ یہ کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ نہ صرف خود ظریف بلکہ مولانا صفی بھی بھائی کو شاعر بنانے کی خوش فہمی میں مبتلا رہے۔

شوکت تھانوی فرماتے ہیں۔

"اور یہ شبہ اس وقت سے تقویت حاصل کر گیا جب لکھنؤ کے مشہور ماہر امراض جنسی ایس۔ اے۔ حکیم کا ایک منظوم اشتہار مولانا صفی نے اپنے نام سے لکھا تھا۔ اس اشتہار میں جو شوخی اور ظرافت تھی وہ تقریباً وہی تھی جو ظریف صاحب کے کلام میں نظر آتی ہے۔ بہر حال ہم کو اس سے بحث نہیں۔ اگر یہ واقعہ بھی ہے تو اس کو گھر کا لین دین سمجھنا چاہیے۔[1] ظریف صاحب بہر حال مولانا صفی ہی سے مشورہ فرماتے تھے۔ بڑے بھائی اور استاد نے اگر کچھ بخش دیا ہو تو کیا عجب ہے۔"

اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ باتیں اگر کسی کے نوک قلم سے نکل جاتیں تو دکھ بھی نہیں ہوتا۔ مگر جب شوکت تھانوی مرحوم جیسا انسان تحقیق کئے بغیر ایسی بے سر و پا باتیں ضبط تحریر میں لائے تو انتہائی تکلیف ہوتی ہے اور نہ تو ہم اسے مزاحیہ خاکہ سمجھ کر نظر انداز کر سکتے ہیں اس لیے کہ کہیں بھی مزاحیہ نقطہ نہیں جھلکتا۔ ان کی تحریر پڑھنے کے بعد چند باتیں سوالیہ نشان کی صورت میں سر ابھارنے لگتی ہیں۔ پہلی چیز تو یہ کہ مولانا صفی نے اپنے ظریفانہ کلام کو اپنے نام سے کیوں نہیں طبع کرا دیا؟ کیا وہ اس قابل نہیں تھا یا اسے اپنے نام سے شائع کرانے میں اپنی ذلت سمجھتے تھے؟ جب ایسا تھا تو پھر مولانا صفی جیسے ثقہ انسان نے یہ کیسے گوارا کر لیا کہ وہ کلام ظریف کے نام سے شائع ہو؟ یا ظریف کا کلام (دوسرے لفظوں میں صفی کا کلام) اس منظوم جنسی اشتہار سے بھی گیا گزرا تھا؟ کیونکہ منظوم جنسی اشتہار

---

[1] یہ شاعری نہ ہوئی بلکہ پیسہ یا جائداد کا معاملہ ہو گیا۔

اپنے نام سے شائع کروانے پر تو صفی مرحوم راضی ہو گئے۔ مگر
مزاحیہ اور طنزیہ کلام ظریف کو بخش دیا!! یہ بھی تو ممکن ہے کہ
صفی چونکہ اس میدان کے سورما نہ تھے اور ان سے فرمائش کی گئی
ہوگی اس لئے انھوں نے ظریف سے وہ اشتہار لکھوا لیا ہو۔ اس
بات کا بھی تو امکان ہے۔

کلام پر اصلاح لینا اگر کسی کی دین ہوتا ہے تو پھر اس
الزام سے (چند ایک کو چھوڑ کر) شاید ہی کوئی شاعر محفوظ ہو۔ اور
ستم ظریفی دیکھئے کہ "نقوش" کے اس سات سو صفحات والے
"شخصیات نمبر" میں پہلے تو ظریف پر کوئی علیحدہ مضمون نہیں اور
جہاں "لکھنؤ کی چند ادبی شخصیتیں" کے تحت ایک صفحے کا تذکرہ آیا
بھی ہے تو اس رنگ کا۔

ظریف ۱۸۷۰ء کو لکھنؤ (مولوی گنج) میں مولانا
سید فضل حسین صاحب کے گھر پیدا ہوئے اور سات سال کی
عمر میں تعلیم کے لیے بٹھا دیے گئے۔ کلام شریف اپنی بڑی بھاوج
یعنی مولانا صفی کی اہلیہ سے پڑھا۔ ظریف مولانا صفی کے قائم کردہ
اسکول میں تیرہ سال کی عمر (۱۸۸۳ء) تک فارسی، عربی
اردو اور انگریزی کی تعلیم حاصل کرتے رہے اور اس کے ساتھ
ساتھ اپنے ہم عمر ٹڈوی پنڈت برجن لال سے ہندی اور سنسکرت
بھی پڑھتے رہے۔ ظریف یوں تو کسی یونیورسٹی کے سند یافتہ تو
نہیں تھے مگر ان کے وسیع مطالعہ اور علمی صحبت نے نظر میں وسعت
دی تھی۔ اور حافظ کو بیدار کر دیا تھا۔ ظریف نے کمسنی ہی میں قافیہ
پیمائی شروع کر دی تھی۔ مولانا صفی نے ہی ظریف کو ظریفانہ
شاعری کرنے پر اکسایا تھا۔ مگر ظرافت ایسی ہو جو طنز و مزاح کی
حدود کو پار نہ کرے بلکہ سننے والا کچھ حاصل کرے۔ دوسرے معنوں
میں بد مذاقی کے مرض کے علاج کے لیے طنز و مزاح میں لپٹی ہوئی
گولیوں کا کام دے۔ جس کسی نے بھی ظریف پر قلم اٹھایا ہے اس
نے ان کے پڑھنے کے خاص انداز کا ذکر ضرور کیا ہے۔ ان کا
کلام سن کے ہنسی کے مارے سامعین کا برا حال ہو جاتا تھا مگر
ظریف کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی چھائی رہتی۔ سننے والے ہنسی
سے جتنے بے حال ہوتے جاتے اتنا ہی ظریف اپنے چہرے پر
سنجیدگی طاری کر لیا کرتے تھے۔

ظریف اکبر الہ آبادی مرحوم کے عین حیات بیسیوں
شاعروں کو لوٹ چکے تھے۔ مگر تحقیقاً ظریف کا زمانہ حضرت
اکبر کی موت کے بعد شروع ہوتا ہے۔

ظریف نے سامعین کی تفریح کے لیے شروع شروع میں
خالص مزاحیہ انداز میں شاعری کی مگر ان کے سینے میں جو ایک
حساس دل دھڑک رہا تھا اس نے انھیں وقت اور حالات
کے ساتھ بدلنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ ان کے کلام میں مزاح کی
چاشنی کے ساتھ طنز کی کڑواہٹ اور نشتریت بھی آتی گئی۔
جس میں مقصدیت تھی اصلاح کا پہلو نمایاں ہوتا گیا۔ اور پھر
ایک وقت ایسا بھی آیا کہ لوگ انھیں اکبر ثانی کہنے لگے۔

ظریف کی ابتدائی شاعری میں مزاح کے ساتھ لفظی الٹ
پھیر کی شعبدہ بازی تھی جیسے ان اشعار کو لیجئے۔

ترے کپڑوں کی لادی لادنا جب یاد کرتے ہیں
تو اکثر شب کو دھوبی کے گدھے فریاد کرتے ہیں

نہاتے وقت کرتہ قیس کو یہ تھی دعا ماں کی
الٰہی خیر کرنا میرے بچے کے گریباں کی

کہا کرتے تھے والد قیس کے فرط محبت میں
نہیں معلوم کس جنگل میں برخوردار بیٹھے ہیں

مجمع عشاق میں جو تھا سڑی دیوانہ تھا
گھر کسی کا کیا تھا، اچھا خاصا پاگل خانہ تھا

نزع میں پکڑے ہوئے تھے اپنی داڑھی شیخ جی
رہ گئی دم اور مرغ روح نے پرواز کی

دولتی سے سمند ناز کی غیروں کا مر جانا
یہی تو ہے طویلے کی بلا بندر کے سر جانا

شوخی دست جنون فتنہ ساماں دیکھئے
ناف تک پہنچی مدد چاک گریباں دیکھئے

بجا کرتا لیاں تقریر پر تحسیں کے پردے میں

مہذب لوگ اسپیکر کو کیا اُلّو بناتے ہیں

رحمت ہے میکشوں پہ عجب کارساز کی
کُھلیا سامنے ضعیفی میں پیمانہ ہوگیا

آئی یہ فصل گردشِ لیل و نہار سے
گورے ہزاروں مر گئے کالے بخار سے

ہے جب سے کوچۂ جاناں میں کرفیو آرڈر جاری
تو شب کو دس بجے سے قبل عاشق بھاگ جاتے ہیں

ان اشعار کے علاوہ "افیونیوں کا رجز" والی نظم پیش کی جاسکتی ہے جو انھوں نے جرمنی کی پہلی جنگ پر کہی تھی۔ کلام کا دوسرا اور بالکل اصلاحی ہے مگر یہ اصلاح محدود نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ کو محیط کئے ہوئے ہے۔ اکبر ہی کی طرح ظریف کو بھی قوم کی بیٹیوں کی فیشن پرستی کا غم کھائے جا رہا تھا۔ اس غم نے تو رآ ہی اشعار کی صورت اختیار کر لی۔ لیکن دیکھئے کہ ظریف کا طنز آج کے فیشن اور ہماری نئی نسل پر کتنا پورا اتر رہا ہے:

مساوات اس کو کہتے ہیں، نئی تہذیب کیا کہنا
کہ یکساں ہوگئی صورت زنانی اور مردانی
نظر بازو، جوانی ہوگی اس کی دید کے قابل
ابھی تو گھٹنیوں چلنے لگا ہے شوق عریانی
کہ موٹی، لنڈورے بال، سینہ صاف قد لابنا
ہزاروں ہیجڑے صدقے تبانِ فیشن ایبل پر

اور اب شادی کی سودا بازی پر طنز ملاحظہ فرمایئے۔

بیوی کی روٹی کھاتے ہی نواب ہوگیا   شادی ہوئی کسی کی اگر مال دار سے

ہماری قوم کے نوجوانوں کی بدحالی اور ناعاقبت اندیشی پر بھرپور طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ہم کو اڑانے دو کنکوے، بدکر پیچ لڑانے دو
سر پہ فلاکت منڈلاتی ہے، حرج نہیں، منڈلانے دو
غیر ورزش کوبیں، پٹا سیکھیں   آپ کنکوے لوٹنا سیکھیں
غیر میداں میں جاکے نام اٹھائیں   آپ چرخی لیے پتنگ اڑائیں

ایک طرف تو ظریف اپنے ملک کے نوجوانوں سے مایوس اور دوسری طرف رہنماؤں اور مذہبی پیشواؤں سے حد درجہ نالاں اور بیزار تھے اور جب بھی موقع ملا سخت سے سخت تنقید سے باز نہیں آتے تھے۔

کہتا تھا صیاد کرکے روز دانتوں میں خلال
ایک ایک تنکا نشیمن کا مرے کام آگیا

ہمیشہ اک نہ اک دینے نیا آزار بیٹھے ہیں
جہاں میں صدر بن کر قوم کے غدار بیٹھے ہیں
لگائیں گے یہ بیڑا پار کیا، کشتی ڈبو دیں گے
جو قومی ناؤ کھینے تھام کر پتوار بیٹھے ہیں

اب مذہبی رہنماؤں سے بھی دو دو ہاتھ ہوتے دیکھ لیجئے۔

حکومت کے لبولے سے جہاں قربت ہوئی ان کو
تو اپنوں ہی کی جڑ کاٹیں، یہ ان کی خاص عادت ہے

داڑھی کو تری واعظ سب دیکھ کے کہتے ہیں
وہ قصرِ تقدس کا چھجا نظر آتا ہے

موجودہ فیشن کو پیشِ نظر رکھئے اور ہماری نئی پود کے شعرا کو دیکھتے ہوئے "شاعرہ" پر ظریف مرحوم کی نظم کے دو ایک بند سنتے چلئے۔

مٹ گیا تانیث اور تذکیر کا جب امتیاز
اب نہ داڑھی ہے نہ مونچھیں اور نہ وہ زلفِ دراز
رفتہ رفتہ بڑھ گیا گر شوقِ ذوقِ نغمہ ساز
شاعر اب آئیں گے محفل میں پہن کر پشواز
ختم اس فقرے پہ ہوگی ہر غزل استاد کی
سنئے میں ہوں جانکی بائی الہ آباد کی

الکشن بھی ظریف کا خاص موضوع تھا مگر طوالت کے خوف سے میں پہلو تہی کرنے پر مجبور ہوں۔ ظریف کی مشہور زمانہ نظم "سفرنامہ" کا ایک بند پیش خدمت کرتے ہوئے مضمون ختم کرتا ہوں۔

کچھ ریل گھر کا حال کروں مختصر بیاں   وہ نو بجے کا وقت وہ ہنگامہ کا سماں
قلیوں کا لاؤ لاد کے لانا وہ پیٹیاں   بجنا وہ گھنٹیوں کا، وہ انجن کی سیٹیاں
گرد بڑے مسافروں کی بھی اک یادگار تھی
عورت پہ مرد، مرد پہ عورت سوار تھی

★

دیوانِ میرؔ کا قدیم ترین اور مستند مخطوطہ
نسخۂ محمود آباد (۲)

• ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو شمارہ ۲۶ جنوری ۱۹۷۴ء۔ اس قسط میں کتب خانہ راجہ صاحب محمود آباد میں موجود میرؔ کے دو اہم دیوان ــــ دیوان چہارم کی تفصیل اور ۱۲۰۳ھ کے مکتوبہ مخطوطہ کے، جسے مضمون میں آسانی کے خیال سے "نسخہ محمود آباد کہا گیا ہے"، غیر مطبوعہ کلام کا کچھ حصہ درج کیا گیا ہے۔ یہاں نسخۂ محمود آباد کے دیگر غیر مطبوعہ اشعار درج کیے جا رہے ہیں۔ فٹ نوٹ میں نسخۂ کلکتہ کے وہ صفحات درج کردیے گئے ہیں جن پر ان اشعار کو درج ہونا چاہیے۔ (ایڈیٹر)

غزل ۹۱

کیونکر میں فتح پاؤں تری زلفوں پہ کہ اب — یکدل شکست خوردہ مراد و طرف ہوا[1]

غزل ۹۴

جلا کیونکر نہ ہوگا آشیانِ بلبلِ بیکس — برنگِ آتش خس پوش رنگ گل دہکتا تھا[2]

غزل ۹۵

مجھے تو نور نظر نے تنک کبھی تن نہ دیا — بہار جاتی رہی دیکھنے چمن نہ دیا

لباس دیکھ لیے میں نے تیری کوشش کے — کہ بعد مرگ کنھیں نے مجھے کفن نہ دیا

کھلی نہ بات کئی حرف تھے گرہ دل میں — اجل نے اس سے مجھے کہنے اک سخن نہ دیا

غزل ۹۶

تھا زعفراں پہ ہنسی کو دل جس کی گرد کا — مشتاق مونہہ میرا ہوا اسی رنگ زرد کا

کیا ڈراُسے ہے گرمیٔ خورشید حشر سے — سایہ پڑا ہے جس پہ مری آہ سرد کا

غزل ۹۷

جبکہ تابوت مرا جائے شہادت سے اٹھا — شعلۂ آہ دل گرم محبت سے اٹھا

عمر گزری مری بیمار ہی رہتے رہتے — دل عزیزوں کا اگر میری عیادت سے اٹھا

غزل ۹۹ شعر ۳

میں تو افسردہ ہر چمن میں پھرا — غنچۂ دل مرا کبھی نہ کھلا[3]

غزل ۱۰۱

طفلِ مطرب جو میرے ہاتھ آیا — چٹکیوں میں رقیب اڑ جاتا

حد ہے الفت کچھی تیغ سے اس کی — قتل کرتا تو لوہو جم جاتا[4]

خواب میں بھی رہا تو آنے سے — دیکھنے ہی کا تھا یہ سب ناتا

غزل ۱۰۲ شعر ۴، ۵

جو نہ کہتا تھا سو کبھی میں نے کہا — دل کی بے طاقتی سے خوار ہوا[5]

---

[1] نسخۂ کلکتہ ص ۶۹ [2] نسخۂ کلکتہ ص ۶۹ [3] نسخۂ کلکتہ ص ۳۰۳ دیوان دوم و دیوان پنجم ص ۶۱۸ [4] کتب خانہ آصفیہ (نسخہ آصفیہ) حیدر آباد میں دیوان میرؔ کا ایک نادر مخطوطہ ہے۔ اس میں دوسرا شعر مقطع کے طور پر یوں درج ہے ؎

الفت اس تیغ سے کچھ ہے حد میرؔ — قتل کرتا تو لوہو جم جاتا

[5] نسخۂ کلکتہ ص ۲۷

پھر گیا ہے زمانہ کیا کہ مجھے   ہوتے خوار ایک روزگار ہوا

غزل ۱۰۵
محشر سوائے کیا ہوا سے التیام میرؔ   یہ زخم سینہ جائے گا میرا دہیں سیا

غزل ۱۰۶
لوہو پینے کو میرا بس تھی مری تشنہ لبی   کاہے کو کیجیے تصدیع یہ جلاد آیا

غزل ۱۰۸
سنو ہو جل ہی بجھونگا کہ ہو رہا ہوں میں   چراغ مضطرب الحال صبح گاہی کا

غزل ۱۰۹ شعر ۵
تا کجا غنچہ صفت رکتا چمن میں دہر کے   کب گرفتہ دل مرے سینہ میں خوں ہو جائے گا[1]

غزل ۱۱۲ شعر ۷
لاشہ مرا تسلی نہ زیر زمیں ہوا   جب تک نہ آن کر وہ سر گور ہو گیا[2]

غزل ۱۳۱ شعر ۴، ۵ (ردیف ب)
رویا تھا تری چشم و مژہ یاد کر کے میں   ہے نیزہ نیزہ تب سے ذراع ختن میں آب[3]
ناسور پھونک پھونک کے کھینچو خبر ہو شرط   ہے آپ داغ کو چہ زخم کہن میں آب

غزل ۱۳۸ شعر ۵ (ردیف ت)
رہ گیا دیکھ کے تجھ چشم پہ یہ سطر مژہ   ساقیا یوں تو پڑھے تھے میں خط جام بہت[4]

غزل ۱۳۹ شعر ۸ (ردیف ج)
کرتی ململ کی پہن آتے تو ہو رندوں میں   شیخ صاحب نہ کہیں چھنتے پڑے شانے بیچ[5]

غزل ۱۴۲ شعر ۸، ۹، ۱۰ (ردیف ح)
سو طرح دیکھ دیکھ طبیبوں نے یہ کہا   صحت پذیر ہوئے یہ بیمار ایک طرح[6]
سو بھی ہزار طرح سے ٹھہراوتے ہیں ہم   تسکین کے لیے ترے ناچار ایک طرح
بن جی دیئے ہو کوئی طرح فائدہ نہیں   گر ہے تو یہ ہے اے جگر افگار ایک طرح

غزل ۱۴۵ (ردیف خ)
ہے نئے دشمن جاں وہ شوخ   ان دنوں کچھ مہربان وہ شوخ

غزل ۱۵۹ شعر ۶ (ردیف ر)
جیتے جی مرے لینے نہ پائے طپش بھی دم   اتنی تو سعی تو بھی جگر خواہ مخواہ کر[7]

غزل ۱۶۳ شعر ۴، ۶
سیر کر کثرت عالم کی مری جان کہ پھر   تن تنہا ہی تو اور کنج مزار آخر کار[8]
ابتدا ہی میں محبت کی ہوئے ہم تو تمام   ہونا ہوگا یہی کچھ عشق میں یار آخر کار

غزل ۱۶۴ شعر ۳
ہجراں کی شب سے مجھکو گلہ نہیں کہ ان نے بھی   دیکھی نہیں ہے خواب میں آنکھوں کبھی سحر[9]

غزل ۱۶۵
گل ہوئے کوچے میں اس کے آنے سے بھی اب رہا
ابر تو کاہے کو رو دیا تھا ہماری خاک پر[10]

غزل ۱۶۹ شعر ۵
تری وضع ستم سے اے بیدرد   ایک عالم گیا الم لے کر[11]

غزل ۱۷۰ شعر ۶ (ردیف ز)
گزری نہ پار عرش کی تسکین ہو مجھے   افسوس مری آہ رہی نارسا ہنوز[12]

غزل ۱۷۱ شعر ۳، ۵، ۸
خاک میں ہے وہ طفل اشک اس بن   چشم ہے جس کا گاہوارہ ہنوز[13]
ایک بار آکے پھر نہیں آیا   عمر کی طرح وہ دوبارہ ہنوز
کب کی توبہ کی میرؔ نے لیکن   ہے بتر از شراب خوارہ ہنوز

غزل ۱۷۲ شعر ۵
ناامیدی میں تو مر گئے یہ نہیں معلوم   جیتے ہیں کون سی امید پہ ناچار ہنوز[14]

غزل ۱۷۳ شعر ۳
ایک بھی تار گریبان کفن بیچ نہیں   جم ہوئی بیٹھی ہے چھاتی پہ مری خاک ہنوز[15]

غزل ۱۷۷ شعر ۳ (ردیف ش)
ایک دم بھر برسوں تک کینہ   یوں ہی گزری ہے اپنی اس کی ہمیش[16]

غزل ۱۸۱ شعر ۲ (ردیف ع)
یوں جلا ڈالا کہ کچھ روشن نہ ہوئی تقریر شمع
واہ وا اے آتش جاں سوز بے تاثیر شمع[17]

غزل ۱۸۶ شعر ۳ (ردیف ک)

۱؎ نسخۂ کلکتہ ص ۹۶ ، ۲؎ ص ۱۲۶ ، ۳؎ ص ۸۰ ، ۴؎ ص ۸۳ ، ۵؎ ص ۸۶ ، ۶؎ ص ۸۶ ، ۷؎ ص ۶۶۲ دیوان پنجم ، ۸؎ ص ۹۹ ، ۹؎ ص ۱۰۰ ، ۱۰؎ دیوان پنجم ص ۶۶۳
۱۱؎ نسخۂ کلکتہ ص ۹۹ ، ۱۲؎ ص ۱۰۱ ، ۱۳؎ ص ۱۰۲ ، ۱۴؎ ص ۱۰۳ ، ۱۵؎ ص ۱۰۳ ، ۱۶؎ ص ۱۰۵ ، ۱۷؎ ص ۱۰۶

سیماگن ۱۸۹۵ اشک

مجنوں نہ تھا کہ جس کے تئیں سونپ کے مرد ہوں — آشفتگی کا مجھ کو پٹا غم ہے زیر خاک[1]

غزل ۱۸۸ شعر ۳

دور والوں کو بھی نہ پہنچے ہم — یہی نہ تم سے ہیں مگر نزدیک[2]

غزل ۱۸۹ شعر ۳

روتا ہوں آہوؤں کی تری چشم یاد کر — طوفاں کئے ہیں سینکڑوں دشت ختن تلک[3]

غزل ۱۹۷ شعر ۶ (ردیف م)

جب جا پھنسا کہیں تو ہمیں یہاں ہوئی خبر
رکھتا ہے کون دل تری اتنی خبر کہ ہم[4]

غزل ۲۰۰ شعر ۳، ۶، ۱۰

تم ہی بیگانگی کرو نہ کرو — دلبرو دے ہی آشنا ہیں ہم[5]
ترے کوچے میں تا برگ رکھا — کشتۂ منت دفا ہیں ہم
ڈرتے ہیں تیری بے دماغی سے — کیونکہ پھر یار جی بلا ہیں ہم

غزل ۲۰۲ شعر ۵ (ردیف ن)

لگتی ہے آگ تن میں دیکھے سے داغ اس کے
اس دل جلے ہوئے پہ کتنا ہی دل جلاؤں[6]

غزل ۲۰۴ شعر ۹

اے اجل سے جی چھپانا مرا آشکار رہے گا
کہ خراب ہوگا تجھ بن غم عشق گلعذراں[7]

غزل ۲۰۶ شعر ۲، ۵، ۸

آتے ہیں مجھے خوب یہ دونوں ہنر عشق — رونے کے تئیں آندھی ہوں کڑھنے کا بلا ہوں[8]
آیا کوئی بھی طرح مری چین کی ہوگی — آزردہ ہوں جینے سے میں مرنے سے خفا ہوں
دل خواہ جلا اب تو مجھے اے شب ہجراں — میں سوختہ بھی منتظر روز جزا ہوں

غزل ۲۰۷ شعر ۶

بخت سیہ تو اپنے رہتے ہیں خواب ہی میں
اے رشک یوسف مصر پھر کس کو چاہ دیکھوں[9]
تاریک ہو چلا ہے آنکھوں میں میرے عالم
ہوتا ہے کیونکے دل بن میرا نباہ دیکھوں

غزل ۲۰۸ شعر ۷

رندوں کے تئیں ہمیشہ ملامت کرے ہے تو — آجائیو نہ شیخ کہیں ہشت بہشت میں[10]

غزل ۲۰۹ شعر ۲، ۱۲

جس پہ کرتے ہو سدا جور و جفا میں ہی ہوں
پھر بھی جس کو ہے گماں تم سے وفا میں ہی ہوں[11]
رک کے جی ایک جہاں دوسرے عالم کو گیا
تن تنہا نہ ترے غم میں ہوا میں ہی ہوں

غزل ۲۱۱ شعر ۵، ۶

کہتا ہوں حال دل تو کہے ہو کہ مت بکے — کیوں ہی تری تو بات مرے دلنشیں نہیں[12]
ضائع کیا میں اپنے تئیں تو نے کی خوشی — بے مہر کیوں کے جانئے تجھ میں کہ کیں نہیں

غزل ۲۱۴ شعر ۳

خطرہ سے ہونٹھ سوکھ ہی جاتے تھے دیکھ کر — آتا نظر ہمیں جو کوئی چشم تر کہیں[13]

غزل ۲۱۵ شعر ۵

کس سے مانگا ہے میں آج تک کہ جی لیوے — یہ احتیاج تجھہی تک اے یار لایا ہوں[14]

غزل ۲۱۶ شعر ۴

تو کرے ہے قرار ملنے کا — ہم ابھی بے قرار ہوتے ہیں[15]

غزل ۲۱۷ شعر ۵

کیا چہرہ تجھ سے ہوگا اے آفتاب طلعت — مونہہ چاند کا جو ہم نے دیکھا تو چھایاں ہیں[16]

غزل ۲۱۸ شعر ۶

جنوں جب سے ہوا اس کا دشمن ہوں ناصح — تو کب سے ہوا دوستدار گریباں[17]

غزل ۲۲۰ شعر ۳

بحث کرتا ہوں ہو کے ابجد خواں — کس قدر بے حساب کرتا ہوں[18]

غزل ۲۲۳ شعر ۶، ۷، ۸

کوئی رووے ہے کوئی تڑپے ہے — کیا کروں میری ہی کہاتے ہیں[19]
ورنہ میں سیر ہوں مرے آگے — دشت غم میں نے نبھتے پاتے ہیں
کھود گاڑوں زمیں میں دونوں کو — گرچہ یہ آسماں پہ جاتے ہیں

غزل ۲۲۴ شعر ۴

۱؎ ص۱۰۸، ۲؎ ص۱۰۹، ۳؎ ص۱۱۱، ۴؎ ص۱۱۵، ۵؎ نسخۂ کلکتہ ص۱۱۸، ۶؎ ص۱۱۹، ۷؎ ص۱۲۱، ۸؎ ص۱۲۳، ۹؎ ص۱۲۴، ۱۰؎ ص۱۲۵، ۱۱؎ ص۱۲۶، ۱۲؎ ص۱۲۸
۱۳؎ ص۱۳۰، ۱۴؎ ص۱۳۲، ۱۵؎ ص۱۳۳، ۱۶؎ ص۱۳۵، ۱۷؎ ص۱۳۴، ۱۸؎ ص۱۳۶، ۱۹؎ ص۱۳۶۔

ے عاشق ترے رسوا کہائے — ترے ہو کر کہہ اب کس کے کہاویں[1]

غزل ۲۲۵ شعر ۴

گئے وے دن جو آنسو روتے تھے میر — جھمکتا ہے لہو اب چشم نم میں[2]

غزل ۲۳۰ شعر ۵

خواب خوش سحر سے شوخ تجھ کو صبا جگا گئی

مجھ پر عبث ہے بے دماغ میں نے تو کچھ کہا نہیں[3]

ل ۲۳۳ شعر ۵

تلخ ان کے کیا کہوں میں عرض — خوبرو بد زبان ہوتے ہیں[4]

غزل ۲۳۵ شعر ۳، ۴

پہچانتا ہوں تیرے تئیں — اتنا بھی تو میں بے شعور نہیں[5]

ل ہی کر کہ اس میں راحت ہے — لازم اس کام میں مزدور نہیں

غزل ۲۳۶ شعر ۳، ۶

ن جگر تو کچھ نہ رہا تو ہی سب ہوا — بس اے سرشک آنکھیں تری کیا گہر نہیں[6]

الاماں کرے ہے دل شب گھڑی گھڑی — برچھی لگاتی آہ ہماری اگر نہیں

ل ۲۳۹ شعر ۵

ستوں بھی ہو وہی اور وہی جوئے شیر — تھا نمک شہرت شیریں کا سو فرہاد نہیں[7]

ل ۲۴۱ شعر ۴، ۸

فلک پر راہ مجھکو نے زمیں پر دے مجھے — ایسے کس محروم کا میں آہ بے تاثیر ہوں[8]

سعادت ایک جدھر مجھکو بھی گزرانئے — منصفی کیجے تو میں تو محض بے تقصیر ہوں

ل ۲۴۲ شعر ۹

کبھی جانے یہ بیگانہ وضعی مجھ سے شوخ — تو تو ایدھر یک نگاہ آشنا کرتا نہیں[9]

۲۴۳ شعر ۶

عشق سے رہتی ہے دل پر اداسی رہتا — نہایت عیب یہ اس دیار غم کے والی میں[10]

ل ۲۴۳ شعر ۴

ری دیکھے جو ہو ایدھر — ایسا کہ تم نے آنکلا ہے یہاں[11]

ل ۲۴۴ شعر ۸

کہیں کھول کھڑا اپنا تو شگفتہ بردشتابی — کہ رہا ہے غنچہ ہو کر گل آفتاب تجھ بن[12]

غزل ۲۴۷ شعر ۶، ۸

بے رحم ٹک تو پا تو تو چھاتی پہ رکھے رہ — مارا کبھی ہو کبھو تئیں کسی خستہ جاں کے تئیں[13]

دیکھے کہاں ہیں زلف تری مردمان شہر — سودا ہوا ہے کہنے لگے اس جواں کے تئیں

غزل ۲۴۹ شعر ۵

چہرہ کے زخم ناخن کیسے کہاں کہ گویا — گھر سے نکلتے ہیں ہم تلواریں منھ پہ کھا کر میں[14]

غزل ۲۵۲ شعر ۷

ہر لحظہ ہے تزاید رنج و غم و الم — غالب کہ طبع دل کو مغلوب کر چکے ہیں[15]

غزل ۲۶۱ شعر ۴، ۱۲، ۱۳ (ردیف واؤ)

لباس مرد میداں جوہر ذاتی کفایت ہو — نہیں پروائے پوشش معرکہ میں تیغ عریاں کو[16]

زبس حرف جنوں میرے ہوا آہیں عبث مت کر — نہ ہو گر حلقہ در خانۂ زنجیر سازاں کو

گل و سرو و چمن گر جائینگے مت سیر گلشن کر — ملامت خاک میں ان بلبلوں کے رعنا جوانا کو

غزل ۲۶۵ شعر ۱۲

کل بتکدے میں ہم نے دھولیں لگائیاں ہیں — کعبہ میں آج زاہد گو ہم پہ سرگراں ہو[17]

غزل ۲۶۹ شعر ۶

زاہداں دیتے نشان ان بتوں کا ڈرتا ہوں

توڑ کر کعبہ کہیں دیر نہ آباد کرو[18]

غزل ۲۷۱ شعر ۳

حشر پہ موقوف تھا سو تو نظر آیا نہ یہاں — کیا ملا در پیش آئی وعدۂ دیدار کو[19]

غزل ۲۷۷ شعر ۵

مجھکو آوارہ جو رکھتا ہے مگر چاہے ہے چرخ

ماتم آسائش غفران پناہی کبھی نہ ہو[20]

غزل ۲۷۹

اس بیگنہ کے قتل میں اب دیر مت کرو — جو کچھ کہ تم سے ہو سکے تقصیر مت کرو

ایفائے عہد قتل تو تم کر کے بیٹھے ہو — اتنے بھی خلف وعدہ سے دلگیر مت کرو

غزل ۲۸۰ شعر ۵

---

۱ صفحہ ۱۳۵، ۲ صفحہ ۱۴۰، ۳ صفحہ ۱۴۱، ۴ صفحہ ۱۴۱، ۵ صفحہ ۱۴۳، ۶ صفحہ ۱۴۳، ۷ نسخہ کلکتہ صفحہ ۱۴۳، ۸ صفحہ ۱۴۷، ۹ صفحہ ۱۳۶، ۱۰ صفحہ ۱۳۶، ۱۱ صفحہ ۱۳۸، ۱۲ صفحہ ۱۳۸، ۱۳ صفحہ ۱۳۸،

۱۴ صفحہ ۱۵۰، ۱۵ صفحہ ۱۵۱، ۱۶ صفحہ ۱۲۹، ۱۷ صفحہ ۱۵۴، ۱۸ صفحہ ۱۵۶، ۱۹ صفحہ ۱۶۴، ۲۰ صفحہ ۱۶۶، صفحہ ۱۶۹

آنکھوں میں اشک حسرت اور لب پہ شیون آیا
اے حرف شوق تو بھی آیا زباں تلک تو [1]

غزل ۲۸۶ شعر ۳ (ردیف ہ)

جگر سوزاں و دل بریاں برہنہ پا و سر عریاں
تجاوز کیا کروں ایسے کہ انھیں کا ہوں وابستہ [2]

غزل ۲۸۹ شعر ۵، ۷، ۹

داماں و جیب چاک و خرابی و خستگی — ان سے ترے فراق میں ہم نے کیا نباہ [3]
گل سے شگفتہ داغ دکھاتا ہوں تیرے تئیں — گر موافقت کرے ہے تنک مجھ سے سال و ماہ
گو منع مجھ کو کرتے ہیں تیری گلی سے لوگ — کیونکر نہ جاؤں مجھ کو تو مرنا ہے خواہ مخواہ

غزل ۲۹۹ شعر ... (ردیف یے)

بڑے آسودگان خاک چونکو شور محشر سے
مرا جو کوئی بے خود ہے وہ ہشیاری کو کیا جانے [4]
پریشاں فوج فوج لخت دل نکلے ہے آنکھوں سے
نپٹ ناداں ہے طفل اشک سرداری کو کیا جانے

غزل ۳۰۰ شعر ۴

دیکھتے پھرتے ہیں مونہہ سب کا سحر آئینے
جلوہ گر ہو کے یہ تجھ بن بہت حیران ہوئے [5]

غزل ۳۰۲ شعر ۱

کس شکل سے احوال کہوں اب میں الٰہی
صورت سے تری جس میں وہ بیزار نہ ہوئے [6]

غزل ۳۰۵ شعر ۵

نظر سے جس کی یوسف سا گیا پھر اس کو کیا سوجھے
حقیقت کچھ نہ پوچھو پیر کنعاں کی بصارت کی [7]

غزل ۳۱۱ شعر ۲، ۵

مت پوچھ میری اس کی شام و سحر کی صحبت
اس طرف سے ہے گالی اس طرف سے دعا ہے [8]

آزردگی عبث کیوں تشہیر و قتل و ایذا
فرمایئے تو وہ کچھ جو کچھ کہ مدعا ہے

غزل ۳۱۸ شعر ۶

کچھ تو کہے گا ہم کو خاموش دیکھ کر وہ — اس بات کے لیے اب چپ ہی رہا کریں گے [9]

غزل ۳۲۱

رشک گلشن اگر تو ناز کرے — رنگ رو کو چمن نیاز کرے
تیری ابرو جدھر کو مائل ہو — ایک عالم ادھر نماز کرے

غزل ۳۲۲ شعر ۲

چلے آتے تھے جو آنا فانا دیکھ حیرت کو — دے آنسو بھی لگے آنکھیں چرانے کیا زمانا ہے [10]

غزل ۳۲۳

صبح سے بن علاج تو خوش ہے — ترا بیمار آج تو خوش ہے
تیر پھر کہیو سرگذشت اپنی — بارے یہ کہہ مزاج تو خوش ہے

غزل ۳۳۱ شعر ۳

گاہے آتا ہوں آپ میں سو بھی — جیسے کوئی مہمان جاتا ہے [11]

غزل ۳۳۲ شعر ۳

صیاد عرض حال کروں اور تجھ سے کیا — ظاہر اضطراب مرا زیر دام ہے [12]

غزل ۳۳۶ شعر ۷، ۱۱، ۱۲

ہر چند کہ ان ترکوں میں ہو چلو مزاجی — ہر کام میں ملنے کی یہ تاخیر کریں گے [13]
کھڑے کے ترے دیکھنے والوں کے مقابل — لادے گا کوئی منہ کو تو تعذیر کریں گے
شیخوں کی نہ جا سجو و سجادہ پہ ہرگز — مقدور تلک اپنی یہ تزویر کریں گے

غزل ۳۳۷ شعر ۴

ٹک زیر طاق نیلی وسواس سے رہا کر — مدت سے گرنے پر یہ ایوان ہو رہا ہے [14]

غزل ۳۳۰ شعر ۷، ۸

کتنی ہی جی نے تجھ سے لی خاک گرائی — وابستگی کر اس سے پرو ہی جہاں ہے دار [15]
قتل گاہ کس کی کو یہ ترا ستمگر — یک عمر خضر ہو گئی خوں منفعل رواں ہے

غزل ۳۴۱ شعر ۶

---

[1] ص۱۷۰، [2] ص۱۷۰، [3] ص۱۸۵، [4] ص۱۹۳، [5] ص۱۹۴، [6] ص۱۹۵، [7] ص۱۹۸، [8] ص۱۹۹، [9] ص۲۰۳، [10] ص۲۱۶، [11] ص۲۰۸، [12] ص۲۲۳، [13] ص۲۲۳، [14] ص۱۸۶، [15] ص۲۲۶

تب ٹھکانے لگی ہماری خاک جب ترے آستان پر آئی [1]

غزل ۳۳۳ شعر ۵

کیا فکر ملک گیری میں ہے جسے جو پیش ازیں

ان میں سے تو ہی دیکھ جہاں دار کون ہے [2]

غزل ۳۳۶ شعر ۵

اٹھتے ہی صبح کے تئیں عاشق کو قتل کرنا خوباں کی سلطنت میں دستور ہے تو یہ [3]

غزل ۳۴۹ شعر ۶

نہیں سوجھتا کچھ جو اس بن ہمیں بغیر اس کے رہتے ہیں ہم کور سے [4]

غزل ۳۵۱ شعر ۴، ۶

مرنا بھلا ہے ظالم اس زندگی بد سے

یوں چاہیے کہ کوئی تجھ سے نہ یار ہووے [5]

وابست آسماں کا ملتا ہے خاک ہی میں

اس بے مدار اوپر کس کا مدار ہووے

غزل ۳۵۲ شعر ۱۶

گاہ نالاں طپاں گہے بیدم دل کی میری عجیب ہی حالت ہے [6]

غزل ۳۵۴ شعر ۸

ہے وہ بلائے عشق کہ آئے سو آئے ہی کلول نہیں ہے ایسی محبت کہ ٹل سکے [7]

غزل ۳۵۶ شعر ۴

تیغ برہنہ کف میں وہ بیداد گر ہے آج ہے مفت وقت اس کو جو کوئی جان کھوئے [8]

غزل ۳۶۰ شعر ۳

خوار و خستہ کبھی پامال تری راہ میں ہیں کیجیے رنجہ قدم ان کو بھی عزت دیجیے [9]

غزل ۳۶۰ شعر ۳

ملایا خاک کر دامن سے اشکوں میں ڈبایا پھر

مرے ہاتھوں کی تردستی گریباں یاد کرتا ہے [10]

غزل ۳۶۹ شعر ۵

یاری لڑکوں سے مت کرے ان کا عشق کچیا مان ہے پیارے [11]

غزل ۳۸۱ شعر ۶، ۷

ایک غم میں ہوں میں ہی عالم میں یوں تو شاداں ہے اور سب کوئی [12]

ناسمجھ یوں خفا بھی ہوتا ہے مجھ سے مخلص سے بے سبب کوئی

غزل ۳۸۲ شعر ۳

جو خوشہ تھا صد خرمن برق تھا یہاں جلایا ہوا ہوں میں حاصل کا اپنے [13]

غزل ۳۸۶

تو خاطر جمع رکھ دامن کہ اب شہر گریباں سے

تری خاطر ہزاروں چاک تحفہ ہاتھ لاتا ہے

بتاں کے ہجر میں روتا ہوں شب کو اور سحر ہر دم

ہنسے ہے دور سے مجھ پر خدا یہ دن دکھاتا ہے

غزل ۳۸۷ شعر ۳، ۴

داغ ہی اگتے رہے دل میں مری نومیدی سے

ہارا میں تخم تمنا کو بھی بوتے بوتے [14]

جی جلاتا تھا کہ ترے ہونٹھ مجھے یاد آتے

لعل پائے ہیں میں اس جی ہی کے کھوتے کھوتے

غزل ۳۸۸ شعر ۲

کیا تفاوت ہے بڑے چھوٹے میں گر سمجھے کوئی

کیا عجب ہے مشک کو سقا اگر دریا کہے

غزل ۳۹۰ شعر ۲، ۳

آتش غم میں جل رہے ہیں ہما چشم مجھ استخواں پہ مت رکھیے

سو گیا وہ سمجھ کے افسانہ درد دل اب کہاں تلک کہیے

غزل ۳۹۳ شعر ۳

عشق بتاں سے نبض مری دیکھ کر حکیم کہنے لگا خدا ہی ہو اب تو تو یہ جیے [15]

غزل ۳۹۵ شعر ۶

گر زندگی یہی ہے جو کرتے ہیں ہم اسیر تو وے ہی جی گئے جو گرفتار مر گئے [16]

غزل ۳۹۸ شعر ۴، ۷، ۱۰

---

۱ نسخہ کلکتہ ص ۱۸۶، ۲ ص ۲۲۸، ۳ ص ۲۳۸، ۴ ص ۲۳۰، ۵ ص ۲۲۹، ۶ ص ۲۳۱، ۷ ص ۲۳۳، ۸ ص ۲۳۵، ۹ ص ۲۳۴ دیوان دوم، ۱۰ ص ۲۳۴ دیوان دوم، ۱۱ ص ۲۱۴ ـ ۱۲ ص ۲۱۹، ۱۳ ص ۲۲۰ ۱۴ نسخہ کلکتہ ص ۲۲۱، ۱۵ ص ۲۲۲، ۱۶ ص ۲۲۱،

اسیری میں سارا قفس بوئے گل ہے — معطر ہوا گو دماغ اب کہاں ہے [۶]
درود اس کے تئیں دیکھ کر بھیجتے ہیں — وہ تو گل بھی صل علیٰ کیا جواں ہے
ہے بس شاید حال رنگ شکستہ — جو دل میں ہے میرے سو منھ پر عیاں ہے

غزل ۴۰۵

دن میں سو سو کتابیں لکھئے — یار جو حرف آشنا ہوئے [۷]
کر نمک سود سینۂ مجروح — جی میں گر ہے کہ کچھ مزا ہوئے

غزل ۴۰۷ شعر

ہوتا نہیں ہوں حضرت ناصح میں بے دماغ
کر کر کے پوچ گوئی مری جان کھائیے [۸]

غزل ۴۱۲ شعر ۸

نہیں ہے تاب و تواں کی جدائی کا اندوہ
کہ ناتوانی بہت ہے مزاج داں میری [۹]

غزل ۴۱۳ شعر ۵، ۶

کیا جانئے کیا کیا میں لکھوں شوق میں قاصد
پڑھنا نہ کرے خط کا کہیں اس پہ گرانی [۱۰]
یہ جان اگر بید مولے کہیں دیکھے
رہ گئی ہے کسی موئے پریشاں کی نشانی

غزل ۴۱۴ شعر ۱۰، ۱۱

پی نہ ہرگز شراب صبا چاہ — اس کے نشہ کا تار رہتا ہے
پُر ہو پیمانہ عمر کا جب تک — تب تلک یہ خمار رہتا ہے

غزل ۴۱۶

خون ہوتا نظر آتا ہے کسی کو مجھ کو — ہر نگہ ساتھ ترے مصلحت آبرو ہے

غزل ۴۱۸ شعر

مضطرب گریہ ناک ہے یہ گل — برق ابر بہار ہیں ہم بھی

غزل ۴۲۱ شعر

ہے حرف بسکہ رویا ہے حال پر ہمارے
قاصد کے ہاتھ میں خط نمناک ہوگیا ہے

غزل ۴۲۲ شعر ۸

دیدار کی گرسنگی اپنی نہیں ہے دیکھ — ایک ہی نگاہ یاروں کی اوقات ہوگئی [۹]

غزل ۴۲۳ شعر ۵

شیخ جی مندیل کچھ بگڑی سی ہے کیا آپ بھی
رندوں بانکوں میکشوں آشفتہ دستاروں میں تھے

غزل ۴۲۴ شعر ۲، ۷

داغ فراق و حسرت وصل آرزوئے دید
کیا کیا لیے گئے ترے عاشق جہان سے [۱۱]
کینہ کے مرے تجھ سے نہ چاہے گا کوئی داد
میں کہہ مروں گا اپنے ہر اک مہربان سے

غزل ۴۲۵ شعر ۷، ۸

قتل کو میں کہا تو اٹھ بولا — آجکل صبح و شام ہوتا ہے [۱۲]
آخر آؤں گا نعش پر اب آہ — کہ یہ عاشق تمام ہوتا ہے

غزل ۴۲۷ شعر ۴، ۷

زلف سیاہ یار کی رہتی ہے چت چڑھی
یہ تازہ مرے جی کو کہاں کی بلا لگی [۱۳]
تھا صید ناتواں میں دلے میرے خون سے
پاؤں میں صید بندوں کے بھر کر حنا لگی

غزل ۴۲۹ شعر ۱

نے صبر ہے نہ ہوش ہے گل بن نہ تاب ہے
بے طاقتی ہے بے کلی ہے اضطراب ہے [۱۴]

(باقی)

★

[۱] نسخۂ کلکتہ ص ۱۳ میں قصیدہ درج ہے اور یہ اشعار وہاں درج نہیں ہیں، [۲] ص ۲۳۷۔ پہلا شعر نسخۂ آصفیہ میں ہے۔ [۳] نسخۂ کلکتہ ص ۲۳۹، [۴] ص ۲۴۱، [۵] ص ۲۴۳، [۶] ص ۲۴۳، [۷] ص ۲۴۳، [۸] ص ۲۴۵، [۹] ص ۲۴۷، [۱۰] ص ۲۴۷، [۱۱] ص ۲۴۸، [۱۲] نسخۂ کلکتہ ص ۲۴۹، [۱۳] ص ۲۵۰، [۱۴] ص ۲۵۲،